انوار البیان
عام فہم اردو تفسیر
محقق العصر حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ
دار الاشاعت
اردو بازار ○ کراچی
فون: 021-2213768

انوار البیان
فی کشف اسرار القران

عام فہم اردو تفسیر

انوار البیان

فی کشف اسرار القرآن

سلیس اور عام فہم اردو میں پہلی جامع اور مفصل تفسیر جس میں تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، دلنشیں انداز میں احکام و مسائل اور مواعظ و نصائح کی تشریحات، اسباب نزول کا مفصل بیان، تفسیر، حدیث و فقہ کے حوالوں کے ساتھ

محقق العصر حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : نومبر ۲۰۰۶ء علمی گرافکس
ضخامت : 728 صفحات

مصححین: مولانا محمد شفیق کشمیری صاحب (فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن)
مولانا سرفراز احمد صاحب (فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن)
مولانا عرفان صاحب (فاضل مدرسہ عربیہ رائے ونڈ لاہور)

تصدیق نامہ

میں نے تفسیر ''انوار البیان فی کشف اسرار القرآن'' کے متن قرآن کریم کو بغور پڑھا جو کمی نظر آئی اصلاح کر دی گئی۔ اب الحمدللہ اس میں کوئی غلطی نہیں۔ انشاءاللہ

23/08/06

محمد شفیق (فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن)
رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف سندھ نمبر مجاریہ R.ROAUQ 2002/338

﴿........ ملنے کے پتے ....﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

Islamic Books Centre
119-121, Halli Well Road
Bolton BL 3NE, U.K.

Azhar Academy Ltd.
London
Tel : 020 8911 9797, Fax : 020 8911 8999
Email : sales@azharacademy.com.
Website : www.azharacademy.com

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

فہرست تفسیر انوار البیان

(جلد اول از پارہ ۱ ...... تا ...... ۵)

☆☆☆..................☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

مکی	سورۃ الفاتحۃ	۷ آیتیں اور ۱ رکوع

(ایاتہا ۷) (۱) سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مکیۃ (۵) (رکوعہا ۱)

سورۃ الفاتحہ مکہ میں نازل ہوئی اس میں سات آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہانوں کا۔ جو سب سے بڑا مہربان بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ مالک ہے روزِ جزا کا۔ ہم تیری ہی

نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ

عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، چلا ہم کو سیدھے راستہ پر۔ جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تُو نے

عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

انعام فرمایا، جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں۔

المنزل ۱ ع ۱

سورۂ فاتحہ کے اسماء اور فضائل............سورۂ فاتحہ مکی ہے، بعض عُلماء نے اسے مدنی بھی کہا ہے اور بعض علمائے تفسیر نے فرمایا کہ یہ سورت دوبار نازل ہوئی ہے ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں، اس سورت کے بہت سے نام ہیں سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحہ ہے۔ تفسیر اتقان میں پچیس (۲۵) نام ذِکر کئے ہیں، جن میں چند نام یہ ہیں: ۱۔ فاتحۃ الکتاب، ۲۔ فاتحۃ القرآن، ۳۔ ام الکتاب، ۴۔ ام القرآن، ۵۔ السبع المثانی، ۶۔ سورۃ المناجاۃ، ۷۔ سورت السوال، ۸۔ سورۃ الحمد، ۹۔ سورۃ الشکر۔

سورۂ حجر میں فرمایا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ؕ

(اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں، جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم دیا)۔

السبع (سات) اس لئے فرمایا کہ اس میں سات آیات ہیں اور مثانی اس لئے فرمایا کہ یہ سورت بار بار پڑھی جاتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ص ۶۴۲ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کا نام ام الکتاب اس لئے رکھا گیا کہ یہ مصاحف میں بالکل شروع میں لکھی جاتی ہے اور نماز میں بھی اسی سے قرأت شروع کی جاتی ہے اور سورۂ فاتحہ کی یہ بھی بہت بڑی فضیلت ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

احادیث شریفہ میں سورۂ فاتحہ کی بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، صحیح بخاری ص ۶۴۲ ج ۲ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

سورۂ فاتحہ کو اعظم سورۃ فی القرآن (یعنی قرآن کی عظیم ترین سورت) فرمایا سنن ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کی قسم اس جیسی سورت نہ توریت میں اُتاری گئی نہ انجیل میں نہ زبور میں نہ قرآن میں۔ (باب ما جاء فی فضل فاتحۃ الکتاب)۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کو افضل القرآن بتایا۔ (درمنثور ص ۵ ج ۱) بعض احادیث میں سورۂ فاتحہ کو دو تہائی قرآن کے برابر فرمایا ہے۔ (درمنثور ص ۵ ج ۱)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں اُس خزانہ سے اُتاری گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے ان چار کے علاوہ اس میں سے کوئی چیز نہیں اُتاری گئی۔ (۱) اُم الکتاب، (۲) آیۃ الکرسی، (۳) سورۂ بقرہ کی آخری آیات، (۴) سورۂ کوثر۔ (درمنثور ص ۵ ج اعن الطبرانی والضیاء المقدسی فی المختارۃ)

حضرت مجاہد تابعیؒ نے فرمایا کہ ابلیس ملعون چار مرتبہ رویا، ایک تو اس وقت رویا جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، دوسرے اُس وقت جب وہ ملعون قرار دیا گیا، تیسرے جب زمین پر اُتارا گیا، چوتھے جب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ (درمنثور ص ۵ ج ۱)

صحیح مسلم (ص ۲۷۱ ج ۱) میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی نظر آسمان کی طرف اُٹھائی اور کہا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ کھولا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا، ایک فرشتہ نازل ہوا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو آج سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اُترا، اس فرشتہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ خوش خبری سن لیجئے، دو نور آپ کو ایسے ملے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے۔ (۱) فاتحۃ الکتاب، (۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں (ان میں دُعا ہے اور چونکہ یہ دُعا اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہے اس لئے مقبول ہے) ان دونوں میں سے جو بھی کچھ آپ تلاوت کریں گے اللہ تعالیٰ ضرور آپ کا سوال پورا فرمائیں گے۔

تفسیر اتقان میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ میں (اجمالی طور پر) قرآن شریف کے تمام مقاصد اور مضامین جمع کر دیئے ہیں یہ سورت مطلع القرآن ہے اور یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ سورت پورے قرآن شریف کے لئے براعت استہلال کا حکم رکھتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن شریف اور تمام آسمانی ادیان چار علوم پر مشتمل ہیں۔ اوّل: علم الاصول جس میں تین چیزیں ہیں (۱) اللہ پاک کی ذات وصفات کو جاننا، اسکی طرف سورۂ فاتحہ میں شروع کی دو آیتوں میں اشارہ ہے۔ (۲) نبوت و رسالت، اس کی طرف اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں اشارہ ہے۔ (۳) قیامت، اس کی طرف مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں اشارہ ہے۔ دوم: علم العبادات، اس کی طرف اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں اشارہ ہے۔ سوم: علم السلوک یعنی نفس کو آدابِ شرع کا پابند بنانا اور احکام خداوندی کی فرمانبرداری پر آمادہ کرنا اس کی طرف وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اشارہ ہے۔ چہارم: علم القصص یعنی گزشتہ اُمتوں کے واقعات، ان واقعات سے یہ غرض ہے کہ فرماں برداروں کی سعادت و کامیابی اور نافرمانوں کی بدبختی و بربادی معلوم کر کے عبرت حاصل کی جائے، اس مقصد کی طرف صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں اشارہ ہے۔

مسلم شریف (ص ۱۷۰ ج ۱) میں ہے کہ آنحضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے نماز کو (یعنی نماز کے اہم ترین حصہ کو) اپنے اور بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اور بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے (اسکے بعد اس تقسیم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ) جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (یعنی میرے بندہ نے میری تعریف کی) پھر جب وہ کہتا ہے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَثْنٰی عَلَیَّ

عَبْدِیْ (یعنی میرے بندہ نے میری بڑائی بیان کی) پھر جب وہ کہتا ہے: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ (یعنی بندہ نے میری بزرگی بیان کی) پھر جب وہ کہتا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے۔ (یہ آیت اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جہاں بندہ نے اپنی بندگی کا اعلان اور اقرار کیا اور مدد مانگنے کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کو خاص کر لیا اور مان لیا اور اس طرح خود کو رحمت و نعمت کی نوازش کے قابل بنا لیا وہاں اس نے بلاشرکت غیرے اللہ پاک کی معبودیت کا بھی اعلان کیا اور یہ بھی مانا اور جانا اور دوسروں کو بتایا کہ جس سے مدد مانگی جائے وہ صرف اللہ پاک رؤف و رحیم، احد و صمد ہے جو سب کچھ دے سکتا ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور جس کے قبضہ میں ہر چیز ہے اور جس کسی کے پاس قلیل و کثیر جو کچھ بھی ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے) پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرے بندہ کے لئے ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تعوذ اور تسمیہ کا بیان...... جب قرآن مجید کی تلاوت شروع کی جائے تو اوّل اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھا جائے۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (سو جب تو قرآن پڑھنا شروع کرے تو اللہ کی پناہ مانگ شیطان مردود سے) اور اس کے بعد بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھا جائے۔

جب کسی مکان میں رہنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو اس کو تکلیف دینے والی چیزوں سے صاف ستھرا کرتے ہیں پھر اس کو زینت دیتے ہیں یعنی رنگ و روغن کرتے ہیں۔ اسی طرح سے جب تلاوت شروع کریں تو پہلے اپنے دل کو شیطان مردود کے وسوسوں سے پاک کریں اس کے لئے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ (آخر تک) پڑھی جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دل کو مزین کریں۔ نماز میں سب سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس کو شروع کرنے سے پہلے دل کو شیطانی وسوسوں سے صاف کیا جاتا ہے اور اللہ کے نام سے دل کو مزین کیا جاتا ہے۔ جب آدمی نماز شروع کرے تو اُن چیزوں سے ذہن فارغ کرلے جن میں شیطان لگائے رہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل بنانے والی ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ بھی جب بھی کوئی سورت شروع کرے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے، البتہ سورۂ انفال ختم کرکے سورۂ براءت شروع کرے تو بسم اللہ نہ پڑھے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو سورتوں کے درمیان فصل کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے لیکن سورۂ فاتحہ یا اس کے علاوہ کسی دوسری سورت کا جز نہیں ہے، البتہ سورۂ نمل کے دوسرے رکوع میں جو ایک جگہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے وہ سورۂ نمل کا جزو ہے، ساری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیات ہیں جو حضرات بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو سورۂ فاتحہ کا جزو مانتے ہیں وہ اس کو ایک آیت شمار کرتے ہیں اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے لے کر ختم سورت تک چھ آیات شمار کرتے ہیں (حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے) اور جن ائمہ اور قراء کے نزدیک بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے ان کے نزدیک غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ساتویں آیت

ہے۔ (معالم التنزیل ص ۳۹ ج ۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سورت ختم ہونے کا علم نہ ہوتا تھا جب تک بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل نہ ہوجاتی تھی جب بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا نزول ہوتا تو آپ سمجھ لیتے تھے کہ سورت ختم ہوگئی اور اب نئی سُورت شروع ہورہی ہے۔ (درمنثور ص ۷ ج ۱)

تفسیر معالم التنزیل (ص ۳۷ ج ۱) میں لکھا ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہر سورت کے شروع میں ہونا اللہ پاک کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے کہ قرأت سے پہلے اس کو پڑھیں اور قرأت شروع کرنے کا ادب جان لیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے خاص ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں...... اوّل کی تین آیات میں اللہ پاک کی تعریف اور اسم ذات اور اللہ پاک کی بڑی بڑی صفات ذکر کی گئی ہیں جو دیگر صفات کمالیہ کو بھی شامل ہیں۔

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں۔ اِس دعویٰ کو واضح اور ثابت کرنے میں مذکورہ صفات کو بڑا دخل ہے یعنی جو ذات پاک ایسی ایسی صفات سے متصف ہے ظاہر ہے کہ ہر تعریف کی مستحق ہے۔ جتنی تعریفیں آج تک ہوئی ہیں یا آئندہ دنیا و آخرت میں ہوں گی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تعریف کسی نے کی ہے یا آئندہ کوئی کرے گا اس کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونا تو ظاہر ہے اور جو تعریفیں اس کی مخلوق کی کی جاتی ہیں یا آئندہ کی جائیں گی یا گزشتہ تمام زمانوں میں ہوچکی ہیں وہ بھی درحقیقت اللہ پاک کی ہی تعریفیں ہیں کیونکہ ہر صاحب کمال کو اُس نے وجود بخشا ہے اور کمال سے نوازا ہے اور کمال اور صاحبِ کمال کی پرورش فرمائی ہے اور اپنی رحمت سے ان کمالات کو باقی رکھا ہے لِلّٰهِ میں لام اختصاص اور استحقاق کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ محمود حقیقی اور مستحق حمد اللہ تعالیٰ ہی ہے اگر کوئی اللہ کی حمد نہ کرے تو اس کی محمودیتِ حقیقیہ میں ذرا فرق نہیں آتا۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا معنی اور مطلب: رَبّ عربی زبان میں بمعنی مالک بھی آتا ہے اور بمعنی پروردگار (پالنے والا) بھی آتا ہے۔ (معالم التنزیل) یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ اللہ پاک تمام جہانوں کے مالک ہیں اور پالنے والے بھی۔ اَلْعٰلَمِیْنَ عالم کی جمع ہے، عَالَمْ (بروزن فاعل بفتح العین) علم سے لیا گیا ہے۔ عربی قاعدہ کی رو سے فاعَل کا وزن مادۂ اشتقاق کے آلہ کے لئے آتا ہے، عالم کا مادۂ اشتقاق علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق عالم ہے اِس لئے کہ اپنے خالق (پیدا کرنے والے) کے معلوم ہونے کا ذریعہ ہے، یوں تو ساری مخلوق بحیثیت مخلوق کے ایک عالم ہے لیکن مخلوق کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ہر قسم کو علیحدہ علیحدہ عالم قرار دیکر جمع (عالمین) لائی گئی گویا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خدائے پاک کے جاننے اور پہچاننے کے لئے ایک عالم (بلکہ اس کا ایک ذرّہ بھی) کافی ہے لیکن عالم اتنے زیادہ اور بے شمار ہیں کہ ان کو دیکھ کر اگر کوئی کوڑھ مغز، بدباطن خدائے پاک کو نہ پہچانے تو اس کی محرومی، بدنصیبی، جہالت اور حماقت کے سوا اور کیا ہے۔ ہر ہر جنس کو ایک عالم بتا کر اللہ پاک کو سب عالموں کا رب بتانے میں ان مشرکوں اور جاہلوں کی بھی تردید ہے جو بعض مخلوقات کو معبود مانتے ہیں اور خالق کو چھوڑ کر مخلوق و مملوک کے سامنے جبینِ نیاز رکھتے ہیں۔ مقاتل بن حبانؒ نے فرمایا کہ عالم اسّی ہزار ہیں، چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ عالموں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہے لیکن صحیح بات وہ ہے جو جناب کعب الاحبار نے فرمائی کہ عالموں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا انہوں نے اپنے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی ۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ط ۔ (معالم التنزیل ص ۴۰ ج ۱)

اللہ جل شانہٗ سارے جہانوں کا خالق بھی ہے اور مالک بھی اور پرورش کرنے والا بھی اس نے صرف وجود ہی نہیں دیا بلکہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے اسباب بھی پیدا فرمائے ۔ وہ رزق بھی دیتا ہے کھلاتا پلاتا بھی ہے ہر فرد تک رزق پہنچاتا ہے ۔ جب کھانے والا رزق کھالیتا ہے تو وہ اس رزق کو پچاتا ہے ۔ جس سے جسم بڑھتا ہے خون پیدا ہوتا ہے رگوں میں دوڑتا ہے اور یہ سب بقائے حیات کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔ جتنے بھی اسباب معاش ہیں اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائے ہیں، ان سب سے شان ربوبیت اچھی طرح واضح ہوتی ہے ۔ نئی نئی تحقیقات سے اجسام کے پلنے بڑھنے کے جو راز منکشف ہوئے ہیں انسانی عقل وشعور کے لئے بہت حیرت ناک ہیں ۔ زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں کو دیکھا جائے ۔ طرح طرح کے غلّے پھل اور میوے مختلف سبزیاں ترکاریاں وجود میں آ رہی ہیں انسان اور جانوران کو کھاتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں ۔ جس کا جو رزق مقرر ہے وہ اس کو ضرور پہنچ کر رہتا ہے ایک برِ اعظم کی پیدا شدہ چیزیں دوسرے برِ اعظم کے لوگ کھا کر اور استعمال کر کے جی رہے ہیں ۔

پالنے کے مفہوم میں صرف جسمانی غذائیں ہی نہیں آتیں بلکہ ہر وہ چیز آجاتی ہے جو زندگی اور بقاء کا ذریعہ ہو ۔ اجسام کی پرورش کے ساتھ رُوح کی پرورش بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو زندگی کے لئے اصل چیز ہے اور جو معیشت کے آلات اور اسباب ہیں اور جو جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں یہ سب پرورش کا ذریعہ ہیں ۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾

بہت بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔ روزِ جزا کا مالک ہے ۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ :...... یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں رحم سے مشتق ہیں بعض علماء کا قول ہے کہ دونوں کا ایک معنی ہے اور اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے چونکہ دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں اس لئے ہر ایک کے ترجمہ میں معنی مبالغہ کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ رحمٰن اللہ پاک کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور رحیم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کی مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے کما قال تبارک وتعالٰی فی شان نبیه علیه الصلٰوۃ والسلام بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ط ۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا برابر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے وہ ساری مخلوق پر رحم فرماتا ہے، سب کا وجود اور بقاء آرام وسکون سب اسی کی رحمت سے ہے ۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ...... دین جزا اور بدلہ کو کہتے ہیں يَوْمِ الدِّيْنِ بدلہ کا دن، اس سے قیامت کا روز مراد ہے ۔ اس روز خیر وشر کے بدلوں کا فیصلہ ہوگا ہر شخص اپنے اپنے عمل کا نتیجہ پائے گا ۔ اللہ پاک کے رحم وکرم کے سوا کوئی راستہ جان چھوٹنے کا نہ ہوگا اگر کوئی سفارش کرنا چاہے گا تو بغیر اجازت مالک یوم الدین جل مجدہٗ سفارش نہیں کر سکے گا، اس روز کسی کی مجازی حکومت وحاکمیت بھی نہ ہوگی ۔ قال اللّٰه تعالٰی شانه اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وقال جل جلاله لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ وقال عز اسمه يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔ اللہ تعالیٰ شانہ صرف قاضی یوم الدین ہی نہیں بلکہ مٰلک یوم الدین بھی ہے ۔ بعض مرتبہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ قاضی (جج) فیصلہ تو کرتا ہے مگر ملک اور قانون کا مالک نہیں ہوتا ۔ بادشاہِ ملک یا مجلسِ قانون ساز

کے مُرتب کردہ دستور کا پابند ہوتا ہے اور اسی کے دائرہ قانون میں فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ مالک الملک ہے، قاضی روزِ جزا ہے اور مالکِ روزِ جزا بھی۔ اس پر کسی کا کوئی قانون اور کوئی حکم لاگو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ رَدّ نہیں ہوسکتا، اس کے خلاف اپیل نہیں ہو سکتی...... وہاں دنیا کے حاکموں اور فیصلے کرنے والوں کے فیصلے بھی ہوں گے اور جانوروں تک نے جو ایک دُوسرے پر ظلم وزیادتی کی تھی اس کا بھی فیصلہ ہوگا۔ دنیا کے بادشاہ اور بڑے بڑے تسلّط اور دبدبہ والے مُجرموں کی صف میں کھڑے ہوں گے اور اپنے اپنے عمل اور کردار کا فیصلہ سنیں گے اور اس فیصلے کے مطابق عمل ہوگا لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

معبود اور مُستعان صرف اللہ کی ذات ہے...... شروع سورت سے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کا بیان تھا۔ اس بیان میں اگرچہ غیبت کا عنوان تھا لیکن جب بندہ نے مستحقِ حمد کی حمد بیان کرنے میں صفاتِ کمال اور مظاہرِ جلال و جمال کا یقینی طور پر تصوّر کرلیا تو اس مستحقِ حمد سے خطاب کرنے اور مراد مانگنے کے لئے جذبہ میں آ کر خطاب کرنے لگا، اول مخاطب ہو کر یہ اعلان کیا کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور پھر اپنی سب سے بڑی ضرورت کا سوال کیا کہ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا دے اور بتادے۔ کاف ضمیر خطاب نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ کا مفعول ہے اس کو ضمیر منفصل بنا کر فعل سے مقدم لانے سے معنیٰ میں حَصر پیدا ہو گیا۔ اہلِ بلاغت نے بتایا کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید حصر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ یہ ہوگیا کہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے والا گو واحد شخص ہوتا ہے۔ لیکن صیغہ جمع متکلم لا کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ ساری مخلوق کا تو ہی معبود ہے اور ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ جو لوگ مُشرک ہیں وہ گمراہ ہیں اور غلطی پر ہیں اُن کا معبودِ حقیقی بھی تو ہے، ہم ساری بنی نوع انسان کی طرف سے اور سارے جنّات اور فرشتوں کی طرف سے بلکہ ساری مخلوق کی طرف سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ صرف تو ہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے بعد یوں عرض کیا کہ ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ جب خداوندِ قدوس جل مجدہ ہر چیز کا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، معبودِ حقیقی بھی ہے۔ قادرِ مطلق بھی ہے تو اِس کے سوا کوئی نہیں جس سے مدد مانگی جائے۔ عبادت بھی صرف اُسی کی کرتے ہیں اور مدد بھی صرف اسی سے لیتے ہیں اس میں بھی صیغہ خطاب کا استعمال کیا اور یہ اعلان کیا کہ اے اللہ تعالیٰ ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے تیرے سوا کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معبود اور مدد گار ماننے کے بعد کسی دوسرے کو عبادت اور استعانت (مدد مانگنے) کے لئے پکارنا اعلان اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس آیت میں شرک فی العبادت اور شرک فی الاستعانت دونوں کی نفی علی وجہ الکمال کردی گئی ہے۔ دیوی، دیوتا، مزار، قبر، وَلی، پیر، تعزیہ یا اور کسی چیز کو حاجت روا مشکل کشا سمجھنا اور اسکے سامنے سجدہ کرنا شرک ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾

ہم　کو　سیدھا　راستہ　دکھا۔

صراطِ مستقیم کی دُعا:...... راہِ حق دکھانا اور مطلوب حق تک پہنچانا یہ سب کچھ ہدایت کے مفہوم میں داخل ہے۔ مدد مانگنے کے ذیل میں

جہاں اور باتیں ہیں وہاں ہدایت کی طلب بھی ہے اور درحقیقت ہدایت ہی مخلوق کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے اگر سب کچھ موجود ہو اور بندہ ہدایت پر نہ ہو عقیدہ اور عمل سے گمراہ ہو تو دنیاوی چیزوں سے تھوڑا بہت فائدہ اُٹھا کر عذابِ دوزخ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ اس اعتبار سے حقیقی نعمت ہدایت ہی ہوئی۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں فوراً ہدایت کا سوال کرلیا گیا۔ یعنی صحیح راستہ پر چلانے کی دُعا کر لی گئی۔ صحیح راستہ کون سا ہے اس کی تعیین کے لئے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ لایا گیا جس کی تفسیر ابھی آتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جو لوگ مؤمن ہیں قرآن کو مانتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہدایت پر ہیں ہی ان لوگوں سے بار بار ہدایت کا سوال کیوں کرایا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت یافتہ ہوتے ہوئے ہدایت کی دُعا کرنا موت تک ہدایت پر جمے رہنے اور ثابت قدم رہنے کا سوال ہے جیسا کہ دوسری آیت میں اہل ایمان کی دعا کا اس طرح تذکرہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (اے ہمارے رب ہمارے دِلوں کو حق سے نہ ہٹا دیجئے بعد اس کے کہ آپ نے ہمیں ہدایت دی اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرما دیجئے، بے شک آپ بہت زیادہ دینے والے ہیں) قال النسفی ای ثبتنا علی المنهاج الواضح كقولک للقائم قم حتی اعود الیک ای اثبت علی ما انت علیه أو اهدنا فی الاستقبال كما هديتنا فی الحال. (مدارک التنزیل ص ۷ ج ۱)

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں یعنی ہمیں صراط مستقیم پر ثابت قدم فرما جیسا کہ کھڑے ہوئے شخص سے کہا جائے' کھڑا رہ یہاں تک کہ میں تیرے پاس لوٹ آؤں' مطلب یہ ہے کہ اپنی حالت پر ثابت قدم رہ۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہمیں زمانہ مستقبل میں بھی ہدایت سے نواز جیسا کہ تو نے ہمیں زمانہ حال میں ہدایت سے نوازا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ

راستہ ان حضرات کا جن پر آپ نے انعام فرمایا

صراطِ مستقیم والے کون حضرات ہیں ...... صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ان الفاظ میں صراطِ مستقیم کی تعیین کردی گئی۔ صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کیا ہے جتنی جماعتیں اور قومیں دنیا میں بستی ہیں وہ اپنے آپ کو ہدایت پر ہی سمجھتی ہیں۔ لیکن وہ کون سا راستہ ہے جسے سیدھا راستہ مانا جائے اور جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور آخرت میں نجات ہوگی اس کے بتانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یہ حضرات کون ہیں ان کا ذکر سورۂ نساء کی اس آیت میں ہے۔ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۔ (اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے یہ اشخاص اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں) اس سے واضح ہوگیا کہ ان حضرات پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان ہی حضرات کے راستہ کو صراط مستقیم یعنی صحیح اور سیدھا راستہ بتایا گیا ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں۔

ع ۱ / ۷

مغضوب علیھم اور ضالین کے راستہ سے بچنے کی دُعا...... غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ٥ (جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں) یہ اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جن حضرات پر آپ نے انعام فرمایا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن پر آپ کا غصہ نہیں اور جو گمراہ نہیں ہیں۔ مفسر ابن کثیر نے بعض روایات ایسی نقل کی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اَلۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ سے یہود اور اَلضَّآلِّیۡنَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ یہودیوں کے بارے میں سورۂ بقرہ میں فرمایا: فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ کہ وہ غصہ پر غصہ کے مستحق ہوئے اور نصاریٰ کے بارے میں سورۂ مائدہ میں فرمایا...... وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ (ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور اُنہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے) یہودیوں نے علم ہوتے ہوئے عمل کو کھو دیا اور حق کو ٹھکرا دیا، نصاریٰ علم کے مدعی نہ تھے اور علم سے خالی بھی تھے لیکن اپنے آپ کو عبادت گزار سمجھتے تھے۔ اُن کے راہب پہاڑوں میں رہتے تھے اور عبادت میں طرح طرح کی مشقتیں جھیلتے تھے اور عبادت کے طریقے اُنہوں نے خود نکالے تھے۔ یہ لوگ راہِ حق سے ہٹے اور گمراہ ہوئے، جو شخص علم ہوتے ہوئے عمل چھوڑ دے وہ زیادہ مستحق غضب ہوتا ہے اس لئے صفت مغضوبیت یہودیوں کے لئے خاص طور سے ذکر کی گئی اور نصاریٰ نے عمل کا ارادہ تو کیا لیکن بے علمی کی وجہ سے طریقہ غلط اختیار کر گئے اور اتباعِ حق کو چھوڑ کر بے راہ ہو گئے۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور اس پر عمل بھی ہو۔ پھر لکھتے ہیں۔ وکل من الیھود والنصارٰی ضال مغضوب علیه لکن اخص اوصاف الیھود الغضب واخص اوصاف النصارٰی الضلال (ص۲۹ ج۱) یعنی ہیں تو دونوں ہی فریق (یہود و نصاریٰ) گمراہ اور مغضوب علیہ، لیکن مغضوبیت کی شان یہودیوں میں زیادہ ہے (اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُن کی طرف مغضوبیت کی نسبت کی گئی) اور نصاریٰ کے اوصاف میں خاص طور پر ضلال زیادہ واضح ہے (اس لئے ان کو ضَآلِّیۡنَ فرمایا)۔

یہودیوں کی شرارت، عناد اور مکاریاں اور دسیسہ کاریاں جو سورۂ بقرہ میں اور دُوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہیں اُن کے جاننے کے بعد ہر صاحبِ عقل یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ لوگ قصداً و ارادۃً ایسی حرکتیں کرتے تھے جن سے اللہ تعالیٰ کے غصہ کے زیادہ سے زیادہ مستحق ہوتے چلے گئے۔

سورۂ فاتحہ کے ختم پر اہلِ ایمان سے یہ دُعا کرائی گئی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں دونوں جماعتوں کے طریقوں سے علیحدہ اور بیزار رہیں۔ نماز میں بار بار سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہود و نصاریٰ کے طریقوں سے بچنے کی دُعا مانگتے ہیں۔ اب مسلمان غور کر لیں کہ وہ ان دونوں جماعتوں کے طور طریق سے کس قدر دُور ہیں اور جن حضرات پر انعام ہوا یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور صالحین ان کے طریقوں سے کتنے قریب ہیں۔ حکومت، سیاست، معاشرت، شکل و صورت، لباس، کسبِ مال، تجارت، معیشت و معاشرت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غور کر لیں۔ اُمت محمدیہ میں یہود و نصاریٰ کی مشابہت اور ان کا اتباع پایا جاتا ہے عوام میں بھی اور خواص میں بھی، جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور نماز میں دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں **مغضوب علیھم** اور **ضالین** کے راستہ سے بچا وہ لوگ بھی ان کی اتباع سے پرہیز نہیں کرتے۔ بعض اکابر نے فرمایا کہ اس اُمت میں سے جو عالم بگڑے گا اس کے اندر یہود کی صفات سے مشابہت ہو گی اور جو عابد بگڑے گا اس کے اندر نصاریٰ کی مشابہت ہو گی در حقیقت صحیح فرمایا اُمت کا حال نظروں کے سامنے ہے جو مغضوب اور ضالین ہیں لوگوں کو انہیں کے طریقے محبوب ہیں۔ (اعاذنا الله من ذٰلک)

جن حضرات پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ان کے راستہ کے علاوہ جتنے بھی دین، مذہب، فرقے، جماعتیں، پارٹیاں، قوانین ہیں سب ہی صراطِ مستقیم سے خارج ہیں اور مؤمن موحد کے لئے ان سب سے بچنا فرض وواجب ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے راستہ سے بچنے کی دُعا مانگنے کی اس لئے تلقین کی گئی کہ ایک مسلمان بت پرست دہری منکرِ خدا ہونا گوارا نہیں کرسکتا اور اہلِ کتاب کے راستوں کو اختیار کرسکتا ہے، اہل کتاب کے دونوں فرقوں کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کے انجام کار ہی کو ان کا لقب بنا کر ذکر فرما دیا، جس میں دو امر کی طرف اشارہ ہے۔ اوّل، یہ کہ انبیاء، صلحاء، صدیقین وشہداء کے راستہ سے ہٹنے کا انجام راہ سے بھٹک جانا اور خدائے پاک کے غصہ میں آ جانا ہے۔ دوسرے یہ کہ صراطِ مستقیم کے خلاف صرف یہود ونصاریٰ ہی کا راستہ نہیں ہے بلکہ جو بھی یہود ونصاریٰ کے عقائد وکردار اوصاف واخلاق اختیار کرے گا اسکے نتیجہ میں مغضوب علیہ اور ضال ہوگا (خواہ فرد ہو خواہ جماعت) لہٰذا اسکے راستہ سے بچنا بھی فرض ہوگا۔

آمین ...... سورۂ فاتحہ کے ختم پر نماز میں اور خارج نماز آمین کہنا مسنون ہے اور اس کے علاوہ بھی جو دعا کی جائے اس کے آخر میں آمین کہا جائے۔ احادیث شریفہ میں اس کی فضیلت اور ترغیب وارد ہوئی ہے۔ آمین کا معنی ہے کہ اے اللہ قبول فرما۔ ایک مرتبہ دُعا کی پھر دُعا کی قبولیت کی دُعا کی یہ مل کر گویا دو مرتبہ دُعا ہو جاتی ہے۔

معالم التنزیل (ص ۴۲ ج ۱) میں لکھا ہے کہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد ذرا ٹھہر کر آمین کہے (تا کہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہونے کا ایہام نہ ہو)۔

چونکہ امیــــن قرآن مجید کا جز نہیں ہے اس لئے قرآن مجید میں لکھا نہیں جاتا لیکن پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ یہودیوں نے تمہاری کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کیا جتنا آمیـن کہنے پر حسد کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ یہودیوں نے تم سے تین چیزوں پر حسد کیا ہے۔ ۱۔ سلام کو پھیلانا، ۲۔ نماز میں صفیں قائم کرنا، ۳۔ آمین کہنا۔ (یہ روایات درمنثور میں نقل کی گئی ہیں)

فائدہ......بعض غیر مسلموں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اپنی تعریف خود کرنا ٹھیک نہیں ہے پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی تعریف خود کیوں کی؟ اس کا ایک جواب مفسرین کے اس قول سے نکل سکتا ہے کہ یہ مضمون بندوں کی زبانی ادا کرایا گیا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے پہلے قُوْلُوْا (صیغہ امر) مقدر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کو حکم فرمایا ہے کہ یوں کہو اور چونکہ بندہ کی زبانی اول کی تین آیات ادا کرائی گئی ہیں اس لئے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ بھی اول کی تین آیات کے ساتھ اس صورت میں مضمون واحد ہو کر مسلسل ہو جائے گا۔ لیکن یہ جواب جزوی طور پر سورۂ فاتحہ کے بارے میں ہوسکتا ہے، قرآن شریف میں جگہ جگہ اللہ پاک کی حمد بیان کی گئی ہے اور حدیث شریف میں صاف اس طرح آیا ہے کہ **لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علٰی نفسک**۔ (اے اللہ! میں ایسی تعریف تیری بیان نہیں کرسکتا جیسی تُو نے اپنی تعریف بیان کی ہے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی تعریف بیان کرتے ہیں، پس غیر مسلموں کے سوال مذکور کا ایسا ٹھیک کلی جواب جو ہر موقع پر جواب بن سکے یہ ہے کہ خالق کو مخلوق پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔ بلاشبہ مخلوق کے لئے خودستائی بری بات ہے لیکن خالق اگر اپنی تعریف کرے تو یہ کوئی بے جا نہیں ہے، بلکہ صحیح اور دُرست ہے۔ اول اس پر غور کرنا چاہیے کہ خودستائی بری چیز کیوں ہے؟ اس کی وجہ غور کرنے اور اہل عقل ودانش کے بتانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خودستائی سے عجب (خود پسندی) اور تکبر پیدا ہوتا ہے اور خالق کمالات رب العالمین جل مجدہٗ سے غفلت ہو جاتی ہے اور انسان کا ذہن خالق کی حمد اور خالق کے کمالات سے ہٹ کر خود اپنی ذات میں اُلجھ جاتا ہے اور رب العالمین خالق کل شئی اپنی خود تعریف کرے تو یہ کسی خرابی کا باعث نہیں ہے اللہ پاک سے اُوپر کوئی نہیں ہے اور وہ ایسا بڑا ہے کہ سب کی بڑائیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور ہر بڑے کو اس نے بڑائی دی ہے۔ لفظ تکبر میں تکلف کے معنی پوشیدہ ہیں یعنی جو بڑا نہیں وہ بڑا بنے اس کو تکبر کہتے ہیں۔ اللہ پاک کی بڑائی کامل ہے تکلف سے نہیں ہے وہ سب کا خالق ہے اس کا کوئی

خالق نہیں لہٰذا اس کو اپنی تعریف کا پورا پورا حق ہے۔ اگر وہ اپنی تعریف کرے تو یہ لازم نہیں آتا کہ جو بڑا نہیں اس نے بڑائی کا دعویٰ کیا اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اپنے خالق کو چھوڑ کر اپنی تعریف میں مشغول ہوا۔ **فللّٰہ الحمد اولا و آخرا و ظاھراً و باطِنًا اللّٰھم لک الحمد لا احصٰی ثناء علیک انت کما اثنیت علٰی نفسک۔**

سورۂ فاتحہ شفا ہے...... سورۂ فاتحہ کا ایک نام شافیہ (یعنی شفا دینے والی ہے) بھی ہے اس کے مضامین جس طرح مؤمن موحد کے لئے باطنی اور روحانی شفاء کا باعث ہیں اسی طرح اس کے الفاظ جسمانی امراض و تکالیف اور دُکھ درد کے لئے شفا بن جاتے ہیں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض سے نجات دلانے کے لئے سورۃ فاتحہ پڑھ کر مجھ پر دَم کرتے ہوئے تھتکار دیا، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب زہر کے لئے شفاء ہے۔ حضرت عبدالملک بن عمیر نے (مرسلاً) روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب ہر مرض کے لئے شفاء ہے۔ (یہ سب روایات درمنثور میں ہیں)۔

حصن حصین میں (ابوداؤد اور نسائی سے نقل کیا) ہے کہ جس کی عقل ٹھکانے نہ ہو تین روز صبح شام سورۃ فاتحہ کے ذریعہ جھاڑا جاوے (جھاڑنے والا) سورۃ فاتحہ کو پوری پڑھ کر اپنا تھوک (منہ) میں جمع کر کے تھتکار دے اور ترمذی شریف سے نقل کیا کہ جس کو سانپ، بچھو ڈس لیوے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر جھاڑا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ (سفر میں) ایک تالاب پر گزرے وہاں ایک آدمی کو بچھو نے ڈس لیا تھا۔ وہاں جو قبیلہ مقیم تھا اُن میں سے ایک آدمی ان حضرات کے پاس آیا اور اُس نے کہا کیا تم میں کوئی شخص جھاڑ پھونک کرنے والا ہے۔ یہ سن کر اُن حضرات میں سے ایک صاحب چلے گئے اور اُنہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا اور کچھ بکریاں لینے کی شرط لگالی وہ شخص اچھا ہو گیا، اور یہ بکریاں لے کر اپنے رفقاء کے پاس آ گئے۔ انہوں نے ان بکریوں کا لینا اچھا نہ جانا اور کہنے لگے کہ تم نے اللہ کی کتاب پر اُجرت لے لی۔ جب مدینہ منورہ میں واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اُنہوں نے کتاب اللہ پر اُجرت لی ہے آپ ؐ نے فرمایا بلاشبہ کتاب اللہ ان سب چیزوں میں اُجرت لینے کے لئے زیادہ احق ہے۔ جن پر تم اُجرت لیتے ہو۔ (صحیح بخاری ص ۸۵۴ ج ۲) اس حدیث کی وجہ سے جھاڑ پھونک کی اُجرت لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ کلام صحیح ہو، شرکیہ کلام نہ ہو۔

رات کو حفاظت کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا...... حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو نے بستر پر اپنا پہلو رکھا اور فاتحۃ الکتاب اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (ختم سورت تک) پڑھ لی تو موت کے سوا ہر چیز سے تجھے امان مل گئی۔ (درمنثور)

ولقد تم تفسیر فاتحۃ الکتاب بحمداللہ تعالٰی وحسن توفیقہ فلہ الحمد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ ......

☆☆☆.................☆☆☆

مدنی	سورۃ البقرۃ	۲۸۶ آیتیں ۴۰ رکوع

آیاتہا ۲۸۶ (۲) سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (۸۷) رکوعاتہا ۴۰

سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی اس میں دوسو چھیاسی آیتیں اور ۴۰ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

الٓمّٓ۔ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس میں ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔ جو ایمان لاتے ہیں غیب پر

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ

اور قائم کرتے ہیں نماز کو اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اُس پر جو

اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ

اُتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی ہدایت پر ہیں اپنے

رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

رب کی طرف سے اور یہ لوگ ہی کامیاب ہیں۔

مصحفِ عثمانی کی ترتیب کے لحاظ سے یہ دوسری سورت ہے۔ اس سورت میں بقرہ کا تذکرہ ہے اس لئے سورۃ البقرہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ روایت حدیث میں اس کا یہ نام آیا ہے۔

فضائل سورۂ بقرہ ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی ذکر وتلاوت سے گھروں کو خالی نہ رکھو جیسا کہ قبریں خالی ہوتی ہیں) بے شک شیطان اُس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔ (سنن ترمذی ص ۴۰۸)

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن پڑھو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے لوگوں کے لئے سفارش کرنے والا بن کر آئے گا۔ دو روشن چیزوں کو پڑھو (یعنی) سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران کو، کیونکہ وہ دونوں قیامت کے دن اس طرح آئیں گی جیسے بادل ہوں یا جیسے پرندوں کی دو جماعتیں صف بنائے ہوئے ہوں۔

اپنے لوگوں کے لئے خوب زوردار سفارش کریں گی۔ سورۂ بقرہ کو پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کر لینا برکت ہے اور اس کا چھوڑ دینا حسرت ہے اور وہ اہل باطل کے بس کی نہیں۔ (صحیح مسلم ص ۲۷۰ ج ۱)

اہلِ باطل کے بس کی نہیں، یعنی وہ اسے حفظ نہیں کر سکتے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اہلِ باطل سے جادوگر مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے پڑھنے والے پر جادو کا اثر نہیں ہو سکتا۔ (ابن کثیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز کا ایک بلند حصہ ہوتا ہے اور قرآن کا بلند حصہ سورۂ بقرہ ہے۔ اس میں ایک آیت ہے جو قرآن کی سب آیتوں کی سردار ہے وہ آیۃ الکرسی ہے، جس گھر میں پڑھی جائے گی اس میں سے شیطان ضرور بھاگ جائے گا۔ (الترمذی فی السنن ص ۴۰۸ والحاکم وصححہ کمافی الدرالمنثور ص ۲۰ ج ۱) سورۂ بقرہ کو سب سے بڑی سورت ہونے کے اعتبار سے قرآن کا بلند حصہ فرمایا نیز اس اعتبار سے بھی کہ اس میں احکام کثیر تعداد میں مذکور ہیں اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جہاد کا حکم ہے جس سے رفعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم (مرقات شرح مشکوٰۃ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء، سورۂ حج اور سورۂ نور کو سیکھو کیونکہ ان میں فرائض ہیں۔ (درمنثور)

حروف مقطعات کی بحث

الٓمّٓ ...... یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات انتیس سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور وہ یہ ہیں ...... الٓمّٓ، الٓرٰ، الٓمّٓصٓ، الٓمّٓرٰ، حٰمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ، طٰسٓ، طٰسٓمّٓ، طٰهٰ، یٰسٓ، صٓ، قٓ، نٓ۔

ان میں الٓمّٓ چھ جگہ ہے اور الٓرٰ پانچ جگہ ہے اور حٰمٓ چھ جگہ ہے اور طٰسٓمّٓ دو جگہ ہے۔ اور ان کے علاوہ باقی سب ایک ایک جگہ ہیں کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہیں اس لئے مفسرین ان کے سامنے یوں لکھ دیتے ہیں۔ اللّٰہ اعلم بمراده بذلک۔ (اللہ کو اس کا معنی معلوم ہے)

بہت سے اکابر جن میں خلفاء اربعہ اور ابنِ مسعودؓ بھی ہیں ان کا موقف یہی ہے جیسا کہ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے۔ بعض حضرات نے ان کے کچھ معانی بھی بتائے ہیں کسی نے کہا ہے کہ یہ ان سُورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں آئے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ کا قول ہے کہ الٓمّٓ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت شعبیؒ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ الٓمّٓ لفظ اللّٰہ کا پہلا حرف ہے اور لام اللّٰه کے نام لطیف کا پہلا حرف ہے اور میم مجید کا پہلا حرف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ الف سے الاء اللّٰه یعنی اللہ کی نعمتیں اور لام سے لطف اللّٰه یعنی اللہ کی مہربانی اور میم سے مجد اللّٰه یعنی اللہ کی بزرگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس میں سے کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ مفسرین نے حروف مقطعات کے ذریعہ سورتیں شروع کرنے کی یہ حکمت بھی لکھی ہے کہ اہلِ عرب کو بتانا تھا کہ یہ کتاب جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اس کے کلمات انہیں حروف سے مرکب ہیں جو تمہاری گفتگو اور محاورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ تم فصیح بلیغ ہو اس جیسی کتاب بنا کر لاؤ۔

جب ماہرین اس جیسی کتاب بنا کر نہیں لا سکتے تو ایک اُمّی جس نے کسی سے کچھ نہیں پڑھا اس کے بارے میں کیسے کہتے ہو کہ اس نے اپنے پاس سے بنا لیا۔ اگر یہ کلام کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو تم لوگ اس جیسا کلام بنانے سے کیوں عاجز رہ جاتے۔ اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں بیان کی ہیں جو مفسر بیضاوی نے لکھی ہیں۔ ان حروف کو اسی طرح الگ الگ پڑھا جاتا ہے ان میں تجوید کے قواعد کے مطابق

مد بھی ہیں جو مد حرفی مثقل اور مد حرفی مخفف کے نام سے کتب تجوید میں بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا تو اس کی وجہ سے اُسے ایک نیکی ملے گی اور نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے (بلکہ) الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (رواہ الترمذی ص ۴۱۳ وقال حدیث حسن صحیح)

قرآن مجید بلا ریب اللہ کی کتاب ہے

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں) مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب جو محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم پر نازل کی گئی۔ اس کا وحی الٰہی ہونا اور خداوند قدوس کی طرف سے نازل ہونا یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں نظر صحیح کی جائے تو کسی عاقل کے لئے کسی طرح کے کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں اگر کسی کو کوئی شک ہے تو اس کی کج فہمی کی وجہ سے ہے اس کے شک کا اعتبار نہیں اور جو شخص فکرِ صحیح کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے لیکن پھر بھی منکر ہے اور کہتا ہے کہ مجھے شک ہے تو اسے حقیقت میں شک نہیں ہے۔ ضد اور عناد نے اُسے اس پر آمادہ کیا ہے کہ حق اور حقیقت کا انکار کرے۔

قرآن مجید متقیوں کیلئے ہدایت ہے

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کیلئے) سورۂ بقرہ میں دوسری جگہ (رکوع ۲۳) میں قرآن مجید کو هُدًى لِّلنَّاسِ فرمایا اور یہاں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمایا ہے، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ قرآن کی دعوت عام ہے ہر انسان کو قرآن نے حق کی دعوت دی ہے اور بار بار سمجھایا ہے اور دلائل پیش کئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا بھی ہدایت پر آ سکتا ہے لیکن چونکہ اس سے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو اپنی عقل وفکر کو استعمال کر کے حق قبول کرتے ہیں اور یہ طے کر چکے ہیں کہ ہمیں گمراہی میں نہیں رہنا اور شرک وکفر سے بچنا ہے اس لئے یہاں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمایا، لفظ اِتّقاء (جس سے متقی کا لفظ ماخوذ ہے اور اس کی جمع متقین ہے) اس کا معنی بچنے کا ہے اور ڈرنے کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ لفظ تقویٰ اور اتقاء دونوں کا مادہ ایک ہی ہے شرک اور کفر سے بچنا اور ایمان قبول کر کے چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنا اور مزید ترقی کر کے مشتبہات سے بچنا اور اپنے باطن کو صرف ذات حق تعالیٰ شانہ ہی میں مشغول رکھنا اور اُسی کی طرف متوجہ رہنا یہ سب تقویٰ میں آتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں جو یہ بات بتائی گئی تھی کہ اس میں ہدایت پر ثابت رہنے کی دُعا ہے یہاں بھی وہ بات کہی جا سکتی ہے جو لوگ متقی ہیں۔ قرآن مجید پڑھ کر اور سن کر ان کی صفتِ تقویٰ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایمان بڑھ جاتا ہے (فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ)۔

متقین کی صفات...... اس کے بعد متقین کی صفات بیان فرمائیں اول یہ کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن باتوں کی خبر دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں بتائی ہیں ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے اُن سب کو مانتے ہیں اور اُن پر ایمان لاتے ہیں، بغیر دیکھے صرف خبر پر ایمان لے آنا یہ ایمان بالغیب ہے اور ایمان بالغیب ہی معتبر ہے۔ جب قیامت کا دن ہو گا تو وہاں کے حالات سب ہی دیکھ لیں گے اور مان لیں گے لیکن دیکھنے کے بعد مان لینا اور ایمان لانا معتبر نہیں۔

متقیوں کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی وہ نماز قائم کرتے ہیں يُصَلُّوْنَ نہیں فرمایا بلکہ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ فرمایا، نماز قائم کرنا یہ ہے کہ نماز کے فرائض وواجبات وسنن ومستحبات سب کو خوب دھیان اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کیا جائے۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا ہے: اقامة الصلوٰة اتمام الرکوع والسجود والتلاوة والخشوع والاقبال

علیھا فیھا یعنی نماز کا قائم کرنا یہ ہے کہ رکوع سجدہ پورا پورا ادا کیا جائے اور تلاوت بھی صحیح ہو اور نماز میں خشوع بھی ہو اور نماز پڑھتے وقت نماز کا دھیان بھی ہو۔

پھر فرمایا...... وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں) متقیوں کی صفت اقامت الصلوٰۃ بیان کرنے کے بعد (جو عباداتِ بدنیہ میں سے سب سے اہم اور سب سے بڑی عبادت ہے) مالی عبادت کا ذِکر فرمایا۔ یعنی متقیوں کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ اُس میں سے اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس میں مالی فرائض (زکوٰۃ اور عشر) اور واجبات (صدقۂ فطر وغیرہ) نفلی صدقات سب داخل ہیں۔

پھر فرمایا...... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو لوگ متقی ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا) ایمان وہ معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ پر اُس کے تمام رسولوں پر اور اس کی تمام کتابوں پر ایمان ہو۔ اللہ تعالیٰ کے کسی ایک نبی یا اس کی کسی ایک کتاب کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ میں اسی بات کا اعلان کیا گیا ہے وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کے عموم میں قرآن کریم سے پہلی تمام کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا شامل ہے۔ بعض صحیفوں کا ذِکر قرآن مجید میں بھی ہے (صحف ابراہیم وموسیٰ) اللہ تعالیٰ کی جن کتابوں اور صحیفوں کا علم ہے اور جن کا علم نہیں، ان سب پر ایمان لانا اور اللہ کی کتاب ماننا فرض ہے۔

پھر فرمایا...... وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) ایمان کے تین اہم جزو ہیں۔ توحید، رسالت اور موت کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لانا، یہاں ان تینوں چیزوں کو بتادیا ہے اور ساتھ ہی نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر فرمادیا کیونکہ ایمان قلبی کے بعد دوسرا درجہ نماز کا ہے اور اس کے بعد زکوٰۃ ہے۔ ایک فریضہ بدنیہ اور دوسرا فریضہ مالیہ بیان فرمادیا۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (آخر تک) اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت پر ہونے اور کامیاب ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ جن کی صفات پہلے بیان ہوئیں۔ ان کو اس بات کی سند دی گئی ہے کہ یہ ہدایت پر ہیں اور حقیقی اور واقعی کامیابی انہی کو حاصل ہونے والی ہے۔ جو آخرت میں اللہ کی رضا اور دخول جنت کی صورت میں حاصل ہوگی۔ اللہ کی رضا سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ

بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے برابر ہے کہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ع

مُہر لگا دی اُن کے دِلوں پر، اور اُن کے سننے کی قوت پر، اور اُن کی آنکھوں پر بڑا پردہ ہے اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

کافروں کی گمراہی اور آخرت میں بدحالی

اہل ایمان کے اوصاف بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں اُن کافروں کا ذِکر فرمایا ہے جن کا اللہ کے علم میں خاتمہ کفر پر ہونا ہے اور جو لوگ حق واضح ہوتے ہوئے اور حق و باطل کو سمجھتے ہوئے کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہمیں ہرگز کسی حالت میں اسلام قبول نہیں کرنا۔ اللہ جل شانہٗ نے ہر شخص کو فطرت ایمانیہ پر پیدا فرمایا پھر اس کے ماں باپ اس کو کفر پر ڈال دیتے ہیں

اور وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کی وجہ سے ایمانی استعداد کو کھو بیٹھتا ہے اور اپنے کو اس درجہ میں پہنچا دیتا ہے کہ کسی قیمت پر اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ جب اُنہوں نے اپنی شرارت اور عناد کی وجہ سے اپنی استعداد خود برباد کر دی تو اپنی تباہی کا سبب وہ خود ہی بن گئے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے اس لئے اس خلق افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی جسے مُہر لگانے سے تعبیر کیا گیا۔ یہ مسئلہ قدرے باریک ہے اسی لئے اسی اجمال پر ہم اکتفا کرتے ہیں جو لوگ کافر ہیں خواہ یہود و نصاریٰ ہوں خواہ ہندو مشرک ہوں خواہ دوسری کسی قوم کے افراد ہوں اہلِ اسلام اُن سے ملتے رہتے ہیں اور دلیل سے اُن کو عاجز اور خاموش کر دیتے ہیں اور اُن میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو قرآن اور اسلام کو حق جانتے ہیں پھر بھی نہ صرف یہ کہ خود اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ دُوسروں کو بھی اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں اور جو کوئی اسلام قبول کر لیتا ہے اُس کو کفر میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کو حق جانتے ہوئے قومی یا مذہبی عصبیت کے باعث اسلام کیخلاف کتابیں لکھتے ہیں ان کے احوال اور اقوال پر نظر کرو تو اُن کا عناد اور ان کا حال معلوم کرنے کے بعد آیت سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کا مطلب بالکل واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ دھوکہ دیتے ہیں

اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ

اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دِلوں میں بڑا روگ ہے سو اللہ

اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰

نے اُن کا روگ بڑھا دیا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

وقف لازم

منافقین کی تاریخ اور نفاق کے اسباب

جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور دینِ اسلام خوب پھیلنے لگا تو یہودیوں اور خاص کر ان کے علماء اور احبار کو یہ بات زیادہ کھلی اور یہ لوگ دشمنی پر اُتر آئے کچھ لوگ اوس اور خزرج میں سے بھی اسلام کے مخالف ہو گئے۔ اسلام کی اشاعت عام ہو جانے کے بعد کھل کر یہ لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور دشمنی کے اظہار سے بھی عاجز تھے اس لئے انہوں نے یہ چال چلی کہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا، اندر سے کافر تھے اور ظاہر میں مُسلمان تھے۔ ان کا سردار عبداللہ ابن اُبی تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے اوس اور خزرج نے عبداللہ بن اُبی کو اپنا بادشاہ بنانے اور اُس کو تاج پہنانے کا مشورہ کیا تھا سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے کسی کی سرداری نہیں چل سکتی تھی اُس نے اور اس کے ساتھیوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے اپنے کو مسلمانوں میں شمار کرا دیا اور اندر سے اسلام کی کاٹ میں لگے رہے۔ ان کے اس طریقہ کار میں یہ راز پوشیدہ تھا کہ اسلام قبول کرنے پر جو منافع ہیں وہ بھی ملتے رہیں اور کنبے اور قبیلے سے باہر بھی نہ ہوں اور اہلِ کفر سے بھی گٹھ جوڑ رہے۔ اور اُن سے بھی فائدہ ملتا رہے۔

اور یہ بھی پیشِ نظر تھا کہ اگر العیاذ باللہ اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام اور بقاء زیادہ دیر تک نہ رہے تو حسب سابق پھر سرداری مل جائے گی لہٰذا یہ اُوپر سے مسلمان اور اندر سے کافر رہے اور اسلام اور داعی اسلام کی ناکامی کے انتظار میں رہنے لگے مسلمانوں

سے کہتے تھے کہ ہم مؤمن ہیں اور اس طرح سے اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے تھے اور خالص کافروں سے تنہائیوں میں ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بھی پڑھتے تھے لیکن چونکہ دِل سے نمازی نہ تھے اس لئے جماعتوں کی حاضری میں سستی کرتے تھے اور الکساتے ہوئے اُوپر کے دل سے نماز پڑھتے تھے جہادوں میں بھی شریک ہونے کے لئے ساتھ لگ جاتے تھے لیکن کبھی تو درمیان سے واپس آ گئے اور کبھی ساتھ رہتے ہوئے ہی مکر و فریب کو کام میں لاتے رہے۔ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچانے اور دل دکھانے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے جھوٹی قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام کے خلاف منصوبے بنا کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والی باتیں کر کے صاف انکار کر جاتے تھے اور قسم کھا جاتے تھے کہ ہم نے تو نہیں کہا۔

ان لوگوں کے حالات سورۂ بقرہ کے دوسرے رکوع میں اور سورۂ نساء کے رکوع ۲۱ میں اور سورۂ منافقون اور سورۂ حشر میں بیان کئے گئے ہیں اور سورۂ برأۃ میں خوب زیادہ ان کی قلعی کھولی گئی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ان لوگوں کے نام بھی لکھے ہیں کہ یہ کون کون تھے اور کس قبیلہ سے تھے۔ البدایہ والنہایہ اوائل کتاب المغازی ص ۳۳۶ تا ۳۴۰ ج ۳ میں یہودی علماء اور احبار جنہوں نے اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کھل کر مخالفت اختیار کی اور خوب زیادہ دشمنی میں لگ گئے اُن کے نام اور اُن لوگوں کے نام جو یہودیوں اور اوس وخزرج میں سے منافق بنے ہوئے تھے واضح طور پر ذکر کئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مروّت کا برتاؤ فرماتے رہے اور ان کی ایذاؤں کو سہتے رہے۔ آپ احسن اسلوب سے اپنی دعوت کو لے کر آگے بڑھتے رہے اور دینِ اسلام کو برابر ترقی ہوتی رہی۔ اس میں جہاں یہ حکمت تھی کہ شاید یہ لوگ مخلص مسلمان ہو جائیں وہاں یہ مصلحت بھی تھی کہ اگر ان کے ساتھ سختی کریں گے تو عرب کے دوسرے قبائل جو مسلمان نہیں ہوئے اور صحیح صورتِ حال انہیں معلوم نہیں وہ اسلام کے قریب آنے کے بجائے اور دُور ہو جائیں گے اور شیطان ان کو یہ سمجھائے گا کہ دیکھو محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے ماننے والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے۔ بالآخر ایک دن وہ آیا کہ یہ لوگ سختی اور ذلت کے ساتھ مسجد نبویؐ سے نکال دیئے گئے۔ جس کی تفصیل سیرت ابن ہشام (جلد ثانی کے اوائل) میں مذکور ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں اور ان کے بعد والی چند آیتوں میں منافقین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اول تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور یوم آخرت پر بھی ایمان لائے پھر فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔ یہ اہل ایمان نہیں ہیں۔ ایمان فعلِ قلب ہے۔ صرف زبانی دعویٰ سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوگا۔ جب تک دِل سے اُن چیزوں کی تصدیق نہ کرے جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ بتائی ہیں اور جن پر ایمان لانے کا حکم فرمایا ہے اس وقت تک کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا۔ منافقین کے اسی دوغلے پن کو کہ ''وہ کہتے ہیں کہ ہم مؤمن ہیں، حالانکہ مؤمن نہیں'' سورۃ مائدہ میں اس طرح بیان فرمایا...... مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ (یعنی اُن لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے مونہوں سے کہا کہ ہم ایمان لائے اور حال یہ کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے) اِس دورنگی اور دوغلے پن کو قرآن وحدیث میں نفاق اور منافقت سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ان کو منافق فرمایا گیا ہے۔

یہ کلمہ لفظ ''نفق'' سے ماخوذ ہے۔ نفق اُس سرنگ کو کہتے ہیں جس میں دونوں طرف سے راستہ ہو چونکہ منافقین اسلام میں ایک دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور دوسرے دروازہ سے نکل جاتے ہیں اس لئے ان کے اس عمل کا نام نفاق رکھا گیا۔ مفردات امام راغب میں ہے ...... ومنه النفاق وهو الدخول فى الشرع من باب والخروج عنه من باب وعلى ذلك نبه تعالى بقوله ان المنافقين هم الفاسقون اى الخارجون من الشرع۔ منافقت کفر کی بدترین اور خبیث ترین قسم ہے۔ اس میں کفر بھی ہے، جھوٹ بھی ہے، دھوکہ دہی بھی ہے۔ ایسے لوگ صرف بندوں ہی کو دھوکہ نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ایمان اور اہلِ ایمان کا مذاق بناتے

ہیں اور جو کھلے کافر ہیں اُن کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ کسی میں سے نہیں۔ جس کو سورۂ نساء میں یوں بیان فرمایا ہے۔ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (یعنی وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بس تھوڑا بہت یاد کرتے ہیں اور ایمان اور کفر کے درمیان مذبذب ہیں نہ ان کی طرف ہیں اور نہ اُن کی طرف) وجہ اس کی یہ ہے کہ منافق کسی کا نہیں ہوتا وہ صرف اپنا ہوتا ہے۔ جہاں دُنیا اور دُنیاوی منافع دیکھتا ہے موقع دیکھ کر اُسی طرف ہو جاتا ہے اور اتنے ہی وقت کے لئے ہوتا ہے جتنے وقت تک ضرورت محسوس کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی مثال ایسی ہے جیسے بکریوں کے دو ریوڑوں کے درمیان ایک بکری ہے وہ گابھن ہونے کے لئے کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے کبھی اُس ریوڑ کی طرف جاتی ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۷)

منافقین اپنے اس عمل کو چالبازی اور ہوشیاری سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اللہ تعالیٰ اور مؤمنین کو دھوکہ دیا اور اپنا کام نکالا، حالانکہ اس دھوکہ دہی اور چالبازی کا برا انجام خود انہی کے سامنے آئے گا اور یہ چالبازی اِنہی کے لئے وبالِ جان بنے گی وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوب سمجھتے ہیں حالانکہ اپنے اصل نفع اور نقصان تک کو نہیں سمجھتے۔

نفاق کا مرض بہت پُرانا ہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ زمانۂ نبوت کے منافقین اِس مرض میں مبتلا تھے۔ جیسے جیسے اسلام آگے بڑھتا گیا منافقوں کا نفاق بھی بڑھتا رہا، مرض نفاق حسد اور حُب دنیا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، دُنیا میں ایسا شخص ذلیل ہوتا ہے اور آخرت میں منافق کے لئے سخت سزا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ آج تو یا اسلام ہے یا کفر ہے۔ اُن کا یہ ارشاد امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ شراح حدیث نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہم دِلوں کا حال نہیں جانتے اس لئے ہم کسی مدعی اسلام کو یوں نہیں کہیں گے کہ یہ منافق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک کی طرف سے اس زمانہ کے منافقوں کے نفاق کا علم تھا۔ اس لئے متعین طریقے پر اُن کو منافق قرار دیا گیا ہم ظاہر کے مکلّف ہیں جو شخص کہے گا میں مسلمان ہوں اس کو مسلمان سمجھیں گے، جب تک کہ اس سے کفر کا کوئی کلمہ یا کفر کا کوئی کام صادر نہ ہو اگر کسی کے بارے میں اندازہ ہو کہ یہ ظاہر میں مسلمان بنتا ہے، اندر سے مسلمان نہیں ہے اُسے منافق کہے بغیر اپنی حفاظت کریں گے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح ہی کرنیوالے ہیں۔ خبردار بلاشبہ یہی لوگ

الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ

مفسد ہیں لیکن نہیں سمجھتے ہیں۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں

کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

جیسے یہ بیوقوف ایمان لے آئے، خبردار بلاشبہ یہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔ اور جب یہ لوگ اُن سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ ہم

قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰہُ

ایمان لے آئے اور جب تنہائیوں میں اپنے شیطانوں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق بنانے والے ہیں۔ اللہ اُن کا

يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۵﴾

مذاق بناتا ہے اور اُن کو ڈھیل دے رہا ہے وہ اپنی سرکشی میں اندھے ہو کر بھٹک رہے ہیں۔

منافقوں کے دعوے اور اُن کا طریقِ کار

ان آیات میں منافقین کے بعض دعوے نقل فرمائے ہیں اور اُن کا طریقہ کار ذکر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے تھے کہ اجی ہم کہاں فساد کہاں؟ ہمارا کام تو اصلاح کرنا ہی ہے۔ اُن کی تردید میں فرمایا کہ خبردار بلاشبہ یہ لوگ فسادی ہی ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے، جس فساد میں یہ لوگ مبتلا تھے اُس میں کئی طرح سے حصہ لیتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنے کھڑے کرتے تھے اور دشمنان اسلام کو لڑائیوں پر آمادہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے بھید دشمنوں تک پہنچاتے تھے۔ اور جو لوگ مسلمان ہونے کا ارادہ کرتے اُن کو اسلام سے روکنے کا سبب بنتے تھے اور مسلمانوں کا مذاق بناتے تھے فساد کے کاموں میں مبتلا ہوتے ہوئے اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ مفسر ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں فریق یعنی مسلمین اور کافرین کی مدارات کرتے ہیں۔ دونوں میں جوڑ لگانے اور دونوں کے تعلقات استوار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ (وکذا نقلہ السیوطی عن ابن عباس فی الدر) اُنہوں نے اپنے نفاق کو اصلاح سے تعبیر کیا، اُن کا دعویٰ جھوٹ تھا۔ دونوں فریق میں سے ہر فریق اُن کو اپنی جماعت سے علیحدہ سمجھتا تھا۔ (لا إلى هؤلاء ولا إلى هؤلاء) جس شخص سے دونوں جانب میں سے کوئی بھی مطمئن نہ ہو وہ کیا جوڑ بٹھا سکتا ہے۔ پھر ایمان اور کفر میں جوڑ بٹھانے کا ارادہ کرنا بھی مزید کفر ہے۔ ایمان اور کفر کا جوڑ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اُن کا دعوائے اصلاح صرف دھوکہ ہے اور وہ اس کے نتیجہ سے ناواقف ہیں، اُن کے عمل سے جو فساد پھیلتا ہے اس کو نہیں سمجھتے اور آخرت میں جو اس کا وبال ان پر پڑے گا اس کو نہیں جانتے۔

اور جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ ایمان لے آؤ یعنی دینِ اسلام کو سچے دل سے قبول کرو تو وہ کہتے تھے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ تو بے وقوف ہیں ہم بیوقوفی کا کام کیوں کریں۔ حضراتِ صحابہ اور خاص کر انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو انہوں نے بیوقوف بنایا اور گویا اپنے سمجھ دار اور ہوشیار ہونے کا دعویٰ کیا۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ خود بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں ہیں۔ جس نے ایمان کھویا کفر اختیار کیا اسلام کو نقصان پہنچایا اپنی آخرت برباد کی اور دُنیا میں مؤمنین اور کافرین دونوں کے نزدیک مطعون اور قابلِ ملامت ہوا اس کی بیوقوفی میں کیا شک ہے؟

منافقین کا یہ طریقہ تھا کہ مؤمنین سے کہتے تھے کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائیوں میں اپنے شیطانوں یعنی کفر کے سرغنوں کے پاس جاتے تھے جو کھلے کافر تھے تو اُن سے کہتے تھے کہ بلاشبہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں یہ جو ہم مسلمانوں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یہ تو ہمارا مذاق ہے۔ اُن کا مذاق بنانے کے لئے بطورِ دل لگی ہم اُن کے سامنے اُن کی جماعت میں ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں لیکن اندر سے اور دِل سے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ (قال ابن عباس كان رجال من اليهود اذا لقوا اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم او بعضهم قالوا انّا على دينكم واذاخلوا إلى شياطينهم وهم اخوانهم قالوا انّا معكم اى على مثل ما انتم عليه انما نحن مستهزء ون ساخرون)۔ (درمنثور ص۳۱ ج۱)

انہوں نے یہ جو کہا کہ ہم مسلمانوں کا مذاق بناتے ہیں اس کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کا مذاق بناتا ہے یعنی وہ ان کے اس

استہزاء اور مذاق بنانے کا بدلہ دے گا انہوں نے استہزاء کر کے مسلمانوں کے ساتھ جو حقارت کا معاملہ کیا اس کی پاداش میں آخرت میں ذلیل و رسوا ہوں گے اور ان کے استہزاء کا وبال انہیں پر پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دے رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت فائدے میں ہیں حالانکہ وہ دوزخ کی طرف جا رہے ہیں یہاں دنیا میں مسلمانوں کی طرف اشارے کرتے ہیں زبانوں سے کنکھیوں سے اُن کا مذاق بناتے ہیں۔ آخرت میں مؤمنین ان پر ہنسیں گے۔ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ سورۂ حدید کے دوسرے رکوع میں منافقین کے پیش آنے والے ایک استہزاء کا ذکر ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ جس کی تفسیر ان شاء اللہ اپنی جگہ پر بیان ہوگی۔

دُنیا میں منافقین اپنے مال اور جائیداد وغیرہ میں مشغول ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں ان کا سمجھنا غلط ہے ان کا مال اور جائیداد اُن کو گمراہی اور سرکشی میں لگائے ہوئے ہے اور اسی گمراہی میں حیران اور سرگرداں ہو کر بھٹک رہے ہیں۔ دُنیاوی مال اور جائیداد سے دھوکہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ کفر کے ہوتے ہوئے یہ ہمارے لئے مفید اور نافع ہے بہت بڑا دھوکہ ہے۔ سورۂ مؤمنون میں فرمایا...... اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (کیا یہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال اور بیٹے دیئے چلے جاتے ہیں (اس طرح) ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (بات یوں نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی، سو اُن کی تجارت نفع مند نہ ہوئی اور نہ وہ ہدایت پر چلنے والے بنے۔

منافقین نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہر شخص کو فطرت ایمان پر پیدا فرمایا پھر عقل اور ہوش بھی دیا اور انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ کتابیں نازل فرمائیں اس سب کے باوجود اگر کوئی شخص ہدایت کو اختیار نہ کرے اور گمراہی کو اختیار کرے تو یہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے والا بن گیا اس نے اپنی عقل و بصیرت کی پونجی کو جس کے ذریعہ ہدایت پر چل سکتا تھا، ضائع کر دیا اور گمراہی اختیار کر لی۔ یعنی اپنی پونجی گمراہی حاصل کرنے میں لگا دی ایسے لوگوں کی یہ تجارت نفع مند نہیں، بلکہ سراسر نقصان اور خسران کا باعث ہے۔ حقیر دنیا کے لئے گمراہی لی، ہدایت سے منہ موڑا، آخرت کی بربادی کو خریدا، فطرت سلیمہ جو اُن کی پونجی تھی اس کو برباد کیا ایسی تجارت میں نفع کہاں؟ نقصان کو نفع سمجھنا بہت بڑی حماقت اور خود فریبی ہے۔ اہلِ ایمان کو دھوکہ دیا اُن کو بیوقوف بتایا اور خود ہی دھوکہ میں پڑے اور برباد ہوئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ

ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی پھر جب اُس آگ نے اس شخص کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی روشنی کو ختم کر دیا

وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور اُن کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ رجوع نہ ہوں گے۔

مُنافقوں کے بارے میں دو اہم مثالیں

منافقوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا اور دل میں اُن کے ایمان نہ تھا ظاہری ایمان قبول کرنے سے جو کچھ انہیں دنیاوی فائدہ پہنچ گیا مثلاً جان و مال محفوظ کر لیا کہ مسلمان ان سے تعرض نہ کریں اس کو اولاً ایسے شخص سے تشبیہ دی جو اندھیری رات میں آگ جلائے اور اُس روشنی سے راستہ دیکھنے کا فائدہ حاصل کرنا چاہے، اور اُن لوگوں کا جو انجام ہونے والا ہے کہ مرتے ہی سخت عذاب میں مُبتلا ہوں گے اس کو اس آگ کے بجھانے سے تشبیہ دی جس کو انہوں نے روشنی کے لئے جلایا تھا، دنیا میں جُھوٹے مُنہ سے ایمان ظاہر کر کے ذرا سا فائدہ اُٹھالیا اور ہمیشہ کے لئے عذاب الیم میں گرفتار ہوئے جیسے کوئی شخص اندھیری رات میں آگ جلائے اور روشنی ہو جائے تو وہ روشنی اللہ تعالیٰ شانہٗ ختم فرمادے اور یہ آگ جلانے والا اندھیروں میں حیران کھڑا رہ جائے نہ کچھ دیکھ سکے نہ بُوجھ سکے۔ منافقوں نے اپنے طور پر بڑی ہوشیاری کی کہ ایمان ظاہر کر کے دُنیا کا کچھ فائدہ اُٹھالیا لیکن دل میں جو کفر گُھسا ہوا ہے اس کی وجہ سے موت کے بعد جن مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے اس کو نہ سوچا اور کُفر میں بڑھتے بڑھتے اس درجے پر پہنچ گئے کہ بہرے بھی ہیں حق سُننے کے قابل نہ رہے اور گونگے بھی ہیں جن کے مُنہ سے کلمہ حق ادا نہیں ہو سکتا اور اندھے بھی ہیں جو راہ حق نہیں دیکھ سکتے۔ اپنا نفع نقصان جاننے اور سمجھنے سے غافل ہیں۔ اُن کے بارے میں اب نہ سوچا جائے کہ وہ حق کی طرف رُجوع کریں گے اور دل سے مُسلمان ہوں گے۔ ذکر ابن کثیر فی شرح المثل عدۃ اقوال وقد اخترنا ما نقلہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال ھذا مثل ضربہ اللہ للمنافقین انھم کانوا یعتزون بالاسلام فیناکحھم المسلمون ویوارثونھم ویقاسمونھم الفیٔ فلما ماتوا سلبھم اللہ ذلک العز کما سلب صاحب النار ضوءہ۔ (ابن کثیرؒ نے لفظ مثل کی شرح میں متعدد اقوال ذکر کئے ہیں اور ہم نے ان میں سے صرف اسی قول کو اختیار کیا ہے جو ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے لئے بیان فرمائی ہے کہ وہ اسلام کے ذریعے عزت حاصل کر لیتے ہیں مسلمان ان سے مناکحت کرنے لگتے ہیں اور وراثت اور مال غنیمت ان میں تقسیم کرتے ہیں لیکن مرتے ہی انکی یہ عزت جاتی رہتی ہے جیسے آگ بجھتے ہی اسکی روشنی آگ جلانے والے سے جاتی رہتی ہے۔)

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ

یا ان کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان سے تیز بارش ہو رہی ہو اُس میں اندھیریاں ہوں اور گرج ہو اور بجلی ہو یہ لوگ موت کے اندیشے کے سبب اپنے کانوں میں

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ

انگلیاں دے رہے ہیں کڑک کی وجہ سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ کئے ہوئے ہے کافروں کو۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی بینائی کو اُچک لے

كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ

جب کبھی اُن کے لئے روشنی ہوئی تو اس میں چلنا شروع کر دیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے سننے

وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

اور دیکھنے کی قوتوں کو ختم فرمادے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

ع ۲ / ۱۳ / ۲

دوسری مثال: ان دو آیتوں میں منافقین کی دوسری مثال پیش فرمائی جیسے تیز بارش ہو، اندھیریاں چھائی ہوئی ہوں، گرج بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو موت کا سامنا ہو۔ جو لوگ وہاں موجود ہوں کڑک کی آواز سے خوف زدہ ہو رہے ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ ابھی موت آ جائے گی۔ کڑک کی آواز کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے ہیں۔ سخت بجلی اُنکی آنکھوں کی روشنی سلب کرنے کو ہے اِسی حیرانی اور پریشانی میں کھڑے کھڑے جب ذرا بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں ایک دو قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران سرگردان کھڑے رہ جاتے ہیں۔ منافقوں کی یہی حالت ہے جب غلبہ اسلام کو دیکھتے ہیں اور اس کا نور پھیلتا ہوا نظر آتا ہے تو اس کی طرف بڑھنے لگتے ہیں پھر جب دنیا کی محبت زور پکڑتی ہے اور دُنیاوی فائدے کفر اختیار کئے رہنے میں نظر آتے ہیں تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی ایمان کی طرف بڑھنے سے رُک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم وقدرت سے سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کی طرف بڑھنا اور اس کا دِین قبول کرنا لازم ہے۔ وہ چاہے تو سننے اور دیکھنے کی ساری قوتیں ختم فرمادے اور بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ منافقین کو اصحاب صَیِّب (بارش والوں) سے تشبیہ دی اور اُن کے (ظاہری) ایمان کو جو کفر اور دھوکے بازی کے ساتھ ملا ہوا تھا ایسی بارش سے تشبیہ دی جس میں اندھیریاں ہوں، اور گرج ہو اور بجلی ہو یہ تشبیہ اس اعتبار سے ہے کہ بارش اگر چہ فی نفسہ نافع ہے لیکن جب مذکورہ صورت میں بارش نازل ہوئی تو اِس کا نفع ضرر سے بدل گیا اور منافقین نے جو نفاق اس لئے اختیار کیا کہ مومنین کی طرف سے جو تکالیف پہنچنے والی ہوں اور کھلے کافروں کی طرف سے جو تکالیف پہنچتی ہوں ان سے بچاؤ ہو جائے ان کی اس منافقت کو کانوں میں انگلیاں دینے سے تشبیہ دی جیسے کوئی شخص بجلیوں کی کڑک سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رہا ہو اور موت سے ڈر رہا ہو تو جس طرح کانوں میں انگلیاں دینے سے اللہ تعالیٰ کے قضاء قدر کے فیصلے کو نہیں ٹالا جا سکتا اسی طرح سے منافقت اختیار کرنے سے مصائب وآلام سے حفاظت نہیں ہو سکتی اور شدت الامر کی وجہ سے جو ان کو حیرانی اور یہ پریشانی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اسے بجلی سے تشبیہ دی کہ کوئی موقع پاتے ہیں تو ذرا اپنے مقاصد میں آگے بڑھ جاتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ خوف لگا ہوا ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں نہ اُچک لے۔ لہٰذا چند قدم چلتے ہیں پھر جب بجلی کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو بلا حس وحرکت کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

اور پھر دوسری طرح سے بھی اس تشبیہ کی تقریر کی ہے۔ (راجع البیضاوی ص ۳۹ ج ۱) بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلی مثال اُن منافقوں کے بارے میں پیش فرمائی ہے جو بہت مضبوطی کیساتھ کفر پر جمے ہوئے تھے اُن کے بارے میں فرمایا:...... وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔

اور دوسری مثال اُن منافقوں کے بارے میں ہے جن کو اسلام کے بارے میں تردد تھا کبھی اس کی حقانیت دِل میں آتی تو اس کی طرف مائل ہونے لگتے اور جب دُنیاوی اغراض سامنے آتیں اور دُنیا کی محبت زور پکڑ لیتی تو وہ میلان ختم ہو جاتا تھا اور کفر ہی پر جمے رہ جاتے تھے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا فرمایا اور اُن لوگوں کو بھی پیدا فرمایا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ،

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ

جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت، اور اُتارا آسمان سے پانی، پھر نکال دیا اس کے ذریعہ

الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

پھلوں سے تمہارے لئے رزق، للہذا مت بناؤ اللہ کے لئے مقابل، حالانکہ تم جانتے ہو۔

دعوتِ توحید اور دلائلِ توحید

مؤمنین مخلصین اور کافرین اور منافقین کا ذکر کرنے کے بعد اب دلائل کے ساتھ توحید کی دعوت دی گئی۔ اور اللہ جل شانہٗ کی شان خالقیت اور شان ربوبیت بیان فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمت کا تذکرہ فرمایا جس کا مظاہرہ سب کے سامنے ہے اور ایک کم سمجھ آدمی بھی اس کو دیکھتا ہے۔

اول...... تو یہ فرمایا کہ (کہ تم اپنے رب کی عبادت کرو جو تمہاری پرورش فرماتا ہے اور یہی نہیں کہ صرف پرورش فرماتا ہے بلکہ اس نے تم کو وجود بھی بخشا ہے، ممکن ہے کوئی ناسمجھ یہ کہنے لگتا کہ مجھے تو میرے ماں باپ نے پیدا کیا اس وہم کو دفع فرمانے کے لئے فوراً ہی یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ تم سے پہلے ہیں ان سب کو اُسی نے پیدا فرمایا ہے اس نے وجود بھی دیا اور وہ وجود کو باقی رکھے ہوئے بھی ہے اور وجود کے باقی رہنے کے جو اسباب ہیں وہ بھی اُسی نے پیدا فرمائے ہیں، پھر یہ فرمایا کہ جب اسی ذات پاک کی عبادت کو اختیار کرو گے اسی میں لگو گے تو تم کو صفتِ تقویٰ حاصل ہوگی۔ تقویٰ عربی زبان میں بچنے اور پرہیز کرنے کو کہتے ہیں اور اس کے بہت سے درجات ہیں۔ سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک کا مراقبہ رکھے اور ہر وقت اسی کی طرف دِل و دِماغ کو متوجہ رکھے اسی کے لئے جیے اور اُسی کے لئے مرے، چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنا بھی تقویٰ کے مفہوم میں داخل ہے۔ جب کسی کو خلوت اور جلوت میں اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات پاک کا استحضار رہے گا تو کہاں گناہ کر سکے گا اور جب گناہوں سے بچے گا تو ظاہر ہے دوزخ سے بھی محفوظ رہے گا۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اِس کا ترجمہ یوں لکھا ہے "تا کہ تم دوزخ سے بچو"۔ سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ شرک سے بھی بچے اور توحید کو اختیار کرے جو سب سے بڑی عبادت ہے اور چھوٹے بڑے گناہوں سے بھی پرہیز کرے، ایسا کریگا تو ظاہر ہے کہ دوزخ سے ضرور اس کی حفاظت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور شانِ خالقیت کا مظاہرہ تو ہر چھوٹی بڑی چیز میں ہوتا ہے لیکن بہت واضح چیزیں جو سب کے سامنے ہیں اور کم سمجھ بھی جن کو سمجھتا اور جانتا ہے اُن میں سے تین چیزیں بیان فرمائیں۔

اول: جن میں سے اول یہ ہے کہ اُس نے زمین کو پیدا فرمایا۔ یہ زمین سب کے سامنے ہے اِس پر بستے ہیں اور رہتے سہتے ہیں اگر کوئی نابینا ہو تو وہ بھی یہ تو جانتا ہی ہے کہ میں کس چیز پر آباد ہوں کس چیز پر چل پھر رہا ہوں، جو زمین ہے اس کا وجود ہی بتاتا ہے کہ اِس کا پیدا کرنے والا بڑی قدرت والا ہے پھر زمین کا وجود محض وجود ہی نہیں بلکہ انسانوں کے لئے اس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے ساری زمین انسانوں کے لئے بچھونا ہے جس پر رہتے سہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، اس کے اتنے بڑے پھیلاؤ میں انسانوں کے رہنے کے مکانات بنانے، چلنے پھرنے، سفر کرنے، حاجتیں پوری کرنے کے مواقع ہیں، اگر زمین پر پہاڑ ہی پہاڑ ہوتے یا پانی ہی پانی ہوتا تو اس پر رہنا دُشوار ہو جاتا۔

دوم: زمین کے ساتھ ہی آسمان کا ذِکر فرمایا اور وہ یہ کہ آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا۔ یہ چھت ستاروں سے مزین ہے، دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے، اس کی طرف نظر کرنے سے فرحت اور بشاشت محسوس ہوتی ہے۔ صاحب بیان القرآن نے اپنے رسالہ رفع البناء کے آخر میں لکھا ہے کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ آسمان کی طرف دیکھنے سے دس فائدے ہیں۔ (۱) غم کا کم ہونا،

(۲) وسواس کی تقلیل، (۳) وہم اور خوف کا ازالہ، (۴) اللہ کی یاد، (۵) قلب میں اللہ کی عظمت کا پھیل جانا، (۶) افکار ردّیہ کا جاتا رہنا، (۷) سوداوی مرض کے لئے نافع ہے، (۸) مشتاق کی تسلی، (۹) محبین کا مونس ہونا، (۱۰) دُعا کرنیوالوں کا قبلہ ہے۔ اھ نقله عن كتاب الحكمة للغزالي۔

سوم: پھر بارش کے پانی کا تذکرہ کیا اور یہ فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے آسمان سے پانی اُتارا اور اس کے ذریعہ طرح طرح کے پھل پیدا فرمائے جو بنی نوع انسان کے لئے رزق ہیں اور غذا ہیں ان کے ذریعہ انسانوں کی پرورش اور بقاء ہے، اس میں دلائل قدرت بھی ہیں اور شان ربوبیت کا اظہار بھی ہے۔ ایک ہی زمین ہے اس میں طرح طرح کے پھل ہیں جن کے رنگ بھی مختلف ہیں، مزے بھی مختلف ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ جب اپنے رب اور خالق کو تم نے اس کے دلائل قدرت کے ذریعہ اور اس کی نعمتوں کے واسطہ سے پہچان لیا تو عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اس کو ایک جانو اور ایک مانو اس کی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کرو اور اس کے مقابل شریک مت ٹھہراؤ۔ اُس کے علاوہ نہ کوئی رب ہے، نہ کوئی خالق ہے، نہ نعمتیں دینے والا ہے، نہ زندگی کے اسباب پیدا کرنیوالا ہے۔ ان سب باتوں کو جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کے لئے شریک تجویز کرنا اور کسی کو اس کے علاوہ عبادت کا مستحق سمجھنا علم و فہم اور عقل و دانش کے خلاف ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

اور اگر تم اس کتاب کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی تو لے آؤ کوئی سورت جو اِس جیسی ہو اور بُلا لو اپنے مددگاروں کو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

رَسالتِ محمدیہ ﷺ کی دلیل اور قرآن پاک کا اعجاز

توحید کے ثابت کرنے کے بعد رسالت کے ماننے اور تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے، کوئی شخص خالق و مالک کو مان لے تو اس کی معرفت کی بھی ضرورت رہتی ہے، اس کی ذات وصفات کو جاننا اور ماننا لازم ہے اور اِن کا علم خود بخود نہیں ہوسکتا اور خالق و مالک جلّ مجدہٗ کی عبادت کے طریقے اپنے پاس سے ایجاد نہیں کئے جا سکتے۔ لہٰذا ان سب چیزوں کے سمجھانے اور بتانے کے لئے اللہ جل شانہ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا جو انسان تھے اور انسانوں سے انسان کی زبان میں بات کرتے تھے، جتنے بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے ان کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ہر ایک زمانہ کے ماحول کے اعتبار سے معجزات دیئے گئے۔ آخر الانبیاء سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطۂ عرب میں پیدا ہوئے، مکہ معظمہ آپ کا وطن تھا جو جزیرۂ عرب میں واقع ہے۔ اس زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا، اہلِ عرب جب مختلف مواقع میں جمع ہوتے تھے تو مقابلے کے طور پر مختلف قبائل اپنے اپنے قصیدے سنایا کرتے تھے۔ جس کا قصیدہ بہت زیادہ فصیح بلیغ سمجھا جاتا اُس کو کعبہ شریف پر لٹکا دیتے تھے اور یہ گویا ایک قسم کا چیلنج ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس کے مقابلہ میں قصیدہ لکھ کر پیش کرے۔

حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ سارے عالم کے انسانوں کے لئے ہے، قیامت آنے تک

آپ ہی رسول ہیں۔ آپ ہی کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنے میں سب کی نجات ہے آپ سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور ان معجزات پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان معجزات میں بہت بڑا معجزہ اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جو آپ پر نازل ہوئی جس کا نام قرآن مجید ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ فصاحت و بلاغت کا بہت چرچا تھا اور مخاطبین اوّلین چونکہ اہل عرب ہی تھے۔ اس لئے یہ ایک ایسا معجزہ دے دیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے تمام شعراءِ عرب عاجز رہ گئے (اور اُس کو دیکھ کر بہت سے شعراء نے کلام کہنا ہی چھوڑ دیا جن میں حضرت لبید بن ربیعہؓ بھی تھے۔ ان کا قصیدہ بھی اُن قصائد میں شامل ہے جن کو مقابلہ کے لئے کعبہ شریف پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُن سے دریافت کرایا کہ زمانۂ اسلام میں آپ نے کیا اشعار کہے ہیں اُنہوں نے جواب دیا۔ ابدلنی الله بالشعر سورة البقرة و سورة آلِ عمران. (الاصابة ص۳۲۶ ج۳)

مذکورہ بالا آیت میں اہلِ عرب کو قرآن جیسی کوئی سُورت بنا کر پیش کرنے کے لئے تحدی کی گئی ہے یعنی مقابلہ میں کوئی سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم سب اپنے حامیوں اور مددگاروں کو بُلا لو اور اللہ تعالیٰ کے سوا سارے حمایتیوں کو جمع کرو پھر قرآن کریم جیسی کوئی سُورت بنا کر پیش کرو۔ پہلے دس سورتیں بنا کر لانے کا چیلنج کیا گیا تھا پھر ایک سورت لانے کے لئے فرمایا گیا تمام فصحاء بلغاء ایک چھوٹی سے چھوٹی سُورت بھی بنا کر نہ لا سکے اور یکسر عاجز رہ گئے۔ سورۃ یونس میں ارشاد فرمایا:

قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(آپ فرما دیجئے کہ لے آؤ تم کوئی سُورت اِس جیسی، اور بُلا لو جس کو بھی بُلا سکتے ہو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو)۔

قرآن کریم کا معجز ہونا ایسی ظاہر بات ہے جو سب کے سامنے ہے اور سب کو اِس کا اقرار ہے دُشمن بھی اس کو جانتے اور مانتے رہے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں بعضے جاہلوں نے تو یہ کہہ کر اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی کہ ..... لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (اگر ہم چاہیں تو اس جیسا کہہ دیں) لیکن کر کچھ نہ سکے اور کچھ لوگوں نے قرآن کے مقابلہ میں کچھ عبارتیں بنائیں پھر خود ہی آپس میں مل کر بیٹھے تو تسلیم کر لیا کہ یہ قرآن جیسی نہ بنی اور آج تک بھی کوئی بنا کر نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں اِرشاد ہے اور سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا

(آپ فرما دیجئے کہ یہ بات ضروری ہے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جنات کہ وہ لے آئیں اس قرآن جیسا تو نہیں لائیں گے اِس جیسا اگرچہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں)۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

سو اگر تم نہ کرو اور ہرگز نہیں کر سکو گے، سو ڈرو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔

قرآن کے مقابلہ سے ہمیشہ عاجز رہیں گے

اس آیت میں فرمایا ہے کہ تم ہرگز قرآن کے مقابلہ میں اس جیسی کوئی سورت بنا کر نہیں لا سکتے ہو اور کبھی بھی نہ لا سکو گے۔ اس میں رہتی دُنیا تک کے لئے قرآن کے دنیا میں باقی رہنے کی پیشین گوئی کے ساتھ یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ اس جیسا کوئی بھی جماعت یا کوئی فرد نہیں بنا سکتا۔ یہ دونوں پیشین گوئیاں صادق ہیں سچی ہیں سب کے سامنے ہیں چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عام ہے تمام

افراد انسانی جب تک بھی دنیا میں رہیں ان پر فرض ہے کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کا دین قبول کریں۔ چونکہ سارے انسانوں کے لئے سارے زمانوں اور سارے مکانوں میں آپ کی دعوت ہے اور یہ دعوت قیامت آنے تک ہے اس لئے کسی ایسے معجزہ کی بھی ضرورت تھی جو ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے یہ معجزہ قرآن مجید ہے جو اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے تمام انسان اور جنات افراد اور جماعتیں عاجز ہیں اور عاجز رہیں گے۔

قرآن موجود ہے اس کی دعوت عام ہے اس کی حقانیت اور سچائی واضح ہے پھر بھی کفر میں اور شرک میں بے شمار قومیں کروڑوں افراد مبتلا ہیں قرآن سنتے ہیں اور اس کو حق جانتے ہیں لیکن مانتے نہیں۔ عناد اور ضد اور تعصب قومی اور مذہبی نے انکو دعوت قرآن کے ماننے سے اور اسلام قبول کرنے سے روک رکھا ہے سب کچھ جانتے ہوئے پھر اسلام قبول نہ کرنا اپنے لئے عذابِ آخرت مول لینا ہے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ اگر تم قرآن کے مقابلہ میں کوئی سورت نہیں لاسکتے اور ہرگز نہیں لاسکو گے تو دوزخ کی آگ سے اپنے کو بچاؤ یعنی قرآن لانے والے کی رسالت اور دعوت کے منکر ہو کر عذابِ دائمی کے مستحق نہ بنو اور دیکھتے بھالتے دھکتی ہوئی آگ کا ایندھن نہ بنو اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ انسان تو وہی ہیں جو اس کے منکر ہیں اور ایمان لانے کو تیار نہیں اور پتھروں کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ پتھر جن کی دُنیا میں مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، دوزخ میں ہوں گے۔ سورۂ انبیاء میں فرمایا: اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ۔ (بے شک تم اور وہ جن کی تم عبادت کرتے ہو، دوزخ کا ایندھن ہوں گے، تم اس پر وارد ہونے والے ہو)۔

تفسیر درِ منثور میں (ص ۳۶ ج ۱) بحوالہ طبرانی، حاکم اور بیہقی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ پتھر جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ میں فرمایا ہے کبریت (گندھک) کے پتھر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جیسے چاہا پیدا فرما دیا۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا

اور بشارت دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ بلاشبہ ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جب کبھی ان کو اُن باغوں میں

مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ

سے کوئی پھل بطورِ غذا کے دیا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا، اور انکو ہم شکل پھل دیئے جائیں گے اور ان کے لئے ان

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

باغوں میں بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں، اور وہ اُن باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

اہلِ ایمان کو جنّت کی بشارت

کافروں کی سزا بتانے کے بعد (جو اُوپر کی آیت میں مذکور ہوئی) اس آیت میں اہلِ ایمان اور اعمالِ صالحہ والے بندوں کی جزا ذکر فرمائی ہے جو طرح طرح کی نعمتوں کی صورتوں میں ظاہر ہوگی۔

اوّل: تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ باغوں میں رہیں گے۔ یہ باغات دار النعیم میں ہونگے جسے جنت کہا جاتا ہے ان باغوں میں رہنے کے لئے مکان بھی ہوں گے جیسا کہ سورۂ صف میں وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ فرمایا ہے۔ اِن باغات میں نہریں جاری ہوں گی۔ جو

صاف ستھرے پانی کی ہوں گی جس میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اور دودھ کی نہریں ہوں گی جن کا مزہ تبدیل نہ ہوا ہوگا اور شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لئے لذت کا ذریعہ ہوں گی اور صاف ستھرے شہد کی نہریں ہوں گی جیسا کہ سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان نہروں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور جو شراب وہاں پی جائے گی وہ لذت کے لئے ہوگی اس سے نہ نشہ آئے گا اور نہ سر میں درد ہوگا۔ سورۃ الصافات میں فرمایا ہے لَا فِیۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا یُنۡزَفُوۡنَ ۝ (نہ اس میں درد سر ہوگا نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا)۔

دوم: یہ فرمایا کہ ان باغوں کے درختوں میں جو پھل ہوں گے وہ ان کو کھانے کے لئے پیش کئے جائیں گے اور جب کبھی کوئی پھل لایا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا اور وجہ اس کی یہ ہوگی کہ وہ پھل آپس میں ہم شکل ہوں گے اگرچہ لذت اور مزے میں مختلف ہوں گے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ مـن قبـل سے یہ مراد ہے کہ دنیا میں جو پھل ہمیں دیئے گئے تھے یہ اسی جیسا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وہیں جنت میں جو پھل دیئے جائیں گے اُن کے بارے میں کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی پہلے کھایا تھا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ پہلے معنی لینا زیادہ ظاہر ہے تا کہ لفظ کُلَّمَا کا عموم باقی رہے (کیونکہ جنت میں سب سے پہلے جب پھل ملے گا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا تھا اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب مـن قبل سے دنیا والے پھل مراد لیے جائیں) لیکن صاحب تفسیر نسفی لکھتے ہیں: والضمیر فی بہ یرجع الی المرزوق فی الدنیا والاٰخرۃ لان قولہ ھذا الذی رزقنا من قبل انطوی تحتہ ذکر مارزقوہ فی الدارین. جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا یہ کہنا کہ ''یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے''۔ دونوں پھلوں کے بارے میں ہے، دنیا والے پھل اور جو پھل وہاں دیئے جاتے رہیں گے دونوں مراد ہیں جو پھل اُن کو دیئے جائیں گے دیکھنے میں بظاہر دُنیاوی پھلوں کے مُشابہ ہوں گے، جس چیز کو پہلے دیکھا ہو اس سے اُنس اور اُلفت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی طرف طبعی میلان زیادہ ہوتا ہے اس لئے ظاہری صورت میں وہ پھل دنیا والے پھلوں کی طرح ہوں گے اور حقیقت میں اُن کا مزہ اور کیف دُوسرا ہی ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت کے پھلوں سے دنیا میں کوئی پھل نہیں بس ناموں کی مشابہت ہے یعنی پھلوں کو دیکھ کر اہل جنت کہیں گے کہ یہ سیب ہیں، یہ انار ہیں ہم نے اس کو دُنیا میں کھایا تھا۔ لیکن وہ مزے میں دُنیاوی پھل کی طرح نہ ہوں گے بلکہ اُن کا مزہ اور کیف جنت کے اعتبار سے ہوگا جیسا کہ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں فرمایا ہے فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ۔ بعض حضرات نے یہ اشکال کیا ہے کہ دنیا والے پھل مراد لئے جائیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جنتی پھل صرف انہی پھلوں کے مشابہ ہوں جو دنیا میں تھے، یہ اشکال کوئی وزن دار نہیں ہے اس لئے کہ اگر شروع داخلہ کے وقت دنیا والے پھلوں کے مشابہ دیئے جائیں اور پھر اُن پھلوں کے انواع و اقسام پیش کئے جاتے رہیں جو دُنیاوی پھلوں کے مُشابہ نہ ہوں اور ان میں آپس میں مُشابہت ہو تو اس میں کوئی بات عقل و فہم سے بعید نہیں ہے۔ اہلِ جنت کو بار بار اور ہمیشہ ایسے پھل دیئے جانا کہ جن میں ظاہری مشابہت ہو اور حقیقت میں مزہ اور کیف الگ الگ ہو اس سے بہت زیادہ استغراب و استعجاب ہوگا اور اس سے خوشی دوبالا ہوگی۔

سوم: یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مطھرۃ من القذی والاذی کہ وہ گندگی اور تکلیف دینے والی چیز سے پاک ہوں گی۔ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: من الحیض والغائط والبول والنخام والبصاق والمنی والولد۔ یعنی وہ بیویاں حیض سے، اور پیشاب پاخانہ سے، ناک سے نکلنے والے بلغم سے، تھوک سے اور مَنی سے پاک وصاف ہوں گی اور اولاد بھی نہ ہوگی جس کے باعث نفاس آتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: مطھرۃ من الاذی والمأثم یعنی وہ

بیویاں ہر تکلیف والی چیز سے اور نافرمانی سے پاک ہوں گی۔ ان سب اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ اُن عورتوں میں کسی قسم کی کوئی چیز گھن والی اور تکلیف دینے والی نہ ہوگی۔ اُن کا ظاہر اور باطن سب کچھ عمدہ اور بہترین ہوگا۔ شوہروں کی بات مانیں گی نافرمانی نام کو بھی نہ ہوگی۔ (مذکورہ اقوال تفسیر ابن کثیر میں نقل کئے گئے ہیں) مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ مُطَهَّرَةٌ (بابِ تفعیل سے) فرمایا اور طَاهِرَاتٌ نہیں فرمایا اس سے ان کی طہارت اور پاکیزگی کو نہایت اعلیٰ طریقے پر بیان فرمانا مقصود ہے کہ ان کو ایک پاک کرنے والے نے پاک بنایا ہے اور وہ پاک بنانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ان بیویوں کا حسن و جمال دوسری آیات میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ارشاد فرمایا: كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ (گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں) اور سورۂ واقعہ میں فرمایا ...... وَحُورٌ عِينٌ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ۔ (وہ سفید رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی گویا کہ وہ چھپے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں)۔

چہارم: یہ فرمایا هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ یعنی اہل جنت ہمیشہ اُن باغوں میں رہیں گے۔ نہ وہاں سے نکلیں گے اور نہ نکالے جائیں گے، نہ نکلنا چاہیں گے۔ کما فی سورۃ الکھف لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنت کو خوشخبری سنانے کیلئے) ایک ندا دینے والا پکار کر ندا دے گا تمہارے لئے یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ تندرست رہو گے لہٰذا کبھی بھی بیمار نہ ہو گے اور یہ کہ زندہ رہو گے۔ کبھی تمہیں موت نہ آئے گی۔ اور جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے اور یہ کہ نعمتوں میں رہو گے۔ پس تم کو کبھی محتاجگی نہ ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۳۸۰ ج ۲)

دُنیا کی نعمتوں میں کدُورت ملی ہوئی ہے۔ خوشی کے ساتھ رنج ہے، تندرستی کے ساتھ بیماری ہے۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے ہیں۔ مال اور عہدوں کے ساتھ دُوسروں کا حسد اور دشمنی ہے اور سب سے آخر بات یہ ہے کہ سب نعمتیں فانی ہیں، صاحبِ نعمت بھی فانی ہے، نعمتوں کا دَوام اور ہمیشگی کسی کیلئے نہیں۔ آخرت کی نعمتیں اَبدی ہیں دائمی ہیں ہمیشہ کے لئے ہیں۔ ان کے زوال اور چھن جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ زندگی بھی دائمی ہوگی۔ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ان کی شان میں فرمادیا ہے۔ (جعلنا اللہ تعالیٰ منھم)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ

بے شک اللہ تعالیٰ اِس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی بھی مثال بیان فرمائے مچھر ہو یا اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز ہو، سو جو لوگ ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ

أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ

وقف لازم

بلاشبہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا سو وہ کہتے ہیں کیا ارادہ کیا اللہ نے اس کے ذریعہ مثال دینے کا۔

قرآنی مثالوں سے مؤمنین کا ایمان پختہ ہونا اور منکرین کا بے جا اعتراض کرنا

کتابُ اللہ کے منکرین کی سزا اور اہلِ ایمان کی جزا بتانے کے بعد کتابُ اللہ کے منکروں کے ایک اشکال اور اعتراض کا جواب دیا جارہا ہے۔ مخالفین اور معاندین سے یہ تو نہ ہو سکا کہ کتابُ اللہ کے مقابلہ میں کوئی سورت بنا کر لاتے لیکن انہوں نے ایک اعتراض کر دیا اور اس اعتراض میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا انکار مضمر ہے۔ حضرت قتادہؒ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عنکبوت (مکڑی) اور ذباب (مکھی) کا قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا تو مشرکین کہنے لگے اس میں تو مکڑی اور مکھی کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

اس حقیر مثال سے کیا ارادہ کیا ہوگا۔ (ابن کثیر) اور یہ استفہام انکاری ہے مطلب یہ تھا کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتا۔ تفسیر نسفی میں ہے کہ جب مکھی اور مکڑی کا ذکر کتاب اللہ میں سنا تو یہود ہنسے اور کہنے لگے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے ملتی جلتی بات نہیں ہے مقصد ان کا بھی کتاب اللہ کا انکار کرنا ہی تھا۔ (ص ۳۵ ج ۱) ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ مثال ممثل له کے مطابق ہونی چاہیے۔ مثال دینے والے کی عظمت کو اور جس چیز کی مثال دی گئی اسکی حقارت کو سامنے رکھ کر قیاس دوڑانے لگے اور یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ان چیزوں کا ذکر نہیں ہوسکتا۔

اللہ جل شانہٗ نے ان معاندین اور معترضین کی تردید فرمائی اور ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی چیز مثال میں پیش فرمادے خواہ مچھر ہی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہو (بڑھ کر ہونے میں دونوں صورتیں آجاتی ہیں حقارت اور چھوٹا ہونے میں بڑھ کر ہو یا جسامت میں بڑھ کر ہو) اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اہل ایمان کو اس میں کوئی تردد نہیں ہوتا کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (کیونکہ مثال اپنی جگہ ٹھیک ہے ممثل له کے مطابق ہے) وہ یقین رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مثال واقعی صحیح ہے، موقع کے مطابق ہے، ہمارے رب کی طرف سے ہے اور کافر لوگ عناد کرتے ہیں اور ماننے سے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس حقیر چیز سے اللہ تعالیٰ نے کیا ارادہ فرمایا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ

اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اسکے ذریعہ بہت سوں کو ہدایت دیتے ہیں اور اسکے ذریعہ نہیں گمراہ کرتے مگر فرمانبرداری سے نکل جانے والوں کو۔ جو

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ

اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کی مضبوطی کے بعد، اور کاٹتے ہیں اُن چیزوں کو جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور فساد کرتے ہیں

فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

زمین میں، یہ لوگ پورے خسارہ والے ہیں۔

قرآنی مثالیں فاسقوں کے لئے گمراہی کا سبب ہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو طرح طرح کی مثالیں پیش فرمائی ہیں، سمجھانے کے لئے اور معاندین کو راہِ حق پر لانے کے لئے ہیں لیکن ان لوگوں میں بہت سے لوگ ان مثالوں پر اعتراض کرتے ہیں اور اُن کا یہ انکار اور عناد ضلال اور اضلال کا سبب ہو جاتا ہے اور جو اہلِ ایمان ہیں وہ مزید اپنے ایمان پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں اور یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے صحیح اور دُرست ہے اور موقع کے مطابق ہے۔ جو لوگ اس مثال کو اپنے لئے ذریعہ کفر بنا لیتے ہیں یعنی مثال پر اعتراض کر کے اپنے کفر میں مزید اضافہ کر لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو حکم عدولی پر کمر باندھے ہوئے ہیں ان کو غور کرنے اور حق تلاش کرنے کی عادت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام فصاحت التیام ہی کو انہوں نے اپنے لئے ذریعہ ضلال بنالیا۔ ان میں منافقین بھی ہیں اور عام کافرین بھی۔

قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ یضل به کثیرا یعنی به المنافقین ویهدی به کثیرا یعنی به المؤمنین، فیزید هؤلاء ضلالة إلی ضلالتهم لتکذیبهم بما قد علموه حقاً یقیناً من المثل الذی ضربه الله بما ضرب لهم وانه لما ضرب له

موافق فذلک اضلال اللہ ایّاھم بہ ویھدی بہ یعنی بالمثل کثیرا من اھل الایمان والتصدیق فیزیدھم ھدی إلی ھداھم وایمانا الی ایمانھم لتصدیقھم بما قد علموہ حقا یقینا انہ موافق لما ضربہ اللہ لہ مثلا و اقرارھم بہ وذلک ھدایۃ من اللہ لھم بہ (من ابن کثیر) والاضلال خلق فعل الضلال فی العبد والھدایۃ خلق فعل الاھتداء ھذا ھو الحقیقۃ عند اھل السنۃ. (تفسیر نسفی) (ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ''یضل بہ کثیرا'' (اللہ تعالیٰ بہت سوں کو اس کے ذریعہ گمراہ کرتے ہیں) سے منافقین مراد ہیں اور ''ویھدی بہ کثیرا'' (اور بہت سوں کو اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں) سے مؤمنین مراد ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ منافقین کو ضلالت در ضلالت زیادہ کرتے ہیں کیونکہ وہ اس مثال کو یقینی طور پر حق جاننے کے باوجود جھٹلاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان فرمائی ہے اور اس بات کی تکذیب کرتے ہیں کہ یہ مثال اس واقعہ کے موافق ہے جس کے لئے اللہ نے اسے بیان فرمایا ہے۔ پس ان کا اس مثال پر تکذیب کرنا ہی حق تعالیٰ کی طرف سے انہیں مثال کے ذریعہ گمراہ کرنا ہوا اور ہدایت دیتا ہے اس مثال کے ذریعہ بہت سے اہلِ ایمان وتصدیق کو پھر انہیں ہدایت در ہدایت اور ایمان در ایمان زیادہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مثال کی جیسے وہ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ یہ اس واقعہ کے عین موافق ہے جس کے لئے اللہ نے اسے بیان فرمایا ہے تصدیق کرتے ہیں اور اس کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ تصدیق کرنا ہی حق تعالیٰ کی جانب سے اس مثال کے ذریعہ انہیں ہدایت کرنا ہوا۔ اور ضلال (گمراہ کرنا) انسان کے اندر فعل گمراہی پیدا کرنے کا نام ہے اور ہدایت انسان میں فعل رہنمائی پیدا کرنے کا نام ہے۔ اہل سنت کے نزدیک یہی قول حق ہے)

فاسقوں کے اوصاف

پھر ان فاسقوں [1] یعنی حکم عدولی کرنے والوں اور ہدایتِ ربانی کے خلاف چلنے والوں کے کچھ اوصاف ذکر فرمائے۔

وصفِ اول: وہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑتے ہیں۔ اِس عہد سے یا تو عقلِ انسانی مُراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اور یہ عقل دُنیا میں انسان پر حجت ہے اور ایک طرح کا عہد ہے کہ انسان اپنی عقل سے اپنے خالق اور مالک کو پہچانے، اور اپنے خالق اور مالک کو واحد جانے اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ یا عہد الست بربکم مراد ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ساری ذریت کو (جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی) ان کی پشت سے نکالا جو بہت چھوٹی چھوٹی شکلوں میں چیونٹیوں کی طرح سے تھے۔ اور اُن سے عہد لیا اور سوال فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا ''بلٰی'' کہ ہاں آپ ہمارے رب ہیں۔ وادی نعمان میں (عرفات کے قریب) یہ عہد لیا گیا۔ (مشکٰوۃ المصابیح ص ۲۴، از مسندِ احمد)

سورۂ اعراف کی آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى میں اِسی عہد کا ذکر ہے۔ یہ عہد سب نے کیا پھر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اس عہد کے یاد دِلانے کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ جن حدیثوں میں اس عہد کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اقرار کے بعد فرمایا کہ میں ساتوں آسمانوں کو اور ساتوں زمینوں کو تمہارے اوپر گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو بھی تم پر گواہ بناتا ہوں۔ قیامت کے دِن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمیں اس بات کا پتہ نہ تھا۔ تم جان لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے سوا کوئی رب نہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ

---

۱)...... فاسقین' فاسق کی جمع ہے' یہ لفظ فسق سے مشتق ہے' جس کا معنی ہے حکم عدولی کرنا اور فرمانبرداری سے باہر ہو جانا' یہ لفظ کافروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کے لئے بھی ...... ہر ایک کی حکم عدولی اپنے اپنے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے ہے۔

کرنا، میں تمہاری طرف رسول بھیجوں گا جو تم کو میرا یہ عہد اور میثاق یاد دلائیں گے، اور تم پر اپنی کتابیں نازل کروں گا۔ اُنہوں نے کہا ہم اِس بات کے گواہ ہو گئے کہ آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے معبود ہیں اور ہمارے لئے آپ کے سوا کوئی رب نہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں چنانچہ سب نے اس کا اقرار کرلیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴)

جو عہد سب نے کرلیا تھا اس کی یاد دلانے کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے۔ اس عہد کو توڑنا سراسر ناانصافی ہے اور عہد سے مُکر جانا اور اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے بھی عہد لیا تھا کہ جو کتاب تمہارے اوپر نازل کی گئی اس کو تم لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور چھپاؤ گے نہیں۔

کما قال اللّٰہ تعالیٰ ..... وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ (سورۂ آل عمران ع ۱۹)

یہ عہد بھی یہاں اس آیت سے مراد ہو سکتا ہے کیونکہ علماء اہل کتاب بھی قرآن کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے۔ منافقین اور مشرکین عرب کی طرح یہ لوگ بھی اسلام کے پھیلنے اور قرآن کی دعوت عام ہونے میں پوری طرح رُکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے تھے۔

وصفِ ثانی: ان فاسقوں کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ اُن چیزوں کو کاٹتے ہیں جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا، ان میں وہ احکام بھی ہیں جو ''فیما بین العبد و بین اللہ'' ہیں۔ (اللہ تعالیٰ سے بندے کا یہ تعلق ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کا فرمانبردار رہے) اور وہ احکام بھی ہیں جو ''فیما بین العباد'' ہیں۔ جن میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں میں تفریق نہ کریں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں بلکہ سب پر ایمان لائیں، اور لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ کا مصداق بنیں۔

اور اِن احکام میں صلہ رحمی بھی ہے اور اہل ایمان سے دوستی کرنا بھی ہے۔ غرض ایمان باللہ کا جو تقاضا ہے اس کے مطابق عمل کرنا عہد کو جوڑے رکھنا ہے اور ہر وہ عمل جس میں خیر کا چھوڑنا اور شر کا اختیار کرنا ہو یہ سب اُس چیز کے قطع میں آتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑے رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ سورۂ رعد میں ایفاء عہد اور عدمِ نقض میثاق اور وصل ما امر اللہ بہ کی مدح کی گئی ہے۔ اور جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اُن کے توڑنے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ (سورۂ رعد رکوع ۳ کا ترجمہ اور تفسیر پڑھیے)

وصفِ ثالث: ان فاسقوں کا تیسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ یہ زمین میں فساد کرتے ہیں، فساد بگاڑ کو کہتے ہیں اور یہ بہت جامع لفظ ہے۔ کفر اختیار کرنا، منافق بننا، مشرک ہونا، اللہ کی وحدانیت کا منکر ہونا، دوسروں کو ایمان سے روکنا، حق اور اہل حق کا مذاق بنانا، حقوق کا غصب کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، قتل و خون کرنا جس کی شریعت میں اجازت نہیں دی گئی یہ سب فساد فی الارض میں داخل ہے۔ آخر میں فرمایا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ کہ یہ لوگ پورے خسارے میں ہیں۔ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم بہت کامیاب ہیں ایمان نہ قبول کر کے اور منافقت اختیار کر کے دُنیا کے فائدوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا انہوں نے دُنیا کے حقیر فائدوں پر نظر کی، اور آخرت کے دائمی عذاب کے مستحق بنے جس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں۔

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

کیسے کفر کرتے ہو اللہ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان تھے سو اُس نے تم کو زندگی دی پھر تم کو موت دے گا، پھر زندہ فرمائے گا، پھر اُس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مُکرر دعوتِ توحید

اس آیت میں پھر توحید کی دعوت دی گئی جو یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا میں دی گئی تھی اور ارشاد ہو رہا ہے کہ تم اپنے خالق و مالک کے کیسے

منکر ہور ہے ہو اور اُس کی توحید سے کیسے انحراف کر رہے ہو حالانکہ اس نے تم کو وجود بخشا ہے۔ تم نطفے کی حالت میں بے جان تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی دی تمہارا جسم بنایا اور اُس میں رُوح پھونکی۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ایسی ذات پاک پر ایمان لائیں اور کفر اختیار نہ کریں اور بات اتنی ہی نہیں ہے کہ مُردہ تھے اس کے بعد اس نے زندگی بخشی بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جب تمہاری اَجلِ مُقررہ ختم ہوگی وہ تمہیں موت دے گا اس کے بعد پھر زندگی بخشے گا اُس زندگی کے بعد اُسی کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔ اُس وقت اس دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا حساب ہوگا۔ کفر کا اور برے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ ایمان اور عملِ صالح کی جزا بھی ملے گی۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب، پھر قصد فرمایا آسمان کی طرف سو ٹھیک طرح بنا دیا، ان کو سات آسمان،

وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

ع ۳

ارض وسماء کی تخلیق کا بیان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنی شانِ خالقیت بیان فرمائی ہے کہ اُس نے آسمان وزمین پیدا فرمائے۔ جو مخلوقات میں بڑی چیزیں ہیں اور نظروں کے سامنے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ تمہاری حاجت کی چیزیں زمین میں پیدا فرمائیں، زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لئے ہے شرعی قواعد اور قوانین کے مطابق اُس سے نفع حاصل کر سکتے ہو۔ خود زمین انسانوں کے لئے بہت بڑی نعمت اور رحمت ہے اور اس کی سطح پر اور اس کے اندر اَن گنت چیزیں ہیں۔ انسان ان سب سے منتفع ہوتے ہیں۔ سورۂ رحمٰن میں ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور سورۂ ملک میں هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ. (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو تمہارے قابو کی چیز بنا دی، لہٰذا اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور تمہیں اُسی کی طرف موت کے بعد اُٹھ کر جانا ہے)

زمین سے نکلنے والے چھوٹے بڑے درخت، پھل، میوے، معدنیات اور طرح طرح کی چیزیں جن کی گنتی بیان سے باہر ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں انسان ان کو استعمال کرے اور ان کے پیدا کرنے والے کا شکر گزار ہو۔ بعض وہ چیزیں جن میں بظاہر ضرر نظر آتا ہے وہ بھی بعض حالات میں نافع اور مفید ہیں۔ سانپ، بچھو اور سنکھیا تک سے دوائیں بنائی جاتی ہیں۔ البتہ نفع مند بنانے کی تدبیریں ہیں وہ بھی اللہ جل شانہٗ نے ذہنوں میں ڈالی ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے الّا یہ کہ دلیل حُرمت اور استعمال کی ممانعت کسی شرعی دلیل سے ثابت ہو جائے اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس طرح استعمال کے طریقے سیکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شرعی قوانین کے مطابق استعمال کیا جائے مثلاً کوئی شخص کسی کی ملکیت غصب نہ کرے اور نافع چیز کو اپنے لئے ضرر کی چیز نہ بنا لے۔ حرام چیزیں استعمال نہ کرے جس کے فروع اور مسائل جزئیہ بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت سے اور سورۂ حٰمٓ سجدہ کی آیت...... قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ. الآیة سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پہلے

پیدا فرمائی اور اس کے بعد آسمان کی طرف توجہ فرمائی۔ جو دھواں تھا اُس کے سات آسمان بنا دیئے اور سورۃ النازعات میں فرمایا ہے: رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا. وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا. وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (یعنی آسمان کی چھت کو بلند فرمایا اور اس کو ٹھیک بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اُس کے دن کو ظاہر فرمایا اور اُس کے بعد زمین کو پھیلایا)۔

ان سب آیات کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اول زمین کا مادہ بنایا اور اس کے اُوپر بھاری بھرکم پہاڑ پیدا فرمائے پھر سات آسمان بنا دیئے جو بنانے سے پہلے دھوئیں کی صورت میں تھے اس کے بعد زمین کو موجودہ صورت میں پھیلا دیا۔ قال النسفی فی المدارک ولا یناقض ھذا قولہ والارض بعد ذلک دحٰھا لان جرم الارض تقدم خلقہ خلق السماء واما دحوھا فتأخر (ص ۳۹ ج ۱)۔

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، یعنی آسمان کا مادّہ جو دُھوئیں کی صورت میں تھا جس کا ذکر سورۂ حٰم سجدہ میں ہے وَهِيَ دُخَانٌ اس کے سات آسمان بنا دیئے اور خوب اچھی طرح بنائے، ٹھیک بنائے، دُرست بنائے۔ اُن میں نہ کجی ہے، نہ پھٹن ہے، نہ شگاف ہے، نہ کسی قسم کا کوئی نقص ہے۔ ساتوں آسمان جو اُوپر نیچے تہ بتہ بنے ہوئے ہیں ان میں کسی قسم کا کوئی خلل نہیں۔ سورۂ ملک میں فرمایا:

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ. (اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے جس نے تہ بتہ سات آسمان پیدا فرمائے تو خدا کی خالقیت میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا سو نگاہ ڈال کر دیکھ لے کیا تو اِس میں کوئی خلل دیکھ رہا ہے؟)

سورۃ قٓ میں فرمایا:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ. (کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف اپنے اوپر ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اس کو زینت دے دی اور اُس میں کوئی شگاف نہیں ہے۔)

سورۂ بقرہ کی آیت بالا کے آخر میں فرمایا: وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے) اتنے بڑے آسمان اتنی بڑی زمینیں اور اُن میں جو کچھ اب ہے جو کچھ آئندہ ہوگا جو کچھ پہلے تھا اور اُن کے سوا بھی جو کچھ ہے اُن سب کا اس کو پورا پورا علم ہے۔ جو انسان اور جنات دنیا میں آئے اُن کے لئے ہدایت بھیجی اُن میں مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی، فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی، ہدایت قبول کرنے والے بھی ہیں اور اُس سے منہ موڑنے والے بھی۔ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک کے عقیدہ اور عمل کا علم ہے۔ ہر ایک کے عقیدہ اور عمل کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں زمین میں خلیفہ، فرشتوں نے عرض کیا آپ پیدا فرمائیں گے زمین میں جو اُس میں فساد کرے گا

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور خونوں کو بہائے گا اور ہم آپ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو حمد کیساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت آدمؑ کی خلافت کا اعلان اور فرشتوں کی معروض

اِنسان کی تخلیق سے پہلے اِس زمین میں جنات رہتے تھے۔ وہ آگ سے پیدا کئے گئے تھے ان کے مزاج میں شر ہے، زمین میں بہت

فساد کرتے رہے اور خون بہاتے رہے، اللہ جل شانہ نے زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے جنات کا حال دیکھ رکھا تھا انہوں نے سمجھا کہ زمین کا مزاج ایسا ہی ہے کہ جو اس میں رہے گا فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ گویا فرشتوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہونے والے خلیفہ میں تین قوتیں ہوں گی۔ (جن کا وجود خلافت کے لئے ضروری ہے) یعنی قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضبیہ، جو فساد اور خون خرابے پر آمادہ کرنے والی ہیں اور قوتِ عقلیہ جو معرفت باللہ اور طاعت اور فرمانبرداری پر آمادہ کرنے والی ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ پہلی دو قوتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسا خلیفہ پیدا نہ کیا جائے جس میں دونوں موجود ہوں اور قوتِ عقلیہ کے جو تقاضے ہیں یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اور تسبیح و تقدیس و تحمید ہم اس میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے اس سے پہلے ایسی کوئی مخلوق نہیں دیکھی تھی جس میں متضاد قوتیں جمع ہوں اور اُن کے مجموعہ سے ایسی طبیعت پیدا ہو جائے جس سے خیر کا مظاہرہ ہو۔ عفت بھی ہو، شجاعت بھی ہو۔ عدل و انصاف بھی ہو۔ اہل شر کی سرکوبی پر قدرت بھی ہو اور پہلی دو قوتیں مہذب ہو کر قوتِ عقلیہ کے تابع ہو جائیں۔ لہٰذا وہ سوال کر بیٹھے انہوں نے پہلی دو قوتوں کے بارے میں الگ الگ غور کیا، اور یہ نہ غور کیا کہ قوتِ عقلیہ کے ساتھ اِن دونوں کے ملنے سے کیا کچھ کمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ فرشتوں نے لفظ خلیفہ سے یہ بات نکال لی کہ اس دُنیا میں فسادی لوگ ہوں گے کیونکہ خلیفہ کی ضرورت ہی اس لئے ہے کہ اصلاح کی جائے اور اصلاح جبھی ہوگی جب فساد ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے بطورِ تعجب یہ عرض کیا کہ کیا آپ اپنی زمین میں ایسا خلیفہ بنائیں گے جو نافرمانی کرے گا، لفظ خلیفہ سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ زمین میں فساد کرنے والے ہوں گے وہاں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصلاح کرنے والے بھی ہوں گے لیکن اُنہوں نے معصیت کا حکم سب پر لگا دیا۔ جو صحیح نہیں تھا۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بتا دیا تھا کہ زمین میں ایسی مخلوق ہوگی جو فساد کرے گی اور خون بہائے گی۔ اِس لئے انہوں نے وہ بات کہی جو اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ میں ذکر فرمائی۔ فرشتوں نے جو کچھ کہا وہ بطورِ اعتراض نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کفر ہے اور فرشتے کفر سے اور ہر طرح کی معصیت سے بری اور معصوم ہیں۔ کما قال تعالى لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (سورۃ الانبیاء) اور فرمایا لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ (سورۃ تحریم) راجع فی ذلک کله القرطبی و البیضاوی۔

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ہم آپ کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر عیب اور ہر نقص سے آپ کی تنزیہ کرتے ہیں اور یہ تسبیح حمد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ یعنی تسبیح کے ساتھ آپ کی حمد بھی کرتے ہیں اور ہر کمال سے آپ کو متصف جانتے ہیں اور اس کو بیان کرتے ہیں، نُسَبِّحُ کے ساتھ نُقَدِّسُ لَكَ بھی مذکور ہے۔ یہ لفظ تقدیس سے مشتق ہے۔ تسبیح اور تقدیس کا معنی تقریباً ایک ہی ہے اور تفسیر قرطبی میں حضرت مجاہد تابعی سے نُقَدِّسُ کا معنیٰ یوں نقل کیا ہے.......

ای نعظمک و نمجدک و نطهر ذکرک عما لا یلیق بک مما نسبک الیه الملحدون. (یعنی ہم تیری عظمت اور بزرگی بیان کرتے ہیں اور تیرے ذِکر کو ہر اُس چیز سے پاک کرتے ہیں جس کی نسبت ملحدوں نے تیری طرف کی ہے۔)

نُقَدِّسُ لَكَ۔ کا ایک معنی مفسر بیضاوی نے یوں لکھا ہے۔ نطهر نفوسنا عن الذنوب لاجلک. (یعنی ہم اپنی جانوں کو آپ کی رضا کے لئے پاک و صاف رکھتے ہیں گناہوں میں ملوث نہیں ہیں)۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیئے سارے نام، پھر ان کو فرشتوں پر پیش فرمایا، پھر فرمایا کہ مجھے بتا دو ان چیزوں کے نام

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

اگر تم سچے ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام بتا کر فرشتوں سے سوال فرمانا

جس نئی مخلوق کے پیدا فرمانے اور زمین میں خلیفہ بنانے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا وہ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی ذریت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اول تو پتلا بنایا گیا پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ اور جب یہ جاندار چیز بن گئی اور جاننے اور پہچاننے کے قابل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ساری چیزوں کے نام بتادیئے پھر اُن چیزوں کو فرشتوں پر پیش فرمایا جن کے نام حضرت آدم علیہ السلام کو بتادیئے تھے اور فرمایا تم مجھے ان کے نام بتادو اگر تم سچے ہو۔

مفسر بیضاوی لکھتے ہیں ...... فی زعمکم انکم احقاء بالخلافۃ لعصمتکم و ان خلقھم و استخلافھم و ھذہ صفتھم لا یلیق بالحکیم وھو و ان لم یصرحوا بہ لکنہ لازم مقالھم مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے خیال میں اور اس بات میں سچے ہو کہ خلافت کے زیادہ حقدار تم ہو کیونکہ تم معصوم ہو، اور یہ کہ ایسی مخلوق کا پیدا کرنا اور خلیفہ بنانا جس کی صفت فساد فی الارض اور سفک دمـــاء ہو شانِ حکیم کے لائق نہیں تو تم ان چیزوں کے نام بتادو، یہ بات کہ ہم بنسبت نئی مخلوق کے خلافت کے زیادہ مستحق ہیں صاف طور سے اُنہوں نے نہیں کہی تھی لیکن ان کے قول سے یہ بات بطورِ لزوم کے نکلتی ہے۔

لفظ آدم کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ عجمی لفظ ہے۔ جیسے آذر اور شامخ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ عربی لفظ ہے جو اُدْمَۃٌ سے مشتق ہے۔ عربی میں یہ مادہ گندم گونی رنگ کے معنی دیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام بتادیئے تھے حتیٰ کہ چھوٹے بڑے پیالے کا نام بھی بتادیا تھا۔ جب فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر ان کے نام پوچھے تو وہ عاجز رہ گئے (اور سوال ہی ان کا عجز ظاہر کرنے کیلئے کیا گیا تھا) اور اس طرح سے اللہ جل شانہ نے نئی مخلوق کی فضیلت ثابت فرمادی اور بتادیا کہ اِس نئی مخلوق میں صفت علم ایک ایسی بڑی چیز ہے جس کی وجہ سے زمین میں خلافت قائم کی جاسکتی ہے اور باقی رکھی جاسکتی ہے بغیر علم کے خلافت نہیں چل سکتی بلکہ کوئی بھی کام علم کے بغیر صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ صحیح عمل کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہے اور صفتِ علم میں یہ نئی مخلوق تم سے بڑھ کر ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں ہمیں اُس کے سوا کچھ علم نہیں جو آپ نے ہمیں سکھایا، بے شک آپ جاننے والے ہیں حکمت والے ہیں۔

فرشتوں کا عجز اور اقرار

جب فرشتوں نے دیکھ لیا کہ اس نئی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نواز دیا اور جو علوم اُس کو دیئے ہیں وہ ہم میں نہیں ہیں تو

اُنہوں نے اپنی عاجزی کا اقرار کرلیا اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کے نام نہیں بتا سکتے۔ ہمیں جو کچھ علم ہے اسی قدر ہے جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی کہ آپ نے جو اِس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے آپ ہر عیب اور نقص سے پاک ہیں آپ نے جو کچھ ارادہ فرمایا اُس کے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال اُٹھانا درست نہیں اور آپ علیم ہیں سبھی کچھ جانتے ہیں اور حکیم بھی ہیں آپ کا کوئی ارادہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! انکو ان چیزوں کے نام بتا دو، سو جب اُنہوں نے اُنکو ان چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ بیشک میں جانتا

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

ہوں آسمانوں اور زمین کی غیب کی چیزوں کو اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کا علم و فضل ظاہر ہونا

جب فرشتوں نے اُن چیزوں کے نام بتانے سے اپنے عاجز ہونے کا اظہار کر دیا جو اُن پر پیش کی گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ تم ان کے نام بتا دو، چنانچہ انہوں نے اُن چیزوں کے نام بتا دیئے۔ فرشتوں کی عاجزی کا اور حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا خوب اچھی طرح مظاہرہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو تمہیں توقف کرنا چاہیے تھا اور اس انتظار میں رہنا مناسب تھا کہ اِس نئی مخلوق کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہو جائیں جو اس کے فضل و کمال پر اور اس کے مستحق خلافت ہونے پر دلالت کریں۔ خلیفہ پیدا فرمانے کا اعلان سنتے ہی اشکال کرنا درست نہ تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ جو ظاہر کیا وہ یہ بات تھی جو بطورِ سوال عرض کی تھی کیا آپ پیدا فرمائیں گے جو زمین میں فساد اور خون خرابہ کریں گے، اور جو چھپایا اس سے مُراد یہ ہے کہ ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، انہوں نے یہ بات چھپائی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہ فرمائے گا۔ واللّٰہ اعلم۔

ان آیات سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خلافت کے لئے علم ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کیونکہ اِن کو اُن سے زیادہ علم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے۔ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (کیا برابر ہیں جو جاننے والے ہیں اور جو جاننے والے نہیں ہیں)۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ‌ۖ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو آدم کو، سو اُنہوں نے سجدہ کر لیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا اور ابلیس کا انکاری ہونا

جب آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ ان کو سجدہ کرو۔ حکم تو پہلے سے دیا جا چکا تھا جیسا کہ سورۃ حجر اور سورۃ ص میں ہے۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ o (کہ جب میں اس کو بنادوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا)

لیکن جب اُن کا علم وفضل ظاہر ہو گیا اور سجدہ کرنے کا سبب یعنی آدم کا افضل ہونا معلوم ہو گیا تو حکم سابق کا اعادہ فرمایا تا کہ فرشتے اپنے عمل سے انکی فضیلت کا اقرار کریں اور حکم کے مطابق سجدہ میں گر پڑیں۔ لہٰذا وہ سب آدم کے لئے سجدہ ریز ہوئے اور آدم کی تخلیق سے پہلے ہی جو انہوں نے مفسد اور خون خرابہ کرنے والا کہہ دیا تھا، اس کی بھی تلافی ہوگئی۔

سجدۂ تعظیمی کی بحث اور اس کا حکم ...... یہ تو یقینی طور سے ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ سجدہ عبادت کا نہ تھا کیونکہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ پھر یہ سجدہ کون سا تھا؟ اس کے بارے میں مفسرین نے دو باتیں لکھی ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو تھا اور آدم علیہ السلام کو قبلہ بنایا گیا تھا۔ اُن کو قبلہ بنانے سے بھی اُن کا مرتبہ ظاہر ہو گیا۔

جیسا کہ کعبہ شریف قبلہ ہے اور اس سے اس کی فضیلت ظاہر ہے۔ اور لِاٰدَمَ میں جو لام ہے وہ ایسا ہی ہے۔ جیسے حضرت حسان کے اس شعر میں ہے ؎

الیس اوّل من صلّی لقبلتکم   واعرف الناس بالقرآن والسنن

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ تو آدم علیہ السلام ہی کو تھا لیکن یہ سجدۂ تعظیمی تھا۔ سجدۂ عبادت نہ تھا جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کو سجدہ کیا تھا۔ (بیضاوی)

شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ خواہ کیسا ہی سجدہ ہو، سجدۂ تعظیمی جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کیا وہ اُن کی شریعت میں جائز تھا۔ یہ شریعتِ سابقہ کی بات تھی جو منسوخ ہوگئی۔ حضرت قیس بن سعد (صحابی) رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں شہر حیرہ میں آیا میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے علاقے کے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے دِل میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ میں حیرہ شہر گیا تھا وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو (میرے نزدیک) آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو کیا سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا سو (اب بھی) مجھے سجدہ نہ کرو اگر میں حکم دیتا کہ کوئی شخص کسی کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں اس حق کی وجہ سے جو اللہ نے شوہروں کا عورتوں پر رکھا ہے۔ (سنن ابی ابوداؤد ص ۲۹۱ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہؐ میں سجدۂ تعظیمی کسی کے لئے جائز نہیں، نہ زندہ کو نہ مردہ کو، نہ مرشد کو نہ قبر کو۔ اور حدیث مذکور کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت وارد ہوئی۔ بعض حضرات نے سجدہ تعظیمی کی حرمت پر سورۂ جن کی آیت وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا سے بھی استدلال کیا ہے کہ مساجد مصدر میمی بمعنی سجدات ہے اور اس کا عموم اور اطلاق ہر طرح کے سجدوں کو شامل ہے (ترجمہ یہ ہے کہ بلاشبہ تمام سجدے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی

کو نہ پکارو)

ابلیس کی بدتمیزی اور بدبختی۔۔۔۔۔۔سورۂ حجر میں فرمایا ہے۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السَّاجِدِيْنَ (کہ حکم سن کر فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنیوالوں میں شامل ہو)

اللہ جل شانہ نے جب اس سے سوال فرمایا کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا اور تو نے سجدہ کیوں نہ کیا تو اس پر اُس نے جواب دیا کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (کہ میں اس سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو کیچڑ سے پیدا کیا۔)۔(سورۂ اعراف، سورۂ صٓ)

ابلیس ملعون نے نہ صرف یہ کہ حکم کی تعمیل نہ کی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو غلط بتایا اور اعتراض کر بیٹھا کہ آپ نے افضل کو حکم دیا کہ غیر افضل کو سجدہ کرے یہ حکمت کے خلاف ہے۔ اُس نے اپنے خیال میں آگ کو مٹی سے افضل سمجھا اس لئے جو آگ سے پیدا ہُوا ہے اس کو بھی مٹی سے پیدا شدہ شخص سے افضل سمجھ لیا۔ آگ کو مٹی سے افضل سمجھنا ہی اوّل تو غلط ہے۔ آگ میں فساد زیادہ ہے صلاح کم ہے۔ اور مٹی میں سراپا خوبی ہے، جو نافع ہی نافع ہے۔ اور سب سے بڑی جو خوبی کی چیز مٹی میں ہے وہ تواضع اور فروتنی ہے پھر کام کی چیزیں سب زمین ہی سے نکلتی ہیں۔ انسانوں اور جنوں کے رہنے کی جگہ بھی زمین ہی ہے۔ پھل، میوے، غلے، ہرے بھرے باغ، کھیتیاں، سب زمین ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور بہت سی وجوہ سے مٹی کو آگ پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر مؤمن بندے کا کام یہ ہے کہ وہ بات مانے حکم کی تعمیل کرے اگرچہ اپنی سمجھ کے خلاف ہی ہو۔

زبان تازہ کردن باقرار تو نیگیختن علت از کارِ تو!

حکم عالی سن کر اس میں حجت نکالنا کبر اور نافرمانی ہے۔ اللہ جل شانہ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا۔۔۔۔۔۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔ (یعنی ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا، اور وہ پہلے ہی سے اللہ کے علم میں کافروں میں سے تھا) اور بعض مفسرین نے كَانَ بمعنی صَارَ بھی لیا ہے یعنی وہ اب اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہو گیا۔ جب ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا حکم سن کر حجت بازی کی اور حکم الٰہی کو حکمت کے خلاف بتایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ملعون قرار دے دیا یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا اور فرمایا: فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِيْنَ۔ (کہ تو اس سے اُتر تجھ کو کوئی حق نہیں کہ اس میں تکبر کرے سو نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے)۔(سورۃ اعراف) اور فرمایا۔۔۔۔۔۔ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔ (کہ تو اس سے نکل جا کیونکہ بے شک تو مردود ہے اور بیشک تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت رہے گی۔) جو شخص قیامت کے دن تک ملعون رہ گیا اس کے بعد اُس پر رحمت ہو ہی نہیں سکتی پھر تو اس کے لئے دوزخ ہی دوزخ ہے۔ قال تعالیٰ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔(سورۃ ص)

غرض کہ شیطان کو تکبر کھا گیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور مدحور اور ذلیل وخوار ہو گیا۔ اس نے ملعون ہونا گوارا کیا لیکن حکم ماننا اُسے منظور نہ ہُوا۔ تکبر ایسی بُری بلا ہے جو دنیا اور آخرت میں متکبر کا ناس کھو دیتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ سجدہ کا حکم تو فرشتوں کو ہُوا تھا۔ اور ابلیس جن میں سے تھا پھر اس نے سجدہ نہ کیا تو اِس کا مواخذہ کیوں ہوا؟ یہ سوال غلط ہے کیونکہ سورۃ اعراف میں اس کی تصریح ہے کہ اس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ کما قال تعالیٰ مَا مَنَعَكَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (تجھے کس چیز نے روکا اِس بات سے کہ تو سجدہ کرے جبکہ میں نے تجھ کو حکم دیا۔)

اِس تصریح کے بعد اصل سوال تو ختم ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو بالاستقلال الگ سے حکم تھا یا چونکہ فرشتوں کے ساتھ رہتا سہتا اور اُن کے ساتھ عبادت کرتا تھا اس لئے اس کے عموم میں یہ بھی آ گیا تھا یہ دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں۔ والعلم عنداللہ العلیم۔

قرآن مجید سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس عالم بالا میں رہتا تھا جب نافرمانی کی تو وہاں سے اُتر جانے اور نکل جانے کا حکم ہوا۔ وہاں اس کے اعمال واشغال کیا تھے اِس کے بارے میں بعض صحابہؓ اور تابعینؒ سے کچھ باتیں منقول ہیں، جو درِمنثور میں ص ۵۰ ج ا پر لکھی ہیں۔ بظاہر یہ اسرائیلی رِوایات ہیں۔ بہر حال جو بھی کچھ ہو، اس نے اپنا علم بے جگہ استعمال کیا اور غرورِ علم میں اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر دیا اور کفر اختیار کر کے مَردود ہو گیا اور اس سے پہلے جتنی بھی عبادت کی تھی سب اکارت گئی ؎

مارا گیا شیطان ایک سجدہ کے نہ کرنے سے — ہزاروں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

ابلیس کی بنی آدم سے دشمنی ...... سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ...... یٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى . (اے آدم بلاشبہ یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے سو یہ ہرگز تم کو جنت سے نکال نہ دے۔ پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے)۔ اور ابلیس نے قسم کھائی کہ میں آدمؑ کی ذریت کا ناس کھودوں گا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ابلیس نے کہا ...... لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (میں ضرور ضرور اس کی ذریت کو اپنے قابو میں کرلوں گا بجز تھوڑے لوگوں کے) اِس مضمون کی تکمیل ان شاءاللہ سورۂ اعراف کے دوسرے رکوع کی تفسیر سے کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کے جنت میں رہنے اور شیطان کے بہکانے کا ذِکر ہے جو ابھی آتا ہے ان شاءاللہ تعالیٰ۔ ابلیس کا پرانا نام عزازیل تھا۔ جب ملعون ہو گیا تو اس کا نام ابلیس رکھا گیا، اور شیطان بھی کہا جانے لگا۔ شیطان کا معنی ہے، بہت زیادہ شریر یہ سب سے بڑا شیطان ہے اور اِس کی ذرّیت بھی شیطان ہے اور بہت سے اِنسان بھی شیطانوں کا کام کرتے ہیں۔ اِس لئے شیاطین الانس والجن فرمایا گیا ہے۔

وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہا کرو اور اس میں سے خوب اچھی طرح کھاؤ، جہاں سے چاہو، اور نہ قریب جانا اس

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

درخت کے ورنہ تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور اُنکی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم اور ایک خاص درخت سے بچنے کی ہدایت

اس آیت شریفہ میں یہ فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم دیا اور خوب بافراغت اچھی طرح کھانے کا کُھلا اختیار دے دیا۔ لیکن خاص ایک درخت کے بارے میں فرمایا کہ اس کے پاس نہ پھٹکنا۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس میں سے مت کھانا لیکن بطور مبالغہ اچھی طرح اہتمام کے ساتھ اس سے بچنے کے لئے یہ فرمایا کہ اس کے پاس بھی نہ جانا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر تم نے اِس میں سے کھا لیا تو ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے۔ اس سے دو طرح کا ظلم مُراد ہوسکتا ہے۔ اوّل: تو یہ کہ اس کے کھانے سے جو ممانعت کی خلاف ورزی ہوگی، یہ گناہ ہوگا اور ہر گناہ، گناہ کرنے والے کے لئے وبال ہے اور وہ اس کی وجہ سے مستحق سزا ہے۔ دوم یہ کہ

جب خلاف ورزی کرلو گے تو یہاں جن نعمتوں میں رَہ رہے ہو سلب ہو جائیں گی اور یہاں سے نکلنا پڑے گا اور یہ بھی اپنی جان پر ظلم ہوگا۔

شجرہ (درخت) جس کے کھانے سے منع فرمایا تھا وہ کون سا درخت تھا؟ اس بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر صحابہؓ سے منقول ہے کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا۔ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ کھجور کا درخت تھا۔ (یہ اقوال تفسیر درمنثور میں ص ۵۲، ۵۳ ج ا پر درج ہیں)

صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ وہ کون سا درخت تھا، ہمیں معین طریقہ پر اس کا علم یقینی نہیں ہے اور اس میں مضائقہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس کے جاننے پر کوئی حکم شرعی موقوف نہیں ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ

سو شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کے ذریعہ سے لغزش دی، سو ان دونوں کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے، اور ہم نے کہا اُتر جاؤ، تم میں سے

وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

بعض بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا ہے اور ایک زمانہ تک نفع حاصل کرنا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام وحواء کو شیطان کا بہکانا اور جنت سے نکالا جانا

اللہ جل شانہٗ نے آدم علیہ السلام سے فرما دیا تھا کہ دیکھو، یہ ابلیس تمہارا دشمن ہے تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے یعنی جنت سے نکال دیئے جانے کا ذریعہ نہ بن جائے، اُدھر شیطان نے بھی دُشمنی پر کمر باندھ لی تھی اور حضرت آدمؑ اور اُن کی بیوی اور اُن کی ذرّیت کو تکلیف پہنچانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اس تاک میں رہا کہ ان کو کسی طرح جنت سے نکلواؤں اور یہاں کی نعمتوں سے محروم کروں۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ ان کو ایک درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا ہے اگر کسی طرح ان سے اِس ممانعت کی خلاف ورزی کرا دوں تو ضرور ان پر عتاب ہوگا۔ جو یہاں سے نکالے جانے کا سبب بنے گا۔ چنانچہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ دیکھو تم کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا گیا ہے کہ جو کوئی شخص اس درخت میں سے کھالے گا وہ ہمیشہ یہیں رہے گا۔ اور جو بادشاہی یہاں حاصل ہے اس میں کبھی ضعف نہ آئے گا، اور اس نے یہ بھی کہا کہ تم دونوں کو تمہارے رب نے اِس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کو کھا کر فرشتے ہو جاؤ گے اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔

(فی سورۃ الاعراف) مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ (او فی سورۃ طٰہٰ) يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔ اور اس نے صرف معمولی طور پر ہی ترغیب نہیں دی، بلکہ دونوں میاں بیوی سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تمہارے لئے خیر خواہی کا مشورہ دینے والا ہوں۔ (کما فی سورۃ الاعراف) وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۔ شیطان کے سمجھانے بجھانے اور قسم کھانے سے دونوں میاں بیوی نے اُس درخت میں سے کھا لیا جس سے منع فرمایا گیا تھا اور وہ ان کو فریب دے کر نیچے اُتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ اس درخت کو چکھنا تھا کہ جنت کے کپڑے ان کے تن سے جدا ہو گئے اور دونوں کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہو گئیں اب تو جنت کے پتے اپنے جسموں پر جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں مذکور ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے ان کو پکار کر فرمایا کیا میں نے تم کو اس

درخت سے منع نہ کیا تھا اور کیا میں نے یہ نہ کہا تھا کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ دونوں فوراً گناہ کے اقراری ہوئے اور مغفرت طلب کرنے لگے۔ اس کا ذکر سورۂ اعراف میں ہے اور ابھی فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کی تفسیر میں بھی ان شاءاللہ ان کی توبہ کا ذکر آئے گا۔

یہاں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ شیطان نے اُن کو کس طرح بہکا دیا اور وسوسہ کیسے ڈالا۔ جبکہ وہ وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مفسر بیضاوی نے یہ احتمال لکھا ہے کہ اعزاز کے طور پر اس کا وہاں رہنا اور داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ایسی مضبوط ممانعت نہ ہوئی تھی کہ بالکل ہی داخل نہ ہو سکے، چونکہ حضرت آدم وحواء کا ابتلاء اور امتحان مقصود تھا اس لئے وسوسہ کے لئے داخلہ کا موقع دیا گیا۔ اور ایک احتمال یہ لکھا ہے کہ دروازہ کے قریب کھڑے ہو کر وسوسہ ڈالا۔ (لیکن یہ دونوں باتیں اس پر مبنی ہیں کہ وہ جنت سے نکالا گیا تھا اور ابھی زمین پر نہیں آیا تھا۔) ان کے علاوہ دُوسرے اقوال بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ جو بھی صورت ہو اُس نے وسوسہ ڈالا اور بہکایا اور انہوں نے اس کی بات پر عمل کیا۔ جس کی وجہ سے زمین پر آنا پڑا، تکوینی طور پر جو اُن کو زمین پر بھیجنا اور خلیفہ بنانا پہلے سے طے تھا شیطان کا بہکانا اور اُن کا درخت میں سے کھالینا زمین پر آنے اور رہنے اور بسنے کا سبب بن گیا۔

جب درخت کھانے کا واقعہ پیش آ گیا تو اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ تم یہاں سے اُتر جاؤ، زمین میں جا کر رہو وہاں تم میں بعض بعض کے دشمن ہوں گے اور زمین میں تم کو ٹھہرنا ہے اور ایک زمانہ تک نفع حاصل کرنا ہے۔ اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ آدم اور حواء اور ان کی ذریت کو قیامت تک دُنیا میں رہنا ہے جس کا وقت مقرر ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اُن میں سے ہر شخص کو اپنی موت آنے تک زمین پر رہنا ہے اور تھوڑا بہت نفع حاصل کرنا ہے۔

یہاں لفظ اِهْبِطُوْا (تم اُتر جاؤ) جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جب دو آدمی تھے تو جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا؟ اس کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ حضرت آدم وحواء اور ابلیس، تینوں کو خطاب ہے (ابلیس ابھی تک آسمانوں میں تھا، زمین پر نہیں آیا تھا) اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ صیغہ جمع اس لئے لایا گیا کہ حضرت آدم اور حضرت حواء اور اُن کی ذرّیت کا مجموعہ مُراد ہے۔ یہ دونوں اُتارے گئے تو ساری ذرّیت اُتاری گئی، گو ابھی موجود نہ تھی، یہ دوسری بات زیادہ اولیٰ و اَقرب ہے کیونکہ سورۂ طٰہٰ میں تثنیہ کا صیغہ اِهْبِطَا لایا گیا ہے۔ اور ابلیس کو مستقل وہاں سے اُترنے اور نکلنے کا حکم پہلے دیا جا چکا تھا جو سورۂ اعراف میں مذکور ہے۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہوں گے) اِس سے بنی آدم کی آپس کی دُشمنیاں بھی مُراد ہو سکتی ہیں اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان تمہارا دشمن رہے گا اور تم اس کے دشمن ہو گے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

اس کے بعد آدم نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کر لئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ خوب زیادہ توبہ قبول فرمانے والا ہے بڑا مہربان ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا توبہ کرنا اور توبہ قبول ہونا

حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی سے جو خطا ہو گئی اس کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ ندامت تھی۔ اللہ جل شانہ کی طرف سے ان کو چند کلمات بتائے گئے کہ اُن کے ذریعے توبہ کریں، یہ کون سے کلمات تھے بعض مفسرین نے فرمایا کہ سورۂ اعراف میں جو اُن کی توبہ کے الفاظ مذکور ہیں وہی مراد ہیں یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ضرور ضرور ہم خسارے والوں میں سے ہو

جائیں گے)

اِن الفاظ میں متکلم مع الغیر کا صیغہ استعمال فرمایا جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام دونوں ہی نے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ توبہ کی۔ حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوئے تھے وہ یہ الفاظ تھے:

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ. (اے اللہ میں آپ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور آپ کی حمد بیان کرتا ہوں اور آپ کا نام بابرکت ہے اور آپ کی شان بلند ہے اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، لہٰذا مجھے بخش دیجئے بے شک آپ کے علاوہ کوئی بھی گناہ کو نہیں بخش سکتا) جو بھی الفاظ ہوں اللہ تعالیٰ نے اُن کو توبہ کے الفاظ بتائے اُنہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے توبہ کے الفاظ خود ہی القاء فرمائے اور اُن کی توبہ قبول فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ وہ توبہ قبول فرمانے والا اور بہت بڑا مہربان ہے جب کبھی بھی کوئی شخص ندامت کے ساتھ رجوع کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ قبول فرمائے گا۔

سورۂ شوریٰ میں اِرشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ. (اور اللہ وہ ہے کہ جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو)۔ معافی اور مغفرت تو ہوگئی لیکن جنت میں واپس نہیں بسایا گیا کیونکہ تکوینی طور پر اُن کو پہلے ہی سے دُنیا میں بھیجنا اور خلیفہ بنانا طے تھا اُن کے دُنیا میں آنے کی وجہ سے بہت کثیر تعداد میں اُن کی ذرّیت کے افراد مرد اور عورت ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے مستحق جنت ہوئے۔ یہ بنی نوع انسان کا بہت بڑا فائدہ ہوا۔ اگر وہ دونوں جنت ہی میں واپس کر دیئے جاتے تو وہاں کی نعمتوں سے وہی منتفع اور متمتع رہتے اور اگر بالفرض وہاں اولاد ہوتی تو وہ اعمالِ صالحہ کی محنت اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی مشقت کے بغیر ہی نعمتوں میں رہتی اور نعمتوں کی زیادہ قدر نہ ہوتی اپنی محنت سے جو چیز حاصل ہو اور دُکھ تکلیف کے بعد جو نعمتیں ملتیں اُن کا مزہ اور کیف اور ہی ہوتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا

ہم نے کہا تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا تو اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ

هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع ۴ / ۱۰

وہ رنجیدہ ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیتوں کو جھٹلایا، یہ لوگ دوزخ والے ہیں یہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

ہدایت قبول کرنے والوں کے لئے انعام اور کافروں کیلئے دوزخ کا داخلہ

اس سے پہلے حکم اِهْبِطُوْا (اُتر جاؤ) پہلی آیت میں مذکور ہے۔ اس کو دوبارہ لانا یا تو تاکید کے لئے ہے یا پہلا حکم یہ بتانے کے لئے تھا کہ تم یہاں سے جاؤ جہاں جا رہے ہو، مصیبت کی جگہ ہوگی، آپس میں دشمنی ہوگی اور وہاں تھوڑی مُدت رہنا ہوگا، ہمیشگی نہ ہوگی اور دوسرا حکم یہ بتانے کے لئے ہے کہ جہاں تم کو بھیجا جا رہا ہے وہ دار التکلیف ہے۔ وہاں قیام کرنے کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھو اور یہیں سے سمجھتے جاؤ کہ تمہارے خالق اور مالک کی طرف سے وہاں ہدایات آئیں گی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر آئیں گے اِس کی کتابیں نازل ہوں

گی۔ اُن پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لانا ہوگا اور اُن کی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق زندگی گزارنی ہوگی جو ہدایت کا اتباع کریں گے ان کے لئے یہاں واپس آ کر خیر ہی خیر ہے نہ اُنہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی رنج لاحق ہوگا۔ سورۂ طٰہٰ میں یوں فرمایا ہے فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (کہ جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا، سو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی ہوگا)۔ اور جو لوگ کفر اختیار کریں گے اور میری آیات کو جھٹلائیں گے یہ نار (آگ) والے ہوں گے یعنی دوزخ میں جائیں گے جس طرح اہلِ ایمان ہمیشہ جنت میں رہیں گے اسی طرح یہ اہل کفر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

فوائدِ ضروریہ متعلقہ واقعہ حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم وحوا علیہما السلام اور اُن کے دشمن ابلیس ملعون کے مذکورہ واقعہ سے بڑے بڑے اہم نتائج اور فوائد معلوم ہوئے۔

انسان کو خلافتِ ارضی کے لئے پیدا فرمایا...... (۱) اللہ جل شانہ نے انسان کو خلافتِ ارضی کے لئے پیدا فرمایا۔ اُس پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کا خلیفہ بن کر رہے۔ اِس کے احکام پر خود بھی عمل کرے اور اپنے زور و طاقت سے احکام الٰہیہ کو نافذ کرے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو صاحبِ اقتدار بنانا واجب ہے جو احکامِ الٰہیہ پر عمل کرا سکتا ہو جو لوگ قرآن کو نہیں مانتے وہ تو اس واجب پر کیا عمل کریں گے جنہیں قرآن کے ماننے کا دعویٰ ہے وہ بھی احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ کے حق میں نہیں ہیں۔ دُنیا کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے لیکن قوانینِ شریعت نافذ کرنے کے لئے تیار نہیں، اس سے جان چراتے ہیں۔ دُشمنانِ اسلام کے ترتیب دیئے ہوئے ظالمانہ قوانین کو کورٹ اور کچہری میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ شرعی قوانین سے بہت سے دُنیاوی منافع اور نفس کی لذتوں پر زد پڑتی ہے اس لئے اللہ کی خلافت سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور خلیفۃ اللہ نہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ جو ممالک مسلمانوں کے زیرِ اقتدار ہیں فسادات وہیں زیادہ ہیں۔ قتل وخون کے واقعات بھی اِنہیں ممالک میں بہت زیادہ پیش آتے رہتے ہیں۔ مسلمان ہی مسلمان کو قتل کرتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسا خلیفہ بنائیں جو احکامِ الٰہیہ کو نافذ کرے اور اس بارے میں اس کی مدد کریں اور خلافت کے کام انجام دیں اور فاسق بن کر یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ کا مصداق نہ بنیں۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا اس کے اکثر افراد تو کافر ہی ہیں اور جو اسلام کے مُدعی ہیں اُن میں سے بھی اکثر نافرمانی پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ انسان کی حماقت اور شقاوت ہے۔ اپنے بُلند مرتبہ کو چھوڑ کر دنیا کی ذلت اور آخرت کے عذاب کے لئے اپنی جان کو تیار کر رکھا ہے۔ یہی انسان جس کے سب سے پہلے فرد کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا وہی انسان اپنے کفر کی وجہ سے دوزخ میں جانے کو تیار ہے۔ یہ تو اہلِ کفر ہیں اور جو مسلمان ہونے کے مُدعی ہیں وہ بھی صالحین کے پیچھے نہیں لگتے۔ فاسقوں، فاجروں، بدعقیدہ ملحدوں کو اپنا لیڈر اور قائد بنا لیتے ہیں اور اُنہیں کو اقتدار سونپتے ہیں اور یہ لوگ خود اور صاحبِ اقتدار سب مل کر فساد برپا کرتے ہیں۔ قتل وخون اور لوٹ مار کی خبریں برابر آتی رہتی ہیں۔ رشوت کی گرم بازاری ہے، سودی کاروبار ہیں، سودی لین دین ہے، شرابیں پی جارہی ہیں، زکوتیں نہیں دی جاتیں (بہت کم لوگ زکوٰۃ شرعی قاعدہ کے مطابق دیتے ہیں) لوگوں کے حق مارے جارہے ہیں۔ نمازیں برباد ہیں، رمضان میں کھلے عام سب کے سامنے کھایا پیا جاتا ہے، جانتے بوجھتے گناہ کرتے ہیں اور گناہوں پر اصرار ہے، اپنا مقام بھول گئے اور معصیتوں میں لگ گئے شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آئے کہ پھر تو فرشتوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو نئی مخلوق پیدا ہو رہی ہے وہ فسادی ہوگی اور خون خرابہ کرنے والی ہوگی۔ اِس وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں نے تو تمام افرادِ انسانی کو ہی فساد اور خون خرابہ سے متصف کر دیا تھا انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور عُلماء، شُہداء، عابدین، ذاکرین، قانتین، مجاہدین، حُجاج، حُفاظِ قرآن، مفسرین قرآن، محدّثین، مصنفین، مصلحین و

مرشدین بھی ہوں گے۔ اگر بنی نوع انسان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور خاص کر اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسانوں میں کیسے کیسے اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اصلاح حال کے لئے جانیں وقف کرنے والے اور خلافت الٰہیہ کے فریضہ کو انجام دینے والے گزرے ہیں۔ فرشتوں کے سامنے اہل صلاح وفلاح کے اعمالِ خیر کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اندر یکے بعد دیگرے رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آتے رہتے ہیں اور وہ فجر اور عصر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں۔ جب وہ فرشتے واپس ہوکر اُوپر جاتے ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ رات گزاری تو اللہ تعالیٰ شانہ اُن سے دریافت فرماتے ہیں حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والے ہیں کہ میرے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا؟ وہ عرض کرتے ہیں: **ترکناھم وھم یصلون وا تیناھم وھم یصلون**۔ یعنی ہم نے اُن کو اس حال میں چھوڑا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم اُن کے پاس گئے تھے تو بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ (رواہ البخاری ص ۷۵ ج ۱)

اور یوم عرفہ کو جب حجاج عرفات میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ جل شانہ اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر فخر فرماتے ہیں (**فی حدیث جابر مرفوعا اذا کان یوم عرفة ان اللہ ینزل إلی السماء الدنیا فیباھی بھم الملئکة فیقول انظروا الی عبادی اتونی شعثا غبرا ضاجین من کل فج عمیق. الحدیث. کما فی المشکوٰۃ ص ۲۲۹ عن شرح السنة**) (حضرت جابرؓ کی حدیث میں مرفوعاً منقول ہے کہ جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نُزول فرماتے ہیں اور فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں میرے بندوں کو دیکھو جو پراگندہ بال غُبار آلود اور راستوں میں چلاتے اور مجھے پکارتے میرے پاس آئے ہیں)

یوم عید میں بھی اسی طرح فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کو پیش فرما کر اللہ تعالیٰ فخر فرماتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۲)

علم بہت بڑی دولت ہے: (۲) علم اللہ جل شانہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور بہت بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ اسی کے ذریعہ اللہ جل شانہ نے فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر فرمائی۔ علم ہر حال میں جہالت سے بہتر ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ علم کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں اور خلافت الٰہیہ کے کاموں میں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں خرچ کرنے سے صاحبِ علم کی فضیلت باقی رہتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جن چیزوں کا علم دیا گیا تھا، یہ خلافتِ الٰہیہ کو قائم اور باقی رکھنے کیلئے دیا گیا تھا انسان کو جو بھی علم ملے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے قُرب کا ذریعہ بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو علم مجادلہ پر اُبھارے، راہِ حق سے ہٹائے، وہ علم جہل ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ **ان من العلم جھلا** (یعنی بعضے علم جہالت ہوتے ہیں) کتاب وسنت کے علوم تو باعثِ قُربِ الٰہی ہیں ہی دوسرے علوم بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ بن سکتے ہیں (**قال تعالیٰ**) **وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ** (**وقال تعالیٰ**) **سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ** لیکن حال یہ ہو رہا ہے کہ آفاق وانفس، اشجار واحجار، جبال و بحار سے متعلق جو عُلوم مُنکشف ہو رہے ہیں، انسان ان سے اپنے دُنیاوی اُمور میں منتفع اور متمتع ہوتا ہے لیکن جس نے یہ علوم دیئے ہیں اور یہ منافع پیدا فرمائے اور ان کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل کیا ہے اس کی طرف متوجہ نہیں، یہ لوگ عام طور پر ملحد، کافر اور فاسق فاجر ہی ہیں۔

جو علم میں بڑھ کر ہو اس کی برتری تسلیم کرنی چاہیے: (۳) جب کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اُس کے عالم ہونے کا اقرار کرے اور بغیر کسی پس وپیش کے اپنا عجز ظاہر کردے اور اس میں اپنی خفت محسوس نہ کرے۔ جیسا کہ فرشتوں نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم ظاہر ہوتے ہی اپنے عجز کا اقرار کر لیا، جاہل ہوتے ہوئے علم کا دعویٰ کرنا اور اہلِ

علم سے بحث کرنا بہت بڑی حماقت ہے اور حق منکشف ہونے کے بعد باطل پر جمار ہنا یہ بہت بڑی شقاوت ہے۔

توبہ کی اہمیت اور ضرورت ...... (۴) ...... بندے کا کام یہ ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کرے اور اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع ہو، اپنے گناہ کا اقرار کرے اور مغفرت طلب کرے۔ گناہ پر اصرار نہ کرے اور گناہ کو اپنے لئے وبال سمجھے اور گناہ کو اپنی جان پر ظلم جانے۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے گناہ ہو گیا تھا یعنی وہ درخت کھا لیا تھا جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا اور حضرت آدم ممانعت کو اس وقت بھولے ہوئے بھی تھے۔ (کما فی سورۃ طٰہٰ) وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا جب ان کا مؤاخذہ ہوا تو انہوں نے کوئی حجت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور توبہ کی۔ گو بھول پر مؤاخذہ نہیں ہوتا مگر بھول کے اسباب اختیار کرنے پر مؤاخذہ ہو جاتا ہے اور بڑوں کی بڑی بات ہے اُن کی وہ باتیں بھی گرفت میں آ جاتی ہیں جو دوسروں سے درگزر کر دی جاتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی نے کوئی کٹ حجتی نہیں کی، نہ بھول کا بہانہ بنایا۔ اللہ جل شانہ نے اُن پر رحم فرمایا اور خود ہی ایسے کلمات انکو القاء فرمائے جو قبولیتِ توبہ کا ذریعہ بن گئے۔ قال البیضاوی مجیبًا عما یرد علی العصمۃ انہ فعلہ ناسیًا لقولہ تعالٰی فنسی ولم نجد لہ عزمًا ولٰکنہ عوتب بترک التحفظ عن اسباب النسیان ولعلہ (ای النسیان) ان حطّ عن الامۃ لم یحط عن الانبیاء لعظم قدرھم۔ (قاضی بیضاوی عصمتِ انبیاءؑ پر واقع ہونے والے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے یہ فعل بھولے سے سرزد ہوا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فنسی ولم نجد لہ عزما (یعنی آدم بھول گیا اور ہم نے اس کا ارادہ نہیں پایا) لیکن چونکہ انہوں نے بھول کے اسباب سے اپنا بچاؤ نہیں کیا اس لئے وہ عتابِ الٰہی کے سزاوار ٹھہرے اور ممکن ہے کہ نسیان امت کے حق میں تو معاف ہو لیکن انبیاءؑ کیلئے ان کی شانِ رفیع کے پیشِ نظر معاف نہ ہو)

برخلاف ابلیس شیطان کے اس نے دانستہ طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور نہ صرف خلاف ورزی کی بلکہ حکم ہی کو غلط بتایا اور ذاتِ خداوندی پر اعتراض کر بیٹھا اور اپنی خطا تسلیم نہیں کی۔ دونوں باتوں سے معلوم ہوا کہ گناہ کا اقرار کرنا اور توبہ کرنا معافی کے لئے رونا دھونا، بے چین ہونا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمام صالحین کا جو اپنے باپ آدم کی راہ پر تھے یہی طریقہ رہا ہے اور گناہ کر کے کٹ حجتی کرنا اور اس کو گناہ نہ سمجھنا، گناہ کا اقرار نہ کرنا، ابلیس کا طریقہ ہے جو تمام شیطانوں کا سرغنہ ہے۔ مؤمن بندے جن کو تعلق مع اللہ حاصل ہے اور انابت الی اللہ کی نعمت سے نوازے گئے ہیں وہ تو نہ صرف یہ کہ گناہ ہو جانے پر توبہ کرتے ہیں بلکہ نیکی کر کے بھی استغفار کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے خالق کا حق ادا نہ ہوا۔ گناہ تو بندوں سے ہو ہی جاتا ہے لیکن مغفرت کی طلب میں جلدی کرتے ہیں اور معافی مانگتے رہتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''کل بنی ادم خطاء ون وخیر الخطائین التوابون'' یعنی تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہے جو خوب توبہ کرنے والے ہیں۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی۔ مشکوٰۃ ص ۲۰۴)

پس بنی آدم پر لازم ہے کہ اپنے باپ آدم علیہ السلام کے طریقہ پر چلیں اور ابلیس دشمن کی راہ اختیار نہ کریں۔

تکبّر بُری بلا ہے ...... (۵) ...... تکبر بہت بُری بلا ہے۔ یہ صفت انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ ابلیس علیہ اللعنۃ نے تکبر کیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہ مانا اور اُس کو خلافِ حکمت قرار دیا، تنبیہ کرنے پر بھی اپنے انکار پر اڑا رہا، ملعون اور مطرود اور مدحور ہونا گوارا کر لیا لیکن حکمِ خداوندی کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس نے یہ تو کہا کہ میری زندگی دراز کر دی جائے اور مجھے مہلت دی جائے (اور اس میں شر کا پہلو تھا کیونکہ درازئ عمر سے کوئی خیر مقصود نہ تھی بلکہ بنی آدم کو بہکانا، ورغلانا، کفر و شرک میں ڈالنا مقصود تھا) اور توبہ کی طرف متوجہ نہ ہوا، جسے اپنی بڑائی کا خیال ہوا اُس سے بڑے بڑے گناہ صادر ہوتے ہیں وہ حق کو ٹھکراتا ہے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کوئی

شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کا کپڑا اچھا ہو اور جوتا اچھا ہو (کیا یہ تکبر ہے؟) آپؐ نے فرمایا: بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے (لہٰذا اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پہننا تکبر نہیں ہے) پھر فرمایا: الکبر بطر الحق و غمط الناس یعنی تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرائے اور اس کے ماننے سے اِنکار کرے اور لوگوں کو ذلیل اور حقیر جانے۔ (رواہ مسلم ص ۶۵ ج ۱)

اِس آفت میں امیر، غریب، عالم، جاہل سب مبتلا ہوتے ہیں اور مصلحین، واعظین، مرشدین کو بھی یہ مرض گھن کی طرح لگ جاتا ہے۔ اپنے اعمال کی رِیا کاری، دُوسروں کی غیبت اور تحقیر، اپنے عمل و فضل کا ظاہر کرنا، حق سامنے ہوتے ہوئے نہ ماننا، گناہ کرنا اور نصیحت و خیر خواہی کرنے والوں سے کٹ حجتی کرنا، مسئلہ غلط بتا کر یا شائع کر کے رجوع نہ کرنا اور غلطی پر اصرار کرتے رہنا اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو پیش آتی رہتی ہیں۔ یہ سب تکبر ہے۔

اللہ جل شانہ کو تواضع پسند ہے۔ ایمان کا کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی اس کی قدر دانی اور شکر گزاری کرتے ہوئے اس کی مخلوق کے ساتھ عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! تواضع اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ اُس کو بلند فرما دیں گے جو اپنے نفس میں تو چھوٹا ہوگا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوگا اور جو شخص تکبّر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو گرا دیں گے۔ وہ لوگوں کے نزدیک کتّے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۴، از بیہقی فی شعب الایمان)

گناہوں کی وجہ سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں...... (۲)...... گناہ نعمتیں چھن جانے کا سبب ہیں۔ آخرت کے مؤاخذہ کے علاوہ دُنیا میں بھی گناہ کی وجہ سے نعمتیں سَلب ہو جاتی ہیں۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام شجرِ ممنوعہ کے کھانے کے سبب جنت سے نکال دیئے گئے اور دنیاوی مصیبتوں میں اُن کو اور اُن کی ذرّیت کو مُبتلا ہونا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ: اِن الرّجل لیحرم الرزق بالذنب یصیبہ یعنی بلاشبہ انسان گناہ کرنے کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ (مستدرک حاکم ص ۴۹۳ ج ۱)

بہت سے لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں بلکہ پوری پوری قومیں اور قبیلے گناہوں میں لت پت ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مصیبتیں دور ہوں اور تنگدستی سے خلاصی ہو لیکن گناہ چھوڑنے کو تیار نہیں بلکہ سمجھانے والے کو آڑے ہاتھوں لے لیتے ہیں اور اُلٹے سیدھے سوال و جواب کرتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں اِرشاد ہے...... وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تکذیب کی تو ہم نے انکے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا)۔

متعدد احادیث میں بعض اعمال پر دُنیا میں مِل جانیوالی سزاؤں کا خصوصی تذکرہ بھی وارد ہوا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا کہ جس قوم میں زنا کا رواج ہو جائے گا وہ قحط کے ذریعہ پکڑی جائے گی اور جن لوگوں میں رشوت عام ہو جائے گی وہ لوگ رُعب کے ذریعہ پکڑے جائیں گے۔ (یعنی ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا جائے گا دشمن سے ڈریں گے، دُور سے کانپیں گے) (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۳)

اور حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود میں سے کسی حد کو قائم کرنا، اللہ کے شہروں میں چالیس رات بارش برسنے سے بہتر ہے۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۸۲)

یعنی ایک حد قائم کرنے کا اِتنا بڑا نفع ہے جو چالیس دِن بارش ہونے کے نفع سے بھی بڑھ کر ہے۔ اب وہ لوگ غور کر لیں جو اللہ کی حدود

نافذ نہیں کرتے اور نافذ ہونے نہیں دیتے۔ وہ اللہ کی عام مخلوق پر رحم کھا رہے ہیں یا ظلم کر رہے ہیں۔ نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس قوم میں کوئی شخص قطع رحمی کرنے والا ہو اُن پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔ (بیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۰)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے مگر ماں باپ کے تکلیف دینے کو معاف نہیں فرماتا جو شخص ایسا کرے اُس کے لئے اِسی دُنیا میں موت سے پہلے سزا دے دیتا ہے۔ (رواہ البیہقی کما فی مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس قوم میں خیانت ظاہر ہوگی ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ رُعب ڈال دے گا۔ اور جس قوم میں زنا کاری کا رواج ہو جائے گا اُن لوگوں میں موت کی کثرت ہو جائے گی اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے اُن کا رزق منقطع ہو جائے گا اور جو لوگ ظالمانہ فیصلے کریں گے اُن میں قتل و خون خوب زیادہ ہوگا اور جو لوگ عہد کی خلاف ورزی کریں گے اُن پر دشمن مسلّط کر دیا جائے گا۔ (رواہ مالک فی الموطا وہو فی حکم المرفوع)

شرم اور حیا اِنسان کا فطری وَصف ہے......(۷)......شرم اور حیا انسان کی فطری صفت ہے اور اس کی خلقت اور جبلت میں داخل ہے۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے جنت میں شجرِ ممنوعہ کھا لیا تو اُن کے جسموں سے جنت کے کپڑے گر پڑے اور دونوں کی شرم کی جگہ ظاہر ہوگئی لہٰذا جنت کے پتے لے کر اپنے جسم پر لگانے لگے تاکہ شرم کی جگہ ڈھک جائے۔ دونوں میاں بیوی تھے پھر بھی آپس میں شرما گئے اور پردہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انسان دنیا میں آیا تو شرم و حیا کو ساتھ لے کر آیا اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے برابر حیا کی تعلیم دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں پیغمبروں کی عادتوں اور خصلتوں میں سے ہیں (۱) حیا، (۲) خوشبو استعمال کرنا، (۳) مسواک کرنا، (۴) نکاح کرنا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب النکاح)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے: **ان الحیاء و الایمان قرناء جمیعا و اذا رفع احدھما رفع الأخر** (اس میں شک نہیں کہ حیا اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں جب ان میں سے ایک اُٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اُٹھا لیا جاتا ہے)۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۲)

ہدایت قبول کرنے پر انعام......(۸)......حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کے آخر میں یہ جو فرمایا......**فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى.** الآیۃ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اِس دُنیا میں صرف جینے اور کمانے، کھانے اور ماں باپ بننے اور اولاد پالنے کے لئے نہیں آیا اس کو یہاں دار التکلیف میں بھیجا گیا ہے اُسے اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پابند کیا گیا ہے اور یہ احکام اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے پہنچتے رہے ہیں۔ ان احکام پر عمل کرنا اُسے واپس جنت میں لے جائے گا۔ اور وہی مقامِ بُلند اور برتر مل جائے گا جہاں سے اُس کے ماں باپ آدم و حوا اِس دُنیا میں آئے تھے۔ جنت اپنے ماں باپ کی جگہ ہے جہاں وہ گئے وہیں ان کی وفادار اولاد پہنچ جائے گی اور ہمیشہ وہاں رہے گی، اور جو لوگ ان کے دِین سے علیحدہ ہوئے انہیں وہ جگہ دوبارہ نصیب نہ ہوگی بلکہ وہ دار العذاب یعنی دوزخ میں جائیں گے۔ اختلافِ دین کی وجہ سے میراث منقطع ہو جاتی ہے جو کافر ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے دین پر نہیں۔ اس لئے وہ مستحق میراث بھی نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے نبی تھے اُن کا دین اسلام تھا۔ اُن کی ذرّیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو پسند فرمایا اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام آتے رہے۔ سب ہی دینِ اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ جو اُن کے دین پر تھا وہ مُسلم ہوا اور جو اُن کے دِین کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔ بنیادی طور پر دینِ اسلام کے تین عقیدے ہیں۔

اوّل......توحید (جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو اُس طرح ماننا داخل ہے جیسا کہ وہ اپنے نزدیک ہے اور جیسا کہ اُس نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ اپنی پہچان کرائی ہے)

دوم......رسالت (یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں پر ایمان لانا اور اس کی کتابوں پر ایمان لانا) اس میں ہر اس بات کی تصدیق آ جاتی ہے جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں نے بتائی۔فرشتوں پر ایمان لانا، تقدیر کو ماننا، جنت، دوزخ کے اَحوال پر ایمان لانا بھی ایمان بالرسالت میں شامل ہے اور اُن سب احکام کا ماننا اور عمل پیرا ہونا بھی داخل ہے جو اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائے۔

سوم......معاد (یعنی مرنے کے بعد زندہ ہونے اور حساب کتاب ہونے اور ایمان و کفر اور اچھے بُرے اعمال کی جزا ملنے اور جنت یا دوزخ میں داخل کئے جانے کا عقیدہ رکھنا)۔

ان تین عقائد کی ہر نبی نے تبلیغ کی ہے البتہ فروعی احکام میں حالات کے اعتبار سے فرق رہا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انا اولی الناس بعیسی بن مریم فی الاولی والاٰخرۃ الانبیاء اخوۃ من علات وامھاتھم شتی و دینھم واحد. (رواہ البخاری ص۴۹۰ ج۱)

یعنی میں عیسیٰ بن مریم سے سب سے زیادہ قریب تر ہوں دُنیا اور عقبیٰ میں، تمام انبیاء کرام علیہم السلام آپس میں علاتی بھائی ہیں یعنی دینِ واحد ہونے میں اس طرح ہیں جیسے باپ ایک ہو اور مائیں کئی ہوں اُن سب کا دین ایک ہے۔

لوگ اپنی جہالت سے سمجھتے ہیں کہ دین اسلام ڈیڑھ ہزار سال سے دُنیا میں آیا ہے، اُن کا خیال اور عقیدہ غلط ہے انسان جب سے دنیا میں آیا ہے دینِ اسلام کے ساتھ آیا ہے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، آخری رسول ہیں۔ آپؐ وہی دعوت لیکر تشریف لائے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام آپ سے پہلے لے کر آئے تھے آپؐ پر نبوت و رسالت ختم ہوگئی لیکن آپ کی دعوت قیامت تک کے لئے ہے۔ اس دعوت کو پہنچانے اور باقی رکھنے کے لئے قرآن مجید باقی ہے اور باقی رہے گا ہر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام قبول کرنے کا مامور ہے۔ کوئی یہودی ہو یا نصرانی، ہندو ہو یا بدھسٹ پارسی ہو، کسی بھی دین کا ماننے والا ہو سب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت دعوت میں شامل ہیں۔ جو آپ پر ایمان لائے گا آخرت میں نجات پائے گا۔ جو منکر ہوگا دوزخی ہوگا۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ۔ (یعنی جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ آخرت میں تباہ کار لوگوں میں سے ہوگا۔ (آل عمران ۳:۸۵)

سورۂ سبا (آیت:۲۸) میں ارشاد خداوندی ہے......

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ خوشخبری سنانے والا ڈرانے والا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

صحیح مسلم (ص ۸۶ ج۱) میں ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: والذی نفس محمد بیدہ لایسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار ۔ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے میرے نبی ہونے کی خبر جس کسی انسان کو بھی پہنچے گی اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے گا جو دین لیکر میں بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا، یہودی ہو یا نصرانی۔)

بنی اسرائیل کا تعارف

چونکہ آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر آ رہا ہے اور کئی رکوع میں ان کی شرارتیں مذکور ہیں اور سورۂ بقرہ کے علاوہ بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ ہے۔ اس لئے بنی اسرائیل کا تعارف مُفصّل کرایا جاتا ہے تا کہ ان سے متعلقہ مضامین کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن اور اولاد ...... حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصل وطن بابل کا علاقہ تھا جہاں نمرود بادشاہ تھا وہاں بُت پرست رہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی بُت پرست تھے آپ نے اُن لوگوں کو حق کی تبلیغ کی اور توحید کی دعوت دی اور اِس سلسلہ میں بہت تکلیفیں اُٹھائیں۔ اُن کی پوری قوم دشمن ہوگئی۔ یہاں تک کہ اُن کو آگ میں ڈالا گیا۔ اُن کے واقعات جگہ جگہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ اُن کی ایک بیوی کا نام سارہ تھا جو اُن کے چچا کی لڑکی تھی اور ایک بیوی کا نام ہاجرہ تھا۔ حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ وہی ہیں جنہیں مکہ معظّمہ کے چٹیل میدان میں بحکمِ الٰہی چھوڑ دیا تھا۔ اُن کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی تھے جو اس وقت گود میں تھے۔ مکہ معظّمہ کے بالکل ابتداءً آباد کرنے والے یہی دونوں ماں بیٹے تھے۔ حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے علاوہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لڑکے تھے جن کے نام البدایۃ والنہایۃ (ص ۱۷۵ ج۱) میں لکھے ہیں۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب علیہ السلام تھے۔ جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے اور اُن کے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، جس کا قصہ سورۂ یوسف میں مذکور ہے۔

بنی اسرائیل مصر میں ...... حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانۂ اقتدار میں مصر میں جا کر رہنے لگے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات ہوگئی تب بھی یہ لوگ مصر ہی میں رہتے رہے پُشتہا پُشت وہاں رہنے سے ان کی نسل بھی بہت زیادہ ہوگئی اور بارہ بھائیوں کی اولاد جو بارہ قبیلوں میں منقسم تھی، مجموعی حیثیت سے اُن کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ان لوگوں کا اصل وطن کنعان تھا جو فلسطین کا علاقہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا اصلی وطن (بابل) چھوڑ کر اور ہجرت فرما کر اِس علاقہ میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد مکہ معظّمہ میں آباد رہی اور بڑھتی رہی اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل اولاً کنعان میں پھر مصر میں آباد ہوگئی ...... جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد پر مشتمل تھی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو اُن لوگوں کا اقتدار میں کچھ حصہ بھی نہ رہا۔

چونکہ یہ لوگ مصر کے اصل باشندے نہیں تھے۔ اجنبی قوم کے افراد تھے اس لئے مصری قوم (قبط) کے افراد ان لوگوں سے بڑی بڑی بیگاریں لیتے تھے اور اُن کو بُری طرح غلام بنا رکھا تھا۔ حد یہ ہے کہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے اور یہ اُن کے سامنے عاجزِ محض تھے اُن کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ غلامی کی ایسی بدترین مثال دُنیا کی تاریخ میں کسی قوم کی نہیں ملتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور دعوت ...... اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ جنہوں نے اس زمانہ کے ظالم اور جابرترین بادشاہ فرعون کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ کا دین قبول کرنے کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے یہ بھی کہا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے، نہ اُس نے دعوتِ حق کو قبول کیا اور نہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیجنے پر راضی ہوا اور اُس نے اعلان کیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے زیادہ بُلند معبود ہوں)۔

بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا ...... بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے راتوں رات مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور سمندر تک

پہنچ گئے۔ جب صبح کو ان کے نکلنے کا فرعون کو علم ہوا تو وہ اپنے لشکر لے کر ان کے پیچھے لگا اور سمندر پر پہنچ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا مبارک سمندر پر ماری جس سے سمندر پھٹ گیا اور اس میں راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے قبیلے اِن راستوں سے پار ہو گئے ان کو دیکھ کر فرعون نے بھی اپنے لشکروں کو سمندر میں ڈال دیا جب فرعون اور اس کا لشکر بیچ سمندر میں آ گیا تو اللہ جل شانہ نے سمندر کو ملا دیا۔ فرعون کا لشکر تو ڈوب گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر سمندر پار ہو گئے۔ فرعون بھی اس عظیم حادثہ میں غرق ہوا اور مر گیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی لاش کو محفوظ رکھا جو اب بھی مصر کے عجائب گھر میں بتائی جاتی ہے۔ عبرت کے لئے اِس کی لاش کو محفوظ فرمایا تاکہ لوگ خدائی کے جھوٹے دعویدار کا انجام دیکھ لیں۔ قال تعالیٰ **فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً** البدایہ والنہایۃ (ص ۲۷۰ ج ۱) میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پا کر سمندر پار ہوئے تو اس وقت ان کی تعداد چھ لاکھ کے لگ بھگ تھی یہ تعداد بچوں اور عورتوں کے علاوہ تھی اور یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں ان لوگوں کے رہنے کی مُدت چار سو چھبیس سال شمسی تھے۔

مصر سے نکل کر چالیس سال میں وطن پہنچے...... بنی اسرائیل سمندر پار تو ہو گئے لیکن اب سوال تھا کہ کہاں جا کر بسیں؟ اپنے ہی علاقہ میں جانا تھا اور وہ علاقہ بہت دُور بھی نہیں تھا آخر وہیں سے ان کے باپ دادے مصر میں آئے تھے اور چند دنوں میں اُونٹوں پر پورا سفر قطع کر لیا تھا لیکن یہ چلے تو ان کے اپنے وطن پہنچنے میں چالیس سال لگ گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستاتے رہے میدان تیہ میں چالیس سال سرگرداں پھرتے رہے (صبح کو جہاں سے چلتے تھے شام کو وہیں پہنچ جاتے تھے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت شریف ملی وہ طور پہاڑ پر توریت شریف لینے گئے تو پیچھے ان لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کر لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو تمہاری بات جب مانیں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے دیکھ لیں۔ اِن کی غذا کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے من اور سلویٰ ملتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، ہم کو سبزی، پیاز، کھیرا وغیرہ چاہیے۔ جب توریت شریف لے کر موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو اُنہوں نے ماننے سے اِنکار کر دیا۔ لہٰذا پہاڑ طور اکھاڑ کر ان پر سائبان کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ یہ واقعات اسی میدان میں پیش آئے۔ جس میں چالیس سال حیران اور سرگردان گزارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہیں وفات ہوگئی۔ اُن کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانہ میں اُن کا علاقہ فتح ہوا اور بیت المقدس میں داخلہ نصیب ہوا۔ ان کو حکم ہوا تھا کہ عاجزی کے ساتھ اور خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے عاجزی کے ساتھ داخل ہوں اُنہوں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ بنی اسرائیل کے یہ واقعات مختلف مواقع میں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل کو یہودی بھی کہا جاتا ہے۔

یہودی مدینہ میں کب آئے؟ یہودی مدینہ منورہ میں کب آئے؟ اس کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اِن کے وطن بیت المقدس کو جب بُخت نصر (مشہور کافر بادشاہ) نے منہدم کر دیا اور وہاں کے رہنے والوں کو جلا وطن کر دیا اور بنی اسرائیل (یہود) میں سے بہت لوگوں کو قید کر لیا تو ان میں سے ایک جماعت نے حجاز کی طرف رُخ کیا ان میں بعض وادی القریٰ میں اور بعض تیماء اور بعض مدینہ منورہ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ یہاں پہلے سے کچھ لوگ بنی جرہم کے اور کچھ بقایا عمالقہ کے آباد تھے۔ اُنہوں نے کھجوروں کے باغ لگا رکھے تھے اور کھیتیاں کرتے تھے۔ یہودی اُن کے ساتھ ٹھہر گئے اور گھل مل کر رہنے لگے پھر یہ بڑھتے رہے اور بنی جرہم اور عمالقہ کم ہوتے رہے یہاں تک کہ اُن کو یہودیوں نے مدینہ منورہ سے نکال دیا اور مدینہ منورہ پوری طرح ان کے تسلّط میں آ گیا اس کی عمارتیں اور کھیتیاں سب اُنہیں کی ہو گئیں اور ایک مُدت تک جس کا علم اللہ ہی کو ہے اسی حال میں یہ لوگ مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ (فتوح البلدان للبلاذری ص ۳۲۹)

بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہودی علماء توریت شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھتے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ آپ کی ہجرت ایسے شہر کی طرف ہوگی جس میں کھجوریں ہوں گی اور وہ دو پتھریلی زمینوں کے درمیان ہوگا لہٰذا وہ شام سے آئے اور اس صفت کے شہر کی تلاش میں نکلے تاکہ اسی شہر میں جا کر رہیں اور مبعوث ہونے والے نبی پر ایمان لائیں اور اُن کا اتباع کریں۔ جب مدینہ منورہ آئے وہاں کھجوریں دیکھیں، تو وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ شہر ہے جس کی تلاش میں ہم نکلے ہیں اور پھر وہیں رہنے لگے۔ (عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار ص ۳۴ ومعجم البلدان للحموی ص ۸۲ ج ۵)

اوس وخزرج کا مدینہ میں آ کر آباد ہونا ...... مدینہ منورہ کی آبادی بہت پرانی آبادی ہے اس کا پرانا نام یثرب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے کے بعد اس کا نام مدینۃ الرسول اور طابہ اور طیبہ معروف ہوگیا اور المدینہ نیز المدینۃ المنورہ کے نام کی زیادہ شہرت ہوگئی۔ یہودیوں کے مدینہ منورہ میں آ کر بسنے کے سالہا سال کے بعد یمن کے دو قبیلے اوس اور خزرج بھی مدینہ منورہ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو مدینہ منورہ میں تین قبیلے یہودیوں کے یعنی (۱) بنی نضیر، (۲) بنی قریظہ، (۳) بنی قینقاع۔ اور دو قبیلے یمن سے آ کر آباد ہونے والوں کے موجود تھے، یعنی اوس اور خزرج۔ یہی دونوں قبیلے ہیں جو بعد میں انصار بنے۔

یہود کے قبیلوں اور اوس وخزرج میں لڑائیاں ...... یہ دونوں قبیلے بُت پرست تھے آپس میں بھی ان کی لڑائیاں ہوتی تھیں اور یہودیوں سے بھی جنگ ہوتی رہتی تھی۔ یہودی اہلِ کتاب تھے اور اہلِ علم سمجھے جاتے تھے جب یمن کے اِن دونوں قبیلوں سے ان کی لڑائی ہوتی تھی تو کہا کرتے تھے کہ ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں ان کا زمانہ آئے گا ہم ان کا اتباع کر کے اور اُن کے ساتھی بن کر تمہارا ناس کھو دیں گے۔

اوس وخزرج کا اِسلام قبول کرنا ...... حج کے موقع پر پہلی مُلاقات میں جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج کے چند افراد پر اپنی دعوت پیش کی تو یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی تشریف آوری کی خبر یہودی دیا کرتے ہیں اور ہمیں دھمکیاں دیتے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تمہیں قتل کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ آگے بڑھ جائیں لہٰذا ہمیں یہ دین قبول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ یہ حضرات مسلمان ہو گئے اور مدینہ منورہ آ کر انہوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور انصار کے دونوں قبیلوں میں اسلام پھیل گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے بارہ نمائندوں نے اگلے سال موسمِ حج میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے مُلاقات کی اور آپ سے بیعت کی اور عرض کیا آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئیں۔

ہجرتِ مدینہ ...... چنانچہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے آپ کی آمد سے پہلے بہت سے صحابہ ہجرت کر کے آ چکے تھے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہیں۔ فتوح البلدان بلاذری ص ۳۰، الروض الانف ص ۱۶ ج ۲، سیرت ابنِ هشام باب عرض رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نفسه علی القبائل کا مطالعہ کیا جائے۔

یہودیوں کا عناد اور قبولِ حق سے انحراف ...... سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہودی یہ جاننے کے باوجود کہ آپ نبی ہیں (اور علامات پوری اُتر رہی ہیں۔ جو نبی آخر الزماں کے بارے میں انہیں معلوم تھیں) مُنکر ہو گئے اور آپ کو نبی رُسول ماننے اور اسلام قبول کرنے سے اِنکار کر دیا اوس اور خزرج کے لوگوں نے جو توجہ دِلائی اور کہا کہ اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو، تم ہی

تو کہا کرتے تھے کہ ایک نبی آئیں گے اور ہم اُن کے ساتھ مل کر تم سے جنگ کریں گے اور تم اُن کی صفات بیان کرتے تھے۔ اب کیوں منکر ہو رہے ہو۔ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سُنی۔ (سیرۃ ابن ہشام اوائل المجلد الثانی) اور بجز چند آدمیوں کے (جن میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا نام زیادہ مشہور ہے) یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور طرح طرح کی باتیں بناتے رہے اور کٹ حجتی پر اُتر آئے، حسد اور دشمنی پر کمر باندھ لی، اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اور عہد توڑتے رہے آج تک اُن کے سارے قبیلوں اور خاندانوں کا یہی حال ہے۔

يٰبَنِيۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡۚ وَاِيَّاىَ
اے بنی اسرائیل تم میرے احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور پورا کرو میرے عہد کو میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو اور صرف مجھ
فَارۡهَبُوۡنِ ۝۴۰
ہی سے ڈرو۔

بنی اسرائیل کو انعامات کی یاد دِہانی

بنی اسرائیل (اسرائیل کی اولاد) اس سے یہودی مراد ہیں۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جو عبرانی زبان کا لفظ ہے اسرائیل کا معنی ہے صفوۃ اللہ یعنی اللہ کا برگزیدہ بندہ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے عبداللہ (اللہ کا بندہ)۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ جن کی اولاد بارہ قبیلوں پر منقسم ہے اور بنی اسرائیل کا خطاب ان سب کو شامل ہے۔ بنی اسرائیل مدینہ منورہ میں اور خیبر میں اور شام میں اور اِن کے علاوہ مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی تھے۔ آپ کی بعثت تو سارے ہی اِنسانوں کے لئے ہے لیکن آپ کے اوّلین مُخاطبین مکہ معظّمہ کے رہنے والے تھے اور وہاں سے ہجرت فرمائی تو مدینہ منورہ میں اوس و خزرج اور یہودیوں کے تینوں قبیلے سامنے تھے اوس اور خزرج تو مسلمان ہو گئے لیکن یہودیوں میں سے صرف چند افراد نے اسلام قبول کیا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو خصوصی خطاب بھی فرمایا ہے اور ان کو اپنے انعامات اور احسانات یاد دلائے ہیں۔ آیت بالا میں یہی ارشاد فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل! میری اِن نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم کو دی ہیں اور میرا عہد پورا کرو میں بھی تمہارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بنی اسرائیل پر جو کچھ تھیں وہ اُن کو جانتے تھے اُنہیں اپنی تاریخ کا پتہ تھا۔ قرآن مجید میں ان نعمتوں کا تذکرہ فرمانے میں جہاں یہود کو نصیحت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی پر ایمان لائیں وہاں سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل بھی ہیں کیونکہ آپ نے کسی سے نہیں پڑھا تھا اہل کتاب کی صحبت نہیں اُٹھائی تھی۔ یہ واقعات آپ کو کہاں سے معلوم ہوئے اس کا جواب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتائے، آپ کا ان چیزوں کی خبر دینا، یہ سب آپ کے معجزات میں شامل ہے۔

وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا

اورایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی، حال یہ ہے کہ یہ کتاب انکی تصدیق کرنیوالی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کتاب کے انکار کرنیوالوں میں پہل کرنیوالے مت بنو اور میری

بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

آیات کے عوض حقیر معاوضہ مت حاصل کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

بنی اسرائیل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت

بنی اسرائیل کو مزید مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اس کتاب پر ایمان لاؤ، جو میں نے نازل کی ہے یعنی قرآن مجید، اور یہ کتاب اس کتاب کے معارض نہیں ہے جو تم کو دی گئی تھی (یعنی توریت شریف) بلکہ یہ کتاب تو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی جس کو تم جانتے ہو اور مانتے ہو جو توریت و انجیل بزمانہ نزولِ قرآن اہلِ کتاب کے پاس تھیں اگرچہ ان لوگوں نے ان میں تحریفات کردی تھیں پھر بھی ان میں نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود تھیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۔(الآیۃ)

جب یہودیوں کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم ہو گیا اور یہ اہلِ علم تھے، اہلِ کتاب تھے۔ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات اپنی کتاب میں پاتے تھے (اور پہچان بھی گئے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی بشارت پہلے سے دی گئی ہے اور ہم جن کے انتظار میں برسہا برس سے مدینہ میں رہ رہے ہیں) تو ان کو سب سے پہلے ایمان لانا لازم تھا۔ اہلِ کتاب کا جو دوسرا فرقہ تھا یعنی نصاریٰ اُن کے پاس سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر بہ نسبت یہودیوں کے بعد میں پہنچی مکہ معظمہ والے بے علم تھے، مُشرک تھے۔ اپنے کفر اور شرک پر اڑے رہے اور ضد اور عناد پر جمے رہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا لیکن یہود کے لئے انکار کا کیا مقام تھا؟ اُن کو فوراً مان لینا تھا اور تصدیق کرنا تھا اور نصاریٰ سے آگے بڑھ کر اسلام قبول کرنا تھا لیکن بجائے اسلام میں آگے بڑھنے کے اُنہوں نے اسلام سے مُنحرف ہونے اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کرنے میں پہل کر لی۔ اِسی کو فرمایا کہ تم اس کتاب کے انکار کرنے والوں میں پہل کرنے والے مت بنو۔ یہاں جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انکار کرنے والوں میں اہل مکہ پہل کر چکے تھے پھر یہود کو "اَوَّلَ كَافِرٍ" کیسے فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سب سے پہلے منکر یہودی ہی بنے تھے۔ کیونکہ اہلِ کتاب کی دو جماعتیں تھیں: یہود اور نصاریٰ، اِن دونوں میں سے یہود کو سب سے پہلے مسلمان ہونا لازم تھا۔ اوّل تو اِس وجہ سے کہ دعوت اُن کو پہلے پہنچی، دُوسرے اِس وجہ سے کہ اُنہوں نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات بخوبی پہچان لی تھیں اور بہ نسبت نصاریٰ کے یہ لوگ اہل العلم تھے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے یہودِ مدینہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے کافر نہ بنو۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے مخاطب یہود مدینہ ہی تھے۔

قال ابن عباس ولا تكونوا اوّل كافر به وعندكم فيه من العلم ما ليس عند غيركم، قال ابو العالية ولا تكونوا اوّل من كفر بمحمد صلى الله عليه وسلم يعنى من جنسكم اهل الكتاب بعد سماعكم بمبعثه واما قوله اول كافر به فيعنى به اوّل من كفر به من بنى اسرائيل لانه قد تقدمهم من كفار قريش وغيرهم من العرب بشر كثير ـ

(تفسیر ابن کثیر ص ۸۳ ج ۱) (ابن عباسؓ فرماتے ہیں اورتم (بنی اسرائیل کو خطاب ہے) سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے نہ بنو جبکہ تمہارے پاس وہ علم ہے جو دوسروں کے پاس نہیں۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ جب تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سن چکے ہو تو اب اہل کتاب میں سے تم سب سے پہلے ان کا انکار کرنے والے نہ بنو۔ اَوَّلَ کَافِرٍ سے بنی اسرائیل کے اوّل کافر مراد ہیں کیونکہ کفار قریش وغیرہ بہت سے عرب ان سے پہلے آپ کا انکار کر چکے تھے)

پھر فرمایا...... وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اور میری آیات کے عوض حقیر معاوضہ مت حاصل کرو)۔ مفسرین نے اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میری آیات پر ایمان لاؤ اور میرے تمام رسولوں کی تصدیق کرو (جس میں حضرت سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی تصدیق بھی شامل ہے) اور حقیر دنیا کے چلے جانے کی وجہ سے ایمان سے نہ رکو، اگر کفر اختیار کئے رہنے میں کچھ منافع نظر آتے ہیں تو ان کو چھوڑو۔ (ابن کثیر)

ساری دُنیا آخرت کے مقابلہ میں حقیر ہی ہے خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ میری آیات میں تبدیل اور تحریف نہ کرو اور کتمانِ حق نہ کرو۔ جیسا کہ اب تک کرتے رہے ہو اور اپنے عوام سے اِس کے ذریعہ دُنیاوی منافع حاصل کرتے ہو۔ وقیل کانوا یاکلون الرشی فیحرفون الحق ویکتمونہ (من البیضاوی) (اور کہا گیا ہے کہ یہود رشوت لیتے تھے اور حق کو چھپاتے اور اس میں تغیر و تبدل کر ڈالتے تھے)

پھر فرمایا...... وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ (کہ صرف مجھ ہی سے ڈرو) درحقیقت خوفِ خدا بہت بڑی چیز ہے۔ کُفر اور شرک اور ہر طرح کے معاصی چھڑانے میں اس کو سب سے بڑا دخل ہے۔ اس کی طرف دوبارہ توجہ دلائی اور بطور تاکید اس کا دوبارہ اعادہ فرمایا۔ مُفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ رہبت سے تقویٰ کی ابتدا ہوتی ہے اور چونکہ ایمان کا حکم عوام وعلماء سب کو ہے اس لئے پہلی آیت کے ختم پر فَارْھَبُوْنِ فرمایا اور دوسری آیت میں جب علماء کو خصوصی خطاب ہوا تو فَاتَّقُوْنِ فرمایا، کیونکہ تقویٰ خوف وخشیت اور رہبت کا منتہیٰ ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور مت ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔

حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ اور حق کو مت چھپاؤ

اس آیت میں بھی علماء یہود کو خطاب ہے یہ لوگ توریت شریف میں تحریف کر چکے تھے اور اس میں سے جو کچھ صحیح باتیں اُن کے پاس باقی تھیں اُن میں بھی خلط ملط کرتے تھے۔ اول تو تعلیم عام نہیں تھی اپنی قوم کے تمام افراد کو دین اور کتاب نہیں سکھاتے تھے اور توریت شریف کے اوراق منتشر کر کے رکھ رکھے تھے تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا جو شخص کوئی بات پوچھتا تو کوئی ایک ورقہ نکال کر اس کا مطلب جو چاہتے بتا دیتے تھے۔ اور پوچھنے والے کو خوش کرنے اور اس سے رشوت لینے کے لئے اس کی مرضی کے مطابق توریت شریف کے مضامین کی تشریح کر دیتے تھے۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامات توریت شریف میں لکھی تھیں اُن کو چُھپاتے تھے۔ اُن کو حکم فرمایا کہ تم حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ، اپنی بنائی ہوئی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرو خود تراشیدہ بات کو حکم خداوندی ظاہر نہ کرو، تم جانتے ہو کہ ہم ایسا کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتے ہو کہ اِس کا کیا وبال ہے۔ پھر بھی ایسی حرکت کرتے ہو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔

نماز اور زکوٰۃ کا حکم

اِس آیت میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز قائم کرنے کا مطلب سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت دونوں کا ذِکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اللہ کا ذکر کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ نفس میں رجوع الی اللہ اور تواضع پیدا ہوتی ہے اور نماز کی برکات اور ثمرات بہت ہیں جو علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ زکوٰۃ سے نفس کی کنجوسی دُور ہوتی ہے اور مال کا خبث بھی دُور ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یعنی نماز با جماعت پڑھو۔ جماعت کی نماز میں بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں۔ ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ با جماعت نماز پڑھنے سے اِس کا ثواب بڑھ جاتا ہے اور ایک نماز کا ثواب ستائیس نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کا حکم تو سبھی کو ہے۔ لیکن یہودیوں کو خصوصی خطاب اس لئے فرمایا کہ ان لوگوں میں حُبِّ جاہ وحُبِّ مال کا مَرض تھا۔ نماز اور زکوٰۃ میں ان دونوں کا علاج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اس لئے فرمایا کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا، مطلب یہ ہوا کہ اب تک جو نماز پڑھتے رہے اب اُس کو چھوڑ و اور اب وہ نماز پڑھو جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے جو رکوع اور سجدہ دونوں پر مشتمل ہے بعض علماء نے اس آیت سے فرض نماز با جماعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور جو حضرات واجب نہیں کہتے اُن کے نزدیک بھی نماز با جماعت بہت زیادہ مؤکد ہے۔ اس آیت شریفہ سے نماز با جماعت کی اہمیت معلوم ہوئی۔ احادیث شریفہ میں بھی اس کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ قسم ہے، اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے بلا شک میں نے اِرادہ کیا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں جو جمع کر لی جائیں پھر نماز کا حکم دوں، تا کہ اذان دی جائے پھر کسی شخص کو حکم دوں جو لوگوں کا اِمام بنے اور میں ان لوگوں کے گھروں کی طرف چلا جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوئے۔ پھر ان کے گھروں کو ان پر جلا دوں۔ (صحیح بخاری ص ۸۹ ج ۱)

ایک حدیث میں اِرشاد ہے کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی جماعت قائم کرتا اور اپنے جوانوں کو حکم دیتا کہ (ان لوگوں کے گھروں میں جو کچھ ہے) آگ سے جلا دیں (جو جماعت میں نہیں آئے)۔ (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص ۹۷)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر پڑھائی اور سلام پھیر کر فرمایا کیا فلاں شخص حاضر ہے؟ حاضرین نے عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا فلاں شخص حاضر ہے؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: بے شک یہ دونوں نمازیں (عشاء اور فجر) منافقوں پر سب نمازوں سے زیادہ بھاری ہیں اور اگر تم کو معلوم ہو جاتا کہ ان دونوں میں کیا اَجر وثواب ہے تو ان دونوں میں حاضر ہوتے اگر چہ گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا۔ اور (فرمایا) کہ بلا شبہ پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح سے ہے اور اگر تم جان لو کہ اس کی کیا فضیلت ہے تو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور بلا شبہ ایک شخص کی نماز دوسرے شخص کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے سے زیادہ پاکیزہ ہے بنسبت تنہا نماز پڑھنے کے، اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے سے زیادہ پاکیزہ ہے اور جتنی بھی زیادہ تعداد ہوگی، اُسی قدر اللہ کو محبوب ہے۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۹۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلاشبہ میں نے اپنا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ نماز جماعت سے صرف وہی شخص پیچھے رہ جاتا تھا جو منافق ہوتا اور اس کا نفاق کھلا ہوا سب کو معلوم ہوتا تھا یا کوئی مریض ہوتا (بلکہ) مریض کا بھی یہ حال تھا کہ دو آدمیوں کے درمیان چل کر آتا تھا۔ یہاں تک کہ نماز میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اور فرمایا کہ بلاشبہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کے طریقے بتائے ہیں اور ہدایت کے طریقوں میں سے یہ بھی ہے کہ مسجد میں نماز پڑھی جائے جس میں اذان دی جاتی ہو۔ (صحیح مسلم ص ۲۳۲ ج ۱)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی تین مرد کسی جنگل یا بستی میں ہوں جن میں نماز باجماعت قائم نہ کی جاتی ہو تو ضرور شیطان ان پر غلبہ پالے گا۔ لہٰذا جماعت کی حاضری کو لازم کرلو کیونکہ بھیڑیا اُسی بکری کو کھا جاتا ہے جو گلہ سے دُور ہو جائے۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۹۶)

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾
کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو، اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم سمجھ نہیں رکھتے۔

مبلّغ اور داعی اپنے نفس کو نہ بھولے

اس آیت میں بھی یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے چونکہ یہ لوگ قرآن کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق جانتے تھے اس لئے پوشیدہ طور پر کبھی کبھی اپنے عوام اور رشتہ داروں کو اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیتے تھے اور خود اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ تفسیر ابن کثیر اور درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات نقل کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی لڑکے کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے جو آپ کی خدمت کیا کرتا تھا آپ تشریف لائے اور اس کے سر کے پاس تشریف فرما ہو گئے اور اُس کو اسلام کی دعوت دی اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو وہاں موجود تھا اس کے باپ نے کہا کہ ابوالقاسم (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لے چنانچہ اُس نے اسلام قبول کرلیا اور آپ وہیں سے یہ کہتے ہوئے تشریف لائے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اسے دوزخ سے بچا دیا۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۱ ج ۱)

اِس کے علاوہ بھی علماء یہود میں بے عملی عام تھی لوگوں کو نماز، روزے کا حکم کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو عار دلائی اور فرمایا کہ جو خیر کا حکم کرے اُسے خیر میں دوسروں سے آگے بڑھنا چاہیے۔ (قالہ ابن جریج کما فی تفسیر ابن کثیر)

یہاں یہ بات اگرچہ یہودیوں کی بے عملی ظاہر کرنے کے لئے بیان کی گئی ہے لیکن اس کا حکم سب کے لئے عام ہے جو بھی کوئی شخص لوگوں کو بھلائی کا حکم کرے گا اور گناہوں سے روکے گا اور خود بے عمل ہوگا اس کا انجام بُرا ہوگا اور اس طریقۂ کار کی شناعت اور قباحت اُسے لے ڈوبے گی۔ بعض رِوایات میں ہے کہ جو عالم لوگوں کو خیر سکھاتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا وہ اُس چراغ کی طرح ہے جس کی بتی جلتی رہتی ہے لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے لیکن بتی خود جل جاتی ہے۔ (ابن کثیر عن الطبرانی فی المعجم الکبیر)

بے عمل واعظوں کی سزا...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ اُن کے ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ جب کٹ جاتے ہیں تو پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی اُمت کے خطیب ہیں جو لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے

ہیں اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں کیا اُن کو سمجھ نہیں ہے۔ (درمنثور ص ۶۴ ج ا عن البیہقی عن شعب الایمان، وعزاہ صاحب المشکوٰۃ ص ۴۳۸ الی شرح السنۃ)

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا پھر اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جس میں اس کے پیٹ کی آنتیں نکل پڑیں گی اور وہ اپنی آنتوں کے ساتھ گھومتا پھرے گا جیسے گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے، دوزخ والے اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور اِس سے کہیں گے کہ اے فلاں! تجھے کیا ہوا؟ کیا تو ہمیں اچھی باتیں نہیں بتا تا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا۔ وہ جواب دے گا کہ میں تم کو اچھی باتوں کا حکم کرتا تھا اور خود نہیں کرتا تھا اور تم کو برائی سے روکتا تھا اور خود اس بُرائی کو کرتا تھا۔ (صحیح مسلم ص ۴۱۲ ج ۲)

فائدہ...... مذکورہ بالا آیات اور احادیث شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں (نیکیوں کا حکم دیں، برائیوں سے روکیں) اور خود بھی عمل کریں، یہ مطلب نہیں ہے کہ نہ عمل کریں نہ امر بالمعروف کریں نہ نہی عن المنکر کریں۔ مبلّغ اور مصلح کو عمل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ جو عمل نہ کرے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھے اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے۔

قال ابن كثير فكل من الامربالمعروف وفعله واجب ولا يسقط احدهما بترك الأخر على اصح قولى العلماء من السلف والخلف والصحيح ان العالم يأمر بالمعروف وان لم يفعله وينهى عن المنكر وان ارتكبه ۔ (ص ۸۵ ج ۱)

(ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ نیکی کا حکم دینا اور اس پر عمل کرنا دونوں واجب ہے اور سلف وخلف علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق ایک کے ترک سے دوسرے کا وجوب ساقط نہ ہوگا اور صحیح یہی ہے کہ عالم آدمی نیکی کا حکم دے گو وہ خود اس پر عمل نہ کرتا ہو اور برائی سے منع کرے اگر چہ وہ خود اس کا ارتکاب کرتا ہو)

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ

اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ساتھ، اور بلاشبہ نماز ضرور دُشوار ہے مگر خشوع والوں پر

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ع ۷ الربع

صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد حاصل کرو

اِس آیت شریفہ میں صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا طریقہ بتایا ہے۔ لفظ صبر تین معنیٰ میں آتا ہے۔ اول: طاعات پر جمار ہنا خاص کر فرائض اور واجبات کو پابندی سے ادا کرنا۔ دوم: گناہوں سے پوری طرح اہتمام کے ساتھ بچنا۔ سوم: جو مصائب اور مشکلات در پیش ہوں اُن پر صبر کرنا۔

عام طور سے لوگوں میں یہ تیسرا معنی ہی زیادہ معروف ہے۔ تینوں قسم کا صبر اللہ تعالیٰ کی مدد کو لانے والا ہے۔ زندگی میں عموماً صبر کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں۔ عبادات بھی صبر ہی سے ادا ہوتی ہیں۔ نفس عبادت کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اگر تیار ہوتا ہے تو صحیح طریقہ سے ادا کرنے سے بچتا ہے۔ روزہ اور جہاد تو سراپا صبر ہی ہے۔ نماز سب سے بڑی عبادت ہے، اس میں بھی صبر کا مظاہرہ ہے۔ نمازی کا ظاہر

اور باطن عبادت ہی میں مشغول ہو جاتا ہے جو نفس پر شاق ہوتا ہے، صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد طلب کرنے کا حکم فرمایا یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی مدد لانے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ لیلۃ الاحزاب میں (غزوۂ خندق کے موقع پر) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آیا (اُن کو ایک کام کے لئے بھیجا تھا) تو آپ چادر اوڑھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تھی تو نماز پڑھنے لگتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے غزوۂ بدر کی رات میں دیکھا کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب لوگ سوئے ہوئے تھے آپ برابر نماز میں مشغول رہے اور صبح ہونے تک دُعا کرتے رہے۔ (ابن کثیر ص ۸۷ ج ۱) اس سلسلہ کا کچھ مضمون ان شاء اللہ آیت کریمہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے ذیل میں آئے گا۔

مفسر ابن کثیر نے ابن جریر طبری سے نقل کیا ہے کہ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں علماء یہود سے خطاب فرمایا ہے (وہ لوگ تحصیلِ دنیا کے لئے اور ریاست اور جاہ باقی رکھنے کے لئے حق چھپاتے تھے اور اسلام نہ خود قبول کرتے تھے نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے اُن کو حکم ہوا کہ حق قبول کرو اسلام لاؤ، اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگو، صبر اور صلاۃ کے ذریعہ اللہ کی مدد حاصل کرو جو اللہ سے نزدیک کرے گی اور برائیوں سے روکے گی اسلام قبول کرنے پر جو کچھ تکلیف پہنچ جائے، مال اور ریاست میں کمی آ جائے اُسے صبر کے ساتھ برداشت کرو)۔

پھر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا خطاب اگرچہ بنی اسرائیل کے انذار اور تحذیر کے سیاق میں وارد ہوا ہے لیکن علی سبیل التخصیص صرف یہود مخاطب نہیں ہیں بلکہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد حاصل کرنے کا حکم یہود اور غیر یہود سب ہی کے لئے ہے۔ (ص ۸۸ ج ۱)

نماز کی اہمیت...... نماز میں ظاہر اور باطن سب عبادت میں لگ جاتا ہے۔ یہ ظاہری طہارت اور باطنی تزکیہ دونوں کو شامل ہے کچھ نہ کچھ مال بھی خرچ ہوتا ہے (مثلاً وضو اور غسل کے لئے پانی حاصل کرنا پڑتا ہے اور ستر عورت کے لئے کپڑوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے) اگر صحیح طریقہ پر نماز پڑھی جائے تو دل اور اعضاء نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، اس میں شیطان سے مقابلہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ سے مناجات ہے، تلاوت قرآن ہے اور توحید اور رسالت کی گواہی ہے، نفس کو اس کے تقاضوں سے روکنا ہے، اس میں چلنا پھرنا، کھانا پینا اور بات کرنا ممنوع ہے۔ نماز کے بہت سے فضائل اور فوائد ہیں۔ اگر نماز کو ٹھیک طرح سے پڑھا جائے، فرائض کی پابندی کی جائے، سنتوں کا اہتمام کیا جائے، نوافل کی طرف دھیان دیا جائے تو ضرور اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بندہ کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔

خشوع کی ضرورت...... پھر فرمایا نماز ضرور دُشوار ہے مگر خشوع والوں پر دُشوار نہیں۔ خشوع دل کے جھکاؤ اور عاجزی اور فروتنی کو کہا جاتا ہے۔ جب دل میں خشوع ہوتا ہے تو اعضاء میں بھی اس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے جو لوگ خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں ان کی نماز واقعی نماز ہوتی ہے، نماز میں اُن کا دل لگتا ہے نماز چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، مسجد سے جائیں تو مسجد میں واپسی کے لئے دِل اٹکا رہتا ہے، جسے نماز کا خشوع حاصل ہو گیا اُسے ساری کامیابیاں حاصل ہو گئیں۔ (سورۂ مؤمنون میں فرمایا کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (بے شک وہ کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں)۔ دُنیا میں لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ طلبِ دُنیا کے لئے بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں، پہاڑ توڑتے ہیں، پتھر پھوڑتے ہیں، بہت سے لوگ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہیں لیکن دو رکعت پڑھنا ان کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ اگر نماز شروع کر دیں تو اس میں بھی اپنے دُنیاوی مشاغل کا ہی دھیان رکھتے ہیں خشوع نہیں ہوتا اس لئے دو رکعت پڑھنا بھی بھاری پڑ جاتا ہے۔

خشوع والے کون ہیں: ۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر فرمایا کہ خشوع والے وہ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ خشوع اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان کو موت کے بعد جی اُٹھنا ہے اور میدانِ قیامت میں حاضر ہونا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں پیشی ہونی ہے اور اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، جس کو ان باتوں کا یقین ہوگا وہ نماز قضا بھی نہ کرے گا، بے وقت بھی نہ پڑھے گا، اچھی نماز بھی پڑھے گا، اس کو خشوع کی کیفیت بھی حاصل ہوگی، رکوع سجدہ بھی ٹھیک کرے گا، اس کی تلاوت بھی صحیح ہوگی۔ (قال ابن کثیر ای یعلمون انھم محشورون الیہ یوم القیامۃ معرضون علیہ و انھم الیہ راجعون ای امورھم راجعۃ الی مشیئتہ فلھٰذا لما ایقنوا بالمعاد و الجزاء سھل علیھم فعل الطاعات و ترک المنکرات. (ص ۸۸ ج ۱) (ابن کثیرؒ کہتے ہیں وہ (مؤمنین خاشعین) جانتے ہیں کہ انہیں قیامت کے رُوز اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہونا اور اس کے حضور پیش ہونا ہے اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یعنی ان کے تمام تر امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف راجع ہیں لہٰذا جب وہ معاد اور جزاء کا یقین کرتے ہیں تو ان کیلئے طاعات کو بجالانا اور منکرات سے اجتناب کرنا آسان ہوجاتا ہے)۔

درحقیقت جسے یہ یقین ہو کہ یہ نماز آخرت میں نجات کا ذریعہ بنے گی اور نماز قبول ہوئی تو اور نیکیاں بھی قبول ہوں گی۔ یہ رَد ہوئی تو دوسرے اعمال بھی رَد ہوجائیں گے (جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے) اور یہ کہ میری نماز کا ثواب مجھی کو ملنا ہے اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے انعامات نصیب ہوتے ہیں تو ایسا شخص بے وقت نماز کیوں پڑھے گا؟ جلدی جلدی کیوں پڑھے گا؟ اور رکوع سجدہ میں کمی کیوں کرے گا؟ درحقیقت آخرت کی پیشی اور وہاں کے عذاب وثواب کا فکر ہو تو یہ دین کے بڑے بڑے کام کرواسکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو صحیح طریقے پر دو رکعت نماز پڑھنا بھی بھاری ہوجاتا ہے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک انسان نماز سے فارغ ہوتا ہے اور اُس کے لئے نماز کا دسواں یا نواں یا آٹھواں یا ساتواں یا چھٹا یا پانچواں یا چوتھائی یا تہائی یا آدھا حصہ لکھا جاتا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن حبان فی صحیحہ کما فی الترغیب ص ۳۴۱ ج ۲)

یہ ثواب کی کمی اور کٹوتی خود نمازی کے اپنے اخلاص، عمل اور خشوع کی کمی اور کوتاہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل تم میرے احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور اِس بات کو کہ میں نے تم کو فضیلت دی جہانوں پر،

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی بھی شخص کسی کی طرف سے بھی کچھ ادائیگی نہیں کرے گا اور نہ کسی شخص کیطرف سے کوئی سفارش قبول کیجائے گی اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی

عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

معاوضہ لیا جائے گا، اور نہ اُن لوگوں کی مدد کی جائے گی۔

قیامت کے دِن نفسا نفسی

اِن دونوں آیتوں میں بھی بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا اور مکرر اپنی نعمتوں کی یاد دہانی فرمائی۔ اُن میں بہت سی نعمتوں کا تذکرہ آئندہ

آیات میں آنے والا ہے۔ یہ جو فرمایا: وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (کہ میں نے تم کو فضیلت دی جہانوں پر) اس سے اُن کے آباؤ اجداد مراد ہیں۔ جن میں انبیاء کرام علیہم السلام بھی تھے اور وہ علماء صُلحا بھی تھے جنہوں نے اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھاما تھا اور جنہوں نے دینِ خداوندی میں کسی قسم کی تحریف و تغییر نہیں کی تھی۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ سے مُتّصف تھے اور جن پر فضیلت دینے کا ذِکر ہے ان سے ان کے زمانے کے لوگ مراد ہیں۔ تمام عالم کے انسان اگلی پچھلی اقوام وافراد مُراد نہیں ہیں۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام سے افضل ہیں اور آپ کی اُمت ساری اُمتوں سے افضل ہے جس کی تصریح کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اور وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا میں فرمائی ہے۔

اپنے زمانہ میں بنی اسرائیل کو دوسری اَقوام پر فضیلت اور برتری حاصل تھی کیونکہ ان میں حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام ہوتے تھے اور اُن کے ماننے والے بھی ہوتے تھے اور اعمالِ صالحہ والے بھی موجود تھے۔ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو فَترت کا زمانہ ہے (اور یہ زمانہ چھ سو سال کے لگ بھگ تھا) اس میں علماء یہود نے توریت شریف میں تحریف کر دی اور دین خداوندی کو بدل دیا پھر جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور علماءِ یہود نے پہچان بھی لیا کہ آپ وہی نبی ہیں جن کے آنے کا ہمیں انتظار تھا تو آپ کی نبوت اور رِسالت کے منکر ہو گئے۔ تحریف و تغییر و انکارِ نبوت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اپنی ہر طرح کی فضیلت کھو بیٹھے اور اب نہ صرف یہ کہ کفر اختیار کرنے والے بن گئے۔ بلکہ دینِ اسلام کے دشمن بن کر مستقل طریقہ پر **مغضوب علیھم** کی سند لے لی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسل سے ہیں مگر کفر کے ساتھ نسب کوئی کام نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ ہر کافر کو دوزخ میں بھیج دے گا۔ کسی کی بھی اولاد ہو۔

یہودیوں کی دُنیا طلبی، حُبّ مال، حُبِّ جاہ اور اس بات کا حسد کہ نبی ہم میں سے کیوں نہ آیا عربوں میں سے کیوں آیا ان چیزوں نے اُن کو برباد کر دیا۔ قرآن مجید نے خطاب کر کے اُن سے فرمایا کہ دنیا کو نہ دیکھو، آخرت پر نظر کرو۔ اَموال واولاد اور قوم اور قبیلہ قیامت کے دن بالکل کام نہیں آسکتا وہاں نہ کوئی جان کسی کی طرف سے کوئی حق ادا کر سکے گی (یہ نہ ہو سکے گا کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے قرضہ دے دے یا کسی طرح کا کوئی اور حق چُکا دے، اور یہ نہ ہو سکے گا کہ کوئی کسی کی طرف سے عذاب بُھگت لے۔)

جن کو شفاعت کی اجازت ہوگی وہی سفارش کر سکیں گے: کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی، بلکہ کوئی شخص کسی کے لئے سفارش کر ہی نہ سکے گا سوائے اُن لوگوں کے جن حضرات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش کرنے کی اجازت ہوگی اور جن کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ہوگی ان ہی کے بارے میں قبول ہوگی اور کافروں کے لئے کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا اور نہ ان کے لئے سفارش کی اجازت ہوگی۔

(قال اللہ تعالیٰ شانہ) فَمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیْنَ. (وقال اللہ تعالیٰ) مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ. (وقال تعالیٰ) یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوْلًا ط (وقال تعالیٰ) مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ.

وہاں عذاب سے جان چھڑانے کے لئے کوئی معاوضہ یا فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اول تو وہاں کسی کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں جو جان کا بدلہ دے کر عذاب سے جان چھڑائے اور بالفرض کوئی دینا بھی چاہے تو قبول نہیں کیا جائے گا اور جس کے لئے عذاب کا فیصلہ ہو گیا اُسے عذاب ہی میں رہنا ہوگا۔

سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ.

(جولوگ کافر ہوئے اور مر گئے کافر ہی، تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے شخص سے زمین بھر کر سونا اگر چہ فدیہ دے اِس قدر سونے کا، اُن کے لئے عذاب دردناک ہے اور کوئی نہیں ہوگا اُن کا مددگار)

اور سورۂ مائدہ میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ.

(جولوگ کافر ہیں اگر اُن کے پاس جو کچھ زمین میں ہے وہ سب ہو اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تا کہ بدلہ میں دیں قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے، تو اُن سے قبول نہ ہوگا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے)۔

آخر میں فرمایا وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور روزِ قیامت اُن لوگوں کی مدد نہ کی جائے گی۔ اوّل اس بات کی نفی کی گئی کہ کوئی کسی کے کام آئے۔ پھر سفارش کی نفی کی گئی پھر جان کا بدلہ قبول کئے جانے کی نفی کی گئی پھر ہر طرح کی مدد کی نفی کر دی گئی۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ

اور جب ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی وہ تم کو سخت ترین تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری

نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رَب کی طرف سے بڑا امتحان تھا۔

مصر میں بنی اسرائیل کی مظلومیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے ایک بہت بڑے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے پہلے گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام قبیلے مصر میں رہتے تھے۔ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مصر کے لوگ (فرعون اور فرعون کی قوم) اُن پر بُری طرح مسلّط تھے، ان کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر تھی، ان سے بڑی بڑی بیگاریں لیتے تھے اور ایسی بدترین غلامی میں بنی اسرائیل مبتلا تھے کہ مصری لوگ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے تو یہ ذرا چوں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں پیدا فرمایا پھر ان کو اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام کو نبوت عطا فرمائی، فرعون سے ان کا مقابلہ اور مناظرہ ہوا، فرعون نے مقابلہ کے لئے جادوگر بُلائے، معجزہ کے سامنے وہ لوگ نہ ٹھہر سکے اور اپنی ہار مان کر اُنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی وجہ سے بنی اسرائیل پر فرعون اور اس کی قوم کی اور زیادہ سختیاں بڑھ گئیں۔ اللہ جل شانہٗ کا موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکل کھڑے ہو اور راتوں رات روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ لوگ ملکِ مصر سے نکل آئے اور فرعون اور اس کے لشکروں سے نجات پائی۔ اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مصر میں چار سو سال سے رہ رہے تھے۔ عرصہ دراز کی بدترین غلامی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

آیت کے اخیر میں جو لفظ بَلَآءٌ ہے اس کے دو معنی مفسرین نے لکھے ہیں۔ (۱) عربی زبان میں آزمائش اور امتحان کو بھی بَلاء کہتے

ہیں۔ اگر یہ معنی لئے جائیں تو ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ تم ایسی سخت تکلیفوں میں مبتلا تھے اس میں تم بڑے امتحان میں تھے (۲) بَلَاءٌ کا دوسرا معنیٰ انعام کا ہے اگر یہ معنی لئے جائیں تو ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسی تکلیفوں سے اور غلامی سے نجات دینے میں تم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔

فرعون اور اس کا لشکر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو کیوں ذبح کرتے تھے؟ اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا یا اُسے کاہنوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے ملک کو ختم کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ جل شانہٗ کی قضا و قدر غالب آئی ان کی تدبیریں یوں ہی دھری رہ گئی خدا جانے کتنے لڑکوں کو قتل کر دیا۔ اُسی زمانۂ قتل میں موسیٰ علیہ السلام پیدا بھی ہوئے، پلے، بڑھے جوان ہوئے اور فرعون ہی کے محل میں پرورش پائی پھر اس کی اور اس کی حکومت کی تباہی کا ذریعہ بنے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور جب ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا پھر ہم نے تم کو نجات دے دی، اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل کا سمندر پار کر کے نجات پانا اور آلِ فرعون کا غرق ہونا

اس آیت شریفہ میں اجمالی طور پر مصریوں سے بنی اسرائیل کی نجات اور آلِ فرعون کی بربادی اور ہلاکت کا ذکر ہے۔ اللہ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر مصر کی آبادیوں سے نکل جاؤ اس وقت مصر میں فرعون کی حکومت تھی فرعون مصر کے ہر فرمانروا کو کہا جاتا تھا اور اِس فرعون کا نام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا بعض مفسرین نے ولید بتایا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا نام بھی موسیٰ تھا، اس کا تعلق قوم عاد سے بتاتے ہیں، یہ بڑا سرکش بادشاہ تھا اپنے آپ کو سب سے اونچا معبود منواتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو رات کو لے کر مصر کی آبادی سے نکل گئے اور سمندر کے کنارے پہنچ گئے ان کے نکلنے کی جب فرعون اور آلِ فرعون کو خبر لگی تو فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ اِن کا پیچھا کیا، بنی اسرائیل دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے، سورج نکل چکا تھا فرعون جو اپنے لشکروں کے ساتھ پیچھے سے پہنچا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے اور اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (کہ ہم تو دھر لئے گئے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (ہرگز نہیں بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور مجھے راہ بتائے گا) اللہ جل شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تم اپنی لاٹھی سمندر میں مارو! انہوں نے سمندر میں لاٹھی ماری تو سمندر پھٹ گیا اور پہاڑوں کے برابر اس کے ٹکڑے ہو گئے ان پانی کے پہاڑوں کے درمیان زمین خشک ہو گئی اور بنی اسرائیل کے قبیلے ان پہاڑوں کے درمیان سے گزر گئے۔ فرعون نے بھی اپنی جماعتوں اور لشکروں کے ساتھ اِن کا پیچھا کیا اور یہ لوگ بھی سمندر میں داخل ہو گئے بنی اسرائیل کا پار ہونا تھا اور فرعون اور اس کے لشکر کا سمندر میں داخل ہونا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو ملا دیا اور فرعون اپنے لشکروں اور جماعتوں سمیت ڈوب گیا اِن کے ڈوبنے کے اس منظر کو بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس کو اس آیت میں وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرعون جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں بھی ایمان لاتا ہوں کہ اس ذات کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ ارشاد ہوا آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ. (کیا اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تُو فساد کرنے والوں میں سے تھا)۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا فرعون غرق ہو کر ہلاک تو ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی نعش کو محفوظ رکھا تا کہ بعد میں آنے والوں کو عبرت ہو جیسا کہ سورۃ یونسؑ میں فرمایا ہے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۔ (سو آج ہم تیری لاش کو نجات دیں گے تا کہ تیری ذات ان لوگوں

کے لئے عبرت ہو جائے جو تیرے بعد میں آنے والے ہیں) فرعون اور اس کے لشکروں کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے نجات پانے کا واقعہ سورۂ طٰہٰ (رکوع ۴) میں اور سورۂ شعراء (رکوع ۴) میں اور سورۂ دخان (رکوع ۱) میں بھی مذکور ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ

اور جب وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم لوگوں نے اُن کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم

عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

کرنے والے تھے۔ پھر ہم نے اس کے بعد تم سے درگزر کر دیا تا کہ تم شکر ادا کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طُور پر جانا اور بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا

جب حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسرائیل کو لیکر سمندر پار ہو گئے تو ایک میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ان کو اپنے وطن فلسطین جانا تھا لیکن چالیس سال کے بعد وہاں پہنچ سکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے علاقے میں ان کو جانا نصیب ہوا اُن کی وفات اسی میدان میں ہوگئی اور اسی عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت شریف عطا ہوئی۔ طُور پہاڑ اُسی میدان میں ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں بلایا ایک مہینہ اعتکاف کرنے اور روزے رکھنے کا حکم ہوا تھا۔ لیکن تیس راتیں گزرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی جس سے وہ خاص قسم کی رائحہ دُور ہوگئی جو روزہ رکھنے سے منہ میں پیدا ہو جاتی ہے اس کو حدیث میں خَلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ سے تعبیر فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ عمدہ ہے۔ (کما فی صحیح البخاری)

جب یہ رائحہ دور ہوگئی تو دس دن مزید روزہ رکھنے کا حکم ہوا۔ لہٰذا چالیس دن کوہِ طُور پر گزارے۔ مُدت مذکورہ گزر جانے کے بعد توریت شریف عطا ہوئی۔ سُورۂ بقرہ میں چالیس راتوں کا ذِکر ہے۔ اور سُورۂ اعراف میں تفصیل بیان فرمائی کہ تیس راتوں میں دس راتیں اور بڑھادی گئیں۔ لہٰذا چالیس راتیں پُوری ہوگئیں۔ (وَ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً)

سامری سُنار کا زیورات سے بچھڑا بنانا اور بنی اسرائیل کا اس کو معبود بنالینا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام طُور پر تشریف لے گئے اور وہاں چالیس دن لگ گئے۔ اِدھر ان کے پیچھے ان کی قوم بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلنے والے تھے تو اُنہوں نے قبطی قوم کے لوگوں سے (جو مصر کے اصل باشندہ تھے) زیورات مانگ لئے تھے۔ یہ زیورات ان لوگوں کے پاس تھے ان میں ایک آدمی سامری نام کا تھا جو سُنار کا کام کرتا تھا اس نے ان زیوروں کو جمع کر کے گائے کے بچھڑے کی شکل بنادی اور اُس کے منہ میں مٹی ڈال دی۔ یہ وہ مٹی تھی جو اُس نے حضرت جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے اُٹھالی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مٹی میں ایسا اثر ڈالا کہ اس مجسمہ سے گائے کے بچہ کی آواز آنے لگی، بنی اسرائیل مصر میں بُت پرستی دیکھ آئے تھے۔ جب اُس کی آواز سُنی تو کہنے لگے۔ هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (یعنی یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے سو وہ بھول گئے جو طُور پر خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے گئے۔ (معبود تو العیاذ باللہ یہاں موجود ہے) حضرت ہارون علیہ السلام جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پیچھے چھوڑ گئے تھے اُنہوں نے بنی اسرائیل کو سمجھایا اور بتایا کہ تم فتنے میں پڑ گئے ہو تمہارا رب رحمٰن ہے میرا اتباع

کرو، میری اطاعت کرو۔ اس پر بنی اسرائیل نے کہا ہم برابر اس بچھڑے کے آگے پیچھے لگے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آ جائیں۔

سامری کو بددُعا اور بچھڑے کا انجام ...... جب موسیٰ علیہ السلام توریت شریف کی تختیاں لے کر تشریف لائے تو اُنہوں نے یہ ماجرا دیکھا، بہت غصہ ہوئے اور پوری صورتِ حال معلوم فرمائی پتہ چلا کہ سامری نے یہ حرکت کی ہے۔ اس سے بھی سوال جواب فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بددعا دے دی اور فرمایا:

فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِی الْحَیٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَامِسَاسَ

(تو جا تیرے لئے زندگی بھر یہ بات طے کر دی گئی کہ تو جسے دیکھے گا اُس سے کہے گا کہ مجھے نہ چھونا) لہٰذا وہ حیران پریشان جنگل میں پھرتا رہتا تھا جب وہ کسی کو چھو لیتا تھا یا کوئی شخص اس کو چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اُس بچھڑے کو جلا دیا اور راکھ کو سمندر میں بہا دیا اور فرمایا: اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۔ (تمہارا معبود صرف اللہ ہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے)۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے تم سے درگزر کر دیا۔ یہ اُن کی توبہ کرنے کے بعد کی بات ہے۔ اُن کی توبہ کا ذکر ابھی ایک آیت کے بعد آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فیصلہ کرنے والی چیز دے دی تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

توریت شریف عطا فرمانے کا انعام

اس آیت میں توریت شریف عطا فرمانے کا ذِکر ہے۔ بنی اسرائیل پر جو اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے انعامات ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کو ایک جامع کتاب دی گئی جو احکام پر مشتمل تھی اس میں احکام دینیہ پوری طرح واضح طور پر بیان فرما دیئے گئے تھے۔

سورۃ انعام میں فرمایا:

ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۔

(پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پُوری ہو جائے اور سب احکام کی تفصیل معلوم ہو جائے اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو تا کہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے پر ایمان لائیں۔) توریت شریف کو فرقان فرمایا یعنی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا معنیٰ ہے حلال وحرام کے درمیان فرق کرنے والی۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔ اللہ کی کتاب کی یہ سب صفات ہیں۔ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے اور حلال وحرام کے درمیان بھی۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ الفرقان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات مُراد ہیں۔ سیاق کلام سے یہ بھی بعید نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو توریت شریف بھی دی اور معجزات بھی دیئے۔ جو اُن کے دعوائے نبوت اور رسالت کو ثابت کرنے والے تھے۔ جو انعامات موسیٰ علیہ السلام پر ہوئے وہ سب بنی اسرائیل پر بھی ہیں کیونکہ بنی اسرائیل ان کی اُمت میں سے تھے اور خود موسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل میں سے تھے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کی ساری نعمتوں کی ناقدری کی اور بجائے شُکر گزار ہونے کے، ناشکرے ثابت ہوئے اور ہدایت کے بجائے گمراہی اختیار کی جس کا تذکرہ آئندہ آیات میں آ رہا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بے شک تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ لہٰذا تم اپنے پیدا کرنے

اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

والے کی بارگاہ میں توبہ کرو، سو اپنی جانوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنیوالے کے نزدیک، پھر اُس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ بہت زیادہ

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

توبہ قبول فرمانے والا ہے، اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

گوسالہ پرستی کرنیوالوں کی توبہ اور اِس بارے میں جانوں کو قتل کرنا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لے کر واپس بنی اسرائیل کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ گوسالہ پرستی یعنی بچھڑے کی عبادت میں مُنہمک ہو چکے ہیں اس پر انہیں بہت زیادہ غصہ آیا اور ان کو بُت پرستی سے توبہ کرنے پر متوجہ فرمایا۔ ان لوگوں کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توجہ دِلانے سے اپنی گمراہی کا احساس ہو گیا جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا:

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.

(اور جب نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں معاف نہ کرے تو ہم بالکل نقصان میں پڑ جانے والے ہوں گے)

اُن لوگوں کی توبہ کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمایا تھا کہ وہ مقتول ہو جائیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یوں حکم ہوا تھا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی وہ ان لوگوں کو قتل کر دیں جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب قتل کرنا شروع کیا تو قاتلین کے سامنے بچھڑے کی عبادت کرنے والوں میں سے وہ لوگ بھی سامنے آ جاتے تھے جو ان کے رشتہ دار اور عزیز قریب تھے لہٰذا وہ قتل کرنے سے ہچکچاتے تھے اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل بھیج دیئے تا کہ ایک دُوسرے کو نہ دیکھیں اور صبح سے شام تک قتل کا سلسلہ چلتا رہا حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دُعا کی بادل ہٹا دیا گیا اور توبہ نازل ہو گئی اس وقت تک ستر ہزار آدمی قتل کئے جا چکے تھے۔ مفسرین کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ سب ہی مقتول نہیں ہوئے بلکہ ستر ہزار کے قتل ہونے پر سب کی توبہ قبول ہو گئی۔ (بیضاوی وابن کثیر)

آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا کہ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ (کہ تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مستحق عبادت وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اُسے چھوڑ کر تم ایسی چیز کی پرستش میں لگ گئے جس کی شکل وصورت تمہارے آدمی نے خود بنائی۔ شرک کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے اُس سے بچنے کے لئے توبہ کر لو اور توبہ کی قبولیت کے لئے یہ شرط لگائی کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، یہ ایک وقتی تکلیف ہے جس کا سہہ لینا دوزخ کے دائمی عذاب کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہل ہے۔ اور اس عذاب سے بچنا تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔ اُمتِ محمدیہ پر اللہ جل شانہٗ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے ان کی توبہ ندامت سے اور آئندہ گناہ کے نہ کرنے کا فیصلہ کر لینے پر اور حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے سے قبول ہو جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی کتنا بڑا

گناہ کرے، کفر اختیار کرے شرک کا کام کرے اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ سچے دل سے اسلام قبول کرے توحید و رسالت پر ایمان لائے اُس کی توبہ قبول ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہ کریں گے، جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ طور پر نہ دیکھ لیں، سو پکڑ لیا تم کو کڑک نے اور حال یہ تھا کہ تم آنکھوں

تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تم کو زندہ اُٹھا دیا تمہاری موت کے بعد، تاکہ تم شکر ادا کرو۔

بنی اسرائیل کی بیجا جسارت، اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال

جب موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام توریت شریف لے کر تشریف لائے تو بنی اسرائیل کو پایا کہ اُن میں سے بہت سے لوگ بچھڑے کی عبادت کر چکے ہیں بچھڑے اور اُس کی عبادت کرنے والوں کا انجام اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کے علاوہ ایک اور اڑ لگائی، اور انہوں نے کہا کہ آپ جو فرما رہے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ہمارے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ ہم تو اس کو جب مانیں گے جب اللہ تعالیٰ ہم سے خود فرمائیں کہ یہ میری کتاب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چلو یہ بھی سہی تم لوگ اپنے نمائندے تیار کر لو اور جو لوگ میرے ساتھ چلیں وہ روزہ رکھیں اور پاک صاف ہو کر چلیں جس دن ان کو خداوند قدوس سے ہم کلامی سے مشرف ہونے کا موقع آیا (جس کے لئے پہلے سے اجازت لی ہوئی تھی اور وقت مقرر فرما دیا تھا) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستّر آدمیوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر یہ لوگ مطمئن نہ ہوئے اور دُوسری کروٹ بدلی اور کہنے لگے کہ ہم تمہاری بات جب مانیں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر اپنے آمنے سامنے دیکھ لیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ان کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے لُقمۂ اجل بن گئے۔ جب یہ ماجرا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فکر لاحق ہوئی کہ پہلے ہی بنی اسرائیل مجھے متہم کرتے تھے اور طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اب اتنے آدمی ہلاک ہو گئے تو میں جب یہ بیان کروں گا کہ وہ لوگ بجلی کی کڑک سے مر گئے تو خدا جانے کیا کیا باتیں بنائیں گے اور کیسے اتہام دھریں گے لہٰذا اُنہوں نے بارگاہِ خداوندی میں دُعا کی جس کی وجہ سے دوبارہ زندہ کر دیئے گئے۔ اِس نعمت کا شکر اُن زندہ ہونے والوں پر اور ساری قوم پر واجب ہوا۔ (ابن کثیر ص ۹۳ و ۹۴ ج ا والبیضاوی ص ۵۷ ج ا)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ہم نے تمہارے اوپر مَن اور سلویٰ نازل کیا، جو کچھ ہم نے تم کو دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ،

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور اُنہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنی ہی جانوں کا نقصان کیا کرتے تھے۔

میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ کرنا اور مَن اور سلویٰ نازل ہونا

جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور دریا پار کر کے ایک بیابان جنگل میں پہنچے جہاں سے اُن کو اپنے وطن کنعان جانا تھا اور وہاں پہنچنے

میں چالیس سال لگ گئے صبح کو جہاں سے چلتے تھے شام کو وہیں موجود ہوتے تھے۔(ذکرہ البیضاوی فی تفسیر قولہ تعالیٰ یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ) دھوپ اور گرمی میں چلنا اور روزانہ چلنا نہایت تکلیف دہ تھا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لئے کچھ سایہ کا انتظام ہونا چاہیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں دُعا کی جس کی وجہ سے اُن کے لئے بادل بھیج دیئے گئے دِن میں جب وہ سفر کرتے تھے تو بادل ان پر سایہ کرتے تھے اس سایہ میں ان کا سفر طے ہوتا تھا چونکہ روزانہ سفر ہی سفر تھا کسی طرح کی تجارت یا صنعت و حرفت یا زراعت کا موقع نہیں تھا اور کھانے کی ضرورت بدستور جس کا ہر انسان محتاج ہے تو ان کی اس حاجت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مَن اور سلوٰی نازل فرمائے۔

مَنّ کے بارے میں علماءِ تفسیر کے کئی اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی ایسی چیز تھی جو درختوں پر نازل ہو جاتی تھی۔ صبح جا کر اس میں سے جس قدر چاہتے کھالیتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ یہ ایک قسم کا گوند تھا۔ حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ وہ کوئی چیز تھی جو گاڑھے گودے کے مشابہ تھی۔ حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ یہ لوگ جہاں مقیم ہوتے تو وہیں برف کی طرح اُن کی جگہوں میں مَن کا نزول ہو جاتا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ اور یہ طلوع فجر سے طلوع شمس تک نازل ہوتا تھا ایک دِن کی ضرورت کے بقدر ہر شخص کو لینے کی اجازت تھی اس سے زیادہ کوئی لے لیتا تو وہ خراب ہو جاتا تھا۔ البتہ جمعہ کے دِن جمعہ اور سنیچر دونوں دِنوں کے لئے لے لیتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عجوہ (مدینہ منورہ کی کھجوروں کی ایک قسم) جنت سے ہے اور اس میں زہر سے شفا ہے اور کھمی مَنّ سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے۔ (اخرجہ الترمذی فی ابواب الطب وھو فی البخاری ص ۶۴۳ ج ۲ من غیر ذکر العجوۃ)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جو کھمی کبھی کبھی زمین پر نظر آ جاتی ہے یہ اُس مَن کا بقیہ ہے جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ راوی حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میری ایک باندی چُندھی تھی میں نے کھمی کا پانی لیکر اُس کی آنکھ میں ڈالا تو وہ ٹھیک ہوگئی۔

سلوٰی: یہ کیا چیز تھی؟ یہ کوئی پرندہ تھا جو بٹیر سے مُشابہ تھا اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے پاس خوب زیادہ تعداد میں پرندے بھیج دیتا تھا جو ہوا کے ذریعہ آ جاتے تھے وہ لوگ ان کو ذبح کر دیتے تھے اس بارے میں بھی حکم تھا کہ بقدرِ ضرورت لیں اور ذخیرہ بنا کر نہ رکھیں لیکن انہوں نے اس بات پر عمل نہ کیا، مَن اور سلوٰی دونوں کا ذخیرہ بنایا اور جب دوسرے دِن اسے دیکھا تا کہ کھائیں تو اس میں بدبو آ چکی تھی اور خراب ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی سرائیل نہ ہوتے تو گوشت میں تغیر نہ آتا اور وہ بدبودار نہ ہوتا۔ اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت کبھی بھی اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی۔ (صحیح بخاری ص ۴۶۹ ج ۱) مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ پر بھروسہ نہ کیا ان کے لئے حکم تھا کہ من و سلوٰی اُٹھا کر نہ رکھیں لیکن وہ نہ مانے، اُٹھا کر رکھا تو اِس میں بدبو آ گئی، خراب ہو گیا لہٰذا گوشت کے خراب ہونے کی ابتداء ان لوگوں سے ہوئی اور ان کی حرکت بد کی وجہ سے ہوئی۔ اسی طرح سے حضرت حوا نے حضرت آدم کو جنت کا وہ درخت کھانے پر آمادہ کیا جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا پھر دونوں نے کھالیا اور دونوں دنیا میں بھیج دیئے گئے۔ شوہر کی خیانت کی ابتداء حضرت حوا سے ہوئی لہٰذا اُن کی نسل میں بھی یہ بات باقی رہ گئی۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں سو کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو خوب اچھی طرح، اور داخل ہو جاؤ دروازہ میں جھکے ہوئے،

وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ

اور یوں کہو کہ ہم گناہوں کی بخشش کا سوال کرتے ہیں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے، اور نیکو کاروں کو اور زیادہ دیں گے۔ سو بدل دیا اُن لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات کو اس

قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

بات کے علاوہ جو ان سے کہی گئی تھی سو ہم نے نازل کر دیا اُن لوگوں پر آسمان سے عذاب جنہوں نے ظلم کیا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

ع ۱۳

ایک بستی میں خشوع کے ساتھ داخل ہونے کا حکم، اور بنی اسرائیل کی شرارت اور اس پر عذاب آنا

یہ کون سی بستی ہے؟ جس میں داخل ہونے کا یہاں اس آیتِ شریفہ میں ذکر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے بیت المقدس مُراد ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ اریحا بستی تھی جس میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ مفسر ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ پہلا قول ہی صحیح ہے کیونکہ یہ مصر سے آ کر اپنے علاقہ ارضِ مقدسہ میں جا رہے تھے اور اریحا اُن کے راستہ میں نہیں پڑتا تھا اور پھر لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا نہیں ہے بلکہ جب بنی اسرائیل چالیس سال میدان میں حیران و سرگرداں پھرتے رہے تو حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں ان کو بیت المقدس میں داخل ہونا نصیب ہوا ان کے علاقہ میں (جسے یہ چھوڑ کر مصر چلے گئے تھے) قوم عمالقہ آباد تھی۔ وہ بڑے قد آور اور قوت و شوکت والے لوگ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل سے فرمایا کہ چلو اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے تو ان لوگوں نے کہا کہ اس میں تو بڑے جابر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ہمارے بس کا نہیں جو اُن سے مقابلہ کریں تم جاؤ اور تمہارا رب جائے دونوں وہاں جا کر قتال کر لیں۔ ان کی اس حرکت پر چالیس سال کے لئے بیت المقدس کی سرزمین ان پر حرام کر دی گئی پھر یوشع علیہ السلام کی سرکردگی میں بیت المقدس فتح ہوا جب بیت المقدس میں داخل ہونے لگے تو حکم ہوا کہ اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں کہ اس نے ان کا علاقہ واپس فرمایا اور اس میں فتح یابی نصیب فرمائی اور ان کو میدانِ تیہ کی حیرانی اور پریشانی سے نجات دی۔ اور اس شکر کے اظہار کے لئے عملی طور پر یہ تجویز فرمایا کہ جھکے ہوئے داخل ہوں تواضع کا طریقہ اختیار کریں غرور اور تکبر کو پاس نہ آنے دیں ایسی کوئی صورت اختیار نہ کریں جس سے استہزاء کی کیفیت ظاہر ہو اور ان کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ حِطَّةٌ کہتے ہوئے داخل ہوں جس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہم گناہوں کی بخشش کا سوال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ایسا کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور جو لوگ اچھے کام کرنے والے ہیں ان کے ثواب میں اور اضافہ کر دیں گے۔ حکم کیا ہوا تھا اور حرکت کیا کی؟ اسی کو فرمایا کہ ظالموں نے اس کو بدل دیا جس کا حکم دیا تھا، عمل کو تو اس طرح بدلا کہ جھکے ہوئے داخل ہونے کی بجائے بچوں کی طرح اپنے دھڑوں پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے جس میں ایک طرح کا استہزاء ہے اور جو معافی مانگنے کا حکم ہوا تھا اس میں اس طرح اَدل بدل کیا کہ حِطَّةٌ کی بجائے حَبَّةٌ فِي شَعِيْرَةٍ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔

(کما فی صحیح البخاری ص ۶۴۳ ج ۲)

جب انہوں نے ایسی حرکت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے فاسقانہ کرتوتوں کی وجہ سے اُن پر عذاب نازل فرما دیا۔ یہ عذاب جو

بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا اس کو ''رجز'' سے تعبیر فرمایا ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ ان لوگوں پر طاعون بھیج دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں بنی اسرائیل کی موتیں ہوئیں۔ علماء تفسیر نے یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ عَذَابٌ عُذِّبَ بِهٖ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (یعنی طاعون رجز ہے جو عذاب ہے جس کے ذریعہ تم سے پہلی اُمتوں کو عذاب دیا گیا)۔ (ذکرہ ابن کثیر عن ابن ابی حاتم)

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ طاعون کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ستّر ہزار آدمی ایک ہی ساعت میں ہلاک ہو گئے۔ مؤمن بندوں کو ہر حال میں اپنے خالق و مالک ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ فتح اور کامرانی دے تو خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف متوجہ ہوں عاجزی اور فروتنی کو اختیار کریں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دِن مکہ معظمہ میں خشوع خضوع کے ساتھ داخل ہوئے فتح مکہ کے بعد حضرت اُم ہانی کے گھر میں آٹھ رکعات نماز پڑھی یہ چاشت کا وقت تھا، مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے اس کو صلاۃ الضحیٰ اور بعض حضرات نے صلاۃ الفتح سے تعبیر کیا ہے جب امیر لشکر کسی شہر کو فتح کرے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ اول مرتبہ جب داخل ہو تو آٹھ رکعت نفل پڑھے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب فارس فتح کیا اور ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے بھی آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ (ابن کثیر ص ۹۹ ج ۱)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ

اور جب موسیٰ نے اُن کی قوم نے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو سو اِس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے،

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

ہر جماعت نے اپنے اپنے پینے کی جگہ جان لی، کھاؤ اور پیو، اللہ کے رزق سے اور مت خرابی کرو زمین میں فساد کرتے ہوئے۔

میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل کیلئے پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹنا

یہ بھی میدانِ تیہ کا قصہ ہے۔ اس میدان میں جب بنی اسرائیل کو پیاس لگی اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا سوال کیا جب موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں پانی کی درخواست کی تو اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لاٹھی کا پتھر پر مارنا تھا کہ اُس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، علامہ بغویؒ نے معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جس پتھر میں لاٹھی مارنے سے چشمے جاری ہوتے تھے یہ ایک ہلکا سا پتھر تھا جو چوکور تھا۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں رہتا تھا جب پانی کی حاجت ہوتی اُسے زمین پر رکھ کر لاٹھی مار دیتے تھے جس سے چشمے جارے ہو جاتے تھے۔

جب بنی اسرائیل پانی سے سیراب ہو جاتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس کو اٹھا کر تھیلے میں رکھ لیتے اور جب پانی لینا چاہتے تو پھر اس میں لاٹھی مار دیتے جس سے پانی نکلتا، روزانہ چھ لاکھ آدمی اس سے سیراب ہوتے تھے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلے کے لئے پتھر سے چشمہ پھوٹتا تھا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے سیراب ہوتا تھا۔

لق دق میدان میں اللہ جل شانہٗ نے بنی اسرائیل کے کھانے کے لئے ''من وسلویٰ'' عطا فرمایا اور اُن کے پینے کے لئے پتھر سے

چشمے جاری فرمائے یہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل پر بہت بڑا انعام تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت بڑا معجزہ بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ. (کہ اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد کرنے والے نہ بنو) لَا تَعْثَوْا، عثی سے مشتق ہے جو خوب زیادہ بڑا افساد کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آپس کا قتل وقتال اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا بہت بڑا افساد ہے۔ نعمتوں کی ناشکری کرنے سے نعمتوں سے محرومی ہو جاتی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکری اور نافرمانی شرعاً وعقلاً بہت بڑی جہالت اور باعثِ ہلاکت ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر لہٰذا ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے وہ ہمارے لئے اُن چیزوں میں سے نکال دے

الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ

جن کو زمین اُگاتی ہے۔ اس کی سبزی اور کھیرا اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا کہ تم بدلتے ہو اُس چیز کو

هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ

جو گھٹیا ہے اُس چیز کے بدلہ میں جو خیر ہے؟ اُتر جاؤ کسی شہر میں، سو بے شک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے سوال کیا، اور ماردی گئی اُن لوگوں پر ذلت اور مسکنت،

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ

اور مستحق ہو گئے غصہ کے جو اللہ کی طرف سے تھا، یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق

الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

قتل کرتے تھے، یہ اس لئے کہ اُنہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھتے تھے۔

ع ۷

بنی اِسرائیل کا کہنا کہ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، ہمیں پیاز، لہسن چاہیے!

میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل کو دونوں وقت کھانے کے لئے من وسلویٰ ملتا تھا۔ انسان کا کچھ ایسا مزاج ہے کہ وہ ایک قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بددل ہو جاتا ہے اور اس کی طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے کھانے کھائے۔ بنی اسرائیل من وسلویٰ کھاتے کھاتے اُکتا گئے لیکن اُنہوں نے طبعی اُکتاہٹ کو دیکھا اور اِس بات کو نہ دیکھا کہ ہم ایسی بدترین غلامی سے نکل کر آئے ہیں جہاں ہمارے بچے ذبح کر دیئے جاتے تھے اور اُف نہ کر سکتے تھے ایسے بڑے دشمن کا ہلاک اور برباد ہونا اور اس سے نجات پانا یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے سامنے کھانے کی طبعی اُکتاہٹ پر صبر کر لینا معمولی بات ہے لیکن اُنہوں نے صبر کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اپنے رب سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے لئے زمین سے نکلنے والی چیزیں پیدا فرمائے ہمیں سبزیاں چاہئیں، کھیرا چاہیے، گیہوں چاہیے، مسور کی دال چاہیے اور پیاز چاہیے۔ اور طرزِ سوال بھی عجیب ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں کہ آپ اپنے رب سے دُعا کریں یہ نہیں کہتے کہ ہم سب مل کر اپنے رب سے مانگیں، گویا اپنا کوئی تعلق ہی اپنے رب سے نہیں ہے اور گویا موسیٰ علیہ السلام نے

ان کو مصر سے لا کر ایک طرح کے کھانے کی مصیبت میں ڈالا ہے لہٰذا وہ دُعا کریں اور وہی مصیبت حل کریں۔ اُن کا شکر یہ تو کجا کہ اُن کی محنتوں، کوششوں اور قربانیوں سے بدترین غلامی سے نجات پائی۔ شکریہ کی بجائے اُن کو مطعون کر رہے ہیں کہ تم نے ہم کو مصیبت میں ڈالا۔ جب مزاج بگڑ جاتا ہے تو انسان عزت اور رفعت کی قدر نہیں کرتا وہ اپنے پست ذہن کی وجہ سے پستی کو ہی پسند کرتا ہے اور ذلت کا خوگر ہو جاتا ہے اس کی طبیعت ذلیل ہو کر رہنے ہی کو پسند کرتی ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ طبیعت کی خواہشوں کے مطابق جیتا رہوں، چاہے جوتے ہی پڑتے رہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناراضگی...... حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی یہ ادا پسند نہ آئی اور فرمایا کہ تمہارے پاس عمدہ کھانا بغیر کسب معاش اور بغیر محنت مشقت کے پہنچ جاتا ہے۔ تم اس عمدہ چیز کو چھوڑ کر گھٹیا چیزیں طلب کر رہے ہو، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اگر تم کو سبزیاں اور ترکاریاں، دال اور پیاز چاہیے تو کسی شہر میں چلے جاؤ۔ یہ چیزیں وہاں ملیں گی۔

لفظ ''**فـــوم**'' کا معنی تفسیر کی کتابوں میں گیہوں بھی لکھا ہے اور لہسن بھی، دونوں ہی معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ بنی ہاشم کی زبان میں **فـــوم** گیہوں کو کہا جاتا تھا۔ حضرت مجاہدؒ نے اس کا ترجمہ لہسن کیا اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے بعض حضرات کا قول نقل کیا ہے کہ ''**الحبوب التی تو کل کلها فوم**'' یعنی تمام غلے جو کھائے جاتے ہیں وہ سب **فوم** کا مصداق ہیں۔ (راجع ابن کثیر ص ۱۰۱ ج ۱)

یہودیوں پر ذلت اور مسکنت ماردی گئی...... پھر فرمایا کہ یہود پر ذِلت اور مسکنت ماردی گئی یعنی ان کے ساتھ لازم کر دی گئی۔ وہ برابر ذلیل رہیں گے، جس میں دوسری قوموں کا ماتحت ہونا جزیہ دینا مال کا حریص ہونا بہت زیادہ مال ہوتے ہوئے بھی مال کی طلب میں لگنا اور جان کھپانا یہ سب ذلت میں داخل ہے۔ صاحب معالم التنزیل (ص ۷۸ ج ۱) لکھتے ہیں...... **فتـــری الیهـــود وان کـــانوا میاسیر کأنهم فقراء وقیل الذلة هی فقر القلب فلا تری فی أهل الملل اذل واحرص علی المال من الیهود**۔ (یہود پر چونکہ ذلت اور مسکنت ماردی گئی اور اُن کی جانوں کے ساتھ لگا دی گئی اس لئے تم ان کو دیکھو گے کہ مال دار ہوتے ہوئے بھی فقیر ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ذلت سے دِل کا فقیر ہونا مراد ہے۔ اِسی لئے تمام اہلِ مذاہب میں یہودیوں سے بڑھ کر کوئی قوم زیادہ ذلیل اور مال کی حریص نہیں ہے)

صاحب معالم التنزیل نے سچ فرمایا کہ مالدار ہوتے ہوئے لیچڑ ہونا اور پیسے کے لئے جان دینا اور تھوڑا سا نقصان ہو جانے پر بیمار پڑ جانا دل کا دورہ پڑ جانا یا اچانک مر جانا، یہ باتیں قلبی فقر کو ظاہر کرتی ہیں اور اس کے نمونے اگر دیکھنے ہوں تو ہندوستان کے بنیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

یہود نے انبیاء کرامؑ کو قتل کیا اِس لئے غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے...... پھر فرمایا کہ وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے اور ذلت اور مسکنت کا ان کے ساتھ لازم ہو جانا اور غضبِ الٰہی کا مستحق ہو جانا اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا قتل تو ناحق ہی ہوتا ہے لیکن **بغیر الحق** کی تصریح اس لئے فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی ان کو قتل کرنا ناحق تھا پھر یہ کہ ان حضرات کے قتل کرنے پر کوئی ندامت نہیں ہوتی تھی۔ مفسر ابنِ کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے شروع دِن میں تین سو نبیوں کو قتل کر دیا (علیہم الصلوٰۃ والسلام) پھر شام کو اپنے بازاروں میں سبزیوں کا کاروبار شروع

کر دیا۔ بنی اسرائیل نے جن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قتل کیا اُن میں حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کے اسماء گرامی زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ارشاد فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ سخت عذاب والا وہ شخص ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا جسے کسی نبی نے قتل کیا یا جس نے اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کیا اور تصویر بنانے والوں کو بھی سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا اور اُس عالم کو بھی جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہ کیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۷۸ از بیہقی فی شعب الایمان)

یہودیوں کی حکومت سے متعلق ایک سوال ...... جب سے یہودیوں کی حکومت قائم ہوئی ہے تو کم علم یہ اشکال پیش کرنے لگے ہیں کہ قرآن مجید میں پیشین گوئی تھی کہ اُن کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی اِس پیشین گوئی کے خلاف کیسے ہوگیا؟ یہ سوال کوئی وزنی نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے بلکہ سورۂ آلِ عمران میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو ذِلت ان پر ماردی گئی ہے بعض حالات میں وہ نہ رہے گی چنانچہ ارشاد ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (یعنی اُن پر ذلت جمادی گئی وہ جہاں کہیں پائے جائیں مگر اللہ کے کسی قانون کے ذریعے سے یا آدمیوں کے ذریعہ سے) اللہ کے قانون کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی یہودی بوڑھا ہو عبادت میں لگا ہو مسلمانوں سے جنگ نہ کرتا ہو تو وہ قتل نہ کیا جائے گا۔ اگر چہ اس کی عبادت آخرت میں نفع دینے والی نہیں ہے۔ اور آدمیوں کے ذریعہ اس کی ذلت رُک جانے کا ذریعہ یہ ہے کہ کسی قوم سے ان کی صلح ہو جائے یا کوئی قوم ان کو قوت پہنچانے لگے یا اُن کی مدد کرنے لگے جس سے اُن کو تھوڑی سی عارضی عزت مل جائے۔ ظاہر ہے کہ یہودیوں کی جو اب حکومت قائم ہے وہ بعض دوسری حکومتوں کی وجہ سے ہے اگر وہ ان کی مدد و معاونت چھوڑ دیں تو ایک دن بھی ان کی حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، اور نصاریٰ اور صابئین، ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲

اور نیک عمل کرے سو اُن کے لئے اجر ہے اُن کے رَب کے پاس اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

صرف ایمان اور عملِ صالح ہی مدارِ نجات ہے

گزشتہ آیت میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہودیوں پر ذلت اور مسکنت لازم کردی گئی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہوئے اور اُس کا سبب یہ بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا اِنکار کرتے تھے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں لگتے اور حدود سے آگے بڑھتے تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے مطرود اور مردود ہونا کوئی یہودی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونا اور مستحقِ اجر و ثواب ہونا اور قیامت میں بے خوف اور بے غم ہونا کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جو بھی کوئی شخص ایمان کی صفت سے متصف ہوگا وہ اپنے رب کے نزدیک مستحق اجر و ثواب اور بے خوف و بے غم ہوگا۔ یہ ایمان کی صفت ہر قوم کے اپنے اپنے زمانہ کے اعتبار سے تھی۔ یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور تورات شریف پر ایمان لائیں۔ اور ہر اُس عقیدہ کو مانیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بتایا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر

اور انجیل شریف پر ایمان لانا اور اُن کی شریعت کو پوری طرح سے ماننا اور جو کچھ اُنہوں نے بتایا اُس کو تسلیم کرنا یہ اُن کے زمانہ کے لوگوں کا ایمان تھا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول تھا جو لوگ اُن پر ایمان نہ لائے یا ایمان تو لائے لیکن بعد میں اُن کی شریعت کو بدل دیا اور ان کے دین میں شرک داخل کر دیا، وہ لوگ مؤمن نہ رہے۔ یہودیوں نے جب اُن کی نبوت اور رسالت سے انکار کیا تو اُن میں جو اَب تک مؤمن تھے وہ بھی کافر ہو گئے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ...... پھر جب خاتم النبیین سرورِ عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جن کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ اور جن کا تذکرہ توریت اور انجیل میں پاتے تھے یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ تو اب ایمان یہ ہو گیا کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ کی ہر بات تسلیم کریں۔ اِسی لئے سورۃ آلِ عمران میں فرمایا وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (یعنی جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)۔ جتنی قومیں بھی دُنیا میں بستی ہیں اور جتنے اہلِ مذاہب آنحضرت سرورِ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے یا اب موجود ہیں خواہ وہ کسی نبی کے ماننے اور پیرو ہونے کے مدعی ہوں اور خواہ کسی بھی دین پر ہوں اُن سب پر فرض ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ہر وہ عقیدہ تسلیم کریں اور مانیں جو آپ نے بتایا۔ قیامت تک کے لئے ہر قوم ہر جماعت ہر فرد ہر علاقہ کے انسان آپ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہیں۔

سورۂ اعراف میں فرمایا:۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (آپ فرما دیجئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا پیغمبر ہوں تم سب کی طرف)

اور سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ. (اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے)

لہٰذا جب سے آپ کی بعثت ہوئی ہے یہودی، نصرانی فرقہ صابئین اور ہر قوم اور ہر اہلِ مذہب کے لئے معیارِ نجات صرف سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اور کسی قسم کا کوئی ایمان معتبر نہیں صرف یہی ایمان معتبر ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس کو دل سے مانے اور تسلیم کرے۔

ان سب تصریحات کو سمجھ لینے کے بعد اب آیت کا ترجمہ اور مطلب سمجھ لیں کہ جو لوگ ایمان لائے یعنی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کے اقراری ہوتے ہوئے آپ کو دل سے نبی اور رسول مانا اور یہودی اور نصرانی اور صابئین میں سے جو کوئی اللہ پر ایمان لائے گا اور یوم آخرت کو مانے گا۔ اور عملِ صالح کرے گا اور یہ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر اور عملِ صالح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ایمان کے مطابق اور عملِ صالح آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے موافق ہوگا تو ایسے لوگ قیامت کے دن بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

وحدتِ اَدیان کا فتنہ اور اس کی تردید...... اتنی بڑی تفصیل ہم نے دورِ حاضر کے ملحدین اور زنادقہ کی تردید کرنے کے لئے لکھی ہے دورِ حاضر کے فتنوں میں وحدتِ ادیان کا فتنہ بھی ہے۔ بہت سے اہلِ باطل یہ کہتے ہیں کہ نجاتِ اُخروی کے لئے اللہ پر اور آخرت پر ایمان لانا کافی ہے۔ دینِ اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ (العیاذ باللہ) یہ لوگ اپنی گمراہی کو پھیلانے کے لئے آیت بالا کو پیش کرتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں صرف مـن آمن باللہ و الیوم الآخر مذکور ہے۔ایمان بالرسول کا ذکر نہیں ہے۔ یہ لوگ جاہلوں کو دھوکہ دینے کے لئے اُن آیات کو سامنے نہیں رکھتے جو ہم نے اُوپر ذکر کی ہیں۔ایمان باللہ کا مطلب صرف اتنا سا نہیں ہے کہ اللہ کے وجود کا اقرار کرے اور انسانوں کے خود ساختہ طریقوں سے عبادت کرلیا کرے۔اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے اس کے جاننے کا ذریعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

یہ کیسا ایمان باللہ ہے کہ بتوں کی پوجا کریں اور اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کریں اور یہ کیسا یوم آخرت پر ایمان ہے کہ تناسخ یعنی آواگون کے قائل ہوں اور جنت دوزخ کے منکر ہوں۔آیتِ شریفہ میں الذین اٰمنوا سے صرف اہلِ اسلام مراد ہیں۔

یہود کی وجہ تسمیہ......اور اَلَّـذِیْنَ هَادُوْا سے یہود مراد ہیں۔ھـاد یھود توبہ کرنے کے معنی میں آتا ہے چونکہ ان لوگوں نے گائے کے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کی تھی اس لئے ان کو اِن لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔اِنکا مشہور نام یہود ہے۔ جماعت کو یہود اور ایک شخص کو یہودی کہتے ہیں۔بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے یہودا کی طرف منسوب ہیں۔ اس لئے انکو یہودی کہا جاتا ہے۔بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ لفظ تھـود سے مشتق ہے جو تحرک یعنی حرکت کے معنی میں ہے۔چونکہ یہ لوگ توریت شریف پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے اسی طرح ان کا یہ لقب پڑ گیا۔(قاله ابو عمر و ابن العلاء)

النصارٰی...... سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو ماننے کے مُدعی ہیں۔بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ لفظ نصرت سے مشتق ہے۔جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مَـنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ فرمایا تو اُن کے حواریین نے نَـحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کہا جیسا کہ سورۂ صف میں مذکور ہے۔لفظ نصارٰی کو جمع نصران بھی بتایا گیا ہے،جیسا کہ سکران کی جمع سکارٰی ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک بستی میں سکونت اختیار کی تھی جس کو ''ناصرہ'' کہا جاتا تھا اس کی وجہ سے ان کو نصارٰی کہا گیا۔ بہرحال وجہ تسمیہ جو بھی ہو نصارٰی سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے مدعی ہیں۔ان دعویداروں میں وہ بھی تھے جو اُن کے واقعی اصلی دین پر تھے اور اُن کے دین میں کسی طرح کی تغییر و تبدیل نہیں کی اور وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اُن کا دین بدل دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ کو بھی معبود ماننے لگے۔قرآن مجید میں ان کو کسی جگہ عیسائی نہیں فرمایا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت نہیں کی۔ مُشرک اُن کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔قرآن نے ان کے لئے لفظ نـصـارٰی استعمال فرمایا ہے۔

الصَّابئین...... یہ صَبَـا، یَـصْبُوُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔زمانہ نزولِ قرآن میں اس فرقہ کا وجود تھا، اِن لوگوں کا دین کیا تھا، اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں۔حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت کے درمیان تھے۔ان کا مستقل کوئی دین نہ تھا۔حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ابن ابی الزنادؒ نے اپنے والد سے نقل کیا کہ یہ وہ لوگ تھے جو عراق کے قریب رہتے تھے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لاتے تھے اور سال بھر میں تیس روزے رکھ لیتے تھے اور یمن کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے تھے۔عبدالرحمٰن بن زید نے کہا کہ یہ لوگ موصل کے جزیرہ میں تھے صرف لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے تھے۔خلیل کا قول ہے کہ اِن کا دین نصارٰی کے دین سے ملتا جلتا تھا۔ان کا قبلہ جنوبی ہوا کی طرف تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔وہب بن منبہ کا قول ہے کہ یہ لوگ نہ دینِ یہودیت پر تھے نہ نصرانیت پر نہ مجوسیت پر اور مشرک بھی نہ تھے۔یہ فطرت پر باقی تھے۔اُس کا کوئی مقرر دین نہ تھا جس کا اتباع کرتے اور بعض علماء کا قول ہے کہ صابئین وہ لوگ ہیں کہ

جن کوکسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ (آیت کی تفسیر اور توضیح کے لئے ہم نے تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا اہل علم اس کی مراجعت فرمالیں)

فائدہ۔۔۔۔۔صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ حاصل قانون کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے یہاں مقبول اور اُس کی خدمت مشکور ہے اور ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحق اجر و نجات اخروی ہوگا۔

اور اس قانون میں مُسلمانوں کے ذکر کی ظاہر میں ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو مسلمان ہی ہیں لیکن اس کلام میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ مورد عنایات ہوگا اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سُنانا ہے اصل میں مخالف کو، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں بلکہ ان کی صفتِ موافقت مدار ہے۔ ہماری عنایت کا سو مخالف بھی اگر اختیار کرلے وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کردیا گیا۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ

اور جب ہم نے لے لیا تمہارا عہد اور اُٹھا دیا تمہارے اُوپر طور کو، لے لو قوت کے ساتھ جو کچھ ہم نے تم کو دیا اور یاد کرو جو کچھ اس

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ

میں ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ پھر اس کے بعد تم نے رُوگردانی کی، سو اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾

ضرور تم تباہ کاروں میں سے ہو جاتے۔

بنی اسرائیل سے پختہ عہد لینا پھر ان کا مُنحرف ہو جانا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لے کر آئے اور مستقل شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی تو بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی کتاب پر ایمان لائیں اور اس کے رسول کا اتباع کریں اور اس کی شریعت پر عمل کریں گے۔ جب انہوں نے سخت احکام دیکھے تو عمل کرنے سے اِنکاری ہو گئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پہاڑِ طُور کو اس کی جگہ سے اُکھاڑ کر ان کے اُوپر کھڑا کردیا اور فرمایا کہ ہم نے جو کچھ دیا ہے اسے قوت کے ساتھ لے لو اور جو کچھ اُس میں ہے اُسے یاد کرو۔ سورۂ اعراف میں اور زیادہ واضح طریقے پر اس کو یوں بیان فرمایا: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌ ۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اُٹھا کر سائبان کی طرح اُن کے اوپر معلّق کر دیا۔ اور اُن کو یقین ہوگیا کہ اب ان پر گرا اور ہم نے کہا کہ لے لو قوت کے ساتھ جو ہم نے تم کو دیا ہے اور یاد کرو، جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔)

جب انہوں نے دیکھا کہ واقعی پہاڑ گرنے کو ہے تو اس وقت مان لیا لیکن بعد میں اس میثاق عظیم کو توڑ دیا اور اقرار سے پھر گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کی توفیق دی اور اُن کو باقی رکھا اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ان کی طرف آتے رہے اور اُن کو ہدایات دیتے رہے

اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو دنیا وآخرت میں برباد ہو جاتے۔ (من ابن کثیر)

شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آئے کہ دین میں تو زبردستی نہیں ہے جیسا کہ لا اکراہ فی الدین میں بتایا ہے پھر پہاڑ سروں پر اُٹھا کر بنی اسرائیل سے کیوں قول وقرار لیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اسلام قبول کرانے کے لئے زبردستی نہیں ہے، اگر کوئی قوم مسلمان نہ ہو جزیہ دیکر رہنا چاہے اس سے جزیہ قبول کرلیا جائے گا۔ جس نے اسلام قبول کرلیا اس سے احکام پر زبردستی عمل کرانے کی نفی لَآ اِکْـرَاهَ فِی الـدِّیـنِ میں نہیں ہے اسی لئے ذمی کو قتل نہیں کیا جاتا اور جو شخص اسلام کو چھوڑ کر دُوسرا دین اختیار کرے اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی اگر تین دن کے بعد اسلام میں واپس نہ آئے تو قتل کر دیا جائے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾

اور البتہ تحقیق تم نے ان لوگوں کو جان لیا جنہوں نے سنیچر کے دن میں زیادتی کی، سو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پھر ہم نے اس کو عبرت بنا دیا اُن لوگوں کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے۔ اور نصیحت بنا دیا ڈرنے والوں کے لئے۔

یہودیوں کا سنیچر کے دن میں زیادتی کرنا اور بندر بنا دیا جانا

جیسے مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دِن معظم قرار دیا گیا ہے اسی طرح یہودیوں کے لئے سنیچر کے دن کو معظم قرار دیا گیا تھا اور اس کی تعظیم کے لئے یہ حکم بھی تھا کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ ایک طرف تو یہ حکم تھا اور دوسری طرف ان کا امتحان تھا اور وہ امتحان اس طرح سے تھا کہ دوسرے دِنوں میں مچھلیاں عام حالات کے مطابق پانی کے اندر ہی رہتی تھیں اور سنیچر کے دِن خوب اُبھر اُبھر کر پانی پر آ جاتی تھیں جس کا تذکرہ سورۂ اعراف کی آیت وَسْـئَلْهُـمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِیْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ میں فرمایا ہے چونکہ سنیچر کے دن مچھلیاں خوب اُبھر کر سامنے آ جاتی تھیں اس لئے ان لوگوں نے ان کے پکڑنے کے لئے حیلے نکالے اور یہ کہا کہ سنیچر کا دِن آنے سے پہلے جال اور مچھلی پکڑنے کے کانٹے پہلے سے پانی میں ڈال دیتے تھے۔ چُنانچہ وہ ان میں پھنس کر رہ جاتی تھیں جب سنیچر کا دِن گزر جاتا تھا تو اُن کو پکڑ لیتے تھے اور اپنے نفسوں کو سمجھا لیتے تھے کہ ہم نے سنیچر کے دِن ایک مچھلی بھی نہیں پکڑی وہ تو خود سے جالوں میں اور کانٹوں میں آ گئیں اور یہ جال اور کانٹے ہم نے جمعہ کے دن ڈالے تھے ان کو منع کرنے والوں نے منع کیا تو نہ مانے لہٰذا اللہ پاک کی طرف سے ان پر یہ عذاب آیا کہ ان کو بندر بنا دیا گیا۔ جب یہ لوگ بندر بنا دیئے گئے تو بندروں کی طرح آوازیں نکالتے تھے اُنکی دُمیں بھی پیدا ہو گئیں جو لوگ ان کو منع کرتے تھے وہ ان کے پاس گئے اور کہا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ سر ہلا کر جواب دیتے تھے۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا: وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ اس میں بتایا ہے کہ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے یہ خنزیر بنا دینے کا واقعہ اسی موقع سے متعلق ہے جبکہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے کے جرم میں بندر بنا دیئے گئے تھے یا اور کسی موقع سے متعلق ہے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ملی۔ البتہ تفسیر ابنِ کثیر میں آیت بالا وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ کے ذیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سنیچر کے دن زیادتی کرنے والے بندر بنا دیئے گئے اور خنزیر بھی، اُن میں جو جوان تھے وہ بندر ہو گئے اور جو بوڑھے تھے وہ خنزیر بنا دیئے گئے۔

حضرت ابن عباس سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ قوم مسخ ہوئی ہے وہ مسخ شدہ حالت میں تین دن سے زیادہ نہیں رہی ان تین دنوں میں انہوں نے کچھ کھایا پیا نہیں اور اُن کی نسل بھی نہیں چلی ۔ یہ جو بندروں اور خنزیروں کی نسلیں ہیں مسخ شدہ قوموں کی نسلیں نہیں ہیں بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے ۔ الجامع الصغیر میں بروایت حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد نقل کیا ہے ۔ ما مسخ اللہ تعالیٰ من شئ فکان له عقب و لا نسل رمزله السیوطی بالحسن قال الهیثمی فیه لیث بن سلیم مدلس و بقیة رجاله رجال الصحیح (کما فی فیض القدیر ص۴۲۶ ج۵) (جو قومیں اللہ تعالیٰ نے مسخ کی ہیں ان کی بقایا جات اور نسلیں نہیں ہیں ۔ سیوطی نے اس حدیث کے حسن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں لیث بن سلیم راوی مدلس ہے اور بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں)

اس واقعہ کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں بیان ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاصی کی وجہ سے کئی طرح سے عذاب آتا رہا ہے ان میں سے ایک طریقہ صورتیں مسخ کر کے ہلاک کرنے کا بھی تھا اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ اب تک مسخ کے عذاب سے محفوظ چلی آ رہی ہے لیکن قربِ قیامت میں مسخ ہوگا ۔ جیسا کہ سنن الترمذی کتاب الفتن میں حدیث اذا اتخذ الفئی دولا کے آخر میں تصریح ہے اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بھی مسخ کئے جانے کا ذکر ہے ۔ (مشکوٰۃ ص ۴۵۶) جتنے بھی عذاب آئے سب میں عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے بھی جو عذاب کے وقت موجود تھے اور اُن کے لئے بھی جو بعد میں آنے والے ہیں اور اُن عذابوں میں نصیحت بھی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے خاص کر یہ مسخ کا عذاب تو بہت ہی زیادہ عبرت ناک ہے ہلاک تو ہو ہی گئے لیکن ہلاکت سے پہلے تین دن جو بندر رہے اس میں سب کے لئے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے اسی لئے فرمایا کہ ہم نے اس کو عبرت بنادیا اُن لوگوں کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے ہیں اور نصیحت بنادیا ڈرنے والوں کے لئے فَجَعَلْنٰهَا کی ضمیر عقوبت کی طرف یا قریٰ کی طرف راجع ہے جس سے اہلِ قریٰ مراد ہیں لِمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا کی تفسیر کرتے ہوئے مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں اُن کو مسخ کرنے کی سزا دی گئی اُس زمانہ کے لوگوں کے لئے اور اُن کے بعد آنے والوں کے لئے عبرت ہو جائے اور ایک معنی یہ لکھا ہے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہاں کی قریب کی بستیوں اور دُور کی بستیوں کے لئے عبرت ہو جائے ۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہ دوسرا معنی منقول ہے ۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے ۔

عن ابن عباس لما بین یدیها من القری و ما خلفها من القری ۔

اس کے بعد حضرت ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے ۔

و ما خلفها لما بقی ما بعد هم من الناس من بنی اسرائیل ان یعملوا مثل عملهم ۔

یعنی ما خلفها سے وہ بنی اسرائیل مراد ہیں جو اِس عبرتناک واقعہ کے بعد باقی رہے یہ واقعہ ان کیلئے عبرت ہے تا کہ اپنے اسلاف جیسا عمل نہ کریں ۔

حضرت حسنؒ اور قتادہؒ نے موعظۃً للمتقین کے بارے میں فرمایا کہ اُن لوگوں کے بعد میں جو آنے والے ہیں ان کے لئے نصیحت ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں گے اور خوف کھائیں گے اور عطیہ عوفی نے کہا ہے کہ المتقین سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت مراد ہے ۔ مفسر ابنِ کثیر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اُن چیزوں کا ارتکاب نہ کرو جن کا یہودیوں نے اِرتکاب کیا حیلوں کے ذریعہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال مت کرلو ۔ (وہذا اسناد جید)

یہود نے ایک اور بھی حیلہ کیا اور وہ یہ کہ ان پر چربی حرام کر دی گئی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو انہوں نے اچھی صورت میں بنا کر بیچ دیا۔ (بخاری ومسلم کمافی مشکوٰۃ ص ۲۴۱)

شراح حدیث نے اچھی صورت میں بنانے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ چربی کو انہوں نے پگھلا دیا اور اس میں کچھ ملا کر دوسرا کوئی نام رکھ کر اس کو بیچ دیا۔ اور اس کی قیمت کھا گئے۔ اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں اس طرح کے حیلے رواج پا گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ شراب کو حلال کر لیں گے عرض کیا یہ کیسے ہوگا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی حرمت واضح طور پر نازل فرمائی ہے آپؐ نے فرمایا کہ یسمونها بغير اسمها فيستحلونها یعنی وہ شراب کا دوسرا نام رکھ لیں گے اور اس طرح اس کو حلال کر لیں گے۔ (رواہ الدارمی، مشکوٰۃ ص ۴۶۱)

چنانچہ آج کل ایسی باتیں سننے میں آ رہی ہیں، شراب پیتے ہیں، نام دُوسرا رکھ لیا ہے، سود لیتے ہیں اس کا نام نفع رکھ لیا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے تدبیریں کر لیتے ہیں، تصویریں اور مورتیاں حلال کرنے کے لئے حیلے تراشتے ہیں، داڑھی مونڈنے کے جواز کے لئے حجتیں نکالتے ہیں ایسے حیلوں اور بہانوں کی تفصیلات بہت ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے بیشک اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کیا تُو ہمارا مذاق بناتا ہے؟

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ

موسیٰ نے کہا میں اس بات سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ وہ کہنے لگے کہ تو اپنے رب سے دُعا کر ہمارے لئے بیان کر دے کہ وہ بیل کیسا ہو،

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا

موسیٰ نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو بوڑھا نہ ہو اور بالکل جوان بھی نہ ہو اِن دونوں کے درمیان ہو، سو تم اس پر عمل کر لو جس کا تم کو

تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ تو اپنے رب سے دُعا کر ہمارے لئے بیان فرما دے کہ اس بیل کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ نے کہا بے شک وہ فرماتا ہے کہ

صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ

وہ تیز رنگ کا پیلا بیل ہو جو دیکھنے والوں کو خوش کرتا ہو۔ وہ کہنے لگے کہ تُو اپنے رب سے ہمارے لئے دُعا کر ہمارے لئے بیان فرما دے کہ اس بیل کی پُوری کیا حقیقت ہے؟ بیشک بیلوں کے بارے

تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا

میں ہم کو اشتباہ ہو رہا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔ موسیٰ نے کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو صحیح

ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ

سالم نکما نہ ہو گیا ہو، وہ نہ زمین کو پھاڑتا ہو اور نہ کھیتی کو سیراب کرتا ہو اس میں ذرا کوئی دھبہ نہ ہو، وہ کہنے لگے کہ اب تم نے ٹھیک طرح

بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۟ؒ

ع ۸/۱۰

طرح بیان کیا ہے، لہٰذا انہوں نے وہ بیل ذبح کر دیا اور حال یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے نہ تھے۔

ذبح بقرہ کا قصہ، یہود کی کج بحثی

ان آیات میں ذبح بقرہ کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ بقرہ عربی زبان میں گائے اور بیل دونوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ بیل کیا ہے اور اُن کا فرمانا ہے کہ قصہ کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ وہ بقرہ ایسا ہو جو ہل جوتنے میں استعمال نہ کیا ہو اور کھیتی کی آبپاشی میں اس کو نہ لگایا گیا ہو۔ یہ کام چونکہ بیل ہی سے ہوتا ہے اس لئے بقرہ سے بیل مراد ہے۔ دوسرے حضرات نے اس کا ترجمہ گائے سے کیا ہے۔ چونکہ بقرہ اسمِ جنس ہے اس لئے گائے کا ترجمہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ وزن دار ہے کیونکہ قرآن کے الفاظ سے اِس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بارے میں قرآن مجید کی اگلی آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص مقتول ہو گیا تھا اور قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ لہٰذا قاتل کا پتہ چلانے کے لئے اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ ایک بیل ذبح کرو اور اس بیل کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم میں مارو چنانچہ بڑی حجتوں کے بعد بنی اسرائیل نے ایک بیل ذبح کیا اور ذبح شُدہ بیل کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم میں مار دیا۔ چنانچہ وہ مقتول زندہ ہو گیا (اور اپنا قاتل بتا کر اُسی وقت دوبارہ مر گیا)

واقعہ کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں کئی طرح سے لکھی ہے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی کوئی اولاد نہ تھی اور مالدار بہت تھا اور اس کے بھائی کے لڑکے تنگدست تھے۔ اور اُن کو چچا کی میراث بھی پہنچتی تھی۔ یہ لوگ چچا کی موت کا انتظار کرتے تھے لیکن اس کی زندگی لمبی ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا شیطان نے ان کو یہ سمجھایا کہ تم اپنے چچا کو قتل کر دو تم اس کے مال کے وارث بھی ہو جاؤ گے اور اس کی دیت (خون بہا) بھی حاصل کر لو گے۔ جس جگہ کا یہ واقعہ ہے وہاں دو بستیاں تھیں جب کوئی مقتول دونوں بستیوں کے درمیان پڑا ہوا ملتا تھا تو جس بستی سے قریب تر ہوتا اس پر دیت ڈال دی جاتی تھی شیطان نے اُن لوگوں کو سمجھایا کہ تم قتل کر کے دوسری بستی کے قریب ڈال دینا جس میں تمہاری سکونت نہیں ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے چچا کو رات میں قتل کر کے دوسری بستی کے قریب ڈال دیا پھر جب صبح ہوئی تو یہی قاتلین دعویدار ہو گئے اور اس بستی والوں پر دعویٰ کر دیا جس کے قریب نعش کو ڈال دیا تھا۔ اور اُن سے کہا کہ تمہاری بستی کے دروازے پر ہمارا چچا مقتول ملا ہے۔ ہم تم سے اس کی دیت ضرور لیکر چھوڑیں گے اس بستی کے لوگ قسم کھانے لگے اور انہوں نے کہا ہم نے نہیں قتل کیا اور نہ ہی ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے۔ ہم نے شام سے لے کر صبح تک اپنی بستی کا دروازہ ہی نہیں کھولا، لہٰذا ہمارے ذمہ اس کے قتل کا الزام لگا دینا صحیح نہیں اور کوئی دیت لازم نہیں۔ مفسر سدی نے واقعہ اس طرح بیان کیا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت مالدار تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی اور اُس کے بھائی کا بیٹا تھا جو غریب تھا۔ اس نے اپنے چچا کو پیغام دیا کہ اپنی لڑکی سے میرا نکاح کر دو، چچا نے انکار کیا تو وہ غصہ ہو گیا اور اس نے چچا کے قتل کا خیال دِل میں جما لیا اور اپنے دِل میں کہا کہ چچا کو قتل بھی کروں گا اور اس کا مال بھی لوں گا اور اس کی بیٹی سے نکاح بھی کروں گا اور اس کی دیت بھی کھا جاؤں گا۔ لہٰذا وہ چچا کے پاس آیا اور رات کو اپنے چچا کو ایک کاروباری ضرورت بتا کر اپنے ساتھ لے گیا اور کسی جگہ جا کر قتل کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو اِس انداز میں باتیں کر رہا ہے کہ خُدا جانے میرے چچا کہاں گئے؟ جس جگہ قتل کیا تھا وہاں پہنچا دیکھا کہ وہاں کے لوگ

اُس نعش کے قریب جمع ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو اس نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے میرے چچا کو قتل کیا ہے لہٰذا اس کی دیت ادا کرو۔ وہ دیت کا مطالبہ کر رہا تھا اور رو رہا تھا اور سر پر مٹی ڈال رہا تھا اور ہائے ہائے چچا کی آوازیں لگا رہا تھا۔

واقعہ کی صورت جو بھی ہو قاتل کا پتہ چلانے کے لئے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قاتل کا پتہ چلانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مار دو۔ بات سننے کے ساتھ ہی اُن کو چاہیے تھا کہ کوئی بھی ایک بیل ذبح کر کے مقتول پر مار دیتے۔ لیکن اوّل تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو مذاق اور مخول بتایا، کہنے لگے کہ کہاں بیل کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم کو مارنا اور کہاں مقتول کا زندہ ہو کر نام بتانا یہ بے جوڑ بات ہے آپ تو ہم لوگوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں ان جاہلوں نے یہ نہ سوچا کہ ہمیں اللہ کا نبی ایک بات بتا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اس میں مذاق اور مخول کا وہم بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ اپنی جہالت اور حماقت سے ایسی بات کہہ بیٹھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ناگوار ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ..... اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔ (کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں) ایک ادنیٰ مسلمان سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اللہ کے حکم کو مخول اور ٹھٹھا مذاق بنائے۔ یہ تو جہالت کی بات ہے پھر اللہ کا نبی کیسے اللہ کی طرف کسی ایسے حکم کی نسبت کر سکتا ہے جو مذاق اور مخول ہو۔ پھر جب بیل ذبح کرنے پر راضی ہو گئے تو طرح طرح کے سوالات کرتے گئے اور اُن سوالات کے ذریعہ بندشوں اور قیدوں میں بندھتے چلے گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ کوئی بھی بقرہ ذبح کر دیتے تو اُن کا کام چل جاتا لیکن اُنہوں نے سختی کا راستہ اختیار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بے تکے سوالات کرتے رہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر حکم میں سختی فرما دی۔ وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دُعا کریں جو ہمیں یہ بتا دے کہ وہ بیل کیسا ہے یعنی اس کی عمر کتنی ہو۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ وہ بوڑھا جانور بھی نہ ہو اور بالکل کم عمر بچھڑا بھی نہ ہو۔ ان دونوں کی درمیانی عمر کا ہو اور فرمایا کہ جو تم کو حکم ہو رہا ہے اس کو کر گزرو۔ لیکن ان لوگوں کو اُلٹی چڑھی ہوئی تھی، پھر سوال اُٹھایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اپنے رب سے ہمارے لئے یہ دُعا کر دیجئے کہ وہ ہمیں اس کا رنگ بتا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسا بیل ہو جس کا رنگ پیلا خالص گہرا تیز ہو جس سے دیکھنے والوں کی طبیعت خوش ہوتی ہو۔ اُن لوگوں نے پھر سوال اُٹھایا کہ ہماری سمجھ میں تو پوری طرح بات نہیں آئی اپنے رب سے ہمارے لئے دُعا کیجئے کہ وہ ہمیں خوب واضح طور پر بتا دے کہ وہ بیل کیسا ہو بیل بہت سارے ہیں طرح طرح کے ہیں ہمیں اشکال ہو رہا ہے کہ کونسا بیل ذبح کریں اب کی مرتبہ بیان ہو جانے پر ان شاء اللہ ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی ان کو پوری طرح اُس بیل کا حال بیان نہ کیا جاتا جس کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔ (درمنثور میں اس کو حدیث مرفوع بتایا ہے) لیکن مفسر ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بظاہر حضرت ابوہریرہؓ کا کلام ہے۔

بہر حال تیسری بار جب اُنہوں نے سوال کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ وہ ایسا بیل نہ ہو جسے کام کاج میں استعمال کر کے نکما کر دیا گیا ہو یعنی اس نے نہ تو کھیتوں میں ہل چلایا ہو اور نہ آبپاشی کے لئے اُسے کنویں سے پانی نکالنے میں استعمال کیا گیا ہو۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اس کا جو رنگ بتایا گیا ہے پورا بیل اُسی رنگ کا ہو۔ اُس میں کسی قسم کے دوسرے رنگ کا نشان داغ دھبہ نہ ہو اور وہ جانور جسمانی طور پر صحیح سالم ہو اُس کے اعضاء میں کمی اور خرابی نہ ہو مثلاً لنگڑا، کانا، اندھا نہ ہو۔ جب بیل کے حالات بیان ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہاں اب آپ نے پوری طرح ٹھیک اور واضح بات کی ہے۔ لہٰذا اب اُس قسم کا جانور تلاش کرنے

لگے جیسا بیان کیا گیا تھا اور جو اُن کے سوالات کے جوابات کے بعد اپنی خاص صفات کے اعتبار سے متعین ہو چکا تھا۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے (جو اسرائیلی روایات سے منقول ہے) کہ وہ جانور ان کو بہت زیادہ مہنگا ملا۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ لوگ انہیں مخصوص صفات کا بیل تلاش کر رہے تھے اسی اثناء میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کے پاس مذکورہ صفات کا بیل تھا اس سے کہا یہ ہمیں بیچ دے۔ یہ لوگ قیمت لگاتے رہے اور وہ قیمت بڑھاتا رہا حتیٰ کہ اس بیل کے وزن کا دس گنا سونا دینے پر معاملہ ہوا۔ چنانچہ وہ سونا اُس نے قیمت کے طور پر لے لیا یہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے۔ درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس بیل کی کھال دیناروں سے بھر کر دینے کا سودا کیا۔ اور اس بیل کے مالک نے اس قدر دینار لیکر وہ بیل اُن کے حوالے کیا۔ بہر حال خدا خدا کر کے وہ لوگ ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے اور اُس بیل کو اُنہوں نے ذبح کر دیا حالانکہ ان کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ یہ کام کرنے والے نہیں تھے۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور جب تم نے ایک جان کو قتل کر دیا پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس کو ظاہر فرمائے جس کو تم چھپا رہے ہو،

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

پس ہم نے حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ اس میں مارو، ایسا ہی اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے مُردوں کو، اور دکھاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل سے کام لو۔

مُردہ زندہ ہونے کا ایک واقعہ اور قصۂ سابقہ کا تکملہ

ان آیات میں سابقہ قصہ کا تتمہ بیان فرمایا ہے اور یہ بھی بیان فرمایا کہ ذبح بقرہ کا حکم کیوں ہوا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ تم نے ایک خون کر دیا تھا اور اس خون کو ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے، قاتل اقراری نہیں تھا اور ہمیں منظور تھا کہ اس کے قاتل کا لوگوں کو علم ہو جائے لہٰذا ہم نے یہ طریقہ بتایا کہ یہ جو بیل ذبح کیا ہے اس کا کوئی ٹکڑا مقتول کی لاش سے لگا دو۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اُن لوگوں نے اس بیل کا ایک ٹکڑا لیکر مقتول کے مونڈھوں کے درمیان لگا دیا چنانچہ وہ زندہ ہو گیا اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے قتل کیا ہے تو اس نے کہا مجھے میرے بھائی کے بیٹے نے قتل کیا ہے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میرا مال لے لے اور میری بیٹی سے نکاح کر لے، یہ بات بیان کر کے وہ شخص دوبارہ مر گیا اور قصاص میں قاتل کو قتل کر دیا گیا۔

یہاں یہ سوال اُٹھانا بے جا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یوں بھی قدرت ہے کہ جس مردہ کو چاہے زندہ فرمائے پھر اس کے لئے بیل کا ذبح ہونا اور مقتول کو اس کے گوشت کا ٹکڑا مارا جانا کیوں مشروط کیا گیا؟ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنا مخلوق کے بس کا کام نہیں۔ اور نہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تکوین اور تشریع میں جو حکمتیں ہیں اُن میں سے کوئی سمجھ میں آ جاتی ہے کبھی سمجھ میں نہیں آتی۔ مؤمن بندہ کا کام ماننا اور عمل کرنا ہے۔ ذبح بقرہ سے متعلق ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کی حجت بازی اور کج روی کا حال عام لوگوں کو اور ان کے بعد میں آنے والی نسلوں کو معلوم ہو جائے تاکہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس کے بعد اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (ایسے ہی اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے مُردوں کو اور دکھاتا

ہے تم کو اپنی نشانیاں تا کہ تم عقل سے کام لو)

موت کے بعد زندہ کرنا اور حساب و کتاب کے لئے قبروں سے اُٹھایا جانا قرآن و حدیث میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے سے بہت سے لوگوں کو انکار رہا ہے کہ موت کے بعد زندہ ہوں گے اُن کے اشکالات قرآن مجید میں دُور کئے گئے ہیں اور بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ نے مُردوں کو زندہ کر کے دِکھایا ہے اُن مواقع میں سے ایک موقع یہ بھی تھا کہ مقتول نے بحکمِ خدا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتا دیا اور یہ واقعہ حاضرین کے سامنے ہوا، سب نے دیکھ لیا کہ مُردہ زِندہ ہوا۔ اور تواتر کے ساتھ یہ قصہ لوگوں تک پہنچ گیا۔ تو اَب موت کے بعد زندہ ہونے کا انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ عقلاً بھی یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مُردوں کے زندہ کرنے پر قدرت ہے۔ اور بعض مواقع میں حاضرین نے اپنی آنکھوں سے مُردوں کو زندہ ہوتا دیکھا ہے، عقل کو کام میں لائیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوئے، سو وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر ہوں یا اُن سے بھی زیادہ سخت، اور بلاشبہ بعض پتھر ایسے ہیں

لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ

جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بلاشبہ اُن میں بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پھر اُن سے پانی نکلتا ہے اور بلاشبہ اُن میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے

مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے بے خبر نہیں ہیں جن کو تم کرتے ہو۔

یہودیوں کی قلبی قساوت کا تذکرہ

اس آیت کریمہ میں یہودیوں کے قلوب کی قساوت اور سختی بیان فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ اُن میں سختی آ گئی۔ دلائلِ قدرت بھی دیکھتے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائلِ نبوت بھی دیکھتے ہیں ان کے دلوں میں ذرا خدا کا خوف نہیں ہے اور حق قبول کرنے کیلئے ذرا بھی آمادہ نہیں۔ پتھروں میں تو یہ بات ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

پہلے ان کے دِلوں کو سختی میں پتھروں سے تشبیہ دی جو اس اعتبار سے لوہے سے بھی سخت ہیں کہ لوہے کو بھٹی میں ڈالا جائے تو پگھل جاتا ہے لیکن کیسی ہی آگ ہو اس سے پتھر پگھلتا نہیں۔ پھر فرمایا کہ تمہارے دِل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں کیونکہ بعض پتھروں سے تو نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور جب پھٹتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے اگر تمہارے دِل نرم ہوتے تو نافرمانیوں کی وجہ سے خوب زیادہ روتے (یہ مثال ہے نہریں جاری ہونے کی) اور کچھ بھی نہیں تو تھوڑا بہت ہی روتے (یہ مثال ہے فیخرج منہ الماء کی) اور آنکھوں سے آنسو نہ نکلتے تو کم سے کم دِل ہی روتا (یہ مثال ہے یھبط من خشیة اللہ کی) (من ابن کثیر)

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں جو کچھ کرتے ہو وہ سب کچھ جانتا ہے اس سب کی سزا پاؤ گے دنیا کی کچھ دن کی زندگی کے دھوکے میں نہ آؤ۔

اہل کتاب کے دلوں کی سختی کا قرآن مجید میں اور جگہ بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً ط (پھر ان کے میثاق توڑنے کے باعث ہم نے ان کو ملعون قرار دے دیا اور ہم نے اُن کے دلوں کو سخت کر دیا)۔

اُمتِ محمدیہ کو حکم کہ قاسی القلب نہ بنیں ...... اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو حکم ہے کہ تم اہلِ کتاب کی طرح سے سخت دل مت بن جاؤ۔ سورۂ حدید میں ارشاد ہے ......

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے لئے اور جو دینِ حق نازل ہوا ہے اُس کے لئے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی پھر اُن پر ایک زمانہ دراز گزر گیا پھر اُن کے دِل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی اُن میں سے فاسق ہیں۔)

اپنے گناہوں کو یاد کرنا اور اللہ سے مغفرت چاہنا اور اللہ کے خوف سے رونا، یہ کسی کو حاصل ہو جائے تو بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے ڈر سے رویا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس ہو جائے (جس طرح دُودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا اسی طرح یہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا) (الترغیب والترہیب)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! نجات کس چیز میں ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھ کہ تجھے نقصان نہ پہنچادے اور تیرے گھر میں تیری گنجائش رہے (یعنی بلاضرورت گھر سے باہر نہ جا) اور اپنے گناہوں پر رویا کر۔ (اُخرجہ الترمذی فی ابواب الزہد)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ چار چیزیں بدبختی کی ہیں۔ (۱) آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی ان سے آنسو نہ نکلنا) اور (۲) دل کا سخت ہونا، (۳) لمبی لمبی آرزوئیں رکھنا، (۴) اور دنیا کی حرص رکھنا۔ (الترغیب ص ۲۴۵ ج ۴ عن البزار)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اے لوگو! روؤ اور رونا نہ آئے تو بتکلف رونے کی کوشش کرو کیونکہ دوزخ والے دوزخ میں اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر اس طرح جاری ہوں گے جیسے چھوٹی چھوٹی نہروں میں پانی جاری ہوتا ہے روتے روتے آنسو ختم ہو جائیں گے تو خون بہنے لگیں گے جس سے آنکھوں میں زخم ہو جائیں گے اور اس قدر کثرت سے خون اور آنسو جمع ہو جائیں گے کہ اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو جاری ہو جائیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۰۴ عن شرح السنۃ) اگر کوئی شخص قبر، دوزخ اور حشر کے حالات کا مراقبہ کیا کرے تو آسانی سے سخت دِلی دُور ہو سکتی ہے اور رونے کی شان پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا دل سخت ہے، آپ نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر۔ (مشکوٰۃ ص ۵۰۴)

کثرتِ ذکر سے دِل نرم ہوتا ہے اور زیادہ بولنے سے سختی آتی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ذِکر کے علاوہ زیادہ بات نہ کیا کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ بات کرنا دِل کی سختی کا سبب ہے اور بلاشبہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دُور وہ شخص ہے جس کا دِل سخت ہو۔ (رواہ الترمذی)

غیر ذی رُوح میں حیات ہے سب چیزیں اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتی ہیں: اس آیت میں پتھروں سے پانی نکلنا اور اُن سے نہریں جاری ہونا مذکور ہے اور ایسی بات ہے جو نظروں کے سامنے ہے دنیا میں چشمے ہیں جھرنے ہیں پہاڑوں سے پانی نکل رہے

ہیں عموماً لوگ اس کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ بعض پتھر اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اس بارے میں کسی کوتاہ عقل کو شبہ ہوسکتا ہے کہ اُن میں عقل وادراک نہیں ہے پھر وہ کیسے ڈرتے ہیں اور ڈر کر گر پڑتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ پتھروں میں اور دوسری جمادات میں ہمارے خیال میں ادراک اور شعور نہیں ہے کیونکہ وہ ہم سے بات نہیں کرتے اور ہمیں وہ احوال معلوم نہیں جو اُن پر گزرتے ہیں۔ اور ان کا اپنے خالق سے مخلوق اور مملوک اور عبادت گزار ہونے کا جو تعلق ہے انسان اس سے واقف نہیں ہے۔ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں ادراک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ (تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔ لیکن تم لوگ اُن کے پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں بلاشبہ وہ حلیم ہے غفور ہے)

اور سورۂ نور میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (کیا تجھ کو معلوم نہیں اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پر پھیلائے ہوئے ہیں سب کو اپنی اپنی دُعا اور اپنی اپنی تسبیح معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے)

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اُحد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اُس سے محبت کرتے ہیں۔ (ص ۵۸۵ ج ۲)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ بلاشبہ مکہ مکرمہ میں ایک پتھر ہے میں اُسے پہچانتا ہوں جن دِنوں میں میری بعثت ہوئی وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ (صحیح مسلم ص ۲۴۵ ج ۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا ہم ایک دن بعض اطراف مکہ کی طرف نکلے جو بھی درخت یا پہاڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتا تھا وہ السلام علیکم یا رسول اللّٰہ کہتا تھا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب المناقب وقال حسن غریب)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات یا نو کنکریاں لیں ان کنکریوں نے آپ کے ہاتھ میں تسبیح پڑھی یہاں تک کہ میں نے ان کی ایسی آواز سنی جیسی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے پھر آپ نے اُن کو رکھ دیا تو ان کی گویائی ختم ہوگئی۔ پھر آپ نے ان کنکریوں کو حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں رکھ دیا تو اُن کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو اُن کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی پھر حضرت عثمان کے ہاتھ میں رکھ دیا تو اُن کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی اور ہر مرتبہ میں نے شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سنی۔ (جمع الفوائد فی ذکر کلام الحیوانات والجمادات)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب جنّات بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر قرآن سننے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتایا کہ جنات حاضر ہیں؟ حضرت ابن مسعودؓ نے جواب دیا وہاں جو ایک درخت تھا اس نے آپ کو بتایا۔ (للشیخین کما فی جمع الفوائد)

اسطوانہ حنانہ کا قصہ تو مشہور ومعروف ہی ہے مسجد نبوی کے لئے منبر تیار کر دیا گیا تو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر خطبہ

دینے کے لئے تشریف فرما ہوئے اس سے پہلے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے یہ ستون کھجور کا تنا تھا۔ جب آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے تو کھجور کا یہ تنا چیخنے لگا جیسے بچہ چیختا ہے آپ منبر سے اُترے اور اس تنے کو چمٹا لیا اور اس سے ایسی آواز نکلنے لگی جیسے بچہ کی آواز ہوتی ہے جب اُسے چپ کیا جاتا ہے۔ یہ تنا جو اللہ کا ذکر سنا کرتا تھا اس سے محروم ہو جانے کے باعث بچہ کی طرح چیخنے لگا۔ (رواہ البخاری ص ۵۰۶ ج ۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے خیبر تشریف لے گئے تھے وہاں ایک یہودی عورت نے بکری کا ایک ہاتھ بھون کر پیش کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول فرمایا اور آپ کے بعض صحابہؓ نے بھی اس میں سے کھایا پھر آپؐ نے فرمایا آپ لوگ ہاتھ اُٹھالیں اور اُس یہودی عورت کو بُلا کر فرمایا کہ تو نے بکری میں زہر ملایا ہے، وہ کہنے لگی آپ کو کس نے بتایا آپؐ نے فرمایا مجھے بکری کے اس ہاتھ نے بتایا جو میرے ہاتھ میں ہے۔ کہنے لگی ہاں واقعی میں نے زہر ملایا ہے۔ (جمع الفوائد عن ابی داؤد)

حصن حصین میں بحوالہ طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا نام لیکر آواز دیتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ اے فلاں کیا تجھ پر کوئی ایسا شخص گزرا ہے جس نے اللہ کا ذکر کیا ہو وہ دوسرا پہاڑ جب جواب دیتا ہے کہ ہاں ایک شخص اللہ کا ذکر کرنے والا میرے اُوپر گزرا ہے تو وہ سوال کرنے والا پہاڑ خوش ہوتا ہے۔

اِن سب روایات اور واقعات سے معلوم ہوا کہ ہم جن چیزوں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں اِدراک اور احساس و شعور نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے اس احساس و ادراک کا پتہ نہیں ورنہ اُن میں احساس اور شعور ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتی ہیں اور اللہ کا ذکر سن کر خوش ہوتی ہیں۔ اور جب اللہ کی مشیت ہوتی ہے تو ان کو بولنے کی قوت دے دی جاتی ہے۔

قال العارف الرومی ؎

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند
با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ

کیا تم لوگ یہ اُمید رکھتے ہو کہ یہودی تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور حال یہ ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو اللہ کا کلام سنتے رہے ہیں پھر اس

يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

میں تحریف کرتے رہے ہیں اس کے بعد کہ وہ اس کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے۔

یہودیوں میں عناد ہے ان سے ایمان قبول کرنے کی اُمید نہ رکھی جائے

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی یہ اُمید اور آرزو ختم فرما دی کہ یہودی ایمان لائیں گے، اور فرمایا کہ ان کے اِسلاف کا یہ حال تھا کہ اللہ کا کلام سنتے تھے پھر جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے اس میں تحریف کر دیتے تھے اور یہ لوگ اُن پر اب تک کوئی نکیر نہیں کرتے اور طریقہ کار کو غلط نہیں بتاتے بلکہ اُن سے محبت اور تعلق میں بہت آگے ہیں۔ اور جس طرح اُن لوگوں نے اپنے اپنے زمانہ میں آیات بیّنات کا کھلا مشاہدہ کیا پھر بھی اپنے نبیوں کی تکذیب کی اور اللہ کے کلام کی تکذیب کی اسی طرح یہ لوگ بھی معجزات اور دلائل اور شواہد دیکھتے ہیں لیکن ٹس

سے مس نہیں ہوتے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت شریفہ میں جو اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر اس میں تحریف کرنے کا ذکر ہے اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے، وہاں اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا تھا لیکن جب قوم کے پاس واپس آئے تو اُنہوں نے اس کے خلاف بیان دیا جو وہاں سن کر آئے تھے۔ دُوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے توریت شریف کی تحریف کرنا مُراد ہے۔ علماءِ یہود رشوت لیکر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیتے تھے اگر کوئی شخص رشوت لے آیا تو اس کے مطابق مسئلہ بتا دیا اور جو شخص کچھ بھی نہ لایا اس کو صحیح اور حق بات بتا دی۔ یہ لوگ جو ایسی حرکت کرتے تھے جانتے بوجھتے ہوئے کرتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہم گناہ کر رہے ہیں۔ پھر بھی اس کو کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی تحریف میں یہ بات بھی تھی کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور علامات جو توریت شریف میں بیان کی گئی تھیں، اُن کو بدل دیا۔ اس میں وہ لوگ بھی مبتلا تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے جو لوگ خود مبتلائے تحریف ہوں اور دوسروں کو ایمان لانے سے روک رہے ہوں وہ خود کیا ایمان لائیں گے؟

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا

اور جب ملاقات کرتے ہیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے پاس تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

کیا تم ان کو وہ چیزیں بتاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تا کہ یہ لوگ ان کے ذریعے اللہ کے پاس حجت میں تم کو مغلوب کر دیں، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے ہو؟

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں، اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔

یہودیوں کی منافقت

جو عام منافقین کا طریقہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور تنہائیوں میں اپنے سرغنوں سے کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اسی طرح یہودی منافق بھی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر کر دیتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور اسی ظاہر کرنے میں یہ بھی کہہ جاتے تھے کہ توراۃ شریف میں ایسا ایسا لکھا ہے اور اس میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت اور آپ کی علامات اور صفات موجود ہیں اور ان عُلامات اور صفات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ واقعی اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اہلِ مدینہ (اوس اور خزرج) نے یہودِ مدینہ سے مشورہ کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری ملاقات ہوئی اور ہم لوگ اُن پر ایمان لائے ہیں اور وہ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لا رہے ہیں، ان کے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے تو سادہ دل یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہاں اُن پر ایمان لاؤ وہ نبی ہیں۔ پھر جب تنہائیوں میں ایک دوسرے سے ملتے تو آپس میں کہتے تم لوگ عجیب ہو مسلمانوں کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہو اور اُن کو یہ بھی بتاتے ہو کہ ان کا ذکر اور نعت وصفت توراۃ شریف میں موجود ہے تو تم اپنے اُوپر حجت قائم کر رہے ہو۔ جب قیامت کا دِن ہوگا تو

مسلمان اللہ پاک کے حضور میں تم پر حجت قائم کر دیں گے اور خود تم اپنے اقرار سے پکڑے جاؤ گے تم نے اُن سے تو کہا کہ واقعی نبی ہیں اور خود ان کی نبوت کو نہ مانا تمہارا اقرار خود تم پر حجت ہوگا لہٰذا ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جو تمہارے خلاف حجت بنیں تم اتنی بھی سمجھ نہیں رکھتے خود اپنے اقرار کی چھری سے خود اپنے ذبح کا انتظام کر رہے ہو۔ (درمنثور ص ۸۱ ج ا و معالم التنزیل ص ۸۷ ج ۱)

یہ کیسی بیوقوفی کی بات ہے کہ مسلمان پر حق ظاہر کر کے خود اس کے خلاف کرو گے تو قیامت کے دن مسلمان تم پر حجت قائم کریں گے اور دلیل سے مغلوب کر دیں گے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مواخذہ کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے وہ سب کچھ جانتا ہے جو دلوں میں ہے اُسے اس کا بھی پتہ ہے اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ اگر مسلمانوں سے حق کو چھپایا تو اللہ پاک کے حضور میں اس وجہ سے کفر کے عذاب سے کیونکر خلاصی ہوگی کہ ہم نے مسلمانوں کو صحیح بات نہ بتائی تھی۔ جب شقاوت کسی کو گھیر لیتی ہے تو وہ جان بوجھ کر اُسی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اُن میں ایسے لوگ ہیں جو اَن پڑھ ہیں کتاب کا علم نہیں رکھتے، سوائے آرزوؤں کے اور وہ لوگ صرف گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

النصف

یہودیوں کی جھوٹی آرزوئیں

اس آیت میں یہودی جاہل اَن پڑھ عوام کا تذکرہ فرمایا ہے یہ لوگ نہ توراۃ شریف پڑھ سکتے تھے نہ اور کسی طرح کا علم رکھتے تھے البتہ جھوٹی آرزوؤں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہمیں جنت میں ضرور جانا ہے اگر عذاب بھی ہوا تو تھوڑے سے دن دوزخ میں رہیں گے اور ہم انبیاء کرام علیہم السلام کی نسل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب ہیں اس کی اولاد ہیں اور نبوت صرف ہمارے ہی اندر رہ سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور بہت سی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا تھے خیالات کی دنیا میں پڑے ہوئے تھے اور اپنی نجات اور اللہ کے ہاں محبوب ہونے کے خیالی پلاؤ پکار کھے تھے، ان کے خیال میں نہ اللہ کے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے سے ان کے محبوب عند اللہ ہونے میں فرق آتا تھا اور نہ سود کھانے سے اُن کی دینداری کو بٹہ لگتا تھا نہ کسی طرح کے کسی بھی برے عمل سے ان کو آخرت کا فکر لاحق ہوتا تھا۔ اپنے بارے میں جو جھوٹی آرزوئیں لئے بیٹھے تھے اور خوش کن گمانوں کی دُنیا بسائے ہوئے تھے اُسی میں مست تھے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ

سو بڑی خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کتاب کو لکھتے ہیں اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ خرید لیں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

تھوڑی سی قیمت، سو بڑی ہلاکت ہے اُن کیلئے بوجہ اسکے جو اُنکے ہاتھوں نے لکھا ہے اور بڑی ہلاکت ہے اُن کیلئے اُسکی وجہ سے جسے وہ کسب کرتے ہیں۔

علمائے یہود کا غلط مسائل بتانا اور رشوت لینا

اس آیت شریفہ میں یہودی علماء کی بدعملی اور دھاندلی اور حُبِ دنیا کی وجہ سے ان کی بربادی کا تذکرہ فرمایا ہے عوام جب علماء کے پاس جاتے تھے اور ان سے مسائل معلوم کرتے تھے اور ساتھ ہی رشوت بھی دیتے تھے تو وہ لوگ سائل کی رضا جوئی کے لئے اُس کی مرضی کے

مطابق مسئلہ بتا دیتے تھے، خود اپنے ہاتھ سے مسئلہ لکھ دیتے تھے اور عوام کو باور کراتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور توریت شریف میں یوں ہی نازل ہوا ہے جو شخص رشوت نہ لاتا اُس کے لئے مسئلہ میں اَدل بدل نہیں کرتے تھے۔ اُن کے علماء تحریف کتاب اللہ کے مجرم بھی تھے اور رشوت خوری کے گناہ میں بھی مُبتلا تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے اُن کا حال بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اُن کے لئے دونوں وجہ سے ہلاکت اور بربادی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرنے کی وجہ سے بھی اور اس وجہ سے بھی کہ وہ حرام مال کماتے ہیں اور باقی رہنے والی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں حقیر دنیا کی کچھ نقدی لینے پر راضی ہیں۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اپنے عوام کو بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صفت جو توریت شریف میں موجود پاتے تھے اُسے واضح طور پر بتاتے تو اس میں ممکن تھا کہ ظاہری دنیا میں کمی ہو جاتی لیکن آخرت کے ثواب سے مالا مال ہو جاتے لیکن اُنہوں نے حقیر دنیا کو ترجیح دی اور تھوڑے سے فانی کے مقابلہ میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مستحق عذاب ہوئے۔ ان کے عوام میں اگرچہ بے پڑھے لوگ بھی تھے لیکن اتنا تو ہر عقلمند سمجھتا ہے کہ جو شخص پیسہ لے کر ایک بات بتاتا ہے اور جو پیسہ نہ دے اسے دوسری بات بتاتا ہے ایسا شخص کیسے اہلِ حق ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص پر دین میں اعتماد کرنا سراسر حماقت ہے۔ جس میں سراسر ہلاکت ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ

اور انہوں نے کہا کہ ہم کو ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن گنتی کے، آپ فرمائیے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے لیا ہے،

اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

سو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا یا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

یہود کی جھوٹی خوش گمانی کہ دوزخ میں صرف چند دن کے لئے جائیں گے

اس آیت شریفہ میں یہودیوں کا ایک اور دعویٰ اور اس کی تردید مذکور ہے یہودیوں کا یہ جھوٹا دعویٰ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہیں ہوگی اور اپنے بارے میں سمجھتے تھے کہ ہم اُسی شریعت پر قائم ہیں اور قائم رہیں گے لہٰذا ہمیں عذاب کیوں ہونے لگا۔ اور عذاب ہوگا تو صرف چالیس دن عذاب ہوگا یعنی جتنے دن ہمارے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی عبادت کی ہے اُتنے ہی دن عذاب میں گرفتار ہوں گے اس کے بعد دوزخ سے نکل جائیں گے اور حضرت ابن عباس سے یوں منقول ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہر ہزار سال کے بدلہ ہم کو ایک دن دوزخ میں عذاب بھگتنا ہوگا اور گنے چُنے سات دن ہوں گے جو زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ ہم کچھ دن دوزخ میں رہیں گے پھر ہم تو دوزخ سے نکل آئیں گے اور ہماری جگہ مسلمان دوزخ میں چلے جائیں گے۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر جب ایک یہودی عورت نے زہر ملا کر بکری کا گوشت حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اس وقت آپ ؐ نے ان سے جو سوال و جواب کئے تھے اُن میں یہ بھی تھا کہ آپ ؐ نے دریافت فرمایا کہ دوزخی کون ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم دوزخ میں تھوڑا سا وقت گزاریں گے پھر آپ لوگ اس میں ہمارے بعد داخل ہو جائیں گے۔ آپ ؐ نے فرمایا دور ہو جاؤ اللہ کی قسم ایسا کبھی نہ ہوگا کہ تم اس میں سے نکل جاؤ اور تمہارے بعد ہم اس میں چلے جائیں۔ مفسر ابن کثیر نے یہ روایات لکھی ہیں اور آخری بات جس میں خیبر کی گفتگو مذکور ہے اس کو بحوالہ مسند احمد و صحیح بخاری نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث ص ۸۶۰ ج ۲ پر مذکور ہے۔

پہلی آیت میں یہودیوں کی آرزوؤں اور خوش گمانیوں کا جو ذکر تھا اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم دوزخ میں چند دن

ہی جائیں گے۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں آپ پر ایمان نہ لائے اور یہ جانتے ہوئے کہ کسی نبی کو نہ ماننا کفر ہے اور کفر کی سزا دائمی ہے طرح طرح کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور اُن کے دعوے اور آرزوئیں سب خود ساختہ تھیں جن کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں تھی، بے سند باتیں کرتے تھے اور انہیں باتوں میں مست تھے۔ اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا...... قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا ۔ (الآیۃ)۔

کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن سے فرما دیں کہ یہ جو کچھ تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم صرف چند دن دوزخ میں رہیں گے اس کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے کیا اللہ تعالیٰ سے تم نے کوئی عہد لیا ہے جس کی بنیاد پر تم ایسی باتیں کررہے ہو؟ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں فرماتا لیکن تم سے اس کا کوئی عہد نہیں ہے خود اپنے پاس سے اللہ کی طرف ان باتوں کی نسبت کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں۔ اپنی طرف سے اپنے بارے میں کوئی شخص کوئی بھی خیال اور گمان کرکے بیٹھ جائے اور اُسی پر بھروسہ کرلے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کوئی سند اور دلیل نہ ہو تو اس کا گمان اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کفر کی سزا بہرحال ملے گی خواہ کیسی خوش فہمی میں مُبتلا ہو۔ یہودیوں کی حماقت تو دیکھو کہ خود اپنے اقرار سے دوزخ میں جانے کو تیار ہیں (اگرچہ چند دن دوزخ میں رہنے کا اقرار ہے) لیکن حضرت خاتم النبیین سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں جبکہ یہ جانتے ہیں کہ دوزخ میں ایک سیکنڈ کا عذاب بھی بہت بڑا ہوگا جس کی برداشت کسی کو نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی اس آگ کی ایک چنگاری تھوڑی سی دیر کے لئے ہاتھ میں لینے کو کوئی بھی شخص تیار نہیں اور دوزخ میں جانے کو بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ تیار ہیں۔ جبکہ دوزخ کی آگ کی گرمی دنیا کی آگ سے اُنہتر درجے زیادہ گرم ہے۔ (کما فی روایۃ الصحیحین) جس طرح یہود جھوٹی آرزوؤں اور خود تراشیدہ اوہام وخیالات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اسی طرح آج کل بہت سے فرقے ایسے ہیں جو اسلام کے دعویدار ہیں۔ لیکن کفریہ عقائد کے حامل ہیں مثلاً قرآن کی تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے العیاذ باللہ ہمارے امام کے اندر حلول کیا ہے اور بہت سے لوگ جھوٹے نبی کی اُمت بنے ہوئے ہیں اور ان سب کو اپنی نجات کی خوش گمانی ہے حالانکہ یہ لوگ قرآنی تصریحات کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بہت سے پیر فقیر جو بالکل بے عمل بلکہ بدعمل ہیں وہ صرف اس بنیاد پر اپنی نجات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ کسی بزرگ کی اولاد میں ہیں اپنی خوش گمان اور جھوٹی آرزو سے کچھ نہیں ہوتا نجات کے لئے عقیدہ اور عمل صحیح ہونا ضروری ہے جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو، بے سند آرزو اور بے سند خوش گمانی آخرت کی بربادی کا ذریعہ ہے۔ کسی کی نسل میں ہونے سے نجات نہ ہوگی۔ بنی اسرائیل بھی تو انبیاء کی اولاد ہیں پھر بھی دوزخی ہیں خوب سمجھ لیا جائے۔

دورِ حاضر کے کافروں کی خوش گمانی

جس طرح یہودی اپنے بارے میں خیالی دُنیا اور خوش گمانی میں مبتلا ہیں اسی طرح دَورِ حاضر کے مذاہب والے جو یہودیوں کے علاوہ ہیں وہ بھی اپنے بارے میں خوش گمانیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اُن کے خود ساختہ عقائد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس کوئی سند نہیں کہ وہ جس دین پر ہیں وہ ذریعۂ نجات بنے گا۔ مشرکین اور بُت پرست اپنی مُکتی اور نجات کا عقیدہ لئے پھرتے ہیں اور اُلٹا موحدین مسلمین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی نجات نہ ہوگی۔

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

ہاں جس نے گناہ کیا اور اس کے گناہ نے اس کو گھیر لیا تو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہ لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ع ۱۱ ۹

اصحاب الجنہ کون ہیں اور اصحابُ النّار کون ہیں؟

اِن دو آیتوں میں جنتی اور دوزخی ہونے کا ضابطہ بتایا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے طریقہ سے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید بھی ہے جو اُوپر کی آیت میں مذکور تھا۔ پہلی آیت میں یوں فرمایا کہ تمہارے پاس اپنے دعوے کی کوئی دلیل نہیں اور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہے اور اِن دو آیتوں میں جو ضابطہ جنت اور دوزخ کے داخلے کا ذِکر فرمایا ہے اس میں یہ بتادیا کہ تم لوگ ضابطہ کے مطابق اُن لوگوں کے زُمرہ میں آتے ہو جن کو ہمیشہ دائمی عذاب ہوگا۔

اِرشاد فرمایا کہ تم یہ جو کہتے ہو کہ ہم دوزخ میں ہمیشہ نہ رہیں گے صرف چند دن عذاب ہوگا۔ تمہاری بات غلط ہے۔ تم ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہو۔ ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص برائی کرے اس کی برائی ہر طرف سے اُس کو گھیر لے کہ وہ کفر اختیار کرے جو سب سے بڑی بُرائی ہے تو وہ دوزخ والا ہے اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ تم لوگ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کے منکر ہونے کی وجہ سے کافر ہو لہٰذا ضابطہ کے مطابق ہمیشہ دوزخ میں رہو گے۔ اور اہل جنت وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے جنہوں نے اللہ کے سب نبیوں کو مانا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کو مانا اور اعمالِ صالحہ انجام دیئے۔ یہ حضرات ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے مضبوط عہد لیا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو گے اور والدین کے ساتھ اور قرابت داروں اور یتیموں کے ساتھ

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ

اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو گے اور عام لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا،

ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

پھر تم نے روگردانی کی مگر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں نے، اور تم اعراض کرنے والے ہو۔

بنی اسرائیل سے عہد و پیمان اور اُن کا انحراف

اس آیت شریفہ میں توریت شریف کے چند احکام مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ان سب کاموں کو کرنا انہوں نے عہد کرلیا لیکن ان میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے علاوہ سب اس عہد سے پھر گئے اور عہد کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اُن کے عہد سے پھر جانے کا ذِکر فرمانے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کہ اے یہودیو! تمہاری عادت اور مزاج ہی یہ ہے کہ حق سے

اور قول و قرار سے اور اطاعت سے اعراض کیا کرتے ہو۔ اور خاص طور سے زمانہ نزول قرآن کے یہودیوں کو مخاطب فرمایا کہ تم بھی اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر ہو اور قبول حق سے اعراض کئے ہوئے ہو۔ آیت شریفہ میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور پھر والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم فرمایا اور لوگوں سے اچھی باتیں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا۔ ان چیزوں کا سابقہ اُمتوں کو بھی حکم تھا اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر نسخ وارد نہیں ہوا۔ اُمت محمدیہ بھی ان سب چیزوں کی مامور ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا کہ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ط (اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہلِ قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور قریب والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور دُور کے پڑوسی کے ساتھ بھی اور برابر میں ساتھ بیٹھنے والے کے ساتھ بھی اور اُن کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں)۔ (النساء:۴: ۳۶)

نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں متقیوں کی صفات میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ پھر سورۂ بقرہ کے پانچویں رکوع میں اقامتِ صلوٰۃ اور اداءِ زکوٰۃ کا حکم مذکور ہے اور اسی سورۂ بقرہ کے تیرہویں رکوع میں بھی ان دونوں کا حکم فرمایا ہے اور بھی جگہ جگہ نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت اور تاکید قرآن مجید میں مذکور ہے۔ یہ جو فرمایا: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اِس میں بہت عموم ہے اور یہ بہت سے احکام پر مشتمل ہے۔ اول تو یہ فرمایا کہ لوگوں سے اچھی باتیں کہو اس عموم میں مومن کافر نیک و بد سب قسم کے انسان آ گئے پھر اچھی بات میں سب کچھ آ گیا نیکیوں کی راہ بتانا، بُرائی سے روکنا، نصیحت میں نرمی اختیار کرنا، گفتگو میں بڑوں کا ادب ملحوظ رکھنا، مسئلہ صحیح بتانا، سچ بات کہنا، کسی کو دھوکہ نہ دینا، حقوق کی وصولیابی میں نرم کلمات استعمال کرنا اور اس طرح کے بہت سارے احکام پر یہ کلمہ مشتمل ہے۔ اس میں یہودیوں سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صفت جو توریت میں مذکور ہے اُسے واضح طور پر ظاہر کریں اور حق اور حقیقت کو نہ چھپائیں۔ مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ مذکورہ احکام کی پاسداری کریں اور ان سے اعراض کر کے رُوگردانی نہ کریں اور وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا مصداق نہ بنیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور ایک دوسرے کو اپنے گھروں سے نہ نکالو گے پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس کی

تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز

گواہی بھی دیتے ہو۔ پھر تم وہ لوگ ہو جو قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو اور نکالتے ہو اپنوں میں سے ایک جماعت کو ان کے گھروں سے،

تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ

ان کے مقابلہ میں مدد کرتے ہو گناہ اور زیادتی کے ساتھ، اور اگر وہ آ جائیں تمہارے پاس قیدی ہونے کی حالت میں تو تم انکی جان کا بدلہ دیکر چھڑا لیتے ہو حالانکہ انکا

اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ

نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے منکر ہوتے ہو۔ سو کیا جزا ہے اس کی جو تم میں سے ایسا کام کرے سوائے اس کے کہ

مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا

کہ دنیاوی زندگی میں رُسوا ہو، اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں پہنچادیئے جائیں گے، اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز

اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلہ مول لے لیا،

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

سو نہ ہلکا کیا جائے گا اُن سے عذاب اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی۔

یہودیوں کی ایک خاص خلاف ورزی کا تذکرہ

ان دونوں آیتوں میں یہودیوں کے ایک اور عہد اور قول وقرار کا اور پھر اُن کی عہد شکنی کا تذکرہ فرمایا۔ زمانہ نزولِ قرآن کے وقت جو یہودی تھے ان کو اِس قول وقرار اور اقرار کا بھی پتہ تھا جو یہودیوں سے لیا گیا تھا اور اُن سے جو عہد شکنی اور خلاف ورزی سرزد ہوتی رہی تھی وہ بھی اُن کے علم میں تھی ان سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا اور ان کو عہد شکنی یاد دِلائی اور ان کی دنیا وآخرت کی سزا بھی بتائی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر بھی دلیل قائم ہوگئی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے اس قول وقرار اور عہد اور اس کی خلاف ورزی کا علم آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ آباد تھے اور دو قومیں یمن سے آکر آباد ہوگئی تھیں ان میں سے ایک قبیلہ کا نام اوس تھا اور دوسرے کا نام خزرج تھا، یہ دونوں قبیلے بُت پرست تھے اور یہودیوں کے دونوں قبیلے اپنے کو دینِ سماوی پر سمجھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پابندی کا دَم بھرتے تھے۔ اس زمانے میں عرب کا کچھ ایسا مزاج تھا کہ لڑائی کے بغیر گزارہ ہی نہ ہوتا تھا۔ (جب اوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تھی تو بنو قریظہ اوس کی مدد کرتے تھے اور بنو نضیر خزرج کے حمایتی بن جاتے تھے اس میں جہاں اوس اور خزرج کے افراد مارے جاتے اور گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوتے وہاں یہودیوں کے دونوں قبیلوں کے افراد بھی مارے جاتے تھے اور بہت سے افراد ترکِ وطن پر بھی مجبور ہوجاتے تھے۔

اور جب بنی نضیر اور بنی قریظہ کے کسی فرد کو دشمن قید کر لیتا تو اُس کے چھڑانے کے لئے ان کی دونوں جماعتیں پیسے خرچ کرنے کے لئے تیار ہوجاتی تھیں جب اُن سے کوئی پوچھتا کہ تم اس کو کیوں چھڑا رہے ہو تمہاری حرکت سے تو وہ دشمن کے قبضے میں گیا ہے اور ترکِ وطن پر مجبور ہوا ہے تو جواب دیتے تھے کہ ہم کو شریعت موسوی میں یہ حکم دیا گیا کہ جب کسی کو قیدی دیکھو تو اسے رہائی دِلا دو۔ لہٰذا ہم اس حکم کی پابندی کرتے ہیں اس حکم پر عمل کرنے کو تو تیار تھے کہ قیدی کو رہائی دلا دیں۔ لیکن جس وجہ سے وہ گھر سے بے گھر ہوا اور دشمن کے چنگل میں پڑ کر قیدی ہوا اس کے اختیار کرنے یعنی اپنوں کے مقابلہ میں جنگ کرنے والوں کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو تم خود ہی اپنوں کے مقابلہ میں مددگار بنے اور اُس قتال کی وجہ سے تمہارا آدمی گرفتار ہو کر قیدی ہوا، اب اس کے چھڑانے کو تیار ہو؟ اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ چونکہ اوس اور خزرج ہمارے حلیف ہیں اس لئے ان کی مدد کرنے پر مجبور ہیں۔

اللہ جل شانہٗ نے اسی کو بیان فرمایا کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے)۔

کیا توریت شریف میں قیدی کے چھڑانے ہی کا حکم ہے اور کیا آپس کا قتل وقتال اور ایک دوسرے کو جلاوطن کرنا توریت شریف میں ممنوع نہیں ہے؟ یعنی قتل وقتال کی ممانعت پر تو عمل نہ کیا اور قیدی کو چھڑانے کے لئے پیسے خرچ کرنے کو تیار ہو گئے۔ حالانکہ اس کا قیدی ہونا قتل وقتال کی بنیاد پر ہے۔ نہ قتل وقتال کرتے نہ یہ قیدی ہو کر آتا۔ لہٰذا معاملہ شریعتِ موسوی کا نہ رہا بلکہ اپنی طبیعت کا رہا۔ جس حکم کو چاہا مانا اور جس حکم کو چاہا نہ مانا، جس حکم کو مانا اسے ایمان سے اور جس حکم کو نہ مانا اُسے کفر سے تعبیر فرمایا اگر دل سے کسی حکمِ قطعی کا مُنکر ہو جائے تب تو کافر ہو ہی جاتا ہے اور اگر دل سے مُنکر نہ ہو لیکن عمل حکم کے خلاف ہو تو اس عمل کا کرنے والا گناہ کا مرتکب تو ہو ہی جاتا ہے جو منکروں اور کافروں کا طریقہ ہے۔

یہودیوں کی مذکورہ بالا بے عملی کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا میں رُسوا اور ذلیل ہوں اور آخرت میں اُن کے لیے سخت عذاب ہے ہی، چنانچہ بنونضیر مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل ہوئے مدینہ منورہ سے خیبر کو نکال دیئے گئے اور پھر خیبر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو نکال دیا اور در بدر مارے پھرتے رہے اور بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

آخر میں فرمایا کہ ان لوگوں نے دُنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلہ مول لے لیا، سو آخرت میں ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی اور نہ اُن کی کسی طرح کی کوئی مدد ہوگی۔ کوئی حامی، مددگار، طرف دار، وکیل، مختار موجود نہ ہوگا جو ان کی کچھ مدد کر سکے۔

مسلمانوں کو تنبیہ جو پورے دین پر عمل کرنے کو تیار نہیں

جو حال یہودیوں کا تھا وہی آج مسلمانوں کا ہے، وہ بھی کتابُ اللہ کے بعض حصے پر عمل کرتے ہیں اور بعض پر عمل نہیں کرتے، جو لوگ بے عمل ہیں وہ تو در کنار جو لوگ بظاہر دین دار ہیں اُن کی دینداری بھی نماز، روزہ اور دو چار کاموں تک محدود ہے۔ حرام ذریعہ سے مال کمانا اور حرام محکموں میں ملازمت کرنا، رشوتیں دینا، رشوتیں لینا، میراث کا مال کھا جانا، بہنوں کو اور یتیموں کو اور بیواؤں کو میراث کا شرعی حصہ نہ دینا، بیاہ شادی اور مرنے جینے میں غیر اسلامی طور طریق اختیار کرنا، اِس طرح کے اُمور میں دینداری کے دعویدار بھی مبتلا ہیں۔ بہت سے لوگ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ حج بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے اِسلامی تعزیرات حدود اور قصاص نافذ کرنے کی بات آتی ہے تو ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں اور اس کے نفاذ کے لئے ہاں کرنے کو تیار نہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں ہی اِنکاری ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اُن کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلائل،

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ

اور اُن کی تائید کی ہم نے روح القدس کے ذریعہ، کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لایا جو تمہارے نفسوں کو گوارا نہ تھے

اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

تو تم نے تکبر کیا، سو ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کرتے رہے ہو۔

یہودی بعض نبیوں کی صرف تکذیب کرتے تھے اور بعض کو قتل کر دیتے تھے

اس آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی (یعنی توریت شریف) اور اُن کے بعد بھی رسول بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے معجزات دیئے جو ان کی نبوت اور رسالت پر واضح دلائل تھے۔ مُردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندہ کی صورت بنا کر اس میں پھونک دینا جس سے پرندہ ہو کر اُڑ جانا، مادرزاد اندھے اور برص والے کو اچھا کر دینا اور غیب کی باتیں بتا دینا، اور روح القدس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ان کی تائید کرنا۔ یہ سب اُمور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور رسالت کے لئے واضح دلائل تھے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ (یعنی میں تمہارے لیے بعض چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پر (توریت شریف میں) حرام کر دی گئی تھیں اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے معجزہ لے کر آیا ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعض احکام انہوں نے ایسے بتائے جن سے توریت شریف کے بعض احکام منسوخ ہو گئے تو اس پر یہودی ان کے دشمن ہو گئے، اُن سے حسد بھی کیا اور عناد پر بھی تُل گئے اور اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی تکلیف دی اور اُن کے قتل کے درپے ہو گئے۔ قتل تو نہ کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اوپر اٹھا لیا لیکن ان سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کو قتل کر چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور تکذیب پر اس لئے آمادہ ہو گئے کہ جو احکام اُنہوں نے بتائے ان کے نفسوں کی خواہشوں کے خلاف تھے اور انہوں نے نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی بلکہ بہت سے نبیوں کو اُنہوں نے جھٹلایا اور بہت سے نبیوں کو قتل بھی کیا۔ خُدا جانے انہوں نے کتنے نبیوں کو قتل کیا اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل اور تکذیب کے درپے یہودی اس لئے ہو جاتے تھے کہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتاتے تھے وہ ان کے نفسوں کو نہیں بھاتے تھے اور ان کی طبیعت کے خلاف ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ اُن کی تکذیب تو کرتے ہی تھے، قتل بھی کر دیتے تھے۔ تفسیرِ ابنِ کثیر میں لکھا ہے کہ قتل کا تذکرہ فرماتے ہوئے مضارع کا صیغہ تقتلون لایا گیا ہے۔ قتلتم صیغہ ماضی کا نہیں لایا گیا۔ اس میں اس پر دلالت ہے کہ آئندہ بھی تم سے ایسی حرکت سرزد ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا اور خیبر میں بکری کے گوشت میں زہر ملا کر پیش کر دیا جسے آپؐ نے تناول فرما لیا اور پھر موت کے قریب اس زہر کے اثر سے ایک رگ کٹ گئی جو موت کا سبب بنی جیسا کہ مشکوٰۃ ص ۵۴۸ میں مذکور ہے۔ اس آیت شریفہ میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان بھی انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں ان حضرات میں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے اور بعض حضرات کے اسماءِ گرامی قرآن مجید میں نہیں ہیں تفسیر کی بعض کتابوں میں لکھے ہیں۔ لیکن کسی صحیح روایت سے اِن اسماء کا ثبوت نہیں ملتا۔ تفسیر درمنثور ص ۸۶ ج ۱ میں حضرت ابنِ عباسؓ سے بعض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اسماءِ گرامی نقل کئے ہیں۔ مثلاً شمویل، حزقیل۔ ہم اللہ کے سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں اگرچہ سب کے نام، سب کا زمانۂ بعثت ہمیں معلوم نہیں۔ اس آیت میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم نے روحُ القدس کے ذریعہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی تائید کی اس تائید سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کو اُوپر اُٹھا لیا اور تفسیر جلالین میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور حفاظت فرماتے تھے۔ روحُ القدس قرآن وحدیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب ہے۔ سورۂ نحل میں فرمایا: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ اور حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان کو دُعا دی۔ اللّٰھم ایّدہ بروح القدس ۔ (رواہ مسلم ص ۳۰۰ ج ۲)

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں بلکہ اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کو اللہ نے ملعون قرار دیدیا، سو بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

یہودیوں کا کہنا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں اور اس کی تردید

یہودی اسلام قبول نہیں کرتے تھے اور خاتم النبیّن صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے تھے آپ کی سچائی کی علامات اور معجزات دیکھ کر بھی منحرف تھے اور اس گمراہی کو اپنے لئے کمال اور باعثِ فخر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور پردے پڑے ہوئے ہیں کسی کی بات ہمارے دلوں پر اثر نہیں کرسکتی اور اپنے دین کے علاوہ ہم کوئی دوسرا دین قبول نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی تردید فرمائی کہ یہ بات کو سنتے اور سمجھتے ہیں اور حق بھی جانتے ہیں لیکن حق سے ان کو تنفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ملعون قرار دیدیا ہے۔ لعنت اور پھٹکار میں گرفتار ہیں، دِلوں پر پردے اور غلاف کچھ نہیں کفر کی پھٹکار اور لعنت کے سبب ایمان سے محرومی ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا کہ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر ماردی۔ غرض یہ ہے کہ کفر میں ان کی پختگی لعنت اور پھٹکار اور دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب سے ہے جس پر وہ فخر کررہے ہیں، قبحھم اللہ . یہ جو فرمایا کہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھا لیکن تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بھی ہے اس سے منکر ہوگئے۔ ایک نبی کی تکذیب بھی کُفر ہے، تھوڑا سا ایمان آخرت میں کام نہیں دے گا۔ بعض مفسرین نے فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ کا یہ معنی بھی بتایا ہے کہ اُن میں سے بہت کم لوگ ہوں گے جو ایمان لائیں گے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى

اور جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب پہنچی وہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُن کے پاس ہے اور حال یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ کافروں کے مقابلہ میں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا

فتح یابی طلب کرتے تھے پس جب وہ چیز اُن کے پاس آ گئی جس کو پہچان لیا تو اس کے منکر ہو گئے، سو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر۔ بُری چیز ہے

اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ

وہ جس کو اختیار کر کے اپنی جانوں کو خرید لیا یہ کہ کفر کریں اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُتارا حسد کرتے ہوئے اس بات پر کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے

مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

جس پر چاہے نازل فرمائے، سو وہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہوگئے اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلیل کرنیوالا۔

یہودیوں نے جانتے بوجھتے ہوئے عِناد اور ضِد کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودی اس لئے آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو ہم اُن کا اتباع کریں گے۔ یہ لوگ اپنے کو موحد سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم دینِ سماوی کے حامل ہیں، اوس اور خزرج کے قبیلے بھی یمن سے آکر مدینہ منورہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ بُت پرست مشرک تھے، یہودیوں سے اِن لوگوں کی جنگ ہوتی رہتی تھی اور یہودی اُن سے کہا کرتے تھے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے، ان کی بعثت کا زمانہ قریب آچکا ہے، ہم اُن پر ایمان لا کر اُن کے ساتھ ہو کر تم سے جہاد کریں گے اور اس وقت تمہارا ناس کھودیں گے اور قومِ عاد کی طرح سے تمہارا قتلِ عام کریں گے۔ بلکہ بعض روایات میں ہے کہ یہودی یہ دُعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی کی بعثت فرما جس کے مبعوث ہونے کا ہماری کتاب میں ذکر ہے تا کہ ہم اس کے ساتھ مل کر عرب کے مشرکوں کو قتل کریں۔ یہ لوگ نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صفت جانتے تھے جو توریت شریف میں مذکور تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگئی اور آپ مدینہ منورہ میں بھی تشریف لے آئے اور یہودیوں نے آپ کو اُن علامات اور صفات کے ذریعہ پہچان بھی لیا جو اُن کے علم میں تھیں کہ یہ واقعی نبی آخرالزماں ہیں ہم جن کے انتظار میں تھے اُنہوں نے آپ کے معجزات بھی دیکھے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے آپ کی نبوت اور رسالت کے منکر ہو گئے۔ اُن کو اوس اور خزرج کے بعض افراد نے توجہ بھی دِلائی اور کہا کہ اے یہودیو! تم اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اور اُن کے ساتھ مل کر تمہیں مغلوب اور مقہور کر دیں گے۔ لہٰذا اب تم حق کو قبول کرو نبی آخرالزماں پر ایمان لاؤ اور مسلمان ہو جاؤ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ وہ نبی نہیں ہیں ہم جس کے انتظار میں تھے، وہ تو ہم ہی میں سے ہوگا، عرب میں سے نہیں ہوگا۔ جانتے پہچانتے ہوئے منکر ہو گئے اور یہ حسد اُن کو کھا گیا کہ نبی عرب میں سے کیوں آیا؟ اس آیت میں اُن کے اسی انکار اور حق سے انحراف کرنے کا تذکرہ ہے اور اخیر میں یہ فرمایا کہ کافروں پر اللہ کی لعنت ہے جو حق اور حقیقت کو جانتے ہیں پھر بھی اس کے ماننے سے منکر ہیں۔ (من ابن کثیر ص ۱۲۴ ج ۱)

کتابُ اللہ یعنی قرآن مجید کی صفت بیان کرتے ہوئے یہ جو فرمایا کہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ کہ یہ کتاب اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جس کو وہ اللہ کی کتاب مانتے ہیں (یعنی توریت شریف) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ نبی اس نبی کے خلاف ہوتا جس پر توریت نازل ہوئی اور یہ نبی اس کتاب کا کاٹ کرتا جو اللہ تعالیٰ نے اس نبی پر نازل کی تھی جس کو تم مانتے ہو تو انحراف اور مخالفت کی کوئی وجہ بھی ہوتی۔ وہ تو سارے نبیوں پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتابوں کو ماننے کی دعوت دیتا ہے اس سے انحراف کرنا اس حسد میں کہ یہ عرب میں سے ہے سراپا حماقت اور بیوقوفی ہے اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس نے عرب میں سے نبی کیوں بھیجا اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا مستقل کُفر ہے۔

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا میں یہ بتایا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو دوزخ کا مستحق اس لئے بنایا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے اختیار فرمانے سے عناد ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبوت اور رسالت عطا کرے اور جس بندے پر چاہے اپنی کتاب اُتارے اُسے پورا پورا اختیار ہے اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا اور یہ ضد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو کیوں نبی بنایا اور فلاں کو نہیں بنایا؟

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو کر کافر ہوئے پھر اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہوئے اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ

علیہ وسلم اور اللہ کی کتاب قرآن کے منکر ہوکر کفر ہی کفر میں ترقی کرتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔ لہٰذا آخرت میں ذلت کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

لفظ اِشْتَرَوْا کے بارے میں مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ بَاعُوْا **وشروا بحسب ظنهم** اور صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں: **ای باعوا افالانفس بمنزلة المثمن والكفر بمنزلة الثمن لان انفسهم الخبيثة لاتشترى بل تباع وهو على الاستعارة أى أنهم اختاروا الكفر على الايمان و بذلوا أنفسهم فيه۔**

(یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچ دیا اور اُن کے عوض کفر کو بطور قیمت کے لے لیا اور یہ معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اُن کے خبیث نفس خریداری کے قابل نہیں، بیچنے ہی کے لائق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بیچ ڈالا یعنی برباد کر دیا اور کفر کو بطور قیمت کے حاصل کر لیا)

بعض حضرات نے کہا کہ **اشتروا** اپنے مشہور معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے اعتقاد میں یہ سمجھا کہ جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے اس سے اپنی جانوں کو دوزخ کے عذاب سے چھڑا لیں گے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ کہ اُن کا یہ خیال غلط ہے کہ اس سے وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ **قال صاحب الروح** ص ۳۲۱: **فهٰؤلاء اليهود لما اعتقدوا فيما اتوا به أنه يخلصهم من العقاب ظنوا أنهم اشتروا أنفسهم وخلّصوها فذمهم الله عليه** اگر یہ لوگ نبی آخر الزمان پر ایمان لاتے تو اپنی جانوں کو دوزخ سے بچا لیتے منکر اور منحرف ہوکر ہمیشہ کے دائمی عذاب کے مستحق ہو گئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو اُتارا گیا ہم پر، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے

بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ

وہ اس کے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنے والا جو اُن کے پاس ہے، آپ فرما دیجئے سو تم کیوں اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے قتل کرتے

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

رہے ہو اگر تم مؤمن ہو۔ اور بلاشبہ موسیٰ تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا،

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

حالانکہ تم ظالم تھے۔

یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم توریت کے علاوہ کسی کتاب کو نہیں مانتے، اور اِس پر اُن سے سوال

اس آیت شریفہ میں یہودیوں کا یہ قول ذکر فرمایا کہ ہم صرف توریت پر ایمان لاتے ہیں اس کے سوا کسی کتاب کو نہیں مانتے۔ ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ کہ جو کتاب ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے وہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جس پر وہ ایمان رکھنے کے مُدعی ہیں۔ قرآن کو نہ ماننا توریت کے نہ ماننے کو مُستلزم ہے۔ علّامہ بیضاوی لکھتے

ہیں۔لأنهم لما كفروا بما يوافق التوراة فقد كفروا بها۔

توریت شریف میں یہ ہرگز نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی قوم میں سے اللہ تعالیٰ نبی بھیجے تو اس کو مت ماننا اور توریت کے علاوہ اللہ کی کسی دوسری کتاب پر ایمان نہ لانا۔ یہ سب باتیں ان کے ذاتی حسد کی وجہ سے ہیں۔توریت شریف میں تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی ہے۔ جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگئی اور اُن کی علامات اور صفات سے یہود نے پہچان لیا کہ یہ نبی آخر الزماں ہیں پھر ان سب کے باوجود آپ پر ایمان نہ لانا اور قرآن مجید کو نہ ماننا یہ توریت شریف کے ماننے سے انکاری ہونا ہے، کہہ رہے ہیں کہ ہمارا توریت پر ایمان ہے حالانکہ ان کا اِس پر بھی ایمان نہیں۔

یہودیوں کی بُری حرکتوں میں سے یہ بھی تھا کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کو قتل کر دیتے تھے۔آیت بالا میں فرمایا کہ اگر تم توریت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ بتاؤ کہ تم نے اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے کا ارتکاب کیوں کیا؟ نبی کا قتل کرنا تو توریت شریف کے قانون سے بھی کفر ہے۔تمہارے آباؤ اجداد نے اس جرم کا ارتکاب کیا تم اُس سے راضی ہو اور اُن کو اپنا مقتدا مانتے ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ توریت شریف پر نہ تمہارا ایمان ہے اور نہ تمہارے باپ دادوں کا ایمان تھا۔

اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بہت سے انبیاءِ کرام علیہم السلام تشریف لائے وہ توریت کے احکام کی تبلیغ کرتے تھے اور اُنہوں نے توریت کے منسوخ ہونے کا اعلان بھی نہیں کیا۔اے یہودیو! تم ان کو نبوت اور رسالت میں سچا بھی جانتے تھے۔ پھر بھی تم نے ان کو قتل کر دیا، حالانکہ وہ تمہاری قوم میں سے تھے۔معلوم ہوا کہ تمہارا دین وایمان شریعتِ موسوی کا اتباع نہیں ہے۔ بلکہ خواہشات نفس کا اتباع ہی تمہارا دین ہے۔

پھر فرمایا: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (الآیۃ) یعنی تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام بھی کھلی ہوئی واضح دلیلیں لیکر آئے جو تم نے خود دیکھیں جس سے اُن کا رسول اللہ ہونا واضح ہوگیا اور انہوں نے پوری طرح توحید کی دعوت دی اور تم کو جم کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تبلیغ کی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے لیکن جب وہ کوہ طُور پر توریت شریف لینے چلے گئے تو تم لوگوں نے اُن کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تمہارا یہ غیرُ اللہ کی پرستش کرنا سراسر ظلم صریح تھا۔راہِ حق کے خلاف چلنا دلائلِ واضحہ اور آیات بینات سامنے ہوتے ہوئے منکر ہو جانا سراسر ظلم ہے جو تمہاری پُرانی عادت ہے، تمہارے اسلاف کی حرکتیں تمہارے سامنے ہیں جن کا تم کو علم ہے لیکن ابھی تک اُن کو پیشوا بنائے ہوئے ہو اور اُنہیں کی راہ پر گامزن ہو۔ (من ابن کثیر ص ۱۲۷ ج ۱)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْاؕ

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور بلند کر دیا تمہارے اُوپر طور کو، لے لو جو کچھ ہم نے تم کو دیا قوت کے ساتھ اور سن لو،

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ

وہ کہنے لگے ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں، اور پلا دیا گیا اُن کے دلوں میں بچھڑا ان کے کفر کے سبب، آپ فرما دیجئے کہ بُری ہیں یہ باتیں جن کا تمہیں حکم دیتا ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

تمہارا ایمان اگر تم مؤمن ہو۔

یہودیوں سے عہد و پیمان اوران کے دلوں میں بچھڑے کی محبت

اس سے پہلے بھی اسی سورت کے آٹھویں رکوع میں یہودیوں سے پختہ عہد لینے اور کوہِ طُور اُن پر اُٹھانے اور مضبوطی کے ساتھ توریت شریف کو تھامنے اور اس پر عمل کرنے کا عہد لینے کا ذکر گزرا ہے یہاں پر اس کو دُہرایا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ جب اُن کو حکم ہوا کہ توریت شریف کو مضبوطی سے تھام لو اور اس کے احکام کو سن لو تو انہوں نے کہا کہ ہم نے سن تو لیا لیکن ہم اِس پر عمل نہ کریں گے، حکم تھا کہ دِل کے کانوں سے سنو، قبول کرنے کے لئے سنو، عمل کرنے کے لئے سنو لیکن اُنہوں نے اپنے اوپر پہاڑ گرنے کے ڈر سے اُس وقت تو کہہ دیا کہ ہاں ہم نے سنا اور اُوپر کے دل سے اقرار بھی کرلیا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے لیکن بعد میں اس قول وقرار سے پھر گئے اور نافرمانی پر تُل آئے اور کہنے لگے کہ سنا تو ہے لیکن عمل کرنا ہمارے بس کا نہیں۔ پھر فرمایا کہ اُنہوں نے بچھڑے کی جو عبادت کی تھی وہ ان کے اندر رچ پچ گئی تھی اور رگ وپے میں گھس گئی تھی جیسے پینے کی چیز اندر جا کر جہاں جہاں جگہ دیکھتی ہے اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کا یہ حال ہوا کہ بچھڑے کی محبت ان کے اندر پُوری طرح سرایت کرگئی اور جاگزیں ہوگئی۔

پھر فرمایا کہ آپ ان سے فرمادیں تم ایمان کے دعویدار ہو اگر تم مؤمن ہو (حالانکہ مؤمن نہیں) تو سمجھ لو کہ تمہارا ایمان تمہیں بُرے اعمال کی تعلیم دیتا ہے، کفر اور شرک پر آمادہ کرتا ہے، یہ کیسا ایمان ہے جو توحید کی تعلیم نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اُبھارتا ہے اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر آمادہ کرتا ہے جن کا نبی ہونا تم پر دلائل سے واضح ہے۔

فائدہ...... بچھڑے کی عبادت سے اُن لوگوں نے توبہ تو کی تھی جیسا کہ سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع میں گزرا لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بہت سوں نے اُوپر اُوپر سے توبہ کرلی، دل کی گہرائی سے توبہ نہ کی اور بچھڑے کی پرستش کا اثر ان میں باقی رہا اور اس کے اثر کی وجہ سے اللہ کی کتاب توریت شریف کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جب پہاڑ اُٹھا کر اُن پر کھڑا کر دیا گیا تو اس وقت تو جھوٹ موٹ کو مان گئے لیکن بعد میں نافرمانی پر تُلے رہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

آپ فرما دیجئے اگر آخرت والا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی موت کی

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

تمنا نہ کریں گے بوجہ اُن اعمال کے جو اُنہوں نے آگے بھیجے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ

اور یہ واقعی بات ہے کہ تم ان کو زندہ رہنے پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے اور اُن لوگوں سے بھی زیادہ جنہوں نے شرک کیا، اُن کا ایک ایک فرد یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کو ہزار سال کی

اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع

عمر دے دی جائے، اور حال یہ ہے کہ اُسے یہ چیز عذاب سے بچانے والی نہیں ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہو جائے اور اللہ دیکھنے والا ہے اُن کاموں کو جن کو وہ کرتے ہیں۔

معانقہ ۱۱

یہودیوں کو دعوتِ مباہلہ کہ موت کی تمنا کریں

یہودیوں کے دعوؤں اور آرزوؤں میں یہ بھی تھا کہ عالمِ آخرت کی خیر اور خوبی اور جنت کا داخلہ اور نعمتوں کا حصول یہ سب کچھ ہمارے لئے ہی خاص ہے۔ دوسرے کسی دین والے اور کسی بھی قوم اور نسل کے لوگ جنت میں نہ جائیں گے۔ اِن کے اِس خیالی جھوٹے دعوے اور جھوٹی آرزو کے پیش نظر ان کو مباہلہ کی دعوت دی گئی کہ اگر تم اپنے دعوٰی میں سچے ہو تو آ جاؤ، ہم اور تم مل کر موت کی دُعا کریں کہ دونوں فریق میں سے جو بھی جھوٹا ہو وہ ابھی فوراً مر جائے، جب یہ بات سامنے آئی تو اس پر آمادہ نہ ہوئے اور راہِ فرار اختیار کر لی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے اور اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ لوگ موت کی تمنا کرتے تو اُسی وقت مر جاتے۔ مفسر ابنِ جریرؒ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو اِسی وقت مر جاتے اور دوزخ میں اپنا اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتے اور مباہلہ کے لئے نکلتے تو واپس ہو کر نہ جاتے اور مال کچھ بھی نہ پاتے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ انہیں اپنا کُفر اور بداعمالیاں معلوم ہیں وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کر سکتے، اور اللہ سب مجرموں اور ظالموں کو جانتا ہی ہے جو ہر ایک کو اس کا بدلہ دے دے گا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ کیا موت کی آرزو کر سکتے ہیں۔ یہ تو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کی حرص رکھتے ہیں۔ جو لوگ مُشرک ہیں اللہ کی کسی کتاب کو نہیں مانتے اُن سے بھی زیادہ دُنیا میں رہنے اور جینے کے حریص ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ کاش! ہزار سال زندہ رہ جاتے اگر ہزار سال بھی زِندہ رہ جائیں تو اُس کی وجہ سے عذاب سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا کبھی تو موت آ ہی جائے گی اور موت کے بعد وہی عذاب کا سامنا اور دوزخ کا داخلہ ہو گا جو اہلِ کفر کے لئے طے شدہ ہے، ابلیس کو ہزاروں سال کی زندگی دیدی گئی مگر انجام دوزخ ہی ہے۔ سورۃ الجمعہ میں بھی یہ مضمون مذکور ہے۔ وہاں فرمایا ہے: قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو تم ضرور اس سے ملاقات کرنے والے ہو، پھر اس کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے جو غیب اور شہادۃ کو جانتا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے کاموں کی خبر دیدے گا)

مفسر ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ اوپر جو آیت کی تفسیر بیان ہوئی کہ یہود کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی یہی تفسیر صحیح ہے اور ایسا ہی ہے جیسا نجران کے نصارٰی کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی جو سورۂ آلِ عمران میں مذکور ہے: ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ اس کے بعد ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے آیت کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو کہ دارِ آخرت تمہارے ہی لئے خاص ہے تو موت کی تمنا کرو تا کہ مرنے کے ساتھ ہی جنت میں چلے جاؤ اور دنیا کی تکلیفوں سے محفوظ و مامون ہو جاؤ۔ اس دوسری تفسیر میں مُباہلہ کا ذکر نہیں بلکہ صرف آرزوئے موت کی دعوت دی گئی۔ ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا یہ معنی لیکر اُن لوگوں پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اپنے دعوٰی میں سچا ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ موت کی تمنا بھی کرے کیونکہ وہ اُلٹ کر یہ کہہ سکتے تھے کہ اے مسلمانو! تم بھی تو اپنے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہو تم بھی حالتِ صحت اور تندرستی میں موت کی تمنا نہیں کرتے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

آپ فرما دیجئے کہ جوشخص دشمن ہو جبریل کا سواس نے اُتارا ہے قرآن تمہارے قلب پر اللہ کے حکم سے جو تصدیق کرنیوالا ہے اُس کتاب کی جو اُس سے پہلے ہے

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ

اور ہدایت ہے اور بشارت ہے ایمان والوں کے لئے۔ جوشخص دشمن ہو اللہ کا اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل کا اور میکائیل

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

کا تو بے شک اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

یہودیوں کا کفر یہ قول کہ جبریل ہمارا دُشمن ہے

یہودیوں کو جب معلوم ہوا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں تو کہنے لگے کہ جبریل تو ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ سخت احکام لاتا ہے اور ہم اس کتاب کو نہیں مانتے جو جبریل کے ذریعہ نازل ہوئی ہے اور وہ عذاب بھی لاتا رہا ہے، لہٰذا اگر میکائیل وحی لانے والے ہوتے تو ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر لیتے کیونکہ وہ رحمت اور بارش لانے والے ہیں۔ ایک مرتبہ یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں پوچھ رہے تھے اُنہوں نے وعدہ کرلیا تھا کہ آپ نے یہ باتیں بتادیں تو ہم آپ کا اتباع کر لیں گے جب آپ اُن کا جواب دیتے گئے تو ہر بات مانتے گئے آخر میں جب یہ ذکر آیا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں تو اُنہوں نے یہ بات نکالی کہ جبریل تو ہمارے دشمن ہیں اگر میکائیل آپ پر وحی لانے والے ہوتے تو ہم مان لیتے۔ (ابن کثیر ص۱۲۰ ج۱) اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ جوشخص جبریل کا دشمن ہو، ہوا کرے (جبریل کا کوئی قصور نہیں وہ مامور من اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہی لیکر آتے ہیں) اُنہوں نے ہی آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے قرآن نازل کیا ہے اور یہ قرآن سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور اہلِ ایمان کو بشارت بھی دیتا ہے (جوشخص جبریل سے دُشمنی کرتا ہے وہ حقیقۃً اللہ کا دشمن ہے کیونکہ جبریل کو اللہ تعالیٰ نے قاصد بنایا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے جبریل کے ذریعہ اپنے نبیوں پر بھیجا جبریل وہی لیکر آئے، ان سے دُشمنی کرنا اللہ تعالیٰ سے دُشمنی کرنا ہوا، جوشخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہوگا وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے) یہودیوں کی یہ کیسی احمقانہ بات ہے کہ ہم اس کتاب کو نہیں مانتے جس کو جبریل لے کر آئے۔ اول تو وہ جو کچھ لے کر آئے اللہ کا کلام ہے سفیر اور قاصد کوئی بھی ہو بھیجنے والے کو دیکھا جاتا ہے احکام بھیجنے والا اللہ جل شانہٗ ہے پھر اللہ کے احکام کو اس لئے نہ ماننا کہ جبریل لائے ہیں جب کہ وہ اللہ کے حکم سے لائے، بہت بڑی حماقت اور شقاوت ہے۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ فرشتوں اور رسولوں کے عمومی ذکر کے بعد حضرت جبریل اور میکائیل کا جو خصوصی ذکر فرمایا اس سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی رسول سے دشمنی رکھنا فرشتوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ جوشخص یہ کہتا ہے کہ جبریل سے ہماری دشمنی ہے اور میکائیل سے ہماری دشمنی نہیں ہے وہ غلط کہتا ہے وہ درحقیقت میکائیل علیہ السلام کا بھی دشمن ہے کیونکہ ایک فرشتے سے دُشمنی سب فرشتوں سے دُشمنی کرنے کے درجہ میں ہے اور موجب کفر ہے۔ یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ میکائیل ہمارے دوست ہیں یہ غلط ہے جبریل علیہ السلام کا یا کسی بھی فرشتے کا دُشمن ہونا سارے فرشتوں کا دشمن ہونا ہے اور اس میں اللہ کی دشمنی پوشیدہ ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا

اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے آپ کی طرف واضح دلیلیں نازل کی ہیں، اور اُن کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو حکم عدولی کرنے والے ہیں۔ کیا جب کبھی بھی

عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اُنہوں نے عہد کیا اس عہد کو ان میں سے ایک جماعت نے پھینک دیا بلکہ اُن میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔

آیاتِ بیّنات کا اِنکار فاسقوں ہی کا کام ہے

تفسیر درمنثور میں ص ۹۴ ج ا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا یہودی نے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمدؐ! کوئی ایسی چیز آپ نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوں اور نہ آپ کے پاس ایسی کوئی کھلی ہوئی دلیل ہے جس کی وجہ سے ہم آپ کا اتباع کرلیں۔ اس کی تردید میں اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ہم نے اے محمد! (ﷺ) تمہاری طرف واضح آیات نازل فرمائی ہیں جو آیاتِ بیّنات ہیں، ان آیات میں یہود کی پوشیدہ باتیں اُن کے بھید اور راز بیان کرنا اُن کے گزرے ہوئے اسلاف کے حالات بتانا اور اُن کی تحریفات کا پتہ دینا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمایا اور اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔ جو شخص انصاف پسند ہو حسد اور جلن کی وجہ سے اپنی جان کو ہلاک کرنے پر تُلا نہ گیا ہو اُس کے لئے یہ دلائل کافی اور وافی ہیں۔ لیکن اگر کسی کو حق اور حقیقت سے بغض اور عناد ہو اور حکم عدولی ہی جس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور فسق اُس کی طبیعت میں رچ بچ گیا ہو وہ ہی ان آیات بیّنات کا منکر ہو سکتا ہے۔

یہودیوں کی ایک جماعت ہر عہد کی خلاف ورزی کرتی رہی ہے...... تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو تذکیر فرمائی اور جو ان سے میثاق اور قول و قرار لیا گیا تھا وہ اُن کو یاد دلایا اور خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو اُن سے عہد لیا گیا تھا اُس کی یاد دہانی فرمائی تو وہ صاف مُنکر ہو گئے۔ اُن میں ایک آدمی مالک بن سیف تھا اُس نے کہا کہ اللہ کی قسم محمد (ﷺ) کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی! اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا (الآیۃ) یعنی یہ لوگ اس عہد سے منکر ہو رہے ہیں اور حال اُن کا یہ رہا ہے کہ جب کبھی بھی اُنہوں نے کوئی عہد کیا تو اُن میں سے ایک جماعت نے اُس کو پھینک دیا اُن کا یہ مزاج ہے اور نقض عہد کی عادت ہے۔ صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں کہ واؤ سے پہلے معطوف علیہ حذف ہے اور عبارت یوں ہے۔ أكفروا بالآيت و كلما عاهدوا، وهو من عطف الفعلية على الفعلية۔ روح المعانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ ان کی پرواہ نہ کریں اور ان کی مخالفت کو اپنے دل کا بوجھ نہ بنائیں۔ (ص ۳۳۵ ج ا)

آخر میں فرمایا: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے بعض یہودی مسلمان ہو گئے تھے اس لئے یہ فرمایا کہ اُن میں سے اکثر ایمان نہ لائیں گے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آیا جو تصدیق کرنے والا ہے اُس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے تو جن کو کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک

الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جماعت نے اللہ کی کتاب کو پس پُشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔

اہلِ کتاب نے کتابُ اللہ کو پس پُشت ڈال دیا

اس آیت شریفہ میں یہودیوں کی اس بات کا ذکر ہے کہ جب اُنکے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم المرتبہ رسول آیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور اس رسُول نے اس کتاب کی تصدیق بھی کی جسے یہود مانتے تھے اور اُس کو اللہ کی کتاب جانتے تھے (یعنی توریت شریف) تو ان لوگوں نے دونوں کتابوں میں مطابقت ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب توریت شریف کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ قرآن کو تو قبول کیا ہی نہیں اور توریت شریف کے بھی مُنحرف ہوگئے اور اُس میں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کی گئی تھیں اُن کے اظہار کے بجائے اُن کو پوشیدہ کر لیا اور اس انداز سے منکر اور منحرف ہوئے کہ گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ توریت اللہ کی کتاب ہے اور انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل موجود ہیں۔ (کذا فی الروح ص ۳۳۶ ج ۱)

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا

اور انہوں نے اِس چیز کا اتباع کیا جسے سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھتے تھے اور نہیں کفر کیا سلیمان نے لیکن شیاطین نے کفر اختیار کیا،

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ

وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور انہوں نے اس کا بھی اتباع کیا جو نازل ہوا دو فرشتوں پر بابل میں، یہ دو فرشتے ہاروت اور ماروت تھے اور یہ دونوں نہیں سکھاتے تھے

اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ

کسی کو جب تک یوں نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود ایک فتنہ ہے لہٰذا تو کفر اختیار نہ کر، پس یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ مرد اور اُس کی بیوی کے درمیان جُدائی

وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ

کر دیتے تھے اور وہ لوگ اس کے ذریعہ کسی کو کچھ بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ کے حکم سے، اور وہ لوگ وہ چیز سیکھتے ہیں جو اُن کو ضرر دینے والی ہے اور نفع دینے والی نہیں

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ

اور البتہ تحقیق اُنہوں نے یہ بات جان لی کہ جس نے اسکو خریدا ہے اُس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بے شک وہ بری چیز ہے جسکے ذریعہ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا، اگر

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

وہ جانتے ہوتے، اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ثواب بہتر تھا اگر وہ جانتے ہوتے۔

بابل میں جادُوگروں کا زور، اور یہود کا جادُو کے پیچھے لگنا

جادوگری کا سلسلہ پُرانا ہے۔ ہوتا تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ ہی سے ہے۔ اسباب جو بھی ہوں، جادو بھی ایک سبب ہے جس سے احوال میں کچھ تغیر ہو جاتا ہے اور جس پر جادو کیا جائے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی اُمت کے لوگوں نے کہا: اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (کہ تم تو انہیں لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہو) اور یہی بات حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ان کی اُمت کے افراد نے کہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ تو مشہور ہی ہے اور یہ جادوگری کا سلسلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ تک تھا اور اس کے بعد بھی رہا۔ ایک یہودی نے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا جس کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ (ص ۸۵۸ ج ۲) اور اب بھی جادوگر دنیا میں موجود ہیں اور جادوگری دنیا میں رواج پائے ہوئے ہے۔ اوّل تو یہود کی شکایت فرمائی کہ اللہ کی کتاب اُنہوں نے پسِ پُشت ڈال دی پھر فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں جو شیاطین پڑھتے تھے یعنی جادو کرتے تھے اور اس میں مشغول رہتے تھے اُنہوں نے اس کا اتباع کیا۔ مفسرین نے اس طرح کے واقعات لکھے ہیں کہ عارضی طور پر چند دِن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جاتی رہی تھی اس زمانے میں شیاطین نے اُن کی کُرسی کے نیچے جادو کی چیزیں دفن کر دی تھیں اور جب اُن کی وفات ہوگئی تو اُن کو کھود کر نکالا اور لوگوں میں مشہور کر دیا کہ سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے بلکہ جادو کے زور پر حکومت چلاتے تھے، علماءِ بنی اسرائیل نے تو اس بات کو نہیں مانا لیکن ان کے عوام نے اس بات کو مان لیا اور کہنے لگے کہ یہ جادو ہی سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور اس کے سیکھنے سکھانے میں لگ گئے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابوں کو چھوڑ بیٹھے، جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں اِرشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے پیغمبروں میں سے تھے تو یہودیوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کہتے ہیں کہ سلیمان ابنِ داؤد (علیہما السلام) نبی تھے حالانکہ وہ صرف ایک جادوگر تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سحر سے برأت نازل فرمائی اور صاف فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔

(یعنی سلیمان نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر اختیار کیا) شیاطین کا یہ مشغلہ تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ (من القرطبی وابن کثیر)

ہاروت و ماروت کے ذریعہ امتحان ...... اِرشاد ربانی ہے وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ۔ (یہود نے اس کا بھی اتباع کیا جو دونوں فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل شہر میں اُتارا گیا)

کسی زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا خاص کر شہر بابل میں جو عراق میں واقع ہے، جادو کے اثرات کو دیکھ کر لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے اور جادوگروں کو مقدس سمجھنے لگے۔ اللہ جل شانہٗ نے جادو کا ضرر اور اس کی مذمت ظاہر فرمانے کے لئے دو فرشتوں کو بھیجا جن کا نام ہاروت اور ماروت [1] تھا تاکہ وہ سحر کی حقیقت واضح کریں اور معجزہ اور سحر میں فرق ظاہر ہو جائے۔ اس میں لوگوں کا امتحان بھی مقصود تھا کہ دیکھا جائے کہ کون ایمان اور خیر کو اور کون کفر اور شر کو اختیار کرتا ہے۔ جب اِن دونوں فرشتوں نے اپنا کام شروع کیا تو لوگ ان کے پاس آنے جانے لگے اور کہنے لگے کہ ہم کو بھی جادو کے اصول و فروع بتا دیں وہ دونوں فرشتے جب اُن کو جادو کی کوئی چیز بتاتے تو پہلے یہ ظاہر کر دیتے تھے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے بندوں کی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کہ ان چیزوں کو جان کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے جو شر سے بچ جائے اور کون شخص اپنے دین کو برباد کرتا ہے اور اپنے لئے شر کو اختیار کرتا ہے۔ وہ فرشتے کہتے تھے کہ ہم تم کو نصیحت کرتے

---

۱)...... وما يقضى منه العجب ما قاله الامام القرطبى ان هاروت و ماروت بدل من الشياطين على قراءة التشديد وما فى (وما انزل) نافيه والمراد من الملكين جبرايل و ميكائيل لأن اليهود زعموا ان الله تعالىٰ أنزلهما ...... بقیہ اگلے صفحے پر دیکھئے

ہیں اگر تم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اچھی نیت سے حاصل کرو کہ شر سے محفوظ رہو گے، پھر اسی نیت پر قائم رہنا، شر کے لئے معلوم نہ کرو اور اس کو شر میں استعمال نہ کرنا ورنہ اس میں لگ کر ایمان برباد کر لو گے جو شخص ان سے اس طرح کا عہد و پیمان کر لیتا تھا وہ اُسے جادو کے اصول و فروع بتا دیتے تھے اس کے بعد جو کوئی اپنے عہد پر قائم نہ رہتا اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیتا تو وہ اس کا اپنا عمل تھا۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: وهذان الملكان أنزلا لتعليم السحر ابتلاء من الله تعالٰى للناس فمن تعلم وعمل به كفر ومن تعلم وتوقى عمله ثبت على الايمان، ولله تعالٰى أن يمتحن عباده بما شاء كما امتحن قوم طالوت بالنهر و تمييزا بينه و بين المعجزة حيث أنه كثر فى ذلك الزمان واظهر السحرة اموراً غريبةً وقع الشك بها فى النبوة فبعث الله تعالٰى الملكين لتعليم أبواب السحر حتى يزيلا الشبه ويميطا الأذى عن الطريق قيل كان ذلك فى زمن ادريس عليه السلام (ص ۳۴۰ ج ۱ و مثله فى تفسير ابن كثير ص ۱۳۷ ج ۱)۔ (یہ دونوں فرشتے (ہاروت و ماروت) سحر (جادو) کی تعلیم کیلئے اتارے گئے جس کا ایک مقصد تو من جانب اللہ لوگوں کی آزمائش کرنا تھا۔ پس جس نے اسے سیکھا اور اس پر عمل کیا وہ تو کافر ہو گیا اور جس نے سیکھا اور اپنے عمل کو بچایا وہ ایمان پر ثابت قدم رہا۔ اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کی جس چیز سے چاہیں آزمائش کریں جیسا کہ اس نے قوم طالوت کی نہر کے ذریعے آزمائش کی تھی۔ اور دوسرا مقصد سحر اور معجزہ کے مابین فرق کرنا تھا کیونکہ زمانہ میں سحر بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ساحرین عجیب و غریب سحر انگیزیاں دکھا رہے تھے جس کے سبب نبوت کی پہچان میں شک واقع ہو رہا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں فرشتوں کو ابواب سحر کی تعلیم کیلئے بھیجا تا کہ وہ لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کریں کہا گیا ہے کہ یہ قصہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا)

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو فلسفہ قدیمہ یا جدیدہ پڑھا دیجئے تا کہ خود بھی شبہات سے محفوظ رہوں، اور مخالفین کو جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ

بقیہ پچھلے صفحے سے آگے ......

بالسحر و فى الكلام تقديم و تاخير، والتقدير (وما كفر سليمان) (وما أنزل على الملكين) (ولكن الشياطين) (هاروت و ماروت) (كفروا يعلمون الناس السحر (ببابل) وعليه فالبدل اما بدل بعض من كل ونص عليهما بالذكر لتمردهما ولكونهما، رأسا فى التعليم، اوبدل كل من كل امابناءً على أن الجمع يطلق على الاثنين و على أنهما عبارتان عن قبيلتين من الشياطين لم يكن غيرهما بهذه الصفة، واعجب من قوله هذا قوله و هذا أولى ما حملت عليه الأية من التاويل واصح ما قيل فيها، ولا تلتفت الى ماسواه، ولا يخفى لدى كل منصف أنه لا ينبغى لمؤمن حمل كلام الله تعالٰى وهو فى اعلى مراتب البلاغة والفصاحة على ماهو ادنى من ذلك، وما هو الامسخ لكتاب الله تعالٰى عزشانه واهباط له عن شاواه ____ (روح المعانى ۳۴۳ ج ۱) امام قرطبی کا قول تعجب خیز ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تشدید والی قرأت کی صورت میں ہاروت و ماروت دونوں شیاطین سے بدل ہوں گے اور ما انزل میں ما نافیہ ہے اور ملکین سے مراد جبریل و میکائیل ہیں کیونکہ یہود کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی دو فرشتوں کو نازل کیا تھا۔ اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا اور نہ ہی فرشتوں پر کچھ اتارا گیا لیکن شیاطین یعنی ہاروت و ماروت نے کفر کیا وہ لوگوں کو شہر بابل میں سحر سکھاتے تھے۔ اس قول کے مطابق ہاروت و ماروت کے شیاطین سے بدل ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو یہ شیاطین کا بدل البعض ہوں گے۔ اس صورت میں ان کے ذکر کی تصریح یا تو ان کی سرکشی کی وجہ سے کی گئی یا اس وجہ سے کہ یہ تعلیم سحر میں دوسرے جنوں کے سردار تھے۔ یا یہ شیاطین کا بدل الکل ہوں گے اس صورت میں ان دونوں کے ذکر کی صراحت یا تو اس بناء پر ہے کہ جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے یا اس بناء پر کہ ہاروت و ماروت سے شیاطین کے دو قبیلے مراد ہیں۔ ان دو قبیلوں کے علاوہ دوسرے شیاطین تعلیم سحر کا کام نہیں کرتے تھے اور اس سے بھی زیادہ عجیب تر امام قرطبیؒ کا یہ قول ہے ''اس تاویل پر آیت کو محمول کرنا زیادہ مناسب ہے اور یہی اس آیت کے بارے میں صحیح ترین قول ہے دیگر اقوال کی طرف التفات نہ کرنی چاہیے۔'' کسی بھی انصاف پسند پر مخفی نہیں کہ کسی مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ کے کلام کو جو کہ بلاغت و فصاحت کے اعلیٰ ترین مراتب میں ہے۔ ادنیٰ مراتب پر محمول کرنا مناسب نہیں۔ یہ تو کتاب اللہ کی شان کو مسخ کرنا اور اسے اس کے مقام و مرتبہ سے نیچے لانا ہے۔

ہو کہ مجھ کو مثلاً دھوکہ دے کر پڑھ لے پھر خود بھی تقویت باطل میں اس کا استعمال کرنے لگے اور اس احتمال کی وجہ سے اُس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کرے اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جائے۔ لیکن پھر وہ شخص درحقیقت قصداً اُسی سوءِ استعمال محتمل میں مبتلا ہو جائے، سو ظاہر ہے کہ اس کے سوءِ استعمال سے اُس معلم پر کوئی ملامت یا قبح عائد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس اطلاع سحر سے اُن فرشتوں پر کسی شُبہ و وسوسہ کی گنجائش نہیں۔ (بیان القرآن)

جادو کے بعض اثرات...... پھر فرمایا فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (یعنی وہ لوگ اُن دونوں فرشتوں سے وہ چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ میاں بیوی میں جُدائی کر دیتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ جادو کے اثر سے دو محبت والوں میں بُغض پیدا ہو سکتا ہے اور میل محبت والوں میں جُدائی ہو سکتی ہے۔ جادو کے ذریعہ اُس زمانہ کے لوگ کیا کیا حرکتیں کرتے ہوں گے کیا کیا ایذائیں دیتے ہوں گے اُن میں سے صرف ایک ایسی چیز کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت ہی مبغوض اور شیطان کو بہت محبوب ہے اور وہ ہے میاں بیوی کے درمیان جُدائی کر دینا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر اپنی جماعتوں کو بھیجتا ہے اس کی جماعتوں کے افراد لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہیں ابلیس کا سب سے بڑا مقرب ان میں سے وہ ہوتا ہے جو فتنہ ڈالنے میں سب سے بڑا ہو (فتنوں میں مُبتلا کر کے اس کے نمائندے اس کے پاس آتے رہتے ہیں اور اپنا اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں) ان میں سے ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے ایسا ایسا کیا تو ابلیس کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر اُن میں سے ایک آتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کے پیچھے اتنا لگا کہ اس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان میں نے جُدائی کر دی اُس کی یہ بات سن کر ابلیس اُسے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تو نے کام کیا ہے۔ حضرت اعمش (راوی حدیث) فرماتے ہیں کہ مجھے جہاں تک یاد ہے اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ابلیس اس کو چمٹا لیتا ہے، جس نے میاں بیوی میں جُدائی کرا دی۔ (صحیح مسلم ص ۳۷۶ ج ۲)

جادو کا اثر باذن اللہ ہوتا ہے:...... پھر فرمایا: وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یہ لوگ جادو کے ذریعہ کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ کے حکم سے) اس میں یہ بات واضح طور پر بتادی کہ جادو کے زور سے جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی مشیت اور ارادہ سے ہی ہوتا ہے جو ظاہری اسباب لوگوں کے سامنے ہیں مثلاً آگ سے جل جانا اور چاقو چھری سے زخم ہو جانا اور بعض مشہور دواؤں کے کھانے سے اسہال ہو جانا اور روٹی سے پیٹ بھر جانا اور پانی سے سیراب ہو جانا اس طرح کی چیزیں چونکہ روزانہ مشاہدہ میں آتی ہیں اس لئے ان کو کچھ عجیب نہیں سمجھا جاتا اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ نہ جلائے (جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ نے کچھ اثر نہیں کیا) اور اللہ تعالیٰ چاہے تو چھری سے کچھ بھی نہ کٹے (جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو چھری ذبح نہ کر سکی) اور اللہ تعالیٰ چاہے تو خوب زیادہ کھانے سے بھی پیٹ نہ بھرے (جیسا کہ جوع البقر کا مریض کھاتا ہی رہتا ہے اور اُس کا پیٹ نہیں بھرتا) اور جیسا کہ استسقاء کا مریض پیتا ہی رہتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی جادو کے ذریعہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے بھی اسباب ہوتے ہیں لیکن وہ اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں، نظروں کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے جادو کے اثر سے ظاہر ہونے والی چیزوں کو لوگ تعجب سے دیکھتے ہیں اور کم علم اور کم فہم جادوگروں کے بہت زیادہ معتقد ہو جاتے ہیں اور بہت سے جاہل پیر تھوڑا بہت جادو یا مسمریزم کا کام سیکھ کر جاہلوں کو معتقد بنانے کا کاروبار بھی کر لیتے ہیں جادو کا اثر بھی جبھی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو پھر جب اللہ چاہتا ہے تو جادو کٹ بھی جاتا ہے۔ جب جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے فرمایا: مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ۔ (تم جو کچھ لائے ہو وہ جادو ہے بے شک اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو نیست و نابود کر دے گا)۔ بڑے بڑے جادوگروں کا عمل

سورۂ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور سورۂ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کے ذریعہ ختم ہو جاتا ہے

جادو کے اسبابِ خفیہ...... جادو کے پوشیدہ اسباب کئی طرح کے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ شیاطین سے مدد حاصل کرنے کے لئے ان کو خوش کیا جاتا ہے اور اس کے لئے کبھی ایسے الفاظ اور کلمات پڑھے جاتے ہیں جو کفر و شرک کے کلمات ہوں اور جن میں شیاطین کی تعریف کی گئی ہو اور کبھی ستاروں کی عبادت کی جاتی ہے کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اُس کا خون استعمال کرنا یا جنابت کی حالت میں رہنا اور نجاست میں ملوث رہنا اسی لئے زیادہ کامیاب جادو اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہتے ہیں، اور جو طہارت سے اور اللہ تعالیٰ کے نام سے دور بھاگتے ہیں اور ان کو خبیث کاموں کی عادت ہوتی ہے، جادوگر عورتیں حیض کے زمانہ میں جادو کرتی ہیں جو زیادہ مؤثر ہوتا ہے عموماً خبیث شیاطین جادوگروں کے مدد طلب کرنے سے کام کر دیتے ہیں دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ جادوگر کے کسی کرتب سے ایسا ہو گیا۔ جس طرح فرشتے ان حضرات کی مدد کرتے ہیں جو متقی ہوں اور طہارت اور پاکیزگی کو اختیار کرتے ہوں اور بدبو اور نجاست سے دُور رہتے ہوں اللہ کے ذکر اور اعمالِ خیر میں لگے رہتے ہوں اسی طرح شیاطین ان لوگوں کے مددگار ہوتے ہیں جو قول اور فعل اور اعتقاد کے اعتبار سے خباثت اور نجاست میں شیاطین کی طرح سے ہوں۔ کیونکہ تعاون کے لئے تناسب ضروری ہے۔ (من روح المعانی ص ۳۳۸ ج ۱)

سحرۂ فرعون کا عمل...... مفسر ابنِ کثیر نے ابو عبداللہ رازی سے سحر کی آٹھ قسمیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے قوتِ خیالیہ کا اثر اور نظر بندی اور شعبدہ اور دواؤں کا استعمال کرنا بھی ذِکر کیا ہے ان میں جو شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی یا قوتِ خیالیہ یا دواؤں کا استعمال ہے اس کو مجازاً جادو کہہ دیا گیا ہے نظر بندی کو بطورِ مثال ایسا سمجھ لیا جائے جیسے ریل میں بیٹھے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بھی ساتھ ساتھ جارہی ہے۔ جیسے پلیٹ فارم پر وہ گاڑی چل رہی ہو جس میں ہم بیٹھے ہیں تو نظر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ برابر کی گاڑی چل رہی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو جادوگر آئے تھے اُن کے بارے میں ارشاد ہے۔ یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ اَنَّھَا تَسْعٰی (کہ اُن کے جادُو کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں) یہ سورۂ طٰہٰ میں ہے اور سورۂ اعراف میں ارشاد ہے۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ (کہ جب اُنہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور اُن پر ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو لے کر آئے)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو سے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی جس کے اثر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ سمجھنے لگے اور اُن کے دِل میں تھوڑا سا خوف بھی آ گیا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (موسیٰ نے اپنے جی میں خوف محسوس کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ۔ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ۔

(کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے یہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے اس کو ڈال دو انہوں نے جو کچھ کرتب کیا ہے اس کو تمہاری لاٹھی نگل جائے گی۔ اُنہوں نے جو کچھ بنایا ہے یہ صرف جادو کا مکر ہے اور جادوگر جہاں بھی ہو کامیاب نہیں ہوتا)

معجزہ اور سحر میں فرق...... جیسا کہ پہلے ہم نے عرض کیا کہ سحر کا اثر بھی اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ اسباب عام لوگوں کے سامنے نہیں ہوتے۔ اور جادوگروں کو ان پوشیدہ اسباب کا پتہ ہوتا ہے۔ اب رہا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا معجزہ تو اس میں کوئی سبب ظاہر یا پوشیدہ نہیں ہوتا اس میں بلاواسطہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا فعل حقیقۃً مؤثر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا ٹھنڈا ہو جانا اور حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے لاٹھی مارنے سے سمندر کا پھٹ جانا اور پتھروں سے چشموں کا بہہ جانا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مٹھی خاک پھینک دینے سے کافروں کی آنکھوں میں پہنچ جانا۔ مبارک انگلیوں سے پانی کا جاری ہو جانا اور تھوڑی چیز کا زیادہ ہو جانا، تھوڑے سے آٹے کی روٹیاں کئی سو آدمیوں کے لئے کافی ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کسی سبب کے تحت نہیں تھا ختم نبوت کے بعد ایک مسلمان کو یہ عقیدہ رکھنا کہ اب کوئی نبی نہیں آسکتا ہر مدعیٔ نبوت ساحر کے کرتبوں کی عقیدت سے اُسے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اُوپر جو معجزہ اور سحر کا فرق ظاہر ہو گیا اس کے علاوہ دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ سحر گندے اور ناپاک لوگوں سے ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے نبی طاہرین اور صالحین بندے تھے۔ اِس لئے بھی دونوں میں اشتباہ نہیں ہو سکتا۔ اور صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی جادوگر کو یہ طاقت نہیں دی کہ دریا کو پھاڑ دے، یا مُردوں کو زندہ کر دے یا جمادات سے بات کرا دے اور ان کے علاوہ بھی اُن میں سے کسی کو ایسی چیز پر قدرت نہیں دی جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات تھے۔ (ص ۳۳۹ ج۱) نیز صاحب رُوح المعانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض محققین نے سحر اور معجزہ کے درمیان یوں فرق بتایا ہے کہ معجزہ تحدی کے ساتھ ہوتا تھا یعنی صاحبِ نبوّت کے ہاتھ پر جو کوئی معجزہ ظاہر ہوا اس کی طرف سے نُبوت کا دعویٰ ہوتا تھا اور جو معجزہ اس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ اس کے مقابلہ میں اس طرح کی چیز پیش کرنے کا چیلنج بھی کرتا تھا اور یہ صورت کسی جادوگر اور جھوٹے مُدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ یوں ہی رہی ہے۔ (ص ۳۳۹ ج۱) اور اب تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ہی ختم ہے۔ بہتیرے جھوٹے مُدعیٔ نبوت پیدا ہوئے اگر کسی نے کوئی کرتب دِکھایا بھی تو شُعبدہ تھا اور سب جُھوٹے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔ جادوگر تحدی یعنی چیلنج نہیں کر سکتے وہ تو مقابلہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ایک جادوگر دُوسرے جادوگر کا کاٹ کر دیتا اور تماشا دِکھانے والے جادوگروں کو دیکھا ہے کہ بانسری بجتے بجتے اس کی آواز ختم ہو جاتی ہے اور مجمع میں کھڑا ہوا دوسرا جادوگر اس کی آواز بند کر دیتا ہے۔ کسی نبی کے کسی معجزہ کے موافق کوئی کر کے نہیں دِکھا سکا اور نہ اس کی کاٹ کر سکا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔

کرامت اور سحر میں فرق ...... بہت سے اولیاء اللہ سے کرامت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حسب تحقیق صوفیاء کرام اس کرامت سے تقرب الی اللہ میں اور رفع درجات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ کرامت کو اپنی کرامت کا پتہ بھی نہیں چلتا اس لئے محقق صوفیہ کے نزدیک کرامت کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ معجزہ اور سحر میں تو فرق ظاہر ہو گیا اب نبوت باقی بھی نہیں رہی تاکہ کسی کو دھوکہ ہو سکے لیکن اولیاء اللہ تو ہوتے ہیں اور اُن سے کرامت کا صدور ہونا ممکن ہے۔ پھر کرامت اور جادو میں فرق ظاہر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ سمجھ لینا چاہیے کہ کرامت اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں سے ظاہر ہوتی ہے جو عبادت میں اور ذکر اللہ میں اور اطاعت اور فرمانبرداری میں مشغول رہتے ہیں۔ پاک صاف ہوتے ہیں۔ نجاست سے بچتے ہیں۔ جنابت ہو جانے پر جلدی غسل کر لیتے ہیں اور جادو اُن لوگوں کا کام ہے جو گندے اور ناپاک ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے نام سے بَیر ہوتا ہے اور جو اللہ کی عبادت سے دور بھاگتے ہیں۔ نجاست اور خباثت اور جنابت میں ملوث اور متلبس رہنا اُن کا مزاج بن چکا ہوتا ہے، جو شخص یہ کہے کہ میں ولی صاحب کرامت ہوں اور اُس کا حال وہ ہو جو شیاطین اور اُس کے دوستوں کا ہوتا ہے یعنی طاعت و عبادت اور ذکر اللہ سے دُور اور نجاست و جنابت اور خباثت سے پُر اس کے ولی ہونے کا خیال کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے کرتب کو کرامت کہا جا سکتا ہے۔

سحر فسق بھی ہے اور کفر بھی ...... صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس کے کلمات کُفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ، تب تو کفر ہے۔ خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے اور اگر

کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے یا اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو فسق اور معصیت ہے اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور مباح ہے۔ البتہ لغت میں لفظ سحر اس کو بھی شامل ہے کہ ہر تصرف عجیب کو کہا جاتا ہے اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو وہ بوجہ احتمال کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے اور یہی تفصیل سے تمام تعویذ گنڈوں اور نقش وغیرہ میں کہ غیر مفہوم نہ ہوں اور غیر مشروع نہ ہوں اور غرض ناجائز میں استعمال نہ ہوں، اتنی شرطوں سے جائز ہیں ورنہ ناجائز، اور کفر عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے۔

پھر فرمایا: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (کہ وہ لوگ ایسی چیز سیکھتے تھے جو اُن کو ضرر دینے والی تھی نفع دینے والی نہ تھی) علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں جادو کی وجہ سے نقصان پہنچے گا۔ اگر چہ دنیا میں ذرا بہت نفع کما لیں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ دنیا میں بھی ان کے لئے ضرر ہے کیونکہ جادو کا ضرر جادوگر کو پہنچ جاتا ہے۔ حکومت اسلام اس کو سزا دے گی اور جادوگری کی بدبختی اس کو لاحق ہوگی۔ اھ

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ماقبل پر معطوف ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ جادو خالص شر ہے اور ضرر محض ہے ایسا نہیں کہ جیسی بعض ضرر والی چیزیں نفع بھی دے جاتی ہیں۔ (جیسے زہر کا کشتہ اور وہ دواؤں میں مفید ہو جاتا ہے)۔ اس لئے کہ جادوگر جادو سیکھ کر جادوگری کی باتوں سے محفوظ رہنے کا ارادہ نہیں کرتا تا کہ فی الجملہ کوئی نفع متصور ہو سکے اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ سیاق آیت سے یہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں جہان میں غیر نافع ہے کیونکہ اس کا تعلق نہ امور معاش سے ہے اور نہ معاد سے اور آیت میں جادو سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اھ

اگر کوئی شخص کبھی کوئی نفع جادو کے ذریعہ کسی مسلمان کو اس طرح کا پہنچا دے کہ مسلمانوں سے دفع ضرر کر دے تو گو یہ ایک نفع ہے لیکن چونکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور عام طور پر جادوگر بے دین ہی ہوتے ہیں اس لئے عمومی طور پر جادو مطلقاً ضرر دینے والی چیز ہوئی۔ کوئی بھی جادوگر ایسا نہیں دیکھا گیا جس نے جادُو کے زور پر دنیا جمع کر لی ہو، جائیداد حاصل کر لی ہو یا حکومت پر قابض ہو گیا ہو۔ ان لوگوں کو ہمیشہ بدحالی میں دیکھا جاتا ہے دین اور اعمال دین سے اور طہارت اور ذکر و عبادت سے تو دُور ہوتے ہی ہیں دُنیاوی اعتبار سے بھی میلے کچیلے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں رہتے ہیں۔ تماشے دِکھا کر یا لوگوں کے کہنے سے دُوسروں پر جادُو کر کے تھوڑے بہت پیسے وصول کرنے سے زِندگی گزارتے ہیں اور چند پیسوں کے لئے دُوسروں پر جادُو کر دیتے ہیں اُن کی دُنیا و آخرت کی تباہی نظروں کے سامنے ہے۔

اس کے بعد فرمایا: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (یعنی کتاب اللہ کو چھوڑ کر جو یہودی جادو کے پیچھے لگے انہیں معلوم ہے کہ جس نے جادو حاصل کیا اور کتاب اللہ کو چھوڑا ان کو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ سب جاننے کے باوجود انہوں نے جادُو اختیار کر کے کفر مول لیا)

پھر فرمایا وَلَبِئْسَ مَاشَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کہ اُنہوں نے اپنی جانوں کو جو بیچ دیا یعنی جانوں کے بدلہ جادو اور کفر خرید لیا اور اپنی جانوں کو دُنیا اور آخرت کی نعمتوں سے محروم کر کے مُبتلائے عذاب کر دیا۔ یہ بہت بُرا سودا کیا۔ اگر وہ اس کو جانتے تو ایسا نہ کرتے۔ فی روح المعانی لو كانوا يعلمون ای مذمومية الشراء المذكور لامتنعوا عنه. (ص ۳۴۶ ج ۱) وفی معالم التنزيل باعوا به أنفسهم (ای) حظ انفسهم حيث اختاروا السحر والكفر على الدين والحق. (ص ۱۰۲ ج ۱)

مفسرین نے اشکال کیا ہے کہ پہلے تو وَلَقَدْ عَلِمُوْا فرمایا پھر لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فرمایا اس میں بظاہر تعارض ہے۔ پھر اس کے دو تین جواب دیئے جن میں سے ایک جواب یہ ہے کہ اُن کا جاننا نہ جاننے کے درجہ میں ہے۔ جب ضرر جانتے ہوئے کسی چیز کو اختیار کیا اور ایمان

سے منہ موڑا گویا کہ وہ جاننے کے باوجود نہیں جانتے۔ رُوح المعانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُنہوں نے عتاب اور عذاب کو تو جانا لیکن اس کی حقیقت اور شدت کو نہیں جانا گویا لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کا مفعول محذوف ہے۔

پھر فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا (الآیة) یعنی یہ لوگ اگر اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لاتے (جس میں خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی شامل ہے) اور کفر و معاصی سے بچتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اس کی جزا دی جاتی۔ جو اس سے بہتر ہے جس کے بدلہ انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا۔ اگر وہ جانتے ہوتے تو آخرت کے ثواب کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور خیر کی طرف بڑھتے۔ آخرت کا تھوڑا سا ثواب بھی فانی دُنیا کے بہت بڑے نفع سے بھی بہتر ہے۔ باقی اور فانی کا فرق خود سمجھ لینا چاہیئے۔

جادوگر کی کیا سزا ہے اس کے بارے میں تفصیل ہے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول و مشہور ہے کہ جادوگر علی الاطلاق قتل کیا جائے۔ جب یہ معلوم ہو کہ جادوگر ہے اس کا یہ کہنا کہ میں اب سے جادو نہ کروں گا توبہ کرتا ہوں قبول نہیں کیا جائے گا۔ (ص ۳۳۹ ج ۱)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تکملہ شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں کہ جو سحر کفر ہے اس کا اختیار کرنے والا مُرتد ہو جانے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور جادوگر عورت قتل نہیں کی جائے گی اس لئے کہ مرتدہ کو قتل نہیں کیا جاتا (وہ ہمیشہ قید میں رہے گی الا أن تتوب) اور جو سحر فسق کے درجے میں ہو اس میں سحر کی وجہ سے قتل نہ ہوگا لیکن اگر کوئی ایسا کام ہو جس سے کسی انسان کی ہلاکت ہوگئی یا مریض ہوگیا یا میاں بیوی میں جُدائی کرادی ہو تو زمین میں فساد کرنے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور اس صورت میں ساحر اور ساحرہ دونوں قتل کئے جائیں گے کیونکہ اس کی علّت ارتداد نہیں بلکہ فساد فی الارض ہے۔ اھ حضرت جندب بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک آدمی کھیل کر رہا ہے اس نے ایک شخص کو ذبح کر دیا اور اُس کا سر جُدا کر دیا پھر اُس کا سر واپس جوڑ دیا۔ لوگوں نے دیکھا تو چیخ اُٹھے اور کہنے لگے کہ سُبحان اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے حضرت جندب نے تلوار نکالی اور اس جادوگر کی گردن ماردی اور فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنے نفس کو زندہ کرے۔ حضرت جندب کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یضرب ضربۃً فیکون امۃ واحدۃ کہ یہ ایک ایسی تلوار مارے گا جس کی وجہ سے یہ تنہا ایک اُمت کے برابر درجہ پالے گا۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابہ ص ۲۵۰ ج ۱)

چونکہ اس جادوگر کے عمل سے لوگ متاثر ہو کر یوں سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص مُردوں کو زندہ کرتا ہے اس لئے رفع فساد کی وجہ سے اُس کا قتل ضروری ہوا۔

تفسیر قرطبی میں اس قصے کو اس طرح لکھا ہے کہ ولید بن عقبہ (امیر عراق) کے پاس ایک شخص رسی پر چل رہا تھا اور گدھے کے پیچھے سے اُس کی دُم میں داخل ہوتا تھا اور اس کے مُنہ سے نکل جاتا تھا۔ حضرت جندب نے اس کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں وہ شخص ہوگا جس کو جندب کہا جائے گا وہ ایک مرتبہ ایسی تلوار مارے گا جس سے حق اور باطل کے درمیان تفریق کر دے گا۔ (ص ۴۷ ج ۲)

مسئلہ...... اگر قرآن و حدیث کے کلمات ہی سے عمل کیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں۔ مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے۔ اگرچہ وظیفہ اسماء الٰہیہ، یا آیات قرآنیہ ہی کا ہو وہ بھی حرام ہے۔ (معارف القرآن)

مسئلہ...... تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں اور حرام ہیں اور اگر الفاظ

مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

فائدہ...... عام طور پر عوام میں ایک قصہ مشہور ہے جو ہاروت ماروت اور زہرہ کے بارے میں ہے کہ ان دونوں فرشتوں کو قوتِ شہوانیہ دے دی گئی تھی، اور زمین میں اُتار دیئے گئے تھے۔ وہ زمین میں آئے تو زہرہ سے شہوت والی مطلب بَراری کا اِرادہ کیا اور اس کو آمادہ کرنے کی کوشش کی اس پر اس نے ان سے اسمِ اعظم پوچھ لیا جس کے ذریعہ وہ آسمان پر چلی گئی اور وہاں ستارہ بن گئی۔ ان دونوں فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دُنیا کا عذاب چاہتے ہو یا آخرت کا۔ تو اُنہوں نے دُنیا کے عذاب کو آخرت کے عذاب پر ترجیح دی اور وہ بابل کے کنویں میں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں اور قیامت تک عذاب ہوگا۔ اس قصہ کو علامہ ابن جوزی نے دو طریق سے نقل کیا ہے۔

علامہ قرطبی اور صاحبِ رُوح المعانی نے بھی اس قِصّہ کی تردید کی ہے۔

قال القرطبی أنه قول تدفعه الأصول فی الملائکة هم أمناء الله علی وحیه وسفرائه إلی رسله لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ. يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ٥ وأما العقل فلا ينكر وقوع المعصية من الملا ئكة وان يوجد منهم خلاف ما كلفوه ويخلق فيهم الشهوات اذ فی قدرة الله تعالٰی کل موهوم ومن هذا خوف الانبیاء والاولیاء الفضلاء العلماء لکن وقوع هذا الجائز لا یدرک الا بالسمع ولم یصح. (ص۵۲ ج۲) (قرطبیؒ کہتے ہیں کہ یہ ایسا قول ہے جس سے ملائکہ کے بارے میں قرآنی اصول کی تردید ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی وحی کے امین ہیں اور اللہ کے سفیر ہیں جنہیں وہ اپنے رسولوں کی طرف بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم دے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے بلکہ وہ ایسے بندے ہیں جو عزت دیئے گئے ہیں بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اسی کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں رات دن اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ اور گو عقل اس کا انکار نہیں کرتی کہ فرشتوں سے معصیت وقوع میں آئے اور یہ کہ وہ جس امر کے مکلّف بنائے گئے ہیں اس کے خلاف کا ان سے صدور ہو یا ان میں شہوات تخلیق کر دی جائیں۔ کیونکہ ہر وہم میں آنے والی شے اللہ تعالیٰ کے اختیار و قدرت کے دائرہ میں ہے۔ انبیاء واولیاء وغیرہ کا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا بھی اسی سبب سے ہے۔ لیکن کیا حقیقۃً بھی یہ چیز وقوع پذیر ہوئی ہے تو اس کا ادراک سماع پر منحصر ہے اور سماعاً اس کی صحت ثابت نہیں)

صاحبِ رُوح المعانی فرماتے ہیں:

قد أنكره جماعة منهم القاضی عیاض وذکر أن ما ذکره أهل الاخبار ونقله المفسرون فی قصة هاروت و ماروت لم یرمنه شئ لا سقیم ولا صحیح عن رسول الله صلی الله علیه وسلم . ولیس هو شیأ یوخذ بالقیاس ، و ذکر فی البحر أن جمیع ذلک لا یصح منه شئ، ولم یصح أن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یلعن الزهرة. ولا ابن عمر رضی الله تعالٰی عنهما خلافا لمن رواه وقال الامام الرازی بعد أن ذکر الروایة فی ذلک ان هذه الروایة فاسدة مردودة غیر مقبولة ونص الشهاب العراقی...... علی أن من اعتقد فی هاروت و ماروت أنهما ملکان یعذبان علی خطیئتهما مع الزهرة فهو کافر بالله تعالٰی العظیم فان الملائکة معصومون لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ. يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ٥ والزهرة کانت یوم خلق الله تعالٰی السمٰوٰت والارض والقول بأنها تمثلت لهما فکان ما کان وردت إلی مکانها غیر معقول ولا مقبول، واعترض الامام السیوطی علی من أنکر القصة بأن الامام احمد و ابن حبان

والبیهقی وغیرهم رووها مرفوعة و موقوفة علی علی وابن عباس وابن عمر و ابن مسعود رضی الله عنهم باسانید صحیحة یکاد الواقف علیها یقطع بصحتها لکثرتها وقوة مخرجیها وذهب بعض المحققین ان ماروی مروی حکایة لما قاله الیهود وهو باطل فی نفسه وبطلانه فی نفسه لاینافی فی صحة الروایة ولا یرد ما قاله الامام السیوطی علیه انما یرد علی المنکرین بالکلیة. (ص۳۴۱ ج۱) اقول صحة السند لا تستلزم صحة الروایة فان من لوازم الصحة اشیاء أخر غیر صحة السند ذکرها العلماء فی کتب الاصول، فلو صح بعض الاسانید علی رأی الامام السیوطی لا یستلزم منه قبول الروایة. (ایک جماعت نے اس قصہ کا انکار کیا ہے منجملہ ان کے قاضی عیاض بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ محدثین و مفسرین نے ہاروت و ماروت کے قصہ میں جو کچھ ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں نہ صحیح نہ ضعیف اور نہ ہی وہ ایسی شے ہے جسے قیاس کے ذریعہ اخذ کیا جا سکتا ہو اور بحر میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہاروت و ماروت کے قصہ میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی حدیث بھی صحیح نہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابن عمرؓ زہرہ ستارے پر لعنت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ امام رازیؒ نے اس قصہ کے بارے میں روایت ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ روایت فاسد مردود اور غیر مقبول ہے۔ اور شہاب عراقی نے تصریح کی ہے کہ جو شخص ہاروت و ماروت کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ دو فرشتے ہیں جنہیں زہرہ کے ساتھ گناہ کا مرتکب ہونے کے سبب عذاب دیا جا رہا ہے تو وہ شخص کافر ہے کیونکہ فرشتے معصوم ہیں۔ ارشاد باری ہے اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم دے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور کاہلی نہیں کرتے، دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ اور زہرہ ستارہ اس وقت وجود میں آیا جس وقت اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق کی۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ہاروت و ماروت کیلئے مثل عورت کے بنادی گئی پھر جو ہوا سو ہوا اس کے بعد اسے اس کے مقام پر لوٹا دیا گیا۔ یہ سب غیر معقول اور غیر مقبول ہے۔ امام سیوطیؒ نے اس قصہ کے منکرین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام احمدؒ ابن حبان اور بیہقیؒ وغیرہ نے اس قصہ کو مرفوعاً اور موقوفاً حضرت علیؓ ابن عباسؓ ابن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے صحیح اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے ممکن ہے جو شخص ان روایات پر مطلع ہو وہ روایات کی کثرت اور ان کے ناقلین کی عظمت شان کے پیش نظر ان کی صحت کا یقین کر بیٹھے۔ بعض محققین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس قصہ کے بارے میں جو کچھ مروی ہے وہ یہود کے قول کی حکایت ہے اور یہود کا قول فی نفسہ باطل ہے اور اس کا فی نفسہ باطل ہونا روایت کی صحت کے منافی نہیں ہے لہٰذا امام سیوطیؒ کا اعتراض صرف اس پر وارد ہوگا جو سرے سے روایت ہی کی صحت کا منکر ہو۔ میں کہتا ہوں سند کی صحت روایت کی صحت کو مستلزم نہیں کیونکہ روایت کی صحت کے لوازم میں سے سند کی صحت کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جنہیں علماء نے کتب اصول میں ذکر کیا ہے۔ پس اگر امام سیوطیؒ کی رائے کے مطابق بعض اسانید صحیح بھی ہوں تو ان کی صحت قبول روایت کو مستلزم نہیں)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

اے ایمان والو! تم لفظ رَاعِنَا نہ کہو اور لفظ اُنْظُرْنَا کہو، اور سنو! اور کافروں کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

دردناک عذاب ہے۔

رَاعِنَا کہنے کی ممانعت اور یہود کی شرارت

یہودیوں کی بہت سی شرارتوں میں سے ایک یہ بات تھی کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو لفظ رَاعِنَا کہتے تھے۔ یہ عربی زبان کا لفظ بھی ہے اور عبرانی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری رعایت کیجئے اور عبرانی زبان میں یہ لفظ بددعا کے معنی میں ہے۔ یہ لوگ شرارت سے بدُعا دینے کی نیت سے اس لفظ کو استعمال کرتے تھے تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے سُننے والے یہ سمجھیں کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہماری رعایت فرمایئے اور ہماری طرف توجہ فرمایئے اور اندر سے دِل میں بُرے معنی کی نیت کرتے تھے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ۔ مسلمان عربی زبان کے اعتبار سے رَاعِنَا يَا مُحَمَّدُ کہتے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہودیوں کی زبان جانتے تھے اُنہوں نے محسوس کرلیا کہ یہودی رَاعِنَا يَا مُحَمَّدُ کہتے ہیں اور آپس میں ہنستے ہیں۔ لہٰذا اُنہوں نے یہودیوں سے کہا کہ آئندہ تم میں سے کسی نے یہ لفظ بولا تو میں گردن ماردوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ تم لوگ بھی تو کہتے ہو اس پر یہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی کہ اے مسلمانو! تم رَاعِنَا نہ کہو اس کی بجائے لفظ اُنْظُرْنَا کہو اس کا معنی بھی وہی ہے کہ ہماری طرف دیکھئے اور توجہ فرمایئے۔ لہٰذا وہ لفظ بولنا چاہیئے جس کے معنی میں دوسرے معنی کا اشتباہ نہ ہو سکے اور یہودی یہ نہ کہہ سکیں کہ تم بھی لفظ رَاعِنَا بولتے ہو تو ہم نے بھی بول دیا۔ نیز مسلمانوں سے خطاب ہوا کہ تم بات کو سنو اور اطاعت کرو اور یہ بھی فرمایا کہ کافروں کے لئے عذابِ الیم ہے وہ آخرت میں اپنی حرکتوں کی دردناک سزا پالیں گے۔ (من معالم التنزیل ص ۱۰۲ ج ۱)

بیان القرآن میں لکھا ہے کہ اس حکم سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کسی فعل مباح سے کسی کو گنجائش گناہ کرنے کی ملے تو وہ فعل خود اس کے حق میں مباح نہیں رہتا جیسے مثلاً عالم کے کسی فعل سے کوئی جاہل سند لے کر خلاف شرع کام کرنے لگے تو اگر وہ فعل ضروری نہ ہوگا تو خود اس عالم کے لئے بھی منع ہو جائے گا۔

لَا تَقُولُوا رَاعِنَا سے استنباط احکام ...... اور ابوبکر جصاص احکام القرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ جس لفظ میں احتمال خیر وشر دونوں کا ہو اس کا بولنا جائز نہیں جب تک کوئی ایسی چیز اس کے ساتھ نہ ملالی جائے جس سے وہ خیر ہی کے لئے متعین ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی ہنسی کرنا، مذاق اُڑانا ممنوع ہے اور ہر وہ لفظ ممنوع ہے جس میں احتمال مذاق اُڑانے کا ہو (چونکہ یہودی لفظ راعنا کہہ کر ہنستے تھے اور مذاق بناتے تھے اس لئے جصاص نے اس آیت کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے)۔

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا، قول میں بھی اور فعل میں بھی۔ اس کے بعد مسند احمد اور سنن ابی داؤد سے حدیث نقل کی ہے۔ من تشبه بقوم فهو منهم (کہ جو شخص کسی قوم کی مُشابہت اختیار کرتا ہے وہ اُنہیں میں سے ہے) اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ کافروں کے ساتھ اُن کے اقوال اور افعال اور لباس اور تہوار اور عبادات وغیرہ میں مشابہت اختیار کرنا سخت ممنوع ہے اور مشابہت کرنے والوں کے لئے تہدید اور وعید ہے۔ (ص ۱۴۸ ج ۱)

متعدد احادیث میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ خطاب اور گفتگو میں اچھے الفاظ استعمال کئے جائیں اور اُن الفاظ سے بچیں جو بُرے اور نامُناسب معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اِسی لئے کسی کو ملک الاملاک یعنی شہنشاہ کہنے سے منع فرمایا۔ (کیونکہ سب بادشاہوں کا بادشاہ

اللہ تعالیٰ ہی ہے) ایک لڑکی کا نام عاصیہ (گنہگار) تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام اور باندی کو عَبْدِیْ اور اَمَتِیْ نہ کہے۔ تم سب اللہ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ عَبْدِیْ اور اَمَتِیْ کی بجائے غُلامِیْ اور جَارِیَتِیْ کہا جائے۔ (یہ سب احادیث مشکوٰۃ المصابیح باب الاسامی میں مذکور ہیں)۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ

اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مشرکین یہ پسند نہیں کرتے کہ نازل کی جائے تمہارے اوپر تمہارے رب کی

رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

طرف سے کوئی خیر، اور اللہ تعالیٰ مخصوص فرمائے اپنی رحمت سے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

یہودیوں اور مشرکوں کو یہ گوارا نہیں کہ مسلمان پر کوئی خیر نازل ہو

جب مسلمان یہودیوں سے کہتے تھے کہ تم اسلام قبول کرو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے تھے کہ تم جس دین کی طرف بُلاتے ہو ہمارے دِین سے بہتر نہیں ہے اور ہماری خواہش ہے کہ تمہارا دین بہتر ہوتا تو ہم اس کا اتباع کر لیتے اُن کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور بتایا کہ اے مسلمانو! ان کو یہ پسند نہیں ہے کہ تم کو کسی طرح کی خیر نصیب ہو، یہودی تو اس حسد میں مرے جارہے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کیوں آیا اور حضرت اسحاق کی اولاد میں کیوں نہ ہوا اور مشرکین اس لئے ناراض ہیں کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش فرمایا وہ ان کی خواہشوں کے خلاف ہے اُن کو توحید پسند نہیں۔ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے محبت ہے جب اُن کی تردید کی جاتی ہے تو انہیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہود اور مشرکین کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خیالات کا پابند نہیں وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دے، وہ جسے چاہے نبوت سے سرفراز فرمائے اور جسے چاہے ہدایت دے۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے اور حسد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (من معالم التنزیل ص ۱۰۳ ج ۱، رُوح المعانی ص ۳۵۰ ج ۱)

مفسر ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت شریفہ میں اہلِ کتاب اور مشرکین کی سخت دشمنی کا ذکر فرمایا تا کہ اہلِ ایمان اور اہلِ کُفر کے درمیان مودّت اور محبت بالکل منقطع ہو جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اس انعام کو بیان فرمایا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مؤمنین کو عطا فرمائی یعنی شریعتِ کاملہ عطا فرمائی مَنْ يَّشَاءُ کا عموم خود آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سب کو شامل ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

جس کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اُس جیسی آیت لے آتے ہیں، کیا تو نے نہیں جانا کہ بلا شبہ اللہ ہر چیز پر

شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ

قادر ہے۔ کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ کے لئے آسمان اور زمین کا ملک ہے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا

اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

کوئی ولی اور مددگار نہیں۔

نسخ آیات کی حکمت

قرآن مجید کے بعض احکام اللہ تعالیٰ منسوخ فرما دیتے تھے کبھی ایک حکم دیا پھر اس سے منع فرما دیا اور اُس کے خلاف حکم دے دیا کبھی ایک حکم کے بجائے دُوسرا حکم نازل فرمادیا اس کو دیکھ کر مُشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج ایک بات کہتے ہیں اور کل کو اس سے رجوع کر لیتے ہیں، اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہوتا تو اس میں منسوخیت والی بات کیوں ہوتی معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ محمد ﷺ اپنے پاس سے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسب کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں اِن دشمنوں کی بات کو اس طرح بیان فرمایا: وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ط۔ (اور جب ہم کسی آیت کو ایک آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ نازل فرماتا ہے تو وہ لوگ کہتے کہ بس تو افتراء ہی کرنے والا ہے۔)

اللہ جل شانہٗ نے اس آیت شریفہ میں ان کی جہالت والی بات کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ ہم جس کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بُھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔ منسوخ کرنے میں حکمت ہوتی ہے اور بندوں کا اس میں فائدہ ہوتا ہے یا تو ان کے لئے دوسرا حکم انفع اور اسہل ہوتا ہے یا اس میں منفعت اور ثواب پہلی جیسی آیت کی طرح ہوتا ہے۔ سخت حکم کو آسان کر دیا گیا تو بندوں کے لئے یہ بھی بہتر ہے کہ اس میں عمل کے لئے آسانی ہوگئی اور اگر آسانی کی بجائے کوئی سخت حکم آ گیا تو یہ بھی بہتر ہے کیونکہ عمل جس قدر مشکل ہوگا اسی قدر ثواب زیادہ ہوگا۔

منسوخ ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ عبارتِ قرآنیہ باقی رہے اور اس کا حکم منسوخ ہو جائے اور اس کو منسوخ الحکم کہتے ہیں۔ جیسے عورت کے لئے شوہر کی وفات پر عدّت ایک سال تک رکھی گئی تھی بعد میں چار مہینے دس دِن کر دی گئی۔ اور جس آیت میں ایک سال کا ذِکر ہے وہ بھی مصحف میں باقی ہے۔ (مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ) اور نسخ کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی تلاوت منسوخ ہو جائے اور حکم باقی رہے۔ اس کو منسوخ التلاوہ کہتے ہیں۔ اس کی مثال میں آیت رجم کو پیش کیا جاتا ہے اور منسوخ کی ایک صُورت یہ ہے کہ پہلا حکم منسوخ ہو جائے اور اس کی جگہ دُوسرا حکم آ جائے جیسے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا منسوخ کیا گیا اور اس کی بجائے نماز میں استقبالِ کعبہ کا حکم ہُوا اور جیسے پہلے اقارب کے لئے وصیت کرنا واجب تھا پھر وہ آیتِ میراث سے منسوخ ہوگئی۔ اور بعض سورتیں ایسی ہیں جن میں امرِ اوّل منسوخ ہوگیا اور اس کی جگہ دُوسرا حکم نافذ نہیں کیا گیا جیسے سورۂ ممتحنہ میں اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ منسوخ کر دیا گیا اور اس کی بجائے دُوسرا حکم نازل نہیں ہوا۔ نَنْسَخْ کے ساتھ نُنْسِهَا بھی فرمایا جس کا ترجمہ ، بھلا دینے کا ہے۔ بعض آیات ایسی تھیں جن کو بالکل ہی مصاحف سے اور ذہنوں سے بھلا دیا گیا تھا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ جیسی تھی۔ اس کا اکثر حصہ اُٹھالیا گیا نہ تلاوت باقی رہی نہ حکم باقی رہا۔ درمنثور ص ۱۰۵ ج ا میں ہے کہ حضرت سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ ایک رات کو ایک صحابی تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے انہیں ایک سورت یاد تھی انہوں نے اسے نماز میں پڑھنا چاہا تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے علاوہ کچھ نہ پڑھ سکے اور اُس رات میں چند صحابہ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا صبح کو جب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا یہ سورت گزشتہ رات منسوخ ہوگئی جو لوگوں کے سینوں سے اور ہر اُس جگہ سے محو کر دی گئی

جہاں جہاں لکھی ہوئی تھی۔

وأما على قرأة ننسأها بفتح النون الاوّل وفتح السين مهموزا فمعناه نؤخرها فلا نبدلها أو نرفع تلاوتها ونؤخر حكمها أونؤخرها ونتركها في اللوح المحفوظ فلا ينزل. (معالم التنزیل ص ۱۰۴ ج ۱) (اور نَنْسَأْهَا (پہلے نون کے فتح اور سین کے فتح اور سین کے بعد ہمزہ کے ساتھ) کی قرأت کے موافق اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اس آیت کو چھوڑے دیتے ہیں یعنی تبدیل نہیں کرتے یا اس کی تلاوت اٹھا لیتے ہیں اور حکم رہنے دیتے ہیں یا ہم اسے لوح محفوظ ہی میں چھوڑے دیتے ہیں نازل ہی نہیں کرتے)

پھر فرمایا کہ اے مخاطب کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسے حکم باقی رکھنے پر بھی قدرت ہے اور منسوخ کرنے پر بھی قدرت ہے ذہنوں سے بھلا دینے پر بھی قدرت ہے۔ وہ حکمت کے مطابق جو چاہے کرے جس حکم کو چاہے باقی رکھے جس کو چاہے منسوخ فرمائے۔ کسی کو کیا اعتراض ہے اگر کوئی اللہ پر اعتراض کرے گا تو اس کی سزا بھگت لے گا آسمان و زمین میں اسی کی بادشاہت ہے جب وہ کافروں پر عذاب بھیجے گا ان کا کوئی یار اور مددگار اور دوست اور رشتہ دار اور کارساز نہیں ملے گا۔ قال ابن كثير يرشد عباده تعالى بهذا إلى أنه المتصرف في خلقه بما يشاء فله الخلق والأمر وهو المتصرف فكما خلقهم كما يشاء يسعد من يشاء ويشقى من يشاء ويصحح من يشاء ويمرض من يشاء ويوفق من يشاء ويخذل من يشاء كذلك يحكم في عباده بما يشاء فيحل ما يشاء ويحرم ما يشاء ويبيح ما يشاء ويحظر ما يشاء وهو الذى يحكم ما يريد لا معقب لحكمه ولا يسئل عما يفعل وهم يسئلون ويختبر عباده وطاعتهم لرسله بالنسخ فيامر بالشئى لمافيه من المصلحة التى يعلمها تعالى ثم ينهى عنه لما يعلمه تعالى فالطاعة كل الطاعة فى امتثال أمره واتباع رسله فى تصديق ما أخبروا وامتثال ما أمروا و ترك ما عنه زجروا۔ (ص ۱۵۰ ج ۱) (ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اللہ اس کے ذریعہ اپنے بندوں کی اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ مخلوق میں تصرف کرنے والا پیدائش اور حکم کا اختیار رکھنے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے پس جیسے کہ جس طرح چاہا انہیں پیدا کیا، اسی طرح جسے چاہتا ہے نیک بخت کر دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بد بخت کر دیتا ہے، جسے چاہتا ہے صحت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بیمار کر دیتا ہے، جسے چاہے توفیق دیتا ہے اور جسے چاہے بے نصیب کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے بندوں میں جو چاہے حکم جاری کرے، جسے چاہے حلال کرے، جسے چاہے حرام کرے، جس کی چاہے اجازت دے اور جس سے چاہے روک دے وہ حاکم مطلق ہے جو چاہے احکام جاری فرمائے اس کے حکموں کو کوئی رد نہیں کر سکتا، جو چاہے کرے کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا جبکہ بندوں سے باز پرس ہوگی وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ رسولوں کے کیسے تابعدار ہیں کسی چیز کا کسی مصلحت سے حکم دیا پھر کسی دوسری مصلحت کی وجہ سے اس سے روک دیا۔ پس اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں اس کی پوری اطاعت کرنی چاہیے اور رسولوں نے جو خبریں دی ہیں ان کی تصدیق میں رسولوں کی مکمل اتباع کرنی چاہیے۔ جو حکم دیں اس کی بجا آوری اور جس سے روکیں اس سے رک جانا چاہیے)۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کئے گئے اور جو شخص ایمان کے بدلہ کفر کو اختیار کرے

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

سو وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔

بے جا سوالات کی ممانعت

معالم التنزیل میں اس آیت شریفہ کے دو شان نزول لکھے ہیں۔ اول: تو یہ کہ یہودیوں نے یوں کہا کہ اے محمد (ﷺ) تم آسمان سے اس طرح پوری کتاب یک وقت لا کر پیش کرو، جیسے موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لائے تھے۔ دوسرا: یہ کہ مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے یہاں تک کہ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ ممکن ہے دونوں باتوں کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہو۔ اللہ جل شانہٗ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسے سوالات نہ کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے سوالات کیے گئے۔ بنی اسرائیل نے ان سے کہا ارنا اللہ جھرۃ کہ ہمیں اللہ پاک کو آمنے سامنے دکھا دو۔ دلائل واضحہ سامنے ہیں عقل مند کے لئے کافی ہے تکے بے تکے سوالات کی کوئی ضرورت نہیں اور جن کو اعتراض ہی کرنا مقصود ہے وہ تو ہر فرمائش پوری ہو جانے پر بھی ماننے والے نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو پوری کتاب یک وقت لائے تھے۔ پھر بھی ظالموں نے اُسے کہاں مانا؟

سورۃ قصص میں ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۚ وَ قَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ. (سو جب ہماری طرف سے اُن لوگوں کے پاس حق پہنچا تو کہنے لگے ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ کو ملی تھی کیا جو کتاب موسیٰ کو ملی تھی اس سے قبل یہ لوگ اُس کے منکر نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور یوں بھی کہتے تھے کہ ہم تو ہر ایک کے منکر ہیں)

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا لہٰذا حج کرو اس پر ایک آدمی نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ اس پر آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ سائل نے تین بار سوال کیا، پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم اس کو نہیں کر سکتے تھے پھر فرمایا کہ میں جب تک تم کو چھوڑے رکھوں (یعنی کوئی حکم نہ بتاؤں) تم بھی مجھے چھوڑے رکھو (یعنی سوالات نہ کرو) کیونکہ تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ سوالات زیادہ کرتے تھے اور اپنے نبیوں کے خلاف چلتے تھے سو جب کسی چیز کا حکم کروں تو جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو اور اگر میں کسی چیز سے منع کر دوں تو اُسے چھوڑ دو۔ (ص ۴۳۲ ج ۱)

اور ایک حدیث میں ہے جو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے قیل قال اور کثرتِ سوال اور اضاعت المال کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۹، از بخاری و مسلم)

آیت کا شانِ نزول خواہ وہی ہو جو معالم التنزیل سے نقل کیا گیا لیکن اُس میں مُسلمانوں کو بھی یہ نصیحت مل گئی کہ جو احکام ہیں اُن میں لگیں تکے بے تکے سوال نہ کریں۔ قیل وقال میں وقت ضائع نہ کریں اور ضرورت کی بات پوچھیں۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ

اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا لیں اپنے دلوں کے حسد کے باعث،

مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

بعد اس کے کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو گیا ہے، سو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے، بے شک اللہ ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو کچھ پہلے سے بھیج دو گے اپنی جانوں کے لئے کوئی خیر اُسے اللہ کے پاس پا لو گے، بے شک اللہ اُن کاموں کا

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٠﴾

دیکھنے والا ہے جن کو تم کرتے ہو۔

کفار چاہتے ہیں کہ تمہیں کافر بنالیں

یہودیوں کو یہ تو خوب واضح طریقے پر معلوم ہو گیا تھا کہ نبی عربی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے نبی ہیں لیکن اُن کو حسد کھا گیا خود تو مسلمان ہوتے ہی نہ تھے (الا قلیلا منھم) اور طرح طرح کی کوششیں کرتے تھے کہ عرب بھی مسلمان نہ ہوں اور جو لوگ مسلمان ہو چکے ان کو واپس کر لیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن کے قلبی ارادوں سے مطلع فرمایا تا کہ اُن سے بچتے رہیں اور اُن کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں اور اُن کی جھوٹی ہمدردی کو کوئی حیثیت نہ دیں۔ چونکہ مسلمان اور یہودی ایک ہی شہر یعنی مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور اس وقت تک ظاہری اسباب کے اعتبار سے مسلمانوں کے غلبہ کی صورت ظاہر نہ ہوئی تھی اس لئے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم معاف اور درگزر کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے منجملہ اس قدرت کے یہ بھی ہے کہ وہ تم کو ان پر غلبہ دے دے چنانچہ اس کے بعد وہ دن آیا کہ قبیلہ بنی نضیر کو مسلمانوں نے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا اور یہود کے دُوسرے قبیلہ بنو قریظہ کے مرد قتل کئے گئے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ نمازیں قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور جو کچھ اپنی جانوں کے لئے کوئی بھلائی پہلے سے بھیج دو گے اُسے اللہ کے پاس پالو گے۔ اس میں اعمالِ صالحہ میں مشغول رہنے اور جانی و مالی عبادت ادا کرتے رہنے کا حکم دیا جیسا کہ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا میں صبر کا حکم دیا۔ صبر اور صلاۃ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں جیسا کہ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی ہے۔ اعمالِ صالحہ میں یہ بھی تاثیر ہے کہ دشمن پر غالب ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دنیا میں بھی ان سے فلاح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان کا بدل ملے گا یہاں سے جو کوئی خیر بھیجیں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں جمع رہے گی وہاں جائیں گے تو پالیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتا ہے) ہر خیر و شر کا اُسے علم ہے۔ جو شخص خیر یا شر لے کر پہنچے اس کے مطابق جزا اور سزا کا مستحق ہو گا۔ قال ابن کثیر وھذا الکلام وان کان قد خرج مخرج الخبر فان فیه وعداً ووعیداً وأمراً وزجراً وذلک أنه علم القوم أنه بصیر بجمیع أعمالھم لیجدّوا فی طاعته اذ کان ذلک مذخوراً لھم عنده حتی یثیبھم علیه۔ (ص ۱۵۴ ج ۱) (ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ کلام خبر کے قائم مقام ہے کیونکہ اس میں وعدہ بھی ہے وعید بھی ہے امر بھی ہے نہی بھی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے تمام تر اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں تا کہ وہ اس کی اطاعت میں بڑھ چڑھ کر کوشش کریں کہ ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں ذخیرہ رہیں گے اور وہ انہیں ان کا بدلہ دے گا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر حلال کمائی سے صدقہ کر دے اور اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول فرماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما لیتا ہے پھر اس کی تربیت فرماتا ہے (یعنی اس کو بڑھاتا رہتا ہے) جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچہ کی تربیت کرتا رہتا ہے۔ (بڑھتے بڑھتے وہ بہت زیادہ ہو گا یہاں تک کہ پہاڑ

کے برابر ہو جائے گا۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۹ ج ۱) جب قیامت کے دن ثواب ملنے لگے گا تو کھجور کے برابر جو چیز دی تھی اُس کا ثواب اتنا زیادہ ملے گا جیسے اُس نے اللہ کی راہ میں پہاڑ خرچ کر دیا ہو۔

وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ

انہوں نے کہا کہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی ہو، یہ ان کی آرزوئیں ہیں، آپ فرما دیجئے

هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ

کہ لے آؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو ہاں جس نے اپنی ذات کو اللہ کی فرمانبرداری کے لئے جھکا دیا اور وہ مخلص ہو

فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

تو اُس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے رب کے پاس، اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں، اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے۔

یہود و نصاریٰ کا قول کہ جنت میں ہم ہی جائیں گے اور اس کی تردید

اس آیت شریفہ میں یہود اور نصاریٰ کا یہ دعویٰ ذکر فرمایا ہے کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ ہرگز کوئی داخل نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے بارے میں یہ کہا کہ صرف ہم جنتی ہیں اور نصاریٰ نے اپنے بارے میں یہی کہا۔ دونوں فریق باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کر بیٹھے اور اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں شرک داخل کر دیا۔ اس سب کے باوجود دونوں جماعتوں کو یہ غرور تھا اور اب بھی ہے کہ صرف ہم ہی جنتی ہیں۔ کفر اختیار کریں پھر بھی جنتی ہوں یہ اُن کی سراپا جہالت و حماقت اور سفاہت ہے اور اُن کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (آپ اُن سے فرما دیجئے کہ تم اگر اپنی آرزوؤں میں سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو) دعویٰ بلا دلیل، بلا سند، بلا حجت کیسے مانا جائے گا؟ یہود و نصاریٰ کو بڑا غرور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم مقربانِ الٰہی ہیں سورۂ مائدۃ میں ہے کہ انہوں نے کہا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے محبوب ہیں) اولاد تو اس کی ہے ہی نہیں، یہ عقیدہ شرکیہ ہے کہ اس کی اولاد ہو، شرکیہ عقیدہ رکھنے والا اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب اور مقرب کیسے ہو سکتا ہے؟! اپنی حماقت سے اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے بہکانے سے وہ یہی باطل خیال جمائے ہوئے ہیں کہ صرف ہماری ہی نجات ہوگی اور صرف ہم ہی جنتی ہیں، یہودیوں کا دین تو خاندانی دین ہے وہ اپنے خاص خاندان کے باہر اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہی نہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اُن کے نزدیک ساری دُنیائے انسانیت کے لئے اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی دین نہیں ہے صرف اپنے خیال سے اپنی نجات کا یقین کر بیٹھنا اور یہ سمجھ لینا کہ ہم ہی جنتی ہیں اور باقی سارے انسانوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ اُن کے لئے خالق و مالک کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں جسے اختیار کر کے وہ مستحق جنت بنیں، سراسر خود فریبی ہے

نصاریٰ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے سمجھے جاتے ہیں اُنہیں معلوم ہے کہ ہم جس دین پر ہیں وہ دین نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دے کر بھیجا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہو کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں یا یہ فرمایا ہو کہ میری اور

میری والدہ کی عبادت کرو، یا یہ فرمایا ہو کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے اور میرے قتل کے بعد جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو قتل کرا کر اُن سب لوگوں کے گناہوں کا کفارہ کر دیا جو اُن کو اللہ کا بیٹا مانیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ سب باتیں نصاریٰ کی خود تراشیدہ ہیں۔ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں فرمائی اُنہوں نے تو صرف اللہ کی عبادت کرنے کی تبلیغ کی اور نصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں اُن کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اُن کے جھوٹے ماننے والوں نے کئی سو سال کے بعد تجویز کیں کیونکہ اس میں تن آسانی ہے اور پورے گناہ کرتے ہوئے مغفرت اور نجات کی گارنٹی ہے اس لئے نصاریٰ نے ان باتوں کو بغیر تحقیق کے قبول کر رکھا ہے۔ اتوار کے دن پادری کہہ دیتا ہے کہ میں نے اس ہفتہ کے سب گناہ معاف کر دیئے یہ کیسی خلافِ عقل بات ہے کہ نافرمانی کی ہے خدائے پاک کی اور معاف کر رہی ہے مخلوق۔ ان پادریوں کو گناہ کے معاف کرنے میں خداوند تعالیٰ کا نائب مانتے ہیں ان کو یہ نیابت کہاں سے ملی کس نے ان کو نائب بنایا؟ ہر عقلمند کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں۔ یہ سب کچھ نصاریٰ کا اپنا بنایا ہوا دین ہے اور اُوپر سے اس دھوکہ اور آرزو میں پڑے ہوئے ہیں کہ صرف ہماری ہی نجات ہوگی اور ہم ہی جنتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کوئی بات بلا دلیل قبول نہیں ہوتی اور دُنیا میں سب اسی قانون پر چلتے ہیں، لیکن آخرت کے بارے میں جہاں دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات پانے کی ضرورت ہوگی۔ صرف خوش فہمی اور گمان اور خیالات اور اوہام اور آرزوؤں پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ **ھداھم اللہ تعالیٰ**۔

یہود و نصاریٰ کے علاوہ کفار کی دوسری قومیں بھی اپنے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں اور ان سب نے محض جھوٹی آرزوؤں کا سہارا لے رکھا ہے۔ ان کے پاس ان کے دین کے حق ہونے کی اور اس بات کی کہ ان کا دین یومِ آخرت میں ذریعہ نجات بنے گا کوئی دلیل نہیں ہے مُشرکوں کی بیوقوفی دیکھو کہ پیدا کیا اللہ نے اور کھانے کو وہی دیتا ہے اور انسانوں کی ضرورت کا ہر سامان اُسی نے پیدا فرمایا ہے لیکن پرستش اور پُوجا اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی کرتے ہیں اور اس میں نجات سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ دے۔

عند اللہ جنتی کون ہے...... یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کی تردید کرنے اور اُن سے دلیل طلب کرنے کے بعد حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (الآیۃ) یعنی دوسرے لوگ کیوں جنت میں داخل نہ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ کا قانون تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو اور اپنی ذات کو اللہ کے احکام کی تعمیل میں جُھکا دے اور وہ صفتِ احسان سے متصف بھی ہو تو اس کا اجر اُس کے رب کے پاس ضرور ملے گا۔ جو جنت کے داخلے کی صورت میں ہوگا۔ ان لوگوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہونے کا کوئی موقع ہے۔ یہ عمومی قانون ہے جو بھی اس پر عمل کرے گا داخلہ جنت کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے کسی کی قرابت رشتہ داری نہیں ہے اور نہ کوئی خواہ مخواہ محبوب اور مقرب بن جاتا ہے۔ ایمان پر دخول جنت کا مدار ہے۔

لفظ مُحْسِنٌ لفظ احسان سے مشتق ہے جو حُسن سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے اچھے طریقے سے کام کرنا اور عمدگی کے ساتھ انجام دینا اس میں احسان عقیدہ اور احسانِ عمل سب کچھ داخل ہے۔ بعض مفسرین نے محسن کا ترجمہ مخلص کیا ہے اصل بات یہ ہے کہ عقیدہ بھی صحیح ہونا لازم ہے اور عمل بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ جس کا عقیدہ رسول اکرم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے عقیدوں کے خلاف ہو، وہ عقیدہ میں مُحسن نہیں ہے لہٰذا اس کی نجات نہیں ہے۔ اس نے اپنی ذات کو اللہ کے لئے نہیں جُھکایا وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کی تکذیب کرتا ہے۔ لہٰذا مستحقِ نجات نہیں، اور جس شخص کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق نہیں یا نیت میں اخلاص نہیں یعنی اللہ کی رضا مطلوب نہیں۔ اس کا وہ عمل مردود ہے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ ہو تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے

عقیدہ اور عمل دونوں میں اخلاص ضروری ہے منافق عقیدہ میں مخلص نہ تھے اور جو لوگ عقیدہ ٹھیک رکھتے ہیں لیکن عمل اللہ کی رضا کے لئے نہیں کرتے دکھاوے کے لئے اور دُنیاوی جاہ وعزت حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں ان کے عمل کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں۔ سورۂ کہف کے اخیر میں فرمایا: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا . سو جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ عملِ صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔ کافروں اور مُشرکوں میں جو لوگ کوئی عمل کرتے ہیں اگر ان میں اللہ کی رضا کا مقصود رکھتے ہوں تب بھی وہ معتبر نہیں اور آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں۔ کیونکہ عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ ہیں اور اللہ کے دین پر نہیں ہیں ان کے لئے سورۂ فرقان میں فرمایا: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (اور ہم اُنکے کاموں کی طرف جو وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو اُن کو ایسا کر دیں گے جیسے پریشان غبار) شاید کوئی شخص اپنی جہالت سے یہ سوال کرے کہ آیت میں مسلمان ہونے کی شرط نہیں پھر یہ شرط کہاں سے آ گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ اور وَهُوَ مُحْسِنٌ سے ہی یہ قید ثابت ہوتی ہے اور دُوسری آیات بھی پیشِ نظر رکھنا لازم ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ کو پیشِ نظر رکھیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ

کہا یہود نے کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودی کسی چیز پر نہیں،

وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

حالانکہ وہ لوگ کتاب پڑھتے ہیں، ایسا ہی کہا اُن لوگوں نے جو نہیں جانتے انہی کی سی بات، پس اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

درمیان قیامت کے دن اس بات میں جس میں وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کا آپس میں نزاع اور اُن کی باتوں کی تردید

تفسیر درمنثور ص ۱۰۸ ج ۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہودیوں کے علماء بھی وہاں پہنچے دونوں فریقوں نے وہیں خدمت عالی میں حاضر ہوتے ہوئے آپس میں مباحثہ شروع کر دیا۔ یہودیوں میں ایک شخص رافع بن حریملہ تھا۔ اس نے نصاریٰ سے کہا کہ کسی چیز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور نہ کبھی تھا۔ اس طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا بھی انکار کیا۔ اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کے بھی مُنکر ہوئے نصاریٰ کو مقابلہ میں جواب دینے کا جوش آیا تو ان میں سے ایک شخص نے یہودیوں سے کہا کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو یعنی تمہارے دین کی کوئی اصلیت اور بُنیاد نہیں۔ اللہ کی کسی کتاب سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور نہ کبھی تھا۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر بیٹھے اور توراۃ شریف کے کتاب اللہ ہونے کے مُنکر ہو گئے۔ اللہ جل شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی اور دونوں جماعتوں کے دعوے ذکر کر کے فرمایا وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ (یعنی ہر فریق اللہ کی کتاب پڑھتا ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا علم ہوتے ہوئے اُن کی رسالت کے مُنکر ہو رہے ہیں۔ ہر فریق کو دوسرے فریق کے بارے میں معلوم ہے کہ باوجود تحریف کر لینے کے پھر بھی

اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول سے ہر ایک کو انتساب ہے۔ گو یہ انتساب اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کو نجات دلانے والا نہیں لیکن فی الجملہ اس کا انکار بھی صحیح نہیں کہ اُن کے دین کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے کسی نبی یا کسی کتاب سے ہے، **قال ابن کثیر ولھٰذا قال تعالٰی وھم یتلون الکتاب ای وھم یعلمون شریعۃ التوراۃ والانجیل کل منھما کانت مشروعۃ فی وقت ولٰکنھم تجاحدوا فیما بینھم عنادا و کفرا ومقابلۃ للفاسد بالفاسد** (ص۱۵۵ج۱) (ابن کثیرؒ کہتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ہر فریق اللہ کی کتاب پڑھتا ہے'' یعنی ہر دو گروہ تورات وانجیل کی شریعت کا علم رکھتے ہیں جو کہ اپنے اپنے وقت میں مشروع تھیں لیکن ایک دوسرے کی ضد اور کفر اور فاسد کا مقابلہ فاسد سے کرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو جھٹلایا اور انکار کیا)

پھر فرمایا: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (یعنی ایسی ہی بات اُن لوگوں نے کہی جو نہیں جانتے) یعنی یہود و نصاریٰ کے علاوہ جو اُن سے پہلے اُمتیں گزری ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی جہالت کی باتیں کرتی رہی ہیں کہ عناد اور تعصب کی وجہ سے حق کو جھٹلایا اور حقیقتِ واضحہ کو نہ مانا۔ اور اب مُشرکین عرب کا یہی حال ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کے مُنکر ہوئے حالانکہ آیات بیّنات اور دلائل واضحہ اُن کے سامنے ہیں دِلوں سے جانتے ہیں کہ آپؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن جانتے نہیں۔ **واختلف فیمن عنی فی قولہ تعالٰی الذین لا یعلمون، فقال عطاءٌ اممٌ کانت قبل الیھود والنصارٰی وقال السُّدّی ھم العرب، قالوا لیس محمد علی شیئ، واختار ابن جریر أن الحمل الجمیع اولی** (اس میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول الذین لایعلمون سے کون لوگ مراد ہیں۔ عطاءؒ کہتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھے۔ سدیؒ کہتے ہیں اس سے عرب لوگ مراد ہیں جنہوں نے کہا کہ محمد ﷺ کا مذہب کسی بنیاد پر قائم نہیں۔ ابن جریرؒ اس سے عام مراد لیتے ہیں جو سب کو شامل ہو)۔ (من ابن کثیر ص۱۵۵ج۱)

پھر فرمایا: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع فرمائیں گے اور عدل کے ساتھ اُن کے درمیان فیصلے فرمائیں گے اور اس فیصلہ سے سب پر حق ظاہر ہو جائے گا اور باطل کا پتہ چل جائے گا۔

سورۂ سبا میں فرمایا: قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (کہہ دیجئے کہ ہمارا رب ہم سب کو جمع فرمائے گا پھر ہمارے درمیان میں حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا اور وہ بڑا فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے۔

بیان القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان عملی فیصلہ فرمادیں گے اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہلِ حق کو جنت میں اور اہلِ باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قول اور برہانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعۂ دنیا میں بھی ہو چکا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ

اور اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اس بات سے روکے کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لیا جائے اور اُن کی ویرانی کی کوشش کرے، اُن لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

کہ اُن میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے، اُن کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اللہ کی مسجدوں میں ذِکر سے روکنا بہت بڑا ظلم ہے

اس آیت شریفہ میں اُن لوگوں کو سب سے بڑا ظالم بتایا ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکیں، ان میں اللہ کا نام لینے اور اللہ کی عبادت کرنے سے منع کریں اور اُن کی وِیرانی کی کوشش کریں اس کام کے کرنے والے کون ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؟ معالم التنزیل (ص ۱۰۷ ج ۱) میں حضرت عطاء اور عبدالرحمٰن بن زید سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت مُشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ والوں نے آپ کو مقام حدیبیہ میں روک دیا اور عمرہ کے لئے مسجدِ حرام تک نہ پہنچنے دیا۔ مساجد کی آبادی یہ ہے کہ اُن میں وہ کام ہوتے رہیں جن کاموں کے لئے وہ بنائی گئی ہیں۔ نماز، تلاوت، ذکر، اعتکاف وغیرہ اور مسجدِ حرام کے آباد کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُس میں طواف کیا جائے، جو شخص ان کاموں سے روکے گا وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرنے والا ہے۔ مُشرکینِ مکہ اس وقت مسجدِ حرام کے متولی تھے لیکن کعبہ شریف میں اُنہوں نے بُت رکھے ہوئے تھے ظاہری تعمیر کی دیکھ بھال ہی کو اُنہوں نے اس کی آبادی سمجھ لیا اور اس کی حقیقی تعمیر سے غافل تھے۔ توحید کے بجائے شرک کے کام کرتے تھے وہاں نمازیوں کو نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اُن کے ظلم اور زیادتی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے پھر جب عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو عمرہ نہ کرنے دیا۔ مُشرکین کو سمجھایا بجھایا گیا کہ عُمرہ کر کے واپس ہو جائیں گے لیکن وہ ایک نہ مانے اور ضد پر اڑے رہے۔ بالآخر آپ صحابہ کے ساتھ واپس تشریف لے آئے اور آئندہ سال عمرہ کی قضا فرمائی، یہ جو فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ اس میں اس بات کی خوشخبری دی کہ مکہ معظمہ فتح ہوگا۔ جب غلبہ اہلِ اسلام کا ہو جائے گا تو یہ مشرکین اس میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرایا کہ خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک ہرگز حج نہ کرے۔ (من معالم التنزیل ص ۱۰۷ ج ۱)

بعض مفسروں نے فرمایا ہے کہ آیت شریفہ میں یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے کہ اُنہوں نے مختلف اوقات میں بیت المقدس کی بے حُرمتی کی حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں جو بیت المقدس میں تکلیف دینے والی چیزیں پھینک دیتے تھے اور لوگوں کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ اور قتادہ کا قول ہے کہ اس سے رومی لوگ مراد ہیں اُنہوں نے یہودیوں کے بُغض میں بیت المقدس کی بَربادی میں بخت نصر مجوسی کی مدد کی اور کعب احبار سے منقول ہے کہ نصاریٰ بیت المقدس پر غالب ہوئے تو اُنہوں نے اس کو جلا دیا جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ لہٰذا جو بھی کوئی نصرانی اب بیت المقدس میں داخل ہوتا ہے تو خوف کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ (درمنثور ص ۱۰۸ ج ۱)

سببِ نزول جو بھی ہو اور نزولِ آیت کے وقت مساجد اللّٰہ سے روکنے کا مصداق جو بھی کوئی جماعت ہو قرآن مجید کے عمومی بیان سے واضح ہوا کہ مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکنا ظلم کی چیز ہے اور یہ بڑے ظُلم میں شمار ہے۔ فی روح المعانی و ظاهر الآية العموم فی کل مانع وفی کل مسجد و خصوص السبب لا یمنعه (ص ۳۶۳ ج ۱) (روح المعانی میں ہے کہ ظاہر آیت ہر مانع اور ہر مسجد کو شامل ہے اور سبب کا خاص ہونا عموم مراد لینے سے مانع نہیں) نیز وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا کے عموم میں مسجدوں کو گرا دینا اور معطل کر دینا بھی شامل ہے۔ قال صاحب روح المعانی وسعی فی خرابها ای هدمها و تعطیلها۔ اگر کوئی ایسی جماعت یا اُس کا کوئی فرد مسجد میں آنا چاہے جو دائرہ اسلام سے خارج ہو مثلاً کسی نئے مُدعی نبوت پر ایمان لانے والے لوگ جس نے ختم نبوت کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو ان لوگوں کو اپنی مسجد سے روک سکتے ہیں یہ منع کرنا ذکر اللہ سے منع کرنا نہیں بلکہ مسلمانوں کو کفر سے محفوظ رکھنے کے

لئے ہوگا۔

اسی طرح کی ایک جماعت کو جب مسلمانوں نے مسجد سے روکا تو انہوں نے مذکورہ بالا آیت پڑھ دی جس پر ایک عالم نے سورۂ انعام کی یہ آیت پڑھ کر سنائی وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (اور اُس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی، اور جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے میں عنقریب ایسا نازل کروں گا) بعض مفسرین نے فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ صرف مسجد حرام کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ دیگر مساجد کو بھی اس کا عموم شامل ہے (کما فی تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۷ ج ۱)۔ مؤمنین سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اُن کی مدد ہوگی اور مسجدیں کافروں کے تسلّط سے آزاد ہوں گی۔ (کمامر)

صاحب رُوح المعانی فرماتے ہیں کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا فرمایا اور بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اگر کوئی نصرانی اس میں داخل ہوتا تھا تو چوری چھپے اپنا رُوپ بدل کر داخل ہوتا تھا پھر قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جو بھی کوئی نصرانی بیت المقدس میں پایا جاتا ہے اس کو خوب زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ پھر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ سوال اُٹھائے کہ بیت المقدس پھر نصاریٰ کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ فتح کیا تو یہ سوال وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ آیت میں کوئی کلمہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں ہے کہ بیت المقدس ہمیشہ مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ (جب اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کے قبضے میں دے دیا تو ان پر لازم تھا کہ قبضہ باقی رکھتے، ضعفِ ایمان، ضعفِ اعمال اور ضعفِ تدبیر کی وجہ سے کھو بیٹھے یہ اُنہوں نے ایمانی تقاضوں کے خلاف کیا)

صاحب بیان القرآن نے اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت اور بے باک ہو کر ان مساجد میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیئے تھا بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت وحرمت وادب سے جاتے جب بے باک ہو کر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اس کی ہتک حُرمت کا کب حق حاصل ہے۔ اسی کو ظلم فرمایا گیا۔ اھ

خلاصہ یہ نکلا کہ اس میں مساجد کا اَدب بتایا گیا ہے یہ بات سیاق کلام سے دِل کو زیادہ لگتی ہے۔ **واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

پھر فرمایا لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ کہ دنیا میں ان لوگوں کے لئے رُسوائی ہے اور آخرت میں وہ سب قومیں رُسوا ہوں گی جنہوں نے مسجد حرام یا بیت المقدس میں اللہ کے ذکر وعبادت سے روکا اور اُن کی ویرانی کی کوشش کی دُنیا میں یہ قومیں مغلوب بھی ہوئیں مسلمانوں کی محکوم بھی بنیں اور یہود ونصاریٰ جزیہ دینے پر مجبور ہوئے اور آخرت میں سب کافروں کو جو بڑا عذاب ہوگا۔ بار بار قرآن مجید میں اس کا ذکر ہو چکا ہے اور اس عذاب کی تفصیلات آیات اور احادیث میں مذکور ہیں۔

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب، سو تم جس طرف بھی رُخ کرو اُدھر اللہ کا رُخ ہے، بیشک اللہ واسع ہے، علیم ہے۔

جدھر رُخ کرو اُدھر اللہ کا رُخ ہے

لباب النقول میں تین واقعات لکھے ہیں جن میں اس آیت کے سببِ نزول کا ذکر ہے۔ تینوں واقعات میں یہ تذکرہ ہے کہ حضرات صحابہ سفر میں تھے اندھیری رات میں (اور بعض روایات میں ہے کہ بادل کی وجہ سے) قبلہ کے بارے میں اشتباہ ہوگیا۔ ہر ایک نے اپنے

غور وفکر کے مطابق جدھر قبلہ سمجھ میں آیا اُدھر نماز پڑھی صبح ہوئی تو غلطی معلوم ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے خاموشی اختیار فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ (ان میں سے ایک واقعہ سنن ترمذی ''ابواب التفسیر'' میں بھی مذکور ہے)

جہتِ قبلہ کا قانون ...... آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق کا بھی مالک ہے اور مغرب کا بھی مالک ہے (بلکہ تمام جہات کا مالک ہے اس عموم میں جنوب اور شمال بھی آ گئے) کما قال تعالیٰ: **فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقَادِرُوْنَ** لہٰذا اُسے پورا اختیار ہے کہ جس جہت کو چاہے قبلہ قرار دے دے اور چونکہ معبود وہی ہے اور سب جہات اُسی کی مملوک اور مخلوق ہیں اس لئے وہ اپنی عبادت کے لئے جس رُخ کا بھی حکم دے اور جس رُخ پر بھی عبادت کرنے سے راضی ہو جائے عبادت گزاروں کے لئے وہی جہت قبلہ ہے۔ کسی کو اس میں اعتراض کا کیا حق ہے وہ کعبہ شریف کو قبلہ مقرر فرما دے تو اُسے پورا اختیار ہے اور بیت المقدس کو قبلہ بنا دے تو اُسے پورا اختیار ہے ان دونوں کے علاوہ اور کسی رُخ پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دے تو بھی اُسے اختیار ہے۔

اللہ تعالیٰ تو اس سے بُلند اور بالا ہے کہ اس کا جسم ہو یا وہ کسی جہت میں ہو جدھر بھی رُخ کیا جائے اُدھر اللہ کا رُخ ہے[1]۔ یعنی حکمِ خداوندی اور اذنِ خداوندی کے مطابق جدھر کو بھی نماز پڑھ لیں گے اُدھر ہی وہ جہت ہوگی جس کی طرف تمہیں رُخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی طرف نماز پڑھنے میں اس کی رضا ہے۔ (**قال فی الروح ای فھناک جھته سبحانه التی اُمرتم بھا** (ص ۳۶۵ ج ۱) **وفی معالم التنزیل عن مجاھد فی ھذہ الآیة فثم وجه اللہ فثم قبلة اللہ والوجه والوجھة والجھة القبلة وقیل رضا اللہ تعالٰی** ص ۱۰۸ ج ۱)۔ (یعنی وہی اللہ تعالیٰ کی وہ جہت ہے جس کی طرف رخ کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ معالم التنزیل میں حضرت مجاہدؒ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ادھر ہی اللہ کا رخ سے مراد ہے کہ ادھر ہی قبلہ ہے۔ اور وجه و جھة اور جھة قبلہ کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وجه اللہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا مراد ہے)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت سفر میں نفل نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لا رہے تھے اور اپنی سواری پر نفل نماز پڑھ رہے تھے۔ سواری جدھر بھی متوجہ ہوتی آپ برابر نماز میں مشغول رہے۔ (رواہ الترمذی فی تفسیر سورۃ البقرۃ)

انس بن سیرین کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا جبکہ وہ شام سے آ رہے تھے ہم نے دیکھا کہ مقام عین التمر میں اپنی سواری پر نماز پڑھ رہے ہیں اور رُخ قبلہ سے ہٹا ہوا ہے جو بائیں جانب کو ہے۔ میں نے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں آپ قبلہ کے رُخ کے علاوہ دوسری طرف کو نماز پڑھ رہے ہیں اُنہوں نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا یہ روایات صحیح مسلم میں مذکور ہیں۔ (ص ۲۴۴/۲۴۵ ج ۱)

---

[1]...... قال القرطبی فی تفسیرہ اختلف الناس من تاویل الوجه المضاف الی اللّٰہ تعالٰی فی القراٰن والسنة فقال الحذاق ذلک راجع الی الوجود والعبارة عنه بالوجه من مجاز الکلام اذکان الوجه أظھر الاعضاء فی الشاھد وأجلھا قدرا' قال ابن عباس الوجه عبارة عنه عزوجل کما قال ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام' وقال بعض الائمة تلک صفة ثابتة بالسمع زائدة علی ما توجبه العقول من صفات القدیم تعالٰی قال ابن عطیه وضعف أبو المعالی ھذا القول وھو کذلک ضعیف وانما المراد وجودہ وقیل المراد بالوجه ھنا الجھة التی وجھنا الیھا ای القبلة وقیل الوجه المقصد وقیل المعنی وثم رضا اللّٰہ و ثوابه کما قال تعالٰی انما نطعمکم لوجه اللّٰہ أی لرضائِه وطلب ثوابه ومنه قوله صلی اللّٰہ علیه وسلم من بنی مسجدًا یبتغی به وجه اللّٰہ بنی اللّٰہ له مثله فی الجنة (ص ۸۳ ج ۲)

آیت کے اخیر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ بندوں پر ان کے دین میں وسعت عطا فرماتا ہے اور ایسی کسی بات کا حکم نہیں دیتا جو ان کی طاقت سے باہر ہو بعض حضرات نے فرمایا کہ وَاسِعٌ سے یہ مُراد ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اور فراء کا قول یہ ہے کہ واسع معنی جوّاد اور سخی ہے جس کی عطاء ہر ایک کو شامل ہے بعض مفسرین نے اس کا معنی واسع المغفرہ بتایا ہے یعنی کوئی بھی گناہ ایسا نہیں جس کا بخشنا اس کے نزدیک مشکل ہو۔ (من القرطبی ص ۸۴ ج ۲)

رُوح المعانی ص ۳۶۵ ج ۱ میں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ ای محیط بالاشیاء ملکا او رحمة فلهٰذا وسع علیکم القبلة ولم یضیق علیکم علیمٌ بمصالح العباد واعمالهم فی الاماکن۔

(یعنی اللہ تعالیٰ مالکیت کے اعتبار سے یا رحمت کے اعتبار سے ہر چیز کو محیط ہے اسی لئے اس نے قبلہ کے بارے میں تم پر آسانی فرمادی اور تنگی نہیں فرمائی اور وہ بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور جس جگہ بھی کوئی عمل کریں وہ اس سے باخبر ہے۔ اھ) لہٰذا وہ سب کو ثواب عطا فرمائے گا۔ وہ قلوب کے احوال بھی جانتا ہے اگر کسی نے اندھیرے میں اپنے غور و فکر کے مطابق قبلہ کی معینہ جہت کے خلاف نماز پڑھی لیکن پڑھی اللہ ہی کے لئے اس کا مقصد اطاعت ہی ہے بغاوت نہیں تو ثواب کا مستحق ہوگا اور اُسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

قبلہ کے مسائل

مسئلہ...... استقبال قبلہ نماز کی شرائط میں سے ہے غیر قبلہ کو نماز پڑھے تو نماز نہ ہوگی ہاں اگر کوئی شخص خائف ہے، قوی دشمن اسے معینہ قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھنے دیتا تو جس طرف منہ کر کے پڑھ سکتا ہو اسی طرح پڑھ لے، اس وقت یہی اس کا قبلہ ہے۔

مسئلہ...... اگر کوئی ایک فرد یا جماعت کسی جگہ موجود ہوں اور قبلہ میں اشتباہ ہو جائے اور وہاں پر کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر خوب غور و فکر کرے۔ جس طرف دِل جُھکے ہر شخص اُس طرف کو نماز پڑھ لے۔ اگر غور و فکر کے بعد کسی طرف کو نماز پڑھنی شروع کی اور نماز کے اندر ہی پتہ چل گیا کہ قبلہ دُوسری طرف کو ہے تو اسی طرف گھوم جائے، پھر سے نماز پڑھنا ضروری نہیں۔

مسئلہ...... اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ غلط رُخ پر نماز پڑھی گئی تو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ...... اندھیری رات میں کسی جگہ مسلمان موجود ہیں قبلہ کا علم نہیں ہے اُن میں سے ایک شخص امام بن گیا اور امام اور مقتدی سب نے اپنے اپنے غور و فکر سے ایک جہت کو نماز پڑھ لی اور ہر ایک کی جہت مختلف تھی اور مقتدیوں کو یہ علم نہیں کہ امام کا رُخ کدھر ہے تو یہ نماز باجماعت صحیح ہو جائے گی۔ ہاں اگر کسی کو یہ پتہ ہے کہ امام کا رُخ فلاں جانب ہے اور وہ رُخ اس مقتدی کے نزدیک صحیح نہیں ہے تو اس مقتدی کی نماز نہ ہوگی کیونکہ وہ اپنے امام کو غلطی پر سمجھے ہوئے ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص امام سے آگے بڑھ گیا یعنی امام کے آگے کھڑا ہو گیا (اس طرح سے کہ امام کا چہرہ اس کی پشت کی طرف ہو۔ تو بھی اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ (من الهدايه باب شروط الصلاة)

مسئلہ...... جو شخص آبادی سے باہر ہو اور جانور پر سوار ہو وہ چاہے کہ میں نفل نماز پڑھوں تو وہ بیٹھے بیٹھے اپنی سواری پر نفل نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر چہ سواری کا رُخ قبلہ کی جانب نہ ہو جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور بعض صحابہ کا عمل بحوالہ صحیح مسلم گزر چکا۔

مسئلہ...... فرض نماز غیر قبلہ کی طرف رُخ کر کے پڑھی جائے تو صحیح نہ ہوگی الا یہ کہ قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی بتانے والا نہ ہو تو اس صورت میں تحری یعنی غور و فکر کر کے نماز پڑھ لے جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا۔

مسئلہ...... ریل میں اور پانی کے جہاز میں نماز آسانی سے قبلہ رخ ہو کر پڑھی جا سکتی ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ فرض نماز بھی سفر میں بلا قبلہ پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں اور قبلہ کی طرف رُخ کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے غیر قبلہ کو نماز پڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صاحب سفر میں سب معاف ہے۔ یہ اُن کی غلطی ہے اور اُن کا عمل فقہاء کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ان کی نماز نہیں ہوتی۔

حکمت تعیین قبلہ...... کسی خاص جانب کو قبلہ قرار دینا بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اگر کسی خاص رُخ پر نماز پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا اور ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جدھر کو چاہے رُخ کر کے نماز پڑھ لے تو اس میں تشتت اور انتشار کا مظاہرہ ہوتا اور ایک ہی جانب قبلہ معیّن ہو جانے سے تنظیم اور اتحاد کا جو عملی سبق مل رہا ہے وہ بھی نہ رہتا لہٰذا سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا۔ ہجرت کے بعد ایک سال سے کچھ اوپر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی گئی پھر کعبہ شریف کو قبلہ قرار دیا گیا جیسا کہ دوسرے پارے کے شروع میں قصہ بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے بیت اللہ یا بیت المقدس، جس کی طرف بھی حکم خداوندی کے مطابق نماز پڑھی گئی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے۔ کسی جہت یا کسی گھر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے اس جہت یا اس گھر کی عبادت نہیں ہوتی۔ اس سے بُت پرستوں کا یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں تو تم بھی تو کعبہ کو نماز پڑھتے ہو۔ کیونکہ مسلمان رُخ کعبہ کا کرتے ہیں اور عبادت اللہ کی کرتے ہیں اور مشرکین بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں کہیں سے کہیں تک بھی یہ بات نہیں کہ ہم عبادت اللہ کی کر رہے ہیں اور بتوں کو بطور قبلہ سامنے رکھ رکھا ہے۔ اگر مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ایسا کہنے بھی لگیں تو یہ اُن کی جھوٹی بات ہوگی۔

فائدہ...... بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کے بعد کعبہ شریف کو قبلہ قرار دینے سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ بیت المقدس یا کعبہ شریف کو نماز پڑھنا قبلہ کے طور پر ہے (یعنی حکمت اور مصلحت کی وجہ سے ان میں سے اللہ تعالیٰ نے جس کو جب چاہا قبلہ قرار دے دیا) وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ چاروں جہات میں سے کوئی جہت قبلہ کے لئے معین اور مخصوص نہیں ہے۔ جب کہ کعبہ شریف کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو قبلہ کی کوئی جہت معین نہ رہی سارے عالم کے مسلمانوں کو کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا اور سب اس پر عمل کرتے ہیں تو چاروں جہات کی طرف نمازوں میں رُخ ہو جاتا ہے اس سے فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ

اور اُنہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے وہ اس سے پاک ہے، بلکہ اُسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اُسی

لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

کے لئے فرمانبردار ہیں۔ وہ بلا مثال کے پیدا فرمانے والا ہے، اور جب فیصلہ فرمائے کسی امر کا تو بس یوں فرمادیتا ہے کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

ہو جا، پس ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنیوالوں کی گمراہی

اس آیت شریفہ میں مشرکین کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں پھر فوراہی سُبۡحٰنَهٗ فرما کران کی تردید کی اور خالق و مالک جل وعلیٰ کی تنزیہ بیان فرمائی، اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنے کا شرکیہ عقیدہ یہود میں بھی رہا ہے کیونکہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے تھے۔ اور نصرانیوں کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور مشرکین عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (کیا تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا۔ بیشک تم بڑی بیجا بات کہتے ہو) اور سورۂ زخرف میں فرمایا: وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ. (اور انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے بندے ہیں عورت قرار دے رکھا ہے کیا وہ اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جائے گا اور اُن سے باز پرس ہوگی) قرآن مجید میں جگہ جگہ اس عقیدہ کی تردید فرمائی اور سورۂ اخلاص میں واضح طور پر فرمایا ہے: لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. (کہ اس نے نہ کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا اور کوئی بھی اس کے برابر نہیں) سورۂ انعام میں فرمایا: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(اور لوگوں نے جنّات کو اللہ کا شریک قرار دے رکھا ہے حالانکہ ان کو خدا نے پیدا کیا اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں محض بلا سند تراش رکھی ہیں وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ بیان کرتے ہیں وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اللہ کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے حالانکہ اس کے کوئی ساتھ والی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے)

سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا.

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کی ہے۔ تم بہت زیادہ بڑی بات لے کر آئے۔ کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اُڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کے شایان شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے جتنے بھی کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے رُوبرو بندے بنے ہوئے حاضر ہوتے ہیں)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنا درست نہ تھا اور اُس نے مجھے گالی دی حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنا دُرست نہ تھا۔ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں (موت دے کر) دوبارہ اُسے زندہ نہ کروں گا جیسا کہ میں نے اُسے شروع میں پیدا کیا اور اُس کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہوگیا حالانکہ میں بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ میں جنا گیا اور نہ کوئی میرے برابر ہے۔ (صحیح بخاری ص ۷۴۴ ج ۲)

ان آیات سے اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی زیادہ ناگوار ہے اور یہ بہت بڑا کفر ہے اور بہت بڑا شرک ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حلم نہ ہو اور اس کا مخلوق کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ نہ ہو تو اس شرک کی وجہ سے آسمان وزمین کے ٹکڑے ہو جائیں اور پہاڑ گر پڑیں۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی حلیم نہیں ...... حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تکلیف دینے والی باتیں سن کر صبر کرنے میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ وہ پھر بھی ان کو عافیت دیتا ہے اور رزق عطا فرماتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳، از بخاری و مسلم)

تکلیف تو جسم اور جان کو ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے۔ لیکن لوگوں کی باتیں ایسی ہیں جو تکلیف دینے والی ہیں۔ اور ان سے اللہ تعالیٰ کو سخت ناگواری اور بیزاری ہے وہ پھر بھی زندہ رکھتا ہے، رزق اور عافیت دیتا ہے اور عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔ اصحاب دنیا میں کسی ذرا سے صاحب اقتدار کو بھی کوئی ناگواری کی بات کہہ دی جائے تو وہ بہت جلد سزا دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا: بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کہ جو بھی کچھ آسمانوں میں اور زمین میں موجود ہے۔ یہ سب اللہ کی مخلوق ہے اور مملوک ہے اور سب اس کے بندے ہیں اور سب اس کے فرمانبردار ہیں، خالق اور مخلوق کے درمیان اور مالک و مملوک کے درمیان اور عابد و معبود کے درمیان نسبی کوئی رشتہ نہیں ہوسکتا۔ رشتہ کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہے لہٰذا خالق تعالیٰ شانہٗ کی کوئی اولاد ہونا ہی محال ہے اس کے لئے اولاد تجویز کرنا اس کے لئے عیب تجویز کرنا ہے اور اس کی ذات کو محتاج بتانا ہے اور اس کے لئے برابر کا تجویز کرنا ہے اور وہ ان سب باتوں سے پاک ہے۔ بلند و بالا ہے، اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ کے لئے اولاد تجویز کرنا اس کو گالی دینا ہے یعنی اسکی ذات کو ایسی چیز سے متصف کرنا ہے جو اس کیلئے نقص اور عیب کی چیز ہے۔ پھر فرمایا: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الآیۃ)، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بلا مثال پیدا فرمایا ہے آسمان اور زمین کا پہلے وجود نہ تھا خداوند قدوس نے ان کو بغیر مثال اور بغیر نمونہ کے پیدا فرمایا اور جو کچھ ان کے اندر ہے وہ بھی پیدا فرمایا اور نظام محکم کا ان کو پابند بنایا سب اس کے حکم تکوینی کے پابند ہیں وہ جیسے چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ وہ صفت انفعال سے متصف نہیں ہے اور جب کسی کے اولاد ہوتی ہے تو اس میں سے اولاد منفصل یعنی جدا ہوتی ہے اور یہ سراپا صفت انفعال ہے جس سے اللہ جل شانہٗ منزہ اور پاک ہے اور برتر ہے۔ (من روح المعانی ص ۳۶۸ ج ۱)

پھر فرمایا: وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرما دیتا ہے کہ ہو جا، بس اس کا وجود ہو جاتا ہے) اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے پیدا فرمانے کے لئے اسباب اور آلات کا محتاج نہیں ہے۔ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی کافی ہے جس طرح اسے اسباب اور آلات کی ضرورت نہیں اسی طرح معین اور مددگار کی بھی ضرورت نہیں اولاد کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کاموں میں کچھ مدد کرے یا باپ کی موت کے بعد اس کا قائم مقام ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ ازلی اور ابدی ہے۔ اسے کسی اولاد کی ضرورت نہیں جو اس کی جگہ قائم مقام ہو اور اس کی قدرت بھی کامل ہے محض اس کے ارادہ سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ (۱)

---

۱) ...... فی روح المعانی أی ارادشیاً بقرینة قوله تعالیٰ انما امره اذا اراد شینا وجاء القضاء علی وجوه ترجع کلها الی اتمام الشئ قولا أو فعلا واطلاقه علی الارادة مجاز من استعمال اللفظ المسبب فی السبب فان الایجاد الذی هو تمام الشئ مسبب عن تعلق الارادة لانه یوجبه (ص ۳۶۸ ج ۱)

یہ جو فرمایا کہ کسی چیز کے پیدا فرمانے کے لئے اللہ جل شانہٗ کُن فرماتا ہے اس کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ کلام حقیقت پر محمول ہے اور واقعۃً اللہ تعالیٰ کلمہ کُــنْ فرماتے ہیں جس سے اس چیز کا وجود ہو جاتا ہے جس کے وجود میں لانے کے لئے یہ کلمہ فرماتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ جو چیز ابھی موجود نہیں اس کو کیونکر خطاب کیا جاتا ہے۔ اس اشکال کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ خطاب کرنے کے لئے اس چیز کا علم ہونا کافی ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ کُن سے لفظ کُن مراد نہیں، بلکہ یہ مجاز ہے سرعۃ تکوین سے اور جلد سے جلد وجود میں آجانے سے۔ قـال صـاحب الروح والامر محمول علی حقیقته کما ذهب إلیه محـقـقـو سـاداتـنـا الحنفیة، واللّٰہ تعالیٰ قد اجریٰ سنة فی تکوین الاشیاء أن یکونها بهذه الکلمة وان لم یمتنع تـکـوینها بغیرها . والمراد الکلام الازلی لانه یستحیل قیام اللفظ المرتب بذاته تعالیٰ وکثیر من أهل السنة إلی أنـه لیس الـمـراد به حقیقة الامر والامتثال، وانما هو تمثیل لحصول ما تعلق به الارادة بلامهلة بطاعة المامور الـمـطـیع بـلا توقف۔ (صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ آیت میں امر اپنی حقیقت پر محمول ہے جیسا کہ محققین حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اشیاء کی ایجاد و تخلیق میں سنۃ اللہ یہی جاری ہے کہ انہیں اس کلمہ کُن کے ذریعے وجود میں لایا جاتا ہے گو اس کلمہ کے بغیر بھی اشیاء کی ایجاد و تخلیق ہو سکتی ہے۔ اور کلمہ کُن سے مراد کلام ازلی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے تلفظ کی نسبت جائز نہیں۔ اور اکثر اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اس سے حقیقت امر مراد نہیں بلکہ یہ ارادۂ الٰہی کے حصول وجود کی تمثیل ہے)

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ

اور کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے، کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ، یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی دلیل، ایسا ہی کہا اُن لوگوں نے جو ان

مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

سے پہلے تھے انہیں جیسی بات، ان کے دل آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے، بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے لئے دلیلیں بیان کر دی ہیں جو یقین لاتے ہیں۔

جاہلوں کی باتیں کہ اللہ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اُمتوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سامنے صریح دلائل اور معجزات ہوتے ہوئے اپنے نبیوں کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور اپنے پاس سے تجویز کر کے نبوت کی دلیلیں طلب کرتے تھے، انہیں میں سے ایک یہ مطالبہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کرے تو ہم مانیں، اور کہتے تھے کہ ہم جو معجزہ چاہتے ہیں وہ ہمارے سامنے آنا چاہیئے۔ اس آیت میں بقول بعض مفسرین نے مشرکین عرب کا یہی سوال نقل فرمایا ہے اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں اگر مشرکین عرب مراد ہوں تو ان کے بارے میں اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ جو فرمایا ہے اس میں کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ وہ عموماً اَن پڑھ تھے اور کسی کتاب کے حامل بھی نہ تھے اور اگر یہود و نصاریٰ مراد ہوں تو انکو لَا يَـعْـلَـمُـوْنَ (نہیں جانتے) اس لئے فرمایا کہ اُنہوں نے جانتے ہوئے انجان ہونے کا کام کیا پھر فرمایا كَـذٰلِكَ قَـالَ الَّـذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (یعنی ان سے پہلے جو لوگ تھے جنہوں نے کفر و عناد اور سرکشی پر کمر باندھی ہوئی تھی اُنہوں نے بھی اسی طرح کی باتیں کہی تھیں ان کے قلوب اور اُن کے قلوب ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔ کفر و عناد اور سرکشی میں اور انکار حق میں یہ لوگ اور جو اُن سے پہلے تھے، ایک ہی جیسے ہو گئے۔

پھر فرمایا: قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (بے شک ہم نے دلائل بیان کر دیئے، ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں) تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے۔ وہ اُن کی نبوت اور رسالت ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی وافی تھے اور نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بھی بڑے بڑے معجزات اور دلائل واضحہ سامنے آ چکے ہیں۔ منکرین اور معاندین کو تو ماننا ہی نہیں ہے۔ جن کے دلوں میں اتباع حق کا جذبہ ہے اور جو حق سامنے آنے کے بعد حق کو تسلیم کر لیتے ہیں اور حق کو حق جان کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں یہ دلائل انہیں کے لئے مفید ہوتے ہیں منکرین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جو بھی کوئی معجزہ ان کے سامنے آیا اس کو جادو بتا دیا اور حق کو ٹھکرا دیا جس کو سورت قمر میں یوں بیان فرمایا کہ: وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۔ (اور اگر معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو بھی ختم نہیں ہوتا) سورۂ انعام میں فرمایا: وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(یعنی انہوں نے خوب زوردار قسمیں کھا کر کہا کہ اگر ہمارے پاس (ایسا) معجزہ آ جائے (جس کی ہم فرمائش کرتے ہیں) تو ہم ضرور ضرور ایمان لے آئیں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ سب نشانیاں اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، پھر مسلمانوں سے خطاب فرمایا تم کو اس کی کیا خبر کہ نشانی فرمائش کے مطابق ظاہر ہو جائے تو یہ لوگ اس وقت بھی ایمان نہ لائیں گے)۔

اپنی طرف سے تجویز کر کے دلائل و معجزات طلب کرنا ایمان لانے کے لئے نہیں بلکہ محض ضد اور عناد مقصود ہے اُسی پر تلے ہوئے ہیں ایمان و یقین کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور دوزخ والوں کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ فرمایا کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور آپ کا عہدہ یہ ہے کہ آپ جنت کی بشارت دیں اور دوزخ سے ڈرائیں بشارت میں وہ اعمال بتانا داخل ہے جو دخول جنت کا سبب ہیں جن میں سب سے بڑی چیز ایمان ہے اور ڈرانے کے مفہوم میں ان اعمال سے باخبر کرنا شامل ہے جو دوزخ میں لے جانے والے ہیں جن میں سب سے بڑی چیز کفر و شرک ہے، اور یہ جو فرمایا کہ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (کہ آپ سے دوزخ والوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا) اس میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ مسلمان نہ ہوں آپ اُن کے بارے میں پریشان نہ ہوں آپ اپنا کام کیے جائیں، اللہ کا کلام پہنچائیں، حق کو واضح طور پر بیان فرما دیں، آگے ایمان کو قبول کرنا یا نہ کرنا مخاطبین کی ذمہ داری ہے۔ آپ سے کوئی سوال نہ ہوگا کہ کافروں نے اسلام کیوں قبول نہ کیا اور وہ دوزخ کے مستحق کیوں ہوئے زبردستی ایمان قبول کرانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کا کام پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ کما فی سورة الرعد فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۔ سورۂ غاشیہ میں فرمایا: فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۔ (یعنی آپ حق کی یاد دہانی کرتے رہیے آپ تو مذکر ہی ہیں (یاد دہانی کرنے والے) آپ کو ان پر مسلط نہیں کیا گیا)۔ اور سورۂ ق کے اخیر میں فرمایا: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۔ (یعنی ہم اُن باتوں

کو خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں سو آپ ان کو قرآن کے ذریعہ نصیحت فرماتے رہیں جو میری وعید سے ڈرتا ہے) قال صاحب الروح والآية اعتراض لتسلية الرسول صلى الله عليه وسلم يضيق صدره لاصرارهم على الكفر (إلى ان قال) أى ارسلناك غير مسئول عن أصحاب الجحيم مالهم لم يؤمنوا بعد ان بلغت ما ارسلت به والزمت الحجة عليهم ۔ (صاحب روح المعانی کہتے ہیں یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے آئی ہے کیونکہ آپ کفار کے اصرار علی الکفر کی وجہ سے بہت دل تنگ ہوتے تھے یعنی ہم نے آپ کو اس حال میں بھیجا کہ آپ سے جہنم والوں کے بارے میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے جبکہ آپ انہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا چکے اور ان پر حجت لازم کر چکے)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے آپ سے یہود و نصاریٰ یہاں تک کہ آپ ان کے دین کا اتباع کرلیں، آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اللہ کی ہدایت جو ہے وہی ہدایت ہے اور اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کیا بعد اسکے کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے تو نہ ہوگا آپ کیلئے کوئی ولی اور مددگار جو اللہ سے بچادے۔

وقف منزل

یہود و نصاریٰ راضی نہیں ہو سکتے جب تک اُن کے دین کا اتباع نہ کیا جائے

تفسیر معالم التنزیل ص ۱۱۰ ج ۱ میں ہے کہ یہود و نصاریٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپس میں کچھ صلح کرلیں (یعنی بعض چیزوں میں آپ نیچے اُتر جائیں اور کچھ ڈھیل دے دیں تو ہم آپ کا دین قبول کرلیں گے۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ تفسیر قرطبی ص ۹۳ ج ۲ میں آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا اپنے تجویز کردہ دلائل و معجزات کا مطالبہ اس لئے نہیں ہے کہ ان کے کہنے کے مطابق معجزات ظاہر ہو جائیں تو یہ واقعی ایمان لے آئیں گے حقیقۃً بات یہ ہے کہ آپ ان کے سامنے وہ معجزات لے آئیں جن کا یہ سوال کرتے ہیں تب بھی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ آپ اپنے دین اسلام کو چھوڑ دیں اور ان کا پورا پورا اتباع کرلیں۔ جب تک آپ ان کے دین کا اتباع نہ کریں گے یہ کبھی آپ سے راضی ہونے والے نہیں۔

پھر فرمایا: قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى کہ بلاشبہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اس کے سوا کوئی ہدایت نہیں اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ غلط ہے گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اپنی خواہشوں سے مذاہب بنالئے ہیں۔ ان کا دین اختیار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کیا جبکہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے آپ اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے اور اس وقت اللہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی حامی اور مددگار نہ ہوگا۔ (کما فی سورۃ الرعد) وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ خطاب یا تو حقیقۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور یا بظاہر آپ کو خطاب کیا ہے اور مراد اس سے آپ کی اُمت ہے اگر پہلی صورت مراد لی جائے تب بھی اس میں اُمت کے لئے تادیب ہے کیونکہ اُمت کا مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ سے کہیں کم ہے۔ پس جب دوسروں کی خواہشوں کے اتباع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مواخذہ ہو سکتا ہے تو اگر اُمت ایسا کوئی کام کرے گی جس میں دوسروں کا اتباع ہو وہ کیونکر مواخذہ سے بچے گی۔

مؤمن کا کام ہے کہ صرف اپنے خالق اور مالک کو راضی رکھے اور اُسے راضی رکھنے کے ذیل میں جو راضی ہوتا ہو وہ راضی رہے جو ناراض ہوتا ہو وہ ناراض رہے کوئی اپنا ہو یا پرایا خدا کو ناراض کر کے کسی دوسرے کو راضی کرنے کی کوشش ایمانی تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔ آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں وہ اپنے اعمال اور لباس اور وضع قطع اور شکل وصورت میں یہود و نصاریٰ کا اتباع کئے ہوئے ہیں اور اُن لوگوں کے سامنے اپنے کو حقیر جانتے ہیں اور انہیں راضی رکھنے کے لئے داڑھی بھی مونڈتے ہیں، یورپین لباس بھی پہنتے ہیں، عورتوں کو بھی بے پردہ پھراتے ہیں اور غیروں سے ان کے مصافحہ کراتے ہیں۔ ٹائی لگانے کو فخر سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ دشمنان اسلام طعنے دیں گے۔ اور ہمیں اچھی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ افسوس ہے کہ ان کو یہ منظور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہو جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع چھوٹ جائے لیکن اہل کفر راضی رہیں اور عزت کی نظر سے دیکھیں چاہے آخرت میں گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے عذاب ہی بھگتنا پڑے، حالانکہ وہ لوگ کسی بھی طرح سے راضی نہیں ہو سکتے وہ تو اسی وقت راضی ہوں گے جب العیاذ باللہ دین اسلام کو چھوڑ کر ان کی ملّت و مذہب کا اتباع کر لیا جائے۔

ہمیں کافروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ ہماری عزت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ہم مؤمن موحد ہیں افضل الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں ان کا دامن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہمارے لئے اتنا بڑا فخر ہے کہ اس سے بڑا اور فخر نہیں اور یہی ہماری سب کچھ عزت ہے۔ دُشمنوں کے اتباع میں دنیا و آخرت کی ذلّت ہی ذلّت ہے۔ اور ہلاکت اور بربادی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہو سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔

فائدہ ...... آیت شریفہ میں حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ فرمایا حالانکہ ابتداء آیت میں یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں کا ذکر ہے اور ہر ایک کی ملت الگ الگ ہے۔ پھر بھی تثنیہ کا صیغہ نہیں لایا گیا۔ اور یوں نہیں فرمایا کہ آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کی ملتوں کا اتباع نہ کریں۔ اس سے علماء تفسیر نے یہ بات مُستنبط کی ہے کہ کافر اگرچہ مذہبی اعتبار سے اختلاف رکھتے ہوں۔ لیکن کفر میں سب شریک ہیں اس لئے ان سب کی ملّت بھی ایک ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ملّتیں دنیا میں دو ہیں ایک ملّتِ ایمان اور ایک ملّتِ کفر۔ فقہاء نے اس سے میراث کے بعض مسائل ثابت کئے ہیں اور یہ بات تو سب پر واضح ہے کہ کافروں کی ساری جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کی دُشمنی میں ایک ہی ہیں۔ اور سب کی یہ کوشش ہے کہ اسلام نہ پھیلے اور مسلمان دنیا میں عروج نہ پائیں۔ اسلام کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں ان میں سبھی کافر مشورے یا مال سے یا دِل سے شریک ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض وہ فرقے جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور عقائد کے اعتبار سے مسلمان نہیں ہیں وہ بھی اسلام دُشمنی میں اور مسلمانوں کی حکومتوں کی تباہ کاری میں یہود و نصاریٰ اور مُشرکین سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو تنبیہ ...... آیت بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ایسی کوئی صورت نہیں کہ کافروں کے ساتھ اپنے دین میں کوئی مداہنت اور مصالحت کر لیں۔ دینِ اسلام اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ بندوں کا تجویز کیا ہوا نہیں ہے۔ بندوں کو کوئی اختیار نہیں کہ کچھ اُونچ کر کے دینی مسائل اور احکام میں ردوبدل کر کے دُشمنوں کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے کوئی راستہ نکالیں۔ دشمنانِ اسلام یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دین کو بدل دیں کیونکہ ان کا دین ان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہے اپنی بنائی ہوئی چیز میں اَدل بدل کر سکتے ہیں لیکن مسلمان جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے پابند ہیں وہ اپنے دین میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے اگر چند جاہلوں نے مل کر کسی حکم کو

بدل بھی دیا تو ان کا یہ عمل کافرانہ ہوگا۔اور اسلام میں کوئی تبدیلی نہ آئے گی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو شخص

یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۠ ﴿۱۲۱﴾

اس پر ایمان نہ لائے سو یہ لوگ پوری طرح خسارہ میں ہیں۔

جن کو کتاب ملی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کا حق ہے

اس آیت شریفہ میں اہلِ ایمان کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔حضرت ابنِ عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایسی تلاوت کرنا جیسا کہ تلاوت کا حق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اُن پر عمل کریں اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کو اختیار نہ کریں اور قرآن کو اسی طرح پڑھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اس کے کلمات میں تحریف نہ کریں اور اس کے معانی میں کوئی تبدیلی نہ کریں، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس کے محکمات پر عمل کریں اور متشابہات پر ایمان لائیں اور جو کچھ اشکال پیش آئے اس کو اہلِ علم کے سپرد کریں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو تلاوت کرتے وقت کسی رحمت والی آیت پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب کسی عذاب کی آیت پر پہنچتے ہیں تو اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔
(ابن کثیر ص ۱۶۳، ۱۶۴ ج ۱)

یہ جو فرمایا کہ اسی طرح تلاوت کریں جیسا کہ نازل ہوا اسی میں تجوید کے ساتھ پڑھنا بھی داخل ہے۔سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔عربی ایک مستقل زبان ہے جو ۲۹ حروف پر مشتمل ہے۔حروف کے مخارج بھی ہیں اور صفات بھی ہیں۔مخارج اور صفات کا خیال نہ کرنے سے ایک حرف دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے۔جس سے معانی بھی بدل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ضروری ہے کہ تلاوت کرنے والے قرآن کو صحیح طریقہ پر مخارج و صفات کی رعایت کے ساتھ پڑھیں اور صحیح ادائیگی کے لئے اصحاب تجوید سے رجوع کریں۔علامہ جزری فرماتے ہیں......

وَالاخذ بالتجوید حتم لازم، من لم یجوّد القراٰن اٰثم
علم تجوید کا حاصل کرنا ولا بدی ہے جو شخص قرآن پاک کو تجوید کیساتھ نہیں پڑھتا وہ گنہگار ہے
لانه به الالٰه انزلا وھٰکذا منه الینا و صلا
کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو تجوید کے ساتھ ہی نازل کیا ہے اور یہ تجوید کے ساتھ ہی ہم تک پہنچا ہے

پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، معلوم ہوا کہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی تلاوت اُسی طرح کی جائے جیسا کہ اُس کی تلاوت کا حق ہے اور یہ کہ اس کی لفظی یا معنوی تحریف کرنے والے اس پر ایمان لانے والے نہیں۔آخر میں فرمایا کہ......

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یعنی جو لوگ اللہ کی کتاب کے منکر ہیں۔ اس پر ایمان نہیں لاتے یہ لوگ بھرپور خسارہ اور نقصان میں ہیں اُنہوں نے کفر اختیار کیا اور ایمان کے قریب نہ آئے لہٰذا دوزخ کے عذاب کے مستحق ہوئے۔ اعاذنا اللّٰه منها۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر انعام کیا اور اس بات کو بھی کہ میں نے تم کو جہانوں پر فضیلت دی،

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی شخص کسی جان کی طرف سے کوئی مطالبہ ادا نہ کرے گا اور نہ کسی کی طرف سے جان کا کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی

شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

شفاعت نفع دے گی، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی

بنی اسرائیل کو نعمتوں کی مکرّر یاددہانی

یہ دونوں آیتیں سُورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں گزر چکی ہیں۔ دونوں آیتوں میں وہاں ایک طرح کی تمہید تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر بنی اسرائیل کو اپنے انعامات یاد دلائے تھے اور انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرایا تھا، اس کے بعد تفصیلی طور پر بعض نعمتوں کا تذکرہ فرمایا اور ان کی حرکتوں اور بدعملیوں اور جھوٹی آرزوؤں کا اور بچھڑے کی پرستش کرنے اور جادو کے پیچھے لگنے اور فرشتوں کو اپنا دشمن بتانے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دبی زبان سے رَاعِنَا کہنے اور اس کے بُرے معنی مراد لینے کا اور بعض دیگر اُمور کا تفصیلی بیان ہوا۔ بیان کے ختم پر اب یہاں پھر انہیں دونوں آیتوں کو دُہرایا جو بطور تمہید شروع میں مذکور تھیں۔ البتہ دوسری آیت میں ذرا سا لفظی فرق ہے اولاً و آخراً ان کو اجمالی طور پر اپنے انعامات یاد دِلا کر ایمان اور اعمالِ صالحہ میں لگنے کی طرف متوجہ فرمایا اور قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرایا اگر انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو سامنے رکھے کہ اللہ نے مجھ پر کیا کیا انعامات فرمائے اور اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے کہ میں نے ان کے مقابلے میں کیا کیا اور ساتھ ہی فکرِ آخرت بھی ہو تو ایسا شخص ایمانِ صالحہ سے دُور نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہودی ایمان سے بھی گئے اور اعمالِ صالحہ سے بھی گئے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ

اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے ربّ نے چند کلمات کے ذریعہ تو اُنہوں نے اُن کو پورا کیا۔ ان کے رَبّ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا

وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

بنانے والا ہوں، اُنہوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے، ان کے رب نے فرمایا کہ میرا عہد ظلم کرنے والوں کو نہ ملے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آزمائشوں میں پورا اترنا اور ان کی امامت کا اعلان فرمانا

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کا پھر اس میں ان کے پورا اُترنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے کہ ہم

نے اُن کو چند کلمات کے ذریعہ آزمایا۔

کلمات کی تشریح اور توضیح جن کے ذریعہ آزمایا گیا...... ان کلمات سے کیا مُراد ہے اس کے بارے میں مفسرین کرام نے بہت کچھ لکھا ہے کلمات جمع ہے کلمة کی اور کلمہ لفظ مفرد با معنی کو کہا جاتا ہے اور کلام کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں **کلمات** سے احکامِ شرعیہ مراد ہیں جن کا ابراہیم علیہ السلام کو مکلّف بنایا گیا تھا۔ جو احکام ان کو دیئے گئے انہوں نے اُن کو پورا کیا اللہ تعالیٰ شانہ نے ان احکام کے انجام دینے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ یہاں فرمایا: فَاَتَمَّهُنَّ ای قام بهن کلهن (یعنی جتنے بھی احکام کا حکم دیا گیا اُن کو پورا فرمایا) اور سورۃ النجم میں فرمایا وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (اور وہ ابراہیم جس نے احکام کی پوری بجا آوری کی) یہ کون سے احکام تھے جن کا ان کو حکم دیا گیا اور وہ اُن پر پوری طرح قائم رہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ خود حضرت ابن عباسؓ ہی کے متعدد اقوال ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں ان کا ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مناسک حج کا حکم دیا جس کو اُنہوں نے پورا فرمایا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ طہارت اور نظافت سے متعلق ان کو احکام دیئے تھے اور یہ دس احکام ہیں جن میں پانچ سر کے متعلق اور پانچ باقی جسم کے متعلق ہیں جو سر سے متعلق تھے وہ یہ ہیں۔ ۱۔ مونچھیں کاٹنا ۲۔ کلی کرنا ۳۔ سانس کے ساتھ ناک میں پانی لیکر ناک صاف کرنا جیسا کہ وضو اور غسل میں کرتے ہیں۔ احادیث میں اس کو استنشاق سے تعبیر فرمایا ہے، ۴۔ مسواک کرنا، ۵۔ سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔ اور باقی جسم کے احکام یہ ہیں۔ ۶۔ ناخن کاٹنا، ۷۔ ناف کے نیچے بال صاف کرنا، ۸۔ ختنہ کرنا، ۹۔ بغلوں کے بال اُکھاڑنا، ۱۰۔ پیشاب اور پاخانہ کرکے پانی سے استنجاء کرنا۔

صحیح بخاری (ص ۳۷۴) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام نے اسّی سال کی عمر میں مقامِ قدوم میں اپنی ختنہ کی، حضرت سعید ابن المسیب سے منقول ہے کہ ابراہیم خلیل الرحمٰن سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے مہمان کی مہمان نوازی کی اور سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنی ختنہ کی اور سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنی مونچھیں تراشیں اور سب سے پہلے وہ شخص ہیں جن کے چہرے پر سفید بال نظر آئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب یہ کیا ہے؟ رب تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے (یعنی متانت اور سنجیدگی کی چیز ہے) اس پر اُنہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میرا وقار اور بڑھا دیجئے۔ (مؤطا امام مالک)

حضرت ابن عباسؓ سے تیسرا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن احکام کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی ان میں سے چھ چیزیں انسان کے اندر ہیں اور چار احکام حج کے متعلق ہیں۔ جسمِ انسانی کے متعلق چھ عدد یہ ہیں، ۱۔ ناف کے نیچے بال صاف کرنا اور بغلوں کے بال اُکھاڑنا، ۲۔ ختنہ کرنا، ۳۔ ناخن کاٹنا، ۴۔ مونچھیں تراشنا، ۵۔ مسواک کرنا، ۶۔ جمعہ کے دِن غسل کرنا، اور باقی چار جو احکام حج سے متعلق ہیں۔ وہ یہ ہیں، ۱۔ طواف کرنا، ۲۔ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا، ۳۔ جمرات پر کنکریاں مارنا، ۴۔ طواف زیارت کرنا۔

حضرت ابن عباسؓ سے چوتھا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جن چیزوں کا حکم دیا اور اُنہوں نے اُن کو پورا کیا وہ تیس چیزیں ہیں اُن میں سے دس سورۂ براءت کی آیت اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (الی اٰخر الاٰية) میں اور دس سورۂ مؤمنون کے اوّل میں اور سورۂ معارج (کے پہلے رکوع میں) اور دس سورۂ احزاب کی آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ میں مذکور ہیں۔ مکرّرات کو چھوڑ کر ان سب کا شُمار اس طرح سے ہے، ۱۔ توبہ کرنا، ۲۔ عبادت کرنا، ۳۔ اللہ کی حمد کرنا، ۴۔ روزہ رکھنا، ۵۔ رکوع کرنا، ۶۔ سجدہ کرنا، ۷۔ امر بالمعروف کرنا، ۸۔ نہی عن المنکر کی انجام دہی کرنا، ۹۔ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا۔ اس آیت میں نو چیزیں مذکور ہیں۔ لیکن مفسر ابن کثیر

نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ سورۂ برأت میں دس ہیں۔ احقر کے خیال میں یوں آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے وہ آیت بھی ساتھ ملائی ہوگی جو آیت مذکورہ سے پہلے ہے۔ یعنی اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّةَ ط اس آیت میں قتال اور جہاد مذکور ہے اس کو ملا کر دس صفات ہو جاتی ہیں۔ سورۂ مؤمنون میں یہ احکام مذکور ہیں، ۱۔ نماز میں خشوع کرنا، ۲۔ لغو سے اعراض کرنا، ۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا، ۴۔ شرم کی جگہ کو حرام سے محفوظ رکھنا، ۵۔ اَمانتوں کی نگہداشت رکھنا، ۶۔ عہد کی پابندی کرنا، ۷۔ نمازوں کی پابندی کرنا۔ یہ چیزیں سورۂ مؤمنون کے پہلے رکوع میں مذکور ہیں۔ سورۂ معارج میں بھی ان چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں یہ چیزیں زائد ہیں۔ ۸۔ اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ رکھنا، ۹۔ اپنے رب کے عذاب سے ڈرنا، ۱۰۔ گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔

سورۂ احزاب میں یہ چیزیں مذکور ہیں، (۱)۔ اسلام کے کام کرنا، (۲)۔ دِل سے مؤمن ہونا، (۳)۔ فرمانبرداری کرنا، (۴)۔ قول و عمل میں سچائی اختیار کرنا، (۵)۔ طاعات کی ادائیگی میں اور مصائب کے آنے پر صبر اختیار کرنا، (۶)۔ خشوع اختیار کرنا، (۷)۔ مال خیرات کرنا، (۸)۔ روزہ رکھنا، (۹)۔ شرم کی جگہوں کی حفاظت کرنا، ۱۰۔ بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنا۔ یہ دس چیزیں ہیں لیکن اس میں بعض چیزیں وہ ہیں جو سورۂ مؤمنون کی آیت میں بھی مذکور ہیں اور یہاں اگر خشوع سے مُراد مطلق خشوع لیا جائے (نماز میں اور غیر نماز میں) جس کا معنی ہے قلب کا جُھکاؤ ہونا تو اس سے خشوع فی الاعمال اور خشوع فی المعاملات بھی مُراد ہو سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تکبر اختیار نہ کرے اور قلب و جوارح کو عناد سے اور ہر ایسی چیز سے بچائے جو قلب اور اعضاءِ جوارح کے جُھکاؤ کے خلاف ہو۔ سورۂ برأت میں جو اَلسَّآئِحُوۡنَ ہے اس کا ترجمہ بھی روزہ دار کا کیا گیا۔ سورۂ احزاب میں بھی الصائمین مذکور ہے۔ لیکن حضرت عطار نے اَلسَّآئِحُوۡنَ کا ترجمہ الغزاۃ المجاھدون فی سبیل اللّٰہ بتایا ہے اور حضرت عکرمہ نے اَلسَّآئِحُوۡنَ ھم طلبۃ العلم (کمافی معالم التنزیل) اگر ان میں سے کوئی معنی لیا جائے تو مستقل ایک صفت کا ذکر آ جاتا ہے اور تکرار ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے پانچواں قول یہ منقول ہے کہ جن کلمات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبتلا فرمایا اور اُن کو آزمایا، وہ یہ ہیں۔

(۱)۔ اپنی قوم سے جُدا ہو جانا اور اللہ کے لئے مفارقت اختیار کرنا، (۲)۔ نمرود سے اللہ کی توحید کے بارے میں مباحثہ کرنا اور جان کا خطرہ ہوتے ہوئے ایک جابر کے سامنے کلمۂ حق کہہ دینا، (۳)۔ پھر آگ میں ڈالا جانا اور اس کے باوجود حق پر قائم رہنا، (۴)۔ اپنا وطن چھوڑ کر اللہ کے لئے ہجرت کرنا اور دوسری جگہ (ملکِ شام) چلا جانا، (۵)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ضیافت کے لئے مامور ہو جانا اور اپنی جان و مال سے اس پر ثابت قدم رہنا، (۶)۔ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہونا پھر اس کے لئے نہ صرف یہ کہ آمادہ ہو جانا بلکہ اس کے گلے پر چھرا پھیر دینا (انہوں نے تو چھری پھیر ہی دی، آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوئی اور بیٹا ذبح نہ ہوا۔ یہ دوسری بات ہے) جب یہ سب کام کر گزرے اور امتحان میں پُورے اتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا...... اَسۡلِمۡ (فرمانبردار ہو جاؤ) اُنہوں نے عرض کیا اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (میں رب العالمین کا فرمانبردار ہوں) مفسر ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کے یہ اقوال نقل کئے ہیں ہم نے تشریح میں بعض روایات کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور آیات مذکورہ میں جو احکام ہیں ان کی تعداد میں جو کلام ہے وہ بھی ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بعد مفسر ابن کثیر نے کلمات کی تفسیر میں حضرت حسن بصری کے اقوال نقل کئے ہیں پھر ابن عباس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کلمات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیات میں مذکور ہیں۔ حضرت مجاہد سے بھی ایسا ہی منقول ہے اس کے بعد حافظ ابن کثیر

مفسر ابن جریر سے نقل فرماتے ہیں کہ کلمات کی تفسیر میں جتنے بھی اقوال ہیں ان میں جو کچھ مذکور ہے کلمات سے یہ سب مراد ہوں یہ بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں مراد ہوں اور کسی بھی چیز کے بارے میں متعین طریقہ پر اُسی وقت یقین کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث ہو یا اجماع اُمت ہو لیکن صحیح حدیث یا اجماع سے ان میں سے کوئی چیز کلمات کی تفسیر میں ثابت نہیں ہے۔ اس کے بعد ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت مجاہد نے جو کلمات کی تفسیر کی ہے وہ زیادہ ٹھیک معلوم ہوتی ہے، لیکن ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تمام اقوال میں جو مذکور ہے ان سب کو مراد لینا زیادہ اقوی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت...... اس کے بعد ارشاد ہے: **قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بلاشبہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا) علماءِ تفسیر نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام دے کر آزمایا اور اُنہوں نے احکام کی پورے طور پر بجا آوری کر دی تو بطورِ صلہ اور انعام اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اُن کو لوگوں کا پیشوا بنا دیا۔ اور جن احکام میں اُن کو مبتلا فرمایا تھا اُن کے پورا کروانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے اُن کی پوری طرح تربیت ہو جائے تا کہ وہ امامت کے لائق ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح پیشوا بنایا کہ اول تو ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا ان پر صحیفے نازل فرمائے اور پھر ان کی نسل اور ذرّیت میں امامت کو جاری فرمایا یعنی ان کے بعد جتنے بھی نبی آئے ہیں وہ سب انہیں کی نسل میں سے تھے اور سب اس بات کے مامور تھے کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی ملت کا اتباع کریں۔ حتیٰ کہ نبی عربی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی نسل میں سے تھے اور اُن کو بھی حکم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کریں۔ کما قال تعالیٰ: **ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا** گو پوری طرح سے ان کی ملت کے احکام اُن کے بعد آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام کی ملت میں نہ تھے لیکن اکثر یا بعض احکام ان کے بعد کے شرائع میں ان کی ملت کے موافق اور مطابق تھے۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت دوامی لی جائے اور اگر یہ مطلب ہو کہ اپنے زمانے کے لوگوں کے پیشوا تھے تو یہ بھی بعید نہیں ہے۔ روح المعانی میں دونوں باتیں لکھی ہیں۔ لیکن امامت سے نبوت مراد لینے کی صُورت میں کلمات کی تفسیر میں جو بعض باتیں بیان کی گئی ہیں وہ نہیں آ سکتیں جب کہ پیشوا ہونے کا اظہار تمام کلمات کے بعد مراد ہو کیونکہ لڑکے کا ذبح اور بعض دیگر اُمور جو کلمات کی تفسیر میں بیان ہوئے ہیں وہ نبوت کے بعد ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ (ذکرہ فی الروح ص ۳۷۵ ج ۱)

لیکن ان میں سے جو کوئی ظالم ہوگا وہ اس مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتا، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں **عھد** سے مراد امامت ہے اور متعین طور پر اس سے نبوت مراد ہے اور ظالموں سے کافر مراد ہیں۔ کما قال تعالیٰ: **وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ** آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذرّیت میں ظالم بھی ہوں گے اور ظالم کو نبوت نہیں مل سکتی اور نبوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے ملتی چلی جائے وہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہا اللہ تعالیٰ نے نبی بنا دیا اور جب چاہا سلسلۂ نبوت ختم فرما دیا۔ قال فی الروح و عبّر عنها بالعهد للاشارة إلى أنها أمانة الله تعالى و عهده الذى لا يقوم به الا من شاء الله تعالى من عباده واثر النيل على الجعل ايماءً إلى أن امامة الانبياء من ذريته عليهم السلام ليست بجعل مستقل بل هي حاصلة في ضمن إمامته تنال كلا منهم في وقته المقدر له ۔ (ص ۳۷۷ ج ۱) (روح المعانی میں ہے۔ امامت کو عہد سے تعبیر کرنے کا مقصد اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ امامت اللہ تعالیٰ کی امانت اور اس کا وہ عہد ہے جس کے ساتھ وہی متصف ہوتا ہے جسے اللہ چاہے **جاعلك** کے بعد **ینال** ذکر کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے جو حضرات امامت کے شرف سے

مشرف ہوں گے ان کی امامت امامت مستقلہ نہیں ہوگی بلکہ انہیں امامت حضرت ابراہیمؑ کی امامت کے ضمن میں حاصل ہوگی جسے وہ حضرات اپنے اپنے مقدر اوقات میں حاصل کریں گے)۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور جب ہم نے بنایا خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ اور امن، اور بنا لو مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

کعبہ شریف کو مرجع اور جائے امن بنایا

حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے وطن سے ہجرت فرما کر ملک شام چلے گئے تھے ان کی ایک بیوی حضرت سارہ تھی اور اس سے جو اولاد تھی وہ سب وہیں رہتے تھے۔ دُوسری بیوی حضرت ہاجرہ تھی، جن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ ان کو، اور اُن کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بحکم خدا آپ مکہ معظّمہ میں چھوڑ گئے، جو اس وقت سنسان اور چٹیل میدان تھا جس کا واقعہ ان شاء اللہ سورۂ ابراہیم کی تفسیر کے ذیل میں بیان ہوگا۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے ذبح کرنے کا حکم ہوا جس کی بجا آوری میں کامیاب ہو گئے۔ نیز دونوں کو کعبہ شریف بنانے کا حکم ہوا۔ دونوں باپ بیٹے نے مل کر کعبہ بنایا جس کا ذکر ابھی آ رہا ہے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) اس آیت شریفہ میں کعبہ شریف کو اول تو مثابہ فرمایا جو ثَابَ یَثُوْبُ سے ظرف کا صیغہ ہے۔ جس کا معنیٰ ہے لَوٹنے کی جگہ، حضرت ابن عباس اور متعدد تابعین سے مروی ہے کہ اس کو مثابہ اس لئے فرمایا کہ لوگ بار بار اس کی طرف آتے ہیں طواف کرتے ہیں اور اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں، اس کی حاضری دینے سے طواف کرنے سے دِل نہیں بھرتا۔ دنیا کے مختلف شہروں کے لوگ اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں۔ حضرت عکرمہ، قتادہ اور عطاء خراسانی نے اس کا ترجمہ ''مجمع'' سے کیا یعنی جمع ہونے کی جگہ، مآل اس کا بھی وہی ہے جو دوسرے حضرات نے فرمایا۔ کیونکہ جب ہر طرف سے لوگ آتے ہیں تو وہاں جمع ہونے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پھر فرمایا وَاَمْنًا (کہ ہم نے کعبہ شریف کو امن کی جگہ بنایا) سورۂ آل عمران میں فرمایا وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (اور جو شخص اس میں داخل ہوگا امن والا ہوگا) حضرت ابراہیم علیہ السلام، بانی کعبہ ہی کے وقت سے کعبہ شریف کی حُرمت ذہنوں میں چلی آ رہی ہے۔ درمیان میں مشرکین بھی کعبہ شریف کے متولی رہے ہیں اور وہ بھی اس کی عظمت اور حُرمت کے قائل تھے اور سارے عرب میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ امن کی جگہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر غارت گری کر دیتا تھا اور جنگ کرنا ان کا ضروری مشغلہ تھا لیکن مکہ معظّمہ کے رہنے والوں پر کوئی قبیلہ حملہ آور نہیں ہوتا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے سورۂ عنکبوت میں اہل مکہ پر اپنا انعام ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہم نے بنا دیا حرم کو امن کی جگہ اور ان کے گرد و پیش میں لوگوں کو اُچک لیا جاتا ہے یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں) چونکہ حرم مکہ امن کی جگہ قرار دے دی گئی۔ اس لئے اس میں قتل و قتال جائز نہیں ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی کے

لئے یہ حلال نہیں ہے کہ مکہ میں ہتھیار ساتھ لئے پھرے۔ (صحیح مسلم ص ۴۳۹ ج ۱) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں قتال کرنا حلال قرار نہیں دیا گیا اور میرے لئے حلال نہیں کیا گیا مگر دن کے تھوڑے سے حصہ میں پس مکہ معظمہ حرام ہے (یعنی اس کی حُرمت برابر قائم ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اُس کی حُرمت باقی رکھی ہے۔ (بخاری)

یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ میرے لئے اس میں تھوڑی دیر کے لئے قتال حلال کیا گیا اس سے فتح مکہ کا دِن مراد ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص حرم کے باہر حل میں کسی کو قتل کر کے حرم میں پناہ لے لے تو اس کو حرم میں قتل نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اُٹھا بیٹھا نہ جائے، خرید و فروخت نہ کی جائے، کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے تا کہ مجبور ہو کر حرم سے باہر آ جائے پھر اُسے خارج حرم (حل) میں قتل کر دیا جائے۔ (رُوح المعانی ص ۳۷۸ ج ۱) حرم مکہ میں جیسا کہ قتل و قتال جائز نہیں اسی طرح اس میں شکار کرنا۔ شکار کے جانوروں کو بھگانا دوڑانا بھی ممنوع ہے۔ حرم مکہ سے گھاس اور درخت کاٹنا اور وہاں کے کانٹے کاٹنا بھی ممنوع ہے جس کی تصریح بخاری و مسلم کی احادیث میں موجود ہے۔ اور کتب فقہ میں تفصیل لکھی ہے۔ پھر فرمایا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو) مقام ابراہیم سے کیا مُراد ہے؟ اس بارے میں متعدد اقوال مشہور ہیں اور معتمد قول یہ ہے جسے عام مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ (اور احادیث شریفہ سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ) اس سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ شریف تعمیر فرماتے تھے یہ پتھر زینہ کا کام دیتا تھا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اینٹیں اور چونہ وغیرہ دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے لے کر تعمیر فرماتے تھے۔ جب کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو جس جانب کعبہ شریف کا دروازہ ہے اسی طرف دیوار سے ملا ہوا اُس کو چھوڑ دیا۔ سالہا سال وہ وہیں تھا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اسی جگہ رہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی وہیں تھا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو اُنہوں نے وہاں سے ہٹا کر اس جگہ رکھ دیا جہاں اب ہے۔ اور بعض رِوایات میں ہے کہ ایک مرتبہ سیلاب آ گیا تھا جو اس کو بہا کر لے گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے لے کر وہاں رکھ دیا جہاں اَب ہے۔ حضرات صحابہ کے سامنے اس کی جگہ بدلی، کسی نے کوئی نکیر نہیں کی اور ساری اُمت نے اس کا اس جگہ ہونا تسلیم کر لیا جہاں حضرت عمرؓ نے رکھ دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین میں سے ہیں جن کے طریقے پر چلنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ (علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین) اور اُن کے بارے میں یہ بھی فرمایا اقتدوا بالذین من بعدی أبی بکر و عمر. (رواہ الترمذی) (یعنی میرے بعد اُن کا اتباع کرنا جو میرے بعد ہوں گے یعنی ابوبکر اور عمر) اور اس کو پہلی جگہ سے ہٹانے میں حکمت بھی ہے کیونکہ اب طواف کرنے والوں اور طواف کی رکعتیں پڑھنے والوں کی زیادہ کثرت ہے اگر اپنی جگہ ہوتا اور طواف کرنے والے اُسی کے پیچھے طواف کی رکعتیں پڑھتے تو طواف کرنے والوں کو کعبہ شریف کے قریب سے گزرنے کا راستہ نہ ملتا۔ ایک زمانہ تک مقام ابراہیم ایک چار دیواری کے اندر تھا جو مسقّف تھی اور قفل پڑا رہتا تھا۔ موجودہ حکومت نے وہ مسقّف عمارت ختم کر کے مقام ابراہیم کو بلوری شیشہ میں رکھ دیا ہے۔ باہر سے مقام ابراہیم دکھائی دیتا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۳۹۵ ج ۱ میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف کرنے کے بعد مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور قرآن مجید کے یہ الفاظ تلاوت فرمائے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ اور وہاں دو رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبہ شریف کے درمیان کر لیا۔ ان دو رکعتوں میں سورۂ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنا لیتے تو اچھا تھا تو اس پر آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى ط نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری ص ۶۴۲ ج ۲) طواف کے بعد جو دو رکعتیں پڑھنا واجب ہے۔ ان کو مسجد حرام میں کسی بھی جگہ پڑھ سکتے ہیں لیکن مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھنا افضل ہے۔

بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ۔۔۔۔۔۔ پھر فرمایا وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ط (اور ہم نے حکم بھیجا ابراہیم اور اسماعیل کی طرف کہ پاک کرو میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور وہاں کے مقیمین کے لئے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے) اس میں کعبہ شریف کو پاک رکھنے کا حکم ہے اور کعبہ شریف کے ساتھ مسجد حرام کے پاک رکھنے کا بھی حکم ہو گیا کیونکہ طواف اور نماز کی ادائیگی اسی میں ہوتی ہے۔ اور پاک کرنے میں سب کچھ داخل ہے۔ باطنی ناپاکی شرک وکفر اور بُت پرستی سے اور گندی باتوں سے جھوٹ سے، فریب سے، بدعملی سے اور ظاہری ناپاکی سے اسے پاک رکھیں۔ طواف ایک ایسی عبادت ہے جو صرف مسجد حرام ہی میں ہو سکتی ہے جو کعبہ شریف کے چاروں طرف ہے۔ آیت شریفہ میں جو لفظ اَلْعَاكِفِيْنَ آیا ہے اس کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے کہ اس سے مکہ معظمہ کے رہنے والے مراد ہیں اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو دوسرے شہروں سے آتے ہیں اور مسجد حرام میں قیام کر لیتے ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم جب بھی مسجد حرام میں بیٹھ گئے تو عاکفین میں شمار ہو گئے۔ اور اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو مسجد حرام میں اعتکاف کریں۔ کیونکہ لفظ عکوف اُن پر بھی صادق آتا ہے۔ اور اَلرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (رکوع اور سجدہ کرنے والے) سے نمازی مراد ہیں۔ مسجد حرام میں جس قدر بھی طواف اور نماز کا اہتمام ہو سکے، غنیمت جانے ان دونوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

طواف کا ثواب ۔۔۔۔۔۔ سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اس گھر کا طواف کرتے ہوئے سات چکر لگائے اور ٹھیک طرح سے شمار کیا اُسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہوگا اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ طواف کرنے والا جو بھی قدم رکھے گا اور اُٹھائے گا تو ہر قدم پر اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ معاف فرما دیں گے اور ایک نیکی اس کے اعمال نامہ میں لکھ دیں گے۔

مسجد حرام میں نماز کا ثواب ۔۔۔۔۔۔ مسجد حرام میں نماز پڑھنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں ایک نماز دوسری نمازوں کے مقابلہ میں ہزار نمازوں سے افضل ہے مگر مسجد حرام اس سے مستثنیٰ ہے (کیونکہ اس کا ثواب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے زیادہ ہے) مسجد حرام میں ایک نماز دوسری نمازوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔

(رواہ احمد وابن ماجہ باسنادین صحیحین کما فی الترغیب للحافظ المنذری ص ۲۱۴ ج ۲)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا دے اس شہر کو امن والا، اور رزق دے یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ان میں سے

مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ

ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جو شخص کفر اختیار کرے گا سو میں اسے تھوڑا سا نفع پہنچاؤں گا۔ پھر اُسے دوزخ کے عذاب کی طرف

النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

جبراً پہنچاؤں گا اور وہ بُری جگہ ہے۔

اہلِ مکہ کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاء

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لئے اللہ جل شانہ سے درخواست کی کہ اس کو امن والا شہر بنا دیجئے، اللہ جل شانہ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور اس کو بـلـد امین قرار دیا جس کے متعلق بعض احکام گزشتہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دُعا کی کہ اس شہر کے رہنے والوں کو جو بھی ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دِن پر ایمان رکھتا ہو رزق دیا جائے جو طرح طرح کے پھلوں سے ہو۔ چونکہ انہوں نے پہلے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کا اعلان سُن لیا تھا اس لئے دعا میں اہلِ ایمان کی تخصیص کر دی اور عرض کیا پھلوں کا انعام اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو دیا جائے، چونکہ اللہ تعالیٰ دنیا سبھی کو دیتے ہیں اور رزق دُنیاوی مؤمن اور کافر سبھی کو ملتا ہے اس لئے اللہ پاک کی طرف سے اعلان ہوا کہ رزق تو سبھی کو ملے گا اس میں ایمان والوں کی تخصیص نہیں ہے مؤمن اور کافر سبھی کھائیں گے لیکن آخرت کا رزق صرف مؤمنین کے لئے مخصوص ہے کافروں کو بھی دنیا میں رزق ملتا رہے گا۔ جتنی جس کی زندگی ہوگی اتنے دن دنیا میں اپنا رزق کھا سکے گا اور دُنیا میں جتنی بھی بڑی زندگی ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی ہی سی ہے۔ اہلِ کفر دنیا میں لھاپی لیں گے دنیا سے نفع اُٹھالیں گے لیکن آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں وہاں اُن کو دوزخ میں جانے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔ اور دوزخ کے عذاب سے انہیں کسی بھی طرح اور کبھی بھی کوئی چھٹکارہ نہ ملے گا اور دوزخ بہت بُری عذاب کی جگہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل میں جب تک اللہ نے چاہا اہلِ ایمان رہے اور مکہ معظمہ میں بستے رہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ پھر اہلِ مکہ مشرک ہو گئے۔ کعبہ شریف تک میں انہوں نے بُت رکھ لئے اور لات اور عزّیٰ اور منات کی پوجا کرنے لگے۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا قبول ہو جاتی کہ جو اہلِ ایمان ہیں انہیں رزق ملے تو اہلِ مکہ نے جو کفر اختیار کیا تھا اُسی وقت سے پھلوں سے محروم ہو جاتے لیکن اللہ جل شانہٗ نے اہلِ مکہ کو ہمیشہ رزق دیا مؤمنوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔

مکہ معظّمہ میں دُنیا بھر کے پھل...... اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ایسی قبول فرمائی کہ دُنیا بھر سے مکہ معظمہ میں پھل آتے ہیں اور وہاں کے مقامی حضرات اور حجاج وزائرین سب کھاتے ہیں اور ان سے مـنـتـفـع اور متمتع ہوتے ہیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا: اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (کیا ہم نے اُن کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے کھانے کو ملتے ہیں لیکن اُن میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

مکہ معظمہ کے قریب ہی شہر طائف آباد ہے اور وہ سرسبز وشاداب علاقہ ہے ہمیشہ وہاں سے طرح طرح کے پھل مکہ معظمہ پہنچتے رہے ہیں اور دنیا کے تمام اطراف واکناف سے مکہ معظّمہ میں طرح طرح کے پھل آرہے ہیں۔ شاید دنیا کا کوئی پھل ایسا نہ بچا ہو جو مکہ معظّمہ نہ پہنچا ہو بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ ثمرات کے عموم میں درختوں کے پھلوں کے علاوہ مشینوں کی پیداوار اور دستکاریوں سے حاصل ہونے والا سامان بھی داخل ہے۔ مکہ کی سرزمین میں نہ کاشت ہے نہ شجر کاری ہے اور نہ صنعت کاری لیکن پھر بھی اس میں دُنیا بھر کے ثمرات اور طرح طرح کی مصنوعات ملتی ہیں۔

مدینہ منوّرہ کے لئے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا...... حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے مکہ معظّمہ کے لئے دُعا کی تھی اور حضرت حبیب اللہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لئے دُعا کی۔ صحیح مسلم ص ۴۴۲ ج ۱ میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہلِ مدینہ کا یہ طریقہ تھا کہ جب پہلا پھل آتا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے آپ

اُسے لے کر یوں دعا کرتے تھے، اے اللہ! تو ہمارے لئے ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے شہر میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے صاع میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے مُد میں برکت دے (صاع اور مُد اُس زمانہ کے پیمانے تھے) اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تیرے بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں تیرا بندہ تیرا نبی ہوں اور ابراہیم علیہ السلام نے آپ سے مکہ کے لئے دُعا کی تھی اور میں آپ سے مدینہ کے لئے دُعا کرتا ہوں جو کچھ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لئے مانگا میں اُسی قدر اور اُس کے ساتھ اُس جیسا مزید آپ سے طلب کرتا ہوں اس کے بعد اپنے کسی سب سے چھوٹے بچہ کو بُلا کر وہ پھل دے دیتے تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دُعا کی...... اللھم اجعل بالمدینة ضعفی ما بمكة من البركة (اے اللہ! مدینہ میں اُس سے دوگنی برکت کر دے جو مکہ میں ہے)۔ (صحیح مسلم ص ۴۴۲ ج ۱)

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا بھی مقبول ہے مدینہ منوّرہ میں بھی پورے عالم سے طرح طرح کے ثمرات و مصنوعات و منتجات کھچ کر آتے ہیں اور کھلی آنکھوں مکہ معظمہ سے دوچند برکات دیکھنے میں آتی ہیں۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ

اور جب اُٹھا رہے تھے ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اور اسمٰعیل بھی، اے ہمارے رب قبول فرمالے ہم سے بے شک تو ہی

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب اور بنا دے ہم کو تو اپنا فرمانبردار، اور بنا دے ہماری اولاد میں سے ایک اُمت جو تیری فرمانبردار ہو،

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور ہمیں بتادے ہمارے حج کے احکام، اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا کعبہ شریف تعمیر کرنا

کعبہ شریف پہلے فرشتوں نے پھر حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا پھر عرصہ دراز کے بعد جب طوفانِ نوح کی وجہ سے اس کی دیواریں مسمار ہو گئیں اور عمارت کا ظاہری پتہ تک نہ رہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر کعبہ شریف کی بنیادیں اٹھائیں اور کعبہ بنایا (کما ذکرہ الازرقی) چونکہ جگہ معلوم نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو متعین کر کے اس کی جگہ بتا دی گئی جس کا ذِکر سورۂ حج کی آیت کریمہ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ میں فرمایا ہے۔ بنائے ابراہیمی میں حطیم کا حصہ کعبہ شریف میں داخل تھا قریش مکہ نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے جب کعبہ شریف بنایا۔ تو ان کے پاس خرچہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے کعبہ شریف کا کچھ حصہ باہر چھوڑ دیا جسے حطیم کہا جاتا ہے اس حصہ میں میزابِ رحمت کا پانی گرتا ہے اور نصفِ قد کے برابر دیواریں بنی ہوئی ہیں اس پر چھت نہیں ہے۔

صحیح مسلم ص ۴۲۹ ج ۱ میں ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تیری قوم کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں تو میں کعبہ شریف کو توڑ دیتا اور اُسے ابراہیم علیہ السلام کی بُنیادوں پر بنا دیتا اور اس کا دروازہ زمین پر کر دیتا اور حجر یعنی حطیم کو اس میں داخل کر دیتا۔ دُوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اس کے لئے دو دروازے بنا دیتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کعبہ شریف اُسی حال میں رہنے دیا جس طرح قریش مکہ نے بنایا تھا پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے قواعد ابراہیمیہ پر بنادیا تھا اور حطیم کو کعبہ شریف میں داخل کر دیا تھا اور دو دروازے بنا دیئے تھے ایک داخل ہونے کا ایک خارج ہونے کا اور بالکل زمین کے برابر کر دیا تھا اندر جانے کے لئے زینہ کی ضرورت نہ تھی پھر حجاج بن یوسف نے اُسی طرح بنا دیا جیسا قریش نے بنایا تھا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے حجاج کے بعد ہارون الرشید بادشاہ نے پوچھا کہ ہم پھر سے اُسی طرح بنا دیں جیسا حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا تھا اُنہوں نے فرمایا کہ اے امیر المؤمنین اس کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنایئے، جو بھی آئے گا اسے توڑا کرے گا، اور بنایا کرے گا۔ اس طرح سے لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت جاتی رہے گی۔ (ذکرہ النووی فی شرح مسلم ص۴۲۹ ج۱)

صحیح بخاری ص ۴۷۶ ج ۱ میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ بے شک مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ آپ اپنے رب کے حکم کی فرمانبرداری کیجئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میری مدد کرنا، عرض کیا کہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ یہاں ایک گھر بناؤں اور ایک اُونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اس کے بعد دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھانا شروع کیں، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر لاتے تھے اور حضرت ابراہیم تعمیر کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ جب دیواریں اُونچی ہوگئیں تو یہ پتھر (یعنی مقامِ ابراہیم) لے آئے جس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے تھے۔ یہ پتھر زینہ کا کام دیتا تھا حضرت اسمٰعیلؑ ان کو پتھر دیتے تھے اور دونوں یہ دُعا کرتے جاتے تھے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

یہ بات کس قدر ذہن میں بٹھانے کے لائق ہے کہ اللہ کے دو پیارے اللہ کے دونوں پیغمبر خلیل اللہ اور ذبیح اللہ علیہما السلام اللہ کا گھر اللہ کے حکم سے بنا رہے ہیں۔ اُن کے اخلاص میں ذرا بھی شبہ نہیں پھر بھی وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ ہم سے قبول فرمایئے، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کیسا ہی مخلص ہو اور کیسا ہی عملِ صالح کرے اُسے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دُعا کرتے رہنا چاہیئے اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں خود پسندی اور عجب نفس میں مُبتلا نہ ہو جائے درحقیقت اہلِ اخلاص کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کام کرتے جاتے ہیں اور ڈرتے جاتے ہیں کہ ہمارا یہ عمل قبول ہوتا ہے۔ یا نہیں؟ کما قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ . مفسر ابن کثیر ص ۱۷۵ ج ۱ نے بحوالہ ابن ابی حاتم وہیب بن الورد سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے آیت: يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ (الآیۃ) پڑھی پھر رونے لگے اور کہنے لگے کہ اے رحمٰن کے دوست آپ بیت الرحمٰن کی بنیادیں اُٹھا رہے ہیں اور اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ قبول نہ ہو، حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دُعا بھی کی کہ اے ہمارے ربّ تو ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک اُمت بنا دے جو تیری فرمانبردار ہو، اس میں اوّل تو وہی خوف و خشیت والی بات کا مظاہرہ کیا کہ مسلم اور فرمانبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے بارے میں دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا فرمانبردار ہی رکھے۔ مؤمن کو چاہیئے کہ ڈرتا رہے اور ایمان و اسلام کی دولت کے لئے اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر گزار رہے اور اس کو محض اللہ کی توفیق سمجھے اور اس نعمت کی بقاء اور دوام کی دُعا کرتا رہے۔

اُمت مسلمہ کے لئے دُعا اور اُس کی قبولیت ...... حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اپنی ذرّیت میں سے اُمت مسلمہ کے پیدا ہونے کی دُعا بھی کی۔ مُفسرین نے فرمایا کہ چونکہ ارشادِ خداوندی: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُن

کی ساری ذرّیت مؤمن نہ ہوگی اس لئے انہوں نے یوں عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہماری ذریت سے اُمت مسلمہ بنا دینا بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ اس سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن بندوں کو اپنے دین وایمان کی فکر رکھتے ہوئے اپنی نسل اور ذرّیت کے دین وایمان کے لئے بھی فکرمند ہونا چاہیئے اور یہ دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ ہماری نسل میں موحدین، مؤمنین، مخلصین، متقین باقی رہیں۔ سورۂ فرقان میں مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا پیشوا بنا دے) اور سورۂ تحریم میں فرمایا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے) اہل وعیال کے دین وایمان کے لئے دعا بھی کرنا چاہیئے اور فکر بھی کرنا چاہیئے)

مناسکِ حج جاننے کے لئے دُعاء

کعبہ شریف بناتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے یہ دُعا بھی کی کہ اے اللہ ہمیں مناسک یعنی احکام حج سکھا دے۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۸۳ ج ۱ میں ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کی تعمیر مکمل کر دی تو حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر صفا اور مروہ پر لے گئے کہ یہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں پھر اُن کو منیٰ لے گئے، پھر مزدلفہ میں لے گئے اور فرمایا یہ المشعر الحرام ہے۔ پھر اُن کو عرفات میں لے گئے اور اُن کو احکام حج سکھا دیئے۔ جب عرفات میں لے گئے تو پوچھا کہ میں نے جو کچھ تم کو بتایا ہے تم نے پہچان لیا اور تین بار پوچھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حضرت جبریل علیہ السلام نے حج کا طریقہ اور حج کے احکام بتائے انہوں نے حج کا اعلان عام کر دیا جس کا ذکر سورۂ حج میں ان الفاظ میں ہے۔

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو)

ان کے بعد موحدین برابر حج کرتے رہے اور ان کے حجوں میں توحید کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ جب ان ہی کی نسل اور ذرّیت میں مُشرکین پیدا ہو گئے اور وہی کعبہ شریف کے متولی بنے تو ان لوگوں نے حج میں شرک کی آمیزش کر دی اور حج کے احکام بدل دیئے، حج کا مہینہ بھی بدل دیتے تھے، عرفات ہی میں نہیں جاتے تھے۔ مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے۔ بیت اللہ شریف کا ننگے طواف کرتے تھے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور مکہ سے مشرکین کا تسلط ختم ہوا تو آپ نے اعلان کروادیا کہ آئندہ کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے طواف نہ کرے اور کوئی مُشرک حج نہ کرے۔ پھر آپ نے ۹ ھ میں حج کیا جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں اور اُس میں پوری طرح حج کے احکام سکھائے اور بتائے اور حکم فرمایا کہ خُذُوْا عَنِّىْ مَنَاسِكَكُمْ (یعنی تم مجھ سے احکام حج سیکھ لو) اور یہ بھی فرمایا...... قفوا علی مشاعر کم فانکم علی ارث من ارث أبیکم ابراهیم علیه السلام۔

(کہ تم لوگ اُنہیں جگہوں میں وقوف کرو جو پُرانی جگہیں معروف ہیں کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہو)۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ کما فی المشکوٰۃ ص ۲۲۸)

جس کسی کو بھی حج یا عمرہ کرنا ہو اُس کو لازم ہے کہ حج اور عمرہ کے احکام معلوم کرے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ حج اور عمرہ کے لئے چل دیتے ہیں اور ذرا بھی ان کے احکام معلوم نہیں کرتے تلبیہ تک نہیں جانتے، فرائض و واجبات تک چھوڑ دیتے ہیں اور جب کوئی عالم

بتانے لگتا ہے تو اس کا بتانا نا گوار ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من الجهل و السفاهة و الحمق و الضلالة.

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اے ہمارے رب اور بھیج دے ان میں ایک رسول ان میں سے، جو تلاوت کرے ان پر تیری آیات، اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت

وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

اور اُن کا تزکیہ کرے، بے شک تو ہی عزیز ہے، حکیم ہے۔

اہلِ مکہ میں سے ایک رسُول بھیجنے کی درخواست اور اس کی مقبولیت

اس آیت میں بھی حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا کا تذکرہ ہے کعبہ شریف بناتے ہوئے جو دعائیں ان دونوں حضرات نے کی تھیں ان میں سے ایک یہ دُعا بھی ہے کہ اے ہمارے رب ان میں سے ایک رسُول مبعوث فرما۔ اس رسول سے خاتم النبیّین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جو عربی بھی تھے اور مکی بھی اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی نسل میں سے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے سب انہی کی نسل میں سے تھے اور حضرت سرورِ عالم خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سب بنی اسحٰق تھے اور صرف آپ ہی بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ مفسر ابن کثیر نے ص ۱۸۴ ج ۱ مسند امام احمد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا ابتدائی تذکرہ اولاً کیسے شروع ہوا آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری والدہ نے جو خواب دیکھا کہ اُن کے اندر سے نور نکلا ہے جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا۔ میں اس خواب کا مظہر ہوں یہ حدیث صاحبِ مشکوٰۃ نے بھی ص ۵۱۳ شرح السنہ سے نقل کی ہے اِس میں یوں ہے کہ میں اپنی والدہ کے خواب کا مظہر ہوں جنہوں نے وضعِ حمل کے وقت دیکھا تھا اُن کے لئے ایک نور روشن ہوا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔ حدیث نقل کر کے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مطلب یہ کہ سب سے پہلے جنہوں نے میرا تذکرہ کیا اور لوگوں میں مجھے مشہور کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ تذکرہ دُعا کی صورت میں تھا۔ ذکر مشہور ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے جو آخری نبی تھے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہوں نے آپ کا نام لیکر بشارت دی اور بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا: يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيلَ اِنِّى رَسُولُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (کہ اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں۔ میرے سامنے جو توراۃ ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایک ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا)۔

زمانہ حمل میں آپ کی والدہ نے خواب دیکھا تھا کہ ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنا خواب اپنی قوم کو سنایا جو لوگوں میں مشہور ہو گیا اور یہ آپ کی تشریف آوری کے لئے ایک بہت بڑی تمہید تھی۔

آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا جن کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام نے جن کی بشارت دی تھی۔ آپ کا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت ختم فرما دی اور سارے عالم کے انسانوں کے لئے رہتی دُنیا تک آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیج دیا اور سورۂ احزاب میں آپ کے خاتم النبیّین ہونے کا اعلان فرما دیا اور آپ نے لا نَبِیَّ

بَعْدِیْ (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اور ختم بی النبیّون (مجھ پر نبیوں کی آمد ختم ہوگئی) اور إن الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبیّ (بلاشبہ نبوت ختم ہوگئی اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ نبی ہے)۔ (سنن ترمذی)

اعلان فرمایا۔ آپ کی نبوت اور رسالت عامہ کا اعلان فرمانے کے لئے سورۂ اعراف میں یوں ارشاد فرمایا: قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔

(آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں)

جس رسول کے آنے کی دُعا کی اس کی صفات...... حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی نسل میں سے جس رسول کے مبعوث ہونے کے لئے دُعا کی تھی اس کی صفات میں یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ اور یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ فرمایا تھا۔ سورۂ آلِ عمران (ع ۱۸) میں بھی آپ کی یہ صفات مذکور ہیں اور سورۂ جمعہ میں بھی آپ کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرمائے تھے۔ آپ نے ان کو پوری طرح سے انجام دیا۔

تلاوتِ کتاب...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت میں سُورۂ بقرہ میں اوّل تو یہ فرمایا کہ، یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ کہ وہ نبی لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت فرمائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا اور سننا اور سنانا، تلاوت کرنا صحیح طریقہ پر ادا کرنا بھی مطلوب اور مقصود ہے۔ بہت سے جاہل جو تلاوت کا انکار کرتے ہیں اور بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح رَٹنے سے کیا فائدہ؟ یہ لوگ کلام الٰہی کا مرتبہ اور مقام نہیں سمجھتے دُشمنوں کی باتوں سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ قرآن مجید کو لوگوں کے آپس کے خطوط پر اور انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں اور اپنی جہالت سے یوں کہتے ہیں کہ قرآن کے معانی اور مفاہیم کا سمجھنا کافی ہے۔ اس کا پڑھنا اور یاد کرنا ضروری نہیں۔ (العیاذ باللہ) یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ قرآن مجید کے الفاظ کو محفوظ رکھنا فرضِ کفایہ ہے۔ صحیفوں پر اعتماد کئے بغیر سینوں میں یاد رکھنا لازم ہے تا کہ اگر مطبوعہ مصاحف (العیاذ باللہ) معدوم ہو جائیں تب بھی قرآن شریف اپنی تمام قراءتوں کے ساتھ محفوظ رہ سکے۔

تلاوتِ قرآن کے فضائل...... نیز قرآنِ مجید کی تلاوت میں بہت بڑا ثواب ہے، سمجھ کر پڑھے یا بے سمجھے پڑھے، تلاوت پر اجر عظیم ملتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جسے قرآن نے میرے ذکر سے اور مجھ سے مانگنے سے مشغول کرلیا میں اُسے اُس سے افضل عطیہ دوں گا جو مانگنے والوں کو دوں گا اور کلام اللہ کی فضیلت دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہے جیسی اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ایک حرف پڑھا اس کے بدلہ میں ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس گنی ہو کر ملتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے (بلکہ) الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (صرف الم کا تلفظ کرنے سے تیس نیکیاں مل جائیں گی) (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح)

معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن کو طوطے کی طرح رَٹنے سے تشبیہ دینا سخت گمراہی ہے۔ جس کی تلاوت کرنے سے ہر حرف پر ایک نیکی ملتی ہو اور ہر نیکی کی دس نیکیاں بن جاتی ہوں اُس کی تلاوت طوطے کی طرح رَٹنی لگانے کے برابر کیسے ہوئی۔ درحقیقت قرآن کی تلاوت مُستقل کام ہے اس کے الفاظ کو محفوظ رکھنا مُستقل ذمہ داری ہے اور اس کی تفسیر کو صحابہ اور تابعین کے طریقے پر محفوظ رکھنا اور بیان کرنا مُستقل کام ہے۔ اور اس کے معانی مفاہیم کو سمجھنا اور اس سے احکام کا استنباط کرنا مستقل عمل ہے۔ یہ سب چیزیں ضروری ہیں اُمت ان کی مکلّف ہے۔

جولوگ اس پر زور دیتے ہیں کہ الفاظ کے پڑھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت نہیں یہ لوگ نصاریٰ اور یہود سے بھی عبرت نہیں لیتے ان لوگوں نے اپنی کتابوں کے الفاظ کو محفوظ نہ رکھا تو اپنی کتابوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی کتابوں کے ترجمے تو دنیا کی زبانوں میں ملتے ہیں مگر اصل کتاب مفقود ہے۔ ترجمہ صحیح ہے یا غلط اس کے میاان کے لئے ان کے پاس اصل کتاب نہیں ہے اور یہیں سے اُن کے یہاں تحریف کا راستہ بھی نکل آیا۔ جب اصل کتاب موجود نہیں تو جس کا جو جی چاہے ترجمہ کر سکتا ہے۔

مسجد نبوی ﷺ میں ایک صاحب سے احقر کی ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے کہا کہ میں نے اپنے بچہ کو قرآن مجید حفظ کرنے میں لگایا ہے لیکن میرے ایک اُستاذ آئے تھے اُنہوں نے کہا کہ اب قرآنِ حفظ کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ قرآن مجید کمپیوٹر میں آ گیا ہے۔ احقر نے اُن سے کہا کہ تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے کیا کمپیوٹر محرابوں میں رکھ دیا جائے گا؟ اور دنیا بھر کے دیہات میں ایک ایک گاؤں میں پانچ چھ سات مسجدیں ہیں کیا گاؤں والے ہر مسجد کے لئے کمپیوٹر خریدیں گے اور کمپیوٹر سیکھنے کے لئے اپنے دیہاتی آدمیوں کو سکھانے والوں کے پاس بھیجیں گے؟ حفظ کی ضرورت صرف اسی لئے نہیں ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ فلانی آیت کس سورت میں ہے اور پوری آیت کس طرح سے ہے۔ قرآن کا تلاوت کرنا اور سُننا اور سُنانا اور اپنی زُبانوں اور کانوں کو اس میں مشغول رکھنا بہت بڑا عملِ صالح ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ قرآن مجید اور حدیث شریف کو نہیں جانتے اور ایمانی تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں وہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی باتوں سے متاثر ہو کر الفاظِ قرآنیہ سے محروم ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ایمانی سمجھ دے اور اہلِ شر کے شر سے بچائے۔

کتاب اور حکمت کی تعلیم ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دُوسرا کام ذکر کرتے ہوئے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فریضہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ بھی سکھائیں اور معانی بھی سمجھائیں۔ عربی زبان جاننا قرآن کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر وہی معتبر ہے جو رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور جو حضرات صحابۂ کرامؓ نے سیکھی پھر اُن سے تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین سے ہوتے ہوئے اُمت تک پہنچی۔ سورۂ نحل میں فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (اور ہم نے آپ کی طرف ذِکر نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے لئے وہ بیان کریں جو ان کی طرف تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا گیا) آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تھوڑی بہت عربی جان کر قرآن شریف کے معانی اور مفاہیم اپنی طرف سے بتانے لگے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تفسیر سے بے نیاز ہو کر گمراہ ہو رہے ہیں اور گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جہالت اور گمراہی سے کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا خط ہے۔ جو مخلوق کی طرف بھیجا گیا اور رسول کی حیثیت محض ایک ڈاکیے کی ہے۔ ڈاکیے کا کام خط پہنچا دینا ہے۔ خط پڑھ کر سنانا، سمجھانا اس کا کام نہیں۔ قرآن مجید نے تو اپنے بارے میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ یہ اللہ کا خط ہے جو مخلوق کی طرف آیا ہے اس کو خود ہی سمجھ لینا اور اس کے لانے والے سے مت سمجھنا، بلکہ قرآن نے تو رسول اللہ ﷺ کے فرائض میں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بتایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان سے نکال کر قرآن سمجھنا کفر کی دعوت اور اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ اُمت مرحومہ کو ان لوگوں کے فریب سے محفوظ فرمائے۔

آیت شریفہ میں الکتاب اور الحکمۃ دو لفظ مذکور ہیں اور دونوں کی تعلیم دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کے فرائض میں شمار فرمایا ہے۔ مفسر بغوی معالم التنزیل ص ۱۱۶ ج ۱ میں لکھتے ہیں کہ الکتاب سے قرآن مجید مُراد ہے اور الحکمۃ سے مجاہد کی

تفسیر کے مطابق فہم القرآن مراد ہے اور بعض حضرات نے اس سے احکام قضاء مراد لئے ہیں اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیر العلم و العمل سے کی ہے۔ صاحب روح المعانی نے ص ۳۸۷ ج ابعض مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ الحکمة سے کتاب اللہ کے حقائق و دقائق اور وہ سب چیزیں مراد ہیں جن پر قرآن مجید مشتمل ہے۔ اس صورت میں تعلیم کتاب سے مراد اس کے الفاظ سمجھانا اور اس کی کیفیت ادا بیان کرنا مراد ہے اور تعلیم الحکمۃ سے اس کے معانی اور اسرار اور جو کچھ اس میں ہے اس سے واقف کرانا مراد ہے اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیر یوں کی ہے۔ ما تكمل به النفوس من المعارف و الاحكام یعنی وہ تمام معارف اور احکام جن سے نفوس کی تکمیل ہوتی ہے حکمت سے وہ سب مراد ہیں۔

درحقیقت حکمت کے جو معانی حضرات مفسرین نے بتائے ہیں وہ ایک دوسرے کے معارض اور منافی نہیں ہیں مجموعی حیثیت سے اُن سب کو مراد لیا جا سکتا ہے۔

تزکیۂ نفوس...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی وَیُزَکِّیهِمْ بیان فرمایا۔ لفظ یُزَکِّی تزکیه سے مضارع کا صیغہ ہے۔ تزکیہ لغت میں پاک صاف کرنے کو کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کا پڑھا دینا اور سمجھا دینا ہی نہیں بلکہ نفوس کا تزکیہ بھی آپ کے فرض منصبی میں داخل تھا۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ میں تحلية النفوس بالفضائل اور یزکیهم میں تخلية النفوس عن الرذائل کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو توحید خداوندی سے آراستہ کیا اور کفر اور شرک کی نجاست سے پاک کیا۔ ایمان اور یقین دیا۔ شک سے بچایا۔ گناہوں کی گندگی سے دُور کیا۔ نفوس کے رذائل دُور کئے۔ اخلاقِ عالیہ اور اعمالِ صالحہ بتائے اور عمل کر کے دکھایا۔ گناہوں کی تفصیل بتائی ان کے اثرات ظاہرہ، باطنہ، دنیویہ، اُخرویہ سے باخبر فرمایا۔ نیکیوں کی تفصیلی فہرست بتائی اور اُن کے منافع دنیویہ اور اخرویہ سے مطلع فرمایا۔ حسد، بخل، کینہ، تکبر، حرص، لالچ، حُبِّ جاہ کی مذمت فرمائی۔ حُبِّ فی اللہ اور تواضع اور فروتنی، صلہ رحمی، سخاوت، ضعیف کی مدد، بڑوں کی خدمت، یتیم کے ساتھ رحم دلی، تقویٰ، اخلاص، اکرام اہلِ ایمان، نرمی، حسن الجوار، غصہ پی جانا وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی۔ انسان کو انسان بنایا حیوانیت اور بہیمیت سے بچایا۔ آپ نے فرمایا کہ بعثت لاتمم حسن الاخلاق (کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) رواه مالک فی المؤطا۔

نفوس کا تزکیہ صرف زبانی طور پر بتا دینے سے نہیں ہو جاتا اس کیلئے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لئے انسانوں ہی میں سے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے تاکہ وہ عملی طور پر ان کا تزکیہ کر سکیں اور تاکہ اُن کی صحبت سے انسانوں کے نفوس خیر کی طرف پلٹ سکیں اور اعمالِ صالحہ کے خُوگر ہو جائیں اور نفوس کی شرارتوں کو سمجھ سکیں اور اُن سے بچ سکیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اس آیت شریفہ میں سچوں کے ساتھ ہونے کی تعلیم فرمائی ہے جو لوگ اپنے اخلاص اور عمل میں سچے ہیں ان کے ساتھ رہنے سے طبیعت اعمالِ صالحہ کی طرف راغب ہوتی ہے اور نفس و شیطان کی مکاریوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے پھر ان کا توڑ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے جس کسی کی صحبت اختیار کرے پہلے دیکھ لے کہ وہ متبع سنت ہے یا نہیں؟ اس میں فکرِ آخرت کتنی ہے؟ اور حب دنیا اور جلب زر کے لئے تو مرشد بن کر نہیں بیٹھا، جس کسی کو متبع سُنّت اور آخرت کا فکرمند پائے اس کی صُحبت اُٹھائے، مال و جاہ کا حریص مصلح اور مُرشد نہیں ہو سکتا اس کی صُحبت میں رہنا زہرِ قاتل ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى

اور ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کریگا جس نے اپنے نفس کو احمق بنایا، اور بے شک ہم نے ان کو منتخب کر لیا

الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ

دنیا میں، اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہیں۔ جب فرمایا اُن کے رب نے کہ فرمانبردار ہو جا، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں

لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

رب العالمین کا فرمانبردار ہوں۔

ملّتِ ابراہیمی سے وہی اعراض کرے گا جو احمق ہو

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملّت میں توحید الٰہی پر جینے اور مرنے کا حُکم ہے اور شرک سے بیزاری ہے۔ ظاہری باطنی نظافت اور طہارت ہے، مہمانی ہے، قربانی ہے، اللہ کی عبادت ہے اور فرمانبرداری ہے، انابت الی اللہ ہے، صحیح انسانیت کی تعلیم ہے اُن کی ملّت کا اتباع کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

(پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کیجئے جو باطل دینوں کو چھوڑ کر حق ہی کی راہ پر چلنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل اتمام کلمات، اور اُن کو لوگوں کا پیشوا بنانے کا اعلان، اور ان کے کعبہ بنانے، اور قبولیت کی دُعائیں کرنے، اور اپنی نسل میں سے نبی آخرالزماں کی بعثت کی دُعا مانگنے کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہورہا ہے کہ ملّتِ ابراہیمی سے وہی شخص بے رغبت ہوسکتا ہے اور اُن کی ملّت سے وہی روگردانی کرسکتا ہے جو عقل سے کورا ہو اور جس نے اپنے نفس کو بالکل ہی احمق بنا دیا ہو، کوئی سلیم الفطرت عقل مند انسان اُن کی مِلّت سے انکاری نہیں ہوسکتا۔

ملتِ ابراہیمی اس وقت ملّتِ محمدیہ میں منحصر ہے اور آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے داعی ہیں۔ جو لوگ اس سے بیزار ہیں وہ لوگ مُشرک، بُت پرست، بے حیا، بے شرم، بداخلاق، بداعمال، دھوکے باز اور زمین میں فساد کرنے والے اور قوموں کو لڑانے والے ہیں اور جس قدر بھی دُنیا میں قبائح اور خراب کام ہیں سب انہیں لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو ملّت ابراہیمی سے ہٹے ہوئے ہیں (گو کمزور ایمان والے مسلمانوں میں بھی معاصی ہیں لیکن اوّل تو انہیں گناہ سمجھتے ہوئے کرتے ہیں اور دوسرے توبہ کرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں گناہ بھی حماقت ہی سے ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں فرمایا: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (الآیہ) مسلمین اہل معاصی کی حماقت ان لوگوں کی حماقت سے بہت زیادہ کم ہے جو کفر اور شرک پر جمے ہوئے ہیں اور ملّت ابراہیمی کو قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔

یہ بتانے کے بعد کہ ابراہیم کی ملت سے وہی روگردانی کرے گا جس نے اپنی جان کو بے وقوف بنا دیا ہو یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چُن لیا اور برگزیدہ بنالیا۔ دُنیا میں ان کی فضیلت اور برتری سب پر ظاہر ہے سب قومیں اُن کی فضیلت کی قائل ہیں اور اُن کے

بعد جو بھی کوئی نبی آیا ہے انہیں کی نسل اور ذریت میں سے آیا ہے اور سب ان کو مانتے ہیں اور اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اُن کو دشمن نے آگ میں ڈالا، اللہ تعالیٰ نے وہ آگ اُن کے لئے گلزار بنادی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کعبہ تعمیر کرایا اس وقت سے لے کر آج تک کعبہ شریف کا حج ہوتا ہے اور اُن کو جو مناسک حضرت جبریل علیہ السلام نے بتائے تھے، اُن پر برابر عمل ہو رہا ہے، انہوں نے جو بیٹے کی قربانی کی تھی اس قربانی کے اتباع میں کروڑوں قربانیاں ہر سال پُورے عالم میں ہوتی ہیں، درود ابراہیمی میں اُن کا ذکر ہے۔ اُمت محمد یہ جس کا نام اُنہوں نے مسلمین رکھا تھا (کمافی سورۃ الحج) وہ اُن کی ملت کی اتباع کرنے والی ہے اور اُن کی یادگار ہے۔ پھر فرمایا: وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوں گے) ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ ثابت قدم صاحبِ استقامت اور خیر اور صلاح سے متصف ہونے والوں میں شُمار ہوں گے وہاں بھی اُن کی رفعت ہوگی جیسا کہ دُنیا میں ان کی فضیلت مشہور و معروف ہوئی۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں: ای المشھود لھم بالثبات علی الاستقامة والخیر والصلاح اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: وذٰلک من حیث المعنی دلیل مبین لکون الراغب عن ملة ابراھیم سفیھا الاصطفاء والعز فی الدنیا غایة المطالب الدنیویة والصلاح جامع للکمالات الاخرویة ولامقصد للانسان الغیر السفیه سوی خیر الدارین۔ یعنی ان کی خیر و صلاح اور ثبات علی الاستقامۃ میں اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جو شخص ملّتِ ابراہیمی سے منحرف ہوا وہ واقعی بیوقوف ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ بننا اور معزز ہونا دُنیاوی مطلوبات کا آخری مقام ہے اور صلاح کمالات اُخرویہ کو جامع ہے، اور سمجھ دار آدمی کے لئے دونوں جہان کی خیر سے بڑھ کر کوئی مقصد نہیں (ناسمجھ یعنی بیوقوف ہی ان مقاصد عالیہ سے منحرف ہوسکتا ہے)۔

اِسلام کا معنی اور مفہوم ...... پھر فرمایا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یعنی جب ان کے رب نے ان سے کہا کہ فرمانبردار ہو جا تو اُنہوں نے عرض کیا میں ربّ العالمین کا فرمانبردار ہوں)

لفظ اسلام کا مادہ سین۔ لام۔ میم ہے۔ جب یہ مادہ باب افعال میں مستعمل ہوتا ہے تو حکم ماننے فرمانبرداری کرنے اور حکم کے سامنے جھک جانے اور ظاہر اور باطن سے فرمانبردار ہو جانے پر دلالت کرتا ہے، اس کا صیغہ اسم فاعل مسلم ہے جس کی جمع مسلمون اور مسلمین ہے۔ اللہ جل شانہٗ خالق اور مالک ہیں سب اس کے بندے ہیں۔ بندہ اپنے خالق کا فرمانبردار ہو اس سے بڑھ کر اس کی کوئی سعادت نہیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دُعا کرتے جا رہے تھے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ (کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہم کو اُن لوگوں سے بنا دے جو تیرے فرمانبردار ہیں) اور ساتھ یہ بھی دعا کی وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (کہ ہماری ذرّیت میں سے بھی ایک اُمت مسلمہ بنا دے) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے فرمایا کہ اپنے رب کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ تو اُنہوں نے عرض کیا کہ میں اپنے رب کا فرمانبردار ہوں۔ فرمانبردار تو وہ تھے ہی فرمانبرداری پر ثابت قدم رہنے کے لئے حکم ہوا اور اُنہوں نے ہمیشہ فرمانبردار رہنے کا اقرار کیا اور یہ بتا دیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے رب کا فرمانبردار رہوں۔ لفظ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ کر یہ بات ظاہر کر دی کہ چونکہ وہ ربّ العالمین ہے اس لئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم ہی لازم ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا وہ اپنے مخلوق ہونے کا فرضِ منصبی ادا کرے گا۔ سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ سورۃ آلِ عمران میں فرمایا: اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ

(کیا اللہ کے دین کے سوا دوسرا دین چاہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے سب فرمانبرداری کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور سب اُس کی طرف لوٹیں گے) ساری مخلوق پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کی اطاعت کریں۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام امتحانات میں کامیاب ہوئے ہر مرحلہ سے گزرتے گئے اور اطاعت وفرمانبرداری ہی کو اختیار کئے رہے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا یہی مقصد تھا کہ وہ سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ شانہٗ کی فرمانبرداری کی طرف بلائیں، تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام تھا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانیں اور شرک سے بیزار ہوں اور احکام الٰہیہ کی تعمیل کریں اور ہر طرح سے فرمانبردار ہوں۔ گو احکام فرعیہ میں اختلاف بھی رہا۔ لیکن اصول میں سب متحد اور متفق تھے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الانبیاء اخوۃ من علات و امھاتھم شتی و دینھم واحد. (رواہ البخاری ومسلم کمافی المشکوٰۃ ص ۵۰۹)

اُن کی اپنی اپنی زبانوں میں اس دین کے لئے جو بھی لفظ اختیار کیا گیا ہو، ہمارے رسول حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ عربی تھے اور ان پر کتاب بھی عربی میں نازل ہوئی اِس لئے لفظی اور معنوی طور پر اُن کے دین کا نام اسلام ہی ہے اور یہ لفظ جہاں فرمانبرداری کے معنی دیتا ہے وہاں اپنے مادہ کے اعتبار سے اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ حقیقی سلامتی دینِ اسلام ہی میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم کو جو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تھا اُس میں تحریر فرمایا تھا اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰهُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ (تو اسلام قبول کر سلامت رہے گا اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا)۔ (صحیح بخاری ص ۵ ج ۱)

حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام نے جو اُمت مسلمہ کے لئے دُعا کی اس کی قبولیت کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ وجود میں آ گئی اور اس امت کے اعیان واشخاص وافراد کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''مسلمین'' رکھ دیا تھا۔ (حیث قال فی دعائہ امّۃ مسلمۃ لک)

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام اسلام ہے دعوت بھی فرمانبرداری کی ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام پورا کر دیا اور میں نے اسلام کو دین کے اعتبار سے تمہارے لئے پسند کر لیا) اور فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (کہ بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) اور فرمایا: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ. (اور جو اسلام کے سوا کسی دُوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا) پس مسلمانوں کا دین لفظاً و معنًی سراپا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری ہے۔ زندگی کے آخری لمحات تک فرمانبردار رہنے کا حکم ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

(اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت میں مت مرنا)

معلوم ہو گیا کہ مسلمان کا کام بس یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے بغیر چوں چرا اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل پیرا ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے کیونکہ رسول اللہ کی اطاعت، اللہ ہی کی اطاعت ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ بہت سے لوگ اپنے دعویٰ میں تو مسلمان ہیں لیکن دِل سے مسلمان نہیں۔ وہ اپنی عقل سے اسلام کی باتوں کو رد

کرتے ہیں اور دشمنانِ اسلام کی صحبتوں سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلام کو اپنے نظریات کے تابع بنانا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ حقائق ایمانیہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام والے نہیں (اگرچہ مسلمان ہونے کے مُدعی ہیں) ایسے لوگ ملّت ابراہیمہ سے منحرف ہیں۔

دینِ اسلام کے علاوہ ہر دین مَردود ہے

شاید کوئی ناسمجھ یہ اعتراض کرے کہ جب خالق و مالک کی فرمانبرداری ہی مطلوب ہے تو دینِ اسلام قبول کرنے کی ضرورت کیا ہے جس دین پر بھی کوئی شخص ہو اور اس دین میں رہتے ہوئے (اللہ تعالیٰ کی) فرمانبرداری کرے تو مقصود حاصل ہو گیا اور وہ مستحق نجات ہوگا۔ اس جاہلانہ سوال کا جواب یہ ہے کہ خالق و مالک نے اُسی کو فرمانبردار قرار دیا ہے جو اُس کے بھیجے ہوئے دین کے مطابق اس کی فرمانبرداری کرے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ میں آتے رہے ان پر ایمان لانا فرض تھا اور اُن کی کتابوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لانا فرض تھا اور قیامت پر ایمان لانا بھی اُن تفصیلات کے ساتھ فرض تھا جو انہوں نے بتائیں۔ اللہ کے کسی نبی سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے۔ کسی بھی نبی کا انکار اور اللہ کی کسی کتاب کا انکار کفر ہے، کفر سب سے بڑی نافرمانی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت اور کوئی فرمانبرداری معتبر نہیں سب سے آخر میں خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لانا ہر انسان پر فرض ہے جو شخص آپ کے لائے ہوئے دین سے اور آپ کی لائی ہوئی کتاب سے اور آپ کی نبوت اور رسالت سے منحرف ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا باغی اور نافرمان ہوگا۔ لہٰذا اس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں۔ اس بارے میں آیاتِ قرآنیہ ہم گزشتہ صفحہ پر پیش کر چکے ہیں۔

اسلام کے علاوہ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں کفر تو ان سبھی میں ہے اور اُن میں اکثر مشرکین ہیں اور بہت بڑی بھاری تعداد میں وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ یہ سب کیسے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو سکتے ہیں؟ پھر ان لوگوں میں بے شرمی، بے حیائی، سُود خوری، رشوت ستانی، اور زناکاری اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ یہ کسی طرح بھی فرمانبرداری کے دائرہ میں نہیں آسکتے، ہندوؤں اور بدھسٹوں کے پیشوا تو لنگوٹی باندھے ہوئے عام مخلوق کے سامنے آجاتے ہیں یورپ اور امریکہ کے لوگ اور ان کی تقلید کرنے والے جہاں کہیں بھی ہیں حتیٰ کہ ان کے مذہبی مقتدا اور سیاسی زعما بداعمالی اور بدکرداری میں لت پت ہیں۔ ان لوگوں کو خداوند قدوس کی فرمانبرداری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ جس قوم میں زناکاری عام ہو اور اُن کے عقیدہ میں اتوار کے دن چرچ میں پوپ کے معاف کر دینے سے گناہ معاف ہو جاتے ہوں اور چھوٹے پوپ کے گناہ بڑا پوپ معاف کر دیتا ہو وہ خداوند قدوس کے حُکم کے فرمانبردار نہیں ہو سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انجیل شریف کی تحریف کی اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ آپ کی ذات گرامی پر اعتراضات کئے اور کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خداوند قدوس کے نافرمان اور سراپا نافرمان ہیں ان میں جو کوئی شخص راہب ہے اور اپنے خیال میں خُداوند قدوس کی عبادت کرتا ہے۔ اس کی رہبانیت اور عبادت سب بیکار ہے اور ضائع ہے، بھسم ہے اور راکھ کا ڈھیر ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ

اور ملت ابراہیمیہ کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی، اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے منتخب فرمایا ہے تمہارے لئے اس دین کو، سو ہرگز

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ

مت مرنا مگر اس حالت میں کہ تم دین اسلام پر ہو۔ کیا تم حاضر تھے جس وقت آنے لگی یعقوب کو موت، جبکہ اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے

لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ ۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ

کہا کہ کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟ اُنہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم ، اسمٰعیل اور اسحٰق کے

اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۞

معبود کی ، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

ملّتِ ابراہیمی علیہ السلام کی وصیت

یعنی ملّت ابراہیمیہ کی وصیت کی ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے اپنے بیٹوں کو اور اُنہوں نے فرمایا کہ اے بیٹو! تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمیہ کو منتخب فرمادیا ہے۔ جس میں اخلاص ہے اور احکام الٰہیہ کا انقیاد ہے اور سراپا فرمانبرداری ہے۔ اس دین کو کبھی بھی مت چھوڑنا، مرتے وقت تک اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی پر قائم رہنا کہ تم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو۔ علامہ واحدی اسباب النزول میں لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یعقوب نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں کو یہ وصیّت کی تھی کہ تم یہودیت پر قائم رہنا اُن کی اس بات کی تردید میں آیت بالا نازل ہوئی کہ تم لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف یہ بات کیسے منسوب کرتے ہو کہ اُنہوں نے موت کے وقت یہودیت کی وصیّت کی تھی کیا تم اُن کی موت کے وقت ان کے پاس موجود تھے؟ اُن کی موت کے سینکڑوں سال کے بعد تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی جن کے دین کو تم یہودیت سے تعبیر کرتے ہو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کو بھی صدیاں گزر گئیں۔

اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی وصیت کی تھی تمہارے دعویٰ کی نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی گواہ ہے اور یہودیت ان کے زمانہ میں تھی بھی نہیں پھر اُنہوں نے بیٹوں کو کیسے اس کی وصیت کردی؟ انہوں نے تو توحید کی وصیت کی جس پر ملّت ابراہیمیہ مشتمل ہے اور جو ملتِ ابراہیمیہ کا رکن اعظم ہے اُن کے بیٹے سراپا مطیع اور فرمانبردار تھے اور توحید خالص اُن کا دین تھا جب اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو ان سب نے جواب میں کہا کہ ہم اسی ذات پاک کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود اور آپ کے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام کا معبود ہے۔ اور معبود صرف وہی ایک ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں اور طاعت گزار ہیں اور ہم اسی دین پر رہیں گے اور مریں گے۔ درحقیقت جب عصبیت جاہلیہ کسی فرد یا قوم یا جماعت کے دِلوں میں جگہ پکڑ لے تو حق اور ناحق کی تمیز ختم ہوجاتی ہے اور ایسے لوگ صرف اپنے نفسانی عقائد و اعمال کے پیچھے چلتے ہیں تدبّر اور تفکّر سے محروم ہوجاتے ہیں۔ کہاں ابراہیم اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام کا دین جو توحید الٰہی پر مشتمل تھا اور جس میں سراپا خداوند قدوس کی فرمانبرداری تھی اور کہاں یہودیوں کا وہ دین جس پر وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے۔ جس میں حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں ابن اللہ ہونے کا عقیدہ بھی تھا اور جس میں حق کا چھپانا بھی تھا اور جس میں حضرت عیسیٰ رسول اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور توریت شریف کی تحریف اور رشوت خوری اور سُود خوری تھی جو آج تک بھی یہودیوں

کے اندر باقی ہے۔

فائدہ ۔۔۔۔۔ (۱) ۔۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام اور دوسرے بیٹے اسحٰق تھے اور یعقوب اسحٰق کے بیٹے تھے۔ اسمٰعیل یعقوب کے والد نہ تھے پھر بھی اُن کے آباء کے عموم میں شامل فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ چچا پر بھی باپ کا اطلاق کرنا جائز ہے۔ تفسیر رُوح المعانی میں مصنف ابن ابی شیبہ سے حدیث مرفوع نقل کرتے ہیں: واحفظونی فی العباس فانہ بقیۃ آبائی. (ص ۳۵۱ ج ۱) کہ تم عباس کے بارے میں میرے تعلقات کی حفاظت کرو کیونکہ وہ میرے آباء کا بقیہ ہیں۔

فائدہ ۔۔۔۔۔ (۲) ۔۔۔۔ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو جہاں اپنے دین کے لئے فکرمند ہونا ضروری ہے۔ وہاں یہ بھی لازم ہے کہ اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کیلئے اس بات کا فکرمند ہو کہ وہ توحید پر قائم رہیں اور دینِ اسلام پر جئیں۔ اور ہمیشہ اللہ کے فرمانبردار رہیں برخلاف اسکے اپنی اولاد کو ایسے ممالک میں بھیجنا یا لے جانا جہاں وہ دین خداوندی پر باقی نہ رہ سکیں یا ایسی درسگاہوں میں ان کو علم پڑھانا جہاں وہ اپنے دین کو کھو بیٹھیں یہ اُنکے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ جو لوگ اپنے نماز روزے کا خیال کرتے ہیں اور اولاد کو کفر اور فسق و فجور کے ماحول میں دھکیل دیتے ہیں اور وہ اس ماحول کو ان کیلئے تقدم اور ترقی سمجھتے ہیں وہ بڑے ظالم ہیں۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا

وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لئے وہ ہے جو اُنہوں نے عمل کیا، اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے عمل کیا، اور تم سے اس چیز کا سوال نہ ہوگا

يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾

جو وہ کیا کرتے تھے۔

یہودیوں کے اس غرور کا جواب کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں

یہودیوں کو اس بات پر بہت غرور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اور ان کے نسل اور نسب میں ہونے کی وجہ سے ہم عذاب سے بچ جائیں گے اس آیت میں صاف صاف اس بات کی تصریح فرما دی کہ وہ حضرات اپنے اپنے عقائد اور اعمال لیکر دنیا سے چلے گئے اُنہوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے ساتھ ہے ان کے اعمالِ صالحہ ان کے کام آئیں گے اور تم نے جو کچھ کیا وہ تمہارے ساتھ ہے ان کے اعمال میں سے کوئی حصہ تمہیں نہ ملے گا دوسروں کے اعمال کی وجہ سے خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھے ہو جبکہ یہ آس اور اُمید قانونِ خداوندی کے خلاف ہے، تم اپنے عقائد اور اعمال اور کفر و ایمان کو دیکھو تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہو انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے پھر بھی نجات کی اُمید لگائے ہوئے ہو۔ یہ بہت بڑی جہالت ہے وہ حضرات سابقین جن سے تم انتساب رکھتے ہو ان کے اعمال کی تم سے پوچھ تک نہ ہوگی اور نہ اُن کا ذِکر تمہارے سامنے آئے گا ان کے اعمال کا تمہیں نفع پہنچنا تو دُور کی بات ہے۔

اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں بھی بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جو سید زادے، پیرزادے ہونے پر گھمنڈ کئے ہوئے ہیں تارکِ فرائض ہیں۔ مرتکب منہیات و محرمات ہیں بڑے بڑے گناہوں میں مُبتلا ہیں لیکن وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کی نسل اور نسب میں ہونے کی وجہ سے بخش دیئے جائیں گے اور بہت سے جعلی جھوٹے دنیا دار پیروں نے اپنے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ تم ہمارے

جھنڈے کے نیچے ہو گئے جس نے ہم سے بیعت کر لی بس وہ بخشا بخشایا ہے یہ سب فریب ہے گمراہی ہے قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ (صحیح بخاری ص ۷۰۲ ج ۲) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو اور اپنے اعزہ واقرباء کو پکارا۔ سب کو حق کی دعوت دی اور عمومی اور خصوصی خطاب فرمایا اس خطاب میں یہ بھی تھا کہ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، اور اے صفیہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور اے فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میرے مال سے جو چاہو سوال کر و میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنا دین اور ایمان اور عمل صالح اللہ کے ہاں کام آئے گا جو مؤمن نہ ہو گا اس کو میری رشتہ داری کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رشتہ داری کے بارے میں ایسا فرمادیا تو دوسروں کی کیا مجال ہے کہ وہ نسب کی بنیاد پر بخشے جانے کی اُمید رکھیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من بطأبه عمله لم يسرع به نسبه**۔ یعنی جس کا عمل دیر لگائے اُس کا نسب جلدی کر کے آگے نہیں بڑھا دے گا۔ (ص ۳۴۵)

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ

اور انہوں نے کہا کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تم ہدایت پا جاؤ گے، آپ فرمائیے بلکہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو جو پوری طرح حق ہی کی طرف تھے اور مشرکین میں

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۳۵ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ

سے نہ تھے تم لوگ کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم اور اسمٰعیل

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ

اور اسحٰق اور یعقوب پر، اور اُن کی اولاد پر اور اُس پر بھی جو عطا کیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو کچھ عطا کیا گیا دیگر انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے،

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۶

ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانے کا حکم

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن اسحاق وابن جریر وغیرہما حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن صوریا اعور (یہودی) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ ہدایت صرف وہی ہے جس پر ہم ہیں لہٰذا تم ہمارا اتباع کرو، ہدایت پا جاؤ گے اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے آیت وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (الآیۃ) نازل فرمائی۔ (ص ۱۴۰ ج ۱)

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اس کی دعوت دی اور نصاریٰ نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اس کی دعوت دی اللہ جل شانہٗ نے ان کی تردید فرمائی کہ تم ہدایت پر نہیں ہو تم اپنے اپنے دین کو چھوڑ دو اور ابراہیم حنیف کے دین کو اختیار کرو جس کے داعی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کے دین کا عالم اور شارح اور داعی آپ کے سوا کوئی نہیں ہے اُن کے دین میں توحید ہے حق پر استقامت ہے، قربانی ہے، ایثار ہے، اخلاص ہے اور تم میں سے کوئی بھی ملّتِ ابراہیمی کا متبع نہیں ہے۔ دینِ حق میں اللہ پر ایمان لانے

کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرض ہے کہ اس کی ساری کتابوں اور اس کے سارے نبیوں پر ایمان لایا جائے اور ایمان لانے میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔ اگر کسی ایک نبی کو بھی نبی نہ مانا تو سب کی تکذیب لازم آئے گی۔ اس صورت میں ہدایت پر ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو نہیں مانا اور یہود و نصاریٰ دونوں قوموں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا قرآن کو نہیں مانا پھر ہدایت پر کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خصوصی وصف لفظ حنیفاً میں بیان فرمایا اور یہ قرآن مجید میں کئی جگہ ان کے حق میں استعمال ہوا ہے اس کا مادہ ح۔ن۔ف ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں الحنف هو الميل عن الضلال إلى الاستقامة والحنيف هو المائل إلى ذلك. (ص ۱۲۳) یعنی حنف یہ ہے کہ گمراہی سے ہٹتے ہوئے حق پر استقامت ہو اور حنیف وہ ہے جس میں یہ صفت پائی جائے۔ تفسیر درمنثور (ص ۱۴۰ ج ۱) میں مسند احمد اور الادب المفرد (للبخاری) سے نقل کیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کو کون سا دین پسند ہے؟ آپ نے فرمایا الحنيفية السمحة یعنی وہ دین اللہ کو محبوب ہے جس میں باطل سے بچتے ہوئے حق کو اپنایا گیا ہو اور جس پر عمل کرنے میں دُشواری نہیں ہے (اس سے دین اسلام مراد ہے)

حنیفاً کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُوسری صفت بیان فرمائی یعنی وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اُن کی یہ صفت دُوسری آیات میں بھی ان الفاظ میں مذکور ہے۔ اس میں صاف اور واضح طور پر بتا دیا کہ ابراہیم علیہ السلام مُشرک نہیں تھے۔ جو بھی کوئی جماعت یا فرد مشرک ہوگا وہ دینِ ابراہیمی پر نہیں ہو سکتا مشرکین مکہ بھی اس بات کے مُدعی تھے کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پر ہیں۔ اُن کے اندر ختنہ کرنا، حج کرنا اور مہمان نوازی کرنا باقی تھا۔ لیکن ساتھ ہی مشرک بھی تھے۔ حج کے تلبیہ میں بھی شرک کے الفاظ بڑھا رکھے تھے اور کعبہ شریف میں بُت بھر رکھے تھے اور یہود و نصاریٰ نے بھی شرک اختیار کر رکھا ہے۔ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو خدا کا بیٹا بتاتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ملت ابراہیم کا اتباع کرو اور اُن کی ملت میں سب سے پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ توحید کے اقراری ہوں اور شرک کے اِنکاری ہوں۔

مذکورہ بالا آیت میں لفظ الاسباط جو آیا ہے یہ سبط کی جمع ہے اس سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد مراد ہے۔ ان میں سب تو نبی نہیں تھے لیکن ایک بڑی تعداد میں اُن میں انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ اسی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا:

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّالَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (ذكره حكاية عن موسىٰ عليه السلام في سورة المائدة)

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد بجز سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے بھی نبی آئے سب انہی کی اولاد میں سے تھے اور وہ حضرت اسحٰق کے بیٹے تھے (صلوات اللہ علیہم اجمعین) اُمت محمد یہ الحمد للہ اللہ کے تمام نبیوں پر اور اس کی ساری کتابوں پر ایمان رکھتی ہے سب کا ادب سے نام لیتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی عصبیت نہیں ہے۔ باوجود یکہ یہود و نصاریٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بے جا باتیں کرتے ہیں لیکن مسلمان کبھی بھی اُلٹ کر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی شان میں کوئی ناروا کلمہ نہ کہتے ہیں اور نہ کہہ سکتے ہیں اگر ایسا کریں گے تو ان کا ایمان جاتا رہے گا۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ

سو اگر وہ ایمان لے آئیں ان چیزوں پر جن [1] پر تم ایمان لائے تو وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ رُوگردانی کریں تو بس وہ مخالفت ہی میں لگے ہوئے ہیں

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

پس عنقریب اللہ آپ کی طرف سے ان کے لئے کافی ہوگا اور وہ سمیع ہے علیم ہے۔

اگر دُشمنانِ دینِ اسلام نہ لائیں تو وہ مخالفت پر ہی تُلے ہوئے ہیں

اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی ہے ارشاد ہے کہ اپنے اپنے دین کو ہدایت پر بتانے والے اگر اسی طرح مؤمن ہو جائیں جس طرح کے تم مؤمن ہو اور اُن سب چیزوں پر ایمان لائیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر وہ اعراض کریں اور اس ایمان سے رُوگردانی کریں جو اللہ کے نزدیک معتبر ہے اور جسے تم پیش کرتے ہو تو سمجھ لو کہ ان کو خواہ مخواہ کی ضد ہے حق قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے حق کی مخالفت پر کمر باندھی ہوئی ہے تھوڑا سا موقع ان کو مل رہا ہے اے نبی اللہ تعالیٰ عنقریب تمہاری طرف سے کفایت فرمائے گا اور اُن کے شر اور مکر و کید سے مستقل طریقہ پر تمہیں چھٹکارہ اور خلاصی دے گا۔ وہ ذلیل ہوں گے خوار ہوں گے دنیا و آخرت کی سزا میں مبتلا ہوں گے اللہ تعالیٰ سمیع ہے وہ ان کی سب باتیں سنتا ہے اور علیم بھی ہے جو اُن کی سب باتوں کو جانتا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور وہ کون ہے جس کا رنگ دینا اللہ تعالیٰ کے رنگ دینے سے اچھا ہو اور ہم اُسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے

علامہ واحدی نے اسباب النزول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ کا یہ طریقہ تھا کہ جب اُن کا کوئی بچہ سات دن کا ہو جاتا تھا تو اُسے پانی میں رنگ دیتے تھے اور اس پانی کو معمودی کہتے تھے۔ مقصد اُن کا یہ تھا کہ اس طرح سے اُسے پاک کر دیں۔ اور (چونکہ ختنہ نہیں کرتے تھے) اس لئے کہتے تھے کہ یہ عمل ختنہ کی جگہ ہے جس سے طہارت حاصل ہو گئی جب یہ کام کر لیتے تھے تو سمجھتے تھے کہ اب پکا نصرانی ہو گیا۔ اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور بتا دیا کہ صحیح رنگ وہی ہے جس رنگ میں اللہ نے اپنے مؤمن بندوں کو رنگ دیا۔ اصل رنگ ایمان کا رنگ ہے اور اعمالِ صالحہ کا رنگ ہے اور اللہ کے علاوہ وہ کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ کے رنگ دینے کی حالت سے اچھی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ مؤمن بندے اعلان کر دیں کہ ہمارے دِل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان رچا دیا ہے اور اعمالِ صالحہ سے ہم کو آراستہ فرما دیا، ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہم کو جو استقامت بخشی ہے ہمارا رنگ یہی ہے اور ہم اسی رنگ میں رنگے

---

۱) ترجمہ علی ان "مثل" زائدۃ کمال فی تفسیر الجلالین ۱۲ ــــــ قال صاحب معالم التنزیل ای بما آمنتم به و کذلک کان یقرءها ابن عباس والمثل صلة کقوله تعالیٰ لیس کمثله شیء ای لیس هو کشیء وقیل معناه فان امنوا بجمیع ما امنتم به أی اتو بایمان کایمانکم و توحید کتوحیدکم، وقیل معناه فان امنوا مثل ما امنتم والباء زائدۃ (ص۱۲۰ ج۱)

ہوئے ہیں۔ ہم ایمان اور اعمالِ صالحہ کے رنگ کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں اس سے اچھا کوئی رنگ نہیں ہے اللہ نے ہمیں رنگ دیا ہے اور ہم اسی رنگ میں خوش ہیں۔ ہم اللہ کی توحید پر جیتے اور مرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ صاحب تفسیر جلالین فرماتے ہیں صبغة الله مصدر مؤكد لـآمـنـا ونصبه بفعل مقدر أى صبغنا الله والمراد بها دينه الذى فطر الناس عليها لظهور أثره على صاحبه كالصبغ ۔

نصرانی معمودی نام کے پانی میں رنگنے سے اپنے بچوں کو اپنے باطل خیال میں پاک کرتے تھے اور اب بھی جس کو نصرانی بناتے ہیں بپتسمہ دیتے ہیں اور خاص پانی میں نہلاتے ہیں، کفر کے ساتھ باطن پاک ہو ہی نہیں سکتا، ظاہری پانی تطہیر باطن کا کام دینے والا نہیں ہے۔

آیت شریفہ میں مؤمنین کو ایمان پر استقامت کا حکم بھی ہو گیا اور نصاریٰ کی تردید بھی ہو گئی۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ

آپ فرمائیے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے اور ہم اللہ تعالیٰ

لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

کے لئے اخلاص والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ سے فرما دیں کہ تم ہم سے اللہ کے دین کے بارے میں جو حجت بازی کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جو دین اللہ کو پسند ہے وہ یہودیت اور نصرانیت ہے۔ تمہارا یہ کہنا اور اپنے خیال کے مطابق جنت میں داخل ہونے کے خواب دیکھنا غلط ہے۔ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سب کو اُسے راضی کرنے کے لئے فکر مند ہونا لازم ہے اور اُس نے جس دین اور جس ملت کو جس زمانہ میں ذریعہ نجات بنایا اُسی کو اختیار کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے عرب میں سے ایک نبی کو چن لیا۔ اس نبی پر ایمان لانا فرض ہے تم ایمان نہیں لاتے اور ہم سے جھگڑتے ہو۔ ہم سے جھگڑنا فضول ہے ہمیں اپنے ایمان اور اعمالِ حسنہ کا اجر ملے گا تمہیں تمہارے کفر اور تکذیب کی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کی مخالفت کی سزا ملے گی۔ ہم تو اللہ کے لئے مخلص ہیں اپنے اعمال کے ذریعہ صرف اُسی کی رضا چاہتے ہیں۔ قـال صـاحـب الروح قل أتحاجوننا تجريد الخطاب للنبى صلى الله عليه وسلم لما أن الـمـامـور به من الوظائف الخاصة به عليه الصلوٰة والسلام والهمزة للإنكار فى الله اى فى دينه وتدعون أن دينه الـحـق اليهودية والنصرانية وتبنون دخول الجنة والاهتداء عليهما ، وقيل :المراد فى شان الله تعالىٰ واصطفائه نبيا مـن الـعـرب دونكم بناء على أن الخطاب لأهل الكتاب، و سوق النظم يقتضى أن تفسر المحاجة بما يختص بهم، والـمـحـاجة فى الدين ليست كذٰلك (إلى آخر ما قال). (قل اتحاجوننا میں خطاب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ مامور بہ وظائف کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہونا ہے اور اس میں ہمزہ انکار کیلئے ہے۔ فی اللّٰہ کا معنی ہے کہ اللہ کے دین میں جھگڑتے ہو اور یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا دین حق یہودیت اور نصرانیت ہے اور ہدایت و دخول جنت کی بنیاد یہودیت و

نصرانیت کو ٹھہراتے ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کی شان میں اور اس بات میں جھگڑتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کا انتخاب تمہیں چھوڑ کر عربوں سے کیوں کیا۔ یہ قول تب صحیح ہوگا اگر اس میں خطاب اہل کتاب سے مانا جائے۔ اور سیاق کلام اس کا مقتضی ہے کہ جھگڑے کی تفسیر ان امور سے کی جائے جو اہلِ کتاب کے ساتھ خاص ہوں جبکہ دین میں جھگڑنا ان کے ساتھ خاص نہیں)

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا

کیا تم کہتے ہو کہ بے شک ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد

هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ

یہودی تھے یا نصرانی تھے، آپ فرما دیجئے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جاننے والا ہے، اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے چھپایا اُس گواہی کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

اُس کے پاس موجود ہے، اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے بے خبر نہیں ہے جنہیں تم کرتے ہو۔

یہود و نصاریٰ کے اس قول کی تردید کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب یہودی یا نصرانی تھے

یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد جن کو اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا یہودی تھے اور نصاریٰ کہتے تھے کہ یہ حضرات نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان لوگوں کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ یہ حضرات ملت ابراہیمی پر تھے یہودیت اور نصرانیت اور توریت اور انجیل اُن کے بعد نازل ہوئی ہیں جن سے تم اپنا جوڑ لگاتے ہو پھر ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے بیٹے اور پوتے یہودیت اور نصرانیت اور توریت پر کیسے ہو سکتے ہیں تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ تعالیٰ کو زیادہ علم ہے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا عالم ہے اور اُسی کو صحیح علم ہے تم جہاں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق اور یعقوب اور ان کے اسباط کے بارے میں غلط بات کہتے ہو اور ان کو یہودیت اور نصرانیت پر بتلاتے ہو وہاں اس شہادت اور گواہی کو بھی چھپاتے ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس پہنچی اور وہ شہادت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے، موحد تھے، مشرک نہیں تھے، یہودی اور نصرانی نہیں تھے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا......

قال تعالٰی يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(اے اہلِ کتاب کیوں حجت کرتے ہو ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد، کیا پھر سمجھتے نہیں ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں تو حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی سو ایسی باتوں میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصلاً واقفیت نہیں اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے لیکن طریق مستقیم والے صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔

آیت شریفہ کے عموم میں جہاں اس شہادت کے چھپانے کو بڑا ظلم بتایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تھی وہاں یہودیوں کی اس بد باطنی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی وجہ سے اُن لوگوں نے اس گواہی کو چھپا رکھا تھا جو تورات اور انجیل میں حضرت رسولِ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت و رسالت کے بارے میں موجود تھی۔

قال فی الروح (ص ۴۰۰ ج ۱) وفی اطلاق الشھادۃ مع ان المراد بھا ما تقدم من الشھادۃ المعینۃ تعریض بکتمانھم شھادۃ اللہ تعالی لنبیہ محمد صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فی التوراۃ والانجیل۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لئے وہ ہے جو انہوں نے عمل کیا، اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے عمل کیا، اور تم سے اُس چیز کا سوال نہ ہوگا جو

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

وہ کرتے تھے۔

ع ۱۶

نَسب پر غرور کرنے والوں کو تنبیہ

یہ آیت مکرّر ہے صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ یہود کو دوبارہ متنبہ فرمایا ان کی طبیعتوں میں جو باپ دادوں پر فخر کرنا اور نسب پر بھروسہ کرنا مستحکم تھا اس کے نافع نہ ہونے پر دوبارہ بطور تاکید کے تنبیہ فرمائی اور بتادیا کہ اللہ تمہیں تمہارے اعمال پر جزادے گا اور تمہارے باپ دادوں کا عمل تمہیں کچھ نفع نہ دے گا اور قیامت کے دن تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادا ے کیا عمل کرتے تھے (یعنی ان کے اعمال کا بالکل ذکر نہ ہوگا) بلکہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال ہوگا۔ اس کے بعد صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ یہ آیت پہلے جو گزری ہے وہاں اہل کتاب کو خطاب تھا۔ اور یہاں اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو تنبیہ ہے کہ تم لوگ یہود کی اقتداء نہ کرنا اور اُن کی طرح سے آباؤ اجداد پر فخر نہ کرنا اور اپنے ذاتی اعمال کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔

☆☆☆..................☆☆☆

(پارہ نمبر ۲ / سیقول)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ

عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کس چیز نے پھیر دیا ان کو ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے، آپ فرما دیجئے

لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

اللہ ہی کے لئے مشرق اور مغرب ہے، وہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے سیدھے راستہ کی طرف۔

تحویلِ قبلہ پر بیوقوفوں کا اعتراض اور اُن کا جواب

تفسیر درِمنثور ص ۱۴۱ ج ۱ میں بحوالہ ترمذی ونسائی وغیرہم حضرت براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی اور آپ کا دل چاہتا تھا کہ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھیں۔ آپ آسمان کی طرف منہ اُٹھاتے تھے (اور وحی کا انتظار کرتے تھے کہ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہو جائے) اللہ جل شانہ نے آیت قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (الآیۃ) نازل فرمائی اور کعبہ شریف کی طرف نماز میں رُخ کرنے کا حکم فرما دیا اس پر بیوقوفوں نے یعنی یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کس چیز نے قبلہ سے ان کا رُخ پھیر دیا؟ جس پر یہ تھے (یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا چھوڑ کر کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنا کیوں شروع کیا) اللہ تعالیٰ نے (اس کے جواب میں) قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ نازل فرمائی۔ تفسیر درمنثور ص ۱۴۲ ج ۱ میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جو حکم قرآنی منسوخ ہوا وہ قبلہ کی منسوخیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ منورہ تشریف لائے) تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے جو یہود کا قبلہ تھا۔ سترہ مہینے تک آپ نے اس طرف نماز پڑھی۔ تاکہ یہود ایمان لے آئیں اور آپ کا اتباع کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اور قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ نازل فرمائی۔

جب کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کر دیا گیا تو یہودیوں نے باتیں بنانا اور اعتراض کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ (حضرت) محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے اصحاب کو کس چیز نے اُس قبلہ سے پھیر دیا جس کی طرف اب تک نماز پڑھتے رہے۔ اللہ جل شانہ کی طرف سے ارشاد ہوا۔ اے نبی آپ فرما دیں اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہے اُسے اختیار ہے اپنے عبادت کرنے والوں کو جس طرف چاہے نماز پڑھنے کا حکم دیدے۔ کسی کو خداوند قدوس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے مؤمن بندے اللہ کے قانون پر چلتے ہیں وہ اُسی کے پابند ہیں۔ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو ادھر نماز پڑھنے لگے۔ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو اُسے قبلہ بنا لیا۔ قبلہ بدلنے پر اعتراض کرنا مسلمانوں پر اعتراض نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے۔ مقصد اللہ کی عبادت اور اطاعت ہے۔ کسی جہت یا کسی جانب کا رُخ کرنا مقصود نہیں اور اسی لئے اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف بتایا وہ یہ نہیں سمجھ رہے کہ ہمارا اعتراض کس پر ہو رہا ہے۔

معترض اندھا تو ہوتا ہی ہے اُسے یہ ہوش نہیں ہوتا کہ میری بات کہاں لگے گی اور میرا اعتراض کہاں پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلنا ہی صراطِ مستقیم کو اختیار کرنا ہے۔ اللہ کا ہر فرمان حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس نے اپنی حکمت کے موافق بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا پھر حکمت ہی کے مطابق اپنے بندوں کا رُخ کعبہ شریف کی طرف پھیر دیا اس نے اپنے بندوں کو ہدایت دی اور ہدایت کے لئے چن لیا۔ ہدایت یافتہ بندے حکم کے پابند ہیں، بے چون و چرا حکم پر عمل کرتے ہیں، دشمنانِ اسلام صراطِ مستقیم سے دُور ہیں اور اللہ کے حکم اور اس کی حکمت پر معترض ہیں۔ ایسے معترضین کا بے وقوف ہونا ظاہر ہے۔ قال صاحب الروح (ص۳ ج۲) کأنه قيل إن التولية المذكورة هداية يخص الله تعالى بها من يشاء ويختار من عباده. وقد خصّنا بها فله الحمد۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دی جو اعتدال والی ہے تاکہ تم ہو جاؤ لوگوں پر گواہ اور ہو جائے رسول تم پر گواہ۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ ساری اُمتوں سے افضل ہے

ابھی قبلہ کا مضمون باقی ہے۔ درمیان میں اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی فضیلت بیان فرمادی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ سب قبلوں سے افضل بنا دیا اسی طرح ہم نے تم کو اعتدال والی اُمت بنا دی اور ساری اُمتوں سے افضل اُمت بنا دی۔ اس امت کی افضلیت کا ظہور میدانِ حشر میں اس طرح سے ہوگا کہ یہ اُمت تمام اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کے بارے میں گواہی دیں گے کہ ہاں میری اُمت عدل ہے، ثقہ ہے، اس کی گواہی معتبر ہے۔

دُوسری اُمتوں کے مقابلہ میں اس اُمت کی گواہی اور اس پر فیصلے...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا اور اُن سے سوال ہوگا کیا تم نے تبلیغ کی؟ وہ عرض کریں گے یا رب! میں نے واقعۃً تبلیغ کی تھی۔ اُن کی اُمت سے سوال ہوگا کہ بولو انہوں نے تم کو احکام پہنچائے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی نذیر (ڈرانے والا) نہیں آیا۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے دعوے کی تصدیق کے لئے گواہی دینے والے کون ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے اُمتی ہیں۔ یہاں تک بیان فرمانے کے بعد آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس کے بعد تم کو لایا جائے گا اور تم گواہی دو گے کہ بے شک حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو تبلیغ کی تھی، اس کے بعد آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ذیل تلاوت فرمائی:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دی ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم دُوسری اُمتوں کے لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو اور تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ بنیں۔

یہ بخاری شریف کی روایت ہے (ص ۶۴۵ ج ۲) اور مسند احمدؒ وغیرہ کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتیں بھی انکاری ہوں گی اور کہیں گی کہ ہم کو تبلیغ نہیں کی گئی ان کے نبیوں سے سوال ہوگا کہ تم نے تبلیغ کی؟ وہ اثبات میں جواب دیں گے کہ واقعی ہم نے تبلیغ کی تھی، اس پر ان سے گواہ طلب کئے جائیں گے تو وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کی اُمت کو گواہی میں پیش کریں گے۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت سے سوال ہوگا کہ اس بارے میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ وہ جواب میں عرض کریں گے کہ ہم پیغمبروں کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اُمت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ سے سوال ہوگا کہ تم کو اس معاملہ کی کیا خبر ہے؟ وہ جواب میں عرض کریں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اُنہوں نے خبر دی کہ تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی اُمت کو تبلیغ کی۔ (درمنثور ص۱۴۴ ج۱)

آیت کا عموم لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ بھی اس کو چاہتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں کے مقابلہ میں بھی امت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ گواہی دے گی۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جب اُمت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ دوسری اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی کہ ان کے نبیوں (علیہم السلام) نے ان کو تبلیغ کی تو سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا اور آپ سے آپ کی اُمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا کیا آپ کی اُمت عادل ہے، گواہی دینے کے لائق ہے؟ اس پر آپ اُن کا تزکیہ فرمائیں گے اور گواہی دیں گے کہ واقعی میری اُمت عدل ہے، گواہی کے لائق ہے، اس کی گواہی معتبر ہے۔ (ص۵ ج۲)۔ بلاشبہ اس اُمت کا بڑا مرتبہ ہے اور بڑی فضیلت ہے جس کا میدانِ حشر میں تمام اولین و آخرین کے سامنے ظہور ہوگا۔ یہ اُمت خیر الامم ہے اس کو افضل الانبیاء کی اُمت میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے سب کتابوں میں سے افضل کتاب عطا فرمائی جو اللہ کی کتاب ہی نہیں اللہ کا کلام بھی ہے جو چھوٹے بچوں تک کے سینوں میں محفوظ ہے اور صغیر و کبیر سب کے ورد زباں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو تمام بنی آدم سے منتخب فرمایا۔ سورۂ حج میں ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

(اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اُس نے تم کو منتخب فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اللہ تعالیٰ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی تا کہ تمہارے لئے رسول گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو)

اُمتِ محمد یہ کی آپس میں گواہی پر بخشش کے فیصلے ...... اِس اُمت کی فضیلتوں میں یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کی گواہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے ان کی گواہی سے دوسری امتوں کے خلاف فیصلہ ہوگا اور آپس میں بھی ان کی گواہی معتبر ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ کچھ لوگ ایک جنازے کو لے کر گزرے تو حاضرین نے اس جنازہ کے بارے میں اچھے کلمات کہے اور اس کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا وَجَبَتْ پھر دوسرا جنازہ لے کر گزرے تو حاضرین نے بُرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا آپؐ نے اس پر بھی وَجَبَتْ فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ وَجَبَتْ کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اُس کے بارے میں تم نے خیر کے کلمات کہے لہٰذا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور اس کے بارے میں تم نے شر کے الفاظ استعمال کئے اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی۔ انتم شهدآء الله في الارض. یعنی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ (صحیح بخاری ص۱۸۳ ج۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی مسلمان کے لئے چار آدمی خیر کی گواہی دے دیں اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر دو شخص گواہی دے دیں؟ آپ نے فرمایا، دو کا بھی یہی حکم

ہے۔ پھر ہم نے ایک کی گواہی کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۳ ج ۱)

تفسیر درمنثور ص ۱۴۵ ج ۱ میں بحوالہ مسند احمد وسنن ابن ماجہ وغیرہ حضرت ابوزہیر ثقفی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب ایسا ہوگا کہ تم اپنے اچھے لوگوں کو برے لوگوں سے ممتاز کرسکو گے اور جان سکو گے کہ کون کیسا ہے۔ حضرات صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا ذکر ہونے سے اور برا ذکر ہونے سے (یعنی جسے مسلمان اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جسے برا کہیں وہ برا ہے) تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اھ۔ گواہی دینے کے اس بڑے مرتبہ سے وہ لوگ محروم ہوں گے جو لعنت کے الفاظ زیادہ نکالتے ہیں۔ سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زیادہ لعنت کرنے والے قیامت کے دن نہ شہید ہوں گے نہ شفیع ہوں گے۔ (یعنی قیامت کے دن یہ لوگ نہ گواہی دینے کے اہل ہوں گے اور نہ سفارش کرنے کے لائق ہوں گے)

اُمتِ محمدیہ کا اعتدال اور لفظ وَسَطًا کی تشریح...... امتِ محمدیہ کی تعریف میں اُمَّةً وَسَطًا فرمایا لفظ وسط کا معنی بہترین بھی کیا گیا ہے اور عدول بھی کیا گیا ہے۔ **عدول**، عدل کی جمع ہے عدل اس کو کہتے ہیں جو ثقہ ہو، منصف ہو اور اس کی گواہی معتبر ہو۔ اوصافِ عالیہ سے متصف ہو، خیر کی صفات کو جامع ہو، برائیوں سے دُور ہو۔ اور بعض حضرات نے اس کا معنی معتدل کا بھی لیا ہے یعنی یہ اُمت ہر اعتبار سے اعتدال پر ہے اس کے اخلاق اور اعمال سب میں اعتدال ہے افراط اور تفریط سے بَری ہے۔ نہ عبادات سے غفلت ہے نہ راہبوں کی طرح دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں رہنا ہے۔ ساری رات نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نفس اور بیوی اور مہمان کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی۔ روزانہ روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا۔ نہ فضول خرچی ہے نہ بخل بلکہ درمیانی راہ ہے جس کا نام جود ہے۔ اس طرح نہ بزدلی نہ ضرورت سے زیادہ بہادری جس سے لوگوں پر ظلم ہو جائے بلکہ ان کے درمیان شجاعت ہے ظالم بھی نہیں اور مظلوم رہنے کو بھی تیار نہیں نہ عورتوں کو سردار بنایا گیا نہ ان کی مظلومیت روا رکھی گئی نہ ہر فعل حلال قرار دیا گیا نہ ہر چیز کا کھانا جائز کیا گیا بلکہ حلال حرام کی تفصیلات بتائی گئیں۔ ضرر دینے والی اور خبیث چیزوں کے کھانے سے منع کر دیا گیا، جن سے اخلاق و اجسام پر بُرا اثر پڑے، طیب اور حلال چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی۔ انسانیت کو اُونچا کیا گیا بہیمیت سے بچایا گیا بربریت سے دُور رکھا گیا۔ حد یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ عین میدانِ جنگ کے موقع پر عمل کرنے کے لئے بھی ایسے احکام صادر فرمائے جن میں اعتدال ہی اعتدال ہے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا گیا۔ مُثلہ کرنے یعنی دشمن کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان کاٹنے سے منع فرمایا۔ معاشی نظام میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔ نفلی صدقات کا بھی حکم دیا گیا۔ میراث کے احکام جاری کئے گئے تا کہ دولت ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے، جان کا بدلہ قصاص مقرر کیا گیا لیکن خطا میں دیت رکھی گئی۔ اور قصاص واجب ہونے کی صورت میں اولیاءِ مقتول کو یہ اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو قصاص لے لیں۔ چاہیں دیت لے لیں۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں عام ابواب پر نظر کی جائے تو احکام میں سراسر اعتدال ہی نظر آتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ

اور جس قبلہ پر آپ تھے اسے ہم نے مقرر نہیں کیا مگر اس لئے کہ ہم جان لیں کون اتباع کرتا ہے رسول کا اس سے ممتاز ہو کر جو پیچھے پلٹ

عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ

جاتا ہے اپنے الٹے پاؤں، اور بے شک یہ قبلہ بدلنا بھاری بات ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ضائع کرے

اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

تمہارے ایمان کو، بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا مشفق مہربان ہے۔

تحویلِ قبلہ امتحان کے لئے ہے

اُمت محمدیہ کی فضیلت ظاہر فرما کر پھر قبلہ کے موضوع سے متعلق باقی بیان شروع ہوتا ہے۔ بیت المقدس کی طرف جو سولہ سترہ مہینے تک نمازیں پڑھی گئیں، پھر کعبہ شریف کی طرف نماز میں رُخ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے پہلے قبلہ کی بجائے دوسرے قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا جو حکم دیا اس میں یہ حکمت ہے کہ ہم جان لیں کہ رسول کا اتباع کون کرتا ہے اور تبدیل قبلہ کی وجہ سے کون اُلٹے پاؤں لوٹتا ہے اور اتباعِ رسولؐ سے روگردانی کرتا ہے۔ مؤمن بندوں کا مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت ہے۔ جدھر منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا وہی جہت قبلہ ہے۔ فرمانبردار بندوں کے لئے حق تعالیٰ شانہ کے احکام ماننے میں ذرا بھی کوئی جھجک نہیں ہوتی اور نہ ان کے نزدیک چوں چرا کا موقعہ ہوتا ہے۔

زبان تازہ کردن باقرارِ تو   نینگیختن علت از کارِ تو

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قبلہ بدلنے میں یہی حکمت تھی کہ ہم جان لیں یعنی علمِ اَزلی کا ظہور ہو جائے کہ کون ہمارے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون مُنکر اور مُنحرف ہو جاتا ہے۔ اور اُلٹے پاؤں چلا جاتا ہے جب قبلہ بدلنے کا حکم ہوا تو بعض ضعیف الایمان، ایمان سے پھر گئے۔ اور اُنہوں نے کہا کہ کبھی ادھر نماز پڑھنے کا حکم ہوتا ہے اور کبھی ادھر (اسکو بہانہ بنا کر مرتد ہو گئے)۔ (نقله في الدر المنثور عن ابن جرير ص ۱۴۶ ج ۱)

اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے بندوں کو جو چاہے حکم دے لیکن جاہلوں، بیوقوفوں اور منافقوں اور یہودیوں کے نزدیک قبلہ بدلنا بہت بڑی چیز ہو گئی۔ ان کے نفسوں پر یہ امر بہت شاق گزرا اور اسے ہدفِ طعن و تشنیع اور محلِ اعتراض بنا لیا اور مؤمنین کے لئے اس میں کوئی اشکال اور اعتراض کی بات ہی نہیں ہے۔ فرمانبردار یوں بھی خوش ہے اور یوں بھی راضی، وہ تو پابندِ حکم ہے، اُسے فرمانبرداری کے سوا اور کچھ مطلوب نہیں۔

قال صاحب الروح ص۶ ج۲ وان كانت لكبيرة اى شاقة ثقيلة، والضمير لما دل عليه قوله تعالىٰ وما جعلنا (الخ) من الجعلة أو التولية أو الردة او التحويلة الصيرورة أو المتابعة أو القبلة وفائدة اعتبار التانيث على بعض الوجوه الدلالة على أن هذا الرد والتحويل بوقوعه مرة واحدة وقوله الا على الذين هدى الله أى إلى سر الاحكام الشرعية المبنية على الحكم والمصالح إجمالا او تفصيلا والمراد بهم (من يتبع الرسول) من الثابتين على الايمان الغير المتزلزلين المنقلبين على أعقابهم (اھ بحذف) (**وان كانت لكبيرة** یعنی قبلہ کی تبدیلی لوگوں پر شاق اور گراں ہے' کانت کی ضمیر **الجعلة' التولية' الردة' التحويلة' الصيرورة' المتابعة يا القبلة** کی طرف راجع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول **وما جعلنا الخ** اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض وجوہ میں اعتبار تانیث کا فائدہ اس امر پر دلالت ہے کہ تحویلِ قبلہ کا واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا۔ **الا على الذين هدى الله** یعنی تبدیلی قبلہ ان لوگوں پر گراں نہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے احکام شرعیہ (جو کہ اجمالاً یا تفصیلاً حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہیں) کے اسرار کی طرف رہنمائی کی ہے۔ **من يتبع الرسول** سے وہ لوگ مراد ہیں جو

ایمان پر ثابت قدم رہیں اور متزلزل وایڑیوں کے بل پلٹنے والے نہ ہوں)

قبلہ اولیٰ کی طرف جو نمازیں پڑھی گئیں اُن کا ثواب ضائع نہیں۔۔۔۔۔۔پھر فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (اور اللہ نہیں ہے کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو) تفسیر درمنثور میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بحوالہ سنن ترمذی و معجم طبرانی و مستدرک حاکم حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تو حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھتے رہے (اور قبلہ بدلنے سے پہلے وفات پا گئے) اس پر اللہ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع فرمادے۔

اس آیت میں نماز کو ایمان فرمایا اس سے نماز کا رُتبہ معلوم ہو گیا۔ بعض روایات میں نماز کے بارے میں فرمایا کہ اسلام میں نماز کا مرتبہ ایسا ہے جیسے انسان کے جسم میں سر کا مرتبہ ہے۔ (الترغیب ص ۲۴۶ ج ۱)

سر موجود ہے تو جسم کی بھی حیثیت ہے، جسم سے سر کٹ گیا تو کچھ بھی نہ رہا۔ آیت کے اخیر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (کہ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا مشفق اور مہربان ہے) اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہے، حاکم بھی ہے۔ وہ حکمت کے مطابق ان کاموں کا لوگوں کو حکم دیتا ہے جن میں بندوں کا بھلا اور نفع ہوتا ہے ہر حکم میں ان کے ساتھ رأفت اور رحمت کا معاملہ ہے۔ جو نمازیں حکم کے مطابق پڑھ لی گئیں ان کے ضائع ہونے کا وہم و گمان صحیح نہیں۔ وہ عمل صحیح کو ضائع نہیں فرماتا جو حکم کے مطابق انجام دیا گیا ہو، لفظ رحمت اور رافت دونوں ہی مہربانی کے معنی میں آتے ہیں لیکن رأفت میں رحمۃ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ

ہم دیکھ رہے ہیں آپکا آسمان کی طرف بار بار منہ اٹھانا پس ہم آپکو ضرور ضرور متوجہ کردیں گے ایسے قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہوں گے، سو آپ پھیر دیجئے اپنا

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

چہرہ مسجد حرام کی طرف، اور جہاں کہیں بھی تم لوگ ہو سو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف متوجہ کیا کرو، اور بلاشبہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی،

الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

وہ ضرور جانتے ہیں کہ بلاشبہ یہ حکم حق ہے، ان کے رب کی طرف سے ہے اور اللہ غافل نہیں ہے اُن کاموں سے جن کو تم کرتے ہو۔

کعبہ شریف کی طرف رخ کرنے کا حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شدت سے اس کا انتظار

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ سلام پھیر کر آسمان کی طرف (اس انتظار میں) منہ اُٹھاتے کہ کعبہ شریف قبلہ مقرر کیا جائے۔ لہٰذا آیت قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ نازل ہوئی۔ علامہ واحدی اسباب نزول ص ۳۹ میں لکھتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کے قبلہ سے ہٹا کر میرے لئے کوئی دوسرا قبلہ مقرر فرمادے اور مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف قبلہ مقرر ہو جائے کیونکہ وہ قبلہ ابراہیمی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں بھی تو آپ کی طرح ایک بندہ ہوں، کسی چیز کا اختیار نہیں

رکھتا۔ آپ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ آپ کو قبلہ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرمادے۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام اُوپر چڑھ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اس اُمید میں آسمان کی طرف نظر فرماتے رہے کہ جبریل آپ کی خواہش کے مطابق حکمِ خداوندی لے کر نازل ہوں۔ اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور یہ سولہ یا سترہ مہینے تک رہا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کر دیا گیا اور کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا اور عمومی طور پر سب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو (مکہ یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں یا دُنیا کے کسی گوشہ میں) مسجدِ حرام ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

جہتِ قبلہ سے تھوڑا سا انحراف مفسدِ صلوٰۃ نہیں...... مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو کعبہ شریف کے چاروں طرف ہے اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ کعبہ شریف ہی قبلہ ہے۔ چونکہ کعبہ شریف مسجد حرام کے اندر ہے اس لئے مسجد حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خاص کعبہ ہی کی طرف ہر دور اور قریب کے نمازی کو رُخ کرنا لازم نہیں بلکہ مسجد حرام کی طرف منہ کرنے سے نماز ہو جائے گی جو لوگ مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں چونکہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا اُن کی قدرت سے باہر ہے اس لئے آسانی اور رفعِ حرج کے لئے مسجد حرام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ لیکن جو شخص مسجدِ حرام میں موجود ہے اس کے لئے لازم ہے کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے۔ تفسیر قرطبی ص ۱۵۹ ج ۲ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعبہ شریف مسجد حرام والوں کا قبلہ ہے اور مسجد حرام اہلِ حرم کا قبلہ ہے اور حرم شرقاً وغرباً میری تمام اُمت کے لئے قبلہ ہے زمین میں جہاں کہیں بھی ہوں، فقہاء نے لکھا ہے کہ جس جہت پر کعبہ شریف ہو اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے نماز ہو جائے گی، تھوڑا سا انحراف مفسدِ صلاۃ نہیں۔ جب کوئی شخص جہت کعبہ کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو اور کعبہ شریف سے دائیں یا بائیں جانب ۴۵ درجے کے اندر انحراف ہو گیا تو نماز ہو جائے گا۔ قرآن مجید میں جو شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا ہے اس سے حضرت فقہاء نے یہ استنباط کیا کہ کعبہ شریف کے رُخ پر نماز پڑھنا کافی ہے۔ اگرچہ تھوڑا سا انحراف ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مابین المشرق والمغرب قبلة (رواہ الترمذی) فرما کر یہ بتا دیا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان جو جہت ہے اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ یہ آپ نے اہلِ مدینہ کے لئے فرمایا کیونکہ کعبہ شریف مدینہ منورہ سے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اور وہاں سے جہت جنوب مشرق اور مغرب کے درمیان پڑتی ہے۔ پورے عالم میں بسنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے استقبال کے بارے میں یہ بہت آسانی دی گئی ہے کہ وہ جہت قبلہ کی طرف نماز پڑھ لیں، تھوڑا سا انحراف ہو جائے تب بھی نماز ہو جائے گی۔ احکام شرعیہ کو اللہ جل شانہٗ نے اس قدر آسان رکھا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل اور پہاڑ اور جزیرہ میں بسنے والے مسلمان احکامِ شریعت پر عمل کر سکتے ہیں۔ اوقاتِ نماز طلوع وغروب کے مشاہدہ سے سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح حسابات اور ریاضی اور ہیئت اور آلاتِ رصدیہ کے احتیاج کے بغیر کسی تکلف کے اپنا قبلہ مقرر کر سکتے ہیں یعنی جہت کعبہ کی طرف نماز پڑھ سکتے ہیں جس میں کافی وسعت ہے۔ ہاں مسجدیں بناتے وقت خوب محقق کر کے قبلہ مقرر کرنا افضل ہے۔

کعبہ شریف کو قبلہ بنانے میں حکمت...... اللہ جل شانہٗ کی ذات پاک سمت اور جہت سے بالا اور برتر ہے۔ مشارق اور مغارب سب اُس کی ملکیت ہیں۔ اسی لئے قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فرمایا۔ تاہم نماز میں اجتماع اور وحدت کے لئے تمام دنیا کے تمام انسانوں کا رُخ کسی ایک جہت کی طرف ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا کعبہ شریف کو آخر میں قبلہ نماز مقرر فرما دیا گیا اور کعبہ شریف چونکہ اول

حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا اور وہ سب سے پہلے پیغمبر تھے اور تمام انسانوں کے باپ تھے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا جن کو ان کے بعد آنے والی تمام قومیں مانتی ہیں۔ اس لئے کعبہ شریف کو ہمیشہ کے لئے قبلہ قرار دیا گیا۔ اس سے تمام مسلمانوں کی وحدت اجتماعیہ فی الصلوٰۃ حاصل ہوگئی۔ اگر انسانوں پر اس کا فیصلہ چھوڑا جاتا تو بہت سے اختلافات رُونما ہوتے اور کسی طرح سے وحدت حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ کعبہ شریف کو قبلہ صلوٰۃ مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ چاروں جہات میں ہر جہت نماز کے لئے مقرر ہوگئی۔ ہر جہت والے اس رُخ پر نماز پڑھتے ہیں جس رُخ پر ان کے علاقہ کے اعتبار سے کعبہ شریف واقع ہے۔ اب نمازیں مشرق کو بھی ہورہی ہیں اور مغرب کو بھی اور جنوب شمال کو بھی۔ اس میں لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اور اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا پورا پورا مظاہرہ ہے۔

پھر آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا: وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

(جن لوگوں کو کتاب دی گئی یعنی یہود و نصاریٰ ان کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قبلہ کا بدلنا اور کعبہ شریف کو قبلہ قرار دینا بالکل صحیح ہے اور حق ہے اور اُن کے رب کی طرف سے ہے)۔

لیکن وہ ضد اور عناد کی وجہ سے معترض ہورہے ہیں اور حق کی تکذیب کررہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کی بشارت ان کی کتابوں میں موجود ہے اور وہ باطل کا حکم نہیں دیتے۔ (روح المعانی) آخر میں ارشاد فرمایا وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اعمال سے اور ان کی حرکتوں سے غافل نہیں ہے اُسے سب کچھ معلوم ہے یہ لوگ اپنے کفر اور اعمالِ بد کی سزا پائیں گے۔

وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی اگر آپ ان کے پاس تمام دلیلیں لے آئیں تب بھی آپ کے قبلہ کا اتباع نہ کریں گے، اور نہ آپ ان کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں،

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں اور البتہ اگر آپ نے اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے ان کی خواہشوں

الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾

کا اتباع کیا تو بے شک آپ اس وقت یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

وقف لازم

یہود و نصاریٰ کی ضد اور عناد کا مزید تذکرہ

اس آیت شریفہ میں یہود و نصاریٰ کے عناد اور ضد کو مزید واضح کر کے بیان فرمایا اور صاف طور سے بتادیا کہ ان لوگوں سے قبول حق کی کوئی اُمید نہیں۔ انہوں نے جو آپ کے قبلہ کو قبول نہیں کیا تو یہ کسی دلیل کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف مخالفت اور عناد اور مکابرہ پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ دلیلیں پیش کردیں انہیں آپ کی موافقت کرنا نہیں ہے۔ نہ وہ آپ کے قبلہ کا اتباع کریں گے اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں اہلِ کتاب نے دھوکہ دینے کے لئے کہا تھا۔ یا محمدُ عُد الی قبلتنا نؤمن بک و نتبعک۔ (کہ اے محمد! ہمارے قبلہ کی طرف واپس آ جاؤ، ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اور تمہارے قبلہ کا اتباع کرلیں گے) اللہ تعالیٰ نے دونوں طرف کی اُمید کو ختم فرمادیا کہ نہ وہ آپ کے قبلہ کا اتباع کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ یہود کا قبلہ بیت المقدس ہے۔ اور

نصاریٰ نے اپنا قبلہ جہت مشرق کو تجویز کرلیا تھا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رفع الی السماء تک کبھی بھی مشرق کی طرف نماز نہیں پڑھی ان کا قبلہ وہی تھا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا یعنی بیت المقدس۔ (روح المعانی ص ۱۱ ج ۲)

پھر فرمایا: وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ (کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کا اتباع کرنے والے نہیں ہیں) صاحب روح المعانی (ص ۱۲ ج ۲) لکھتے ہیں کہ اس میں یہود و نصاریٰ کے الحاد اور تصلب فی الھویٰ کو بیان فرمایا ہے۔ مطلب یہ کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کی یہ مخالفت اور عناد صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خود آپس میں بھی ان کی مخالفت اور عناد کا یہی حال ہے۔ آخر میں فرمایا: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ. جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس اللہ کی طرف سے علم آ گیا اور یہ یقین ہے کہ یہ صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ انہیں حق قبول کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ لہٰذا بالفرض اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کرلیا تو آپ اُن لوگوں میں شمار ہو جائیں گے جو ظلم کرنے والے اور حق کو چھوڑ کر ناحق کی طرف جانے والے ہیں۔ اِس طرز بیان میں اتباع ہویٰ سے بچنے کی بہت زیادہ تاکید ہے اور یہ بتایا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اتباع ہویٰ اور ارتکاب گناہ ظالموں کا شیوہ ہے۔ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر ظلم سے محفوظ اور معصوم ہیں۔ (روح المعانی ص ۱۲ ج ۲)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ رسول کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ اُن میں سے ایک فریق ایسا ہے جو ضرور حق کو چھپاتے ہیں

الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے سو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔

ع ۱۷ - رکوع منزل

اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے ہیں اور حق چھپاتے ہیں

اس آیت شریفہ میں اہلِ کتاب کا مزید عناد اور تمرد بیان فرمایا کہ اہل کتاب صرف قبلہ کے بارے میں ہی عناد پر قائم نہیں بلکہ وہ تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہی کے منکر ہیں اور اُن کا یہ انکار خالص عناد پر مبنی ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں آپ کی صفات جلیلہ اور آپ کی تشریف آوری کی بشارت عظیمہ پڑھتے رہے ہیں اور وہ نعوت اور صفات خوب اچھی طرح واضح طور پر دیکھ کر آپ کی نبوت کو اس طرح پہچان گئے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے بیٹے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں اُن کو ذرا شک و شبہ نہیں ہے۔ (تفسیر درمنثور ص ۱۴۷ ج ۱)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو یہود کے علماء میں سے تھے) آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں انہوں نے اسلام قبول کیا اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں مجھے اپنے بیٹے کے پہچاننے سے زیادہ یقینی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ کیونکر؟ انہوں نے کہا کہ میں بالکل یقین کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں لیکن میں اس طرح کی گواہی اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں دے سکتا، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ عورتیں (مردوں کے پیچھے) کیا کرتی ہیں ممکن ہے میری بیوی نے خیانت کی ہو اور میں جسے اپنا بیٹا کہہ رہا ہوں وہ

میرا بیٹا نہ ہو۔ (اسباب النزول للواحدی ص۴۰، درمنثور ص ۱۴۷ ج ۱)

پھر فرمایا کہ بلاشبہ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو چھپاتا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ یہ حق ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم حق کو چھپا رہے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حق چھپانے کا وبال اور عذاب بہت زیادہ ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے لہٰذا آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔ صاحب رُوح المعانی (ص ۱۴ ج ۲) لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق اپنی جگہ ثابت اور متحقق ہے اور ظاہر و باہر ہے اس میں کسی کو کچھ بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ صیغہ نہی کا ہے لیکن مقصود اخبار ہے۔ حق میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ

اور ہر جماعت کیلئے ایک جہت ہے، جس کی طرف وہ اپنا رخ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا تم نیک کاموں کی طرف آگے بڑھو، جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تعالیٰ تم سب کو

جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

لے آئے گا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہر ملّت کا قبلہ الگ الگ ہے

اس میں لکل کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ ای لکل أهل ملة أو جماعة من المسلمين واليهود والنصارٰی یعنی ہر مذہب اور ملت اور ہر جماعت کا عبادتوں میں اپنا رُخ الگ ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کر دیا گیا ہو۔ خواہ لوگوں نے کوئی جہت اپنے طور پر مقرر کر لی ہو پھر اگر نبی اکرم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ ابراہیمی مقرر کر دیا گیا جو دُوسروں کے قبلہ سے مختلف ہے تو اس میں اعتراض اور تعجب کی کیا وجہ ہے اور یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا رُخ مختلف بلاد و اَمصار اور مختلف آفاق و اَطراف میں مختلف ہوتا ہے۔ چار جہات (مشرق، مغرب، جنوب، شمال) میں سے کوئی جہت بھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں ہے بلکہ ان کا قبلہ کعبہ ہے اور کعبہ شریف کو رُخ کرنے سے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف جہات کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ رُخ سب کا کعبہ شریف ہی کی طرف ہے کوئی مشرق کو رُخ کئے ہوئے ہے۔ کوئی مغرب کی طرف نماز پڑھتا ہے کسی کا قبلہ جنوب اور کسی کا قبلہ شمال کی طرف ہے۔ او لكل قوم من المسلمين جهة وجانب من الكعبة يصلي اليها جنوبية او شمالية او شرقية او غربية۔ (رُوح المعانی ص ۱۴ ج ۲)

پھر فرمایا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اے مؤمنو! اُن کاموں کی طرف آگے بڑھو اور پہل کرو جن میں دارین میں سعادت حاصل ہو قبلہ کا استقبال بھی امر خداوندی کے مطابق کرو اور اُس کے سوا دیگر احکام الٰہیہ پر بھی بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ الخیرات سے نمازیں مُراد ہیں جب نماز کا وقت مامور بہ ہو جائے تو نماز کی طرف لپکنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

پھر فرمایا اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ...... یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو جس خطۂ زمین میں ہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی جزا دینے کے لئے تم سب کو جمع فرمائے گا۔ فرمانبرداری اور اعمالِ صالحہ کی اچھی جزا ملے گی اور برے کاموں کی سزا ملے گی۔ لہٰذا فُرصت کو غنیمت جانیں اور موت اور حشر نشر سے غافل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے۔ زندگی بخشنا موت دینا جمع کرنا جزا دینا سب اُس کے لئے آسان ہے۔

یہ جو فرمایا کہ "ہر جماعت کا الگ الگ قبلہ ہے پس تم نیک کاموں کی طرف سبقت کرو" اس سے واضح ہو رہا ہے کہ مسلمان کا کام فضول بحثوں میں اُلجھنا نہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ اہل کتاب تمہارے قبلہ کی طرف رُخ کرنے والے نہیں اور تم ان کے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تو اب بحث بلا ضرورت ہے اور فضول ہے اور وقت کا ضیاع ہے ان بحثوں کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگیں یعنی خیر کے کاموں کی طرف سبقت کریں جو آخرت میں اجر و ثواب کا ذریعہ ہے اور فَاسْتَبِقُوْا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب بھی کبھی خیر کا موقع مل جائے تو فوراً اس کی طرف بڑھنا اور لپکنا چاہیئے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ وَمَا

اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں اور بلاشبہ یہ ضرور حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، اور

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ

اللہ غافل نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِيْنَ

اور جہاں کہیں بھی تم ہو سو اپنے چہرے اُس کی طرف پھیر لو، تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے، سوائے اُن کے

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

جنہوں نے اُن میں سے ظلم کیا، لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو تاکہ میں پوری کر دوں تم پر اپنی نعمت اور تاکہ تم ہدایت پر رہو۔

دُنیا میں جہاں بھی ہوں مسجد حرام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں

ان آیات میں اول تو یہ فرمایا کہ اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جس جگہ سے بھی کہیں سفر میں باہر نکلیں نماز میں اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں اور فرمایا کہ یہ حکم حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ اللہ سب کاموں کو دیکھتا ہے۔ کسی کے عمل سے غافل نہیں۔ پھر مذکورہ بالا حکم کا دوبارہ اعادہ فرمایا اور ساتھ ہی عامۃ المسلمین کو بھی خطاب فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو نمازوں میں اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ سے لے کر لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تک فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ ہے اور وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ دوبار ہے۔ تحویل قبلہ کا مسئلہ چونکہ بہت اہم بن گیا تھا۔ مخالفوں کے اعتراض اور شور و شغب کی وجہ سے بعض کچے مسلمان بھی متاثر ہو گئے تھے اور اُن میں سے بعض مُرتد بھی ہو گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزرا اس لئے تاکید کے طور پر بار بار مسجد حرام کی طرف استقبال کرنے کا حکم فرمایا گیا اور درمیان میں اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ اور لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لایا گیا۔

اور بعض حضرات نے یوں بھی کہا ہے کہ پہلے حالتِ حضر کا پھر حالتِ سفر کا حکم بیان فرمایا کہ سفر میں بھی مسجد حرام ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں اور مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ سفر قریب کا ہو یا بعید کا مشرق کا ہو یا مغرب کا جنوب کا ہو یا شمال کا۔ ہر حالت میں مسجد حرام ہی کی طرف نماز پڑھنا ہو گی۔

قبلہ بدلنے پر یہودیوں کی حجت ختم ہوگئی...... آخر میں یہ جو فرمایا لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ اس کے بارے میں مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ کی علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیت المقدس کی بجائے کعبہ شریف کی طرف رُخ پھیر دینے میں یہودیوں کی حجت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اُن کا یہ اعتراض تھا کہ توریت شریف میں تو یہ مذکور ہے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ کعبہ شریف ہوگا لیکن یہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور دُوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کا انکار کرتے ہیں لیکن ہمارے قبلہ کا اتباع کرتے ہیں یہودیوں کے یہ دونوں اعتراض کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ملنے سے ختم ہو گئے۔ اور مشرکین جو یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اُن کے قبلہ کے علاوہ دوسرا قبلہ اختیار کئے ہوئے ہیں تحویل قبلہ سے ان کا اعتراض بھی ختم ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ اَلنَّاس کا عموم یہود اور مشرکین دونوں کو شامل ہے۔

پھر فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ یعنی کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کردینے سے لوگوں کی حجت ختم ہوگئی اور اب کسی کا اعتراض باقی نہیں رہا سوائے ان لوگوں کے جو ظالم ہیں۔ جنہوں نے عناد پر ہی کمر باندھ رکھی ہے اور جنہیں حق قبول کرنا ہی نہیں۔ مثلاً یہودی معاندین کہیں گے کہ اُنہوں نے کعبہ کو قبلہ اس لئے اختیار کرلیا کہ اپنی قوم کے دین کی طرف مائل ہو گئے اور وطن کی محبت نے ان کو کعبہ کو قبلہ بنانے پر آمادہ کرلیا۔ یا یوں کہیں گے کہ ان کو اس وقت یہ خیال آ گیا کہ اپنے باپ دادوں کا قبلہ اختیار کرلیں ممکن ہے کہ پھر ہمارے قبلہ کی طرف واپس آ جائیں۔ معترض اور معاند کا منہ تو کبھی بند نہیں ہوسکتا وہ تو کٹ حجتی کرتا ہی رہتا ہے۔

پھر فرمایا: لَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِیْ (کہ تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو) جو حکم کعبہ شریف کو رُخ کرنے کا ہوا ہے اس کی تعمیل کرو اور معترضین اور معاندین کی کسی بات کا کوئی خیال نہ کرو ان سے نہ ڈرو کیونکہ ان کے طعنے اور اعتراضات تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے مجھ سے ڈرو میرے اَمر کی مخالفت نہ کرو۔

آخر میں فرمایا: وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ یہ محذوف کی علت ہے یعنی وامرتکم لاتمامی النعمۃ علیکم وارادتی اھتدائکم یعنی میں نے تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا ہے جو اس لئے ہے کہ میں تم پر اپنی نعمت پُوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ (کلہ من البیضاوی)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ

جیسا کہ ہم نے بھیجا تمہارے اندر ایک رسول جو تم میں سے ہے وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت کی

وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ

تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ چیزیں سکھاتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔ سو تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، اور میرا شکر کرو،

وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

اور میری ناشکری نہ کرو۔

عبدالمناخرین معانقہ ۲ ع ۱۸

اہلِ ایمان کے لئے تکمیلِ نعمت

یہ ماقبل سے متعلق ہے ای ولاتم نعمتی علیکم فی امر القبلۃ او فی الاٰخرۃ کما اتممتھا بارسال رسول

منکم یعنی ہم نے تم کو کعبہ شریف کی طرف نمازوں میں رُخ کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ تم پر اپنی نعمت قبلہ کے بارے میں اور آخرت میں پوری کروں جیسا کہ میں نے اپنی نعمت تم پر اس طرح بھی پوری کی ہے کہ تمہارے اندر تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔ جو ہماری آیتیں پڑھ کر تم کو سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تم ظاہری باطنی بُرائی اور خرابی سے پاک ہو جاؤ گے۔ وہ تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ وہ باتیں بتاتا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ جن کے جاننے کا راستہ وحی الٰہی کے علاوہ بالکل نہیں ہے۔ ہم نے اپنا رسول بھیجا اس پر وحی بھیجی اور وحی کے ذریعہ تم کو بہت کچھ بتایا اور سمجھایا لہٰذا تم میرا ذکر کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو، اور میری ناشکری نہ کرو۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ کی تفسیر ...... مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ فاذکرونی باطاعتی اذکرکم بالثواب یعنی تم مجھے فرمانبرداری کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں ثواب دے کر یاد کروں گا، دل سے، زبان سے اللہ کو یاد کرنا یہ بھی یاد ہے اور فرمانبرداری اور اطاعت میں لگنا یہ بھی یاد ہے۔ اللہ کے خوف سے گناہوں کو چھوڑ دینا یہ بھی یاد ہے۔ محققین نے فرمایا: کل مطیع للہ فھو ذاکر یعنی ہر وہ شخص جو اللہ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو وہ ذاکر ہے۔ زبان سے یاد کرنے کی بھی بہت زیادہ فضیلت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کریں۔ (صحیح بخاری عن ابی ہریرۃؓ) اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندہ کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے سو اگر اس نے مجھے تنہائی میں یاد کیا تو میں بھی اُسے تنہا یاد کروں گا اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرے تو میں اُسے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔ (یعنی عالمِ بالا کے درباری فرشتوں کے سامنے)۔ (صحیح بخاری ایضاً عن ابی ہریرۃؓ)

ذکر اللہ کے فضائل ...... احادیث شریفہ میں تسبیح و تہلیل اور تکبیر میں مشغول ہونے کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں یوں کہوں کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تو یہ مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن چیزوں پر آفتاب طلوع ہوا۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۵ ج ۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سا کلام (ذکر کے لئے) سب سے زیادہ افضل ہے۔ آپ نے فرمایا جو اللہ نے اپنے فرشتوں کے لئے منتخب فرمایا یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ. (رواہ مسلم ص ۳۵۱ ج ۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے یوں کہا سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ اس کے لئے جنت میں ایک کھجور کا درخت لگا دیا جائے گا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الدعوات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں (قیامت کے دِن) ترازو میں بھاری ہوں گے اور رحمٰن کو محبوب ہیں اور وہ یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ. (صحیح بخاری آخری حدیث)

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسلام کی باتیں تو بہت ہیں آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جس میں لگا رہوں آپ نے فرمایا لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ یعنی تیری زبان ہر وقت اللہ کی یاد میں تر رہے۔ (رواہ الترمذی وحسنہ)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل رہا تھا اور دِل میں لَا حَوْلَ وَلَا

قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ پڑھ رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن قیس (یہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام ہے) کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا وہ خزانہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ ہے۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۶ ج ۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور اُن پر رحمت چھا جاتی ہے اور اُن پر اطمینان کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے درباریوں میں یاد فرماتا ہے۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۵ ج ۲)

شکر کی فضیلت اور اہمیت...... ذِکر کا حکم فرمانے کے بعد شکر کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا: وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ (یعنی میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو) ذکر کے ساتھ شکر ادا کرنا بھی لازم ہے۔ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جن کا شکر بھی بندوں کی قُدرت سے باہر ہے۔ اُن نعمتوں کا شکر ادا کرنا واجب ہے شکر میں یہ سب کچھ آجاتا ہے کہ نعمتوں کا اقرار کریں۔ قول اور فعل سے نعمتوں کا اظہار کریں۔ نعمتوں کی قدردانی کریں۔ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت میں خرچ کریں۔ نعمتوں کا منکر ہونا ان کی ناقدری کرنا ان کو گناہوں میں خرچ کرنا ناشکری ہے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ نعمتیں اللہ تعالیٰ عنایت فرمائے اور ان نعمتوں کا استعمال اللہ کی نافرمانی میں اور نفس و شیطان کی فرمانبرداری میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو سبھی استعمال کرتے ہیں لیکن شکر گزار بندے کم ہیں جیسا کہ سورۂ سبا میں فرمایا: وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔ شکر بہت بڑی چیز ہے اس کی وجہ سے نعمتیں باقی بھی رہتی ہیں اور نعمتوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ناشکری پر نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ سورۂ ابراہیم (ع ۱) میں فرمایا: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (اور جب تمہارے رب نے اعلان فرمایا کہ البتہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں ضرور ضرور اور زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب سخت ہے)

انسان کے مزاج میں ناشکری غالب ہے۔ سورۂ زخرف میں فرمایا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ (بلاشبہ انسان کھلا ناشکرا ہے) اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا: وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ (اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سب چیزوں میں سے دیا جن کا تم نے سوال کیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہ کرسکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ظالم ہے (اور) بڑا ناشکرا ہے)

بندوں کا یہی کام ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں اس کی نعمتوں کو یاد کریں۔ جب انہیں استعمال کریں تو اللہ کی حمد و ثنا میں مشغول ہوں۔ حدیث شریف کی کتابوں میں جو دعائیں وارد ہوئیں ان میں نعمتوں پر بار بار اللہ کی حمد کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ الحمد رأس الشکر ما شکر اللہ عبد لا یحمدہ (یعنی اللہ کی حمد کرنا اصل شکر ہے جو بندہ اللہ کی حمد بیان نہیں کرتا، اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا)۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ص ۲۰۱)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو، بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگنے کا حکم

اس سے پہلی آیت میں ذکر اور شکر کا حکم فرمایا اور اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ صبر اور صلاۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ لفظ صبر کا لغوی معنی رُکنے اور اور ٹھہر جانے کا ہے۔ شریعت میں یہ لفظ تین معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اوّل...... اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت و فرمانبرداری پر لگائے رہنا۔ دوم...... اپنے نفس کو گناہوں سے روک کر رکھنا۔ سوم...... آفات اور مصائب پر جو تکلیف ہو اُسے سہ جانا اور اس طرح سے گزر جانا کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر پر راضی ہو اور اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہ کرے اور دکھ تکلیف اور مصیبت پر ثواب کا اُمیدوار رہے عام لوگ صبر صرف تیسرے معنی ہی کے لئے استعمال کرتے ہیں پہلے دو معنی کی طرف اُن کا ذہن نہیں جاتا حالانکہ یہ تینوں صورتیں صبر کا جزو ہیں اور صبر کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اور تینوں میں مشترک امر وہی ایک بات ہے یعنی نفس کو دبانا اور ہر اُس بات سے روکنا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔ جو شخص بھی صبر کے ان تینوں طریقوں کو اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نصرتیں اس پر نازل ہوں گی۔ سُورہ زمر میں ارشاد فرمایا۔ اِنَّمَا یُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کہ صابروں کو پورا پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔

صبر کی فضیلت اور اہمیت...... درحقیقت صبر اور شکر مؤمن کی زندگی کے لئے (جو ایک رواں دواں سیارہ کے مشابہ ہے) پہیئے ہیں اور مؤمن کی کوئی چیز ضائع نہیں ہے۔ آرام و راحت ہو نعمتیں ہوں یا دکھ تکلیف ہو کلفتیں ہوں ہر حال میں اُس کے لئے نفع ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کی ہر حالت خیر ہے اور یہ مؤمن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر مؤمن کو خوش کرنے والی حالت پہنچ گئی تو اس نے شکر کیا جو اس کے لئے بہتر ہوا اور اگر اس کو تکلیف دینے والی حالت پہنچ گئی تو اس نے صبر کیا یہ بھی اس کے لئے بہتر ہوا۔ (رواہ مسلم ص ۴۱۳ ج ۲)

صحیح بخاری ص ۹۵۸ ج ۲ میں ہے کہ ولن تعطوا عطاء خيرا و أوسع من الصبر۔ (یعنی تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر سے بہتر اور وسیع کوئی عطا نہیں دی گئی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو چار چیزیں عطا کردی گئیں اُسے دنیا و آخرت کی بھلائی دے دی گئی، ۱۔ شکر گزار دل، ۲۔ ذکر کرنے والی زبان، ۳۔ مصیبت پر صبر کرنے والا بدن، ۴۔ ایسی بیوی جو اپنی جان کے بارے میں اور شوہر کے مال کے بارے میں شوہر کی خیانت نہ کرے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ ص ۲۸۳)

صبر میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس کے بعد نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ کچھ ملتا ہے جس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ تکلیفیں تو سبھی کو پہنچتی ہیں۔ مؤمن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد۔ فرق اتنا ہے کہ جو لوگ صبر کر لیتے ہیں وہ ثواب بھی لے لیتے ہیں اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد، رحمت اور نُصرت کے دروازے بھی ان کے لئے کُھل جاتے ہیں۔ جو لوگ صبر نہیں کرتے واویلا کرتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں، اللہ پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کی قضا اور قدر پر راضی نہیں ہوتے وہ تکلیف بھی اُٹھاتے ہیں اور ثواب سے بھی محروم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہو جاتے ہیں اور درحقیقت اصل مصیبت زدہ وہی لوگ ہیں جو ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں۔

وانما المصاب من حرم الثواب. (رواه البيهقى فى دلائل النبوة)

جس نے اپنی تکلیف پر صبر کر کے ثواب لے لیا آخرت میں درجات بلند کروا لئے۔ اس کی تکلیف کوئی تکلیف نہیں ہے کیونکہ اُسے اس تکلیف کی قیمت مل گئی۔ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ مہینہ بھر ملازمت کی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے تکلیف اُٹھاتے ہیں۔

مزدور دن بھر دھوپ میں کام کرتے ہیں لیکن چونکہ ان سب کا معاوضہ مل جاتا ہے اس لئے یہ تکلیف خوشی سے برداشت کر لیتے ہیں اور اس کو تکلیف سمجھا ہی نہیں جاتا۔

دفع مصائب کے لئے نماز ...... صبر کے ساتھ نماز کا تذکرہ بھی فرمایا اور نماز کے ذریعہ بھی مدد حاصل کرنے کا حکم فرمایا۔ نماز بھی اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت لانے کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور ہر طرح کی پریشانیاں دُور کرنے کے لئے اکسیر ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی مشکل پیش آ جاتی تھی تو نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۱۷)

نماز فرض کا تو بہر حال اہتمام ہوتا ہی تھا۔ مشکلات سے نکلنے کے لئے اور حاجات پوری کرانے کے لئے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے ساتھ نفل نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ صلاۃ الحاجہ، صلاۃ الاستخارہ، صلاۃ التوبہ، صلاۃ الاستسقاء (بارش طلب کرنے کی نماز) یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ جو اللہ کی رحمت اور نصرت طلب کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی بعض روایات آیت کریمہ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے ذیل میں گزر چکی ہے لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ کوئی مصیبت آ جائے دنیا بھر کی تدبیریں کرتے ہیں اور مخلوق سے مدد چاہتے ہیں لیکن صبر اور صلاۃ کو مدد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اس کے برعکس بے صبری کرتے ہیں اور تھوڑے سے بہت چند افراد جو نمازیں پڑھتے ہیں وہ فرض نمازیں بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ نفل نمازوں میں لگنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور جن گناہوں میں مبتلا تھے۔ ان سب گناہوں میں بھی لگے رہتے ہیں پھر رحمت اور نصرت کیسے ملے؟ آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔ صابروں کے لئے یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہے۔ اگر حکومت کا کوئی معمولی درجہ کا آدمی بھی یقین دلا دے کہ فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں تو اس سے بڑی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ طبیعت میں بڑا اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے جو وعدہ فرمایا کہ میں صبر والوں کے ساتھ ہوں اس وعدہ پر عموماً لوگ یقین نہیں رکھتے اور صبر کے موقع میں بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ درحقیقت مؤمن کو کسی بھی جگہ ناکام ہونے اور گھبرانے کا کوئی موقع نہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر میں اور صبر و صلاۃ میں لگا رہے پھر اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں اُن کے بارے میں یوں نہ کہو کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا ادراک نہیں کرتے۔

شہداء کے فضائل

علامہ واحدی اسباب النزول ص ۴۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت بدر میں شہید ہو جانے والے مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جن میں آٹھ حضرات انصار میں سے اور چھ حضرات مہاجرین میں سے تھے۔ شہید ہو جانے والوں کے بارے میں بعض لوگوں نے یوں کہا کہ فلاں مر گیا اور دُنیا کی لذّت اور نعمت اس سے فوت ہو گئی تو آیت بالا کا نزول ہوا۔ اھ

اللہ کے دین کے پھیلانے اور حق کے آگے بڑھنے میں جو لوگ آڑے آتے ہیں اُن سے نپٹنے کے لئے جہاد اور قتال کرنا پڑتا ہے جب جہاد کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ سب کافر ہی مقتول ہوں اس میں بہت سے مسلمان بھی مقتول ہو جاتے ہیں ان مقتول مسلمانوں کو شہداء کا معزز خطاب دیا گیا ہے۔ شہیدوں کے بڑے مرتبے ہیں۔ اُن سے بلند درجات کے وعدے ہیں ان کی برزخی زندگی بھی دوسروں

سے ممتاز ہے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں یوں نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اُن پر موت طاری ہوئی ہے لیکن برزخی زندگی میں اُن کو امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ تم لوگ ان کی اس حیات کا ادراک نہیں کر سکتے۔

سورۂ آلِ عمران میں شہداء کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (اور اُن لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں، اللہ نے جو کچھ ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا اس پر خوش ہیں)

حیاتِ برزخیہ میں سب سے زیادہ قوی تر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ہے۔ اُن کے اجسام کو زمین نہیں کھاتی۔ حدیث شریف میں ہے۔

ان الله حرّم على الارض أن تاكل اجساد الانبياء. (رواہ ابو داؤد ص ۱۵۰ ج ۱) اور ان کی حیاتِ برزخیہ اس قدر ممتاز ہے کہ اس کے ظاہری آثار احکام دنیا بھی بعض اُمور میں ظاہر ہیں مثلاً ان کی میراث کا تقسیم نہ ہونا اور ازواج مطہرات کا ان کی وفات کے بعد دوسروں سے نکاح جائز نہ ہونا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ممتاز اور قوی تر حیاتِ برزخیہ کے بعد شہداء کی حیات کا درجہ ہے۔ جس کا آیت بالا میں اور سورۂ آل عمران کی آیت مذکورہ میں تذکرہ ہے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں کی حیات ہے جس کے ذریعہ قبر میں عذاب ہوتا ہے یا آرام ملتا ہے۔ ان کی تفصیلات احادیثِ شریفہ میں موجود ہیں۔

شہید چونکہ اپنا جان و مال لے کر حاضر ہو جاتا ہے اور اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے اُس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا مرتبہ ہے ان کا جو وہاں اکرام ہوتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ دُنیاوی زندگی اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہے۔ حضرت مسروق تابعی نے بیان فرمایا کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیت کریمہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. (الآیۃ) کے بارے میں معلوم کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ ہم نے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہداء کی رُوحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں اُن کے لئے قندیلیں ہیں جو عرش کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں یہ پرندے جنت میں جہاں چاہتے ہیں چلتے پھرتے ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان سے فرمایا کہ تم کچھ خواہش رکھتے ہو اُنہوں نے کہا ہم کیا خواہش کریں۔ (اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ) ہم جنت میں جہاں چاہیں پھرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے تین مرتبہ ان سے یہی سوال فرمایا جب اُنہوں نے دیکھا کہ سوال ہوتا ہی رہے گا کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی ہے تو عرض کیا اے رب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری رُوحیں دوبارہ جسموں میں واپس کر دی جائیں تاکہ ہم پھر تیری راہ میں مقتول ہو جائیں۔ جب اُنہوں نے کسی اور حاجت کا سوال نہ کیا (اور وہاں سے واپسی کا قانون نہیں ہے) تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ (رواہ مسلم ص ۱۳۵ ج ۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی بندہ وفات پا جاتا ہے جس کے لئے اللہ کے پاس خیر ہو (یعنی عذاب سے نجات ہو اور وہاں کی نعمتوں سے متمتع ہو رہا ہو) اُسے یہ خوشی نہیں ہوتی کہ دنیا میں واپس آ جائے۔ اگرچہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اُسے مل جائے سوائے شہید کے، شہید کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ دنیا میں دوبارہ آ جائے اور پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے کیونکہ وہ (وہاں پہنچ کر) شہادت کی فضیلت دیکھ لیتا ہے۔ (بخاری ص ۳۹۲ ج ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں

میری جان ہے۔ ضرور میری یہ خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ (بخاری ص۳۹۲ ج۱)

نبوت کا مرتبہ تو ہر مرتبہ سے فائق ہے اور برتر ہے پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی راہ میں بار بار شہید ہونے کی تمنا ظاہر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں بار بار قتل ہونے اور زندہ ہونے کی تمنا پوری نہ فرمائی لیکن آپ کو درجہ شہادت اس طرح سے عطا فرما دیا کہ غزوۂ خیبر میں جو ایک یہودی عورت نے بکری کے بھنے ہوئے دست میں زہر ملا کر دے دیا تھا۔ اُس کا اثر وقتی طور پر رُک گیا تھا لیکن وفات کے وقت اس نے اثر کیا اور وہ آپ کی وفات کا ذریعہ بن گیا۔

حقوق العباد کے علاوہ شہید کا سب کچھ معاف ہے ...... شہید کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن فی سبیل اللہ قتل ہو جانے سے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یُغفر للشھید کل ذنب الاّ الدَّین (کہ شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ قرض کے علاوہ)۔ (صحیح مسلم ص۱۳۵ ج۲)

جہاد میں اخلاص کی ضرورت ...... شہادت کا درجہ ملنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اللہ کی رضا کے لئے دشمنانِ دین سے جنگ کی ہو اور اُس میں مقتول ہوا ہو اور اللہ کی بات اُونچی کرنے کے لیے لڑا ہو۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص غنیمت کے لئے جنگ کرتا ہے ایک شخص اپنی شہرت کے لئے لڑتا ہے اور ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ بہادری میں اس کا مقام اور مرتبہ مشہور ہو جائے۔ سو اِن میں اللہ کی راہ میں کون سا ہے آپ نے فرمایا جو اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کی بات بُلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (صحیح بخاری ص۳۹۴ ج۱ و صحیح مسلم ص۱۳۹ ج۲)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری ظاہر کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے اور ایک شخص (قوم یا وطن) کی حمیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے اور ایک شخص رِیا کاری کے لئے جنگ کرتا ہے۔ سو ان میں اللہ کی راہ میں کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو اس لئے جنگ کرتا ہے کہ اللہ کی بات بلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (صحیح مسلم ص۱۴۰ ج۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جس کسی بھی شخص کو اللہ کی راہ میں زخم پہنچ جائے اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اُس کی راہ میں کس کو زخم پہنچا تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اُس کے زخم سے خون جاری ہوگا۔ رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ (صحیح مسلم ص۱۳۳ ج۲)

اس میں یہ جو فرمایا کہ ''اللہ ہی کو معلوم ہے جو اللہ کی راہ میں زخمی ہوا'' اس میں اُسی اخلاص کی طرف اشارہ ہے جس کی ہر عبادت میں ضرورت ہے۔ بندے ظاہری اعمال تو دیکھتے ہیں لیکن اصل معاملہ اللہ سے ہے اگر اللہ کے نزدیک اُس کی نیت یہ ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے تو عمل کا ثواب ملتا ہے اور وہ فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں جن کا وعدہ کیا گیا ہے اور اگر کسی عمل سے رِیا اور شہرت مقصود ہو تو اس سے ثواب کیا ملتا۔ وہ تو آخرت میں وبال بن جائے گا اور آخرت میں دوزخ میں داخل کرانے کا ذریعہ ہوگا۔

وطنی اور قومی جنگ میں قتل ہونے والے شہید نہیں ہیں ...... آج کل بھی دُنیا میں جنگ وجدال اور قتل وقتال جاری ہے لوگ برابر مر رہے ہیں قتل ہو رہے ہیں لیکن عموماً قومی، وطنی، لسانی، صوبائی عصبیت کی وجہ سے لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اللہ کی رضا کا کہیں سے کہیں تک بھی خیال نہیں۔ پھر ان لڑائیوں میں جو کوئی مارا جاتا ہے اس کو شہید بھی کہتے ہیں حالانکہ شہید وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید ہو اور اب تو شہید وطن اور شہید قوم کے الفاظ بھی زبانوں پر جاری ہیں اور صحیفوں جریدوں میں آ رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کافروں اور ملحدوں کے

لئے شہید کا لفظ استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ سب جہالت اور الحاد اور بے دینی کی باتیں ہیں۔ حفظنا اللہ من الضلال

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ

اور ضرور ضرور ہم تم کو آزمائیں گے کچھ خوف سے اور کچھ بھوک سے اور کچھ مالوں میں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے، اور خوشخبری سنا دیجئے

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ

صبر کرنے والوں کو۔ جن کی صفت یہ ہے کہ جب پہنچے ان کو کوئی مصیبت تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے عام رحمتیں ہیں اور خاص رحمت بھی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں۔

مختلف طریقوں سے آزمائش ہوگی

یہ دنیا دار الابتلاء اور دار الامتحان ہے۔ موت اور حیات کی تخلیق ہی ابتلاء اور امتحان کیلئے ہے۔ جیسا کہ سورۂ ملک میں فرمایا: تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۨ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں پورا ملک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے، جس نے پیدا فرمایا موت کو اور زندگی کو۔ تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں کون عمل کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے)

سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِیْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (اور البتہ ہم تم کو ضرور جانچیں گے تاکہ معلوم کرلیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں اور تاکہ ہم جان لیں تمہاری خبریں)

مذکورہ بالا آیت میں بھی ابتلاء و امتحان کا تذکرہ فرمایا اور لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کر کے فرمایا کہ ہم تم کو ضرور ضرور جانچ میں ڈالیں گے اور امتحان کریں گے۔ کبھی خوف ہوگا۔ کبھی بھوک سے دوچار ہوگے، مال کم ہوگا، جانیں بھی کم ہوں گی۔ اعزاء و اقرباء، اولاد اور احفاد فوت ہوں گے، پھلوں میں کمی ہوگی اس میں تمام امہات المصائب کا تذکرہ آ گیا، دنیا میں دُشمنوں کا خوف قحط سالی، سیلاب اور زلزلے، تجارتوں میں نقصان، مکانات کا گر جانا۔ اموال کا چوری ہونا، کہیں دفن کر کے بھول جانا، رکھے ہوئے مالوں کا تلف ہوجانا، کارخانوں کا بند ہوجانا، مشینوں کا خراب ہوجانا، بجلی کا بند ہوجانا، اعزہ و اقرباء اور احباب کی موتیں ہونا، وبائی امراض کا پھیل جانا، باغوں میں پھل کم آنا یا بہت زیادہ پھل آ کر آندھی سے گر جانا، کھیتوں میں کیڑا لگ جانا، ٹڈی آ جانا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب اُمور کی طرف اشارہ ہوگیا۔

مؤمن بندے صبر سے کام لیتے ہیں جس طرح کی بھی کوئی مصیبت درپیش ہو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اللہ کی قضا و قدر پر راضی رہتے ہیں اور ثواب کی اُمید رکھتے ہیں جو مصیبتیں درپیش ہوتی ہیں وہ گناہوں کی سزا کے طور پر بھی پیش آتی ہیں اور کفارہ سیئات کے لئے بھی ہوتی ہیں۔ امتحان کے لئے بھی ہوتی ہیں اور رفع دَرجات کے لئے بھی۔ قرآن مجید سے اور احادیث شریفہ سے یہ باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

مؤمن بندوں کو مصائب کا فائدہ ...... سورۂ نساء میں فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا) تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کیا اب کامیابی کی صورت ہے جبکہ ہر بدی کا بدلہ ملنا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابوبکر! اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ کیا تم مریض نہیں ہوتے ہو؟ یا تمہیں تکلیف نہیں پہنچتی؟ کیا تم رنجیدہ نہیں ہوتے، کیا تم کو کوئی مصیبت در پیش نہیں ہوتی؟ عرض کیا۔ ہاں! یہ چیزیں تو پیش آتی ہیں، آپ نے فرمایا ان چیزوں کے ذریعہ گناہوں کا بدلہ ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا اے ابوبکر! تم اور تمہارے اصحاب مؤمنین دنیا میں گناہوں کا بدلہ پائیں گے یہاں تک کہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کریں گے کہ کوئی گناہ باقی نہ ہوگا۔ لیکن دوسرے لوگ (یعنی کافر) ان کے سب گناہ جمع کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان سب کی سزا ان کو قیامت کے دن ملے گی۔ (ابن کثیر ص ۵۵۷، ۵۵۸ ج ۱)

سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (اور جو کوئی مصیبت تم کو پہنچے سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور اللہ معاف فرما دیتا ہے بہت سے گناہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی بندے کو کوئی تھوڑی یا زیادہ تکلیف پہنچتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت زیادہ ہے۔ پھر آپ نے آیت کریمہ: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ تلاوت فرمائی۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اُسے تکلیف میں مُبتلا فرما دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۸۴۳ ج ۲) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی درجہ مقرر کر دیا گیا جس درجہ میں وہ اپنے عمل کی وجہ سے نہ پہنچ سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو جسم یا مال میں یا اولاد میں (تکلیفوں کے ساتھ) مبتلا فرما دیتے ہیں پھر اس پر اس کو صبر دے دیتے ہیں یہاں تک کہ اُسے اُسی درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جو پہلے سے اُس کے لئے طے فرما دیا تھا۔ (رواہ احمد وابوداؤد کما فی المشکوٰۃ ص ۱۳۷)

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جو بھی کوئی تکلیف، مرض، فکر، رنج، اذیت، غم پہنچ جائے یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی لگ جائے تو اللہ تعالیٰ شانہٗ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ فرما دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۸۴۳ ج ۲)

ام السائب ایک صحابیہ تھیں۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے وہ کپکپا رہی تھیں آپ نے فرمایا کیا بات ہے کیوں کپکپا رہی ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ اس کا بُرا ہو بخار چڑھ گیا، آپ نے فرمایا بخار کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ بنی آدم کی خطاؤں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو ختم کر دیتی ہے۔ (صحیح مسلم ص ۳۱۹ ج ۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دنیا ہی میں سزا دے دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا روکے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو قیامت کے دن پوری سزا دے دیں گے۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو

جان مال اور اولاد میں برابر تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا کوئی گناہ بھی باقی نہ رہا ہوگا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بھی مسلمان کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں جو بالغ نہیں ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ ان بچوں پر رحمت فرمانے کی وجہ سے اس مسلمان کو (یعنی ان کے والد کو) جنت میں داخل فرما دیں گے۔ (بخاری ص ۱۶۷ ج ۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ عورتیں جمع ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامنے وعظ و نصیحت کی باتیں فرمائیں اور یہ بھی فرمایا کہ جس کسی کے تین بچے فوت ہو گئے وہ اس کے لئے دوزخ سے بچانے کے لئے آڑ بن جائیں گے ایک عورت نے کہا اگر کسی کے دو بچے فوت ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر کسی کے دو بچے فوت ہوئے ہوں تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (بخاری ص ۱۶۷ ج ۱)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو مسلمان (میاں بیوی) جن کے تین بچے فوت ہو جائیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرما دے گا اپنی رحمت کے فضل سے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر دو بچے فوت ہوئے ہوں؟ فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے۔ عرض کیا اگر ایک بچہ فوت ہوا ہو۔ فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بلاشبہ ادھورا بچہ اپنی ماں کو اپنی ناف کے ذریعہ کھینچتا ہوا لے جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ اگر اس کی ماں نے اس کی موت پر ثواب کی پختہ اُمید رکھی ہو۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵۳)

مؤمن بندوں کے لئے تکالیف اور مصائب کوئی گھبرانے اور پریشان ہونے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ تو اس کے لئے خیر ہی خیر ہے۔ فانی دنیا میں تھوڑی بہت تکلیفیں پہنچ گئیں اور آخرت کے مواخذہ سے بچ گیا اور وہاں کی نعمتوں سے مالا مال ہو گیا تو اس کے حق میں یہ سراسر بہتر ہی بہتر ہے اور نفع کا سودا ہے۔ بس صبر کرے۔ ثواب کی اُمید رکھے۔ اللہ کی قضا اور قدر پر راضی رہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مصیبت اور تکلیف دُور ہونے کی دُعا نہ کرے کیونکہ دُعا بھی سنت ہے اور ہمیشہ اللہ سے عافیت کا سوال کرے، مُصیبت، تکلیف اور مرض کا سوال بھی نہ کرے، آجائے تو صبر کرے۔

صابرین کی ایک خاص صفت ...... یہ فرمانے کے بعد کہ ہم تم کو ضرور ضرور آزمائیں گے۔ صابرین کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ. (صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو) پھر انکی صفات بیان فرمائیں۔ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب اُن کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں) یہ کلمہ بہت سے حقائق کو اپنے اندر سموئے ہوئے اور اس میں بہت بڑی تسلی ہے۔ اس میں اول تو زبان اور دل سے اس بات کا اقرار ہے کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں جب ہم اللہ ہی کے بندے ہیں۔ اس کی مخلوق ہیں اس کی مملوک ہیں تو ہمیں پوری طرح اپنے خالق و مالک کے فیصلے پر راضی ہونا ضروری ہے۔ ہم بھی اللہ ہی کے ہیں اور جو جان و مال اس نے لے لیا وہ بھی اللہ ہی کا ہے اس نے جو کچھ کیا اپنی مخلوق اور مملوک میں تصرف کیا۔ کسی کو بولنے، اعتراض کرنے دل اور زبان سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی کا بچہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں خبر بھیجی اور تشریف لانے کی گزارش کی۔ آپ نے اُن کو سلام کہلایا اور فرمایا اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَا اَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ (کہ بلاشبہ اللہ ہی کے لئے ہے جو

کچھ اُس نے لے لیا اور اُسی کے لئے ہے جو اس نے عطا فرمایا اور ہر ایک کی اُس کے نزدیک اجل مقرر ہے۔ لہٰذا صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی اُمید رکھے)۔ (بخاری ص ۱۷۲۱ ج ۲) دوسرے اس بات کا اعلان اور اقرار ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچیں گے تو ہم کو ہر ضائع اور فوت شدہ چیز کا ثواب مل جائے گا۔ اور یہ ثواب دنیا کی حقیر چیزوں سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے جن کے چلے جانے پر رنج ہوتا ہے۔ اپنے اعزا و اقرباء آل اولاد جو فوت ہو گئے ان سے بھی عارضی جُدائی ہے۔ جہاں وہ گئے وہیں ہم کو جانا ہے۔ وہاں دار النعیم میں ان شاء اللہ تعالیٰ اُن سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔

سنن ترمذی ص ۱۲۶ ج ۱ میں ہے کہ جب بندہ کا کوئی بچہ فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندہ کے بچے کو قبض کر لیا وہ کہتے ہیں کہ ہاں، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے اس کے دِل کے پھل کو قبض کر لیا وہ کہتے ہیں کہ ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے آپ کی تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اُس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ مسلمان مرد یا عورت کو جو بھی کوئی تکلیف پہنچ جائے اور اس کو بعد میں یاد کرے اگر چہ اس کو عرصۂ دراز گزر چکا ہو اور اُس وقت پھر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو پھر اُسی جیسا اجر عطا فرماتے ہیں جیسا کہ اُس دن عطا فرمایا تھا جس دن اُس کو مصیبت پہنچی تھی۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ص ۱۵۳ ج ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تب بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے۔ کیونکہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ایک مُصیبت ہے۔ (مشکوٰۃ عن شعب الایمان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا تو اللہ تعالیٰ اُس کی مصیبت کی تلافی فرما دیں گے اور اس کی آخرت اچھی کریں گے اور اسے ضائع شدہ چیز کے بدلہ اچھی چیز عطا فرمائیں گے۔ (درمنثور)

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ...... صابرین کی صفت بیان فرمانے کے بعد (کہ جب اُن کو مصیبت پہنچتی ہے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں) ان کے لئے جو بشارت ہے اس کا ذکر فرمایا اور وہ یہ کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

لفظ صلوٰت صلاۃ کی جمع ہے صلاۃ رحمت کو کہتے ہیں۔ اور صلوٰت کے ساتھ لفظ رحمت بھی مذکور ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ رحمت بطور تاکید کے لایا گیا ہے۔

وكرّر الرحمة لما اختلف اللفظ تاكيدا و إشباعا للمعنى. (قرطبی ص ۱۷۷ ج ۲)

مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صلاۃ کی نسبت ہو تو اس سے تزکیہ اور مغفرت مراد ہوتی ہے اور اس کو جمع لانے میں اس کی کثرت پر اور اس کی مختلف انواع پر تنبیہ فرمائی اور رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔ (ص ۱۱۷ ج ۱) بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ صلاۃ سے عام مہربانیاں اور رحمت سے خاص رحمت مراد ہے۔ رحمتوں کا انعام ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کہ صابرین جو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی قضا پر دل اور زبان سے رضامندی ظاہر کر کے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر حق اور ثواب کی راہ پانے والے ہیں۔ (بیضاوی ص ۱۱۸ ج ۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صابرین کے لئے صلوات اور رحمت کے وعدہ کے ساتھ ہی جو اُن کو ہدایت یافتہ بتایا اور اُن کی شان

ہیں المھتدون فرمایا۔ یہ زائد چیز بھی بہت عمدہ ہے رحمتوں کا وعدہ بھی اور ہدایت پر ہونے کا اعلان بھی یہ سب کچھ نفع ہی نفع ہے اور خیر ہی خیر ہے۔

صبر سے متعلق چند فوائد

فائدہ (۱) ......اس دنیا کا یہ مزاج ہے کہ دُکھ تکلیف کا ہر ایک کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور نہ آرام ہمیشہ رہتا ہے اور نہ تکلیف ہمیشہ رہتی ہے۔ مؤمن بندے صبر اور شکر کو اختیار کرتے ہیں۔ جو لوگ صبر نہیں کرتے اجر سے محروم ہوتے ہیں۔ شدہ شدہ کچھ دن کے بعد ان کو بھی صبر آ ہی جاتا ہے اور مصیبت کو بھول جاتے ہیں لیکن اس صبر کا کوئی اعتبار نہیں اجر و ثواب اور فضیلت اُسی صبر کے متعلق ہے جو عین مصیبت کے وقت ہو۔ حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم اگر تو صدمہ اولیٰ کے وقت صبر کرے اور ثواب کی اُمید باندھے تو میں تیرے لئے جنت کے علاوہ کسی دوسرے ثواب سے راضی نہ ہوں گا (یعنی تیرے صبر اور احتساب کا بدلہ جنت ہی ہے)۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۱۴ ج ۱)

صحیح بخاری (ص ۱۷۱ ج ۱) اور صحیح مسلم (ص ۳۰۲ ج ۱) میں ایک قصہ لکھا ہے جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عورت پر گزر ہوا وہ ایک قبر کے پاس رو رہی تھی آپ نے اس سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر اور صبر کر، اس عورت نے آپ کو پہچانا نہیں، کہنے لگی کہ ہٹو مجھے چھوڑ دو کیونکہ تمہیں وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے (اگر تمہیں ایسی مصیبت پہنچتی تو پتہ چلتا کیسی مصیبت ہے اس کے بعد آپ تشریف لے گئے) اس عورت سے کسی نے کہا کہ (تجھے معلوم ہے کس کو تو نے بے ڈھنگا جواب دیا ہے) آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ سن کر وہ عورت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئی دروازہ پر پہنچی تو وہاں دربان (چوکیدار) نہ پائے (حالانکہ اس کو خیال تھا کہ آپ بہت ٹھاٹ باٹھ سے رہتے ہوں گے اور آپ کے دروازے پر بادشاہوں کی طرح دربان ہوں گے یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی کہ سید الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی سادہ زندگی ہے) کہنے لگی یا رسول اللہؐ! میں آپ کو پہچانی نہیں (اس لئے ایسا جواب دیا) آپ نے فرمایا اصلی صبر وہی ہے جو تازہ تازہ مصیبت کے موقع پر ہو (کیونکہ وقت گزر جانے پر خود ہی صبر آ جاتا ہے)۔

اس حدیث میں اسی خاص نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن و حدیث میں جو صبر کی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں۔ اُس سے وہ صبر مراد ہے جو عین مصیبت اور تکلیف کے وقت ہو نیا نیا حادثہ ہے ابھی ابھی کسی کی موت ہوئی یا رقم کھوگئی دل رنجیدہ ہے اس وقت اگر ہم نے صبر کر لیا تو اس صبر کی بہت بڑی قیمت ہے اور بہت بڑی فضیلت ہے۔ بلکہ حقیقت میں صبر ہی وہی ہے جو دل دکھا ہوا ہونے کے وقت ہو کیونکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے مصیبت کا احساس طبعی طور پر کم ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ کچھ دن کے بعد تکلیف کا بالکل احساس نہیں رہتا۔ وقت گزر جانے پر جب مصیبت بھول بھلیاں ہوگئی تو یہ نہ صبر ہے اور نہ اس کی کوئی فضیلت ہے اس میں مؤمن کافر سب برابر ہیں جس صبر پر مؤمنین سے اجر کا وعدہ ہے اس سے وہی صبر مراد ہے جو اس وقت ہو جبکہ رنج تازہ ہو، دل بے چین ہو طبیعت بے قرار ہو۔ برے برے وسوسے آ رہے ہوں۔ زبان اللہ پاک پر اعتراض کرنے کے لئے کھلنا چاہتی ہو۔ نفس خلافِ شرع کاموں پر اُبھارتا ہو۔ ایسی حالت میں صبر کرنا باعث اجر ہے۔

فائدہ (۲) ......کسی کی موت پر دل کا رنجیدہ ہونا یا آنکھوں سے آنسو آ جانا یا زبان سے رنج اور تکلیف کا اظہار کر دینا یہ بے صبری نہیں۔ صحیح بخاری میں (ص ۱۷۴ ج ۱) ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی جان کنی کے وقت

تشریف لائے اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (عام لوگ تو بچوں کی موت پر روتے ہی ہیں) بھلا آپ بھی رونے لگے آپ نے فرمایا یہ طبعی رحمت ہے (جو اللہ پاک نے دل میں رکھی ہے) پھر فرمایا کہ بے شک آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور دل غم زدہ ہے اور زبان سے ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو پھر فرمایا اے ابراہیم! تمہاری جدائی سے ہم کو رنج ہے۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں اور دل کے رنج پر عذاب نہیں دیتا لیکن وہ زبان کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم فرماتا ہے۔ (ص ۱۷۴ ج ۱) یعنی زبان سے بُرے کلمات کہنے اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے پر گرفت اور عذاب ہے اور اگر یوں کہا کہ میں اللہ کی قضا اور قدر پر راضی ہوں اس نے جو کچھ کیا بہتر ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔

فائدہ (۳) ...... جس طرح زبان سے بُرے کلمات نکالنا ممنوع ہے اور بے صبری ہے اسی طرح عمل سے کوئی ایسی حرکت کرنا جو صبر کے خلاف ہے یا غیر مسلموں کا طریقہ ہے اس کو اختیار کرنا بھی سخت ممنوع ہے۔ لوگوں کی عادت ہے کہ مصیبت، دُکھ، تکلیف کے وقت خاص کر جب کوئی بچہ فوت ہو جائے اپنے چہرے پر طمانچے مارتے ہیں۔ دیوار پر سر دے کر مارتے ہیں گریبان پھاڑتے ہیں جاہلانہ الفاظ زبان سے نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا ہی بچہ رہ گیا تھا جو اُسے اللہ نے موت دی۔ یہ سب جہالت ہے اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کفر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں جو رُخساروں پر طمانچے مارے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی دُھائی دے۔ (صحیح مسلم ص ۷۰ ج ۱)

بعض علاقوں میں مرنے والے کے سوگ میں بال منڈا دیتے ہیں اور خاص کر عورتیں تو بہت ہی چیختی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس سے بری ہوں جو (کسی کی موت پر) سر مونڈے آوازیں بُلند کرے اور کپڑے پھاڑے۔ (صحیح مسلم ص ۷۰ ج ۱)

عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ عزیزوں کی موت پر چیختی اور چلاتی ہیں۔ گھر سے باہر آوازیں جاتی ہیں اور برس چھ مہینے تک جو بھی کوئی مہمان آئے اُس کے سامنے زبردستی کا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور نوحہ کرنا ان کی ایک خاص عادت ہے۔ میت کو خطاب کر کے کہتی ہیں اے میرے پیارے! اے میرے جوان! اے بیٹا! تو کہاں گیا۔ مجھے کس پر چھوڑی تو ایسا تھا ویسا تھا، اور اس طرح کی بہت سی باتیں پکار پکار کر بیان کرتی ہیں اور رونا پیٹنا مہینوں تک کے لئے اُن کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ باوجود منع کرنے کے اور شرعی ممانعت کے جاننے کے نوحہ کرتی رہتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے لعن اللہ النائحة والمسمعة کہ اللہ کی لعنت ہو نوحہ کرنے والی پر اور اس کا نوحہ سننے والی پر۔ (رواہ ابو داؤد) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والی پر لعنت فرمائی اور ساتھ ہی نوحہ سننے والی پر بھی (کیونکہ نوحہ کرنے والی کا نوحہ سننے کے لئے جو عورتیں جمع ہوں وہ بھی نوحہ کا سبب بنتی ہیں۔ عموماً نوحہ کرنے والی عورت تنہائی میں نوحہ نہیں کرتی) صحیح مسلم ص ۳۰۳ میں ہے کہ نوحہ کرنے والی موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے بدن پر ایک کُرتہ قطران کا ہوگا اور ایک کُرتہ کھجلی کا ہوگا۔

عرب میں قطران ایک درخت کا پانی ہوتا تھا جس کو کھجلی والے بدن پر لگاتے تھے اس کی خاصیت تیزاب جیسی تھی اس سے کھجلی جل جاتی تھی اور کھجلی جل کر آرام ہو جاتا نوحہ کرنے والی کے جسم پر قیامت کے دن اوّل تو کھجلی مسلط کی جائے گی۔ گویا کُرتے کی جگہ کھجلی کا لباس ہوگا پھر اس کھجلی پر قطران لگا ہوا ہوگا جس کی وجہ سے مزید تکلیف ہوگی دنیا میں رواج ہے کہ جب کسی کو ایگزیما اور داد ہو جاتا ہے تو اس پر تیزاب لگا دیتے ہیں۔ اس سے جو تکلیف ہوتی ہے بیان سے باہر ہے اور یہ تکلیف دنیا میں ہوتی ہے آخرت کی تکلیف دنیا کی

تکلیفوں سے کہیں زیادہ ہے۔ (العیاذ باللہ) پھر دنیا میں جو تیزاب لگاتے ہوا س سے اگیزیما اور داد اچھا ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں چونکہ عذاب دینا مقصود ہوگا اس لئے قطران لگا ہوا ہونے سے کھجلی نہیں جائے گی بلکہ اور شدید تکلیف ہوتی رہے گی۔

فائدہ (۴)...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کے ساتھ ایک اور دعا بھی حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ جس کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچ جائے اور وہ اللہ جل شانہٗ کے فرمان کے مطابق اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھے (اور ساتھ ہی یہ بھی پڑھے اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَيْرًا مِّنْهَا۔

(اے اللہ میری مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کے بدلہ مجھے اس سے بہتر عنایت فرما)۔

تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ جب ابوسلمہ کی وفات ہوگئی تو میں نے (دل) میں کہا کہ ابوسلمہ سے بہتر کون سا مسلمان ہوگا؟ اس کا گھرانہ پہلا گھرانہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ پھر بھی میں نے مذکورہ دعا پڑھ لی لہٰذا مجھے اللہ تعالیٰ نے ابوسلمہ کے بدلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی عطا فرما دی۔ (یعنی آپ سے نکاح ہو گیا) اور آپ ابوسلمہ سے بہتر ہیں۔ (صحیح مسلم ص ۳۰۰ ج ۱)

فائدہ (۵)...... یہاں تک جو متعدد احادیث کا ترجمہ لکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے دنیاوی تکالیف اور مصائب، امراض و آلام سب نعمت ہیں ان کے ذریعہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ درجات بُلند ہوتے ہیں اور گناہوں کا کفّارہ ہو جانے کی وجہ سے برزخ اور روزِ قیامت کے عذاب سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ مؤمن بندوں پر لازم ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ ہر حال کو برداشت کرتے چلیں اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی بہت زیادہ پختہ اُمید رکھیں اور یقین جانیں کہ ہمارے لئے صحت و عافیت بھی خیر ہے اور دُکھ تکلیف بھی بہتر ہے۔ اصل تکلیف تو کافر کی تکلیف ہے اُسے تکلیف بھی پہنچی اور ثواب بھی نہ ملا۔ مؤمن کی تکلیف، تکلیف نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مصیبت و تکلیف اور مرض کی دُعا کیا کریں یا شفا کی دعا نہ مانگیں۔ کیونکہ جس طرح صبر میں ثواب ہے شکر میں بھی ثواب ہے۔ سوال تو عافیت ہی کا کریں اور کرتے رہیں اور تکلیف پہنچ جائے تو صبر کریں۔

فائدہ (۶)...... بہت سے لوگ جو آرام و راحت اور دکھ تکلیف کی حکمت اور اس بارے میں قانون الٰہی کو نہیں جانتے بہت سی بے تکی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ جہان کی ساری مصیبتیں مسلمانوں پر ہی آپڑی ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ کافروں کو محلات اور قصور اور مسلمان کو صرف وعدۂ حور، کبھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیروں کو خوب نوازا ہے اور اپنوں کو فقر و فاقہ اور دوسری مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے، یہ جاہل اتنی بات نہیں جانتے کہ اپنا ہونے ہی کی وجہ سے تو مسلمانوں کو تکلیفوں اور مصیبتوں میں مبتلا فرمایا جاتا ہے تاکہ ان کے گناہ معاف ہوں۔ درجات بلند ہوں۔ اور آخرت میں گناہوں پر سزا نہ ہو در حقیقت یہ بہت بڑی مہربانی ہے کہ دنیا کی تھوڑی بہت تکلیف میں مُبتلا فرما کر آخرت کے شدید عذاب سے بچا دیا جاتا ہے، اور کافروں کو چونکہ آخرت میں کوئی نعمت نہیں ملنی۔ کوئی آرام نصیب نہیں ہونا بلکہ ان کے لئے صرف عذاب ہی عذاب ہے۔ اس لئے ان کو دنیا زیادہ دے دی جاتی ہے اور اُن پر مصیبتیں کم آتی ہیں۔ اگر کسی کافر نے خدمتِ خلق وغیرہ کا کوئی کام کیا تو اس کا عوض اس دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ لیکن آخرت میں اُسے ذرا سی بھی خیر اور معمولی سا بھی آرام نہ ملے گا اور اَبدالآباد تک دوزخ میں رہے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اُنہوں نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ چٹائی اور آپ کے جسم کے درمیان کوئی بستر نہیں ہے۔

چٹائی کی بناوٹ نے آپ کے مبارک پہلو میں نشان ڈال دیئے ہیں۔ آپ ایسے تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے ہیں جو چمڑے کا ہے۔ جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت کو خوب مال دیدے۔ کیونکہ فارس اور روم کے لوگوں کو وسعت دی گئی ہے اور وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابن خطاب! کیا تم (ابھی تک) اسی (سوچ بچار) میں پڑے ہو (تمہیں معلوم نہیں) کہ ان لوگوں کو عمدہ چیزیں اس دنیا میں دے دی گئی ہیں (آخرت میں اُن کو کچھ نہیں ملنا) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یوں فرمایا کہ تم اُس پر راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت ہو۔ (مشکوۃ المصابیح ص ۴۴۷)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر اس بات میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ

يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ان دونوں کے درمیان آنا جانا کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان ہے جاننے والا ہے۔

حج وعمرہ میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کرنے کی مشروعیت اور اس کی ابتداء

شعائر شعیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں صفا اور مروہ مکہ معظمہ میں دو پہاڑیاں ہیں جو کعبہ شریف سے تھوڑے سے فاصلے پر واقع ہیں ان میں صفا بہ نسبت مروہ کے کعبہ شریف سے زیادہ قریب ہے، حج اور عمرہ میں سات مرتبہ ان دونوں پر آنا جانا ہوتا ہے۔ اس کو سعی کہا جاتا ہے یہ حج اور عمرہ دونوں میں واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے صفا اور مروہ کو شعائر اللہ میں سے فرمایا جس کا معنی یہ ہے کہ یہ دونوں اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کے درمیان سعی کی جاتی ہے جو مناسک حج میں سے ہے اور حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے۔ اس اعتبار سے دینِ اسلام میں ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان آنے جانے کی ابتداء کس طرح ہوئی اس کا واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری ص ۴۷۴ ج ۱ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو مکہ معظمہ میں چھوڑ کر تشریف لے گئے (جو اس وقت چٹیل میدان تھا) ان کے پاس ایک تھیلہ میں کچھ کھجوریں اور مشکیزہ میں پانی رکھ دیا، جب واپس ہونے لگے تو حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے ہولیں۔ اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیم! ہمیں یہاں چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یہاں نہ کوئی انسان ہے نہ اور کوئی چیز ہے کئی بار اُنہوں نے یہی سوال کیا وہ سوال کر رہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ نہیں فرما رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے سوال کیا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا، ہاں! وہ کہنے لگیں بس تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اپنے بچہ اسماعیل کو دُودھ پلاتی رہیں اور جو پانی موجود تھا اس میں سے پیتی رہیں، مشکیزہ میں جو پانی تھا جب وہ ختم ہو گیا تو خود بھی پیاسی ہو گئیں اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا، وہ بچہ کو تڑپتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ جب اس کی حالت نہ دیکھی جا سکی تو صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں تا کہ بچہ پر نظر نہ پڑے، صفا پر کھڑے ہو کر نظر ڈالی کہ کوئی شخص نظر آتا ہے یا نہیں، وہاں کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اُتر کر مروہ کی طرف چلیں، درمیان میں نشیب تھا وہاں پہنچیں تو تیزی کے ساتھ

دوڑ کر گزر گئیں، مروہ پر پہنچ کر پھر نظریں ڈالیں کہ کوئی شخص نظر آتا ہے یا نہیں، وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ سات مرتبہ ایسا ہی کیا (کبھی صفا پر جاتیں کبھی مروہ پر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں تک پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں (یعنی یہ سعی کی ابتداء ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کے عمل کو حج وعمرہ کی عبادت کا جزو بنا دیا) جب آخری مرتبہ وہ مروہ پر تھیں تو اُنہوں نے ایک آواز سنی، آواز سن کر اپنے نفس کو خطاب کر کے کہنے لگیں کہ مطمئن ہو جا۔ اس کے بعد اُنہوں نے کان لگایا تو پھر آواز سنی، آواز سن کر کہنے لگیں (کہ اے بولنے والے) تو نے آواز تو سنا دی اگر تیرے پاس کوئی مدد کی صورت ہے تو ہماری مدد کر دے، اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ جس جگہ زمزم ہے وہاں فرشتہ نے اپنی ایڑی سے تھوڑی سی زمین کریدی۔ یہاں تک کہ زمین پر پانی ظاہر ہو گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے وہاں حوض کی صورت بنانی شروع کر دی اور اس میں سے اپنے مشکیزہ میں پانی بھر لیا، مشکیزہ میں بھرنے کے بعد بھی پانی جوش مار رہا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رحم فرمائے اسماعیل کی والدہ پر اگر وہ زمزم کو (اپنے حال پر) چھوڑ دیتیں تو زمزم (زمین پر) جاری ہونے والا چشمہ ہوتا، اب انہوں نے اس میں سے پانی پیا اور بچہ کو دُودھ پلایا۔ اور فرشتے نے ان سے کہا کہ تم نے ضائع ہونے سے نہیں ڈرنا کیونکہ یہاں بیت اللہ ہے جسے یہ لڑکا اور اس کا والد دونوں مل کر تعمیر کریں گے، فرشتہ نے یہ بھی کہا بلاشبہ اللہ اپنوں کو ضائع نہیں فرماتا، (اس کے بعد بخاری شریف میں وہاں بنی جرہم کے آباد ہونے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اسی قبیلہ میں شادی ہونے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تشریف لانے کا اور کعبہ شریف تعمیر کرنے کا ذکر ہے) اللہ تعالیٰ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کا صفا مروہ کے درمیان آنا جانا ایسا پسند آیا کہ حج عمرہ کرنے والوں کے لئے اس کو احکام حج وعمرہ میں داخل فرما دیا۔ اللہ کی راہ میں قربانی والوں کی عجیب شان ہوتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں صفا مروہ کی سعی ...... صحیح بخاری ص ۶۴۶ ج ۲ میں حضرت عاصم بن سلیمان سے نقل کیا ہے کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صفا مروہ کے بارے میں دریافت کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ اُن پر آنے جانے کو جاہلیت کے کاموں میں سے سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ہم ان پر جانے سے رُک گئے اللہ تعالیٰ نے آیت إن الصفا والمروة الآية نازل فرمائی۔ صحیح مسلم ص ۴۱۴ ج ۱ میں اس بارے میں متعدد روایات درج ہیں ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں انصار منات کے لئے احرام باندھتے تھے (جو ایک مشہور ومعروف بُت تھا) جب اُس کے لئے احرام باندھتے تو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو حلال نہیں سمجھتے تھے جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لئے آئے تو اُنہوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ بیان فرما کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ اس کا حج پورا نہیں کرے گا جس نے صفا مروہ کے درمیان سعی نہ کی، صحیح بخاری ص ۲۲۲ ج ۱ میں ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے متعدد اہلِ علم سے سنا ہے کہ عام طور پر زمانہ جاہلیت میں لوگ صفا مروہ کی سعی کیا کرتے تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کا حضرت عائشہؓ نے ذکر فرمایا (کہ جو لوگ منات کے لئے احرام باندھتے تھے وہ صفا مروہ پر آنے جانے سے بچتے تھے) جب قرآن مجید میں طواف بیت اللہ کا حکم آیا (جو سورۂ حج میں ہے) اور صفا مروہ کا ذکر نہیں آیا تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم صفا مروہ پر آیا جایا کرتے تھے اور یہ جاہلیت کے زمانہ کی بات تھی۔

اللہ تعالیٰ نے طواف کے بارے میں حکم نازل فرمایا اور صفا و مروہ کا ذکر نہیں فرمایا تو کیا اس بات میں کچھ حرج ہے کہ ہم صفا مروہ پر آنا جانا کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (آخر تک) نازل فرمائی۔ اس کے بعد ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے

فرمایا کہ آیت بالا دونوں فریقین کے بارے میں نازل ہوئی جو لوگ زمانہ جاہلیت میں صفا مروہ پر نہیں جاتے تھے ان کے بارے میں بھی اور جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں صفا مروہ پر جاتے تھے پھر زمانۂ اسلام میں جانے کو پسند نہ کیا ان کے بارے میں بھی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری ص ۵۰۰ ج ۳ میں اس بارے میں لمبی بحث کی ہے اور روایات میں تطبیق دینے کی کوشش فرمائی۔ نسائی سے نقل کیا ہے کہ صفا اور مروہ پر تانبہ کے دو بت تھے۔ ایک کا نام اساف تھا اور دوسرے کا نام نائلہ تھا۔ مشرکین (حج یا عمرہ میں صفا مروہ پر جاتے تھے تو ان کو ہاتھ لگاتے تھے) حضرت شعبی سے منقول ہے کہ ایک بت صفا پر تھا جس کا نام اساف تھا اور ایک بت مروہ پر تھا جس کو نائلہ کہا جاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو ان دونوں کو پھینک دیا گیا اب مسلمان کہنے لگے کہ صفا مروہ پر آنا جانا جاہلیت والوں کا کام ہے جو اپنے بتوں کی وجہ سے ان پر آتے جاتے تھے لہٰذا ان دونوں کے درمیان سعی کرنے سے رُک گئے اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علمی جواب ...... حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجہ حضرت عروہ نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا اس میں لفظ لَا جُنَاحَ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص صفا مروہ کی سعی نہ کرے تو کچھ حرج نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اے میری بہن کے بیٹے اگر بات اس طرح ہوتی جیسے تم کہہ رہے ہو تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا (یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں جو صفا مروہ پر آنا جانا نہ کرے) آیت میں تو یوں ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں جو صفا مروہ پر آنا جانا کرے، پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جو صفا مروہ پر جانے سے رُکتے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ اب صفا مروہ پر جائیں یا نہ جائیں؟ تو اس پر یہ آیت اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ صفا مروہ پر جانے میں کچھ حرج نہیں ہے پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ صفا مروہ کی سعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع فرمائی ہے۔ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان سعی چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری ص ۲۲۲ ج ۱)

سعی کے مسائل ...... مسئلہ ...... صفا مروہ کی سعی طواف کے بغیر معتبر نہیں ہے۔ حج کی سعی طواف قدوم کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور طوافِ زیارت کے بعد بھی، اور طوافِ زیارت کے بعد سعی کرنا افضل ہے۔ البتہ جس کا حجِ قران ہو اُسے طواف قدوم کے بعد کرنا افضل ہے۔

مسئلہ ...... پہلے زمانے میں صفا مروہ کے درمیان ایک جگہ نشیب تھا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ وہاں سے دوڑ کر گزری تھیں اس لئے حج وعمرہ میں سعی کرنے والے بھی اس جگہ دوڑ کر گزرتے ہیں۔ اب نشیب نہیں ہے زمین برابر ہموار ہے اُوپر چھت پڑی ہوئی ہے اس جگہ کی نشانی کے لئے ہرے ستون بنا دیئے گئے ہیں۔ ایک ہرے ستون سے دوسرے ہرے ستون تک دوڑ کر چلنا مسنون ہے۔

مسئلہ ...... سعی کے صرف سات چکر ہیں۔ صفا سے مروہ تک ایک چکر اور مروہ سے صفا تک دوسرا چکر ہوتا ہے اسی طرح سات چکر پورے کئے جائیں، صفا سے شروع کر کے مروہ پر سعی ختم کی جائے۔

مسئلہ ...... سعی خود کرنا واجب ہے اس میں نیابت نہیں ہو سکتی (الا یہ کہ کوئی شخص احرام سے پہلے بے ہوش ہو جائے تو دوسرا شخص اس کی طرف سے احرام باندھ لے اور مکہ معظّمہ پہنچ کر اس کی طرف سے طواف قدوم اور سعی کرے تو یہ صحیح ہے بشرطیکہ اس سے پہلے اسے ہوش نہ آیا ہو)۔

مسئلہ...... سعی پیدل کرنا لازم ہے اگر کسی نے بلا عذر سواری پر سعی کی اور پھر اعادہ نہیں کیا یعنی دوبارہ نہیں کی تو دم واجب ہوگا۔

مسئلہ...... اگر کوئی شخص سعی چھوڑ کر مکہ معظمہ سے چلا گیا تو اس کی تلافی کے لئے ایک دم واجب ہوگا۔

مسئلہ...... ہرے ستونوں کے درمیان تیزی سے چلنا صرف مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں (کیونکہ ان کی طرف سے ان کی جنس کی ایک عورت یہ کام کر چکی اور اُسی کے عمل کی تو یہ نقل ہے جو حج اور عمرہ کا جز و بنادی گئی ہے)

آیت کے اخیر میں فرمایا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ کہ جو بھی شخص کوئی اچھا کام اپنی خوشی سے کردے (جو اُس پر فرض واجب نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی ثواب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اعمالِ صالحہ کی قدردانی فرماتے ہیں اور جو شخص کوئی عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی پوری طرح خبر ہے۔ خیر و شر کا کوئی ذرّہ اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَٰتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِي

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اُن چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں جو واضح چیزیں ہیں اور ہدایت کی باتیں ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لئے

الْكِتَٰبِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا

کتاب میں بیان کیا یہ چھپانے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت فرماتا ہے اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں لعنت کرنے والے۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی

وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾

اور اصلاح کی اور بیان کیا سو یہ وہ لوگ ہیں میں جن کی توبہ قبول کروں گا اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہوں رحیم ہوں۔

حق چھپانے والوں کی سزا

علامہ واحدی نے اسباب النزول ص ۴۳ ج ا میں لکھا ہے کہ یہ آیت علماء اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جنہوں نے آیتِ رجم کو چھپایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو (جو توریت شریف میں پڑھتے آئے تھے) پوشیدہ رکھا۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور بعض دیگر انصار نے بعض علماءِ یہود سے توریت کی بعض باتیں دریافت کیں تو انہوں نے بتانے سے انکار کردیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ (ص ۱۶۱ ج ا) نیز درمنثور ص ۱۶۲ ج ا میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوالعالیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اہلِ کتاب کا ذکر ہے جنہوں نے حسد کی وجہ سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی نعت کا کتمان کیا (یعنی اس بات کو بھی چھپایا کہ توریت شریف میں آپ کی بعثت کا ذکر ہے اور آپ کی نعت اور صفت جو توریت شریف میں مذکور تھی اس کو بھی پوشیدہ رکھا) حالانکہ وہ یہ سب کچھ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے تھے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر جو کھلی کھلی آیات واضحہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں جن میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ بھی تھا۔ اس کو اہلِ کتاب نے چھپایا اور پوشیدہ رکھا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اَلْهُـدٰى کا عطف ہے البینٰت پر اور اس سے عمومی طور پر ہدایت کی سب چیزیں مراد ہیں۔ جن میں حضرت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع کرنا بھی شامل ہے۔ اور آیات اگرچہ اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن ان کا حکم سب کے لئے عام ہے یعنی علمِ دین کا چھپانا ہر جاننے والے کے لئے گناہ ہے۔ (ص ۲۶۔ ۲۷ ج ۲)

صحیح بخاری ص ۲۲ ج ۱ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اگر دو آیتیں نہ ہوتیں (جن میں علم چھپانے کی وعید مذکور ہے) تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا پھر انہوں نے مذکورہ بالا آیات تلاوت فرمائیں اور سنن ابن ماجہ ص ۲۳ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا علم چھپایا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دینی معاملہ میں نفع پہنچاتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کے منہ میں آگ کی لگام لگائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ آیات بیّنات اور ہدایت کے چھپانے والوں کے بارے میں فرمایا: اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (کہ اللہ تعالیٰ اُن پر لعنت فرماتا ہے اور دُوسرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں) لعنت کا معنی ہے رحمت سے دور کر دینا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دور فرماتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان کے لئے بددُعا کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور ہوں۔ تفسیر درمنثور ص ۱۶۲ ج ۱ میں حضرت عطاء سے نقل کیا ہے کہ لعنت کرنے والوں سے جنات اور انسان اور زمین پر چلنے والے تمام جاندار مُراد ہیں پھر فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا (الآیۃ) یعنی جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی اور بیان کردیا تو میں ان کی توبہ قبول کرلوں گا۔

حق چھپانے اور گمراہ کرنے والوں کی توبہ کی شرائط ...... صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا ای رجعوا عن الکتمان أو عنہ وعن سائر ما یجب أن یتاب عنہ (ص ۲۸ جلد ۲) (یعنی وہ لوگ لعنت سے بچ جائیں گے جنہوں نے علم کے چھپانے سے اور ہر اُس عمل سے توبہ کی جس سے توبہ کرنا لازم ہے)۔

پھر فرمایا وَاَصْلَحُوْا اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں اصلحوا ما افسدوا بالتدارک فیما یتعلق بحقوق الحق والخلق ومن ذلک أن یصلحوا قومھم بالارشاد إلی الاسلام بعد الاضلال وان یزیلوا الکلام المحرف ویکتبوا مکانہ ما کانوا ازالوہ عندالتحریف یعنی توبہ کرنے کے ساتھ اصلاح بھی کریں، جو فساد کیا تھا اس کو دُور کریں حق کے چھپانے کی وجہ سے خالق جل مجدہ اور مخلوق کے جو حقوق تلف ہوئے تھے ان کا تدارک کریں اور جن لوگوں کو گمراہ کیا تھا اُن کو اسلام قبول کرنے کی طرف دعوت دیں اور بتادیں کہ ہم نے تم کو حق سے روکا تھا حق یہ ہے جو ہم اب کہہ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جو کچھ تحریف کی تھی اس کو درست کردیں، غلط کو ہٹادیں اور صحیح کو اس کے قائم مقام کردیں۔

پھر فرمایا وَ بَیَّنُوْا اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں أی اظھر ما بینہ اللہ تعالی معاینۃ (یعنی اللہ تعالیٰ شانہ نے جو کچھ بیان فرمایا تھا اور انہوں نے اُس کو چھپا دیا تھا اب اس کو خوب واضح طور پر بیان کریں)۔

نیز صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں وبھذین الامرین تتم التوبۃ یعنی جن لوگوں نے حق کو چھپایا، فساد کیا، لوگوں کو گمراہی پر ڈالا ان کی توبہ اُسی وقت پوری ہوگی جب وہ اصلاح بھی کریں اور بیان بھی کریں۔ ان کے قول و فعل سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور عوام و خواص میں جو گمراہی پھیلی اس کی تلافی کریں جو حقوق تلف ہوئے ہیں ان کا تدارک کریں۔

یہ بات بہت اہم ہے جس کی طرف لوگوں کو بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بہت سے آزاد خیال لوگ جو اہلِ حق کو چھوڑ کر خود رو مجتہد اور مجدّد بن جاتے ہیں اور مصنف اور مضمون نگار ہونے کے زعم میں زورِ قلم دکھاتے ہیں ایسے لوگ اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر اپنی راہ نکالتے ہیں اور اُسی کی اشاعت کرتے ہیں یہ لوگ اگر توبہ کرنے لگیں تو صرف تنہائی میں توبہ کرنا کافی نہیں ہے ان لوگوں پر لازم ہے کہ صاف صاف اعلان کریں اور عوام کو بتائیں کہ فلاں فلاں عقیدہ یا عمل کی جو ہم نے اہلسنّت والجماعت کے مسلک کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی ہے وہ غلط

ہے۔ آج کل فتنوں کا دور ہے۔ بہت سے لوگ صریح کفر اختیار کر لیتے ہیں اور اس کی تبلیغ واشاعت بھی کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب توبہ کرتے ہیں تو چپکے سے توبہ کر کے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر لازم ہے کہ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا تینوں پر عمل کریں۔

فائدہ اولیٰ...... جہاں علمِ دین کا چھپانا گناہ ہے وہاں یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ جو شخص واقعی عالم ہو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے واقف ہو حلال حرام کا علم رکھتا ہو مسائل سے پوری طرح واقف ہو مسئلہ بتانے میں فتویٰ دینے کا مقام اُسی شخص کا ہے۔ غلط مسئلہ بتانے کا وبال بھی بہت زیادہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من سئل علم علمه ثم کتمه اُلجم یوم القیامة بلجام من نار** (کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا تھا پھر اُس نے اُس کو چھپایا تو قیامت کے دن اُس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی۔ (سنن الترمذی ابواب العلم)

اس میں لفظ **علمه** جو زیادہ فرمایا ہے یہ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ جو شخص جانتا ہو بتانے کی ذمہ داری اُسی کی ہے بے علم اگر دینی بات بتانے کی جرأت کرے گا تو گمراہی کے گڑھے میں گرے گا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

صحیح بخاری میں ص ۷۱۰ ج ۲ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! جسے علم کی کوئی چیز معلوم ہو تو وہ اُسے بتادے اور جسے معلوم نہ ہو تو ''**اللہ اعلم**'' کہہ دے (یعنی اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے) اس لئے کہ یہ بھی علم کی بات ہے کہ جو کچھ نہ جانتا ہو اُس کے بارے میں ''**اللہ اعلم**'' کہہ دے اور خواہ مخواہ اپنے پاس سے نہ بتادے اور بتکلف عالم نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ۔ (آپ فرمادیجئے کہ میں تم سے اس پر کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتا اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)۔

اسی لئے علماء نے فرمایا کہ **لا ادری نصف العلم** یعنی یہ کہہ دینا کہ میں نہیں جانتا یہ آدھا علم ہے۔ بہت سے ناقص العلم آدمیوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اُن کے ہاں لاادری کا خانہ ہی نہیں ہے ہر بات بتانے کو تیار ہیں اور علم پڑھے بغیر دینی کتابیں لکھتے ہیں غلط مسائل جمع کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کسی اچھے علم والے ماہر مفتی سے کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو وہ ابھی غور ہی کر رہا ہے لیکن پاس بیٹھنے والے جاہلوں نے بتا کر بات ختم بھی کر دی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ دینی ذمہ داری اور آخرت کے مواخذہ کا احساس نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اَجْرَءُ کُمْ عَلَی الْفُتْیَا اَجْرَءُ کُمْ عَلَی النَّارِ (یعنی تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں زیادہ جری ہے وہ دوزخ میں جانے پر زیادہ جرأت کرنے والا ہے)۔ (سنن الدارمی ص ۵۳ ج ۱)

درحقیقت قرآن کے معنی بتانا یا حدیث کی روایت کرنا یا مسئلہ بتانا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ حضرت محمد بن المنکدر نے فرمایا کہ بلاشبہ عالم (جو علم کی باتیں بتاتا ہو) وہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔ اب اس ذمہ داری سے نکلنے کا راستہ سوچے۔ (سنن الدارمی ص ۵۰ ج ۱) نکلنے کا راستہ یہ ہے کہ اٹکل سے اور بھرپور علم کے بغیر باتیں نہ بتائے اور جو کوئی بات معلوم نہ ہو، صاف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو کوئی فتویٰ دیا گیا۔ جو علم اور تحقیق کے بغیر تھا تو اس کا گناہ اُسی پر ہے جس نے اُسے فتویٰ دیا۔ (سنن دارمی ص ۵۳ ج ۱ وسنن ابی داؤد ص ۱۵۹ ج ۲)

اوّل تو مسئلہ خوب تحقیق کے بعد بتائیں پھر بھی اگر غلطی ہو جائے تو اپنی غلطی کا اعلان کریں اور جسے فتویٰ دیا ہو اُسے تلاش کریں اور بتائیں کہ ہم سے غلطی ہو گئی، صحیح مسئلہ یہ ہے۔

فائدہ ثانیہ...... علم کی باتوں کو چھپانا گناہ ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت اور حدیث سے معلوم ہوا لیکن بتانے والے کو یہ بھی خیال رکھنا

ضروری ہے کہ سائل جو کچھ پوچھ رہا ہے وہ اس کے جواب کو سمجھنے کا اہل ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر سمجھ بھی لے گا تو اس سے مطلب کیا نکالے گا اور لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگی تو وہ اس کو سمجھ پائیں گے یا نہیں اور کسی فتنہ میں تو نہ پڑ جائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو وہ باتیں بتاؤ جو جانتے پہچانتے ہو (ان کی عقل وفہم سے اونچی باتیں کرو گے تو وہ اللہ ورسول کی تکذیب کریں گے) کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اُس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔ (بخاری ص ۲۴ ج ۱)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا..... من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئا دخل الجنۃ (کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس نے شرک نہ کیا ہو تو جنت میں داخل ہوگا)۔

انہوں نے عرض کیا لوگوں کو اس کی خوشخبری نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، مجھے ڈر ہے کہ لوگ (اسی پر) بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور اعمال چھوڑ دیں گے)۔ (صحیح بخاری ص ۲۴ ج ۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان الذی یفتی الناس فی کل ما یستفتی لمجنون۔ (جو شخص لوگوں کے ہر استفتاء کا جواب دے وہ دیوانہ ہے)۔ (سنن دارمی ص ۵۶ ج ۱، ورواہ الطبرانی فی الکبیر کما فی جمع الفوائد)

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ

بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے سو یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور

أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

تمام لوگوں کی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

کفر پر مرنے والوں پر لعنت اور عذاب

اس آیت شریفہ میں کفر پر مرنے والوں کی سزا کا ذکر ہے آیت کا عموم ان یہود کو بھی شامل ہے جو کفر پر جمے رہے اور دوسروں کو بھی کفر پر جمائے رہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صفت کو چھپایا اور حق کو قبول نہ کیا اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیا، اور یہود کے علاوہ دوسرے تمام کفار نصاریٰ مشرکین منکرین خدا منکرین رسالت انبیاء علیہم السلام اور منکرین عقائد اسلامیہ اور منکرین ضروریات دین اور ختم نبوت کے منکر اور تمام ملاحدہ اور زنادقہ اور وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر کافر ہو گئے ان سب کو آیت کا عموم شامل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تمام کافر جو کفر پر مر جائیں اُن سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور سب فرشتوں کی اور سب انسانوں کی، گزشتہ آیت کی تفسیر میں بتا دیا گیا ہے کہ لعنت خدائے پاک کی رحمت سے دُوری کو کہتے ہیں۔ سب سے بڑی دوری یہ ہے کہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے داخلہ ہو جائے کافروں کے لئے یہ سب سے بڑی لعنت ہے اس کے لئے خَالِدِيْنَ فِيْهَا فرمایا۔ حضرت ابوالعالیہ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا خالدین فی جھنم فی اللعنۃ یعنی وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل ہوں گے اور لعنت میں رہیں گے۔ (درمنثور ص ۱۶۷ ج ۱)

شاید کسی ذہن میں یہ خیال وارد ہو کہ کافر تو ایک دوسرے پر لعنت نہیں کرتے پھر ان سب لوگوں کی لعنت کیسے ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ اس دُنیا میں لعنت نہیں کرتے مگر آخرت میں سب ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّاصِرِيْنَ (یعنی پھر قیامت کے دن تم ایک

دوسرے پر برگشتہ ہو جاؤ گے۔ اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا

سورۃ اعراف میں ہے کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (جب بھی کوئی جماعت دوزخ میں داخل ہوگی تو وہ دوسری جماعت پر لعنت بھیجے گی۔ یہاں تک کہ جب سب دوزخ میں ایک دوسرے کو پالیں گے تو بعد والے پہلے والوں کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ لہٰذا ان کو آگ کا دوگنا عذاب دے)۔

اور سورۃ احزاب میں فرمایا: وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا. رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑوں کی، سو انہوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا اے ہمارے رب اُن کو دُہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت فرما)۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت ابوالعالیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن کافر کھڑا کر دیا جائے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ پھر اس کے فرشتے لعنت کریں گے۔ پھر تمام انسان اس پر لعنت بھیجیں گے۔

پھر فرمایا: لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (یعنی ان لوگوں سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا)۔

سورۂ نحل میں فرمایا: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ (یعنی جو لوگ کفر کرتے تھے اللہ کی راہ سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر دوسری سزا بمقابلہ اُن کے فساد کے بڑھا دیں گے)۔

سورۂ زخرف میں فرمایا اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (بلاشبہ مجرمین جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں ناامید ہوکر پڑے رہیں گے۔)

سورۂ مؤمن میں فرمایا وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ قَالُوْۤا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰى قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (اور جو لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے داروغاؤں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے تم دُعا کرو ایک دن ہمارا عذاب ہلکا فرما دے، وہ کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول کھلے کھلے دلائل لے کر نہ آئے تھے وہ کہیں گے ہاں آئے تو تھے۔ داروغہ کہیں گے کہ پھر تم ہی دُعا کر لو اور کافروں کی دُعا نہیں ہے مگر بے اثر)

آخر میں فرمایا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (اور اُن کو مہلت نہ دی جائے گی)۔ مہلت اُسے دی جاتی ہے جسے اپیل کرنے کا موقع دیا جائے۔ کافروں کو بہرحال دائمی عذاب میں رہنا ہے کسی طرح کی اُن کے لئے کوئی مہلت نہیں دی جائے گی نہ اُن کو کسی طرح کی معذرت خواہی کی اجازت دی جائے گی۔

سورۂ مرسلات میں فرمایا هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (یہ دن ہے جس میں وہ نہ بولیں گے اور نہ اُن کو اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کریں۔ ہلاکت ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔

لعنت کرنے سے متعلقہ مسائل ...... مسئلہ: عام طور سے یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت اور ظالموں پر اللہ کی لعنت لیکن کسی خاص شخص کو مقرر کر کے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ ملعون ہے خواہ مؤمن ہو یا کافر، خاص طور پر معین کر کے صرف اُسی شخص پر لعنت بھیج سکتے ہیں جس کا کفر پر مرنا یقینی ہو جیسے فرعون، ابولہب، ابوجہل وغیرہم، جو شخص اسی دنیا میں موجود ہے اور حالت کفر میں ہے اس کو بھی متعین طریقہ پر ملعون کہنا جائز نہیں کیونکہ یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا، بہت سے لوگ اس میں بے احتیاط ہوتے ہیں نہ صرف کافروں کو بلکہ مسلمانوں کو ملعون لعین کہہ دیتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ کی زبان اس میں زیادہ کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت کرے تو لعنت آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ سو آسمان کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں پھر زمین کی طرف اُتاری جاتی ہے سو زمین کے دروازے بھی بند کر دیئے جاتے ہیں پھر وہ دائیں بائیں اپنا راستہ دیکھتی ہے جب کوئی جگہ نہیں پاتی تو اس پر لوٹ جاتی ہے جس پر لعنت بھیجی ہے۔ سو اگر وہ اس کا اہل تھا تو اس پر پڑ جاتی ہے اور اگر اس کا اہل نہیں تھا اسی پر لوٹ جاتی ہے جس نے لعنت کے لفظ زبان سے نکالے تھے۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب ص ۳۱۶ ج ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کی چادر ہوا نے ہٹا دی، اس نے ہوا پر لعنت کر دی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کر۔ کیونکہ وہ تو اللہ کے حکم کے مطابق چلتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص کسی چیز پر لعنت کرے اور وہ چیز اس کی اہل نہ ہو تو لعنت کرنے والے ہی پر لعنت لوٹ جاتی ہے۔ (سنن ابی داؤد کتاب الادب ص ۳۱۶ ج ۲)

مسئلہ...... لعنت کے ہم معنی جو بھی الفاظ ہوں اُن کا استعمال کرنا بھی اُسی وقت جائز ہے جبکہ اُصول کے مطابق اس پر لعنت بھیجنا جائز ہو۔ لفظ مردود بھی ملعون کے معنی میں ہے اور پھٹکار بھی اردو میں لعنت کے معنی میں آتا ہے۔ عورتوں کو لعنت اور اس کے ہم معنی لفظ استعمال کرنے کی بہت زیادہ عادت ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نماز کے لئے تشریف لے جا رہے تھے عورتوں پر آپ کا گزر ہوا آپ نے فرمایا کہ اے عورتو! تم صدقہ کرو مجھے دوزخ میں تمہاری تعداد زیادہ دکھائی گئی ہے۔ عورتوں نے عرض کیا کیوں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳، از بخاری ومسلم)

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے

معبودِ حقیقی ایک ہی ہے

اس آیت میں خالق تعالیٰ شانہ کی توحید بیان فرمائی ہے اور مشرکین کی تردید فرمائی ہے۔ فرمایا کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اپنی ذات صفات میں یکتا ہے اور تنہا ہے۔ اور ایک ہے، وہ بہت مہربان ہے اور بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں اور اُس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں، اور وہ واحد ہے، احد ہے، وحدہٗ لاشریک ہے۔ ساری مخلوق کو تنہا اُسی نے پیدا فرمایا۔ لہٰذا وہی واحد معبود ہے ساری مخلوق پر وہ رحم فرماتا ہے۔ لوگوں نے اُس کے علاوہ جو دُوسرے معبود بنائے ہیں وہ جھوٹے معبود ہیں اُن میں سے کوئی بھی مستحق عبادت نہیں نہ وہ خالق ہیں نہ مالک ہیں نہ رحمٰن ہیں نہ رحیم ہیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ

بلاشبہ آسمان اور زمین کے پیدا فرمانے میں اور رات و دن کے اُلٹ پھیر میں اور کشتیوں میں جو کہ چلتی ہیں سمندر میں

فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ

وہ سامان لے کر جو لوگوں کو نفع دیتا ہے اور جو کچھ نازل فرمایا اللہ نے آسمان سے یعنی پانی پھر زندہ فرمایا اس کے ذریعہ زمین کو اس

بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

اس کے مردہ ہو جانے کے بعد اور پھیلا دیئے زمین میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے جانور اور ہواؤں کے گردش کرنے میں اور بادلوں میں

بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں ضرور نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

توحید کے دلائل کا بیان

تفسیر درمنثور ص ۱۶۳ ج ۱ میں ہے کہ جب آیت وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو مشرکین کو تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں کہ معبود صرف ایک ہی ہے اگر وہ سچے ہیں تو کوئی نشانی دکھائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اپنے خالق و مالک ہونے کا اور کائنات میں تصرف فرمانے کا تذکرہ فرمایا۔ مشرک بھی جانتے ہیں کہ یہ تصرفات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرتا۔ سمجھ سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں اور حضرت عطاء سے منقول ہے کہ جب مدینہ منورہ میں آیت وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو مکہ میں کفار قریش نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ سب لوگوں کا ایک ہی معبود ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آخر تک) نازل فرمائی۔ ان آیات میں غور کریں تو سمجھ میں آ جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے اور واحد ہے اور وہ ہر چیز کا معبود ہے اور ہر چیز کا خالق ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۴) مشرکین کا عجیب طریقہ تھا اور اب بھی ہے کہ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے، رزق دیا اللہ تعالیٰ نے، ہر طرح کی پرورش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اولاد وہ دیتا ہے، کھانے پینے کی چیزیں وہ پیدا فرماتا ہے لیکن مشرکین عبادت دوسروں کی کرتے ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ کے سامنے یہ بات آئی کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔ تو تعجب سے کہنے لگے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (کیا تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا بلاشبہ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے) دنیا بھی عجیب جگہ ہے جو بھی چیز رواج پا جائے خواہ کیسی ہی باطل اور بری ہو رواج کی وجہ سے لوگ اسے اچھی سمجھنے لگتے ہیں۔ انسانوں پر فرض ہے کہ وہ صرف اپنے خالق مالک کی عبادت کریں۔ اُس کے علاوہ کسی دُوسرے کو معبود نہ بنائیں یہی انسانوں کا دین ہے جو ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے بتایا اور اختیار کیا اور اُن کے بعد تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس کی دعوت دیتے رہے۔ جب لوگوں میں شرک پھیل گیا تو اُسی سے مانوس ہو گئے اور توحید کی دعوت پر تعجب کرنے لگے۔

مذکورہ بالا آیت میں چند ایسی چیزوں کا ذکر ہے۔ جو سب کے سامنے ہیں اور سب کو اقرار ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت اور تصرف سے وجود میں آئی ہیں اور اُس کا بقاء اور وجود صرف اسی کی مشیت سے ہے۔ کسی دوسرے کو ذرہ بھر بھی ان کے وجود و بقاء میں دخل نہیں۔

آسمان و زمین کی تخلیق...... سب سے پہلے آسمان و زمین کی تخلیق کا تذکرہ فرمایا ان کی تخلیق صرف اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ سورۂ زمر میں فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو تو وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا)۔ سورۂ احقاف میں فرمایا: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِىْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ترجمہ) آپ کہیے

کہ یہ تو بتلاؤ جن چیزوں کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ اُنہوں نے کون سی زمین پیدا کی یا اُن کا آسمانوں میں کچھ ساجھا ہے۔ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہو یا اور کوئی مضمون منقول لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

رات دن کا آنا جانا...... آسمان وزمین کی پیدائش کا ذکر فرمانے کے بعد اختلاف اللیل والنہار یعنی رات دن کے آگے پیچھے آنے ایک کے کم ہونے دوسرے کے زیادہ ہونے کا تذکرہ فرمایا۔ سورۂ فرقان میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (اور وہی ذات پاک ہے جس نے بنادیا رات و دن کو آگے پیچھے آنے والا اُس شخص کے لئے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ کرے یا ارادہ کرے شکر گزار ہونے کا)۔ سورۂ زمر میں فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ اللَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی اللَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر، اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر، اور اس نے مسخر فرمایا سورج کو اور چاند کو)۔

سورۂ فاطر میں فرمایا یُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی اللَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ
(وہ داخل فرماتا ہے رات کو دن میں اور داخل فرماتا ہے دن کو رات میں اور اُس نے مسخر فرمایا سورج کو اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے اپنی مقررہ اجل کے لئے، یہ اللہ ہے تمہارا رب ہے اُسی کے لئے ملک ہے اور جن لوگوں کو تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں)۔

رات اور دن کا وجود میں آنا، کم و بیش ہونا، کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں رات کا زیادہ ہونا اور کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں دن کا زیادہ ہونا سب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کے تحت ہے کسی کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں سب اہل عقل اس کو جانتے اور مانتے ہیں۔

سمندروں میں جہازوں کا چلنا...... پھر تیسری نشانی کا ذکر فرمایا: وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ (یعنی جو کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں وہ سامان لے کر جس سے لوگ نفع اُٹھاتے ہیں) ان کشتیوں کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے سمندر خود اللہ تعالیٰ کی بڑی مخلوق ہے اس میں طرح طرح کے جانور اور بہت سی چیزیں ہیں جو انسانوں کے کام آنے والی ہیں۔ سمندروں نے ایک براعظم کو دوسرے براعظم سے ملا رکھا ہے۔ اگر سمندر نہ ہوتے تو خشکی ہی کے ذریعہ دُور و نزدیک کے سامان کو منتقل کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر میں کشتیاں جاری فرمادیں اگر اللہ چاہتا تو کوئی کشتی سمندر کی سطح پر نہ چلتی بلکہ ڈوب کر رہ جاتی۔ ایک سوئی سمندر کی سطح پر نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن ہزاروں من کے جہاز اور کشتیاں سمندر کی سطح پر ہزاروں من سامان لے کر چلتی ہیں۔ یہ سامان یورپ سے ایشیا اور ایشیا سے یورپ تک جاتا ہے۔ ایک براعظم کے لوگ دوسرے براعظم کی پیداوار سے منتفع ہوتے ہیں باوجودیکہ ہوائی جہازوں کی سروس بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ٹرینیں بھی کثیر تعداد میں چلنے لگی ہیں لیکن سامان کے نقل و حمل کے لئے آج تک بحری جہازوں سے بے نیازی نہیں ہے۔

سورۂ نحل میں فرمایا: وَتَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ سمندر میں پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ شکر کرو)

سمندر کا سفر ہے نیچے پانی ہے، اُوپر آسمان ہے، بھاری بھرکم جہاز، دریا کا تلاطم، ہواؤں کے تھپیڑے اور ڈوبنے کا ڈر۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، ڈوبنے سے بچاتے ہیں، جو سامان لدا ہوا ہے اور جو لوگ اس میں سوار ہیں صرف اللہ کی حفاظت سے منزلِ

مقصود تک پہنچتے ہیں جب سمندر میں طغیانی آ جائے تو ڈرتے ہیں اور لرزتے ہیں اور اُس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی اور صرف اُسی کو پکارتے ہیں۔ سارے باطل معبودوں کی یادیں ہی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰھُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا ھُمْ یُشْرِکُوْنَ. لِیَکْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰھُمْ وَلِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب وہ اُن کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ وہ ناقدری کریں اُس نعمت کی جو اُن کو ہم نے دی اور تاکہ وہ نفع حاصل کرلیں سو عنقریب جان لیں گے)

یہ مشرک انسان کا عجیب مزاج ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو صرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور اُسی کو پکارتا ہے اور جب مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے تو شرک کرنے لگتا ہے اور غیر اللہ کو پکارتا ہے اور اس کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔

بارش کا نازل فرمانا...... چوتھی نشانی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو پانی اُتارا ہے اور اس کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ فرمایا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خالق، مالک اور واحد ہونے کی نشانیوں میں سے ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت بہت زیادہ ہے کروڑوں انسان اور چوپائے اور درخت اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ لیکن ختم ہونے نہیں پاتا بارشیں ہوتی ہیں، میٹھا پانی برستا ہے، خشک زمینیں اس سے سیراب ہوتی ہیں۔ کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں، باغات سرسبز وشاداب ہوتے ہیں، تالابوں میں پانی جمع ہوتا ہے، مہینوں انسان اور جانور اس کو اپنے خرچ میں لاتے ہیں بہت سے علاقوں میں بارش کے سوا پانی کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ کنوئیں ہیں تو وہ بھی بہت گہرے اور کم پانی والے ہیں۔ پانی پینے، کپڑے دھونے اور کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے، بارش کے لئے اللہ تعالیٰ سے لو لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو جان میں جان آتی ہے جن علاقوں میں میٹھے پانی کی نہروں سے سیرابی ہوتی ہے وہ بھی آسمان ہی کا برسایا ہوا ہے۔ کیونکہ آسمان کی بارشیں پہاڑوں پر برف کی صورت میں منجمد ہو جاتی ہیں پھر وہ برف پگھل پگھل کر نہروں میں آتا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ وَھُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ (اور وہی ہے جو بارش نازل فرماتا ہے اس کے بعد کہ وہ نا اُمید ہو چکے اور وہ پھیلاتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی کام بنانے والا، سب تعریفوں کے لائق ہے)

سورۂ حٰم سجدہ میں فرمایا: وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنَّکَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَۃً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاھَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ط اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تُو زمین کو دیکھتا ہے کہ دَبی ہوئی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے بلاشبہ جس نے اس زمین کو زندہ فرمایا وہی مُردوں کو زندہ کردے گا بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے)

سورۂ روم میں فرمایا فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ج وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سو رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)

زمین کا خشک ہو جانا اور اس کے درختوں کا سوکھ جانا اس کو زمین کی موت سے تعبیر فرمایا اور اس کی سرسبزی شادابی کو حیات سے تعبیر فرمایا۔

جانوروں کا پیدا فرمانا اور زمین میں پھیلانا...... اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے پانچویں نشانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پھیلا دیئے ہر قسم کے چلنے پھرنے والے جانور۔ اس کا عطف اَنْزَلَ پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اَحْیٰی پر بھی۔ کما ذکرہ صاحب الروح عربی لغت کے اعتبار سے دَآبَّة ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلے پھرے اگرچہ عرف عام میں بڑے بڑے جانور گائے، بیل، بھینس، اونٹ وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ زمین پر چلنے پھرنے والے طرح طرح کے جانور بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ کس قدر کثیر تعداد میں مختلف اجناس واصناف کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ اُن کی طبیعتیں الگ الگ ہیں۔ صورتیں الگ الگ ہیں۔ منافع مختلف ہیں اور ان سب پر انسان کو مسلط فرما دیا ہے۔ خوب زیادہ غور کیا جائے اور ایک ایک جانور کے خواص پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار قدرتِ الٰہیہ کے مظاہر سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

ہواؤں کو مختلف رُخوں پر چلانا...... چھٹی نشانی ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَتَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ یعنی ہواؤں کو چلانے پھرانے ان کے رُخوں کو بدلنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جیسا چاہتے ہیں ہوائیں چلتی ہیں جس رُخ پر اللہ چاہتے ہیں اُدھر ہی جاتی ہیں۔ تیز چلنے کا حکم ہو تو تیز چلتی ہیں اور آہستہ چلنے کا حکم ہو تو آہستہ چلتی ہیں عذاب کا ذریعہ بھی بنتی ہیں اور رحمت کا سبب بھی۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں ہے کہ ان کا رُخ بدل دے یا اُن کی تیز رفتاری کو کم کر دے یا سست رفتاری کو تیز کر دے۔ سورۂ روم میں فرمایا: وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں اور تاکہ تم کو اپنی رحمت چکھا دے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ اس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ (قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے عذاب دینے کے لئے ہوا بھیج دی وہ آندھی بن کر سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی پوری نافرمان قوم ہلاک اور برباد ہوگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اُس کو نعمت بنا دیا۔ صبح کو ایک ماہ کی مُسافت تک لے جاتی تھی اور شام کو بھی ایک ماہ کی مسافت پر لے جاتی تھی۔ غزوۂ خندق میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آندھی بھیج دی جس نے دُشمنانِ اسلام کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، ہانڈیاں اُلٹ گئیں، اُن کے چہرے مٹی سے اَٹ گئے۔ سخت تیز اور سخت ٹھنڈی ہوا تھی جس کی وجہ سے بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جبکہ آ گئے تمہارے پاس لشکر، سو ہم نے بھیج دیا اُن کے اُوپر ہوا کو اور ایسے لشکر کو جسے تم نہیں دیکھ رہے تھے)۔ صحیح بخاری ص ۱۴۱ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **نصرت بالصبا و أهلكت عاد بالدبور** یعنی صبا کے ذریعہ میری مدد کی گئی اور قوم عاد دبور کے ذریعے ہلاک کی گئی (صبا اور دبور ہواؤں کے نام ہیں)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہوا رحمت لے کر آتی ہے اور عذاب لے کر آتی ہے جب تم اس کو دیکھو تو اُسے بُرا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگو۔ (سنن ابی داؤد ص ۳۳۹ ج ۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہوا چلتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَهَا وَخَیْرَ مَافِیْهَا وَخَیْرَ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّمَا فِیْهَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ (اے اللہ میں آپ سے اس کی خیر کا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی خیر کا اور جو کچھ یہ لے کر بھیجی گئی اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ کی پناہ ۔ نگتا

ہوں اس کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے اور جو کچھ یہ لیکر بھیجی گئی ہے اس کے شر سے)۔ (صحیح مسلم ص ۲۹۴ ج ۱)

بادلوں کی تسخیر......ساتویں نشانی ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اور بادلوں میں نشانی ہے جو مسخر ہیں آسمان اور زمین کے درمیان) بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان وزمین کے درمیان مسخر فرمایا کہ یہ پانی بھر بھر کرلاتے ہیں جب بارش ہوتی ہے، تو ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ ان کو دیکھ کر لوگ اپنا انتظام کر لیتے ہیں اور پانی سے بھرے ہوئے بادل اُدھر ہی جاتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔

سورۂ اعراف میں فرمایا: وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا ۢبَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ط حَتّٰىٓ اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ط كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ . (اور وہ ایسا ہے کہ اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو وہ خوش کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اُٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر اس کے ذریعہ پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ یوں ہی ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو)

بادلوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو میدانِ تیہ میں سایہ عطا فرمایا۔ بادل اُن کے ساتھ ساتھ چلتے تھے، اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور تصرف سے بادلوں کا ہلکا بھاری ہونا، بہت زیادہ بادلوں کا آ جانا، بالکل ختم ہو جانا، نظروں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ سب اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قوم عاد پر عذاب آنے کی ابتداء اسی طرح ہوئی تھی کہ عرصۂ دراز سے بارش نہ ہوئی تھی اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل ظاہر ہو گئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ بادل بارش برسائے گا۔ سخت گرمی کی وجہ سے جب میدان میں نکل کھڑے ہو گئے تو بجائے بارش کے سخت آندھی آ گئی جس کی وجہ سے وہ بالکل تہس نہس ہو کر رہ گئے۔ صحیح بخاری ص ۷۱۵ ج ۲ میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بادل یا ہوا دیکھتے تھے تو اس کا اثر آپ کے چہرۂ مبارک میں ظاہر ہو جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ! لوگ جب بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اس اُمید پر کہ بارش ہوگی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جب آپؐ کے سامنے بادل آ جائے تو آپؐ کے چہرۂ مبارک میں پریشانی محسوس ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، اے عائشہ! مجھے کیا اطمینان ہے اس میں عذاب ہو۔ ایک قوم کو ہوا کے ذریعہ عذاب دیا گیا۔ جب اُنہوں نے عذاب کو دیکھا (جس کی ابتداء بادل ظاہر ہونے سے تھی) تو اُنہوں نے کہا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (کہ یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا) لیکن وہ ہوا کی صورت میں سخت عذاب تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جب آسمان میں کچھ بادل وغیرہ معلوم ہوتا تھا تو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مُبارک کا رنگ بدل جاتا تھا آپ کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے جب بارش ہو جاتی تو آپ کی وہ کیفیت جاتی رہتی تھی۔ (صحیح مسلم ص ۲۹۴ ج ۱)

یہ امور جو آیت میں مذکور ہوئے ان سب میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خالقیت کی نشانیاں ہیں توحید کے منکر بھی مانتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اسی کے تصرف سے عالم میں سب کچھ ہو رہا ہے پھر بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے اور شرک میں مبتلا ہیں۔ هداهم الله تعالىٰ۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کے علاوہ اسکے شریک تجویز کر رکھے ہیں وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی واجب ہے اور جو لوگ ایمان لائے

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ

ان کا اللہ سے محبت کرنا بہت ہی زیادہ قوی ہے، اور اگر جان لیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جس وقت دیکھیں عذاب کو کہ بلاشبہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے

وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

مشرکین کی باطل معبودوں سے محبت اور اس پر سخت عذاب

توحید کا ذکر کرنے اور توحید کے دلائل بیان فرمانے کے بعد اَب اُن لوگوں کی حالت بیان فرمائی جنہوں نے توحید سے منہ موڑا اور شرک کو اختیار کیا۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ معبود تجویز کر لئے جن کو اللہ تعالیٰ برا سمجھتے ہیں۔ ان کی عبادت کرتے ہیں ان کے لئے نذریں مانتے ہیں، اور ان کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں۔ ان کا حال بتانے کے بعد فرمایا: يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ کہ یہ لوگ ان باطل معبودوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے۔

صاحب رُوح المعانی (ص ۳۴ ج ۲) لکھتے ہیں کہ یہاں محبت سے تعظیم اور فرمانبرداری مُراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور معبودانِ باطلہ کے درمیان برابری کرتے ہیں اور باطل معبودوں کی تعظیم اور اطاعت میں اسی طرح لگتے ہیں جیسا کہ معبودِ حقیقی کی عبادت اور اطاعت کرنا لازم ہے چونکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کا ہم سر سمجھتے ہیں اس لئے وہ ضمیر جمع لائی گئی جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتی ہے یعنی يُحِبُّوْنَهُمْ فرمایا يُحِبُّوْنَهَا نہیں فرمایا۔ بعض مفسرین نے اَنْدَادًا سے قوم و قبیلے اور علاقہ کے بڑے لوگ مُراد لئے ہیں یعنی بہت سے لوگ اپنے رؤساء کو ایسا مُطاع مانتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور فرمانبرداری کرنا لازم ہے۔

اہلِ ایمان کو اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہے...... پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (یعنی جو لوگ ایمان لائے اُن کا اللہ سے محبت کرنا بہت ہی زیادہ قوی ہے) کیونکہ اہلِ ایمان کی جو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے وہ کامل ہے اور راسخ ہے اور مضبوط ہے۔ اُن کی محبت میں کبھی کمی نہیں آتی۔ وہ کبھی بھی اللہ کو چھوڑ کر دُوسروں سے مدد نہیں مانگتے اور غیر اللہ کی کبھی بھی عبادت نہیں کرتے۔ برخلاف بت پرستوں کے کہ جب وہ مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثلاً جب کشتی میں سوار ہوں اور وہ ڈوبنے اور ڈگمگانے لگے تو سارے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی سے نجات کا سوال کرتے ہیں اور دوسرے احوال میں بھی جب بھی کوئی پریشانی ہو اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ تک کسی بت کی پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں۔ پھر اُسے چھوڑ کر دُوسرا بُت تراش کر اُس کے سامنے جبینِ نیاز رگڑنے لگتے ہیں اور بعض مرتبہ حلوے وغیرہ کا بت بنا لیتے ہیں پھر عند الضرورت اسے کھا جاتے ہیں۔

ہندوستان کے مشرکوں کو دیکھا جاتا ہے کہ دیوالی کے موقع پر (جو اُن کا ایک تہوار ہے) کھانڈ کی مورتیاں بناتے ہیں پھر ان کو بیچتے ہیں اور چھوٹے بڑے مل کر ان کو کھا جاتے ہیں۔

پھر فرمایا: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا لا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ط (کہ جن لوگوں نے خدا کے ہمسر تجویز کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا قیامت کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو اُس وقت جان لیں گے کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس موقع پر ان کو بہت زیادہ ندامت، پشیمانی اور شرمندگی ہوگی جس سے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہ آیت کی ایک تفسیر ہے۔ اور اس تفسیر کی بنا پر جواب لو محذوف ہے۔

قال البيضاوی لويعلمون أن القدرة لله جميعا اذا عاينوا العذاب لندموا اشد الندم اور مفسر ابن کثیر ص۲۰۲ ج ۱ نے اس کی تفسیر اس طرح سے کی ہے کہ: اگر وہ جان لیں اُس عذاب کو جسے وہاں یوم قیامت میں دیکھیں گے (جو سخت عذاب ان کے شرک اور کفر کی وجہ سے ان کو دیا جائے گا) تو آج ہی اس دنیا میں اپنے کُفر سے باز آ جائیں۔

مفسر بیضاوی نے بعض مفسرین سے آیت کی تفسیر اس طرح بھی نقل کی ہے وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْدَادَهُمْ لا تَنْفَعُ لَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ كُلَّهَا لَا يَنْفَعُ وَلَا يَضُرُّ غَيْرُه (یعنی جنھوں نے ظلم کیا اگر وہ جان لیں کہ ان کے بنائے ہوئے خدا نفع دینے والے نہیں ہیں تو یہ بات ضرور جان لیں کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع اور ضرر کا مالک نہیں۔ اس صورت میں یَـــــرٰی کا مفعول یعنی اندادهم لا ينفع محذوف ہوگا۔ وذكره فی الروح ايضا. (ص۳۵ ج۲)

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

جب کہ بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنھوں نے پیروی کی تھی اور دیکھ لیں گے عذاب کو اور کٹ جائیں گے ان کے آپس کے

الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ط

تعلقات اور کہیں گے وہ لوگ جنھوں نے پیروی کی کاش ہم کو واپس جانا نصیب ہو جاتا تو ہم ان سے بیزار ہو جاتے جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہو گئے،

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ط وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

اللہ اسی طرح دکھائے گا ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ ہوں گے۔

قیامت کے دن متبوعین کا اپنے ماننے والوں سے بیزاری ظاہر کرنا اور اس وقت ان کو پشیمانی ہونا

ان آیات میں کافروں کی ایک اور حسرت اور ندامت اور شناعت اور فظاعت ذکر فرمائی اور وہ یہ کہ جو لوگ دنیا میں پیشوا تھے اور قوموں اور قبیلوں کے اور ملک و وطن کے بڑے تھے جن کے پیچھے چل کر ان کی اولاد نے اور قوم و قبیلہ نے اور ملک کے بسنے والوں نے اپنا ناس کھو دیا اور کفر اور شرک میں مبتلا ہوئے۔ یہ سردارانِ قوم اور زعماء ملک و وطن قیامت کے دن اپنے ماننے والوں اور پیچھے چلنے والوں اور ان کی رضامندی کے لئے قربانیاں دینے والوں سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں اور یہ بیزاری ایسے موقعہ پر ہوگی، جب اُن کے ماننے والے اس دنیا سے گزر چکے ہوں گے اور کفر و شرک پر مر چکے ہوں گے۔ وہاں نہ ایمان لانا معتبر ہوگا نہ دُنیا میں واپس آ سکیں گے اور عذاب بھگتنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور ان کے آپس کے تعلقات ختم ہو چکے ہوں گے اور کوئی کسی طرح بھی مدد نہ دے سکے گا۔ کما قال تعالىٰ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (سورۂ مؤمن) (ظالموں کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کی اطاعت کی جائے۔)

جب سرداران قوم بیزاری ظاہر کر دیں گے تو وہ لوگ جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا۔ یوں کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس جانا نصیب ہو جائے تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری ظاہر کریں جیسا کہ آج وہ ہم سے بیزار ہو گئے۔

پھر فرمایا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (یعنی جس طرح ان کو آپس کی بیزاری کا منظر دکھایا جائے گا۔ اسی طرح ان کے دوسرے اعمال بھی حسرتیں بنا کر اُن کو دکھائے گا اور حسرت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا) دوزخ کے عذاب کے ساتھ حسرتوں کا عذاب مستقل عذاب ہوگا۔ بار بار نادم ہوں گے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا اتباع کر لیتے تو اچھا تھا۔ کفر و شرک اختیار نہ کیا ہوتا، فلاں فلاں عمل اختیار کرتے تو کیسا ہی اچھا ہوتا اور اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے اُس دن کا سوچنا، سمجھنا، نادم ہونا۔ دوزخ سے نکلنے کا ذریعہ نہ بنے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے کبھی بھی اُس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ

اے لوگو! کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں حلال پاکیزہ ہیں اور مت پیچھے چلو شیطان کے قدموں کے۔ بے شک وہ تمہارے لئے

لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تم کو صرف بُرائی کا اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔

حلال کھانے اور شیطان کے اتباع سے پرہیز کرنے کا حکم

ان آیات میں اوّل تو ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی جو زمین میں حلال اور پاکیزہ چیزیں موجود ہیں۔ پھر یہ فرمایا کہ شیطان کے قدموں کا اتباع نہ کریں۔ شیطان کا اتباع کرنے اور اس کی بات ماننے میں سراسر نقصان اور خسران اور ہلاکت اور بربادی ہے۔ اس کا کوئی مشورہ اور کسی بھی عمل کی ترغیب انسانوں کے لئے خیر نہیں ہو سکتی وہ تمہارا دشمن ہے اس نے دشمنی پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ اُسے دوزخ میں جانا ہے اُس کی کوشش یہ ہے کہ سب بنی آدم بھی میرے ساتھ دوزخ میں چلے جائیں۔ وہ ہمیشہ بُرائی ہی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور بدکاری ہی کا راستہ بتاتا ہے۔ اس کا یہ بھی کام ہے کہ تم سے شرک کرائے اور تمہیں غلط عقیدوں پر ڈالے۔ اور پھر تم سے یہ کہلوائے کہ یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے اور اس کی رضا کے لئے ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. (اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کا حکم نہیں دیتا، کیا خدا کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کو تم نہیں جانتے)

اسباب النزول للواحدی ص ۴۳ میں ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ (الآیۃ) بنی ثقیف اور بنی خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان لوگوں نے کچھ کھیتیاں، کچھ جانور اپنے اُوپر حرام کر لئے تھے اور جن جانوروں کو حرام کیا تھا (اُن کی حرمت کے لئے کچھ شرطیں اور قیدیں لگا دی تھیں اور) اُن کے نام بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ اور حامی تجویز کر لئے تھے۔ اھ سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام کی تفسیر میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی تفصیلات مذکور ہوں گی۔ یہ باتیں ان کو شیطان نے بتائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا یا حرام کو حلال کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ یہ جو تحریم و تحلیل کا سلسلہ مشرکین نے نکالا تھا اس میں شیاطین کو اور

بتوں کو راضی رکھنے کے جذبات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں جو چیزیں حلال ہیں ان کو حرام کر لینا حلال نہیں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی شریعت کو بدلنا ہے اور تحریف کرنا ہے۔

تحلیل وتحریم کا حق صرف اللہ ہی کو ہے...... سورۂ مائدہ میں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (اے ایمان والو! اللہ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو، بلاشبہ اللہ حد سے نکلنے والوں سے محبت نہیں فرماتے)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شہد پینے کے متعلق فرما دیا تھا کہ اب ہرگز نہ پیوں گا، اللہ جل شانہٗ نے آیت نازل فرمائی یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (اے نبی! تم اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے) ایسی بہت سی رسمیں آج لوگوں میں موجود ہیں جن میں عملاً بلکہ اعتقاداً بھی بہت سی حلال چیزوں کو حرام سمجھ رکھا ہے مثلاً ذی قعدہ کے مہینہ میں (جسے عورتیں خالی مہینہ کہتی ہیں) اور محرم وصفر میں شریعت میں شادی کرنا خوب حلال اور دُرست ہے لیکن اللہ کی اس حد سے لوگ آگے نکلتے ہیں اور ان میں شادی کرنے سے بچتے ہیں۔ ماہ محرم میں میاں بیوی والے تعلق سے بچتے ہیں۔ اور بہت سی قوموں میں بیوہ عورت کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھتے ہیں اور عملاً اس کو حرام بنا رکھا ہے۔ بہت سی قوموں میں ماموں، خالہ، چچا، پھوپھی کی لڑکی سے نکاح کرنے کو عملاً بلکہ اعتقاداً حرام قرار دے رکھا ہے۔ یہ سب حدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔ جس طرح حلال کو حرام کرنا منع ہے اسی طرح حرام کو حلال کر لینا بھی منع ہے۔ حرام وحلال مقرر فرمانے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے خواہ اس نے قرآن میں نازل فرمایا ہو یا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بتایا ہو۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا زبانی جھوٹا دعویٰ ہے۔ ان کی نسبت یوں مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے۔ جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے)

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا اتباع کرو، جو اللہ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں بلکہ ہم اُس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا،

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے، اگر چہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں، اور ہدایت پر نہ ہوں۔

باپ دادے ہدایت پر نہ ہوں تو اُن کا اتباع اور اقتداء باعث ہلاکت ہے

مشرکین کا یہ طریقہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ اپنے باپ دادوں کو مقتدیٰ سمجھتے رہے ہیں۔ اُن کو ہزار سمجھایا جائے، حق کی دعوت دی جائے، توحید کی طرف بلایا جائے، اللہ کے دین اور اس کی شریعت قبول کرنے کے لئے کہا جائے اور توحید کی دلیلیں خوب کھول کر بیان کر دی جائیں اور شرک وکفر کی مذمت خوب واضح کر کے بتا دی جائے تو وہ کسی بھی قیمت پر اپنے باپ دادوں کا دین کفر وشرک چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ان کا یہی ایک جواب ہوتا ہے کہ ہم اس دین اور طور طریق اور رسم ورواج کے پابند ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ اس آیت شریفہ میں مشرکین کی یہی بات نقل فرمائی ہے اور پھر اس کی تردید کی ہے۔ تردید کرتے ہوئے

ارشاد فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے اگر چہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں) باپ دادوں نے اپنی ناسمجھی سے شرک اختیار کیا غیر اللہ کی پرستش کی بُرے رسم ورواج نکالے وہ لوگ کیسے لائق اتباع ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ معلوم ہے کہ باپ دادوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ۔ نہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کے پاس تھی نہ کسی نبی سے اُنہوں نے ہدایت حاصل کی تھی، سراپا گمراہی میں تھے، گمراہوں کا اتباع کرنا کہاں کی سمجھداری ہے ہاں اگر باپ دادے ہدایت پر ہوں اور اُنہوں نے حق کی راہ بتائی ہو تو اُن کا اتباع کیا جائے جیسا کہ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نقل فرمایا کہ اُنہوں نے اپنے جیل کے ساتھیوں سے فرمایا: وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ (کہ میں نے اتباع کیا اپنے باپ دادوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کا) باطل میں کسی کی بھی تقلید کرنا حلال نہیں ہے۔ البتہ جو اہلِ حق ہو، اللہ کے دین پر چلتا ہو اور اُسی کی دعوت دیتا ہو اُس کا اتباع کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں فرمایا: وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (کہ جو شخص میری طرف رجوع ہو اُس کا اتباع کرو)۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ

اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اُس شخص کی مثال ہے جو آواز دے ایسی چیز کو جو نہ سنے سوائے پکار کے اور بلاوے کے،

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

کافروں کی ایک مثال

صاحب روح المعانی (ص ۴۸ ج ۲) لکھتے ہیں کہ مشبہ یا مشبہ بہ کی جانب میں مضاف محذوف ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ کافروں کو دعوت دینے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اُن جانوروں کے پیچھے چیخ رہا ہو جو بس پکار اور آواز سنتے ہیں اور اُس سے زیادہ کوئی بات وہ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کسی نے آواز دی لیکن کیا کہا اس کو بالکل نہیں سمجھتے اور دُوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ کافروں کی مثال اُس شخص کے جانوروں کی طرح سے ہے جو اپنے جانوروں کو پکارتا اور چیختا چلاتا ہے اور جانوروں کو پکار کے سوا کچھ خبر نہیں۔ خُلاصۂ مطلب دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ کافر لوگ اپنی جہالت اور حماقت سے باپ دادوں کی تقلید میں لگے ہوئے ہیں حق سمجھنے اور قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس بارے میں وہ جانوروں کی طرح سے ہیں۔ حق کی آواز سُنتے ہیں لیکن سب اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ نہ اُدھر اپنے ذہنوں کو متوجہ کرتے ہیں اور نہ غور وفکر کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ بالکل جانوروں کی طرح سے ہیں۔ آواز تو سنی لیکن سمجھے کچھ نہیں۔

کافر بہرے، گونگے، اندھے ہیں...... پھر فرمایا صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ کہ یہ لوگ حق سننے کو تیار نہیں بہرے بنے ہوئے ہیں، حق بولنے کو تیار نہیں گونگے بنے ہوئے ہیں۔ راہِ حق پر چلنے کو تیار نہیں۔ اندھا پن اختیار کئے ہوئے ہیں، اپنے حواس کھو چکے ہیں۔ لہٰذا حق کو ذرا بھی نہیں سمجھتے۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ

اے ایمان والو! کھاؤ اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم

اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾

اس کی عبادت کرتے ہو۔

حلال کھانے اور شکر ادا کرنے کا حکم

اس آیت شریفہ میں بھی پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم فرمایا اور اللہ پاک نے جو نعمتیں دی ہیں اُن کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو کیونکہ جو عبادت اُس کی عظمت و کبریاء کی شایان شان ہے وہ شکر کے بغیر کامل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے جو حلال رزق عطا فرمایا ہے اُسے کھاؤ پیو اور شکر کرو۔ سورۂ سبا میں فرمایا: كُلُوا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوا لَهٗ (اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو) نعمتوں کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت اور عبادت میں مشغول ہوں۔ اور اس کی نعمتوں کو گناہوں میں خرچ نہ کریں۔ مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ میں یہ بھی نکتہ ہے کہ دُوسروں کا مال چھین کر یا چرا کر یا خیانت کر کے استعمال نہ کیا جائے کہ اللہ نے جو مال جس کسی کو دیا ہے وہ اگر چہ فی نفسہ اصول شریعت کے مطابق حلال اور طیب ہے۔ لیکن دوسروں کے لئے اسی وقت حلال اور طیب ہوگا جبکہ حلال طریقہ سے صاحب مال سے حاصل کیا ہو۔

حرام کھانے کا وبال...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ پاک ہے اور وہ پاک ہی (مال اور قول و عمل) کو قبول فرماتا ہے (پھر فرمایا کہ) بلاشبہ (حلال کھانے کے بارے میں) اللہ جل شانہ نے پیغمبروں کو جو حکم فرمایا ہے وہی مؤمنین کو حکم فرمایا ہے چنانچہ پیغمبروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے رسولو! طیب چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو اور مؤمنین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں اُن میں سے کھاؤ، اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر رہا ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں جسم پر گرد و غبار اَٹا ہوا ہو اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے یَا رَبِّ یَا رَبِّ کہہ کر دعا کرتا ہو یہ شخص دُعا تو کر رہا ہے اور حال یہ ہے کہ اُس کا کھانا حرام ہے پینا حرام ہے اور پہننا حرام ہے اور اس کو حرام غذا دی گئی ہے پس ان حالات کی وجہ سے اس کی دُعا کیونکر قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۳۲۶ ج ۱)

اس حدیث میں حرام سے پرہیز کرنے اور حلال کھانے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ جو صدقہ حلال مال سے ہوگا وہی قبول ہو گا۔ اللہ پاک ہے اور اس کی بارگاہ میں پاک چیز ہی قبول ہو سکتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی دو آیتیں تلاوت فرمائیں۔ پہلی آیت میں حضرات انبیا علیہم السلام کو حکم ہے کہ پاک چیزیں کھائیں اور نیک عمل کریں اور دُوسری آیت میں ایمان والوں کو حکم ہے کہ اللہ پاک کی عطا کردہ چیزوں میں سے پاک چیزیں کھائیں۔ اللہ جل شانہٗ نے جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے کہ حلال کھائیں، وہی حکم اپنے مؤمن بندوں کو دیا ہے۔ حلال کی اہمیت اور ضرورت ظاہر کرنے کے بعد آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر میں ہو اور بدحالی کی وجہ سے اس کے بال بکھرے ہوں جسم پر غبار پڑا ہو اور وہ اپنی اسی بدحالی میں آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے یا رب یا رب کہہ کر خدائے پاک کو پکار رہا ہو اور چاہتا ہو کہ میری دُعا قبول ہو جائے اس کی دُعا قبول نہ ہوگی کیونکہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام اور

لباس حرام ہے اور اُس کو حرام غذا دی گئی۔ مسافر کا شمار اُن لوگوں میں ہے جن کی دُعا خصوصیت سے قبول ہوتی ہے اور مضطر و پریشان حال شخص کی بھی دُعا مقبول ہوتی ہے۔ لیکن مسافر اور پریشان حال ہونے کے باوجود ایسے شخص کی دُعا قبول نہیں ہوتی جس کا کھانا پینا اور پہننا حرام ہو، آجکل بہت سی دُعائیں کی جاتی ہیں۔ لیکن دُعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ لوگ شکایتیں کرتے پھرتے ہیں کہ دُعاؤں کا اس قدر اہتمام کیا اور اتنی بار دُعا کی لیکن دُعا قبول نہیں ہوتی۔ شکایت کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنا حال دیکھیں اور اپنی زندگی کا جائزہ لیں۔ ہر شخص غور کرے کہ میں حلال کتنا کھاتا ہوں اور حرام کتنا، اور کپڑے جو پہنتا ہوں وہ حلال آمدنی سے ہیں یا حرام سے اگر روزی حرام ہے یا لباس حرام ہے تو اُس کو ترک کریں، خوراک اور پوشاک کو حدیث شریف میں بطورِ مثال ذکر فرمایا ہے اوڑھنا بچھونا رہائش کا مکان آسائش کی چیزیں اگر حرام کی ہوں تو وہ بھی لباس کے حکم میں ہیں ان کا استعمال بھی حرام ہے۔

حرام کی کمائی کی چند صورتیں ...... رشوت آج کل بہت عام ہے سب کو معلوم ہے کہ رشوت کا مال حرام ہے۔ رشوت کا نام ہدیہ تحفہ رکھ لیا جائے تب بھی حرام ہی رہتی ہے۔ جو لوگ حکومت کے کسی جائز شعبے میں کام کرتے ہیں اور رشوت لیتے ہیں ان کی رشوت تو حرام ہے ہی تنخواہ بھی حلال نہیں اس لئے کہ جس کام کے لئے حکومت نے ان کو دفتر میں بٹھایا ہے وہ کام اُنہوں نے نہیں کیا رشوت لینے کے لئے اُن اصول و قواعد کے خلاف کام کرتے ہیں جو کام کرنے والے کے لئے مقرر کئے ہیں۔

سود کم ہو یا زیادہ عوام سے لیا جائے یا کسی بھی ادارہ سے وہ سب حرام ہے اگرچہ اس کا نام نفع رکھ لیا جائے، ہر وہ ملازمت حرام ہے جس میں گناہ کیا جاتا ہو، چونکہ گناہ کرنا اور گناہ کی مدد کرنا دونوں حرام ہیں اس لئے گناہ کی اُجرت بھی حرام ہے اور گناہ پر مدد کرنے کی اُجرت بھی حرام ہے۔ حرام چیزوں کی تجارت حرام ہے اور اس پر نفع بھی حرام ہے۔ شراب، خنزیر، خون، مُردار گوشت، تصویریں، مورتیاں ان سب چیزوں کی خرید و فروخت حرام ہے۔ اور ان کی قیمت اور نفع بھی حرام ہے جتنے بھی ٹیکس ہیں سب کا وصول کرنا حرام ہے اور اس سلسلہ کی تمام ملازمتیں بھی حرام ہیں اور ان کی تنخواہ بھی حرام ہے۔ محکمہ آبکاری کی ملازمت حرام ہے اور اس کی تنخواہ بھی حرام ہے۔ بیمہ پالیسی سراسر قمار ہے یعنی جوا ہے زندگی کا بیمہ ہو یا اموالِ تجارت کا کارخانوں کا یا گاڑیوں کا یہ سب حرام ہے۔ اور ان میں اپنی جمع کردہ رقم سے زائد جو کچھ ملے وہ سب حرام ہے۔ جتنے بھی قمار کے طریقے ہیں گھوڑ دوڑ وغیرہ ان کی آمدنی سب حرام ہے۔ غصب، چوری، ڈاکہ زنی کے ذریعہ جو کچھ حاصل کیا وہ سب حرام ہے۔ لوگوں کو اغوا کر کے جو اُن پر رقم حاصل کی جائے وہ بھی حرام ہے۔ جو لوگ پیری مُریدی کا کاروبار کرتے ہیں اُن کو اہلِ حق اور اہلِ ارشاد سمجھ کر جو کچھ دیا جاتا ہے۔ (حالانکہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں) ان کے لئے وہ سب حرام ہے۔ میراث، شریعت کے مطابق تقسیم نہیں کی جاتی۔ جس وارث کے قبضہ میں جو مال آجاتا ہے وہی اپنا بنا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مرنے والے کے بیٹے اپنی بہنوں کو اور ماؤں کو میراث نہیں دیتے۔ اور چونکہ میراث تقسیم نہیں ہوتی اس لئے یتیموں کے حصہ کا مال بھی خورد برد کر دیا جاتا ہے۔ شرعاً جو دوسروں کا مال ہے اس کو اپنی ملکیت اور کام میں لانا حرام ہے۔ اور نفس کی خوشی سے جو مال نہ دیا گیا ہو اگرچہ دینے والے نے بظاہر کسی دباؤ میں خاموشی اختیار کر لی ہو وہ مال بھی حرام ہے۔ یہ تھوڑی سی تفصیل زیرِ قلم آگئی ہے۔ حرام کے شعبے بہت ہیں۔ ہر شخص اپنی آمدنی اور اخراجات کا فکر کرے۔

حرام مال کا وبال ...... بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حرام آمدنی میں سے صدقہ کر دیا جائے تو باقی سب مال حلال ہو جاتا ہے۔ حرام سے صدقہ کرنا تو اور گناہ ہے۔ وہ مقبول ہی نہیں ہوتا۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ ہی کو قبول فرماتے ہیں جو صدقہ خود ہی قبول نہیں اس کے ذریعہ باقی مال کیسے حلال ہو جائے گا جو صدقہ دیا وہ بھی وبال اور جو باقی مال ہے وہ بھی وبال اور آخرت کے

عذاب کا ذریعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جو بھی کوئی بندہ حرام مال سے کسب کرے گا پھر اس میں سے صدقہ کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا اور اُس میں سے خرچ کرے گا۔ تو اس کے لئے اس میں برکت نہ ہوگی۔ اور اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے دوزخ میں جانے کا ذریعہ ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بُرائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتے لیکن برائی کو نیکی کے ذریعہ مٹاتے ہیں۔ بے شک خبیث، خبیث کو نہیں مٹاتا۔ (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں وہ گوشت داخل نہ ہوگا جو حرام سے پلا بڑھا اور ہر وہ گوشت جو حرام سے پلا بڑھا ہو دوزخ کی آگ اس کی زیادہ مستحق ہے۔ (ایضاً) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں وہ جسم داخل نہ ہوگا۔ جس کو حرام سے غذا دی گئی۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۳)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی بھی نماز قبول نہ فرمائے گا جب تک کہ وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۳)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف مُردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور حرام کئے ہیں جن کے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔

اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

سو جو شخص مجبوری میں ڈال دیا جائے اس حال میں کہ باغی نہ ہو، اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے۔

محرمات کا اجمالی بیان اور اضطرار کا حکم

اس آیتِ شریفہ میں مردہ جانور (جو اپنی موت سے بغیر ذبح کئے مرجائے) اور خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی اور اُن جانوروں کے کھانے کی حرمت بیان فرمائی ہے جن پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ ان چیزوں کے کھانے کا عرب کے مشرکوں میں رواج تھا۔ اور اُن کے علاوہ حلال چیزیں بھی کھاتے تھے۔ ان کے رواج میں جو چیزیں حرام تھیں اُصولی طور پر ان کی حُرمت بیان فرمائی اور لفظ اِنَّمَا سے جو حصر معلوم ہو رہا ہے۔ یہ حصر اضافی ہے۔ جو چیزیں یہاں مذکور ہیں ان کے علاوہ بھی حرام چیزیں ہیں جس کا ذکر دیگر آیات میں اور احادیث میں وارد ہوا ہے۔

سورۂ مائدہ میں مزید چند حرام چیزوں کا بیان ہے۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ پوری تفصیل سورۃ مائدہ ہی کی تفسیر میں لکھیں گے یہاں یہ جو فرمایا کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ. اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے ایسا دوچار ہو رہا ہو کہ جان پر بن رہی ہو اور اُس کے پاس حلال چیزوں میں سے کھانے کو کچھ بھی نہ ہو تو وہ حرام چیزوں میں سے اپنی جان بچانے کے لئے اِتنا سا کھالے جس سے موت سے بچ جائے۔ صرف اتنا ہی کھائے جس سے جان بچ جائے۔ اس سے آگے نہ بڑھے اور لذّت کا طالب بھی نہ ہو۔ مثلاً اگر بھوک سے جان جا رہی ہو تو شراب پینے اور سور کھانے کی اجازت کو بہانہ بنا کر یہ نہ سوچے کہ آج اجازت مل گئی ہے خوب مزے سے کھاؤں پیوں گا۔ خُم کے خُم چڑھالوں گا اور پیٹ بھر کے خنزیر کا گوشت کھالوں گا۔ پھر کبھی موقع ملے یا نہ ملے، ایسا آدمی باغی اور عادی یعنی حد سے بڑھنے والا ہے اگر طلبِ لذّت کے لئے کھائے گا یا ضروری مقدار سے زیادہ کھائے گا تو گنہگار ہوگا اور لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ فرما کر یہ بتایا

کہ جان بچانے کی مجبوری میں تھوڑا سا کھانے کی جو اجازت ہے وہ درجہ معافی میں ہے یوں نہ کہا جائے گا کہ یہ چیز حلال ہو گئی۔ یوں کہیں گے کہ اس کا کھانا حلال ہو گیا۔ حرام اپنی جگہ حرام ہی ہے۔ بہت سے لوگ یورپ امریکہ اور آسٹریلیا میں بلا تکلف شراب پیتے ہیں، اور خنزیر کھاتے ہیں اور ان جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جو شرعی طریقے پر حلال نہیں کئے گئے اور جب اُن سے بات ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ اور لفظ فَمَنِ اضْطُرَّ کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ اضطرار اور مجبوری اُن کو کہیں سے کہیں تک بھی نہیں ہے۔ ان ملکوں میں سینکڑوں قسم کی چیزیں ملتی ہیں مچھلی بھی ہے اور انڈے بھی ہیں۔ دُودھ بھی ہے اور انتظام کرنے سے حلال گوشت بھی مل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں حرام کھانا پینا کسی طرح بھی حلال نہیں ہے اور بالفرض واقعی کوئی شخص مجبور ہو جس کی جان ہی جا رہی ہو کھانے کو کچھ بھی نہ مل رہا ہو وہ جان بچانے کے لئے ذرا سا کھا سکتا ہے۔ یہ پیٹ بھر بھر کر روزانہ حرام کھانا اور پینا اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں، بعض لوگوں نے بتایا کہ ہم تو سور کا گوشت بسم اللہ پڑھ کر کھا لیتے ہیں، العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ، بسم اللہ پڑھنے سے حرام حلال نہیں ہو جاتا بلکہ حرام پر بسم اللہ پڑھنے سے ایمان سلب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ پھر یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ مسلمان کو ایسے ملک میں رہنے کی کیا مصیبت ہے جہاں حلال نہ ملتا ہو۔ حرام ہی کھانا پڑتا ہو طلبِ دُنیا کے جذبات ہی ایسے مُلکوں میں لے جاتے ہیں اور حرام کھلاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ

بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے نازل فرمائی یعنی کتاب، اور خریدتے ہیں اس کے بدلہ تھوڑی قیمت تو یہ وہ لوگ ہیں

مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ

جو نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا،

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ

اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے، اور عذاب کو مغفرت کے بدلے،

اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ

سو وہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں آگ پر۔ یہ اس وجہ سے کہ بے شک اللہ نے نازل فرمایا کتاب کو حق کے ساتھ، اور بے شک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا

لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

بے شک وہ بڑی دوری کی خلاف ورزی میں ہیں۔

کتاب اللہ کی تحریف کرنے والوں کا انجام

ان آیات میں اللہ کی نازل فرمودہ کتاب کو چھپانے اور اس میں تحریف و تبدیل کرنے اور غلط تفسیر بتانے اور پھر اس کو دنیاوی معاوضہ کا ذریعہ بنانے کی مذمت کی گئی ہے۔ اسباب النزول میں (ص ۴۴) علامہ واحدی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے رؤسا اور علماء کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے نیچے کے لوگوں سے ہدایا وصول کرتے تھے اور وہ یہ اُمید باندھے ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اُن میں سے ہوں گے۔ لیکن جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت ہوگئی جو ان کے قبائل میں سے نہیں ہیں تو ان کی صفات کو بدل دیا جو توریت میں پاتے تھے اور دوسری صفات بتادیں جو توریت میں نہیں تھیں تاکہ ان کے عوام نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں اور ان کی ریاست باقی رہے اور رشوت ملتی رہے۔ اس سے پہلے بھی اللہ کی کتاب کے مضامین کو چھپانے پر وعید مذکور ہوئی تھی۔ یہود کے علماء میں یہ مرض بہت زیادہ تھا۔ دوبارہ اس مضمون کا اعادہ فرمایا اور ان کی توجہ دلائی کہ حقیر دنیا کے حقیر مال کے لئے جو حرکتیں کرتے ہو آخرت میں اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔ یہ حرکتیں دوزخ میں لے جانے والی ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ گو اس دنیا میں کھانے پینے کی چیزوں سے پیٹ بھرتے ہیں لیکن یہ پیٹ بھرنا دوزخ کی آگ کے انگارے پیٹ میں بھرنے کا ذریعہ بنے گا یہ لوگ دنیاوی غذا نہیں نہیں کھا رہے ہیں بلکہ اپنے پیٹوں میں دوزخ کے انگارے ہی بھر رہے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا غصہ بہت زیادہ ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے مہربانی کے ساتھ بات بھی نہ فرمائے گا اور ان کو پاک بھی نہ کرے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

نیکی اس میں نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لیا کرو۔ لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے اور آخرت

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر، اور اپنا مال دے اس کی محبت ہوتے ہوئے قرابت والوں کو اور یتیموں کو، اور مسکینوں کو،

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

اور مسافروں کو، اور سوال کرنے والوں کو، اور گردنوں کے چھڑانے میں، اور قائم کرے نماز کو اور ادا کرے زکوٰۃ کو، اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۖ

جبکہ وہ عہد کریں، اور صبر کرنے والے ہیں سختی میں اور تکلیف میں اور جنگ کے موقع پر، یہی لوگ ہیں جنہوں نے سچائی کی راہ اختیار کی

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کا بیان

یہ آیت کریمہ ان آیات میں سے ہے جن میں بہت سے اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کو ایک ہی جگہ جمع فرمادیا ہے۔ لباب النقول (ص ۲۳) میں بحوالہ مصنف عبدالرزاق حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہودی مغرب کی جانب نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف (اور اپنے اپنے قبلہ پر جمنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور ایمان قبول نہ کرتے تھے) لہٰذا آیت لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (الآیۃ) نازل ہوئی۔ حضرت قتادہؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی (کی تفصیلات) کے بارے میں سوال کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آپ نے اس شخص کو بلایا اور آیت کریمہ پڑھ کر اسے سنادی۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں (ص ۲۰۷ ج ۱) کہ جب پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا پھر کعبہ شریف کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو

اہل کتاب اور بعض مسلمانوں کو شاق گزرا اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی حکمت نازل فرمائی کہ کوئی جہت مقصود بالذات نہیں ہے۔ بندوں کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں اس کے حکموں کو مانیں جدھر رُخ کرنے کا حکم ہوا ُدھر رخ کرلیں۔ بس یہ نیکی ہے اور تقویٰ ہے اور ایمان کامل کا تقاضا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل ہو جائے مشرق یا مغرب کو رُخ ہو عنداللہ یہ کوئی چیز نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا یہ نیکی نہیں ہے کہ نماز پڑھا کرو اور دوسرے احکام پر عمل نہ کرو، اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ولٰکن البر والتقویٰ أن تؤدوا الفرائض علی وجهها یعنی نیکی اور تقویٰ یہ ہے کہ تمام فرائض کو حکم کے مطابق صحیح طریقے پر پورا پورا ادا کرو۔

اس آیت میں بہت سے نیک کام مذکور ہیں۔ سب سے پہلے تو ایمان کا ذکر فرمایا اور اُصول عقائد بتا دیئے۔ ایمان وہ چیز ہے جس کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ ایمان تو لاتے نہیں تھے اور اپنے اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصلی نیکی اُس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی سب کتابوں پر اور اس کے سب نبیوں پر۔ جو شخص ان چیزوں پر ایمان لائے گا۔ اللہ کی کسی کتاب یا اس کے کسی رسول کی تکذیب نہ کرے گا اور رسولوں کے درمیان تفریق نہ کرے گا وہ مؤمن ہو گا پھر ایمان کے تقاضوں کے مطابق جو اعمال کرے گا اور جو اموال خرچ کرے گا اور جو اقوال اُس سے صادر ہوں گے وہ سب نیکی اور تقویٰ میں شمار ہوں گے۔

اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا...... اصول عقائد بتانے کے بعد مال خرچ کرنے کی عمومی مدّیں ذکر فرمائیں اور مال کی محبت ہوتے ہوئے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو مال دینا نیکی میں شُمار فرمایا۔ اور جو ایسے غلام ہیں جن سے اُن کے آقاؤں نے کتابت کا معاملہ کرلیا (یعنی اُن سے کہہ دیا کہ اِتنا مال لا کر دے دو تو آزاد ہو) ان کی گردنوں کے آزاد کرانے میں مال خرچ کرنے کو نیک کاموں میں ذکر فرمایا۔ لفظ عَلٰی حُبِّهٖ میں جو ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے۔ اس کا مرجع مفسرین نے مال کو قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی احتمال نکالا ہے کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اپنے مال کو وجوہِ خیر میں خرچ کرتے ہیں۔ لیکن پہلا معنیٰ دوسرے معنیٰ کو شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص مال کی محبت ہوتے ہوئے مذکورہ وجوہ خیر میں خرچ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی کی محبت میں خرچ کرے گا۔

افضل الصدقہ...... صحیح بخاری (ص ۱۹۱ ج ۱) میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون سا صدقہ ثواب کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ تو ایسے وقت میں صدقہ کرے جبکہ تو تندرست ہو اور خرچ کرتے ہوئے نفس کنجوس بن رہا ہو، تجھے تنگدستی کا ڈر ہو اور مالداری کی اُمید لگائے بیٹھا ہو، اور صدقہ کرنے میں تو اِتنی دیر نہ لگا کہ جب روح حلق کو پہنچنے لگے تو تُو کہنے لگے کہ فلاں کو اِتنا دینا اور فلاں کو اتنا دینا (اب تیرے دینے اور اعلان کرنے سے کیا ہو گا) اب تو فلاں کا ہو ہی چکا۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کرنے کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ تندرستی کے وقت (جبکہ مرض الموت میں مبتلا نہیں ہے) اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اس وقت خرچ کرتا ہے تو نفس یوں کہتا ہے کہ خرچ نہ کر پھر بھی نفس کے تقاضے کو دَبا کر خرچ کرتا ہے۔ نفس کہتا ہے کہ خرچ کرو گے تو تنگدستی آ جائے گی۔ اور مالدار بننے میں دیر لگے گی۔ پہلے خوب مالدار ہو جاؤ پھر خرچ کرنا، لیکن خرچ کرنے والا نفس کی کوئی بات نہیں مانتا اللہ کی رضا کے لئے وجوہِ خیر میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ موت کے وقت صدقہ کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں کو اتنا دینا، فلاں کو اتنا دینا اس کی وہ حیثیت نہیں رہتی جو تندرستی میں خرچ کرنے کی تھی اب دوسروں کو کیا دے رہے ہو اب تو دوسروں کا ہو ہی چکا۔

رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی فضیلت...... مال خرچ کرنے کے مصارف خیر بتاتے ہوئے پہلے ذَوِی الْقُرْبٰی کا ذکر فرمایا، عربی

زبان میں ذوی القربیٰ رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے۔ سنن الترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسکین کو صدقہ دینے میں صرف صدقہ کا ثواب ہے اور جس سے رحم کا رشتہ ہو اُس کو صدقہ دینے میں (دہرا) ثواب ہے۔ (کیونکہ وہ) صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ رشتہ داروں میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا رشتہ ماں باپ کا اور اپنی اولاد کا ہے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے اور بیوی پر اور اولاد پر خرچ کرنے کی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔ ان رشتوں کے تعلق سے طبعی تقاضے کے باعث سب ہی خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نہ صرف والدین اور اولاد بلکہ دور اور نزدیک کے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرنے میں بھی ثواب رکھا ہے۔ اللہ کی رضا مقصود ہو، ریاکاری نہ ہو۔ جن پر خرچ کرے اُن پر احسان نہ جتائے۔ طعن و تشنیع نہ کرے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل خرچ کرنا اُس دینار کا ہے جو تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور وہ دینار جسے تو اپنے ساتھیوں پر جہاد میں خرچ کرے (یعنی سب سے زیادہ افضل صدقہ ہے)۔ (صحیح مسلم ص ۳۲۲ ج ۱)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آدمی کا اپنے گھر والوں پر ثواب سمجھتے ہوئے خرچ کرنا صدقہ ہے (یعنی اس میں بھی ثواب ہے)۔ صحیح بخاری ص ۳۲۴ ج ۱ بلکہ خرچ کرنے میں اُن لوگوں کا سب سے پہلے دھیان رکھنے کا حکم فرمایا جو اپنے عیال میں ہوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۰)

یتیموں پر مال خرچ کرنے کی فضیلت...... ذوی القربیٰ کے بعد یتامیٰ پر خرچ کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ یتیم کی جمع ہے۔ یتیم ان نابالغ بچوں کو کہا جاتا ہے جن کا باپ زندہ نہ ہو۔ عموماً ایسے بچے حاجت مند ہوتے ہیں۔ ان پر خرچ کرنے کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ اخراجات کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی اُن کی دلداری کی جائے۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صرف اللہ کی رضا کے لئے ایسا کیا تو ہر بال جس پر اُس کا ہاتھ گزرے گا اس کے عوض نیکیاں ملیں گی۔ اور صحیح بخاری ص ۸۸۸ ج ۲ میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنیوالا جنت میں اس طرح ساتھ ہوں گے۔ اس موقع پر آپ نے اپنی انگلیاں (انگوٹھے کے پاس والی اور بیچ والی) ساتھ ملا کر دکھائیں۔ آج کل لوگوں میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ یتیموں پر اپنا مال تو کیا خرچ کرتے انہیں کا مال کھا جاتے ہیں۔ باپ کی میراث میں سے جو حصہ ان کو ملتا ہے۔ اس کو دبا لیتے ہیں۔ اپنے نام یا اپنی اولاد کے نام کروا لیتے ہیں۔ یتیم کے مال پر قبضہ کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے۔

مساکین پر مال خرچ کرنا...... پھر مساکین پر مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا، جن لوگوں کے پاس کچھ بھی نہ ہو ان کو مسکین کہا جاتا ہے۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی حاجت کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے، دُکھ، تکلیف میں بھوکے پیاسے وقت گزار لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ جن کو سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ تو سوال کر کے اپنی حاجت پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن آبرومند آدمی سوال نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی تلاش رکھنی چاہیئے۔ صحیح بخاری ص ۲۰۰ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو (سوال کرنے کے لئے) لوگوں کے پاس چکر لگاتا ہے۔ جسے ایک لقمہ اور دو لقمہ یا ایک کھجور اور دو کھجوریں واپس کر دیتی ہیں۔ یعنی کوئی دیتا ہے کوئی نہیں دیتا (لیکن واقعی) مسکین وہ ہے، جو ایسی چیز نہیں پاتا جو اُسے بے نیاز کرے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے اور وہ سوال کرنے کے لئے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔

سورۂ بلد میں فرمایا: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا

مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ط (سو کیوں وہ گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا اور اے مخاطب تجھے معلوم ہے، گھاٹی کیا ہے؟ گردن [1] کا چھڑانا یا بھوک کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم یا کسی خاک نشین کو کھانا کھلانا، اس میں غلاموں کی آزادی میں مدد دینے اور یتیم اور مسکین کو کھانا کھلانے کو گھاٹی کے پار کرنے سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ یہ چیزیں نفس پر شاق ہیں)

مسافر پر مال خرچ کرنا ...... پھر ابن سبیل پر خرچ کرنے کا ذکر فرمایا۔ عربی زبان میں ابن سبیل مسافر کو کہا جاتا ہے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مسافر کے پاس سفر میں خرچہ ختم ہو جاتا ہے یا مال چوری ہو جاتا ہے۔ یا جیب تراش کر رقم نکال لی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال معلوم ہو جائے تو ان پر خرچ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ یہ لوگ حاجت کا اظہار کریں تب ہی دیا جائے۔ کسی طرح بھی ان کی حاجت معلوم ہو جائے تو ان کی مدد کر دی جائے۔ مسافر کے گھر پر جس قدر بھی مال ہو اور اپنے اموال واملاک جائیداد کی وجہ سے غنی ہو لیکن سفر میں حاجت مند ہو گیا تو اس پر خرچ کر کے ثواب لیا جائے۔

سوال کرنے والوں کو دینے کا حکم ...... پھر سوال کرنے والوں کا ذکر فرمایا۔ ان لوگوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان میں واقعی ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ ان کو تو دینا ہی چاہیئے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں یقین تو نہیں کہ وہ حاجت مند ہو گا لیکن اس کے ظاہر حال اور غالب گمان سے ضرورت مند ہونا معلوم ہوتا ہے ان کو بھی دینا دُرست ہے۔

بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کرنے کی ممانعت ...... مجبوری میں بھوک دفع کرنے یا اور کسی حاجت کے پورا کرنے کے لئے کوئی مانگ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن اس کو پیشہ بنا لینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جن کو سوال کی عادت ہوتی ہے وہ مانگتے رہتے ہیں۔ مال جمع کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہ دیا جائے۔ دنیا میں تو سوال کرنے والے بن کر بے آبرو ہوتے ہی ہیں۔ قیامت کے دن بھی بے آبرو ہوں گے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے لوگوں سے ان کے مالوں کا سوال اس لئے کیا کہ مال زیادہ جمع ہو جائے تو وہ آگ کے انگاروں کا سوال کرتا ہے (جو دوزخ میں اسے ملیں گے) اب چاہے کم کرے یا زیادہ کرے۔ (رواہ مسلم ص ۳۳۳ ج ۱)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان دنیا میں برابر سوال کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔ (صحیح بخاری ص ۱۹۹ ج ۱)

اس کا چہرہ دیکھ کر لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ دُنیا میں سائل تھا وہاں اپنے چہرے کی آبرو کھوئی تو یہاں بھی اسی کا ظہور ہوا۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ غنی کو اور ٹھیک ٹھاک بدن والے قوی آدمی کو سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ الا یہ کہ ایسا مجبور ہو کہ تنگدستی نے اُسے مٹی میں ملا رکھا ہو (یعنی زمین کی مٹی کے سوا اس کے پاس کچھ نہ ہو) یا قرضے میں مبتلا ہو گیا ہو جو ذلیل کرنے والا ہو، اور جس شخص نے مال زیادہ کرنے کے لئے لوگوں سے سوال کیا تو قیامت کے دِن اس کا چہرہ چھلا ہوا ہو گا۔ اور یہ مال گرم پتھر بنا ہو گا جس کو جہنم سے لے کر کھاتا ہو گا اب جی چاہے تو کمی کرے اور چاہے تو زیادتی کر لے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۶۳)

ہر شخص کو اپنی اپنی ذمہ داری بتا دی گئی مانگنے والا مانگنے سے پرہیز کرے اور جس سے مانگا جائے وہ موقع دیکھ کر خرچ کرے۔ سائل کو جھڑکے بھی نہیں۔ کیا معلوم مستحق ہی ہو اور غور و فکر بھی کرے حاجت مندوں کو تلاش بھی کرے۔

مسئلہ ...... جو شخص مسجد میں سوال کرتا ہوا اُسے نہ دے۔

---

[1] ...... یعنی غلام آزاد کرانا۔

غلاموں کی آزادی میں مال خرچ کرنا...... مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں سب سے آخر میں وَفِی الرِّقَابِ فرمایا رقاب رقبة کی جمع ہے۔ رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں ص ۲۰۸ ج ۱ کہ فی الرقاب سے مکاتبوں کے آزاد کرانے میں مدد دینا مراد ہے، جو غلام کسی کی ملکیت میں ہو اور اس کا آقا کہہ دے کہ اتنا مال دے دو تو تم آزاد ہو اُس کو مکاتب کہا جاتا ہے۔ ان کو مال دے کر آزاد کرا دینا بھی وجوہِ خیر میں سے ہے اور ثواب کا کام ہے۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں (ص ۱۲۴ ج ۱) کہ قیدیوں کی جانوں کا فدیہ دے کر اُن کا چھڑا لینا یا غلام خرید کر آزاد کر دینا بھی اس کے عموم میں شامل ہے (جب کبھی مسلمان اللہ کے لئے جنگ کرتے تھے اور شریعت کے مطابق جہاد اور قتال ہوتا تھا۔ اس وقت غلام اور باندیوں کے مالک ہوتے تھے۔ اب نہ اللہ کے لئے جہاد ہے نہ غلام ہیں نہ باندیاں ہیں۔ کوئی انسان کسی انسان کا مالک نہیں ہے۔ پھر جب کبھی مسلمان اللہ کے لئے جنگ کریں گے اور اُصولِ شریعت پر لڑیں گے تو پھر غلام، باندیاں قبضہ میں آئیں گی)۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا...... مال خرچ کرنے کے مواقع ذکر فرما کر فرمایا: وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ یعنی تقویٰ کے کاموں میں یہ بھی ہے کہ فرض نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا بیان پہلے بھی آ چکا ہے۔ اوپر مال کے مصارفِ خیر بیان فرما کر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی ذکر فرمایا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ پہلے مصارفِ زکوٰۃ بیان کئے اور پھر زکوٰۃ کی ادائیگی پر متوجہ فرمایا پھر لکھتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جو وجوہِ خیر بیان کی ہیں ان سے نفلی صدقات مُراد ہوں (اور نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر فرمانے میں اس کی فرضیت بتانا مقصود ہو)۔

عہد پورا کرنا...... نیکی اور تقویٰ کے کام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ عہد کر لیں)۔ ایفائے عہد کی شریعتِ مطہرہ میں بڑی اہمیت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا ہو اور یہ نہ فرمایا ہو کہ اَلَا لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (خبردار اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پورا نہیں)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۵ عن شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جس شخص کے اندر چار خصلتیں ہوں گی خالص منافق ہوگا اور جس میں اُن میں سے ایک خصلت ہوگی تو یوں مانا جائے گا کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ اُسے چھوڑ نہ دے۔

۱۔ جب اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ۲۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
۳۔ جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔ ۴۔ جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے۔ (صحیح بخاری ص ۱۰ ج ۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ دھوکہ دینے والے کیلئے قیامت کے دِن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی دھوکہ بازی (کا جھنڈا) ہے اور اس جھنڈے کے ذریعہ اُسے پہچانا جائے گا۔ (صحیح بخاری ص ۴۵۲ ج ۱)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دِن ہر دھوکہ دینے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا۔ جو اس کے پیچھے اس کے دھڑ پر کھڑا ہوا ہوگا اور جتنا بڑا اس کا غدر ہوگا اُسی قدر وہ جھنڈا اونچا ہوگا (پھر فرمایا) خبردار

اُس سے بڑھ کر بڑا دھوکے باز کوئی نہیں جو عوام کا امیر ہو اور عوام کو دھوکہ دے۔ (صحیح مسلم ص ۸۳ ج ۲)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بندہ کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا راعی بنا دے۔ (یعنی صاحبِ اقتدار بنا کر عوام کی نگرانی اور خیر خواہی اس کے سپرد کر دے) پھر وہ اس کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ شخص جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا۔ (صحیح بخاری ص ۱۰۵۸ ج ۲)

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کی کسی جماعت کا والی ہو اور اُن کی نگرانی اور نگہداشت اُس کے ذمّہ ہو پھر وہ اس حال میں مر جائے کہ وہ ان کے ساتھ خیانت کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس پر جنت حرام فرما دے گا۔ (صحیح بخاری ص ۱۰۵۹ ج ۳)

جو لوگ بڑے بڑے وعدے کر کے حکومت حاصل کرتے ہیں یا حکومت کے چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں پھر وہ عوام کے ساتھ غدر کرتے ہیں اور سارے عہد و پیمان توڑ دیتے ہیں اُن لوگوں کے حق میں یہ کیسی سخت وعیدیں ہیں غور کر لیں۔

مسئلہ...... اگر کافروں سے کوئی معاہدہ ہو تو اس کا پورا کرنا بھی لازم ہے۔ جب کسی قوم سے معاہدہ ہو اور ان کی طرف سے خیانت کا ڈر ہو اور اس کے ختم کرنے میں مصلحت ہو تو پہلے یہ بتا دیں کہ ہمارا عہد باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد کوئی نئی کارروائی کر سکتے ہیں جو معاہدہ کی شرطوں کے خلاف ہو۔ سورۂ انفال میں ارشاد فرمایا: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ. (اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا جس سے (امان و حفاظتِ جان کا وعدہ تھا) تو وہ جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا۔ (صحیح بخاری ص ۴۴۸ ج ۱)

صابرین کی فضیلت...... پھر صبر والوں کی تعریف فرمائی اور فرمایا: وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اس میں سختی اور تکلیف کے زمانہ میں صبر کرنے کو نیکی اور تقویٰ والا کام بتایا ہے اور جنگ کے وقت جب کافروں سے مقابلہ ہو اُس وقت جم کر ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں شمار فرمایا ہے۔ سورۂ انفال میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (اے ایمان والو! جب تم کسی جماعت سے مقابلہ کرو تو ثابتِ قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو اور اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ)۔

سورۂ صف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہو)۔

آخر میں فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (کہ یہ حضرات جن کی صفات اُوپر مذکور ہوئیں وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے ہیں (کیونکہ ایمانِ قلبی کے ساتھ ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں) اور یہ لوگ تقویٰ والے بھی ہیں (کیونکہ حرام سے بچتے ہیں، اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں)۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

اے ایمان والو ! تم پر قصاص فرض کیا گیا مقتولین کے بارے میں، آزاد کو آزاد کے بدلہ، اور غلام کو غلام کے بدلہ،

وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ

اورعورت کوعورت کے بدلہ، سوجس شخص کیلئے اسکے بھائی کی طرف سے کچھ معافی کردی جائے تو بھلائی کے ساتھ اس کا مطالبہ ہواور اچھے طریقہ پر اس کی ادائیگی ہو۔

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل والو! تاکہ تم پرہیز کرتے رہو۔

قصاص اور دیت کے بعض احکام

جب کوئی شخص کسی کوقتل کردے تو اُس کی جان کا بدلہ جو جان سے دیا جاتا ہے۔قرآن وحدیث میں اس کوقصاص کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ قصاص قتل عمد (یعنی قصداً جان کوقتل کرنے) میں ہوتا ہے۔جس کی تفصیلات کتب فقہ میں مرقوم ہیں۔لفظ قصاص مماثلت یعنی برابری پر دلالت کرتا ہے چونکہ جان کا بدلہ جان سے رکھا گیا ہے اس لئے اس میں حاکم ،محکوم ،صغیر ،کبیر اور امیر وغریب میں کوئی فرق نہیں اور قبیلوں اور قوموں کے اعتبار سے جو دُنیا میں امتیاز سمجھا جاتا ہے قصاص کے قانون میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اگر مقتول کے اولیاء سب یا کوئی ایک وارث جان کے بدلہ مال لینے پر راضی ہو جائے تو اس مال کو دیت (خون بہا) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اگر کوئی شخص کسی کو خطاً قتل کردے (جس کی کئی صورتیں ہیں اور جس کے احکام سورۂ نساء میں مذکور ہیں) تو اس کے عوض مال واجب ہوتا ہے اس مال کو بھی دیت کہا جاتا ہے۔اگر کوئی شخص کسی کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کاٹ دے تو اس میں بھی بعض صورتوں میں قصاص اور بعض صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے۔اعضاء کی دیت کو اَرش بھی کہا جاتا ہے۔اعضاء کے قصاص کا ذکر سورۂ مائدہ میں آئے گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔ یہاں قصاص نفس کے بعض احکام ذکر فرمائے ہیں۔لباب النقول میں حضرت سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عرب کے دو قبیلے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے اور اُن میں کُشت وخون کی وارداتیں ہوتی تھیں۔غلام اور عورتوں تک کو قتل کر بیٹھے تھے ابھی تک ان کے آپس کے قصاص یا دیت کے فیصلے نہ ہونے پائے تھے کہ دونوں قبیلوں نے اسلام قبول کرلیا۔اُن میں سے ایک قبیلہ دُوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو زیادہ صاحبِ عزت اور رفعت سمجھتا تھا اس لئے اُنہوں نے قسم کھائی کہ ہم راضی نہ ہوں گے جب تک کہ ہمارے غلام کے بدلہ آزاد کوقتل نہ کیا جائے اور ہماری عورت کے بدلہ دُوسرے قبیلہ کا مرد قتل نہ کیا جائے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی ،جس میں ارشاد فرمایا کہ آزاد، آزاد کے بدلہ اور غلام، غلام کے بدلہ اور عورت، عورت کے بدلہ قتل کی جائے۔اس شانِ نزول سے معلوم ہوگیا کہ اَلْعَبْدُ بِالْعَبْدِ اور اَلْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ غلام کے بدلہ آزاد قتل نہ ہو اور عورت کے بدلہ مرد قتل نہ ہو۔سورۂ مائدہ میں جو اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے اس میں ہر جان کو دوسری جان کے برابر قرار دیا ہے۔مفسر ابن کثیر (ص ۲۰۹ ج ۱) نے حضرت

ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اہل عرب مرد کو عورت کے بدلہ قتل نہیں کرتے تھے بلکہ مرد کو مرد کے بدلہ اور عورت کو عورت کے بدلہ قتل کرتے تھے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ وَالۡعَيۡنَ بِالۡعَيۡنِ کا حُکم نازل فرمایا۔

قصاص وارثوں کا حق ہے...... قتل عمد (جس میں قصاص ہے) اس میں قصاص لینا مقتول کے وارثوں کا حق ہے۔ مقتول کے جتنے بھی شرعی وارث ہوں وہ سب قصاص کے مستحق ہیں۔ لیکن چونکہ قصاص قابلِ تقسیم نہیں ہے اس لئے اگر کوئی بھی ایک وارث اپنا حق قصاص معاف کر دے تو اب دوسرے وارث بھی قصاص نہیں لے سکتے اور اب وہ دیت ہی لے سکتے ہیں۔ اور جس نے قصاص معاف کر دیا اب وہ بھی دیت لے گا۔ ہاں اگر اس نے اپنے حصہ کی دیت بھی معاف کر دی تو وہ بھی معاف ہو جائے گی۔ ایک جان کی دیت سو اُونٹ ہیں۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ نساء کی آیت وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ يَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا کی تفسیر میں بیان ہوگی۔ اگر قاتل اور مقتول کے ورثاء آپس میں مال کی کسی مقدارِ معلوم پر صلح کر لیں تب بھی قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور جو مال مصالحت یا دیت کے طور پر وصول ہو مقتول کے وارث شرعی میراث کے حصوں کے مطابق اس کے مالک اور وارث ہوں گے۔ یہ دیت کے طور پر یا مصالحت کے ذریعہ مال لینا فریقین کی رضامندی سے ہوسکتا ہے۔

قصاص کے عوض مال لینے کی مشروعیت اُمتِ محمدیہ کے لئے تخفیف اور رحمت ہے...... قتل عمد کی صورت میں باہمی رضامندی سے قصاص کے عوض مال دے کر قاتل کی جان بچا دینا اور دیت کا حلال ہونا یا بطورِ مصالحت کے کچھ مال لے لینا یہ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے اور خاص رحمت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل پر قصاص ہی فرض تھا۔ دیت اُن کے لئے مشروع نہ تھی۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر رحم فرمایا کہ اُن کو دیت لینے کا حق دیا اور اس اُمت سے پہلے دیت حلال نہیں تھی۔ اہلِ توریت پر صرف قصاص فرض تھا اور دیت مشروع نہ تھی اور اہلِ انجیل کو معاف کر دینے ہی کا حکم تھا۔ اس اُمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص اور معافی اور دیت تینوں چیزیں مشروع فرما دیں۔ (ابن کثیر ص۲۱۰ ج۱)

جب کوئی ایک وارث یا سب وارث خون معاف کر دیں یا دیت پر راضی ہو جائیں اور دیت کا دینا واجب ہو جائے یا مصالحت کے ذریعہ آپس میں کچھ مال دینا طے ہو جائے تو اب مقتول کے ورثاء کو چاہیئے کہ حسن مطالبہ کریں اور سختی اور تشدد سے کام نہ لیں فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ میں اُسی کا حکم فرمایا ہے اور قاتل پر لازم ہے کہ بغیر ٹال مٹول کے اور بغیر تقاضوں کے وارثوں کو طے شدہ مال ادا کر دے۔ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ میں اسی کا حکم دیا ہے۔ جب آپس میں معاملات طے ہو گئے تو دونوں فریقوں میں سے جو شخص بھی زیادتی کرے گا وہ آخرت میں عذابِ الیم میں گرفتار ہوگا۔ اُسے سخت عذاب دیا جائے گا۔ مثلاً قاتل اگر دیت پر معاملہ کر کے دیت دینے سے انکاری ہو جائے کہیں چھپ جائے، فرار ہو جائے تو یہ اس کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہے اور مثلاً مقتول کے اولیاء دیت لیکر بھی قتل کر دیں تو یہ اُن کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہوگی۔ ہر فریق کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ حضرت ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جس شخص کا کوئی خونی نقصان ہو جائے (یعنی اُس کا کوئی عزیز عمداً قتل کر دیا جائے یا زخم پہنچ جائے) تو اُسے تین چیزوں کا اختیار ہے قصاص لے لے، یا معاف کر دے یا دیت لے لے۔ اس کے سوا اگر کوئی چوتھا کام کرنا چاہے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو، ان میں سے کسی چیز کو اختیار کرنیکے بعد زیادتی کرے تو اس کیلئے دوزخ ہے اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۳۰۱)

قانونِ قصاص میں بڑی زندگی ہے...... قصاص کا قانون جاری کرنے اور اس کو عملاً نافذ کرنے میں بہت بڑی زندگی ہے۔ اس

مضمون کو وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ میں بیان فرمایا ہے۔ قصاص میں بظاہر قاتل کی موت ہے لیکن اُسے اُمت کے حق میں بڑی حیات فرمایا۔ کیونکہ جب قصاص کا قانون نافذ ہوگا تو قاتل بھی قتل کرنے سے بچے گا اور ہر شخص کے کنبہ اور قبیلے کے لوگ اس بات کے فکرمند رہیں گے کہ ہمارے کسی فرد سے کوئی شخص قتل نہ ہو جائے۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو چند آدمی مل کر قتل کر دیں تو اُن سب کو اُس ایک مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا۔ (ص ۲۱۰ ج ۱)

حضرت سعید بن المسیبؒ نے بیان فرمایا کہ پانچ یا سات آدمیوں نے کسی ایک شخص کو تنہائی میں پوشیدہ طور پر قتل کر دیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پانچوں یا ساتوں کو ایک شخص کے قصاص میں قتل کر دیا اور فرمایا کہ اگر شہر صنعاء کے سارے آدمی مل کر بھی شخص واحد کو قتل کرتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ (رواہ مالک و روی البخاری عن ابن عمر نحوہ کما فی المشکوٰۃ ص ۳۰۲)

قصاص عین عدل ہے، اس کو ظلم کہنا ظلم ہے...... قصاص کا قانون نافذ ہونے سے اور اس پر عمل کرنے سے بہت سی جانیں بچتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز رہتے ہیں اس لئے قصاص کو بڑی حیات کا ذریعہ بتایا۔ بہت سے جاہل قصاص کے قانون کو ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ظلم کا معنی بھی نہیں جانتے، ظلم کرنے والا تو قاتل ہے۔ جس نے ناحق قصداً و عمداً کسی کو قتل کیا قتل کے بدلہ میں قاتل کو قتل کر دینا عین انصاف ہے اس کو ظلم سے تعبیر کر دینا جہالت اور حماقت ہے یہ جاہل کہتے ہیں کہ قاتل کو قتل نہ کیا جائے بلکہ جیل میں ڈال دیا جائے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے تو اور زیادہ قتل پر جرأت ہو جاتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ قتل تو کر ہی دوں، تھوڑی بہت جیل بھگت لوں گا۔ جن کا مزاج قتل اور غارت گری اور ڈکیتی اور فتنہ فساد کا ہے وہ جیل سے بالکل نہیں ڈرتے۔ جیل کی دیواریں پھاند کر اور کھڑکیاں توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک انسانوں کی جانوں کی قیمت نہیں ہے وہ لوگ قصاص کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اُنہیں قاتل پر رحم آتا ہے۔ عامۃ الناس کی جانوں پر رحم نہیں آتا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ جس نے قصداً قتل کیا تو اس میں قصاص ہے اور جو شخص قصاص نافذ کرنے کے بارے میں آڑے آ جائے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی لعنت ہے اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ (آخر حدیث من کتاب الدیات)

قصاص یا دیت معاف کرنا سربراہِ مملکت کے اختیار میں نہیں ہے...... دنیا میں ایک یہ جاہلانہ قانون نافذ ہے کہ ملک کا سربراہ قاتل کی درخواست پر اپنے ذاتی و جماعتی فوائد کو سامنے رکھ کر قاتل کو معاف کر دیتا ہے۔ یہ شریعتِ اسلامیہ کے بالکل خلاف ہے مقتول کے وارثوں کو حق ہے کہ معاف کریں یا قصاص لیں یا دیت لیں، کسی امیر یا وزیر یا صدر یا بادشاہ کو معافی دینے کا اور وارثوں کا حق باطل کرنے کا بالکل اختیار نہیں ہے۔ جو بھی کوئی سربراہ ایسا کرے گا۔ وہ قانون قرآن کا باغی ہوگا۔ اور اس کی سزا کا مستحق ہوگا۔

كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ اۨلۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ

تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت حاضر ہو جائے تو اپنے والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت کرے

بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى

بشرطیکہ مال چھوڑا ہو۔ یہ حکم لازم ہے اُن لوگوں پر جو خدا کا خوف رکھتے ہیں۔ پھر جو شخص سننے کے بعد اُس کو بدل دے اُس کا گناہ انہیں لوگوں پر ہوگا جو اُس کو تبدیل

الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا

کر دیں گے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ سو جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی جانب داری یا گناہ کا خوف کھائے

فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

پھر ان کے درمیان صلح کرادے سو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے۔

وصیت کے احکام

اس آیت کریمہ میں والدین اور قرابت داروں کے لئے مال کی وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا ہے جب کسی کو موت کے آثار معلوم ہونے لگیں تو وہ وصیت کردے۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس وصیت کی فرضیت میراث کے حصے مقرر ہونے کے بعد منسوخ ہو چکی ہے۔ والدین وارثوں میں شامل ہیں۔ جن کے حصہ سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں مذکور ہیں۔ اور وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے جب تک کہ دوسرے ورثاء کی اجازت نہ ہو لما ورد فی الحدیث لا وصية لوارث. اخرجه الترمذی وابوداؤد اجازت وصیت کرنے والے کی موت کے بعد معتبر ہوگی۔ اگر دُوسرے ورثاء اجازت دیں تو کسی وارث کے لئے وصیت نافذ ہو سکتی ہے۔ البتہ غیر وارث رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے لیکن وصیت کا اُصول یہ ہے کہ وہ صرف تہائی مال میں نافذ ہو سکتی ہے، بہتر یہ ہے کہ مرنے والا تہائی مال سے کم میں وصیت کرے اور بہت سے بہت تہائی مال تک وصیت کرنے کی گنجائش ہے۔ جتنی بھی وصیتیں ہوں گی وہ قرضوں کی ادائیگی کے بعد جو مال بچے اس کے تہائی میں نافذ ہوں گی۔

اگر تہائی سے زیادہ مال کی وصیت ہو تو وہ بھی بالغ ورثاء کی اجازت سے مرنے والے کی موت کے بعد نافذ ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی میں جو کوئی وارث اجازت دے دے وہ معتبر نہیں ہے۔ اگر وارثوں نے اس کی زندگی میں تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت دے دی تھی تو اس کی موت کے بعد منسوخ کر سکتے ہیں اور وصیت کرنے والا جو کچھ وصیت کردے وہ بھی اپنی زندگی میں منسوخ کر سکتا ہے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں اللہ کے لئے خرچ کرتا رہے۔ اپنے اہل وعیال پر بھی خرچ کرے اور دُوسرے اعزہ واقرباء پر بھی اور یتامیٰ اور مساکین پر بھی۔ مساجد ومدارس کے لئے وقف کرے مسجدیں بنوائے، مدرسے کھولے۔

وصیت نافذ کرنے سے پہلے قرضے ادا کئے جائیں گے...... وصیت کے بارے میں اول تو یہ قانون ہے کہ قرضوں کی ادائیگی کے بعد باقی تہائی مال میں نافذ ہو سکتی ہے۔ دوسرے وصیت کے مطابق خرچ کرنے کا تعلق وارثوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ دیانتداری سے خرچ کریں یا نہ کریں۔ اس لئے جو کچھ فی سبیل اللہ خرچ کرنا چاہے زندگی میں خرچ کردے۔ البتہ ایسا نہ ہو کہ گھر والے ضرورت مند ہوں۔ ان کی ضروری حاجتیں رُکی رہیں اور یہ باہر خرچ کرتا رہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ لوگوں کے قرضے چڑھے ہوئے ہوں اور سخاوت کے جوش میں ثواب کے کاموں میں خرچ کرتا رہے اور قرضوں کی ادائیگی رُکی رہے۔ اگر زندگی میں نیک کاموں میں خرچ نہ کر سکا اور موت سے پہلے وصیت کردی کہ فلاں فلاں جگہ اتنا مال خرچ کردیا جائے اور قرض خواہوں کے قرض کا ذکر چھوڑ دیا تب بھی پہلے قرضے ہی ادا کئے جائیں گے اگر اتنا زیادہ قرض ہے کہ جتنا مال ہے وہ سب ان کی ادائیگی میں ختم ہو جاتا ہے تو نہ وصیت نافذ ہوگی نہ میراث میں کسی کو کچھ ملے گا۔

مسئلہ...... وصیت کرنے میں پہلے فرائض کو مقدم کیا جائے۔ مثلاً اگر وصیت کرنے والے نے حج فرض نہیں کیا تھا یا اس کے ذمہ زکوتیں فرض ہوئی تھیں اور اُس نے نہیں دیں یا کفارات واجبہ ہیں جن کی ادائیگی باقی ہے۔ ان چیزوں کی ادائیگی کو وصیت میں مقدم کرے۔ اگر اس نے فرائض اور واجبات کے ساتھ غیر فرض اور غیر واجب کاموں کی وصیت کردی تب بھی اُن لوگوں پر لازم ہے جن کے قبضے میں اُس

کا مال آجائے کہ فرائض اور واجبات کو مقدم کریں۔ اگرچہ اُس نے وصیت میں ان کا ذکر بعد میں کیا ہو۔

حج بدل کی وصیت...... جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ قرضوں کی ادائیگی کے بعد تہائی مال میں وصیت نافذ ہوسکتی ہے (اگرچہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی کی وصیت ہو) پس اگر حج بدل کی وصیت کی ہو اور اس کے لئے کسی کو بھیجنا چاہیں اور تہائی مال اس کے لئے کافی نہ ہو اور بالغ ورثاء اپنے پاس سے بقدر ضرورت تہائی سے زائد مال دے دیں تو بہتر ہے لیکن یہ ان پر واجب نہیں ہے۔

مسئلہ...... یہ حج مرنے والے کے شہر سے کسی شخص کو بھیج کر کرائیں جو سواری پر جا کر اس کی طرف سے حج کرلے، اگر اس کی وصیت کے مطابق اس کے شہر سے کسی کو بھیج کر حج کرانا چاہیں اور اس کے لئے وصیت کی رقم کافی نہیں ہو رہی ہے اور ورثاء اپنے پاس سے بھی نہیں دیتے تو جس کسی شہر سے بھی آدمی بھیج کر حج کرایا جاسکتا ہو وہیں سے کسی کو بھیج دیا جائے اور وصیت کی رقم اس پر خرچ کر دی جائے۔

گناہ کی وصیت کرنا گناہ...... کسی بھی گناہ کی وصیت کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص گناہوں میں مال خرچ کرنے کی وصیت کر دے تو وہ نافذ نہ ہوگی۔ شرک اور بدعت کے کاموں کے لئے کوئی شخص وصیت کر دے تو وہ بھی نافذ نہ ہوگی۔ اس کے متعلقین اور ورثاء پر لازم ہے کہ اس کی اس طرح کی وصیت کو نافذ نہ کریں۔

وارثوں کے لئے مال چھوڑنا بھی ثواب ہے...... وارثوں کے لئے مال چھوڑ کر جانا بھی ثواب ہے۔ صحیح بخاری (ص ۳۸۳ ج۱) میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں فتح مکہ کے سال ایسا مریض ہوا کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ ابھی موت آنے والی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس بہت سا مال ہے اور (فرائض میراث کے اعتبار سے) صرف میری بیٹی کو میراث کا حصہ پہنچتا ہے تو کیا میں اپنے پورے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نے عرض کیا دو تہائی مال کی وصیت کر دوں، فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا آدھے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا تہائی مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا ''ہاں'' تہائی مال کی وصیت کر سکتے ہو اور تہائی (بھی) بہت ہے، بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو (جن کو عصبہ ہونے کے اعتبار سے میراث پہنچتی ہے) مال دار ہونے کی حالت میں چھوڑ و تو یہ اُس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگدستی کی حالت میں چھوڑ و جو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا کریں اور اس میں شک نہیں کہ تم جو بھی کوئی خرچہ کرو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تمہیں ضرور اس کا ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ ایک لقمہ اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دے دو گے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔

وصیت میں دیر نہ کی جائے...... انسان دنیا میں رہتا ہے تو لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کسی سے لینا کسی کو دینا حقوق واجبہ ہوتے ہیں۔ قرضے لئے ہوئے ہوتے ہیں امانتیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور موت کا کچھ پتہ نہیں کب آجائے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وصیت لکھی ہوئی ہر وقت تیار رہے جس جس کا جو کچھ حق ہے یا قرضہ ہے یا امانتیں ہیں یا دینی فرائض اور واجبات ہیں جن کی ادائیگی باقی ہے ان سب کو کسی کاپی وغیرہ میں لکھ کر رکھے اور وصیت تیار رہے تا کہ اچانک موت آجائے تو وارثین ان سب کو ادا کر دیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کسی مسلمان کے پاس کوئی چیز ہو جس کی وصیت کرنا ہو تو اس کے لئے یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ دو راتیں گزر جائیں اور اس کی وصیت اُس کے پاس لکھی ہوئی نہ ہو۔ (صحیح بخاری ص ۳۸۲ ج۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو وصیت پر موت آئی (یعنی وصیت کر کے مرا) وہ صحیح راستہ پر اور سنت پر مرا اور تقویٰ اور شہادت پر مرا اور بخشا ہوا ہونے کی حالت میں مرا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۹۴)

وصیت کو بدلنے کا گناہ...... جب وصیت کرنے والا وصیت کر کے وفات پا جائے تو اس کے ورثاء اور جس کو اُس نے وصی یا مختار بنایا ہو اسی طرح حاکم اور قاضی ان لوگوں پر ضروری ہے کہ مرنے والے نے جو وصیت کی اس کے مطابق شرعی اصول پر نافذ کر دیں۔ وصیت کرنے والا تو دُنیا سے چلا گیا اس کے اختیارات ختم ہو گئے۔ اب مال دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ ان لوگوں پر لازم ہے کہ وصیت کو صحیح طریقہ پر نافذ کریں جس کو جتنا دینا ہے، اس کو دینے سے دریغ نہ کریں۔ فقراء اور مساکین کے لئے وصیت کی ہے انہیں معلوم بھی نہیں کہ ہمارے لئے کوئی وصیت کی گئی ہے اور بعض رشتہ دار جو دُور رہتے ہیں اُن کے لئے وصیت کی اور اُنہیں اس کا پتہ نہیں ہے یہ لوگ خود سے تقاضا کریں گے نہیں۔ اب جن کے قبضہ میں مال ہے وہ دیں یا نہ دیں، کم دیں زیادہ دیں، نصیحت کو چھپائیں یا ظاہر کریں۔ یہ سب اُن کے اختیار میں ہے اب وصیت نافذ کرنے اور مال تقسیم کرنے کی ذمہ داری انہیں پر ہے۔ یہ لوگ آخرت کو سامنے رکھتے ہوئے سارا کام انجام دیں۔ وصیت کو اَدل بدل نہ کریں۔ اگر وصیت میں تبدیلی کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور آخرت میں باز پُرس ہوگی۔ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَاسَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وصیت کر کے مر جائے (اور ادائیگی کے لئے مال بھی چھوڑا ہو) تو اس کی آخرت کی ذمّہ داری ختم ہوگئی اب ذمہ داری وارثوں پر آ گئی۔ اگر اُنہوں نے ادائیگی نہ کی تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے ان کا ادا نہ کرنا تبدیلِ وصیت کی ایک صورت ہے۔ نیز علامہ جصاص لکھتے ہیں کہ جس کسی پر زکوٰۃ فرض ہوئی اور اس کی ادائیگی کے بغیر مر گیا۔ تو وہ گنہگار ہوگا اور زکوٰۃ روکنے والوں کے حکم میں داخل ہوگا۔ اگر اس نے ادائیگی زکوٰۃ کی وصیت کر دی اور ورثاء نے وصیت نافذ نہ کی تو وہ گناہ سے بری ہو گیا اور اب وصیت بدلنے والے گناہ گار ہوں گے۔ علامہ جصاص نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وصیت میں ظلم کیا گیا ہو (مثلاً پورے مال کی وصیت کر دی یا ورثاء کی اجازت کے بغیر تہائی مال سے زائد کی وصیت کر دی تو اس کا بدل دینا واجب ہے)۔

آخر میں فرمایا: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (سو جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی جانبداری کا یا گناہ کا خوف کھائے پھر اُن کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والا خطاً یا عمداً وصیت میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کر لیتا ہے جس میں کسی وارث یا دوسرے کسی رشتہ دار کی طرف میلان ہو جاتا ہے اور وصیت میں عدل باقی نہیں رہتا اگر ایسی کوئی صورت ہو جائے اور کسی کو معلوم ہو جائے کہ ایسی وصیت کی ہے یا ایسی وصیت کرنے کا اِرادہ کیا ہے اور وہ بیچ میں پڑ کر موصی (وصیت کرنے والا) اور موصٰی لھم (جن کے لئے وصیت کی جائے) کے درمیان اصلاح کر دے اور اُن کو صحیح طریقہ بتا دے جو شرعاً دُرست ہو یا صاحبِ اقتدار اس کو بدل دے تو اس کو بدلنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو شخص ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا یہ وہ تبدیلی نہیں ہے جس کی مذمت فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ میں کی گئی ہے۔

جو وصیت عادلانہ نہ ہو اس کی کئی صورتیں مفسرین نے لکھی ہیں۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ دُور کے رشتہ داروں کے لئے وصیت کر دے اور قریب کے رشتہ داروں کو چھوڑ دے اور ایک صورت یہ ہے کہ چونکہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے پوتوں کو میراث نہیں مل سکتی اور کسی ایک بیٹے کو زیادہ مال پہنچانا چاہتا ہے تو پوتوں کے غیر وارث ہونے کا بہانہ بنا کر پوتوں کے لئے وصیت کر دے تا کہ اُن پوتوں کے باپ کو مال زیادہ پہنچ جائے اور ایک صورت یہ ہے کہ کل مال کی وصیت کر دے یا تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر دے، جو شخص بھی اس قسم کی وصیت پر واقف ہو کر صحیح طریقہ بتائے گا۔ اور راہ صحیح پر ڈالے گا اس کو تبدیلِ وصیت کا گناہ نہ ہوگا۔

بعض لوگ بیٹیوں کو میراث سے محروم کرنے کے لئے زندگی ہی میں بیٹوں کے نام یا کسی ایک بیٹے کے نام جائیداد کر دیتے ہیں تا کہ

دوسری اولاد محروم ہو جائے اور بھی طرح طرح کی غیر شرعی وصیتیں کر جاتے ہیں جس سے گنہگار ہوتے ہیں۔ وارث کو میراث سے محروم کرنے کے لئے کسی کو مال ہبہ کر دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بلا شبہ کوئی مرد اور کوئی عورت ساٹھ سال تک اللہ کی فرمانبرداری میں لگے رہیں۔ پھر ان کو موت حاضر ہو جائے اور وصیت کرنے میں کسی کو ضرر پہنچانے کا پہلو اختیار کرلیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ حدیث بیان کر کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سورۂ نساء کی آیت مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ تلاوت کی اور وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ تک پڑھی۔ (رواہ احمد کمافی المشکوٰۃ ص ۲۶۵ ج ۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے وارث کی میراث سے کوئی حصہ کاٹ دیا۔ اللہ تعالیٰ جنت سے اُس کی میراث کاٹ دیں گے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۹۴)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

اے ایمان والو! فرض کئے گئے تم پر روزے جیسا کہ فرض کئے گئے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ

پرہیزگار بن جاؤ۔ چند دن کے روزے رکھ لو سو جو شخص تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دُوسرے دِنوں کی گنتی کر کے

اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ

روزے رکھ لے۔ اور جن لوگوں کو روزہ رکھنے کی طاقت ہے ان کے ذمہ ہے فدیہ ایک مسکین کے کھانے کا، پس جو شخص اپنی خوشی سے کوئی خیر کا کام کرے تو وہ اس

خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

کے لئے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

رمضان کے روزوں کی فرضیت اور ان کے ضروری احکام

ان آیات میں رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کا اعلان اور اظہار فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

(۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔ (۴) حج کرنا۔ (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔ (صحیح بخاری ص ۶ ج ۱)

نماز اور روزہ دونوں بدنی عبادتیں ہیں اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور حج میں مال بھی خرچ ہوتا ہے بدنی محنت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بدنی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی ہے۔ نماز تو نبوت کے پانچویں ہی سال مکہ معظمہ ہی میں فرض ہوگئی تھی جو شب معراج میں عطا کی گئی۔ اور رمضان شریف کے روزے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ۲ھ میں فرض ہوئے۔ جس طرح نماز اور زکوٰۃ پہلی اُمتوں پر فرض تھی۔ اسی طرح سے روزے بھی اُن پر فرض تھے كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں یہ بتایا ہے کہ روزے کوئی نئی چیز نہیں ہیں یہ

پہلی اُمتوں پر بھی فرض ہوئے تھے انہوں نے بھی روزے رکھے تم بھی رکھو۔

روزہ سے صفت تقوٰی پیدا ہوتی ہے...... پھر روزہ کی حکمت اور فائدہ بتاتے ہوئے فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ 'روزے رکھنے سے نفس کے تقاضوں پر زد پڑتی ہے اور قوٰی شہوانیہ میں ضعف آتا ہے اور تقوٰی صغیرہ و کبیرہ ظاہرہ اور باطنہ گناہوں سے بچنے کا نام ہے۔ آیت کریمہ میں بتایا کہ روزہ کی فرضیت تقوٰی حاصل کرنے کے لئے ہے بات یہ ہے کہ انسان کے اندر بہیمیت کے جذبات ہیں نفسانی خواہشات ساتھ لگی ہوئی ہیں جن سے نفس کا اُبھار معاصی کی طرف ہوتا رہتا ہے روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس سے بہیمیت کے جذبات کمزور ہوتے ہیں اور نفس کا اُبھار کم ہو جاتا ہے اور شہوات ولذات کی اُمنگ گھٹ جاتی ہے۔ پورے رمضان کے روزے رکھنا ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ ایک مہینہ دن میں کھانے پینے اور جنسی تعلقات کے مقتضی پر عمل کرنے سے اگر باز رہے تو باطن کے اندر ایک نکھار اور نفس کے اندر سُدھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص روزے اُن احکام و آداب کی روشنی میں رکھ لے جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں تو واقعۃً نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ جو گناہ انسان سے سرزد ہو جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ دو چیزیں گناہ کا باعث بنتی ہیں۔ ایک منہ، دوسری شرمگاہ۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوداؤد سے روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ کون سی چیز دوزخ میں داخل کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ آپؐ نے جواب دیا الفم والفرج ،یعنی منہ اور شرم گاہ (ان دونوں کو دوزخ میں داخل کرانے میں زیادہ دخل ہے) روزہ میں منہ اور شرمگاہ دونوں پر پابندی ہوتی ہے اور مذکورہ دونوں راہوں سے جو گناہ ہو سکتے ہیں روزہ ان سے باز رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے اسی لئے تو ایک حدیث میں فرمایا کہ اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ یعنی روزہ ڈھال ہے (گناہ سے اور آتشِ دوزخ سے بچاتا ہے)۔ (بخاری ص۲۵۴ ج ۱) اگر روزہ کو پورے اہتمام اور احکام و آداب کی مکمل رعایت کے ساتھ پورا کیا جائے تو بلاشبہ گناہوں سے محفوظ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ خاص روزہ کے وقت بھی اور اس کے بعد بھی اگر کسی نے روزہ کے آداب کا خیال نہ کیا روزہ کی نیت کر لی کھانے پینے اور خواہش نفسانی سے باز رہا مگر حرام کمائی اور غیبت کرنے میں لگا رہا تو اس سے فرض تو ادا ہو جائے گا مگر روزہ کی برکات وثمرات سے محرومی رہے گی۔ جیسا کہ سنن نسائی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ مَالَمْ يَخْرِقْهَا (یعنی روزہ ڈھال ہے جب تک کہ اُس کو پھاڑ نہ ڈالے) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجةٌ فی ان یدع طعامه و شرابه۔ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹی بات اور غلط کام نہ چھوڑے تو اللہ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ (گناہوں کو چھوڑے بغیر) محض کھانا پینا چھوڑ دے۔ (بخاری ص۲۵۵ ج ۱)

معلوم ہوا کہ کھانا پینا اور جنسی تعلقات چھوڑنے ہی سے روزہ کامل نہیں ہوتا بلکہ روزہ کو فواحش ومنکرات اور ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رکھنا لازم ہے روزہ منہ میں ہو اور آدمی بدکلامی کرے، یہ اسکے لئے زیب نہیں دیتا۔ اسی لئے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ امْرَءٌ صَائِمٌ (یعنی جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو گندی باتیں نہ کرے۔ شور نہ مچائے، اگر کوئی شخص گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرنے لگے تو (اس کو گالی گلوچ سے جواب نہ دے بلکہ) یوں کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں۔) (گالی گلوچ کرنا یا لڑائی کرنا میرا کام نہیں)۔ (بخاری ص۲۵۵ ج ۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کے لئے (حرام کھانے یا حرام کام کرنے یا غیبت کرنے کی وجہ سے) پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور بہت سے تہجد گزار ایسے ہیں جن کے لئے

(ریا کاری کی وجہ سے) جاگنے کے سوا کچھ نہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۷)

اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ فرما کر یہ بتایا کہ یہ چند دن کے روزے ہیں۔ان روزوں کو رکھ لینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔اس کے بعد مریض اور مسافر کے لئے آسانی بیان فرمائی کہ وہ اپنے ایامِ مرض اور ایامِ سفر میں روزہ نہ رکھیں تو رمضان گزر جانے کے بعد دوسرے دِنوں میں اتنی ہی گنتی کر کے روزے رکھ لیں۔یعنی چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کر لیں۔اس کی توضیح آئندہ آیت کے ذیل میں آئے گی۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہ جو فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کے کھانے کا) یہ ابتدائی حکم تھا۔سنن ابی داؤد ص ۷۴ ج ا پر ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو (ہر ماہ) تین دن کے روزے رکھنے کا حکم فرمایا پھر رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہو گیا۔لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہ تھی اور روزہ رکھنا اُن کے لئے بھاری کام تھا۔لہٰذا یہ اجازت تھی کہ طاقت ہوتے ہوئے بھی جو شخص روزہ نہ رکھے وہ ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ پھر آیت کریمہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی (اور طاقت ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت منسوخ ہوگئی) اور سب کو روزہ رکھنے کا حکم ہوا۔البتہ مریض اور مسافر کے لئے اجازت باقی رہی کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں روزہ رکھ لیں۔

روزوں کے احکام میں تین انقلاب...... مسندِ امام احمد میں (ص ۲۴۶ ج ۵) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ نماز کے احکام میں تین چیزوں میں انقلاب ہوا ہے اور روزوں کے احکام میں تین چیزوں میں انقلاب ہوا ہے۔اس کے بعد نماز کے تین انقلاب ذکر کرنے کے بعد روزہ کے تین انقلاب یوں ذکر کئے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر ماہ تین دن کے روزے رکھتے تھے اور عاشورا کے دن کا روزہ بھی رکھتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض فرما دیئے اور آیت کریمہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ نازل فرمائی جس میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم بھی ہے اور یہ بھی ہے کہ جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں۔اُنہیں اختیار ہے کہ چاہیں تو روزہ رکھ لیں اور چاہیں تو ایک روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، یہ کھانا کھلا دینا روزہ رکھنے کے عوض کفایت کرے گا۔

(۲) پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اس کے بعد والی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (آخر تک) نازل فرمائی اس آیت میں یہ بھی ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (کہ تم میں سے جو شخص ماہِ رمضان میں موجود ہو اس کا روزہ رکھے اس آیت سے مقیم اور تندرست پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا اور طاقت رکھنے والے کو روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کی جو اجازت تھی وہ منسوخ کر دی گئی) اور مریض اور مسافر کے لئے رُخصت باقی رہی (کہ وہ رمضان میں روزہ چھوڑ سکتے ہیں، بعد میں روزہ رکھ لیں) اور روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ایسے بوڑھے کے لئے باقی رہا جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو۔

(۳) روزے کی راتوں میں کھاتے پیتے تھے اور عورتوں کے پاس جاتے تھے جب تک کہ سونہ جائیں۔اگر کوئی شخص سو گیا (اگرچہ رات باقی ہوتی) تو ان کاموں میں سے کوئی کام کرنا جائز نہ تھا۔اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک انصاری صحابی جن کا نام صِرْمَہ تھا وہ روزہ کی حالت میں دن بھر کام کرتے رہے شام کو گھر آئے تو عشاء پڑھ کر سو گئے اور اب سونے کی وجہ سے کچھ کھا پی نہ سکے کیونکہ سو جانے والے کو اجازت نہ تھی کہ باقی رات میں کھائے پیئے ان کو اسی حال میں صبح ہوگئی اور روزہ بھی رکھ لیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھا

کہ اُن کے جسم میں تکلیف کے آثار محسوس ہورہے ہیں آپ نے فرمایا کیا بات ہے میں تمہیں سخت تکلیف میں دیکھ رہا ہوں۔ اُنہوں نے اپنا سارا واقعہ سُنایا اور ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سو جانے کے بعد آنکھ کھلنے پر کسی باندی سے یا بیوی سے جماع کرلیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا واقعہ سنایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ نازل فرمائی۔ (جس صحابی نے نیند آجانے کی وجہ سے کھائے پیئے بغیر دُوسرے دن روزہ رکھ لیا تھا ان کا واقعہ صحیح بخاری میں ص ۲۵۶ ج ۱ میں بھی ہے)

صحیح بخاری ص ۲۶۱ ج ۱ میں حضرت ابن ابی لیلی تابعی سے نقل کیا ہے کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ہم سے بیان کیا کہ رمضان کے روزے نازل ہوئے تو روزہ رکھنا ان پر شاق گزرا۔ لہٰذا جو شخص روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا وہ باوجود طاقت ہونے کے روزہ چھوڑ دیتا تھا اور ان کو اس کی اجازت دی گئی تھی، پھر اس حکم کو وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ نے منسوخ کردیا۔ اور سب کو روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت ابن عمر نے بھی فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ یہ اجازت منسوخ ہوچکی ہے۔ ان روایات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کی طاقت ہوتے ہوئے بھی روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کی اجازت منسوخ ہے۔ اب تو روزہ رکھنا ہی ہوگا اور اس میں جو تکلیف اور مشقت ہوگی وہ برداشت کرنا ہوگی۔ البتہ جو شخص بالکل ہی عاجز ہو جو روزہ رکھ ہی نہیں سکتا اُس کے لئے فدیہ کا حکم باقی ہے اور احادیث شریفہ کی تصریحات کے بعد اب اس تاویل کی ضرورت نہیں رہی کہ يُطِيْقُوْنَ سے قبل حرف نفی ''لا'' مقدر ہے۔ یا یہ کہ باب افعال کا ہمزہ سلب ماخذ کے لئے ہے۔ پھر فرمایا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (کہ جو بھی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اس کے لئے بہتر ہے)۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پورے ماہ رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ ان فرض روزوں کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے نفل روزے رکھ لے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے جیسا کہ صحیح بخاری ص ۲۵۴ ج ۱ میں ہے کہ جب ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کے لئے پانچ نمازوں کی فرضیت بتادی اس پر اس نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے آپ نے فرمایا کہ ان کے علاوہ اور کوئی نماز فرض نہیں اِلّا یہ کہ اپنی خوشی سے نفل نمازیں پڑھ لو۔ پھر آپ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت ذکر فرمائی اس نے وہی سوال کیا، کیا ان کے علاوہ مجھ پر اور روزے بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کوئی روزہ فرض نہیں الّا یہ کہ اپنی خوشی سے نفلی روزے رکھ لو۔ الفاظ کے عموم میں ہر نیک کام کی ترغیب ہے۔ ایک نماز روزہ ہی کیا جو بھی کوئی شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے گا۔ نفلی عبادات میں لگے گا۔ وہ اس کا صلہ پائے گا اور اجر و ثواب کا مستحق ہو گا۔ جو اس کی آخرت کے لئے بہتر ہوگا۔ اور دوسرا مطلب علمائے تفسیر نے یہ لکھا ہے کہ ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا دینا ہے اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے زائد دیدے تو وہ بہتر ہے۔

آیت کے اخیر میں فرمایا وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کو شروع میں تندرست اور گھر پر مقیم ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھنے اور اس کی جگہ فدیہ دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ باوجود روزہ نہ رکھنے اور فدیہ دینے کی اجازت کے یہ فرمایا کہ روزہ رکھنا بہتر ہے۔ روزے کی جو خیر و برکت ہے اور اس کا جو روحانی نفع ہے۔ روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے میں وہ نفع نہیں ہے۔ علامہ جصاص فرماتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ سے بھی ہو اور مسافروں سے بھی ہو کیونکہ اس سے پہلے یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ مسافر اور مریض رمضان میں روزے نہ رکھ کر بعد میں قضا کرسکتے ہیں ان

کے لئے بھی فرمایا کہ وہ بھی رمضان ہی میں روزہ رکھ لیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ عموماً مسافروں کو بغیر کسی ضرر کے روزہ رکھنے کی طاقت ہوتی ہے اور اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ سفر میں روزہ رکھنا نہ رکھنے سے بہتر ہے۔ علامہ جصاص نے اس سے ایک اور دقیق مسئلہ کا استنباط کیا ہے اور وہ یہ کہ جب ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا دینے کی اجازت دی گئی تھی (اور یہ ایک مسکین کا کھانا نصف صاع کے برابر ہوتا ہے) تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک نفلی روزہ نصف صاع صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ (ص ۱۸۰ ج ۱)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کے بارے میں اس کے بیانات خوب واضح ہیں اور حق و باطل کے

وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى

درمیان فرق ظاہر کرنے والے ہیں سو جو شخص تم میں سے اس ماہ میں موجود ہو وہ اس میں روزہ رکھے اور جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی کر کے

سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا

روزے رکھ لے، اللہ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے، دشواری کا ارادہ نہیں فرماتا اور تاکہ تم گنتی

الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

پوری کیا کرو اور تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اُس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔

قرآن مجید رمضان المبارک میں نازل کیا گیا

اس آیت شریفہ میں ان دنوں کی تعیین فرمادی گئی جن میں روزے رکھنا فرض ہے۔ پہلی آیت میں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا اور اس آیت میں ماہِ رمضان کا صاف نام لے کر بیان فرما دیا کہ جو شخص اس ماہ میں موجود ہو وہ روزے رکھے اور ساتھ ہی رمضان المبارک میں ایک دوسری فضیلت بھی بیان فرمادی اور وہ یہ کہ اس ماہ میں قرآن مجید نازل ہوا۔ اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا۔ اور سورۂ قدر میں فرمایا کہ لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ لیلۃ القدر رمضان المبارک میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ قرآن مجید تو تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال میں نازل ہوا۔ پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ رمضان المبارک میں نازل ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شبِ قدر میں لوح محفوظ سے پورا قرآن جملة واحدة (اکٹھا) آسمانِ دُنیا پر نازل کیا گیا اور بیت العزت میں رکھ دیا گیا۔ پھر وہاں سے حضرت جبریل علیہ السلام تھوڑا تھوڑا حسب الحکم لاتے رہے۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۹۲ ج ۲) قرآن کے بارے میں فرمایا کہ وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کے بارے میں واضح بیانات ہیں اور وہ حق اور باطل میں فرق کرنے والا ہے۔ قرآن کی یہ صفت ظاہر باہر واضح ہے دوست دشمن سب پر عیاں ہے۔

یہ جو فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اس میں ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد عورت پر رمضان کے روزوں کی فرضیت کی تصریح فرمادی۔ البتہ مسافر اور مریض اور حمل والی عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو اجازت دی گئی کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں

اس کی قضا رکھ لیں۔ اور حیض و نفاس والی عورت کو حکم ہے کہ وہ رمضان میں روزے نہ رکھیں اور بعد میں رکھ لیں۔ ان مسائل کی تفصیلات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن میں سے بعض مسائل ان شاء اللہ ابھی نقل کریں گے۔

دُنیا میں جب سے سلسلہ مواصلات کی آسانی ہوگئی ہے اور تیز رفتار طیارے گھنٹوں میں مہینوں کی مسافت پر پہنچا دیتے ہیں اس وقت سے یہ سوال سامنے آنے لگا کہ کوئی شخص کسی ملک میں تھا وہاں اس نے تیس روزے رکھ لئے پھر وہ کسی ایسے ملک میں پہنچ گیا جہاں ایک دو دن ابھی رمضان کے ختم ہونے میں باقی ہیں تو وہ ان دنوں میں کیا کرے۔ احقر کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ جہاں پہنچا ہے وہاں چونکہ رمضان موجود ہے۔ اس لئے اِن دنوں کے روزے رکھے۔ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کا عموم اسی کو متقاضی ہے اور فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ رمضان کے دن میں بے روزہ نابالغ، بالغ ہو جائے یا کوئی حیض والی عورت پاک ہو جائے تو وہ رمضان کے احترام میں شام تک نہ کھائے پیئے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی ایسے علاقہ میں پہنچ گیا جہاں ابھی رمضان باقی ہے وہ رمضان کا احترام کرے احترام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ روزہ نہ رکھے اور کھائے پیئے بھی نہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ روزہ سے رہے۔ اور یہ روزہ رکھنا آیت کے عموم کے مطابق ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو روزہ ہی رکھنا چاہیے۔ مطلق نیت صوم سے روزہ رکھ لینا چاہیے۔ مطلق نیت سے نفل روزہ ادا ہو جاتا ہے اور رمضان کا فرض روزہ بھی۔ لہٰذا اگر مطلق روزہ کی نیت کر لی اور خدائے تعالیٰ کے نزدیک اِن دِنوں کے روزے فرض ہوئے تو فرض ادا ہو جائے گا۔ ورنہ نفل کا ثواب مل جائے گا اور رمضان کا احترام بھی ہو جائے گا۔

مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت اور بعد میں قضا رکھنے کا حکم...... یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "جو شخص ماہِ رمضان میں موجود ہو اس کے روزے رکھے" مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جتنے دنوں کے روزے رمضان المبارک میں مسافر اور مریض نے نہیں رکھے وہ رمضان کے بعد دوسرے دِنوں میں اتنی ہی گنتی کر کے جتنے روزے چھوٹے ان کی قضا رکھ لے۔ علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً اتنے دنوں کی گنتی کر کے قضا کرنے کا حکم فرمایا ہے جتنے دِن کے روزے رہ گئے ہیں اور لگاتار قضا رکھنے کی کوئی قید اور شرط نہیں لگائی اس لئے روزوں کی قضا کرنے والا متفرق طور پر رکھ لے یا لگاتار رکھ لے دونوں طرح دُرست ہے۔ اور يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ (ص ۲۰۸ ج ۱)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دوسرا رمضان آنے تک پہلے رمضان کے قضا روزے نہ رکھے تو اب اس موجودہ رمضان کے روزے رکھ لے اور گزشتہ رمضان کے روزوں کی قضا بعد میں کر لے البتہ جلد سے جلد قضا رکھ لینا بہتر ہے اس میں مسارعت الی الخیر ہے اور چونکہ موت کا کچھ پتہ نہیں اس لئے ادائیگی فرض کا اہتمام بھی ہے۔

مسئلہ...... ہر مریض کو اجازت نہیں ہے کہ بعد میں قضا رکھنے کے لئے رمضان کے روزے چھوڑے بلکہ یہ رخصت و اجازت ایسے مریض کو دی ہے جس کو روزہ رکھنے سے سخت تکلیف میں مبتلا ہونے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا قوی اندیشہ ہو، یا ایسے مرض میں مبتلا ہو جس میں روزے رکھنے کی وجہ سے مرض کے طول پکڑ جانے کا غالب گمان ہو جو تجربہ سے ماہر مسلم معالج کے قول کی بنیاد پر ہو اور یہ ماہر مسلم معالج ایسا ہو جس کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو۔ قال فی الدر المختار او مریض خاف الزیادۃ لمرضه وصحیح خاف المرض بغلبة الظن بأمارة أو بتجربة أو بإخبار طبیب حاذق مسلم مستور اھ وفی الشامی أما الکافر فلا یعتمد علی قوله لاحتمال أن غرضه إفساد العبادة . (فصل فی العوارض)

اس بارے میں لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ معمولی سے مرض میں روزہ چھوڑ دیتے ہیں گو اس مرض کے لئے روزہ مضر بھی نہ ہو بلکہ بعض

امراض میں روزہ مفید ہوتا ہے پھر بھی مرض کا بہانہ بنا کر روزہ نہیں رکھتے اور بہت سے لوگ ڈاکٹروں کے کہہ دینے سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس بارے میں ہر ڈاکٹر کا قول معتبر نہیں ڈاکٹر بے دین فاسق بلکہ کافر بھی ہوتے ہیں۔ اُنہیں نہ مسئلہ کا علم ہوتا ہے۔ نہ رُوزہ کی قیمت جانتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو تو خواہ مخواہ روزہ چھڑوانے میں مزہ آتا ہے اور کافر ڈاکٹر کا قول تو اس بارے میں بالکل ہی معتبر نہیں۔

مریض کو اپنے تجربے اور اپنی ایمانی صوابدید سے اور کسی ایسے معالج سے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرنا چاہیئے جو مسلمان ہو روزے کی اہمیت سمجھتا ہو اور خوفِ خدا رکھتا ہو۔ اور مسئلہ شرعیہ سے واقف ہو۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے لوگ بیماری کی وجہ سے رمضان کے روزے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر رکھتے ہی نہیں اور بہت بڑی گنہگاری کا بوجھ لے کر قبر میں چلے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی محبت اور آخرت کی بے فکری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ یہ ان مریضوں کا بیان ہوا جو عموماً تندرست رہتے ہیں اور عارضی طور پر مریض ہو گئے۔ یہ لوگ صحت یاب ہو کر بعد میں قضا رکھ لیں۔ لیکن ایسا مرد یا عورت جو مستقل مریض ہو جسے روزہ رکھ سکنے کی زندگی بھر اُمید نہ ہو اور ایسے مرد یا عورت جو بہت بوڑھے ہوں، نہ اب روزہ رکھنے کی طاقت ہے نہ پھر کبھی روزہ رکھ سکنے کی امید ہے تو یہ لوگ روزوں کے بجائے فدیہ دیں، لیکن اگر کبھی بعد میں روزہ رکھنے کے قابل ہو گئے تو روزے رکھنا فرض ہوگا اور فدیہ جو دیا ہے نفلی صدقہ ہو جائے گا۔

جس طرح کہ ہر مریض کو روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ہر مسافر کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ رمضان المبارک کا روزہ بعد میں قضا رکھنے کی نیت سے اس مسافر کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے جو مسافت قصر کے ارادہ سے اپنے شہر یا بستی سے نکلا ہو جب تک سفر میں رہے گا مرد ہو یا عورت اُسے رمضان کا روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ جب گھر آ جائے تو روزوں کی قضا کر لے۔ ہاں اگر سفر میں کسی جگہ پندرہ دِن ٹھہرنے کی نیت کر لی تو اب شرعاً مسافر کے حکم میں نہیں رہا۔ ان دنوں میں رمضان المبارک ہو تو روزے رکھنا فرض ہوگا اور نماز میں قصر کرنا جائز نہ ہوگا۔ مسافت قصر ۴۸ میل ہے (کلومیٹر کا حساب کر لیا جائے) اتنی مسافت کے لئے خواہ پیدل سفر کرے یا بس سے یا ہوائی جہاز سے شرعی مسافر مانا جائے گا۔ وہ نمازوں میں قصر بھی کرے اور اُسے یہ بھی جائز ہے کہ رمضان شریف کے روزے نہ رکھے اور بعد میں جب گھر آ جائے تو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا رکھ لے۔

جو شخص مسافت قصر سے کم سفر کے لیے گیا ہوا سے روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔ شرعی مسافر کو (جس کی مسافت سفر اُوپر بتا دی گئی ہے) سفر میں روزہ چھوڑنے کی اجازت تو ہے۔ لیکن رمضان میں روزہ رکھ لینا بہتر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اول تو رمضان کی برکت اور نورانیت سے محرومی نہ ہوگی۔ دُوسرے سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر روزہ رکھنے میں آسانی ہوگی اور بعد میں تنہا روزہ رکھنا مشکل ہوگا۔

مسئلہ......مسافر اور مریض (جنہیں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے) وہ اگر اپنے زمانۂ عذر ہی میں مر گئے تو چونکہ اُنہوں نے قضا رکھنے کا وقت ہی نہیں پایا۔ اس لئے ان پر اپنے چھوٹے ہوئے روزوں کی طرف سے فدیہ دینے کی وصیت کرنا واجب نہیں اور اگر مریض نے اچھا ہو کر مسافر نے گھر آ کر روزے نہیں رکھے یا کچھ رکھے اور کچھ نہ رکھے۔ تو جتنے دن مرض اور سفر کے بعد پائے ہیں ان کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے۔ وصیت کے بعد اُس کا ولی قرضوں کی ادائیگی کے بعد اس کے تہائی مال سے ہر روزہ کے عوض بقدرِ صدقہ فطر کے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وصیت نہ کی اور اُس کے وَلی نے اپنی خوشی سے اپنے ذاتی مال میں سے اس کی طرف سے فدیہ دے دیا تو ان شاء اللہ یہ بھی مفید ہوگا۔

مثلاً اگر دس دن کے روزے چھوڑے تھے اور اسی قدر ایامِ صحت اور ایامِ اقامت پا لئے اور قضا روزے نہ رکھے اور موت آنے لگی تو پورے دس دِن کے روزوں کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرے اور اگر ایامِ صحت اور ایامِ اقامت میں صرف پانچ دن ملے تھے

اوران میں قضاروزے نہ رکھے تو صرف پانچ دن کے روزوں کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرے۔ (من الدر المختار)

حاملہ اور مرضعہ کے لئے رخصت...... سنن نسائی (ص ۳۱۸) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے اوراس کی نماز کا ایک حصہ معاف فرمادیا ہے (کہ چار رکعات والی فرض نماز کی دو رکعتیں مسافر کے ذمہ رہ جاتی ہیں) اور دودھ پلانے والی عورت اور حمل والی عورت کوبھی رمضان میں روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں ان روزوں کی قضا رکھ لیں۔ جس حاملہ کو روزہ رکھنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہو یا زیادہ تکلیف میں پڑ جانے یا اپنی جان یا بچے کی جان کا اندیشہ ہو تو وہ عورت رمضان کے روزے چھوڑ کر بعد میں رکھ لے اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی اس وقت رمضان المبارک کا روزہ چھوڑنا جائز ہے جبکہ روزہ رکھنے سے بچے کو دودھ سے محرومی ہوتی ہو اور بچہ دودھ پلانے والی کے دودھ کے علاوہ دوسری غذا کے ذریعہ گزارہ نہ کرسکتا ہو اُوپر کا دُودھ پلانے سے (جیسا کہ آج کل رواج ہے) یا دلیہ یا چاول وغیرہ کھانے سے بچہ کی غذا کا کام چل سکتا ہو تو پھر دُودھ پلانے والی کو رمضان المبارک کے روزے چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جب بچہ کی عمر دوسال ہوجائے تو اس کو عورت کا دودھ پلانا ہی منع ہے۔ جب بچہ کی عمر دوسال ہوجائے اس کے دودھ پلانے کے لئے روزہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حیض اورنفاس والی عورت کا حکم...... جس عورت کو رمضان المبارک میں ماہواری کے دن آجائیں یا ولادت کے بعد کا خون آرہا ہو جسے نفاس کہتے ہیں یہ دونوں عورتیں رمضان المبارک کے روزے نہ رکھیں اگرچہ روزہ رکھنے کی طاقت ہو لیکن بعد میں ان روزوں کی قضا رکھ لیں اور حیض نفاس کے زمانہ کی نمازیں بالکل معاف ہیں۔ ان دونوں پر ان کی قضا نہیں۔

اللہ نے دین میں آسانی رکھی ہے...... اللہ تعالیٰ شانہٗ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا جو بندوں کی طاقت سے باہر ہو قرآن میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے آیت بالا میں مریض اور مسافر کا حکم بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ مشقت کا ارادہ نہیں فرماتا۔ نمازوں کے بارے میں بھی مریض کے لئے آسانی ہے کہ کھڑے ہو کر لیٹ کر بیٹھ کر رکوع اور سجدہ یا اشارہ کے ساتھ اپنی طاقت کے مطابق جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لے زکوٰۃ میں بھی مطلق مال ہونے پر زکوٰۃ فرض نہیں کی گئی، بلکہ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی اس وقت فرض ہے جب نصاب پر چاند کے حساب سے ایک سال گزر جائے اور پھر زکوٰۃ میں جو کچھ واجب ہوتا ہے وہ بہت قلیل ہے یعنی کُل مال کا چالیسواں حصہ دینا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح حج ہر شخص پر فرض نہیں جو شخص مکہ معظمہ تک سواری پر آنے جانے کی طاقت رکھتا ہو اور ساتھ ہی سفر خرچ بھی ہو اور بال بچوں کا ضروری خرچہ پیچھے چھوڑ جانے کے لئے موجود ہو تب حج فرض ہوتا ہے اور وہ بھی زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے۔ روزہ رمضان فرض ہونے کے باوجود مریض اور مسافر اور شیخ فانی حاملہ اور دُودھ پلانے والی کے لئے جو آسانیاں ہیں وہ اُوپر ابھی بیان ہوچکیں دیگر احکام میں جو آسانیاں ہیں وہ بھی عام طور سے معلوم اور مشہور ہیں۔

قوله تعالىٰ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (الآية) اس کے بارے میں رُوح المعانی (ص ۶۲ ج ۲) فرماتے ہیں ای وشرع لکم جملة ما ذكر من امر الشاهد بصوم الشهر المستفاد من قوله تعالىٰ فمن شهد منكم الشهر فليصمه وامر المرخص له بالقضاء كيف ما كان متواترا أو متفرقا وبمراعاة عدة ما افطر من غير نقصان ومن الترخيص المستفاد من قوله عزّوجل (يريد الله بكم اليسر او من قوله تعالىٰ فعدة من ايام أُخر) لتكملوا الخ ـ

مطلب یہ کہ ولتکملوا میں واؤ عاطفہ ہے جو فعل محذوف پر عطف ہے مطلب یہ کہ تمہارے لئے جو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم مشروع فرمایا کہ جو شخص ماہِ رمضان میں موجود ہو وہ روزے رکھے اور مریض اور مسافر کو رمضان میں روزے چھوڑ کر بعد میں چھوٹے ہوئے روزوں کی گنتی کے موافق قضا روزے متواتر یا متفرق طریقے پر رکھنے کی جو اجازت دی یہ اس لئے ہے کہ تم ٹھیک اچھی طرح گنتی کا دھیان رکھ کر تکمیل کر و تا کہ اداء وقضاء کوئی روزہ رہ نہ جائے اور تا کہ تم اس پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور یہ جو فرمایا: وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی یعنی اس کی حمد وثنا بیان کرنے کا حکم ہے۔ حضرت زید بن اسلمؒ نے فرمایا کہ اس سے یوم عید کی تکبیریں مراد ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے چاند دیکھنے کے وقت اللّٰہ اکبر کہنا مراد ہے۔

اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں تسہیل اور تیسیر کی علت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حالتِ سفر اور مرض میں روزہ چھوڑ کر بعد میں قضا رکھنے کی جو آسانی دی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ آسانی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس نعمت کی قدر دانی کرو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں سو بلاشبہ میں قریب ہوں، دُعا کرنے والے کی دُعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دُعا کرے، سو وہ میرے احکام کو

وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ وہ نیک راہ پر رہیں۔

دُعا کی فضیلت اور آداب

تفسیر درمنثور ص ۱۹۴ ج ۱ میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمارا رب قریب ہے جس سے ہم آہستہ طریقے پر مناجات کریں یا دُور ہے جسے ہم زور سے پکاریں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ آخر تک نازل فرمائی اور حضرت عطاء ابن ابی رباح نے بیان فرمایا کہ آیت وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کس وقت دعا کریں تو اچھا تھا اس پر آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ اخیر تک نازل ہوئی۔

گزشتہ آیات میں روزے کے احکام بیان ہوئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ آخرت کمانے کا سیزن ہے اس میں کمائی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۲۵۵ ج ۱) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رات ایک منادی ندا دیتا ہے کہ اے خیر کی تلاش کرنے والے آگے بڑھ اور اے شر کے تلاش کرنے والے رُک جا۔ (سنن الترمذی ص ۱۴۲ ج ۱) اور اہلِ ایمان کی طبیعتیں نیکیوں کی طرف بہت زیادہ راغب ہو جاتی ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ نمازوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ فرضوں کے علاوہ مزید نمازیں پڑھتے ہیں ذکر و تلاوت میں لگتے ہیں۔ دُعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ شبِ قدر کو زندہ رکھتے ہیں۔ رمضان میں دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ (سنن ترمذی ابواب الدعوات) لہٰذا یہ مناسب ہوا کہ احکام رمضان کے درمیان دُعا کی قبولیت کا ذکر کر دیا جائے۔ آیتِ بالا میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے وہ سب کی دُعا سنتا ہے اور قبول بھی فرماتا ہے۔ آہستہ سے دُعا کرو یا زور سے وہ ہر دُعا سنتا ہے۔ جو دُعا زبان سے نہ ہو صرف دل سے ہو وہ اس کو بھی جانتا ہے اور قبول فرماتا

ہے۔ اسی لئے اَسْمَعُ نہیں فرمایا بلکہ اُجِیْبُ فرمایا تاکہ قلبی دُعا کو بھی شامل ہو جائے۔ سورۂ ق میں فرمایا وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے نفس میں جو خیالات آتے ہیں ہم اُن کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ)

صحیح بخاری ص ۹۴۴ ج ۲ میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے جب ہم کسی اونچائی پر چڑھتے تو بلند آواز سے اللّٰہ اکبر کہتے تھے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو کیونکہ تم کسی ایسے کو نہیں پکار رہے ہو جو بہرہ ہے اور غائب ہے تم تو سمیع اور بصیر کو پکار رہے ہو۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تمہارا رب شرمیلا ہے کریم ہے وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ جب اس کی طرف ہاتھ اُٹھائے تو وہ ان ہاتھوں کو بغیر کسی خیر کے واپس فرمادے۔ (اخرجہ الترمذی فی ابواب الدعوات وحسنہ واخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال علی شرط الشیخین واقرہ الذہبی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری دُعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ دعا کرنے والا جلدی نہ کرے وہ کہتا ہے کہ میں نے دُعا کی وہ قبول نہ ہوئی۔ (صحیح بخاری ص ۹۳۸ ج ۲)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی رہتی ہے جب تک کہ گناہ کی اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے بشرطیکہ جلدی نہ مچائے عرض کیا کہ جلدی مچانے کا کیا مطلب ہے فرمایا جلدی مچانا یہ ہے کہ یوں کہنے لگے میں نے دُعا کی اور لیکن مجھے قبول ہوتی نظر نہیں آتی یہ سمجھ کر تھک کر بیٹھ جائے اور دُعا کو چھوڑ دے۔ (صحیح مسلم ص ۳۵۲ ج ۲) دُعا برابر کرتے رہیں۔ رغبت کے ساتھ دِل کو حاضر کر کے دُعا کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا......لیس شیء اکرم علی اللہ من الدعاء کہ اللہ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی چیز فضیلت والی نہیں ہے اور ایک حدیث میں ہے الدعاء مخ العبادۃ کہ دُعا عبادت کا مغز ہے اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کو یہ خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں اور بے چینیوں کے وقت اسکی دعا قبول کرے سو چاہیئے کہ وہ اچھے حالات میں کثرت سے دُعا کرے۔

دُعا قبول ہونے کا کیا مطلب ہے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی شخص کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سوال کے مطابق اسے عطا فرما دیتا ہے یا اس جیسی آنے والی کسی مصیبت کو روک دیتا ہے جب تک کہ گناہ گاری اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے۔ (أخرج الاحادیث الاربعة الترمذی فی ابواب الدعوات)

اور مسند احمد میں ایک بات کا اضافہ ہے اور وہ یہ کہ یا اس کی دعا کو اللہ تعالیٰ آخرت کیلئے ذخیرہ بنا کر رکھ دے گا (جو اُسے آخرت میں کام دے گی)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹۶)

لوگ کہتے ہیں دُعا قبول نہیں ہوتی حقیقت میں مانگنے والے ہی نہیں رہے۔ اوّل تو حضورِ قلب سے دُعا نہیں کرتے۔ دُوسرے حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص لمبے سفر میں ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں جسم پر گرد و غبار اَٹا ہوا ہے۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے یا ربّ یا ربّ کہہ کر دُعا کرتا ہو اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے پینا حرام ہے اور اس کو حرام سے غذا دی گئی۔ پس ان حالات میں اس کی دُعا کیوں کر قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۳۲۶ ج ۱)

نیز سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دُعا ان مصیبتوں کے دُور ہونے کے لئے بھی نافع ہے جو نازل

ہوچکیں اور اُن مصیبتوں کو روکنے کے لئے بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ سوائے اللہ کے بندو! تم دُعا کو لازم پکڑ لو۔ (ابواب الدعوات)

سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سے تم اس طرح دُعا کرو کہ قبولیت کا یقین ہو اور یہ جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غافل اور لاپرواہ دل کی دُعا قبول نہیں فرماتا۔ آیت کریمہ کے اخیر میں فرمایا:

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ کہ میرے تمام احکام کو قبول کریں اور میری ذات وصفات پر ایمان لائیں مجھ پر یقین اور بھروسہ رکھیں۔ ایسا کریں گے تو ہدایت پر ثابت قدم رہیں گے اور مزید ہدایت پائیں گے۔ قال صاحب الروح أی فلیطلبوا إجابتی لهم اذا دعوتهم للإیمان والطاعة كما أني اجيبهم إذا دعوني لحوائجهم۔ (ص۶۴ ج۲)

وقال القرطبی ص۲۱۴ ج۲ قال الهروی الرُشد والرشَد والرشاد الهُدی والاستقامة و منه قوله تعالیٰ لعلهم یرشدون۔ وقال البیضاوی ص۱۳۰ ج۱ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ إذا دعوتهم للايمان والطاعة كما اجيبهم اذا دعوني لمهماتهم وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ امر بالثبات والمداومة عليه لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ راجين اصابة الرشد وهو اصابة الحق. (صاحب روح المعانی کہتے ہیں۔ یعنی انہیں چاہیے کہ جب میں انہیں ایمان وطاعت کی طرف بلاؤں تو وہ میری آواز پر لبیک کہیں جیسا کہ جب وہ اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں مجھ سے دعا کرتے ہیں تو میں ان کی دعائیں قبول کرتا ہوں۔ ہرویؒ کہتے ہیں: رُشد، رَشد اور رشاد تینوں کا معنی ہدایت واستقامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول لعلهم یرشدون اسی سے ہے۔ بیضاویؒ کہتے ہیں بندوں کو چاہیے کہ جب میں انہیں ایمان وطاعت کا حکم دوں تو وہ میرے حکم کو قبول کریں جیسا کہ جب وہ اپنی مہمات یعنی اہم امور میں مجھ سے دعا کرتے ہیں تو میں ان کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ ولیؤمنوا بی میں ایمان پر ثابت قدمی اور ہمیشگی کا حکم ہے۔ لعلهم یرشدون یعنی راہ ہدایت جو کہ راہ حق ہے کو پہنچنے کی امید رکھیں)۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ

حلال کیا گیا تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں بیویوں میں مشغول ہونا، وہ لباس ہیں تمہارے لئے اور تم ان کا لباس ہو،

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ

اللہ نے جان لیا کہ بلاشبہ تم اپنے نفسوں کی خیانت کرتے تھے سو اُس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم کو معاف فرما دیا، سو اب اُن سے میل ملاپ کرو،

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

اور تلاش کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے سفید تاگہ سیاہ تاگہ سے

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ

ممتاز ہوکر ظاہر ہوجائے، یعنی فجر کا تاگہ، پھر تم روزے پورے کرو رات تک اور بیویوں سے میل ملاپ نہ کرو اس حال میں کہ تم اعتکاف کئے ہوئے ہو مسجدوں میں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ بھٹکو اسی طرح اللہ بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اپنی آیات تاکہ لوگ پرہیزگار بنیں۔

تکملہ احکامِ صیام

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ روزوں کی فرضیت کے ابتدائی زمانہ میں (قانون کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس پر عمل کرتے تھے کہ جب کسی شخص کا روزہ ہوتا اور افطار کا وقت آجاتا اور وہ افطار سے پہلے سو جاتا تو اب پوری رات اور اگلے پورے دن نہیں کھا سکتا تھا جب تک کہ شام نہ ہو جائے۔ اور یہ واقعہ پیش آیا کہ قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ عنہ کا روزہ تھا افطار کا وقت ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اُن سے کہا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے کہا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے لیکن میں کہیں سے جا کر تمہارے لئے انتظام کر کے لاتی ہوں۔ انہوں نے دن بھر کام کیا تھا ابھی اُن کی بیوی واپس نہ آئی تھی کہ ان کی آنکھ لگ گئی پس جب وہ آئیں اور ان کو دیکھا کہ سو چکے ہیں تو کہنے لگیں ہائے تیری محرومی (کھانے کا وقت ختم ہوا اور کل کو روزہ بھی رکھنا ہے) انہوں نے اسی طرح (بغیر کھائے پیئے) روزہ رکھ لیا جب آدھا دِن ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ سے اِس کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ نازل فرمائی جس سے مسلمان بہت خوش ہوئے اور آیت وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری ص ۲۵۶ ج ۱) قال فی فتح الباری بعد ذکر الاختلاف فی اسم الصحابی الذی وقع له ذٰلک أنه ابوقیس صرمة بن أبی أنس قیس بن مالک فمن قال قیس بن صرمة قلبه۔ (یعنی جس صحابی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ان کے نام میں اختلاف ذکر کرنے کے بعد صاحب فتح الباری کہتے ہیں کہ وہ صحابی ابوقیس صرمہ بن انس قیس بن مالک ہیں اور جس نے قیس بن صرمہ کہا ہے اس نے اسکی تقلیب کر دی ہے۔)

سو جانے کے بعد رمضان المبارک میں جیسے کھانا پینا ممنوع ہو جاتا تھا اسی طرح بیویوں سے ہمبستر ہونا بھی ممنوع ہو جاتا تھا۔ صحابہ کو اس میں بہت دُشواری پیش آئی۔

صحیح بخاری ص ۶۴۷ ج ۲ میں ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم ہوا تو (افطار کے بعد نیند آ جانے کی صورت میں) عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور پورے رمضان کا یہی قانون تھا اور بہت سے لوگ اپنے نفسوں کی خیانت کرتے تھے (اور قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھتے تھے) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ نازل فرمائی۔ سنن ابی داؤد (باب کیف الاذان) میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی سے جماع کرنے کا ارادہ کیا انہوں نے کہا میں تو سو گئی تھی (اب یہ کام جائز نہیں رہا) اُنہوں نے سمجھا کہ یہ بہانہ کر رہی ہے لہٰذا جماع کر بیٹھے۔ تفسیر درمنثور ص ۱۹۷ ج ۱ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے اور باتیں کرتے رہے گھر آئے تو دیکھا کہ بیوی سو چکی ہے اُسے جگایا اور مخصوص کام کا ارادہ کیا وہ کہنے لگی کہ میں تو سو گئی تھی۔ اُنہوں نے کہا تم سوئی نہیں ہو (غلط کہہ رہی ہو) پھر اس سے جماع کر لیا اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا صبح کو حضرت عمرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ نازل فرمائی۔ نفس کے اُبھار کی وجہ سے جو نفسوں کا تقاضا پورا کر لیا اس میں بظاہر نفس کی موافقت ہے لیکن قانون شرعی کی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ نفسوں کی خیانت ہے کیونکہ احکام کی خلاف ورزی مواخذہ کی چیز ہے اور تختانون کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ غلبۂ شہوت کی وجہ سے تمہارے نفسوں کا تقاضا بیویوں کے پاس جانے کا ہوتا تھا لیکن تم اجازت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے تقاضے کو پورا نہ کرتے تھے اس میں نفسوں کی خواہش کی خیانت تھی اگرچہ ایمانی تقاضوں کی موافقت تھی۔ اب مُباشرت کی اجازت دے دی گئی تو نفسوں کی خیانت بھی ختم ہوئی۔ آیت شریفہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ آخر تک نازل

ہونے سے پوری رات کھانا پینا اور بیویوں سے مباشرت کرنا جائز ہوگیا۔ جو کچھ کسی سے خلاف ورزی ہوئی تھی وہ اس پر نادم ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اُن کو معاف فرمادیا۔

زن وشوہر کے تعلقات کا لطیف انداز میں بیان...... رمضان المبارک کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کی اجازت دیتے ہوئے میاں بیوی کے تعلق کو ایک لطیف انداز میں بیان فرمایا اور وہ یہ کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں یعنی وہ تمہارے لئے سکون اور دل جمعی کا باعث ہیں اور تم اُن کے لئے سکون اور دل جمعی کا باعث ہو۔

کما فی سورۃ الاعراف لِیَسْکُنَ اِلَیْھَاو فی سورۃ الروم لِتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا۔

عورت اور مرد چونکہ معانقہ کرتے ہیں اور ہر ایک دوسرے سے لپٹ جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو ایک دوسرے کے لئے لباس سے تعبیر فرمایا اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پردہ بن جاتے ہیں اور فسق و فجور سے روکتے ہیں۔ اس لئے بھی ہر ایک کو دوسرے کا لباس بتایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی بندہ نے نکاح کرلیا تو اس نے آدھا دین کامل کرلیا۔ لہٰذا وہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔ (مشکوٰۃ عن البیہقی فی شعب الایمان)

صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ پہلے جملہ یعنی **هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ** سے یہ واضح ہورہا ہے کہ تم عورتوں سے صبر نہیں کرسکتے اور دوسرا جملہ **وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ** یہ بتارہا ہے کہ تمہارے لئے ان سے پرہیز کرنا مشکل ہے اور چونکہ مرد کا احتیاج خوب واضح ہے اس لئے پہلے جملہ کو مقدم کیا گیا۔ (من رُوح المعانی ص ۱۶۵ ج ۲)۔

ابتغائے اولاد کا حکم...... یہ جو فرمایا **وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ** (یعنی طلب کرو تم جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے اولاد طلب کرنا مقصود ہے یعنی جماع کرنے میں نیت رکھو کہ اللہ تعالیٰ اولاد نصیب فرمائے گا۔ صاحب روح المعانی ص ۶۵ ج ۲ لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ نکاح کرنے میں نسل بڑھنے کی نیت رکھنی چاہیئے۔ صرف قضائے شہوت مقصود نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شہوتِ جماع کو بنی نوع انسان کی بقاء کے لئے انسانوں میں رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ کھانے کی خواہش انسانوں کے زندہ رہنے کے لئے پیدا فرمادی ہے صرف قضائے شہوت جانوروں کا مقصود ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا کہ جب جماع کو اولاد طلب کرنے کا ذریعہ بنادیا گیا تو اس سے عورتوں سے غیر فطری طریقے سے قضاء شہوت کرنے کی ممانعت ثابت ہوگئی کیونکہ وہ جگہ طلبِ ولد کی نہیں ہے۔

صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت...... پھر فرمایا **وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ** (اور کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ تمہارے لئے سفید تاگہ سیاہ تاگہ سے ممتاز ہو کر ظاہر ہوجائے یعنی فجر کا تاگہ) اس میں اجازت دی گئی ہے کہ روزوں کی راتوں میں صبح صادق ہونے تک کھاپی سکتے ہو سفید تاگے سے بیاض النہار (یعنی دن کی سفیدی جو صبح صادق سے شروع ہوتی ہے) مراد ہے۔ اور سیاہ تاگہ سے سواد اللیل (یعنی رات کی تاریکی) مُراد ہے۔ یہ تفسیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ (کمافی صحیح البخاری ص ۳۵۷ ج ۱)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت **وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ** نازل ہوئی اور ابھی لفظ **مِنَ الْفَجْرِ** نازل نہ ہوا تھا تو بعض لوگوں نے اپنے پاؤں میں سفید اور کالا تاگہ باندھ لیا اور برابر کھاتے پیتے رہے یہاں تک کہ ان دونوں میں فرق ظاہر ہوجائے (وہ زمانہ بتی اور بجلی کا تو تھا نہیں چھوٹے چھوٹے گھروں میں اندر بیٹھ کر کھاتے

رہے صبح صادق ہو جانے اور باہر روشنی پھیل جانے پر بھی دونوں تاگوں میں امتیاز نہ ہوا۔ ان حضرات نے خَیْطِ اَبْیَضْ اور خَیْطِ اَسْوَدْ کا معروف معنی سمجھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے لفظ مِنَ الْفَجْرِ نازل فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ خیطِ ابیض اور خیطِ اسود سے دِن اور رات مراد ہے۔ (صحیح بخاری ص ۲۸۷ ج ۱)

معلوم ہوا کہ سحری کھانے کا آخری وقت صبح صادق تک ہے اور چونکہ پوری رات میں جماع کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اس لئے جماع بھی صبح صادق ہونے تک جائز ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنابت روزہ کے منافی نہیں کیونکہ جب رات کے آخر حصے تک جماع کرنے کی اجازت ہے تو جماع کرنے والا لامحالہ فجر طلوع ہونے کے بعد ہی غسل کرے گا اور غسل کرنے میں جو وقت خرچ ہوگا اس وقت میں روزہ بھی ہوگا۔ جو صبح صادق سے شروع ہو چکا ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ جنابت میں فجر ہو جاتی تھی، پھر آپؐ روزہ رکھ لیتے تھے اور یہ جنابت احتلام کی نہیں بلکہ جماع کرنے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ (صحیح بخاری ص ۲۵۸ ج ۱) چونکہ جنابت روزہ کے منافی نہیں اس لئے اگر روزہ میں احتلام ہو جائے تو اس سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

روزہ کا ابتدائی وقت حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمْ میں بتا دیا پھر روزے کی انتہاء بتانے کے لئے فرمایا ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (پھر روزوں کو رات تک پورا کرو) رات غروب شمس ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے جیسے ہی سورج غروب ہو جائے روزہ افطار کرنے کا وقت ہو جاتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مشرق کی طرف سے رات آ گئی اور دِن مغرب کی طرف چلا گیا اور سورج چھپ گیا تو روزہ دار کے افطار کا وقت ہو گیا۔ (صحیح بخاری ص ۲۶۲ ج ۱)

مسئلہ...... غروب ہوتے ہی فوراً افطار کر لینا مستحب ہے جیسا کہ سحری کھانا آخر رات میں مُستحب ہے۔ (کمافی صحیح مسلم ص ۳۵۱ ج ۱)

البتہ سحری میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ صبح صادق ہونے کا اندیشہ ہو جائے۔

اعتکاف کے فضائل اور مسائل...... پھر فرمایا: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ (اور بیویوں سے میل ملاپ نہ کرو اس حال میں کہ تم اعتکاف کیے ہوئے ہو مسجدوں میں) اعتکاف مسنون ہے جو صرف مسجدوں ہی میں ہوتا ہے اور اس کے لئے نیت کرنا بھی ضروری ہے۔ اعتکاف کی نیت کے بغیر مسجد میں جتنا بھی وقت گزارے اعتکاف میں شمار نہ ہوگا۔ اعتکاف کے دِنوں میں ایک تو شب قدر میں بیدار رہنے اور نمازوں میں قیام کرنے کی آزادی ہو جاتی ہے۔ دوسرے مخلوق سے تعلق کم سے کم ہو جاتا ہے۔ اور خالق تعالیٰ شانہٗ ہی کی طرف پوری توجہ رہتی ہے۔ دل و جان سے جسم اور زبان سے عبادت اور تلاوت میں مشغولیت رہتی ہے۔ یہ دَر پر جا پڑنے والی بات ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن کا اعتکاف فرماتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (صحیح بخاری ص ۲۷۴ ج ۱) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے پھر ایک سال کا اعتکاف نہیں کیا تو آئندہ سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (سنن ابوداؤد ص ۳۳۴ ج ۱) اور ایک سال آپؐ نے ماہِ شوال میں بھی بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (ایضاً)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ گناہوں سے روکتا ہے اور اس کے لئے اس شخص کا ثواب لکھا جاتا ہے جو تمام نیکیاں کرنے والا ہو (سنن ابن ماجہ ص ۱۲۷) رات ہو یا دن اعتکاف میں جماع کرنا یا شہوت کے ساتھ بیوی کو چھونا جائز نہیں۔ اگر جماع کر لیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا اگر شہوت کے بغیر ہاتھ لگایا تو اس کی

گنجائش ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت اعتکاف میں (مسجد میں بیٹھے ہوئے) اپنا سر مبارک میری طرف نکال دیتے تھے اور میں آپ کا سر دھو دیتی تھی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے سر میں کنگھی کر دیتی تھی۔ (صحیح بخاری ص ۲۷۲ ج ۱) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی بیان فرمایا کہ آپ اعتکاف کی حالت میں صرف انسانی حاجت کے لئے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ (صحیح بخاری ص ۲۷۲ ج ۱)

حاجتِ انسانی سے پیشاب پاخانہ مراد ہے۔ کھانا پینا چونکہ مسجد ہی میں ہوتا ہے اس لئے معتکف کو اس کے لئے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب کوئی شخص اعتکاف کرے گا اور راتوں میں بیدار رہے گا۔ تو جس رات میں بھی شب قدر ہوگی وہ اُسے پالے گا اور اس کی خیر و برکت سے محرومی نہ ہوگی۔ قرآن شریف میں فرمایا کہ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ (کہ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے) لہٰذا شب قدر کی تلاش میں رہنا چاہیئے اور خاص کر آخر عشرہ کی طاق راتوں میں اسے تلاش کریں ہزار مہینے میں ۸۳ سال چند ماہ ہوتے ہیں چند گھنٹے عبادت میں گزار کر اتنا بڑا ثواب لے لینا عظیم نفع ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وَلَا یحرم خیرھا الا کل محروم (یعنی شب قدر کی) خیر سے وہی محروم ہوگا جو پورا محروم ہے (جسے ذرا بھی عبادت کا ذوق نہیں)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۳ ج ۱) ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے شب قدر کی رات میں نماز میں قیام کیا (یعنی نفل نمازیں پڑھتا رہا) اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (صحیح بخاری ص ۲۷۰ ج ۱)

نفل روزوں کا بیان...... گزشتہ آیت میں جو فرمایا: فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ اس میں نوافل کی ترغیب دی ہے بیان تو روزوں کے ذیل میں آیا ہے۔ لیکن الفاظ کے عموم میں ہر نفلی عبادت آ گئی۔ یہاں نفل روزوں کے کچھ فضائل لکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ ہر نیکی کم از کم دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے۔

شش عید کے روزے...... حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھے روزے شوال کے مہینے میں رکھ لئے تو (پورے، سال کے روزے رکھنے کا ثواب ہوگا اگر ہمیشہ ہی ایسا کرے گا تو) گویا اس نے ساری عمر روزے رکھے۔ (رواہ مسلم ص ۳۶۹ ج ۱)

جب کسی نے رمضان کے تیس روزے رکھے اور پھر چھ روزے اور رکھ لئے تو یہ چھتیس روزے رکھنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین سو ساٹھ روزے شمار ہوں گے، اس طرح سے پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا۔ اگر کوئی شخص ہر سال ایسا ہی کر لیا کرے تو وہ ثواب کے اعتبار سے ساری عمر روزہ رکھنے والا شمار ہوگا۔ اگر رمضان کے روزے چاند کی وجہ سے ۲۹ ہی رہ جائیں تب بھی شوال کے چھ روزہ رکھنے سے ان شاء اللہ مذکورہ بالا ثواب ملے گا کیونکہ ہر مسلمان کی نیت یہی ہوتی ہے کہ چاند نظر نہ آیا تو تیسواں روزہ بھی ضرور رکھے گا۔

پیر اور جمعرات کا روزہ...... پیر اور جمعرات کو بھی روزہ رکھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال پیش ہوتے ہیں لہٰذا میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزہ دار ہوں۔ (رواہ الترمذی ص ۱۳۱ ج ۱)

ایام بیض کے روزے...... ایامِ بیض کے روزے رکھنے کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو ایام بیض کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو مہینے سے تین روزے رکھے تو تیرہ،

چودہ، پندرہ تاریخ کے روزے رکھ لے (رواہ الترمذی ص۱۳۳ ج۱) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامِ بیض کے روزے رکھنے کا حکم فرماتے تھے۔ (رواہ النسائی ص۳۲۹ ج۱)

عاشوراء کا روزہ...... صحیح بخاری (ص ۲۶۸ ج۱) میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا کہ جاہلیت کے زمانہ میں قریش عاشوراء (محرم کی دس تاریخ) کا روزہ رکھتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس دن کا روزہ رکھا اور صحابہؓ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا پھر جب رمضان کے روزے فرض ہوگئے تو عاشوراء کا روزہ (بحیثیت تاکیدی حکم کے) باقی نہ رہا پھر جو چاہتا اس دِن کا روزہ رکھتا تھا اور جو چاہتا چھوڑ دیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوم عاشوراء کا روزہ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے مشروع تھا اور اس کا روزہ رکھنا مؤکد تھا۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد تاً کد ختم ہوگیا اور استحباب کا درجہ رہ گیا۔ صحیح مسلم ص ۳۶۷ ج۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے پوری پوری اُمید رکھتا ہوں کہ یوم عرفہ (بقرعید کی نویں تاریخ) کا روزہ رکھنے پر ایک سال قبل اور ایک سال بعد کے گناہ معاف فرما دے گا۔ اور یوم عاشوراء کے روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے پوری پوری اُمید رکھتا ہوں کہ ایک سال پہلے کے گناہوں کا کفارہ فرما دے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ رمضان کے بعد سب سے زیادہ افضل محرم (یعنی اُس کی دس تاریخ) کا روزہ ہے جو شہر اللہ ہے اور سب نمازوں میں فرض نمازوں کے بعد رات کی نماز (یعنی نمازِ تہجد) افضل ہے۔ (صحیح مسلم ص۳۶۶ ج۱)

قال الطيبي أراد بصيام شهر الله صيام يوم عاشوراء اھ ويكون من باب ذكر الكل وارادة البعض ويمكن أن يقال أفضليته لما فيه من يوم عاشوراء ولكن الظاهر أن المراد جميع شهر المحرم (كذا في المرقاة)

محرم کو شھر اللہ یعنی اللہ کا مہینہ فرمایا۔ یہ اضافت تشریفی ہے کیونکہ سب مہینے اللہ ہی کے ہیں۔ محرم الحرام کی فضیلت بتانے کے لئے شھر اللہ فرمایا حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہودیوں کی مخالفت کرو۔ (سنن الترمذی ص۱۲۲ ج۱)

اور شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ دسویں تاریخ کا روزہ رکھنا مستحب ہے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ ایک دِن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔ صرف یومِ عاشوراء کا روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں یہود کی مشابہت ہے۔ (ذکرہ فی المرقاۃ)

عشرہ ذی الحجہ کے روزے...... بقرعید کی نویں تاریخ کے روزہ کی فضیلت اُوپر معلوم ہوئی، اُس سے پہلے جو آٹھ دن ہیں اُن میں بھی روزہ رکھنا چاہیئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ذوالحجہ کے اول کے دس دِنوں میں عملِ صالح سب دنوں کے اعمال سے افضل ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی؟ فرمایا (ہاں) جہاد فی سبیل اللہ بھی ان دِنوں کے اعمالِ صالحہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص اللہ کی راہ میں نکلا (اور اس نے جان اور مال کی بازی لگا دی) پھر کچھ بھی واپس لے کر نہ ہوا۔ (صحیح بخاری ص۱۳۲ ج۱)

ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء کا روزہ اور ذوالحجہ کے عشرہ اولیٰ کے روزے (باستثناء یوم الاضحیٰ) اور مہینے کے تین روزے نہیں چھوڑتے تھے۔ (سنن نسائی ص۲۲۸ ج۱)

فائدہ...... ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو حج ہوتا ہے۔ اس دِن حج کرنے والے عرفات میں ہوتے ہیں۔ ظہر کی نماز کے بعد سے غروب

آفتاب تک دعاؤں میں مشغولیت ہوتی ہے اس لئے حجاج کے لئے افضل ہے کہ اس تاریخ کا روزہ نہ رکھیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حج کے موقع پر اس دن روزہ نہیں رکھا تھا۔ (کمافی صحیح البخاری ص ۲۶۷ ج ۱، صحیح مسلم ص ۳۹۷ ج ۱)

فائدہ...... نفلی عبادت روزہ ہو یا نماز، ذکر ہو یا تلاوت، حج ہو یا عمرہ۔ جس قدر بھی کوئی شخص ادا کرے گا اُس کا ثواب پائے گا۔ لیکن ہر عمل میں شریعت کے اصول وقوانین کا خیال رکھنا لازم ہے۔ ایک نفلی روزہ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے فی سبیل اللہ ایک روزہ رکھ لیا اللہ تعالیٰ اس کی ذات کو دوزخ سے اتنی دور کر دیں گے جتنی دور کوئی شخص ستر سال میں چل کر پہنچے۔ (یعنی وہ دوزخ میں نہ جائے گا)۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۸ ج ۱)

لفظ **فی سبیل اللہ** کا متبادر معنی تو یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر روزہ رکھنے کی یہ فضیلت ہے اور اسی لئے امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الجہاد میں ذکر کیا ہے۔ اور بعض شراح حدیث نے اس کا ترجمہ **لوجہ اللّٰہ** بھی کیا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کی رضا کے لئے روزہ رکھے۔ اس کا یہ ثواب ہے۔ فتح الباری ص ۴۸ ج ۲ میں دونوں معنی لکھے ہیں۔ نفل روزے بقدر طاقت (جس سے دوسری فرض عبادتوں میں ضعف نہ آ جائے اور اپنے لئے اہل وعیال کے لئے ضروری حلال کسبِ معاش میں فرق نہ آئے) رکھتے رہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزانہ روزہ رکھتے تھے اور راتوں رات نفل نماز میں قیام کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے پاس آنے جانے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اور فرمایا کہ سب سے افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن بے روزہ رہتے تھے۔ (صحیح البخاری ص ۲۶۵ ج ۱)

سال بھر میں پانچ دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنا حرام ہے...... پانچ دن پورے سال میں روزہ رکھنا حرام ہے وہ پانچ دن یہ ہیں۔ عید الفطر کا دن اور ذی الحجہ کی ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ تاریخوں میں۔ ذوالحجہ کے اِن دنوں کو ایامِ تشریق کہا جاتا ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایامِ تشریق کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کے دن ہیں۔ (رواہ مسلم ص ۳۶۰ ج ۱) بخاری ص ۲۶۷ ج ۱ میں حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا، ذکر اللہ میں تو ہمیشہ ہی مشغول رہنا چاہیئے۔ لیکن ایامِ تشریق میں خصوصیت کے ساتھ ذکر اللہ کا اہتمام کیا جائے۔

مسئلہ...... جس عورت کا شوہر گھر پر موجود ہو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزے نہ رکھے البتہ فرض روزوں میں شوہر کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ وہ منع بھی کرے تب بھی رکھے۔ کیونکہ اللہ کے فرائض سب کے حقوق سے مقدم ہیں۔

روزانہ نفلی روزہ رکھنا محمود نہیں۔ فائدہ...... بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ روزانہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزانہ روزہ رکھنا محمود نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **لا صام من صام الابد** (یعنی جس نے ہمیشہ روزے رکھے اُس نے روزے رکھے ہی نہیں)۔ (صحیح بخاری ص ۲۶۵ ج ۱)

اور آپ نے روزانہ روزہ رکھنے والے کے لئے یہ بھی فرمایا کہ **لا صام و لا افطر** کہ اس نے نہ روزے رکھے نہ بے روزہ رہا۔ (صحیح مسلم ص ۳۶۷ ج ۱) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ روزانہ روزہ رکھنے سے نفس کو عادت ہو جاتی ہے۔ صرف کھانے پینے کے اوقات بدل جاتے ہیں۔

افضل الصیام...... سب سے افضل روزہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن بے روزہ رہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح

نفلی روزے رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاصوم فوق صوم داؤد (صحیح بخاری ص ۲۶۶ ج ۱) (یعنی داؤد علیہ السلام کے روزہ سے بڑھ کر کوئی روزہ نہیں) اور ایک روایت میں ہے، لا أفضل من ذلک (بخاری ص ۲۶۵ ج ۱) یعنی اس روزے سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔

حدود اللہ سے آگے بڑھنے کی ممانعت ...... آخر میں فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا الآیۃ (یعنی یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ پھٹکو) گزشتہ آیات میں جو روزہ کی فرضیت اور مریض و مسافر کے لئے رخصت اور روزہ کی ابتداء اور انتہاء کے اوقات بیان ہوئے اور اعتکاف والوں کے لئے ارشاد ہوا کہ اعتکاف میں مباشرت نہ کریں۔ ان سب کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ یہ احکام اللہ کی حد بندیاں ہیں۔ حدود سے آگے مت بڑھو جو حکم جس طرح ہوا ہے اس کو اسی طرح پورا کرو اور ایسی صورت اختیار نہ کرو جس سے روزہ یا اعتکاف فاسد ہو جائے رمضان کا روزہ بلا عذر شرعی چھوڑو بھی نہیں اور توڑو بھی نہیں۔ حد بندیوں کے قریب جانے کی ممانعت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے روزہ ضائع ہو جائے۔ نہ سحری میں اتنی دیر کریں کہ صبح صادق ہو جائے نہ افطار میں اتنی جلدی کریں کہ سورج چھپنے سے پہلے ہی کھا کے فارغ ہو جائیں حالتِ روزہ میں منہ میں ایسی کوئی چیز نہ لیں جس کا اندر جانے کا اندیشہ ہو اور وضو کرتے وقت ناک میں پانی دینے میں مبالغہ نہ کریں۔ (کما فی الحدیث وبالغ فی الاستنشاق الا ان تکون صائما، رواہ ابو داؤد) روزے میں مسواک کرنا تو احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے لیکن دوسری چیزوں سے روزے میں دانت صاف کرنے کو فقہاء نے اسی لئے مکروہ رکھا ہے کہ تھوڑا بہت اندر چلے جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل ذریعہ سے مت کھاؤ اور نہ لے جاؤ اُن کو حاکموں کی طرف تا کہ کھا جاؤ ایک حصہ لوگوں کے مالوں میں

النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳

سے گناہ کے ساتھ حالانکہ تم جانتے ہو۔

باطل طریقوں سے مال کھانے کی ممانعت

اس آیت میں باطل طریقوں پر کسی کا مال حاصل کرنے اور اپنے استعمال میں لانے کی ممانعت فرمائی۔ رمضان میں دن کے اندر حلال کھانے کی ممانعت فرمائی گئی۔ اور اب احکام رمضان کے متصل ہی یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ حرام کبھی نہ کھاؤ۔ نہ رمضان میں نہ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینہ میں۔ لفظ "بالباطل" بڑھا کر یہ بتا دیا کہ جو مال شرعاً جائز ہو مثلاً طیب نفس کے ساتھ کوئی ہدیہ دے دے یا شریعت کے مطابق تجارت کرنے سے نفع کی صورت میں کچھ مال مل جائے یا میراث میں حلال مال مل جائے تو یہ حلال ہے۔ باطل کے ذریعہ مال حاصل کرنے کی بہت صورتیں ہیں۔ جن میں سے متعدد صورتیں آیت کریمہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ...... کے ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں۔ یہاں قرآن کریم نے ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعہ لوگوں کے مالوں پر باطل طریقہ سے قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ حکامِ وقت کو ذریعہ بنا کر لوگوں کے مالوں کو اپنا مال بنا لیتے ہیں، اس کی کئی صورتیں ہیں۔

حاکم کے فیصلہ کر دینے سے کسی کا مال حلال نہیں ہو جاتا ...... ایک صورت یہ ہے کہ کسی کے مال پر دعویٰ کیا کہ یہ میرا ہے اور

حاکم کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرالیا اور ایک طریقہ یہ ہے کہ جھوٹی تحریر لکھ کر یا جھوٹے گواہ بنا کر حاکم کے ہاں پیش کرکے کسی غیر کے مال اور جائیداد کے بارے میں اپنے حق میں فیصلہ کرالیا۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ شرعی قانون کے خلاف حکومتِ وقت کے رائج قوانین کے مطابق کسی کا مال دبالیا۔ مثلاً کسی حکومت نے یہ قانون بنادیا کہ مرنے والے کے مال میں صرف لڑکوں کا حصہ ہوگا۔ اور اس قانون کے پیش نظر لڑکوں نے حاکم سے اپنے حق میں میراث تقسیم کرانے کا فیصلہ کرالیا اور بہنوں کو محروم کردیا یا جیسے کسی حکومت نے قانون بنادیا کہ فلاں فلاں اشخاص کا مال زبردستی لے کر فلاں فلاں قسم کے آدمیوں پر تقسیم کردیا جائے۔ تو ان میں سے کسی بھی صورت میں کسی شخص کا مال ہرگز حلال نہیں ہوگا اور بھی اس کی بہت سی صورتیں ہیں جنہیں مقدمہ باز جانتے ہیں اور مکر و فریب کے ذریعہ حکام کو استعمال کرکے دوسروں کے مالوں پر قبضہ کرتے رہتے ہیں۔ حاکم سے فیصلہ کرا کر جو شخص کسی کا مال لے لے گا۔ وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگا۔ دنیا و آخرت میں اس کا بہت بڑا وبال ہے اور سخت عذاب ہے دنیاوی حکام کے فیصلوں کے ذریعہ کسی کا مال اپنا بنا کر مطمئن نہ ہو جائیں۔ یہ یاد رکھیں کہ مالک یوم الدین، قاضی روزِ جزا جل مجدہ کے حضور میں بھی پیش ہونا ہے۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں انسان ہی ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو اور ممکن ہے کہ تم میں سے ایک آدمی دوسرے کے مقابلہ میں اپنی حجت کو بڑھ چڑھ کر بیان کردے اور میں اس کے مطابق فیصلہ کردوں جو کچھ میں نے اس سے سنا (اور یہ فیصلہ حقیقت میں غلط ہو) سو جس کے لئے میں اُس کے بھائی کے مال میں سے کسی چیز کا کوئی فیصلہ کردوں تو اُسے ہرگز نہ لے کیونکہ میں اُس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (صحیح بخاری ص۱۰۶۲ ج۲)

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی پر جھوٹا مقدمہ دائر کیا اور جس کا حق نہیں ہے اُس کے زورِ بیان پر میں نے اس کو دوسرے کا حق دِلا دیا تو میرے دلانے سے وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں فیصلہ کردیا ہے۔ لہٰذا میرے لئے دوسرے کا مال حلال ہوگیا۔ باوجود فیصلہ کردینے کے دوسرے کا مال مدعی کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جو شخص کسی ایسی چیز کا دعوٰی کرے جو اُس کی نہیں ہے تو وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے اور وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔ (رواہ مسلم ص۵۷ ج۱)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جھوٹی قسم کھائی جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اپنے حق میں کرلینا چاہتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوگا۔ (صحیح بخاری ص ۹۸۷ ج۲، صحیح مسلم ص۸۰ ج۱)

لفظ فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ جو فرمایا ہے۔ اس میں یہ بتادیا کہ صرف آپس میں مسلمانوں ہی کا مال ناحق لے لینا حرام نہیں ہے بلکہ غیروں کا مال ناحق لے لینا بھی حرام ہے جو کافر مسلمانوں کی عملداری میں رہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اُن کو ذمی کہا جاتا ہے۔ تمام مسلمانوں پر ان کی جان و مال کی حفاظت لازم ہے۔ اور خیانت کرکے یا کسی بھی طرح سے ان کا مال ناحق رکھ لینا جائز نہیں ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ

وہ آپ سے چاندوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ اوقاتِ مقررہ ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے، اور نیکی نہیں ہے کہ تم

تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا

ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے، اور آ جاؤ تم گھروں میں ان کے دروازوں سے، اور

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

چاندوں میں کمی بیشی کیوں ہوتی ہے

تفسیر درِ منثور ص ۲۰۳ ج ۱ میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور ثعلبہ بن غنمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ چاند چھوٹا بڑا کیسے ہو جاتا ہے۔ اول باریک تاگہ کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے بڑا ہو جاتا ہے اور گول ہو جاتا ہے پھر گھٹتے گھٹتے باریک ہو جاتا ہے اور شروع میں جیسا تھا ویسا ہی آخر میں ہو جاتا ہے۔ ان کے سوال پر آیتِ بالا نازل ہوئی اور ان کو جواب دیا گیا کہ یہ چاند لوگوں کے لئے اوقاتِ مقررہ بتانے والے ہیں اور حج کا وقت بھی ان کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزے کب رکھنا شروع کریں گے۔ عورتوں کی عدت کے اوقات ان کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کے معاملات میں جو کوئی اجل اور میعاد مقرر ہوتی ہے چاندوں کے ذریعہ ان کے ختم ہونے کا علم بھی ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے...... شریعتِ اسلامیہ میں چاند کے مہینوں کا اعتبار کیا گیا ہے صاحبِ نصاب پر چاند کے اعتبار سے بارہ مہینے گزر جانے پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہوتی ہے (اگر کوئی شخص شمسی مہینوں کے اعتبار سے سال گزر جانے پر زکوٰۃ ادا کرتا رہے گا تو چھتیس سال کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی رہ جائے گی۔ کیونکہ شمسی سال قمری سال سے دس دن بڑا ہوتا ہے) جس عورت کا شوہر وفات پا جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اور جس عورت کو اب تک حیض نہیں آیا اُس کو طلاق ہو جائے تو اس کی عدت تین مہینے ہے۔ یہ مہینے قمری مہینوں کے اعتبار سے معتبر ہوں گے اور رمضان کے روزے بھی چاند ہی کے حساب سے رکھے جاتے ہیں کیونکہ رمضان چاند کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے پھر عید بھی چاند دیکھ کر کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چاند دیکھ کر (رمضان کے) روزے رکھنا شروع کرو، اور چاند دیکھ کر رمضان کے روزے رکھنا ختم کر دو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تمیں (روزوں کی) گنتی پوری کر لو۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۷ و ۳۴۸ ج ۱)

حج بھی ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو ہوتا ہے اور قربانیاں ذوالحجہ کی دس، گیارہ، بارہ کی تاریخوں میں ہوتی ہیں۔ ان سب احکام میں چونکہ چاند ہی کا مہینہ معتبر ہے اور چاند ہی کے حساب سے مہینوں کی ابتداء اور انتہا ہوتی ہے اس لئے چاند کے مہینوں کا محفوظ رکھنا اور ان کی ابتداء و انتہاء جاننا فرضِ کفایہ ہے۔

دینی اُمور کو قمری مہینوں سے متعلق کرنے میں آسانی ہے...... چاند کے مہینوں سے دینی اُمور کو متعلق کرنے میں عوام اور خواص کے لئے اور پورے عالم کے انسانوں کے لئے آسانی بھی ہے۔ چاند شروع میں مغرب کی طرف چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ شروع ہے پھر چند دن کے بعد پوری رات روشن رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایامِ بیض کا زمانہ ہے پھر اخیر میں مشرق کی طرف چھوٹا ہو کر نظر آنے لگتا ہے اور ایک دو دن بالکل ہی نظر نہیں آتا، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ

اخیر ہو رہا ہے۔ اگر شمسی مہینوں سے عبادات کا تعلق ہوتا تو اُسے صرف حساب دان ہی سمجھ سکتے تھے اور ہر شخص کے پاس کیلنڈر اور جنتری ہونا ضروری تھا اور یہ یاد رکھنا ضروری تھا کہ کونسا مہینہ کتنے دن کا ہوتا ہے یہ سب باتیں عوام کے لئے سمجھنا اور یاد رکھنا مشکل تھا پھر کیلنڈر وغیرہ اب ترقی یافتہ دنیا میں چھپنے لگے وہ بھی ہر بستی اور ہر گھر میں نہیں ہوتے۔ اور احکام اسلام چودہ سو سال سے نافذ ہیں پھر کیلنڈر اور جنتریوں پر عبادات کیسے موقوف رکھی جا سکتی ہیں۔ عوام اور خواص کے لئے یہ آسانی ہے کہ چاند دیکھا اور مہینے کی ابتداء اور انتہا سمجھ لی۔ سورج روزانہ ایک ہی طرح نکلتا اور چھپتا ہے۔ سردی گرمی میں اس کا طلوع غروب ایک ہی طرح ہے۔ اسے دیکھ کر مہینوں کی ابتداء اور انتہا سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں۔

صاحب رُوح المعانی ص ۷۱ ج ۲ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ نے جو سوال کیا تھا وہ یہودیوں کے سوال کرنے پر تھا۔ یہودیوں نے حضرات صحابہؓ سے چاند کے بارے میں سوال کیا تو ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا۔ الفاظ سوال میں احتمال ہے کہ اُنہوں نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم کی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے کی علت اور سبب معلوم کیا ہو۔ اگر چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم کی تھی تب تو جواب سوال کے مطابق ہو گیا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں عبادات کے اوقات اور معاملات کی میعادیں معلوم کرنے کا فائدہ ہے۔ اگر چاند آفتاب کی طرح ایک ہی حالت پر ہوتا تو اوقات کا سمجھنا اور معلوم کرنا مشکل ہو جاتا۔ اور اگر حضرات صحابہؓ کا سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت جاننے کے متعلق تھا تو جواب من قبیل اسلوب الحکیم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ معلوم کرنا چاہیئے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے اسباب تکوینیہ جاننے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں، تمہیں تو یہ پوچھنا چاہیئے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے چنانچہ ان کو اسی سوال کا جواب دے دیا گیا جو سوال انہیں کرنا چاہیئے تھا۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا یعنی چھوٹا بڑا نظر آنا اس کے اسباب تکوینیہ ریاضی کی کتابوں میں لکھے ہیں کچھ پُرانے فلاسفہ کے تخیلات ہیں اور کچھ نئے سائنس کے تصورات ہیں ان میں سے کسی بھی چیز کی قرآن و حدیث سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی دینی مسئلہ ان کے جاننے پر موقوف ہے۔ بہت سے لوگ فلکیات اور اجرام سماویہ کے احوال جدید آلات کے ذریعہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور مروّجہ علوم میں ماہر بھی ہو جاتے ہیں اور اپنے کو بڑا عالم بھی سمجھتے ہیں دنیا کے ادارے اور ملکوں کے سربراہ اُن کو اعزازی ڈگریاں بھی دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ ان چیزوں کے خالق و مالک کی نہ صرف عبادت کرنے اور اُس کی معرفت سے محروم ہیں بلکہ اس ذات پاک پر ایمان بھی نہیں لاتے جس نے یہ چیزیں پیدا فرمائیں۔ قرآن مجید کے طرزِ جواب میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے اسباب تکوینیہ کے جاننے میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ ان پر سب سے زیادہ خالق جل جلالہٗ کے احکام کی طرف متوجہ ہونا فرض ہے۔

گھروں کے دروازوں سے آنے کا حکم ...... چاندوں کے متعلق سوال کا جواب دینے کے بعد جاہلیت کی ایک رسم کی تردید فرمائی۔ صحیح بخاری ص ۶۴۸ ج ۲ میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جاہلیت میں عرب کے لوگ جب احرام باندھ لیتے تھے تو (احرام کے زمانہ میں) گھر کی پشت سے داخل ہوتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا اور صحیح بخاری ابواب العمرۃ ص ۲۴۲ ج ۱ میں یوں نقل کیا ہے کہ انصار (اوس اور خزرج کے قبیلے) جب حج کر کے واپس ہوتے تھے تو اپنے گھروں میں دروازوں سے نہیں بلکہ پچھواڑوں کی طرف سے داخل ہوتے تھے ایک انصاری جو حج کر کے آئے تو وہ گھر کے دروازے سے داخل ہو گئے (ان کو عار دلائی گئی، گویا انہوں نے کوئی بُرا کام کیا ہے) اس پر آیت بالا نازل ہوگئی۔

اپنی طرف سے کسی کام میں ثواب یا گناہ سمجھ لینا بدعت ہے ...... گھروں کے پچھواڑوں سے داخل ہونے کو وہ لوگ ثواب سمجھتے

تھے اور اس کو نیک کام جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہ نیکی نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں ان کی پشتوں کی طرف سے آؤ۔ نیکی اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ان سے پرہیز کیا جائے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی رہے اور اپنی طرف سے تراشے ہوئے احکام اور اعمال کی پابندی کی جائے اور اس میں ثواب سمجھا جائے یہ گمراہی کی بات ہے۔ جس چیز کو شریعت نے ضروری نہیں قرار دیا یا ثواب کا کام نہیں بتایا اس کو اپنی طرف سے ضروری قرار دے دینا یا ثواب کا کام سمجھ لینا بدعت ہے اور گناہ ہے جیسا کہ جو چیز شرعاً جائز ہو اُسے گناہ سمجھنا گناہ ہے، گھر کے دروازوں سے داخل ہونا شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا اور مکان کی پشتوں کو توڑ کر داخل ہونے کو ضروری سمجھا اور ثواب کا کام جانا اس لئے ان کے عقیدہ اور عمل کی تردید فرمائی اور آخر میں فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ تم اللہ سے ڈرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے احکام پر عمل پیرا ہو اور اس کے احکام میں تغیر و تبدل نہ کرو۔

علامہ جصاصؒ کا ایک استنباط...... علامہ جصاص احکام القرآن ص ۲۵۶ ج ۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ قانون معلوم ہوا کہ جس عمل کو اللہ تعالیٰ نے ثواب کا کام نہیں بتایا اور جس کی ترغیب نہیں دی وہ کسی شخص کے ثواب بنا لینے سے ثواب کی چیز نہ بنے گا۔ نہ دین کا جزو ہوگا۔ اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے اور یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ وہ دین ہے پھر لکھتے ہیں کہ اُس کی نظیر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن بھر خاموش رہنے سے منع فرمایا، (چونکہ شریعت محمدیہ میں خاموش رہنے کا روزہ نہیں ہے) اور ایک شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ دھوپ میں کھڑا ہے آپؐ نے فرمایا اس کو کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا اس نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی نذر مانی ہے۔ آپؐ نے اس کو حکم دیا کہ سایہ میں چلا جا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

اور تم اُن کو قتل کرو جہاں بھی پالو، اور نکال دو ان کو جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکالا، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے،

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ

اور اُن سے جنگ مت کرو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تم سے اُس میں خود نہ لڑیں، سو اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم اُن کو قتل کر دو، ایسی ہی

جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ

جزا ہے کافروں کی۔ سو اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔ اور اُن سے یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے

يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور ہو جائے دین اللہ ہی کے لئے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر۔

اللہ کی راہ میں قتال کرنے کا حکم اور ظلم و زیادتی سے پرہیز کرنے کی تاکید

حضرت سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت کے چھٹے سال اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے

جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مقام حدیبیہ پر مشرکین مکہ نے آپ کو روک دیا اور مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ بڑی ردّ و کد کے بعد انہوں نے دس سال کے لئے چند شرطوں پر صلح کر لی اُن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس سال عمرہ نہیں کر سکتے آئندہ سال عمرہ کے لئے تشریف لائیں اور اس وقت مکہ معظمہ میں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ یہ ذی قعدہ کا مہینہ تھا۔ پھر آپ آئندہ سال ماہ ذی قعدہ ہی میں عمرہ کی قضا کیلئے تشریف لائے اس زمانہ میں چار مہینوں میں قتال اور جنگ کرنا ممنوع تھا۔ اُن چار مہینوں میں ذیقعدہ کا مہینہ بھی شامل تھا۔

لباب النقول میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا آیت اس موقع پر نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لئے اپنے صحابہؓ کے ساتھ ۷ھ میں تشریف لے گئے تھے حضرات صحابہؓ کو یہ اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے کہ قریش مکہ صلح کی شرطوں کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور اس مرتبہ بھی مسجد حرام تک نہ پہنچنے دیں اور جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیں بھی جنگ کا اقدام کرنا پڑے گا اور یہ اس مہینہ میں ہوگا جس میں جنگ کرنا حرام ہے اور ہم جوابی کارروائی نہ کریں تو مغلوب ہوں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور قتال کرنے کی اجازت دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں اُن سے قتال کرو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ زیادتی مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ شریعت اسلامیہ میں ہر چیز کی حدود ہیں۔ اصول ہیں، آداب ہیں اور اخلاق عالیہ ہیں۔ قتل و قتال کے بھی کچھ اصول ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لَا تَعْتَدُوْا کے عموم میں وہ سب باتیں داخل ہو گئیں جو جنگ کے موقع پر ممنوع ہیں مثلاً مُثلہ کرنا (کسی مقتول کے ناک، کان کاٹ دینا، صورت بگاڑ دینا) مالِ غنیمت میں خیانت کرنا عورتوں، بچوں اور اُن بوڑھوں کو قتل کرنا جو نہ جنگ کرتے ہوں نہ جنگ کے معاملات میں کوئی رائے یا مشورہ دیتے ہوں اور مثلاً راہبوں کو قتل کرنا اور بغیر کسی مصلحت کے درختوں کو جلانا اور حیوانات کو قتل کرنا۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۶ ج ۱) صحیح مسلم ص ۸۲ ج ۲ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر یا کسی فوجی دستہ کا کسی کو امیر بنا کر بھیجتے تو خاص کر اُس کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور جو مسلمان اس کے ساتھ جا رہے ہوں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت فرماتے تھے۔ پھر فرماتے تھے کہ اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو شخص اللہ کو نہ مانتا ہو اُس سے جنگ کرنا مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور غدر نہ کرنا اور کسی کا مثلہ نہ کرنا اور کسی بچہ کو قتل نہ کرنا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ جہاد کے موقع پر ایک عورت مقتولہ پائی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا، آپؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (صحیح مسلم ص ۸۴ ج ۲) پھر فرمایا وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (کہ اُن کو قتل کرو جہاں بھی پاؤ)۔ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (اور ان کو نکال دو جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکالا) یعنی تمہیں مکہ معظمہ چھوڑ کر ہجرت پر مجبور کیا۔

فتنہ گری قتل سے زیادہ سخت ہے...... اور فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ج (اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے) فتنہ سے مُراد شرک ہے۔ صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں ص ۵۷ ج ۲ کہ صحابہؓ کے دِلوں میں جو بات آ رہی تھی کہ حرم میں اُن کو کس طرح قتل کریں گے۔ جبکہ حرم کا احترام ضروری ہے۔ ان کے اس وسوسہ کا جواب دیا گیا کہ جس کام میں یہ لوگ خود لگے ہوئے ہیں یعنی شرک باللہ اور وہ بھی حرم میں وہ قتل کرنے سے بہت زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا تم اس کی پرواہ نہ کرو کہ حرم میں قتل و قتال واقع ہو جائے گا۔

دفاع کے لئے قتال کرنا...... پھر فرمایا وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (اور اُن سے جنگ مت کرو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تم سے اُس میں خود نہ

لڑیں سو اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کردو، ایسی ہی جزا ہے کافروں کی) اس میں مسلمانوں کو ابتداء بالقتال کی ممانعت فرمائی کہ مسجد حرام کے قریب خود سے قتل وقتال کی ابتداء نہ کرنا جب تک کہ وہی تم سے قتال شروع نہ کریں، اگر وہ حرم کی حرمت کی پاسداری ترک کردیں تو تم بھی اُن کو قتل کردو۔

قال صاحب الروح ص۵۷ج۲ نفی للحرج عن القتال فی الحرم الذی خاف منه المسلمون و کرهوه ای ان قاتلوکم هناک فلا تبالوا بقتالهم لانهم الذین هتکوا الحرمة و أنتم فی قتالهم دافعون القتل عن انفسکم۔

اس کے بعد فرمایا فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی اگر مشرکین کفر اور شرک سے باز آ جائیں اور اسلام قبول کرلیں گے تو (اہلِ اسلام سے قتال بھی نہ کریں گے) اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (وہ سب کی توبہ قبول فرماتا ہے)۔

قتال کب تک ہونا چاہیئے...... پھر فرمایا وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (یعنی کافروں سے یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے) اس میں قتال کی ضرورت اور غرض و غایت بیان فرمائی ہے شرک اور کفر بدترین گناہ ہے۔ خالق و مالک کی بغاوت ہے۔ دنیا میں اس کو مٹانے کے لئے کافروں اور مشرکوں سے جنگ کرتے رہیں اور یہاں تک جنگ کریں کہ سارا دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ صحیح بخاری ص ۸ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہ حکم ہوا کہ لوگوں سے اُس وقت تک قتال کرتا رہوں جب تک کہ وہ لا الـٰه الا الله کو نہ مانیں۔ جب انہوں نے اس کو کہہ لیا تو وہ مجھ سے اپنے خونوں اور مالوں کو بچالیں گے۔ ہاں اگر اسلام کا قانون ان کے خونوں اور مالوں کے بارے میں جاری کرنا ضروری ہوا تو وہ اور بات ہے اور اُن کا حساب اللہ پر ہے۔

(یعنی کوئی شخص اگر ظاہراً اسلام قبول کرے گا تو ہم اُس کو قتل نہ کریں گے۔ آگے اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے دِل سے اسلام قبول نہ کیا ہوگا تو آخرت کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ دلوں کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ہم ظاہر کے پابند ہیں)۔

قتال کرنے میں کیا نیت ہو؟ آیت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قتال کی ضرورت کفر اور شرک کو مٹانے کے لئے ہے وہاں قتال کرنے والوں کو یہ بھی بتا دیا کہ قتال اور جہاد میں یہ نیت رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کا بول بالا ہو اس کا دین بلند ہو۔ دنیا سے اس کے باغی ختم ہوں، اور حقیقۃً اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا وہی ہے جو اللہ کی بات بلند کرنے کے لئے قتال کرے۔ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا کہ ایک آدمی مالِ غنیمت کے لئے قتال کرتا ہے ایک شہرت کے لئے لڑتا ہے اور ایک اس لئے لڑتا ہے کہ لوگ اس کی بہادری کے قائل ہو جائیں سو اُن میں فی سبیل اللہ لڑنے والا کون ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کی بات اُونچی ہو تو وہ فی سبیل اللہ لڑنے والا ہے۔ (صحیح بخاری ص۳۹۴ ج ۱)

فائدہ...... عرب کے مشرکوں کے لئے یہی قانون ہے کہ یا تو اسلام قبول کریں یا قتل کردیئے جائیں ان کے علاوہ دُوسرے انسانوں کے لئے جان و مال محفوظ کرنے کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ جزیہ دینا منظور کرلیں وہ مسلمانوں کے ملک میں مغلوب ہو کر رہیں اور اصولِ شریعت کے مطابق ان سے جزیہ وصول کیا جاتا رہے۔ سورۂ برأت میں ادائے جزیہ کی صورت میں جنگ بند کرلینے کا ذکر ہے۔ یہاں چونکہ مشرکین عرب کا ذکر ہے اس لئے جزیہ کا ذکر نہیں فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزیہ کا قانون بعد میں نازل ہوا ہو۔

فتنوں کو دبانے کے لئے جنگ کرنا...... یہ جو فرمایا وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ اس میں واضح طور پر فرما دیا کہ قتال فتنہ ختم کرنے کے لئے ہے۔ لفظ فتنہ عام ہے۔ سب سے بڑا فتنہ کفر اور شرک ہے اور اس کے علاوہ فسق و فجور کے فتنے بھی اُٹھتے

رہتے ہیں کبھی مسلمان بھی آپس میں لڑتے ہیں اس میں بہت سی مرتبہ واضح طور پر کسی جماعت کے بارے میں حق اور ناحق کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ جنگ میں شریک ہونے پر موجودہ فتنہ میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے دین دار سمجھ دار آخرت کے فکر مند حضرات اس میں حصہ نہیں لیتے۔ صحیح بخاری ص ۶۴۸ ج ۲ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں دو آدمی آئے۔ یہ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدال کرنے کا زمانہ تھا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ لوگ ضائع ہو رہے ہیں اور آپ حضرت عمرؓ کے بیٹے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے صحابی ہیں۔ آپ جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان دونوں سے کہا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے (مسلمان) بھائی کا قتل کرنا حرام قرار دیا ہے (پھر میں کیسے شرکت کروں؟ ممکن ہے مجھ سے کوئی ناحق قتل ہو جائے) اُن دونوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (کہ اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے دشمنانِ دین سے یہاں تک جنگ کی کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ ہی کے لئے ہو گیا اور تم چاہتے ہو کہ یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ وجود میں آجائے اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے (لہٰذا تمہاری جنگ اللہ کے لئے نہیں ہے میں اس میں کیسے شرکت کروں؟)

آجکل قتل و قتال کی کثرت ہے اسلام کا دعویٰ کرنے والے افراد اور جماعتیں طرح طرح کی عصبیتوں کی وجہ سے اور دُشمنانِ دین کے اُبھارنے کے باعث آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمان بے تحاشہ قتل کر ڈالتے ہیں اول تو قتل مسلم حرام ہے اور بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا آخرت میں بہت سخت ہے پھر اس سے کفر اور اہلِ کفر کو تقویت ہوتی ہے اور دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں میں کمزوری آتی ہے۔ یہ وہی فتنہ ہے جس کے پیش نظر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما قتال میں حصہ لینے سے باز رہے اور فرمایا کہ قرآن نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ نہ رہے اور تم اس لئے لڑتے ہو کہ فتنہ ہو۔ تمام مسلمان حضرت ابن عمرؓ کی بات کو سمجھیں اور باہمی قتل و قتال کر کے دنیا و آخرت کے عذاب اور وبال کے مستحق نہ بنیں۔

جو مشرک اسلام قبول کر لیں ان کو قتل کرنا جائز نہیں ...... یہ جو فرمایا فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ اس میں یہ بتایا کہ کافر اور مشرک اگر اسلام قبول کر لیں تو پھر ان کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اسلام قبول کرنے کے بعد تم نے ان کو قتل کیا تو تم ظالم ہو جاؤ گے اور پھر تم گرفت اور سزا کے مستحق ہو گے کیونکہ ظالم ہی گرفت کے مستحق ہوتے ہیں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان پر سختی کرنے کا موقع نہ رہا۔ سختی تو ظالموں پر ہوتی ہے جو لوگ کفر و شرک پر مُصر ہیں اُن پر سختی کرنا دُرست ہے۔

مفسر بیضاوی ص ۱۳۴ پر لکھتے ہیں ای فلا تعتدوا علی المنتهین إذلا یحسن أن یظلم الا من ظلم أو أنكم اِن تعرضتم للمنتهین صرتم ظالمین وینعكس الأمر علیكم اور معالم التنزیل ص ۱۶۳ ج ۱ میں ہے أی فان اسلموا فلا نهب ولا أسر ولا قتل الا علی الظالمین الذین بقوا علی الشرك۔ لفظ عدوان کا ترجمہ زیادتی کیا گیا ہے۔ جو اس کا لفظی ترجمہ ہے تعدی اور اعتداء کا مادّہ بھی یہی ہے جو لوگ اسلام قبول نہ کریں ان سے قتال کرنے کو عدوان سے جو تعبیر فرمایا ہے یہ مشاکلۃ ہے یعنی اُنہوں نے جو کفر پر کمر باندھ رکھی ہے اور اس طرح سے زیادتی کر رکھی ہے تم ان کو اس زیادتی کی سزا دے سکتے ہو۔ انہوں نے زیادتی کی ہے تو تم بھی زیادتی کر سکتے ہو یعنی ان کی زیادتی پر اُن کو قتل کر سکتے ہو۔ مسلمانوں کی طرف سے جو اُن پر قتل اور غارت گری کی صورت میں سزا ہوگی اُسے عدوان فرمایا۔ جیسے مُحاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں زیادتی کرے تو تم بھی زیادتی کرو حالانکہ زیادتی کا جواب زیادتی نہیں ہوتا۔ وفی التنزیل العزیز وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (من البغوی والبیضاوی)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے عوض اور حرمتیں معاوضہ کی چیزیں ہیں، سو جو شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو اس پر اتنی ہی زیادتی کرو

بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مشرکین کی زیادتی کا جواب

صلح کی شرطوں کے مطابق جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے تو یہ ماہ ذیقعدہ تھا۔ مشرکین مکہ سے مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ معاہدہ کی پاسداری نہ کریں اور حملہ کردیں اگر اُنھوں نے حملہ کیا تو حُرمت والے مہینہ میں اور حرم میں جنگ کرنی پڑے گی اور اس سے مکان وزمان دونوں کی حرمت میں فرق آئے گا۔ حرم کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ اور مہینہ کی حرمت کے بارے میں اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر جنگ کرنی پڑے تو تم جنگ کر لینا اور حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض ہو جائے گا یعنی مشرکین حرمت والے مہینہ کا احترام کریں تو تم بھی احترام کرو اور خود سے جنگ نہ کرو وہ بے حرمتی کر بیٹھیں تو تم بھی جوابی کارروائی کرو۔ اور یہ جو فرمایا وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرمت عوض اور معاوضہ کی چیزیں ہیں جو لوگ تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کریں تم بھی ان کی رعایت کرو جس ذات پاک نے حرم اور ماہِ حرام میں جنگ کرنے کو حرام قرار دیا اسی کی طرف سے جوابی کارروائی کرنے اور دفاع کرنے کی اجازت مل گئی تو اب حیرانی پریشانی کا کوئی موقع نہ رہا۔

پھر فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (یعنی جو شخص تم پر زیادتی کرے تو اُس پر اُتنی ہی زیادتی کرو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے)۔ جس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (یعنی عمرۃ القضاء جس میں دشمنوں کے حملے کا خطرہ تھا) اس کے بارے میں بتادیا کہ زیادتی کرنے والے پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی وہ زیادتی کرے آیت کا نزول اگرچہ خاص موقع پر تھا لیکن الفاظ کے عموم نے مستقل قانون بتادیا کہ زیادتی کا جواب بقدر زیادتی ہی دے سکتے ہو اور جتنی زیادتی کسی نے کی ہو اُس سے اُسی قدر بدلہ لے سکتے ہو اگر اس سے زیادہ کچھ کیا تو پھر تم زیادتی کرنے والے ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے...... آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (یعنی بدلہ لینے میں اور ہر موقعہ پر گناہ سے بچو اور اللہ سے ڈرو جس چیز کی اجازت نہیں اُسے نہ کرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کا بہت بڑا مقام ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔ اگر کسی موقع پر نفس کے اُبھار کی وجہ سے زیادتی کرنے کا تقاضا ہوا، اور شرعی ممانعت کی وجہ سے اس سے پرہیز کیا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ دیں گے۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں، اور خوبی کے ساتھ کام کیا کرو، بے شک

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اللہ تعالیٰ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت

مستدرک حاکم ص ۲۷۵ ج ۳ میں ابوعمران سے روایت نقل کی ہے اُنہوں نے بیان کیا کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے اور امیر المؤمنین کی طرف سے مصر پر عقبہ بن عامر جہنی اور شام پر فضالہ عامل تھے رومیوں کی ایک بہت بڑی صف (جنگ کرنے کے لئے) سامنے آئی۔ مسلمانوں نے بھی ان کے سامنے بہت بڑی صف بنالی ایک مسلمان نے رومیوں کی صف پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اُن میں گھس گئے پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر وہاں سے نکلے۔ لوگ کہنے لگے کہ اس نے تو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈال دیا اس پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کا مطلب غلط لیتے ہو (اس کا یہ مطلب نہیں کہ دشمنوں سے قتال نہ کرو اور اُن پر حملہ آور نہ ہو) یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غلبہ دے دیا اور ان کے مددگار بہت ہو گئے تو بعض انصار نے یوں کہا کہ ہمارے مال ضائع ہو گئے۔ لہٰذا اب اگر ہم مالوں کی دیکھ بھال کے لئے گھروں میں مقیم رہیں (تو شاید کچھ حرج نہ ہو) اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ہمارے ارادوں کی تردید فرمائی اور آیت کریمہ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الآیۃ) نازل فرمائی۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ مالوں کی دیکھ بھال کے لئے گھروں میں بیٹھنے میں ہلاکت ہے۔ پس ہم کو جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ موت آنے تک برابر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔ سنن ترمذی کتاب التفسیر (تفسیر سورۃ البقرہ) میں بھی یہ واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں فلو اقمنا فی اموالنا و اصلحنا ماضاع منها۔ (کہ اگر ہم اپنے مالوں میں قیام کرتے اور اُن میں جو خرابی و خستگی آ گئی ہے اُسے ٹھیک کر لیتے تو اچھا تھا) اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی جس سے واضح ہوا کہ ہلاکت مالوں کی دیکھ بھال اور اُن کی اصلاح کے لئے گھروں میں مقیم ہونے اور جہاد چھوڑنے میں ہے۔ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ کافروں کے ساتھ جہاد کرتے رہنے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے رہنے میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت اور غلبہ ہے اور اس کو چھوڑنے میں ہلاکت ہے۔

جہاد کی اہمیت اور ضرورت ...... درحقیقت جہاد بہت بڑی چیز ہے اس میں بہت بڑی عزت ہے اس سے اللہ کی مدد آتی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ رہتا ہے۔ تاریخ الخلفاء ص ۸۷ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مرویات میں بحوالہ طبرانی (فی المعجم الاوسط) حدیث نقل کی ہے ما ترک قوم الجهاد الا عمهم الله العذاب (جس قوم نے جہاد کو چھوڑ دیا اس پر اللہ تعالیٰ عام عذاب بھیج دیں گے) جب مسلمانوں نے فی سبیل اللہ جہاد کرنا چھوڑ دیا اس کی وجہ سے عمومی عذاب بھی دیکھ رہے ہیں۔ مسلمان جہاد کی طرف متوجہ نہیں، یا تو آپس میں لڑتے ہیں یا دشمن کی شہہ پر جنگ کرتے ہیں اور جنگ میں بھی وطن یا زبان کی عصبیتیں پیش نظر ہوتی ہیں اللہ کی رضا کے لئے اور اللہ کی بات اونچی کرنے کے لئے جنگ کرنے کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ لامحالہ دشمن پیٹ دیتا ہے۔ اور جب ایک دشمن دوسرے دشمن کو مسلمانوں کا ملک دلواتا ہے تو اُسی کے پاس فریاد لے کر چلے جاتے ہیں اور اُسی کے فیصلوں پر راضی ہو جاتے ہیں اس طرح ہلاکت میں پڑ رہے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جو جان و مال خرچ کرنے کا حکم ہے مسلمانوں کا کوئی ملک اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ فالی الله المشتکی وهو المستعان۔

یہ جو فرمایا وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ اس کی ایک تفسیر تو وہی ہے جو شانِ نزول سے معلوم ہوئی اور حضرت ابوایوب انصاری

رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی لیکن مفسرین نے اس کا مصداق بناتے ہوئے اور بھی کئی چیزیں ذکر کی ہیں اور الفاظ کے عموم کے اعتبار سے بہت سی صورتیں اس میں شامل ہیں۔ مال کے خرچ کرنے میں اسراف کرنا، حلال ذریعہ معاش کو ضائع کرنا خودکشی کرنا۔ قصداً وعمداً ایسے کام کرنا جس میں ہلاکت ہو۔ جن مواقع میں مال خرچ کرنا فرض یا واجب ہے وہاں خرچ کرنے سے جان چرانا۔ گناہوں میں مبتلا رہنا توبہ نہ کرنا اور اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں جو جان کو ہلاکت میں ڈالنے کے ذیل میں آتی ہیں وہ سب ممنوع ہیں۔

صفت احسان اختیار کرنے کا حکم ...... آیت کے آخر میں فرمایا وَاَحۡسِنُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ لفظ اَحۡسِنُوۡا باب افعال سے امر کا صیغہ ہے اور احسان حُسن سے ماخوذ ہے۔ حُسن خوبی اور اچھائی کو کہتے ہیں اور احسان کسی کام کو عمدہ طریقے پر انجام دینے کو کہا جاتا ہے۔ جو کام کئے جائیں اُن کی شرائط اور آداب کا خیال رکھا جائے۔ تاکہ اُن میں صفتِ احسان پیدا ہو جائے اور خوبی کے ساتھ انجام دینا صادق آجائے۔ حدیثِ جبریل میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے تو آپؐ نے عبادت کا احسان بتا دیا اور فرمایا ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراک (احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے)۔ زکوٰۃ کو صفتِ احسان کے ساتھ ادا کریں دِکھاوا مقصود نہ ہو۔ ردّی مال نہ دیں۔ جس کو دیں اُس پر احسان نہ دھریں۔ خوش دِلی کے ساتھ دیں۔ پوری زکوٰۃ نکالیں۔ حج میں جنایات نہ کریں۔ جنگ و جدال سے پرہیز کریں۔ حج کر کے نام کرنا مقصود نہ ہو۔ روزہ رکھیں، غیبت اور سب وشتم سے روزہ کی حفاظت کریں یہ سب صفتِ احسان میں شامل ہے انسانی ضرورت کے لئے جانوروں کے ذبح کرنے کی اجازت دی گئی لیکن اس میں بھی صفتِ احسان ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں خوبی اختیار کرنے کا حکم فرمایا سو جب تم کسی کو (شریعت کی اجازت سے) قتل کرو تو قتل کرنے میں خوبی کو اختیار کرو (مثلاً ہاتھ پاؤں نہ کاٹ دو، چہرہ نہ بگاڑ دو) اور جب تم ذبح کرنے لگو تو خوبی کے ساتھ ذبح کرو اپنی چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔ (صحیح مسلم ص۱۵۲ ج۲)

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ

اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے، پس اگر تم کو روک دیا جائے تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دو، اور اپنے سروں کو اس وقت تک نہ مونڈو

حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ

جب تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے، سو جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دے دے روزوں سے

صِيَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ ۚ

یا صدقے سے یا قربانی کے جانور سے۔

حج اور عمرہ کے احکام

جہاد کا حکم بیان فرمانے کے بعد اب حج اور عمرہ کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ جو شخص مکہ معظّمہ تک سواری پر آ جا سکتا ہو اور سفر کے اخراجات اس کے پاس ہوں اور بال بچوں کے لئے ضروری اخراجات بھی موجود ہوں اس پر حج کرنا فرض ہے اور حج زندگی میں ایک

ہی مرتبہ فرض ہے اس سے زیادہ جو کوئی شخص حج کرے گا تو وہ نفل ہوگا۔ حج کے کام آٹھ ذوالحجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ، تیرہ ذوالحجہ تک ختم ہو جاتے ہیں۔ البتہ طواف وداع اس وقت ہوگا جب مکہ معظمہ سے واپس آنے لگیں اگرچہ اس سے پہلے بھی جائز ہے (بشرطیکہ اس سے پہلے طواف زیارت کر چکا ہو) چونکہ افعالِ حج کے لئے ایام مقرر ہیں۔ اس لئے حج میں یہ بات نہیں ہے کہ جب چاہے کر لیں اور عمرہ پورے سال میں جس وقت چاہے کر سکتا ہے اس کی کوئی تاریخ مقرر نہیں البتہ ایام حج میں یعنی ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ کو عمرہ کرنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے (کیونکہ یہ ایام حج کی مشغولیت کے ہیں) عمرہ زندگی میں ایک مرتبہ کر لینا سنت ہے اگر کسی کو مقدور ہو تو عمرہ کی فضیلت سے محروم نہ ہو۔ عمرہ میں احرام اور طواف دو چیزیں فرض ہیں اور صفا و مروہ کی سعی اور حلق یا قصر (سر منڈانا یا کاٹنا) جس سے احرام سے نکل جائے یہ دونوں چیزیں واجب ہیں، حج اور عمرہ دونوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیانی گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور (جس میں گناہ نہ کئے ہوں) اس کی جزا جنت ہی ہے (صحیح بخاری ص ۲۳۸ ج ۱) اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور ایسی باتیں نہ کیں جو مرد وعورت کے درمیان ہوتی ہیں اور گناہ نہ کئے وہ (حج کر کے) ایسا واپس ہوگا جیسا کہ اس دن (بے گناہ) تھا، جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ (صحیح بخاری ص ۲۰۶ ج ۱) اور رمضان المبارک میں عمرہ (ثواب میں) حج کے برابر ہے (صحیح بخاری ص ۲۳۹ ج ۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج وعمرہ کے درمیان متابعت کرو (کہ ایک کے بعد دوسرے کو ادا کرو) کیونکہ وہ دونوں تنگدستی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جیسے بھٹی سونے چاندی اور لوہے کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

جو لوگ حج کے لئے جاتے ہیں وہ حج سے پہلے یا حج کے بعد عمرہ کر ہی لیتے ہیں لیکن جو لوگ غیر ایام حج میں مکہ مکرمہ جا کر عمرہ کر کے چلے آتے ہیں اور پھر زندگی بھر حج فرض کے لئے نہیں جاتے وہ لوگ ترکِ حج کر کے گنہگار ہوتے ہیں جس کی وعید بہت شدید ہے۔

حج نہ کرنے پر وعید...... مکہ معظمہ پہنچنے کی قدرت ہوتے ہوئے حج کئے بغیر مرجانا سخت گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جسے مجبوری نے یا ظالم بادشاہ نے یا روکنے والے مرض نے حج سے نہ روکا اور مر گیا اور حج نہ کیا تو چاہے تو یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے یا نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۲۲ عن الدارمی)

حج اور عمرہ احرام کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ (یعنی لبیک اللّٰھمّ لبیک اخیر تک) پڑھنے سے احرام میں داخل ہو جاتا ہے۔ ممنوعات اور محظورات دونوں احراموں کے ایک ہی ہیں۔ ان کی خلاف ورزی پر بعض صورتوں میں دم (یعنی حرم مکہ میں ایک سال کی بکری یا بکرا ذبح کرنا) اور بعض صورتوں میں صدقہ (بقدر صدقۂ فطر) واجب ہوتا ہے۔

احرام کے ممنوعات...... احرام کے ممنوعات یہ ہیں۔ (۱) خوشبو استعمال کرنا، (۲) جسم سے بال دُور کرنا، (۳) ناخن کاٹنا، (۴) خشکی کا شکار کرنا، (۵) میاں بیوی والے خاص تعلق کو کام میں لانا اور شہوت کے کام کرنا، (۶) مرد کو ایسا کپڑا پہننا جو پورے بدن یا کسی عضو کی ہیئت اور ساخت پر سی کر یا بُن کر یا چپکا کر تیار کیا گیا ہو، (۷) مرد کو سر یا چہرہ کو کپڑا لگانا اور عورت کو چہرہ پر کپڑا لگانا (اجنبی مردوں سے پردہ کرنے کے لئے چہرہ سے ہٹا کر چادر وغیرہ لٹکا لے، پردہ احرام میں بھی لازم ہے)۔

ان چیزوں کی خلاف ورزی کرنے پر جو دم یا صدقہ واجب ہوتا ہے اس کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں اور حج کی معتبر کتابوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مرض کی مجبوری سے اگر بال دُور کرے یا ناخن کاٹے یا مرد سلا ہوا کپڑا پہنے یا سر ڈھانکے یا چہرہ ڈھانکے یا عورت

چہرہ ڈھانکے تو اُس کے لئے رعایت ہے جو ابھی عنقریب ان شاء اللہ تعالیٰ مذکور ہوگی۔ جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکلنے کا شرعاً موقع آجائے اس وقت بال مونڈ کر یا بال کاٹ کر احرام سے نکل جائے۔ اس وقت سے پہلے بالوں کو مونڈنے یا تراشنے سے جزا لازم ہوگی۔ عورتوں کو احرام سے نکلنے کے لئے سر مونڈنا حرام ہے۔ وہ پورے سر کے بال بقدر ایک پورے کے کاٹ کر احرام سے نکل جائے۔ اگر کسی مرد نے بقدر ایک پورے کے چوتھائی سر کے بال کاٹ دیئے یا عورت نے چوتھائی سر کے بال اپنی چوٹی سے بقدر ایک پورے کے کاٹ دیئے تو احرام سے نکل جائیں گے بشرطیکہ احرام سے نکلنے کا وقت ہو چکا ہو۔

احصار کے احکام...... اگر کسی مرد یا عورت نے حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا اور کسی مرض یا دشمن یا درندہ کی وجہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا کہ حج کے احرام والا نہ عرفات جا سکتا ہے نہ طواف کر سکتا ہے اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد طواف سے روک دیا گیا تو اس کو احصار کہتے ہیں اور جس محرم کو روک دیا گیا ہو اُسے مُحصَر کہتے ہیں۔ مُحصَر اگر انتظار نہیں کر سکتا اور احرام سے نکلنا چاہتا ہے تو وہ حدودِ حرم میں ایک سال کی بکری ذبح کردے ایسا کرنے سے احرام سے نکل جائے گا۔ اور اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اگر حدودِ حرم میں خود موجود نہیں ہے تو جس جگہ بھی ہے وہاں سے کم از کم ایک سال کی بکری یا بکرا یا اُس کی قیمت بھیج دے اور جس کے ذریعہ بھیجے اُس سے وقت مقرر کرلے کہ فلاں دن فلاں وقت ذبح کردے۔ جب وہ وقت آجائے اور غالب گمان ہو جائے کہ اب جانور ذبح ہو چکا ہوگا تو احرام سے نکل جائے۔ اب اگر اُن کاموں میں سے کوئی کام کرے گا جو احرام کی وجہ سے ممنوع تھے تو جزاء لازم نہ ہوگی اور صرف جانور ذبح ہو جانے سے احرام سے نکل جائے گا مگر بہتر یہ ہے کہ مردِ مُحصَر ہو تو سر بھی منڈا دے۔ اگر کوئی شخص قارن تھا یعنی اس نے حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھا تھا تو وہ حدودِ حرم میں دو جانور ذبح کرائے۔ جب یہ دونوں جانور ذبح ہو جائیں گے تو وہ دونوں احراموں سے نکل جائے گا۔

حج و عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد پورا کرنا لازم ہے...... اس ساری تفصیل کو سامنے رکھ کر اب آیت کی تفسیر غور سے پڑھئے۔ اول تو یہ فرمایا: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (کہ حج و عمرہ کو پورا کرو اللہ کے لئے) اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی کوئی مرد یا عورت حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو اب احرام کے کپڑے اتار دینے سے یا نیت بدل دینے سے احرام سے نہ نکلے گا اور حج یا عمرہ پورا کرنا ہی ہوگا۔ حج فرض ہو یا نفل، عمرہ سنت ہو یا نفل، اپنا حج ہو یا حجِ بدل، بہر حال پورا کرنا ہی لازم ہے۔ اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ حج یا عمرہ کا احرام تو باندھ لیا لیکن احصار ہو گیا۔ کسی دشمن یا مرض کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور احرام میں رہنے میں دقت ہے اور جلد حلال ہونا چاہتا ہے تو حرم میں قربانی کا جانور ذبح کرادے جس کی تفصیل اُوپر گزر چکی۔ حرم میں جانور ذبح کرائے بغیر احرام سے نہیں نکل سکتا۔ اسی کو فرمایا: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کہ اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو جانور میسر ہو ذبح کردو۔ یا دوسرے سے ذبح کرادو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب ۶ھ میں عمرہ کرنے کے لئے اپنے صحابہؓ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور دشمنوں نے مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ جانور ذبح کر کے احرام سے نکل گئے تھے۔ یہ مقام حدیبیہ کا قصہ ہے جو مکہ معظمہ سے دس میل ہے اور جدہ کے پُرانے راستہ پر ہے۔ آج کل اس کو شمیسہ کہتے ہیں۔ یہ جو فرمایا وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (اور اپنے سروں کو مت مونڈو، یہاں تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پہنچ جائے) جگہ سے مراد حرم ہے۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ احصار کا جانور حرم میں ذبح کیا جائے، وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ احرام میں سر مونڈنا ممنوع ہے۔

سنن ترمذی (باب ما جاء فی الذی یهل بالحج فیکسر او یعرج) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا لنگڑا ہوگیا تو اس کو حلال ہونے کی اجازت ہے اور اس پر آئندہ ایک حج کرنا لازم ہے۔ (وقال الترمذی ہذا حدیث حسن اخرجہ الحاکم فی المستدرک ص ۴۷۰ ج ا وقال صحیح علی شرط الشیخین واقرہ الذہبی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب محصر قربانی کا جانور ذبح کرا کر حلال ہو جائے تو اس کے ذمہ قضا بھی لازم ہوتی ہے۔

احصار زائل ہو جانے کے بعد ...... اگر کسی شخص نے حج کا احرام باندھا تھا اور احصار ہو جانے کی وجہ سے حرم میں جانور ذبح کرا کے حلال ہو گیا پھر احصار دور ہو گیا اور ابھی اسی سال حج کا وقت باقی ہے لہٰذا اس نے دوبارہ احرام باندھ کر اسی سال حج کر لیا تو حج ادا ہو گیا۔ اور اب اس کی قضا واجب نہیں(۱) اور اگر اسی سال حج نہ کر سکا تو حج کی قضا واجب ہے، آئندہ سال یا جب بھی موقع ہو قضا کی نیت سے حج کرے اور اس کے ساتھ ایک عمرہ کرنا بھی واجب ہوگا۔ اگر قارن تھا اور اسی سال احرام کے مطابق حج وعمرہ نہ کر سکا تو اس پر قضا میں ایک حج اور دو عمرے واجب ہوں گے۔

مسئلہ ...... اگر حج فرض کے احرام میں احصار ہوا تھا اور حرم میں قربانی کرا کر احرام سے نکل گیا تھا تو جب بھی حج کرے قضا کی نیت کرنا واجب نہیں خواہ اسی سال حج کرے یا اس کے بعد۔

مسئلہ ...... ہر محصر پر قضا واجب ہے خواہ حج فرض ہو یا نفل، اپنا حج ہو یا حج بدل۔ اگر عمرہ کے احرام میں احصار ہوا تھا تو اس کی قضا بھی واجب ہے۔ اور اس پر صرف ایک ہی عمرہ کی قضا لازم ہے۔ جب چاہے عمرہ کر سکتا ہے۔ عمرہ کے ساتھ دوسرا عمرہ کرنا واجب نہیں (جبکہ حج قضا کرنے کی صورت میں اس کے ساتھ ایک عمرہ کرنا بھی واجب ہے)

فائت الحج کا حکم ...... اگر کسی شخص کو احصار ہو گیا اور وہ حرم میں قربانی کرا کے احرام سے نہ نکلا حتیٰ کہ حج کے دن گزر گئے یعنی احرام باندھنے کے بعد نو ذوالحجہ کو زوال سے لے کر صبح صادق ہونے تک عرفات میں نہ پہنچ سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا اور یہ شخص فائت الحج ہو گیا۔ جب حج فوت ہو جائے۔ عذر سے یا بلا عذر تو اسی احرام سے عمرہ کے افعال ادا کر کے یعنی طواف اور سعی کر کے بال مونڈا کر احرام سے نکل جائے پھر آئندہ سال یا جب موقع مل جائے اس حج کی قضا کر لے۔ اس قضا کے ساتھ عمرہ کرنا لازم نہیں۔

مسئلہ ...... عمرہ میں احصار تو ہو سکتا ہے لیکن عمرہ فوت نہیں ہوتا۔ عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد جتنے دن بھی گزر جائیں جب بھی عمرہ کرے گا ادا ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ پورے سال میں ادا ہو سکتا ہے۔ اگر عمرہ کے احرام کے بعد محصر ہو گیا اور ابھی قربانی کرا کے احرام سے نہیں نکلا تھا کہ احصار زائل ہو گیا تو اب جا کر عمرہ کر لے۔

عذر کی وجہ سے ارتکاب جنایت کا حکم ...... اگر کسی نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اور وہ سر منڈانے پر دکھ تکلیف کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ مثلاً سر میں جوئیں زیادہ پڑ گئیں یا پورے سر یا آدھے سر میں درد ہے تو ایسے شخص کو اختیار ہے کہ سر منڈا دے اور چونکہ یہ احرام پر جنایت ہو گی اس لئے یا تو حرم میں ایک سال کی بکری ذبح کر دے یا تین صاع گیہوں چھ مسکینوں کو دے دے۔ ہر مسکین کو آدھا صاع دے (آدھا صاع صدقہ فطر کے برابر ہوتا ہے) یا تین روزے رکھ لے، اگر مالدار ہو تب بھی اختیار ہے کہ ان تینوں کاموں میں سے جو صورت چاہے اختیار کر لے۔

---

۱) ...... المحصر بالحج اذا تحلل ثم زال الاحصار عنه وحج من عامه فليس عليه نية القضاء ولا عمرة عليه (عالمگیری ۲۵۶)

آیت شریفہ میں یہ جوفرمایا ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (یعنی جوشخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہوتو فدیہ دے دے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی کے جانور سے) اس میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام حدیبیہ میں میرے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے سر سے جوئیں گر رہی تھیں آپ نے فرمایا کیا یہ جانور تجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ سر مونڈ لو۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنا سر مونڈ لو اور تین دن کے روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا دے دو یا ایک بکری ذبح کر دو۔ تیسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ ہر مسکین کو آدھا صاع دے دینا۔ یہ سب روایات صحیح بخاری ص ۲۴۴ میں مذکور ہیں۔ آیت شریفہ میں جو فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ وارد ہوا ہے اس کی تفسیر حدیث شریف سے معلوم ہوگئی۔

مسئلہ...... مرض کی معذوری اور سر میں تکلیف ہونے کی مجبوری سے سر منڈانے کا فدیہ اوپر مذکور ہوا اگر کوئی شخص احرام میں ہو اور سخت بخار یا سخت سردی یا سخت گرمی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے سلا ہوا کپڑا پہن لے اور بقدر ایک دن یا ایک رات کے پہنے یا بقدر ایک دن ایک رات کے سر یا چہرہ ڈھانک لے یا علاج کی مجبوری سے زخم پر خوشبودار دوا استعمال کر لے تو اس صورت میں ایک دم واجب ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عذر کی وجہ سے جنایت کا ارتکاب کیا ہے اس لئے مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اگر بلا عذر ان جنایات کا ارتکاب کرے تو دم ہی دینا لازم ہے۔

مسئلہ...... اگر بیماری کی مجبوری کی وجہ سے کوئی ایسا کام کیا جسے بلا عذر کرنے میں صدقہ واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دن یا ایک رات سے کم سلا ہوا کپڑا پہنا تو اس صورت میں اختیار ہے کہ ایک مسکین کو آدھا صاع گیہوں دے دے یا اس کے عوض ایک روزہ رکھ لے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

پھر جب تم امن کی حالت میں ہو سو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہو تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دے، سو جو شخص نہ پائے

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ

تو تین دن کے روزے ہیں حج میں اور سات دن کے روزے ہیں جب کہ تم لوٹ آؤ، یہ پورے دس ہوئے، یہ اس کے لئے

لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

ہے جس کے گھر والے مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں، اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔

تمتّع اور قران کا بیان

جو شخص صرف حج کا احرام باندھے اور حج سے پہلے کوئی عمرہ نہ کرے اُس کا حج، حج افراد ہوگا۔ اور جو شخص حج سے پہلے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور پھر اُسی سال حج بھی کرے اس کی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ کر جائے پھر عمرہ کرنے کے

بعد سر مونڈ کر یا قصر کر کے احرام سے نکل جائے اور ایام حج کا انتظار کرتا رہے پھر ذوالحجہ کی آٹھ تاریخ کو مکہ معظمہ سے حج کا احرام باندھ لے اور حج کے سب کام پورے کرلے جیسا کہ حجِ افراد والا کرتا ہے۔ اس کو فقہاء کی اصطلاح میں حج تمتع کہا جاتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ میقات سے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھے اس کے بعد مکہ معظمہ آ کر عمرہ کرلے پھر حلق یا قصر کئے بغیر احرام میں ہی رہے۔ اور ایامِ حج میں حج کرے اور دس تاریخ کو جمرہ کبریٰ کی رمی کرنے کے بعد حلق یا قصر کر کے احرام سے نکل جائے۔ اس کو فقہاء کی اصطلاح میں قِران کہا جاتا ہے جو صرف حج کرے وہ مفرد ہے اور جو شخص حج اور عمرہ دونوں کو جمع کرنے کی پہلی صورت اختیار کرے وہ متمتع ہے اور جو شخص دوسری صورت اختیار کرے، وہ قارن ہے۔

متمتع اور قارن پر قربانی واجب ہے...... متمتع اور قارن پر جمرۂ کبریٰ کی رمی کرنے کے بعد حَلق یا قصر سے پہلے قربانی کرنا بھی واجب ہے اس کو دمِ شکر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں عبادتیں جمع کرنے کی سعادت نصیب فرمائی، اسی کو فرمایا فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا ہو جو قربانی کا جانور میسر ہو ذبح کردے)۔

قربانی حرم ہی میں ہونا ضروری ہے اور منیٰ میں ہونا افضل ہے اور بارہویں تاریخ کا سورج چھپنے سے پہلے پہلے قربانی کردینا واجب ہے۔ متمتع اور قارن جب تک قربانی نہیں کرے گا اُس وقت تک حلق یا قصر کرنا جائز نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جو لفظ تَمَتَّعَ فرمایا ہے یہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے اصطلاحی تمتع اور قِران دونوں کو شامل ہے۔ تمتع اور قِران کی قربانی میں ایک سال کا بکرا یا بکری یا پانچ سالہ اونٹ یا دو سالہ گائے کا ساتواں حصہ بھی کافی ہوسکتا ہے بشرطیکہ تمام شرکاء کی نیت ثواب کی ہو۔

تمتع اور قِران کی قربانی کا بدل...... اگر متمتع یا قارن کے پاس قربانی کا جانور نہیں اور پیسے بھی نہیں تا کہ جانور خرید کر قربانی کرے تو اس کے لئے یہ آسانی ہے کہ عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد ذوالحجہ کی دسویں تاریخ سے پہلے پہلے تین روزے رکھ لے چاہے متفرق طور پر رکھے چاہے متواتر (لگاتار) رکھے۔ مگر لگاتار رکھنا مستحب ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ ذوالحجہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ کو رکھ لے اور اگر اندیشہ ہو کہ نویں کا روزہ رکھنے سے وقوفِ عرفات کے موقع پر ضعف ہو جائے گا تو اس سے پہلے ہی تینوں روزے رکھ کر فارغ ہو جائے۔ تین روزے تو یہ ہوئے جو حج سے پہلے رکھ لئے اور سات روزے تیرہویں تاریخ کے بعد رکھ لے۔ خواہ مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہو خواہ اپنے گھر یا اور کسی جگہ چلا گیا ہو۔ ان روزوں کو بھی متفرق طور پر رکھ سکتا ہے اور لگاتار رکھنا افضل ہے۔ یہ کل دس روزے ہو گئے جو قربانی کا بدل ہیں۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

مسئلہ...... اگر کسی نے دس ذوالحجہ سے پہلے تین روزے نہ رکھے اور نویں تاریخ گزر گئی تو اب روزے رکھنے سے تمتع اور قران کی قربانی کا بدل نہیں ہوسکتا بلکہ اب قربانی ہی کرنا متعین ہوگیا۔ اگر قربانی کرنے پر قدرت نہیں ہے تو حلق یا قصر کرا کر حلال ہو جائے پھر اگر بارہ تاریخ کے اندر قربانی کرنے پر قادر ہو گیا تو قربانی کردے اور ایک دم ذبح سے پہلے حلق یا قصر کرنے کا دے اور اگر بارہ تاریخ کے بعد قربانی پر قادر ہوا تو تین دم دینے ہوں گے۔ ایک دم شکر (یعنی تمتع یا قِران کی قربانی) اور ایک ذبح سے پہلے حلق یا قصر کرنے کا، اور ایک ایامِ نحر سے ذبح کو مؤخر کرنے کا۔

مسئلہ...... تمتع کی ایک صورت یہ ہے کہ محرم اپنے ساتھ قربانی کا جانور بھی لایا ہو ایسے محرم کو سائق الھدی کہتے ہیں۔ جو متمتع سائق الھدی ہو مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کرلے لیکن حلق اور قصر نہ کرے ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ آنے تک احرام ہی میں رہے پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام

باندھ لے اور حج افراد کرنے والوں کی طرح حج کرے اور دسویں تاریخ کو جمرۂ کبریٰ کی رمی اور ذبح کے بعد حلق یا قصر کر کے دونوں احراموں سے ایک ساتھ نکل جائے۔

مسئلہ...... جو شخص مفرد ہو اس پر حج کی قربانی واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کہ وہ قربانی کر دے۔ اگر قربانی کرے تو افضل یہ ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمرۂ کبریٰ کے بعد پہلے ذبح کرے پھر حلق یا قصر کرے البتہ رمی سے پہلے حلق یا قصر جائز نہیں ہے۔ اگر مفرد نے قربانی سے پہلے حلق یا قصر کر دیا تو افضل کے خلاف ہوگا۔

مسئلہ...... دم قران یا تمتع کی قربانی عید الاضحیٰ کی قربانی کے قائم مقام نہیں ہے۔ عید الاضحیٰ کی قربانی مقیم پر واجب ہے مسافر پر واجب نہیں۔ جو لوگ مکہ مکرمہ میں حج سے پہلے پہنچ کر پندرہ روز قیام کرنے کی نیت کر چکے ہیں اُن پر عید الاضحیٰ کی قربانی بھی واجب ہے مگر اس کے لئے حرم میں ہونا شرط نہیں۔ وطن میں بھی خط بھیج کر یا پہلے سے کہہ کر کرائی جا سکتی ہے۔ پھر فرمایا ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یہ اس کے لئے ہے کہ جس کے گھر والے مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں)۔ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ ذٰلک کا مشار الیہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ اشارہ مَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کی طرف ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اشارہ جمع بین النسکین کی طرف ہے جو مَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ میں مذکور ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے فرمایا کہ تمتع اور قران اُن لوگوں کے لئے جائز نہیں ہے جو مکہ معظمہ میں یا حرم میں یا حل میں رہتے ہیں بلکہ جو شخص مکہ مکرمہ میں اس وقت موجود ہو جب عید کا چاند ہوا تو اس کے لئے بھی تمتع اور قران جائز نہیں ہے ہاں اگر یہ لوگ حج کے مہینوں سے پہلے میقات سے باہر کہیں چلے جائیں پھر اشہر حج میں احرام باندھ کر مکہ مکرمہ آئیں تو قران اور تمتع کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ کہ اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے چونکہ ہر کام اُسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ کا خوف دل میں ہو اس لئے بار بار تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے حج کے متعدد احکام بیان فرما کر یہاں بھی وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ شدید العقاب ہے۔ نافرمانی پر عذاب ہونے کا قانون ہے۔ لہٰذا ہر نافرمانی سے بچو۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ

حج کا وقت چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، سو جس شخص نے ان میں حج کو اپنے ذمہ لازم کر لیا تو نہ کوئی فحش بات ہے نہ فسوق ہے نہ کسی

فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ

قسم کا جھگڑا ہے، اور جو بھی کوئی نیک کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اُس کو جانتا ہے اور زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو چونکہ بہتر زادِ راہ بچا رہنا ہے اور اے عقل والو!

يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

مجھ سے ڈرتے رہو۔

حج کے مہینوں کا تذکرہ اور حج کے بعض احکام

حج کا وقت چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کے چند مہینے اللہ پاک کی طرف سے مقرر ہیں جو معروف و مشہور مہینے ہیں۔ ان میں ماہِ شوال اور ماہِ ذی قعدہ اور شروع کے دس دن ذوالحجہ کے ہیں افعالِ حج تو ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے شروع ہوتے

ہیں لیکن شوال اور ذی قعدہ کو حج کے مہینوں میں اس لئے شمار کیا گیا کہ ان میں اگر کوئی شخص عمرہ کرے اور اس کے بعد اسی سال حج بھی کرے تو وہ عمرہ مل کر حج تمتع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قربانی واجب ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص شوال سے پہلے عمرہ کرے تو وہ عمرہ مفردہ ہوگا اور اس کی وجہ سے حج تمتع نہ بنے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو تمتع یا قران کی قربانی کے عوض روزے رکھنے ہیں تو وہ حج کے کسی بھی مہینہ میں عمرہ کے احرام کے بعد تین روزے رکھ سکتا ہے جو ہدی کے عوض حج سے پہلے رکھے جاتے ہیں اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھ لے تو احرام تو منعقد ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔ یہ سب احکام اس پر متفرع ہیں کہ حج کے مہینے شوال کا چاند دیکھنے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ حج اُن لوگوں پر فرض ہے جو حج کی استطاعت رکھتے ہوں اور جب حج کی استطاعت ہو جائے تو حج کرنے میں جلدی کرنی چاہیے لیکن اگر کسی نے دیر لگائی اور زندگی بھر میں کبھی بھی حج کر لیا تو وہ حج ادا ہی ہوگا فرض ہوتے ہی پہلے سال نہ کرنے سے یہ نہ کہا جائے گا کہ حج قضا ہو گیا۔ جب کسی سال حج کا احرام باندھ لیا تو احرام باندھنے والے نے اپنے ذمہ حج کرنا فرض کر لیا اب حج کرنا ہی ہوگا اور بغیر حج کئے احرام سے نہیں نکل سکتا (ہاں اگر احصار کی صورت پیش آ جائے تو اور بات ہے)۔ احرام کی ممنوعات چند صفحات پہلے بیان ہو چکی ہیں ان ممنوعات میں وہ چیزیں بھی ہیں جو غیر احرام کی حالت میں جائز ہیں۔ مرد کو سلے ہوئے کپڑے پہننا، سر اور چہرہ ڈھکنا، بال اور ناخن کاٹنا، میاں بیوی والے تعلقات کو کام میں لانا (جماع، بوس و کنار اور اس سلسلے کی بے تکلفی والی باتیں کرنا) یہ چیزیں غیر احرام کی حالت میں جائز ہیں لیکن احرام میں جائز نہیں۔ وقوف عرفات سے پہلے جماع کرلے تو حج فاسد ہو جاتا ہے اور شہوت سے بوس و کنار کرے تو دم واجب ہوتا ہے۔

حج میں گناہوں سے بچنے کی تاکید...... آیت بالا میں جو فلا رفث فرمایا۔ اُس میں ان سب چیزوں کی ممانعت فرما دی جو شوہر اور بیوی کے درمیان زوجیت کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ بھی فرمایا۔ فسوق نافرمانی کو کہا جاتا ہے۔ لفظ فاسق اسی سے نکلا ہے۔ حج میں نافرمانی نہیں اس کا عموم ان سب نافرمانیوں کو شامل ہے۔ جو احکام احرام کی خلاف ورزی کی صورت میں ہوں اور جو باتیں احرام میں بھی گناہ ہیں اور غیر احرام میں بھی گناہ ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف کرنا وہ بھی سب اس کے عموم میں داخل ہیں، یہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سے لوگ حج کرنے نکلتے ہیں تو فرض نمازیں تک چھوڑ دیتے ہیں اور بہت سے لوگ حرام مال ہی سے حج کرنے کو چل دیتے ہیں۔ عورتیں بغیر محرم کے حج کے لئے روانہ ہو جاتی ہیں۔ عین احرام کے وقت غیبتیں بھی جاری رہتی ہیں اور احرام میں بدنظری کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اس سے بھی احتیاط نہیں برتی جاتی حالانکہ لَا فُسُوْقَ کے عموم کا تقاضا ہے کہ احرام میں ہر گناہ سے خصوصیت کے ساتھ پرہیز کریں گو گناہوں سے بچنا ہمیشہ ہی لازم ہے۔ حجاج کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مبارک ایام میں مقدس سرزمین میں حدودِ حرم میں جہاں صرف عبادت ہی کے لئے آئے ہیں اور بار بار تلبیہ پڑھ رہے ہیں۔ احرام کے لباس میں ہیں پھر بھی چھوٹے بڑے گناہوں میں ملوث رہتے ہیں۔ داڑھی مونڈنے کا گناہ تو ہزاروں حجاج کرتے ہیں۔ احرام سے نکلنے کے لئے ذرا بہت بال کاٹ دیتے ہیں جس سے احرام سے نکلتے بھی نہیں۔ سر کے بال تو منڈاتے نہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے اور جو قصر سے افضل ہے لیکن وہیں منیٰ میں بیٹھ کر داڑھی ضرور مونڈ دیتے ہیں عین وقوف عرفات کے موقع پر گانے سننے میں مشغول رہتے ہیں۔ حالانکہ قبولیتِ حج کی شرط یہ ہے کہ رفث اور فسوق کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اس بارے میں حدیث صریح آیت واتموا الحج کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

لڑائی جھگڑے سے بچنے کا حکم...... فسوق کی نفی کے بعد جدال کی نفی فرمائی۔ جدال عربی زبان میں لڑنے جھگڑنے کو کہتے ہیں۔

سفر حج میں اول سے اخیر تک بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جہاں رفقاء سفر سے اور حجاج سے لڑنے کو جی چاہتا ہے کہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور کہیں پانی لینے کی بھیڑ میں دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ حجاج لڑ پڑتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ معمولی سی باتیں جن پر ہمیشہ اپنے گھروں میں آپس میں مسامحت کر لیتے ہیں اُن میں سے کوئی صورت حج میں پیش آ جائے تو دل کھول کر لڑائی لڑتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک ابتلاء ہوتا ہے بعض حجاج نے بتایا کہ اندر سے بار بار نفس میں لڑائی کے لئے اُبھار ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سنیچر کے دن بنی اسرائیل کے لئے مچھلیاں سمندر کی تہہ سے اوپر آ جاتی تھیں لیکن اس دن پکڑنا منع تھا اور دوسرے دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ ابتلاء کے موقع پر ہر مسلمان اپنے نفس پر قابو کرے اور شریعت کو سامنے رکھے، قرآن وحدیث کی ہدایت کا اتباع کرے۔

جو بھی خیر کا کام کرو اللہ کو معلوم ہے ...... یہ جو فرمایا وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ اس میں یہ بتا دیا ہے کہ جو کچھ خیر کا کام کرو گے۔ اللہ اُسے جان لے گا اور اُس کا ثواب دے گا۔ احرام کی ممنوعات سے بچو اور ان دنوں کو غنیمت جانو، عبادت تلاوت، ذکر اور اعمال صالحہ میں لگاؤ۔ یہ چیزیں ضائع ہونے والی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان سب کا ثواب ملے گا۔

مخلوق سے سوال کرنے کی ممانعت ...... پھر فرمایا وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى کہ زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو کیونکہ بہتر زادِ راہ بچا رہنا ہے (بچے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے سوال نہ کیا جائے) اسباب النزول ص ۵۵ میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یمن کے لوگ حج کو آتے تھے لیکن سفر کے لئے انتظام کر کے نہیں چلتے تھے (زادِ راہ پاس نہ ہوتا تھا) اور کہتے تھے کہ ہم توکل والے ہیں جب مکہ معظمہ پہنچ جاتے تو لوگوں سے سوال کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ توشہ ساتھ لیا کرو، کیونکہ بہتر توشہ یہ ہے کہ لوگوں سے سوال نہ کیا جائے۔ (صحیح بخاری ص ۲۰۶ ج ۱)

چونکہ ایام حج میں عموماً مال والے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان دنوں میں سوال کرنے والوں کو خوب مواقع ملتے ہیں اور بہت سے لوگ حج اور عمرہ کا سفر ہی حجاج سے مانگنے کے لئے کرتے ہیں بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وقوفِ عرفات میں سارا وقت خیمہ خیمہ گھومنے اور لوگوں سے سوال کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح (ص ۱۶۳ ج ۱) میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو عرفات میں لوگوں سے مانگ رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو ایک درّہ مارا اور فرمایا کیا تو آج کے دن اور اس جگہ میں غیر اللہ سے سوال کرتا ہے۔

آخر میں تقویٰ کا حکم دیا اور فرمایا وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (کہ اے عقل والو! مجھ سے ڈرو)۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، گناہوں سے بچنا ہر کام میں ضروری ہے اور اس طرح ہر کام خوبی کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔

(کما فی الحدیث علیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ، مشکوٰۃ ص ۴۱۵ ج ۲)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ

تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ معاش تلاش کرو جو تمہارے رب کی طرف سے ہے، پھر جب تم عرفات سے

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ

واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر حرام کے نزدیک، اور اس کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور حقیقت میں بات یہ

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

ہے کہ تم اس سے پہلے محض ناواقف تھے۔

حج میں خرید و فروخت کی اجازت اور مشعر حرام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم

اس آیت میں اوّل تو حج کے موقع پر کسب معاش کی اجازت دی اور فرمایا کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فضل تلاش کرنے میں تجارت اور محنت مزدوری سب داخل ہیں۔ صحیح بخاری ص ۶۴۸ ج ۲ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت میں لوگوں کی تجارت گاہیں تھیں۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو مسلمانوں نے اُن میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا۔ یہاں تک کہ آیت لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ نازل ہوگئی جس میں موسمِ حج میں تجارت کرنے کی اجازت دی گئی۔

مستدرک ص ۴۴۹ ج ۱ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میں حج کے موقع پر (اونٹ وغیرہ) کرائے پر لے جاتا ہوں اور لوگ یوں کہتے ہیں کہ تیرا کوئی حج نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کیا تو احرام نہیں باندھتا، تلبیہ نہیں پڑھتا، طواف نہیں کرتا، عرفات جا کر واپس نہیں آتا، رمی جمار نہیں کرتا؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ میں یہ تو سب کام کرتا ہوں۔ فرمایا پھر تو تیرا حج ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا جو سوال تو نے مجھ سے کیا ہے آپؐ نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ آیت لَيْسَ عَلَيْكُمْ (الآیۃ) نازل ہوگئی اور آپؐ نے اس شخص کو بلا کر یہ آیت سنا دی اور فرمایا کہ تیرا حج ہوگیا۔ (قال الحاکم هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه وأقره الذهبي)

فتح الباری ص ۵۹۴ ج ۳ میں لکھا ہے کہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کی صبح سے بیس دن تک مقامِ عکاظ میں میلہ لگاتے اور تجارت کرتے تھے پھر دس دن مقام مجنہ میں بازار لگاتے تھے پھر یکم ذوالحجہ سے آٹھ ذی الحجہ تک مقام ذی المجاز میں قیام کرتے اور کاروبار جاری رکھتے تھے۔ عکاظ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نخلہ اور طائف کے درمیان واقع تھا اور مجنہ کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ مرالظہر ان کے قریب تھا اور ذوالمجاز کے بارے میں لکھا ہے کہ عرفات کے قریب ذرا ایک جانب کو ہٹ کر تھا۔ آیتِ بالا میں حج کے موقع پر کسبِ معاش کی جو اجازت دی گئی ہے۔ اس میں اندازِ بیان ایسا اختیار فرمایا ہے کہ اگر کوئی تجارت کرے تو اس کی اجازت ہے ایسی کوئی ترغیب نہیں دی گئی کہ اس کو حج کا جزو ہی بنالیں اور تجارت کو حج کے کاموں میں داخل کر لیں کوئی شخص اپنی نیت اصلیہ کے اعتبار سے حج کے لئے ہی گیا اور موقع پا کر خصوصاً ضرورت کے وقت تجارت بھی کر لی تو اس کی گنجائش آیت شریفہ سے معلوم ہوتی ہے۔ سفر حج ہی کے لئے ہونا چاہیئے۔ اصل سفر تجارت کا ہو اور حج نمبر دو پر ہو۔ ایسا نہ کیا جائے۔

قال الحافظ فی الفتح ص ۵۹۵ ج۳ واستدل بهذا الحديث على جواز البيع والشراء للمعتكف قياسا على الحج والجامع بينهما العبادة وهو قول الجمهور وعن مالک كراهة ما زاد على الحاجة كالخبز اذا لم يجد ما يكفيه وكذا كرهه عطاء و مجاهد والزهرى ولا ريب انه خلاف الاولى والآية انما نفت الجناح ولا يلزم من نفيه نفى اولوية مقابله والله اعلم اھ (فتح الباری میں ہے۔ اس حدیث سے حج پر قیاس کرتے ہوئے معتکف کیلئے بھی بیع وشراء کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے وجہ جامع حج اور اعتکاف کے مابین دونوں کا عبادت ہونا ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ امام مالکؒ سے مروی ہے کہ

حاجت سے زائد شی کی خرید و فروخت مکروہ ہے جیسے کہ روٹی اگر بقدر کفایت نہ ملے (تو مزید روٹی بقدر کفایت خریدنا مکروہ نہیں) نیز عطاء، مجاہد اور زہری نے بھی اسے مکروہ جانا ہے۔ اور یہ بات تو بلا شک ہے کہ مسجد میں بیع و شرا خلاف اولیٰ ہے اور آیت میں گناہ کی نفی ہے تو گناہ کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلاف اولیٰ کی بھی نفی ہو جائے)

صاحب روح المعانی ص ۸۱ ج ۲ میں لکھتے ہیں کہ چونکہ پچھلی آیت میں جدال سے منع فرمایا اور تجارت میں کچھ جھگڑا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ قیمت کی کمی بیشی کے سلسلہ میں نزاع ہو سکتا ہے۔ اس لئے ممکن تھا کہ بعض اذہان جدال کی ممانعت سے تجارت کی ممانعت کی طرف چلے جاتے اس لئے تجارت کی اجازت دے دی۔ تجارت چاہے تو کرے لیکن جدال اور نزع سے بچے، پھر فرمایا فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ۔ (پھر جب تم عرفات سے واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر الحرام کے نزدیک) اس میں عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں اللہ کے ذکر کرنے کا حکم فرمایا۔ عرفات مزدلفہ سے تین میل مشرق کی طرف ہے یہ ایک بہت بڑا میدان ہے۔ یہاں پر ٹھہرنا حج کا سب سے بڑا رکن ہے حج کے احرام کے ساتھ کوئی شخص ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو زوال کے بعد سے لے کر آنیوالی رات کی صبح صادق تک عرفات میں پہنچ جائے تو اس کا حج ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرائض حج میں سے صرف طواف زیارت باقی رہ جاتا ہے۔ عرفات میں ذکر اور دعا میں مشغول رہتے ہیں۔ ظہر و عصر کی نماز بھی اسی وقفہ میں پڑھتے ہیں۔ سورج چھپ جانے کے بعد مزدلفہ کے لئے واپس ہوتے ہیں (جب عرفات گئے تھے تو مزدلفہ سے ہوتے ہوئے گئے تھے۔ کیونکہ منیٰ سے عرفات کو جاتے ہوئے درمیان میں مزدلفہ آتا ہے) مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی جاتی ہے۔ عرفات میں یا راستہ میں نماز مغرب پڑھنا جائز نہیں۔ سورج چھپ جانے کے باوجود قصداً نماز مغرب کو مؤخر کرنا واجب ہے۔ مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت میں مغرب پڑھی جائے۔ اگر کسی نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھ لی تو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ مغرب عشاء دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ کر رات کو مزدلفہ میں رہنا سنت ہے۔ اور صبح صادق کے بعد تھوڑی دیر مزدلفہ میں وقوف کرنا واجب ہے۔ اور سنت یہ ہے کہ دیر تک وقوف کرے۔ یہاں تک کہ سورج نکلنے میں تھوڑی دیر رہ جائے تو منیٰ کے لئے روانہ ہو جائے۔ المشعر الحرام مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام جبل قزح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی۔ پھر آرام فرمایا، اس کے بعد صبح صادق ہوتے ہی نماز فجر اندھیرے میں پڑھ کر المشعر الحرام کے پاس تشریف لے گئے اور قبلہ رخ ہو کر خوب زیادہ روشنی پھیل جانے تک دعا اور تکبیر و تہلیل میں اور توحید باری تعالیٰ، ذکر کرنے میں مشغول رہے۔ پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کے لئے روانہ ہو گئے۔ (صحیح مسلم ص ۳۹۹ ج ۱)

مزدلفہ سارا وقوف کی جگہ ہے۔ البتہ المعشر الحرام کے قریب وقوف کرنا افضل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ... وقفت ههنا وجمع كلها موقف (صحیح مسلم ص ۴۰۰ ج ۱)

چونکہ سارا ہی مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے اور المشعر الحرام اسی میں ہے اس لئے بعض حضرات نے پورے مزدلفہ کو المشعر الحرام سے تعبیر کر دیا ہے۔ (كما ذكر في الدر المنثور ص ۲۲۴ ج ۱ عن عبدالله بن عمرو و عبدالله بن عمر رضي الله عنهم) مزدلفہ میں رات کا وقت گزاریں، اور صبح صادق کے بعد منیٰ کے لئے روانہ ہونے سے پہلے جو وقت ہے اس میں خوب اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں اور دعائیں مانگیں۔ پھر ارشاد فرمایا وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ (اور اس کو یاد کرو جیسا کہ اس نے تم کو ہدایت دی)۔ یعنی جس طرح اس نے تم کو ہدایت سے نوازا ہے اور راہ حق پر ڈالا ہے تم بھی اسے خوب اچھی طرح سے یاد کرو اور بعض مفسرین نے اس کا یہ معنی بتایا ہے کہ اللہ کا ذکر

اُسی طریقے پر کرو جو طریقے اس نے سکھائے اور بتائے ہیں۔ دونوں معانی صاحب روح المعانی نے لکھے ہیں اور تیسرا معنی یہ لکھا ہے اُذکروہ وعظموہ لأجل هدایته السابقة منه تعالٰی لکم یعنی تم اُس کا ذکر کرو اور عظمت کے ساتھ اُسے یاد کرو اس وجہ سے کہ اُس نے تم کو پہلے سے ہدایت دی ہے۔ پھر فرمایا وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ تم اس سے پہلے محض ناواقف تھے) یعنی ایمان کو اور طاعات کو نہیں جانتے تھے اور جاہلیت میں جو حج کرتے تھے اس میں جو ذکر کرتے تھے اول تو آباؤ اجداد کا ذکر ہوتا تھا اور تھوڑا بہت اللہ کا نام لے لیتے تھے۔ آخرت میں وہ بھی مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی کام نہیں دیتی۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

پھر تم اسی جگہ سے واپس آؤ جہاں سے دوسرے لوگ واپس آئیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا کہ قریش اور وہ لوگ جو ان کے دین پر تھے (بنو عامر، بنو ثقیف، بنو خزاعہ) یہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں حج کرتے تھے تو عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ یہ لوگ مزدلفہ میں ہی ٹھہر جاتے تھے اور وہیں سے واپس ہو جاتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ عرفات میں پہنچیں، اور وہاں وقوف کریں پھر وہاں سے واپس آئیں۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ میں یہی حکم مذکور ہے۔ (صحیح بخاری ص ۶۴۸ ج ۲)

تفسیر معالم التنزیل ص ۱۷۵ ج ۱ میں ہے کہ قریش اور ان کے حلفاء اور جو اُن کے دین پر تھے مزدلفہ ہی میں ٹھہر جاتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ ہم اللہ والے اور اس کے حرم کے رہنے والے ہیں۔ لہٰذا ہم حرم کو پیچھے نہ چھوڑیں گے اور حرم سے نہ نکلیں گے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھتے تھے کہ تمام لوگوں کے ساتھ عرفات میں ٹھہریں۔ جب دُوسرے قبائل عرفات میں وقوف کر کے واپس آتے تھے تو قریش اور اُن کے حلفاء مزدلفہ سے ان سب لوگوں کے ساتھ واپس آ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ عرفات میں وقوف کریں پھر وہاں سے سب لوگوں کے ساتھ مزدلفہ میں آئیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی قریشی تھے اس لئے حجۃ الوداع کے موقع پر قریش کو اس میں کچھ شک نہ تھا کہ آپ ہماری طرح مزدلفہ ہی میں ٹھہر جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ عرفات پہنچ گئے۔ (کما فی صحیح مسلم ص ۳۹۷ ج ۱)

آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کیا اور سب صحابہ بھی آپ کے ساتھ عرفات پہنچے اور پھر وہاں سے آفتاب غروب ہونے پر واپس ہو گئے۔

لفظ ثم جو اس آیت میں وارد ہوا ہے اس کی وجہ سے بعض اہل تفسیر نے یوں کہا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں مزدلفہ سے منٰی کو واپس ہونے کا ذکر ہے۔ کیونکہ عرفات سے واپس ہونے کا ذکر گزشتہ آیت میں ہو چکا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ثم واو کے معنی میں ہے۔ صاحب معالم التنزیل نے یہ تینوں قول لکھے ہیں بظاہر یہ تیسرا قول زیادہ مناسب ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ثم ترتیب ذکری کے لئے ہے ترتیب عملی کے لئے نہیں ہے۔ (قال ابن کثیر ص ۲۴۲ ج ۱) ثم ههنا لعطف خبر علی خبر و ترتیبه علیه کانه تعالٰی امر الواقف بعرفات ان یدفع الی المزدلفة لیذکر الله تعالٰی عند المشعر الحرام وامره ان یکون وقوفه مع جمهور الناس بعرفات الخ۔ (لفظ ثم اس مقام پر خبر کا عطف خبر پر کرنے کیلئے ہے تا کہ ترتیب قائم ہو

جائے۔ گویا عرفات میں ٹھہرنے والے کو حکم ملا کہ وہ یہاں سے مزدلفہ جائے تا کہ مشعر الحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کر سکے اور یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام لوگوں کے ساتھ عرفات میں ٹھہرے)

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

سو جب تم پورا کر لو اپنے حج کے کاموں کو سو اللہ کو یاد کرو، جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے رہے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ذکر کرو۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰

سو بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں دے دیجئے، اور ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں،

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بہتری عطا فرمائیے اور آخرت میں بہتری عنایت کیجئے اور ہم کو دوزخ کے عذاب

النَّارِ ۝۲۰۱ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲

سے بچائیے۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے لئے بڑا حصہ ہے ان کے اعمال کی وجہ سے اور اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

النصف

ایام منیٰ میں ذکر اللہ میں مشغول ہونے کا حکم

دسویں ذوالحجہ کو مزدلفہ سے واپس آ کر جمرہ کبریٰ کو کنکریاں ماری جاتی ہیں اور پھر حلق یا قصر کر کے احرام سے نکل جاتے ہیں اس کے بعد طوافِ زیارت اور دو تین دن کی رمی یعنی کنکریاں مارنا باقی رہ جاتا ہے۔ زمانۂ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ حج سے فارغ ہو کر اپنے باپ دادوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور مقابلہ میں اشعار پڑھتے تھے اور اپنے قبیلوں کی بڑائی بیان کرتے تھے۔

اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ حج کے کاموں سے فارغ ہو کر اللہ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ کو یاد کرو۔ (روح المعانی ص۸۹ ج۲)

صاحب معالم التنزیل نے مَنَاسِكَكُمْ کا ترجمہ نَسَائِكَكُمْ کیا ہے۔ اور آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ اور قربانی کے جانور ذبح کر لو تو اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔

وذٰلک بعد رمی جمرة العقبة والاستقرار بمنٰی (ص۱۷۸ ج۱)

پھر دُعا کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ حج میں بکریاں، اُونٹ، گائیں اور غلام مانگا کرتے تھے۔ صرف طالبِ دنیا تھے۔ آخرت کا انہیں کچھ بھی دھیان نہ تھا۔ یہ لوگ یوں دُعا کرتے تھے۔ اے اللہ! میرے باپ کا عظیم قبہ تھا، بڑا پیالہ تھا اور وہ کثیر المال تھا مجھے بھی اسی قدر مال عطا فرما جتنا اُس کو دیا تھا۔ (معالم التنزیل ص۱۷۶ ج۱)

ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے آخرت میں ذرا سا بھی حصہ نہیں ہے۔ پھر اہلِ ایمان کی دعا کا تذکرہ فرمایا کہ وہ یوں دُعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی عطا فرما، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اہلِ

ایمان دونوں جہاں کی کامیابی، خوشحالی اور خوبی و بہتری کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ لفظ حَسَنَۃٌ، حَسَنٌ کی تانیث ہے جو ہر خوبی اور ہر بہتری کو شامل ہے مذکورہ دُعا میں دنیا کی ہر خوبی اور آخرت کی ہر خوبی اور بہتری کا سوال ہے اور اس میں بڑی جامعیت ہے۔

صحیح بخاری ص ۹۴۵ ج ۲ میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دُعا کیا کرتے تھے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ. حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیؓ کی عیادت کی جن کی آواز بہت ہی زیادہ کمزور ہوگئی تھی اور وہ چوزہ کی طرح دُبلے ہوگئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم اللہ سے کوئی دعا کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں میں یہ دعا کرتا تھا کہ یا اللہ! مجھے جو کچھ سزا آخرت میں دینی ہو وہ دنیا میں ہی دیدیجئے۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! تم میں اس کی طاقت نہیں ہے تم نے دُعا میں یوں کیوں نہ کہا رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ط

راوی حدیث حضرت انس فرماتے ہیں کہ ان صاحب نے اس کے بعد یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطا فرمادی۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۳ ج ۲) سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان طواف کرتے ہوئے ربنا اٰتنا فی الدنیا (آخر تک) پڑھتے تھے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَمَنْ

اور اللہ کا ذکر کرو چند دنوں میں پھر جو شخص دو دن میں تعجیل کرے اس پر کچھ گناہ نہیں، اور جو شخص تاخیر کرے

تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اس پر کچھ گناہ نہیں اس شخص کے واسطے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

ایام تشریق میں ذکر اللہ اور رمی جمار کی مشغولیت

آیتِ بالا میں اول تو یہ فرمایا کہ چند دنوں میں اللہ کا ذکر کرو۔ اِن دنوں سے ایامِ تشریق مراد ہیں جن میں قربانیاں کی جاتی ہیں اور حجاج کا منٰی میں قیام ہوتا ہے اور جمرات کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس سے پہلے مزدلفہ میں ذکر کرنے کا حکم فرمایا اور عرفات میں تو ذکر اور دعا ہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمرات کو کنکریاں مارنا اور صفا مروہ کی سعی کرنا اللہ کا ذکر قائم کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ مؤمن بندوں کو ہر وقت اس میں لگا رہنا چاہیئے، بعض خاص ایام اور خاص اوقات میں ذکر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ سب سے بڑی عبادت نماز ہے اس کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ (نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو) جیسا کہ سب جانتے ہیں نماز اوّل سے آخر تک ذکر ہی ہے، نماز سے پہلے اذان و اقامت ہے وہ بھی ذکر ہے، نماز کے بعد تسبیحات اور دعائیں ہیں یہ بھی ذکر ہے۔ حج سراپا ذکر ہے، تلبیہ ذکر ہے، طواف میں ذکر ہے، سعی میں ذکر ہے، عرفات میں ذکر ہے، مزدلفہ میں ذکر ہے، ایامِ منٰی میں ذکر ہے، رمی کرتے وقت ذکر ہے، قربانی کرتے وقت ذکر ہے۔

سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے تمام احوال و اشغال میں افکار و ادعیہ کی تعلیم دی۔ درحقیقت ذکر ہی اس دنیا کی رُوح ہے جس دن اللہ کا ذکر نہ ہوگا یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ صحیح مسلم ص ۸۴ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایسا وقت نہ آ جائے کہ زمین میں اللّٰہ اللّٰہ نہ کہا جائے۔ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ کان یذکر اللہ فی کل احیانہ. (صحیح مسلم) منیٰ کے قیام کے دوران خوب اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں۔ تفسیر روح المعانی ص ۹۳ ج ۲ میں ہے واذکروا اللہ ای کبروہ أدبار الصلوات و عند ذبح القرابین وعند رمی الجمار وغیرھا۔ یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرو نمازوں کے بعد اور قربانی کرتے وقت اور رمی جمار وغیرہ کے وقت۔ پھر فی ایام معدودات کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا وھی ثلثة ایام التشریق وھو المروی فی المشھور عن عمر وعلی وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھم۔

اور تفسیر معالم التنزیل ص ۱۷۱ ج ۱ میں لکھا ہے ومن الذکر فی أیام التشریق التکبیر (یعنی ان دنوں کے ذکر میں سے یہ بھی ہے کہ ان میں تکبیر کہی جائے) پھر لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نمازوں کے بعد منیٰ میں تکبیر کہتے تھے اور مجلس میں بھی اور بستر پر ہوتے ہوئے بھی اور راستہ میں بھی۔ اھ تکبیر تشریق بھی ان ایام میں مشروع ہے، منیٰ میں موجود ہوں یا اپنے وطن میں مقیم ہوں فرض نمازوں کے بعد اس کا پڑھنا واجب ہے۔ مرد زور سے تکبیر تشریق پڑھیں اور عورتیں آہستہ کہیں۔ یہ تکبیر نویں تاریخ کی فجر سے لیکر تیرہویں تاریخ کی عصر تک پڑھی جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح منقول ہے۔ ایام تشریق میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لا تصوموا فی ھذہ الأیام فانھا ایام أکل وشرب وذکر اللہ۔ (صحیح مسلم ص ۳۶۰ ج ۱)

یعنی ان دنوں میں روزہ نہ رکھو، کیونکہ یہ دن کھانے پینے کے اور اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں۔

رمی جمار کے بعض مسائل ...... ذکر کا حکم فرمانے کے بعد رمی جمار کے بعض مسائل بیان فرمائے جس کی تشریح یہ ہے کہ دسویں ذی الحجہ کو صرف جمرۂ کبریٰ کی رمی کی جاتی ہے۔ اس کا وقت سورج نکلنے کے بعد سے لے کر آنے والی صبح صادق تک ہے۔ لیکن رات میں کنکریاں مارنا قوت اور صحت والوں کے لئے مکروہ ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کی کنکریاں مارنے کا وقت زوالِ آفتاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور وہ بھی آنیوالی صبح صادق تک رہتا ہے، قوت وصحت والوں کے لئے رمی کرنا ان دونوں راتوں میں بھی مکروہ ہے۔ گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کی جاتی ہے۔ دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی رمی کرنا واجب ہے۔ منیٰ میں چھوٹے چھوٹے تین منارے سے بنائے ہوئے ہیں ان کو جمرات کہتے ہیں جو جمرۃ کی جمع ہے پہلا جمرہ مسجد خیف کے قریب ہے اس کو جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ صغریٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو جمرہ ہے اُسے جمرۂ وسطیٰ کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جو جمرہ ہے اس کو جمرۂ کبریٰ اور جمرۂ اُخریٰ اور جمرۃ العقبۃ کہتے ہیں۔ اس کے قریب منیٰ کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ ان تینوں جمرات کے نیچے جڑ میں دائرے بنے ہوئے ہیں۔ ان دائروں میں کنکریاں گرنا ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو ان تینوں جگہ شیطان نے وسوسہ ڈال کر ورغلانے کی کوشش کی تھی آپؑ نے اس کو کنکریاں ماری تھیں۔ کنکریاں مارنا اسی کی یادگار ہے ہر کنکری کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ رَغْمًا لِلشَّیْطَانِ وَرِضًی لِلرَّحْمٰنِ پڑھے (میں اللہ کا نام لے کر رمی کرتا ہوں، اللہ سب سے بڑا ہے، یہ رمی شیطان کو ذلیل کرنے کے لئے اور رحمٰن کو راضی کرنے کے لئے ہے)۔

۱۳ ذی الحجہ کی رمی چھوڑ دینا جائز ہے ...... ان دو دنوں (گیارہ، بارہ تاریخ) کی رمی کرنے کے بعد اگر کوئی شخص چاہے کہ منیٰ سے چلا جائے اور تیرھویں تاریخ کی رمی نہ کرے تو اس کی اجازت ہے۔ اسی کو فرمایا فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ لیکن افضل یہ ہے

کہ منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تیرہویں تاریخ کی رمی کر کے منیٰ سے روانہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر تیرہویں تاریخ کی رمی بھی کی تھی جیسا کہ گیارہ بارہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی کی، تیرھویں تاریخ کی رمی کا وقت صرف غروب آفتاب تک ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بارہویں تاریخ کو اگر منیٰ میں ہوتے ہوئے سورج غروب ہو جائے تو تیرھویں کی رمی چھوڑ کر جانا مکروہ ہے اور اگر منیٰ میں ہوتے ہوئے تیرھویں کی صبح ہو جائے تو تیرھویں کی رمی کرنا بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص گیارہ بارہ کی رمی کر کے چلے جانے کی اجازت ہوتے ہوئے منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تیرھویں کی رمی کر کے جائے۔ اُس کے بارے میں فرمایا وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى (اور جو شخص تاخیر کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے)۔

صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ فَلَآ اِثْـمَ عَـلَيْـهِ جو دو جگہ وارد ہوا ہے اس سے دونوں باتوں میں اختیار دینا مقصود ہے کہ دسویں تاریخ کے بعد دو دن کی رمی کر کے چلا جائے تو اس کا بھی اختیار ہے اور تیسرے دن کی رمی کے لئے ٹھہر جائے اور منیٰ سے روانگی میں تاخیر کرے تو اس کا بھی اختیار ہے۔ اس پر یہ جو اشکال ہوتا ہے کہ جب تیرھویں تاریخ کی رمی کر کے جانا افضل ہے تو اس کے بارے میں فَلَآ اِثْـمَ عَـلَيْـهِ کے بجائے ایسا لفظ ہونا چاہئے تھا جو افضلیت پر دلالت کرتا۔ اس کے جواب میں صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ اس سے افضلیت کی نفی نہیں ہوتی (کیونکہ جو چیز افضل ہوتی ہے فَلَآ اِثْـمَ عَلَيْهِ اس پر بھی صادق آتا ہے) لیکن یہ بات پھر بھی قابلِ توجہ ہے کہ نفی الاثم کو دونوں جگہ کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت کی تردید کرنے کے لئے یہ طرز اختیار فرمایا ہے کیونکہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے تعجیل گناہ ہے اور بعض کہتے تھے کہ تاخیر گناہ ہے۔ اھ

علامہ قرطبی نے بھی ص ۱۳ ج ۳ یہ بات لکھی ہے کہ اہلِ عرب کی تردید کے لئے یہ لفظ اختیار کیا گیا ہے حیث قال فمعنی الآية أن كل ذلك مباح وعبر عنه بهٰذا التقسيم اهتماما وتاكيدا اذ كان من العرب من يذم المتعجل وبالعكس، فنزلت الآية رافعة للجناح فی کل ذالک اھ۔ (آیت کا معنی یہ ہے کہ منیٰ سے روانگی میں تعجیل اور تاخیر دونوں امر مباح ہیں۔ از روئے اہتمام و تاکید یہ انداز اختیار کیا گیا کیونکہ بعض عرب تعجیل والے کو مذموم گردانتے تھے اور بعض تاخیر والے کو اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ہر دو امر میں کوئی مضائقہ نہیں) صاحب معالم التنزیل نے (ص ۱۷۹ ج ۱) آیت کی تفسیر میں بعض حضرات سے یوں نقل کیا ہے کہ حج کرنے والے پر کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا۔ خواہ بارہ تاریخ کو رمی کر کے چلا جائے خواہ تیرھویں کی رمی کے لئے ٹھہر جائے۔ اور اس معنی کی تائید کے لئے حدیث من حج لله فلم يرفث ولم يفسق پیش کی ہے۔ اور پھر یہ فرمایا کہ یہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے، اس معنی کو لینے سے لـمـن اتـقـی کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ تعجیل کرے یا تاخیر کرے کوئی گناہ باقی نہ رہے گا۔ بشرطیکہ اس حج میں تقویٰ اختیار کیا ہو اور گناہوں سے بچا ہو۔ صاحب معالم التنزیل نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول انما جعلت مغفرة الذنوب لمن اتقى الله تعالٰی فی حجه اس معنی کی تائید کے لئے نقل کیا ہے اور حضرت ابوالعالیہ سے لـمـن اتقی کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ذهب ائمة لمن اتقی فيما بقی من عمره۔ (یعنی بعض آئمہ نے لـمـن اتقی کا معنی یہ کیا ہے کہ حج کرنے کے بعد باقی عمر میں گناہوں سے بچتا رہے) والله تعالٰی اعلم بالصواب۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ

لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جس کی گفتگو آپ کو دنیاوی زندگی میں پسند آتی ہے اور وہ اللہ کو گواہ بناتا ہے اُس بات پر جو اُس کے دل میں ہے،

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ

حالانکہ وہ سخت ترین جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے تو زمین میں دوڑ دھوپ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد کرے اور کھیتی کو

وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ

اورنسل کو برباد کرے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر تو اس کا غرورِ نفس اس کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے، سو اس کیلئے

جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

جہنم کافی ہے اور بلاشبہ وہ بُرا بچھونا ہے۔

میٹھی باتیں کرنے والے مُنافقوں اور مُفسدوں کا تذکرہ

معالم التنزیل ص ۱۷۹ ج ۱ میں لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شُریق کے بارے میں نازل ہوئی یہ شخص میٹھی باتیں کرنے والا تھا۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تھا اور پاس بیٹھ کر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں اور اس پر قسمیں کھاتا تھا اور اندر سے منافق تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اس کی ظاہری باتوں کی وجہ سے) اسے قریب بٹھاتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اخنس بن شُریق کی حرکت...... لباب النقول میں بحوالہ ابن جَریر مفسر سُدّی سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا۔ آپؐ کو اس کی باتیں پسند آئیں۔ پھر وہ آپؐ کے پاس سے چلا گیا اور مسلمانوں کی کھیتیوں پر گزرا جہاں گدھے بھی (چر رہے) تھے۔ اس نے کھیتیوں کو آگ لگا دی اور گدھوں کے پاؤں کاٹ کر چلا گیا۔ اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔

(يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ میں اسی کو بیان فرمایا) علامہ مناوی نے فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ص ۱۴۵ ج ۲ میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا اللّٰھُمَّ إنی اعوذبک من خلیل ماکر (الحدیث) میں یہ اخنس بن شریق مراد ہے جو میٹھی زبان والا تھا، جب آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتا تھا، تو نرم نرم باتیں کرتا تھا اور یوں کہتا تھا کہ اللہ جانتا ہے کہ میں سچا ہوں۔

لباب النقول میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ایک یہ بات نقل کی ہے کہ جس جماعت میں حضرت عاصم اور حضرت مرثد تھے اس جماعت کے شہید ہونے کا جب علم ہوا تو دو منافقوں نے یہ کہا کہ افسوس ہے ان لوگوں پر جو فتنے میں پڑ گئے اور ہلاک ہو گئے۔ نہ تو اپنے گھروں میں ہی بیٹھے اور نہ تبلیغی ذمّہ داری کو پورا کر سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔

بہرحال آیت کا سببِ نزول جو بھی ہو الفاظ کا عموم ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو دُنیاوی زندگی میں میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی

باتیں کر کے مسلمانوں کے عوام اور خواص میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں اندر سے منافق ہوتے ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کے جھوٹے دعوے ثابت کرنے کے لئے بار بار قسم کھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اللہ گواہ ہے، ہم سچے مسلمان ہیں، ان لوگوں کا مقصد چونکہ اوّل سے آخر تک دنیا اور دنیا کا جاہ و مال ہی ہوتا ہے اور اندر سے مسلمان نہیں ہوتے اس لئے جب بھی کوئی موقع دیکھتے ہیں مُسلمانوں کو زک دینے اور نقصان پہنچانے اور ان کی حکومتوں کے خلاف منصوبے بنانے میں اور ان کی حکومتوں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا کر نہیں رکھتے۔ جو کام اخنس بن شریق نے کیا کہ خدمتِ عالی میں حاضر ہو کر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ کو اپنے دعوے کی سچائی پر گواہ بنایا اور پھر وہاں سے نکل کر مسلمانوں کی کھیتیوں کو آگ لگا دی اور مویشیوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ وہی کام ہمیشہ سے منافقین کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ قتادہ اور مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ آیت ہر ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کفر کو چھپائے ہوئے ہو، نفاق اور جھوٹ کو اپناتے ہوئے اپنی زبان سے اپنے دِل کے خلاف ظاہر کرتا ہو۔ نیز علامہ قرطبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ دینی اور دنیاوی اُمور میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ص۱۰ ج۳)

لفظ فی الحیاۃ الدنیا کے بارے میں مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ امورِ دنیا اور اسبابِ معاش میں آپ کو اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ دنیاوی مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ ایسی باتیں کرتا ہے اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیاوی باتوں میں اس کی حلاوت اور فصاحت آپ کو پسند آتی ہے لیکن آخرت میں اس کی کوئی بات قابلِ التفات نہیں ہوگی وہاں جو اس کو وحشت سوار ہوگی اس کی وجہ سے وہ بولنے بھی نہ پائے گا۔ (ص۱۳۹ ج۱)

جھگڑالو اور چرب زبان کی مذمت......اَلَدُّ الْخِصَامِ یہ دونوں کلمے آپس میں مضاف مضاف الیہ ہیں۔ پہلا لفظ لدد سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ جھگڑالو، اور خصام بھی جھگڑے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بہت زیادہ جھگڑالو ہے۔ مفسر بیضاوی نے اس کا ترجمہ شدید العداوۃ (سخت دشمنی والا) کیا ہے جو اس کا لازمی معنیٰ ہے۔ منافقوں کی یہ صفت بیان فرمانے سے ہر جھگڑالو کی مذمّت معلوم ہوئی جو باطل کے لئے جھگڑتا ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ مبغوض وہ ہے جو زیادہ جھگڑالو ہو۔ (صحیح بخاری ص۶۴۹ ج۲، ص۱۰۶۶ ج۲)

میٹھی میٹھی باتیں کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور دل میں جو کچھ ہے اس کے خلاف ظاہر کرنا آج کی دنیا میں اس کو بڑی ہوشیاری سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ چیز سیاست حاضرہ کا جزو بن چکی ہے۔ سنن ترمذی، ابواب الزھد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ نکلیں گے جو دین کے ذریعہ دُنیا حاصل کریں گے اور تواضع ظاہر کرنے کے لئے بھیڑوں کی کھالوں کے کپڑے پہنیں گے ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی۔ اور ان کے دل بھیڑیوں کی طرح ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا یہ لوگ میرے حلم سے دھوکہ کھاتے ہیں یا مجھ پر جرأت کرتے ہیں میں اپنی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان لوگوں پر اُن ہی میں سے ایسا فتنہ بھیجوں گا۔ جو اُن میں ہوشمند عقل والا ہوگا، اُسے (بھی) حیران کردے گا۔

تکبر کی مذمت......جن لوگوں میں خالص دنیاوی جاہ اور مال کی طلب ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں جھکاؤ نہیں ہوتا وہ غرورِ نفس کی وجہ سے یہی سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے کسی حق کہنے والے کی بات قبول کرلی تو ہماری ہیٹی ہو جائے گی اور ناک کٹ جائے گی، کفر و شرک پر اور گناہوں پر اصرار کرتے رہتے ہیں اور حق کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا نفس انہیں حق قبول کرنے نہیں دیتا، ایسے لوگوں کے

بارے میں فرمایا وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے طور طریق اور طرزِ عمل میں اللہ سے ڈر تو اس کی حمیت اسے پکڑ لیتی ہے اور گناہ پر آمادہ رکھتی ہے)۔

تکبر کیا ہے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا الکبر بطر الحق وغمط الناس یعنی حق کو ٹھکرانے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام تکبر ہے۔ بہت سے اسلام کے دعویدار بھی حق کو ٹھکرا دیتے ہیں، جب کوئی شخص دین کی بات کرتا ہے اور گناہ چھوڑنے کو کہتا ہے یا کسی بات کی خیر خواہانہ نصیحت کرتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ تو کون ہے ہمیں نصیحت کرنے والا؟ تو ہمارے سامنے کا بچہ ہے، فلاں قوم کا فرد ہے، فلاں مُلک کا رہنے والا ہے، یہ سب کبر ہے اور حق کو جھٹلانے کی باتیں ہیں اوپر منافقوں اور مفسدوں کا طرزِ عمل بیان فرمایا اور اخیر میں فرمایا کہ ایسے شخص کو دوزخ کافی ہے اور دوزخ بُرا بچھونا ہے۔ مھاد عربی میں بستر کو کہتے ہیں، دوزخ میں اہلِ نفاق کا جو ٹھکانہ بنے گا اسے مھاد سے تعبیر فرمایا کیونکہ وہ ان کا مستقل ٹھکانا ہے۔ جو اُن کو دنیا کے بستروں کے بجائے ملے گا۔ یہاں نرم بستروں پر سوتے تھے اور وہاں آگ کا بستر ہوگا اور آرام وراحت ونیند کا نام ونشان نہ ہوگا۔ اعاذنا الله تعالىٰ منه۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢبِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو خرید لیتا ہے اپنے نفس کو اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

اللہ کی رضا کے لئے جان ومال خرچ کرنے والوں کی فضیلت

حلیۃ الاولیاء ص ۱۵۱ ج ۱ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی نیت سے (مکہ معظمہ سے) نکلے تو قریش کے چند افراد ان کے پیچھے لگ گئے تا کہ ان کو واپس کریں۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اپنی سواری سے اُترے اور اپنے ترکش سے تیر نکالے اور اُن سے کہا کہ اے قریش کے لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے بڑھ کر تیر انداز ہوں اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں اپنے سارے تیر تمہاری طرف نہ پھینک دوں جو میرے ترکش میں بھرے ہوئے ہیں اس کے بعد میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک میرے ہاتھ میں سکت رہے گی، اب تم جو چاہو کر لو، اور ایک صورت یہ ہے کہ میرا مال اور میرے کپڑے جہاں مکہ میں رکھے ہیں میں تمہیں ان کا پتہ بتا دیتا ہوں تم ان کو لے لو اور میرا راستہ چھوڑ دو، وہ کہنے لگے ہاں یہ ٹھیک ہے، ہم اس پر راضی ہیں وہ لوگ تو اُدھر چلے گئے اور حضرت صہیبؓ سفر قطع کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا ربح البيع ابا يحيى، ربح البيع ابايحيى (اے ابویحییٰ! یہ بیع نفع والی ہے، اے ابویحییٰ! یہ بیع نفع والی ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑی سی دنیا خرچ کر کے جو اپنی جان اور دین کو بچا لیا یہ نفع کا سودا ہے۔ (ابویحییٰ حضرت صہیب کی کنیت ہے) انکے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو واقعہ کی خبر دیدی تھی۔ مستدرک حاکم ص ۳۹۸ ج ۳ میں بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہ قصہ مذکور ہے اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ آیتِ شریفہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ، حضرت صہیبؓ کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی نازل ہو گئی تھی۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابویحییٰ نفع کا سودا ہوا اور آپؐ نے انہیں آیتِ بالا پڑھ کر سنائی۔ تفسیر ابن کثیر ص ۲۴۷ ج ۱ میں ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب میں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا اے صہیبؓ! تم یہاں آئے تھے تو تمہارے پاس کچھ بھی مال نہ تھا اور اب تم یہاں کا کمایا ہوا مال اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ اللہ کی قسم ایسا نہ ہوگا۔ میں نے ان سے کہا کہ تم مناسب جانو تو

میں تمہیں اپنا مال دیدوں اور تم مجھے چھوڑ دو۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور میں نے اُن کو اپنا مال دیدیا اور مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی خبر مل چکی تھی آپ ؐ نے فرمایا رَبِحَ صُهَيْبٌ رَبِحَ صُهَيْبٌ (صہیب نے نفع کا سودا کیا، صہیب نے نفع کا سودا کیا۔)

بعض مفسرین نے یَشْرِیْ کا ترجمہ یَبِیْعُ سے کیا ہے یعنی بعض آدمی ایسے ہیں کہ اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے اپنے نفس کو بیچ دیتے ہیں۔ مفسر ابن کثیر ص ۲۴۷ ج ا لکھتے ہیں کہ اکثر حضرات نے آیت کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ یہ ہر ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، قرآن پاک کی آیت اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (الآیۃ) سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا۔ اس اعتبار سے مجاہدین اپنے جان و مال کو فروخت کرنے والے ہو گئے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں ص ۲۲ ج ۳ کہ حضرت صہیب ؓ کے قصے میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ وہ مشرکین مکہ سے قتال کے لئے تیار ہو گئے اُس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے نفس کو بیچ دیا، اس اعتبار سے ان کے قصہ کو سامنے رکھ کر بھی یَشْرِیْ کا ترجمہ یبیع (بیچتا ہے) کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت آیت کا جو شانِ نزول ہے (یعنی حضرت صہیب ؓ کا واقعہ) اسکو سامنے رکھتے ہوئے بھی آیت کا عموم ہر اُس شخص کو شامل ہے جو بھی اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال خرچ کرے اور اللہ کی رضا کیلئے اپنی جان پر کھیل جائے۔ معالم التنزیل ص ۱۸۳ ج ۱ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا مصداق ایسے شخص کو بتایا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے قتل کر دیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو، بے شک وہ تمہارا

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

کھلا دشمن ہے۔ سو اگر تم لغزش کھا جاؤ اس کے بعد کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آ چکی ہیں تو جان لو کہ بلاشبہ اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اسلام میں پورے طور پر داخل ہونے کا حکم

آیت کے شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ بعض صحابہ ؓ جو پہلے یہودی تھے انہوں نے سنیچر کے دن کی تعظیم کو باقی رکھنا چاہا جو شریعت موسوی میں تھی اور اونٹ کا گوشت کھانے سے پرہیز کرنا چاہا کیونکہ یہودیت کے زمانہ میں نہیں کھاتے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ توریت بھی تو اللہ کی کتاب ہے، ہم اس کو تہجد کی نماز میں پڑھ لیا کریں (جیسا کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے) اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی اور حکم فرمایا کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ (من الدر المنثور والبیضاوی) شریعتِ محمدیہ ؐ کے آنے کے بعد اب کوئی شریعت باقی نہیں رہی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ میں تمہارے پاس خوب روشن اور صاف شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو اُن کے لئے بھی اس کے سوا کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ میرا اتباع کریں۔ (معالم التنزیل ص ۱۸۳ ج ۱) حضرت جابر ؓ کی روایت مسندِ احمد اور شعب الایمان للبیہقی میں بھی ہے۔ (کمافی المشکوٰۃ ص ۳۰)

زندگی کے تمام شعبوں میں ہر شخص اسلام کے احکام کا پابند ہے...... اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اسلام میں پورے

پورے داخل ہو جاؤ۔ اسلام کے احکام کو پورا پورا قبول کرو اور اس کے جملہ احکام پر عمل کرو، حاکم ہو یا محکوم، بڑا ہو یا چھوٹا، شہری ہو یا دیہاتی، تاجر ہو یا کاری گر، کارخانہ دار ہو، مزدور ہو یا کسان، سب اسلام پر پوری طرح چلیں اور ایک دوسرے کا منہ نہ دیکھے کہ وہ چلے تو میں بھی چلوں۔ ہر ایک اپنی ذمہ داری کو سامنے رکھے۔ بہت سے لوگوں نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ نماز، روزہ اور ان کے علاوہ دو چار کاموں تک ہی اسلام کو محدود رکھتے ہیں اس کے علاوہ معیشت اور معاشرت، تجارت اور سیاست اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اسلام کے احکام کی پاسداری نہیں کرتے جس طرح چاہیں تجارت کر لیں اور جو بھی چیز سامنے آ جائے خرید لیں، یا بیچ دیں۔ جس محکمہ میں چاہیں ملازم ہو جائیں۔ حرام حلال کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ بیاہ شادی میں غیر شرعی طریقہ کا راختیار کرتے ہیں۔ سراسر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی کے موقعہ پر ہم پر شرعی کوئی پابندی نہیں، حرام حلال کی بحثوں کو فضول سمجھتے ہیں، کوئی عالم اگر بتادے کہ تمہاری ملازمت حرام ہے یا تجارت میں سُود ہے تو کہتے ہیں کہ مولوی ترقی سے روکتا ہے۔ جن قوموں کے دین میں چند تصوّرات اور توہمات اور چند اعمال کے علاوہ اور کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ اپنے دین کو انہیں کے دین پر قیاس کر لیتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) ہمارا دین جامع ہے، کامل ہے مکمل ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے احکام تفصیل کے ساتھ اسلام میں نہ بتائے ہوں۔ بعض احکام پر عمل کرنا اور بعض کو چھوڑ دینا یہ وہی چیز ہے جس کو سورۂ بقرہ کے رکوع (۱۰) میں یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ......

(کیا کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض حصہ کے منکر ہوتے ہو) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمان ہونے کے صرف دعوے دار ہی ہیں۔ اسلام کے فرائض تک پر عمل نہیں کرتے، اور کچھ لوگوں کو دینداری کا خیال تو ہے لیکن ان کی دینداری نماز تک یا ایک دو اعمال تک محدود ہے۔ اگر توجہ دلائی جائے کہ حرام ملازمت چھوڑ دو تو تیار نہیں اگر یوں کہا جائے کہ سود کا لین دین نہ کرو تو آمادہ نہیں اگر یوں کہو کہ حرام چیزیں فروخت نہ کرو تو کہتے ہیں کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔ اس کو کیسے چھوڑیں؟ ان کی جاہلانہ بات کا مطلب یہ ہے کہ روزی کمانے میں گویا پورے آزاد ہیں۔ (العیاذ باللہ)

اصحابِ حکومت کی بے راہی...... جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں وہاں کے ذمہ داران ہی طریقوں پر حکومتیں چلاتے ہیں جو کافروں سے سیکھے ہیں کچہریوں میں کافرانہ اور ظالمانہ قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ اسلام کے قانون کا نام آ جائے تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ کافرانہ اقوال اور افعال کے باوجود اس کے دعویدار ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام پر پوری طرح عمل نہ کرنا بعض احکام کو ماننا بعض کو چھوڑ نا یہ سب شیطانی حرکات ہیں۔ اسلام میں پورا پورا داخل ہونے کا حکم دینے کے بعد یہ بھی فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (کہ شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو) اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے) لوگ شیطان کو بُرا بھی کہتے ہیں اور اُس پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ یہ عجیب طریقہ ہے۔ پھر فرمایا...... فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (سو اگر تم لغزش کھا جاؤ اس کے بعد کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آ چکی ہیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے)

اس آیت میں بتایا کہ واضح دلائل آ جانے کے بعد پھر بھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تو اس کو معمولی بات نہ سمجھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بغاوت ہے۔ وہ غالب ہے اس کے عذاب اور انتقام سے بچ نہیں سکتے اور وہ حکیم بھی ہے اپنی حکمت کے موافق وہ سزا دینے میں جلدی نہ کرے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا اور یہ نہ سمجھنا کہ گرفت نہ ہوگی اور انتقام سے محفوظ رہیں گے۔

قال صاحب الروح ص۹۸ ج۲ غالب علی أمره لا یعجزه شیئ من الانتقام منکم حکیم لا یترک ما تقتضیه الحکمة من مؤاخذة المجرمین۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ؕ

یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ اللہ اور فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں ان کے پاس آ جائیں اور سارا قصہ ختم ہو جائے،

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

اور اللہ ہی کی طرف تمام اُمور لوٹائے جائیں گے۔

ع ۲۵ ۱۴ ۹

حق قبول نہ کرنے پر وعید

جولوگ واضح دلائل کے بعد بھی دینِ اسلام میں داخل نہیں ہوتے انہیں کیا انتظار ہے ان کے طور طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس اُسی کا انتظار کررہے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں آ جائیں اور ان کو ان کے کفر کی سزا مل جائے، اور سارا فیصلہ ہو جائے، پھر آگے اسلام قبول کرنے کا موقع ہی نہیں ہے کیونکہ عذاب سامنے آنے کے بعد اسلام قبول نہیں ہوتا، پھر فرمایا کہ تمام اُمور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ وہ قاضی روزِ جزا ہے۔ اس دن مجازی صاحبِ اختیار بھی کوئی نہ ہوگا۔ وہ حق کے ساتھ فیصلے فرمائے گا۔ اہلِ کفر کے بارے میں دائمی عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ لہٰذا اپنا انجام سوچ لیں۔

فائدہ......لفظ یاتیهم الله میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اتیان (یعنی آنے) کی نسبت کی ہے اس پر ایمان لائیں۔ مفہوم کے سمجھنے اور معنی کریدنے میں نہ لگیں۔ سلف کا یہی طریقہ ہے، اور بعض حضرات نے مضاف مقدر مانا ہے۔ قال القرطبی ص۲۵ ج۳ وقیل لیس الکلام علی ظاهره فی حقه سبحانه وانما المعنی یأتیهم امر الله وحکمه، وقیل ای بما وعدهم من الحساب والعذاب۔

مطلب یہ ہے کہ یأتیهم الله سے اللہ کا امر اور اس کا حکم اور عذاب آنا مراد ہے۔ والله تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سَلْ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

آپ بنی اسرائیل سے دریافت فرمائیے ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ

مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

نعمت اس کے پاس آ جائے تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

بنی اسرائیل کی ناشکری اور اس پر عذاب

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی واضح دلیلیں عنایت فرمائی تھیں۔ وہ ان دلائل سے کام لیتے اور حق پر جمتے تو ان کے حق میں اچھا تھا۔ لیکن انہوں نے اُلٹی ہی چال چلی ہدایت کے بجائے گمراہیوں کو پسند کیا، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو نقمت سے بدل دیا۔ جس کی وجہ سے دنیا و آخرت میں مستحق عذاب وعقاب ہوئے۔ بنی اسرائیل کو جو دلائلِ واضحہ دیئے گئے تھے ان کے بارے میں صاحب معالم

التنزیل ص ۱۸۴ ج ا لکھتے ہیں کہ اس سے وہ دلائل مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً عصا موسوی اور ید بیضاء اور سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو پار کرنا وغیرہ ذلک، اور ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے وہ صاف اور واضح بیانات مراد ہیں جو توراۃ وانجیل میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں تھے، یہودیوں نے جو ان آیات سے انحراف کیا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود گمراہی کا راستہ اختیار کیا اس کے بیان کرنے کے لئے ایک ایسا اسلوب اختیار فرمایا جس سے ہر نعمت کے بدلنے کی شناعت اور قباحت معلوم ہو جائے اور عمومی طور پر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جو بھی کوئی شخص اللہ کی کسی بھی نعمت کو بدلے گا وہ مستحق عذاب وعقاب ہوگا۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ

مزین کی گئی ان لوگوں کے لئے دنیاوی زندگی جنہوں نے کفر کیا اور وہ ہنسی کرتے ہیں ان لوگوں سے جو لوگ ایمان لائے حالانکہ جن لوگوں نے

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

پرہیزگاری کو اختیار کیا وہ قیامت کے دن اُن سے بالا ہوں گے، اور اللہ جسے چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے۔

کافروں کے لئے دنیا کا مزین ہونا اور ان کا ایمان والوں پر ہنسنا

اس آیت میں کافروں کے کفر پر جمنے اور کفر اختیار کرنے کا سبب بتایا ہے اور وہ یہ کہ دنیاوی زندگی اور اس سے متعلقہ ساز و سامان آرائش اور زیبائش ان کی نظروں میں بھایا ہوا ہے۔ اسی حسن ظاہر کو دیکھ کر وہ دنیا پر پلے پڑے ہیں۔ چونکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ اختیار کرنے میں انہیں دنیا اور اسبابِ دنیا میں کمی ہوتی نظر آتی ہے اس لئے کفر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ دنیا کے ساز و سامان مال اور جائیداد کو کامیابی سمجھے ہوئے ہیں اس لئے اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ان سے تمسخر کرتے ہیں (کیونکہ ان کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں) دنیا چندروزہ ہے اس کے بعد اہلِ کفر کے لئے عذاب ہی عذاب ہے اور اہلِ ایمان کے لئے جنت ہے۔ اہلِ ایمان قیامت کے دن بلند و بالا ہوں گے۔ جنت کے بالا خانوں میں ہوں گے اور اہلِ کفر دوزخ میں پڑے ہوں گے۔ اس وقت اہلِ ایمان ان پر ہنسیں گے جیسا کہ سورۂ مطففین میں فرمایا: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ. عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (سو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے، مسہریوں پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہوں گے) علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین عرب ابوجہل وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ اپنے مالوں میں مست تھے۔ تنعم کی زندگی گزارتے تھے اور آخرت کی تکذیب کرتے تھے اور فقرائے مؤمنین مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ وعمار بن یاسرؓ اور صہیبؓ اور بلالؓ اور خبابؓ جیسے حضرات کا مذاق بناتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منافقین (عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں) کے بارے میں نازل ہوئی یہ لوگ دنیا میں مزے کی زندگی گزارتے تھے اور فقرائے مہاجرین پر پھبتیاں کستے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا ہے کہ ان (مسکینوں) کو ساتھ لے کر لوگوں پر غلبہ پائیں گے۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ یہ آیت رؤساءِ یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو فقرائے مہاجرین پر ہنستے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا کہ بنی نضیر اور بنی قریظہ کے اموال تم کو بغیر جنگ کے مل جائیں گے چنانچہ الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔ (معالم التنزیل ص ۱۸۵ ج ۱)

آیت کے ختم پر فرمایا وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (اور اللہ جسے چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے)

بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے دنیا میں بغیر کسی محنت اور تکلیف کے جس قدر چاہے عطا فرما دے اور اسے اعمالِ صالحہ کی توفیق دیدے پھر آخرت میں اس مال کا حساب نہ لے، اور بعض حضرات نے بغیر حساب کا یہ معنی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہے دے کم دے زیادہ دے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ اس سے کوئی حساب لینے والا نہیں، اور ایک معنی یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے حساب خرچ فرماتا ہے اسے خرچ کرنے میں حساب کرنے کی ضرورت نہیں اس کے خزانے بے انتہاء ہیں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ

سب لوگ ایک جماعت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے، اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ

کتاب اُتاری حق کے ساتھ، تاکہ فیصلہ فرمائے لوگوں کے درمیان اُس بات کا جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور یہ اختلاف ان ہی لوگوں نے کیا

اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا

جن کو کتاب دی گئی اور انہوں نے یہ اختلاف باہمی ضدا ضدی کے باعث اس کے بعد کیا جبکہ انکے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آ چکی تھیں، پھر اللہ نے اپنے فضل سے ان لوگوں کو

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

جو ایمان لائے اس امرِ حق کی ہدایت دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جس کو چاہے سیدھے راستہ کی ہدایت دیتا ہے۔

سارے انسان اُمتِ واحدہ تھے، حق واضح ہونے کے بعد عناد اور ضد کی وجہ سے مختلف فرقے ہوگئے

تفسیر درِ منثور ص ۲۴۳ ج ۱ میں حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان جو قرنیں تھیں یہ سب ہدایت پر اور حق شریعت پر تھے، پھر لوگوں نے اختلاف کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا جو (اس اختلاف کے بعد) سب سے پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا، اور ایسے وقت میں بھیجا جب کہ لوگوں میں اختلاف ہو چکا تھا اور حق کو چھوڑ چکے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کے بعد رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں جو مخلوق پر حجت ہیں۔

اور تفسیر قرطبی ص ۳۱ ج ۳ میں کلبی اور واقدی سے نقل کیا ہے اُمتِ واحدہ سے وہ مسلمان مُراد ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے۔ (اس وقت دنیا میں صرف یہی لوگ اہلِ ایمان تھے، دوسری کوئی جماعت نہ تھی) حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلاف ہوگیا (اور اہلِ ایمان کے مقابلہ میں مُشرکوں اور کافروں کی جماعتیں پیدا ہوگئیں)

امۃ واحدۃ کا مصداق بیان کرنے کے سلسلے میں اور بھی اقوال ہیں۔ بہرصورت آیتِ شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب اور ملت اور ایک ہی عقیدہ پر تھے اور یہ وہ دین تھا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول تھا، پھر لوگوں میں (شیطان کے بہکانے سے اور رائے وفکر کے اختلاف سے) بہت سے فرقے پیدا ہوگئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے راہِ حق بتانے کے لئے حضراتِ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام نے راہِ حق بتانے اور

اصلاح حال کرنے کے لئے اپنی پوری پوری کوششیں کیں، یہ حضرات حق قبول کرنے والے کو جنت کی بشارت دیتے تھے۔ اور حق سے منہ موڑنے والوں کو آخرت کے عذاب سے ڈراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ امورِ اختلافیہ میں فیصلہ فرمایا، اور حق اور ناحق کو ممتاز کر کے بتا دیا، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیم و تبلیغ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگوں نے اپنی نفسانیت اور ضد و عناد کی وجہ سے حق سے منہ موڑا، اور باہمی اختلاف کرتے رہے، جن کو علم دیا گیا واضح دلائل سامنے ہوتے ہوئے حق سے منحرف ہوئے۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل سے اہل ایمان کو راہِ حق کی ہدایت دی اور جو چیز حق تھی وہ ان کو بتا دی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ تفسیر درمنثور ص ۲۴۲ ج ۱ میں وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت اُبی بن کعب سے نقل کیا ہے کہ جن کو کتاب اور علم دیا گیا ان سے بنی اسرائیل مراد ہیں اور بَغْيًا بَيْنَهُمْ کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کی حرص اور ملک کی طلب اور اس کی ظاہری زیب و زینت کی وجہ سے بعض نے بعض پر بغاوت کر دی اور آپس میں ایک دُوسرے کی گردنیں ماردیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ہدایت دی جو اختلاف کے وقت اس دین پر قائم رہے جو دینِ حق تھا وہ خدائے وحدہ لاشریک کے لئے اخلاص کے ساتھ دین میں لگے اور اختلاف والوں سے علیحدہ ہو کر رہے، لہٰذا یہ لوگ قیامت کے دن دُوسری قوموں یعنی قوم نوح اور قومِ ہود اور قومِ صالح اور قومِ شعیب (وغیرہم) کے مقابلہ میں گواہی دیں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان کے رسولوں نے ان کو تبلیغ کی تھی لیکن اُنہوں نے ان کو جھٹلایا تھا۔

اس عالم میں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے ہیں اور کتب الٰہیہ نازل ہوتی رہی ہیں۔ حق پر چلنے والے بھی رہے اور مخالفین بھی رہے اب اہلِ ایمان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اہلِ کفر ہماری مخالفت کرتے رہیں گے اور حق ظاہر ہونے کے باوجود اسے اختیار نہ کریں گے اور جب اختلاف ہوگا تو ان سے تکلیفیں بھی پہنچیں گی، اور قتل و قتال کی نوبت بھی آئے گی۔ صبر بھی کرنا ہوگا اور اللہ کی راہ میں جان و مال بھی خرچ کرنا ہوگا کافر اپنے عناد پر جمے رہیں گے۔ اہل ایمان کو ایمانی تقاضوں پر ثابت قدم رہنا لازم ہوگا۔ اِس تقریر سے آیت اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کا ربط بھی سمجھ میں آ گیا۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ

کیا تم نے خیال کیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اُن لوگوں جیسے واقعات تمہیں پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، ان کو پہنچی

الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى

سختی اور تکلیف، اور وہ لوگ جھنجھوڑ دیئے گئے یہاں تک کہ رسول نے اور ان مؤمنین نے جو رسولؐ کے ساتھی تھے کہہ دیا کہ کب ہو گی

نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

اللہ کی مدد، خبردار بلاشبہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

مصائب میں مسلمانوں کو صبر کی تلقین اور اُممِ سابقہ کے مسلمانوں سے عبرت حاصل کرنے کی تعلیم

مسلمانوں کو مشرکین اور یہود و منافقین سے برابر تکلیفیں پہنچتی رہتی تھیں۔ مکہ معظمہ میں جب تک رہے مشرکین برابر تکلیفیں پہنچاتے

رہے پھر جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے آ گئے تو یہودیوں سے اور منافقوں سے واسطہ پڑا اور مشرکینِ مکہ نے یہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ ان کی دشمنی کی وجہ سے بدر اور اُحد اور خندق کے غزوات پیش آئے۔ دشمنوں کی ایذا رسانیوں کے علاوہ بھوک، پیاس وغیرہ کی تکلیفیں بھی پہنچتی رہتی تھیں۔

اسباب النزول ص ۶۰ میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ خندق کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی، دشمنوں کا خوف بھی تھا اور سردی بھی سخت تھی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی مہیا نہ تھیں اور کئی طرح سے تکالیف کا سامنا تھا جس کو اللہ جل شانہ نے سورۂ احزاب میں یوں بیان فرمایا ہے کہ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے) نیز اللہ جل شانہ نے غزوۂ احزاب کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (کہ اس موقع پر مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا اور ان کو سختی کے ساتھ جھنجھوڑا گیا)

منافقین اس حال کو دیکھ کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگے حتیٰ کہ کفریہ کلمات تک کہہ گئے اللہ رب العزت تعالیٰ شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم جنت کی آرزو لئے بیٹھے ہو حالانکہ جسے جنت میں جانے کا ارادہ ہو اُسے آزمایا جاتا ہے۔ تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے اُن کو دُکھ پہنچا، مصیبتوں نے گھیرا، تکلیفوں نے دبوچا، اور ان کو اس قدر سختی کے ساتھ جھنجھوڑا گیا کہ ان کے زمانہ کے رسول نے اور ان کے ساتھیوں نے مدد میں دیر محسوس کی تو یوں کہہ دیا کہ اللہ کی مدد کب ہوگی۔ جب وہ اس حال پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری دی گئی کہ خبردار اللہ کی مدد قریب ہے۔

اس میں جہاں منافقین کو جواب دیا گیا ہے (جنہوں نے غزوۂ احد میں مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا کہا تھا) وہاں مسلمانوں کو بھی تسلی دی گئی کہ یہ مصائب اور تکالیف کوئی نئی نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھ نیا معاملہ نہیں کیا جا رہا ہے تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں۔ ان کو بھی آزمایا گیا ہے جب ان کو بہت زیادہ تکلیف پہنچی تو انہوں نے مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (کب ہوگی اللہ کی مدد) کہا تو اللہ پاک کی طرف سے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ کا اعلان کیا گیا اور جلد ہی مدد آ گئی تمہاری تکلیف بھی اس مرحلہ پر پہنچ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے دنیا میں بھی مدد ہوگی اور جنت کا داخلہ بھی ہوگا۔ قال ابن کثیر ص ۲۵۱ ج ۱ **قال اللّٰہ تعالٰی الا ان نصر اللّٰہ قریب کما قال فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا و کما تکون الشدۃ ینزل من النصر مثلھا ولھٰذا قال تعالٰی الا ان نصر اللّٰہ قریب** اھ۔

یہ آزمائش پہلے نبیوں (علیہم السلام) پر اور ان کی اُمتوں پر آئی ہمارے رسول سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر آئی آپ کے صحابہؓ پر آئی، تابعینؒ پر آئی ان کے بعد مسلمانوں پر آتی رہی اور آتی رہے گی۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

الٓمّٓ. اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ. (کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا اور بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو آزمایا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ ضرور ضرور جان لے گا۔ ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور ضرور جان لے گا جھوٹوں کو) حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن تکلیفوں کی شکایت کی جو مُشرکینِ مکّہ سے پہنچتی رہتی تھیں۔ اس وقت آپ کعبہ کے سایہ میں چادر سے تکیہ لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ ہم نے عرض کیا: کیا آپ اللہ سے دُعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو مسلمان تھے۔ ان میں سے بعض کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیا جاتا تھا پھر آرہ لا کر سر کے اُوپر سے لے کر (نیچے تک) چیر دیا جاتا تھا جس کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ یہ تکلیف

بھی اُن کو ان کے دین سے نہیں روکتی تھی اور ان کے سروں میں لوہے کی کنگھیاں کی جاتی تھیں جو گوشت سے گزر کر ہڈی اور پٹھے تک پہنچ جاتی تھیں اور یہ چیز انہیں ان کے دین سے نہیں روکتی تھی۔ (مشکوۃ عن البخاری ص ۵۲۵)

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى

وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جو مال تم خرچ کرو اس کا مصرف والدین اور قرابت دار اور یتیم

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اور مسکین لوگ ہیں اور جو بھی خیر کا کوئی کام تم کرو گے سو اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے۔

کن مواقع میں مال خرچ کیا جائے

اسباب النزول ص ۶۰ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عمرو بن جموح انصاریؓ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بوڑھے آدمی تھے اور بہت مال والے تھے، اُنہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم کیا صدقہ کریں اور کس پر خرچ کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، تفسیر درِ منثور ص ۲۴۳ ج ۱ میں ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں نفلی صدقات کا ذکر ہے اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے۔

سببِ نزول کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دو باتوں کا سوال کیا گیا تھا، اول یہ کہ کیا خرچ کریں؟ دوم یہ کہ کس پر خرچ کریں؟ اللہ جل شانہٗ نے اولاً دوسرے سوال کا جواب دیا کہ والدین پر اور دیگر رشتہ داروں پر، اور یتیموں پر اور مسکینوں پر خرچ کرو۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس پر اور بیوی بچوں پر چونکہ انسان اپنے ذاتی مقاصد سے خرچ کرتا ہے اس لئے سوال ان کے علاوہ دُوسروں پر خرچ کرنے کے متعلق تھا۔ لہٰذا اخراجات کی تفصیل بتاتے ہوئے پہلے والدین کا ذِکر فرمایا پھر ماں باپ کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا اجمالی ذکر فرمایا جو اپنے کنبہ کے لوگ ہیں۔ پھر یتیموں اور مسکینوں کا ذکر فرمایا جو رشتہ داروں میں ہوتے ہیں اور رشتہ داروں کے علاوہ دُوسرے خاندانوں میں بھی ہوتے ہیں۔

سنن ابی داؤد ص ۳۴۳ ج ۲ میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ فرمایا، اپنی ماں کے ساتھ۔ عرض کیا، پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا، اپنے باپ کے ساتھ، پھر جو تجھ سے زیادہ قریب ہو، پھر اس کے بعد جو تجھ سے زیادہ قریب ہو۔

پھر وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ فرما کر پہلے سوال کا جواب دیدیا کہ جو مال بھی تھوڑا یا بہت خرچ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا خوب علم ہے وہ اس سب کی جزا عطا فرمائے گا اور مال کو جو خیر سے تعبیر فرمایا اس میں یہ بتادیا کہ مال حلال ہو (کیونکہ مالِ حرام خیر نہیں ہے) اور رضائے الٰہی کے لئے خرچ ہوا ہو (کیونکہ جس خرچہ سے رِیا کاری اور شہرت مقصود ہو وہ خیر نہیں ہے)۔

مفسرین نے فرمایا کہ دوسرے سوال کے جواب کو اس لئے اہمیت دی گئی کہ کوئی شخص کتنا ہی مال خرچ کرے جب تک صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو ثواب کا استحقاق نہ ہوگا۔ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی فضیلت سے متعلق بعض رِوایاتِ حدیث آیتِ کریمہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ کے ذیل میں گزر چکی ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

فرض کیا گیا تم پر جنگ کرنا اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو،

وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جہاد کی فرضیت اور ترغیب

مکہ مکرمہ کے زمانۂ قیام میں مسلمان بہت ہی ضعیف تھے، تھوڑے سے تھے۔ کافروں کا تسلط تھا ان سے لڑنے اور جنگ کرنے کا کوئی موقع نہ تھا اور نہ جنگ کرنے کی اجازت تھی۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ ؓ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ قیام پذیر ہو گئے، یہاں قیام کرنے کے بعد ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی جو لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جیسا کہ سورۂ حج میں فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا اس کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ عام مشرکین سے قتال کرنے کا حکم ہو گیا اگر چہ وہ ابتداء نہ کریں۔ (قرطبی ص ۳۸ ج ۳)

آیت بالا کے عموم سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ کفار سے جنگ کرنا ہر مسلمان پر نماز روزہ کی طرح فرض عین ہے لیکن سورۂ برأت کی آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (الآیۃ) سے اور بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال کرنا ہر مسلمان پر ہر وقت فرض عین نہیں ہے اسی لئے فقہاء نے اس بارے میں تفصیل لکھی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ بعض حالات میں فرض عین اور عام حالات میں فرض کفایہ ہے کافروں سے جنگ کرنا جارحانہ بھی مشروع ہے اور مدافعانہ بھی، جیسا کہ قرآن وحدیث کی نصوص عامہ سے ثابت ہے۔ عام طور سے کافروں سے جنگ کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے لفظ جہاد جُہد سے لیا گیا ہے جو محنت اور کوشش کے معنی میں ہے یہ اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے ہر اس محنت اور کوشش کو شامل ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے ہو، سورۂ برأت میں فرمایا: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (نکل کھڑے ہو ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو)

اس آیت میں مال اور جان دونوں سے جہاد کرنے کا حکم فرمایا ہے اور سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جاهدوا المشركين بأموالكم وانفسكم وألسنتكم. (باب كراهية ترك الغزو)

اس حدیث میں زبانوں سے جہاد کرنے کا حکم بھی فرمایا ہے۔ زبان سے جہاد کرنے میں بہت باتیں آ گئیں، کافروں سے مناظرہ کرنا، ان کے خلاف تقریریں کرنا، مسلمانوں کو جہاد کے لئے ترغیب دینا اور آمادہ کرنا وغیرہ۔ مسلمانوں پر ہر قسم کا جہاد باقی رکھنا لازم ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص احکام القرآن ص ۱۱۳ ج ۳ میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ اور امام احمدؒ اور امام مالکؒ اور تمام فقہاء امصار کا قول ہے کہ جہاد قیامت تک فرض ہے۔ لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ عام حالات میں فرض کفایہ ہے مسلمانوں کی ایک جماعت اس میں مشغول رہے گی تو باقی مسلمانوں کو اس کے ترک کرنے کی گنجائش ہوگی، اور یہ بھی لکھا ہے کہ تمام مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کے ممالک کی سرحدوں کے رہنے والے مسلمان اگر طاقتور نہ ہوں اور ان میں کافروں سے مقابلہ کی طاقت نہ ہو جس کی وجہ سے انہیں اپنے

شہروں اور اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں پر دُشمنوں کی طرف سے خوف ہو تو ساری اُمت پر فرض ہوگا کہ وہ اپنے گھروں سے نکلیں اور کافروں کے حملہ سے مسلمانوں کی حفاظت کریں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اُمت میں کسی کا بھی یہ قول نہیں ہے کہ جب (کسی علاقہ میں) مسلمانوں کو اپنی جانوں کے قتل ہونے کا اور بچوں کے قید ہونے کا خطرہ ہو تو دُوسرے (علاقہ کے) مسلمانوں کو ان کی مدد چھوڑ کر گھر میں بیٹھنا جائز ہو۔

پھر لکھا ہے کہ امام المسلمین پر اور عامۃ المسلمین پر لازم ہے کہ ہمیشہ کافروں سے جنگ کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ اسلام قبول کریں یا جزیہ ادا کریں۔(ثم قال : وهو مذهب أصحابنا ومن ذكرنا من السلف المقداد بن الأسود و أبي طلحة في آخرين من الصحابة و التابعين وقال حذيفة بن اليمان : الإسلام ثمانية أسهم وذكر سهما منها الجهاد)۔ علامہ جصاص نے جہاد کی فرضیت پر متعدد آیاتِ قرآنیہ نقل کی ہیں۔ مثلاً:

(وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ) اور (قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ الآية) اور (قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآية) اور (فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْآ اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ) اور (فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ) اور (وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً) وغيرها من الآيات. صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جہاد فرض کفایہ ہے، مسلمانوں کی ایک جماعت اگر اس فریضہ پر قائم رہے تو باقی مسلمانوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی بھی جہاد میں مشغول نہ رہے تو سب گناہ گار ہوں گے۔ پھر لکھتے ہیں کہ کافروں سے قتال کرنا واجب ہے اگر چہ وہ خود سے جنگ میں پہل نہ کریں اور اگر مسلمانوں کے کسی شہر پر دُشمن چڑھ آئیں تو تمام مسلمانوں پر ان کا دفاع لازم ہوگا۔ اس صورت میں عورت بھی شوہر کی اجازت کے بغیر نکل کھڑی ہو، اور غلام بھی آقا کی اجازت کے بغیر میدان میں آجائے، اس لئے کہ اس صورت میں دشمنوں سے جنگ کرنا فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ (ہدایہ کتاب السیر) جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا جہاد اور قتال اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اور اللہ کے دین پھیلانے کے لئے ہے اور جنگ برائے جنگ نہیں ہے اور جہاد کے لئے مستقل احکام ہیں جو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

جہاد کے بعض احکام...... صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جب مسلمان کافروں کے ملک میں داخل ہوں اور ان کے کسی شہر یا قلعہ کا محاصرہ کر لیں تو ان کو اسلام کی دعوت دیں اگر وہ دعوت قبول کر لیں اور اسلام لے آئیں تو جنگ کرنے سے رُک جائیں، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دیں (اور مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائیں) (كما زاده مسلم في رواية) اور اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنا منظور کر لیں تو پھر ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور ان کی وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو (ملک کی حفاظت کے سلسلے میں) مسلمانوں پر عائد ہوں گی (لیکن جزیہ کی دعوت مشرکینِ عرب کو نہیں دی جائے گی ان کے لئے اسلام ہے یا تلوار ہے) جن لوگوں کو دعوتِ اسلام نہیں پہنچی ان کو دعوت دیئے بغیر جنگ کرنا جائز نہیں۔ اور جن لوگوں کو دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہے۔ ان کے بارے میں مستحب ہے کہ پہلے ان کو دعوت دی جائے پھر قتال کیا جائے، اگر کفار قبولِ اسلام سے بھی انکاری ہوں اور جزیہ دینے پر بھی راضی نہ ہوں تو اللہ سے مدد طلب کر کے ان سے جنگ کی جائے اور عورتوں کو اور بچوں کو اور بہت بوڑھے کو اور اپاہج کو اور اندھے کو قتل نہ کیا جائے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی شخص امورِ حرب میں رائے رکھنے والا ہو یا عورت بادشاہ بنی ہوئی ہو تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ (من الهداية باب كيفية القتال) مسلمانوں نے جب سے جہاد چھوڑا ہے دُشمنوں نے ان پر قابو پایا ہوا ہے۔ اور ایسے معاہدوں میں جکڑ دیا ہے جن

کی وجہ سے وہ کافروں پر حملہ نہ کرسکیں، اور کافروں کا اپنا یہ حال ہے کہ معاہدوں کی پاسداری کے بغیر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ سراسر خیر ہی ہے اس سے اسلام پھیلتا ہے کافروں پر حجت قائم ہوتی ہے، مسلمانوں میں قوت آتی ہے، دشمن مغلوب ہوتے ہیں اور مغلوب رہتے ہیں، مسلمان باعزت زندہ رہتے ہیں، اللہ کی مدد نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کرنا، دشمنانِ دین کے مشوروں پر چلنا اور ان سے دبنا اسی نے تو عالم میں مسلمانوں کی ساکھ خراب کررکھی ہے۔

مسلمانوں نے خدمت اسلام کے جذبہ کو چھوڑ دیا، حُبِّ جاہ، حُبِّ اقتدار نے ان کے چھوٹے چھوٹے ملک بنا دیئے، ہر ایک اپنے اقتدار کی ہوس میں ہے اور اقتدار باقی رکھنے کے لئے دشمنوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اس طوائف الملوکی نے مسلمانوں کی طاقت کو منتشر کررکھا ہے۔ آپس میں لسانی عصبیتوں کی بُنیاد پر ایک دوسرے کی جانوں کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ دشمنوں کی شہہ پر اپنی وحدت ختم کررکھی ہے۔ سارے عالم کے مسلمانوں کا اگر ایک ہی ملک ہوتا اور ایک ہی امیر المؤمنین ہوتا سارے مسلمان اسلام ہی کے لئے سوچتے اور اسی کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرجاتے تو کسی دشمن کی ہمت نہ تھی کہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتا، دشمنوں نے عصبیتیں سمجھا کر بہت سارے چھوٹے چھوٹے ملک بھی بنوا دیئے اور جہاد سے بھی دُور کردیا۔ لہٰذا اپنے قابو میں کچھ نہ رہا، ہمت کرکے آپس میں ایک ہوں تو اب بھی اِن شاء اللہ حال ٹھیک ہو جائے گا۔

مجاہدین کے فضائل...... حضرت ابوہریرہ، حضرت سہل بن سعد اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام کو نکلنا ساری دُنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری ص۳۹۲ ج۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کردیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ (صحیح بخاری ص۳۹۲ ج۱)

حضرت عبدالرحمٰن بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بندے کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوگئے اُسے دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔ (بخاری ص۳۹۴ ج۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد نقل کیا کہ جو بھی کوئی شخص جنت میں داخل ہوگا وہ دنیا میں واپس آنے کی آرزو نہ کرے گا۔ خواہ اس کو وہ سب کچھ مل جائے جو دنیا میں ہے سوائے شہید کے۔ وہ وہاں جو اپنا اعزاز دیکھے گا اس کی وجہ سے آرزو کرے گا کہ دنیا میں واپس چلا جاتا اور دس مرتبہ قتل کیا جاتا۔ (صحیح بخاری ص۳۹۵ ج۱)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن ایک رات اسلامی ملک کی سرحد کی حفاظت میں گزارنا ایک ماہ کے روزے رکھنے اور راتوں رات ایک ماہ نمازوں میں قیام کرنے سے بہتر ہے اگر یہ شخص اسی حالت میں وفات پا گیا تو (ثواب کے اعتبار سے) اُس کا وہ عمل جاری رہے گا جو عمل وہ کیا کرتا تھا اور اس کا رزق جاری رہے گا اور (قبر میں) فتنہ ڈالنے والوں سے پُرامن رہے گا۔ (صحیح مسلم ص۱۴۲ ج۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرگیا اس نے جہاد نہیں کیا اور اس کے نفس میں جہاد کا خیال بھی نہ آیا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرگیا۔ (صحیح مسلم ص۱۴۱ ج۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس کی راہ میں کون زخمی ہوتا ہے تو وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ رنگ تو خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ (صحیح بخاری ص ۳۱۳ ج ۲، صحیح مسلم ص ۱۳۳ ج ۲)

جہاد میں مال خرچ کرنے کا ثواب ...... اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا بھی بڑا ثواب ہے۔ ایک شخص نے جہاد کے لئے ایک اُونٹنی پیش کردی جس کو مہار لگی ہوئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے لئے اس کے عوض قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ہوں گی ہر ایک کو مہار لگی ہوئی ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۱۳۷ ج ۲) (یعنی مہار لگی ہوئی سات سو اونٹنیاں خرچ کرنے کا ثواب ملے گا)۔

جہاد میں شرکت کے لئے جانے والے کو سامان دے دینا جس سے وہ جنگ کرے اور کھائے پیئے اس کا بھی بہت بڑا ثواب ہے۔ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے کسی فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے کو سامان دیا اُس نے (بھی) جہاد کیا اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے گھر والوں کی خدمت میں خیر کے ساتھ رہا اس نے بھی جہاد کیا۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۹ ج ۱)

جہاد پر دشمنانِ اسلام کا اعتراض اور اس کا جواب ...... دشمنانِ اسلام نے جہاد کو بہت مکروہ طریقہ پر پیش کیا ہے۔ اوّل تو اسلام کی دشمنی میں اسلام کی دعوت کو نہیں سمجھتے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ سارے انسان اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانیں اس کے سب رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لائیں۔ خاتم النبیّٖن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی اور رسول مانیں، قرآن پر ایمان لائیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے جو شریعت پیش کی ہے اس کو مانیں، جو شخص یہ سب قبول کرے گا وہ مسلم ہوگا، اللہ کا فرمانبردار ہوگا، مستحق جنت ہوگا اور جو شخص اس دین و شریعت کو قبول نہ کرے گا۔ وہ کافر ہوگا، مستحق دوزخ ہوگا، ہمیشہ ہمیشہ آگ کے دائمی عذاب میں رہے گا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے جب مسلمان کافروں سے جنگ کریں تو انہیں پہلے اسلام کی دعوت دیں اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو کوئی لڑائی نہیں، جنگ نہیں، قتال نہیں، اگر اسلام کو قبول نہ کریں تو اُن سے جزیہ دینے کو کہا جائے گا، پھر اگر جزیہ دینا بھی قبول نہ کریں تو جنگ کی جائے۔ جہاد کا مقصودِ اعلیٰ کافروں کو دینِ حق کی طرف بُلانا ہے تاکہ وہ جنگ کے مستحق ہو جائیں اگر جنگ کرکے کسی قوم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا تو اس میں ان کے ساتھ احسان ہی کیا، کسی قوم کے تھوڑے سے افراد جنگ میں کام آگئے اور اکثر افراد نے اسلام قبول کرلیا تو مجموعی حیثیت سے اُس قوم کا فائدہ ہی ہوا، اگر کوئی قوم اسلام قبول نہ کرے اور جزیہ دینے پر راضی ہو جائے اور اس طرح مسلمانوں کی عملداری میں رہنا قبول کرے تو اس میں بھی اس قوم کا فائدہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے ان کی جانیں محفوظ ہوگئیں اور آخرت کے اعتبار سے یہ فائدہ ہوا کہ انہیں دینِ اسلام کے بارے میں غور کرنے کا موقع مل گیا۔ مسلمانوں کی اذانیں سنیں گے، نمازیں دیکھیں گے۔ مسلمانوں کا جو اللہ سے تعلق ہے اور جو مخلوق کے ساتھ ان کے معاملات ہیں وہ سامنے آئیں گے۔ مسلمانوں کے زُہد و تقویٰ سے متاثر ہوں گے۔ اس طرح سے اقرب ہے کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور کفر سے بچ جائیں اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ رہا جزیہ تو وہ ان کی جانوں کی حفاظت کا بدلہ ہے اور وہ بھی سب پر نہیں ہے اور زیادہ نہیں ہے۔ اس ساری تفصیل سے سمجھ لینا چاہیے کہ جہاد میں کافروں کی خیر خواہی پیشِ نظر ہے اگر کافروں کی کوئی جماعت اسلام بھی قبول نہ کرے اور جزیہ دینا بھی منظور نہ کرے تو اُن کے ساتھ جنگ اور قتل و قتال کا معاملہ ہوگا۔ کافر اللہ کا باغی ہے۔ کفر بہت بڑی بغاوت ہے۔ مجازی حکومتوں میں سے کسی حکومت کا کوئی فرد یا جماعت بغاوت کرے تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے اللہ کے باغی جو اس کی زمین پر بستے ہیں اس کا دیا کھاتے ہیں اس کی عطا کی ہوئی

نعمتیں کام میں لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اگر اللہ کو مانتے ہیں تو اس کے ساتھ غیر اللہ کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں اور بہت سے خدا مانتے ہیں ایسے لوگ اس قابل کہاں ہیں کہ خدا کی زمین پر زندہ رہیں، اللہ کے وفادار بندے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کیا اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں پھر ان باغیوں کے منکر ہونے کے بعد اللہ کے وفادار بندے ان کو قتل کر دیں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ دنیا سے کفر وشرک مٹانے کے لئے خالق و مالک جل مجدہٗ کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے جو اسلام میں جہاد شروع کیا گیا ہے اس پر تو دشمنوں کو اعتراض ہے۔

لیکن صدیوں سے دُشمنانِ اسلام خاص کر یورپ کے لوگ جو ایشیا کے ممالک پر قبضہ کرتے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں جو لاکھوں کروڑوں خون ہوئے ہیں۔ اٹھارہ سوستاون میں جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کا قتلِ عام کیا ہے اور ۱۹۴۱ء میں اور ۱۹۴۲ء میں جو عالمی جنگیں ہوئی تھیں اور ہیروشیما پر جو بم پھینکا گیا اور ایک طویل زمانہ تک جو صلیبی جنگیں ہوئی ہیں جن میں لاکھوں انسان تہ تیغ ہوئے یہ سب کچھ کونسی خیر پھیلانے کے لئے ہوا؟ کیا اس میں ملک گیری کی ہوس اور کفر وشرک پھیلانے کے عزائم اور دینِ اسلام کو مٹانے کے ارادے نہیں تھے؟ یہ لوگوں کی حرکتیں ہیں جو سیدنا حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت رکھنے کے جھوٹے دعویدار ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یہ تھی کہ کوئی شخص تمہارے رخسار پر ایک طمانچہ مارے تو دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو، اور مشرکین ہند کو دیکھو جن کے یہاں ہتھیار کرنا بہت بڑا پاپ ہے جو چوہا مارنے کو بُرا جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں اور برابر فساد کرتے ہیں اور قتل وخون کا بازار گرم کرتے رہتے ہیں۔

اسلامی جہاد پر اعتراض کرنے والے اپنے آئینہ میں اپنا منہ نہیں دیکھتے اور جو لوگ اللہ کے باغی ہیں ان کی بغاوت کو کچلنے والوں کے جہاد اور قتال پر اعتراض کرتے ہیں، سچ ہے ؎

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پرواہ ہے؟
غلط الزام بھی اَوروں پر لگا رکھا ہے!
یہ ہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

ممکن ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو ...... آیتِ بالا میں جہاد کی فرضیت بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ (کہ ممکن ہے تمہیں کوئی چیز ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تمہیں کوئی چیز محبوب ہو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو)

سیاق کلام کے اعتبار سے تو اس کا تعلق جہاد اور قتال سے ہے کہ طبعی طور پر جہاد ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے تمہارے لئے بہتر ہے، اور جہاد کو چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جانا اور کاروبار میں لگنا تمہاری محبوب چیز ہے لیکن حقیقت میں جہاد کا چھوڑ دینا تمہارے حق میں شر ہے، اور اس کے چھوڑ دینے سے بہت سی خیر سے محرومی ہے اور بُرے نتائج سامنے آنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اندازِ بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ جہاد کے علاوہ بھی بہت سے اُمور کو شامل ہے، عموماً انسان بعض چیزوں کو مکروہ جانتا ہے لیکن اس کے لئے وہ بہتر ہوتی ہیں اور بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کے لئے مُضر ہوتی ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا رات دن تجربہ ہوتا

رہتا ہے۔لہٰذا خیر اسی میں ہے کہ اللہ کے احکام مانیں اوران ہی پر چلیں۔

آخر میں ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (کہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے، کیونکہ حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، اسے مخلوق کا نفع و ضرر اور مصلحت سب کچھ معلوم ہے وھو بکل شئ علیم.

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

آپ سے شہر حرام کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا جرم ہے، اور اللہ کی راہ سے

وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ

روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اہلِ مسجد حرام کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ پردازی

مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ

قتل کرنے سے بڑا جرم ہے اور کافر لوگ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے۔یہاں تک کہ تمہیں پھیر دیں گے تمہارے دین سے اگر اُن سے ہو سکے اور جو شخص

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى

تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے پھر حالت کفر میں مر جائے، سو دنیا و آخرت میں ایسے لوگوں کے اعمال اکارت

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۱۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ہو جائیں گے اور یہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۱۸

ہجرت کی اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ لوگ اللہ کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور مسجد حرام سے روکنا اور فتنہ پردازی کرنا جُرم کے اعتبار سے قتل سے بڑھ کر ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش ؓ کی امارت میں چند مہاجرین سے فرمایا کہ مقامِ بطن نخلہ میں پہنچ کر قریش کے قافلہ کا انتظار کرنا ممکن ہے کوئی خیر کی خبر لے آؤ، بطن نخلہ مکّہ اور طائف کے درمیان ہے، یہ حضرات وہاں پہنچے تو قریش کا قافلہ گزرتا ہوا نظر آیا جو طائف سے سامانِ تجارت کشمش وغیرہ لے کر آ رہا تھا، یہ قافلہ عمرو بن الحضرمی اور حکم ابن کیسان اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور نوفل بن عبداللہ پر مشتمل تھا۔ان لوگوں نے حضراتِ صحابۂ کرامؓ کو دیکھا تو ڈر گئے، حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ لوگ خوف زدہ ہو گئے لہٰذا ان پر حملہ کر دینا چاہیے جب مشورہ سے یہ بات طے ہو گئی تو واقد بن عبداللہ تمیمیؓ نے عمرو بن الحضرمی کو تیر مار کر قتل کر دیا، یہ پہلا مشرک تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، نیز حضراتِ صحابہؓ نے حکیم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو قید کر لیا۔یہ دونوں سب سے پہلے قیدی تھے جنہیں مسلمانوں نے قید کیا۔قافلہ کا ایک فرد نوفل بن عبداللہ قابو میں نہ آیا اور فرار ہو گیا۔

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اس قافلہ کے سامان کو اور دونوں قیدیوں کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ جمادی الاخریٰ کی انتیس (۲۹) تاریخ گزرنے کے بعد آنے والے دن میں پیش آیا۔ اسکے بارے میں یہ طے نہ کر سکے کہ یہ جمادی الاخری کی تیس تاریخ تھی یا رجب المرجب کی پہلی ہے۔

رجب کا مہینہ ان چار مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن میں جنگ کرنا ممنوع تھا (زمانۂ جاہلیت میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب میں قتال نہیں کرتے تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی ان میں قتال کرنے کی ممانعت تھی۔) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو یہ حملہ کر دیا تھا اس میں رجب کا شروع ہونا متحقق نہیں تھا لیکن قریشِ مکّہ نے اس کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنالیا اور کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے اس مہینہ میں قتال حلال کرلیا جو شہر حرام ہے۔ اس مہینہ میں لوگ امن کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اپنی روزیوں کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں اور انہوں نے اس ماہ کی بے حُرمتی کی ہے۔ اس اعتراض کو انہوں نے بہت اہمیت دی۔ مسلمانوں کی جس جماعت نے حملہ کیا تھا ان کو قریش مکہ نے عار دِلائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کا حملہ آور ہونا پسند نہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں شہر حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ آپ نے یہ سامان اور دونوں قیدیوں کا معاملہ موقوف رکھا، اور اس مال میں سے کچھ بھی نہیں لیا، جس جماعت نے یہ کارروائی کی تھی انہیں بڑی ندامت ہوئی انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! جس دن ہم نے عمرو بن حضرمی کو قتل کیا اس دن شام کو جو چاند نظر آیا تو اس کے اعتبار سے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ قتل ہم سے جمادی الاخریٰ میں ہوا یا رجب میں، اس پر اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ نزولِ آیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ کا سامان لے لیا اور اس میں سے خُمس علیحدہ کر لیا جو مالِ غنیمت کا اصول ہے۔ اور باقی مال اسی جماعت پر تقسیم کر دیا جنہوں نے قافلہ سے مال چھین لیا تھا جو دو قیدی مسلمانوں نے پکڑ لئے تھے مال دے کر ان کو مکہ والوں نے چھڑا لیا، پھر ان دونوں میں سے حکم بن کیسان تو مسلمان ہو گئے اور مدینہ منورہ میں رہے اور بیرِ معونہ کے غزوہ میں شہید ہوئے اور دُوسرا قیدی عثمان بن عبداللہ نامی مکہ واپس جا کر حالتِ کفر میں مرگیا۔ (اسباب النزول ص ۶۲ تا ۶۴، روح المعانی ص ۱۰۷ ج ۲)

مشرکین نے جو اعتراض کیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ جل شانہٗ نے آیتِ کریمہ نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیجئے شہر حرام میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے لیکن مشرکین کو اپنے کرتوت نظر نہیں آتے۔ اللہ کی راہ سے روکنا دینِ حق قبول کرنے والوں کو منع کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اہل مسجد حرام کو وہاں سے نکالنا (جیسا کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ معظّمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ مسجد حرام کے تقدس کو باقی رکھنے والے اور نمازوں سے اسے معمور کرنے والے یہی حضرات تھے۔ یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک شہر حرام میں قتل کرنے سے گنہگاری میں بڑھ کر ہیں جن کا ارتکاب کیا ہے (قال القرطبی ص ۴۶ ج ۳) وما تفعلون انتم من الصدعن سبیل اللہ لمن اراد الاسلام ومن کفرکم باللہ واخراجکم اھل المسجد منہ کما فعلتم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ اکبر جرماً عند اللہ۔ پھر فرمایا: وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (فتنہ پردازی جرم میں قتل سے بڑھ کر ہے) مشرکینِ مکّہ شرک وکفر میں مُبتلا تھے اور جو لوگ مسلمان ہو جاتے تھے ان کو مارتے پیٹتے تھے اور کفر میں واپس لے جانے کی کوشش کرتے تھے، یہ سب سے بڑا فتنہ ہے جو ایک شخص کے قتل سے بہت بڑھ کر ہے جسے بعض صحابہؓ نے چاند کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا تھا پھر مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ وہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اس میں مشرکین کے عزائم بتائے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان سے کبھی بھی راضی نہ ہوں گے اور اپنے دین میں واپس کرنے کی کوششیں کرتے رہیں گے (وہ اپنے دین

میں پختہ ہیں تم اپنے دین میں پختہ رہو، وہ تمہیں اپنے دین میں کھینچنا چاہتے ہیں تم انہیں اپنے دین میں لانے کی کوشش کرتے رہو)۔

مرتد کے احکام......اس کے بعد فرمایا......وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے، پھر حالتِ کفر میں مرجائے تو دنیا و آخرت میں اُن لوگوں کے اعمال اکارت ہوجائیں گے اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے)۔

اس میں مرتد کے بعض احکام بتائے ہیں، دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد جو شخص اس کو چھوڑ کر کوئی سا بھی دین اختیار کرے۔ (اور اسلام کے علاوہ ہر دین کفر ہی ہے) تو اس نے زمانۂ اسلام میں جو اعمال کئے تھے وہ سب ضائع ہوگئے۔ کفر کی وجہ سے ان سب کا اجر و ثواب ختم ہوگیا دنیا میں بھی اُن اعمال کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جو زمانہ اسلام میں کئے تھے اور آخرت میں بھی ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا، اور دوسرے کافروں کی طرح وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں جائے گا۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اور جو شخص ایمان کا منکر ہوجائے تو اس کے اعمال حبط ہوگئے اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا) جو شخص مُرتد ہوجائے (العیاذ باللہ) اس سے بات کی جائے، اس کا جو کوئی شُبہ ہو دُور کیا جائے اور تین دن اسے بند رکھا جائے، اگر تین دن گزر جانے پر اسلام قبول نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اور اگر عورت مُرتد ہوجائے۔ (العیاذ باللہ) اور باوجود سمجھانے کے دوبارہ اسلام نہ لائے تو اسے بند کر دیا جائے یہاں تک کہ مسلمان ہوجائے اگر اسلام قبول نہ کرے تو موت آنے تک جیل ہی میں رکھی جائے۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اسے بھی تین دن کی مہلت دینے کے بعد قتل کر دیا جائے، جب کسی نے اسلام کے بعد کفر اختیار کر لیا تو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کے تمام اموال اس کی ملک سے نکل گئے، پھر اگر مسلمان ہوگیا تو واپس اس کی مِلک میں آجائیں گے، اگر حالتِ کفر میں مرگیا یا مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تو اس کے وہ اموال جو اُس نے زمانہ اسلام میں کسب کئے تھے اس کے مسلمان وارثوں کو مل جائیں گے۔ اور جو مال اس نے مرتد ہونے کی حالت میں کمایا اس پر مالِ فئی کے احکام جاری ہوں گے۔ (یعنی اس کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا اور حسبِ قواعد مسلمانوں کی ضرورتوں میں خرچ کر دیا جائے گا۔) یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔ اور حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ دونوں قسم کے اموال پر فئی کے احکام جاری ہوں گے۔

اور جیسے ہی کوئی شخص مرتد ہوجائے اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی۔ اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کی اسے میراث پہنچی تھی تو اس کی میراث سے یہ شخص محروم ہوگا۔ مرتد کی نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اور اس کا ذبیحہ بھی حرام ہوگا۔ ارتداد سے پہلے جو بھی نیک کام نماز، روزہ، حج، عمرہ وغیرہ کیا تھا یہ سب ضائع ہوگیا۔ آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ شخص دوبارہ مسلمان ہوجائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ سو اس کے بارے میں جان لینا چاہیے کہ آخرت میں دوزخ سے بچ جائے گا اور دنیا میں بھی آئندہ احکامِ اسلام اس پر جاری ہوں گے اور اسے خود بھی احکام اسلام پر عمل پیرا ہونا لازم ہوگا اور عام مسلمان بھی اس سے مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے۔ رہی یہ بات کہ اس کے گزشتہ اعمالِ صالحہ کا ثواب پھر سے واپس ملے گا یا نہیں اور جو حج کر لیا تھا اس کی فرضیت دوبارہ عود کرے گی یا نہیں، اس بارے میں حضرات ائمہ کرامؒ کا اختلاف ہے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مرتد ہوجانے کی وجہ سے جو اس کے اعمال ضبط ہوگئے تھے اب دوبارہ مسلمان ہونے سے ان کا ثواب واپس نہ ہوگا اور جو حج کر لیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔ اب حج فرض دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔ مُرتد ہونے کی وجہ سے جو بیوی

نکاح سے نکل گئی تھی دوبارہ اسلام قبول کرنے سے پھر باہمی رضامندی سے نکاح کریں تو ہوسکتا ہے دوبارہ نکاح نہ کیا تو اس کی بیوی نہ ہو گی۔

لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کے عموم میں مُرتد شامل نہیں...... یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرتد دوبارہ اسلام قبول نہ کرنے سے جو قتل کیا جائے گا یہ تو ایک قسم کا جبر ہے حالانکہ سورۂ بقرہ ہی میں دوسری جگہ (ع ۳۴) لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ فرمایا ہے جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے درحقیقت یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ان کافروں سے متعلق ہے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، جب کسی نے ایک مرتبہ اسلام قبول کرلیا اور اس کو حق مان لیا دلائل سے سمجھ لیا اس کی برکات دیکھ لیں تو اب اس کے لئے صرف یہی ہے کہ یا اسلام قبول کرے یا قتل کردیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ ۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۲۳ ج ۲)

آخر میں یہ جو فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا (الآیۃ) اس کے بارے میں مفسر ابن کثیر ص ۲۵۴ ج ا لکھتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن جحش ؓ اور ان کے ساتھیوں کا مسئلہ حل ہو گیا اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لائے ہوئے مال کو جو کافروں سے لیا تھا ۵/۱ نکال کر باقی مال انہی پر تقسیم فرمادیا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم اس بات کی اُمید کریں کہ جو کچھ ہم نے کیا یہ ہمارے لئے جہاد شرعی میں شمار ہو جائے گا اور اس میں ہمیں وہ اجر مل جائے گا جو مجاہد کو ملا کرتا ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ شانہٗ نے واضح طور پر بتادیا کہ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں یہ لوگ رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کا اُمید رکھنا بھی صحیح ہے اور ان لوگوں سے جو خطأً اجتہادی کے طور پر ایک آدمی قتل ہو گیا تھا وہ بھی اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا۔

فائدہ...... قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ کَبِیْرٌ (آپ فرمادیجئے کہ شہر حرام میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ شہر حرام میں قتال کرنا ممنوع ہے۔ سورۂ براءت کی آیت اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ سے بھی خوب واضح طور پر چار مہینوں میں قتال کرنے کی حرمت معلوم ہو رہی ہے۔ ان چار مہینوں میں قتال کی حرمت اب بھی باقی ہے یا نہیں اس بارے میں اختلاف ہے، حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے تھے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے لہٰذا اشہر حرم میں قتال کرنا جائز نہیں الا یہ کہ دشمن قتال کرنے لگے تو اس کے جواب میں قتال کرنا جائز ہوگا، حضرت سلیمان بن یسار اور سعید بن المسیب فرماتے تھے کہ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت منسوخ ہوگئی اور اب اشہر حرم میں قتال کرنا جائز ہے، علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں: وھو قول فقهاء الأمصار (کہ یہی فقہاء امصار کا قول ہے)

پھر لکھتے ہیں کہ پہلا حکم حرمت قتال والا منسوخ ہے۔ آیت کریمہ اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ اور دوسری آیت قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اشہر حرم میں قتال کرنے کی ممانعت کے بعد نازل ہوئی۔ (احکام القرآن ص ۳۲۲ ج ۱)

علامہ قرطبی ص ۴۳ ج ۳ میں لکھتے ہیں کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتال کرنے کی ممانعت منسوخ ہوچکی ہے اور اب ان میں قتال کرنا مباح ہے، اس کا ناسخ کون ہے۔ اس میں اختلاف ہے حضرت زہریؒ نے فرمایا کہ آیت کریمہ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّةً (سورۂ توبہ) نے اسے منسوخ کردیا اور بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں بنی ثقیف سے جہاد فرمایا تھا اور حضرت ابو عامر اشعری کو شہر حرام میں وادی اوطاس میں جہاد کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اھ

بہر حال جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اَشہرِ حرم میں قتال کرنے کی ممانعت منسوخ ہے۔ ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے اور اگر دشمن جنگ کی ابتداء کردیں تو اس صورت میں وہ حضرات بھی جنگ کرنے کی اجازت دیتے ہیں جو اس حکم کو منسوخ نہیں مانتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ

وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں، اور ان کا گناہ ان کے نفع

نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

سے بڑا ہے، اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے کہ جو زائد ہو وہ خرچ کر دیں اللہ ایسے ہی بیان فرماتا ہے آیات،

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ

تاکہ تم فکر کرو۔ دنیا میں اور آخرت میں، اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں یتیموں کے بارے میں، آپ فرما دیجئے کہ اصلاح کرنا ان کے لئے

خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ آپس میں ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ تم میں مفسد کون ہے مصلح کون ہے اور اللہ چاہتا تو تم کو مشقت

لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

میں ڈال دیتا، بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

شراب اور جوئے کی حُرمت

ان آیتوں میں اوّل تو شراب اور جوئے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں پھر یہ فرمایا کہ ان کا گناہ ان کے منافع سے بڑا ہے، اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ کسی چیز کے نفع مند ہونے سے اُس کا حلال ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز نفع مند ہو اور حرام بھی ہو۔ حرام حرام ہی رہے گا خواہ اس میں کتنا ہی بڑا نفع ہو۔ اور اس کے ارتکاب میں گناہ ہوگا جو دنیا و آخرت میں باعثِ وبال ہوگا۔ شراب اور جوئے کے بارے میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ تعالیٰ ہم سورۂ مائدہ کی آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ (الآیۃ) کے ذیل میں لکھیں گے۔ یہاں اتنا سمجھ لیں کہ نشہ لانیوالی ہر چیز کا پینا حرام ہے اور ہر ایک جوا حرام ہے۔ جس طرح سے بھی ہو اور جس صورت میں بھی ہو، اس کا جو بھی نام رکھ لیا جائے حرام ہی رہے گا۔

فی سبیل اللہ کیا خرچ کریں؟...... پھر ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں یہ سوال چونکہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ وہاں یہ جواب دیا تھا کہ جو بھی تم مال خرچ کرو اپنے والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو چونکہ وہاں مصارف بتانے کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے وہاں خرچ کے مواقع بتا دیئے اور پھر یہ بتا دیا کہ جو بھی کوئی خیر کا کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا (اور وہ اس کا ثواب عطا فرمائے گا) اور یہاں الفاظِ سابقہ میں جو دوبارہ سوال مذکور ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ اس پر زور ہے کہ کیا خرچ کریں؟ لہٰذا انہیں اسی سوال کا جواب دے دیا گیا۔

لباب النقول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہوا تو چند صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے مالوں میں جو مقرر فرما دیا گیا ہے وہ کس قدر ہے، ہم اس میں سے کتنا خرچ کریں ان کے سوال کے جواب میں اللہ جل شانہٗ نے آیت کریمہ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ نازل فرمائی اور سوال کرنے والوں کے جواب میں فرمایا کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ساتھ ہی یہ فرمایا: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کہ تم خرچ کرنے میں غور وفکر سے کام لو، آخرت کی ضرورت دیکھو، اور دنیاوی ضروریات کو بھی سمجھو، ایسا نہ ہو کہ خرچ ہی نہ کرو کہ ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہو وہ پڑا ہی رہے اور جمع ہی ہوتا رہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ سب خرچ کرکے بیٹھ رہو اور فقر وفاقہ میں مُبتلا ہو کر کل کو دوسروں سے مانگنے کی نوبت آجائے، نیز جوشِ سخاوت میں ایسا بھی نہ ہو کہ اہل وعیال جن کے حقوق واجب ہیں ان کا کوئی حق ضائع ہو جائے، ضرورت سے زیادہ جو مال جمع ہو جائے اگر اس میں سے فرض زکوٰۃ اور صدقات ونفقات واجبہ ادا ہوتے رہیں تو اس کا جمع کرنا جائز تو ہے لیکن خرچ کر دینا افضل ہے اس میں احوال بھی مختلف ہوتے ہیں، کسی میں زُہد غالب ہے اور جتنا زائد ہو سب خرچ کر دیتا ہے اس کی بھی گنجائش ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات ادا کرنے کے بعد زائد مال میں سے للہ فی اللہ کچھ خرچ کر دے اور کچھ رکھ لے تو اس کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت زیادہ خرچ کرتے تھے لیکن ان کے پاس مال جمع بھی رہتا تھا اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا آپؐ نے نکیر نہیں فرمائی۔

پھر ارشاد فرمایا: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کہ وہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں پھر اس سوال کا جواب عنایت فرمایا، جواب سمجھنے سے پہلے آیت کا سببِ نزول سمجھ لیا جائے اس سے سوال کا مضمون بھی واضح ہو جائے گا، اور پھر جواب بھی سمجھ میں آجائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

درمنثور ص ۲۵۵ میں بحوالہ سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب آیتِ کریمہ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو احسن ہو) اور آیت کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ (جو لوگ یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں) نازل ہوئی تو وہ صحابہؓ جن کے پاس کوئی یتیم تھا انہوں نے یتیم کا کھانا پینا الگ کر دیا (یتیم کے لئے الگ پکاتے اور اپنے لئے الگ تیار کرتے) ایسا کرنے سے یتیم کے کھانے میں سے کچھ حصہ بچ جاتا تھا اسے رکھ لیتے تھے پھر بعد میں وہ یتیم کھالیتا تھا یا خراب ہو جاتا تھا، جب یہ صورتِ حال پیش آئی تو ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پوری کیفیت پیش کی اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (درمنثور ص ۲۵۵ ج ۱)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مقصود اصلی اصلاح ہے۔ یتیم بچوں کا مال اس طریقہ پر ان پر خرچ کرو کہ ان کا نقصان بھی نہ ہو اور کوئی خراب نیت بھی نہ ہو کہ اس کا مال ساتھ ملا کر پکانے میں اس کے حصہ میں سے اپنے اوپر یا اپنے بچوں پر خرچ ہو جانے کی نیت ہو ان کا مال اپنے مال میں ملا کر پکانے میں چونکہ مصلحت پیشِ نظر ہے کہ ان کا مال زیادہ خرچ نہ ہو اور ضائع نہ ہو تو اس میں کوئی مؤاخذہ اور محاسبہ کی بات نہیں ہے وہ تمہارے بھائی ہیں۔ بھائیوں کی طرح مل جُل کر اصلاح وخیر خواہی مدنظر رکھتے ہوئے کھاؤ اور پیو، اللہ تعالیٰ شانہٗ مصلح کو بھی جانتا ہے۔ (جس کی نیت اصلاح کی ہو)، اور مفسد کو بھی جانتا ہے جس کی نیت خراب ہو اور فساد اور بگاڑ کا ارادہ رکھتا ہو۔

پھر فرمایا کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا اور تم کو حکم دیتا کہ یتیموں کا ہر حال میں الگ پکاؤ اور ایسے انداز سے پکاؤ کہ ذرا بھی خراب نہ ہو اور یہ تمہارے لئے مشکل اور دشواری کا باعث ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے آسانی عطا فرما دی، آسانی پر عمل کرو، اور نیت اچھی رکھو، آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی غلبہ والا ہے اور وہ مؤاخذہ فرمائے تو کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اور وہ حکیم بھی ہے اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

اور نکاح نہ کرو مشرک عورتوں سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، اور البتہ ایمان والی باندی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں اچھی لگے

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ

اور نہ نکاح کرو اپنی عورتوں کا مشرکین سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، البتہ ایمان والا غلام بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے، یہ لوگ

يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

بلاتے ہیں دوزخ کی طرف، اور اللہ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے، اور اللہ بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اپنی آیات

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

ع ۲۷ / ۱۱

مُشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت

اس آیت شریفہ میں مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مشرک عورتوں سے نکاح کریں، ہاں اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان سے نکاح کرنا جائز ہوگا مشرک عورتیں بعض مرتبہ حسن و جمال یا اموال کے اعتبار سے اچھی معلوم ہوتی ہیں اور ان سے نکاح کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تم مشرکہ سے نکاح نہ کرو، اگر کوئی باایمان لونڈی مل جائے تو اس سے نکاح کر لو۔ وہ تمہارے لئے مشرک عورت سے بہتر ہے۔ پھر دوسرا حکم ارشاد فرمایا کہ مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو، مشرک کی نسبت مؤمن غلام بہتر ہے (تم اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کرو) ہاں اگر کوئی مشرک مسلمان ہو جائے تو وہ تمہارا دینی بھائی ہو گیا اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کر سکتے ہو۔

آخر میں مشرکوں سے بچنے اور ان سے ازدواجی تعلقات قائم نہ کرنے کی علت بتادی کہ مشرکین دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، مشرکین سے مرد ہوں یا عورت ازدواجی میل جول رکھنے میں خطرہ ہے کہ مسلمان مرد ہو یا عورت خدانخواستہ ان کے عقائد سے متاثر ہو جائے اور کسی دن ایمان کھو بیٹھے اور مستحق دوزخ ہو جائے، پھر مسئلہ اولاد کا بھی پیدا ہوگا مرد مشرک ہو یا عورت وہ اولاد کو ضرور اپنے دین پر لگائیں گے۔ اگر اولاد مشرک ہوگئی تو دوزخی ہوگی۔ لامحالہ مؤمن مرد و عورت مشرک مرد و عورت سے بہتر ہے چاہے وہ مؤمن غلام یا باندی ہی ہو، چونکہ نہ تو وہ اپنے جوڑے کو دوزخ کی دعوت دیتا ہے اور نہ اولاد کو دوزخ کے راستہ پر ڈالتا ہے۔

فائدہ...... آیت کے عمومِ الفاظ سے ظاہر ہے کہ کسی مؤمن عورت کا کسی مشرک مرد سے اور کسی مؤمن مرد کا کسی مشرک عورت سے

نکاح درست نہیں ہے اور اس عموم میں ہر طرح کے کافر داخل ہیں۔ ملحد زندیق دہریئے بھی اسی حکم میں آ جاتے ہیں۔ ایسے مردوں اور عورتوں سے کسی مرد مؤمن اور عورت مؤمنہ کا نکاح درست نہیں اگر نکاح کر لیا تو وہ نکاح شرعی نکاح نہ ہوگا اور اس کی بنیاد پر ازدواجی تعلقات حرام ہوں گے، البتہ کتابی عورت (یہودیہ ہو یا نصرانیہ) سے مسلمان مرد کا نکاح دُرست ہے اور اُس کا جواز سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں بیان فرما دیا ہے، اس کے بعض احکام ہم وہیں بیان کریں گے ان شاء اللہ، یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اگرچہ یہودیہ ونصرانیہ عورت سے مسلمان کا نکاح درست ہے لیکن اُن سے بچنا افضل ہے خاص کر اس زمانہ میں جبکہ یہ عورتیں مسلمانوں سے نکاح کرتی ہی اس لئے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دین پر لے آئیں اور اولاد کو بھی اپنے دین پر ڈال دیں، اور مسلمانوں کی اندرونی خبریں دُشمنانِ اسلام کو پہنچایا کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اس نزاکت کو بھانپ لیا تھا اور اپنے عہد خلافت میں صحابہؓ کو اس سے روکتے تھے۔ (کما فی کتاب الآثار للامام محمد بن الحسن الشیبانی ص ۸۹)

بہت سے ممالک میں جہاں مسلمان مل جل کر رہتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں غیر مذہب اور مسلک کے لڑکے لڑکیاں یکجا ہو کر کلاسوں میں بیٹھتے ہیں وہاں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مقامی حکومت کے قانون کے مطابق کورٹ میں جا کر نکاح کر لیتے ہیں، اگر لڑکا مسلمان ہو اور لڑکی کتابی ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے بشرطیکہ ایجاب وقبول گواہوں کے سامنے ہوا ہو اور اگر لڑکی کتابی نہیں ہے۔ ہندو، سکھ، بدھسٹ، آتش پرست ہو تو یہ نکاح ہونے ہی کا نہیں، اور کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی کافر سے نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ کافر یہودی ونصرانی ہو۔ بہت سے فرقے ایسے بھی ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن وہ اپنے عقائد کی وجہ سے کافر ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو ختم نبوت کے منکر ہیں اور وہ لوگ جو تحریفِ قرآن کے قائل ہیں اور وہ لوگ جو اپنے امام کے اندر خُدائے پاک کا حلول مانتے ہیں یہ سب لوگ بھی کافر ہیں ان سے کسی مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا اور نہ کسی مسلمان مرد کا اس طرح کی کسی عورت سے نکاح ہو سکتا ہے۔

سببِ نزول بیان کرتے ہوئے اسباب النزول ص ۶۶ میں لکھا ہے کہ ابو مرثد غنوی صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناق نامی عورت سے نکاح کرنے کی اجازت چاہی، یہ عورت قریشیہ تھی اور حسن وجمال میں بڑھ کر تھی لیکن وہ مشرکہ تھی اور ابو مرثد مسلمان تھے، ابو مرثد نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ میرے دل کو بھاتی ہے، اس پر آیت وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ نازل ہوئی اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ایک سیاہ فام باندی تھی انہوں نے غصہ میں اس کو ایک طمانچہ مار دیا پھر گھبرائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا، آپؐ نے فرمایا اے عبداللہ! وہ کیسی عورت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! وہ روزہ رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، اور اچھی طرح وضو کرتی ہے اور اللہ کی توحید کی اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے عبداللہ! وہ مؤمنہ ہے، انہوں نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں ضرور اُس کو آزاد کر دوں گا اور اس سے نکاح کر لوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس پر بعض مسلمانوں نے ان پر طعن کیا اور کہا کہ اس نے باندی سے نکاح کر لیا، جو لوگ چاہتے تھے کہ مشرکین سے مناکحت ہوتی رہے (کیونکہ ان لوگوں میں کچھ مال وجمال نظر آتا تھا) ان کی تردید میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ نازل فرمائی۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ

اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ گندگی ہے، سو تم علیحدہ رہو عورتوں سے حیض کے زمانہ میں، اور ان کے پاس نہ جاؤ یہاں

حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ

تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر وہ جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، بے شک اللہ پسند فرماتا ہے خوب توبہ کرنے والوں کو،

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

اور پسند فرماتا ہے خوب پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو۔

حیض والی عورت سے متعلقہ احکام

اللہ جل شانہٗ نے نوعِ انسانی کو بڑھانے اور باقی رکھنے کے لئے مرد عورت کے درمیان خاص تعلق رکھا ہے اور شرعی قانون کے مطابق نکاح ہو جانے سے قواعد اور اُصول کے مطابق آپس میں ایک دُوسرے سے میل ملاپ رکھنے اور قریب تر ہونے کی اجازت دی ہے اور طبعی طور پر مرد عورت میں شہوت رکھی ہے وہ اس شہوت کے تقاضے پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہی شہوت اولاد پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اولاد پیدا ہونے کے لئے شہوت رکھ دی اور پھر اس کی پرورش کروانے کے لئے محبت رکھ دی، جسے مامتا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور تکوینی طور پر عورتوں کے لئے یہ تجویز فرمادیا کہ ان کے رحم سے خون جاری ہوا کرے یہ خون عموماً بالغ عورتوں کو ہر مہینہ جاری ہوتا ہے۔ اسے حیض اور محیض کہا جاتا ہے، شریعت مطہرہ میں اس کے بھی احکام ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے کہ وہ ان ایام میں نہ روزہ رکھیں نہ نماز پڑھیں (اور ایامِ حیض گزر جانے کے بعد نمازوں کی قضا بھی واجب نہیں، البتہ رمضان میں حیض آیا تو پاک ہونے کے بعد ان روزوں کی قضا رکھنا واجب ہے) زمانہ حیض میں مسجد میں داخل ہونا کعبہ شریف کا طواف کرنا، قرآن شریف پڑھنا، اور قرآن شریف چھونا بھی ممنوع ہے۔ (ہاں اگر ایسے غلاف کے ساتھ چھوئے جو قرآن شریف سے الگ ہوتا رہتا ہے تو چھو سکتی ہے)۔

جو احکام حیض سے متعلق ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ان ایام میں عورت کا شوہر اس سے جماع نہ کرے، حیض کے زمانہ میں جماع کرنا حرام ہے۔ جس کو فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں بیان فرمایا ہے، حیض والی عورت کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب جائز ہے، اور ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصہ کو چھوڑ کر شوہر اس سے بوس و کنار کے ذریعہ استمتاع بھی کر سکتا ہے، بہت سی قوموں میں یہ جو رواج ہے کہ حیض کے زمانہ میں عورت اچھوت بنا کر ڈال دی جاتی ہے، شریعتِ اسلامیہ میں ایسا نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ وہ حیض کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُبارک سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھیں اور اُنہوں نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میرے حیض کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری گود میں تکیہ لگا کر قرآن شریف تلاوت فرمالیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میرے حیض کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرماتے تھے کہ تہبند باندھ لو پھر میرے ساتھ لیٹ جاتے تھے۔ (صحیح بخاری ص ۴۳، ۴۴ ج ۱)

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ زمانہ حیض میں پانی پی کر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو برتن دے

دیتی تھی آپ میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے تھے اور میں اپنے دانتوں سے ہڈی کا گوشت چھڑا کر کھا لیتی تھی پھر آپ کو دے دیتی تھی تو آپؐ میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر تناول فرما لیتے تھے۔ (صحیح مسلم ص۱۴۳ ج۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب عورت کو حیض آ جاتا تھا تو اس کے ساتھ نہ تو کھاتے پیتے تھے اور نہ گھروں میں ان کے ساتھ رہتے سہتے تھے حضرات صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کیا کریں تو اس پر اللہ جل شانہٗ نے آیت کریمہ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (آخر تک) نازل فرمائی، آیت نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جماع کرنے کے سوا سب کچھ کرو (اس میں ساتھ کھانے پینے، رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے، لیٹنے کی اجازت ہوگئی) یہودیوں کو جو اس بات کی اطلاع ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ شخص ہر چیز میں ہماری مخالفت کرنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے، ان کی یہ بات سن کر (دو صحابی) اُسَید بن حضیر اور عباد بن بشیر حاضر خدمت ہوئے اور اُنہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہودی ایسا ایسا کہتے ہیں تو کیا ہم ایسا نہ کریں کہ حیض والی عورتوں کے ساتھ رہنا چھوڑ دیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور متغیر ہو گیا۔ (ص۱۴۳ ج۱)

ان روایاتِ حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں جماع کرنے کی ممانعت ہے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی ممانعت نہیں ہے۔ یہ جو فرمایا: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (پس جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ، جس جگہ سے اللہ نے حکم دیا ہے)۔

یعنی عورتوں سے جماع کرنے کے لئے سامنے کے راستہ سے آؤ جو رحم کا راستہ ہے۔ اس میں اس بات کی ممانعت فرمائی کہ کوئی مرد اپنی بیوی سے پیچھے کے راستہ سے شہوت پوری کرے، اس بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ ان شاء اللہ ابھی بیان ہوں گی۔

پھر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (کہ بلاشبہ اللہ پسند فرماتا ہے خوب زیادہ توبہ کرنے والوں کو) اس میں باطنی پاکیزگی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، یعنی گناہوں سے پاک ہونے کا طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے حضور میں توبہ کرے، اور گناہوں کے سوا دوسری تمام گندی چیزوں سے بچنے کی تعلیم اور ترغیب کے لئے وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (اور پسند فرماتا ہے خوب زیادہ پاکی اختیار کرنیوالوں کو) فرمایا، اس میں ہر قسم کی ظاہری گندگیوں سے بچنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ جسم یا کپڑوں میں ناپاکی کا لگا رہنا حالتِ حیض میں جماع کرنا گندی جگہ پر شہوت پوری کرنا، ان سب چیزوں کی بُرائی اور ممانعت اس میں آ گئی۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، سو تم اپنی کھیتی میں آ جاؤ جس طرف سے ہو کر چاہو اور تم اپنی جانوں کے لئے آگے بھیج دو، اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بلاشبہ تم اُس

اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

سے ملاقات کرنے والے ہو، اور مؤمنین کو خوشخبری سنا دو۔

وطی فی الدبر کی حُرمت اور یہود کی ایک بات کی تردید

صحیح بخاری ص۶۴۹ ج۲ میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہودی یوں کہتے تھے کہ جو کوئی مرد عورت کی سامنے کی شرمگاہ

میں پیچھے کی جانب سے جماع کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ ان کے اس خیال کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی، اور فرمایا کہ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ لہٰذا تم اپنی کھیتی میں آجاؤ جیسے چاہو۔ اس میں اوّل تو عورتوں کو کھیتی فرمایا اور مرد عورت کے میل ملاپ کی ضرورت اور فائدہ کو واضح طور پر بیان فرمایا کہ اس کی ضرورت اور مشروعیت اولاد طلب کرنے کے لئے ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ (کے رکوع ۲۲) میں وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ فرمایا ہے۔ نکاح کرنے میں جہاں نفس ونظر کی حفاظت ہے۔ وہاں طلبِ ولد بھی مطلوب ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی عورت سے نکاح کرو جو محبت رکھنے والی ہو اور اس سے اولاد زیادہ پیدا ہونے والی ہو (جس کا اندازہ خاندانی عورتوں کے احوال سے ہوجاتا ہے) کیونکہ میں (قیامت کے دن) تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ (سنن ابوداؤد ص ۲۸۰ ج ۱)

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اولاد کی پیدائش پر کوئی پابندی لگانا یا اولاد کی کثرت کے خلاف منصوبے بنانا شریعت اسلامیہ کے مقصد اور مزاج کے خلاف ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ تم اپنی کھیتیوں میں آجاؤ جس طرف سے ہوکر چاہو آجاؤ اس میں یہ بتادیا کہ عورت کے پاس مرد کے آنے کا راستہ صرف ایک ہی ہے، یعنی وہ راستہ جسے اختیار کرنے سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اس میں اس بات کی بھی ممانعت فرمائی کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے پیچھے کے راستہ سے شہوت پوری کرے کیونکہ وہ راستہ کھیتی کا نہیں ہے بلکہ اس کی گندگی حیض والی گندگی سے زیادہ ہے۔ پہلے تو فرمایا:

فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ

پھر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ

پھر فرمایا فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ اس میں ایک ہی سیاق میں تین اسلوب اختیار فرما کر عورت کے پیچھے والے راستہ سے شہوت پوری کرنے کی ممانعت فرمادی بعض اکابر نے فرمایا کہ غالباً صریح الفاظ میں اس کا ذکر نہ فرمانا اس لئے ہے کہ صراحۃً ایسے خبیث و بدترین فعل کا تذکرہ بصورت نفی یا بصورت نہی بھی گوارہ نہیں فرمایا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی حیض والی عورت سے شہوت پوری کی یا کسی عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت والا کام کیا، یا کسی ایسے شخص کے پاس آیا جو غیب کی خبریں بتاتا ہو تو وہ اس دین کا منکر ہوگیا جو محمد (ﷺ) پر نازل کیا گیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۶)

تفسیر درِ منثور ص ۲۶۴ ج ۱ میں بحوالہ ابوداؤد والنسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس شخص نے کسی مرد یا کسی عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کیا وہ ملعون ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کرے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ایسا کام کافر ہی کرسکتا ہے (درمنثور) معلوم ہوا اغلام کرنا اپنی بیوی کے ساتھ بھی حرام ہے، اور اہلِ کفر کا طریقہ ہے۔ أعاذ الله منه كل مؤمن۔

یہ جو فرمایا: فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (کہ تم اپنی کھیتی میں آجاؤ جیسا چاہو) اس کا مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، سامنے سے، پیچھے سے اپنی بیویوں سے لذت حاصل کرو، بشرطیکہ کھیتی کی جگہ پر آؤ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ (آخر تک) نازل ہوئی ہے۔ اس میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ عورت سے جو خاص تعلق ہے اس کے لئے آگے سے آؤ یا پیچھے سے

آ ؤ (دونوں طرح اختیار ہے) اور دبر میں (یعنی پیچھے کے راستہ میں) اور حیض کے زمانہ میں جماع کرنے کی ممانعت فرمادی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا جس نے کسی مرد یا عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کیا۔ (رواہ الترمذی)

پھر فرمایا: وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (کہ اپنی جانوں کے لئے خیر آگے بھیج دو، اور اللہ سے ڈرو) اس میں ہر خیر کا حکم آ گیا اور ہر شر سے بچنے کی تاکید آ گئی وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے عموم میں تمام گناہوں کے چھوڑنے کا حکم فرمادیا۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، پھر تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ بتادیا، اور فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (کہ تم جان لو کہ بے شک تم اللہ سے مُلاقات کرنے والے ہو) جو شخص یوم القیامہ کی حاضری اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں پیشی کا یقین رکھے گا اور بار بار اس کا استحضار کرے گا۔ اُسے ان شاء اللہ تعالیٰ صفتِ تقویٰ حاصل ہوگی۔

آخر میں فرمایا: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (کہ مؤمن بندوں کو کامیابیوں کی اور نعمتوں کی بشارت دے دیجئے)۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ

اور اپنی قسموں کے ذریعہ نیکی کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کے لئے اللہ کو آڑ نہ بناؤ اور اللہ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اپنی قسموں کو نیکی اور تقویٰ سے بچنے کا ذریعہ نہ بناؤ

اسباب النزول ص ۷۲ میں ہے کہ یہ آیت شریفہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، ان کے بہنوئی اور بہن کے درمیان کچھ ناراضگی ہوگئی تھی انہوں نے قسم کھائی کہ اس کے پاس کبھی بھی نہیں جائیں گے اور نہ اس سے بات کریں گے اور نہ میاں بیوی کے درمیان صلح کرائیں گے وہ کہتے تھے کہ میں نے تو قسم کھا رکھی ہے۔ اب میں اس کی خلاف ورزی کیسے کروں۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔

تفسیر درمنثور ص ۲۶۸ ج ۱ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بعض مرتبہ کوئی شخص قسم کھا لیتا تھا کہ فلاں نیکی اور تقویٰ کا کام نہیں کروں گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔

اگر کوئی شخص قسم کھائے تو خیر کی قسم کھائے یعنی نیک کام کے ارادہ کو مؤکد کرنے کے لئے قسم کھائی جاسکتی ہے لیکن نیکی نہ کرنے پر قسم کھانا اور گناہ کرنے پر قسم کھانا شرعاً ممنوع ہے بعض لوگ جو قسم کھا لیتے ہیں کہ میں فلاں عزیز کے گھر نہیں جاؤں گا یا فلاں مسلمان بھائی کی دعوت قبول نہیں کروں گا یا جماعت سے نماز نہیں پڑھوں گا یا فلاں گناہ کروں گا۔ ایسے لوگوں کو آیت بالا میں ہدایت دی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کو نیکیوں سے بچنے اور تقویٰ چھوڑنے کا ذریعہ مت بناؤ، قسم کھا بیٹھے اب کہتے ہیں کہ قسم کے خلاف کیسے کریں؟ حالانکہ قسم اس لئے نہیں ہے کہ اس کو خیر سے بچنے کا ذریعہ بنایا جائے، اگر کوئی شخص گناہ کی قسم کھالے تو اس کا توڑنا واجب ہے۔

قطع رحمی کی یا کسی بھی قسم کے گناہ کی قسم کھالے تو اس پر لازم ہے کہ قسم توڑ دے اور اس کے خلاف کرلے، اور قسم کا کفارہ دیدے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنے چچا کے بیٹے کے پاس جاتا ہوں اس سے کچھ سوال کرتا ہوں سو وہ مجھے نہیں دیتا اور صلہ رحمی نہیں کرتا، پھر اسے حاجت درپیش ہو جاتی ہے تو مجھ سے آ کر سوال کرنے لگتا ہے حالانکہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں اسے کچھ نہ دوں گا اور صلہ رحمی نہیں کروں گا، اس کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں وہ کام کروں جو خیر ہو اور قسم کا کفارہ دیدوں (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۹۷) سورۂ نور میں ارشاد فرمایا: وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَالْمُهَاجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ط اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللهُ لَکُمْ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. اور جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں اور چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کر دے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک بھانجہ پر خرچ کیا کرتے تھے اس سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بہت ناراضگی ہوئی اور انہوں نے قسم کھالی کہ اب اس پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر سورۂ نور کی مذکورہ آیت بالا نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو کوئی قسم کھالے پھر تو دیکھے کہ جس چیز پر قسم کھائی ہے دُوسری چیز اس سے بہتر ہے (جو اس کے مقابل ہے) تو اس بہتر صورت کو اختیار کر لے (اور اس کے اختیار کرنے سے جو قسم ٹوٹ گئی) اس کا کفارہ دے دے۔ (رواہ البخاری و مسلم کما فی المشکوٰۃ ص ۲۹۶)

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ط وَاللهُ

اللہ تعالیٰ تمہارا مؤاخذہ نہیں فرمائے گا تمہاری لغو قسموں کے بارے میں، لیکن مؤاخذہ اُس بات پر فرمائے گا جس کا تمہارے دِلوں نے ارادہ کیا اور اللہ

غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

غفور ہے حلیم ہے۔

قسموں کی قِسموں کا بیان اور ان کے احکام

جو قسم کھائی جائے اس کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ گزشتہ کسی فعل پر جھوٹی قسم کھائی جائے، جو کام نہیں کیا تھا اس کے بارے میں قسم کھالے کہ میں نے کیا، یا جو کام کیا تھا اس کے بارے میں قسم کھالی کہ یہ میں نے نہیں کیا، اس کو یمین غَمُوس کہا جاتا ہے، اس کا بہت بڑا گناہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو قتل کرنا اور یمین غموس۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷)

یہ لفظ غَمس سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو پوری طرح کسی دوسری چیز میں داخل کر دیا جائے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جھوٹی قسم کو یمین غموس اس لئے کہا گیا کہ یہ اولاً گناہ میں پھر دوزخ میں داخل کر دیتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آئندہ کسی کام کے بارے میں قسم کھائے، مثلاً یوں کہے کہ اللہ کی قسم یہ کام ضرور کروں گا، یا اللہ کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا، اس کو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ جو سورۃ مائدہ کے رکوع ۱۲ میں مذکور

ہے کفارۂ قسم کی تفصیلات ان شاء اللہ تعالیٰ وہیں بیان ہوں گی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی گزشتہ کام پر قسم کھالی اور یہ سمجھ کر قسم کھائی کہ میں سچ بول رہا ہوں سچی قسم کھا رہا ہوں، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ تھا جیسا اس نے سمجھا تھا اپنے خیال میں اس نے سچی قسم کھائی لیکن اصل واقعہ اس کے خلاف تھا۔ اس قسم کا نام یمین لغو ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا، یمین لغو کی دوسری تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یوں منقول ہے کہ باتوں باتوں میں قسم کی نیت کے بغیر جو زبان سے لا و اللہ اور بلی و اللہ نکل جاتا ہے۔ یہ یمین لغو ہے۔ (رواہ البخاری ص ۹۸۶ ج ۲)

یمین لغو میں کیونکہ ارادہ نہیں ہوتا اس لئے اس پر مواخذہ نہیں ہے۔ آیت کے ختم پر فرمایا: وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے جو یمین لغو پر مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ اور بُردبار بھی ہے سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کے بارے میں قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لئے چار مہینہ کا انتظار ہے پھر اگر رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کا بیان

جو کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا۔ اس کے لئے شریعت میں کچھ احکام ہیں۔ اگر قسم کھا کر یوں کہا کہ اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا لیکن کوئی مدت مقرر نہیں کی، یا یوں کہا کہ چار ماہ تک اس سے جماع نہیں کروں گا یا چار ماہ سے زیادہ کا ذکر کر دیا (جس میں ہمیشہ کے لئے قسم کھانا بھی شامل ہے) یا چار مہینہ سے کم مدت مقرر کر دی۔ تو اِن سب صورتوں میں پہلی تین صورتوں کو ایلاء کہا جاتا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں اگر چار مہینے گزر گئے اور اس نے قسم نہیں توڑی یعنی اس مُدت میں بیوی سے جماع نہیں کیا تو اس سے ایک بائن طلاق واقع ہو جائے گی۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اب بلا نکاح ثانی کے رجوع نہیں ہو سکتا۔ آپس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اور مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں اگر چار ماہ کے اندر اس بیوی سے جماع کر لیا جس سے ایلاء کیا تھا تو قسم ٹوٹ گئی۔ اور اس صورت میں بیوی تو نکاح سے نہیں نکلی لیکن قسم ٹوٹ جانے کی وجہ سے قسم توڑنے کا کفارہ واجب ہوگا جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے۔ اب رہ گئی چوتھی صورت جس میں چار مہینہ سے کم کی مدت مقرر کر کے بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اس میں اگر مُدت مقررہ کے اندر جماع کر لیا تو قسم توڑنے کا کفارہ واجب ہوگا اور بیوی نکاح سے نہیں نکلے گی، اور مُدتِ مقررہ پوری کر لی تو قسم پوری ہو گئی جس کا کوئی کفارہ نہیں اور نکاح بھی اپنی حالت پر باقی رہا۔ قسم کھانے کے بعد رجوع کرنے کو فیئ کہتے ہیں، عربی زبان میں یہ لفظ بھی رجوع کے معنیٰ میں آتا ہے۔

فائدہ اولیٰ...... ایلاء کی صورت میں حکم ایلاء اسی وقت ختم ہوگا جبکہ چار مہینہ کے اندر جماع کر لے، یہ رجوع بالعمل ہے لیکن اگر کوئی ایسی مجبوری ہو کہ جماع نہیں کر سکتا مثلاً یہ کہ عورت مریض ہے جماع کے قابل نہیں یا کم عمر ہے تو اس صورت میں رجوع بالقول بھی ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ مدت ایلاء میں زبان سے کہہ دے فِئْتُ اِلَیْھَا (یعنی میں نے اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لیا) لیکن اگر مُدتِ ایلاء کے اندر پھر

جماع پر قادر ہوگیا تو یہ رجوع باللسان باطل ہوجائے گا اور اب لازم ہوگا کہ رجوع بالعمل کرے، یعنی جماع کرلے، اگر جماع نہ کیا اور چار مہینے گزر گئے تو حسبِ قانون طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔

فائدہ ثانیہ...... اگر یوں قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی اس سے جماع نہیں کروں گا اور چار مہینہ تک جماع نہیں کیا تو ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور قسم باقی رہے گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر پھر اس سے نکاح کرلیا تو قسم باقی رہنے کی وجہ سے ایلاء کا حکم نافذ ہوگا۔ اگر اس دوسرے نکاح کے بعد چار مہینے کے اندر جماع کرلیا تو قسم ٹوٹ گئی، جس کا کفارہ واجب ہوگا اور بیوی پر طلاق واقع نہ ہوگی، لیکن اگر نکاح ثانی کی ابتداء سے لے کر چار ماہ پورے ہوجانے تک جماع نہ کیا تو پھر طلاق بائن واقع ہوجائے گی پھر اگر تیسرے نکاح کے بعد سے لے کر چار ماہ گزر جانے تک جماع نہیں کیا تو تیسری طلاق واقع ہوجائے گی اور اس مُدت کے اندر جماع کرلیا تو طلاق واقع نہ ہوگی لیکن قسم ٹوٹ جائے گی اس کا کفارہ دینا ہوگا۔ (من الھدایہ)

فائدہ ثالثہ...... یہ چار ماہ جن کا بار بار ذکر ہوا چاند کے حساب سے معتبر ہوں گے۔ اس میں شمسی مہینوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسباب النزول ص ۲۷ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہلِ جاہلیت کا ایلاء سال دو سال اور اس سے زیادہ بھی جاری رہتا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے چار مہینہ کی میعاد مقرر فرمادی، لہٰذا چار مہینے سے کم پر جو قسم کھائے گا تو وہ ایلاء نہ ہوگا (اگرچہ خلاف ورزی کرنے پر قسم کا کفارہ دینا لازم ہوگا۔) اور چار ماہ یا اس سے زیادہ کی قسم کھانے پر چار مہینے تک فئی نہ کرے گا تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ (مطلق قسم چونکہ چار ماہ کو بھی شامل ہے اس لئے وہ بھی ایلاء ہوگی)۔

حضرت سعید بن المسیب نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے عورتوں کو تکلیف پہنچانے کے لئے ایلاء کا طریقہ اختیار کررکھا تھا، جو شخص اپنی بیوی کو نہیں چاہتا تھا اور ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے تو یہ قسم کھالیتا تھا کہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں جائے گا پھر اس کو اسی حال پر چھوڑے رکھتا تھا اور عورت کی زندگی اس طرح گزرتی تھی کہ نہ شوہر والی ہے اور نہ بے شوہر والی ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے ایلاء کی ایک مدت مقرر فرمادی۔ اور آیت شریفہ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ (آخر تک) نازل فرمادی۔ (معالم التنزیل ص ۲۰۲ ج ۱)

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنی جانوں کو روکے رکھیں تین حیض آنے تک، اور ان کے لئے یہ بات حلال نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا فرمایا

اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا

ہے اسے چھپائیں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر، اور اُن کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں اس مُدت کے اندر اگر

اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اصلاح کا ارادہ کریں، اور عورتوں کیلئے اس جیسا حق ہے جو انکے اوپر ہے اچھے طریقے پر، اور مردوں کو انکے مقابلہ میں درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

مطلقہ عورتوں کی عدت کا بیان

مرد عورت آپس میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، اس حاجت کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کا قانون مشروع فرمایا ہے اور

نکاح اس لئے ہے کہ دونوں اطمینان اور سکون کے ساتھ اچھی زندگی گزاریں اور مل جل کر حسنِ سلوک کے ساتھ رہیں اور زندگی بھر نباہنے کی کوشش کریں، آپس میں کوئی ناگوار بات ہو جائے تو اس سے درگزر کرتے رہیں، لیکن کبھی ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ ساتھ رہنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سے یا دونوں طرف سے طبیعت کا جوڑ نہیں کھاتا اور باہمی میل جول کی خوبصورتی کے ساتھ کوئی صورت نہیں بنتی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے طلاق اور خلع کا قانون مشروع فرمادیا۔ بہت سی قوموں میں نکاح تو ہے لیکن طلاق نہیں ہے۔ یہ لوگ پہلے اسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے لیکن جب حالات نے مجبور کیا تو خود طلاق کا قانون بنا کر اپنے دین میں داخل کر رہے ہیں چونکہ ان کا دین اپنا ہی بنایا ہوا ہے اس لئے اس میں کمی بیشی بھی کرتے رہتے ہیں۔

ہر چند کہ اسلام میں میاں بیوی کا آپس میں نباہ بہت زیادہ محبوب و مرغوب ہے لیکن اس قدر مجبور بھی نہیں کیا کہ باہمی ساتھ رہنے میں اچھے طریقہ پر زندگی نہ گزار سکیں تو خواہ مخواہ بد دلی کے ساتھ نباہتے رہیں اور ایک دُوسرے کے لئے سوہانِ روح بنا رہے۔

اسلام میں جو طلاق کا قانون ہے اس کے کچھ احکام بھی ہیں۔ اِن احکام میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت طلاق کے بعد کچھ ایسی مُدت گزارے گی۔ جس میں کسی دُوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکے گی۔ اس مُدت کے گُزرنے کو عدت کہتے ہیں، عدت لغت میں شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے، چونکہ عورت کو یہ مُدت گزارنے کے لئے مہینے یا حیض شُمار کرنے پڑتے ہیں اس لئے اس کو عدت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، عدت کے بعض احکام یہاں آیتِ بالا میں مذکور ہیں اور بعض احکام سورۂ طلاق کے پہلے رکوع میں ذکر فرمائے ہیں۔ جس عورت کو اس کا شوہر طلاق دے دے تو دیکھا جائے گا کہ اس کو حمل ہے یا نہیں، اگر اس کو حمل ہے تو اس کی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہو جانے پر ختم ہو جائے گی، سورۃ الطلاق میں فرمایا ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (اور حمل والی عورتوں کی اجل یعنی ختم عدت یہ ہے کہ وضع حمل ہو جائے)

اور مطلقہ اگر حمل والی عورت نہیں نابالغ ہے یا بالغ تو ہے لیکن اسے اب تک حیض آیا ہی نہیں یا وہ کبھی حیض والی تھی بوڑھی ہو چکی ہے اور حیض آنے سے نا اُمید ہو چکی ہے تو ان تینوں قسم کی عورتوں کی عدتِ طلاق یہ ہے کہ تین ماہ گزار دیں، اس کو سورۂ طلاق میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّ الّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ۔ (اور جو عورتیں حیض آنے سے نا اُمید ہو چکی ہیں تمہاری عورتوں میں سے اگر تم شک میں پڑو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور جن کو حیض نہیں آیا ان کی عدت بھی یہی ہے)

اب ان عورتوں کا حکم جاننا چاہیے جو حمل والی نہیں ہیں ان کو حیض آتا ہے ایسی عورتوں کو طلاق ہو جائے تو ان کی عدت یہ ہے کہ طلاق کے بعد تین حیض گزاریں، جب شرعی اصول کے مطابق تین حیض گُزر جائیں گے تو عِدّت پوری ہو جائے گی۔ خواہ کتنے ہی مہینے میں تین حیض آئیں، آیتِ بالا میں اُنہیں عورتوں کی عدت بیان فرمائی ہے جن کو حیض آتا ہے۔ زمانہ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے۔ جب کسی شخص نے طہر میں یعنی ایسے زمانہ میں طلاق دی جو پاکی کا زمانہ ہے حیض کا زمانہ نہیں تو یہ عورت ایک حیض گزارے پھر ایک طہر گزارے پھر ایک حیض گزارے پھر ایک طہر گزارے پھر ایک حیض گزارے جب تیسرا حیض ختم ہو جائے تو عدّت تمام ہو جائے گی۔ ابھی بیان کیا گیا کہ جس عورت کو حمل ہو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ حمل اور حیض یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق خود عورت کی ذات سے ہے وہ جانتی ہے کہ مجھے حیض ہے یا حمل ہے۔ یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں، اب یہاں عورت کی دیانت پر مسئلہ موقوف ہو جاتا ہے۔ عورت سمجھتی ہے

کہ وضع حمل میں تو کئی مہینے لگیں گے لہٰذا یوں بیان کر دوں کہ مجھے حمل نہیں ہے اور حیض والی بھی نہیں ہوں۔ اس طرح عدت مہینوں پر آ جائے گی اور تین ماہ گزر جانے پر میرے بارے میں عِدّت گزر جانے کا فیصلہ کر دیا جائے گا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مہینوں میں طہر کا زمانہ لمبا ہوگیا کئی ماہ سے حیض نہیں آ رہا لیکن عِدّت کا فیصلہ جلد ہو جانے کی وجہ سے دو تین ماہ میں کہہ دیتی ہیں کہ مجھے تین حیض آ چکے ہیں حالانکہ ابھی تین حیض نہیں آئے اس طرح کی غلط بیانی کرنا حرام ہے، اس بات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (اور ان کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا فرمایا ہے اسے چھپائیں اگر اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں)۔

جب کوئی شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور آخرت کے دن کی پیشی کا اعتقاد رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا تو اللہ تو جانتا ہے ایسا شخص امانت و دیانت کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے پھر وہ جھوٹ نہیں بول سکتا اور غلط بیانی نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا: وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا (اور ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں۔ اس مُدّت کے اندر اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں)۔

اس میں طلاق رجعی سے متعلق ایک مسئلہ بیان فرمایا ہے جب کوئی شخص اپنی بیوی کو صاف صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دے دے تو یہ طلاق رجعی ہوتی ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ عدت کے اندر اندر نکاحِ ثانی کے بغیر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ اگر عدت گزر جائے تو یہ طلاق رجعی بائن ہو جاتی ہے، جس کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ نکاح کے بعد جماع بھی ہوا ہو، اگر نکاح ہوا ہو اور اس کے بعد جماع نہ ہوا اور طلاق دے دے تو یہ طلاق رجعی نہیں بلکہ طلاق بائن ہوگی۔ طلاق رجعی جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق ہے اس طلاق کے بعد عدّت کے اندر شوہر رجوع کرنا چاہے تو عورت کے رشتہ دار یا کوئی بھی شخص بلکہ خود عورت بھی اس کو بُرا نہ مانے اور کوئی شخص ایسی صورتِ حال پیدا نہ کر دے۔ جس سے کہ وہ رجوع کے ارادے کو موقوف کر دے، بلکہ جوڑ لگانے کی اور تعلق استوار ہو جانے کی کوشش کرنی چاہئے، شوہر اگر رجوع کرلے تو عورت اور عورت کے رشتہ داروں کی مرضی کے بغیر رجوع تو ہو ہی جائے گا۔ لیکن سب کی خوشی اور رضامندی سے ہو اور آپس کے تعاون کے ساتھ ہو تو زیادہ مستحسن اور مُبارک ہوگا۔

جس طرح عورت اور اس کے رِشتہ داروں کو چاہیے کہ رجوع کی فضا بن جائے تو اس میں آڑے نہ آئیں اور ایسی باتیں نہ کریں جن سے شوہر کا دِل کھٹا ہو جائے۔ اسی طرح سے شوہر کو بھی لازم ہے کہ اصلاح کی نیت سے رجوع کرے، اس کو اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا میں بیان فرما دیا ہے۔

شوہر اگر یہ سمجھتا ہے کہ آئندہ میں خوش اسلوبی، اور حسنِ معاشرت اور حُسنِ اخلاق کے ساتھ نباہ کر سکوں گا تو رجوع کرلے، ضرر دینے کا اِرادہ نہ کرے۔ بہت سے لوگ جہالت کی وجہ سے اور نفس کی بھڑاس نکالنے کے لئے رجوع کر لیتے ہیں اور پھر حُسنِ سلوک سے پیش نہیں آتے بلکہ صاف کہہ دیتے ہیں تو یوں ہی پڑی رہے گی۔ نہ تیرا حق ادا کروں گا نہ نکاح سے خارج کروں گا اور بہت سے لوگ رجوع کر کے پھر طلاق دیتے ہیں جس سے عِدّت لمبی ہوتی جاتی ہے، یہ بھی ضرر پہنچانے کا ایک پہلو ہے، یہ سب طریقے غیر اسلامی ہیں۔ اصلاح مقصود ہو تو رجوع کرے ورنہ عدّت گزرنے دے، عِدّت گزرتے ہی رجعی طلاق بائن ہو جائے گی، پھر وہ جہاں چاہے اپنی مرضی سے مُناسب جگہ نکاح کرلے گی، جب نباہ کرنا نہیں ہے تو رجوع کر کے تکلیف دینا سمجھداری اور دینداری کی بات نہیں ہے بلکہ ظلم ہے۔

اسلام میں عورت کی حیثیت ...... پھر فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اورعورتوں کے لئے اس جیسا حق ہے جوان کے اُوپر ہے اچھے طریقہ پر) اس میں یہ بتایا ہے کہ صرف یہی بات نہیں ہے کہ مردوں ہی کے حقوق عورتوں پر ہیں بلکہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق ہیں۔ عورت کو خدمت گزار سمجھنا اور اس کے حقوق اور حاجات کا دھیان نہ رکھنا، شریعتِ اسلامیہ کے سراسر خلاف ہے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے دنیا کی اقوام میں عورت کی بہت بری گت بنائی جاتی تھی اب باوجودیکہ زمانہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر بھی اسلام کے علاوہ کسی دین یا قانون میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں جو شریعتِ اسلامیہ نے اس کو دیا ہے۔ ہندوستان کے مشرکین میں تو یہ دستور تھا کہ مرد مر جاتا تھا تو عورت کو اس کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا اور عورتوں کا میراث میں کسی بھی مذہب اور قانون میں حصہ نہیں ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عورت کی حیثیت ایک استعمالی چیز سے زیادہ نہ تھی، عورت مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، عورت کسی چیز کی مالک نہ تھی، جب اس کا شوہر مر جاتا تھا تو شوہر کے خاندان والے ہی اس پر قابض ہو جاتے تھے اور اس کی اجازت کے بغیر جہاں چاہتے جبراً نکاح کر دیتے تھے بلکہ شوہر کی اولاد ہی اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتی تھی، عرب کے جاہل لڑکیوں کو زندہ درگور بھی کر دیتے تھے اور پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے تھے۔ اسلام نے عورت کو اس کا صحیح مقام عطا فرمایا جو اس کی شان کے لائق ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اس کو عورت پنے سے نکال کر مردوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہو، اور ایسا بھی نہیں کہ وہ محض ایک استعمال کی چیز بن کر رہ جائے نہ اس کا کوئی حق تسلیم کیا جائے اور نہ اس کی کوئی حیثیت مانی جائے۔

اسلام میں عورت گھر کی ملکہ ہے اپنی اولاد کی محترم والدہ ہے اپنے شوہر کی چہیتی بیوی ہے باپ، ماں، شوہر اور اولاد کی مال کی حسبِ قوانین وارث ہے اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا اسے پورا اختیار ہے جس میں شوہر کو ممانعت کا کوئی حق نہیں ہے بشرطیکہ خلافِ شرع کاموں میں خرچ نہ کرے۔ عورت کا ایک طرف میراث میں حصہ ہے دوسری طرف شوہروں پر مہر لازم ہوتا ہے، اور یہ مہر عورتوں کی مرضی سے مقرر ہوتا ہے۔ کمی بیشی کرنا ان کا اپنا حق ہے، وہ چاہیں اپنی مرضی سے معاف کریں اور چاہیں تو پورا وصول کریں۔ اسلام نے صلہ رحمی کی بھی تعلیم دی ہے ایک عورت کسی کی والدہ ہے کسی کی بہن ہے۔ کسی کی خالہ ہے کسی کی پھوپھی ہے۔ صلہ رحمی کے اصول پر سب کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ شوہر بھی حُسنِ معاشرت سے پیش آئے۔ نان نفقہ کا خیال کرے اور اُس کی حاجات پوری کرے۔ اولاد بھی اکرام واحترام سے پیش آئے۔ اس طرح عورت کی برتری ظاہر ہوگی اور معاشرہ میں اس کا مرتبہ اونچا ہوگا۔ اور عزت واکرام کے ساتھ اس کی زندگی گزرے گی۔

یورپین اقوام میں عورت کی بے آبروئی ...... یورپین اقوام نے عورت کو بالکل ہی بے آبرو کر کے چھوڑ دیا ہے، ان کے یہاں عورت مرد کی نفسانی خواہش پوری کرنے کا محض ایک آلہ ہے۔ اُن کے معاشرہ میں اس سے زیادہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ میراث میں اُسے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ مہر کا بھی کوئی معاملہ نہیں، بلکہ سرے سے نکاح ہی کو ان کے یہاں عیب سمجھا جاتا ہے۔ دوستانہ طریقہ پر برسوں زندگی گزارتے ہیں اور نفسانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ بعد میں کبھی رسمی نکاح بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے ان میں اولاد بھی ثابت النسب نہیں ہے۔ اولاد کی ولدیت میں ماؤں کے نام لکھے جاتے ہیں اور عورتوں کے اخراجات کی ذمّہ داری عموماً چونکہ کسی پر نہیں ہے اس لئے انہیں اپنی آبرو کھو کر ملازمتیں کرنی پڑتی ہیں راہ گیر کے جوتوں پر پالش کرتی ہیں۔ دوکانوں میں مال فروخت کرنے پر ملازمت کرتی ہیں۔ ننگا لباس پہن کر شوروموں کے پاس کھڑی رہتی ہیں تا کہ گاہک متوجہ ہو اور آنے والوں کا نفس ان کی طرف مائل ہو جس سے زیادہ خریداری ہو سکے۔

اس آزادئ نسواں کو دیکھ کر بہت سے نام نہاد مسلمان بھی اپنی عورتوں کو یورپین اقوام کی عورتوں کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں بازاروں میں کاروبار کریں۔ بے پردہ ہو کر رہیں، عورت ناقص العقل تو ہیں ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ہمیں حق دلائے جارہے ہیں اور بے پردہ گھومنے اور ننگا لباس پہننے اور دوست تلاش کرنے کی آزادی کو اپنے لئے ہُنر اور فخر کی بات سمجھتی ہیں۔ افسوس کہ دورِ حاضر میں عورت کو یہ گوارا نہیں کہ گھر کی ملکہ بن کر گھر میں بیٹھے، گھر کے سب لوگ اس کا احترام واکرام کریں اسے شوہر سے بھی مال ملے، میراث میں بھی حصے ملیں اور نفس ونظر کا تعلق صرف شوہر سے رہے۔ اور اپنے مال میں جیسے چاہے تصرف کرے، وہ شیطانوں اور ملعونوں اور ملحدوں اور زندیقوں سے متاثر ہو کر گھر سے باہر نکلنے اور خود کما کر خرچ اُٹھانے پر اپنے حقوق کی ادائیگی سمجھتی ہیں۔

یورپ کے رواجی طریقوں میں جب عورت کا کسی پر کوئی حق ہی نہیں ہے تو کوئی شخص ان کا کیا حق ادا کرے گا؟ درحقیقت عورت کی یہ کوئی زندگی نہیں ہے جو مذہب اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور قوانین میں ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہیں جہاں زنا کی کثرت ہے جو بچے پیدا ہوتے ہیں حکومت ان کی پرورش کرتی ہے۔ نہ کوئی ماں ہے نہ باپ نہ چچا ہے نہ ماموں نہ خالہ نہ پھوپھی نہ صلہ رحمی ہے، نہ نکاح ہے نہ مہر ہے۔ اس سے زیادہ انسانیت کی مٹی اور کیا پلید ہوگی، ان لوگوں کی نا سمجھی کی کہاں تک داد دی جائے جو انسانیت ونسوانیت کا خون کر رہے ہیں اور دعویٰ ان کا یہ ہے کہ وہ حقوق انسانی کے محافظ ہیں، اور عورتوں کو ان کے حقوق دلا رہے ہیں۔

مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے...... پھر فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے)۔ اس میں یہ بتایا کہ اگرچہ میاں بیوی کے آپس میں ایک دُوسرے پر حق ہیں (اور ہر ایک دُوسرے کا حق ادا کرے) لیکن مردوں کو عورتوں پر ایک طرح کی برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۔ (مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ذمہ عورتوں کا خرچہ مقرر فرمایا ہے اور مردوں کو ان پر فضیلت دی ہے اور وہ ان پر حکمران ہیں۔ اُمور خانہ داری میں اور دینی پابندی کرانے میں اور عورت کو اس کے ماں باپ کے یہاں آنے جانے میں اور بہت سے اُمور میں مرد کے حکموں کی فرمانبرداری کرنا لازم ہے اس کے بغیر گھر کا نظام ٹھیک نہیں بیٹھتا، اگر مرد کی برتری عورتوں پر بالکل ہی نہ رہے، تو شریعت اسلامیہ کے مطابق زندگی کا نظام نہیں چل سکتا، البتہ مردوں کے لئے بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ سردار بن گئے تو ظلم کیا کریں اور اس کے حقوق ادا نہ کریں اور اس کا مال برباد کردیں۔ عورت یہ سمجھ کر چلے کہ یہ میرا سردار ہے اور مرد یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ضروریات پورا کرنے کے لئے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی ہے مجھے خیر وخوبی کے ساتھ نباہنا چاہیے۔ ایسا کریں گے تو ماں باپ اور اولاد سب کی زندگی ان شاء اللہ تعالیٰ عمدہ طریقہ پر گزرے گی۔ سورۃ النساء میں فرمایا: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (کہ خوش اسلوبی کے ساتھ عورتوں کے ساتھ زندگی گزارو) اس میں ہر طرح کی خیر وخوبی ہمدردی اور حقوق کی ادائیگی اور مراعات کا حکم فرمادیا۔

مردوں کو چونکہ سرداری اور بڑائی دی گئی ہے اس لئے وہ اپنے مقام اور مرتبہ کا خیال کریں اور عورتوں کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر صبر کریں اور برداشت کریں، اگر برداشت نہ کیا تو بڑائی ہی کیا رہی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن مرد کسی مؤمن عورت سے (یعنی ایمان والی بیوی) سے بغض نہ رکھے۔ اگر اس کی ایک بات ناپسند ہوگی تو دوسری بات پسند آجائے گی۔ (مسلم ص ۴۷۵ ج ۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب میں بہتر ہوں۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۴۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے زیادہ کامل ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے زیادہ مہربان ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۴ ج ۲)

آخر میں فرمایا: وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے) اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اگر کسی نے کی تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میرا کوئی مواخذہ نہیں۔ اللہ نے احکام بھیجے ہیں اور عمل پیرا ہونے کا حکم فرمایا ہے۔ جو خلاف ورزی کرے گا اس کی گرفت ہونے لگے تو بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ حکم دینے والا عزیز اور غالب ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس نے جو احکام دیئے ہیں وہ سب حکمتوں پر مبنی ہیں ان میں بندوں کی رعایتیں ملحوظ ہیں بندوں کے لئے اس نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں جو ان کے خالق نے ان کے لئے حکمت کے مطابق تجویز فرمایا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ

طلاق دو مرتبہ ہے پھر روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ، یا چھوڑ دینا ہے اچھے طریقہ پر، اور تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے تم کچھ بھی لے لو اس مال میں سے

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ

جو تم نے ان کو دیا ہے۔ مگر اس صورت میں کہ میاں بیوی اس بات سے ڈرتے ہوں کہ حدود اللہ قائم نہ رکھ سکیں گے، سو اگر تم ڈرو اس بات سے کہ دونوں اللہ کے حدود

اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ج وَمَنْ

قائم نہ رکھ سکیں گے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر اس بارے میں کہ عورت اپنی جان کا بدلہ دیدے، یہ اللہ کے حدود ہیں، سو تم ان سے آگے مت بڑھو، اور جو کوئی شخص

يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ

اللہ کے حدود سے آگے بڑھ جائے تو ایسے لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔ پھر اگر اس کو طلاق دیدی تو اس کیلئے اسکے بعد حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ اس شوہر کے بعد کسی دوسرے

زَوْجًا غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط

شوہر سے نکاح نہ کرے۔ سو اگر اس نے طلاق دیدی تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ پھر آپس میں رجوع ہو جائیں۔ اگر دونوں کو اس بات کا گمان ہو کہ اللہ کے حدود قائم رکھیں گے

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

اور یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں وہ انہیں بیان فرماتا ہے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں۔

طلاق اور خلع کے چند احکام

ان دونوں آیتوں میں طلاق کے متعدد مسائل اور متعدد تنبیہات مذکور ہیں جو زن وشوہر سے متعلق ہیں، طلاق رجعی، طلاق بائن، طلاق مغلظہ اور خلع کے مسائل اجمالی طور پر بیان فرمائے ہیں۔

اگر کوئی شخص طلاق دینے کی ضرورت محسوس کرے تو احسن طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے طہر میں (یعنی پاکی کے زمانے میں) ایک طلاق

دے دے جس میں جماع نہ کیا ہو پھر عورت کو اپنی حالت پر چھوڑ دے، قانونِ شرعی کے مطابق یہ طلاق رجعی ہوگی (بشرطیکہ عورت سے نکاح کرنے کے بعد جماع بھی کر چکا ہو، اگر صرف نکاح ہوا تھا تو یہ طلاق بائن ہوگی) جب پاکی کے زمانہ میں طلاق رجعی دے دی اور عورت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا حتیٰ کہ عدت گزر گئی (جس کی تفصیل پہلے رکوع میں گزر چکی ہے) تو یہی رجعی طلاق بائن طلاق ہو جائے گی۔ عدّت سے پہلے پہلے رجوع کرنے کا حق تھا۔ جب طلاق بائن بن گئی تو اب رجوع کا حق ختم ہوگیا۔ اگر عدت کے اندر ایک طلاق اور دیدی تو یہ بھی طلاق رجعی ہوگی اور اس کے بعد بھی عدت ختم ہونے تک رجوع کا اختیار رہے گا۔ عدت ختم ہو جانے پر دونوں طلاقیں بائن ہو جائیں گی اور رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔

طلاق بائن کے بعد آپس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ شوہر نے عدت کے اندر تیسری طلاق بھی دیدی تو اب یہ طلاق مغلظ ہوگئی جس کا حکم یہ ہے کہ اب آپس کی رضامندی سے بھی دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ اب دوبارہ آپس میں نکاح ہونے کی یہی ایک صورت ہے کہ کسی دوسرے مرد سے اس عورت کا نکاح ہو پھر وہ مرد اس سے جماع کرے پھر طلاق دے یا وفات پا جائے اور پھر اس کی عدت گزر جائے اگر دوسرا شوہر جماع کئے بغیر طلاق دیدے تو پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی جس کی تصریح حدیث شریف میں موجود ہے۔ اور یہ طے کر کے کسی سے نکاح کر دینا کہ تو جماع کر کے طلاق دیدینا مکروہ تحریمی ہے اس پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے۔ **عن علیؓ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المحلل والمحلل لہ** (**رواہ ابن ماجۃ و رواہ الحاکم فی المستدرک** ص۱۹۹ ج۲ **وصححہ واقرہ الذہبی**) (حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور جس کیلئے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت فرمائی ہے)

اللہ جل شانہٗ نے بندوں کی مصلحتوں کی کس قدر رعایت رکھی ہے اول تو حلال چیزوں میں طلاق کو مبغوض ترین چیز قرار دیا (کما قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق. (رواہ ابو داؤد ص۲۹۶ ج۲) پھر حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا کیونکہ یہ بے رغبتی کا زمانہ ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی تھی تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ ان کو حکم دو کہ رجوع کرلیں پھر حالت طہر یا حمل میں طلاق دیں۔ (رواہ مسلم ص۴۷۶ ج۱)

صحیح بخاری ص۸۰۳ ج۲ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم دیا کہ زمانۂ حیض میں جو طلاق دی ہے اس سے رجوع کرلیں اِس کے بعد یہ حیض گذر جائے پھر ایک طہر گذر جائے پھر ایک حیض اور گزر جائے اس کے بعد جو طہر یعنی پاکی کا زمانہ آئے چاہے تو اس میں طلاق دے دے اور یہ طلاق جماع کرنے سے پہلے ہو اھ اگر طلاق دے تو اچھی طرح غور کرلے اگر طلاق کی ضرورت محسوس کرے تو پاکی کے زمانہ میں طلاق دے دے اور ایک طلاق دے کر چھوڑ دے۔ (اگر نکاح کے بعد جماع کیا تھا تو یہ طلاق رجعی ہوگی) عِدّت گزر جانے سے پہلے ایک طلاق اور دیدی تو وہ بھی رجعی ہوگئی۔ اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا تو دونوں طلاقیں بائن ہو جائیں گی۔ لیکن باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکے گا۔ اس تفصیل کو سامنے رکھ کر غور کرلیا جائے کہ شریعتِ اسلامیہ میں مرد وعورت کی مصلحتوں کی کس قدر رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اگر شوہر تین طلاقیں دے دے تو خواہ متفرق اوقات میں دے یا بیک وقت تینوں طلاقیں دے تو اس سے طلاق مغلظہ ہو جاتی ہے جس کا حکم اوپر بیان ہوا۔ جب شریعت کی دی ہوئی رعایتوں کی پاسداری نہ کی تو اب یہ سزا دی گئی کہ اب دُوسرے شوہر سے نکاح اور جماع کئے بغیر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔

مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن عورت کو بھی مرد کے نکاح سے نکلنے کے حق سے محروم نہیں کیا گیا ہے اگر کوئی صورت نباہ کی نہ رہے تو وہ مرد سے خلع کرسکتی ہے خلع کا معنی یہ ہے کہ وہ مرد سے یوں کہے کہ میں اپنے مہر کے عوض یا اپنے مال کے عوض آپ سے خلع کرتی ہوں مَرداُسے منظور کرلے تو عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور جو مال دینا طے ہوا ہے وہ عورت پر ادا کرنا واجب ہوگا۔

خلع کا یہ مطلب نہیں کہ عورت مرد کو خود سے چھوڑ کر علیحدہ ہوجائے یا حاکم کے یہاں دعویٰ کرکے بغیر کسی شرعی سبب کے جُدائی کا فیصلہ کرالے، حاکم سے نکاح فسخ کرانے کے کچھ اصول اور قوانین ہیں بعض صورتوں میں قاضی کو شرائط فسخ ملحوظ کرتے ہوئے نکاح فسخ کردینے کا اختیار ہوتا ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن صورتوں میں حاکم کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے ان میں یہ بھی ضروری ہے کہ حاکم مسلمان ہو غیر مسلم حاکموں کے فسخ کرنے سے مسلمان عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوگا خواہ کیسی ہی مجبوری ہو۔

میاں بیوی دونوں جہاں تک ممکن ہو آپس میں نباہ کی کوشش کریں لیکن اگر دونوں کو اس بات کا ڈر ہو کہ اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ عورت مال دے کر اپنی جان چھڑالے، اگر مرد کی طرف سے زیادتی ہو تو اس سے کچھ بھی نہ لے اور بلاعوض اس کی جان چھوڑ دے، اور اگر عورت کی طرف سے زیادتی اور نافرمانی ہو تب بھی مرد اتنا ہی لے جتنا مہر اسے دے چکا ہے اس سے زیادہ نہ لے۔ اور اگر زیادہ لے لیا تو قضاءً جائز تو ہوگا۔ لیکن مکروہ ہوگا۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے ثابت بن قیس کی عادت اور خصلت اور دینداری کے بارے میں کوئی ناراضگی نہیں ہے لیکن میں مسلمان ہوتے ہوئے ناشکری کو پسند نہیں کرتی (میرا ان سے دل نہیں ملتا لٰہذا علیحدگی کی کوئی صورت ہوجائے) آپ نے فرمایا کہ کیا تم ان کا باغیچہ واپس کردوگی (جو مہر میں دیا تھا) عرض کیا ہاں میں واپس کردوں گی، آپ نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے فرمایا کہ تم اپنا باغیچہ قبول کرلو اور اس کو ایک طلاق دے دو، (رواہ البخاری ص ۷۹۴ ج ۲)

اس حدیث سے خلع کا جواز معلوم ہوا، اور آیت شریفہ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ کے سیاق سے معلوم ہوا کہ نباہ کی صورت نہ رہے اور حدود اللہ قائم نہ کرسکیں تو خلع کرلینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ خواہ مخواہ بلاوجہ خلع کرنا اور چھوٹ چھٹاؤ کے درپے ہونا محمود نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھوٹ چھٹاؤ کا مطالبہ کرنے والی اور خلع چاہنے والی عورتیں نفاق والی عورتیں ہیں۔ (رواہ النسائی ص ۱۰۷ ج ۲ والترمذی ص ۱۹۱ ج ۱)

مسئلہ: لفظ خلع سے خلع ہوجاتی ہے یعنی شوہر کے قبول کرنے پر عورت پر طلاق واقع ہوجاتی ہے اس کے بعد وہ عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے اور چونکہ طلاق مغلظہ نہیں ہے اس لئے دوبارہ شوہر اوّل سے بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ خلع کے علاوہ ایک "طلاق بالمال" بھی ہے اور وہ اس طرح سے ہے کہ مرد یوں کہے کہ میں تجھے اتنے مال کے عوض طلاق دیتا ہوں اگر عورت قبول کرلے تو طلاق بائن واقع ہوجائے گی، اور عورت کو مقرر مال دینا لازم ہوگا۔

فائدہ...... مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں اول دو رجعی طلاقوں کا ذکر ہے اس کے بعد خلع کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ میں چوتھی طلاق مذکور نہیں ہے بلکہ دو طلاق کے بعد بطور جملہ معترضہ سے خلع کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد تیسری طلاق کو ذکر فرمایا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی عدت گزر جانے کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو روک لو بھلائی کے ساتھ یا ان کو چھوڑ دو خوبی کے ساتھ

وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ

اور ضرر پہنچانے کے لئے انہیں روک کر کے نہ رکھو تاکہ تم زیادتی کرو، اور جو شخص ایسا کرے گا سو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور مت بناؤ اللہ کی آیتوں کو

اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ

مذاق کی چیز اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، اور جو کچھ اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے کتاب اور حکمت اس کو بھی یاد کرو۔

يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

اللہ اس کے ذریعہ تم کو نصیحت فرماتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بے شک ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

مطلقہ عورتوں کو ضرر پہنچانے کی ممانعت

اس آیت میں چند باتوں پر تنبیہ فرمائی۔ اوّل یہ کہ جو لوگ اپنی عورتوں کو طلاق رجعی دے دیں اگر انہیں رغبت نہیں ہے اور اب بیوی بنا کر رکھنا گوارا نہیں ہے تو خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چھوڑیں، جب عدت گزرنے کے قریب ہو جائے تو رجوع کئے بغیر عدت ختم ہونے دیں تاکہ عدت ختم ہوتے ہی طلاق بائن ہو جائے اور عورت کسی دوسری جگہ اپنا نکاح کر سکے، ایسا نہ کریں کہ جب عدت گزرنے کے قریب ہو تو رجوع کر لیں اور اس کے بعد پھر طلاق دے دیں اور جب عدت گزرنے کے قریب ہو پھر لوٹا لیں، ایسا کرنے سے خواہ مخواہ عورت کو تکلیف ہوگی اور ضرر پہنچے گا۔ تفسیر روح المعانی ص ۱۴۲ ج ۲ میں ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ یہی معاملہ کیا حتیٰ کہ اسی طرح نو مہینے گزر گئے، اللہ جل شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی اور فرمایا فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ کہ ان کو اگر اپنے نکاح میں رکھنا ہے تو اچھے طریقہ پر روک لو، اور نکاح میں نہیں رکھنا تو خوبی کے ساتھ اسے چھوڑ دو، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مزید فرمایا: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا کہ ان کو ضرر پہنچانے اور دُکھ دینے کے لئے روک کر نہ رکھو تاکہ ان پر ظلم کرو۔

اور مزید فرمایا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ کہ جو شخص ایسا کرے گا اس نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ایک مؤمن عورت کو ضرر پہنچانے کی نیت کر کے اپنی جان کو آخرت کے عذاب کے لئے پیش کر دیا اور اللہ کے حکم کی فرمانبرداری پر جو ثواب مل سکتا تھا اس سے محروم ہو گیا، کسی بھی مؤمن کو ضرر پہنچانا حلال نہیں ہے حدیث شریف میں ہے مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ (یعنی وہ شخص ملعون ہے جو کسی مؤمن کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر کرے)۔ (رواہ الترمذی)

اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق بنانے کی ممانعت...... دوسری تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا کہ اللہ کی آیات کو اور اس کے احکام کو کھیل اور مذاق مخول ٹھٹھہ نہ بناؤ۔ ایسا نہ کرو کہ جی چاہا عمل کیا، چاہا نہ کیا اور احکام کی رعایت کا دھیان نہ رکھا، بلکہ آیاتِ قرآنیہ میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی پابندی کرو اور عزم و ہمت و ارادہ کے ساتھ عمل پیرا ہو، حضرت محمود بن لبید

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے بارے میں خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں، آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا اللہ عزوجل کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جائے گا حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ آپ کا غصہ دیکھ کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کردوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۲۸۴ ج۲) اکٹھی تین طلاق دے دینا شرعاً مذموم ہے۔ ایک سے زیادہ طلاق دے تو الگ الگ کر کے دے، اور ہر طہر میں (پاکی کے زمانے میں) ایک ایک طلاق دے۔ کیونکہ اس شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی۔ مؤطا مالک میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا تیری بیوی پر تین طلاق واقع ہوگئیں اور ستانوے طلاقوں کے ذریعہ تو نے اللہ کی آیات کا مذاق بنایا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۲۸۴)

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو...... تیسری بات یہ فرمائی کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور جو کچھ اس نے تمہارے اوپر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اس کو بھی یاد کرو۔ یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا شکر ادا کرو نعمتوں کے ذریعہ گناہ نہ کرو اور آیاتِ قرآنیہ پر عمل کرو۔ اللہ کے احکام میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ ان میں خیر سمجھو۔

پھر فرمایا: **یَعِظُکُمْ بِہٖ** یہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا وہ اس کے ذریعہ تم کو نصیحت فرماتا ہے۔ خلاف ورزی کر کے نصیحت سے منہ موڑنے والے نہ بنو۔

پھر فرمایا: **وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ** (اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے)

سب کے اعمال کو وہ جانتا ہے ان کے مطابق جزا سزا دے گا اور جن چیزوں میں تمہارے لئے مصلحت ہے ان کو بھی جانتا ہے، اس کے حکموں میں تمہاری مصلحت مضمر ہے۔ مخالفت کر کے اپنے لئے خرابی کا راستہ اختیار نہ کرو۔

مسئلہ...... اگر کوئی شخص مذاق میں طلاق دے دے تو اس سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کی تصریح حدیث شریف میں موجود ہے۔ فقد روی أبوهريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم ثَلَاثٌ جَدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ، اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ. رواه الترمذی ص۱۹۱ ج۱ وحسنه و أخرجه الحاكم ايضا فی المستدرک ص۱۹۸ ج۲ وصححه

فائدہ...... ارشاد باری تعالیٰ **لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا** اگرچہ مسائل طلاق کے ذیل میں وارد ہوا ہے لیکن الفاظ کا عموم اس بات کو بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور احکام کا مذاق بنانا بدترین گناہ ہے بلکہ قصداً و ارادۃً اگر آیات و احکام کا مذاق بنایا جائے تو کفر ہے۔ سورۂ مائدہ میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَالْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ. وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ** (اے ایمان والو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا، یعنی وہ لوگ جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان کے علاوہ دُوسرے کافروں کو بھی دوست نہ بناؤ، اور اللہ سے ڈرو، اگر تم مؤمن ہو، اور جب تم نماز کی طرف بُلاتے ہو تو نماز کا مذاق اور کھیل بنالیتے ہیں یہ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھتے نہیں)۔

سورۃ الجاثیہ میں اہلِ دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: **ذٰلِکُمْ بِاَنَّکُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا وَّغَرَّتْکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا** (یہ عذاب اس لئے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنالیا تھا اور تم کو دنیا والی زندگی نے دھوکہ میں ڈالا تھا)۔

بہت سے لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں لیکن قرآن اور احادیث شریفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا مذاق بناتے ہیں ایسے لوگ اگر چہ مدعی اسلام ہوں لیکن اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہت سے لوگ حج کے احکام وافعال کو فلماتے ہیں اور سینما میں لہوولعب کے پردہ پر دکھاتے ہیں اور دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ کعبۃ اللہ شریف کے چاروں طرف جونماز ہوتی ہیں اس کے فوٹو لئے جاتے ہیں۔ حجر اسود کا استلام کرتے ہوئے فوٹو لئے جاتے ہیں، منیٰ میں تصویر کشی ہے۔ عرفات میں کیمرے کھڑے ہیں، فوٹو کھنچے جارہے ہیں۔ نیک کام کو معصیت کے ساتھ مکدّر کیا جارہا ہے۔ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ٹیلیویژن میں ڈرامے آرہے ہیں۔ ان اکابرِ دین کی داڑھیاں مُنڈی اور مونچھیں خوب زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی جارہی ہیں۔ ان حضرات کے علم وعمل کو لہوولعب اور تماشہ بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ سب دین اور دینیات کے ساتھ استہزاء اور تمسخر ہے جو لہوولعب میں شامل ہے۔ عوام الناس نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ اس سے دین کی تبلیغ ہوگی۔ حالانکہ اس کی حیثیت لہوولعب سے زیادہ نہیں ہے۔ قرأت قرآن کی مجلسیں ہیں۔ قاریوں کی تصویریں کھینچی جارہی ہیں اور اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔ قرآن کے نام پر اجتماعات ہیں۔ فوٹو گرافی ہو رہی ہے۔ فلمیں دکھائی جارہی ہیں کالج یونیورسٹی میں اسلامیات کی کلاسیں ہیں۔ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ بے پردہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ عین اسلامی عنوان کے پیریڈ میں احکام قرآن کی خلاف ورزی ہورہی ہے، سودی لین دین ہے بنک کا نام اسلامی ہے۔ حرام مال سے ایصالِ ثواب کیا جارہا ہے اسی سے حج وعمرہ ہورہا ہے۔ داڑھی مونڈنے کی دکانیں ہیں۔ اسلامی صالون یا صالون الحرمین کا نام دیا جا رہا ہے، یہ سب اعمال وافعال ایسے ہیں جن سے احکام اسلام کی توہین اور تضحیک ہوتی ہے، اسلام کے نام پر مذاق ہے۔ گناہ کرنا بہت بڑی بدبختی ہے جس کا لوگوں کو بالکل احساس نہیں، داڑھیوں کا، داڑھی رکھنے والوں کا تمسخر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنے والوں پر پھبتیاں ہیں اور یہ سب کچھ ان لوگوں سے صادر ہورہا ہے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ سب کو صحیح سمجھ دے۔ (آمین)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا

اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پہنچ جائیں اپنی عدت کو تو ان کو اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کریں جبکہ آپس میں

تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

خوبی کے ساتھ رضا مند ہو جائیں۔ اس کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن

الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

پر ایمان لاتا ہے، یہ تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مطلقہ عورتیں سابقہ شوہروں سے نکاح کرنا چاہیں تو اس میں رکاوٹ نہ ڈالیں

اس آیت میں عورتوں کے اولیاء اور اقرباء کو ایک خاص نصیحت کی گئی ہے اور وہ یہ کہ جب طلاق کے بعد عورت کی عدت گزر جائے اور وہ اپنے اسی شوہر کے نکاح میں پھر جانا چاہے جس نے طلاق دی تھی تو اس میں رُکاوٹ نہ ڈالو، طلاق رجعی کے بعد جب عدت گزر جائے تو یہ طلاق بائن ہو جاتی ہے اور طلاق بائن ہوجانے پر میاں بیوی کی رضامندی سے آپس میں دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ جب دونوں یہ محسوس

کریں کہ ہمیں پھر سے زن وشوہر کی طرح رہنا چاہیے اور پھر سے نکاح کر لینے میں مصلحت محسوس کریں تو عورت کے اولیاء واقرباء رکاوٹ نہ ڈالیں ان کا نکاح آپس میں ہونے دیں۔ البتہ ان دونوں میں آپس میں خیر وخوبی سے اور عمدہ طریقہ پر نباہ کرنے کے جذبات ہونے چاہییں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وقتی جوش میں مرد طلاق دے بیٹھتا ہے اور عورت بھی کبھی غصہ میں طلاق طلب کر لیتی ہے جس سے شوہر کے منہ سے طلاق کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ پھر آپس میں پشیمان ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھر مل بیٹھیں۔ یعنی دوبارہ نکاح کر لیں۔ جب ایسی صورتِ حال بن جاتی ہے تو عورت کا باپ یا بھائی یا خاندان کے دوسرے لوگ رُکاوٹ ڈالتے ہیں اور اس کو اپنی ہتک عزت سمجھتے ہیں اور بعض مرتبہ رشوت لینے کے پھیر میں ہوتے ہیں اس کے شوہر کو دباتے ہیں تاکہ کچھ مال دینے پر مجبور ہو جائے، ان سب باتوں سے آیتِ بالا میں منع فرمایا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ میں نے اپنی ایک بہن کا ایک شخص سے نکاح کر دیا تھا پھر اس نے اس کو طلاق دی۔ جب عدت گزر گئی تو پھر وہ اس سے نکاح کرنے کے لئے پیغام لے کر آ گیا میں نے کہا کہ میں نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا اور اس کو تیرے پاس بھیج دیا اور تیرا اکرام کیا پھر تو نے طلاق دے دی تو اب تُو دوبارہ نکاح کا پیغام لے کر آیا ہے اللہ کی قسم کبھی بھی تیرے پاس نہ جائے گی۔ یہ آدمی مُناسب تھا اور عورت چاہتی تھی کہ واپس چلی جائے۔ اللہ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی آیت سن کر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اب تو میں ضرور وہی کروں گا جس کا حکم ہُوا ہے۔ لہٰذا اپنی قسم کا کفارہ دے دیا اور اسی شخص سے اس کا نکاح کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب آیت سنی تو حضرت معقل بن یسار نے کہا کہ سَمْعًا لِرَبّی وَطَاعَةً (میں نے اپنے رب کا فرمان سنا اور میں فرمانبرداری کے لئے حاضر ہوں)۔ (تفسیر درمنثور ص ۲۸۷ ج ۱ عن البخاری وابی داؤد والترمذی والحاکم وغیرہم)

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اَزْوَاجَهُنَّ سے پہلے شوہروں کے علاوہ وہ لوگ بھی مراد ہو سکتے ہیں جو پہلے شوہر نہ تھے لیکن طلاق وعدت کے بعد مطلقہ عورتیں بعض مرتبہ بعض مردوں سے رشتہ طے کر لیتی ہیں اور آپس میں دونوں شریعت کے قاعدہ کے مطابق نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو عورت کے اولیاء واقرباء آڑے نہ آئیں اور نہ طلاق دینے والا شوہر رکاوٹ ڈالے لفظ بالمعروف میں یہ بتادیا کہ وہ شرعی قاعدہ کے مطابق نکاح کرنا چاہیں تو ان کو نکاح کرنے دیں، البتہ خلاف شرع کوئی بات ہو تو اس سے روکنا واجب ہے۔ عورت کو بھی چاہیے کہ اپنے برابر اور میل کے آدمی سے نکاح کرے اور مہر مثل پر نکاح کرے تاکہ اولیاء کو خفت محسوس نہ ہو اور کسی طرح اعتراض کا موقع نہ ملے پھر فرمایا اس میں ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ فرمایا کہ اس حکم کے ماننے میں تمہاری بہت بڑی صفائی اور پاکیزگی ہے کیونکہ اس کی خلاف ورزی میں فتنہ فساد اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے مواقع نکل سکتے ہیں، اور مرد وعورت کی عفت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) بعض لوگ اپنے خیال سے کچھ مصلحتیں سوچتے ہیں لیکن فکر میں خطاء کرتے ہیں غلط بھی سوچتے ہیں۔ دنیاداری کے جذبات سے سوچتے ہیں مرد وعورت کی مصلحتوں پر نظر نہیں رکھتے، اپنے غور وفکر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کریں، اس نے جو قانون بتایا ہے اس پر چلنے میں خیر ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال پورے اس کے لئے جو دودھ پلانے کی مُدت پوری کرنا چاہے

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

اور جس کی اولاد ہے اس کے ذمہ ماؤں کا کھانا اور کپڑا ہے قاعدہ کے مطابق، کسی جان کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی برداشت کے مطابق،

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ

نہ تکلیف دی جائے والدہ کو اُس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ اُس کو تکلیف دی جائے جس کا بچہ ہے اس کے بچہ کی وجہ سے، اور وارث کے ذمہ اسی طرح سے لازم ہے،

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

سو اگر دونوں آپس کی رضامندی اور باہم مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور اگر تم اپنی اولاد کو

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کچھ گناہ نہیں ہے جبکہ تم سپرد کر دو جو کچھ ان کو دینا طے کیا ہے قاعدہ کے موافق، اور اللہ سے ڈرو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ ان کاموں کو دیکھتا ہے جنہیں تم کرتے ہو۔

بچوں کو دُودھ پلانے کے احکام

اس آیت میں بچوں کو دودھ پلانے اور پلوانے کے بارے میں چند احکام مذکور ہیں۔ جب میاں بیوی خوشی کے ساتھ آپس میں مل جل کر رہ رہے ہوں اور اولاد پیدا ہو جائے تو چونکہ ماں اور باپ دونوں کو بچہ پر شفقت ہوتی ہے اور دونوں اس کی تربیت کرتے ہیں اور دکھ تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے بچے ماں باپ کے سایہ میں خوب اچھی طرح سے پرورش پاتے ہیں اور ایسی صُورت میں والدہ اس کے دُودھ پلانے یا پرورش کرنے پر اس کے باپ سے کسی طرح کی اُجرت بھی طلب نہیں کرتی، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بچے کی والدہ جب اپنے شوہر کے نکاح میں ہے اور بحق زوجیت کھانا کپڑا اسے مل رہا ہے تو اس کے لئے یہ دُرست نہیں کہ دُودھ پلانے کے سلسلے میں کوئی اُجرت طلب کرے اور بعض مرتبہ ایسا ہو جاتا ہے کہ شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ اس میں اوّل تو یہ اختلاف رُونما ہوتا ہے کہ بچہ کون لے۔ اُصول یہ ہے کہ لڑکا جب تک سات برس کا نہ ہو جائے اور لڑکی نو سال کی نہ ہو جائے اس وقت تک والدہ کو پرورش کا حق ہے۔ لڑکا یا لڑکی کی پرورش کا حق مطلقہ عورت کو اُس وقت تک ہے جب تک کہ کسی ایسے شخص سے نکاح نہ کر لے جو بچے کا محرم نہ ہو، والدہ کی پرورش میں بچہ کے رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ بچہ کے اخراجات بھی والدہ ہی کے ذمہ ہوں بلکہ اخراجات بچے کے والد پر ہی واجب ہوں گے، جب کسی مرد نے کسی عورت کو طلاق دے دی اور ماں نے بچہ کو پرورش کے لئے لے لیا اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو جب تک عدت نہ گزر جائے اس وقت تک بچہ کو دودھ پلانے کی اُجرت وہ نہیں لے سکتی کیونکہ

اسے طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے زمانہ عدت کا نان ونفقہ مل رہا ہے۔ دوہرا خرچہ نہیں دیا جائے گا اور جب عدت گزر جائے اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو اب بچہ کی ماں بچہ کے باپ سے دُودھ پلانے کی اجرت لے سکتی ہے۔ بچہ کے دُوسرے اخراجات اس کے سوا ہوں گے اور دودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ بچہ کی عمر دوسال (قمری مہینوں کے اعتبار سے) ہو جانے تک طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بچہ کا باپ دُودھ پلانے کی اجرت نہ دے تو دُودھ پلانے والی والدہ دُودھ پلانے کی اُجرت طلب نہیں کر سکتی (حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دودھ پلانے کی مُدت زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال ہے اور دُوسرے اماموں کے نزدیک دوسال ہے اور احتیاط اسی میں ہے کہ دوسال سے زیادہ دودھ نہ پلایا جائے البتہ اگر کسی نے دوسال کے بعد بھی ڈھائی سال ہونے تک کی مُدت میں پلا دیا تو اس سے حُرمتِ رضاعت کا فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ تحریم نکاح کے سلسلہ میں اسی میں احتیاط ہے، سو اگر کوئی عورت دوسال کے بعد بھی دودھ پلائے تو شوہر کے ذمّہ دودھ پلائی کا خرچہ نہیں ہے)

ماں کو یا باپ کو اولاد کی وجہ سے ضرر نہ دیا جائے...... اُجرت رضاعت اور مُدتِ رضاعت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: وَلَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا، جس میں یہ بتایا کہ بچہ کا باپ جو دودھ پلانے والی کو اُجرت دے گا اس میں اس کی حیثیت سے زیادہ مطالبہ نہ کیا جائے گا وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق خرچہ دے گا جو خرچہ اس کی استطاعت سے باہر ہو اس کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے پھر ارشاد فرمایا: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ مبِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ یعنی کسی ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور کسی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے۔ مثلاً طلاق ہو گئی تو بچہ کے ماں باپ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے باز رہیں اگر بچہ کی والدہ دُودھ پلانے سے معذور ہو یا حقِ پرورش سے دستبردار ہو جائے اور یوں کہے کہ کسی اور سے دُودھ پلوالو تو اس کا باپ زبردستی نہ کرے کہ تجھے ہی پلانا ہوگا اور مفت پلانا ہوگا ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔ یہ نہ سوچے کہ جب بچہ کو تڑپتا دیکھے گی خود ہی پلائے گی۔ یا ماں اُجرت پر پلانے کو راضی ہو تو باپ یوں نہ کہے کہ میں تجھ سے نہیں پلواتا، میں دوسری عورت کو زیادہ اُجرت دے دوں گا لیکن تجھے ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔

باپ نہ ہو تو وارث ذمّہ دار ہے...... پھر فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بچہ کا باپ وفات پا جائے تو اس کے دودھ پلانے کی ذمّہ داری وارث پر ہے اگر بچہ کا اپنا مال ہو مثلاً اس کے باپ کی میراث سے اسے ملا ہے اور بچہ کے دُودھ پینے کی مدّت ابھی باقی ہے تو بچہ کے مال میں سے بچہ پر خرچ کرے اور دودھ پلوانے کی اجرت اسی مال سے دے اور اگر بچہ کا اپنا مال نہیں ہے تو یہ وارث اپنے مال سے بچہ پر خرچ کرے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وارث سے بچہ کا وارث مُراد ہے مثلاً اگر یہ فرض کیا جائے کہ بچہ کی موت ہو گئی تو اس وقت جو لوگ اس کے وارث ہو سکتے ہیں ان پر اس کا خرچ واجب ہے۔ حضرت امام صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے وہ وارث مراد ہے جو محرم ہو، اگر اس طرح کا وارث ایک ہی ہو تو پورا خرچ اس ایک ہی پر واجب ہوگا، اور اگر چند افراد ایسے ہوں تو ان سب پر بقدر حصہ میراث بچہ کے اخراجات لازم ہوں گے۔ محرم اس کو کہتے ہیں جس سے کبھی بھی نکاح جائز نہ ہو۔ اگر بچہ اور اس کے رشتہ دار ایک ہی جنس کے ہوں یعنی سب مرد ہوں تو محرم کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ بچہ اور اس کے رشتہ داروں میں سے اگر کسی کو عورت فرض کر لیا جائے تو آپس میں نکاح درست نہ ہو۔ ایسے رشتہ کو رشتہ محرمیت کہتے ہیں۔ چچا بھتیجی کا نکاح تو آپس میں دُرست نہیں ہے لہٰذا چچا اپنی بھتیجی کا محرم ہے اور چچا اپنے بھتیجہ کا بھی محرم ہے اس لئے کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو عورت فرض کر لیا جائے تو آپس میں نکاح دُرست نہ ہوگا۔

مسئلہ...... اگر کسی بچہ کا والد وفات پا گیا اور بچہ کا مال بھی نہیں ہے اور اس کی والدہ ہے اور دادا ہے تو دونوں پر بقدر اپنے حصۂ میراث کے

بچے کا خرچہ واجب ہوگا، لہٰذا ۱/۳ اماں کے ذمّہ ہوگا اور ۲/۳ دادا کے ذمّہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچے کی میراث ان دونوں کو اسی نسبت سے پہنچتی ہے۔

دوسال سے پہلے بھی باہمی مشورہ سے دُودھ چُھڑا سکتے ہیں ...... پھر فرمایا: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالاً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی اگر دوسال سے پہلے ہی والدین بچہ کا دودھ چھڑانا چاہیں اور آپس میں رضامندی اور مشورے سے اس کا فیصلہ کر لیں تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ مشورے میں بچے کی مصلحت پیشِ نظر رکھی جائے، کبھی ایسا ہوتا ہے، بچہ کی والدہ کا دُودھ خراب ہو جاتا ہے وہ بچہ کے لئے مضر ہوتا ہے۔ کبھی بچہ دُودھ پینا خود سے چھوڑ دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ ماں کے علاوہ نہ کسی اور عورت کا دودھ پینے کو تیار ہے نہ اُوپر کا دُودھ پینا گوارا کرتا ہے ایسی صورت میں ماں کا دودھ چھڑائیں گے تو وہ بھوکا رہے گا، دودھ چھڑاتے وقت بچہ کی ہمدردی اور مربیانہ شفقت پیشِ نظر رکھی جائے۔

اجرت پر دُودھ پلوانے کے مسائل ...... پھر فرمایا: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم بچوں کی ماؤں کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ ماں زندہ ہے لیکن مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ دودھ کسی اور سے پلوائیں۔ تو یہ بھی دُرست ہے۔ بچہ کی مصلحت پیشِ نظر ہوتے ہوئے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اس میں ایک یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ بچہ کی ماں کو اس کے باپ نے طلاق دے دی ہے اور عدت بھی گزر گئی ہے اور دُودھ پلانے کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا تو بچہ کی ماں اگر اُجرت پر پلانا گوارا کرے تو باپ اس سے بچہ کو جُدا نہ کرے اس کی والدہ ہی سے پلوائے، ہاں اگر وہ دوسری دُودھ پلانے والیوں کی بہ نسبت زیادہ اُجرت مانگتی ہو، یا ماں کے دُودھ میں کچھ خرابی ہو تو اس کا باپ دُوسری عورت سے دُودھ پلوادے تو یہ بھی جائز ہے۔

مسئلہ ...... جب بچہ کو ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے اور ماں یوں کہے کہ دودھ خواہ وہ پلائے لیکن رہے میرے ہی پاس تو اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے۔ بچہ کے باپ کو یہ مطالبہ پورا کرنا لازم ہے۔

مسئلہ ...... جب کسی عورت کو دُودھ پلانے پر مقرر کریں تو اس کی اُجرت اچھی طرح سے طے کرلیں۔ ایسا نہ کریں کہ اُجرت طے کر کے اسے بالکل ہی نہ دیں یا جو اُجرت طے ہوئی تھی اس سے تھوڑی دیں یا ٹال مٹول کریں۔ جو کچھ طے ہوا ہے قاعدے کے موافق خوش اسلوبی سے دے دیں۔ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

مسئلہ ...... دودھ پلانے کے علاوہ اگر اس سے اور کوئی خدمت لینا چاہیں تو اسے بھی معاملہ میں طے کرلیں۔

مسئلہ ...... دُودھ پلانے والی کو روٹی کپڑے پر مُلازم رکھنا دُرست ہے۔ البتہ کھانا کپڑا کیسا ہوگا اس کی صاف صاف تصریح کردے۔ دُودھ پلانے والی کے علاوہ اور کسی ملازم کو روٹی کپڑے پر رکھنا جائز نہیں ہے۔ مذکورہ بالا احکام بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو پوری طرح دیکھنے والا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرو۔ خلاف ورزی کر کے مؤاخذہ اور عذاب کے مستحق نہ بنو۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ بیویاں اپنی جانوں کو روکے رکھیں چار مہینے

وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ

دس دن، پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی میعاد کو سو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ وہ عورتیں اپنی جانوں کے بارے میں خوبی کے ساتھ

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

کوئی فیصلہ کرلیں، اور جو تم کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

شوہر کی موت پر عدت گزارنے کے احکام

اس آیت شریفہ میں اُن عورتوں کی عدت بیان فرمائی ہے جن کے شوہر وفات پا جائیں اور یہ عدت چار مہینہ دس دن ہے۔ چار ماہ دس دن تک وہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح نہ کرے جس کا شوہر وفات پا گیا ہو اور اس زمانہ میں سوگ بھی کرے، یعنی خوشبو مہندی نہ لگائے اور بَن ٹھن کر نہ رہے۔ یہ حکم حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، واضح رہے کہ چار ماہ دس دن اس عورت کی عدت ہے جس کو حمل نہ ہو اور اس کا شوہر وفات پا جائے اگر کسی ایسی عورت کا شوہر وفات پا جائے جو حمل سے ہو تو پھر اس کی عدت وضع حمل ہے، یعنی شوہر کی موت کے بعد جتنی مدت میں بھی بچہ پیدا ہو، اس وقت تک وہ عورت عدت میں رہے گی، خواہ شوہر کی مُدت کے ایک گھنٹہ بعد ہی ولادت ہو جائے، خواہ مہینوں لگ جائیں، یہ مضمون سورۂ طلاق کی آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ میں بیان فرمایا ہے اور سوگ کرنا بھی اس کے لئے واجب ہے۔

مسئلہ...... جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ عدت ختم ہونے تک اس گھر میں رہے، جس میں رہتے ہوئے شوہر کی موت ہوئی۔ اگر خرچہ نہ ہو تو بقدر ِضرورت روزی حاصل کرنے کے لئے دن کے اوقات میں نکل سکتی ہے۔ ضرورت پوری کر کے پھر اسی گھر میں آجائے۔

مسئلہ...... اگر چاند رات کو شوہر کی وفات ہوئی تو مہینوں کے اعتبار سے چار ماہ دس دن پورے کرلے اور اگر چاند رات گزر جانے کے بعد وفات ہوئی تو ایک سو تیس دن شمار کر کے عدت پوری کرے۔

جب عدت گزر جائے تو عورتیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی خود مختار ہیں کہ خوبی کے ساتھ شرعی قواعد کے موافق جس سے چاہیں نکاح کرلیں۔ اولیاء اس میں رُکاوٹ نہ ڈالیں۔ ہاں اگر کوئی خلاف شرع کام کرنے لگیں تو اولیاء کے ذمہ ہوگا کہ اس سے روکیں اور نہی عن المنکر کریں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی کو بیان فرمایا ہے اور عورتوں کو اور ان کے اولیاء کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے کاموں کی پوری طرح خبر ہے، اگر کسی عورت نے خلافِ شرع کوئی اقدام کیا یا مردوں نے اس طرح کا اقدام کرنے دیا تو گناہ گار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس سے کسی کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ

اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو کنایۃً نکاح کا پیغام دیدو یا اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھو، اللہ کو معلوم ہے

أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا

کہ بے شک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، اور لیکن ان سے نکاح کا خفیہ طور پر وعدہ نہ کر لینا، مگر یہ کہ ان سے ایسی بات کہو جو قاعدہ کے موافق ہو، اور تم نکاح کرنے کا

عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ

ارادہ مت کرو یہاں تک کہ عدت قانون کے مطابق ختم ہو جائے، اور تم جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے۔ جو تمہارے دلوں میں ہے، اور سو تم اللہ سے ڈرو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ع ۳۰ / ۱۴

بیوہ عورتوں کو صریح پیغامِ نکاح دینے کی ممانعت

اس آیت شریفہ میں عدت وفات گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ایک تنبیہ فرمائی ہے اور وہ یہ کہ ایسی عورتوں کو صاف صریح الفاظ میں نکاح کا پیغام نہ دیا جائے ہاں اگر اشارۃً و کنایۃً ذکر کر دیا جائے مثلاً یوں کہہ دیا جائے کہ فکر نہ کرنا اللہ مالک ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ صرف دل میں یہ خیال کر لیا جائے کہ اس کی عدت گزر جائے گی تو اس سے نکاح کر لوں گا۔ اللہ تعالیٰ کو سب کے دِلوں کا حال معلوم ہے۔ اس نے اتنی گنجائش دے دی کہ اشارۃً و کنایۃً عورت کے کان میں بات ڈال دی جائے۔ البتہ اس کی اجازت نہیں دی کہ عدت والی عورت اور پیغام دینے والا مرد آپس میں خفیہ طریقہ پر عقدِ نکاح کا آپس میں وعدہ کر لیں اور اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ عدت ختم ہونے سے پہلے نکاح کریں۔

آیت کے ختم پر پھر وہی بات دُہرا دی کہ اللہ تعالیٰ کو دلوں کا سب حال معلوم ہے اس سے ڈرو احکام کی خلاف ورزی نہ کرو، اگر کبھی کوئی خطا ہو جائے تو توبہ کرو، اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے حلیم بھی ہے۔

لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ

کوئی گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دے دو عورتوں کو جبکہ تم نے ان کو چھوا نہ ہو اور مہر مقرر نہ کیا ہو اور ان کو متعہ دے دو،

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾

گنجائش رکھنے والے پر گنجائش کے بقدر ہے، اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے موافق ہے، یہ فائدہ پہنچانا عمدہ طریقہ پر ہو، واجب ہے اچھا سلوک کرنے والوں پر۔

وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ

اور اگر تم ان کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ ان کو چھوا ہو حالانکہ ان کے لئے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس صورت میں اس کا آدھا ہے

مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا

جتنا تم نے مقرر کیا ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، اور یہ بات کہ تم معاف کر دو

اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

زیادہ قریب ہے تقویٰ سے، اور نہ بھولو آپس میں احسان کرنے کو، بے شک اللہ اس کو دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

مہر اور مُتعہ کے احکام

اِن دونوں آیتوں میں چند مسائل بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو صرف نکاح کر کے طلاق دے دے نہ اسے ہاتھ لگایا ہو نہ اس کے لئے مہر مقرر کیا ہو تو اس صورت میں مہر واجب نہیں ہے۔

البتہ بطورِ سلوک و احسان اور دلداری کے متعہ دینا واجب ہے، یہ متعہ ایک جوڑا کپڑوں کی صورت میں ہوگا، یعنی طلاق دینے والا مرد مطلقہ عورت کو تین کپڑے دے دے، ایک کرتہ، ایک دوپٹہ ایک خوب چوڑی چکلی چادر جو سر سے پاؤں تک ڈھانک سکے اور اس میں مرد کی حالت کا اعتبار ہوگا، مرد پیسہ والا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگ دست ہے تو اپنے حالات کے مطابق دے دے، اس وجوب کو مؤکد فرمانے کے لئے ارشاد فرمایا: مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ کہ یہ نفع پہنچانا شرعی قاعدہ کے مطابق ہو جو محسنین پر واجب ہے، ہر مسلمان اپنے ایمان کی وجہ سے صفتِ احسان اختیار کرنے پر مامور ہے اور ہر مؤمن محسن ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جو لوگ فاسق اور گناہ گار ہیں۔ ان پر واجب نہیں، آیتِ بالا سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر کئے بغیر نکاح کر لیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد اگر مذکورہ بالا صورت پیش آ جائے (کہ مرد نے عورت کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور طلاق دے دی) تو اس صورت میں متعہ دینا ہوگا جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور اگر مہر مقرر کئے بغیر نکاح کر لیا، اور پھر میاں بیوی والی تنہائی بھی ہوگئی یا خلوت سے پہلے شوہر کی وفات ہوگئی تو مہر مثل دینا ہوگا جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے۔

اور اگر مہر مقرر کیا تھا لیکن طلاق خلوت سے پہلے دیدی تو اس صورت میں مقرر کردہ مہر کا آدھا دینا لازم ہوگا، ہاں اگر عورت بالکل ہی چھوڑ دے کچھ بھی نہ لے تو معاف ہو جائے گا اور اگر شوہر اسے پورا ہی مہر دے دے باوجودیکہ آدھا ہی واجب تھا، یا جو پورا مہر دے چکا تھا اس میں سے آدھا واپس نہ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ میں یہی آخری بات بیان فرمائی ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، وہ شوہر ہے، اور اگر مہر مقرر کیا گیا تھا اور خلوت بھی ہوگئی تھی تو پورا مہر دینا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا: وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (کہ تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے)۔ کیونکہ معاف کرنا موجب اجر و ثواب ہے۔ پھر فرمایا وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنے کو نہ بھولو، آپس میں حُسنِ سلوک سے پیش آتے رہو۔ قال صاحب الروح ص۱۵۵ ج۲ ای لا تترکوا أن یتفضل بعضکم علی بعض کالشئی المنسی۔

آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ اس میں وہی تذکیر و تنبیہ ہے جو بار بار گزر چکی ہے اور مضامین کے ختم میں بار بار دُہرائی جاتی ہے، درحقیقت اس بات کا مراقبہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے باخبر ہے، اور ہمارے کردار کو وہ دیکھ رہا ہے، سارے اعمال کو درست بنا دینے کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ جہاں آخرت کی مسئولیت سے ذرا غفلت ہوتی ہے وہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ضائع ہونے کے مواقع پیش آ جاتے ہیں اس لئے قرآن مجید میں بار بار اس بات کو

دہرایا ہے کہ آخرت کی پیشی اور محاسبہ کو سامنے رکھیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

پابندی کرو نمازوں کی اور درمیان والی نماز کی، اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے اس حال میں کہ عاجزی اختیار کئے ہوئے ہو۔

تمام نمازوں اور خاص کر صلوٰۃ وسطیٰ کی محافظت کا حکم

طلاق اور شوہر کی وفات سے متعلق بعض مسائل باقی ہیں درمیان میں نمازوں کی پابندی کا حکم فرمادیا، بندے جس حال میں بھی ہوں۔ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں اور خاص کر نمازوں کا خوب زیادہ اہتمام کریں۔ نماز سراپا ذکر ہے، بار بار خالقِ کائنات جل مجدہ کی یاد کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اللہ کی یاد ہی اس پورے عالم کی جان ہے، آدمی کیسی ہی مشغولیت میں ہو نماز سے غافل نہ ہو، اور ان نمازوں میں بھی صلاۃ وسطیٰ یعنی درمیان والی نماز کا اور زیادہ دھیان رکھے۔ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح ہے کہ صلاۃ وسطیٰ، (درمیان والی نماز) سے عصر کی نماز مراد ہے۔ اس نماز کا خصوصی دھیان رکھنے کے لئے اس لئے ارشاد فرمایا کہ عموماً تجارتی امور اور کاروبار اور بہت سے کام ایسے وقت میں سامنے آجاتے ہیں جبکہ نمازِ عصر کا وقت ہوتا ہے۔ مالوں کی خرید و فروخت کی گرم بازاری عصر ہی کے وقت ہوتی ہے، اس وقت میں نمازوں کی پابندی کرنے والے بھی نمازِ عصر سے غافل ہو جاتے ہیں۔

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ نمازیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض فرمایا ہے۔ جس نے اچھی طرح ان کا وضو کیا اور ان کو بروقت پڑھا اور ان کا رکوع و خشوع پورا کیا تو اللہ کے ذمہ یہ عہد ہے کہ وہ اس کی مغفرت فرمادے گا، اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اُس کے لئے اللہ کا کوئی عہد نہیں چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے اسے عذاب دے۔ (رواہ ابو داؤد ص۶۱ ج۱) آخر میں فرمایا: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ،لفظ قانتین ،قنوت سے لیا گیا ہے۔ جو اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی گئی ہے، مطیعین، خاشعین، ساکتین، یہ سب اس کی تفسیریں ہیں۔ جو سب حضرات سلف سے مشہور ہیں۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے اندر باتیں کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ آیت کریمہ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ نازل ہوگئی تو ہمیں خاموشی کا حکم ہوا اور آپس میں بات کرنے سے روک دیئے گئے۔ (رواہ البخاری ص۶۵۰ ج۲)

نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہی پڑھا جائے اور آپس میں باتیں نہ کی جائیں۔ حضرت مجاہد تابعی نے فرمایا کہ قنوت یہ ہے کہ رکوع لمبا ہو نظر پست ہو اور خشوع حاصل ہو، اور یہ کہ کسی طرف التفات نہ کیا جائے، اور کنکریوں کو اُلٹ پلٹ نہ کیا جائے (جو بعض مسجدوں میں فرش پر پڑی رہتی تھیں) اور دُنیاوی اُمور کے وسوسے اپنے دل میں نہ لائے، بعض حضرات نے قانتین کی تفسیر کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے۔ مکملین الطاعة ومتممیها علی أحسن وجه من غیر اخلال بشیئ مما ینبغی فیها کہ نہایت اچھے طریقہ پر طاعت کو درجہ کمال تک پہنچایا جائے اور جو چیزیں طاعت کے لئے چاہئیں ان میں سے کسی بھی چیز میں خلل نہ آنے دیا جائے۔ (رُوح المعانی ص۱۰۷ ج۲)

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ

پھر اگر تم کو خوف ہو تو کھڑے ہوئے یا سواری پر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ لیا کرو، پھر جب تم کو امن حاصل ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اس نے تمہیں سکھایا ہے جو تم نہیں

مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

جانتے تھے۔

دُشمنوں کا ہجوم ہو تو نماز کیسے پڑھی جائے؟

گزشتہ آیت میں تمام نمازوں کی پابندی اور خاص کر صلاۃ وسطیٰ کی پابندی کا حکم فرمایا۔ اس آیت میں خوف اور امن کے حالات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو پانچوں نمازوں کو ہر حال میں اور ہر مقام میں ضروری پڑھیں۔ بعض مرتبہ دُشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ باقاعدہ رکوع سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں کھڑے کھڑے اشارہ ہی سے نماز پڑھ لیا کریں۔ زمین پر اُترنے کا موقع نہ ہو تو سواری ہی پر پڑھ لیں۔ پھر جب امن ہو جائے اور اطمینان نصیب ہو جائے تو اسی طرح نماز پڑھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امن و اطمینان کے حالات میں نماز پڑھنے کی تعلیم دی ہے اگر دُشمنوں کا ہجوم ہو اور کوئی صورت کسی طرح نماز پڑھنے کی بن نہ پڑے تو مجبوراً نماز مؤخر کر دے اور بعد میں قضا پڑھ لے۔ صحیح بخاری ص ۸۳ ج ۱ میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ جنگِ خندق کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے اور کفار قریش کو بُرا کہنے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نماز نہیں پڑھ سکا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اللہ کی قسم میں نے بھی عصر نہیں پڑھی پھر وادی بطحان کی طرف توجہ فرمائی اور آپؐ نے وضو کیا اور ہم نے بھی وضو کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مشرکین کو بددعا دیتے ہوئے) فرمایا اللہ ان کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ سے روک دیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ (صحیح مسلم ص ۲۲۶ ج ۱)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا

اور جو لوگ وفات پا جائیں اور چھوڑ جائیں بیویوں کو وصیت کر دیں اپنی بیویوں کے لئے منتفع ہونے کی

اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ

ایک سال تک اس طور پر کہ وہ گھر سے نہ نکالی جائیں، پس اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اس بات میں جو وہ اپنی

اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

جانوں کے لئے قاعدہ کے مطابق اختیار کرلیں، اور اللہ عزت والا ہے، حکمت والا ہے۔

بیویوں کے لئے وصیت کرنا

زمانۂ جاہلیت میں جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تھا تو اس کی عدت ایک سال تھی، وہ ایک سال تک کسی کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی اور ایک سال کے بعد اس کوٹھڑی سے نکالتے تھے اور اس کی گود میں اُونٹ کی مینگنیاں بھر دیتے تھے پھر اسے باہر گلی کوچے میں نکالتے تھے۔ وہ لوگوں پر مینگنیاں پھینکتی جاتی تھی اس سے لوگ سمجھ لیتے تھے کہ اس کی عدت ختم ہوگئی جیسا کہ صحیح بخاری ص ۸۰۳ ج ۲ اور صحیح مسلم ۴۸۷ ج ۱ اور سنن ابوداؤد ص ۳۱۴ ج ۱ میں مذکور ہے۔ اسلام میں ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن مقرر فرمادی جس کا شوہر وفات پا جائے اور وہ حمل سے نہ ہو اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس آیت میں حکم فرمایا کہ مرنے والا اپنی بیویوں کا خیال رکھے موت سے پہلے اس بات کی وصیت کردے کہ شوہر کے ترکہ سے ایک سال تک اس کو نان ونفقہ دیا جائے، لفظ مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ میں اس کو بیان فرمایا ہے، یہ حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہوگیا اور اس کے ساتھ یہ حکم تھا کہ وصیت میں یہ بھی شامل کردیں کہ ایک سال تک اسے شوہر کے گھر سے نہ نکالا جائے، غَيْرَ إِخْرَاجٍ میں اس حکم کو بیان فرمایا ہے لیکن عورت کو اختیار تھا کہ اگر وہ چاہے تو مرنے والے شوہر کے گھر میں رہے اور چاہے تو اپنے ماں باپ کے یہاں چلی جائے فَاِنْ خَرَجْنَ میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے یہ حکم آیت میراث نازل ہونے سے پہلے تھا۔ جب میراث کا حکم نازل ہوگیا اور شوہر کے مال میں بیوی کا حصہ بطور میراث مقرر کردیا گیا تو یہ حکم کہ ایک سال تک اسے نان ونفقہ دیا جائے منسوخ ہوگیا اور اس کے بعد یہ حکم ہوگیا کہ میراث لے لے اور خرچہ اسی میں سے کرے۔ البتہ عدت پوری ہونے تک شوہر ہی کے گھر میں رہے۔ نہ اس میں سے نکلے نہ نکالی جائے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے فائدہ پہنچانا ہے اچھے طریقہ پر، یہ ضروری قرار دیا گیا ہے متقیوں پر، اسی طرح اللہ بیان فرماتا
لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع
ہے اپنی آیات تاکہ تم سمجھو۔

ع ۳۱ ۷ ۱۵

مطلقہ عورتوں کو متعہ دینے کی تاکید

جن عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی جائے اور مہر مقرر نہ کیا گیا ہو ان کے لئے متعہ دینے کا حکم عنقریب گزر چکا ہے۔ اس آیت میں پھر فرمایا کہ طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے نفع پہنچانا ہے، اس سے کیا مُراد ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا کہ اس سے پہلے جن عورتوں کو مُتعہ یعنی تین کپڑے دینے کا حکم ہوا تھا اس کو یہاں بطورِ تاکید دوبارہ بیان فرمایا ہے۔ صاحب رُوح المعانی ص ۱۶۰ ج ۲ لکھتے ہیں کہ اس کی تعیین اس روایت سے ہوتی ہے جو ابنِ جریر نے ابن زید سے روایت کی ہے اور وہ یہ کہ جب لفظ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نازل ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ تو احسان اور سلوک کی بات ہوئی۔ (یعنی تبرع والا معاملہ ہوا) چاہے عمل کروں چاہے نہ کروں۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ فرمادیا، جس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص اس پر عمل نہیں کرے گا وہ گناہ گار ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے عدت کے زمانہ کا نان ونفقہ مراد ہوسکتا ہے کیونکہ وہ بھی نفع پہنچانے میں شامل ہے اور لفظ

مَتَـاعٌ کو اور زیادہ عام لیا جائے تو اس میں وہ سب احکام داخل ہو جاتے ہیں جو مطلقہ عورتوں سے متعلق ہیں جس میں بعض صورتوں میں پورے مہر کی ادائیگی اور بعض صورتوں میں نصف مہر کی ادائیگی واجب ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اگر بیوی کا مہر ادا نہیں کیا ہے تو یہ نہ سمجھے کہ اب تو میری بیوی رہی ہی نہیں اب کیا لینا دینا ہے بلکہ اب تو مہر کی ادائیگی کی فرضیت اور زیادہ مؤکد ہوگئی کیونکہ جب تک نکاح میں تھی تو معاف کر دینے کا بھی احتمال تھا اب کیوں معاف کرنے لگی۔ لہٰذا اب جلدی ادائیگی کر کے سبکدوش ہو جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ

تُو نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ تعداد میں ہزاروں تھے، پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے

اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

کہ مر جاؤ، پھر ان کو زندہ فرما دیا، بے شک اللہ ضرور فضل والا ہے لوگوں پر، لیکن اکثر

لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

لوگ شکر نہیں کرتے ۔ اور قتال کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ معالم التنزیل ص ۲۲۳ ج ۱ میں لکھتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک بستی جس کا نام داوردان تھا اس میں طاعون واقع ہو گیا، اس موقع پر ایک جماعت وہاں سے نکل گئی اور ایک جماعت بستی ہی میں رہ گئی۔ جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے ان میں سے اکثر ہلاک ہو گئے اور جو لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ صحیح سلامت رہے اور پھر بستی میں آ گئے، جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمارے یہ ساتھی ہم سے زیادہ ہوشیار رہے۔ آئندہ ہم ایسی زمین کی طرف نکل جائیں گے جہاں وباء نہ ہو چنانچہ آئندہ سال طاعون واقع ہوا تو بستی کے تقریباً سب ہی لوگ چلے گئے اور ایک وسیع میدان میں قیام کر لیا، اس میدان میں نجات پانے کی نیت سے قیام کیا تھا لیکن ہوا یہ کہ ایک فرشتہ نے اوپر کے حصہ سے اور ایک فرشتہ نے میدان کے نچلے والے حصے سے پکارا اور کہا کہ مُوْتُوْا کہ تم سب مر جاؤ، چنانچہ وہ سب مر گئے۔

دوسرا قول علامہ بغوی نے یہ نقل کیا ہے کہ جو لوگ گھروں سے نکلے تھے یہ لوگ جہاد سے فرار ہوئے تھے جس کا واقعہ یوں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ دشمن سے جنگ کرنے کے لئے نکلیں ان لوگوں نے اوّل تو لشکر تیار کر لیا لیکن پھر اُن پر بزدلی سوار ہوگئی اور موت سے جان چھڑانے لگے، لہٰذا اُنہوں نے ایک حیلہ بنایا اور اپنے بادشاہ سے کہا کہ جس سرزمین میں جہاد کرنے کے لئے ہم کو جانے کا حکم ہوا ہے اس میں وَبا پھیلی ہوئی ہے، جب وَبا ختم ہو جائے گی تو ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان پر موت بھیج دی، جب وہیں ان کی بستی میں موتیں ہونی شروع ہوئیں تو وہ موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، جب بادشاہ نے یہ منظر دیکھا تو بارگاہِ خداوندی میں اُس نے دُعا کی کہ اے اللہ! آپ ان کو کوئی ایسی نشانی دکھا دیجئے جس سے یہ سمجھ لیں کہ موت سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور فرارِ موت سے نہیں بچا جا سکتا۔ چنانچہ جب وہ بستیوں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا موتوا (مر جاؤ) اور یہ بطور عقوبت و سزا کے فرمایا چنانچہ وہ لوگ مر گئے، ان کے جانور بھی مر گئے اور آنِ واحد میں سب

کوموت آ گئی۔ جیسے شخص واحد کی موت ہو، وہ آٹھ دِن تک اسی طرح پڑے رہے، یہاں تک کہ نعشیں ان کی پھول گئیں۔ ان کی طرف لوگ نکلے تو اتنی کثیر تعداد کو دفن کرنے سے عاجز آ گئے، لہٰذا انہوں نے ان کے چاروں طرف احاطہ بنا دیا تا کہ درندے نہ پھاڑ ڈالیں اور ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیا، حضرت حزقیل علیہ السلام جو اس زمانہ کے نبی تھے وہ ان لوگوں پر گزرے تو کھڑے ہو گئے اور تعجب سے غور فرمانے لگے، اللہ جل شانہ نے ان کی طرف وحی بھیجی کیا میں تمہیں کوئی نشانی دکھاؤں، عرض کیا ہاں! دکھایئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو زندہ فرما دیا، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان کے زندہ کرنے کے لئے دُعا کی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ فرما دیا، جب وہ لوگ زندہ ہو گئے تو ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔

سبحان اللہ ربنا وبحمدک لا الٰہ الا انت (اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں) زندہ ہو کر یہ لوگ اپنی قوم میں چلے گئے، حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بطورِ سزا کے موت دیدی تھی ۔ کیونکہ موت سے بھاگے تھے پھر باقی عمریں پوری کرنے کے لئے زندہ کر دیئے گئے، اگر ان کی عمریں ختم ہو چکی ہوتیں تو دوبارہ زندہ نہ کئے جاتے۔

یہ لوگ مقدار میں کتنے تھے جو موت کے بعد زندہ ہوئے اس کے بارے میں علامہ بغوی نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ ۳ ہزار، ۴ ہزار، ۸ ہزار، ۱۰ ہزار، ۳۰ ہزار سے کچھ اوپر، ۴۰ ہزار، ستر ہزار۔ علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ جس نے دس ہزار سے زیادہ کہا وہ قول زیادہ مناسب ہے کیونکہ لفظ اُلــوف جمع کثرت ہے جس کا دس ہزار سے کم پر اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ جو کچھ معالم التنزیل سے نقل کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی کتب تفسیر میں واقعات کچھ نقل کئے گئے ہیں۔ بظاہر یہ سب واقعات اسرائیلیات ہیں اور ان قصوں کے جاننے پر قرآن کا مفہوم سمجھنا موقوف بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے ایک واقعہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں انسانوں کو موت دیدی پھر ان سب کو زندہ فرما دیا، اللہ تعالیٰ کی قوت کاملہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسے موت دینے اور پھر زندہ کرنے پر قدرت ہے۔ ایک جان کی موت و حیات اور ہزاروں جانوں کی موت و حیات اس کے لئے سب برابر ہیں۔ آن واحد میں وہ ہزاروں افراد کو موت دے سکتا ہے اور زندہ بھی کر سکتا ہے۔ اس واقعہ میں خاص کر بنی اسرائیل کے لئے تذکیر ہے۔ کیونکہ انہیں اپنے خاندانوں کے واقعات یاد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی تھے۔ آپ کو ان باتوں کا پتہ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ باتیں بتائی ہیں اور یہ آپؐ کی نبوت کے دلائل میں سے روشن دلیل ہے۔ دوسری آیت میں یہ جو فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرو اس کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ اُن لوگوں کو خطاب ہے جو موت کے بعد زندہ کئے گئے تھے۔ اور یہ بات ان مفسرین کے بیان سے جوڑ بھی کھاتی ہے جنہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں نے جہاد سے بچنے کے لئے راہِ فرار اختیار کی تھی، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ اس میں اُمتِ محمدیہؐ کو خطاب فرمایا ہے اور ان کو جہاد کا حکم دیا ہے اس قول کے مطابق بنی اسرائیل کے واقعہ کو حکمِ جہاد کی تمہید کہا جا سکتا ہے کہ جہاد میں شریک ہونے سے موت کا خوف مانع نہ ہونا چاہیے موت کے ڈر سے بھاگنا موت سے بچا نہیں سکتا۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں آدمی بھاگ کھڑے ہوئے تھے لیکن موت نے ان کو نہ چھوڑا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا آخرت کے بہت بڑے اجر و ثواب اور اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ ہے جو جہاد نہ کرے گا موت اس کو بھی آئے گی پھر کیوں اجر و ثواب کو کھوئے۔ بعض اہلِ تفسیر کے قول کے مطابق وہ لوگ طاعون سے بھاگے تھے جو بنی اسرائیل کے لئے عذاب تھا اور اس اُمت کے لئے رحمت ہے ہمارے نبی فخر الانبیاء والمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طاعون ایک عذاب ہے اللہ جس پر چاہتا ہے اُسے بھیج دیتا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مؤمنین کے لئے رحمت بنایا ہے، جو بھی کوئی شخص کسی ایسی جگہ موجود ہو جہاں طاعون واقع ہو گیا ہو اور صبر کرتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے وہیں ٹھہرا رہے کہ مجھے اس کے سوا کچھ

(ضرر) نہیں پہنچ سکتا جو اللہ نے میرے لئے لکھ دیا ہے، تو ایسے شخص کے لئے ایک شہید کا ثواب ہے۔ (رواہ البخاری ص۸۵۳ ج۲)

یہ تو اس شخص کے لئے ہے جو طاعون کی جگہ ثابت قدم رہا۔ وہاں سے گیا نہیں اور طاعون میں مبتلا نہ ہوا۔ صبر و استقامت کی وجہ سے اسے شہید کا ثواب ملے گا اور جو شخص طاعون میں مر گیا تو وہ بھی شہیدوں میں شمار ہے۔ (کما رواہ البخاری ص۸۵۳ ج۲)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سنو کہ کسی سرزمین میں طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی ایسی سرزمین میں طاعون آ جائے جہاں تم موجود ہو تو اس سے بھاگنے کے لئے مت نکلنا۔ (رواہ البخاری ص۸۵۳ ج۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص طاعون سے بھاگے تو وہ ایسا ہے، جیسے میدانِ جہاد سے بھاگا اور جو صبر کرتے ہوئے وہیں رہے اس کے لئے ایک شہید کا ثواب ہے۔ (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص۱۳۹ ج۱)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ

کون ہے جو قرض دے اللہ کو قرض حسن، پھر اللہ اُس کے لئے اضافہ فرما دے چند در چند بہت سے اضافے فرما کر، اور اللہ تنگی فرماتا ہے

وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور کشادہ فرماتا ہے، اور اس کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

اللہ کی رضا کے لئے صدقہ خیرات کرنے کی فضیلت

لباب النقول میں اس آیت کریمہ کا سببِ نزول بتاتے ہوئے بحوالہ ابن حبان وغیرہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب آیت شریفہ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (آخر تک) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا رَبِّ زِدْ اُمَّتِیْ (یعنی اے میرے رب! میری اُمت کو اور زیادہ عطا فرما) اس پر آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے استفہام کا طریقہ اختیار فرمایا ہے (جو ترغیب کا بہت عمدہ طریقہ ہے) کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دیتا ہے۔ قرض کا معنیٰ تو سب ہی جانتے ہیں اور حسن اچھے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ صاحب روح المعانی ص۱۶۲ ج۲ لکھتے ہیں کہ اخلاص کے ساتھ خرچ کرنا اور حلال اور طیب مال خرچ کرنا یہ سب قرض حسن کے عموم میں داخل ہے۔ اھ اللہ تعالیٰ شانہٗ محتاج نہیں ہے سب کچھ اسی نے پیدا فرمایا اور سب اسی کی ملکیت ہے۔ جو لوگ مجازی مالک ہیں وہ اور اُن کے اَموال سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا کتنا بڑا فضل اور شان کریمانہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے میں سے جو شخص اس کی مخلوق پر خرچ کرے جو خرچ کرنے والے کی اپنی جنس ہے حتیٰ کہ اپنے اُوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے اور اس میں ثواب سمجھے تو اس کا نام قرض رکھ دیا، اور پھر جتنا دیا ہے اس سے بہت زیادہ عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جس کو اس آیت میں اَضْعَافًا كَثِیْرَةً فرمایا ہے، کسی نے کیا خوب کہا

مالِ عالم ملک تست و مالکان مملوکِ تو

باوجود ایں بے نیازی اقرضوا اللہ گفتۂ

صحیح بخاری ص ۱۸۹ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص ایک کھجور کے برابر حلال مال سے صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ صرف حلال ہی کو قبول فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے پھر اس کی تربیت فرماتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچہ کی تربیت کرتا ہے اور وہ ذرا سا صدقہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

صحیح مسلم ص ۲۵۸ ج ۲ میں ہے کہ روزانہ رات کو جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کون ہے جو مجھ سے دُعا کرے میں اس کی دُعا قبول کروں۔ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اس کو دے دوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اس کی مغفرت کر دوں، کون ہے جو ایسے کو قرض دے جس کے پاس سب کچھ ہے اور جو ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ صبح تک یوں ہی فرماتے رہتے ہیں۔ یہ جو فرمایا کہ کون ہے جو ایسے کو دے جس کے پاس سب کچھ ہے اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے مال کی حاجت نہیں ہے اس کی ملکیت میں سب کچھ ہے، کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ضرورت مند کو دے رہا ہوں، بلکہ اپنا فائدہ سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور یہ جو فرمایا کہ وہ ظلم کرنے والا نہیں ہے اس میں یہ بتایا کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے ضائع نہ جائے گا اس کے مارے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۖ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اللہ تعالیٰ تنگی کرتا ہے اور کشادہ فرماتا ہے اور اسکی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہے دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس کی روزی تنگ کر دے اس کا بھی اسے اختیار ہے اس پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں۔ کسی کو زیادہ دینا اور دے کر کم کر دینا سب اسی کے قبضہ وقدرت میں ہے اس مضمون کو قرآن کریم میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا (بلاشبہ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق عطا فرماتا ہے اور تنگی فرما دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے دیکھنے والا ہے) یہ مضمون سورۂ عنکبوت رکوع نمبر ۶ اور سورۂ سباء رکوع نمبر ۴، اور رکوع نمبر ۵ میں بھی مذکور ہے۔ آخر میں یہ جو فرمایا وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اس میں یہ بتایا کہ اللہ کے لئے خرچ کیا ضائع نہیں ہے۔ جب اللہ کے یہاں پہنچو گے، سب کا ثواب پالو گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا (وقف لازم)

کیا آپ کو بنی اسرائیل کی ایک جماعت کا قصہ معلوم ہے جو موسیٰ کے بعد پیش آیا، جب انہوں نے اپنے نبی سے عرض کیا کہ مقرر کر دیجئے ہمارے لئے

نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا

ایک بادشاہ تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، انہوں نے فرمایا کیا ایسا ہو گا کہ اگر تم پر قتال فرض کیا گیا تو تم قتال نہ کرو؟ وہ کہنے لگے

وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ

اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں حالانکہ ہم نکال دیئے گئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں کے پاس سے، پھر جب ان پر

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ

قتال فرض کیا گیا تو پھر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اور کہا ان سے ان کے نبی نے بے شک اللہ نے

بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

مقرر فرما دیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ وہ کہنے لگے کہ ان کو ہم پر حکمران ہونے کا حق کیسے پہنچتا ہے حالانکہ ہم ان سے زیادہ حکمرانی کے

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ

مستحق ہیں اور ان کو مالی گنجائش نہیں دی گئی، ان کے نبی نے کہا کہ بے شک اللہ نے ان کو تم پر حکمرانی کے لئے منتخب فرمایا ہے، اور ان کو علم میں اور جسم میں

وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ

فراخی عطا فرمائی ہے اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا ہے علم والا ہے۔ اور کہا ان سے ان کے نبی نے

اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى

کہ بلاشبہ اس کے حکمران ہونے کی یہ نشانی ہے کہ آ جائے گا تمہارے پاس تابوت جس میں تسکین ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے

وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع ۳۲ / ۱۶

جنہیں چھوڑا تھا آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون نے جس کو فرشتے اُٹھا کر لے آئیں گے بے شک اس میں ضرور نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ اور طالوت کی بادشاہت کا ذکر

ان آیاتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔ پورا واقعہ پارہ کے ختم کے قریب تک بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ میں بنی اسرائیل کے لئے جہاں تذکیر نعمت ہے وہاں اُمت محمدیہ (علی صاحبھا الصلاۃ و التحیۃ) کے لئے بھی بہت سی عبرتیں ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد انہی کی قوم میں سے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے جو یکے بعد دیگرے آتے رہے، حضرت یوشع، حضرت شمعون، حضرت شمویل اور حضرت کالب بن یوقنا اور حضرت حزقیل علیہم السلام کے اسماء گرامی لکھے ہیں۔ یہ حضرات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تبلیغ اور توریت شریف کے مضامین بیان فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل میں شدہ شدہ بے دینی بلکہ بد دینی تک آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط فرما دیا۔ جو جالوت کی قوم میں سے اور عمالقہ کی قوم میں سے تھے اور بحر روم کے ساحل پر اور مصر و فلسطین کے درمیان رہتے تھے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل پر غالب ہو گئے ان کی زمین چھین لی اور ان کی اولاد کو جن میں ان کے بادشاہوں کی نسل کے لوگ بھی تھے قید کر لیا اور ان پر جزیہ لگا دیا، بنی اسرائیل اس موقع پر بہت ہی زیادہ مصیبت اور سختی میں مبتلا رہے کوئی ایسا نہ رہا جو اُن کا قائد و مدبر ہوتا۔ جب بہت زیادہ دُکھ اور تکلیف میں مبتلا ہوئے تو اس زمانہ میں جو اُن کے نبی تھے۔ (اور اِسی مصیبت کے زمانہ میں وہ پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر نبوت سے سرفراز ہوئے) ان کی خدمت میں بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اللہ پاک کی طرف سے آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کرا دیں تا کہ ہم ان کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد کریں اور ان کو اپنے علاقوں سے نکال دیں (چونکہ بنی اسرائیل کو سیاسی حالات میں بادشاہوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت تھی اس لئے اُنہوں نے ایسا سوال کیا) جب ان لوگوں نے کسی کو بادشاہ بنانے کا سوال کیا اور دشمنوں سے جہاد کرنے کا اِرادہ ظاہر کیا تو ان کے نبیؑ نے جو ان کے حال اور قال کو جانتے تھے۔ خطرہ ظاہر کیا اور فرمایا کہ تم سے تو یہ اُمید ہے کہ قتال فرض ہو گیا تو جنگ سے دُور بھاگو گے اور لڑائی سے جان چھڑاؤ گے اس پر وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں۔ جنگ نہ لڑنے کا کوئی سبب نہیں بلکہ لڑنے کا سبب موجود ہے اور وہ یہ کہ دشمن نے ہم پر جو تسلط کر رکھا ہے اس کی وجہ سے ہم اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے دُور کر دیئے گئے ہیں۔ باتیں تو بڑھ چڑھ کر کر رہے تھے لیکن جب قتال فرض ہو گیا تو وہ خطرہ سامنے آ گیا جو ان کے نبی کو تھا اور تھوڑے لوگوں کے علاوہ باقی سب ارادوں اور وعدوں سے پھر گئے اور جنگ کرنے سے منہ موڑ لیا۔ اللہ جل شانہٗ نے ان کی درخواست پر حضرت طالوت کو بادشاہ بنا دیا اور ان کے نبی نے اس کا اعلان کر دیا، عمل اور کارگزاری حضرت طالوت کی تھی اور مشورہ اور رہبری ان کے نبی کی تھی۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ نبی جس سے مذکورہ بالا درخواست کی تھی۔ حضرت شمعون علیہ السلام تھے۔

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست پر حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا تو اپنی روایتی کجروی کے باعث اُس طرح کی اُلٹی باتیں کیں جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور پُرانا طریقہ کار تھا۔ ان کی اس طرح کی باتیں ذبح بقرہ کے واقعہ کے سلسلہ میں گزر چکی ہیں۔ حضرت طالوت کی بادشاہت کا اعلان سننے کے بعد کہنے لگے کہ یہ شخص ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے پاس پیسہ ہے نہ کوڑی، اس سے زیادہ تو ہم بادشاہ بننے کے مستحق ہیں اپنی جہالت سے وہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کو بھی رائے دینے لگے کہ اس کے بجائے ہم میں سے کوئی پیسہ والا بادشاہ ہونا چاہیے، اور یہ انسان کا عجیب مزاج ہے کہ وہ پیسہ والا کو بڑا آدمی سمجھتا ہے خواہ کیسا ہی بے علم اور ناسمجھ اور بخیل ہو۔

ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو منتخب فرمالیا ہے تم پر ان کو ترجیح دے دی اور حکومت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس میں پوری طرح موجود ہے حکومت کے لئے علم ہونا چاہیے جس کے ذریعہ وہ تدبیر امور کر سکے اور دُشمنوں سے نمٹ سکے اور ساتھ ہی جسمانی قوت بھی ہونی چاہیے علم کی تدبیر اور جسم کی قوت سے ہمّت ہوتی ہے اور حوصلہ بُلند ہوتا ہے اور دُشمنوں پر غلبہ پانے کے لئے انہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور یوں بھی اللہ کو اختیار ہے، وہ جس کو چاہے حکومت اور مملکت عطا فرمائے، تمہیں اعتراض کا کیا حق ہے اور اللہ کے فیصلہ کے خلاف تم رائے دینے والے کون ہو اُسے معلوم ہے کہ حکومت ملنے پر کوئی کیا کرے اور کیسا ثابت ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ایک نبی کا فرمانا بات ماننے کے لئے اور حضرت طالوت کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن ان کے نبی نے حضرت طالوت کی بادشاہت کا ثبوت دینے کے لئے ایک نشانی بھی بیان فرمائی اور وہ یہ کہ تمہارے پاس وہ تابوت آئے گا جو تمہارے لئے باعثِ اطمینان وسکون ہوگا۔ اس تابوت میں ان چیزوں کا بقیہ ہوگا جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے چھوڑی تھیں چنانچہ وہ تابوت ان لوگوں کے پاس آ گیا جسے فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے، دشمنوں نے ان سے چھین لیا تھا جب یہ تابوت ان کے پاس تھا تو دُشمنوں سے جنگ کرتے وقت اُس کو سامنے رکھا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ دشمن پر فتح یابی حاصل کر لیتے تھے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے جو چیزیں چھوڑی تھیں ان کا بقیہ کیا تھا جو اس تابوت میں تھا۔ اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ توراۃ شریف کی دو تختیاں تھیں اور اُن تختیوں کا کچھ چورا تھا جو ٹوٹ گئی تھیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا اور حضرت ہارون علیہ السلام کی پگڑی تھی، اور کچھ من بھی تھا جو سلویٰ کے ساتھ بنی اسرائیل پر نازل ہوا کرتا تھا، اس تابوت کا ان کے پاس فرشتوں کا لیکر آنا اور دوبارہ واپس مل جانا اس بات کی صریح دلیل تھی کہ حضرت طالوت کو واقعی اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بنایا ہے، فرشتے یہ تابوت لائے اور حضرت طالوت کے سامنے رکھ دیا لیکن بنی اسرائیل سے پھر بھی یہ بعید نہ تھا کہ انکار کر بیٹھیں اس لئے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (تمہارے لئے اس میں نشانی ہے اگر تم مؤمن ہو)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ

طالوت لشکروں کے ساتھ روانہ ہوئے تو اُنہوں نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعہ آزمانے والا ہے، سو جس نے اس میں سے

مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ

پی لیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور جس نے اس میں سے نہ پیا تو وہ مجھ سے ہے سوائے اس شخص کے جس نے اپنے ہاتھ سے ایک چلو پی لیا،

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا

پھر تھوڑے سے افراد کے علاوہ سب نے اس میں سے پی لیا پھر جب آگے بڑھے طالوت اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے تو کہنے لگے کہ

طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ

آج ہمیں جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، جو لوگ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے تھے، وہ کہنے لگے کتنی ہی کم تعداد

فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا

جماعتیں اللہ کے حکم سے بھاری تعداد والی جماعتوں پر غالب ہو چکی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کیساتھ ہے۔ اور جب یہ لوگ جالوت اور اسکے لشکروں

لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى

کے مقابلہ کیلئے نکلے تو عرض کیا کہ اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ، اور کافروں کے

الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ

مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ سو ان کو شکست دے دی اللہ کے حکم سے اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور اللہ نے ان کو

اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

ملک دے دیا اور حکمت عطا فرما دی، اور ان کو جو کچھ چاہا علم دے دیا اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع فرمانا لوگوں کو بعض کو بعض کے

لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ

ذریعہ تو زمین میں فساد ہو جاتا اور لیکن اللہ جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ پر تلاوت کرتے

بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

ہیں اور بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔

طالوت کے لشکر کا عمالقہ پر غالب ہونا اور جالوت کا مقتول ہونا

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کا حکمران مقرر کر دیا گیا اور ان کے نبی کی خبر کے مطابق مذکورہ تابوت

فرشتے لے کر آ گئے تو اب بنی اسرائیل کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی، اور جہاد کرنے کے لئے نکلنا پڑا۔ جب دُشمن سے جنگ کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت طالوت نے اپنے لشکروں سے فرمایا کہ تم لوگوں کا امتحان ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو مبتلا فرمائے گا اور یہ ابتلاء اور امتحان ایک پانی کی نہر کے ذریعہ ہوگا، چونکہ گرمی سخت تھی اور پیاس سے بے تاب ہو رہے تھے اس لئے اکثر افراد امتحان میں ناکام ہو گئے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ نہر فلسطین تھی اور بعض حضرات کا قول ہے کہ اردن اور فلسطین کے درمیان کوئی نہر تھی جس کا پانی میٹھا تھا، حضرت طالوت نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو اس میں سے چلُّو بھر پانی پینے تک تو بات ٹھیک ہے۔ جس نے چلّو بھر پانی پی لیا وہ تو میرا ساتھی ہے میرے آدمیوں میں ہے اور جس نے زیادہ پانی پی لیا وہ مجھ سے نہیں ہے میری جماعت میں اس کا شمار نہیں، چونکہ اکثر افراد نے خوب پانی پی لیا تھا اس لئے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور جی چھوڑ بیٹھے اور ہمت ہار گئے اور کہنے لگے ہم تو آج اپنے دشمن جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں ہماری بساط نہیں کہ ہم ان سے لڑ سکیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت طالوت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ ستّر یا اسّی ہزار تھے ان میں سے تھوڑے ہی سے رہ گے جنہوں نے پانی نہیں پیا، جن لوگوں نے پانی نہیں پیا تھا ان کی تعداد تین سو تیرہ لکھی ہے۔ یہ تھوڑا سا ایک چلّو پانی جن لوگوں نے پیا اللہ تعالیٰ نے اتنے ہی پانی کو ان کے لئے کافی فرما دیا ان کی پیاسیں اس سے بجھ گئیں اور جن لوگوں نے ڈٹ کے پانی پی لیا تھا وہ وہیں نہر کے کنارے پھیل گئے اور بُزدل ہو کر گر پڑے، جو لوگ حضرت طالوت کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن کی طرف پیش قدمی کی وہ دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ ہمیں اللہ کے پاس جانا ہے۔ میدانِ جہاد سے بھاگنا مؤمن کا شیوہ نہیں۔ ہمیں جہاد کرنا ہی کرنا ہے۔ رہا ہماری جماعت کا کم تعداد ہونا تو اللہ کی مدد کی اُمید رکھنے والوں کے لئے یہ بات سوچنے کی نہیں ہے۔ بہت سی کم تعداد جماعتیں بڑی بھاری تعداد والی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہو چکی ہیں، صبر و ثابت قدمی اللہ کی مدد کو لانے والی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت طالوت کا لشکر دشمن سے جہاد کرنے کے لئے جا رہا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے ایک تھیلے میں چند پتھر رکھ لئے تھے جب دونوں فریق مقابل ہوئے تو جالوت نے کہا کہ تم لوگ اپنے میں سے ایک شخص نکالو جو مجھ سے جنگ کرے اس نے مجھے قتل کر دیا تو میرا ملک تمہارا ہو جائے گا۔ اور میں نے قتل کر دیا تو تمہارا ملک میرے ملک میں شامل ہو جائے گا۔ حضرت طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو جالوت کے مقابلہ کے لئے روانہ کرنا چاہا اور ان کو ہتھیار پہنا دیئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس سے جنگ کرنے کے لئے ہتھیار پہننا منظور نہیں ہے۔ اصل اللہ کی مدد ہے اگر اللہ نے مدد نہ فرمائی تو کوئی ہتھیار کام نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر جالوت سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ جالوت نے کہا تم مجھ سے مقابلہ کرو گے انہوں نے فرمایا کہ ہاں، جالوت نے کہا تو یہ پتھر اور غلیل لے آئے ہو جس سے کتے کو مارا جاتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ تو اللہ کا دشمن ہے کتے سے بھی بدتر ہے یہ کہہ کر اپنی غلیل سے ایک پتھر مارا جو اس کی آنکھوں کے درمیان لگا اور دماغ میں گھس گیا۔ اس سے جالوت کا کام تمام ہوا اور اس کے لشکر نے شکست کھائی۔ جالوت جو اُن کا دشمن تھا اور قوم عمالقہ کا بادشاہ تھا اس سے اور اس کے لشکروں سے آمنا سامنا ہوا، دونوں فریق صف آرا ہوئے تو حضرت طالوت کے ساتھیوں نے اللہ تعالیٰ سے صبر کی اور ثابت قدمی کی اور کافروں کے مقابلہ میں فتح یاب ہونے کی دُعا کی، جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں جالوت اور اس کے لشکروں کو شکست ہوئی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت طالوت کے لشکر کو فتح یابی ہوئی اور دُشمن نے باوجود کثیر تعداد ہونے کے شکست کھائی، اس جہاد میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی شریک تھے۔ ان کے ہاتھ سے جالوت قتل ہوا۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت عطا فرما دی جس کا ذکر سورۂ صٓ کے پہلے رکوع میں فرمایا ہے حضرات

مفسرین نے فرمایا ہے کہ ملک سے حکومت اور حکمت سے نبوت مراد ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دونوں سے سرفراز فرمایا، صاحب رُوح المعانی ص ۱۷۳ ج ۲ لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے جو نبی تھے ان کی وفات کے بعد اور طالوت کی وفات کے بعد ان کو نبوت اور بادشاہت دی۔ جس کا اجمالی طور پر وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ میں تذکرہ فرمایا ہے۔ مذکورہ قصہ جہاد بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ فرماتا تو زمین فساد والی ہو جاتی اور لیکن اللہ تعالیٰ جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے) وہ قوت اور شوکت والوں کی طاقت کو دُوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع فرماتا رہتا ہے اور ظالمین تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کسی ایک ہی علاقہ ایک ہی قوم کی قوت و شوکت ہمیشہ رہتی تو وہ ساری دنیا کو مصیبت میں ڈال دیتے اور سب کو مقہور و مجبور بنا لیتے، اور ہمیشہ طغیانی سرکشی کرتے رہتے۔

آخر میں فرمایا ''کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کرتے ہیں اور بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں'' چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کتابیں پڑھی تھیں، نہ پُرانی تاریخیں سنی تھیں۔ اس لئے ان واقعات کا علم ہو جانا اور لوگوں کو بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا ہے۔ قال صاحب الروح قوله تعالى (وانك لمن المرسلين) حيث تخبر بتلك الأيات والقرون الماضية على ماهي عليه من غير مطالعة كتاب ولا اجتماع بأحد يخبر بذلك (ص ۱۷۵ ج ۲)۔ (صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول: وانك لمن المرسلين یعنی بلاشبہ آپ رسولوں میں سے ہیں کہ آپ ان آیات کی اور اقوام گزشتہ کی صحیح صحیح خبریں دیتے ہیں جبکہ آپ نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی آپ کسی ایسے شخص کے پاس جاتے ہیں جو آپ کو ان چیزوں کی خبریں دے)۔

(پارہ نمبر ۳/ تِلْكَ الرُّسُلُ)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ

یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی ان میں بعض کو بعض پر، ان میں بعض سے اللہ نے کلام فرمایا اور بعض کو درجات کے اعتبار

دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا

سے بلند فرمایا، اور ہم نے دیئے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے معجزات اور ہم نے ان کی تائید کی روح القدس کے ذریعہ، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ

اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

آپس میں جنگ نہ کرتے جو اُن کے بعد تھے، اسکے بعد کہ آئے انکے پاس کھلے ہوئے معجزات لیکن انہوں نے آپس میں اختلاف کیا سو ان میں سے بعض وہ تھے جو ایمان لائے اور بعض

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳)

وہ تھے جنہوں نے کفر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ نہ کرتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فرقِ مراتب

لفظ تلک اسم اشارہ ہے اس کا مشار الیہ المرسلین ہے، یعنی یہ پیغمبر جن کا ذکر ابھی ابھی ہوا ان کو ہم نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت دی کہ بعض کو ایسی منقبت سے متصف فرما دیا جو بعض دُوسروں میں نہیں تھی اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے تفضیل بالشرائع مراد ہے۔ ان میں سے بعض کو مستقل شریعت دی تھی اور بعض کو سابق ہی نبی کی شریعت کا مؤید و مبلغ بنایا۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں ص ۲ ج ۳، پہلے قول کی تائید مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے ہوتی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام میں سے بعض ایسے حضرات تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو سب ہی کلیم اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا اور اس کلام سے بلا واسطہ کلام مُراد ہے، جس میں فرشتے کا واسطہ نہ تھا۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ان حضرات میں شامل ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام فرمایا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی ایک دُوسرے پر فضیلت بیان کرتے ہوئے وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ بھی فرمایا یعنی بعض انبیاء کے درجات دوسرے بعض انبیاء کے مقابلہ میں زیادہ بلند فرمائے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ یہاں بَعْضَهُمْ سے سرورِ عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آپؐ کو وہ خواص علمیہ وعملیہ عطا فرمائے کہ زبانیں ان کو پوری طرح ذکر کرنے سے عاجز ہیں، آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں، صاحب الخلق العظیم آپ کی صفتِ خاص ہے۔ آپؐ پر قرآن کریم نازل ہوا جو پوری طرح محفوظ ہے۔ آپؐ کا دین ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جو معجزات کے ذریعے مؤید ہے۔ مقامِ محمود اور شفاعتِ عظمیٰ کے ذریعہ آپؐ کو رفعت دی گئی اور آپؐ کے فضائل اور مناقب اتنے زیادہ ہیں جن کا شمار کرنا بندوں کے بس سے باہر ہے، حضرات علماء کرام نے آپ کے معجزات اور

الجزء ۳ وقف لازم ع ۳۳

مناقب اور خصائص پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب الخصائص الکبریٰ، اور امام بیہقی کی کتاب دلائل النبوۃ کا مطالعہ کیا جائے آخر الذکر کتاب سات جلدوں میں ہے جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح معجزات عطا کئے اور رُوح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) کے ذریعہ ان کی تائید کی، اس کی تفسیر وتشریح سورۃ البقرہ کے رکوع ۱۲ میں گزر چکی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ (الآیۃ) اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ اور قتل وقتال نہ کرتے جو حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے تشریف لے جانے کے بعد آپس میں مختلف ہو گئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی امتیں آپس میں اختلاف کرتی رہیں اور ان میں لڑائیاں ہوتی رہیں حالانکہ ان کے پاس کھلے ہوئے دلائل موجود تھے۔ اگر ان کو سامنے رکھتے تو نہ مختلف ہوتے نہ جنگ کرتے ان میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے ایمان قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع بنے اور بہت سے لوگوں نے کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی تو ان کا آپس میں قتل وقتال نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور فاعلِ مختار ہے وہ جو چاہے کرے اس پر کسی کا اعتراض ہو نہیں سکتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ

اے ایمان والو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جس میں نہ بیع ہو گی نہ دوستی

وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اور نہ سفارش، اور جو کافر ہیں وہ ظلم کرنے والے ہیں۔

روزِ قیامت آنے سے پہلے اللہ کے لئے خرچ کرلو

اس آیت شریفہ میں مال خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے اور لفظ رَزَقْنٰكُمْ میں یہ بتا دیا کہ یہ مال ہمارا دیا ہوا ہے، جس نے مال دیا اس کو پورا حق ہے کہ مال خرچ کرنے کا حکم فرمائے۔ نیک کاموں میں فرائض واجبات کے مصارف بھی ہیں اور مستحب ونفلی صدقات بھی، اور جس طرح بدنی عبادات (نماز، روزہ) آخرت کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح مالی عبادات اس کا سبب ہیں۔

صحیح بخاری ص ۱۹۱ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ (دوزخ سے بچو اگرچہ آدھی ہی کھجور کا صدقہ کردو) قیامت کا دن بہت سخت ہوگا نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہی کام دیں گے۔ اس دن نہ بیع ہوگی، نہ دوستی نہ سفارش، لہٰذا اس دِن نجات پانے اور عذاب سے بچنے کے لئے اعمالِ صالحہ کرتے رہنا چاہیئے، اعمالِ صالحہ میں اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا بھی شامل ہے۔

یہ جو فرمایا کہ ''اس دن بیع نہیں ہوگی'' اس کے بارے میں حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے فدیہ یعنی جان کا بدلہ مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی جان کسی جان کے بدلہ عذاب بھگتنے کے لئے تیار نہیں ہوگی جیسا کہ سورۃ البقرہ کے چھٹے رکوع میں فرمایا: لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا اور فدیہ کی صورت میں کیونکہ مبادلہ ہوتا ہے اس لئے اسے بیع سے تعبیر فرمایا۔ اور یہ جو فرمایا وَلَا خُلَّةٌ اس میں دوستی کی نفی فرمائی مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دِن دنیا کی کوئی دوستی کسی کو کام نہ دے گی یہاں جو محبتیں ہیں اور دوستی کے مظاہرے ہیں

یہ وہاں بالکل نہ رہیں گے بلکہ دوست دشمن ہو جائیں گے۔ کوئی دوست کسی کی مدد نہ کر سکے گا۔ یہ اہل کفر اور اہل فسق کے بارے میں ہے۔ متقی حضرات کی محبتیں باقی رہیں گی جیسا کہ سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا: اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ م بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ○ (کہ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جو صفت تقویٰ سے متصف تھے) وَلَا شَفَاعَةٌ فرما کر شفاعت یعنی سفارش کی نفی فرمادی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کے لئے اُس دن کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ جیسا کہ سورۃ المؤمن میں فرمایا: مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ (کہ ظالموں کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارش کرنے والا ہوگا جس کی بات مانی جائے۔ اہل ایمان کے لئے جو شفاعت ہوگی اس میں اس کی نفی نہیں ہے جس کو سفارش کرنے کی اجازت ہوگی وہی سفارش کر سکے گا اور جس کے لئے سفارش کرنے کی اجازت ہوگی اس کے لئے سفارش ہو سکے گی)۔

آیت کے ختم پر فرمایا: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (کفر کرنے والے ظالم ہی ہیں) انہوں نے معبود حق سے منہ موڑا اور خالق و مالک سے منحرف ہو گئے۔ ایسے لوگوں کی نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

اللہ ایسا ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی، وہ زندہ ہے، قائم رکھنے والا ہے، اس کو نہیں پکڑتی اُونگھ اور نہ نیند، اُسی کے لئے ہے جو آسمانوں میں

وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ

ہے اور جو زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت کے ساتھ، وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے

اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ

پیچھے ہے، اور وہ احاطہ نہیں کرتے اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا مگر جو وہ چاہے، گنجائش ہے اس کی کرسی میں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

آسمانوں کی، اور زمین کی اور اسے بھاری نہیں ہے ان دونوں کی حفاظت، اور وہ برتر ہے، عظمت والا ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ جلیلہ کا بیان

یہ آیت کریمہ آیت الکرسی ہے احادیث شریفہ میں اس کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوالمنذر (یہ اُن کی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو اللہ کی کتاب میں وہ کون سی آیت تمہارے پاس ہے جو اعظم ہے (سب سے بڑی عظمت والی ہے) میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے پھر وہی سوال فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ وہ آیت اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ہے، آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے ابوالمنذر، تمہیں علم مُبارک ہو۔ (رواہ مسلم ص ۲۷۱ ج ۱)

بعض احادیث میں اس آیت کو قرآن مجید کی تمام آیات کی سردار بتایا ہے۔ (الدر المنثور ص ۳۲۴ ج ۱) چونکہ اس آیت شریفہ میں کرسی کا ذکر ہے اس لئے عوام و خواص سب ہی اسے آیت الکرسی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ خود روایات حدیث میں اسے

آیت الکرسی کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ آیت الکرسی میں اللہ جل شانہٗ نے اپنی صفات جلیلہ بیان فرمائی ہیں۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے، وہی معبودِ حقیقی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، صفت الوہیت میں منفرد ہے۔

پھر ارشاد فرمایا اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لفظ حَیٌّ عربی زبان میں زندہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ زندہ ہے ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ اس کی ذات و صفات ازلی و ابدی ہیں جن کو کبھی بھی زوال نہیں، اور قَیُّوْمٌ مبالغہ کا صیغہ ہے، قائم خود قائم رہنے والا اور قیوم قائم رکھنے والا، ساری کائنات اللہ تعالیٰ شانہٗ کی مخلوق ہے اور اس نے ان سب کو وجود دیا ہے اور اسی کے اذن و مشیت سے سب کا وجود قائم ہے کائنات کے سب احوال اسی کی مشیت اور قدرت سے متغیر و متبدل ہوتے ہیں اور وہ جس کو جس حال میں چاہے رکھتا ہے۔ صحیح بخاری ص ۱۵۱ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب نمازِ تہجد کے لئے بیدار ہوتے تھے، تو بارگاہِ خداوندی میں جو معروض پیش کرتے تھے۔ اس میں یہ بھی تھا: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ (اے اللہ، آپ ہی کے لئے سب حمد ہے، آپ تمام آسمانوں کے اور زمینوں کے اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کے قائم رکھنے والے ہیں)۔

پھر فرمایا: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (اس کو نہیں پکڑتی اُونگھ اور نہ نیند) سِنَةٌ ہلکی نیند کو کہتے ہیں جس کا ترجمہ اُونگھ سے کیا گیا ہے۔ اور نوم سو جانے کو کہا جاتا ہے جس میں ہوش و حواس بالکل ہی قائم نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ اونگھ اور نیند دونوں سے برتر اور بالا ہے، مخلوق کو تھکن دُور کرنے اور آرام پانے کے لئے نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کو کسی طرح کی کوئی بھی تھکن نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ نیز نیند اور اُونگھ میں انفعال ہوتا ہے اور تغیر حال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ انفعال اور تغیر حال سے پاک ہے۔ لہٰذا اسے نہ نیند آ سکتی ہے نہ آتی ہے۔ مخلوق کا یہ حال ہے کہ کام کرتے کرتے تھک جائیں تو نیند غالب ہو جاتی ہے، سونا نہ چاہیں تب بھی نیند دَبا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ اپنے اختیار سے سوتا ہے نہ اسے نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ لفظ لَا تَاْخُذُهٗ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ پر نیند غلبہ نہیں پا سکتی۔ جب ہلکی نیند یعنی اُونگھ بھی اسے نہیں پکڑ سکتی تو بڑی نیند کیسے غلبہ پائے گی۔ نیند مخلوق کی صفت ہے جو خالقِ کائنات کے حق میں عیب و نقص ہے اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اَنْ یَّنَامَ. (رواہ مسلم ص ۹۹ ج ۱) یعنی اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور نہ یہ اس کی ذات کے شایانِ شان ہے کہ وہ سوئے۔

پھر فرمایا: لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے) سب اسی کے بندے ہیں اور ہر چیز اس کی ملکیت ہے سب کو اسی نے پیدا فرمایا ہے وہ فاعلِ مختار ہے، جس طرح چاہے اپنی مخلوق میں تصرف فرمائے۔ پھر فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (کون ہے جو اس کی بارگاہ میں سفارش کرے مگر اس کی اجازت سے) اس میں یہ بتایا کہ کسی کی ایسی حیثیت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کر سکے، ہاں اس کا یہ کرم اور فضل ہے کہ جس کو چاہے سفارش کرنے کی اجازت دے دے اور جس کے لئے اجازت دے اسی کی سفارش ہو سکتی ہے۔ قیامت کا دن جو مخلوق کے لئے بہت ہی کھٹن ہوگا۔ اس وقت لوگ متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے جب سب عاجزی ظاہر کر دیں گے تو فخر الاوّلین والآخرین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ آپ ہماری سفارش فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں روانہ ہو جاؤں گا۔ اور عرش کے نیچے آ کر اپنے رب کے لئے سجدہ میں پڑ جاؤں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی وہ تعریفیں اور وہ بہترین ثنا منکشف فرمائیں گے جو مجھ سے پہلے کسی پر منکشف نہ فرمائی تھیں۔ پھر ارشاد ربی ہوگا کہ اے محمد! سر اُٹھاؤ اور مانگو تمہارا سوال پورا کیا جائے گا۔ سفارش کرو تمہاری سفارش پُوری کی جائے گی (اس کے بعد آپ سفارش فرمائیں گے۔ جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے)۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (اس روز سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو جس کے واسطے رحمٰن نے اجازت دی ہو اور جس کے لئے بات کرنا پسند فرمایا ہو) سورۃ الانبیاء میں فرشتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُونَ (اللہ جانتا ہے ان کے اگلے پچھلے احوال کو اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر اس کے لئے جس کیلئے خدا تعالیٰ راضی ہو، اور وہ سب اللہ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں) سورۃ نجم میں فرمایا: وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ ۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہو جائیں)۔

پھر فرمایا: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے آگے اور پیچھے ہے) یعنی ان کے اُمور دنیویہ و اخرویہ کا اس کو پوری طرح علم ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عمل کرنے والوں کے جو اعمال اچھے بُرے سامنے ہیں وہ ان کو بھی جانتا ہے اور جو پہلے کر چکے ہیں ان کو بھی جانتا ہے، غرض کہ اس کا علم پوری مخلوق کو اور مخلوق کے احوال و اعمال و افعال سب کو پوری طرح محیط ہے۔

پھر فرمایا: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ (اور بندوں کو اللہ کی معلومات میں سے بس اسی قدر علم ہے جتنا اُس نے چاہا) جس کسی مخلوق کو جتنا بھی علم ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عطا فرمانے سے ملا ہے۔ ان میں سے کسی کا کوئی علم ذاتی نہیں ہے اور نہ کسی کا علم ساری معلوماتِ الٰہیہ تک محیط ہے۔

پھر فرمایا: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (کہ گنجائش ہے اس کی کرسی میں آسمانوں کی اور زمینوں کی) اس میں کرسی کی وسعت بتائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اس کی کرسی میں آسمان اور زمین سب سما سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نشست و برخاست سے اور جگہ و مکان سے بالاتر اور منزہ ہے۔ اس طرح کی آیات کو علماء کرام متشابہات میں شمار فرماتے ہیں جن کا حکم یہ ہے کہ ان کے معنیٰ و مفہوم پر ایمان لائیں کہ اُن کا جو مطلب اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے میں اُس پر ایمان لاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس بھی نہ کریں، عرش اور کُرسی دونوں کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ صاحبِ رُوح المعانی ص ۹ ج ۳ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرمایا ہے کہ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کو الگ الگ پھیلا دیا جائے تو کرسی کے مقابلہ میں سب مل کر ایسی ہوں گی جیسے جنگل میں کوئی چھوٹی سی گول چیز پڑی ہو، پھر صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ کرسی عرش کے علاوہ ہے۔ اور کرسی عرش کے سامنے اتنی چھوٹی ہے جیسے چھوٹی سی گول چیز میدان میں پڑی ہو۔ یہ روایت انہوں نے بحوالہ ابن جریر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کی ہے۔ یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بتایا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عرش اور کُرسی ایک ہی چیز ہے۔ کُرسی کے بارے میں اور بھی چند اقوال مفسرین نے نقل فرمائے ہیں۔

پھر فرمایا: وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا (کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی حفاظت بھاری نہیں ہے) چونکہ وہ خالق ہے اور مالک ہے اس لئے اس کی کوئی بھی مخلوق خواہ آسمان ہو خواہ زمین اس کے علم سے اور اس کی حفاظت سے باہر نہیں۔ مخلوق عاجز ہے وہ اپنی جیسی مخلوق کی حفاظت سے بھی عاجز ہے اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے وہ اپنی ساری مخلوق کا نگران و نگہبان ہے۔

آخر میں فرمایا: وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (کہ اللہ تعالیٰ برتر ہے اور عظمت والا ہے)

صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے صفاتِ عالیہ الوہیت، وحدانیت، حیات علم، ملک، قدرت،

ارادہ جمع فرمادی ہیں: ونطقت بأنه سبحانه موجود منفرد في الوهيته ، حيّ واجب الوجود، لذاته مُوجِد لغيره منزه عن التحيز والحلول مبرا عن التغير والفتور، لامناسبة بينه وبين الأشباه ،لا يحل بساحة جلاله ما يعرض النفوس والأرواح، مالك الملك والملوك ومبدع الأصول والفروع، ذوالبطش الشديد، العالم وحده بجلي الأشياء وخفيها وكلّيها وجزئيها واسع الملك والقدرة لكل ما من شأنه أن يملك ويقدر عليه، لايشق عليه شاق ولا يثقل شئ لديه، متعال عن كل ما لا يليق بجنابه عظيم لا يستطيع طيرُ الفكر أن يحوم في بيداء صفات قامت به ـ (رُوح المعانی ص ۱۱ ج ۳) (یعنی یہ آیت ناطق ہے کہ اللہ سبحانہ موجود ہے اپنی الوہیت میں یکتا ہے ہمیشہ سے زندہ جس کا وجود بذاتہٖ ہے دوسروں کو وجود عطا کرنے والا تحیز اور حلول سے مبرا تغیر وفتور سے پاک اس کے اور امثال کے درمیان کوئی مناسبت نہیں نفوس وارواح کے عوارض اس کی جلالت شان کے لائق نہیں بادشاہوں اور بادشاہی دونوں کا مالک ہے اصول وفروع کو بغیر نمونہ کے پیدا کرنے والا اس کی بادشاہی اور قدرت ہر اس چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس کی شان سے مملوک ومقدور بننا ہو کوئی گراں چیز اس پر شاق نہیں اور کوئی چیز اس کے ہاں ثقیل نہیں ہر اس شی سے عالی ہے جو اس کی جناب عظیم کے مناسب نہیں فکر وسوچ کے طائر کا اس کی صفات پر گزر بھی نہیں ہوسکتا)

فائدہ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرے تو جنت کے داخل ہونے میں اس کے لئے صرف موت ہی آڑ بنی ہوئی ہے اور جس نے آیت الکرسی لیٹتے وقت پڑھ لی اللہ تعالیٰ اس کے گھر کو اور اس کے پڑوسی کے گھر کو اور آس پاس کے چند گھروں کو امن سے رکھے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۸۹)

اور ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے رات کو اپنے بستر پر پہنچ کر آیت الکرسی پڑھ لی۔ صبح ہونے تک اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگران مقرر رہے گا، اور شیطان قریب نہ آئے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۵ عن البخاری فی قصۃ اسیر ابی ہریرۃؓ)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے صبح کو سورۂ حٰم (یعنی سُورۂ مؤمن جسے سُورۂ غافر بھی کہتے ہیں) اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک پڑھی اور اس کے ساتھ آیۃ الکرسی بھی پڑھ لی تو شام ہونے تک ان دونوں کی وجہ سے محفوظ رہے گا اور جس نے ان دونوں کو شام کو پڑھ لیا تو صبح ہونے تک محفوظ رہے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۷ عن الترمذی)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ

نہیں ہے زبردستی دین میں، ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو کر، سو جو شخص منکر ہو طاغوت کا اور ایمان لائے

بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

اللہ پر تو بے شک اُس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا، جو ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

دین میں زبردستی نہیں ہے

لباب النقول میں اس آیت کا سببِ نزول بتاتے ہوئے بحوالہ ابوداؤد ونسائی وابن حبان، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جس عورت کا بچہ مر جاتا تھا وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنا دوں گی۔ (العیاذ باللہ) جب یہود کا قبیلہ بنونضیر مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے قبیلوں کے وہ لڑکے بھی تھے جو دینِ یہودیت پر تھے۔ یہودی

مدینہ منورہ سے جانے لگے تو ان لڑکوں کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم ان کو نہیں جانے دیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل فرمائی۔

نیز لباب النقول میں بحوالہ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ لَآ اِكْـرَاهَ فِـي الدِّيْنِ ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو قبیلہ بنی سالم میں سے تھے اور جن کا نام حصین تھا ان کے دو بیٹے نصرانی تھے اور وہ خود اسلام قبول کر چکے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ دونوں نصرانیت چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، کیا میں ان پر زبردستی نہ کروں (تا کہ وہ دونوں مسلمان ہو جائیں) اس پر اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

آیت شریفہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، اگر کوئی شخص دینِ اسلام قبول نہیں کرتا تو اس پر زبردستی نہیں کی جائے گی کہ تو اسلام قبول کر لے ورنہ تجھے قتل کر دیں گے، شاید حکم جہاد کی وجہ سے کسی کو اس کا وہم اور وسوسہ ہو کہ زبردستی نہیں ہے تو جہاد کیوں شروع کیا گیا جن لوگوں کو جہاد کی حقیقت معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاد کا قانون یہ ہے کہ جب کافروں کی کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو اوّل ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور یہ دعوت ان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کے لئے ہے اگر وہ اسلام قبول کرنے پر راضی نہ ہوں تو اُن سے کہا جائے گا کہ تم جزیہ دو، جب وہ جزیہ دینے لگیں گے تو ان کا دار السلام اور اہلِ اسلام سے ایک خاص تعلق پیدا ہو جائے گا جس سے آپس میں ملنا جلنا ہوگا۔ اہلِ کفر اسلام سے قریب ہوں گے اس کے سمجھنے کے مواقع فراہم ہوں گے اللہ کی کتاب ان کے کانوں میں پڑے گی۔ اسلام کی سچائی کے دلائل واضحہ ان کے سامنے آئیں گے اور اہلِ ایمان کے اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ دیکھیں گے تو اقرب ہے کہ کفر سے باز آ جائیں اور اسلام قبول کر لیں، اگر اسلام کے دلائل واضحہ سامنے آنے کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا تو اس کی حماقت ہے کہ کفر پر جمنے ہی کو اختیار کئے ہوئے ہے۔

اسلام کے عہدِ اوّل سے لے کر آج تک مسلمان ممالک میں کروڑوں کافروں نے زندگی گزاری ہے کسی امیر یا خلیفہ یا بادشاہ نے انہیں اسلام پر مجبور نہیں کیا، اور جن قوموں نے اسلام قبول کیا وہ اہل اللہ کی محنتوں و کوششوں سے اسلام کے آغوش میں آئی ہیں، کسی نے سر پر تلوار رکھ کر یا سینہ پر بندوق رکھ کر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ فقہاء نے واضح طور پر لکھا ہے کہ میدانِ جہاد میں عورتوں، بوڑھوں، اپاہجوں اور گرجوں میں رہنے والوں کو قتل نہ کیا جائے، حالانکہ ان لوگوں کو تلوار کے ذریعہ بآسانی اسلام میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

تفسیر درِ منثور ص ۳۳۰ ج ۱ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا اَسْلِمِيْ تَسْلَمِيْ (یعنی تو اسلام قبول کر لے، عذاب سے بچ جائے گی) اس نے انکار کیا تو عمر رضی اللہ نے اللہ پاک کے حضور عرض کیا اللّٰھم اشھد (کہ اے اللہ! آپ گواہ رہیں میں نے دعوت دے دی ہے) اس کے بعد انہوں نے یہی آیت لَآ اِكْـرَاهَ فِـي الدِّيْنِ تلاوت کی۔ البتہ اتنی بات ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ کفر خالق و مالک کی سب سے بڑی بغاوت ہے۔ باغی کی سزا تو سب کو معلوم ہی ہے۔ ان باغیوں کی بہت بڑی اور سب سے بڑی دائمی سزا تو ان کو آخرت میں ہوگی لیکن دنیا میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی سرکوبی ہوتی رہے۔ اور کفر کا اثر جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے اگر جہاد و قتال نہ ہو تو کافر اہلِ ایمان پر چڑھ جائیں گے اور اہلِ ایمان تھوڑے رہ جائیں اور ان کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اگر جزیہ بھی دینا منظور نہیں کرتے تو ان سے قتال کیا جائے، اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کفر جو خداوند تعالیٰ کی بغاوت ہے اس کی سزا میں قتل کر دینا اور بات ہے (اور جو لوگ باغیوں کا قانون جانتے ہیں وہ اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتے) اور سر پر تلوار رکھ کر یہ کہنا کہ اسلام قبول کر ورنہ قتل کر دیں گے یہ دوسری بات ہے اس دوسری بات کو اکراہ کہا جاتا ہے اور جہاد کے موقع پر اکراہ نہیں کیا جاتا۔ اور

یہ بات بھی ہے کہ ایمان قبول کرنے پر زبردستی کا کوئی فائدہ ہے بھی نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص جبر واکراہ کی وجہ سے ظاہری طور پر اسلام قبول کر بھی لے اور دل سے مسلمان نہ ہوتو نہ تو اس کے حق میں مفید فی الآخرۃ ہوگا اور نہ جھوٹی زبان سے اسلام قبول کرنے والے سے مسلمانوں کو کوئی نفع پہنچے گا۔ جیسا کہ منافقین ظاہر میں مسلمان تھے اور اندر سے کافر تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے۔ اسلام کی حقانیت اور اس کی سچائی کے دلائل روزِ روشن کی طرح واضح ہیں دنیا بھر کی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ چھپ چکا ہے گھر گھر اسلام کا کلمہ پہنچ چکا ہے۔ آلات جدیدہ نے دُنیا کے ہر گوشہ میں اسلام کی دعوت پہنچا دی ہے اس کو حق جانتے ہوئے بھی جو لوگ اس کو قبول نہیں کرتے، وہ اپنے کو عذاب میں دھکیلنے کے خود ذمہ دار ہیں۔ ہدایت ظاہر ہو چکی ہے، گمراہی کو لوگ سمجھ چکے ہیں، دونوں میں کوئی التباس واشتباہ نہیں ہے اب اگر کوئی شخص ہدایت قبول نہیں کرتا اور جانتا ہے کہ یہ ہدایت ہے، دنیاوی مصلحتوں نے جائیدادوں کے خیال نے، رشتہ داریوں کے فکر نے، عہدوں کے چھن جانے کے خوف نے ہدایت قبول کرنے سے روک رکھا ہے اور چندروزہ دُنیاوی زندگی کے منافع اور مصالح کی وجہ سے آخرت کے دائمی عذاب کے لئے تیار ہے اور اس طرح اپنی جان کا دُشمن بنا ہوا ہے، تو اس کا علاج ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ھداھم اللّٰہ تعالیٰ۔

لفظ طاغوت معتل لام واوی ہے جس کا ماضی مضارع طغی یطغیٰ ہے یہ لفظ سرکشی کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے اہلِ لغت کا فرمانا ہے کہ اس میں قلبِ مکانی ہوا ہے اصل کلمہ طغووت ہے۔ لام کلمہ کو مقدم کر دیا گیا اور عین کلمہ کو مؤخر کر دیا گیا، پھر حرف علت کو الف سے بدل دیا گیا، یہ تو لفظی تحقیق ہوئی معنوی اعتبار سے اس میں متعدد اقوال ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس سے شیطان مراد ہے، مجاہد اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کل ما عبد من دون اللّٰہ فھو طاغوت (یعنی اللہ کے سوا جس کسی کی بھی عبادت کی گئی وہ طاغوت ہے) اور بعض حضرات کا قول ہے کہ اس سے اصنام یعنی بُت مراد ہیں، یہ سب اقوال لکھنے کے بعد صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں ص ۱۳ ج ۳ والأولیٰ أن یقال بعمومہ (یعنی اس کا عمومی معنیٰ مراد لینا زیادہ بہتر ہے) اور اس کے مفہوم میں وہ سب معانی داخل ہیں جو اُوپر بیان ہوئے، درحقیقت شیطان اور اس کی مددگار تمام طاغوتی طاقتیں انسان کو اسلام سے روکتی ہیں۔ جس کسی نے بھی ان طاقتوں کو نہ گردانا اور ان سے رشتہ توڑا اور ان سب سے منہ موڑا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے بہت مضبوط حلقہ اور بڑی قوّت والا کڑا پکڑ لیا، یہ کڑا ایسا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں جس نے اللہ تعالیٰ کو مان لیا اور اس کے دین کو تسلیم کر لیا اور اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لے آیا اس نے سب سے بڑی طاقت کا سہارا لے لیا اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو گیا نہ اس قوت کو شکستگی ہے نہ زوال ہے، آخر میں فرمایا کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ وہ سب کے اقوال کو سنتا ہے۔ سب کے اعمال کو جانتا ہے، جو صرف زبان سے مسلمان ہوا ہے اس کا بھی علم ہے اور جس نے جھوٹی زبان سے کلمہ پڑھا وہ اس سے بھی باخبر ہے۔

صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاک اور خسران سے محفوظ رہتا ہے اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مأمون ہو جائے اور جس طرح ایسی رسّی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں (اور یوں کوئی رسّی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے) اسی طرح اسلام میں بطلان کا احتمال نہیں جو مفضی الی الھلاک ہو، اور خود کوئی اسلام ہی کو چھوڑ دے وہ اور بات ہے، اور مقصود آیت کا اسلام کی خوبی کا واضح وثابت بالدلیل ہونا ہے جس کو اس عنوان خاص سے بیان فرمایا گیا۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـٴُـهُمُ

اللہ ولی ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے، وہ ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے نور کی طرف، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے اولیاء

الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

شیاطین ہیں وہ اُن کو نکالتے ہیں نور سے اندھیروں کی طرف، یہ لوگ دوزخ والے ہیں وہ

فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ع ۳۴ ۲

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے وَلی ہیں اور کافروں کے اولیاء شیطان ہیں

ولی مددگار کارساز اور دوست کو کہتے ہیں، اس آیت شریفہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی ہے وہ ایمان والوں کو کفر وشرک کی اندھیریوں سے نکالتا ہے ان کو اسلام کی روشنی میں لاتا ہے ان کو نور پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اندھیریوں سے بچاتا ہے اور جن کے لئے ایمان مقدر ہے ان کو کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ ایمان عطا فرماتا ہے برخلاف کافروں کے کہ ان کے اولیاء یعنی دوست شیاطین ہیں۔ شیاطین ان کو ایمان قبول کرنے نہیں دیتے اور ان کو کفر کی تاریکیوں ہی میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کفر پر مریں۔ شیاطین خود دوزخ والے ہیں وہ اپنے ماننے والوں کو بھی دوزخ میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں سب دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے بارے میں جو فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اس کے عام معنیٰ مراد لئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو کفر کی تاریکیوں سے اور گناہوں کی تاریکیوں سے محفوظ رکھتا ہے اور نور کو عام لیا جائے تو تمام اعمالِ صالحہ کے نور کو بھی اس کا شمول ہوگا والأولى أن يحمل الظلمات على المعنى الذى يعم سائر انواعها ويحمل النور أيضا على ما يعم سائر انواعه، ويجعل فى مقابلة كل ظلمة مخرج منها نور مخرج اليه ۔ (ص۱۴ ج۳)

صاحب رُوح المعانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نور کو مفرد اور ظلمات کو جمع لایا گیا ہے کیونکہ حق ایک ہی ہے جسے نور سے تعبیر فرمایا ہے اور تاریکیاں چونکہ بہت ساری ہیں اور طرح طرح کی ہیں (کیونکہ گمراہی کے راستے بہت سے ہیں) اس لئے اس کے لئے لفظ جمع یعنی ظلمات لایا گیا ہے۔ اہلِ کفر کا ذکر فرماتے ہوئے جو یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ فرمایا اس بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس سے یا تو وہ نورِ فطری مُراد ہے جس پر تمام انسان پیدا کئے گئے (وهو المراد بقوله صلى الله عليه وسلم كل مولود يولد على الفطرة الحديث) اور نورِ بیّنات بھی مُراد ہوسکتا ہے کھلے کھلے دلائل کے ذریعہ جو حق واضح ہو چکا ہے وہ سراپا نور ہے شیاطین اپنے ماننے والوں کو اس سے بچاتے ہیں اور کفر وشرک کے فائدے ان کو سمجھاتے ہیں اور حق قبول کرنے نہیں دیتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم پر حجت بازی کی انکے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو حکومت دی تھی، جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا رب

الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ

کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے، اس نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا سو بلاشبہ اللہ لاتا ہے سورج کو

مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾

پورب سے تو اس کو لے آ پچھم سے، پس حیرانی میں پڑ گیا وہ شخص جو کفر اختیار کئے ہوئے تھا اور اللہ قوم ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا۔

وقف لازم

ایک کافر بادشاہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مباحثہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیدائشی وطن شہر بابل کے آس پاس تھا ان کے زمانہ کا بادشاہ نمرود تھا جو اس علاقہ پر حکمران تھا۔ دنیا میں کفر و شرک پھیلا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ بھی بت پرست تھا جس کا تذکرہ سورۃ الانعام (ع ۸) اور سورۂ مریم (ع ۳) میں فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے جب توحید کی دعوت دی اور پوری قوم کو بتایا کہ تم گمراہی پر ہو تو سب کو بُرا لگا، نمرود بھی کافر تھا نہ صرف کافر تھا بلکہ داعی کافر تھا اور اپنے آپ کو معبود بتاتا تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی تو وہ کٹ حجتی کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میرے خیال میں تو میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک اور مال دیا تھا اسی لئے اس کے گھمنڈ میں اس نے ایسی بات کہی، اور حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے دلیل مانگی کہ آپ جس رب کی توحید کی دعوت دیتے ہیں اس کے وجود پر کیا دلیل ہے، حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے ارشاد فرمایا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت بڑی دلیل تھی جتنے بھی خدائی کے دعویدار ہوتے ہیں اور جتنے ان کے ماننے والے ہیں سب کو معلوم ہے کہ زندہ کرنے اور موت دینے کا کام ان میں سے کسی کے بس کا بھی نہیں ہے لامحالہ کوئی ذات ہے جس کے تصرف میں ساری مخلوق ہے اور جلانا اور موت دینا اسی کا کام ہے۔ جو خُدائی کے دعویدار ہوئے وہ اپنی جان کو تو بچا ہی نہیں سکے وہ کسی دوسرے کو کیا زندہ کرتے، ایسی واضح موٹی بات نمرود نے یا تو بے عقل ہونے کی وجہ سے نہ سمجھی یا بطور کٹ حجتی کے یوں ہی بحث جاری رکھنے کیلئے اس نے جواب میں یوں کہہ دیا کہ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اپنی بات کی دلیل کے لئے اس نے یہ کیا کہ دو آدمیوں کو بُلایا جن کے قتل کا حکم ہو چکا تھا ان میں سے ایک کو قتل کروا دیا اور ایک کو چھوڑ دیا، اُس کی جہالت کا جواب تو یہ تھا کہ تو یہ بتا کہ جسے تو نے قتل کیا ہے اس میں جان کس نے ڈالی تھی اور جسے تو نے چھوڑ دیا یہ موت کے بعد زندہ کرنا ہوا یا زندہ کو زندہ چھوڑ دینا ہوا لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کے عناد اور سفاہت و جہالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالق کائنات جل مجدہ کے وجود پر اور کائنات میں اس کے تصرفات پر دوسری دلیل دیدی اور فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (کہ اللہ تعالیٰ روزانہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو معبود ہونے کا مُدعی ہے تو سُورج کو پچھّم سے لاکر دِکھادے) میرے رب کے حکم سے روزانہ سورج پچھّم کی جانب غروب ہو جاتا ہے تو اسی جانب سے اسے واپس کردے، یہ سنتے ہی خُدائی کا دعویٰ دار نمرود مبہوت اور حیران رہ گیا اور بالکل ہی گُونگا بن گیا آگے ایک کلمہ بھی نہ بول سکا۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا وہ کسی نبی یا نبی کے نائبین کے سامنے حجت اور دلیل سے نہیں جیت سکتے۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُحَاجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (اور جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کے بارے میں اس کے بعد کہ اس کا معبود ہونا تسلیم کرلیا گیا (یعنی اصحاب علم وفہم اس پر ایمان لا چکے ہیں) اُن لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے)۔

بعض علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب سورج مشرق سے لاتا ہے تُو مغرب سے لاکر دکھادے تو وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مشرق سے لاتا ہوں تو اپنے رب سے کہہ کہ وہ مغرب سے لائے لیکن وہ ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے ایسا مبہوت ومتحیر ہو چکا تھا کہ اس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اہل حق کے مقابلہ میں اہل باطل دلیل کے ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تُو مغرب سے نکال کر لے آ، اس کی وجہ سے اس کو یہ یقین ہوگیا کہ واقعی اس پوری دنیا کا کوئی خالق و مالک متصرف ضرور ہے اور یہ شخص جو بر ملا مجھ سے سوال و جواب کر رہا ہے ضرور اسی ذات پاک کا پیغمبر ہے جو ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور جس کے تصرف میں ساری مخلوق ہے اور اس کی یہ دلیل بہت زیادہ وزن دار ہے اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں مشرق سے سورج کو لاتا ہوں تو اپنے رب سے کہہ کر مغرب سے لے آ، تو حاضرین میں سے کوئی اس کو نہیں مانے گا اور جو میرے ماننے والے ہیں وہ اسی کی طرف ہو جائیں گے۔ تھوڑی سی جو جھوٹی سلطنت ہے وہ بھی جاتی رہے گی اس لئے اس نے دم بخود ہو جانا ہی مناسب جانا، واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ

یا اس شخص کی طرح سے جو گزرا ایک بستی پر اور وہ اس حال میں تھی کہ چھتوں پر اسکی دیواریں گری پڑی تھیں، یہ شخص کہنے لگا کہ اللہ کیونکر زندہ فرمائے گا اس بستی کو اسکی

بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ

موت کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اس کو سو سال تک مُردہ رکھا پھر اسے اُٹھا دیا، اس سے سوال فرمایا کہ تو کتنے عرصہ تک ٹھہرا رہا۔ اس نے کہا کہ میں

يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ

ایک دن یا ایک دن سے کم ٹھہرا ہوں، فرمایا بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا ہے، سو تو دیکھ لے اپنے کھانے کو اور پینے کی چیز کو وہ سڑی گلی نہیں ہے

وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور دیکھ لے اپنے گدھے کو، اور تاکہ ہم تجھے نشانی بنا دیں لوگوں کے لئے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم ان کو کیسے جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾

گوشت پہنا دیتے ہیں، سو جب اس پر یہ سب کچھ ظاہر ہوگیا تو کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مُردہ کو زندہ فرمانے کا ایک واقعہ

یہ آیت پہلی آیت پر معطوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح سے ہے۔ الم تر الی الذی حاج ابراهيم فی ربه اوهل رأيت كالذی مر علی قرية۔ حضرات مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت قتادہؒ اور

حضرت عکرمہؒ وغیرہم بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ جس شخصیت کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت عزیر بن شرخیا تھے اور بعض حضرات نے آرمیا بن خلقیا بھی بتایا ہے اور اس بارے میں دیگر اقوال بھی ہیں لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے، بہرصورت قرآن کریم نے موت کے بعد زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنے والے شخص کا واقعہ ذکر فرمایا ہے یہ حضرت عزیر علیہ السلام ہوں یا کوئی بھی شخصیت ہو، ایک بستی پر ان کا گزر ہوا جس کی سب آبادی ختم ہو چکی تھی۔ اور بستی کے در و دیوار بھی منہدم تھے چھتیں گر گئی تھیں پھر چھتوں پر دیواریں گر گئی تھیں اس بستی کا یہ حال دیکھ کر ان کے منہ سے بطور تعجب یہ نکلا کہ اللہ اس بستی کو اس کی موت کے بعد کیسے زندہ فرمائے گا؟ خدا تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا انکار کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انسان کے مزاج میں جو ایسی چیزوں میں ایک استبعاد کی شان ہے اس کے اظہار کے طور پر منہ سے ایسے الفاظ بے ساختہ نکل گئے، جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے کو بھی اولاد دے سکتا ہے خدا تعالیٰ سے اپنے لئے بیٹے کی دعا کی پھر جب فرشتے بیٹے کی خوشخبری لے کر آئے تو بطور تعجب یوں کہنے لگے رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ (کہ اے میرے ربّ کیسے ہو گا میرے لڑکا، حالانکہ میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے) جس نے سوال کیا ہو وہی کیسے قدرتِ الٰہیہ کا منکر ہو سکتا ہے لیکن بطور تعجب سوال کر بیٹھے، جس واقعہ کا یہاں ذکر ہے اس میں بھی اس طرح کی بات ہے، جب اُنہوں نے یہ کہا کہ اللہ کیسے زندہ فرمائے گا اس بستی کو (جس میں تعجب بھی تھا اور کیفیت کا سوال بھی) تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کے کہنے والے ہی کو موت دے دی اور سو سال تک اسی حال میں رکھا پھر سو سال کے بعد زندہ فرما کر اُٹھا دیا اور سوال فرمایا کہ تم کتنے وقت اسی حالت میں ٹھہرے رہے (جو زندگی کی حالت نہ تھی) تو اُنہوں نے جواب میں عرض کر دیا کہ میں اس حالت میں ایک دِن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں، مفسرین نے بیان کیا ہے کہ چاشت کے وقت ان کو موت آئی تھی اور سو سال گزرنے کے بعد جب ان کو اللہ تعالیٰ نے اُٹھایا تو غروب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ سُورج پر نظر ڈالی تو نظر آیا کہ وہ غروب ہونے والا ہے لہٰذا اُنہوں نے جواب میں کہا کہ ایک دِن ایسی حالت میں رہا ہوں اور جب یوں غور کیا کہ ابھی تو سُورج چھپا بھی نہیں تو کہنے لگے کہ ایک دن بھی نہیں بلکہ دن کا کچھ حصہ رہا ہوں، اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ تمہارا یہ بیان کرنا صحیح نہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ تم سو سال تک اسی حالت میں رہے ہو سو سال تک وہ مردہ رہے لیکن چونکہ جسم اُسی طرح صحیح سالم تر و تازہ باقی رہا۔ جیسا کہ زندگی میں تھا تو ان کو اس سے مزید تعجب ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک اور نمونہ ان کو دکھایا اور فرمایا کہ تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے وہ ذرا بھی گلی سڑی نہیں ہے۔ جس طرح یہ کھانا اپنی حالت پر سو سال باقی رہ گیا اس طرح بغیر رُوح کے تیرا جسم بھی صحیح سالم تر و تازہ رہا، قال فی الروح (ص۲۲ ج۳) واستشکل تفرع فانظر علی لبث المائة بالفاء وهو یقتضی التغیر وأجیب بأن المفرع علیه لیس لبث المائة : بل لبث المائة من تغیر فی جسمه حتی ظنه زمانا قلیلا ففرع علیه ما هو أظهر منه وهو عدم تغیر الطعام والشراب وبقاء الحیوان حیا من غیر غذاء۔ پھر اللہ جل شانہٗ نے ان کے سامنے ان کے مردہ گدھے کو زندہ کر کے دکھایا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ تم اپنے گدھے کو دیکھو اور ہڈیوں پر نظر ڈالو۔ گدھے کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھو ہم ان کو کس طرح ترکیب دیتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، ان کے سامنے وہ ہڈیاں ترتیب کے ساتھ جمع ہوئیں پھر ان پر گوشت چڑھا اور گدھا زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو بے اختیار بول اُٹھے کہ میں جانتا ہوں کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یقین تو پہلے ہی سے تھا کیونکہ مؤمن آدمی تھے۔ لیکن عینی مشاہدہ بھی کر لیا، درمیان میں یہ جو فرمایا کہ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ اس کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ محذوف پر معطوف ہے۔ صاحب رُوح المعانی ص۲۳ ج۳ لکھتے ہیں کہ یہاں عبارت مقدر ہے۔ ای وفعلنا ذٰلک لنجعلک یعنی ہم نے تمہیں مُردہ کر

کے زندہ کر دیا تا کہ ہم تمہاری ذات کو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں، تمہیں دیکھ کر اور تمہارا واقعہ معلوم کر کے لوگوں کو ہدایت ہوگی اور موت کے بعد اُٹھائے جانے پر یقین کرنے میں ہچکچاہٹ کرنے کا موقع نہ رہے گا۔

صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ اُنْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ جو حکم تھا وہ مُدت دراز تک موت کی حالت میں رہنے کو ظاہر کرنے کے لئے تھا اور وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ میں جو حکم ہوا وہ مُردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے تھا۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ

اور جب کہا ابراہیم نے کہ اے میرے ربّ آپ مجھے دکھا دیجئے مُردوں کو کس طرح زندہ فرماتے ہیں، فرمایا کیا تم کو یقین نہیں ہے؟ عرض کیا یقین ہے لیکن اس

لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ

غرض سے سوال کرتا ہوں کہ میرا قلب مطمئن ہو جائے، فرمایا سو تم لے لو چار پرندے پھر ان کو اپنے سے ہلا لو پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک

جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

حصہ رکھ دو پھر ان کو بُلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ عزیز ہے حکیم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال پر پرندوں کا زندہ ہونا

اس آیت شریفہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک سوال اور پھر خداوند قدوس کی طرف سے عینی مشاہدہ کرا کر ان کے سوال کا جواب ذکر فرمایا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے موحد تھے حشر ونشر، بعث بعد الموت کے قائل تھے پھر بھی انہوں نے نظروں سے دیکھنے کے لئے اللہ جل شانہٗ سے سوال کیا کہ آپ مجھے دکھا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کیا تمہیں اس کا یقین نہیں ہے کہ میں مُردوں کو زندہ کر دوں گا انہوں نے عرض کیا کہ یقین ضرور ہے پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ علم الیقین سے آگے مجھے عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے اور اپنی آنکھوں سے مُردوں کو زندہ ہوتے دیکھ لوں تا کہ طبعی طور پر انسان کو جو اطمینان دیکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی مجھے حاصل ہو جائے۔ حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر حضرات سے منقول ہے کہ جب فرشتہ نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنا لیا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا کو قبول فرمائے گا اور آپ کی دُعا سے مُردوں کو زندہ فرمائے گا تو اس پر انہوں نے یہ سوال کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم چار پرندے لے لو اور پہلے ان کو اپنے پاس رکھو اور مانوس کر لو اور ہلا لو، جب وہ تم سے مانوس ہو جائیں اور ہل جائیں تو ان چاروں کو ذبح کرنا اور ان کے گوشت اور پروں کو ایک ساتھ ملا دینا اور ان کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دینا ان کو پکارنا وہ پرندے تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے، چنانچہ حسب الحکم انہوں نے ایسا ہی کیا اور وہ پرندے زندہ ہو کر انکی آواز پر دوڑتے ہوئے چلے آئے، پرندے ہونے کے باوجود وہ اُڑ کر نہ آئے بلکہ پیروں سے چل کر آئے کیونکہ نظروں کے سامنے اس کا ظہور بدرجہ اتم ہے۔

آخر میں فرمایا: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (کہ اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے) اسباب عادیہ وغیر عادیہ سب اُس کے قبضہ میں ہیں۔ اس کے سب کاموں میں حکمت ہے۔ (من روح المعانی ص ۲۶ تا ص ۳۱ ج ۳)

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ

مثال ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو اس نے اُگائیں سات بالیں،

فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ہر بال میں ہیں سو دانے اور اللہ چند در چند کر دیتا ہے جس کے لئے چاہے، اور اللہ وسعت والا ہے علم والا ہے۔

فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کا اَجر وثواب

اس آیت شریفہ میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی۔ اللہ کی رضا کے لئے جو بھی مال خرچ کیا جائے وہ سب فی سبیل اللہ ہے اور عام طور سے یہ لفظ جہاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بہر صورت جہاد میں خرچ کرے یا غیر جہاد میں خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی فضیلت بہت ہے اور یہ تو عام قانون ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (جو کوئی شخص ایک نیکی کرے اس کے لئے اس کا دس گنا ہے) ایک نیکی کی دس نیکی یہ تو کم سے کم ہے اور اس کے علاوہ اللہ جل شانہٗ اس سے زیادہ جتنا جس کو بڑھا چڑھا کر عنایت فرمائے وہ مزید انعام واکرام ہے۔ اس آیت شریفہ میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے بارے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے اور وہ یہ کہ جیسے کوئی دانہ زمین میں گر جائے پھر اس سے ایک درخت نکل آئے اس درخت میں سات بالیں ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہیں اس طرح سے ایک دانہ کے سات سو دانے بن گئے، اللہ تعالیٰ شانہٗ ایک درہم یا ایک دینار یا ایک روپیہ یا ایک پیسہ خرچ کرنے پر اس کے عوض ثواب میں سات سو گنا عطا فرماتے ہیں اور سات سو پر بھی کوئی منحصر نہیں ہے اس سے زیادہ بھی عطا فرمادیتے ہیں جس کو وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑی وسعت والا ہے وہ جس کو جتنا چاہے دے سکتا ہے اور وہ علم والا بھی ہے کسی کی کوئی نیکی اس کے علم سے باہر نہیں اس کی رضا کے لئے جو بھی کوئی بدنی یا مالی عبادت انجام دے گا اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں، آخرت میں اس کا ثواب چند در چند پالے گا۔

سنن ابن ماجہ میں ص ۱۹۸ متعدد صحابہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس نے اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) خرچ کرنے کے لئے مال بھیج دیا اور خود گھر ہی میں رہا تو اسے ہر درہم کے عوض سات سو درہم (کا ثواب) ملے گا اور جس شخص نے اپنی جان سے شریک ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اللہ کی خوشنودی کے لئے مال خرچ کیا تو اُس کے لئے ہر درہم کے عوض سات لاکھ درہم ہوں گے، یہ فرما کر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کی تلاوت فرمائی۔ تفسیر درِمنثور ص ۳۳۶ میں بحوالہ طبرانی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ اس کے لئے بہت بڑی خوبی ہے جو فی سبیل اللہ جہاد میں مشغول ہوتے ہوئے اللہ کے ذکر کی کثرت کرے کیونکہ اُسے ہر کلمہ کے عوض ستر ہزار نیکیاں ملیں گی جن میں سے ہر نیکی دس گُنی کر کے ملے گی اس کے علاوہ جو اس کے لئے اللہ کے نزدیک ہے وہ مزید ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا کیا ثواب ہے آپؐ نے فرمایا وہ بھی اس قدر ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے شاگرد نے عرض کیا کہ میں نے تو یہ سنا ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا ہے اُنہوں نے فرمایا کہ تو کم سمجھ آدمی ہے۔ یہ سات سو گنا اس وقت ہے جب اپنے گھروں میں رہتے ہوئے جہاد میں خرچ کرنے کے لئے بھیج دیں اور خود جہاد میں شریک نہ ہوں اور جب خود جہاد میں شریک ہوں اور اس وقت خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں میں ان کے لئے جو کچھ پوشیدہ رکھا ہے۔ وہاں تک بندوں کے علم کی رسائی نہیں ہے اور بندے

اس کی کیفیت کے جاننے سے عاجز ہیں۔ یہ لوگ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) ہیں اور اللہ کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔

حضرت بریدہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج و جہاد کا خرچہ یکساں ہے ایک درہم خرچ کرنا سات سو درہم خرچ کرنے کے برابر ہے۔ (درمنثور ص ۳۳۷ ج ۱) اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کے ثواب میں کوئی کمی نہیں فضل ہی فضل ہے، عطا ہی عطا ہے، تھوڑے پر بہت ملتا ہے۔ نیت اللہ کی رضا کی کرنی لازم ہے، آیتِ بالا میں بھی لفظ **فی سبیل اللہ** فرما کر اخلاص کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور آئندہ آنے والی آیات میں خرچ کرنے کے آداب بتاتے ہوئے ریاکاری کے طور پر خرچ کرنے کی مذمت فرمائی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں دھرتے اور ایذاء نہیں پہنچاتے ان کے لئے

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

ثواب ہے ان کے رب کے پاس، اور نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ بھلی بات کہہ دینا اور درگزر کر دینا ایسے

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا

صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ غنی ہے حلیم ہے۔ اے ایمان والو! مت باطل کرو اپنے صدقات کو

صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح سے جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے اور ایمان نہیں لاتا اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ

اور یوم آخرت پر، سو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنا پتھر ہو جس پر ذرا سی مٹی ہو پھر پہنچ گئی اس کو زوردار بارش

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

سو کر چھوڑا اس کو بالکل ہی صاف، یہ لوگ اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے آداب اور ریاکاروں کے صدقات کی مثال

ان آیات میں اوّل تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت بتائی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے لئے اجر و ثواب ہے نہ ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ رنجیدہ ہوں گے، اور ساتھ ہی دو باتوں پر تنبیہ فرمائی ہے، اوّل یہ کہ جس کسی کو مال دیں اس پر احسان نہ دھریں اور اسے تکلیف نہ پہنچائیں، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو جو یہ عادت ہوتی ہے کہ تھوڑا بہت صدقہ دے کر ان لوگوں پر احسان دھرتے ہیں جن لوگوں کو کچھ دیا اور خاص کر ان لوگوں پر جو رشتہ دار ہیں یا اپنے شہر کے رہنے والے ہیں ایسے لوگ احسان دھرنے سے اپنا ثواب باطل کر دیتے ہیں جس پر احسان دھرا

جائے اسے احسان کے الفاظ سننے سے یا احسان دھرنے کی طرح برتاوا کرنے سے تکلیف ہوتی ہی ہے اور بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں یا اُن پر خرچ کرنے کی وجہ سے بیگاریں لیتے ہیں۔ اس لئے لفظ مَنّ (احسان جتانے) کے ساتھ لفظ اَذًی بھی ذکر فرمایا کہ اللہ کے لئے خرچ کریں اور احسان بھی نہ دھریں اور کسی قسم کی کوئی تکلیف بھی نہ پہنچائیں تب ثواب کے مستحق ہوں گے، اگر کسی نے سوال کیا اور اسے نہ دیا اور خوبصورتی کے ساتھ اچھے الفاظ میں جواب دے دیا اور سائل کی بدتمیزی پر اور تنگ کرنے پر جو غصہ آیا اس سے درگزر کر دیا تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کچھ دیدے پھر احسان دھرے یا کسی طرح سے تکلیف پہنچائے۔ اس کو فرمایا: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط جو لوگ صدقہ کر کے احسان جتاتے ہیں یا ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ ان لوگوں کا ایسا حال ہے جیسے کوئی شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے مال خرچ کرے اور اللہ پر اور آخرت کے دِن پر ایمان نہ رکھتا ہو ایسے شخص کے خرچ کرنے کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جیسے کوئی چکنا پتھر ہو اس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اُوپر سے زوردار بارش پڑ جائے جو اس ذراسی مٹی کو بہا کر لے جائے اور پتھر کو بالکل چکنا سپاٹ چھوڑ دے، اوّل تو پتھر چکنا پھر اس پر مٹی بھی ذرا سی اور جو بارش برسی تو وہ بھی زوردار، ظاہر ہے کہ اس حالت میں پتھر صاف ہو کر چکنا نہ رہ جائے گا تو اور کیا ہوگا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ منافق کے خرچ کرنے کی مثال ہے کیونکہ وہ اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ مسلمانوں میں شریک ہو کر جو کسی نیک کام میں تھوڑا بہت خرچہ کیا تو ایسا ہوا جیسے چکنے پتھر پر ذراسی مٹی آجائے اور چونکہ اس خرچ کا اسے کوئی ثواب نہ ملے گا اس لئے یہ خرچ کرنا اس کے حق میں بالکل ہی بے فائدہ ہے جیسا کہ اِس ذراسی مٹی پر خوب تیز بارش برس جائے اور اسے دھوڈالے۔ یہ لوگ اپنی کمائی پر ذرا بھی قادر نہ ہوں گے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کمایا اور خرچ کیا حالتِ کفر میں تھا اور دِکھاوے کے لئے تھا اس کا ثواب انہیں ذرا نہ ملے گا، آخرت میں ان کا کمانا بھی ضائع ہے اور خرچ کرنا بھی، اور جب ایمان نہیں اور اخلاص نہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن اُنہیں جنت کا راستہ بھی نہ دکھائے گا۔ اوپر منافق ریاکار کا ذکر ہے جو مؤمن مخلص کے مقابلہ میں آیا ہے۔

اگر کوئی شخص مسلمان ہو اور ریاکاری سے کوئی ایسا کام کرے جو فی نفسہ نیک ہو، خواہ مالی عبادت ہو یا جانی عبادت، ریاکاری کی وجہ سے وہ بھی ثواب سے محروم رہے گا بلکہ ریاکاری اس کے لئے وبال ہوگی اور آخرت میں مستحق عذاب ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ان میں ایک شخص وہ ہوگا جو بظاہر شہید ہو گیا تھا لیکن اُس کی نیت یہ تھی کہ بہادری میں اس کا نام ہو، اور ایک وہ شخص ہوگا جس نے علم پڑھا اور پڑھایا اور قرآن شریف پڑھا۔ علم حاصل کرنے سے اس کی نیت یہ تھی کہ اس کو عالم کہا جائے اور قرآن پڑھنے سے اُس کی نیت یہ تھی کہ اُس کو قاری کہا جائے۔ اور ایک وہ شخص ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مال دیا تھا وہ اللہ پاک کے حضور میں کہے گا کہ جو بھی کوئی خرچ کرنے کی سبیل مجھے ملی جس میں خرچ کرنا آپ کے نزدیک محبوب تھا اس میں میں نے آپ کے لئے خرچ کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے یہ اس لئے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے۔ تینوں آدمیوں سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمہاری جو خواہش تھی وہ پوری ہو چکی اور جو تم چاہتے تھے وہ کہا جا چکا لہٰذا ان تینوں کو منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جن کے ذریعہ سب سے پہلے دوزخ کو دہکایا جائے گا یہ تین آدمی ہوں گے۔ (الترغیب والترہیب ص ۶۲ ج ۱)

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، اور جس نے روزہ رکھ کر ریاکاری کی اُس نے شرک کیا اور جس نے صدقہ دے کر ریاکاری کی اُس نے

شرک کیا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۵۵ ج ۳)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ

اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی رضاجوئی کے لئے اور نفسوں کو پختہ کرنے کے لئے ایسی مثال ہے

جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

جیسے ایک باغ ہو کسی ٹیلہ پر جس کو پہنچ جائے زوردار بارش پھر وہ دوگنا پھل لایا ہو، پس اگر زوردار بارش نہ پہنچی تو ہلکی بونداباندی بھی اسے کافی ہے

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے والوں کی مثال

اس آیت شریفہ میں مؤمنین صالحین مخلصین کے مال خرچ کرنے کی ایک مثال بتائی ہے اور اس مثال میں ان کے ثواب کی کثرت اور عنداللہ مقبولیت ظاہر فرمائی ہے، ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اور اس خرچ کرنے میں ان کی یہ بھی نیت ہے کہ ان کے نفس اس نیکی کرنے میں پختہ ہو جائیں تا کہ نفس خرچ کرنے کے خوگر رہیں اور کنجوسی کو پاس نہ آنے دیں تو ایسے لوگوں کے خرچ کرنے کی ثواب کے اعتبار سے ایسی مثال ہے جیسے کسی ٹیلے پر ایک باغیچہ ہو (ٹیلوں کی آب و ہوا باغوں کے لئے نہایت مناسب ہوتی ہے) پھر اُوپر سے زوردار بارش بھی ہو جائے تو زمین کو اور زیادہ قوت و طاقت پہنچ جائے جس کی وجہ سے دو گنے پھل آ جائیں چونکہ یہ باغیچہ اُونچے ٹیلہ پر ہے اس لئے زوردار بارش نہ ہو تو تھوڑا بہت چھینٹا بھی اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ جس طرح اس باغیچہ میں پھل خوب زیادہ کثیر مقدار میں آئیں گے اہلِ ایمان اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے جو مال خرچ کریں گے اسی طرح ان کے خرچ کرنے کا ثواب بھی بہت زیادہ ملے گا۔

آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یعنی جو بھی کوئی کسی طرح کا عمل کرتا ہے اچھا ہو یا بُرا، اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتا ہے ہر عمل کا بدلہ اللہ کے یہاں سے ملے گا ریاکار کو بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور مخلص کو بھی، اپنے عمل کی ہر ایک کو نگرانی کرنا لازم ہے کہ اخلاص ہے یا نہیں۔ صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ اس تشبیہ میں جو دو طرح کی بارش فرض کی گئی ہے اس سے مقصود تفاوت مراتب اخلاص کا بیان کرنا ہے کہ چونکہ یہ انفاق ایمان کے ساتھ مقرون ہے مَنّ و اَذیٰ و رِیا اس میں مفقود ہے اخلاص اس میں موجود ہے تو ضرور ہی مقبول ہو کر موجب تضاعف اجر و ثواب ہو جاتا ہے۔ خواہ اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہو یا اوسط یا ادنیٰ درجہ کا ہو نفس قبول و تضاعف کے لئے ہر حال میں کافی ہے گو تفاوت مراتب اخلاص سے مراتب قبول و تضاعف میں بھی تفاوت ہو جائے گا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا اس کے نیچے جاری ہوں نہریں

لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ

اس میں اس کے لئے ہر طرح کے پھل ہوں اور اس کو بڑھاپا آ جائے اور اس کی ضعیف آل و اولاد ہو پھر پہنچ گئی اس کو سخت تیز آندھی

فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

جس میں آگ ہو، سو وہ باغ جل جائے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے تمہارے لئے آیات تاکہ تم فکر کرو۔

عبادات اور طاعات کو باطل کر دینے والوں کی مثال

اس آیت شریفہ میں ان لوگوں کے بارے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے جو اعمالِ صالحہ انجام دیتے ہیں لیکن ان کو ریا کاری یا مَن واذی کی وجہ سے یا کسی ایسے عمل کے کرنے سے جو حبطِ اعمال کا سبب ہو برباد کر دیتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کا باغ ہو جس میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت ہوں اور ان کے علاوہ بھی ہر قسم کے پھل ہوں اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں وہ خود بوڑھا ہو گیا اور اس کے اہل و اولاد ضعیف ہوں۔ خود بھی کچھ نہیں کر سکتا اور اولاد بھی کسی قابل نہیں، گزارہ کا راستہ صرف یہی باغ ہے اپنا خرچہ بھی اسی سے ہے اور بال بچوں کا سہارا بھی یہی باغ ہے۔ ایسی حالت میں ایک تیز آندھی آئی اس آندھی میں آگ تھی اُس آگ نے سارے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، عین حاجت کے وقت جبکہ اس باغ کی بہت زیادہ ضرورت تھی کچھ بھی نہ بچا سارا ہی جل کر راکھ ہو گیا، اس مثال کو سامنے رکھ کر سمجھ لیں کہ جو اعمالِ صالحہ انجام دیئے جاتے ہیں اُن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کا ثواب ملے۔ وہاں حاجتیں پوری ہوں اور عذاب سے حفاظت ہو لیکن اخلاص نہ ہونے کے باعث جب بہت بڑی اور سب سے بڑی حاجت کا وقت آیا تو جو اعمال کئے تھے انہوں نے کچھ بھی کام نہ دیا کیونکہ اللہ کی رضا کے لئے نہیں بلکہ بندوں کو دکھانے کے لئے اعمال کئے تھے جو بظاہر نیک تھے لیکن ریا کاری نے ان کی نیکی ختم کر دی تھی نماز پڑھی دکھاوے کے لئے، حج کیا نام و نمود کے لئے، صدقہ دیا شہرت کے لئے، جہاد کیا بہادری ظاہر کرنے کے لئے، صدقہ دیا شہرت کے لئے اور شہرت کے خیال سے نہ تھا تو جن کو دیا تھا اُن پر احسان دھر کر اور تکلیف پہنچا کر اکارت کر دیا آخرت میں پیشی ہے اعمالِ صالحہ کی ضرورت ہے اور اعمال کا ثواب مل نہیں رہا ایسے وقت میں جو بدحالی ہو گی اس کا کچھ اندازہ مذکورہ بالا باغ والے آدمی کی حیرت اور پریشانی سے کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فکر مند بنانے کے لئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪

اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی کمائی میں سے پاکیزہ چیزوں کو، اور اس میں سے جو ہم نے نکالا تمہارے لئے زمین میں سے

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا

اور مت ارادہ کرو ردّی چیز کا کہ اس میں سے خرچ کرو اور تم خود اس کے لینے والے نہیں ہو مگر اس صورت میں کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور جان لو

اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

کہ بلاشبہ اللہ غنی ہے اور حمید ہے۔

اللہ کی رضا کے لئے عمدہ مال خرچ کرنے کا حکم

گزشتہ آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا ثواب ذکر فرمایا ہے اور خرچ کرنے کے آداب بتائے ہیں اس آیت میں اپنے کمائے ہوئے مالوں میں سے طیب عمدہ حلال اور اچھی چیزیں خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے، حرام کمانا تو حرام ہے جو حلال مال ہے اس میں سے بھی عمدہ چیز کو اللہ کی راہ میں دینا چاہیئے۔ اسباب النزول ص ۸۲ میں اس آیت کا سببِ نزول بتاتے ہوئے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی، جب فصل پر کھجوروں کے پھل کاٹتے تھے تو کھجوروں کے خوشے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ستونوں کے درمیان بندھی ہوئی رسّی پر لاکر ٹانگ دیتے تھے جس میں سے فقراء مہاجرین کھا لیتے تھے ان میں سوکھے ہوئے خوشے بھی ہوتے تھے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ (کہ تم ردّی چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو)۔

لباب النقول میں بحوالہ حاکم حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۃ الفطر ادا فرمانے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کھجور کا ایک صاع صدقہ میں دیا جائے اُس پر ایک شخص ردّی کھجوریں لے آیا لہٰذا آیت کریمہ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ نازل ہوئی۔ یہ جو فرمایا وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا فِيهِ اس میں تنبیہ فرمائی کہ تم اللہ کی راہ میں گھٹیا مال خرچ کرنے کو تو تیار ہو لیکن ویسا ہی گھٹیا مال تمہیں کوئی دے تو تم خود اسے لینے کو تیار نہ ہو گے۔ تمہارا کسی پر قرضہ ہے قرضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں تمہیں کوئی خراب کھجوریں یا دوسرا کوئی گھٹیا مال دینے لگے تو تم اُسے قبول نہ کرو گے ہاں یہ اور بات ہے کہ موقع دیکھ کر آنکھیں میچ لو اور یہ سمجھ کر رکھ لو کہ اس آدمی سے عمدہ مال کبھی بھی نہیں ملے گا چلو جو ہاتھ آتا ہے یہ ہی سہی، یہ مسامحت والی بات دُوسری ہے رضا اور رغبت اور دل کی خوشی کے ساتھ تم ردّی چیز قبول نہیں کر سکتے۔

عمومی طور پر مالِ طیب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ (کہ ہم نے زمین سے جو کچھ تمہارے لئے نکالا ہے اس میں سے بھی خرچ کرو) حضرات فقہاء کرام نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ ہے اور احادیث شریفہ سے بھی پیداوار کی زکوٰۃ ثابت ہے فقہاء کی اصطلاح میں اس کو عشر کہا جاتا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ زمین سے جو بھی کچھ پیدا ہو (غلہ ہو یا سبزیاں، ترکاریاں ہوں یا پھل) سب کی زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔ البتہ گھاس اور لکڑی ان کے نزدیک اس سے مستثنیٰ ہے۔ پیداوار کی زکوٰۃ کا اصول یہ ہے کہ جو زمین ایسے پانی سے سیراب کی جائے جس کی قیمت ادا کرنی نہ پڑے مثلاً بارش کے پانی سے سیراب کی جائے یا ندی یا دریا کے کنارے پر ترائی میں کوئی چیز پانی دیئے بغیر بونے سے پیدا ہو جائے تو اس کی کل پیداوار سے دسواں حصہ مستحقین زکوٰۃ کو دینا فرض ہے اور یہ بھی زکوٰۃ ہی ہے مثلاً دس کلو پیداوار میں سے ایک کلو دیدے اور اسی طرح باغ میں جو پھل پیدا ہوں ان کا بھی دسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرے۔ اور اگر پانی کی قیمت دے کر زمین کو سیراب کیا گیا ہے تو ایسی زمین کی پیداوار پر نصف العشر یعنی دسویں کا آدھا زکوٰۃ میں دینا فرض ہوتا ہے جس کو بیسواں حصہ کہا جاتا ہے یعنی دس کلو پیداوار میں سے آدھا کلو زکوٰۃ میں دیدے۔

مسئلہ...... یہ دسواں یا بیسواں حصہ جو زکوٰۃ میں ادا کرنا فرض ہے۔ اس میں کوئی نصاب نہیں ہے یعنی جس قدر بھی پیداوار ہو اُس کا دسواں یا بیسواں حسبِ تفصیلِ بالا ادا کرے۔

مسئلہ...... کھیتی پر جو مال خرچ ہوا مثلاً بیج ڈالا، مزدوروں سے زمین کھُدوائی، بیل خریدے، ٹریکٹر چلوایا، کام کرنے والوں کو مزدوری

دی، یہ سب اخراجات منہا نہیں ہوں گے جو کچھ بھی پیداوار ہواس کی زکوٰۃ کا دسواں یا بیسواں حصہ (حسبِ تفصیل بالا) زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہے۔

فائدہ......زمینوں کے عشری اور خراجی ہونے میں کچھ تفصیل ہے۔ مختصراً اتنا سمجھ لیا جائے کہ جو کوئی علاقہ کافروں کے قبضہ میں تھا پھر مُسلمانوں نے حملہ کر دیا وہ علاقہ اُن سے چھین لیا اور امیر المؤمنین نے اس علاقہ کی زمین مُسلمانوں میں تقسیم کر دی تو یہ زمین عشری ہے اسی طرح سے اگر کسی شہر کے رہنے والے مسلمان ہو جائیں تو ان کی زمین بھی عشری ہو جائے گی۔

آیت کے ختم پر فرمایا: وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے مستحقِ حمد ہے) اُسے تمہارے صدقات کی حاجت نہیں جو کچھ خرچ کرتے ہو آپس میں خود ہی منتفع ہوتے ہو اُس نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے عطا فرمانے پر وہ مستحق حمد ہے۔ مستحق شکر ہے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ حمید بمعنی حامد بھی ہوسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ عمدہ چیز قبول فرماتا ہے یعنی خرچ کرنے والے کو ثواب دیتا ہے اور یہ قبول کرنا اور ثواب دینا اس کی طرف سے بندوں کی تعریف ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ

شیطان تم کو ڈراتا ہے تنگدستی سے، اور حکم دیتا ہے تمہیں فحش کاموں کا، اور اللہ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا،

وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾ یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا

اور اللہ وسعت والا ہے خوب جاننے والا ہے۔ وہ حکمت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اُسے خوب زیادہ خیر عطا

کَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

کی گئی، اور وہی لوگ نصیحت قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

شیطان تنگدستی سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے

اس آیتِ شریفہ میں ہدایت فرمائی ہے کہ شیطان کے بہکانے اور ڈرانے میں نہ آئیں جب تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ کرو گے تو شیطان تمہارے دل میں وسوسے ڈالے گا۔ اور یوں کہے گا کہ صدقہ دو گے تو مال کم ہو جائے گا۔ تنگدستی آ جائے گی اپنی کل کی ضرورت کے لئے مال بچا کر رکھو، بچوں کے کام آئے گا، اگر خرچ کرنے ہی لگو گے تو پھر وہ گھٹیا مال خرچ کرنے کی ترغیب دے گا وہ تنگدستی سے ڈراتا ہے۔ بُخل پر اُبھارتا ہے اور اِس کے علاوہ۔ بے حیائی کے کاموں کا بھی حُکم کرتا ہے وہ گناہوں کی ترغیب دیتا ہے، تم اس کے کہنے میں نہ آؤ، اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھو، اس نے تم سے جو مغفرت اور فضل کا وعدہ فرمایا ہے اس کے اُمیدوار رہو اور یقین جانو کہ وہ اپنے سب وعدے پورے فرمائے گا، اپنے خالق و مالک کے وعدوں کو بھول جانا اور دشمن شیطان کی باتوں میں آ جانا سمجھداری کی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تھوڑا سا دو گے تو بہت ملے گا آخرت میں تو اجر و ثواب ہے ہی دنیا میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بڑے بڑے منافع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر میں قسم کھاتا ہوں ایک تو یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے کسی بندہ کا مال کم نہ ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ جس کسی بندہ پر بھی ظلم کیا جائے وہ اس پر صبر کر لے گا تو اللہ اس کی وجہ سے اس کو ضرور عزت عطا فرمائے گا اور تیسری بات یہ ہے کہ جو بھی کوئی شخص بندوں سے مانگنے کا دروازہ کھولے گا تو اس کے لئے ضرور تنگدستی کا دروازہ

کھل جائے گا۔ (رواہ الترمذی کمافی المشکوٰۃ ص۱۵۴ ج ۱)

زکوٰۃ اور صدقات سے مال گھٹتا نہیں ہے بڑھتا ہی ہے اور اس سے مال کی حفاظت بھی ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اپنے مالوں کو زکوٰۃ ادا کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کرو اور اپنے مریضوں کے علاج کے لئے صدقہ دیا کرو (کیونکہ یہ بہت بڑا علاج ہے) اور مُصیبت کی موجوں کا مقابلہ دُعا سے اور تضرع وزاری سے کرو۔ (رواہ ابوداؤد فی المراسیل)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہ روزانہ جب صبح ہوتی ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اُس کے عوض اور دے اور دُوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ! روکنے والے کا مال تلف کر دے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۱۶۴ جلد ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ابنِ آدم تو (مخلوق پر) خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ (صحیح بخاری)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم خرچ کرتی رہو اور گن گن کر مت رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی گن کر دے گا اور بند کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی داد و دہش بند فرما دے گا جو بھی تھوڑا بہت ہو خرچ کرتی رہو۔ (صحیح بخاری ص۱۹۳ ج ۱)

شیطان چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کریں نفس بھی ہچکچاتا ہے کہ خرچ ہو جائے گا تو آگے کیا ہوگا، کہاں سے آئے گا اور ایسے ہی وقت میں صدقہ کرنے کی زیادہ فضیلت ہے جبکہ نفس کنجوسی کی طرف جاتا ہو۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کونسا صدقہ ثواب کے اعتبار سے زیادہ بڑا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسا صدقہ کہ صدقہ کرتے وقت تندرست ہو۔ (مرض الموت میں نہ ہو) خرچ کرنے کو دل نہ چاہتا ہو۔ تنگدستی سے ڈرتا ہو اور پیسہ پاس رکھنے کی آرزو رکھتا ہو یہ صدقہ ثواب کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے، اور خرچ کرنے میں تو دیر نہ لگا یہاں تک کہ جب موت آ جائے اور جان حلق کو پہنچ جائے تو کہنے لگے کہ فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا (اب فلاں کو کیا دِلوا رہا ہے) اب تو دوسروں کا ہو ہی چکا۔ (صحیح بخاری ص۱۹۱ ج ۱)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اس کی وجہ سے مال کا شر چلا گیا (یعنی مال کی وجہ سے جس کسی شر کا اندیشہ تھا اس سے حفاظت ہوگئی)۔ (الترغیب والترہیب ص۵۱۹ ج ۱)

شیطان انسان کا بہت بڑا دشمن ہے یہی نہیں کہ صرف اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے بلکہ طرح طرح کی مشکلات سامنے لاکر پریشان کرتا ہے اور ڈراتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور بندوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی آدم کے دِل پر شیطان کی پہنچ بھی ہوتی ہے اور فرشتے کا نزول بھی ہوتا ہے۔ شیطان (تنگدستی وغیرہ سامنے لاکر) ڈراتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ خیر کے واقع ہونے کی اُمیدیں دِلاتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ سو تم میں سے جو شخص بھی اسے محسوس کرے تو جان لے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اللہ کی حمد کرے اور جو شخص دُوسری بات (یعنی شیطان کی سمجھائی ہوئی چیز) محسوس کرے وہ شیطان سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگے۔ یہ بات بیان فرما کر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ تلاوت فرمائی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص۱۸ ج ۱)

آیت کے ختم پر فرمایا: وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ کہ اللہ تعالیٰ وسیع رحمت، وسیع فضل، وسیع علم والا ہے۔ سب کے صدقات کو اور نیتوں کو جانتا

ہے۔ وہ خوب زیادہ دے گا پھر فرمایا: یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے جس کو چاہے، لفظ حکمت مضبوط چیز کے معنیٰ میں آتا ہے، علم عمل قول جس میں بھی اتقان ہو وہ سب حکمت ہے یہ لفظ قرآن مجید میں بہت سی جگہ وارد ہوا ہے۔ روح المعانی ص ۴۱ ج ۳ میں تفسیر البحر المحیط سے نقل کیا ہے کہ اس میں حضرات علماء کرام کے انتیس اقوال ہیں اور تقریباً سب کا مرجع ایک ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اس سے فقہ فی القرآن مراد ہے، حضرت قتادہؒ وغیرہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کو پڑھنا اور اس میں فکر کرنا یہ حکمتِ عملی ہے، حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ قول وعمل کی دُرستگی حکمت ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ قرآن وعلم وفقہ یہ سب حکمت ہے، اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حکمت سے وہ علم مراد ہے جس کا نفع بہت بڑا ہو اور فائدہ خوب زیادہ ہو، حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ اللہ کی معرفت کا نام حکمت ہے۔ حضرت ابوعثمانؒ نے فرمایا کہ حکمت ایک نُور ہے جس کے ذریعہ وساوس اور الہام صحیح میں فرق ہوتا ہو۔ جو بھی معنیٰ لیا جائے ہر ایک مناسب معلوم ہوتا ہے، بلکہ سب کا مرجع تقریباً ایک ہی ہے، علم محکم اور علم نافع اور عمل صحیح اور قولِ صحیح اجمالی طور پر یہ معنیٰ مراد لے لئے جائیں تو آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے، اوّل تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عطا فرمائے۔ پھر فرمایا کہ جسے حکمت عطا کی گئی اُسے بہت زیادہ خیر عطا کر دی گئی، کیونکہ حکمت اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر حاصل ہونے کا ذریعہ بنے گی جس کے اقوال و اعمال ٹھیک ہوں، علم محکم کے مطابق ہوں۔ صحیح بخاری ص ۱۷ ج ۱ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رشک کے قابل صرف دو ہی آدمی ہیں ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا پھر اسے حق کے کاموں میں خوب زیادہ خرچ کرنے پر مسلط فرما دیا، اور دُوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت دی اور وہ اس کے ذریعے فیصلے کرتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ آیت کے ختم پر فرمایا: وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ؁ کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اوہام سے اتباعِ ہوٰی کی تاریکیوں سے دُور ہیں۔ اللہ کی آیات میں غور وفکر کرتے ہیں اور یہ غور وفکر ان کے لئے ذریعہ موعظت ونصیحت بنتا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الآیۃ)۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ

جو کچھ کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو بلاشبہ اللہ اس کو جانتا ہے اور ظلم کرنے والوں کے لئے

مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

کوئی بھی مددگار نہیں۔

جو کچھ خرچ کرو گے یا نذر مانو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور ریا اور مَن واَذیٰ سے بچنے کی تاکید اور مالِ طیّب خرچ کرنے کا حکم فرمانے اور شیطان کے وَسوسوں پر عمل نہ کرنے اور خدائی وعدوں کے مطابق اعمال کے ثواب کی اُمید رکھنے کا حکم دینے کے بعد اب اجمالی طور پر یہ فرمایا ہے تم جو بھی کوئی خرچہ کم یا زیادہ دِکھا کر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرو گے یا کوئی نذر مانو گے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے وہ نیت اور عمل سب کو جانتا ہے اسی کے مطابق وہ جزا دے گا۔ یہ ایک اعتبار سے گزشتہ مضامین کی تاکید ہے، نفقہ کے ساتھ نذر کا ذکر بھی فرمایا ہے کوئی شخص اگر نذر مان لے بشرطیکہ گناہ کی نذر نہ ہو تو وہ لازم ہو جاتی ہے نذر مطلق بھی ہوتی ہے اور معلّق بھی، مطلق یہ کہ یوں زبان سے کہے کہ اللہ کے لئے ایک روزہ

رکھوں گا یا دو رکعت نماز پڑھوں گا یا نفلی صدقہ دوں گا اور نذرِ معلّق یہ ہے کہ یوں کہے کہ میرا بیٹا اچھا ہو جائے تو اتنے نفل پڑھوں گا یا اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا یا سو روپے صدقہ کروں گا۔ دونوں طرح کی نذر کرنے سے نذر کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

سورۂ حج میں ارشاد ہے: وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ (کہ اپنی نذروں کو پورا کریں)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور سے لوگ چونکہ کسی مرض یا خوف یا کسی مصیبت کے دُور کرنے کے لئے نذر مانتے ہیں اور عموماً مال خرچ کرنے کی نذر ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں نفقہ کے ساتھ اُس کا بھی ذکر فرما دیا ہے۔ نذر کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ وہ کسی چیز کو دفع نہیں کر سکتی اور ہوتا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بخیل سے کوئی چیز نکال لی جاتی ہے۔ (رواہ البخاری ص ۹۹۰ ج ۲)

نذر ماننا مناسب تو نہیں جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوا لیکن اگر کوئی شخص نذر مان لے تو اسے پورا کرے۔ البتہ اگر گناہ کی نذر مانی ہو تو اس کو پورا نہ کرے لیکن اس کا کفارہ ادا کرے جو قسم کا کفارہ ہے وہی نذر کی خلاف ورزی کا بھی کفارہ ہے قسم کا کفارہ سورۂ مائدہ میں ساتویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے وہاں اس کی تفصیل دیکھ لی جائے۔

مسئلہ...... کسی بھی گناہ کی نذر ماننا حرام ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کی نذر مانے وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جو شخص معصیت کی نذر مان لے وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ (رواہ البخاری ص ۹۹۱ ج ۲) یعنی گناہ کی نذر ماننے کی وجہ سے یہ نہ سمجھے کہ مجھے گناہ کرنا ہی ہے بلکہ اپنی نذر کی خلاف ورزی کرے اور کفارہ دیدے۔ (کما فی روایۃ ابی داؤد والترمذی والنسائی، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۹۸)

وجوبِ نذر سے متعلق فقہاء نے چند مسائل لکھے ہیں ان کے لئے کتبِ فقہ کی مراجعت کی جائے۔ پھر فرمایا: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (کہ ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں) ہر معصیت ظلم ہے، چھوٹے بڑے جتنے بھی گناہ ہیں اپنے اپنے درجہ کے اعتبار سے ظلم ہیں، بہت سے گناہ ایسے ہیں جو دوسروں پر ظلم کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن ہر گناہ، گناہ کرنے والے کی جان پر تو بہر حال ظلم ہے ہی اور سب سے بڑا ظلم کفر و شرک ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ

اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ اچھی بات ہے، اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور فقراء کو دو تو وہ زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے،

وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

اور اللہ تمہارے گناہوں کا کفارہ فرما دے گا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔

صدقات کو ظاہر کر کے یا پوشیدہ طریقہ پر دینا

اس آیت شریفہ میں صدقات دینے کے بارے میں ایک بہت اہم بات ذکر فرمائی ہے اور وہ صدقات ظاہر کر کے دینے یا چھپا کر دینے کے متعلق ہے۔ اوّل تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ریا کاری جس کا نام ہے وہ خواہ مخواہ چپکتی نہیں پھرتی وہ تو نیت و ارادہ کا نام ہے، جو کوئی شخص نماز پڑھے یا ذکر کرے یا زکوٰۃ دے یا صدقہ نافلہ دے اور اس کی نیت یہ ہو کہ لوگ مجھے نیک سمجھیں، میرا نام ہو، میری شہرت ہو تو یہ

ریا کاری ہوگی اور گناہ ہوگا جس سے اعمال اکارت ہو جائیں گے، لیکن اگر کوئی شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جانی و مالی عبادت کرے چاہے لوگوں کے سامنے ہی ہو اور اس سے نام و نمود شہرت مقصود نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ اگر یہ نیت ہو کہ لوگوں کے سامنے عمل کرنے سے دُوسروں کو بھی ترغیب ہوگی تو اس نیت کا مستقل ثواب ملے گا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں اپنے گھر کے اندر اپنی نماز کی جگہ نماز پڑھ رہا تھا ایک آدمی داخل ہوا اس نے مجھے دیکھ لیا اس کے آنے سے مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ! تجھ پر اللہ کی رحمت ہو، اس میں تیرے لئے دو اجر ہیں، پوشیدہ عمل کرنے کا اجر بھی اور ظاہراً عمل کرنے کا اجر بھی۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو یہ بیان کیا کہ: ''مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا''۔ اس کے بیان کرنے میں یا تو ان کا یہ مطلب تھا کہ میرے نفس میں ریا کاری کا وسوسہ آ گیا کہ مجھے ایک آدمی نے تنہائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا یا یہ مطلب تھا کہ نفس کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ جو آدمی آیا ہے یہ میرا عمل دیکھ کر خود بھی عمل کر لے گا۔ بہر حال جو بھی صورت ہو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوہرے اجر کی خوشخبری دی۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ریا لوگوں کے سامنے عمل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو اندر کے اس جذبہ کا نام ہے کہ لوگ میرے معتقد ہوں اور مجھے اچھا کہیں اور عبادت کی وجہ سے میری تعریف ہو۔ اس تمہید کے بعد آیت بالا کی تفسیر ذہن نشین کر لینی چاہئے، اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اگر تم صدقات ظاہر کر کے دے دو تو یہ بھی اچھی بات ہے، جب نیت خالص ہے اور اللہ کی رضا مقصود ہے تو یہ ادائیگی ریا کاری نہ رہی اور اس میں اس فائدہ کی اُمید ہے کہ دُوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہوگی پھر فرمایا اور اگر تم صدقات کو چھپا کر دو تو یہ تمہارے لئے ظاہر کر کے دینے سے زیادہ بہتر ہے۔ ظاہر کر کے دینے کو اچھی بات بتایا اور چھپا کر دینے کو زیادہ بہتر بتایا، کیونکہ چھپا کر دینے میں احتمال ریا کا ختم ہو جاتا ہے اور نفس کے پھولنے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ اور اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس کو صدقہ دیا جائے وہ تنہائی میں لینے سے شرماتا نہیں اور اپنی خفت بھی محسوس نہیں کرتا۔ الفاظِ آیت کے عموم سے معلوم ہو رہا ہے کہ چھپا کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ بعض حالات کے اعتبار سے لوگوں کے سامنے خرچ کرنا زیادہ باعثِ فضیلت ہو جائے وہ دوسری بات ہے۔ مثلاً کسی جگہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا رِواج نہیں ہے لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے فریضۂ زکوٰۃ زندہ کرنے اور اس کا رِواج ڈالنے کے لئے لوگوں کے سامنے دے یا کوئی ایسا شخص ہو جس کی اقتداء میں لوگوں کو خرچ کرنے کی طرف توجہ ہوگی تو ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے دینے اور خرچ کرنے میں چُھپا کر دینے سے زیادہ ثواب ہو سکتا ہے۔ اصل چیز اخلاصِ نیت ہے اور نفس پر قابو پانا چونکہ ہر شخص کے بَس کا نہیں ہے اس لئے چھپا کر خرچ کرنے کو زیادہ بہتر اور افضل بتایا ہے، بہت سے لوگ دیتے تو تنہائی میں ہیں لیکن اخبارات کے ذریعہ شہرت کرتے ہیں اور مساجد و مدارس کی روئیدادوں میں اپنا نام لانے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے بڑے القاب و آداب کے ساتھ اپنا نام چھپنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ تنہائی میں دینے کا کیا فائدہ ہوا جبکہ دِل میں ریا کاری کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ عمل ظاہر میں کرے یا پوشیدہ کرے صرف اللہ کی رضا مقصود ہو اور عمل کی جو خوبی ظاہر میں ہو وہی پوشیدہ حالت میں ہو تو یہ دلیل اخلاص ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب لوگوں کے سامنے نماز پڑھتا ہے اور اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور پوشیدہ طور پر نماز پڑھتا ہے تب اچھی نماز پڑھتا ہے تو اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ واقعی یہ میرا بندہ ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۵)

صاحبِ رُوح المعانی (ص ۴۴ ج ۳) لکھتے ہیں کہ چھپا کر صدقہ کرنے کے بارے میں کثیر تعداد میں احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں پھر

مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جو صدقہ کسی فقیر کو چپکے سے دے دیا جائے یا ایسا شخص صدقہ کر دے جو تنگدست ہوتے ہوئے محنت اور کوشش کر کے مال حاصل کرے اور صدقہ دے دے اس کے بعد آپ نے آیتِ بالا تلاوت فرمائی۔ صحیح بخاری ص ۱۹۱ ج ۱ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، ان سات آدمیوں میں ایک وہ شخص ہے جس نے دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

آپ کے ذمہ نہیں ہے ان کی ہدایت، لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو بھی کچھ اچھا مال تم خرچ کرتے ہو، تو وہ تمہاری

فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ

جانوں کے لئے ہے، اور تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی رضا کے لئے، اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اچھا مال وہ پورا پورا تمہیں

اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

دے دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

جو کچھ بھی اچھا مال خرچ کرو گے اس کا بدلہ تمہیں مل جائے گا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت محنت و کوشش فرماتے تھے اور اہلِ کفر کو حق کی دعوت دیتے تھے۔ وہ لوگ جب قبول نہیں کرتے تھے تو آپ کو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا، آپ کی تسلی کے لئے آیات نازل ہوتی تھیں، ایسی آیات قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہیں انہی میں سے ایک یہ آیت بھی ہے کہ آپ کا کام راہ دکھانا ہے۔ صحیح بات بتانا ہے، حق کا قبول کرانا آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہادی ہے۔ وہ جس کو چاہے ہدایت دے، آپ کو غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ صاحبِ رُوح المعانی (ص ۴۵ ج ۳) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا سببِ نزول یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ہم صرف اہلِ اسلام پر خرچ کریں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ نیز حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ انصار کی رشتہ داریاں تھیں جن میں بعض لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ حضرات ان کو صدقہ دینے سے بچتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ سببِ نزول کو سامنے رکھنے کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے۔ تا کہ صدقہ روک کر لوگوں کو اسلام پر لانے کی صورت پیدا کی جائے صدقات نافلہ غیر مسلم ضرورت مندوں کو دینے میں بھی ثواب ہے۔ اسلام قبول کرنا نہ کرنا ان کا کام ہے۔

پھر فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ صاحب رُوح المعانی اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو مال بھی نیک کاموں میں خرچ کرو گے اس کا نفع تم ہی کو ہوگا۔ لہٰذا منّ اور اذٰی اور ریاکاری سے اُسے ضائع نہ کرو یا یہ مطلب ہے کہ فقراء کو دے دیا کرو، خواہ وہ کافر ہی ہوں تمہیں ثواب ملنے سے مطلب ہے۔

پھر فرمایا: وَمَا تُنفِقُونَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کہ تم تو صرف اللہ کی رضا ہی کے لئے خرچ کرتے ہو، لہٰذا ان آداب کی رعایت کرو جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو اور ان اعمال سے بچو جن سے اللہ کی ناراضگی ہوتی ہو اور جن سے صدقات باطل ہو جاتے ہوں، بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ نفی نہی کے معنی میں ہے یعنی تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا کے لئے۔

پھر فرمایا: وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ یعنی جو مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور ذرا سی بھی کمی نہ ہوگی اس سے پچھلے جملہ کی تاکید ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس کا یہ معنی بتایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے خرچ کرنے کے بعد مزید مال عطا فرمائے گا۔ بحکم حدیث اللّٰھم اعط منفقا خلفا یہ معنی لینا بھی بعید نہیں ہے۔

(من روح المعانی ص ۴۶ ج ۳)

مسئلہ: کافر کو نفلی صدقات دینا جائز ہے اس میں بھی ثواب ہے۔ البتہ کافر کو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ دینا جائز نہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ

صدقات فقراء کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں روکے ہوئے ہیں وہ زمین میں سفر نہیں کر سکتے۔ سوال سے بچنے

الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا

کے سبب انجان آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے، تو انہیں پہچان لے گا ان کی نشانی سے، وہ لگ لپٹ کر لوگوں سے سوال نہیں کرتے اور جو بھی

تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

کچھ تم خرچ کرو گے، اچھا مال سو اللہ اس کا جاننے والا ہے۔

ع ۳۷

فی سبیل اللہ کام کرنے والوں پر خرچ کرنے کا حکم

اس آیتِ شریفہ میں ان فقراء پر خرچ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی جو دینی کاموں میں مشغول ہوں ان کی دینی مشغولیت انہیں کہیں آنے جانے نہیں دیتی اور کسبِ مال کے مواقع ان کی مشغولیت کی وجہ سے میسر نہیں ہیں۔

صاحبِ رُوح المعانی (ص ۴۶ ج ۳) میں حضرتِ ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے حضرات اصحابِ صفہ مراد ہیں پھر لکھا ہے کہ یہ حضرات تین سو کے لگ بھگ تھے ان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی تھی یہ فقراء مہاجرین تھے جو مسجدِ نبویؐ کے چبوترے پر رہتے تھے جس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ یہ حضرات اپنے اوقات علمِ دین حاصل کرنے میں اور جہاد میں خرچ کرتے تھے اور جو کوئی جماعت جہاد کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجتے تھے۔ اس میں چلے جاتے تھے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ ان سے وہ حضرات مُراد ہیں جن کو جہاد میں زخم آ گئے تھے، اور وہ معذور ہو گئے تھے لہٰذا مسلمانوں کے اموال میں ان کا حق مقرر فرما دیا۔

صاحبِ رُوح المعانی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم ان حضرات کو اوّلیت کے اعتبار سے شامل ہے حصر مقصود نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم قیامت کے دن تک باقی ہے جو لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں ان کی ایک صفت تو یہ بیان فرمائی کہ دینی مشغولیت کی وجہ سے چل پھر کر کسبِ معاش نہیں کر سکتے اور اُن پر خرچ کرنے کا

یہ بہت بڑا سبب ہے۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ کہ یہ لوگ مخلوق کے سامنے سوال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس وجہ سے انجان آدمی جسے ان کا اندرونی حال معلوم نہیں ہے انہیں مالدار سمجھتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں جنہیں کمانے کی فرصت نہیں وہ مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کریں کسی کے سامنے کوئی حاجت نہ رکھیں ایسے بے نیاز ہو کر رہیں کہ جنہیں ان کا حال معلوم نہ ہو وہ ان کی بے نیازی کو دیکھ کر انہیں مالدار سمجھیں ہاں دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ خرچ کرنے کی صحیح جگہ پہنچیں اور ایسے حاجت مندوں کا پتہ چلائیں، اور درحقیقت اصل مسکین وہی ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ وہ مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا ہے اُسے ایک لقمہ اور دو لقمے اور ایک کھجور اور دو کھجوریں دربدر پھراتی ہیں۔ لیکن واقعی مسکین وہ ہے جسے اتنا مقدور نہیں جو اُسے بے نیاز کر دے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تا کہ اُس پر خرچ کر دیا جائے اور وہ لوگوں سے سوال کرنے کے لئے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ (رواہ البخاری ج۱)

ان حضرات کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمَاهُمْ کہ اے مخاطب! ایسے لوگوں کو تو ان کی نشانی سے پہچان لے گا۔ نشانی سے حالتِ ظاہرہ مراد ہے جسے دیکھ کر ان کی حاجت مندی اور بیچارگی معلوم ہو جائے۔ اس نشانی کے بارے میں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مشقت کے ظاہری آثار جو چہرے سے عیاں ہوں وہ مراد ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بھوک کی وجہ سے جو رنگ زرد ہو گئے ہوں وہ مراد ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ کپڑوں کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے۔ صاحب معالم التنزیل ص ۲۵۹ ج ا نے یہ اقوال نقل کئے ہیں لیکن درحقیقت ان پر کوئی انحصار نہیں، بھانپنے والے طرح طرح سے بھانپ لیتے ہیں جو فکرمند ہو گا وہ ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اور ان کے پاس اُٹھ بیٹھ کر ان کی حاجت مندی کو پہچان ہی لے گا۔

پھر فرمایا کہ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا یعنی یہ حضرات لوگوں سے لگ لپٹ کر ذمہ ہو کے ضد کر کے سوال نہیں کرتے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اِلْحَافًا قید احترازی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے اگر سوال کرتے تو دیکھنے والا اُنہیں مالدار کیوں سمجھتا اور ان کے بارے میں یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ کیوں ارشاد ہوتا۔

آخر میں فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ اور جو بھی کچھ تم خیر میں سے خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اُس کا جاننے والا ہے اس کی قدر فرمائے گا اور اس کی جزا دے گا تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہ ہو گا۔

صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دینیہ کی اشاعت میں مشغول ہیں پس اس بنا پر سب سے اچھا مصرف طالبِ علم ٹھہرے اور ان پر بعض ناتجربہ کاروں کا جو یہ طعن ہے کہ ان سے کمایا نہیں جاتا اس کا جواب قرآن میں دے دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص ایسے دو کام نہیں کر سکتا جن میں سے ایک میں یا دونوں میں پوری مشغولی اور انہماک کی حاجت ہے اس کے لئے اس کے ساتھ اکتسابِ مال کا شغل جمع نہیں ہو سکتا اور اس کے کرنے سے علمِ دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے چنانچہ ہزاروں نظائر پیش نظر ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں پوشیدہ طور پر اور علانیہ طریقہ پر سو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے

وقف منزل

عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾

رب کے پاس، اور ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

رات دن مال خرچ کرنیوالوں کی فضیلت اور منقبت

اس آیت میں رات دن اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے کا تذکرہ ہے۔ جولوگ پوشیدہ طور پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں گے یا علانیہ طور پر قیامت کے دن ان کا خرچ کیا ہوا مال اجر وثواب کی صورت میں انہیں مل جائے گا۔ وہ وہاں غمگین نہ ہوں گے، جبکہ بہت سے لوگ بد عملی کی وجہ سے یا اپنے مالوں کو گناہوں میں خرچ کرنے کی وجہ سے غمگین ہوں گے اس آیت میں مال خرچ کرنے کے بیان میں سِــــرًّا وَّ عَلَانِيَةً فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے سامنے مال خرچ کرنا ریا کاری میں شامل نہیں جس سے گناہ ہو اور خرچ کرنا اکارت ہو جاتا ہو، گو خفیہ طریقہ پر خرچ کرنے کی فضیلت زیادہ ہے لیکن اگر دِکھاوا مقصود نہ ہو نام ونمود پیشِ نظر نہ ہو اور مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہی ہو تو لوگوں کے سامنے خرچ کرنے سے ریا کاری میں شمار نہ ہوگا، ریا کاری اپنے دل کے جذبہ اور ارادہ کا نام ہے، اگر کوئی شخص تنہائی میں نیک عمل کرے اور مال خرچ کرے اور پھر لوگوں کو معتقد بنانے کے لئے اپنے عمل کو ظاہر کرے یا دل میں یہ تڑپ ہو کہ میرے اعمال لوگوں پر ظاہر ہوں تا کہ میری تعریف ہو تو یہ بھی ریا میں شامل ہو جائے گا بلکہ اس میں دُہرا ریا ہے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ دیکھو کیسے مخلص ہیں، تنہائیوں میں عمل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جیسے کہ کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے شیطان لپٹ کر

وقف لازم

مِنَ الۡمَسِّ‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا‌ ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ

مخبوط بنا دے، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ بیع تو سُود ہی کی طرح سے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سُود کو حرام قرار دیا،

الرِّبٰوا‌ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ

سو جس کے پاس آ گئی نصیحت اس کے رب کی طرف سے پھر وہ باز آ گیا تو اس کے لئے وہ ہے جو گزر چکا، اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے،

وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

اور جو شخص پھر عود کرے سو یہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

سُودخوروں کی مذمت

ان آیات میں سُودخوروں کی مذمت بیان فرمائی ہے اور ان کا حال بیان فرمایا ہے جو قیامت کے دن ان کو پیش آئے گا یعنی وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح حیران اور مدہوش کھڑے ہوں گے جیسے کسی کو شیطان لپٹ چپٹ جائے اور وہ اس کی وجہ سے مخبوط ہو جائے اس کے ہوش خطا ہو جائیں، مبہوت ہو جائے، بہکی بہکی باتیں کرے اس کا دل اور دماغ کام نہ کر سکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کے پیٹ بُیوت یعنی گھروں کی طرح سے تھے اُن میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو ان کے پیٹوں کے باہر سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہا، اے جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سُود کھانے والے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۶ بحوالہ احمد و ابن ماجہ)

جس کے سامنے ایک سانپ ہو اس کی حیرانی اور پریشانی کا تصور کرو، پھر یہ سوچو کہ اگر کسی کے پیٹ میں ایک سانپ ہو تو اُس کا کیا حال ہوگا اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ جس کا پیٹ گھر کے برابر ہو اور اس میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے ہوں اس کا کیا حال ہوگا اور کیا ہوش برقرار رہے گا۔ سُود خوروں کی قیامت کے دن کی حالت بتا کر یہ بتایا کہ یہ لوگ سُود کو حلال قرار دینے کے لئے یوں کہتے ہیں کہ سُود میں اور بیع میں فرق کیا ہے کاروبار کرنے میں بھی زیادہ مال ملتا ہے۔ اور سُود کے لین دین میں بھی زیادہ مال ملتا ہے لہٰذا بیع کی طرح سُود لینا بھی صحیح ہوا۔ اس بات کو سُود لینے والے مختلف الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو نفع کے نام سے کھاجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے پیسے کا نفع ہے، حالانکہ کسی چیز کا نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی اور حرام حلال نہیں ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے سُود کو حرام قرار دیا ہے وہ ہمیشہ حرام ہی رہے گا، جب سے بینکوں کا نظام جاری ہوا ہے۔ لوگوں کو سُود لینے کی عادت ہوگئی اور جب تک سُود نہ کھائیں ان کے نفس کو تسلّی ہی نہیں ہوتی اور علماء کو خصوصیت کے ساتھ ہدفِ ملامت بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولویوں نے قوم کو سود لینے سے اور سُودی کاروبار سے روک دیا جس کی وجہ سے قوم بہت نیچے چلی گئی اور دُوسری قومیں سُودی کاروبار کر کے بامِ عروج پر پہنچ گئیں۔ بھلا مولوی کی کیا مجال ہے کہ وہ اپنے پاس سے خود کچھ کہے۔ وہ تو حکم سنانے والا ہے۔ حلال چیز کو حرام قرار دینا اس کے عہدہ میں کب ہے؟ اس کا تو صرف اتنا قصور ہے کہ حق سناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے۔ جن لوگوں کو حرام کا ذوق ہے وہ اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ بیع اور سُود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سُود کو حرام قرار دیا پھر کیسے فرق نہیں ہے؟ ایک چیز حلال ہے دوسری چیز حرام ہے یہ بہت بڑا فرق ہے اور بیع اور سُود کی حقیقت میں بھی فرق ہے۔ بیع تو مال سے مال کے مُبادلہ کو کہا جاتا ہے پوری قیمت کے بدلہ مال آ جاتا ہے اور سود میں یہ ہوتا ہے کہ جتنا قرض دیا وہ تو پُورا وصول کر لیا جاتا ہے اور اس کے سوا الگ سے بھی زائد رقم لی جاتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ہر وہ قرض جو ذرا سا بھی زائد کچھ لے کر آئے تو وہ سود ہے۔ (کل قرض جرّ نفعا فھو ربوا)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو کچھ قرض دے پھر قرض لینے والا کچھ ہدیہ دے یا اپنے جانور پر سوار کرے تو نہ سوار ہو نہ ہدیہ قبول کرے، ہاں اگر ان کے درمیان اس سے پہلے ہدیہ لینے دینے کا تعلق تھا تو وہ اور بات ہے۔ (رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ ص ۲۴۶)

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اُنہوں نے فرمایا کہ تم ایسی سرزمین میں رہتے ہو جہاں سُود کا لین دین رواج پائے ہوئے ہے جب کسی پر کچھ قرض ہو پھر وہ تمہیں بھوسہ کا ایک گٹھڑ یا جَو کی گٹھڑی یا رسّی میں بندھی ہوئی سبزی بھی دینا چاہے تو اس کو مت لینا کیونکہ وہ سود ہے۔ (رواہ البخاری)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط کا تو یہ عالم تھا کہ جب کسی قرضدار سے تقاضا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو اس کی دیوار کے سایہ میں بھی کھڑے نہ ہوتے تھے تاکہ قرضدار کی کسی چیز سے انتفاع نہ ہو جس کو قرض دیا ہو اس سے ہدایہ لینے کی ممانعت

سے اس بات کا جواب بھی نکل آیا کہ جو شخص سود دیتا ہے وہ اپنی خوشی سے دیتا ہے۔ پھر اس کے لینے پر کیوں پابندی ہے؟ ہدایہ لینے کی ممانعت سے معلوم ہوا کہ خوشی سے دینے پر بھی سُود لینا حلال نہیں ہے۔ جبکہ قرض دار سے ہدیہ لینا بھی حلال نہیں ہے تو سود کے نام سے اور سود کے عنوان سے جو کچھ طے کر کے لیا جائے۔ اُس کے حلال ہونے کا ذِکر ہی کیا ہے؟ باہمی رضامندی سے نہ سود حلال ہے نہ رِشوت حلال ہے نہ زنا حلال ہے۔ سود کا لین دین پُرانی اُمتوں میں بھی حرام تھا۔ سورۂ نساء میں فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (سو یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو اُن کے لئے حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ وہ کثرت سے اللہ کے راستہ سے روکنے کا کام کرتے تھے اور ان کے سُود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو اس سے روکا گیا تھا، اور باطل طریقوں سے لوگوں سے مال کھانے کی وجہ سے، اور ہم نے اُن کے لئے جو اُن میں سے کفر پر ثابت رہے، دردناک عذاب تیار کیا ہے)۔

چونکہ سودی لین دین میں غریبوں پر ظلم ہوتا ہے اور مہاجن لوگ گھر بیٹھے ہوئے عوام کا خُون چوستے ہیں اِس لئے سُود کھانے کی وہ سزا جو عالم برزخ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خواب میں یوں دکھائی گئی کہ ایک شخص خون کی نہر میں کھڑا ہے اور نہر کے کنارے ایک آدمی ہے جس کے سامنے پتھر ہیں جو شخص نہر میں ہے وہ نکلنا چاہتا ہے تو یہ دوسرا شخص اس کے منہ پر پتھر مار دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اسی جگہ چلا جاتا ہے جہاں پہلے تھا جب بھی وہ شخص نکلنا چاہتا ہے تو یہ شخص اس کے منہ پر پتھر مار دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی جگہ چلا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا جن میں ایک جبریل اور دوسرے میکائیل تھے (علیہما السلام) کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اِن دونوں نے بتایا کہ یہ شخص جو نہر کے اندر ہے سُود کھانے والا ہے۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۵ ج ۱)

کیونکہ سُود کا لین دین بہت ہی بڑا گناہ ہے اس لئے سُود سے متعلق ہر شخص پر لعنت کی گئی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے سُود کھانے والے پر اور سُود کھلانے والے پر اور اس کی لکھا پڑھی کرنے والے پر اور اُس کے گواہوں پر، اور فرمایا کہ یہ لوگ گناہ میں سب برابر ہیں۔ (رواہ مسلم ص ۲۷ ج ۲)

جو لوگ سُودی کاغذات لکھتے ہیں اس کی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں۔ سودی لین دین کی فرموں اور کمپنیوں اور بینکوں میں کام کرتے ہیں اور جو سود لیتے ہیں اور سود دیتے ہیں وہ اپنے بارے میں غور کر لیں کہ لعنت کے کام میں مشغول ہیں۔ گناہ کی مد د بھی حرام ہے اور جس نوکری میں گناہ کرنا پڑے وہ بھی حرام ہے اور اسکی تنخواہ بھی حرام ہے۔ سود کا لین دین کرنے والوں اور زیادہ آمدنی کی خواہش رکھنے والوں کو مفتیوں کی بات ناگوار تو لگتی ہے مگر حق تو کہنا ہی پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سود کا ایک درہم جو انسان کھا لے اور وہ جانتا ہو کہ یہ سود کا ہے تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ (رواہ احمد والدار قطنی ،مشکوۃ ص ۲۴۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سُود کے ستر حصے ہیں اُن میں سب سے ہلکا یہ ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بُرا کام کرے۔ (مشکوۃ المصابیح ص ۲۴۶)

بیع کی حلت اور سُود کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ کہ جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی سو جو کچھ گزر چکا وہ اسی کے لئے ہے یعنی اب تک جو سود لیا اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا قال

النسفی فی مدارک التنزیل ص ۱۳۸ ج افلایؤاخذ بما مضی منه لأنه اخذ قبل نزول التحریم ۔یعنی گزشتہ عمل پر اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ اس نے حُرمت نازل ہونے سے پہلے لیا ہے۔صاحب رُوح المعانی ص ۵۱ ج ۳ لکھتے ہیں کہ یہ سُود واپس نہ کروایا جائے گا کیونکہ حُرمت نازل ہونے سے پہلے حُرمت کا قانون نافذ نہیں تھا۔لہٰذا معاف کردیا گیا۔

پھر فرمایا: وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ کہ نصیحت اور موعظت کے بعد جس نے توبہ کرلی اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔اگر سچے دل سے توبہ کی ہے تو اللہ کے یہاں قبول ہوگی اور جھوٹی توبہ کی ہے تو نفع نہیں دے گی، ظاہری توبہ کے بعد بندوں کو بدگمانی کا کوئی موقع نہیں۔اور جس نے پہلی بات کی طرف عود کیا یعنی سود کو حلال بنایا اور یوں کہا کہ وہ تو بیع کی طرح سے ہے تو ایسا کہنے والے دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔تفسیر مدارک وروح المعانی کی تصریح سے معلوم ہوا کہ فَلَهٗ مَا سَلَفَ نزول تحریم سے پہلے جو سود لیا تھا اس سے متعلق ہے۔ بعد تحریم کے جو شخص سود لے گا وہ واپس ہوگا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾

اللہ مٹاتا ہے سُود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو، اور اللہ دوست نہیں رکھتا کسی کفر کرنے والے ،گناہ کرنے والے کو۔

صدقات کی برکات اور سُود کی بَربادی

سُودخوروں کی مذمت بیان فرمانے کے بعد اِس آیت شریفہ میں سود اور صدقات کے درمیان ایک فرق عظیم بتایا ہے اور وہ یہ کہ صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے اور سود کے مال کو بے برکت کردیتا ہے اور اس کو برباد اور تلف فرمادیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ سُود اگرچہ بہت ہوجائے اس کا انجام کمی کی طرف ہوجائے گا۔(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان واحمد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۶)

دنیا میں سودی مالوں کی بے برکتی تو سب کی نظروں کے سامنے ہے، سودخور ہمیشہ ایک کے دس کرنے ہی کے فکر میں رہتا ہے۔اور پیسہ ہی اس کی زندگی بن جاتا ہے۔خُدائے پاک کی رضا کے لئے کوئی کام کرے اس سے تو اس کا ذہن فارغ ہی رہتا ہے اس میں بے رحمی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔حاجت مند کی حاجت دیکھتا ہے اور اسکی مجبوری سے مال حاصل کرنے کا راستہ نکالتا ہے اور مجبور اور بے کس کو سُود پر قرض دے دیتا ہے اور خیر کے کاموں میں اسکا مال خرچ ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے؟ پھر سُود سے جو مال جمع ہوتا ہے اس سے اسبابِ معیشت تو جمع ہوجاتے ہیں لیکن سکون واطمینان سلب ہوجاتا ہے۔اسبابِ راحت ہیں۔راحت نہیں، پھر یہ سودی اموال ہلاک ہوجاتے ہیں مالوں سے بھرے ہوئے جہاز ڈوب جاتے ہیں اور بینک دِیوالیے ہوتے رہتے ہیں، یہ سب باتیں نظروں کے سامنے ہیں اگر کسی سودخور کا مال دنیا میں ہلاک اور برباد نہ ہوا تو آخرت میں تو یہ مال بالکل ہی کام نہ دے گا۔ بربادی ہوگی۔وہاں نہ مال ہوگا نہ مال سے فائدہ۔اور حرام مال دوزخ میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی شخص حرام مال کما کر صدقہ کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا اور جو کچھ اس میں سے خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہ ہوگی۔اور اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کیلئے دوزخ کی آگ میں لے جانے والا توشہ بنے گا۔(رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۲)

پھر جو حرام مال آل واولاد پر زندگی میں خرچ ہوتا ہے اور جو موت کے بعد ان کو پہنچے گا اور اُن پر خرچ ہوگا وہ ان کے لئے بھی وبال ہوگا۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو گوشت حرام سے بڑھا ہو، جنت میں داخل

نہ ہوگا اور جو گوشت حرام سے بڑھا دوزخ کی آگ اس کی زیادہ مستحق ہوگی۔ (احمد و دارمی، مشکوٰۃ ص ۲۴۲) اُس مال کی کثرت کس کام کی جو صاحبِ مال کے لئے اور اس کی آل اولاد کے لئے، دوزخ میں جانے کا ذریعہ بنے اور دنیا میں بے برکت ہو اور اس کی وجہ سے آرام اور چین مفقود ہو، برخلاف حلال مال کے وہ خواہ تھوڑا ہی ہو اس میں برکت ہوتی ہے۔ اس میں سے جو صدقہ کر دیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے اور تھوڑا مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے تو بہت زیادہ چند در چند مضاعف کر دیا جاتا ہے جس کا بے انتہا ثواب آخرت میں ملے گا۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ یعنی جو شخص سود کی حُرمت کا قائل نہ ہو اس کو حلال سمجھے اور کفر اختیار کرے اور سُود کھا کھا کر خدائے پاک کی نافرمانی کرے اللہ تعالیٰ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے وہ شخص اللہ کا مبغوض ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی سو اُن کے لئے ان کا ثواب ہے ان کے

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

رب کے پاس نہ وہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ غمگین ہوں گے۔

مؤمنوں، نمازیوں اور زکوٰۃ دینے والوں کا اجر و ثواب

ابھی سُود کے بارے میں بعض احکام کا بیان باقی ہے۔ درمیان میں اہلِ ایمان کی فضیلت اور ان کا اجر و ثواب بیان فرما دیا، اور ان کے بعض اعمالِ خاصہ کا تذکرہ فرمایا یعنی نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور فرمایا کہ بروزِ قیامت ان لوگوں پر کوئی خوف نہ ہوگا اور رنجیدہ نہ ہوں گے۔ برخلاف سود لینے والوں کے کہ وہ وہاں دیوانوں کی طرح کھڑے ہونگے مخبوط الحواس ہونگے۔ اموال دنیا میں چھوڑ چکے ہوں گے اور وہاں ان اموال کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے کی وجہ سے عذاب میں ڈالے جائیں گے۔

اوّل تو مال حرام والے نیک کاموں میں پیسے خرچ کرتے ہی نہیں اور اگر خرچ کر بھی دیں تو آخرت میں انکا کچھ اجر نہیں نمازوں اور زکوٰۃ اور صدقات والے وہاں آرام اور چین سے ہوں گے کوئی خوف ان کو لاحق نہ ہوگا اور سُود خوروں کا بُرا حال ہوگا، جیسا کہ پہلی آیت میں مذکور ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سُود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، پس اگر تم نہ کرو

لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ

تو جنگ کا اعلان سن لو اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے اصل مال ہیں

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

سُود خوروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ

اس آیت کا سببِ نزول بیان کرتے ہوئے علماءِ تفسیر نے نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی ثقیف کے چار آدمی جو آپس میں بھائی بھائی تھے بنی مغیرہ سے سُود کا معاملہ کرتے تھے یعنی بنی مغیرہ کو سُود پر قرض دیتے تھے۔ جب طائف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ ہو گیا (اور طائف اسلامی علاقہ میں داخل ہو گیا) تو یہ چاروں بھائی بھی مسلمان ہو گئے، انہوں نے بنی مغیرہ سے اپنا سود طلب کیا تو بنی مغیرہ نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم اسلام قبول کرنے کے بعد سُود نہیں دیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ختم فرما دیا ہے، یہ قضیہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا جو مکہ معظّمہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عامل یعنی حاکم تھے۔ اُنہوں نے پورا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیا۔ اِس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی، سُودی مال بہت زیادہ تھا۔ آیت شریفہ سن کر ان لوگوں نے اپنا سود چھوڑ دیا۔ آیت شریفہ میں باقی سُود چھوڑنے کا حکم فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ تم اصلی مال لے سکتے ہو، نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر تم سود چھوڑنے کو تیار نہیں ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو، یہ بات سن کر ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں اللہ سے مقابلہ کی کہاں طاقت ہے؟ کس کے بس کی بات ہے جو اللہ سے جنگ کرے؟ ہم اپنا سود چھوڑتے ہیں۔

آیت کا سببِ نزول ہم نے اس لئے ذکر کیا کہ کوئی ایسا شخص جو مسلمان ہے اور اس نے سُود پر قرضے دے رکھے ہیں اور بہت سے سُود وصول بھی کر رکھے ہیں وہ آیت کا مطلب یہ نہ نکال لے کہ جو سود میں نے اب تک لیا ہے وہ میرے لئے حلال ہے باقی سُود چھوڑ دیتا ہوں اور اصل مال لے لیتا ہوں، آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن لوگوں نے زمانۂ کفر میں سُود پر قرضے دیئے تھے اور بہت سا سُود قرضداروں سے وصول کر چکے تھے، وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی سود وصول کرنا چاہتے تھے ان کو حکم فرمایا کہ جو سود باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ جو کوئی مسلمان سود پر قرضے دے کر سود وصول کر چکا ہو اس کا حکم اس آیت میں مذکور نہیں ہے، اگر کسی مسلمان نے سود لیا ہے اگرچہ سود دینے والے نے خوشی سے دیا ہے تو اس کا واپس کر دینا واجب ہے، اگر یاد نہ رہا ہو کہ کس کس سے لیا ہے تو جتنا مال سود کا وصول کیا تھا اس کا صدقہ کر دینا واجب ہے، جن لوگوں نے سُودی قرضے دے رکھے ہیں وہ توبہ کریں کہ سُود وصول نہ کریں گے اگر توبہ نہیں کرتے تو اپنا انجام سوچ لیں کیونکہ سُود لینا اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنا ہے اور اس کی گرفت وعذاب سے نڈر ہو جانا ہے جو اموال سُود کے طور پر لے چکے ہیں ان کو واپس کریں، جن سے سود لیا ہے، البتہ اپنا مال وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں، سود لے کر ظلم نہ کریں، اور جن لوگوں پر قرضے ہیں وہ اصل مال روک کر قرض دینے والوں پر ظلم نہ کریں۔

بنکوں میں جو رقمیں رکھتے ہیں اور ان پر سُود لیتے ہیں یہ سخت حرام ہے اگرچہ اس کا نام نفع رکھ لیں۔ توبہ کریں اور وہاں سے اپنا اصلی مال لے لیں، نام رکھنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی اور سُود کا نام نفع رکھنے سے نفع نہیں ہو جاتا، جو لوگ سود کا نام نفع رکھ لیتے ہیں اور پھر سود لیتے رہتے ہیں۔ ان کا قول انہی لوگوں کے قول کے مطابق ہو جاتا ہے جنہوں نے اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کہا تھا۔ اللہ پاک نے اُن کی تردید فرمائی اور اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فرمایا، جب کسی چیز کا رواج ہو جاتا ہے وہ خواہ کیسی ہی بُری چیز ہو اس کی قباحت اور شناعت دِلوں سے اُٹھ جاتی ہے۔ جب سے بینکوں کا سلسلہ چلا ہے لوگ بینکوں سے سُود لینے کے خُوگر ہو گئے ہیں اور اس کی قباحت دِلوں سے جاتی رہی ہے اور سُود کو حلال کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ صاحب بینک والے ہمارے پیسوں سے تجارت کرتے ہیں نفع کماتے ہیں ہمیں بھی اُنہوں نے اگر نفع میں شریک کر لیا تو کیا ہوا؟ یہ ان کی جہالت وگمراہی کی بات ہے۔ وہ بینک تجارت تو کرتا ہے، اور تمہارے پیسوں سے کرتا ہے لیکن تم نے بینک کو مال مضاربت کے اُصول پر نہیں دیا، تمہیں فی صد ایک متعین رقم مل جاتی ہے۔ شرعی اصول سے یہ سود ہے، باتوں کی

ہیرا پھیری سے سود حلال نہ ہوگا۔

فائدہ...... جو شخص سود نہ چھوڑے اس کے لئے اللہ پاک نے اپنی طرف سے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ فرمایا، اس طرح کا مضمون ان لوگوں کے بارے میں بھی آیا ہے جو اللہ کے دوستوں سے دُشمنی کریں، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ (کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرے تو اس سے میں جنگ کا اعلان کرتا ہوں) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے من عادٰی لله ولیا فقد بارز اللہ بالمحاربة. (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۵، از ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان) یعنی جس نے اللہ کے کسی ولی سے دشمنی کی وہ اللہ سے جنگ کرنے کے لئے میدان میں آ گیا۔ شراح حدیث نے لکھا ہے کہ یہی دو گناہ ایسے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کا ارتکاب کرنے والوں کو اعلانِ جنگ کرتا ہوں اور یہ دونوں گناہ ایسے ہیں جو آج کل بہت زیادہ رواج پا گئے ہیں۔ سُود کا لین دین بھی بہت ہو رہا ہے اور جو اولیاء اللہ ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ عبادت و تلاوت میں لگے رہتے ہیں قرآن و حدیث کے علوم پڑھتے ہیں۔ دینی علوم و اعمال کی طرف بُلاتے ہیں دین کے لئے محنتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے دشمنی کی جاتی ہے۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے اُمیدوار بھی ہیں جس سے لڑائی ہے اس سے اُمید رحمت کیسی ناسمجھی کی بات ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اور اگر تنگ دست ہو تو مہلت دینا ہے آسودہ ہو جانے تک، اور یہ بات کہ تم صدقہ کر دو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اور ڈرو تم اس دن سے جس میں لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر ہر جان کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ اس نے کسب کیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ع ۳۸ / ۶

تنگدست قرض دار کو مہلت دینا

اس آیت میں تنگدست قرضدار کو مہلت دینے کی ترغیب دی ہے کہ جب تک مال میسر نہ ہو اس کو مہلت دیدو، اور یہ بھی فرمایا اگر اس پر صدقہ کر دو یعنی اپنا قرض بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ سود خوروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اُدھار کی وجہ سے اصل مال پر زائد رقم لیتے ہیں اور جب قرضدار وقت پر ادا نہ کر سکے تو دل سے خوش ہوتے ہیں اور سود کی رقم کو اصل کے ساتھ ملا کر مزید سُود لگا دیتے ہیں، اللہ جل شانہٗ نے اس کے برخلاف حکم دیا کہ اوّل تو اصل رقم سے زائد نہ ٹھہراؤ (غریب کی حاجت پوری کرنے کے لئے قرض دے دو) پھر جب دیکھو کہ باوجود مقررہ اجل پُورا ہونے کے وہ ادائیگی پر قادر نہیں تو اس کو مہلت دے دو، اور اگر بالکل معاف ہی کر دو تو یہ اور زیادہ بہتر ہے۔ معاف کرنے کو صدقہ سے تعبیر فرمایا جس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح صدقہ دینے سے مال بڑھتا ہے اور مال میں برکت ہے اسی طرح قرضدار کا قرضہ معاف کر دینے میں بھی وہی برکات حاصل ہوں گی جو صدقہ دینے کی برکات ہیں۔ تنگ دست قرضدار کو مہلت دے دینے اور قرضہ معاف کر دینے کی احادیث شریفہ میں بڑی فضیلت آئی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک تاجر لوگوں سے قرضوں کا لین دین کیا کرتا تھا قرضے وصول کرنے پر جو غلام اس نے مقرر کر رکھے تھے ان سے کہتا تھا کہ جب کسی تنگ دست کے پاس پہنچو تو اس سے درگزر کر دینا اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم

سے بھی درگزر فرمائے گا۔ چنانچہ موت کے بعد جب وہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا تو خداوند تعالیٰ شانہٗ نے اس سے درگزر فرمادیا۔ (رواہ البخاری ص ۲۷۹ ج ۱ و مسلم ص ۱۸ ج ۲)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی بے چینیوں سے نجات دے تو تنگدست (قرضدار) کو مہلت دیدے یا معاف کردے۔ (رواہ مسلم ص ۱۸ ج ۲)

حضرت ابواُسیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دے دی یا قرضہ معاف کردیا تو اللہ تعالیٰ اُسے (قیامت کے دن) اپنے سایہ میں رکھے گا۔ (رواہ مسلم ص ۴۱۶ ج ۲)

قرض دینا بھی ایک طرح کا صدقہ ہے اگرچہ بعد میں وصول ہوجائے اور مہلت دینا بھی صدقہ کرنے میں شامل ہے تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ مسند احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے جس نے کسی تنگدست کو مہلت دیدی تو اس کو روزانہ اسی قدر صدقہ دینے کا ثواب ہوگا۔ جتنا قرض اس نے کسی کو دیا ہے یہ ثواب ادائیگی دین کا مقررہ وقت آنے سے پہلے ملتا ہے۔ پھر مقررہ وقت آنے کے بعد مہلت دے تو روزانہ اتنے مال کا دوگنا صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے جتنا اس نے قرض دیا ہے۔ (ص ۱۳۱ ج ۱)

آخر میں ارشاد ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (الآیۃ) سود اور قرض سے متعلق احکام بیان فرمانے کے بعد قیامت کے دن کی حاضری کی طرف متوجہ فرمایا اور یوم الحساب کی حاضری کا مراقبہ کرنے کا حکم دیا جس دن ہر شخص اپنے پورے پورے اعمال کی فہرست پر مطلع ہوگا اور اپنے کئے ہوئے کا بدلہ ملے گا جسے فکرِ آخرت ہو موت کے بعد کے حالات کا یقین ہو اور بارگاہِ خداوندی میں اعمال کا حساب دینے کا استحضار ہو وہ وہاں کی نجات اور اجر و ثواب کے لئے ہر طرح حرام مال کو بآسانی چھوڑ سکتا ہے اور اس کے لئے اپنے نفس کو راضی کرسکتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ

اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت تک اُدھار لینے دینے کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ جو شخص

بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ

تمہارے درمیان لکھنے والا ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھے، اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے، سو چاہیے کہ لکھ دیا کرے،

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ

اور جس کے اُوپر حق ہے اسے چاہیئے کہ لکھوا دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے، سو اگر وہ شخص کم سمجھ ہو

عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

جس پر حق ہے یا ضعیف ہو یا املا کرانے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے،

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ

اور اپنے مَردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لیا کرو، پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں

تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ

سے جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ ان دو عورتوں میں سے اگر ایک بھٹک جائے تو ایک دوسری کو یاد دِلا دے اور نہ انکار کریں گواہ جب

اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْــَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

ان کو بُلایا جائے، اور قرضے کے معاملہ میں لکھنے سے مت اُکتاؤ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کی مُدت مقررہ تک، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کو

وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا

زیادہ درست رکھنے والی ہے اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو جس میں لینا دینا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں

بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ

معاملہ کر رہے ہو سو تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ لکھا پڑھی نہ کرو، اور گواہ بنا لیا کرو جب کہ تم آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرو، اور نہ ضرر دیا جائے

كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

کاتب کو، اور نہ گواہ کو، اور اگر تم ایسا کرو تو بلا شُبہ اس میں گنہگاری ہے تمہارے لئے، اور اللہ سے ڈرو اللہ تمہیں سکھاتا ہے،

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

مداینت اور کتابت اور شہادت کے ضروری مسائل

یہ کلمات اور حروف کے اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت ہے جو متعدد احکام پر مشتمل ہے۔

شروع آیت میں فرمایا کہ جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو جس کی میعاد مقرر ہو تو اسے لکھ لیا کرو۔ اس سے ایک تو قرض کے لین دین کا جواز معلوم ہوا۔ دوسرے اس بات کا تاکیدی حکم معلوم ہوا کہ قرض کے لین دین کو لکھ لیا کرو۔ اس لکھنے میں قرض کی مقدار بھی آ جائے گی اور جس وقت ادا کرنا طے کیا ہو وہ وقت تحریری طور پر متعین ہو جائے گا۔ دونوں باتیں مفید ہوں گی۔ کیونکہ خدانخواستہ آپس میں کوئی اختلاف ہو گیا تو تحریر سامنے ہوگی جس سے اختلاف رفع ہو جائے گا۔ لفظ اَجَل کے ساتھ جو مُسَمّٰی بڑھایا ہے اس میں یہ بتایا کہ ادائیگی کا وقت اس طرح مقرر کریں جسے واقعی مقررہ وقت کہا جا سکے۔ مثلاً کسی مہینہ کی تاریخ مقرر کر دیں، اگر یوں کہا کہ جب میرا باغ پکے گا تو دے دوں گا یا کھیت کٹے گا تو دیدوں گا یا میرا بیٹا یا باپ سفر سے آئے گا تو ادا کروں گا تو یہ اجل مسمّٰی نہیں ہے۔

قرض کے لین دین کے لکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے علماء کرام نے اس کو فرض یا واجب پر محمول نہیں کیا بلکہ یہ ایک مستحب عمل ہے اور استحباب مؤکد ہے تاکہ کوئی اختلاف واقع ہو جائے یا بھول چوک ہو جائے تو تحریر کے ذریعہ رفع ہو سکے۔ جہاں دین (قرض) کی لکھا پڑھی کا حکم ہوا اسی کے ساتھ ان لوگوں کو بھی پابند کیا جو لکھنا جانتے ہیں کہ انصاف کے ساتھ لکھیں، کچھ ردّ و بدل نہ کر دیں اور یہ بھی فرمایا کہ جو لکھنا جانتا ہو وہ اللہ کی نعمت کی قدر دانی کرے اللہ نے اسے کتابت کی نعمت دی ہے اور لکھنے کے لائق بنایا ہے تو اللہ کی مخلوق کے کام آئے

اور جب اس سے لکھنے کے لئے کہا جائے تو لکھ دیا کرے۔

پھر فرمایا: وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ یعنی جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ املا کرائے اور کاتب کو بتائے کہ یہ لکھ دو اور عبارت لکھوانے میں اللہ سے ڈرے، صحیح بات لکھوائے، پورا حق لکھوائے، حق واجب میں سے ذرا سی کمی بھی نہ کرے۔ تحریر کرانے میں اس کو خطاب فرمایا جس پر حق ہے کیونکہ جس پر حق ہے اس کا لکھوانا ایک قسم کا اقرار بھی ہے اور چونکہ اسی کو ادا کرنا ہے اس لئے حق واجب سے زیادہ تو لکھوا ہی نہیں سکتا۔ البتہ صاحب حق کی غفلت یا کم سمجھی یا محاورات نہ جاننے یا کاتبوں کی اصطلاحات نہ سمجھنے کے باعث اصل حق سے کم نہ لکھوادے۔

اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ کم سمجھ اور خفیف العقل ہے یا کسی بھی اعتبار سے ضعیف ہے (جس میں کم سن نابالغ بچہ ہونا اور بہت زیادہ بوڑھا ہونا بھی شامل ہے جو کاتب تک نہیں پہنچ سکتا یا اس پر خطاء و نسیان غالب ہے) یا املاء کرانے اور لکھوانے پر قدرت نہیں رکھتا (مثلاً غیر ملکی ہے یا گونگا ہے یا بے پڑھا ہے۔ عبارت بنانے اور بولنے پر قدرت نہیں رکھتا یا جو عبارت دستاویز میں لکھی جاتی ہے وہ نہیں جانتا بات کے الٹ پلٹ ہونے کا اندیشہ ہے) تو اس کا ولی (جس کے ذمہ اس کے اعمال و اموال کی دیکھ بھال ہے) انصاف کے ساتھ املا کرا دے، کتابت کرانے کے حکم کے ساتھ گواہ بنالینے کا بھی حکم فرمایا اور فرمایا کہ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ جس کا مطلب ہے کہ کتابت کے ساتھ دو گواہ بھی بنالو، دونوں گواہ مرد ہوں اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے کہ دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیں، عورتیں چونکہ حافظہ کے اعتبار سے اور ادائیگی مفہوم کے اعتبار سے عموماً کمزور ہوتی ہیں اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی رکھی گئی ہے۔ اس بات کو اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى میں بیان فرمایا کہ ایک عورت بھٹک جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے گی۔ قانون چونکہ عمومی احوال کے اعتبار سے وضع کیا جاتا ہے۔ اس لئے شاذ و نادر احوال اور افراد کو سامنے نہیں رکھا جاتا اس سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ بعض عورتیں بعض مردوں سے زیادہ فہیم ہوتی ہیں اور حافظہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور بات پیش کرنے کا سلیقہ زیادہ رکھتی ہیں۔ گواہ عاقل بالغ ہوں، مسلم ہوں یہ مِنْ رِّجَالِكُمْ سے مفہوم ہو رہا ہے اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ جو فرمایا اس سے واضح ہو رہا ہے کہ گواہ صالح عادل ہونے چاہئیں جن پر بھروسہ ہو اور جن پر دونوں فریق کا اعتماد ہو، اور ان میں سے کسی کے بارے میں جانب داری اور غلط بیانی کا احتمال نہ ہو۔

پھر فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا کہ جن لوگوں کے سامنے معاملہ ہوا ہے ان کو معاملہ کی صحیح خبر ہے اب جب ضرورت کے وقت ان کو بُلایا جائے کہ گواہی دے دو تو ان کو انکار کرنا جائز نہیں ہے وہ جا کر حاکم کے یہاں یا جہاں بُلائے جائیں جا کر گواہی دیدیں، اگر کسی کا حق مارا جاتا ہو اور گواہ کی گواہی سے اس کا حق زندہ ہو سکتا ہو تو گواہوں پر واجب ہے کہ گواہی دیں حق جانتے ہوئے گواہی کو چھپائیں گے تو گناہ گار ہوں گے جس کا ذکر آئندہ آیت میں آرہا ہے۔

بعض مرتبہ آپس کے اعتماد یا ہجوم اشغال کی وجہ سے کتابت کرانے سے دل تنگی محسوس کرتے ہیں اسکے بارے میں تنبیہ فرمائی کہ وَلَا تَسْئَمُوْآ اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ کہ چھوٹا قرضہ ہو یا بڑا اس کے لکھنے میں بد دلی اختیار نہ کرو، یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی چیز ہے اور ٹھیک طرح گواہی کی ادائیگی کے لئے بھی بہت زیادہ قائم رکھنے والی ہے اور اس میں ہر قسم کے شک و شبہ سے بچنے اور دُور رہنے کا بھی فائدہ ہے البتہ ایک صورت میں کتابت کرنے کی تاکید نہیں ہے جسے یوں بیان فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا کہ اگر ایسی تجارت ہو جس کا لین دین نقد اسی وقت ہو رہا ہو اس کی

اگر لکھا پڑھی نہ کی تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ لفظ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ سے معلوم ہوا کہ صورتِ مذکورہ میں نہ لکھنے کی اجازت تو ہے لیکن اگر لکھ لیا تو وہ بھی کوئی ممنوع چیز نہیں ہے جیسا کہ دورِ حاضر میں مال خریدتے وقت کیش میمو نقد کاٹ کر دے دیتے ہیں اور اس میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس کا نام کیش میمو میں لکھ دیا گیا ہو اس پر خود دکاندار جس سے خریدا ہے یا دوسرا شخص غصب کرنے یا چُرانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور جب تم خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو گواہ بنا لیا کرو) گواہ بنانے میں بہت سے فائدے ہیں آپس میں کوئی اختلاف ہو جائے گا تو گواہوں کے ذریعہ رفع ہو گا۔ مثلاً فریقین کے دل میں کوئی خیانت کا جذبہ پیدا ہو جائے یا بھول کر کسی بات کا انکار کر دیں مثلاً بیچنے والا کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول نہیں ہوئی (حالانکہ خریدار کا دعویٰ ہے کہ میں قیمت ادا کر چکا ہوں) یا بیچنے والا سرے سے بیع ہی کا انکار کر دے یا یوں کہہ دے کہ میں نے ہر عیب سے برأت کر لی تھی یا خریدار کہنے لگے کہ میں نے خریدا ہی نہیں، یا یوں کہہ دے کہ قیمت تو میں نے دیدی ہے لیکن سامان مجھے نہیں ملا، یا یوں کہنے لگے کہ میں نے اپنے لئے واپسی کا اختیار بھی رکھا تھا جسے بائع نے مان لیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ بیع کا معاملہ کرتے وقت اور قیمت لیتے وقت اور مال دیتے وقت گواہ بنانے کی صورت میں اس طرح کے انکار اور نزاع کا دفعیہ ہو سکے گا، گواہ ہوں گے تو صحیح بات کی گواہی دے دیں گے، بھول اور خیانت سب کا دِفاع ہو جائے گا۔

پھر فرمایا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (کہ کسی کاتب کو اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے)

پہلے کاتب کو حکم دیا کہ انصاف کے ساتھ کتابت کر دے اور لکھنے سے انکار نہ کرے اور اللہ کی اس نعمت کی قدر کرے کہ اس نے اسے لکھنا سکھایا ہے اور گواہوں کو حکم دیا کہ گواہی کو نہ چھپائیں (جیسا کہ آئندہ آیت میں مذکور ہے) کاتب اور گواہ دونوں کو ان سے متعلقہ کام کی تاکید کے ساتھ ان لوگوں کو ہدایت فرمائی جو کاتب سے کتابت کرائیں اور جو گواہوں کو گواہی دینے کے لئے بُلائیں، کتابت کرانے والے ایسا نہ کریں کہ کاتب کو کسی طرح کوئی تکلیف یا نقصان پہنچائیں اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کاتب کتابت کرنے پر اُجرت مانگے تو اس کو اُجرت دے دی جائے اور مفت لکھنے پر مجبور نہ کیا جائے، اس طرح جب گواہ کو بُلائیں اور اس کو آنے جانے میں زحمت ہو یا جگہ دُور ہو سواری طلب کرتا ہو تو اس کے لئے سواری کا انتظام کر دینا واجب ہے، اور جب وہ گواہی دے چکے تو اس کے واپس گھر پہنچانے کا بھی انتظام کر دیں ایسا نہ کریں کہ اب تو ہمارا کام نکل ہی گیا ہے اب خیر و خبر کا خیال نہ کیا تو کیا حرج ہے۔ البتہ گواہی دینا چونکہ فرض ہے اس لئے اس کی اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔ جب سچی گواہی کی اُجرت لینا جائز نہیں تو جھوٹی گواہی کی اُجرت لینا جس کا عام رِواج ہو گیا ہے کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

یوں تو ہر مسلمان کو ضرر پہنچانا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ملعون من ضارّ مؤمنا او مكربه (رواه الترمذی) وہ شخص ملعون ہے جو کسی مؤمن کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر کرے، کاتب اور شہید کو ضرر نہ پہنچانے کی تاکید فرمائی اور مزید تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ ۢ بِكُمْ کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے گنہگار ہونے کی بات ہے۔

آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (کہ اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ کا احسان مانو، وہ تمہیں احکام کی تعلیم دیتا ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے، کوئی گناہ صغیرہ یا کبیرہ کرو گے تو اسے اس کا علم ہو گا، دنیا میں کسی کا حق مار لیا یا کسی کو ضرر پہنچایا یا تکلیف دیدی تو یہ نہ سمجھنا کہ یہیں پر ختم ہو گیا بلکہ وہ سب محفوظ ہے۔ اللہ کے علم میں ہے۔ یوم آخرت میں پیش ہونے کا یقین رکھو اور وہاں کے مواخذہ اور محاسبہ سے ڈرو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

اور اگر تم سفر میں ہو اور حال یہ ہو کہ نہ پاؤ کسی کاتب کو تو رہن کی چیزیں قبضہ میں دے دی جائیں، سو اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اطمینان کرے تو جس کو

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ

امانت دار سمجھا گیا ہے صاحب امانت کو امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی کو

يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

مت چھپاؤ، اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا تو اُس کا دِل گنہگار ہے، اور اللہ ان کاموں کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

رہن کا حکم اور گواہی چھپانے کی مذمت

اس آیت کریمہ میں اوّل تو رہن کا قانون مشروع فرمایا، اور فرمایا کہ تم اگر کہیں سفر میں ہو اور کوئی کاتب معاملہ لکھنے والا نہ ملے تو جس کے ذمہ قرض ہو وہ دوسرے فریق کو اطمینان دِلانے کے لئے بطورِ رہن کوئی چیز دے دے جس پر وہ قبضہ کر لے اور اُسے اطمینان ہو جائے کہ میرا حق واجب مارا نہیں جائے گا۔

سفر کی قید احترازی نہیں ہے جو لوگ حضر میں یعنی وطن میں ہوتے ہوئے بھی اطمینان کے لئے رہن رکھنے کا معاملہ کر لیں تو یہ بھی صحیح ہے لفظ مَقْبُوْضَةٌ سے معلوم ہوا کہ جب راہن (رہن رکھنے والا) مرتہن (جس کے پاس رہن رکھا جائے) کے قبضہ میں رہن کی چیز دیدے تب اُس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے محض زبانی بات چیت کر لینے سے رہن نہیں ہوگا۔

کوئی کاتب بھی نہیں اور گواہ بھی نہیں اور رہن رکھنے کو بھی کوئی چیز نہیں اور اس سب کے باوجود جس کا حق ہے وہ اس شخص پر بھروسہ کرتا ہے جس کے ذمہ قرض ہے اور اُدھار دے دیتا ہے تو جس پر بھروسہ کیا اُس پر لازم ہے کہ امانت کو پوری طرح صحیح طریقہ پر مُدّت مقررہ کے مطابق ادا کر دے نفس یا شیطان کے بہکانے سے حق مارنے کا ارادہ نہ کرے اور یہ نہ سوچے کہ نہ تحریر ہے نہ گواہ ہیں نہ میں نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اگر میں مُکر ہی جاؤں تو یہ کیا کرے گا؟ یوں تو سب کے حقوق مالیہ ادا کرنا فرض ہے لیکن جس نے اطمینان کیا اور بھروسہ کیا اُس کے حق کی ادائیگی کا فکر کرنا تو اور زیادہ لازم ہے، اور شرافت کا یہی تقاضا ہے۔ اگر گواہ یا تحریری سند نہ ہونے کی وجہ سے دُنیا والے صاحبِ حق کا حق نہ دِلا سکیں تو اس سے چھٹکارہ نہیں ہوسکتا۔ سامنے آخرت ہے یوم الحساب ہے اُس دِن سب کے حقوق ادا کرنے ہوں گے۔ قاضی روزِ جزا جل مجدہ حساب لے گا اور ذرّہ ذرّہ کا محاسبہ ہوگا اور اموال کی جگہ اعمالِ صالحہ دینے ہوں گے اعمالِ صالحہ نہ ہوئے تو حقوق والوں کے گناہ سر ڈال دیئے جائیں گے۔ دنیاوی حکام کچھ نہیں کر سکتے تو احکم الحاکمین کو تو سب کچھ معلوم ہے جب وہاں پیشی ہوگی تو چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ ہوگا اسی کو ارشاد فرمایا وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ کہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ پھر فرمایا: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (یعنی گواہی کو مت چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا تو اُس کا دل گنہگار ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ گواہی کا چھپانا حرام ہے جب کسی کا کوئی حق مارا جا رہا ہو اور ایک شخص کو معلوم ہے کہ واقعی اس کا حق فلاں شخص پر ہے تو اُس کے لئے یہ حرام ہے کہ گواہی کو چھپائے۔ بشرطیکہ صاحبِ حق اُس سے درخواست کرے کہ تم چل کر گواہی دیدو اگر وہ درخواست

نہ کرے تو گواہی کے لئے جانا واجب نہیں۔ گواہی چھپانے والے کے بارے میں فرمایا کہ اُس کا دل گنہگار ہے اس میں یہ بتایا کہ گواہی کے لئے نہ جانا صرف اعضاء ظاہرہ ہی کا گناہ نہیں دل کا گناہ بھی ہے۔

مسئلہ...... شہادت پر اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ گواہ آمد و رفت کا کرایہ لے سکتا ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔

آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے حق نہ دینے والا اور گواہی کو چھپانے والا اور ہر شخص اس بات کا یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور اس کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ

اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے یا اس کو پوشیدہ رکھو اللہ اس کا محاسبہ

بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾

فرمائے گا، پھر جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ

ایمان لایا رسول اس پر جو اس کی طرف نازل کیا گیا اس کے رب کی طرف سے، اور مؤمنین بھی ایمان لائے، سب ایمان لائے اللہ پر اور اُسکے فرشتوں پر

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ

اور اس کی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر، وہ کہتے ہیں کہ ہم اُسکے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا، ہم آپ کی بخشش کا سوال کرتے

رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ

ہیں، اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ نہیں مکلّف بناتا کسی جان کو، جس کی اُسے طاقت نہ ہو، ہر جان کیلئے وہی ہے جو اس نے کسب کیا، اور

عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا

اسکے اُوپر وبال ہے اُسکا جو وہ گناہ کرے، اے ہمارے ربّ ہمارا مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے چوک ہو جائے، اے ہمارے رب

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

اور نہ رکھ ہم پر بھاری بوجھ جیسا کہ آپ نے ان لوگوں پر بھاری بوجھ رکھا جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو

لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾ ع ۳ ۸

طاقت نہ ہو، اور ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہماری مغفرت فرما دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ ہمارے مولیٰ ہیں، سو ہماری مدد فرمائیے کافر قوم کے مقابلہ میں۔

خطا اور نسیان کی معافی اور چند دُعاؤں کی تلقین

اعضاء و جوارح کے افعال دو قسم کے ہیں ایک اختیاری، دوسرے وہ جو بلا اختیار صادر ہوں بلا اختیار کی صورت ایسی ہی ہے جیسے رعشہ

کی وجہ سے ہاتھ ہر وقت حرکت کرتا ہو، جس کو یہ مرض ہو وہ ہاتھ کی حرکت کو روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یا جیسے سوتے میں زبان سے کچھ اُلٹی سیدھی بات نکل جائے۔ یہ بھی اختیاری نہیں ہے۔ امورِ غیر اختیاری پر گرفت نہیں ہے۔ جزا سزا امورِ اختیاریہ سے متعلق ہے۔ کسی کا بچہ فوت ہو گیا اس کو بے اختیار رونا آ گیا تو اس پر کوئی گرفت نہیں لیکن اگر زبان سے ایسے کلمات نکال دیئے جن سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوتا ہو تو ایسے کلمات کفریہ کلمات کے دائرے میں آ جاتے ہیں اور ان پر عذاب اور عتاب ہے۔

اسی طرح قلب کے اعمال بھی دو طرح کے ہوتے ہیں جو خیالات اور وسوسے غیر اختیاری طور پر آ جائیں اُن پر گرفت نہیں اور اپنے اختیار سے جو بات دل میں جمالے کفر کی بات ہو یا فسق کی تو اس پر گرفت ہے۔ کینہ، حسد، کسی گناہ کے کرنے کا پختہ عزم، کسی کو نقصان پہنچانے کا مضبوط ارادہ، یہ سب گرفت کی چیزیں ہیں اور محض وسوسہ اور خیال پر کوئی مواخذہ نہیں، آیتِ بالا میں اوّل تو یہ فرمایا کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے سب کچھ اس کی مخلوق بھی ہے اور مملوک بھی ہے، اُسے اپنی مخلوق کے بارے میں پورا پورا اختیار ہے، ان کے اعمال و افعال کے بارے میں تکوینی یا تشریعی طور پر جو بھی حکم فرما دے اُسے کوئی روکنے والا نہیں، اُس کے بعد افعالِ قلبیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو اللہ تعالیٰ اُس کا محاسبہ فرمائے گا۔ اِن افعال قلبیّہ میں جو لائقِ مواخذہ ہوں گے جس کے لئے چاہے معاف فرما دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا البتہ کفر و شرک کی کبھی بخشش نہ ہو گی جیسا کہ دوسری آیت میں اس کی تصریح ہے۔ اخیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ سب کا حساب لے سکتا ہے۔ بخش بھی سکتا ہے اور عذاب بھی دے سکتا ہے۔

آیت میں بظاہر اختیاری اور غیر اختیاری کی تفصیل نہیں ہے۔ اس لئے مضمونِ آیت پر مطلع ہو کر حضرات صحابۂ کرامؓ بہت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب تک تو ہمیں اُن اعمال کا حکم تھا جنہیں ہم کر سکتے تھے یعنی نماز اور روزہ، جہاد اور صدقہ اور اب یہ آیت نازل ہوئی ہے اِس پر عمل کرنے کی تو ہمیں طاقت نہیں (کیونکہ بلا اختیار وسوسے آ جاتے ہیں اگر اُن پر بھی پکڑ ہوئی تو ہمارا کیا بنے گا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم بھی وہی کہنا چاہتے ہو جو اہلِ کتاب یعنی توریت اور انجیل والوں نے کہا اُن کے پاس احکام آئے تو کہنے لگے، سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (کہ ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں) تم یوں کہو: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (ہم نے سنا اور مان لیا، اے ہمارے رب ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف جانا ہے) حضراتِ صحابہ دل اور زبان سے مان گئے اور بار بار ان کلمات کو دہرایا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے بعد والی آیتیں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ آخر سورت تک نازل فرمائیں۔ جن میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مؤمن بندوں کی تعریف فرمائی اور انہوں نے بخوشی جو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ کہا تھا قبولیت کے انداز میں نقل فرمایا اور حکم سابق کو جس میں بظاہر عموم تھا منسوخ فرما دیا اور بالتصریح فرما دیا کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (کہ اللہ تعالیٰ کسی جان کو ایسے کام کا مکلّف نہیں بناتا جو اُس کے بس میں نہ ہو)۔ (صحیح مسلم ص ۷۷ ج۱)

بعض حضرات نے اس پر اشکال کیا ہے کہ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا اس کو نسخ سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ درحقیقت یہ نسخ بالمعنی الحقیقی نہیں ہے۔ بلکہ ایضاحِ مجمل کو نسخ سے تعبیر فرما دیا ہے، نسخ کے قول سے احتراز کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ اِس کا تعلق سابق آیت سے ہے جس میں کتمانِ شہادت کا ذکر ہے، مطلب یہ ہے کہ عمل ظاہری طور پر کرو گے یا پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ اس کا حساب فرمالے گا۔ یعنی مؤاخذہ فرمائے گا۔ صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ حضرت شعبیؒ اور حضرت عکرمہؒ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس قول کو لیا جائے

تو نسخ لازم نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ نے لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ کے ساتھ ہی لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ بھی فرمایا ہے پہلے جملہ میں یہ بتایا ہے افعالِ غیر اختیار یہ پر مؤاخذہ نہیں ہے اور دُوسرے دونوں جملوں میں یہ بتایا کہ جو اچھا عمل اپنے اختیار سے کرو گے اُس پر اجر ملے گا اور جو کوئی کام ایسا کرو گے جس کی ممانعت ہے تو وہ وَبالِ جان ہوگا اور اُس پر مؤاخذہ اور محاسبہ کا قانون جاری ہوگا۔

یہ عموم افعالِ قلبیّہ کو بھی شامل ہو گیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ :وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (لیکن اللہ تمہارا مؤاخذہ فرمائے گا اُن چیزوں پر جنہیں تمہارے قلب نے کسب کیا) اور سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (بے شک کان، آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا) آیت کی تفسیر میں جو اعمال اختیار یہ اور غیر اختیار یہ کی تفصیل لکھی ہے اور جو صحابہؓ کے فکر مند ہونے پر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے ذریعہ عموم الفاظ سے مفہوم ہونے والے مضمون کا منسوخ ہونا مذکور ہوا اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ بلا اختیار جو وسوسے آجاتے ہیں اُن پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے اُن چیزوں کے بارے میں درگزر فرما دیا ہے جو اُن کے نفسوں میں آجائیں جب تک کہ اُن پر عمل نہ کریں یا زبان سے نہ کہیں۔ (صحیح مسلم ص ۷۸ ج۱)

انسان کے دل میں بہت سے خطرات گزرتے ہیں اور وسوسے آتے ہیں۔ بُرے بُرے خیالات کا ہجوم ہوتا ہے شیطان وسوسے ڈالتا رہتا ہے چونکہ یہ چیزیں اختیاری نہیں ہیں اس لئے اِن پر گرفت نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے پریشان بھی نہ ہوں اور فکر میں بھی نہ پڑیں۔ ہاں اگر بُرائی کا کوئی وسوسہ آیا پھر اس پر عمل کرلیا یا اپنے اختیار سے زبان سے کوئی بُرا کلمہ نکال دیا تو اس پر مؤاخذہ ہوگا کیونکہ یہ چیزیں دائرہ اختیار میں آگئیں۔ جو لوگ پکے مؤمن ہوتے ہیں۔ اِن کے دل میں ایسے وسوسوں کا آنا ہی خالص مؤمن کی دلیل ہے۔ صحیح مسلم ص ۷۹ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم اپنے نفسوں میں ایسی بات محسوس کرتے ہیں کہ جس کو زبان پر لانا بھاری معلوم ہوتا ہے آپ نے یہ سن کر سوال فرمایا کہ واقعی تم نے ایسا محسوس کیا ہے؟ عرض کیا: ہاں! محسوس کیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ یہ خالص ایمان ہے۔ سنن ابوداؤد ص ۳۴۱ ج ۲ میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے عرض کیا میں اپنے نفس میں ایسی چیز محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اُسے زبان سے نکالنے کی بنسبت کوئلہ ہو جانا زیادہ محبوب ہے یہ سن کر آپؐ نے فرمایا اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، پھر فرمایا کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے شیطان کی شرارت کو وسوسہ تک ہی رہنے دیا (اگر دِل سے مؤمن نہ ہوتے تو اِس بات کو بُرا کیوں جانتے اور زبان پر لانے کو کیوں بھاری چیز سمجھتے ، یہ بھاری سمجھنا اور کوئلہ ہو جانے کو محبوب جاننا سراسر ایمان ہے)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ شیطان تمہارے پاس آئے گا پھر کہے گا کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی ،فلاں چیز کس نے پیدا کی ،اس طرح کے کئی سوال کرتے ہوئے یوں کہے گا کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا سو جب تم میں سے کسی شخص کے ساتھ اس طرح کی صورت حال پیش آجائے تو اللہ کی پناہ مانگے اور وہیں رک جائے (وسوسہ کو اور سوال و جواب کو آگے نہ بڑھائے) دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ برابر آپس میں طرح طرح کے سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ بھی سوال کریں گے یہ (جو کچھ موجود ہے) اللہ کی مخلوق ہے اسے اللہ نے پیدا کیا ہے تو اللہ کو کس نے

پیدا کیا ہے؟ جو کوئی شخص ایسے سوالات میں سے کوئی چیز (اپنے اندر) محسوس کرے تو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (میں اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا) کہہ دے۔ (ایضاً)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے وسوسے آنے پر پڑھنے کے لئے یہ بتایا اَللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ اور فرمایا اس کے بعد بائیں طرف کو تین بار تھوک دے اور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھ لے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹)

پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو دُعا تلقین فرمائی کہ اس طرح دُعا مانگا کریں، جو متعدد جملوں پر مشتمل ہے اور ان میں متعدد دعائیں ہیں پہلے یہ دعا بتائی: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (اے ہمارے رب! ہماری گرفت نہ فرما۔ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے چوک ہو جائے) صاحبِ جلالین فرماتے ہیں کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ خطا اور نسیان پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوال کرنا اللہ تعالیٰ شانہٗ کی اس نعمت کا اقرار کرنا ہے کہ اُس نے بھول اور خطاء پر مواخذہ نہیں رکھا، خطا اُردو کے محاورہ میں گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں وہ معنیٰ مُراد نہیں ہیں بلکہ خطا سے وہ عمل مراد ہے جو بلا ارادہ کوئی عمل صادر ہو جائے۔ یاد رہے کہ مؤاخذہ ہونا نہ ہونا اور بات ہے اور خطا ونسیان سے بعض احکام کا متعلق ہونا دوسری بات ہے۔ خطا اور نسیان کے بارے میں جو بعض احکام ہیں عدم مؤاخذہ فی الآخرۃ سے ان احکام کی نفی نہیں ہوتی مثلاً نماز میں بھول کر کوئی شخص بول پڑا تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر خطاء کسی مؤمن کو قتل کر دے تو دیت اور کفّارہ واجب ہوگا۔

پھر ایک اور دعا تلقین فرمائی اور وہ یہ ہے: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا اس میں ارشاد فرمایا کہ بارگاہِ خداوندی میں یوں عرض کرو کہ اے ہمارے رب! ہم پر بھاری احکام کا بوجھ نہ رکھ جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں یعنی بنی اسرائیل پر رکھا تھا مثلاً توبہ قبول ہونے کے لئے اپنی جان کو قتل کرنا مشروط تھا اور زکوٰۃ میں چوتھائی مال نکالنا فرض تھا اور کپڑا دھو کر پاک نہیں ہو سکتا تھا اس کے لئے نجاست کی جگہ کو کاٹ دینا پڑتا تھا اور جب کوئی شخص چھپ کر رات کو گناہ کرتا تھا تو صبح کو اُس کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ اس نے فلاں گناہ کیا ہے اور بعض طیّبات اُن پر حرام کر دی گئی تھیں۔

کَمَا قَالَ تَعَالٰی حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَھُمْ. وَقَالَ تَعَالٰی وَعَلَی الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ (الآیۃ) اور نماز پڑھنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مسجد ہی میں نماز پڑھے اور مالِ غنیمت اُن لوگوں کے لئے حلال نہیں تھا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اُمتِ محمدیہ کے لئے آسانی فرمائی اور مشکل احکام مشروع نہیں فرمائے جو بنی اسرائیل پر فرض تھے۔ سورۂ اعراف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (وہ پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال فرماتے ہیں اور گندی چیزوں کو اُن پر حرام فرماتے ہیں اور اُن پر جو بوجھ اور طوق تھے اُن کو دُور کرتے ہیں)۔

مزید دعا تلقین فرماتے ہوئے ارشاد ہے: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ (اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو) اس سے تکالیف شرعیہ بھی مراد ہو سکتی ہیں اور مصائب تکوینیہ بھی اور دونوں بھی مراد لے سکتے ہیں۔ صاحبِ جلالین لکھتے ہیں: من التکالیف و البلایا اِس سے دونوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

آخر میں مختصر الفاظ میں چار دُعائیں اکٹھی تلقین فرمائیں وَاعْفُ عَنَّا (اور ہمیں معاف فرما) وَاغْفِرْ لَنَا (اور ہماری مغفرت فرما)

وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرما) اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (تو ہمارا مولیٰ یعنی ولی اور مددگار ہے۔ سو ہماری مدد فرما، کافر قوم کے مقابلہ میں)۔

صحیح مسلم ص ۷۸ ج ۱ میں ہے ہر ہر دُعا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب میں نَعَمْ کا جواب ملا، دُوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دُعا کے جواب میں قَدْ فَعَلْتُ فرمایا یعنی میں نے تمہارے سوال کے مطابق کر دیا یعنی تمہاری دُعائیں قبول ہو گئیں۔

صحیح مسلم ص ۹۷ ج ۱ میں یہ بھی ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔ (۱) پانچ نمازیں، (۲) سورۃ البقرہ کا آخری حصہ (اٰمن الرسول سے سُورت کے ختم تک)، (۳) آپ کی اُمت میں جو لوگ مشرک نہ ہوں۔ ان کے بڑے بڑے گناہوں کی بخشش کر دی گئی (گناہ کبیرہ محض اللہ کی رحمت سے یا توبہ سے یا بطورِ تطہیر و تمحیص عذاب بھگت کر معاف ہو جائیں گے اور اہلِ ایمان، ایمان کی وجہ سے جنت میں چلے جائیں گے۔ فاسق کو دائمی عذاب نہیں ہے کافر و مشرک کو دائمی عذاب ہوگا) قال النووی فی شرح صحیح مسلم والمراد واللہ اعلم بغفرانها انه لا یخلد فی النار بخلاف المشركين ولیس المراد انه لا یعذّب اصلا الخ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے اسی اثناء میں اُوپر سے ایک آواز سنی، انہوں نے اوپر کو سر اُٹھایا اور بتایا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ آج کھولا گیا ہے۔ جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا تو جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ فرشتہ زمین پر نازل ہوا ہے آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس فرشتے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ دونوروں کی خوشخبری سن لیں جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپؐ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ اوّل فاتحۃ الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ، دوم سورۃ البقرۃ کی آخری آیتیں (سورۂ فاتحہ اور یہ آیات دُعاؤں پر مشتمل ہیں) ان میں سے جو بھی کوئی حصہ آپؐ تلاوت کریں گے (جو سوال پر مشتمل ہوگا) تو اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو سوال کے مطابق عطا فرمائیں گے۔ (صحیح مسلم ص ۲۷۱ ج ۱)

مذکورہ بالا روایات سے سُورۃ البقرہ کی آخری دونوں آیات کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ آیات شبِ معراج میں عطا ہوئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اِن دُعاؤں کو قبول فرمالیا۔ صحیح بخاری ص ۷۵۵ جلد ۲ اور صحیح مسلم ص ۲۷۱ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الاٰیتان فی اٰخر سورۃ البقرۃ من قرأبهما فی لیلۃ كفتاه (یعنی جس نے کسی رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے کافی ہوں گی)

حضرات شراح حدیث نے کافی ہونے کے کئی مطلب لکھے ہیں اوّل یہ کہ پڑھنے والے کو تمام انسان اور جنات کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ہوں گی، دُوسرے یہ کہ ہر قسم کی آفات و مکروہات سے حفاظت رہے گی، تیسرے یہ کہ رات کو جو پڑھنے کی چیزیں ہیں وہ رہ گئیں تو ان کی جگہ کفایت کریں گی، اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ قیام اللیل یعنی رات کو نفل نمازوں میں قیام کرنے کے قائم مقام ہو جائیں گی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیه المرجع والمآب۔

ولقد من اللہ تعالیٰ باكمال تفسیر سورۃ البقرۃ علی ید هٰذا العبد الضعیف بالمدینۃ المنورۃ فی اواخر شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بحسن توفیقه و تیسیره وأرجو أن یوفقنی اللہ تعالیٰ لإتمام تفسیر كتابه كله والحمد للہ اولا واٰخرًا، والصلاۃ والسلام علی من جاء نا بكتاب اللہ تعالیٰ وأرسل طیبا وطاهرا،

وكانت مدة تاليفه من بدء سورة الفاتحة الى آخر سورة البقرة سنة فصاعدا والله ولى التوفيق وبيده أزمة التحقيق.

☆☆☆..................☆☆☆

مدنی	سورۃ آل عمران	۲۰۰ آیتیں ۲۰ رکوع

اٰيَاتُهَا ۲۰۰ (۳) سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ (۸۹) رُكُوْعَاتُهَا ۲۰

سورۂ آل عمران مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں دو سو آیات ہیں اور بیس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

الٓمّٓ: اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے قائم رکھنے والا ہے۔ اُس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ایسی کتاب جو

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ

اُن کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے تھیں، اور اس سے پہلے نازل فرمایا توریت کو اور انجیل کو جو لوگوں کے لیے ہدایت ہیں اور نازل

الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

فرمایا فرقان کو، بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ غلبہ والا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي

بدلہ لینے والا ہے۔ بے شک اللہ ایسا ہے کہ اُس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں۔ اللہ وہ ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے رحموں

الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

میں جس طرح چاہے، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، وہ غلبہ والا ہے، حکمت والا ہے۔

نصاریٰ کے ایک وفد سے گفتگو اور ان کی باتوں کی تردید

اسباب النزول میں ص ۹۰ اور معالم التنزیل میں ص ۲۷۷ ج اعلماء تفسیر سے نقل کیا ہے کہ نجران کے لوگ وفد کی صورت میں مدینہ منورہ آئے یہ لوگ نصاریٰ تھے ان کا یہ وفد ساٹھ افراد پر مشتمل تھا ان میں چودہ آدمی ایسے تھے جو اُن کی قوم کے سردار تھے اور ان میں سب سے بڑا ایک شخص عبدالمسیح نامی اور ایک شخص ابہم نامی تھا یہ بھی بڑا سردار تھا۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور مشرق کی طرف اُنہوں نے اپنی نماز پڑھی ان میں سے جو دو آدمی سب سے بڑے سردار اور قوم کے ذمہ دار تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی انہوں نے کہا کہ ہمارا دین تو اسلام ہی ہے، ہم آپ سے پہلے اس دین کو قبول کر چکے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا تم جھوٹے ہو دین

اسلام پر نہیں ہو (اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے دین اسلام ہی کو پسند فرمایا ہے اور اسی پر نجات کا مدار ہے دین اسلام میں سب سے بڑی دعوت، دعوتِ توحید ہے جو توحید والا نہیں وہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین پر نہیں ہو سکتا) تم لوگ دین اسلام والے کس طرح ہو سکتے ہو جبکہ تم اللہ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہو اور صلیب کی عبادت کرتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو انہوں نے کہا کہ اگر عیسیٰ اللہ کے بیٹے نہیں ہیں تو پھر ان کا باپ کون ہے اور اس طرح سے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کٹ حجتی کی اور بحثا بحثی میں اُن کے دوسرے لوگ بھی شریک ہو گئے۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے؟ کہنے لگے ہاں! یہ بات تو ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اس پر موت طاری نہ ہوگی اور (تمہارے عقیدہ کے مطابق) عیسیٰ کو موت آ چکی ہے۔ (کیونکہ اُن کے عقیدہ میں وہ مقتول ہو چکے ہیں اور اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ وہ قربِ قیامت میں تشریف لائیں گے اور وفات پائیں گے) وہ کہنے لگے ہاں! یہ بات بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم کئے ہوئے ہے سب کی حفاظت فرماتا ہے اور سب کو رزق عطا فرماتا ہے کہنے لگے ہاں ہم اس کو بھی مانتے ہیں! آپ نے فرمایا تو اب تم بتاؤ کیا عیسیٰ ان میں سے کسی چیز پر قدرت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں ان چیزوں پر وہ قادر نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں؟ کہنے لگے ہاں! ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا اب بتاؤ کیا عیسیٰ علیہ السلام کو اس سے زیادہ کچھ علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا؟ کہنے لگے اُن کو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں تھا! آپ نے فرمایا ہمارے رب نے رحمِ مادر میں عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بنا دی جس طرح چاہا۔ اور ہمارا رب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بتاؤ اس بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ کہنے لگے جو کچھ آپ نے فرمایا وہ صحیح ہے پھر آپ نے اُن سے سوال کیا کہ بتاؤ کیا عیسیٰ علیہ السلام ماں کے پیٹ میں نہیں رہے جیسا کہ اور بچے رہتے ہیں پھر اُن کی اسی طرح پیدائش ہوئی جیسا کہ دوسرے بچے پیدا ہوتے ہیں پھر بچوں کی طرح اُنہیں غذا دی گئی اور وہ کھاتے تھے اور پیتے تھے اور حالتِ حدث بھی اُن کو طاری ہوتی تھی وہ کہنے لگے کہ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے! آپ نے فرمایا پھر ایسے شخص کے بارے میں یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ پاک کا بیٹا ہو۔

یہ بات سُن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے اور اللہ جل شانہٗ نے سورۂ آلِ عمران کی ابتدائی آیات نازل فرمائیں جن کی تعداد اسّی سے کچھ اوپر ہے (ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں عقائد بیان فرمائے جن کے بغیر کوئی شخص مُوَحِّد اور مُسلِم نہیں ہو سکتا۔ درمیان میں مشرکین سے بھی خطاب فرمایا۔ اور اہلِ دنیا کے مرغوبات بیان فرما کر اُن کے مقابلہ میں آخرت کے انعامات بیان فرمائے۔ نیز ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف دین اسلام ہی معتبر ہے۔ حضرت مریم اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا بھی تذکرہ فرمایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا فرمانے کی بھی تصریح فرمائی۔ نیز اُن کے آسمان پر اُٹھائے جانے کا تذکرہ فرمایا اور آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اُن کو مباہلہ کی دعوت دیں۔ آپ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی تو وہ مقابلہ میں آنے سے عاجز ہو گئے۔ یہ مضامین اور ان کے ساتھ اور بہت سے اُمور ساتویں رکوع کے ختم تک بیان کئے گئے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران کی فضیلت......سورۂ آلِ عمران یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب پر حجت ناطقہ ہے اس میں ان سب سے خطاب فرمایا ہے اور اُن کو حق کی دعوت دی ہے اور اُن کے عقائد باطلہ کی خوب کھول کر تردید فرمائی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ کے بارے میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو خیالات باطلہ لوگوں نے اختیار کئے ہوئے تھے ان سب کا رد فرمایا۔

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن قرآن کو لایا جائے گا اور قرآن والوں کو بھی لایا جائے گا اور جو اس پر عمل کرتے تھے آگے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران ہوں گی جو دو بادلوں کی طرح یا دو سائبانوں کی طرح ہوں گی جن کا سایہ خوب زیادہ گھنا ہوگا اُن کے درمیان میں روشنی چمک رہی ہوگی۔ (رواہ مسلم ص ۲۷۰ ج ۱)

الٓـمّٓ ...... یہ حروف مقطعات میں سے ہیں جو متشابہات میں شمار کئے جاتے ہیں ان کا معنیٰ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان کیا گیا۔

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کی تفسیر ...... اَللّٰہُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اس میں اولاً اللہ جل شانہٗ کی توحید بیان فرمائی اور بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس سے تمام مشرکین کی تردید ہوگئی۔ ثانیاً اللہ جل شانہٗ کی دو بڑی اہم صفات ذکر فرمائیں یعنی الحی القیوم حَيٌّ یعنی زندہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اُسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ قَيُّـــــوْمٌ جو ساری مخلوق کو قائم رکھنے والا ہے اُسی نے سب کو پیدا فرمایا۔ وہی سب کی پرورش فرماتا ہے اُسی نے سب کا وجود باقی رکھا ہے وہ جب چاہے گا سب کو فنا کردے گا۔ اور وہ خود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ظاہر ہے کہ جو ذات ان صفات سے متصف ہے وہی عبادت کے لائق ہے، اور جس کا وجود پہلے نہ تھا بعد میں وجود ملا اور وہ وجود اُسے خالق و مالک جلّ مجدہٗ نے بخشا اور اپنی بقا میں وُہ اپنے خالق و مالک کا محتاج ہے وہ کسی طرح بھی معبود نہیں ہوسکتا۔ معبود صرف وہی ہے جو حیّ ہے اور قیوم ہے جو لوگ معبودانِ باطلہ کو مانتے ہیں اور اُن کی پرستش کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں اپنی بقا میں خالق تعالیٰ شانہٗ کی محتاج ہیں اور پہلے ان کا وجود بھی نہ تھا اور اُنہیں دنیاوی چیزوں کی حاجت ہے۔ یہ سب باتیں دیکھتے اور سمجھتے ہوئے ان باطل معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ ان کی حماقت ہے۔ لفظ الحی القیوم باری تعالیٰ شانہٗ کی صفات میں ذکر فرما کر تمام مشرکین کی پُوری پوری تردید ہوگئی۔

کتبِ سماویہ کا تذکرہ ...... نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اس آیت میں قرآن مجید اور توریت شریف اور انجیل شریف کے نازل فرمانے کا ذکر فرمایا ہے قرآن کے بارے میں فرمایا کہ وہ اُن سب کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے نازل کی گئیں اس میں یہود و نصاریٰ کی تالیفِ قلوب بھی ہے اور قرآن کے ماننے کی طرف دعوت بھی ہے۔ قرآن سے اور صاحبِ قرآن سے کیوں دُور بھاگتے ہو۔ یہ تو اُن کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جن کو تم مانتے ہو اور قرآن مجید اصولی طور پر عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ معاد کی دعوت دیتا ہے۔ اگر قرآن مجید تمہاری کتابوں کی مخالفت کرتا تو تم یہ بہانہ کرسکتے تھے کہ یہ ہمارے دین کے خلاف ہے، جس طرح انجیل نے توریت کی تصدیق کی۔ اسی طرح قرآن توریت اور انجیل کی اور تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے نیز قرآن کے نزول سے متعجب نہیں ہونا چاہیے اس سے پہلے توریت اور انجیل نازل ہوچکی ہیں جن کو تم تسلیم کرتے ہو۔ جس ذات پاک نے ان دونوں کو نازل فرمایا اُسی نے قرآن مجید نازل فرمادیا۔

توریت اور انجیل کے بارے میں هُدًى لِّلنَّاسِ فرمایا جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں بھی سورۂ بقرہ ع ۲۲ میں هُدًى لِّلنَّاسِ فرمایا۔ توریت انجیل لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اسی ہدایت میں یہ بھی ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے اُن پر ایمان لانا اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۝ (الآیۃ)۔

فرقان سے کیا مراد ہے؟ ...... پھر فرمایا وَاَنْـــزَلَ الْفُرْقَانَ لفظ الفرقان فعلان کے وزن پر ہے، جس کا معنی ہے فرق کرنے والی چیز۔

یہاں الفرقان سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں صاحبِ رُوح المعانی نے ص ۷۷ ج ۳ میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ حضرت قتادہ تابعی کا ارشاد ہے کہ الفرقان سے قرآن مراد ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے اس میں حلال و حرام حدود اور فرائض طاعت اور معصیت کو خوب اچھی طرح واضح فرما دیا ہے پہلے اس کی تنزیل کا ذکر فرمایا پھر اس کی صفت بیان فرمائی کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے تمام کُتبِ الٰہیہ مراد ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے زبور مراد ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی مشہور چار کتابوں میں سے تین کتابوں کا ذکر فرما کر وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ میں زبور شریف کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض حضرات کا ارشاد ہے کہ الفرقان سے معجزات مراد ہیں جن کے ذریعہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی تائید اور تصدیق ہوتی رہی اور حق اور باطل میں فرق ظاہر ہوتا رہا۔

منکرین کے لئے وعید: توحید اور رسالت کے بیان کے بعد منکرین کے لئے وعید ذکر فرمائی اور فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ کہ جنہوں نے اللہ کی آیات کے ساتھ کُفر کیا اُن کے لئے سخت عذاب ہے پھر فرمایا: وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ۞ کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور جسے چاہے عذاب دے سکتا ہے۔ عزیز کے ساتھ ذو انتقام بھی فرمایا کہ وہ مجرموں کو سزا دینے والا ہے اور اُسے پوری پوری طاقت اور قوّت ہے، کوئی مُجرم اُس کے علم سے باہر نہیں اور اس کے فیصلے سے کسی کو کوئی مفر نہیں۔

اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں...... اس کے بعد اللہ تعالیٰ شانہٗ کے علم کی وسعت بیان فرمائی اور فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؕ یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ارض و سماء (آسمان و زمین) سے پورا عالم مراد ہے آسمان و زمین کے علاوہ بھی مخلوقات ہیں اُن میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں آسمان و زمین چونکہ نظروں کے سامنے ہیں اور عام طور سے لوگ انہیں جانتے ہیں اس لئے ان کا ذکر فرما دیا۔ وھٰذا من اطلاق الجزء و ارادۃ الکل۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مغیبات کا علم اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جو کسی کو عطا فرما دیا (جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہ لوگوں کو ان کے گھروں میں رکھی ہوئی چیزیں بتا دیتے تھے) اس سے معبود ہونا لازم نہیں آتا۔ معبودِ حقیقی وہی ہے جس کے علم سے کوئی بھی چیز باہر نہ ہو۔

قال صاحب الروح فی بیان ذٰلک تنبیہ علٰی ان الوقوف علی بعض المغیبات کما وقع لعیسی علیہ السلام بمعزل من بلوغ رتبۃ الصفات الالٰھیہ ۔ (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں اس کے بیان میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ بعض غیب کی چیزوں پر اطلاع پالینا صفات الٰہیہ کے مرتبہ کو پہنچنا نہیں ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے واقع ہو گیا تھا)

اللہ جیسے چاہے رحمِ مادر میں تصویر بنا تا ہے...... پھر اللہ جل شانہٗ کی ایک اور خاص صفت بیان فرمائی اور فرمایا: ھُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو ماؤں کے رحموں میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بنا دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جسے موحد اور مشرک سب ہی مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے ماؤں کے رحموں میں تصویریں بنا دیتا ہے کسی کے اعضاء صحیح سالم ہیں کسی میں نقص، کوئی کالا ہے کوئی گورا ہے، کوئی مذکر ہے کوئی مؤنث ہے، کسی کی ناک اونچی ہے اور کسی کی ناک پھڈی ہے، کسی کے ہونٹ موٹے ہیں اور کسی کا ہاتھ ٹیڑھا ہے، کان تو ہیں مگر بہرا پیدا ہوا، زبان تو ہے مگر گونگا ہے اور اس طرح کی کتنی چیزیں ہیں

نہ باپ کچھ کرسکتا ہے نہ ماں کچھ کرسکتی ہے نہ پیدا ہونے والا کوئی طاقت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ جیسی صورت بنا دے اُسی صورت میں عالمِ دنیا میں انسانوں کے بچے ظہور پذیر ہوجاتے ہیں اور انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق کا بھی یہی حال ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنی صورت خود نہیں بنا سکتا وہ کیا معبود ہوسکتا ہے۔ خالق و مالک نے اس کی جیسی صورت بنادی وہ مجبور ہے کہ اُسی صورت میں رہے اُسے یہ مرتبہ کہاں حاصل ہوسکتا ہے کہ اُس کی عبادت کی جائے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے والوں کی بھی واضح تردید ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خود پیدا ہوئے نہ اپنی صورت بنا سکے ان کو خدا ماننا سراسر گمراہی ہے آخر میں فرمایا لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اس میں پھر مضمون توحید کا اعادہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اللہ عزیز اور حکیم ہے۔ اس کی قدرت سے کوئی باہر نہیں اور جو کچھ وجود میں ہے سب اُس کی حکمت کے موافق ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ

اللہ وہ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس میں آیات محکمات ہیں جو اُمّ الکتاب ہیں اور دوسری

مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ

آیات متشابہات ہیں سو وہ لوگ جن کے دِلوں میں کجی ہے وہ اُن کے پیچھے پڑتے ہیں جو قرآن میں متشابہات ہیں فتنہ تلاش

تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ

کرنے کیلئے اور اس کا مطلب تلاش کرنے کیلئے، اور نہیں جانتا اسکے مطلب کو مگر اللہ، اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

رب کی طرف سے ہے اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے۔

(وقف النبی ﷺ وقف لازم وقف منزل)

محکمات اور متشابہات کا مطلب

اس آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات محکمات ہیں اور بہت سی آیات متشابہات ہیں اور بعض آیات میں تمام آیات کو محکم بتایا ہے جیسا کہ سورۂ ہود میں فرمایا ہے۔ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ اور بعض جگہ پورے قرآن کو متشابہ فرمایا جیسا کہ سورۂ زُمر میں فرمایا: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ان مواقع میں محکم اور متشابہ کا وہ معنی مراد نہیں ہے جو سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت میں مُراد ہے جو ابھی مذکور ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پورا قرآن محکم اس اعتبار سے ہے کہ وہ سارا حق ہے لفظی اور معنوی اعتبار سے بالکل صحیح ہے کسی بھی جگہ کسی طرح کا اس میں اشکال نہیں ہے اس کے الفاظ اور معنی سب ہی محکم مضبوط اور مربوط ہیں، اور جہاں پورے قرآن کو متشابہ فرمایا وہاں یہ مراد ہے کہ قرآن مجید کی آیات آپس میں متشابہ ہیں اس کے معنی حُسن اور خوبی میں، حق اور صادق ہونے میں ایک دوسرے سے تشابہ رکھتے ہیں۔

یہاں (سورۂ آلِ عمران میں) محکمات سے وہ آیات مراد ہیں جن کا مطلب بالکل ظاہر اور واضح ہے۔ نیز یہ آیات اُم الکتاب یعنی اصل الاصول ہیں جن کے معانی و مفاہیم میں کوئی اشتباہ نہیں ان میں اوامر و نواہی ہیں اور احکام ہیں جو بالکل واضح ہیں ان کے جاننے اور

سمجھنے میں کوئی اشتباہ والتباس نہیں اگر کسی آیت میں کوئی ابہام یا اجمال ہو تو اس کے مفہوم کو بھی انہی محکمات یعنی اصل الاصول کی طرف راجع کر دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی آیات یعنی متشابہات سے وہ آیات ہیں جن میں صاحب کلام کی مراد ہمیں معلوم نہیں۔ ان آیات کو متشابہات کہا جاتا ہے۔

راسخین فی العلم کا طریقہ......ان کے بارے میں راسخین فی العلم کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے مفہوم کو آیات محکمات کے مفاہیم کی طرف لوٹا دیتے ہیں جو معنی آیات محکمات کے خلاف پڑے اس کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیاتِ محکمات کے خلاف نہ ہو اور کوئی ایسی تاویل اور توجیہ صحیح نہ سمجھی جائے جو اصول مسلمہ اور آیاتِ محکمہ کے خلاف ہو۔ آیات متشابہات کا صحیح مطلب وہی تسلیم کیا جائے جو اللہ کے نزدیک ہے یہ اسلم ترین راستہ ہے۔ بہت سے لوگ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے اور چونکہ ان کے دلوں میں کجی ہے اس لئے آیات محکمات کے واضح بیانات کو چھوڑ کر متشابہات کے معانی سمجھنے اور کریدنے کے نامبارک شغل میں لگ جاتے ہیں اور فتنہ گری کے لئے ان کے وہ مفاہیم تجویز کرتے ہیں جو ان کی خواہشوں اور افکار و آراء کے موافق ہوں۔ اگرچہ ان کی یہ تاویل آیاتِ قرآنیہ محکمہ کے خلاف ہی ہو۔

بہت سے وہ لوگ جو منکرینِ حدیث تھے منکرینِ قرآن بن گئے۔ کیونکہ وہ لوگ متشابہات کے پیچھے لگے اور ان کے دل کی کجی نے ان کو قرآن پاک سے دُور کر دیا۔ قرآن میں جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اور يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ اور جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ وارد ہوا۔ راسخین فی العلم ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور سمجھے بغیر ان کے معانی اور مفاہیم کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا جو مطلب اللہ کے نزدیک ہے وہی ہمارے نزدیک ہے اسی کو فرمایا وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ط كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا کہ جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ جو لوگ قرآنی تعلیمات کا مرکز اور محور آیاتِ محکمات کو مانتے ہیں اور متشابہات کے بارے میں اپنے علم کے قصور کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے حقیقی معانی کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے یوں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کا جو مفہوم اللہ کے نزدیک ہے ہم اسے تسلیم کرتے ہیں اس پر ہمارا ایمان ہے۔

جب امام مالک رحمہ اللہ سے اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ المعنی معلوم والکیف مجھول والایمان بہ واجب والسوال عنه بدعة (معنی معلوم ہے اور کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے (معنی کے) بارے میں سوال کرنا بدعت ہے)۔

نقائص اور عیوب سے اور تجسیم و تعطیل سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرنا بھی واجب ہے اور جو کچھ وارد ہوا ہے اس پر ایمان لانا بھی واجب ہے تاکہ متشابہات کے ان مفاہیم پر بھی ایمان ہو جائے جو اللہ کے نزدیک ہیں اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے خلاف بھی عقیدہ نہ ہو جائے۔ بہت سے لوگ متشابہات کے ظاہری معانی لیتے ہیں اور لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کو بھول جاتے ہیں یہ اتباع ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کی تفتیش میں لگے ہوئے ہوں تو ان سے پرہیز کرو۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، لہٰذا ان سے پرہیز کرو۔ (صحیح بخاری ص ۶۵۲ ج ۲)

''ای ذکرھم فی قوله فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ط''

بعض علماءِ اصول نے فرمایا کہ متشابہات اہلِ علم کے ابتلاء کے لئے ہیں، جن کا تفتیش اور تلاش کا مزاج ہوتا ہے ان کا ابتلاء اس میں

ہے کہ بس رُک جاؤ آگے نہ بڑھو اور جن لوگوں کو علم کا ذوق نہیں ان کا ابتلاء اس میں ہے کہ ان کو ترغیب دے دیگر علم پر لگایا جائے اور آیاتِ محکمات کے سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے پر آمادہ کیا جائے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ

اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو کج نہ کر دیجئے اسکے بعد کہ آپ نے ہم کو ہدایت دی، اور ہمیں اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا فرمایئے، بے شک

اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا

آپ بہت بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔ اے ہمارے رب! بیشک آپ لوگوں کو اس دن میں جمع فرمانے والے ہیں جس میں کوئی شک نہیں۔ بیشک اللہ

يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹

وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔

راسخین فی العلم کی دعاء

ان دونوں آیتوں میں ان لوگوں کی دُعا نقل فرمائی ہے جنہیں رسوخ فی العلم حاصل ہے۔ وہ یوں دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! آپ نے ہم کو ہدایت عطا فرمائی ہے۔ ہم کو ہدایت پر ہی رکھئے ہمارے دلوں میں کجی اور ٹیڑھا پن پیدا نہ فرمایئے۔ جو لوگ دلوں کی کجی کی وجہ سے متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں ہمیں اُن میں سے نہ کیجئے اور اپنے پاس سے ہمیں بڑی رحمت عطا فرمایئے۔ یہ رحمتِ عامہ ہمیں دنیا میں بھی شامل ہو اور آخرت میں بھی شامل ہو۔ ہمارا ایمان محکمات پر بھی رہے اور متشابہات پر بھی رہے۔ درحقیقت یہ دُعا بہت اہم ہے اور یہ دعا برابر کرتے رہنا چاہیئے۔ بہت سے لوگوں نے ہدایت اختیار کرنے کے بعد گمراہی اختیار کر لی فتنہ گروں کے اتباع میں لگ گئے اور فتنہ میں پڑ گئے اور ایمان کھو بیٹھے اور ہدایت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ بنی آدم کے دل سب کے سب رحمان کے قبضہ میں ہیں وہ جیسے چاہے پھیر دے۔ پھر آپؐ نے یہ دُعا کی۔

اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۰)

(اے اللہ! دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی فرمانبرداری پر لگائے رکھ)

راسخین فی العلم کی دوسری دعا یہ نقل فرمائی کہ اے ہمارے رب! آپ سب لوگوں کو ایسے دن میں جمع فرمائیں گے جس میں کوئی شک نہیں ہے آپ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے جو سچا وعدہ ہے، قیامت کا دن ضرور آئے گا اور تمام لوگ اس میں ضرور جمع ہوں گے۔

اس دعا میں اپنی حاجت اصلیہ کا اظہار کر دیا جو دن واقعی حاجت مندی کا ہے اس دن کی خیر طلب کی۔ کما قال صاحب الروح ص ۹۱ ج ۳ و مقصودهم من هذا كما قال غير واحد عرض كمال افتقارهم الى الرحمة وأنها المقصد الاسنى عندهم والتاكيد لاظهار ماهم عليه من كمال الطمانينة وقوة اليقين باحوال الأخرة لمزيد الرغبة فى استنزال طائر الاجابة ۔ (مومنین کا مقصود اس دعا سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف اپنے کمال احتیاج کو بیان کرنا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ان کا مقصدِ اعظم ہے۔ اور اپنی اس عرض کو نزول اجابت میں مزید رغبت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اپنے کامل اطمینان اور احوال آخرت

پر کامل یقین کے اظہار کے ذریعے مؤکد کرنا ہے)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے مال اور اولاد اللہ کے نزدیک کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، اور یہ لوگ وہ ہیں جو

هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ

دوزخ کا ایندھن ہیں۔ ان کا طریقہ وہی ہے جو آل فرعون کا اور اُن لوگوں کا تھا جو اُن سے پہلے تھے، ان لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا،

فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

سو اللہ نے اُن کو پکڑ لیا ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔

آخرت میں اموال واولاد کام نہیں آئیں گے

اہلِ کفر اپنے مالوں پر اور اولاد پر بہت فخر کرتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ چیزیں ہمارے لئے بہت فائدہ مند ہیں دنیا میں کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا ہے اُن کا خیالِ خام یہ ہے کہ آخرت میں بھی مال اور اولاد سے کام چلے گا اور اللہ کے عذاب سے یہ چیزیں ہم کو بچا لیں گی۔ سورۂ سبا رکوع ۴ میں کافروں کا قول نقل فرماتے ہوئے ارشاد ہے وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ٥ (اور انہوں نے کہا ہم زیادہ مال اور اولاد والے ہیں اور ہم کو عذاب ہونے والا نہیں ہے)

جب آخرت میں کفر پر عذاب ہوگا تو وہاں مال تو ہونے ہی کا نہیں۔ اگر مال ہو بھی تو جان کے بدلے میں قبول نہیں ہوسکتا جیسا کہ اسی سورت کے رکوع ۹ میں فرمایا إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ط أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ ٥ (بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ اس حالت میں مر گئے کہ کافر تھے سو ہرگز اُن میں سے کسی کی طرف سے بھی زمین بھر کر سونا قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اپنی جان کا بدلہ دینا چاہے، اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اور اُن کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا)۔

یہ تو مال کے بارے میں ارشاد فرمایا اور اولاد کے بارے میں سورۂ عبس میں فرمایا کہ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ط لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ

(جس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے، ہر شخص کی الگ الگ حالت ہوگی جو دوسروں کی طرف متوجہ کرنے سے بے نیاز کر دے گی)۔

ان حالات میں یہ اُمید رکھنا کہ جس طرح مال واولاد سے دنیا میں کام چل جاتا ہے آخرت میں بھی کام چل جائے گا سراپا حماقت اور بے وقوفی ہے اور جھوٹی آرزو ہے جنہوں نے کفر کیا اور کفر پر مرے اُن کو دوزخ میں جانا ہی ہوگا اور وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کا حال اور طور طریق وہی ہے جو آلِ فرعون کا تھا۔ اور جو اُن لوگوں کا تھا جو اُن سے پہلے تھے اُن لوگوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کے گناہوں کے سبب گرفت فرمالی۔ دنیا میں بھی اُن پر عذاب آئے اور آخرت میں بھی اُن کے لئے عذاب ہی عذاب ہے۔

قوله تعالىٰ مِنَ اللهِ شَيْئًا قال الكلبي من عذاب الله وقال ابو عبيدة من بمعنى عند اى عندالله۔ (معالم التنزیل ص۲۸۱ ج۱)
علامہ کلبی فرماتے ہیں۔ من اللّٰہ شیئا سے مراد من عذاب اللّٰہ (اللہ کے عذاب سے) ابوعبیدہؒ فرماتے ہیں۔ یہاں من عند کے معنی میں ہے یعنی (اللہ کے ہاں)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ

آپ اُن لوگوں سے فرما دیجئے جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اور جمع کئے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور بُرا بچھونا ہے۔ بلاشبہ تمہارے

كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى

لئے نشانی تھی اُن دو جماعتوں میں جو آپس میں مقابل ہوئیں ایک جماعت لڑ رہی تھی اللہ کی راہ میں، اور دوسری جماعت کافر تھی،

كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ

وہ دیکھتی آنکھوں مسلمانوں کی جماعت کو دوگنی دیکھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہے تائید فرماتا ہے، بلاشبہ اس میں ضرور بڑی

ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو آنکھوں والے ہیں۔

یہودیوں کو نصیحت کہ واقعۂ بدر سے عبرت لیں

روح المعانی میں ص ۹۴ ج ۳ بحوالۂ بیہقی وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں فتحیابی ہوئی تو آپؐ نے بدر سے واپس ہو کر یہودیوں کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع فرمایا اور فرمایا کہ اے یہودیو! اسلام قبول کر واس سے پہلے کہ تم کو بھی وہی مصیبت پہنچ جائے جو قریش کو پہنچی، یہ سن کر یہودیوں نے کہا کہ اے محمد! (ﷺ) تم اس دھوکے میں نہ رہو کہ تم نے قریش کے چند ایسے افراد کو قتل کر دیا جو اناڑی ناتجربہ کار تھے جنگ کرنا نہیں جانتے تھے، تم یہ خیال نہ کرو کہ ہمارے مقابلہ میں بھی کامیاب ہو جاؤ گے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے ہم سے جنگ کی تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم ہم ہیں، اُن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات نازل فرمائیں اور اُن کو بتا دیا کہ تم نے بھی کُفر اختیار کر رکھا ہے تم بھی عنقریب مغلوب ہو گے۔ (یہ گیدڑ بھبکیاں اور دھمکیاں کچھ کام نہ آئیں گی) دنیا میں مغلوب و مقتول ہو گے اور آخرت میں بھی دوزخ میں جمع کر دیئے جاؤ گے دوزخ بہت بُرا بچھونا ہے وہاں کی جو آگ ہے اُسی پر پڑے رہو گے اور جلتے رہو گے۔

یہودیوں کی ڈھٹائی...... یہودیوں نے بہت بڑی بھبکی دی لیکن بالآخر مغلوب ہوئے بنی قریظہ مقتول ہوئے اور بنی نضیر کو خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد وہاں بھی اُن پر مسلمان حملہ آور ہوئے اور اُن کے قلعے فتح ہوئے اور اُن سے یہ معاہدہ ہوا کہ کھیتی باڑی کرتے رہیں اور کھجور کے باغوں میں کام کریں اور جو پیداوار ہو اس کا مخصوص حصہ مسلمانوں کو دیا کریں۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اُن کو خیبر سے بھی نکال دیا گیا۔ یہ دُنیا میں اُن کی مغلوبیت ہوئی اور آخرت میں تو ہر کافر کے لئے جہنم ہے ہی۔

غزوۂ بدر کا منظر...... یہودیوں کو اللہ رب العزت نے توجہ دلائی اور فرمایا کہ تمہارے لئے عبرت ہے اور اس بات کی نشانی ہے کہ مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے اور یہ عبرت بدر کے معرکے سے تم کو لے لینی چاہیے۔

بدر میں دو جماعتیں مقابل ہوئیں ایک جماعت مسلمانوں کی تھی جو اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے تھے اور دوسری جماعت کافروں کی تھی یہ قریش مکہ تھے مسلمان تعداد میں تھوڑے سے تھے ان کی تعداد ۳۱۳ تھی جن میں ۷۷ مہاجرین اور ۲۳۶ انصاری تھے ان کے پاس ستر اونٹ تھے ہر تین آدمیوں کو ایک اونٹ دیا گیا تھا جو اُترتے چڑھتے نمبر وار سفر کرتے تھے دو گھوڑے تھے اور چھ زرہیں تھیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ مدینہ منورہ سے بدر کا سفر تھا جو سو میل ہے پہاڑی راستہ تھا اس کو گزار کر بدر میں پہنچے۔

مشرکین مکہ کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا تھی اُن میں ۹۰۰ لڑنے والے تھے اور عورتیں ان کے علاوہ تھیں یہ لوگ بڑے طمطراق سے گاتے بجاتے ہوئے کھانے پینے کا بہت زیادہ سامان لے کر بدر پہنچے۔ ان کے ساتھ سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے جب جہاد ہوا تو مشرکین مکہ میں سے ستر آدمی مقتول ہوئے اور ستر افراد کو قید کر کے مدینہ منورہ لایا گیا اور مسلمانوں میں سے چھ مہاجرین اور آٹھ انصاری شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کئی طرح مدد فرمائی۔ ایک صورت مسلمانوں کی مدد اور تائید کی یہ ہوئی کہ مشرکین مکہ مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے (یہ اُس صورت میں ہے جب مِثْلَيْهِمْ کی ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہو) سورۂ انفال میں فرمایا ہے:

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِالْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا

(اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تمہاری مڈبھیڑ ہونے کے وقت تمہاری آنکھوں میں اُن کو کم دکھا رہا تھا اور تم کو اُن کی آنکھوں میں کم دکھا رہا تھا)

دونوں آیات کا مضمون ملانے سے معلوم ہوا کہ جنگ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی آنکھوں میں مسلمانوں کو اُن کی اپنی تعداد سے کم دکھایا تاکہ مشرکین میں جنگ کرنے کی جرأت بڑھ جائے اور زیادہ تعداد دیکھ کر واپس نہ ہو جائیں پھر جب جنگ شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو مسلمانوں کی اصل تعداد سے زیادہ دکھایا (وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان ہم سے دوگنے ہیں) اور مسلمانوں کی آنکھوں میں مشرکین کی تعداد کم دکھائی تاکہ مسلمان خوب زیادہ جرأت سے لڑیں اور مشرکین بزدل ہو جائیں۔ آیت کی تفسیر میں علماء کا یہ ایک قول ہے جسے صاحب معالم التنزیل نے (ص ۲۸۳ ج ۱) نقل کیا ہے۔

صاحبِ رُوح المعانی نے بھی (ص ۹۶ ج ۲) میں یہ قول ذکر کیا ہے۔ وقال و کان ذٰلک عند تدانی الفئتین بعد ان قللهم اللہ تعالٰی فی اعینهم عند الترائی لیجترء وا علیهم ولا یرهبوا فیهربوا حیث ینفع الهرب۔ (فرمایا اور یہ دونوں لشکروں کے قریب ہونے کے وقت ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بعد ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں کی نظروں میں قلیل دکھلایا تاکہ مسلمان کافروں پر بہادر ہو جائیں اور پیٹھ نہ پھیریں اور کافر بھاگ کھڑے ہوں۔ جس وقت کہ ان کا بھاگنا مسلمانوں کے لئے مفید ہو)

اِذِالْتَقَيْتُمُوْهُمْ کو سامنے رکھ کر یوں کہا جائے گا کہ جب ابتدائی مقابلہ کے لئے فریقین آمنے سامنے آئے تو مشرکین مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور جب بالکل ہی مڈبھیڑ ہونے لگی تو وہ مسلمانوں کو کم دیکھ رہے تھے اور مسلمان اُن کو کم دیکھ رہے تھے لفظ تدانی اور ترائی جو صاحب روح المعانی اپنی عبارت میں لائے ہیں اُس سے یہ معنیٰ مفہوم ہوتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے بعض علماء سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ يَرَوْنَ کی ضمیر مرفوع سے مؤمنین مراد ہیں اور ضمیر منصوب کافروں کی طرف راجع ہو۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہو گا کہ مؤمنین کافروں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ اُن سے تین گُنا تھے اور اُن کو دوگنا اسلئے دکھایا کہ انہیں اپنی فتح کا اطمینان رہے کیونکہ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ میں اللہ تعالیٰ کا ان سے وعدہ تھا کہ اپنے سے دوگنوں پر غالب ہوں گے۔

علامہ صاوی نے فرمایا ہے کہ فاعل اور مفعول کے ضمیروں کے احتمالات کو دیکھتے ہوئے معنوی اعتبار سے چار صورتیں بنتی ہیں یعنی

(۱) یشاھد المومنون الکفار قدر انفسھم مرّتین (مؤمنین کفار کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے)

(۲) یری المؤمنون الکفار قدر الکفار مرتین محنۃً لھم. (مؤمنین کفار کو ان کی تعداد سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور ایسا مؤمنین کی آزمائش کیلئے تھا)

(۳) یری الکفار المؤمنین قدرھم مرّتین. (کفار مؤمنین کو ان کی تعداد سے دوگنا دیکھ رہے تھے)

(۴) یری الکفار المؤمنین قدر المؤمنین مرّتین. (کفار مؤمنین کو ان کی تعداد سے دوگنا دیکھ رہے تھے)

یہ سب احتمال ہو سکتے ہیں لیکن دوسرا احتمال بعید معلوم ہوتا ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بمرادہٖ پھر فرمایا وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے ساتھ جس کی چاہے تقویت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے ۳۱۳ بے سروسامان جماعت کو ہزاروں افراد کے لشکر پر غالب فرمایا جبکہ اس مغلوب ہونے والے لشکر کے پاس خوب زیادہ ہتھیار تھے۔ سب لڑنے والے مسلح تھے اور کھانے پینے کا سامان بھی خوب تھا اور ہر طرح کی آسائش تھی۔ یہودیوں نے اس بھرپور مدد کو نہ دیکھا اور عبرت حاصل نہ کی۔ بلکہ اُلٹا اثر لیا اور کہنے لگے کہ وہ تو اناڑی لوگ تھے جو جنگ میں ہار گئے۔ ہم سے پالا پڑا تو پتہ چلے گا کہ لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔

درحقیقت جب ظاہری باطنی بینائی کو کام میں نہ لایا جائے اور قصداً کوئی شخص اندھا بنے تو وہ ہلاک ہی ہو کر رہتا ہے اسی کو فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ○ کہ بدر کے واقعہ میں بصارت اور بصیرت رکھنے والوں کے لئے بہت بڑی عبرت ہے، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہودی قصداً اندھے بنے ہوئے ہیں بصیرت سے کام نہیں لیتے عقل اور سمجھ کو کام میں لاتے تو مشرکین مکہ کی شکست دیکھ کر جو سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ تھا اسلام قبول کر لیتے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

خوش نما بنا دی گئی ہے لوگوں کے لئے خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور بڑے بڑے بھاری مال

الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ

سونے کے اور چاندی کے، اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیا والی زندگی

الدُّنْیَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

کا فائدہ اٹھانا ہے اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ۔

لوگوں کے لئے دُنیاوی مرغوبات مزیّن کر دی گئی ہیں

اس آیتِ کریمہ میں اجمالی طور پر انسانوں کی مرغوب چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ چیزیں چونکہ انسان کو مرغوب اور محبوب ہیں اور ایمان قبول کرنے کی صورت میں بظاہر ان چیزوں کا ضائع ہونا نظر آتا ہے اس لئے عموماً اہل کفر ایمان قبول نہیں کرتے۔ یہودیوں کے سامنے بھی یہی چیزیں تھیں جو ایمان سے مانع تھیں یہ انسان کی بیوقوفی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے دین پر چلوں گا تو نعمتیں چھن جائیں گی۔

حالانکہ ایمان کیوجہ سے نعمتیں زیادہ ملتی ہیں یہ بات اور ہے کہ کچھ دن کے لئے بطور امتحان کچھ تکلیف پہنچ جائے۔
خواہش کی چیزیں جو انسان کو مرغوب ہیں وہ بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں ان چیزوں میں عورتیں بھی ہیں بیٹے بھی، اور بھاری تعداد میں اموال بھی ہیں۔ (یہ اموال سونے چاندی کی صورت میں ہیں) اوران میں نشان لگائے ہوئے گھوڑے بھی ہیں اور مویشی بھی اور کھیتیاں بھی۔ ان چیزوں سے انسان خوش ہوتے ہیں اور جس کے پاس یہ چیزیں ہوں اُس کو دُنیاوی اعتبار سے بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں چندروزہ ہیں دُنیاوی زندگی میں ان سے تھوڑا سا فائدہ اُٹھالیا جاتا ہے اور آخرت میں تو صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ ہی کام آئیں گے اسی کو فرمایا ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ انسان کو چاہیئے کہ اپنی آخرت کی فکر کرے ایمان اور اعمالِ صالحہ سے آراستہ ہو تا کہ دارِ آخرت میں اچھا ٹھکانہ نصیب ہو۔

اَلْقَنَاطِيْر ...... یہ قنطار کی جمع ہے عربی میں قنطار مالِ کثیر کو کہتے ہیں پھر اس کو المقنطرہ سے موصوف فرمادیا۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ خوب بڑے بڑے مال۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں ظِلٌّ ظَلِيْلٌ اور لَيْلٌ اَلْيَلُ ۔ مبالغہ کے معنی ظاہر کرنے کے لئے القناطیر المقنطرة فرمایا۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قنطار کا معنی پوچھا گیا تو آپ نے بارہ ہزار اوقیہ بتایا۔ ایک اوقیہ چالیس درہم چاندی کا ہوتا تھا (ایک درہم ۳ ماشہ ایک رتی اور ۱/۵ رتی کا) دورِ حاضر کے اعتبار سے القناطیر المقنطرہ کا معنی نوٹوں کے گڈے کہا جاسکتا ہے۔

اَلْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ ...... (نشان زدہ گھوڑے) اہلِ عرب گھوڑے پر کچھ نشان لگالیا کرتے تھے اس لئے مُسَوَّمَةٌ فرمایا۔
اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ لفظ تسویم سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے جانوروں کو چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑ دینا اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ایسے گھوڑے جو چراگاہوں میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے اَلْمُسَوَّمَةُ کا معنی المطھمة الحسان کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے گھوڑے جو جسمانی اعتبار سے خوب اچھی طرح صحیح اور تندرست ہوں اور خوبصورت ہوں۔

وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ...... پھر مویشیوں کا ذکر فرمایا اور اُن کو لفظ ''الانعام'' سے تعبیر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ اونٹ، گائے، بکری وغیرہ بھی لوگوں کو مرغوب ہیں جس کے پاس یہ چیزیں زیادہ ہوتی ہیں عام طور سے اُسے گاؤں کا بڑا اور چودھری مانا جاتا ہے جب صبح کو مویشی چرنے کے لئے جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں اس وقت چودھری صاحب کے نشہ کا کیا پوچھنا، اپنے جانوروں کو دیکھ دیکھ کر پوری طرح مست ہو جاتا ہے اور اپنے سامنے کسی کو نہیں سمجھتا۔ سورۂ نحل میں فرمایا۔ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○
آخر میں کھیتیوں کا ذکر فرمایا، کھیتوں اور کھیتیوں والے بھی اپنی فصل کو دیکھ دیکھ کر مست ہوتے ہیں اور خوشی میں پھولے نہیں سماتے اہلِ دنیا اپنی دنیا میں خوش ہیں اور اہلِ آخرت اپنی آخرت کی طرف متوجہ ہیں، اہلِ دنیا کو آئندہ آیت میں آخرت کی نعمتوں کی طرف متوجہ فرمایا چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ

آپ فرما دیجئے کیا میں تم کو اس سے بہتر بتادوں ؟ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے اُن کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

جاری ہیں اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور بیویاں ہیں پاکیزہ، اور رضامندی ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ بندوں کو دیکھنے

بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب بلاشبہ ہم ایمان لائے لہٰذا بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا دے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، اور سچے ہیں، اور حکم ماننے والے ہیں، اور خرچ کرنے والے ہیں، اور راتوں کے پچھلے حصوں میں مغفرت طلب کرنے والے ہیں۔

اہلِ تقویٰ کا آخرت میں انعام

لوگوں کی دنیاوی مرغوبات ذکر فرمانے کے بعد اس آیت میں آخرت کی نعمتوں کو ذکر فرمایا اور بتا دیا کہ ان دنیاوی چیزوں سے بہتر وہ چیزیں ہیں جو آخرت میں نصیب ہوں گی لیکن وہ ہر شخص کو نہیں ملیں گی وہ اہل تقویٰ کو نصیب ہوں گی۔ سب سے بڑا تقویٰ تو یہ ہے کہ انسان کفر اور شرک سے بچے اور ایمان قبول کرے ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح معتبر ہی نہیں اور اس کے بعد تقوے کے درجات ہیں، کبیرہ گناہوں سے بچنا یہ بھی تقویٰ ہے، صغیرہ گناہوں سے بچنا بھی تقویٰ ہے، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی سے بچنا بھی تقویٰ ہے اور مشتبہات سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ متقی بندوں سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اُن کے رب کے پاس انہیں ایسے باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ مزید برآں یہ کہ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں بھی ملیں گی (پاکیزہ کا مطلب سورۂ بقرہ کے رکوع ۳ کی تفسیر میں دیکھ لیجئے)۔

رضائے الٰہی...... اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے ان سب سے اپنی رضا مندی کا اعلان فرما دیا۔ درحقیقت اللہ کی رضا ہر نعمت سے بڑھ کر ہے اور سب سے بڑی چیز ہے۔ سورۂ توبہ میں فرمایا: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ اور جگہ جگہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا اعلان فرمایا ہے ایک غلام کی اس سے بڑھ کر کیا سعادت اور نیک بختی ہوگی کہ اس کا آقا اس سے راضی ہو۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جنت والوں سے فرمائیں گے کہ اے جنت والو! وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں اور تعمیل ارشاد! کے لئے موجود ہیں اور پوری خیر آپ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کیسے راضی نہ ہوں گے۔ آپ نے ہم کو وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا میں تم کو اس سے افضل چیز عطا کر دوں؟ وہ عرض کریں گے اے پروردگار اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں۔ اب اس کے بعد کبھی بھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (بخاری و مسلم) اہلِ تقویٰ کو ان کے رب کے پاس جو نعمتیں ملیں گی جن میں سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے ان کے ذکر فرمانے کے بعد ان حضرات کی دعا کا تذکرہ فرمایا اور ان کی چند صفات ذکر فرمائیں کہ وہ لوگ یوں دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے لہٰذا آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیجئے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچائیے۔ پھر ان کی صفات کا تذکرہ فرمایا اور صفت صبر کو مقدم کیا اور فرمایا:

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ○

اَلصَّابِرِيْنَ...... (صبر کرنے والے) اس صفت کو مقدم فرمایا کیونکہ صفت صبر ہی ایسی چیز ہے جس کا تمام نیکیوں میں دخل ہے جیسا کہ آیتِ کریمہ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی تفسیر میں عرض کیا گیا کہ صبر کی تین قسمیں ہیں۔ اوّل نیکیوں پر جما رہنا، دوسرے

گناہوں کے چھوڑنے پر نفس کو لگائے رہنا اور گناہوں کے تقاضوں کو دبانا، تیسرے تکلیفوں پر صبر کرنا۔ مؤمن بندہ کی زندگی میں ہر موقعہ پر اور ہر عبادت میں مالی ہو یا بدنی اس صفت کی ضرورت پڑتی ہے پھر فرمایا۔

وَالصّٰدِقِیْنَ...... (سچے لوگ) سچائی بہت بڑی صفت ہے۔ ایمان میں سچائی ہو تو انسان منافق نہیں ہوتا۔ اقوال میں سچائی ہو تو انسان جھوٹ نہیں بولتا اعمال میں سچائی ہو تو اعمال کو اچھی طرح انجام دیتا ہے، اور نیت میں سچائی ہو تو سب اعمال درست ہوتے ہیں۔

سورۂ زمر میں فرمایا وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (اور جو شخص سچ لے کر آیا اور سچ کی تصدیق کی یہ لوگ تقویٰ والے ہیں)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سچ کو لازم پکڑ لو کیونکہ سچ نیکی کی راہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور انسان برابر سچ کو اختیار کرتا ہے اور اہتمام سے فکر کر کے سچ کو اختیار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صدیق (بہت زیادہ سچا) لکھ دیا جاتا ہے۔ اور تم لوگ جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ گنہگاری کی راہ بتاتا ہے اور گنہگاری دوزخ کی طرف لے جاتی ہے اور انسان برابر جھوٹ اختیار کرتا ہے اور دھیان کر کے سوچ سوچ کر جھوٹ کو اختیار کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کذّاب (بہت زیادہ جھوٹا) لکھ دیا جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

وَالْقٰنِتِیْنَ...... (فرمانبرداری کرنے والے) یہ لفظ قنوت سے لیا گیا۔ قنوت کے متعدد معنی ہیں اُن میں سے ایک معنی طاعت اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں اس کے عموم میں ہر طرح کی فرمانبرداری اور تمام عبادات اور ترک منکرات داخل ہے۔

وَالْمُنْفِقِیْنَ...... پھر فرمایا وَالْمُنْفِقِیْنَ (خرچ کرنے والے) اس میں مال خرچ کرنے کی فضیلت ذکر فرمائی، یعنی تقویٰ اختیار کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کرنے والے ہیں، خرچ کرنے کا تعلق مالداری سے نہیں ہے آخرت میں ثواب ملنے کے جذبات سے ہے۔ جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت نہیں ہوتی مالِ کثیر ہوتے ہوئے بھی خرچ نہیں کرتے اور جن کے پیشِ نظر آخرت کا ثواب ہوتا ہے وہ تھوڑا مال ہوتے ہوئے بھی للہ فی اللہ خرچ کر دیتے ہیں۔

وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ...... پھر فرمایا وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (اور پچھلی راتوں میں گناہوں کی مغفرت طلب کرنے والے ہیں) یہ بھی اہل تقویٰ کی خاص صفت ہے۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ قیام اللیل (نماز تہجد) کو لازم پکڑ لو کیونکہ تم سے پہلے جو صالحین تھے یہ اُن کا طریقہ رہا ہے اور یہ تمہارے رب کی نزدیکی کا سبب ہے اور گناہوں کا کفارہ کرنے والی ہے اور گناہوں سے روکنے والی ہے۔ (ترمذی) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کون ہے جو مجھ سے دعا کرے میں اس کی دعا کو قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اسے عطا کروں۔ کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے میں اس کی مغفرت کر دوں۔ (صحیح بخاری ۱۵۳، ج۱)

رات کو اُٹھنے کی فضیلت...... حضرت عمرو بن عبسہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب آخری رات کے حصے میں ہوتا ہے۔ سو اگر تجھ سے ہو سکے تو اُن لوگوں میں سے ہو جا جو اس وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ (رواہ الترمذی)

قرآن مجید میں متعدد سورتوں میں راتوں کو اُٹھنے اور پچھلے پہر نمازوں اور دعاؤں میں مشغول ہونے کی فضیلت اور ترغیب مذکور ہے۔

سورۂ ذاریات میں فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ. اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ ؕ كَانُوْا

قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ. وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (بے شک جولوگ تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اُن کے رب نے جو انہیں عطا فرمایا اس کے لینے والے ہوں گے۔ بلاشبہ یہ لوگ اس سے پہلے اچھے کام کرنے والے تھے رات کو کم سوتے تھے اور راتوں کے پچھلے حصوں میں استغفار کرتے تھے)۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا

اللہ نے گواہی دی کہ بلاشبہ کوئی معبود نہیں اُس کے سوا، اور فرشتوں نے اور اہل علم نے، وہ انصاف کے ساتھ قائم ہے، کوئی معبود نہیں

هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

مگر وہی، وہ غلبہ والا ہے حکمت والا ہے۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور نہیں اختلاف کیا اُن لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی

اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ

مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آ گیا محض آپس میں ضدا ضدی کی وجہ سے، اور جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے سو اللہ جلد

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ

حساب لینے والا ہے۔ سو اگر وہ آپ سے حجت بازی کریں تو آپ فرما دیجئے کہ میں نے اپنی ذات کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا اور ان لوگوں نے

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا

بھی جنہوں نے میرا اتباع کیا، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی آپ اُن سے اور اَن پڑھوں سے کہہ دیجئے کیا تم اللہ کے فرمانبردار ہوئے؟ پس اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو انہوں نے

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

ہدایت پالی، اور اگر وہ روگردانی کریں تو آپ کے ذمہ بس پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

توحید پر گواہی

روح المعانی ص ۱۰۴ ج ۳ اور معالم التنزیل ص ۲۸۵ ج ۱ میں کلبی سے نقل کیا ہے کہ شام کے علماء یہود میں سے دو عالم مدینہ منورہ آئے انہوں نے مدینہ کو دیکھا اُن میں سے ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ یہ شہر تو ہُو بہُو وہی معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم نے پڑھا ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر میں قیام پذیر ہوں گے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو انہیں صفات کے ساتھ پہچان لیا جو انہیں پہلے سے معلوم تھیں انہوں نے دریافت کیا کہ آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! میں محمد (ﷺ) ہوں، پھر سوال کیا کہ آپ احمد ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں! میں احمد (ﷺ) ہوں۔ کہنے لگے کہ ہم ایک شہادت کے بارے میں آپ سے دریافت کرتے ہیں اگر آپ نے ہم کو بتا دیا تو پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی تصدیق کریں گے، آپ نے فرمایا تم دونوں سوال کرو، کہنے لگے ہمیں یہ بتائیے کہ اللہ کی کتاب میں سب سے بڑی شہادت کون سی ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آخر تک) نازل فرمائی۔ اس کو سن کر اُن دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی گواہی کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنے کو معبود لَا شَرِیْکَ لَهٗ ہونے کی گواہی دی، اور فرشتوں کی گواہی کا بھی ذکر ہے جو اللہ کے برگزیدہ اور مقرب بندے ہیں ہر طرح کے گناہوں سے معصوم اور محفوظ ہیں۔ اُن میں سے بہت سے دربارِ الٰہی کے حاضرین بھی ہیں اور تمام فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہے، پھر اہلِ علم کی گواہی کا ذکر فرمایا کہ ان حضرات نے بھی اللہ کے معبود وحدہٗ لاشریک ہونے کی گواہی دی۔

اہلِ علم کون ہیں؟...... اہلِ علم سے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام اور وہ تمام حضرات مراد ہیں جنہوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے دلائلِ قطعیہ عقلیہ سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور اُسے اپنی ذات وصفات میں اور معبودِ حقیقی ہونے میں اور وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے میں خوب اچھی طرح سے جانا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ جو اللہ کی مخلوقات کا تجزیہ اور تحلیل کرنے میں مصروف ہیں اور کائنات میں طرح طرح کی ریسرچ کرتے ہیں۔ حیوانات، نباتات، جمادات کے احوال جاننے کے لئے محنتیں کرتے ہیں۔ ان میں اہلِ علم کہنے کے لائق وہی لوگ ہیں جو مخلوق کے ذریعہ خالق کی معرفت حاصل کرنے میں عمریں خرچ کرتے ہیں اور جو خالق جل مجدہٗ کے منکر ہیں یہ لوگ اہلِ علم نہیں ہیں۔ بڑی بڑی ریسرچ کرتے ہوئے بھی جہالت میں مُبتلا ہیں۔ اسی کو سورۂ زمر میں فرمایا: قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (آپ فرما دیجئے کیا اللہ کے سوا کسی کی عبادت کا تم مجھے حکم دیتے ہو اے جاہلو!) مخاطبین کو جاہل فرمایا حالانکہ وہ اس زمانہ کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت میں بہت زیادہ آگے بڑھے ہوئے تھے۔

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ...... پھر فرمایا قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کاملہ کے ساتھ عدل کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے سب احکام اور فیصلے انصاف کے ساتھ ہیں مخلوق کی جزاء اور سزا کے سب فیصلے جو دنیا میں ہیں اور آخرت میں ہوں گے سب میں انصاف ملحوظ ہے۔ کسی پر ذرّہ بھر بھی ظلم نہیں ہے اور نہ ہوگا جو لوگ ظلم اور انصاف کے معانی نہیں سمجھتے وہی اشکال کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام اور قضایا میں کوئی ظلم نہیں۔

پھر فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس میں بطور تاکید ابتدائی آیت کے مضمون کا اعادہ فرمایا ہے۔ شروع آیت میں توحید بیان فرمائی اور اس آیت میں بھی اور دو صفات کا ذِکر فرمایا کہ وہ عزیز ہے یعنی زبردست ہے اور سب پر غالب ہے اور حکمت والا ہے جو کچھ مخلوق میں تصرفات ہوتے ہیں وہ سب اس کی حکمت کے مطابق ہیں۔

اللہ کے نزدیک صرف دینِ اسلام معتبر ہے...... اس کے بعد فرمایا: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اس میں اعلان فرمایا کہ اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی معتبر ہے۔ وہی ذریعہ نجات ہے اگر کسی نے اللہ کو مانا لیکن اللہ کے دین کو نہ مانا جو اس کے نزدیک معتبر ہے تو وہ گمراہ ہے آخرت میں اس کی نجات نہ ہوگی۔ اسی سورت کے (رکوع ۹) میں فرمایا: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین کو تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا) اسلام کا لغوی معنی فرمانبردار ہونے کا ہے جو دین اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لئے تجویز فرمایا اس کا نام اسلام رکھا ہے۔ کیونکہ وہ سراپا فرمانبرداری ہی ہے، ہر شخص اپنے خالق و مالک کے سامنے ظاہر سے اور باطن سے جسم سے اور جان سے جھک جائے اور ہر حکم کو مانے اور تعمیل ارشاد کرتا رہے۔

تمام انبیاء کرام علیہم السلام دین اسلام کے داعی تھے ہر نبی کا دین اسلام تھا جو اُن پر ایمان لایا وہ مسلم تھا اور جس نے اُن کی دعوت کو نہ مانا وہ غیر مسلم تھا کافر تھا حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا دین بھی اسلام ہے انہوں نے اُسی کی دعوت دی اور اس کی دعوت قیامت

تک ہے، جو شخص اس دین کو مانے گا مسلم ہوگا۔ اللہ کا فرمانبردار ہوگا اور جو اسے نہ مانے گا وہ کافر ہوگا۔

لفظ اسلام کا مادہ سلامتی ہے جو شخص اسلام قبول کرے گا دنیا و آخرت کی آفات اور مصائب اور عذاب اور تکالیف سے محفوظ رہے گا اسے ہر طرح کی سلامتی ملے گی۔ مضمون بالا سورۂ بقرہ کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ اور دوسری آیت اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ کے ذیل میں بھی بیان ہو چکا ہے اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے جو اختلاف کیا اور داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کیا اُن کا یہ اختلاف جہالت سے نہیں بلکہ یہ جاننے کے بعد ہے کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں اسلام کی حقانیت کی دلیل پہنچ گئی پھر بھی ضِدًّا ضِدّ ی کا مزاج رکھنے کے جذبات نے ان کو حقانیت اسلام کے انکار پر آمادہ کیا۔ انہیں دنیا اور دنیا میں سرداری مطلوب ہے جس کی وجہ سے اللہ کی آیات کے منکر ہو رہے ہیں اور جانتے بوجھتے حق کا انکار کر کے مستحق عذاب بن رہے ہیں اللہ تعالیٰ جلد سب کا حساب لے لے گا اسی کو فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ پھر فرمایا: فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ط (پس اگر وہ آپ سے حجت بازی کریں تو آپ فرما دیں کہ میں نے اپنی ذات کو اللہ کے لئے جھکا دیا اور اُن لوگوں نے بھی جنہوں نے میرا اتباع کیا) تم نہیں مانتے تم جانو نہ ماننے کی سزا بھگتو گے ہم تو اللہ کے ہو گئے اس کی فرمانبرداری ہمارا شعار ہے۔ پھر فرمایا: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ یعنی آپ ان لوگوں سے فرما دیں جن کو کتاب دی گئی (یعنی یہود و نصاریٰ) اور مشرکین عرب سے بھی فرما دیں جو اُمّی یعنی اَن پڑھ ہیں کہ بولو تم نے اسلام قبول کیا۔ یعنی اُن کو دعوت دے دو۔

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا اگر اسلام قبول کرلیں تو ہدایت والے ہو جائیں گے وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ اور اگر وہ آپ کی دعوت سے اعراض کریں اور روگردانی کریں تو آپ کو اس سے کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے۔ منوانا آپ کے ذمہ نہیں آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے، وہ مسلم کو بھی جانتا ہے اور کافر کو بھی۔ داعی حق کا بھی اُسے علم ہے اور حق قبول کرنے والے کا بھی۔ وہ ہر ایک کو اسکی جزا دے گا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میری حرکتوں کی میرے خالق کو خبر نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور ناحق نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے

يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٢١ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں سو اُن کو آپ دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٢

دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے اور اُن کی کوئی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔

کافروں کے لئے عذاب کی وعید

اس آیت شریفہ میں وعید ہے تمام کافروں کے لئے جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں جن میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں، اور خاص کر یہودیوں کا ذکر فرمایا کہ وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ جن یہودیوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا وہ تو قاتل تھے ہی اور

جو یہودی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے وہ بھی چونکہ اپنے اسلاف کی حرکتوں سے بیزار نہیں تھے اس لئے اُن کی طرف بھی قتل کا اسناد کیا گیا۔ نیز اُن لوگوں کا بھی ذکر فرمایا جو ایسے حضرات کو قتل کرتے رہے جو انصاف کا حکم کرتے تھے۔ جن لوگوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اُن سے کوئی بعید نہیں کہ اُن کے اُمتیوں کو قتل کریں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، اس دور میں بھی لوگ اہلِ حق اور اہلِ عدل کے قتل کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ان سب لوگوں کے بارے میں فرمایا فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ط کہ اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو، خوشخبری تو آرام راحت اور نعمت کی ہوتی ہے لیکن عذاب الیم کے ساتھ جو بَشِّرْ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی حرکتوں کو ذریعہ عذاب سمجھنے کے بجائے اچھی چیز سمجھتے تھے اور مغفرت اور نجاتِ آخرت کی اُمید رکھتے تھے لہٰذا اُن کو عذاب الیم کی خوشخبری دی گئی۔ صاحبِ روح المعانی ص ۱۰۹ ج ۳ نے ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن کن لوگوں کو ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ شخص سب سے زیادہ عذاب میں ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت بالا تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اے ابوعبیدہ بنی اسرائیل نے ایک ہی وقت علی الصباح ۴۳ نبیوں کو قتل کیا اُن کو منع کرنے کے لئے ایک سو ستر افراد کھڑے ہوگئے جو بنی اسرائیل کے عبادت گزاروں میں سے تھے انہوں نے ان قاتلین کو اچھے کاموں کا حکم دیا اور بری باتوں سے روکا تو دن کے آخر حصہ میں وہ سب بھی قتل کر دیئے گئے، آیت بالا میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔

کافروں کے اعمال اکارت ہیں ...... پھر فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ کہ ان لوگوں کے سارے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت چلے گئے دنیا میں ان کے جان و مال محفوظ نہ رہے اور کسی طرح کی مدح اور تعریف کے مستحق نہ ہوئے اور آخرت میں بھی اُن کے اعمال نے کچھ کام نہ دیا۔ کیونکہ اُن اعمال کا کوئی ثواب نہ ملا اور ان کے اعمال عذاب دفع کرنے کا ذریعہ نہ بن سکے، آخرت میں اُن کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو کسی طرح کی مدد یا سفارش کر سکے۔

جو اعمال بُرے ہوں ان پر تو ثواب ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں جو اعمال نیکی کے نام سے کئے ہوں ان کے حبط ہونے کا تذکرہ فرمایا، کافر کی کوئی نیکی آخرت میں فائدہ نہیں دے سکتی۔ (من روح المعانی)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى

اے مخاطب کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے پھر اُن میں

فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا

سے ایک فریق اعراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ ہرگز ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند گنے چنے

مَّعْدُوْدٰتٍ ص وَّغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ

دنوں میں، اور اُن کو دھوکے میں ڈال دیا اُن کے دین کے بارے میں اس چیز نے جس کو وہ افتراء کرتے تھے۔ پس کیا حال ہوگا جب ہم اُن کو جمع

لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ قف وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں، اور ہر جان کو اس عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

یہودیوں کا اللہ کی کتاب سے اعراض کرنا اور خوش فہمی میں مبتلا ہونا

روح المعانی ص ۱۱۰ ج ۳ میں ابن اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدراس میں تشریف لے گئے۔ (جو یہودیوں کی مذہبی اور تعلیمی جگہ تھی) وہاں یہودی جمع تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی۔ اُن لوگوں میں نعمان بن عمرو اور حارث بن زید دو آدمی تھے انہوں نے کہا کہ اے محمد! آپ کس دین پر ہیں آپ نے فرمایا میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ابراہیم تو یہودی تھے آپ نے فرمایا کہ توریت لے آؤ وہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے گی وہ توریت لانے پر راضی نہ ہوئے اور اس کا فیصلہ ماننے سے انکار کر بیٹھے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی جس میں یہ بتایا کہ اُن کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کردے لیکن اُن میں سے ایک فریق (جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا) اللہ کی کتاب کو ماننے سے اعراض کرتا ہے اور حق قبول کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔

یہودیوں کے خیالات اور آرزوئیں ......: پھر ارشاد فرمایا کہ اِن لوگوں کا یہ طریقہ کار (حق سے منہ پھیرنا اور اللہ کی کتاب سے اعراض کرنا) اس لئے ہے کہ خود تراشیدہ خیالات کی دُنیا میں پھنسے ہوئے ہیں انہوں نے اپنے دلوں میں یہ سوچ رکھا ہے کہ بس جی ہم دوزخ میں صرف چند دن کے لئے جائیں گے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ان چند دنوں سے وہ چند دن مراد لیتے تھے جو اُن کے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی عبادت کی تھی، یہ کتنی بڑی حماقت ہے اپنے عقیدہ کے مطابق چند دن کو دوزخ میں جانے کے لئے تیار ہیں جس کے عذاب کی ایک منٹ کی بھی سہار نہیں اور حق ماننے اور اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، جو جھوٹی باتیں انہوں نے تراش رکھی تھیں اور جن جھوٹے خیالات میں مبتلا تھے ان چیزوں نے اُن کو دھوکے میں ڈالا اور خام خیالیوں کی وجہ سے مستحق عذاب ہوئے وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی ایسی سند نہیں جس میں اس کا وعدہ ہو کہ چند دن کے بعد وہ دوزخ سے نکل آئیں گے انہیں معلوم ہے کہ دینِ حق کا انکار کفر ہے اور کفر کا عذاب دائمی ہے۔ پھر بھی اوہام و خیالات اور افترا آت کی دنیا میں مستغرق ہیں اُن کی خوش فہمیوں میں یہ بھی تھا کہ ہم انبیاء کرام کی اولاد ہیں وہ ہمیں بخشوالیں گے، یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کے بیٹوں کو عذاب نہیں دے گا۔ بس اتنا ہوگا کہ دوزخ سے عبور کریں گے اور یہ بھی کہتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اسی کے محبوب ہیں۔ یہ سب خام خیالیاں اُن کو لے ڈوبیں۔ (من روح المعانی ص ۱۱۱ ج ۳)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ

آپ یوں کہئے کہ اللہ جو ملک کا مالک ہے تُو ملک دیتا ہے جس کو چاہے اور ملک چھین لیتا ہے جس سے چاہے اور تو عزت دیتا ہے

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ

جس کو چاہے اور ذلت دیتا ہے جس کو چاہے، تیرے ہی ہاتھ میں سب بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو داخل کرتا ہے رات

وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ

کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے

مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

اور تو جس کو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذِلّت دے

معالم التنزیل ص ۲۷۹ ج ۱ میں حضرت ابن عباس وحضرت انس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح فرمالیا تو آپ نے اپنی اُمت کو فارس اور روم کے فتح ہونے کی خوشخبری دی یہ سن کر منافقوں اور یہودیوں نے کہا اَجی انہیں فارس اور روم کیسے مل جائیں گے؟ وہ تو بڑے غلبہ والے اور قوت والے لوگ ہیں کیا محمد (ﷺ) کو یہ کافی نہیں کہ مکہ اور مدینہ مل گئے۔ اُسی پر بس نہیں کرتے جو آگے بڑھ کر ملک فارس اور ملک روم کے بارے میں بھی لالچ کررہے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں دُعا کریں کہ اے اللہ! آپ ملک کے مالک ہیں آپ جسے چاہیں ملک دیں اور جس سے چاہیں ملک چھین لیں اور جسے چاہیں عزت دیں اور جسے چاہیں ذلّت دیں، اس میں دعا بھی ہے اور منافقین اور یہودیوں پر تعریض بھی ہے کہ اللہ ملک کا مالک ہے وہ جسے چاہے ملک دے سکتا ہے اور جس سے چاہے چھین سکتا ہے۔ اس نے مدینہ سے یہودیوں کا اقتدار ختم فرمایا اور مکہ معظّمہ سے قریش کا اقتدار ختم فرمایا اور دونوں شہر اور اُن کے ملحقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو عطا فرمادیئے یہ حضرات بے سروسامان تھے ان کو اصحابِ مال اور اصحابِ شوکت سے غلبہ دیا اور فتح عطا فرمائی۔ اللہ ہی نے فارس و روم کو اقتدار دیا ہے وہ اُن سے چھین کر ان کے ملکوں کا اقتدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو دے سکتا ہے یہ لوگ فارس اور روم کی شان وشوکت اور کرّ وفرّ کو دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو نہیں دیکھتے جس نے ان کو اقتدار دیا، جو اقتدار دے سکتا ہے وہ اقتدار لے بھی سکتا ہے ملک کا دینا اور چھین لینا، عزت دینا اور ذلت دینا سب اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

پھر فرمایا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ کہ ساری خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے، علماء نے فرمایا کہ خیر وشر سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے لیکن ایک کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ دوسری چیز اُسی سے سمجھ میں آ گئی اور بعض حضرات نے فرمایا کہ کیونکہ یہ مقام دعا ہے اس لئے خیر پر اکتفا کیا گیا (اور شر کی نفی بھی نہیں کی) کیونکہ مانگنے والا اُسی بات کا ذکر کرتا ہے جس سے اُس کا مطلب ہو جب لینا ہے تو یہی کہے گا کہ آپ کے ہاتھ میں خیر ہے اس موقعہ پر یوں کیوں کہے کہ آپ کے ہاتھ میں شر بھی ہے۔ آخر میں فرمایا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اس میں اجمالی طور پر پوری آیت کے مضمون کو دہرایا گیا ہے اور الفاظ کے عموم نے یہ بھی بتادیا کہ اوپر جو چیزیں مذکور ہیں ان کے علاوہ اور تمام چیزوں پر بھی اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے۔

قدرتِ خداوندی کے بعض مظاہرے...... پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بعض مظاہرے جو نظروں کے سامنے ہیں ان کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے کبھی رات بڑی کبھی دن بڑا پورے عالم میں اس کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں رات دن کے اوقات میں چار پانچ ہی گھنٹے کا فرق ہوتا ہے اور کہیں پندرہ سولہ گھنٹے یا اس سے زیادہ کا بھی فرق ہوجاتا ہے۔ یہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے کسی بھی مخلوق کو قدرت نہیں ہے کہ اس کے خلاف کرسکے، نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ مفسرین نے اس کی شرح میں فرمایا ہے کہ نطفہ جو بے جان ہے اس سے زندہ حیوان نکالتا ہے اور زندہ حیوان سے نطفہ نکالتا ہے جو بے جان ہے اور بعض حضرات نے اس کی مثال بچہ اور انڈے سے دی ہے کہ چوزہ کو انڈے سے اور

انڈے کو پرندہ سے نکالتا ہے، حضرت حسن اور عطاء نے اس کا ایک اور معنی بتایا اور وہ یہ کہ مؤمن کو کافر سے اور کافر کو مؤمن سے نکالتا ہے۔ یعنی مؤمن کی اولاد کافر اور کافر کی اولاد مؤمن ہوتی ہے۔ مؤمن زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔

قَالَ تَعَالٰی اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا

آخر میں فرمایا وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ رازق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے اور کمی بیشی کرنا بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

نہ بنائیں مؤمن کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو شخص یہ کام کرے گا

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى

تو اللہ سے دوستی کرنے کے کسی شمار میں نہیں، مگر اس حالت میں کہ دشمنوں سے کچھ بچاؤ کرنا ہو، اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف

اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

لوٹ کر جانا ہے۔

اہلِ ایمان کو حکم کہ کافروں سے دوستی نہ کریں

اس آیت شریفہ میں اہلِ ایمان کو اس بات سے منع فرمایا کہ مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی شخص ایسا کرے گا یعنی مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے گا اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ معالم التنزیل ص ۲۹۱ ج ۱ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، یہ لوگ ظاہر میں مؤمن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور دل سے کافر تھے۔ یہودیوں سے اور مشرکین سے دوستی رکھتے تھے اور اُن کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے اور یہ اُمید باندھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں یہودی اور مشرکین غلبہ پالیں گے اور فتح یاب ہو جائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مؤمنین کو منع فرمادیا کہ ان لوگوں کی طرح عمل نہ کریں اور کافروں کی دوستی سے پرہیز کریں اپنی دوستی صرف مسلمانوں سے رکھیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ چند یہودی بعض انصار سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا اندرونی مقصد یہ تھا کہ ان کو دینِ اسلام سے پھیر دیں بعض صحابہؓ نے ان انصاریوں کو ان یہودیوں کی دوستی سے منع کیا ان لوگوں نے نہ مانا اور اُن کے ساتھ گھلنا ملنا جاری رکھا۔ اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور دشمنانِ دین کی دوستی سے منع فرمادیا۔ موالات کفار (کافروں کی دوستی) کی ممانعت اس آیت کے علاوہ دیگر آیات میں وارد ہوئی ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ

سَبِيلِي وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَآ أَخْفَيْتُمْ وَمَآ أَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيلِ o إِنْ يَّثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوٓا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوٓءِ وَوَدُّوا لَوْتَكْفُرُونَo

اے ایمان والو! مت بناؤ میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست تم اُن کی طرف دوستی کے پیغامات بھیجتے ہو حالانکہ انہوں نے اس کے ساتھ کفر کیا جو تمہارے پاس حق آیا، وہ نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس وجہ سے کہ تم ایمان لائے اللہ کے ساتھ جو تمہارا رب ہے اگر تم نکلے ہو میری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا کی تلاش میں، تم چپکے سے اُن کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم نے پوشیدہ کیا اور جو کچھ ظاہر کیا اور تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ اگر وہ تم کو پالیں تو تمہارے دشمن ہوں گے اور تمہاری طرف اپنے ہاتھوں اور زبانوں کو بڑھادیں گے برائی کیساتھ، اور اُن کی آرزو ہے کہ کاش تم لوگ کافر ہو جاؤ۔

کافروں سے محبت کرنے کے نتائج......ان آیات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کافروں سے موالات اور اُن سے دوستی رکھنا قطعاً اور سخت ممنوع ہے، آج کل مسلمانوں کو اس ممانعت کی طرف بالکل توجہ نہیں ہے کافروں سے دوستی ہے اور اپنوں سے بیزاری ہے۔ دنیا کا مفاد پیشِ نظر ہے اپنے مفاد کو باقی رکھنے کے لئے کافروں سے دوستی کرتے ہیں اور مسلمانوں کی دوستی کا خیال تک نہیں آتا۔ مسلمان غیر قوموں کے مخبر بھی بن جاتے ہیں مسلمانوں کے ملکوں کی خبریں ان کے دشمنوں کو پہنچاتے ہیں۔ آپس میں بگاڑ ہے اور کافروں سے جوڑ ہے، اس افسوسناک صورتحال نے مسلمانوں کے ملکوں کو کافروں کی حکومتوں کا دم چھلہ بنا رکھا ہے، کوئی ملک کافروں کی کسی حکومت کا سہارا لے کر جی رہا ہے اور کوئی اُن کی کسی دوسری حکومت کا خاص الخاص بنا ہوا ہے، مسلمان مقالے لکھتے ہیں، ڈاکٹریٹ کرتے ہیں۔ دشمن اُن سے ایسے مضامین لکھاتے ہیں جو مسلمانوں کے اندرونی حالات اور معاملات اور اُن کے ارادوں اور اداروں کی خبروں پر مشتمل ہوں، یہ لوگ کافروں کے دوست ہیں اسلام اور مسلمان کی دوستی ان کے پیش نظر نہیں، مسلمانوں کے بعض ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور جفا کا معاملہ ہوتا ہے اُن کو اجنبی کہہ کر ملک سے خارج کر دیا جاتا ہے اور کافروں کو المواطن کہہ کر گلے لگایا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں کافروں کی موالات اور دوستی سے جو منع فرمایا یہ بہت اہم بات ہے لوگ اس کو رواداری کے خلاف سمجھتے ہیں، رواداری اور چیز ہے اور موالات یعنی دل سے دوستی کرنا اور چیز ہے۔ دل سے جب دوستی ہوتی ہے تو مسلمانوں کی خبریں بھی دشمنوں کو پہنچائی جاتی ہیں اور مسلمان حکومتوں کے اندر کے پروگرام بھی دشمن کو بتادیئے جاتے ہیں، ایمان کا تقاضا ہے کہ قلبی محبت صرف مسلمانوں سے ہو کافروں سے نہ ہو، کہتے ہیں فلاں صاحب نمازی ہیں، نمازی تو ہیں لیکن اندر سے دشمنوں کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں ان کو اسلام کا یہ حکم ماننا گوارا نہیں کہ کافروں سے موالات اور محبت نہ کریں۔

مسلمانوں میں طرح طرح کی عصبیتیں ہیں آپس میں موالات نہیں رہی۔ کہیں صوبائی عصبیت ہے، کہیں لسانی عصبیت اور کہیں عرب وعجم کی عصبیت ہے۔ ایمانی رشتوں کو چھوڑ کر غیر ایمانی تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں اس میں کافروں سے بھی موالات کرنی پڑتی ہے اور یہ عصبیتیں کافروں ہی نے سمجھائی اور سجھائی ہیں۔ بعض ملکوں میں تو کافروں سے دوستی کا یہ حال ہے کہ لوگ دشمنوں کے مندر تک بنوا دیتے ہیں اور اُن کی دوستی میں نمازیں تک چھوڑ دیتے ہیں اور اُن کے مذہبی تہواروں میں شرکت بھی کرتے ہیں اور ہدیے بھی دیتے ہیں۔ اس صورتحال نے مسلمانوں کی اپنی ذاتی کوئی حیثیت دنیا میں باقی نہیں رکھی، کافروں سے یہ اُمید کرنا کہ وہ ہمیں فائدہ پہنچادیں گے غلط خیال ہے جو بظاہر اُن سے فائدہ پہنچتا ہے اُس کی آڑ میں نقصان ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا

تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا میں صاف بتادیا کہ کافروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ اور یہ بھی واضح طور پر بتادیا گیا کہ وہ لوگ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑی رہے ان کے ممالک ہماری طرف جھکے رہیں اس طرح ہمارے محتاج بھی رہیں اور ہمارے خلاف کچھ کر بھی نہ سکیں اور ہمیں اُن کے اندرونی راز بھی معلوم ہوتے رہیں۔

آیت میں جو لفظ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا۔ اس میں اس پر خاص تنبیہ ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کریں۔ اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ مسلمانوں کو نہ چھوڑے ان سے بھی دوستی رکھے اور کافروں سے بھی۔ کیونکہ مقصود کافروں کی دوستی سے منع کرنا ہے، اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ کافروں سے قلبی دوستی جبھی ہو سکتی ہے جبکہ مسلمانوں کی دوستی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ خواہ مستقل طور پر مسلمانوں سے بےتعلقی اختیار کی جائے خواہ عارضی طور پر ہر حال میں کافروں سے قلبی محبت ہوگی تو وہ ضرور مسلمانوں سے کسی نہ کسی درجہ میں تعلق کم کرنے یا تعلق توڑنے پر مجبور کرے گی۔

کافروں سے موالات کرنے والوں کے لئے وعید شدید...... آیت شریفہ میں کافروں کی موالات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا اور ان سے دوستی کرنے والوں کے حق میں ارشاد فرمایا کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ کہ جو شخص ایسا کرے گا تو اللہ کی دوستی یا اللہ کے دین کا اس سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ قال صاحب الروح ص۱۲۱ ج۲ والکلام علی حذف مضاف ای من ولایته او من دینه والظرف الاول حال من (شئ) والثانی خبر لیس و تنوین (شئ) للتحقیر أی لیس فی شئ یصح أن یطلق علیه اسم الولایة او الدین۔ (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں اس جملہ میں مضاف محذوف ہے یعنی من ولایتہ یا من دینہ ہے اور پہلا ظرف شئ سے حال ہے اور دوسرا ظرف لیس کی خبر ہے اور شئ کی تنوین تحقیر کے لئے ہے۔ یعنی جو کافروں سے موالات کرے گا تو یہ کوئی چیز نہیں ہے کہ اسے کوئی دوستی یا دین کہا جائے وہ اس لائق نہیں ہے۔)

موالات کی ایک صورت مستثنیٰ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً یعنی ایسی صورت میں ظاہری دوستی کی اجازت ہے جبکہ ان سے کسی قسم کا ضرر پہنچنے کا واقعی اندیشہ ہو، کوئی مسلمان کافروں میں پھنس جائے۔ مقتول ہونے کا یا کسی عضو کے تلف ہونے کا واقعی اندیشہ ہو اور کافر زبردستی کریں کہ تو ہمارے دین کے مطابق نہ بولا تو تجھے مار ڈالیں گے تو صرف ظاہری طور پر زبان سے (نہ کہ دل سے) کوئی کلمہ ایسا کہہ دے جس سے جان بچ جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

پھر فرمایا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہٰذا ہر عمل میں اس کو سامنے رکھیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے یہ ہمیشہ پیش نظر رہے اگر اس پر عمل کریں گے تو گناہوں سے بچ سکیں گے گناہوں میں موالات کفار بھی شامل ہیں۔

مواسات اور مدارات کس حد تک جائز ہے؟...... واضح رہے کہ آیاتِ قرآنیہ میں کافروں سے قلبی دوستی کی ممانعت فرمائی ہے مواسات اور مدارات کی ممانعت نہیں ہے جو خوش خُلقی سے پیش آنا مہمانی کے طور پر کچھ کھلانا پلانا، دفتروں میں اُن کے ساتھ ملازمتیں کرنا۔ تجارتی معاملات کرنا اس کی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ جو کفار دار الحرب کے ہوں اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوں اُن سے کسی قسم کا تعاون نہ کیا جائے اور معاملات میں بھی شرعی اصول کے موافق جائز ناجائز کا خیال رکھا جائے، حربی کافروں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا ممنوع ہے کافروں کو ملازم رکھنا اور اُن کے اداروں میں ملازم ہونا یہ بھی جائز ہے۔ البتہ دلی دوستی اور محبت کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ قرآنِ کریم نے کافروں سے جو قلبی دوستی رکھنے کو منع فرمایا ہے کہ یہ کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ خود کافر بھی اسی پر عامل

ہیں وہ بھی مسلمانوں سے قلبی دوستی نہیں رکھتے جب تک کفر اور کافر سے قلبی نفرت نہ ہوگی اسلامی احکام پر پوری طرح عمل نہیں ہوسکتا۔

کافروں نے ممالک میں یک جہتی کے نام سے تحریک چلا رکھی ہے اور اس طرح سے مسلمانوں کو ان کے دین میں کچا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اپنی جماعت میں مدغم کرنے کی کوشش میں ہیں اور اُن کی کوشش انہیں مسلمانوں میں کامیاب ہوتی ہے جنہیں کفر اور کافر سے نفرت نہیں ہے بعض مسلمان کافروں سے جھینپتے ہیں کہ قرآن میں کافروں سے موالات کرنے کو منع فرمایا ہے اس میں جھینپنے کی کوئی بات نہیں کافر اس پر اعتراض کریں تو ان سے کہیں کہ تم خود بتاؤ کیا تم ہمیں دل سے چاہتے ہو اور ہمارے دین کو اچھا سمجھتے ہو؟ کیا ہمارا وجود تمہیں گوارا ہے؟ وہ اگر صحیح جواب دیں گے تو یہی کہیں گے کہ ہم تمہیں دل سے نہیں چاہتے لہٰذا اُن سے کہیں کہ جو تمہارا حال ہے وہی ہمارا طریقہ ہے۔

روافض کا تقیہ اور اس کی تردید...... روافض کے دین میں تقیہ کی بہت اہمیت ہے یہ ان کے دین کا بہت بڑا رکن ہے **لا ایمان لمن لا تقیة له** ان کا مشہور عقیدہ ہے اور اس پر ان کا عمل بھی ہے انہوں نے اپنے تقیہ کے لئے آیت کے الفاظ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً سے استدلال کیا ہے، اوّل یہ سمجھ لیں کہ روافض کو تقیہ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ بات یہ ہے کہ یہودیوں نے جب روافض کو سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیّین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وسلم کے دین کے علاوہ دوسرا دین بنا کر دیا تو اس میں یہ بھی تھا کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے خلافت غصب کر لی تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بلافصل تھے، اس پر مسلمانوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ اگر وہ خلیفہ بلافصل تھے تو انہوں نے حق کا اعلان کیوں نہیں کیا اور ۲۶ سال تک ان حضرات کے مشوروں میں کیوں شریک رہے؟ اور جہادوں میں ان کے ساتھ کیوں شرکت کی اور ان کے پیچھے جمعہ اور عیدین کیوں پڑھتے رہے اور روزانہ جماعتوں میں کیوں حاضر رہے؟ اس پر روافض کو ان کے استادوں یعنی یہودیوں نے یہ نکتہ سمجھا دیا کہ حضرت علیؓ نے تقیہ کر لیا تھا۔ یہ تقیہ کا ایسا ہتھیار دشمنوں نے ان کے ہاتھ میں دیا کہ اس کو انہوں نے دین کا بہت بڑا استون بنالیا۔ ہر بات میں تقیہ کے ذریعہ گرفت میں آنے سے بچ جاتے ہیں اور اپنے عقیدہ کے خلاف قصداً و ارادۃً بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں اور اس کو بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ کہاں حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا جری اور بہادر ببانگ دہل حق کا اعلان کرنے والے اور کہاں روافض کا تقیہ جو عقیدہ کے خلاف کہہ دینے اور مخاطب کو دھوکہ دینے پر مبنی ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلفاءِ ثلاثہ سے دبنے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ حق گو حق بین حق شناس صحابی (کرم اللہ وجہہ) تھے۔ باطل سے دبنا اور حق کے خلاف زبان نہ کھولنا اہلِ حق کا شیوہ نہیں۔ بزعم روافض حضرت علیؓ خلیفہ بلافصل بھی تھے اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے دب بھی گئے خاتم النبیّین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم کا خلیفہ مخلوق سے دب جائے یہ بات اہلِ ایمان کو سمجھ میں آنے والی نہیں۔

اب دوسرا رخ لیجئے وہ یہ کہ حضرت حسینؓ جب روافض کی دعوت پر کوفہ پہنچے اور وہاں دیکھا کہ اُن کے جھوٹے حامی اُن سے الگ ہو گئے اور اُن کے ساتھ اپنے ہی خاص لوگ مختصر سی تعداد میں رہ گئے تو انہوں نے اظہارِ حق کے لئے جان دینا اور اپنے اہلِ بیت کو قتل کروانا مناسب جانا، اگر تقیہ کوئی دین کا کام تھا تو اُن کو بطور تقیہ یزید اور ابن زیاد کی بات مان لینا چاہیئے تھا، معلوم ہوا کہ روافض کا تقیہ ان کے آئمہ سے بھی ثابت نہیں ہے یہ ایک تراشیدہ عقیدہ ہے اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن سے اس کا کوئی ثبوت نہیں اور جن کو شیعہ اپنا امام مانتے ہیں اُن سے بھی ثابت نہیں اور جو روایات روافض نے تقیہ کے بارے میں اماموں کی طرف منسوب کی ہیں وہ سب جعلی ہیں شیعہ مؤلفین نے تراشی ہیں، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور دیگر آئمہ نے (بقول روافض) تقیہ خوف کی وجہ سے کیا ہو یا بلاخوف، یہ خلیفہ

برحق کی شان کے خلاف ہے۔ اندر کچھ اور باہر کچھ یہ امام کی شان کے خلاف ہے۔ روافض کے نزدیک خلیفہ اوّل کا جو حال ہے وہی بعد کے اماموں کا بھی حال ہے ان کے نزدیک وہ سب تقیہ کرنے والے تھے۔ (العیاذ باللہ) روافض کا جو تقیہ ہے اس کا قرآن کریم سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً میں یہ بتایا کہ کوئی مسلمان کافروں میں پھنس جائے۔ مثلاً محبوس ہو یا محبوسوں کی طرح سے ہو (جیسے اندھے، اپاہج، لنگڑے، لُولے اور بیمار) اور کافر کفر کا کلمہ کہلوانے پر کسی ایسی تکلیف دینے کی دھمکی دیں جو نا قابلِ برداشت ہو اور وہ جو دھمکی دے رہے ہیں اس پر وہ قادر بھی ہوں تو زبان سے کلمۂ کفر کے کہنے کی اجازت ہے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ میں اجازت دی ہے۔ لیکن فضیلت اسی میں ہے کہ جان دیدے اور تکلیف اُٹھالے اور کفر کا کلمہ زبان پر نہ لائے اور روافض کو قرآن مجید سے استدلال کرنے کا حق کیا ہے وہ تو اسے محرف مانتے ہیں اور صحیفہ عثمانی مانتے ہیں، جو قرآن ہمارے پاس ہے جس کو ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتے ہیں اور جس کے بارے میں محفوظ غیر محرف ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اس سے منکرین قرآن کو استدلال کرنے کا کیا حق ہے۔ ممکن ہے کوئی رافضی یوں کہے کہ ہم تمہیں الزام دینے کے لئے تمہارے قرآن سے استدلال کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی جہالت سے اپنے خودتراشیدہ عقیدہ کیلئے آیت کا مطلب جو تم نے تجویز کیا ہے ہم پر حجت نہیں، پھر تمہیں تو پھر بھی تقیہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے اس کی دلیل کیلئے کم از کم حضرت علیؓ کا ایک ارشاد ہی ثابت کر دیجئے جو صحیح سند سے ہو۔ روافض کا بنایا ہوا نہ ہو۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

آپ فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ گے جو تمہارے سینوں میں ہے یا اُسے ظاہر کرو گے تو اللہ اس کو جان لے گا، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٩ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر شخص اپنے نیک عمل کو حاضر پائے گا

مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ

اور ان کاموں کو بھی پالے گا جو بُرے تھے۔ اُس کی خواہش ہو گی کہ کاش اس کے اور اُس دن کے درمیان بہت دور کی مسافت ہوتی اور اللہ تم کو اپنے

نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝٣٠

سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

معانقۃ ٤ ع ۲۰

اللہ سب جانتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

پہلے تو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کو سب کچھ معلوم ہے دلوں کا حال چھپاؤ یا ظاہر کرو وہ سب کو جانتا ہے، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اُسے وہ سب معلوم ہے اور اُسے ہر چیز پر قدرت بھی ہے، جس ذات پاک کے علم و قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں اُس سے ڈرنا اور اُس کے احکام کی پابندی کرنا لازم ہے۔

قیامت کے دن کی پریشانی...... پھر قیامت کے دن کا ایک منظر بتایا اور وہ یہ کہ دنیا میں جس شخص نے بھی جو عمل کیا ہوگا خیر ہو یا شر ہو

وہ اُسے وہاں اپنے سامنے حاضر کیا ہوا پالے گا، انسان کی تمنا ہوگی کہ کاش یہ دن نہ ہوتا جس میں اعمال پیش ہوئے، میرے اور اس دن کے درمیان بہت بڑی مسافت حائل ہوتی، لہٰذا اس دن سے پہلے ہی ہر شخص کو اپنے اعمال درست کر لینا اور اعمالِ صالحہ کی فکر کر لینا لازم ہے۔ بُرے عمل کا بُرا انجام ہے پہلی آیت میں وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ فرمایا پھر اس آیت میں بھی اس کا اعادہ فرما کر مکرر نصیحت فرما دی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

آپ فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت فرمائے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

غفور ہے رحیم ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، سو اگر وہ اعراض کریں تو بلاشبہ اللہ دوست نہیں رکھتا کافروں کو۔

اگر اللہ سے محبت ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو

ان دونوں آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور اطاعت کا حکم دیا ہے، اطاعت فرمانبرداری اور حکم ماننے کو کہتے ہیں اور اتباع اپنے مقتدا کے پیچھے چلنے اور اس کی راہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ جتنی بھی مذہبی قومیں ہیں وہ اللہ کو مانتی ہیں (اگرچہ ماننے کے طریقے مختلف ہیں) اور انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی کتاب میں یہ اعلان کروا دیا کہ محبت صرف دعویٰ کرنے کی چیز نہیں اس کا ایک معیار ہے اور وہ محبت معتبر ہے جو محبوب کی مرضی کے مطابق ہو اُس محبت کا معیار جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے یہ ہے کہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے آپ نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ کر کے دکھایا اُسے اختیار کریں اور اُسے عمل میں لائیں، اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہوگی۔ اور یہ محبت دنیا اور آخرت میں خیر و خوبی کا ذریعہ بنے گی۔ اتباع کے ساتھ اطاعت کا بھی حکم دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، ان دونوں اطاعتوں سے اعراض کرنے والے کو کافر قرار دیا اور فرمایا کہ اگر وہ اعراض کریں تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ فرمانبرداری عقائد میں بھی ہے اور ارکانِ دین میں بھی، فرائض میں بھی، اور واجبات میں بھی، عقائد اسلامیہ سے اعراض کرنا تو کفر ہے ہی۔ فرائض کی فرضیت کا انکار بھی کفر ہے، اگر کسی کے عقائد صحیح ہوں اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہو اور فرائض کو فرائض مانتا ہو تو ترک فرائض کی وجہ سے اس کا کفر اعتقادی نہیں بلکہ عملی ہوگا۔

محبت کے دعویداروں کو تنبیہ...... جو لوگ دین اسلام قبول نہیں کرتے اور اللہ سے محبت کرنے کے دعویدار ہیں اُن کے لئے تو آیت شریفہ میں تنبیہ ہے ہی کہ جب تک محبوبِ رب العالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک نہ کہو گے اُن کی دعوت اور اُن کا دین قبول نہ کرو گے اللہ سے محبت کرنے والوں میں اللہ کے نزدیک شمار نہ ہو گے اور تمہاری محبت اور محبت کا دعویٰ سب ضائع ہے، بیکار ہے اور اکارت ہے۔ ساتھ ہی اُن مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے جو اللہ سے محبت کے بھی دعویدار ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بھی بڑھ چڑھ کر دعویٰ کرتے ہیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور اطاعت سے دور ہیں۔ کاروبار بھی حرام ہے پھر بھی اللہ و رسول سے محبت ہے، داڑھی منڈی ہوئی ہے پھر بھی محبت کا دعویٰ ہے۔ لباس نصرانیوں کا ہے پھر بھی مدعیان محبت ہیں، ملکوں کو کافروں کے قوانین کے مطابق چلاتے ہیں پھر بھی محبت کرنے والے ہیں، یہ محبت نہیں محبت کا دھوکہ ہے اور جھوٹا دعویٰ ہے۔

منکرینِ حدیث کی تردید...... ساٹھ ستر سال سے ایک گروہ ایسا نکلا ہے جو عمل بالقرآن کا مدعی ہے یہ لوگ اطاعت رسول اور اتباعِ رسول کو دین کا جزو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئی اور رسول کی حیثیت ایک ڈاکیہ کی ہے کتاب کو ہم سمجھ لیں گے جیسا مکتوب الیہ اپنے نام کا خط خود پڑھ لیتا ہے۔ رسول کو بیچ میں ڈالنے اور اس کے سمجھانے اور تفسیر کرنے کی کیا ضرورت؟ العیاذ باللہ یہ لوگ اُن تمام آیات کے منکر ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ نحل میں فرمایا وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے لئے بیان فرمائیں جو اُن کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ لوگ فکر کریں، اور سورۂ نساء میں فرمایا اِنَّـآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰٮكَ اللّٰهُ ‌ؕ (بے شک ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلے کریں اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے آپ کو سمجھایا) معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کا بیان کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے اُن سے ہٹ کر جو سمجھنے کا ارادہ کرے گا وہ اللہ کی کتاب سے دور ہو گا، عامل بالقرآن نہیں ہوگا بلکہ اپنے نفس کی ذاتی رائے سے چلنے والا ہوگا۔ سورۂ اعراف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ کہ وہ لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تحریم و تحلیل کا کام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد کئے ہوئے کاموں میں سے ہے۔

حدیث کو چھوڑ کر عمل بالقرآن کے مدعی درحقیقت نفس کی آزادی چاہتے ہیں اور اتباعِ رسول اور اطاعتِ رسول کے انکار کی لپیٹ میں انکارِ قرآن بھی مضمر ہے اور یہ لوگ عجمی سازش کا شکار ہیں اپنے عجمی استادوں یعنی یورپ اور امریکہ کے یہود و نصاریٰ کے اشاروں سے گمراہی اور زندقہ پھیلا رہے ہیں اگر قرآن کے ماننے والے ہوتے تو بحکم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کو لازم قرار دیتے اور احادیثِ شریفہ پر عمل کرنے کی تلقین کرتے۔

قرآن کے بارے میں قرآن ہی کا بیان معتبر ہے قرآن نے تو یہ نہیں فرمایا کہ میری حیثیت ایک ذاتی خط کی ہے قرآن نے تو اپنے بارے میں هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَالۡفُرۡقَانِ فرمایا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا۔ اور چونکہ عقل انسانی ہدایت پانے کے لئے ناکافی ہے (اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی) اور اللہ جل شانہٗ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبیّنِ قرآن اور مفسرِ قرآن بنا کر بھیجا اور آپ کے اتباع کا حکم دیا اس لئے آپ کی تشریحات و تعلیمات کے مطابق عمل پیرا ہونا لازم ہے اگر کتاب اللہ کے معانی و مفاہیم ہر شخص کی سمجھ کے مطابق تسلیم کر لئے جائیں تو ہر آیت کے معانی سینکڑوں طرح کے تجویز کر دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب عقلمندی کے جھوٹے دعویداروں کا کھلونا بن کر رہ جائے گی۔ اعاذنا اللہ من خرافاتھم۔

ان جاہلوں کو اپنے خیال میں قرآن سے عقیدت ہے قرآن کے نازل فرمانے والے کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتے، وہ خالق و مالک ہے اسے سب کچھ اختیار ہے۔ اگر اس نے کتاب نازل فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ اس کی تشریح و تفسیر عائد فرما دی اور بہت سے احکام آپ کی زبانی بیان کروا دیئے تو اس سے ناگواری کیوں ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۳۳ ذُرِّيَّةً ۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ؕ

بے شک اللہ نے منتخب فرما لیا آدم کو اور نوح کو اور آلِ ابراہیم کو اور آلِ عمران کو سارے جہانوں پر۔ بعض اُن میں بعض کی اولاد ہیں،

وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ‌ۚ ۝۳۴ اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لَـكَ مَا فِىۡ بَطۡنِىۡ مُحَرَّرًا

اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جب عرض کیا عمران کی بیوی نے کہ اے میرے رب بے شک میں نے آپ کے لئے نذر مان لی کہ جو بچہ میرے شکم میں ہے وہ آزاد

فَتَقَبَّلۡ مِنِّىۡ‌ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۳۵ فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّىۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰىؕ

ہوگا لہٰذا آپ اُس کو مجھ سے قبول فرمائیے، بے شک آپ ہی ہیں سننے والے جاننے والے۔ پس جب اس کو جنا تو کہنے لگیں اے میرے رب بلاشبہ میں نے اس کولڑکی جنا ہے،

وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡؕ وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡاُنۡثٰى‌ۚ وَاِنِّىۡ سَمَّيۡتُهَا مَرۡيَمَ وَاِنِّىۡۤ اُعِيۡذُهَا بِكَ

اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا ہے، اور نہیں ہے بیٹا بیٹی کی طرح سے، اور میں نے اُس کا نام رکھ دیا ہے مریم، اور بے شک میں اس کو اور اس کی ذرّیت کو

وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ۝۳۶ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا

تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔ سو اس کے رب نے قبول فرمالیا اس بچی کو اچھی طرح قبول فرمانا اور اس کو بڑھایا اچھی طرح سے بڑھانا، اور اس کو زکریا کی

زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ‌ۚ قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا‌ ؕ

کفالت میں دے دیا جب کبھی زکریا داخل ہوئے ان پر محراب میں تو پایا اُن کے پاس رزق، تو انہوں نے کہا کہ اے مریم کہاں سے ہے یہ تیرے لئے،

قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝۳۷

انہوں نے کہا کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے حساب۔

حضرت مریم کی والدہ کی نذر، اور اُن کی ولادت اور کفالت کا تذکرہ

ان آیات میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کو اور حضرت ابراہیم اور جناب عمران کی آل اولاد کو سارے جہانوں پر فضیلت دی اور اُن کو منتخب فرمالیا، اور یہ بھی فرمایا کہ یہ بعض بعض کی اولاد ہیں، آدم علیہ السلام تو سب کے باپ ہیں ہی پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی آل اور عمران اور آلِ عمران سب ہی نسل در نسل آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی نبوت عطا فرمائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پیغمبر بنایا اور آئندہ جتنے بھی نبی آئے وہ سب انہیں کی نسل میں سے تھے جن میں خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور آلِ عمران بھی اُن ہی کی نسل میں سے تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کے بیٹے تھے اور یہ عمران کی بیٹی تھیں یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کے علاوہ دوسرے عمران ہیں۔ معالم التنزیل ص ۲۴۶ ج ۱ میں لکھا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ۱۸۰۰ سال کا فاصلہ تھا۔ پھر مریم علیہا السلام کی والدہ عمران کی بیوی کی نذر کا تذکرہ فرمایا انہوں نے نذر مانی تھی کہ اے میرے رب میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں نے اُس کو آزاد

چھوڑنے کی منت مان لی اور آزاد چھوڑنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کو صرف بیت المقدس کی خدمت کے لئے فارغ رکھوں گی دنیا کا کوئی کام نہیں لوں گی۔ مسجد کی خدمت کرنے والے مرد ہوتے تھے اب ہوا یہ کہ جس حمل کے بچہ کو آزاد چھوڑنے کی منت مانی تھی جب اس حمل کی پیدائش ہوئی تو لڑکا نہ تھا بلکہ لڑکی تھی۔ عمران کی بیوی افسوس کرنے لگیں اور کہنے لگیں کہ اے میرے رب میرے تو لڑکی پیدا ہوگئی۔ لڑکی بیت المقدس کی خدمت گزار کیسے بنے گی۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی تھا کہ اس نے کیا جنا لیکن انہوں نے بطور حسرت کے اللہ پاک سے یوں خطاب کیا۔ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی اور اپنی حسرت کو دوسرے الفاظ میں یوں دہرایا: وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی کہ لڑکا لڑکی کی طرح سے نہیں ہے۔ اس عبارت کو بعض علماء نے مبالغۃً قلب پر محمول کیا ہے اور علامہ بیضاوی نے اوّل تو دونوں لام عہد کے لئے بنائے ہیں پھر یہ تفسیر کی ہے اَیْ وَلَیْسَ الذَّکَرُ الَّذِیْ طَلَبَتْ کَالْاُنْثٰی وُهِبَتْ اور پھر لکھا ہے۔ ویجوز ان یکون من قولها بمعنی ولیس الذکر کالانثی سیئان فیما نذرت فیکون اللام للجنس مطلب یہ ہے کہ لڑکا لڑکی فی الحقیقت برابر نہیں۔ لڑکی وہ کام نہیں کر سکتی جو لڑکا کر سکتا ہے۔

حضرت حکیم الامّت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ولیس الذکر کالانثی حضرت مریم کی والدہ کا قول نہیں ہے بلکہ یہ جملہ معترضہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لڑکی انہوں نے جنی لڑکا اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا جو انہوں نے طلب کیا تھا بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کیونکہ اس کے کمالات و برکات عجیب و غریب ہوں گے یہ معنی لینے سے تشبیہ مقلوب کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔

عمران کی بیوی نے لڑکا پیدا نہ ہونے کا افسوس ظاہر کرنے کے بعد کہا وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ کہ میں نے اس بچی کا نام مریم رکھ دیا پھر یوں کہا وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (کہ میں اس لڑکی اور اس کی ذریت کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے) صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس وقت پیدا ہوتا ہے۔ سو وہ اس کے چھونے سے چیختا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے (کہ وہ اُن کو نہیں چھو سکا) بعض روایات میں ہے کہ شیطان اپنی انگلی سے کچوکا دیتا ہے اسی لئے بچہ چیخ پڑتا ہے سوائے مریم اور اُن کے بیٹے کے کہ وہ ان دونوں تک نہیں پہنچ سکا اور ایک روایت میں ہے کہ وہ پردے میں اُنگلی مار کر چلا گیا۔ (روح المعانی ص ۱۳۷ ج ۱)

حضرت مریم کا نشو ونما اور حضرت زکریاؑ کی کفالت ...... حضرت مریم کی والدہ کا قول ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّ کَفَّلَهَا زَکَرِیَّا کہ اُس کے ربّ نے اس بچی کو قبول فرما لیا۔ نذر کو ہدیہ سے تشبیہ دی اور اُن کی نذر سے راضی ہونے کو قبول کرنے سے تعبیر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور بہت خوبی کے ساتھ قبول فرمایا، علماءِ تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت مریمؑ پیدا ہو گئیں تو اُن کی والدہ جن کا نام حنہ تھا ان کو کپڑے میں لپیٹ کر بیت المقدس میں لے گئیں اور وہاں جو عبادت میں مشغول رہنے والے حضرات مقیم تھے اُن کے سامنے رکھ دیا (اور پوری کیفیت بتا دی کہ میری یہ نذر تھی اور یہ لڑکی پیدا ہوئی ہے) زمانۂ حمل میں لڑکی کے والد جناب عمران کی وفات ہو چکی تھی وہ وہاں کے امام بھی تھے۔ وہ ہوتے تو پرورش کے زیادہ مستحق تھے۔ مریم کی والدہ نے مریم کا (عابدہ) نام رکھا جس میں یہ اشارہ ہے کہ میں اپنی نذر پر اب بھی قائم ہوں۔ خدمت کے لئے نہیں تو عبادت ہی کے لئے سہی۔ اسی نذر کی وجہ سے وہ بیت المقدس کے مقیمین کے پاس لے گئیں۔ (روح المعانی، بیان القرآن)

ان حضرات نے بچی کی کفالت کے سلسلے میں منافست اختیار کی اور ہر ایک چاہتا تھا کہ میں اس کی پرورش کروں انہیں حضرات میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے جو اُن سب کے سردار تھے انہوں نے فرمایا کہ میں اس کی پرورش کا سب سے زیادہ حقدار ہوں اس لئے کہ

اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے وہ حضرات کہنے لگے کہ ہم سب آپس میں قرعہ ڈالیں گے جس کا نام نکل آیا وہی زیادہ حقدار ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے قلم منگوائے اوران کو جمع کر کے ڈھانک دیا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے ایک نابالغ بچے سے فرمایا کہ تو ہاتھ ڈال کر ایک قلم نکال لے اس نے نکالا تو حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم نکل آیا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ (اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ چند صفحات کے بعد آئے گی)۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں مریم علیہا السلام رہنے لگیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا نشوونما خوب اچھے طریقہ سے کیا جو دوسرے بچوں سے مختلف تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اُن کو علیحدہ ایک محراب میں رکھ چھوڑا تھا، محراب سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بیت المقدس میں ایک کمرہ اُن کے لئے مخصوص کر دیا تھا یہ کمرہ بلندی پر تھا جس میں زینہ سے چڑھتے تھے اور بعض حضرات نے محراب سے مطلق مسجد مراد لی ہے اور بعض حضرات نے محراب کا معروف معنی مراد لیا ہے۔

حضرت مریم کے پاس غیب سے پھل آنا ...... بہرحال وہ بیت المقدس میں رہتی رہیں اور نشوونما ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی طور پر اُن کو پھل ملتے رہے، گرمی کے پھل سردی کے زمانہ میں اور سردی کے پھل گرمی کے زمانہ میں اُن کے پاس ملتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام ان کا بہت دھیان رکھتے تھے اور اُن کے سوا کوئی شخص حضرت مریم علیہا السلام کے پاس نہیں جا سکتا تھا جب وہ ان کے پاس جاتے تو دیکھتے کہ غیر موسم کے پھل رکھے ہوئے ہیں اوّل تو دروازہ بند ہوتے ہوئے اندر پھلوں کا پہنچ جانا پھر غیر موسم کے پھل ہونا یہ دونوں باتیں بڑے تعجب کی تھیں، حضرت زکریا علیہ السلام نے اُن سے سوال فرمایا کہ یہ پھل کہاں سے آئے انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے اس آیت سے کرامات اولیاء کا ثبوت ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ

اس موقعہ پر زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، عرض کیا اے میرے رب مجھے آپ اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما دیجئے بلاشبہ آپ دعا سننے

الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا

والے ہیں۔ پس فرشتوں نے اُن کو آواز دی اس حالت میں کہ وہ کھڑے ہوئے محراب میں نماز پڑھ رہے تھے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے وہ اللہ

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ

کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور سردار ہوگا اور عورتوں سے دور رہنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین میں سے۔ وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب کہاں سے ہوگا میرے

وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ

لڑکا حالانکہ مجھے بڑھاپا پہنچ چکا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے۔ وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب میرے

اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ

لئے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کرے گا مگر صرف اشارہ سے، اور یاد کر اپنے رب کو

كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

کثرت کے ساتھ اور اللہ کی پاکی بیان کر شام اور صبح۔

اولاد کے لئے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء

حضرت زکریا علیہ السلام خوب زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے اور اُن کے کوئی اولاد نہ تھی جو دینی علوم اور اعمال میں اُن کی وارث بنے جیسا کہ سورۂ مریم میں ذکر فرمایا: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ○ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ○ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ○ (عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل پڑی اور آپ سے مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں اور میں اپنے بعد رشتہ داروں سے اندیشہ رکھتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے سو آپ مجھ کو خاص اپنے پاس سے ایک ایسا وارث دے دیجئے کہ وہ میرا وارث بنے اور یعقوب کے خاندان کا وارث بنے اور اس کو اے میرے رب پسندیدہ بنائیے)۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری ...... حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور فرشتوں کے ذریعہ اُن کو خوشخبری بھیجی کہ تمہارے لڑکا پیدا ہوگا جس کا نام یحییٰ ہوگا یہ لڑکا اللہ کے کلمہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ اور یہ لڑکا سردار ہوگا (صاحب روح المعانی نے متعدد علماء سے سیداً کے متعدد معانی نقل کئے ہیں الکریم، الحلیم، الحسن الخلق، الشریف، الفقیہ العالم، الراضی بقضاء اللہ تعالٰی، الخلیل، المتوکل، العظیم الھمة الذی لایحسد، الذی یفوق بالخیر قومه (سخی، بردبار، خوش خلق، شریف، عالم فقیہ، اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی رہنے والا، اللہ تعالیٰ کا خاص بندہ، توکل والا، عظیم ہمت والا، جس پر حسد نہیں کرسکتا، جو بھلائی میں اپنی پوری قوم سے بڑھ کر ہو) اس کے بعد لکھتے ہیں کہ سب معانی یحییٰ علیہ السلام کی شان کے لائق ہیں مگر تحقیقی بات یہ ہے سید کے اصل معنی یہ ہیں جو اپنی قوم کا سردار ہو اور اس کے اتباع ہوں پھر ہر اس شخص کے لئے اسی کا اطلاق ہونے لگا جو دین میں یا دنیا میں دوسروں پر فائق ہو۔)

حصور کا معنی ...... حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف میں حصور بھی فرمایا اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں معناه الذی لا یأتی النساء مع القدرة علٰی ذٰلک یعنی حصور وہ ہے جو قدرت ہوتے ہوئے عورت سے شہوانی حاجت پوری نہ کرے اور نفس کی خواہش کے باوجود صبر کرتا رہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے ہر طرح کی مباح اور حلال خواہشوں سے بچنا مراد ہے۔ نیز حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات بتاتے ہوئے نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ بھی فرمایا کہ یہ بچہ جس کی پیدائش کی بشارت دی جارہی ہے نبی ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔

صالحین کا مصداق ...... صالح صلاح سے مشتق ہے جو شخص گناہوں سے بچتا ہو اور نیکیوں سے آراستہ ہو اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع رکھتا ہو وہ صالح ہے اور اس کے بہت سے درجات ہیں اور مراتب ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سب سے اونچے درجے کے صالحین ہیں کیونکہ وہ معصوم تھے اُن کے بعد دوسرے صالحین کے درجات ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کرتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ اور سورۂ انبیاء میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر

کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَ اَدْخَلْنَاهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصَّالِحِیْنَ (اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت میں داخل کرلیا بے شک وہ صالحین میں سے تھے) معلوم ہوا کہ صالحیت بہت بڑی بلکہ اہلِ خیر کی مرکزی صفت ہے۔ صالح ہونا بہت بڑی چیز ہے۔ آج کل کوئی شخص بزرگ مشہور ہو اس کے مریدوں کے سامنے کوئی کہہ دے کہ ان کے پیر صالح آدمی ہیں تو وہ برا مانے گا کہ واہ صاحب ہمارے حضرت بس صالح ہیں وہ تو شمس العارفین ہیں اور قطب الاقطاب ہیں حالانکہ کسی کے بارے میں صالح ہونے کی گواہی بہت بڑی گواہی ہے کیونکہ یہ مقبولین بارگاہِ الٰہی کی مرکزی صفت ہے۔

حضرت زکریاؑ کو استعجاب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب...... جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹا ملنے کی خوشخبری مل گئی اور بیٹے کی صفات بھی معلوم ہوگئیں تو بارگاہِ خداوندی میں عرض کرنے لگے کہ میرے لڑکا کہاں سے ہوگا میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے تو دعا ہی میں عرض کر دیا تھا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے اور اللہ کی قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے انہوں نے دعا کی تھی اب جب دعا قبول ہوگئی تو تعجب کیوں کر رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں حضرات مفسرین کرام نے کئی باتیں لکھی ہیں اوّل یہ کہ اُن کا سوال حصول ولد کی کیفیت سے تھا کہ مجھے اسی عورت سے اولاد عطا ہوگی یا دوسری کوئی جوان عورت سے نکاح کرنا ہوگا۔ دوم یہ کہ یہ تعجب بشریت کے فطری تقاضے کے اعتبار سے اُن کی زبان سے ظاہر ہوگیا۔ قدرتِ الٰہی کو کامل جانتے ہوئے بھی اس قسم کے مواقع پر انسان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں۔

سوم بعض حضرات نے فرمایا کہ غایت اشتیاق کی وجہ سے انہوں نے سوال کیا تاکہ خدائے پاک کی طرف سے دوبارہ بشارت کا اعادہ ہو۔ اور قلبی لذت میں اضافہ ہو جائے جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے تعجب خیز انداز میں یہ کہا کہ اے میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا پہنچ گیا اور میری عورت بانجھ ہے تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ یعنی تمہارا بڑھاپا ہوتے ہوئے ہی اولاد ہو جائے گی اللہ جو چاہے کرے اُسے اختیار ہے، خلاف عادت افعال عجیبہ پر اس کو پوری طرح قدرت ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ كَذٰلِكَ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی الامر كذلك اور اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کو اس کا بیان قرار دیا ہے۔

جب دوبارہ بشارت مل گئی تو حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ میرے لئے کوئی ایسی نشانی مقرر فرما دیجئے کہ جس سے مجھے پتہ چل جائے کہ استقرارِ حمل ہو چکا ہے۔ یہ اس لئے عرض کیا کہ خوشی کی ابتداء ابتداءِ حمل ہی سے ہو جائے اور اللہ کی نعمت کا شکر مزید در مزید ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے اُن کے لئے یہ نشانی مقرر فرما دی کہ تم تین دن تین رات تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے تین دن کا ذکر تو یہیں اسی آیت میں موجود ہے اور تین رات کا ذکر سورۂ مریم میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں سے بول ہی نہ سکو گے البتہ ہاتھ کا یا سر کا اشارہ کر کے بات کر سکو گے زبان سے بات کرنے پر قدرت نہ ہوگی اللہ کے ذکر پر تم کو قدرت ہوگی اور اپنے رب کا ذکر خوب زیادہ کرنا۔ صبح شام اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے اوقاتِ نماز کی پابندی مراد ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ صبح شام کنایہ ہے جمیع اوقات سے، مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہنا۔

سورۂ انبیاء اور سورۂ مریم میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ سورۂ مریم میں کچھ مضمون زائد ہے پہلے رکوع کے ختم پر دیکھ لیا جائے اور سورۂ انبیاء میں فرمایا: فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ کہ ہم نے زکریا کی دُعا قبول کی اور اُن کو یحییٰ (بیٹا) عطا فرما دیا اور اس کی بیوی کو درست کر دیا یعنی ولادت کے قابل بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ خالق الاسباب اور خالق المسببات

ہے وہ اسباب بھی پیدا فرماتا ہے اور اسباب کے بغیر بھی اُسے ہر چیز کی تخلیق پر قدرت ہے۔

نکاح کی شرعی حیثیت...... حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات میں جو لفظ حَصُوْرًا وارد ہوا ہے (عورتوں سے پرہیز کرنے والا) اس سے حضرات شوافع نے اپنے مذہب کے لئے استدلال کیا ہے کہ نکاح نہ کرنا افضل ہے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ نکاح کرنا سنت ہے اور نفس کا تقاضا زیادہ ہو تو نکاح کرنا واجب ہے۔ احادیث شریفہ سے یہ امر بخوبی واضح ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے جوانو! تم میں سے جسے نکاح کی قدرت ہو وہ نکاح کرلے کیونکہ وہ نظر کو پست رکھنے کا ذریعہ ہے اور شرم کی جگہ کو پاک رکھنے والی چیز ہے، اور جسے نکاح کی قدرت نہ ہو اُسے چاہیئے کہ روزے رکھے۔ کیونکہ روزوں سے اس کی قوتِ شہوانیہ دب جائے گی۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ نے تبتل یعنی نکاح نہ کرنے کی اجازت چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو رد فرما دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۶۷ از بخاری و مسلم) نکاح نہ کرنا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خصوصیت تھی۔ عام طور سے حضراتِ انبیاء علیہم السلام نکاح کرتے رہے۔ سورۂ رعد میں فرمایا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (اور البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلے رسول بھیجے اور اُن کے لئے بیویاں مقرر کیں اور اولاد عطا کی) سنن الترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں پیغمبروں کے طریقوں میں سے ہیں شرم والا ہونا، عطر لگانا، مسواک کرنا، نکاح کرنا۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ

اور جب کہا فرشتوں نے کہ اے مریم بے شک اللہ نے تجھے منتخب فرما لیا اور پاک بنا دیا اور سب جہانوں کی عورتوں کے مقابلہ میں

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

تم کو چن لیا۔ اے مریم تم اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

فرشتوں کا حضرت مریم کو بتانا کہ اللہ نے تمہیں چُن لیا ہے

اس سے پہلے رکوع کی ابتداء میں فرمایا تھا کہ آلِ عمران کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمالیا پھر اُسی ذیل میں حضرت مریم کی پیدائش اور نشو و نما اور حضرت زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰ کا پیدا ہونا بیان فرمایا اب اُسی سلسلہ کے تتمہ کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ حضرت مریم کا منتخب فرمانا پھر اُن کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری دینا اور اُن کو رسالت سے سرفراز فرمانا اور اُن کے بعض معجزات کا ذکر فرمانا۔ یہ باتیں اس رکوع میں مذکور ہیں۔ اِصْطَفٰكِ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں۔ اختارک من اول الامر ولطف بک ومیزک علی کل محرر و خصک بالکرامات السنية۔ یعنی شروع ہی سے اللہ نے تجھے چن لیا اور تیرے ساتھ مہربانی فرمائی اور تجھے اُن تمام لڑکوں پر امتیاز بخشا جن کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے آزاد کیا جاتا ہے اور بڑی بڑی کرامات کے ساتھ تجھے مخصوص فرمایا، اور طَهَّرَكِ کے بارے میں لکھتے ہیں أی من الادناس والاقذار التی تعرض للنساء مثل الحیض والنفاس حتی صرت صالحة لخدمة المسجد یعنی اللہ نے تجھے ان گندگیوں سے پاک فرمایا جو عورتوں کو پیش آجاتی ہے۔ جیسے حیض اور نفاس یہاں تک کہ تو مسجد کی خدمت کے لائق ہوگئی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ طهرک بالایمان عن الکفر وبالطاعة عن المعصية یعنی تجھے ایمان دیا اور کفر سے پاک رکھا اور طاعت میں لگایا اور گناہوں سے پاک رکھا۔ اور بعض حضرات نے اس کا مطلب بتاتے ہوئے یوں فرمایا

کہ نزھک عن الاخلاق الذمیمة و الطباع الردیة یعنی تجھے برے اخلاق سے اور بُری طبیعتوں سے پاک صاف کردیا۔ اس کے بعد صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ عموم پر محمول کیا جائے اور مطلب یہ ہے کہ ہر طرح کی گندگیوں سے تجھے اللہ نے پاک کردیا۔ اقذار حسیہ، معنویہ، قلبیہ قالبیہ سب سے صاف اور ستھری بنادیا۔

حضرت مریم کی فضیلت...... پھر فرمایا: وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اور تجھے جہانوں کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب فرما لیا، عموم الفاظ کے پیش نظر بعض حضرات نے فرمایا کہ دنیا کی تمام عورتوں پر حضرت مریم علیہا السلام کو فضیلت دی گئی اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اُس سے اُن کے اپنے زمانہ کی عورتیں مراد ہیں۔

روایات حدیث میں حضرت مریم بنت عمران حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) اور حضرت خدیجہ بنت خویلد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اہلیہ) اور حضرت فاطمہ بنت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عَنْهُنَّ کے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ ان فضائل کی وجہ سے بعض حضرات نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور بعض حضرات نے توقف کیا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان کے فضائل مختلف جہات سے ہیں۔

حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت...... حضرت فاطمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جگر گوشہ تھیں اس حیثیت سے ان کو سب پر فضیلت حاصل ہے اور صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فاطمہ میرے جسم کا حصہ ہے، مجھے وہ چیز ناگوار ہوتی ہے جو اُسے ناگوار ہو اور وہ چیز مجھے ایذا دیتی ہے جو اُسے ایذا دے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۶۸ از بخاری ومسلم) نیز صحیح بخاری ص ۵۱۲ ج ۱ میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں حضرت فاطمہؓ سے فرمایا أما ترضين ان تكوني سيدة نساء اهل الجنة او نسأ المؤمنين (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ جنت والی عورتوں کی سردار ہوگی یا یوں فرمایا کہ مؤمنین کی عورتوں کی سردار ہوگی)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت...... حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس اعتبار سے افضل ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی بیوی ہیں اور سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلام قبول کیا اور اپنا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور دین اسلام کی خدمت میں پوری طرح لگادیا جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى اس کی تفسیر میں علماء لکھتے ہیں کہ اَیْ بِمَالِ خَدِيْجَةَ (یعنی اللہ نے آپ کو بے پیسے والا پایا سو آپ کو خدیجہ کے مال کے ذریعہ مال والا بنادیا)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت...... حضرت عائشہؓ کی فضیلت اس اعتبار سے دوسری تمام عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے آپ کے علوم کو تمام بیویوں سے زیادہ پھیلایا احکام ومسائل بتائے بہت بھاری تعداد میں اُن کے شاگرد تھے جنہوں نے اُن سے علوم حاصل کئے۔ الاصابہ ص ۳۶۰ ج ۴ میں ہے کہ حضرت عطاء بن ابی رباح تابعی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب لوگوں سے زیادہ فقیہ تھیں اور سب لوگوں سے زیادہ عالمہ تھیں اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب بھی کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوا تو ہم نے حضرت عائشہؓ کے پاس ضرور اس کے بارے میں علم پایا۔ یہ تو حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہن کی فضیلتیں ہیں جو مختلف جہات سے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت اس اعتبار سے ہے کہ اُن کی والدہ نے اُن کو بیت المقدس کے لئے بطورِ خادم مقرر کیا اور حضرت زکریا علیہ السلام نے اُن کی کفالت کی اور اُن کے پاس غیب سے رزق آیا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بنیں۔

حضرت آسیہؓ کی فضیلت ...... اور حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) کی فضیلت اس اعتبار سے ہے کہ انہوں نے اس ماحول میں اسلام قبول کیا جبکہ فرعون ایمان قبول کرنے والوں کو بہت تکلیف دیتا تھا۔ زمین پر لٹا کر ہاتھوں میں کیلیں گاڑ دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے بطورِ مثال اہل ایمان کا ذکر فرماتے ہوئے سورۂ تحریم میں یوں اُن کا ذکر فرمایا: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (اور اللہ نے بیان فرمایا مسلمانوں کے لئے فرعون کی بیوی کا حال جبکہ اس نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنایئے اور مجھ کو فرعون سے اور اُس کے عمل سے نجات دیجئے اور مجھ کو تمام ظالم لوگوں سے نجات دیجئے)۔

صحیح بخاری ص ۵۳۲ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مردوں میں بہت لوگ کامل ہیں اور عورتوں میں کامل نہیں ہیں مگر مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسی فضیلت ہے ثرید کی باقی تمام کھانوں پر۔

بہر حال ان پانچوں خواتین کی فضیلت بہت زیادہ ہے جو روایاتِ حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ کلی فضیلت کس کو حاصل ہے۔ اللہ ہی کو معلوم ہے۔

وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی تفسیر ...... حضرت مریم علیہا السلام کے انتخاب اور اصطفاء کا ذکر فرمانے کے بعد اس بات کا ذکر فرمایا کہ فرشتوں نے اُن سے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی فرمانبرداری کرنے اور رکوع سجدہ کرنے کے لئے کہا، اس میں سجدہ کا ذکر رکوع سے پہلے ہے اس کی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا کہ پہلی اُمتوں میں سجدہ رکوع سے پہلے کیا جاتا تھا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ واو ترتیب کے لئے نہیں مطلق جمع کے لئے ہے پہلی اُمتوں میں بھی رکوع سجدہ سے پہلے ہی تھا۔ رکوع کے ذکر کے ساتھ مع الراکعین بھی فرمایا اس کے بارے میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہود نے نماز میں رکوع چھوڑ دیا تھا جیسے بعضے ہم میں قومہ چھوڑ دیتے ہیں اور بعضے رکوع کرتے تھے اس لئے حکم فرمایا کہ نماز کے طریقہ میں اُن لوگوں کے ساتھ رہنا جو رکوع بھی کیا کرتے تھے پس مقصود اہتمام ہے رکوع کا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ امر منقول کسی کے نزدیک ثابت نہ ہو تو عمدہ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فرائض صلوٰۃ میں قیام و سجود کی ہیئت میں عادۃً خلل کم ہوسکتا ہے بخلاف رکوع کے کہ اس کی ہیئت میں خلل زیادہ محتمل ہوتا ہے جیسا کہ اکثر مشاہدہ ہے کہ رکوع میں لوگ کم جھکتے ہیں جس سے وہ اقرب الی القیام رہتا ہے اور کیونکہ اس ہیئت میں معاینہ کو ایک خاص دخل ہے اس لئے مع الراکعین بڑھا دیا کہ جس طرح سے کامل راکعین کیا کرتے ہیں۔ ویسے ہی کرنا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں اور آپ نہیں تھے اُن کے پاس جب کہ وہ ڈال رہے تھے اپنی قلموں کو کہ اُن میں سے کون

يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

مریم کی کفالت کرے اور آپ نہیں تھے اُن کے پاس جس وقت کہ وہ جھگڑ رہے تھے۔

نبوتِ محمدیہ ﷺ پر واضح دلیل

ابھی حضرت مریم علیہا السلام سے متعلق بعض چیزوں کا بیان باقی ہے جو اس آیت کے بعد آنے والا ہے۔ درمیان میں ایک اہم

بات کی طرف توجہ دلا دی اس میں بظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مضمون یہودیوں کو یاد دہانی سے متعلق ہے یہودیوں کے سامنے بار بار ایسی چیزیں آتی تھیں جن سے یہ یقین ہو جاتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی آخر الزمان آپ ہی ہیں جن کی خوشخبری اُن کی کتاب میں دی گئی تھی لیکن وہ ضد عناد اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے خود اُن کے اپنے آباؤ اجداد سے متعلق واقعات جو وہ جانتے تھے قرآن مجید میں وہ بھی بیان کئے گئے اور سب کو یہ بھی معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی ہیں کتابیں نہیں پڑھیں۔ اور علماء یہود کے پاس رہنا بھی نہیں ہوا۔ لامحالہ یہودیوں کے آباؤ اجداد سے متعلق واقعات ضرور وحی کے ذریعہ پہنچے ہیں لیکن جسے ہدایت پر آنا ہی نہ ہو وہ کسی بھی بات سے ہدایت وعبرت حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت مریم کی والدہ کا نذر ماننا پھر حضرت مریم کا پیدا ہونا پھر حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں نشو ونما ہونا اُن کے پاس غیب سے رزق آنا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کا دعا کرنا اور اُن کے ہاں بیٹا پیدا ہونا۔ حضرت مریم کو فرشتوں کا خطاب کرنا یہ سب اُمورِ غیب کی باتیں ہیں جنہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن سے پہلے نہیں جانتے تھے ان چیزوں کا علم آپ کو صرف وحی کے ذریعہ ہوا اور یہ آپ کے معجزات واضحہ میں سے ہے آیتِ بالا میں یہودیوں کو توجہ دلائی کہ دیکھو یہ خبریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں سے معلوم ہوئیں جو تمہارے آباء و اجداد سے متعلق ہیں اور جنہیں تم جانتے اور پہچانتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ان کا ذریعہ صرف وحی ہے لہٰذا حق کو قبول کرو۔

حضرت مریم کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی...... مذکورہ خبروں کے تذکرہ کے علاوہ ایک اور بات کا بھی تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو بیت المقدس میں لے کر آئیں تو اُن کی کفالت کے سلسلے میں وہاں کے حاضرین وعابدین آپس میں جھگڑنے لگے ہر ایک کہتا تھا کہ مجھے ان کی کفالت کی سعادت نصیب ہو۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنا استحقاق ظاہر فرمایا کہ اس بچی کی خالہ میرے گھر میں ہے اس کی تربیت کا حق مجھے زیادہ پہنچتا ہے لیکن وہ لوگ نہ مانے اور کہنے لگے کہ ہم قرعہ ڈالیں گے جس کا نام نکلے گا اسی کو استحقاقِ کفالت ہوگا۔ معالم التنزیل ص ۲۹۶ ج ۱ میں لکھا ہے کہ یہ حضرات ۲۹ افراد تھے انہوں نے آپس میں طے کیا کہ سب لوگ پانی میں قلم ڈالیں جس کا قلم چڑھ جائے وہ زیادہ مستحق ہوگا یہ لوگ نہر اُردن پر پہنچے اور اس میں اپنے اپنے قلم ڈالے ہر ایک قلم پر صاحبِ قلم کا نام لکھا ہوا تھا سب کے قلم پانی میں بیٹھ گئے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ پانی میں بہہ گئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم پانی پر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسا کہ مٹی میں کھڑا ہو۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اُن کا قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں گیا بلکہ پانی کے اوپر الٹا ادھر ہی کو چلا گیا جس طرف سے پانی آ رہا تھا۔ بہر حال حضرت زکریا علیہ السلام کے نام قرعہ نکل آیا اور مجبوراً سب کو ان کا استحقاق ماننا پڑا یہ واقعہ بھی یہودیوں میں معروف و مشہور تھا۔ قرآن کریم نے اس کا اجمالی تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (کہ آپ اُن کے پاس نہیں تھے جبکہ وہ اپنے قلموں کو ڈال رہے تھے) وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (اور آپ اُن کے سامنے نہیں تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے) اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ یہ واقعہ بتایا، یہ بھی آپؐ کے معجزات میں سے ہے۔ مخاطبین بصیرت سے کام لیں اور ضد اور عناد اختیار نہ کریں تو یہ بھی ان کی ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ قال صاحب الروح ص ۱۵۸ ج ۳ قوله تعالٰی من انباء الغيب ای من اخبار ماغاب عنک وعن قومک مما لا يعرف الاّ بالوحی علی ما يشير عليه المقام وقال القرطبی ص ۸۵ ج ۴ فيه دلالة علی نبوة محمد صلی الله عليه وسلم حيث اخبر عن قصة زكريا و مريم ولم يكن قرأ الكتب واخبر عن ذلک و صدقه اهل الكتاب بذلک۔ (تلک من انباء الغيب یعنی یہ وہ خبریں ہیں جو آپ سے اور آپ کی امت سے پوشیدہ ہیں اور ایسی خبریں ہیں جو بغیر وحی کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ قرطبیؒ کہتے ہیں اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

نبوت پر دلیل ہے کیونکہ آپؐ نے حضرت زکریاؑ و مریمؑ کے بارے میں خبریں دیں اور اہل کتاب نے بھی آپؐ کی تصدیق کی حالانکہ آپؐ نے یہ خبریں کتابوں وغیرہ میں نہیں پڑھی تھیں)

فائدہ...... قرعہ ڈالنا امت محمدیہ میں بھی مشروع ہے اس کے مواقع کتب فقہ میں مذکور ہیں کتاب القسمۃ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈال لیتے تھے جس کا نام نکل آتا تھا اُسے ساتھ لے جاتے تھے۔ (رواہ البخاری و مسلم)

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ

جب کہا فرشتوں نے کہ اے مریم بے شک اللہ تمہیں خوشخبری دیتا ہے ایک کلمہ کی جو منجاب اللہ ہو گا اُس کا نام مسیح ہو گا

عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ

وہ عیسیٰ ابن مریم ہو گا وہ دنیا اور آخرت میں باوجاہت ہو گا اور مقربین میں سے ہو گا اور وہ لوگوں سے بات کرے گا

فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ

گہوارہ میں اور بڑی عمر میں، اور وہ صالحین میں سے ہو گا۔ وہ کہنے لگیں کہ اے رب میرے لڑکا کس طرح ہو گا حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا،

بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۖ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

فرمایا اللہ اسی طرح پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے، جب وہ کسی اَمر کا فیصلہ فرما دے، تو فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔

حضرت مریم کو حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری

ان آیات میں اس بات کو ذکر فرمایا کہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو بیٹا ہونے کی خوشخبری دی۔ بیٹے کا نام مسیح ہو گا جو عیسیٰ ابن مریم ہو گا اور یہ بتایا کہ یہ بیٹا من جانب اللہ ایک کلمہ ہو گا۔

کلمۃ اللہ اور مسیح کا مطلب...... حضرت یحییٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ گذر چکا ہے۔ وہاں بھی كَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو كَلِمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ اس لئے فرمایا کہ وہ بغیر باپ کے صرف اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے۔ قال فی الروح ص۱۶۰ ج۳ واطلاق الکلمة علی من اطلقت علیه باعتبار انه خُلق من غیر واسطة اب بل بواسطة کن فقط علی خلاف افراد بنی آدم فکان تاثیر الکلمة فی حقّه اظهر واکمل۔ (صاحب روح المعانی" فرماتے ہیں آپ پر لفظ کلمہ کا اطلاق اس اعتبار سے ہے کہ آپ کو باقی بنی آدم کے برعکس باپ کے واسطہ کے بغیر صرف امرِ کُن کے واسطہ سے پیدا فرمایا ہے۔ پس آپ کے حق میں کلمہ کُن کی تاثیر زیادہ کامل طور پر ظاہر ہوئی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح بھی بتایا اور عیسیٰ بھی، لفظ مسیح کے بارے میں صاحب معالم التنزیل ص۳۰۱ ج۱ لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ فعیل مفعول کے معنی میں ہے مسیح بمعنی ممسوح ہے اور اُن کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اُن کو گندگیوں اور گناہوں سے پاک کیا گیا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اُن کے جسم پر اپنا بازو پھیر دیا تھا جس کی وجہ سے شیطان ان سے دور

رہتا تھا۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مسیح بمعنی ماسح ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر دیتے تھے اور وہ اس سے اچھا ہو جاتا تھا اس لئے اُن کو یہ نام دیا گیا۔ دجال کو بھی مسیح کہا گیا ہے وہ مسیح بمعنی ممسوح ہے کیونکہ وہ ایک آنکھ سے کانا ہوگا گویا کہ اُس کی آنکھ پر کوئی چیز پھیر دی گئی۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ابن مریم کے ساتھ کیا گیا ہے، چونکہ اُن کا کوئی باپ نہیں تھا اس لئے والدہ ہی کی طرف نسبت کی گئی۔ اس زمانہ میں بعض ایسے لوگ ہیں جو قرآن وسنت کی تصریحات کے خلاف عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے کافر ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے باپ تجویز کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منھم۔

وجیھا فی الدنیا والاٰخرۃ...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ بھی فرمایا وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کہ وہ دنیا و آخرت میں باوجاہت ہوں گے۔ جب پیدا ہوئے تو ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت زیادہ رفعت عزت عطا فرمائی۔ جب یہودی ان کے قتل کے درپے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اوپر اُٹھالیا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ قیامت کے قریب اُن کا نزول ہوگا۔ صاحبِ اقتدار ہوں گے اُمتِ محمدیہؐ کو ساتھ لے کر دینِ اسلام کو قبول کریں گے اور اس پر چلیں گے اور چلائیں گے۔ نیز فرمایا وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ کہ اللہ کے نزدیک مقربین میں سے ہوں گے ہر پیغمبر اللہ کا مقرب ہے اور سب اولیاء اللہ اللہ کے مقرب ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے مقرب ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تصدیق...... جب عیسیٰ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے تو یحییٰ علیہ السلام بھی منصب نبوت پر دنیا میں موجود تھے۔ انہوں نے اُن کی نبوت کی تصدیق کی اور وہ پیشین گوئی صادق آئی جو مُصَدِّقًا بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں مذکور ہوئی۔ روح المعانی ص ۱۴۷ ج ۳ میں لکھا ہے وھو اوّل من اٰمن بعیسٰی علیہ السلام وصدقہ انہ کلمۃ اللہ تعالٰی وروح منہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعلان اور اس بات کی تصدیق کی کہ وہ اللہ کا کلمہ ہیں اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہیں سب سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کیا۔

فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مزید فرمایا وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا (کہ اے مریم تمہارے جو یہ لڑکا پیدا ہوگا۔ گہوارہ میں اپنی بچپن میں بات کرے گا۔ اور بڑی عمر میں بھی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ جب اُن کی ولادت ہوگئی اور اُن کی والدہ اُن کو اٹھا کر لائیں تو لوگوں نے کہا کہ اے مریم تم نے یہ بڑے غضب کا کام کیا۔ اس وقت انہوں نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کر دیا وہ کہنے لگے کہ ہم اُس سے کیا بات کریں جو گہوارہ میں ہے، بچہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ط اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا. وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّکٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا. وَّ بَرًّام بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا. (وہ بچہ بول اُٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب دی اور اُس نے مجھ کو نبی بنایا اور مجھ کو برکت والا بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک کہ میں زندہ رہوں اور مجھ کو میری والدہ کا خدمت گذار بنایا اور اُس نے مجھ کو سرکش بدبخت نہیں بنایا) فِی الْمَهْدِ کے ساتھ وَکَهْلًا بھی فرمایا یعنی یہ بچہ زمانہ کہولت میں بھی لوگوں سے بات کرے گا۔ کہولت جوان اور بوڑھے کی درمیانی عمر کو کہتے ہیں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کا کلام کرنا بچپن میں اور زمانہ کہولت میں یکساں ہوگا اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس میں حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت دی گئی کہ تمہارا بچہ زمانہ کہولت کو بھی پائے گا اور اس کی اتنی عمر ہوگی کہ جوانی کی عمر سے بڑھ کر

زمانہ کہولت میں بھی داخل ہوگا۔

آخر میں فرمایا: وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ بچہ صالحین میں سے ہوگا۔ چند صفحات پہلے صالح کا مطلب بتادیا گیا ہے اور وہاں یہ بتایا گیا کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام صفت صلاح سے متصف ہیں۔

بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش...... حضرت مریم علیہا السلام کو جو فرشتوں نے بشارت دی اس بشارت کو سن کر انہیں تعجب ہوا اور کہنے لگیں رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ (مریم عرض کرنے لگیں کہ اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا حال یہ ہے کہ مجھے کسی بھی بشر نے چھوا تک نہیں) سورۂ مریم میں یہ بھی ہے کہ حضرت مریم نے عرض کیا وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا اور نہ میں بدکار ہوں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ کہ اللہ تعالیٰ اس طرح پیدا فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے انسانوں کی پیدائش عادۃً جس طرح ہوتی ہے چونکہ اُن کی پیدائش اس کے خلاف تھی اسلئے لوگوں کو تعجب ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی بھی مشکل نہیں ہے کہ بغیر باپ کے پیدا فرمادے اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ وہ جب کسی چیز کے وجود میں لانے کا فیصلہ فرمائے تو کُن (ہوجا) فرمادیتا ہے۔ پس وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، قادر مطلق جل مجدہٗ نے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمادیا اور اپنی کتاب قرآن حکیم میں بتادیا لیکن یہود و نصاریٰ کی تقلید میں بعض لوگ قرآن کو جھٹلاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے یوسف نجار کو باپ تجویز کرتے ہیں اور اُن کو اپنے کفریہ عقیدہ پر اصرار ہے۔ اعاذنا الله منهم۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ

اور اللہ سکھا دے گا اس کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل۔ اور بنادے گا اس کو رسول بنی اسرائیل کی طرف، بنی اسرائیل سے ان کا یہ خطاب ہوگا کہ بلاشبہ میں

قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ

تمہارے پاس آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر، کہ بلاشبہ میں بناتا ہوں تمہارے سامنے مٹی سے پرندہ کی طرح ایک چیز پھر اُس میں پھونک دیتا ہوں

فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

تو وہ پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے، اور اچھا کرتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور برص والے کو، اور زندہ کرتا ہوں مُردوں کو اللہ کے حکم سے،

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ

اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور ذخیرہ رکھتے ہو اپنے گھروں میں، بلاشبہ اس میں تمہارے لئے نشانی ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ

اگر تم ایمان قبول کرنے والے ہو۔ اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو توراۃ ہے اور تاکہ میں حلال کروں تمہارے لئے بعض وہ

الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ

چیزیں جو تم پر حرام کی گئیں، اور میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بے شک

اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منصب کی ذمہ داری اور اُن کے معجزات

ان آیات میں حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بعض صفات بیان فرمائیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ اُن کو کتاب کی تعلیم دے گا۔ کتاب سے کیا مراد ہے جبکہ تورات اور انجیل کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے اس سے تورات انجیل کے علاوہ کتابیں مراد ہیں مثلاً زبور وغیرہ، نیز فرمایا کہ اللہ ان کو حکمت سکھائے گا۔ صاحب روح المعانی ص ۱۶۶ ج ۳ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے علم الحلال والحرام مراد ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ تمام امورِ دینیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو سکھائے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنتیں مراد ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو تورات اور انجیل سکھائے گا۔ انجیل تو انہیں پر نازل ہوئی تھی اور تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جو بنی اسرائیل کے لئے دینی و دنیاوی امور میں مفصل دستورِ حیات تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تورات بھی سکھا دی اور اس کے علوم بھی بتا دیئے۔ یہ سب باتیں فرشتوں کی خوشخبری ہی کے ذیل میں مذکور ہو رہی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور نبوت سے سرفراز فرمایا ان سب باتوں کا ظہور ہو گیا اور ایسا ہی ہوا جیسے فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو خوشخبری دی تھی۔

معجزات کی تفصیل...... خوشخبری میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مریمؑ کا یہ لڑکا بنی اسرائیل کی طرف اللہ کا رسول ہوگا اور اس کو معجزات دیئے جائیں گے ان کو جو معجزات دیئے گئے اُن میں ایک یہ تھا کہ وہ مٹی (گارا) لے کر پرندہ کی ایک صورت بنا دیتے تھے پھر اس میں پھونک دیتے تھے تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ پرندہ ہو کر اُڑ جاتا تھا۔ اور ایک معجزہ یہ تھا کہ وہ مادر زاد اندھے کی آنکھوں کی جگہ پر ہاتھ پھیر دیتے تھے جس سے وہ بینا ہو جاتا تھا اور دیکھنے لگتا تھا۔ اور ایک معجزہ یہ تھا کہ وہ برص والے کے جسم پر ہاتھ پھیر دیتے تھے جس سے اُس کے جسم کی کھال صحیح ہو جاتی تھی اور مرض جاتا رہتا تھا۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ ایسی چیزیں بھی بطور معجزہ دی جاتی ہیں جن سے اہلِ زمانہ اپنے فن میں ماہر ہونے کے باوجود عاجز ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگری کا بہت زور تھا اُن کو عصا دے دی گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طبّ کا بہت زور تھا بڑے بڑے ماہرین موجود تھے جو اکمہ (مادر زاد اندھا) اور ابرص کے علاج سے بالکل ہی عاجز تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور معجزہ ایسی چیز دی گئی جس کا مقابلہ کوئی بھی صاحبِ فن طبیب نہیں کر سکا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک یہ بھی معجزہ تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ روح المعانی ص ۱۶۹ ج ۳ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار آدمیوں کو زندہ کیا ان چار میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا سام بھی تھا۔ جب انہوں نے مُردوں کو زندہ کیا تو معاندین کہنے لگے کہ یہ تو آپ نے اُن کو زندہ کر کے دکھایا ہے جو زمانۂ حال ہی میں مرے تھے۔ ممکن ہے ان کو سکتہ طاری ہو گیا ہو کسی ایسے شخص کو زندہ کرو جس کی موت کو زمانہ طویل ہو چکا ہو۔ لہٰذا انہوں نے سام ابن نوح کو زندہ کیا اُن کی موت کو چار ہزار سال سے زیادہ ہو چکے تھے اور فرمایا کہ اب تو ایمان لے آؤ اُن میں سے بعض ایمان لائے اور بعض نے تکذیب کی اور کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے۔ دوسرا کوئی معجزہ دکھاؤ۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتاتا ہوں جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور ذخیرہ رکھتے

ہو اور فرمایا کہ یہ سب معجزات خوارق عادات جو تمہارے سامنے آئے یہ واضح معجزات ہیں اگر تمہیں ایمان قبول کرنا ہے راہِ حق اختیار کرنا ہے تو ایمان لے آ ؤ۔لیکن جن کو ماننا نہ تھا انہوں نے نہ مانا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ جو میرے سامنے تورات شریف ہے میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں کہ وہ اللہ کی کتاب ہے یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے تھی کہ بنی اسرائیل توریت شریف کو مانتے تھے اگر کوئی توریت شریف کی تصدیق نہ کرتا تو ایمان نہ لانے کا یہ بہانہ ہو سکتا تھا کہ تم اللہ کی کتاب کو نہیں مانتے تم پر کیسے ایمان لائیں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں توریت شریف کی تصدیق کرتا ہوں تمہارے اور تمہارے دین کے خلاف کوئی دین لے کر نہیں آیا اور تمہارے لئے اللہ کی طرف سے بعض ان چیزوں کو بھی حلال قرار دیتا ہوں جو تم پر سابقہ شریعت میں حرام تھیں اور یہ معجزات منصف سمجھدار کے لئے کافی ہیں تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ کفر اختیار کر کے اپنی بربادی نہ کرو۔اندیشہ تھا کہ مذکورہ بالا معجزات اور خاص کر احیاء موتی کا منظر دیکھ کر لوگ حضرت عیسیٰ کو خدا نہ سمجھنے لگیں اس لئے انہوں نے دو بار باذن اللہ فرمایا۔سورۂ مائدہ کے ختم کے قریب بھی اُن کے معجزات کا ذکر ہے وہاں چار مرتبہ یہ فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو دعوت دیتے ہوئے مزید فرمایا۔

دعوتِ توحید......کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (کہ بلاشبہ میرا رب اور تمہارا رب اللہ ہے پس اُس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کو ایمان کی دعوت دی لیکن وہ اُن کے دشمن ہو گئے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل کر دیا اور اُن سے پہلے پتہ نہیں کتنے انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بھی درپے ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا اور اوپر اٹھا لیا پھر صدیوں کے بعد اُن لوگوں نے جو اپنے جھوٹے خیال میں اُن کے ماننے والے تھے۔عقیدۂ تثلیث اور عقیدہ تکفیر اپنی طرف سے گھڑ لیا اور اب جو لوگ اُن کے ماننے کے دعویدار ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود مانتے ہیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اُن کا قتل ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔(العیاذ باللہ) جس نے بار بار توحید کی دعوت دی اور اپنے کو اللہ کا بندہ بتایا اس کے جھوٹے ماننے والوں نے شرک اختیار کر لیا۔

فائدہ......سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو مٹی سے پرندہ کی شکل بناتے تھے اس کے لئے بعض اکابر نے فرمایا کہ تصویر بنانا اُن کی شریعت میں جائز تھا اُس سے ہماری شریعت میں جواز پر استدلال نہ کیا جائے کیونکہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سازی کو مطلقاً منع فرما دیا۔احقر کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے جواز تصویر پر استدلال کرنے کا موقعہ اس لئے بھی نہیں ہے کہ وہ تو معجزہ دکھانے کے لئے بناتے تھے اور وہ تصویر اپنی حالت میں باقی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے پھونکنے سے پرندہ بن کر اڑ جاتی تھی، آجکل جو مورتیوں اور تصویروں کا رواج ہے وہ زندہ کر کے دکھانے کے لئے نہیں ہے۔الماریوں میں رکھنے اور گاڑیوں میں لٹکانے اور دفتروں میں آویزاں کرنے کے لئے ہے، کہاں موجودہ صورتحال اور کہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ۔دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ

پھر جب عیسیٰ نے اُن کی طرف سے انکار دیکھا تو کہنے لگے کہ کون ہیں جو میرے مددگار ہو جائیں اللہ کی طرف، حواریوں نے کہا ہم اللہ کے

اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا

مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو آپ نے نازل فرمایا اور ہم نے رسول کا اتباع کیا آپ ہمیں ان

مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرنے والے ہیں۔

عامۂ بنی اسرائیل کا کفر اختیار کرنا اور حواریوں کا حضرت عیسیٰ کی مدد کے لئے کھڑا ہونا

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل کو اپنے اتباع اور اطاعت کی دعوت دی اور انجیل پر ایمان لانے کا حکم فرمایا اور اُن کو بتایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تم میری اطاعت و فرمانبرداری کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے عناد اور ہٹ دھرمی پر کمر باندھ لی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود سے خطاب فرماتے اور حق کی دعوت دیتے تھے اور وہ لوگ اُن کا مذاق بناتے تھے اُن کے انکار اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس فرمالیا کہ بنی اسرائیل ایمان لانے والے نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے پکارا کہ کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ اس پر بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے ایمان قبول کیا اور ایک جماعت نے کفر اختیار کیا جیسا کہ سورۂ صف کی آخری آیت میں مذکور ہے وہیں پر حواری بھی موجود تھے انہوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔

حواری کون تھے؟...... حواری کون لوگ تھے اس کے بارے میں مفسرین نے متعدد اقوال نقل کئے لفظ حواری حور سے مشتق ہے۔ حَوَر سفیدی کو کہتے ہیں جنت کی عورتوں کو اس لئے حور کہا گیا کہ اُن کا رنگ سفید ہوگا، ایک قول کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دھوبیوں کا کام کرتے تھے۔ یعنی اُجرت پر لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا جاتا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ اُن کے کپڑے سفید تھے اس لئے حواری کا لقب دیا گیا۔ حضرت قتادہ کی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے قلوب کی صفائی اور اخلاق کی پاکیزگی کی وجہ سے حواری کہا گیا۔ صاحب روح المعانی ص ۱۷۶ ج ۳ نے یہ اقوال لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بارہ افراد تھے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انتیس آدمی تھے، بہرحال یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص متبعین میں سے تھے انہوں نے ایمان بھی قبول کیا اور اُن کے ساتھ دعوت کے کام میں شریک رہنے کا بھی اعلان کیا اور کہا کہ ہم راہِ خداوندی کی طرف دعوت دینے میں آپ کے ساتھی ہیں۔ اور اللہ کے مددگار ہیں۔ اللہ کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ جو اس کے دین کی نصرت کرے اس کے عمل کو اپنی مدد کرنے سے تعبیر فرمادیا۔ جیسا کہ سورۂ محمد (ﷺ) میں ہے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمادے گا) حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی عرض کیا کہ ہم اللہ پر ایمان لائے آپ ہمارے فرمانبردار ہونے کے گواہ بن جائیں، اور انہوں نے اللہ سے یہ دعا بھی کی کہ اے ہمارے رب آپ نے جو کچھ نازل فرمایا ہم اس پر ایمان لے آئے آپ کے رسول کا اتباع کیا۔ آپ ہمیں ان لوگوں میں لکھ دیجئے جو انبیاء کے سچا ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔

پھر لفظ حواری ایسے خصوصی شخص کے لئے استعمال ہونے لگا جو بہت ہی زیادہ خاص ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَّحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ (کہ بلاشبہ ہر نبی کے لئے ایک حواری ہے اور میرا حواری زبیر ہے)

بہرحال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے خاص خادم مل گئے تھے جو اُن کے ساتھ دعوت کے کام میں شریک تھے لیکن پوری قوم بنی اسرائیل کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت ہی کم تھی بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور اُن سے دُشمنی کی اور اُن کی دعوت کو نہ مانا۔ بلکہ ان کے قتل کے درپے ہوگئے۔ (جیسا کہ آئندہ آیت کی تفسیر میں آرہا ہے)

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ

اور اُن لوگوں نے مکر کیا اور اللہ تعالیٰ نے تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر فرمانے والا ہے۔ جب فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ اے عیسیٰ میں تمہیں وفات

مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ

دینے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا، اور جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا

اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ

اُن کو غالب رکھوں گا قیامت کے دن تک اُن لوگوں پر جنہوں نے کفر اختیار کر لیا، پھر میری طرف تم سب کو لوٹنا ہو گا، پھر فیصلے کروں گا

بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾

تمہارے درمیان اس چیز کے بارے میں جس میں تم اختلاف رکھتے تھے۔

یہودیوں کا حضرت عیسیٰ کے قتل کا منصوبہ بنانا اور اس میں ناکام ہونا

جیسے جیسے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت آگے بڑھتی گئی اور آپ اپنے عہدۂ رسالت کے مطابق کام کرتے رہے اور کچھ نہ کچھ افراد ان کے ساتھی ہوتے گئے بنی اسرائیل کی دشمنی تیز ہوتی گئی اور بالآخر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کی ٹھان لی اور طے کر لیا کہ انہیں ختم کر کے رہیں گے۔ اب بنی اسرائیل نے اپنی ایسی تدبیریں شروع کر دیں جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہید کر دیئے جائیں اور اُن سے بنی اسرائیل کا چھٹکارہ ہو جائے۔ بنی اسرائیل نے جب سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو اُن کو ایک مکان میں بند کر دیا اور ان پر ایک نگران مقرر کر دیا۔ جب قتل کرنے کے لئے وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اس نگران کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی بنا دی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر اُٹھالیا (ذکرہ البغوی فی معالم التنزیل ص ۴۹۶ ج ۱) ان لوگوں نے اندر جا کر دیکھا تو وہاں ایک ہی شخص کو پایا اور اُسے قتل کر دیا کیونکہ یہ شخص صورۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل تھا لیکن اس سوچ بچار میں رہے کہ ایک اگر یہ شخص وہی تھا جس کے قتل کرنے کے لئے ہم آئے تھے تو ہمارا آدمی کہاں گیا؟ قتل تو اس کو کر دیا لیکن پھر بھی شک وشبہ میں رہے، اس کو سورۂ نساء میں یوں بیان فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ (اور انہوں نے نہ اُن کو قتل کیا نہ اُن کو صلیب پر چڑھایا لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا) اور بلاشبہ جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ ان کی طرف سے ضرور شک میں ہیں اس کی مزید توضیح ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ نساء کی آیتِ بالا کی تفسیر کے ذیل میں بیان ہوگی۔ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تھا وہ ان کے قتل میں ناکام ہو گئے اور ان کو اشتباہ ہو گیا کہ ان کا اپنا آدمی قتل ہوا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر غالب آئی اور یہود کی مکاری دھری رہ گئی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پورا ہو گیا۔

مکر کا معنی...... لفظ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، یہ اچھے کام کے لئے بھی ہوتی ہے اور بُرے کام کے لئے بھی۔ سورۂ فاطر میں فرمایا: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ اس سے معلوم ہوا کہ مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی، اور عربی زبان میں دونوں معنی کی گنجائش ہے اگر

چالبازی اور دھوکہ سے کوئی تدبیر کی جائے گی تو وہ اردو زبان کے محاورہ میں مکاری ہوگی اور ضروری نہیں کہ تدبیر بری ہو، قرآن مجید میں جو مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے اردو کے محاورہ والا مکر مراد نہیں ہے بلکہ عربی کے معنی مراد ہیں، یعنی خفیہ اور لطیف تدبیر جس کا دوسرے کو پتہ نہ چل سکے۔

فی روح المعانی ص۹۷ ج۳ ونقل عن الامام ان المکر ایصال المکروہ الی الغیر علی وجہ یخفی فیہ وانّہ یجوز صدورہ عنہ تعالیٰ حقیقةً، وقال غیر واحد انہ عبارة عن التدبیر المحکم وھو لیس بممتنع علیہ تعالیٰ . وقال فی تفسیر قولہ تعالیٰ واللہ خیر الماکرین ای اقواھم مکراً وأشدھم او ان مکرہ احسن واوقع فی محلہ لبعدہ عن الظلم ۔ (امام سے منقول ہے کہ مکر سے مراد مخفی طور پر کسی کو تکلیف پہنچانا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے حقیقةً صدور جائز ہے اور بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ مکر مضبوط تدبیر کا نام ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع نہیں۔ نیز وہ اللہ تعالیٰ کے قول واللّٰہ خیر الماکرین کی تفسیر میں فرماتے ہیں یعنی اس کی تدبیر سب سے زیادہ محکم اور شدید ہے یا اس کی تدبیر سب سے اچھی اور ظلم سے بعید ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ برمحل ہے)

مُتَوَفِّيْكَ اور رَافِعُكَ کی تفسیر......اللہ جل شانہٗ نے یہ جو فرمایا کہ یٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ اِذْ لفظ مَکَرَ کا ظرف ہے یا یہاں اُذکر مقدر ہے جیسا کہ اس قسم کے مواقع میں مانا جاتا ہے اگر مَکَرَ سے متعلق کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جب اللہ نے خفیہ تدبیر فرمائی اور یہ فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں وفات دینے والا ہوں اور تمہیں اوپر اٹھا لینے والا ہوں اور تمہیں اُن لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا۔ چونکہ آسمان پر اُٹھانا پہلے ہوا اور احادیث کی تصریح کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور ایک عرصہ تک زندہ رہ کر پھر اُن کو طبعی موت آئے گی اس لئے بعض علماء نے فرمایا کہ مُتَوَفِّيْكَ ذکر میں مقدم ہے اور وقوع کے اعتبار سے مؤخر ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خطاب فرمایا تھا جبکہ یہودی اُن کے قتل کے درپے ہو چکے تھے اس لئے مُتَوَفِّيْكَ کا یہ معنی لینا (کہ میں تم کو طبعی موت دوں گا یہ تمہیں قتل نہ کرسکیں گے اور ابھی تو تم کو اوپر اٹھانے والا ہوں) سیاق کلام سے بعید نہیں ہے اور اس میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ لفظوں میں تقدیم اور تاخیر ہے اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ متوفی اسم فاعل کا صیغہ ہے جو لفظ توفی سے لیا گیا ہے توفی کا اصل معنی موت کا نہیں ہے بلکہ کسی چیز کو پورا پورا لے لینے اور اٹھانے کا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ نیند کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے جیسا کہ سورۂ انعام میں فرمایا وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ (اللہ وہ ہے جو تمہیں اٹھالیتا ہے رات کو اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو دن میں) اگر مُتَوَفِّيْكَ کا یہ معنی لیا جائے کہ تمہیں پورا پورا اٹھانے والا ہوں تو اس میں بھی تقدیم و تاخیر کا قول اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور رَافِعُكَ اس صورت میں متوفی کا عطف تفسیری ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا تو کافروں سے اُن کی جان چھڑا دی۔ اور گندے لوگوں کے ماحول سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پاک کردیا کیونکہ وہ لوگ اُن کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں صاف صاف فرمادیا ہے وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۚ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (سورۂ نساء ع ۲۲) اور یہ یقینی بات ہے کہ اُن لوگوں نے اُن کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھالیا) اس تصریح سے واضح ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو عالم بالا کی طرف اُٹھالیا۔

قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا ...... احادیثِ کثیرہ متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتریں گے اور عدل وانصاف قائم کریں گے۔ حافظ ابن کثیر ص ۳۶۲ ج ۴ لکھتے ہیں وقد تواترت الاحادیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنه أخبر بنزول عيسىٰ عليه السلام قبل يوم القيامة إمامًا عادلاً وحكمًا مقسطًا ۔ (تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں یہ وارد ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کی خبر دی وہ امام عادل ہوں گے اور انصاف کے فیصلے کریں گے) سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول نہیں ہوئے اُن کو آسمان پر اٹھالیا گیا اور وہ وہاں زندہ ہیں اور اسی لئے اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں شمار کیا ہے (شب معراج میں دیگر انبیاء علیہم السلام سے جو ملاقات ہوئی وہ ان حضرات کی برزخی زندگی میں تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چونکہ ابھی وفات نہیں ہوئی اس لئے ان سے جو وہاں ملاقات ہوئی وہ موت سے قبل والی زندگی میں تھی لہٰذا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں شمار ہیں)۔

حیاتِ مسیحؑ کا انکار کرنے والے قرآن کے منکر ہیں ...... حیاتِ مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کا انکار ایک جاہل جھوٹے شخص نے کیا جس نے خود اپنے کو اُن کی جگہ مسیح موعود کے نام سے پیش کیا اُس شخص کے ماننے والے آج تک اُسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ ۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اختیار کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت واضح ہوگئی اور مؤمنین کی راہ کے علاوہ دوسری راہ اختیار کرے تو ہم اس کو وہ کچھ کرنے دیں گے جو وہ کرتا ہے اور اُس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے)۔

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر بتا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنا اور مؤمنین کی راہ کے علاوہ دوسری راہ اختیار کرنا دوزخ میں جانے کا سبب ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں مسلمین کی راہ کو بھی معیارِ حق بتایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے خلاف راہ اختیار کرنے والا دوزخ میں جائے گا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضراتِ صحابۂ کرامؓ نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقائد واعمال سیکھے اور ان سے تابعین نے اور اُن سے تبع تابعین نے اور اُن کے بعد سلفاً عن خلفٍ تمام مسلمانوں نے وہی عقائد واعمال سیکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے تھے لہٰذا اس دین کے خلاف جو کچھ ہوگا وہ سراسر گمراہی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی دوزخ میں جانے کو تیار ہیں لیکن حق ماننے کو تیار نہیں، جب ان کے سامنے رَافِعُكَ اِلَيَّ اور رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ پیش کیا جاتا ہے جس میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے اُن کو اپنی طرف اُٹھالیا تو کہتے ہیں کہ اس سے رفع درجات مراد ہے۔ جب یہ جاہلانہ تاویل کرتے ہیں تو لفظ اِلَيَّ اور اِلَيْهِ کا ترجمہ کھا جاتے ہیں۔ جاہلوں کے سامنے ادھورا ترجمہ کرتے ہیں، قرآن مجید میں جہاں رفع درجات کا ذکر ہے وہاں إلیٰ نہیں ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فرمایا وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ان کافروں ملحدوں کو قرآن ماننا نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ ابن مریم قیامت سے پہلے نازل ہوں گے اس بات کے ماننے کو تیار نہیں ہیں، جھوٹے شخص پر ایمان لے آئے تو اب جھوٹ ہی کو پھیلا رہے ہیں۔ قبحهم الله تعالىٰ

مُطَهِّرُكَ کی دوسری کی تفسیر ...... مُطَهِّرُكَ کی ایک تفسیر تو وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کی کہ اللہ تم کو گندے لوگوں کے ماحول سے دور کر کے پاک کرنے والا ہے۔ قال فی روح المعانی ص ۱۸۳ ج ۳ یحتمل أن يكون تطهيره عليه السلام بتبعيده منهم

بالرفع ویحتمل أن یکون بنجاته مما قصدوا فعله به من القتل (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں یہ احتمال ہے کہ پاک کرنے کا مطلب یہ ہو کہ آپ کو اٹھا کر اور ان سے دور کر کے ان سے پاک کر دیں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کے ارادہ قتل اور پروگرام سے نجات دیدیں گے) اور ایک تفسیر یہ ہے کہ یہود نے تم پر جو الزامات لگائے ہیں اور جو تمہارے نسب کو مطعون کیا ہے اللہ تعالیٰ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان سب چیزوں سے تمہاری تطہیر فرمائے گا اور تم کو ان سب سے بری کر دے گا۔

جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... اللہ جل شانہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا: وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الآیۃ)

(جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ان کو قیامت تک ان لوگوں پر غالب رکھوں گا جنہوں نے کفر کیا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ تھے پھر مسلمان بھی اُن کی رسالت اور نبوت کے ماننے والے ہو گئے ان دونوں قوموں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکرین یعنی یہودیوں پر قیامت تک کے لئے غلبہ عطا فرمایا یہ غلبہ دنیاوی ہے رہا مسئلہ آخرت کی نجات کا تو وہ اس ایمان پر موقوف ہے جو ایمان اللہ کے ہاں معتبر ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اپنے دعوے کے مطابق کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں لیکن سیدنا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ پر ایمان لانے کے لئے اُن سے فرما دیا تھا مُبَشِّرًا ۢبِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ اور مسلمانوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانا کہ وہ اللہ کے رسول تھے اور سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لائے اور اُن باتوں کا بھی عقیدہ رکھا جو قرآن وحدیث میں ان کے بارے میں بیان کی گئی ہیں اس لئے وہ نجات آخرت کے بھی مستحق ہوئے بہرحال یہودیوں پر مسلمین اور نصاریٰ دونوں قوموں کو برتری اس دنیا میں حاصل ہے۔

قال صاحب الروح ص۱۸۳ ج۳ وهٰذا الاتباع یصح ان یراد بالمتبعین مایشمل المسلمین والنصاری مطلقا من آمن به قبل مجیٔ نبینا صلی اللّٰه علیه وسلم ومن آمن بزعمه بعد ذٰلک۔ (یعنی متبعین سے مطلق مراد لینا صحیح ہے خواہ وہ متبعین مسلمان ہوں یا نصاریٰ جو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل ان پر ایمان لایا ہو یا آپ کی آمد کے بعد آپ کے فرمان کے مطابق ان پر ایمان لایا ہو)

فلسطین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں اوّلاً انگریزوں کے تسلط دینے سے اور اب امریکہ کی سرپرستی میں جو یہودیوں کی نام نہاد حکومت قائم ہے اس کی وجہ سے آیت کے مضمون پر کوئی اشکال نہ کیا جائے چونکہ یہ حکومت انہیں نصاریٰ نے ہی دی ہے اور نصاریٰ ہی اُن کی سرپرستی کر رہے ہیں اور پورے عالم کے مسلمان اور نصاریٰ مل کر اُن پر تعداد اور اموال اور ہتھیاروں کے اعتبار سے غالب ہی ہیں اس لئے ان کی حکومت قائم ہونے سے آیت قرآنی کے مضمون پر کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ اگر نصاریٰ اُن کی سرپرستی سے ہاتھ اُٹھالیں تو اُن کی نام نہاد حکومت ذرا دیر بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

پھر فرمایا: ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ (الآیۃ) اس میں یہ ارشاد فرمایا کہ دنیا میں تو غالب اور مغلوب کافر اور مؤمن سب ہی زندگی گزاریں گے پھر سب کو میری طرف لوٹنا ہوگا اور میدانِ قیامت میں اُن سب باتوں کے بارے میں فیصلے کر دوں گا جن کے بارے میں اختلاف رکھتے ہو اس اختلاف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت بھی ہے اُن کو یہودیوں نے اللہ کا رسول نہیں مانا اور نصاریٰ میں سے کسی نے خدا مانا کسی نے خدا کا بیٹا۔ اور مسلمانوں نے قرآنِ حکیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی وجہ سے اُن کے بارے میں صحیح عقائد

رکھے۔قیامت کے دن غلط عقائد رکھنے والوں کو صحیح بات کا پتہ چل جائے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ

سو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا پس میں اُن کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں اور اُن کے لئے کوئی

نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

مددگار نہ ہو گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو اللہ اُن کو پورے پورے اجر عطا فرما دے گا، اور اللہ ظالموں کو

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

دوست نہیں رکھتا۔ یہ آیات اور ذکر حکیم ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

کافروں کے لئے وعید عذاب شدید اور اہلِ ایمان کے لئے اجر و ثواب کا وعدہ

دنیا میں مؤمن اور کافر بھی زندہ رہتے ہیں اور کھاتے کماتے ہیں۔یہ سب دنیاوی اُمور ہیں آخرت میں تو ایمان مدارِ نجات ہوگا ایمان اور اعمال صالحہ کی بنیاد پر جنت ملے گی اور اُس وقت اعمال کا پورا پورا بدلہ اللہ پاک کی طرف سے دے دیا جائے گا اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کے لئے دنیا میں بھی سزا ہے اور آخرت میں بھی، یہ سزا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔جب مسلمان جہاد کرتے تھے (جو اَب بھی واجب ہے) اُس وقت کافر اُن کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے قید ہوتے تھے غلام باندی بنائے جاتے تھے جزیہ دینے پر مجبور ہوتے تھے۔اور اب بھی اُن کے ملکوں میں تباہی آتی رہتی ہے۔نئی نئی بیماریاں زلزلے وغیرہ مصائب و آلام کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور اگر کہیں دنیاوی حال اچھا ہے تو وہ استدراج ہے اور مسلمانوں کے ملکوں میں جو کبھی اس طرح کی کوئی چیز آجاتی ہے وہ کفارہ سیئات کا ذریعہ بنتی ہے۔نصاریٰ کا دنیا میں یہودیوں پر فائق اور غالب رہنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آخرت میں نجات کے مستحق ہوں گے۔کیونکہ وہاں کی نجات کا تعلق اُس ایمان سے ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے۔نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح نہیں مانتے جیسا انہوں نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان نہیں لاتے (اُن کی تشریف آوری کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی) اس لئے کافروں میں شمار ہیں اور کفر کی وجہ سے آخرت میں اُن کو سخت اور دائمی عذاب ہوگا اور یہودی بھی کفر اختیار کئے ہوئے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہیں لائے اور سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بھی نہیں مانتے لہٰذا وہ بھی آخرت میں عذاب دائمی کے مستحق ہیں۔آخر میں فرمایا: ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ.

کہ اے محمد! یہ جو کچھ ہم پڑھ کر آپ کو سناتے ہیں یہ اُن آیات یعنی دلائل واضحہ میں سے ہے جو آپ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہیں ان چیزوں کو کوئی شخص نہیں جان سکتا جب تک کہ پرانی کتاب نہ پڑھی ہو یا کسی معلم سے علم حاصل نہ کیا ہو آپ کو یہ دونوں باتیں حاصل نہیں لہٰذا یہ ساری معلومات متعینہ طور پر وحی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوئیں وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ اور ذکر حکیم یعنی قرآن محکم بھی ہم آپ کو سناتے ہیں جو باطل سے محفوظ ہے اور حکمتوں سے پُر ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

بلاشبہ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ایسی ہے جیسے آدم کی مثال، پیدا فرمایا اُن کو مٹی سے پھر اُن سے فرما دیا ہو جا پس اُن کی پیدائش ہو گئی،

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے سو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔ سو جو شخص اُن کے بارے میں آپ سے جھگڑا کرے۔ اسکے بعد کہ آپ کے

الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ

پاس علم آ گیا ہے تو آپ فرما دیجئے کہ آ جاؤ ہم بلالیں اپنے بیٹوں کو اور تم بلالو اپنے بیٹوں کو اور ہم بلالیں اپنی عورتوں کو اور تم بلالو اپنی عورتوں کو اور ہم حاضر کر دیں اپنی جانوں کو اور تم بھی

اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ

حاضر ہو جاؤ اپنی جانوں کو لے کر پھر ہم سب مل کر خوب سچے دل سے اللہ سے دعا کریں اور لعنت بھیج دیں جھوٹوں پر۔ بلاشبہ یہ سچی

الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ

بات ہے، اور کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا، اور بے شک اللہ زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔

اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع

پھر اگر وہ روگردانی کریں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی طرح سے ہے

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش جو بغیر باپ کے ہوئی اس پر یہودیوں نے شک کیا اور حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی اور آج بھی قرآن کے منکرین اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بلا باپ کے مریم بتول کے ہاں کیسے لڑکا پیدا ہو گیا؟ اللہ جل شانہٗ نے ان سب کے استعجاب اور استبعاد کا جواب دے دیا اور فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (الآیۃ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش ایسی ہی ہے جیسے آدم کو پیدا فرمایا۔ آدم کا پتلا بنایا پھر اس میں روح پھونک دی بس باذن اللہ بغیر ماں باپ کے ایک جیتی جاگتی مخلوق وجود میں آ گئی۔ بغیر ماں باپ کے جو چیز پیدا ہو گئی اُس پر تو کوئی تعجب نہیں اور جو صرف ماں سے بغیر باپ کے پیدا ہوا اس پر تعجب ہے اور انکار پر انکار کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہے اُس نے ابو البشر کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرما دیا اور پھر ابو البشر کا جوڑا یعنی حضرت حوا انہی کے جسم سے پیدا فرما دیا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا فرما دیا۔

اللہ جل شانہٗ نے انسانوں کی عام تخلیق کا سبب والدین کے ملاپ کو بنا دیا ہے اور یہ سلسلہ سب کے سامنے ہے عادۃ مستمرہ ہے اس لئے اس میں کسی کو تعجب نہیں اور ایک جان کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا اور ایک جان کو بغیر ماں کے اور ایک جان کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا ان سب میں اس کی قدرت کے مظاہرے ہیں۔ جو ذات پاک بغیر ماں باپ کے پیدا فرمائے اسے اس پر بھی قدرت ہے کہ بغیر باپ کے پیدا فرما دے۔ قرآن و حدیث کی تصریحات ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بلا باپ کا انکار کر کے کفر اختیار کرنے والوں کو تنبیہ فرمائی کہ عیسیٰ کی پیدائش آدم کی طرح سے ہے۔

پھر فرمایا اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ کہ یہ جو کچھ بیان ہوا آپ کے رب کی طرف سے حق ہے آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں بظاہر اس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مقصود امت کو خطاب کرنا ہے کہ وہ کسی طرح سے شک میں نہ پڑیں (کما قال البغوی فی معالم التنزیل الخطاب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد اُمته ص ۳۱۰ ج ۱) اسباب النزول ص ۹۸ میں لکھا ہے کہ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد آیا اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا بات ہے آپ ہمارے صاحب کو (یعنی ہم جسے مانتے ہیں) بُرا کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں کیا کہتا ہوں؟ کہنے لگے آپ کہتے ہیں کہ وہ ایک بندہ ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور وہ اللہ کا کلمہ ہیں جسے کنواری عورت بتول کی طرف ڈالا۔ یہ سن کر وہ لوگ غصہ ہو گئے اور کہنے لگے کیا کوئی انسان کبھی بغیر باپ کے آپ نے دیکھا ہے۔ ہمیں کوئی شخص ایسا دکھاؤ جو بغیر باپ کے پیدا ہوا ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ نازل فرمائی، اور حضرت حسنؓ سے منقول ہے کہ نجران کے دو راہب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے اُن پر اسلام پیش فرمایا انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ سے پہلے مسلم ہیں۔ آپ نے فرمایا تم دونوں جھوٹے ہو اسلام سے تم کو تین چیزیں روکتی ہیں صلیب کی عبادت اور خنزیر کا کھانا اور اللہ کے لئے اولاد تجویز کرنا۔ کہنے لگے عیسیٰ کا باپ کون ہے آپ جواب دینے میں جلدی نہیں فرماتے تھے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ مل جائے اللہ جل شانہٗ نے آیت اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ نازل فرمادی جس میں ان کا جواب مذکور ہے۔

نصاریٰ کو دعوتِ مباہلہ ...... اللہ جل شانہٗ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ (الآیۃ) اس میں دعوتِ مباہلہ کا ذکر ہے۔ مفسر ابن کثیر نے ۴۳۸ ج ۱ میں محمد بن اسحٰق بن یسار سے نقل کیا ہے کہ نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ان میں چودہ اشخاص ان کے اشراف میں سے تھے جن کی طرف ہر معاملہ میں رجوع کیا جاتا تھا اُن میں سے ایک شخص کو سید کہتے تھے جس کا نام اَیْہم تھا اور ایک شخص ابو حارثہ تھا اور بھی لوگ تھے اُن میں عاقب ان کا امیر تھا اور صاحب رائے سمجھا جاتا تھا اُسی سے مشورہ لیتے تھے اور اس کی ہر رائے پر عمل کرتے تھے اور سید اُن کا عالم تھا۔ اُن کی مجلسوں اور محفلوں کا وہی ذمہ دار تھا اور ابو حارثہ اُن کا پوپ تھا جو ان کی دینی تعلیم و تدریس کا ذمہ دار تھا بنی بکر بن وائل کے قبیلے سے تھا اور عرب تھا لیکن نصرانی ہو گیا تھا۔ رومیوں نے اس کی بڑی تعظیم کی اس کے لئے گرجا گھر بنا دیئے اور اس کی طرح طرح سے خدمت کی۔ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کا علم تھا کتب سابقہ میں آپؐ کی صفات مذکور ہیں اُن سے واقف تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر بھی نصرانیت پر مُصر رہا۔ دنیاوی اکرام اور عزت و جاہ نے اس کو اسلام قبول کرنے سے باز رکھا۔

جب یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نمازِ عصر سے فارغ ہوئے تھے اور مسجد ہی میں تشریف رکھتے تھے ان لوگوں نے بہت ہی بڑھیا کپڑے پہن رکھے تھے اور خوبصورت چادریں اوڑھ رکھی تھیں ان کی اپنی نماز کا وقت آ گیا تو انہوں نے مسجد نبویؐ ہی میں مشرق کی طرف نماز پڑھ لی۔ ان میں سے ابو حارثہ عاقب اور سید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی اور وہی اپنی شرکیہ باتیں پیش کرنے لگے کسی نے کہا عیسیٰ اللہ ہے کسی نے کہا ولدُ اللہ ہے کسی نے کہا ثالث ثلاثہ (یعنی ایک معبود عیسیٰ ہے، ایک اس کی والدہ اور ایک اللہ تعالیٰ ہے) ان لوگوں نے گفتگو میں یہ سوال کیا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) عیسیٰ کا باپ کون تھا؟ آپ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کے شروع سے لے کر اسّی سے کچھ اوپر آیات نازل فرمائیں۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وحی نازل ہوگئی اور اُن سے مباہلہ کرنے کی دعوت کا حکم نازل ہوگیا تو آپ نے اس کے مطابق ان کو مباہلہ کی دعوت دی۔

مباہلہ کا طریقہ...... دعوت یہ تھی کہ ہم اپنی اولاد اور عورتوں سمیت آ جاتے ہیں تم بھی اپنی اولاد اور عورتوں اور اپنی جانوں کو لے کر حاضر ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دونوں فریق مل کر خوب سچے دل سے دعا کریں گے کہ جو بھی کوئی جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو جائے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مباہلہ کی دعوت دی تو کہنے لگے کہ ابوالقاسم (ﷺ) ہمیں مہلت دیجئے ہم غور و فکر کر کے حاضر ہوں گے۔

نصاریٰ کا مباہلہ سے فرار...... جب آپ کے پاس سے چلے گئے اور آپس میں تنہائی میں بیٹھے تو عبدالمسیح سے کہا کہ تیری کیا رائے ہے اس نے کہا کہ یہ تو تم نے سمجھ لیا کہ محمد ﷺ نبی مرسل ہیں اور انہوں نے تمہارے صاحب (یعنی حضرت عیسیٰ) کے بارے میں صاف صاف صحیح باتیں بتائی ہیں اور تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ جس کسی قوم نے کسی نبی سے کبھی کوئی مباہلہ کیا ہے تو کوئی چھوٹا بڑا اُن میں باقی نہیں رہا۔ اگر تمہیں اپنا بیج ناس کھونا ہے تو مباہلہ کرلو۔ اگر تمہیں اپنا دین نہیں چھوڑنا تو ان سے صلح کرلو اور اپنے شہروں کو واپس ہو جاؤ، مشورے کے بعد وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے اے ابوالقاسم (ﷺ) ہمارے آپس میں یہ طے پایا ہے کہ ہم آپ سے مباہلہ نہ کریں آپ کو آپ کے دین پر چھوڑ دیں اور ہم اپنے دین پر رہتے ہوئے واپس لوٹ جائیں اور آپ اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھیج دیں جو ہمارے درمیان ایسی چیزوں میں فیصلہ کر دے جن میں ہمارا مالیاتی سلسلہ میں اختلاف ہے آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ معالم التنزیل ص ۳۱۰ ج ۱ میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ آخر تک نجران کے نصاریٰ کے سامنے پڑھی اور اُن کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے کل تک مہلت مانگی جب صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے آپ پہلے سے حضرت حسین کو گود میں لئے ہوئے اور حضرت حسن کا ہاتھ پکڑے ہوئے تشریف لا چکے تھے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیچھے پیچھے تشریف لا رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے پیچھے تھے آپ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ جب میں دُعا کروں تو تم لوگ آمین کہنا یہ منظر دیکھ کر نصاریٰ نجران کا پوپ کہنے لگا کہ اے نصرانیو! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ سے یہ سوال کریں کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے تو ضرور ہٹا دے گا لہٰذا تم مباہلہ نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک روئے زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا یہ سن کر کہنے لگے کہ اے ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری رائے یہ ہے کہ ہم مباہلہ نہ کریں اور آپ کو آپ کے دین پر چھوڑیں اور ہم اپنے دین پر رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہیں مباہلہ سے انکار ہے تو اسلام قبول کرو اسلام قبول کرنے پر تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور تمہاری وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں کی ہیں انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اس پر آپ نے فرمایا کہ بس ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوگی وہ کہنے لگے کہ ہمیں جنگ کی طاقت نہیں ہم آپ سے صلح کر لیتے ہیں۔

نصاریٰ نجران سے مال لینے پر صلح...... اور وہ یہ کہ ہر سال دو ہزار جوڑے کپڑوں کے پیش کیا کریں گے۔ ایک ہزار ماہِ صفر میں اور ایک ہزار ماہِ رجب میں، آپ نے اُن سے اس بات پر صلح کر لی اور فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اہلِ نجران پر عذاب منڈلا رہا تھا اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو مسخ کر دیئے جاتے اور بندر اور خنزیر بنا دیئے جاتے اور اُن کے

سارے علاقے کو آگ جلا کر ختم کر دیتی اور نجران کے لوگ بالکل ختم ہو جاتے یہاں تک کہ پرندے بھی درختوں پر نہ رہتے۔ اور ایک سال بھی پورا نہ ہوتا کہ تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔

تفسیر ابن کثیر ص ۳۶۹ ج ۱ بحوالہ مسند احمد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مباہلہ کرنے کو تیار ہو رہے تھے اگر مباہلہ کے لئے نکل آتے تو (میدانِ مباہلہ سے) اس حال میں واپس ہوتے کہ نہ مال پاتے نہ اہل و عیال میں سے کسی کو پاتے۔ (اور خود بھی مر جاتے)

نصاریٰ مباہلہ کے لئے راضی نہ ہوئے اور اپنے باطل دین پر قائم رہے اور یہ جانتے ہوئے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں ایمان نہ لائے اور ایمان سے روگردانی کر بیٹھے اور آج تک ان کا یہی طریقہ ہے۔ حضرات علماء کرام نے بارہا مناظروں میں ان کو شکست دی ہے۔ ان کی موجودہ انجیل میں تحریف ثابت کی ہے اُن کے دین کو مصنوعی خود ساختہ دین بارہا ثابت کر چکے ہیں لیکن وہ اپنے دنیاوی اغراض سیاسیہ اور غیر سیاسیہ کی وجہ سے دینِ اسلام کو قبول نہیں کرتے اور دنیا بھر میں فساد کر رہے ہیں جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی تھی اس وقت سے لے کر آج تک ان کا یہی طریقہ رہا اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ (کہ اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جاننے والا ہے) یہ وعید اس وقت سے لے کر آج تک کے نصاریٰ کو اور آج کے بعد جو نصاریٰ حق سے اعراض کریں گے قیامت تک اُن سب کو شامل ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا

آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آ جاؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم عبادت نہ کریں مگر اللہ کی،

نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا

اور اُس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ کو چھوڑ کر ہم آپس میں کوئی کسی دوسرے کو رب نہ بنائے، سو اگر وہ روگردانی

اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اہلِ کتاب کو توحید کی دعوت

اس آیت میں یہود اور نصاریٰ کو توحید کی دعوت دی اور فرمایا کہ ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے نزدیک مسلم ہے ہم بھی مانتے ہیں تم بھی مانتے ہو اور وہ یہ کہ ہم سب صرف اللہ کی عبادت کریں اور اُس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔

یہود و نصاریٰ کو معلوم تھا کہ ہمارے دین کی اصل تعلیم یہی ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں۔ اگرچہ انہوں نے شرک اختیار کر لیا تھا لیکن اُن کے دین میں جو صحیح بات تھی وہ ان کو معلوم تھی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ ان کو توحید کی طرف بلاؤ اور انہیں بتاؤ کہ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اس کو قبول کرو صحیح بات کو کیوں قبول نہیں کرتے۔ اس آیت سے بعض لوگوں نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمان عیسائیوں سے یہ بات کریں کہ ہمارا اور تمہارا جن چیزوں

پر اتفاق ہے دونوں قومیں مل کر غیر قوموں کو ان چیزوں کی دعوت دیں یعنی یہود و نصاریٰ اپنے اپنے دین پر ہوتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور توحید کی دعوت دیتے رہیں، العیاذ باللہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے قرآن کسی قوم کو دین کفر پر باقی رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر لوگوں کو صرف توحید کی دعوت دی اور اسلام کی دعوت نہ دی اور وہ موحد ہو گئے تو یہ توحید اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں جب تک کہ دین اسلام قبول نہ کریں گے باوجود موحد ہونے کے آخرت میں نجات نہ پائیں گے یہ تو غیر اقوام کو دھوکہ دینا ہوا کہ تم توحید کی دعوت میں شریک ہو جاؤ اگر چہ اسلام قبول نہ کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ملک روم ہرقل کو خط لکھا تو اس میں تحریر فرمایا۔ سلام علی من اتبع الھدیٰ یعنی اللہ کا سلام ہے اس پر جو ہدایت کا اتباع کرے، پھر تحریر فرمایا کہ اما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم یعطک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الیریسیین۔

(کہ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں تو اسلام قبول کر سلامت رہے گا۔ اللہ تجھے دُہرا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اعراض کیا تو تیرے اوپر تمام کاشتکاروں کا گناہ ہوگا) مطلب یہ ہے کہ اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے تجھ پر تیرا گناہ تو ہوگا ہی تیری وجہ سے تیری مملکت کے کاشت کار جو اسلام قبول نہ کریں گے اُن کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا کیونکہ تو ان کو اسلام سے روکنے کا ذریعہ بنے گا۔ اس کے بعد آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکتوب گرامی میں آیتِ بالا تحریر فرمائی۔ (صحیح بخاری ص۵)

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل اسلام کی دعوت دی پھر آیتِ بالا تحریر فرمائی جس سے واضح ہوا کہ آیت شریفہ کا مقصد اسلام ہی کی دعوت دینا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ تم یہودیت اور نصرانیت پر باقی رہتے ہوئے ہمارے ساتھ مل کر دعوتِ توحید کا کام کرو۔

قولہ تعالیٰ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اور نہ بنائیں ہم آپس میں ایک دوسرے کو رب، اللہ کو چھوڑ کر) تفسیر روح المعانی ص۱۹۳ ج۳ میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم (صحابی ؓ) نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم غیر اللہ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے (پھر یہ کیوں فرمایا کہ آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں) آپؐ نے فرمایا کیا وہ لوگ تمہارے لئے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے تھے اور تم ان کی بات پر عمل نہیں کرتے تھے؟ عرض کیا ہاں ایسا تو تھا، آپؐ نے فرمایا یہ رب بنانے میں داخل ہے (کیونکہ چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینا صرف اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے لائق ہے وہ خالق و مالک ہے اپنی مخلوق میں جسے چاہے جس کے لئے حلال یا حرام قرار دے یہ مرتبہ کسی اور کو حاصل نہیں) واضح رہے کہ عدی بن حاتم پہلے نصرانی مذہب رکھتے تھے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ

اے اہلِ کتاب تم کیوں حجت کرتے ہو ابراہیم کے بارے میں، حالانکہ نہیں اتاری گئی توریت اور انجیل مگر اُن کے بعد،

بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ

کیا تم عقل نہیں رکھتے ہو۔ اے لوگو! تم ایسے لوگ ہو جنہوں نے اس چیز میں جھگڑا کیا جس کا تمہیں کچھ علم تھا پھر تم کیوں

تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۶ مَا كَانَ

حجت کرتے ہو اس بات میں جس کا تمہیں علم نہیں ہے اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ نہیں تھے

إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾

ابراہیم یہودی اور نصرانی، لیکن وہ حق کو اختیار کرنے والے فرمانبردار تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا ؕ وَاللّٰهُ

بلاشبہ انسانوں میں ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ قریب تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کا اتباع کیا اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ

وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾

سب مؤمنین کا ولی ہے۔

اہلِ کتاب کی اس بات کی تردید کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے

لباب النقول ص ۵۳ میں ہے (بحوالہ دلائل النبوۃ للبیہقی) حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمع ہوئے اور آپؐ کے پاس جھگڑا کرنے لگے علماءِ یہود نے کہا کہ ابراہیمؑ یہودی تھے اور نصاریٰ نے کہا کہ وہ تو نصرانی ہی تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں کی سرزنش فرمائی کہ تم کو جو تھوڑا سا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تھا اس کے متعلق تو تم نے کچھ حجت بازی کر لی لیکن جس چیز کا تمہیں بالکل ہی علم نہیں اس کے بارے میں کیوں حجت بازی کرتے ہو۔ توریت اور انجیل میں جو باتیں ہیں اُن کا کچھ تمہیں علم ہے۔ لیکن ان باتوں سے غلط نتیجے نکال کر تم نے حجت بازی کر لی۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے یہ تو جھوٹ ہی جھوٹ ہے اس کی طرف تو کوئی بھی اشارہ تمہاری کتابوں میں نہیں ہے۔ ابراہیم (علیہ السلام) یہودی کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی نسل میں سے ہیں اور ان سے سینکڑوں سال کے بعد دنیا میں تشریف لائے اور مبعوث ہوئے اور اُن پر توریت شریف نازل ہوئی، دینِ یہودیت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوا اب تم بتاؤ کہ جو شخص ان سے سینکڑوں سال پہلے گذر چکا ہو وہ اُن کے دین پر کیسے ہوگا؟ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں سال کے بعد تشریف لائے اور ان پر انجیل شریف نازل ہوئی۔ اب بتاؤ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے دین پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور تم نے دینِ یہودیت اور دینِ نصرانیت میں شرک ملا لیا ہے۔ خدا تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کر لی ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہو اور ابراہیم علیہ السلام خالص موحد تھے مشرک نہ تھے۔ وہ حق کو اختیار کرنے والے اور باطل سے دور رہنے والے تھے بھلا وہ کیسے یہودی یا نصرانی ہو گئے؟ تم علم کے دعویدار ہو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس بات کا وجود ہی نہیں تم اس کے مُدعی ہو یہ سب تمہاری بے عقلی ہے بے علمی بھی ہے۔ پہلی آیت کے ختم پر اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ o فرمایا اس سے اُن کا بے عقل ہونا بھی بتا دیا اور بے علم ہونا بھی۔

حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصی تعلق والا کون ہے؟...... پھر فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ (الآیۃ) (بلاشبہ انسانوں میں ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ خصوصیت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کا اتباع کیا) یہود و نصاریٰ نے نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا تعلق ظاہر کیا بلکہ یہ دعویٰ کیا کہ وہ یہودی اور نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی تکذیب فرمائی اور فرمایا کہ ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ تھے جنہوں نے اُن کی شریعت کا اتباع کیا اور

یہ نبی یعنی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جولوگ ان پر ایمان لائے یہ بھی ابراہیم سے قریب تر ہیں کیونکہ یہ امت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے۔ جیسا کہ سورۂ حج کے آخر میں فرمایا مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ توحید اور عقیدہ معاد میں تمام انبیاء علیہم السلام مشترک ہیں لیکن شریعتِ محمدیہؐ کے احکام کثیر تعداد میں ایسے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے موافق ہیں توحید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو محنت کی، جان جوکھوں میں ڈالی، اس کے لئے آگ میں ڈالے گئے، وطن چھوڑا۔ اُمت محمدیہؐ نے پوری طرح محنت اور کوشش کر کے جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر اس دعوتِ توحید کے لئے اور توحید پر خود باقی رہنے اور دوسروں کو باقی رکھنے میں اُمت محمدیہؐ نے جو قربانیاں دی ہیں اس کی نظیر دوسری اُمتوں میں نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ تو مشرک ہو گئے۔ انہوں نے توحید کی دعوت ختم ہی کر دی اُن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

اللہ مومنین کا ولی ہے...... آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ کہ اللہ ایمان والوں کا ولی ہے۔ وہ دنیا و آخرت میں ان کی مدد اور حفاظت فرمائے گا اور اُن کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی جزا دے گا وَلِيُّهُمْ کی بجائے وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ صفت ایمان ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ کی مدد و نصرت اور حفاظت حاصل ہوتی ہے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے اس بات کی خواہش کی کہ کسی طرح تمہیں گمراہ کر دیں۔ اور وہ گمراہ نہیں کرتے مگر اپنے نفسوں کو

يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ

اور وہ نہیں سمجھتے۔ اے اہلِ کتاب تم کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیات کے ساتھ، حالانکہ تم اقرار کرتے ہو۔ اے اہل

الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸ ۱۵

کتاب تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔

اہلِ کتاب کی خواہش کہ مسلمانوں کو گمراہ کر دیں

ان آیات میں اوّل تو مسلمانوں کو یہ بتایا کہ اہلِ کتاب کا ایک گروہ ایسا ہے جو تمہیں گمراہ کرنے کے درپے ہے اُن کی خواہش ہے کہ جس طرح ہو سکے تمہیں گمراہ کر لیں۔ کافروں کو یہ گوارا نہیں ہے کہ تم اپنے دین پر رہو اور وہ اپنے دین پر رہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ۔ سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۳ میں گذر چکا ہے کہ اہلِ کتاب تمہیں مرتد بنانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ م بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ ' بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ اور سورۂ نساء میں فرمایا وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (یعنی ان کی خواہش ہے کہ تم کافر ہو جاؤ جیسا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور اُن کی خواہش ہے کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں) اور سورۂ ممتحنہ میں فرمایا وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (اور ان کی خواہش ہے کاش تم کافر ہو جاتے)۔ زمانۂ نبوت میں جو یہود و نصاریٰ اور مشرکین تھے اُن کی یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر کفر اختیار کریں اور اُس کے لئے تدبیریں کرتے رہے۔ اُن کا ایسی تدبیریں کرنا خود ان ہی کی مزید گمراہی میں مبتلا ہونے اور کفر میں شدید ہونے کا ذریعہ بنتا رہا۔ اور اُن کی اس کوشش کا وبال انہیں پر پڑا، آج بھی کافروں کی اس طرح کی کوششیں جاری ہیں۔ ان کے دلوں پر ایسے سیاہ پردے پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں یہ

احساس ہی نہیں کہ ہم گمراہی میں ترقی کر رہے ہیں۔

اے اہلِ کتاب تم کیوں کفر اختیار کرتے ہو اور حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو؟......پھر اہلِ کتاب سے خطاب فرمایا کہ تم اللہ کی آیات کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ آیات حق ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت پر جو دلائل قاطعہ سامنے آچکے ہیں اُن کو جانتے ہوئے گمراہی کو اختیار کرنا سخت در سخت عذاب کا ذریعہ ہے۔

نیز فرمایا کہ اے اہلِ کتاب تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو، اس کے بارے میں حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ توریت اور انجیل میں جو انہوں نے تحریف کر لی تھی مخلوط کرنے سے وہ مراد ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتے تھے اور دلوں میں انہوں نے کفر اختیار کر رکھا تھا منافق بنے ہوئے تھے، اس کی تفسیر میں اور بھی بعض اقوال ہیں، مزید فرمایا وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ کہ تم حق کو یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں، یہودی آپس میں اور بعض مرتبہ انصار اور مہاجرین کے سامنے ہی بات کہہ دیتے تھے کہ آنحضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن دنیاوی اغراض کی وجہ سے حق قبول نہیں کرتے تھے۔ جانتے بوجھتے ہوئے گمراہ ہونا بہت بڑی شقاوت ہے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ

اور کہا اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہ ایمان لاؤ اس پر جو نازل کیا گیا مسلمانوں پر دن کے شروع حصہ میں،

وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى

اور منکر ہو جاؤ دن کے آخر حصہ میں امید ہے کہ یہ لوگ واپس لوٹ آئیں۔ اور اقرار مت کرنا مگر ایسے شخص کے سامنے جو تمہارے دین کا تابع ہو، آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ ہدایت

هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے یہ باتیں تم اسلئے کرتے ہو کہ کسی دوسرے کو ایسی چیز مل رہی ہے جو تمہیں دی گئی یا اسلئے کہ وہ تم پر دلیل میں غالب ہو جائیں گے تمہارے رب کے پاس۔ آپ فرما

الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

دیجئے کہ بلاشبہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اُسے عطا فرماتا ہے جسے چاہے، اور اللہ واسع ہے خوب جاننے والا ہے۔ وہ مخصوص فرماتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے،

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝

اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

یہودیوں کی ایک مکاری کا تذکرہ

ان آیات میں اوّل تو یہودیوں کے ایک منافقانہ طریق کار کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ ان میں سے ایک جماعت نے آپس میں ایک دوسرے کو مشورہ دیا کہ صبح صبح جب دن شروع ہو تم مسلمانوں کے پاس جاؤ اور ان کے سامنے یوں کہو کہ ہم مسلمان ہیں ہم نے تمہارا دین قبول کر لیا۔ اور دن بھر اسی طرح گزار دو، اور جب شام کا وقت ہو جائے دن جانے لگے تو کفر اختیار کر لو تا کہ مسلمان اپنے

دین سے واپس ہو جائیں۔ صاحب روح المعانی ص ۱۲۶ ج ۳ لکھتے ہیں کہ یہود خیبر کے علماء میں سے بارہ آدمیوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا تھا اور وَاکْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ، جو انہوں نے کہا تھا اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صبح کو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کے بعد اُسی دن شام کو اپنے کفر کا اظہار کر دینا (جو دل میں پہلے ہی سے تھا) اور مسلمانوں سے یوں کہنا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں غور کیا اور اپنے علماء سے مشورہ کیا تو ہماری سمجھ میں یہی آیا کہ محمد (ﷺ) کا دین باطل ہے جب ایسا کہو گے تو سچے مسلمانوں پر بھی اثر پڑے گا وہ سمجھیں گے کہ یہ تو اہل کتاب ہیں اہل علم ہیں جب انہوں نے دین اسلام قبول کر کے چھوڑ دیا تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین اسلام صحیح نہیں ہے۔ یہ طریقہ کار انہوں نے اپنے خیال میں مسلمانوں کو ورغلانے کیلئے اختیار کیا لیکن دشمنوں کے مکر و فریب کا الحمد للہ کسی مسلمان نے کچھ بھی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد یہودیوں کی ایک اور بات کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ انہوں نے آپس میں یوں کہا وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ کہ تمہارا جو دین یہودیت ہے اس دین پر مضبوطی کے ساتھ جمنے کا اقرار ان ہی لوگوں کے سامنے کرنا جو تمہارے دین کے تابع ہیں، یعنی اپنا اندرونی عقیدہ اپنے ہی لوگوں کے سامنے بیان کرنا، اور مسلمانوں کو دین اسلام سے پھیرنے کے لئے اوپر اوپر سے یہ کہہ دینا کہ ہم نے تمہارا دین قبول کر لیا (اندر سے اپنے عقیدہ پر رہنا پھر ظاہری طور پر بھی یوں کہہ دینا کہ ہم اپنے دین پر واپس آ گئے حالانکہ دل سے انہوں نے اپنا دین چھوڑا ہی نہیں تھا) یہ ان کا مکر تھا۔

اور بعض مفسرین نے وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم صرف اسی شخص پر ایمان لاؤ جو تمہارے دین کی موافقت کرتا ہو کما فی معالم التنزیل ای ولا تصدقوا الا لمن تبع دینکم ای وافق ملتکم (جس کا معنی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نئی شریعت لے کر آئے ہیں اور وہ تمہاری شریعت کے موافق نہیں ہے اس لئے تم ان پر ایمان نہ لاؤ۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیں کہ بلاشبہ ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، وہ جسے ہدایت دینا چاہے اور ہدایت پر رکھنا چاہے اسے کسی کی تدبیر ہدایت سے نہیں روک سکتی، یہ معنی پہلی تفسیر کے مطابق ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق اس کا یہ معنی ہوگا کہ اللہ کو اختیار ہے کہ اپنی بھیجی ہوئی ایک شریعت کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ دوسری شریعت بھیج دے اور اس پر عمل کرنے کا حکم فرما دے، جب اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دوسری شریعت بھیج دی تو اسے قبول کر لو، اگر اس کے خلاف چلو گے تو برابر کفر کی گمراہی میں رہو گے قولہ تعالیٰ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اس میں بھی یہودیوں کی ایک بات کا تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے آپس میں کہا کہ تم کبھی یہ تصدیق نہ کرنا کہ تم کو جو علم اور کتاب اور حکمت دی گئی ہے اُس جیسی کسی اور کو بھی عطا کی گئی ہو، علم اور کتاب اور حکمت یہ صرف ہمارا ہی حصہ ہے، نیز انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم اس بات کی بھی تصدیق نہ کرنا کہ تمہارے ربّ کے پاس دوسرے لوگ حجت میں تم پر غالب آ جائیں گے۔ کیونکہ تمہارا ہی دین صحیح ہے اس صورت میں اَنْ یُّؤْتٰٓى سے پہلے ایک وَلَا تُؤْمِنُوْٓا مقدر ماننا ہوگا صاحب بیان القرآن نے اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اے یہودیو! تم ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ تمہیں مسلمانوں پر حسد ہے کہ انہیں آسمانی کتاب کیوں مل گئی یا یہ لوگ تم پر مذہبی مناظرہ میں کیوں غالب آ جاتے ہیں اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام کے تنزل کی کوششیں کرتے ہو اس صورت میں أن یوتی سے پہلے تدبّرتم یاقلتم مقدر ماننے کی ضرورت ہوگی۔

آخر میں یہودیوں کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ (الآیۃ) آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ فضل اللہ

کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے عطا فرما دے۔ وہ بڑی وسعت والا ہے بڑے علم والا ہے، وہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے مخصوص فرما دے اور وہ بڑے فضل والا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت سے نواز دیا اور اُن پر کتاب نازل فرما دی اور اُن کے ذریعہ ہدایت پھیلا دی اس پر تم کو حسد کرنا جہالت اور کفر ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی دوسرے کو نبی کیوں بنایا۔ یہ عصبیت جاہلیہ اہلِ علم کو برباد کر دیتی ہے۔ مزید توضیح اور تشریح کیلئے سورۂ بقرہ (ع ۱۱) میں بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ کی تفسیر دیکھ لی جائے۔ (انوار البیان ص ۱۲۴، ۱۲۵ جلد ہذا) یہ لوگ عصبیت جاہلہ کی وجہ سے کفر اختیار کرنے اور کفر پر جمے رہنے اور دائمی عذاب میں پڑنے کو تیار ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے پر تیار نہیں کہ وہ اپنی رحمت سے جسے چاہے اپنا فضل عطا فرمائے۔ اللہ کی مشیت و ارادہ میں کسی کو چوں کرنے کا مقام نہیں۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ

اور اہلِ کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ اُنکے پاس اگر بہت زیادہ مال امانت رکھ دو گے تو وہ تمہاری طرف ادا کر دیں گے اور اُن میں ایسے ہیں کہ اگر تم اُنکے پاس ایک دینار

لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ

امانت رکھ دو گے تو وہ تمہاری طرف ادا نہیں کریں گے مگر یہ کہ تم برابر سر پر کھڑے رہو یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ اَن پڑھوں کے بارے میں ہم پر کوئی

سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ

مواخذہ نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں، ہاں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو بلاشبہ

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷۶

اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

اہلِ کتاب کی امانت داری اور خیانت کا تذکرہ

اس آیت میں اُن اہلِ کتاب کا بیان ہے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اُن اہلِ کتاب کا ذکر ہے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور وہ بدستور حب مال اور حبِّ دُنیا میں غرق رہے۔ صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ سے مؤمنین اہلِ کتاب مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلام اور دیگر صحابہؓ جو پہلے یہودی تھے اور بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا اور لَا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ سے وہ یہود مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور بدستور حبِّ دنیا اور حبِّ مال میں مستغرق تھے۔ جیسے کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن سلام کے پاس ایک شخص نے بارہ سو اوقیہ سونا امانت رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اس کو ادا کر دیا (ایک اوقیہ چالیس درہم کے وزن کے برابر ہوتا ہے) اور فنحاص بن عازوراء ایک یہودی تھا اسکے پاس ایک قریشی نے ایک دینار امانت رکھ دیا تو وہ خیانت کر بیٹھا۔ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کی دو جماعتوں کا حال بیان فرمایا کہ بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس قنطار یعنی مالِ کثیر امانت رکھ دو گے تو وہ واپس کر دیں گے اور اچھے طریقے پر ادا کر دیں گے اور بعضے لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے پاس اگر ایک دینار (گنّی) امانت رکھ دو تو ادا نہ کریں گے ہاں سر پر برابر کھڑے ہی رہو اور تقاضوں سے عاجز آ کر ادا کر دے تو وہ دوسری بات

ہے۔ابوبکر جصاص احکام القرآن ص ۷ اج ۲ میں لکھتے ہیں کہ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا سے معلوم ہوا کہ جس کا حق ہے وہ اس کے پیچھے پڑ سکتا ہے اور مسلسل اس کا پیچھا کر سکتا ہے جس کے اوپر حق ہے۔وقد دلت الاٰية على انّ لِلطّالب ملازمة المطلوب للدين۔

آیت میں اہلِ کتاب کا تذکرہ تو ہے ہی اس امت کے نادہندہ لوگوں کو بھی تنبیہ ہے قرض لینے اور امانت رکھنے کے لئے تو جلد سے جلد تیار ہو جاتے ہیں اور جب دینے کا وقت آتا ہے تو ٹال مٹول کرتے ہیں۔صاحبِ حق کو چکر کھلاتے ہیں۔پریشان کرتے ہیں امانت کھا جاتے ہیں اور قرض مار لیتے ہیں۔ پھر بدنیت لوگوں کی اللہ پاک کی طرف سے مدد بھی نہیں ہوتی۔صحیح بخاری ص ۳۲۱ ج ۱ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے لوگوں کے مال لے لئے جن کی ادائیگی کا وہ ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دیتا ہے۔یعنی اس کی حسن نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قرضوں کی ادائیگی کے لئے سہولت پیدا فرما دیتے ہیں اور جس نے لوگوں کے مال لئے جنہیں وہ تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ تلف فرما دیتا ہے (مال اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس پر قرضہ باقی رہ جائے گا۔قیامت کے دن حقوق العباد مارنے کی وجہ سے عذاب میں جائے گا۔(كما فى حاشية البخارى عن العينى)۔

یہودیوں کا یہ جھوٹ کہ ہمیں اَن پڑھوں کا مال مارنا حلال ہے...... یہودیوں پر ایک اور جہالت سوار تھی اور وہ یوں کہتے تھے کہ عرب کے اُمّی لوگوں کا ہمارے لئے سب کچھ حلال ہے۔ان کا عقیدہ تھا کہ جو بھی کوئی ہمارے دین پر نہ ہو اس پر ظلم کرنا مال مارنا حلال ہے۔حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگوں نے یہودیوں سے خرید و فروخت کے معاملات کئے یہودیوں پر اُن کے قرضے تھے جب وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور یہودیوں سے تقاضا کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہارا ہم پر کوئی حق نہیں اور نہ ہمارے ذمہ کچھ ادائیگی ہے تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور ہمارے تمہارے درمیان جو عہد تھا وہ ختم ہو گیا اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ہم نے یہ بات اپنی کتابوں میں پائی ہے۔عربوں کو اُمیّیو ن (اَن پڑھ) کہا کیونکہ یہ لوگ یہودیوں کے مقابلہ میں پڑھے لکھے نہیں تھے یہودیوں نے کہا کہ اَن پڑھوں کے ہم نے مال مار لئے تو کیا ہے ان کے مالوں کے بارے میں ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں کو ہمارے لئے حلال کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اُن کی تردید فرمائی اور فرمایا: وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ کہ یہ لوگ اللہ کے ذمہ جھوٹ لگاتے ہیں اور جانتے بھی ہیں کہ ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں۔(معالم التنزیل ص ۳۱۷-۳۱۸ ج ۱) تفسیر ابن کثیر میں حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ جب اہلِ کتاب نے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كذب اعداء الله کہ اللہ کے دشمنوں نے جھوٹ کہا۔تفسیر ابن کثیر ص ۳۷۴ ج ۱ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے کہا کہ ہم جہاد میں جاتے ہیں اور ذمی (یعنی وہ کافر جو دارالسلام میں رہتے ہیں) ہم کو اُن کے جو مال مل جاتے ہیں مرغی اور بکری ہم انہیں کھا جاتے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم کیا سمجھ کر کھا جاتے ہو۔اس نے جواب دیا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے اہلِ کتاب نے کہا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ جب ذمیوں نے جزیہ ادا کر دیا تو تمہارے لئے اُن کے مال حلال نہیں ہیں ہاں اگر وہ اپنے نفسوں کی خوشی کے ساتھ دیں تو یہ اور بات ہے۔

جھوٹے فقیروں کا طریقِ کار...... اس اُمّت میں بھی بہت سے جھوٹے پیر فقیر ایسے ہیں کہ جن بستیوں میں اُن کے کسی باپ دادا سے لوگ مرید ہو گئے تھے۔اُن بستیوں کو اپنا مرید آباد بنا رکھا ہے۔سالانہ ان علاقوں میں گشت کرتے ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں اُن کے مالوں میں سے بلا اجازت لیتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور وہ لوگ لحاظ اور مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔شرعاً اس طرح کا لیا ہوا مال

حلال نہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الا لا یحل مالُ امرءٍ مسلمٍ الاّ بطیب نفسٍ مّنهُ (خبردار! کسی مسلمان آدمی کا مال حلال نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نفس کی خوشی سے دے دے) (کمافی المشکوٰۃ ص ۲۵۵) بے آبروئی کے ڈر سے یا کسی بھی طرح کے دباؤ سے کوئی شخص اگر اجازت دیدے تب بھی اس کا مال لینا حلال نہیں ہوتا اگر چہ وہ ظاہری طور پر زبان سے اجازت بھی دیدے یا خاموش رہے، اسی لئے طیب نفس کی قید لگائی جو مال طیب نفس سے نہ ملے گا وہ حلال نہ ہوگا۔اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جو شخص فاسق ہو اندر سے اس کا باطن پاک نہ ہو اور اسے بزرگ سمجھ کر ہدیہ دیا جائے اگر چہ خوشدلی سے ہو وہ ہدیہ اس کے لئے حلال نہیں۔(کمافی احیاء العلوم ص ۱۰۴ ج ۲)

مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى کی تفسیر...... آخر میں فرمایا: بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ کہ یہ بات نہیں ہے کہ ان پڑھوں کے مالوں کو حرام طریقے پر رکھ لینے سے ان پر کوئی مواخذہ نہ ہو اُن پر مواخذہ ضرور ہے۔فی الروح ص ۲۰۳ ج ۳ بلی جواب لقولهم ليس علينا فی الاميين سبيل وايجاب لما نفوه والمعنى بلى عليهم فی الاميين سبيل. (روح المعانی میں ہے کہ بلی ان کے قول لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ کا جواب ہے اور جس چیز کی وہ نفی کر رہے ہیں اس کا اثبات ہے اور مطلب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ان پر ان پڑھوں کے بارے میں بھی مؤاخذہ ہے) اور من اوفى بعهده واتقى یہ جملہ مستانفہ ہے۔یہودی باوجود ایسی حرکتوں کے جواوپر ذکر ہوئیں اپنے کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بھی سمجھتے ہیں۔اللہ کا محبوب وہ ہے جو اس کے عہد کو پورا کرے (عہد میں یہ بھی شامل ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں) اور گناہوں سے بچے سب سے بڑا گناہ کفر اور شرک ہے اس سے بھی بچے اور لوگوں کے اموال مارنے سے بھی بچے۔(یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پوری طرح خیال رکھے) جو شخص ایسا ہوگا۔اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائے گا۔اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ قال ابن كثير ص ۳۷۴ ج ۱ ای لكن من اوفى بعهده واتقى منكم يا اهل الكتاب الذى عاهدكم الله عليه من الايمان بمحمد صلى الله عليه وسلم اذا بعث كما أخذ العهد والميثاق على الانبياء وأممهم بذلک واتقى محارم الله واتبع طاعته وشريعته التى بعث بها خاتم رسله وسيدهم (فان الله يحب المتقين) (یعنی اے اہل کتاب جو شخص تم میں سے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی بعثت کے بعد ایمان لانے کا وعدہ اللہ سے کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء اور ان کی امتوں سے عہد و میثاق لیا ہے اور تم میں سے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے بچا اور اس کی اطاعت اختیار کی اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت لے کر آئے ہیں اس کی پیروی کی تو پھر اللہ تعالیٰ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔)

اس آیت میں عہد پورا کرنے کی اہمیت کا بھی ذکر ہے۔اللہ سے عہد ہو یا بندوں سے اس کا پورا کرنا لازم ہے اللہ سے اہل کتاب کا یہ عہد تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے اُسے انہوں نے پورا نہ کیا اور ہر مسلمان کا اللہ سے عہد ہے کہ میں آپ کے احکام کی تعمیل کروں گا۔حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایک بات بتادیجئے جس کے بعد مجھے آپ کے علاوہ کسی اور سے پوچھنا نہ پڑے اور یہ بات اسلام کی باتوں میں سب سے زیادہ جامع ہو آپ نے فرمایا قل امنت بالله ثم استقم (تو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کہہ دے اور اس پر جما رہ۔رواه مسلم كما فی المشکوٰۃ ص ۱۲)

اسلام کا کلمہ پڑھ لینا محض زبانی بات نہیں ہے اس کی ذمہ داریاں ہیں اس میں اللہ تعالیٰ سے اقرار ہے اور عہد ہے کہ میں آپ کے احکام پر چلوں گا اور جو آپ کی کتاب اور آپ کے رسول کے ذریعہ مجھے پہنچیں ہیں۔اسلام کی جو پابندیاں ہیں ہر مسلمان ان کے پورے کرنے کا عہد کر چکا ہے ان کا پورا کرنا لازم ہے۔سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (اور عہد کو پورا کرو

بلا شبہ عہد کے بارے میں باز پرس ہونے والی ہے) اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں جس شخص میں ہوں گی خالص منافق ہوگا اور جس میں اُن میں سے ایک خصلت ہوگی جب تک اُسے چھوڑ نہ دے گا اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہوگی (۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، (۳) جب عہد کرے تو دھوکہ دے، (۴) جب جھگڑا کرے تو گالیاں دے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ

بے شک اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے مقابلہ میں جو لوگ حقیر معاوضہ لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ اُن سے

وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۷﴾

اللہ تعالیٰ کلام فرمائے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر فرمائے گا اور نہ اُن کو پاک فرمائے گا اور اُن کے لئے عذاب ہے دردناک۔

اللہ کے عہد کے عوض دنیا کمانے والوں کو تنبیہ

یہودیوں سے جو اللہ تعالیٰ کا عہد تھا کہ نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ اس عہد کو انہوں نے اپنے عوام سے چھپایا اور بدل بھی دیا۔ کیونکہ جو صفات توریت شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پڑھی تھیں اُن کو واقعی طور پر جاننے کے باوجود بھی تغیر وتبدل کر دیا اور اپنے عوام کو بتایا کہ جو صفات ہم نے پڑھی ہیں وہ اُن پر منطبق نہیں ہوتیں اور اس طرح اپنے عوام کو اپنی جانب کر کے اپنی ریاست باقی رکھی۔ اور اپنے عوام سے رشوت لیتے رہے۔ یہ عہد خداوندی کے عوض حقیر دنیا حاصل کرنا ہوا۔ حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ یہ آیت ابورافع اور کنانہ اور حیی اور ان کے علاوہ دیگر رؤساء یہود کے بارے میں نازل ہوئی ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن صفات کو چھپا دیا جو توریت شریف میں مذکور تھیں اور اُن کو بدل کر دوسری صفات اپنے قلم سے لکھ دیں اور انہوں نے قسم کھائی کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تاکہ رشوتیں اور کھانے پینے کے طریقے جو جاری کر رکھے تھے وہ ہاتھ سے نہ جائیں۔ اور اُن کے اتباع سے جو کچھ ملتا تھا وہ ملتا رہے۔

جھوٹی قسم اور اُس کا وبال ...... یہودی مالیات کے سلسلے میں جھوٹی قسمیں بھی کھا جاتے تھے اور اس طرح کی حرکتیں دوسرے لوگوں سے بھی صادر ہوتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں اس لئے کسی جماعت کا نام لینے کی بجائے عمومی بات ذکر فرما دی کہ جو لوگ ایسا ایسا کریں گے اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر سخت غصے ہوگا اور اللہ تعالیٰ اُن سے بات بھی نہ فرمائے گا اور اُن کی طرف نظرِ رحمت سے بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے فرمائیں۔ صاحبِ روح المعانی ص ۲۰۳ ج ۳ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے خود حساب لے، بلکہ فرشتے اُن سے بات کریں گے اور حساب لیں گے۔ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ بغوی معالم التنزیل ص ۳۱۹ ج ۱ میں فرماتے ہیں کہ أی لا یثنی علیهم بالجمیل ولا یطهرهم من الذنوب کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اچھائی کے ساتھ یاد نہ فرمائے گا اور انہیں گناہوں سے پاک نہ کرے گا۔ اور حافظ ابنِ کثیرؒ ص ۳۷۵ ج ۱ لکھتے ہیں کہ ای من الذنوب والادناس ویامربهم الی النّار یعنی اللہ تعالیٰ اُن کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا اور اُن کو دوزخ میں بھیج دے گا۔ (نہ اُن کی مغفرت ہوگی جس سے گناہ معاف ہوں اور نہ یہ ہوگا کہ کچھ مدت کے لئے دوزخ میں بھیج کر گناہوں کی سزا دے کر پاک صاف کر

کے جنت میں بھیجا جائے جیسا کہ بعض گناہ گار اہل اسلام کے ساتھ ہوگا) وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جس سے کبھی بھی نہ نکلیں گے۔ صحیح بخاری ص ۳۶۶ ج ۱ میں ہے کہ حضرت اشعث ابن قیس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میرے اور ایک یہودی شخص کے درمیان زمین کے بارے میں مخاصمت تھی اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارا کوئی حق نہیں۔ میں اُسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ آنحضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کیا تمہارے پاس گواہ ہیں میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے یہودی سے فرمایا کہ تو قسم کھا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو قسم کھا لے گا اور میرا مال لے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (الآیۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا کہ جو بھی کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے تاکہ کسی کا مال اس کے ذریعہ حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی تصدیق نازل فرمائی۔ اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے آیتِ بالا تلاوت فرمائی، راوی حدیث حضرت ابووائل (شاگرد ابن مسعود رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت اشعث سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے آج تم سے کیا بیان کیا۔ میں نے اُن سے حدیث بالا بیان کر دی اور عرض کر دیا کہ آخر میں انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت اشعث نے فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری ص ۳۶۸ ج ۱)

حضرت عبداللہ بن اَبی اوفی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص مال بیچنے کے لئے کھڑا ہوا اور اُس نے اللہ کی قسم کھالی کہ میں نے اس کے عوض اتنا اتنا مال دیا ہے (اور یہ جھوٹ تھا کیونکہ اس نے اتنا مال نہیں دیا تھا جتنا اس نے بتایا۔ تاجروں کی عادت ہوتی ہے کہ زیادہ نفع کمانے کے لئے گاہک کے سامنے جھوٹی قسم کھا جاتے ہیں کہ میں نے تو خود اتنے میں خریدا ہے) اس پر آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری ص ۳۶۷ ج ۱)

مذکورہ بالا روایات سے آیت کے چند اسبابِ نزول معلوم ہوئے۔ بیک وقت چند چیزیں جمع ہوگئی ہوں جو آیت نازل ہونے کا سبب بن گئیں اس میں کوئی بعد نہیں۔ آیت شریفہ میں اللہ کے عہد کو بدلنے والوں اور جھوٹی قسم کھا کر دوسروں کا مال حاصل کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے اور اُن کی آخرت کی سزا ذکر کی ہے۔ آیت کا مضمون عام ہے اور ہر اس شخص کو شامل ہے جو اُس طرح کی حرکت کرے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ اُن سے کلام نہ فرمائے گا اور ان کے لئے عذابِ الیم ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ان کا برا ہو اور نقصان میں پڑیں کون ہیں وہ لوگ یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا اپنے کپڑوں کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا اور (کسی کو کچھ دے کر) احسان جتانے والا اور اپنی بکری کے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ چالو کرنے والا۔ (صحیح مسلم) نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم سودا بکوا دیتی ہے اور برکت کو ختم کر دیتی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۳ از بخاری و مسلم)

بہت سے لوگ حاکم کے ہاں جھوٹا مقدمہ لے جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ مدعی جھوٹا ہوتا ہے اور وہ جھوٹے گواہ پیش کر دیتا ہے اور بعض مرتبہ مدعی علیہ جھوٹا ہوتا ہے اور وہ جھوٹی قسم کھا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اُس چیز کا دعوٰی کیا جو اس کی نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے اور ایسا شخص اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔ (رواہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑے بڑے گناہوں میں سے

اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کو تکلیف دینا ہے، جھوٹی قسم کھانا اور جس کسی شخص نے بھی اپنی بات پر جمتے ہوئے قسم کھائی اور اس میں مچھر کے پَر کے برابر بھی کوئی جھوٹی بات داخل کر دی تو وہ قسم قیامت کے دن تک اس کے لئے سیاہ داغ بن جائے گی۔ (رواہ الترمذی کمافی المشکوٰۃ ص ۳۲۸)

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنی قسم کے ذریعہ کسی مسلمان کا حق مار لیا۔ اللہ اس کے لئے دوزخ واجب فرمادے گا اور اس پر جنت حرام فرمادے گا۔ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگرچہ معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا اگر پیلو کے درخت کی ذراسی چھڑی ہی کیوں نہ ہو۔ (رواہ مسلم کمافی المشکوٰۃ ص ۳۲۷)

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِۚ

اور بلاشبہ اُن میں ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبانوں کو موڑ کر کتاب بیان کرتا ہے تاکہ تم اُس کو کتاب سے سمجھو

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ

حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ

يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

وہ جانتے ہیں۔

بعض اہلِ کتاب، کتاب اللہ میں تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے

یہ آیت بھی یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی یہ لوگ توریت شریف میں تحریف اور تغیر کرتے تھے، بیان کرتے ہوئے اس انداز سے زبان موڑ کر بات کر جاتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھ لے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ اللہ کی کتاب میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات جو توریت شریف میں پائی تھیں اُن کو بدل دیا اور آیت رجم کو چھپالیا۔ تحریف کرتے ہوئے جو بات کہتے تھے اس کو ایسے انداز میں پیش کرتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اُن کی اپنی بنائی ہوئی بات ہوتی تھی، اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ صاف ہی کہہ دیتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ بات خود تراشیدہ ہوتی تھی۔ اَلْسِنَتَهُمْ کا جو مطلب اوپر عرض کیا گیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص سے مدعی نے کہا کہ تو کعبہ کی قسم کھا اس نے زبان دبا کر کا بک کی قسم کھالی دوسرے کاف کی طرف مدعی اور دوسرے سننے والوں کا ذہن بھی نہ گیا انہوں نے سمجھا کہ اس نے واقعی کعبہ کی قسم کھالی پھر جب مجلس سے جدا ہوا تو اس کے متعلقین نے کہا تو نے جھوٹی قسم کھائی؟ تو کہنے لگا کہ میں نے تو کابک کی قسم کھائی ہے۔

کابک بعض علاقوں میں کبوتر بند کرنے کے پنجرے کو کہتے ہیں۔ کعبہ کی قسم کھانا بھی جائز نہیں ہے یہ ایک مثال ذہن میں آئی تھی عرض کر دی اس طرح کے اور بھی واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ صاحبِ معالم التنزیل فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ لوی لسانه عن كذا سے ماخوذ ہے اور یہ غیّر کے معنی میں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کا معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ يحرفون الكلم عن مواضعه ويبدلون كلام الله ويزيلونه عن المراد به ليوهموا الجهلة انه فى كتاب الله كذٰلك وينسبونه الى الله وهو كذب على الله وهم يعلمون من انفسهم انهم قد كذبوا وافتروا فى ذالك كله۔ (کلمات کو اپنی جگہ سے ہٹاتے اور کلام اللہ میں تبدیلی کرتے تھے

اور کلام الٰہی کو اپنی مراد سے ہٹا دیتے تھے تا کہ جاہلوں کو جتلائیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اسی طرح ہے۔ اور اسے اللہ کی طرف منسوب کریں اور یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے اور وہ خود جانتے تھے کہ وہ اس پورے عمل میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔)

حافظ بغوی اور حافظ ابن کثیرؒ نے زبان موڑ کر بیان کرنے کا معنی یہی لیا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں یعنی اس کا مطلب غلط بتاتے ہیں اور لوگوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی کتاب کا مطلب تمہارے سامنے صحیح بیان کیا ہے وہ لوگ تحریف کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے اور جان بوجھ کر یہ گناہ کرتے تھے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ چونکہ اللہ کی کتاب کی تعلیم اُن کے ہاں عام نہیں تھی اور چند علماء ہی ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے اس لئے اپنے عوام کو جو چاہتے تھے سمجھا دیتے تھے۔ امت محمدیہ میں بھی بعض فرقے جو اہل ہوٰی ہیں حقیر دنیا کے لئے اہل کتاب کی نقل اتارتے ہیں، ایک واعظ صاحب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکر تھے اپنے عوام کو خوش کرنے کے لئے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کا ترجمہ کرتے ہوئے مَا کو نافیہ بتا گئے اور اس سے بشریت کی نفی ثابت کر گئے اہل ہوٰی کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ خواہ کافر ہی ہو جائیں لیکن ان کے عوام ناراض نہ ہوں۔ اور عوام سے جو ملتا ہے وہ ملتا رہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا

کسی بشر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اُسے کتاب حکمت اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے یوں کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن

لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

جاؤ، اور لیکن وہ یہ کہے گا کہ تم اللہ والے ہو جاؤ اس وجہ سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس وجہ سے کہ تم پڑھتے ہو۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۗ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۸/۹ ۱۲

اور وہ تمہیں یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

ہر نبی کی یہ دعوت ہوتی تھی کہ اللہ والے بن جاؤ

لباب النقول ص ۵۴ میں ہے کہ جب مدینہ کے یہودی اور نجران کے نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمع ہوئے اور آپ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی تو ابورافع نے کہا (جو یہودی کے قبیلہ بنی قریظہ سے تھا) اے محمدؐ! آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپؐ کی عبادت کریں جیسے نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا معاذ اللہ (اللہ کی پناہ) میں ایسی دعوت کیوں دینے لگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں جیسے آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا جاتا ہے۔ کیا ہم ایسا نہ کریں (کہ آپ کی رفعت اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے) آپؐ کو سجدہ کریں آپؐ نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو اپنے نبی کا اکرام کرو اور صاحبِ حق کا حق پہچانو۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا درست نہیں ہے اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ (روح المعانی ص ۲۰۷ ج ۳)

اوپر آیت کے دو سببِ نزول بیان ہوئے اگر دونوں ہی ہوں تو اس میں کوئی بات قابل اشکال نہیں، آیت میں صاف صاف واضح طور

پر بیان فرمادیا کہ جس کسی بشر کو اللہ پاک کتاب اور حکمت عطا فرمائے اور نبوت سے نوازے اُس کے لئے کسی طرح سے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنانے کی دعوت دے۔ نبیوں کا کام تو یہ تھا کہ لوگوں کو خدائے پاک کی بندگی کی طرف بلائیں اور خدا کا بندہ بنائیں وہ خدائے پاک کی عبادت چھڑا کر اپنی عبادت یا کسی بھی غیر اللہ کی طرف دعوت نہیں دے سکتے اس میں نصاریٰ کی تردید ہوگئی جو یہ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اور اپنی ماں کی عبادت کی دعوت دی ہے اور یہودیوں کے اس قول کا بھی رَدّ ہوگیا جنہوں نے کہا کہ اے محمدؐ! تم اپنی عبادت کرانا چاہتے ہو۔ جس کسی بھی بندہ کو اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا اس نے یہی دعوت دی کہ تم ربّانی بن جاؤ۔ اللہ پر ایمان لاؤ اسی کی عبادت کرو۔

قوله تعالٰی بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ،اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی ص ۲۰۸ ج ۳ لکھتے ہیں البـاء لـلسببية متعـلـقة بـكـونـوا أى كُونُوا كذلك بسبب مثابرتكم على تعليمكم الكتاب ودراستكم له والمطلوب ان لا ينفک العلم عن العمل اذلا يعتد احدهما بدون الآخر اس کا مطلب یہ ہے کہ باسببیہ ہے جار مجرور کُونُوا سے متعلق ہے۔ یعنی تم لوگ ربّانی ہو جاؤ، اس وجہ سے کہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور کتاب کو پڑھتے ہو جس کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور جس کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہو اس کا تقاضا یہی ہے کہ ربّانی بنو اور جو تمہارے پاس علم ہے اس پر عمل کرو کیونکہ علم بغیر عمل کے معتبر نہیں اور عمل بغیر علم کے صحیح نہیں۔

ربانی کون ہیں؟ ...... لفظ رَبَّانِيِّينَ، ربّانی کی جمع ہے جو رب کی طرف منسوب ہے نسبت میں الف اور نون زائد کر دیا گیا۔ لفظ ربّانی کا معنی بتاتے ہوئے حضرات مفسرین کرام نے صحابہؓ اور تابعینؒ کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ معالم التنزیل ص ۳۳۰ ج ۱ میں حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ اور حسنؒ سے كـونـوا ربانيين کا معنی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے كُـونُـوْا فُـقَـهَاء ،عُلَمَاءَ اور حضرت قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ حُكَمَاء و عُلَمَاء اور سعید بن جبیر نے فرمایا العالم الذى يعمل بعلمهٖ اور حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ ہے کہ فُقَهَاءَ مُعَلِّمِيْنَ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے۔ هو الذى يربّى علمه بعمله۔

تفسیر درمنثور ص ۴۷ ج ۲ میں حضرت سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے حُكَمَاءُ اَتْقِيَاءُ علامہ بیضاوی لکھتے ہیں۔ هـو الكامل فى العلم والعمل۔

مجموعی طور پر ان سب اقوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ ربّانی وہ لوگ ہیں جو اہل علم ہیں فقیہ ہیں حکیم ہیں متقی ہیں اپنے علم پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی حق کی راہ بتاتے ہیں اور حق پر چلاتے ہیں۔ اور ایمان تو بہرحال ثواب اور نجات آخرت کے لئے شرط ہے، ہی، یہ سب چیزیں ہوں اور باایمان ہو تب ربّانی کا مصداق ہوگا۔ جس کا ترجمہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ''اللہ والے'' فرمایا۔ یہ ترجمہ بہت جامع ہے اس میں علم اور عمل، تعلیم، تدریس، عبادت، اخلاق حسنہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ ربّـانیین کی یہ ذمہ داری ہے کہ خود بھی عمل کریں اور دوسروں کو بھی عمل پر ڈالیں۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ (کیوں نہیں روکتے اُن کو ربانی لوگ اور اہل علم گناہ کی باتیں کرنے سے اور حرام کے کھانے سے)۔

غیر اللہ کو رَب بنانے کی ممانعت ...... پھر فرمایا وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا (کہ نبی تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو اپنا رب بنالو) تمام انبیاء علیہم السلام توحید کی دعوت دینے کے لئے تشریف لائے تھے وہ غیر اللہ کو رب ماننے کی دعوت کیسے دے سکتے تھے؟) أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (کیا نبی تم کو کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم اللہ

کے فرمانبردار ہو۔) اگر تم موحد ہو تو نبی تم کو توحید سے کیوں ہٹائے گا؟ وہ شرک کی دعوت نہیں دے سکتا۔ ہاں اپنی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دے گا۔ جس کا وہ مامور ہے اور جس پر ایمان لائے بغیر تم مؤمن نہیں ہو سکتے اور تمہارا عقیدۂ توحید اس پر ایمان لائے بغیر تمہیں نجات نہیں دلا سکتا۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت یہ تھی کہ صرف اللہ کے بندے بنو اسی کی عبادت کرو نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کی دعوت دی اور اسی دعوت پر محنت کی۔ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے بھی اسی دعوت کے لئے مشقت اٹھائی اور جہاد کئے۔ ایک مرتبہ فارس کے جہاد کے موقعہ پر حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ بطور سفیر رستم کے پاس تشریف لے گئے۔ رستم اہل فارس کا صاحبِ اقتدار تھا۔ رستم نے کہا کہ تم لوگ کیوں آئے ہو انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تا کہ ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لے جائیں اور جو موجودہ دین ہیں اُن کے ظلم سے بچا کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ (کما ذکر ابن کثیر فی البدایة فی ذکر یوم القادسیه)

دورِ حاضر میں بہت سے ایسے پیر وفقیر ہیں جنہیں نہ شریعت سے تعلق ہے نہ طریقت کو جانتے ہیں، سجادے بنے ہوئے گدیاں سنبھالے ہوئے ہیں، اپنے مریدوں سے خود اپنے کو سجدہ کراتے ہیں اور اُن قبروں کو بھی جن کو کسب دنیا کا ذریعہ بنا رکھا ہے طریقت تو شریعت کی خادم ہے۔ بیعت اور ارشاد اور تصوف وسلوک اسی لئے ہے کہ انسان اللہ کے بندے بنیں اور اس کی عبادت میں لگیں نہ اس لئے کہ غیر اللہ کو سجدے کئے جائیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ

اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں جو کچھ بھی تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں پھر آ جائے تمہارے پاس رسول جو تصدیق کرنے والا

لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا

ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور ضرور ضرور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے اس پر میرا مضبوط عہد قبول کر لیا؟ انہوں نے کہا

اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ

کہ ہاں ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا سو تم گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ پھر جو شخص اس کے بعد روگردانی کرے گا

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

سو یہی لوگ نافرمان ہیں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے اللہ تعالیٰ کا عہد لینا

ان دو آیتوں میں اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے یہ عہد لیا کہ تمہاری موجودگی میں جو دوسرا نبی آئے گا اس پر ایمان لانا اور اپنی اُمت کو بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا، تبلیغ کرنا اور اس نبی کی مدد کرنا۔ اگر تمہاری موجودگی میں کوئی نبی نہ آئے تو اپنی اُمت کو تاکید کر دینا کہ اس نبی پر ایمان لانا جو میرے بعد آئے اور اس کی

تصدیق اوراس کی مدد کرنا۔ اسی سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں اور عیسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ رسول کی تنوین تنکیر کے لئے ہو اور بعض مفسرین نے یوں فرمایا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سب نبیوں سے عہد لیا کہ تمہاری موجودگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا اور اپنی اُمتوں کو بھی اس کا حکم دینا کہ ان میں سے جو بھی ان کا زمانہ پالے اُن پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرے۔ (معالم التنزیل ص ۳۲۲ ج ۱)

عہد لے کر اللہ تعالیٰ نے تاکید اً فرمایا: ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ (کیا تم نے اقرار کر لیا، اور اس پر تم نے میرا مضبوط عہد لے لیا) سب نے عرض کیا کہ ہاں ہم نے اس کا اقرار کر لیا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ یہ عہد حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی لیا اور ان کے واسطے سے اُن کی اُمتوں سے بھی لیا۔ اس عہد کو جن لوگوں نے پورا نہ کیا اُن کے بارے میں فرمایا: فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ کہ جس نے اس عہد کے بعد روگردانی کی۔ عہد کو پورا نہ کیا کسی بھی ایک نبی کو جھٹلایا تو ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔ اور نافرمانی کے بدترین مرتبہ میں ہیں کیونکہ وہ کافر ہیں۔ (قال فی الروح أی الخارجون فی الکفر الی افحش مراتبہ) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے تو اللہ کی نافرمانی کا صدور ہو ہی نہیں سکتا۔ اُن کی اُمتوں نے اس عہد سے منہ موڑا اور کفر اختیار کیا۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے اور یہود و نصاریٰ دونوں قومیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی منکر ہو کر کفر پر مصر ہیں۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت........ شیخ ابوالحسن تقی الدین السبکی رحمہ اللہ کا مستقل ایک رسالہ ہے جو آیت بالا کی تفسیر سے متعلق ہے اس رسالہ کا نام التعظیم و المنّة فی لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ہے جو فتاویٰ سبکی میں ص ۳۸ ج ۱ سے شروع ہے۔ علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ رسول مصدق سے مراد اس آیت میں ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی ایسا نہیں جس سے اللہ نے یہ عہد نہ لیا ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کروں گا اگر وہ تمہارے زمانہ میں آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا اور اپنی اُمت کو اس کی وصیت کرنا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اور اخذ میثاق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس عظمت و شان کا بیان ہے وہ پوشیدہ نہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر انبیاء کرام کے زمانہ میں آپ کی بعثت ہوتی تو آپ اُن کے لئے بھی مرسل ہوتے اور اس طرح سے آپؐ کی نبوت اور رسالت تمام مخلوق کو عام ہو گئی۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آخیر زمانے تک اور اس طرح سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اُن کی امتیں سب آپ کی امت میں داخل ہیں اور آپ کا ارشاد بعثت الی الناس کافةً صرف انہی لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو آپ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک ہوں گے بلکہ اُن لوگوں سے بھی متعلق ہے جو آپ سے پہلے تھے اور اس سے آپ کے ارشاد کُنْتُ نَبِیًّا و اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۳) کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

کیا اللہ کے دین کے علاوہ کوئی دین تلاش کرتے ہیں، حالانکہ وہ سب اسکے فرمانبردار ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے،

وَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَ

اور اُسی کی طرف سب واپس ہوں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ نازل کیا گیا ہم پر اور اُس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم پر

اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ النَّبِيُّوۡنَ

اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پراور یعقوب پر اور اُن کی اولاد پر اور اُس پر جو عطا کیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور تمام نبیوں کو ان

مِنۡ رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ

کے رب کی طرف سے، ہم اُن میں سے کسی کے درمیان بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کے لئے فرمانبردار ہیں۔ اور جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ

الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

کسی دین کو طلب کرے گا تو ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

دینِ اسلام ہی اللہ کے نزدیک معتبر ہے

جو دین اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے پسند فرمایا ہے وہ دین اسلام ہے۔ جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کے دوسرے رکوع میں فرمایا اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ (بے شک دین جو معتبر ہے اللہ کے نزدیک وہ اسلام ہی ہے) اور سورۂ مائدہ میں فرمایا اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا (آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام مکمل کر دیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا) اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا نام اسلام رکھا ہے جس کا معنی فرمانبردار ہونے کا ہے۔ ساری مخلوق اللہ کی فرمانبردار ہے اور ہمیشہ سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعوت دی جس کا طریقہ اللہ کی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ معلوم ہوتا رہا ہے۔ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام جب کعبہ شریف بنا رہے تھے تو اس وقت انہوں نے دُعا کی کہ اے اللہ ہم کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذرّیت میں سے ایک امتِ مسلمہ پیدا فرمانا۔ اُن کی دعا اللہ نے قبول فرمائی اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور امتِ مسلمہ پیدا فرمائی جو اُمت محمدیہ ہے۔

دین اسلام میں سراپا خالق اور مالک کی فرمانبرداری ہے، بندہ کا کام ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے ظاہر و باطن سے جسم و جان سے جھک جائے اور ہر حکم کو مانے، سارے فرشتوں کا دین اور اُن کے علاوہ ساری مخلوق اور جو بھی کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب کا دین اسلام ہے۔ مخلوق میں انسان اور جنّات بھی ہیں اللہ پاک کی طرف سے ان کے لئے بھی دین اسلام ہی کو پسند فرمایا ہے لیکن چونکہ ان دونوں قوموں کا ابتلاء بھی مقصود ہے اس لئے ان کو مجبور نہیں کیا گیا کہ اسلام ہی کو اختیار کریں اسی وجہ سے اُن میں بہت سے کافر اور بہت سے مؤمن ہیں (خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا) البتہ تکوینی طور پر یہ دونوں بھی وہی کرتے ہیں جو اللہ کی قضا و قدر کا فیصلہ ہوتا ہے مجبوراً قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق ہی جیتے اور مرتے ہیں۔ ان دونوں قوموں کو بتا دیا ہے کہ ایمان کی جزاء یہ ہے اور کفر کی سزا یہ ہے۔ اب اپنے اختیار سے دوزخ یا جنہم کی تیاری کرتے ہیں۔ وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ نَارًا (الآیہ) تمام حضرات انبیاء کرام علیہم

السلام مسلم تھے۔ اللہ کے فرمانبردار تھے اپنی اُمتوں کو بھی انہوں نے اسی کی دعوت دی اسی لئے فرمایا کہ اے محمد (ﷺ) آپ اعلان فرمادیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس کتاب پر بھی جو ہم پر نازل کی گئی اور اُن چیزوں پر جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل کی گئیں اور اس پر جو موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ اُن سب پر بھی ایمان لائے۔ ان حضرات میں سے ہم کسی کے درمیان بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے اس لئے ہم سبھی پر ایمان لاتے ہیں جو احکام اُن پر نازل ہوئے ہم اُن پر بھی ایمان لاتے ہیں کہ وہ بھی اللہ کی طرف سے ہیں۔ یہ سب حضرات اللہ کے فرمانبردار تھے ہم بھی اللہ کے فرمانبردار ہیں لفظ (النبیون تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو شامل ہے پھر بھی بعض انبیاء علیہم السلام کا خصوصی تذکرہ فرمادیا کیونکہ یہود و نصاریٰ ان حضرات کو جانتے اور مانتے تھے)

طوعًا و کرھًا کی تفسیر......طوعًا و کرھًا کی تفسیر بتاتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں ص ۳۷۹ ج ۱ اما من فی السموٰت فالملائکة و اما من فی الارض فمن ولد علی الاسلام و اما کرھا فمن اتی به من سبایا الامم فی السلاسل و الاغلال یقادون الی الجنة وھم کارھون (یعنی آسمانوں میں فرشتے اور زمین میں وہ لوگ ہیں جو اسلام پر پیدا ہوئے یہ بخوشی اسلام پر چلتے ہیں، اور ناخوشی سے چلنے والے وہ لوگ ہیں جن کو زنجیروں میں اور بیڑیوں میں قید کر کے لایا گیا (اس وقت وہ کافر تھے بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا یہ قید کر کے لانا اُن کے جنت میں جانے کا سبب بن گیا جس وقت قید کئے گئے تھے اُن کو ناگوار تھا)

صاحب روح المعانی نے کرھا کا ایک معنی بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ ماکان حاصلا بالسیف و معاینة ما یُلجئ الی الاسلام یعنی اہل اسلام کی تلواروں کی وجہ سے اور اُن چیزوں کی وجہ سے اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوئے جنہوں نے اضطراری طور پر اسلام کے لئے آمادہ کر دیا۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور قول بھی لکھا ہے وہ اُن کو خود ہی پسند نہیں آیا پھر صوفیہ سے ایک قول نقل کیا کہ طوعًا کا معنی یہ ہے کہ کسی ظلمت نفسانیہ کے بغیر اللہ کے احکام کو مان لیا اور انانیت کا کوئی پردہ حائل نہیں ہوا اور کرھا کا معنی یہ ہے کہ وساوس پیش آ گئے اور پردے حائل ہو گئے۔ پھر لکھتے ہیں طوعا کا مصداق حضرات ملائکہ اور بعض اُن حضرات کا اسلام ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں زمین میں رہتے ہیں اور دوسرا اسلام ان لوگوں کا ہے جن کو شکوک پیش آتے رہتے ہیں، پھر لکھتے ہیں کہ کفار قسم ثانی سے ہیں کیونکہ انہوں نے خالق کو تو مانا لیکن ظلمات نفسانیہ کی وجہ سے خالق جل مجدہ کے ساتھ انہوں نے شرک شروع کر دیا۔ ان کا ایمان شرک میں ملا ہوا ہے جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا تو کہتے ہیں اللہ نے پیدا کیا۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ طوعًا و کرھًا کی تفسیر مجاہد (تابعیؒ) کے کلام سے بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس تفسیر سے اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو بالکل ہی خدا تعالیٰ کو نہیں مانتے وہ خالق اور صانع کے منکر ہیں اور مَن کا عموم سامنے رکھا جائے تو ابن کثیر کی بات بھی عام اور تام نہیں ہوتی۔ اس لئے احقر نے وہ تفسیر کی ہے جو اوپر مذکور ہے جس میں کرھا کا معنی اللہ کی قضا اور قدر کے تابع ہونا اور تکوینی طور پر ان فیصلوں کے مطابق چلنا اختیار کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تکوینی طور پر سب اسی کی قضا اور قدر کے مطابق مرتے اور جیتے ہو تو جو دین تشریعی طور پر اس نے تمہارے لئے بھیجا ہے اسے بھی اختیار کرو، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

دین اسلام کے سوا کوئی دین عند اللہ مقبول نہیں......آخر میں فرمایا وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (یعنی جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کرے گا تو ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ

آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا) دین اسلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ بھیجا اور اسی کو آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے جس کا سورۂ مائدہ میں اعلان فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یہ دین اسلام ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و معتبر ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی دین کوئی شخص اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ خواہ کتنی ہی عبادت کرے اس کی مزید تشریح اور توضیح کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا (آخر تک) کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز آیت شریفہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آخر تک) کا مطالعہ کیا جائے جو سورۂ آلِ عمران کے رکوع نمبر ۲ میں ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

اللہ کیونکر ہدایت دے اس قوم کو جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ بلاشبہ رسول حق ہے اور اُنکے پاس واضح

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ

دلائل بھی آ گئے، اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ اُن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور لوگوں کی سب کی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اُن سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی، سوائے ان لوگوں کے

تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ

جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اصلاح کر لی تو بے شک اللہ غفور ہے رحیم ہے۔ بیشک جن لوگوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا

ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا

پھر کفر میں بڑھتے رہے ہرگز اُن کی توبہ قبول نہ ہو گی اور یہ لوگ پکے گمراہ ہیں۔ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اس حال

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

میں مر گئے کہ وہ کافر تھے تو اُن میں سے کسی سے زمین بھر کر بھی سونا قبول نہ کیا جائے گا، اگرچہ وہ اپنی جان کے بدلہ میں دینا چاہے، یہ وہ لوگ ہیں

عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا۔

ع ۹ ۱۱ ۱۷

مرتدوں اور کافروں کی سزا

تفسیر درمنثور ص ۱۹ ج ۲ میں نقل کیا ہے کہ حارث بن سوید نے اسلام قبول کیا پھر کافر ہو کر اپنی قوم کی طرف چلا گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا .... غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تک نازل فرمائی۔ اس کی قوم میں سے ایک شخص اس کے پاس

گیا اور اسے پوری آیت سنائی۔ آیت سن کر حارث ابن سوید نے کہا کہ میں جہاں تک جانتا ہوں تو سچا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ سے بڑھ کر سچے ہیں اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم دونوں سے بڑھ کر سچا ہے۔ اس کے بعد اس نے (دوبارہ) اسلام قبول کر لیا اور اچھی طرح اسلام کے کاموں میں لگا رہا۔ چونکہ آیت میں اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا بھی ہے اس لئے حارث بن سوید نے اس استثناء پر نظر کی اور اسلام قبول کر لیا اور سچی توبہ کر لی۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام قبول کر کے اسلام سے پھر جائے پھر سچی توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کی توبہ قبول ہے اور اس کا اسلام بھی قبول ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا (الآیۃ) اس کے بارے میں درمنثور میں حضرت حسنؓ سے نقل کیا ہے کہ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو موت کے وقت توبہ کرنے لگیں۔ موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْاٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ (سورۂ نساء ع ۳) کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔

حضرت ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اور پھر کفر میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ پھر اس کے بعد کفر پر باقی رہتے ہوئے گناہوں سے توبہ کرنے لگے۔ لہٰذا اُن کی توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ کفر پر ہوتے ہوئے گناہوں کی توبہ مقبول نہیں اور حضرت مجاہد نے ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ کفر پر مر گئے۔

آخر میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ (الآیۃ) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا پھر حالتِ کفر ہی میں مر گئے تو قیامت کے دن اُن سے ان کی جان کا بدلہ قبول نہ کیا جائے گا تاکہ مال دے کر چھوٹ جائیں۔ وہاں کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا لیکن اگر بالفرض ہو بھی اور وہ دینا چاہے تو اتنا سونا دے جس سے زمین بھر جائے تو بھی قبول نہ ہوگا۔ دائمی عذاب ہی بھگتنا ہوگا اور وہاں کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ . يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (بلاشبہ جو لوگ کافر ہیں اگر اُن کے پاس تمام دنیا بھر کی چیزیں اور اُن چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تاکہ وہ اُن کو دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھوٹ جائیں تو وہ چیزیں اُن سے قبول نہ کی جائیں گی اور اُن کو دردناک عذاب ہوگا وہ چاہیں گے کہ دوزخ کے عذاب سے نکل آئیں حالانکہ وہ اس سے کبھی بھی نہ نکلیں گے اور اُن کو دائمی عذاب ہوگا۔

اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کی تشریح کے لئے سورۂ بقرہ رکوع ۱۹ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

پارہ نمبر ۴ / لن تنالوا

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﵞ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

ہرگز نہ پاؤ گے تم بھلائی کو یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز میں سے جس سے تم محبت کرتے ہو، اور جو بھی کوئی چیز خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے۔

فی سبیل اللہ محبوب مال خرچ کیا جائے

اس آیت میں اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ خیر (کامل) تمہیں نہیں مل سکتی جب تک کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی رضا کے لئے خرچ نہ کرو، حضرات صحابۂ کرامؓ ایک ایک حکم پر عاشق تھے، جب آیتِ بالا نازل ہوئی تو انہوں نے اپنی محبوبات پر نظر ڈالی کہ ہماری محبوب چیزیں کیا کیا ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصارِ مدینہ میں باغوں کی ملکیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مالدار حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، مسجد نبویؐ کے مقابل ان کا باغ تھا جس میں ایک کنواں بیرحاء کے نام سے موسوم تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس باغ میں تشریف لے جاتے اور بیرحاء کا پانی پیتے تھے، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ باغ ان کو اپنی جائیداد میں سب سے زیادہ محبوب تھا، اس آیت کے نازل ہونے پر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے تمام اموال میں بیرحاء مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ثواب کی اُمید رکھتا ہوں اور اللہ کے یہاں اس کو ذخیرہ بنانا چاہتا ہوں۔ آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو اپنی صوابدید سے جیسے اللہ آپ کے دل میں ڈالے خرچ فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ عظیم منافع کا باغ ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم کر دو، حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کو قبول فرما کر اپنے اقرباء اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم فرما دیا۔ (صحیح بخاری ص ۱۹۷ ج ۱)

تفسیر درمنثور میں اس طرح کے اور بھی واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اپنے مال میں ایک رومی لونڈی جس کا نام مرجانہ تھا سب سے زیادہ محبوب تھی۔ آیت شریفہ سن کر انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو حضرت عمرؓ نے لکھا کہ جلولاء کے قیدیوں میں سے ایک باندی میرے لئے خرید کرو جب وہ باندی آ گئی تو حضرت عمرؓ نے آیتِ بالا پڑھی اور اُسے آزاد فرمایا، حضرت محمد بن المنکدر رنے بیان فرمایا کہ جب آیتِ بالا نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہؓ نے اپنا گھوڑا صدقہ میں دے دیا کیونکہ وہ ان کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔ (ص ۵۰ ج ۲)

ہر شخص کی محبوبات الگ الگ ہیں اور جس شخص کے پاس پیسہ کم ہو وہ اس میں سے اللہ کے لئے خرچ کر دے تو وہ بھی اس آیت کے مفہوم میں شامل ہے۔ کیونکہ کم مال ہونے کی وجہ سے پیسہ زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ہو یا صدقات، واجبہ یا نافلہ اُن میں سب سے اچھا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور اپنی محبوب چیزیں مستحقین میں خرچ کی جائیں۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز کو اللہ کی راہ میں دیدے جو اس کی ملکیت تو ہے لیکن ضرورت سے زائد ہے جیسے پرانے اتارے ہوئے کپڑے تو اس کا بھی اَجر ہے۔ البتہ

جس چیز سے محبت ہو اس کے خرچ کرنے میں زیادہ ثواب ہے اسی لئے بعض مفسرین نے اَلْبِرَّ کی تفسیر الخیر الکامل سے کی ہے۔ یعنی کامل ثواب اسی میں ہے جبکہ محبوب چیز خرچ کی جائے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں کہ جو چیز محبوب نہیں اُسے خرچ نہ کرو مطلب یہ ہے کہ محبوب چیز خرچ کرنے کی طرف رغبت کرو۔ آیت کے آخر میں جو فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ اس کے عموم سے اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے نیا کپڑا پہنا۔ پھر یوں کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَ اَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ (سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے کپڑا پہنایا جس کے ذریعہ اپنی شرم کی جگہ کو چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں اس کے ذریعہ جمال حاصل کرتا ہوں) پھر اس کے بعد اس کپڑے کو صدقہ کر دیا جسے پرانا کیا تھا تو اللہ کی حفاظت میں اور اللہ کی طرف سے پردہ پوشی میں ہوگا۔ زندگی میں اور موت کے بعد۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کما فی المشکوٰۃ ص ۳۷۷)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ

سب کھانے حلال تھے بنی اسرائیل کے لئے سوائے اس کے جو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے اس سے پہلے کہ

اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى

توارت نازل ہو، آپ فرما دیجئے کہ تم توارت لے آؤ پھر اُس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ پھر اس کے بعد جس شخص

اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ

نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا، سو وہی لوگ ہیں بڑے بے انصاف والے آپ فرما دیجئے کہ اللہ نے سچ فرمایا لہٰذا تم ملت

اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

ابراہیم کا اتباع کرو جو باطل کو چھوڑ کر حق کو اختیار کرنے والے تھے اور مشرکین میں نہ تھے۔

وقف جبریل علیہ السلام

ملت ابراہیمیہ میں کیا چیزیں حلال تھیں

معالم التنزیل ص ۳۲۶ ج ۲ میں ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ ملت ابراہیمؑ پر ہیں اور ابراہیم اونٹوں کا گوشت نہیں کھاتے تھے اور اونٹنیوں کا دودھ نہیں پیتے تھے معلوم ہوا کہ آپ ان کی ملت پر نہیں ہیں، اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں ابراہیم علیہ السلام کے لئے حلال تھیں، وہ کہنے لگے، ہر وہ چیز جو ہمارے نزدیک حرام ہے وہ نوح پر اور ابراہیم علیہما السلام پر حرام تھیں اور اس کی حرمت اسی طرح ہم تک پہنچی ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے اُن کی تردید کرتے ہوئے آیتِ بالا نازل فرمائی اور فرمایا کہ سب کھانے بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے سوائے اس کے جو اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام) نے توریت نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے۔ قال مجاہد: حرم لحوم الانعام، وروی عکرمة عن ابن عباس انه حرم زائدتی الکبد والکلیتین والشحم الا ما کان علی الظهر، وعن عطاء انه حرم لحوم الابل والبانها وسبب تحریم ذٰلک کما فی الحدیث الذی اخرجه الحاکم وغیره بسند صحیح عن ابن عباس انه

علیہ الصلاۃ والسلام کان به عرق النساء فنذران شفی لم یا کل احب الطعام الیه و کان ذلک احب الیه و فی روایة سعید بن جبیر عنه انه کان به ذلک الدآء فاکل من لحوم الا بل فبات بلیلة یزقوا فحلف ان لا یاکله ابدا، (روح المعانی ص۲ ج۴) (حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں بنی اسرائیل پر چوپایوں کا گوشت حرام کیا گیا تھا۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر جگر اور گردوں کا زائد حصہ اور چربی حرام کی گئی ماسوائے پشت کی چربی کے (کہ وہ حلال تھی) حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان پر اونٹ کا گوشت اور اسکا دودھ حرام کیا گیا اور اس کی تحریم کا سبب جیسا کہ اس حدیث میں ہے جسے حاکم وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف تھی انہوں نے نذر مانی کہ اگر وہ اس مرض سے شفایاب ہو گئے تو جو کھانا انہیں سب سے زیادہ پسند ہے وہ نہیں کھائیں گے (یعنی اپنے اوپر حرام کرلیں گے) اور انکا محبوب ترین کھانا اونٹ کا گوشت اور دودھ تھا۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف تھی۔ انہوں اونٹ کا گوشت کھالیا جس کی وجہ سے ان کی ساری رات تکلیف میں گزری تو انہوں نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ اونٹ کا گوشت نہیں کھائیں گے) آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ ان حلال کھانوں میں اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ بھی تھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام نہیں کئے گئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام پر بھی حرام نہیں تھے اور اُن کی اولاد پر بھی حرام نہیں تھے۔ البتہ یعقوب علیہ السلام نے کچھ کھانے اپنے اوپر حرام کر لئے تھے یعنی اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ (ان کی حرمت روایتی طور پر اُن کی اولاد میں چلتی رہی) اور یہ توریت شریف نازل ہونے سے پہلے تھا۔ توریت شریف میں اونٹ کے گوشت اور اونٹنی کے دودھ کی حرمت نہیں ہے (یعقوب علیہ السلام نے بھی بالکل ابتدائی عمر میں ان کو اپنے اوپر حرام نہیں کیا تھا بلکہ کچھ اسباب ایسے عارض ہوئے کہ انہوں نے ان دو چیزوں کو حرام کرلیا تھا)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بعض چیزیں اپنے اوپر کیوں حرام کی تھیں۔ اس کے بارے میں حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ اُن کو عرق النساء کی تکلیف ہو گئی تھی۔ انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر شفا ہو گئی تو سب سے زیادہ جو محبوب کھانا ہے وہ نہیں کھاؤں گا اُن کو اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ سب سے زیادہ محبوب تھا (لہٰذا شفا ہو جانے پر انہوں نے ان کو چھوڑ دیا)۔ (روح المعانی ص۲ ج۴)

اونٹ کے گوشت اور اونٹنیوں کے دودھ کو یہودی اپنے اوپر حرام سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلی آ رہی ہے اسی بات کے پیش نظر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کر دیا کہ آپ ملتِ ابراہیمی پر ہوتے تو آپ بھی ان کو نہ کھاتے پیتے۔ آیت میں یہودیوں کے دعویٰ کی تردید فرمائی۔

یہود سے توراۃ لاکر پڑھنے کا مطالبہ اور ان کا فرار...... اور مزید فرمایا: قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آپ فرمادیجئے کہ تم توریت لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم اپنے دعوٰی میں سچے ہو کہ توریت میں یہ چیزیں حرام ہیں) ابراہیم علیہ السلام پر تو یہ چیزیں کیا حرام ہوتیں خود توریت میں ان کی حرمت نہیں ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔ صاحب رُوح المعانی ص۳ ج۴ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ توریت لاکر سنانے کی ہمت نہ کر سکے اور مبہوت رہ گئے۔ نیز صاحب روح المعانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بھی دلیل ہے کیونکہ آپ نے اُن کو چیلنج کر دیا کہ توریت شریف لے آؤ حالانکہ آپ ؐ نے توریت پڑھی تھی اور نہ کوئی دوسری آسمانی کتاب پڑھی تھی۔ ظاہر ہے کہ آپ ؐ نے یہود کو جو چیلنج دیا وہ سب کچھ وحی کے ذریعہ تھا۔ پھر فرمایا: فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ (کہ اس کے بعد جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے سو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں) ظہور حق کے بعد نہ حق قبول کرتے ہیں اور نہ اپنے اتباع کو قبول کرنے دیتے ہیں یہ اپنی جانوں پر بھی ظلم ہے اور اپنے ماننے والوں پر بھی۔

ملتِ ابراہیمیہ کے اتباع کا حکم...... آخر میں فرمایا: قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آپ فرما دیجئے کہ اللہ نے سچ فرمایا کہ کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل پر حلال تھیں سوائے اس کے جن کو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا) یہ جو کچھ اسرائیل نے حرام کرلیا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں حرام نہ تھا۔ لہٰذا تم ملت ابراہیمیہ کا اتباع کرو جو دین اسلام ہے جسے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے جو تمام باطل دینوں سے ہٹ کر اور بچ کر دینِ حق پر رہے جو دین توحید تھا اور تمام عبادات میں اور تحلیل و تحریم کے بارے میں احکام الٰہیہ پر عمل کرتے رہے اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھے (اے یہودیو! تم اُن سے اپنا تعلق جوڑتے ہو حالانکہ تم نے شرک اختیار کرلیا ہے)۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ جو برکت والا ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ

اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے، اور جو اس میں داخل ہو گا امن والا ہو گا اور اللہ کے لئے لوگوں کے ذمہ ہے

حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اس گھر کا حج کرنا جسے طاقت ہو اس گھر تک راہ طے کر کے جانے کی، اور جو شخص منکر ہو سو اللہ بے نیاز ہے سارے جہانوں سے۔

کعبہ شریف کی تعمیر اور حج کی فرضیت

روح المعانی میں حضرت ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ بیت المقدس کعبہ سے اعظم ہے کیونکہ وہ اس جگہ ہے جہاں حضرات انبیاء علیہم السلام ہجرت کرتے رہے اور وہ ارضِ مقدسہ میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا کہ کعبہ شریف اعظم ہے۔ اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی، اور حضرت مجاہد نے فرمایا کہ جب گذشتہ آیت میں کافروں کو حکم دیا کہ ملتِ ابراہیمیہ کا اتباع کریں تو بیت اللہ یعنی کعبہ شریف کی تعظیم کا بھی حکم دیا اور اس کی فضیلت اور حرمت بیان فرمائی کیونکہ کعبہ کا حج کرنا اور اس کی فضیلت و حرمت کا اقرار کرنا بھی ملت ابراہیمی میں شامل ہے۔

کعبہ شریفہ کا کثیر البرکت ہونا...... آیتِ بالا میں فرمایا کہ سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے زمین میں بنایا گیا وہ، وہ گھر ہے جو مکہ معظّمہ میں واقع ہے اور وہ کعبہ معظّمہ ہے۔ وہ بابرکت ہے یعنی کثیر الخیر ہے اس میں عبادت کا ثواب بہت زیادہ ہے جو شخص حج یا عمرہ کرے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ ان برکات کے علاوہ اس کی ظاہری برکات بھی بہت ہیں، سورۂ قصص میں اس کی ظاہری برکات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (لائے جاتے ہیں اس کی طرف ہر چیز کے پھل جو بطور رزق ہمارے پاس سے دیئے جاتے ہیں)۔ یہ ظاہری برکات بھی کعبہ شریف میں دیکھی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے ثمرات اور مصنوعات

ہر وقت مکہ معظمہ میں مل جاتی ہیں۔ پھر قربانیاں بھی وہاں اس کثرت سے ہوتی ہیں جو کسی شہر میں نہیں ہوتیں۔ نیز کعبہ شریف کو هُـــدًى لِّـلْعَالَمِيْنَ بھی فرمایا۔ یعنی وہ جنت کی طرف ہدایت کا ذریعہ ہے۔ (روح المعانی ص ۴۰۵ ج ۴) اور سارے عالم کے مسلمان جو اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس میں بھی هُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ کا خوب مظاہرہ ہے۔ لفظ اوّل بیت سے اس طرف اشارہ ہے کہ بنائے ابراہیمی سب سے پہلی بناء نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کعبہ شریف بنایا گیا تھا۔

زمین میں پہلا گھر...... معالم التنزیل ص ۳۲۸ ج ۱ میں اَوَّلَ بَيْتٍ کے معنی بتاتے ہوئے متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ کعبہ شریف سب سے پہلا گھر ہے جو پانی پر ظاہر ہوا آسمان و زمین کے پیدا فرمانے سے دو ہزار سال پہلے وجود میں آیا اُس وقت یہ پانی پر سفید بلبلہ تھا۔ پھر زمین اُسی کے نیچے سے پھیلا دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ سب سے پہلا گھر ہے جو زمین میں بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایک گھر مقرر فرمایا جو بیت معمور ہے اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں پھر اُن فرشتوں کو حکم دیا جو زمین میں رہتے ہیں کہ زمین میں ایک گھر بنائیں جو البیت المعمور کی محاذات میں ہو اور اس جیسا ہو اور زمین والوں کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں جیسے آسمان کے رہنے والے البیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔ یہ حضرت علی بن حسینؓ (حضرت زین العابدین) کا قول ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے اس کو بنایا تھا وہ اس کا حج کیا کرتے تھے، جب آدم علیہ السلام نے اس کا حج کیا تو فرشتوں نے کہا کہ اے آدم! اللہ تمہارا حج قبول فرمائے ہم نے اس گھر کا حج تم سے دو ہزار سال پہلے کیا، ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ حاصل سب کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہی اس کے پہلے بانی نہیں ہیں اس سے بھی پہلے اس کی بناء تھی۔ اسی لئے سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ اس وقت وہاں گھر موجود نہیں تھا پھر بھی انہوں نے عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ کہا۔ اور سورۂ حج میں ہے وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (اور جب ہم نے ابراہیم کو بیت کی جگہ بتا دی) حضرات مفسرین نے فرمایا کہ بَوَّاْنَا کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ شریف کی جگہ متعین طریقے پر بتا دی کیونکہ کعبہ شریف کی عمارت اس وقت موجود نہ تھی۔

تاریخ بناء کعبہ...... صاحب روح المعانی ص ۱۴۲ ج ۷ لکھتے ہیں کہ کعبہ شریف پانچ مرتبہ بنایا گیا پہلی مرتبہ فرشتوں نے بنایا، یہ بناء آدم علیہ السلام سے پہلے تھی اور یہ سرخ یاقوت سے بنایا گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان میں اس کو اٹھا لیا گیا۔ دوسری بناء ابراہیمی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ بیت اللہ بنائیں تو انہیں اس کی جگہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیج دی جو خوب تیز چلی اور اس نے پرانی بنیاد کو ظاہر کر دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کر دی۔ تیسری تعمیر قریش کی ہے۔ جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے اُس وقت حجر اسود کے رکھنے میں جھگڑا ہوا۔ اور ہر قبیلے نے یہ چاہا کہ ہم حجر اسود کو رکھیں پھر یہ طے کیا کہ کل کو جو شخص سب سے پہلے فلاں گلی سے نکلے اور مسجد حرام میں داخل ہو وہ جو فیصلہ کرے وہی منظور ہوگا۔ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ سب لوگ آپ کو امین کہتے تھے آپ کے فیصلے پر سب راضی ہو گئے اور آپ نے فیصلہ فرمایا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ دیں پھر تمام قبیلے اس چادر کو اٹھائیں۔ چنانچہ اُن سب نے اس چادر کو اٹھایا اور حجر اسود کو اس کی جگہ تک لے گئے پھر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔ یہ واقعہ بعثت سے پندرہ سال پہلے کا ہے۔ چوتھی تعمیر عبداللہ بن زبیرؓ کی ہے اور پانچویں تعمیر حجاج کی ہے۔ اور وہی آج تک موجود ہے۔ اس میں کچھ مرمت کے طور پر تغیر اور تبدیلی ہوتی رہی ہے لیکن اصل تعمیر

حجاج ہی کی ہے۔ (انتھی)

بعض حضرات نے حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر اور حضرت شیث علیہ السلام (جواُن کے بیٹے تھے) اور عمالقہ اور بنی جرہم کی تعمیر بھی بتائی ہے۔ (روح المعانی ص ۵ ج ۴) بہر حال سب سے پہلی تعمیر فرشتوں نے کی ہو یا حضرت آدم علیہ السلام نے اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ اس پر صادق آتا ہے اور بنائے ابراہیمی بھی بیت المقدس کی تعمیر سے پہلے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

بکہ اور مکہ...... آیت بالا میں کعبہ شریف کو بکہ میں بتایا۔ عام طور سے اس شہر کو مکہ کہا جاتا ہے جس میں کعبہ شریف ہے اور سورۂ فتح میں مکہ میم سے وارد ہوا ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ با اور میم قریب المخرج ہیں اور اہلِ عرب ایک کو دوسری جگہ استعمال کر لیتے ہیں جیسے لازم کو لازب کہتے ہیں۔ لہٰذا مکہ میں با کو میم سے بدل دیا۔ اور بعض حضرات نے دونوں میں فرق بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ بکہ بیت اللہ کی جگہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔ حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان بکہ ہے اور باقی مکہ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ پورا حرم مکہ ہے۔ (الجامع اللطیف فی فضل مکۃ وبناء البیت الشریف ص ۱۳۶)

آیاتِ بینات اور مقام ابراہیم...... پھر فرمایا: فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ط (اس میں آیات بینات ہیں اور مقام ابراہیم ہے) جن آیات کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے بعض آیات تکوینی ہیں اور بعض آیات تشریعی ہیں۔ کعبہ شریف کا مبارک ہونا اور هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونا اور جو شخص وہاں داخل ہو جائے اس کا مامون ہونا اور بشرط استطاعت حج کا فرض ہونا یہ تشریعی نشانیاں ہیں، اور مقامِ ابراہیم کا وہاں موجود ہونا (یہ وہ پتھر ہے جو زینہ کا کام کرتا تھا۔ اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے تھے) یہ تکوینی نشانی ہے جو اب تک موجود ہے۔ سب کی نظروں کے سامنے ہے۔ نیز کعبہ شریف کی تکوینی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے جس کسی نے بھی کعبہ شریف پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا وہ خود تہس نہس ہو گیا۔ اصحابِ فیل کا واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ ابرہہ یمن کا حاکم ہاتھی لے کر حملہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پرندے بھیج دیئے جنہوں نے اُن پر کنکریاں پھینکیں اور ہاتھی اور ہاتھی والے سب چورہ ہو کر رہ گئے جس کا ذکر سورۂ فیل میں ہے۔

اس ساری تفصیل سے کعبہ شریف کی اولیت اور افضلیت دونوں چیزیں معلوم ہوئیں کیونکہ بیت المقدس میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے نہ بابرکت ہونے میں کعبہ شریف سے زیادہ ہے۔ نہ وہاں نماز پڑھنے کا ثواب مسجد حرام سے بڑھ کر ہے۔ نہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے نہ وہاں کے داخل ہونے والے کو مامون بتایا نہ وہاں حج کے لئے جانے کا حکم ہے۔ نہ وہاں مقامِ ابراہیم ہے۔

حرم مکہ کا جائے امن ہونا...... پھر فرمایا وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (کہ جو شخص اس میں داخل ہو گا وہ امن سے ہو گا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کعبہ شریف بنایا اس وقت دعا کی تھی رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا (کہ اے اللہ اس شہر کو امن والا بنا دے) اُن کی دُعا مقبول ہوئی اور مکہ اور حرم مکہ امن والا بنا دیا گیا۔ اہلِ عرب آپس میں بہت لڑتے تھے اور ایک دوسرے کو مارتے اور لوٹتے تھے۔ لیکن حدودِ حرم میں کسی پر حملہ کرنے سے باز رہتے تھے۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنایا ہے اور حرم والوں کے چاروں طرف لوگ اُچک لئے جاتے ہیں)۔

صحیح بخاری ص ۲۴۷ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ نے اس شہر کو حرام قرار دے دیا جس دن آسمان و زمین کو پیدا فرمایا اور وہ قیامت تک اللہ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے۔ اس میں مجھ سے پہلے کسی کے لئے جنگ حلال نہیں تھی اور میرے لئے بھی حلال نہیں ہوئی مگر دن کے تھوڑے سے حصہ میں، پس وہ قیامت تک اللہ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے۔ نہ اس کے

کانٹے کاٹے جائیں نہ اُس کے شکار کو بھگایا جائے اور نہ اس کی پڑی ہوئی چیز کو اٹھایا جائے اِلّا یہ کہ کوئی شخص اعلان کرنے کے لئے اٹھائے (کہ کسی کی اس طرح کی کوئی چیز گری ہو تو وصول کرلے) اور اس کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے وہیں حضرت عباسؓ بھی موجود تھے انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! اذخر کا استثناء ہونا چاہیئے (جو ایک خاص قسم کی گھاس تھی) کیونکہ اہلِ مکہ سناروں کے لئے اور اُن کے گھروں (کی چھتوں) کے کام آتی ہے۔ آپ نے فرمایا اِلَّا الْاِذْخَرَ یعنی اذخر کے کاٹنے کی اجازت ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ بے شک مکہ کو اللہ پاک نے حرام قرار دیا ہے، لوگوں نے اُسے حرام قرار نہیں دیا، جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اُس کے لئے حلال نہیں ہے کہ اس میں خون بہائے اور اس کے درخت کاٹے۔ سو اگر کوئی شخص رسول اللہ (ﷺ) کے قتال کے پیشِ نظر اپنے لئے رخصت نکالے تو اس سے کہہ دو کہ بلاشبہ اللہ نے اپنے رسول کے لئے اجازت دی تھی اور تم کو اجازت نہیں دی اور مجھے بھی صرف دن کے تھوڑے سے حصہ میں اجازت دی ہے اور اس کی حرمت اسی طرح آج واپس آ گئی جیسے کل اُس کی حرمت تھی۔ (صحیح بخاری ص۲۱ ج۱۷)

معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو اس کے پُر امن ہونے کی دُعا کی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح اس کا پر امن ہونا پہلے سے چلا آ رہا ہے اب بھی اُسی طرح باقی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص حرم میں کسی کو قتل کر دے یا کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے پھر حرم میں داخل ہو جائے تو اس سے حرم ہی میں قصاص لیا جائے۔ اور جو شخص کسی کو حرم سے باہر قتل کر دے پھر حرم میں داخل ہو جائے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ ہاں اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکل جائے نہ کوئی شخص اُس کے ہاتھ کچھ فروخت کرے نہ اُسے کچھ کھانے پینے کو دے تا کہ مجبور ہو کر حرم سے نکل جائے اور وہاں قصاص لیا جائے۔ حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ہر صورت میں حرم میں قصاص لیا جائے گا (کما ذکرہ الجصاص فی احکام القرآن ص۲۱ ج۲)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ہر حال میں حرم میں قصاص لینا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بعض صورتوں میں قصاص لینا ہے اور وہ کَانَ اٰمِنًا کے خلاف نہیں ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ جو شخص بیت اللہ کی پناہ لے لے بیت اللہ اُسے پناہ دے دے گا لیکن اگر وہ کسی کو قتل کر کے آیا ہو تو اس کو نہ ٹھکانہ دیا جائے اور نہ کھلایا پلایا جائے جب باہر نکلے تو اس کی جنایت کا بدلہ لے لیا جائے۔ (ابن کثیر ص۳۸۴ ج۱) حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ہے۔

حج کی فرضیت...... پھر فرمایا: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (اور اللہ کے لئے لوگوں کے ذمہ ہے اس گھر کا حج کرنا جسے طاقت ہو وہاں تک راہ طے کر کے پہنچنے کی)۔

اس آیت میں حضرت حفص کی روایت اور حضرت حمزہ اور کسائی کی قرأت حِجُّ الْبَيْتِ حا کے زیر کے ساتھ ہے اور باقی حضرات نے حا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغت فصیح ہیں۔ (ذکرہ البغوی فی معالم التنزیل)

اِستطاعت کیا ہے...... آیتِ بالا میں ان لوگوں پر حج کرنا فرض بتایا ہے جن کو مکہ معظمہ تک پہنچنے کی طاقت ہو، آیت میں جو مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وارد ہوا ہے۔ اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ مَا السَّبِيْلُ (کہ سبیل سے کیا مراد ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا زَادٌ وَّرَاحِلَةٌ (کہ سفر خرچ اور سواری) ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا چیز حج کو فرض کرتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا زَادٌ وَّرَاحِلَةٌ (کہ سفر خرچ اور سواری ہونے سے حج فرض ہو جاتا ہے)

دونوں حدیثیں مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۲ میں مذکور ہیں (۱)۔

ترکِ حج پر وعیدیں...... درِمنثور ص ۵۶ میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے ارادہ کر لیا ہے شہروں میں لوگوں کو بھیجوں اور وہ ان لوگوں کو دیکھیں جو مالدار ہیں اور انہوں نے حج نہیں کیا، میں ان لوگوں پر جزیہ مقرر کر دوں، یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں، یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ نیز حضرت عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر لوگ حج کو چھوڑ دیں گے تو میں ان سے قتال کروں گا جیسا کہ نماز اور زکوٰۃ چھوڑنے پر قتال ہوگا۔

آیتِ مبارکہ سے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ حج اس شخص پر فرض ہے جس کے پاس مکہ معظمہ تک آنے جانے کا اور سفر خرچ کا انتظام ہو، اتنا پیسہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے مگر حج نہیں کرتے ایسے لوگ وعید پر غور کریں۔

لوگوں نے حج کے بہت سے خرچے اپنے ذمہ لگا لئے ہیں سامان خرید کر لاتے ہیں عزیزوں کو قیمتی ہدایا دیتے ہیں ان سب کو انہوں نے حج کے خرچ میں شمار کر رکھا ہے، بہت سے لوگ مر جاتے ہیں اور اس لئے حج نہیں کر پاتے کہ ان کے پاس رواجی خرچ نہیں ہوتا، یا خرچ ہوتا تو ہے لیکن لڑکیوں کی رواجی شادیاں اور دوسرے دنیاوی انتظامات کی وجہ سے حج کرنے میں تاخیر کرتے ہیں ان میں بعض لوگ ایسے وقت حج کرتے ہیں جبکہ بوڑھے کھوسٹ ہو جاتے ہیں۔ احکامِ حج ادا کرنے سے بوجہ ضعف اور کمزوری قاصر رہتے ہیں اور بعض لوگ گھر بار کے انتظامات کے انتظار میں مر جاتے ہیں اور حج سے رہ جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جسے کسی مجبوری نے یا کسی ظالم بادشاہ نے یا روکنے والے مرض نے حج سے نہ روکا اور مر گیا اور حج نہ کیا تو اُسے چاہیئے کہ یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے یا نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲۲ عن الدارمی)

بڑے بڑے سیٹھ حج نہیں کرتے اور یوں ہی مر جاتے ہیں لاکھوں روپے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں پر ریا کاریوں کے لئے خرچ کرتے ہیں لیکن حج کے لئے رقم خرچ کرنے سے ان کا دل دُکھتا ہے اور بعض لوگ تو حج کا مذاق ہی اڑاتے ہیں اور حج کی فرضیت کے منکر ہیں یہ لوگ تو کافر ہی ہیں اور بعض لوگ حج کی فرضیت کے منکر تو نہیں لیکن استطاعت ہوتے ہوئے حج کو جاتے بھی نہیں۔ ایسے لوگوں کو کافر تو نہ کہا جائے گا لیکن کفرانِ عملی میں ضرور مبتلا ہیں۔ جو کوئی آدمی استطاعت ہوتے ہوئے حج نہ کرے اپنا ہی کچھ کھوئے گا۔ گناہ گار ہوگا اللہ تعالیٰ کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اُسے کسی کی عبادت کی حاجت نہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (اور جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے غنی ہے) فرضیت کا منکر اور جو عملاً منکر ہو آیت کا عموم دونوں کو شامل ہے حج کے مسائل اور احکام بہت ہیں معتبر کتابوں میں دیکھ لیا جائے کچھ مسائل آیت واتموا الحج والعمرۃ للّٰہ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ

اے اہلِ کتاب تم کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیات کے ساتھ حالانکہ اللہ کو تمہارے سب کاموں کی اطلاع ہے۔ آپ فرما

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ

دیجئے کہ اے اہلِ کتاب تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اس شخص کو جو ایمان لائے، تم اس میں کجی تلاش کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو،

۱)......رواہ الترمذی، مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۳۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ

اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے ایک جماعت کا ان لوگوں

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ

میں سے جن کو کتاب دی گئی تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں واپس کافر بنا دیں گے، اور تم کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو حالانکہ تم پر اللہ کی

تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ

آیات کی تلاوت کی جاتی ہے اور تمہارے اندر اس کا رسول ؐ موجود ہے، اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑ لے سو اس کو سیدھے راستہ کی طرف

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

ہدایت دی گئی۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز مت مرنا مگر اس حالت میں

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

کہ تم مسلمان ہو، اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور آپس میں متفرق نہ ہو، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تمہارے اوپر

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ

ہے جبکہ تم دشمن تھے، سو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا فرما دی لہٰذا تم اس کی نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر

مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

تھے سو اللہ نے تم کو اس سے بچا دیا۔ اللہ ایسے ہی بیان فرماتا ہے تمہارے لئے اپنی آیات تاکہ تم ہدایت پر رہو۔

یہودیوں کی شرارت سے مسلمانوں میں انتشار اور مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا حکم!

تفسیر درمنثور ص ۵۷ ج ۲ میں ان آیات کا سببِ نزول یوں لکھا ہے کہ شاس بن قیس ایک بوڑھا یہودی تھا جو بہت بڑا کافر تھا، یہ شخص مسلمانوں سے بہت زیادہ کینہ رکھتا تھا اور بہت سخت حاسد بھی تھا۔ صحابہ ﷺ کی ایک مجلس پر گذرا جس میں اوس اور خزرج کے حضرات جمع تھے۔ آپس میں باتیں کر رہے تھے (اوس اور خزرج کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں لڑائیاں رہتی تھیں) اس حاسد کو ان حضرات کا اُنس اور محبت کے ساتھ جمع ہونا اور آپس میں ان کی صلح ہونا بہت ناگوار ہوا۔ اس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ تو جا کر اُن کے پاس بیٹھ جا اور اُن کو ان کی پرانی لڑائیاں یاد دلا دے اور اُن کے سامنے بعض اشعار پڑھ دے جو یوم بعاث کے سلسلہ میں انہوں نے کہے تھے۔ "بعاث" ایک زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں اوس کو خزرج پر غلبہ ہوا تھا، وہ نوجوان اس مجلس میں چلا گیا اور اُس نے ایسی ہی باتیں کیں جن کی وجہ سے اوس اور خزرج کو پرانی باتیں یاد آ گئیں اور جھگڑے شروع ہو گئے اور ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دو آدمی آپس میں لڑنے بھی لگے اور دونوں فریق میں لڑائی ٹھن گئی۔ پتھریلی زمین میں (جس کو اہلِ مدینہ حرہ کہتے ہیں) لڑنے کا اعلان ہو گیا اور دونوں قبیلے آپس میں جمع ہونے لگے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ معلوم ہوا آپ مہاجرین کو ساتھ لے کر اُن کے پاس تشریف لائے

اور فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت تم اللہ سے ڈرو کیا تم جاہلیت کے دعوے کو لے کر اٹھ رہے ہو اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں اسلام کی ہدایت دی اور اسلام کے ذریعہ تم کو عزت دی اور جاہلیت کی چیزوں کو ختم فرما دیا اور تمہیں کفر سے بچا دیا اور تمہارے درمیان اُلفت پیدا کر دی کیا تم اُسی حالت پر واپس ہونا چاہتے ہو جس پر تم حالت کفر میں تھے۔

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن کر دونوں قبیلوں کو احساس ہوا کہ یہ جو کچھ ہم سے صادر ہوا اور جنگ کا ارادہ ہوا یہ شیطانی حرکت ہے۔ اور دشمن کی مکاری ہے لہٰذا انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ پھر فرمانبردار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے آئے۔ اللہ نے دشمن کی مکاری کو ختم فرما دیا اور شاس بن قیس کے بارے میں دو آیات قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ (الی قوله تعالیٰ) وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ نازل فرمائیں اور وہ جو آدمی آپس میں لڑ پڑے تھے (جن میں ایک کا نام اوس اور دوسرے کا نام جبار تھا) اُن کے بارے میں اور جو لوگ لڑنے کے لئے ان کے ساتھ ہو گئے اُن کے بارے میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا سے لے کر (متعدد آیات) عَذَابٌ اَلِيْمٌ تک نازل فرمائیں۔ ان آیات میں اوّل تو یہودیوں کو خطاب فرمایا جن میں شاس بن قیس بھی شامل ہے کہ تم لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو۔ حالانکہ اللہ کو سب معلوم ہے جو تمہارا کردار ہے۔ اور ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو؟ اللہ کی راہ میں ٹیڑھا پن اور کجی کیوں تلاش کرتے ہو۔ حالانکہ تم اپنے اعمال پر خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔ یہ حسد اور کینہ دونوں تمہیں دنیا میں لے ڈوبے اور آخرت میں بھی لے ڈوبیں گے تم اپنی فکر کرو حسد اور حقد (کینہ) سے باز آؤ اور کفر اور بداعمالی کو چھوڑو۔

پھر اہل ایمان کو خطاب فرمایا جن میں اوس اور جبار بھی شامل ہیں کہ اگر تم اہل کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تم کو ایمان پر رہنے نہ دیں گے تم کو کفر میں واپس کر کے چھوڑیں گے۔ دشمن کی بات کو سمجھ کر چلنا چاہیئے۔ کافر تمہارے ایمان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتے، نیز فرمایا کہ تم کیسے کفر اختیار کر سکتے ہو حالانکہ تم پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور تمہارے اندر اللہ کا رسول (ﷺ) موجود ہے۔ ان آیات کو اور رسولؐ کی تعلیمات کو چھوڑو گے تو دشمن تم کو قابو کر لے گا اور دین کفر پر لگا دے گا۔ تم اللہ کو مضبوطی سے پکڑو، جس نے اللہ کو مضبوطی سے پکڑا اس کو صحیح اور سیدھے راستے کی ہدایت مل گئی۔

اتقوا اللہ حق تقاتہ کا مطلب...... پھر ایمان والوں سے مزید خطاب فرمایا کہ اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ حَقَّ تُقَاتِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے بھولا نہ جائے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حَقَّ تُقَاتِهٖ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں جیسا کہ جہاد کا حق ہے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ اور انصاف کے ساتھ اللہ کے لئے کھڑے ہوں اگرا اپنے خلاف اور اپنے ماں باپ کے خلاف بھی انصاف کرنا پڑے تو ایسے وقت میں بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ (درمنثور ص۵۹ ج۲)

اسلام پر مرنے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم اور افتراق کی ممانعت...... نیز فرمایا: وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور تم ہرگز مت مرنا مگر اس حال میں کہ مسلمان ہو، مطلب یہ ہے کہ آخری دم تک اسلام پر قائم رہنا، مزید فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور متفرق مت ہو جاؤ) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی کتاب، اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے، ایک اور حدیث میں ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن اللہ کی رسی ہے اس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے تم اس کو مضبوطی سے پکڑ لو کیونکہ اس کے پکڑنے کے بعد کبھی بھی گمراہ نہ ہوگے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے اندر اللہ کی کتاب چھوڑ رہا ہوں وہ اللہ کی رسی ہے جس نے اس کا اتباع کیا وہ ہدایت پر ہوگا اور جس نے اس کو چھوڑا وہ گمراہی پر ہوگا۔ (درمنثور ص ۶۰ ج ۲) ان روایات سے جہاں قرآن کو مضبوطی سے تھامنے کی اہمیت اور ضرورت معلوم ہوئی وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کو چھوڑ دینا گمراہی ہے آیت بالا میں وَلَا تَفَرَّقُوْا بھی فرمایا کہ افتراق نہ کرو اور جدا جدا فرقے نہ بناؤ۔ ایک زمانہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندیاں ہیں جس کا سبب قرآن کو چھوڑنا بھی ہے اور قائدین کے اپنے اپنے مفادات بھی ہیں اس افتراق نے دشمنوں کو قابو دے رکھا ہے دشمن جیسے چاہتے ہیں استعمال کر لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمت کی یاد دہانی...... پھر فرمایا: وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً (الآیہ) کہ تم اللہ کے انعام کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے اللہ نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا فرمائی لہٰذا تم اللہ کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ اللہ نے تم کو بچالیا۔ دوزخ کے کنارہ پر ہونا تو ظاہر ہی ہے کیونکہ اوس اور خزرج دونوں قبیلے کافر اور مشرک تھے اور اُن کی آپس کی دشمنی کا یہ عالم تھا کہ بقول ابن اسحٰق اوس اور خزرج میں ایک سو بیس سال تک جنگ جاری رہی تھی، جب دونوں قوموں نے اسلام قبول کیا تو وہ جنگ کی آگ اللہ نے بجھادی اُن کے درمیان اللہ نے الفت پیدا فرمادی۔ (درمنثور ص ۶۱ ج ۲) آخر میں فرمایا: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کہ اللہ اسی طرح تمہارے لئے اپنی آیات بیان فرماتا ہے تا کہ تم ہدایت پر رہو۔

ضروری تنبیہ...... مذکورہ بالا آیات میں اوّل تو تقوٰی کا حکم فرمایا اور یہ فرمایا اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ پھر فرمایا کہ جب مروتو اسلام ہی کی حالت میں مرو، شیطان کے بہکانے سے یا دشمنوں کے ورغلانے سے یا دنیا کی محبت کی وجہ سے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار مت کرو، پھر سب مسلمانوں کو اتفاق کے ساتھ مجتمع رہنے کی ہدایت فرمائی سب کو معلوم ہے کہ اتفاق و اتحاد ہر قوم کی قوت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور اتفاق اس وقت ہی ہو سکتا ہے جبکہ ہر قبیلہ ہر قوم ہر علاقہ کے لوگ اسلام کی قوت اور ساکھ برقرار رکھنے کے لئے اپنے اپنے جذبات کو دبا کر رہیں۔ مسلمانوں کا پورے عالم میں ایک ہی امیر المؤمنین ہونا چاہیئے اور مشرق سے مغرب تک تمام مسلمانوں کا ایک ہی ملک ہو تو اس قوت کا کیا عالم ہوگا اس کو غور کر لیں۔ دشمنوں نے جو عصبیتیں بیدار کر دی ہیں کہ عربی عجمیوں کے ماتحت کیوں رہیں اور عراقی اور شامی یمنی حجاز کے ماتحت کیوں رہیں اور سندھی پنجابیوں کے ماتحت کیوں رہیں اور بنگالی پٹھانوں کے ماتحت کیوں رہیں اور غیر بنگالی بنگالیوں کے ماتحت کیوں رہیں ان باتوں نے کثیر تعداد میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے ملک بنا دیئے ہیں۔ پھر دشمن نے ان ملکوں کے سربراہوں پر سیاسی یا نظریاتی قبضہ کر رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تمہارا امیر ایسا شخص بنا دیا جائے جس کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں جو تمہیں اللہ کی کتاب کے ذریعہ لے کر آگے چلتا ہو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ (رواہ مسلم ص ۱۲۰ ج ۲) ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ بات سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر ایسے شخص کو عامل بنا دیا جائے جو حبشی غلام ہو گویا کہ اس کا سر کشمش (کی طرح) چھوٹا سا ہو۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۵ ج ۲)

حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کہ بات سنیں گے اور فرمانبرداری کریں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی، اور اس بات پر بھی کہ اگر ہمارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی تب بھی فرمانبرداری کریں گے، اور اس بات پر بھی کہ صاحب اقتدار سے جھگڑا نہ کریں گے ہاں اگر بالکل ظاہر باہر کفر

نظر آئے جسکے بارے میں ہمارے پاس اللہ کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل ہو تو اس وقت ہم اس سے جھگڑا کریں گے۔(رواہ مسلم ص۱۲۵ ج ۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امیر المؤمنین کیسا ہی ہو اس کے ساتھ چلنا چاہیئے بشرطیکہ اللہ کی کتاب کے ذریعہ لے چلتا ہو۔ اپنی رائے اور منشا کے موافق ہو تب بھی فرمانبرداری کریں اور اپنی رائے اور منشا کے مخالف ہو تب بھی فرمانبرداری کریں۔ اگر ہمارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جاتی ہو تب بھی بات مانیں اور اطاعت کریں۔ اگر کالے حبشی کو امیر بنادیا جائے تب بھی اطاعت کریں۔ حبشی کی مثال دینے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رنگ اور نسل کا سوال ختم فرمادیا اور یہ جو فرمایا کہ اگر امیر کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں تب بھی بات سنیں اور اطاعت کریں۔ اس سے صورت اور شکل کا سوال ختم فرمادیا۔ پھر عبد حبشی فرما کر یہ بتادیا کہ اگرچہ آئمہ قریش سے ہونے چاہئیں لیکن اس کے خلاف کسی غلام کو بھی اقتدار دے دیا جائے تب بھی اس سے جُڑے رہو۔ بعض مرتبہ امیر کی رائے سے اختلاف ہو جاتا ہے اور اس کی رائے خطا معلوم ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صحیح فیصلہ نہیں کیا اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ باوجود اختلاف رائے کے جھگڑا نہ کریں ہاں اگر بالکل ہی دلیل واضح سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا فیصلہ بالکل کافرانہ فیصلہ ہے اور تم اس کی دلیل اللہ پاک کے حضور میں دے سکتے ہو تو اس سے منازعت کر سکتے ہو۔ امیر اور مامورین کے بارے میں احادیث تو اور بھی ہیں لیکن ان چند احادیث میں ایسے چند امور ارشاد فرمادیئے جن کو اختیار کرنے سے امت کا شیرازہ بندھا رہ سکتا ہے اور وحدت قائم رہ سکتی ہے سارے مسلمان اللہ کی رسی کو مضبوط تھامیں صاحب اقتدار یا عوام یا جماعتیں دشمنوں کا کھلونا نہ بنیں نہ کسی کے ہاتھ بکیں وحدت اسلامیہ کو قائم رکھنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ باوجودیکہ زبانیں مختلف ہوں جغرافیائی اعتبار سے مختلف علاقوں کے رہنے والے ہوں لیکن سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہوں۔ زبانوں کے اختلاف کو اور اختلاف رائے اور فروعی مسائل کو جنگ وجدال اور اختلاف کا ذریعہ نہ بنائیں اور پہلے سے دیکھ کر متقی آدمی کو امارت اور خلافت سونپیں، یورپ سے آئی ہوئی جمہوریت جاہلیہ کو ذریعہ انتخاب نہ بنائیں۔ جو فاسقوں بلکہ کفریہ عقائد رکھنے والوں کو بھی اقتدار اعلیٰ اور اقتدار ادنیٰ دلوادیتی ہے۔

افتراق کے اسباب، اتحاد کا طریقہ...... اس آیت میں اوّل تو اجتماعیت کا طریقہ بتایا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا پھر افتراق سے منع فرمایا اور واضح طور پر بتادیا وَلَا تَفَرَّقُوْا اور سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (آپ فرمادیجئے کہ بلاشبہ یہ میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے لہٰذا تم اس کا اتباع کرو اور دوسری راہوں پر مت چلو وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی) مسائل فرعیہ میں جو ائمہ کا اختلاف ہے وہ اتحاد و اتفاق سے مانع نہیں ہے صدیوں سے حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے ہیں۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی مسائل میں اختلاف تھا لیکن وہ باوجود اختلاف کے آپس میں شیر و شکر ہو کر مجتمع رہے۔ اگر کہیں شدید اختلاف ہو گیا تو وہ بھی اللہ ہی کے لئے تھا۔ کسی سے خطاء اجتہادی ہو گئی یہ دوسری بات ہے لیکن مقصد کسی کا دین اسلام کے خلاف چلنا نہ تھا، البتہ اصحاب ھویٰ (جنہیں اپنی خواہشات پر چلنا ہے) اہل حق کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بحوالہ درمنثور روایت گذر چکی ہے کہ اوس اور خزرج میں ۱۲۰ سال سے لڑائی چلی آ رہی تھی وہ اسلام قبول کرنے پر ختم ہو گئی اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے جس کو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا میں یاد دلایا ہے۔ اتنی پرانی دشمنی محبت سے بدل سکتی ہے تو دور حاضر کے مسلمانوں کے آپس کے صوبائی اور لسانی اور سیاسی اختلافات وحدت اسلامیہ کو قائم کرنے کے لئے کیوں ختم نہیں ہو سکتے؟ جو زعماء سیاست ہیں اور صوبوں کے بڑے سمجھے جاتے ہیں یہ لوگ اسلام پر آئیں اور اپنی قوم کو

بھی اسلام پر لائیں، اقتدار کی ہوس چھوڑیں دیکھو وحدت قائم ہو جاتی ہے یا نہیں؟ وہاں تو مشکل یہ ہے کہ بہت سے زعماء سیاست ایسے ہیں جنہیں اسلام سے تعلق ہی نہیں وہ برملا اسلام سے اپنی برأت ظاہر کرتے ہیں۔ اسلام کے قوانین پر اعتراض کرتے ہیں عجیب بات ہے کہ اسلام کا کلمہ پڑھنے والے انہیں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو حدودِ کفر میں تو داخل نہیں ہوئے لیکن وحدت اسلامیہ سے زیادہ انہیں اپنا اقتدار محبوب ہے ان حالات میں وحدت کیسے قائم ہو؟

جو لوگ نام کے مسلمان ہیں لیکن اپنے عقائد کی وجہ سے اور اسلام پر اعتراض کرنے کی وجہ سے حدودِ کفر میں داخل ہیں عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ اُن پر بھی صادق ہے، یہ لوگ سچے دل سے صحیح معنی میں اسلام قبول کریں تو عذابِ دوزخ سے بچ جائیں گے۔ اللہ کی آیات ہمیشہ کے لئے ہیں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

اور تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا ضروری ہے جو دعوت دیتے ہوں خیر کی طرف، اور حکم کرتے ہوں اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہوں بُرے کاموں سے،

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

اور یہ لوگ پورے پورے کامیاب ہیں، اور مت ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو آپس میں متفرق ہو گئے اس کے بعد اُن کے پاس واضح احکام پہنچے آپس میں

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا

اختلاف کر لیا اور یہ لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جس دن چہرے سفید ہوں گے اور چہرے سیاہ ہوں گے، سو جن

الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ

لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کیا تم نے کفر اختیار کیا اپنے ایمان کے بعد، سو چکھ لو عذاب اس وجہ سے کہ

تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

تم کفر کرتے تھے۔ اور جن کے چہرے سفید ہوں گے سو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي

یہ اللہ کی آیات ہیں ہم آپ پر ان کی تلاوت کرتے ہیں حق کے ساتھ، اور اللہ جہانوں کے ساتھ ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا، اور اللہ ہی کے لئے ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹائے جائیں گے۔

ع ۱۱ ۸ ۲

ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دیتی ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی ہو

مسلمان کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرے۔ نیکیاں کرتا رہے،

گناہوں سے بچتا رہے، اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ دوسروں کو خیر کی دعوت دیتا رہے اور برائیوں سے روکتا رہے خود نیک بن جانا اسلامی معاشرہ باقی رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے دوسروں کو بھی خیر کی دعوت دیتے رہیں اور نیکیوں کا حکم کرتے رہیں اور برائیوں سے روکیں تب اسلامی معاشرہ باقی رہے گا چونکہ انسان کے اندر بہیمیت کے جذبات بھی ہیں اور اُس کے پیچھے شیطان بھی لگا ہوا ہے اس لئے بہت سے لوگ فرائض اور واجبات چھوڑ بیٹھتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کو صحیح راہ پر باقی رکھنے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت...... آیتِ بالا میں حکم فرمایا کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی دعوت دیتی ہو امر بالمعروف کرتی ہو اور نہی عن المنکر کرتی ہو، جو کام اللہ کی رضامندی کے ہیں اُن کو معروف اور جو کام اللہ کی ناراضگی کے ہیں اُن کو منکر کہا جاتا ہے، پانچ آیات کے بعد پھر اس کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ. اور سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا ہے وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ؕ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيۡعُوۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرۡحَمُهُمُ اللّٰهُ (اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں یہ لوگ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا) اس کے علاوہ دوسری آیات میں بھی قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اور ضرورت بتائی ہے سورۂ توبہ کی آیت سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں کام مؤمنین کی خاص امتیازی صفات ہیں احادیثِ شریفہ میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بہت زیادہ اہمیت اور ضرورت بتائی گئی ہے۔ صحیح مسلم ص ۵۱ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنۡ رَاٰى مِنۡكُمۡ مُنۡكَرًا فَلۡيُغَيِّرۡهُ بِيَدِهٖ فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ فَبِقَلۡبِهٖ وَ ذٰلِكَ اَضۡعَفُ الۡاِيۡمَان (یعنی تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے یعنی برائی کرنے والے کو اپنے زور کی طاقت سے روک دے) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بدل دے (یعنی برائی کرنے سے روک دے) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دل سے بُرا جانے اور یہ (صرف دل سے بُرا جان کر خاموش رہ جانا اور ہاتھ یا زبان سے منع نہ کرنا) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے)۔

معلوم ہوا کہ ہر شخص نیکیوں کا حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے کا مامور ہے اپنے گھر کے، بڑے اداروں کے، بڑی کمپنیوں اور فرموں کے ذمہ دار حکومتوں کے عہدیدار بقدر اپنی قوت اور طاقت کے اس فریضے کو انجام دیں، گھر کے لوگ اپنی اولاد کو اور نوکروں کو نیکیوں کی دعوت دینے اور برائیوں سے روکنے میں پوری قوت استعمال کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اپنی اولاد کو دنیاوی دھندے تو سکھاتے ہیں اور تجارتی کاروباری باتیں سمجھاتے ہیں لیکن فرائض و واجبات کا انہیں حکم نہیں دیتے اور گناہوں سے انہیں نہیں روکتے۔

اصحابِ اقتدار کی غفلت...... بہت سے لوگوں کو مختلف طرح کے عہدے اور مناصب حاصل ہیں وہ اپنے ماتحتوں کو نہ فرائض اور واجبات کا حکم کرتے ہیں اور نہ گناہ چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ حکومتوں کے چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہونے والے خود بھی بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور فرضوں کے تارک ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ اپنے ماتحتوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے بلکہ اپنا اقتدار جمانے کے لئے ماتحتوں کو گناہ کرنے کا حکم دیتے ہیں اور سرکاری کاموں میں نمازیں تک برباد کر دی جاتی ہیں۔

اہلِ ایمان صاحبِ اقتدار کی صفات بتاتے ہوئے سورۂ حج میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔ (یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو حکومت دے دیں تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اچھے کاموں کا حکم کریں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے)۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے پر دنیا میں عذاب...... قدرت ہوتے ہوئے امر بالمعروف نہ کرنا اور برائیوں سے نہ روکنا سخت وبال کی چیز ہے، اس دنیا میں عہدے اچھے لگتے ہیں لیکن جب ان کا وبال آخرت میں سامنے آئے گا تب پچھتاوا ہوگا جس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہر مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پابند ہے اور اس فریضہ کو چھوڑ دینا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی عذاب آنے کا ذریعہ ہے۔ اگر اس فریضہ کو چھوڑ دیا جائے تو دعائیں تک قبول نہیں ہوتیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس قوم میں کوئی ایک شخص گناہ کرتا ہو جسے روکنے پر قدرت رکھتے ہوئے وہ لوگ نہ روکیں تو مرنے سے پہلے اُن لوگوں پر عذاب آئے گا۔ (رواہ ابوداؤد ص ۲۴۰ ج ۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستی کا تختہ اس کے رہنے والوں کے ساتھ الٹ دو۔ حضرت جبریل نے عرض کیا کہ اے پروردگار اُن میں آپ کا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے بقدر بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی (کیا اُسے بھی عذاب میں شریک کرلیا جائے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ اس بستی کو اس شخص پر اور باقی رہنے والوں پر الٹ دو کیونکہ اس کے چہرہ پر میرے (احکام) کے بارے میں کبھی کسی وقت شکن بھی نہیں پڑی۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور ضرور امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تمہارے اوپر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم اُس سے دعا کرو گے تو وہ دُعا قبول نہ فرمائے گا۔ (رواہ الترمذی)

معلوم ہوا کہ بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ایسا اہم اور ضروری کام ہے کہ اس کے نہ ہونے سے نیکیاں کرنے والے بھی عذاب کی لپیٹ میں آسکتے ہیں اور جب عذاب آئے گا تو جو دعائیں کی جائیں گی تو وہ بھی قبول نہ ہوں گی۔ عموماً لوگ خود گناہوں میں مبتلا ہیں، نمازیں چھوڑے ہوئے ہیں، زکوٰتیں نہیں دیتے، جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں ان گواہیوں کے ذریعہ پیسہ کماتے ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، مال لوٹے جا رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں۔ قانون شریعت کی اجازت کے بغیر قتل ہو رہے ہیں اور کوئی شخص بولنے والا نہیں ایسی صورت میں عذاب سے کیسے حفاظت ہو اور عذاب آئے تو دعائیں کیسے قبول ہوں؟

ہر شخص کی ایمانی ذمہ داری حدیث شریف میں بتادی کہ جو بھی شخص کسی منکر کو دیکھے اُس کو اپنی طاقت کے بقدر روک دے۔ اور ہر شخص کی ذمہ داری کے سوا آیت بالا میں مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہونے کا بھی حکم فرمایا جو دعوت الی الخیر کرتی ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُس کا خصوصی کام ہو۔ یہ جماعت فرض کفایہ کے طور پر ہر علاقہ میں کام کرے اور اتنے افراد ہونے چاہئیں جو ہر علاقہ کے افراد کو دعوتِ خیر دے سکیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکیں۔ جماعت سے یہ مراد نہیں کہ دورِ حاضر کے انداز کی کوئی جماعت ہو جس کا صدر ہو سیکرٹری ہو، ممبران ہوں، دفتر ہو، جماعت کا کوئی نام یا یونیفارم ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے کام کرنے والے بقدرِ ضرورت امت میں موجود رہیں۔ حکومت ایسے افراد مہیا کرے۔ حکومت نہ کرے تو مسلمان خود ایسی ایک جماعت قائم رکھیں جو اس

فریضہ کوانجام دیتی رہے اور چھوٹی موٹی جماعت نہ ہو بلکہ اتنی بڑی جماعت ہو کہ ہر علاقہ میں اہل اسلام کے جتنے افراد رہتے اور بستے ہوں ان تک بات پہنچانے کے لئے کافی ہوں۔

فائدہ......آیتِ شریفہ میں پہلے یدعون الی الخیر فرمایااس کے بعد یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر فرمایا، دعوت الی الخیر میں سب باتیں داخل ہوگئیں کافروں کو اسلام کی دعوت دینا بھی اس میں آ گیا اور فرائض اور واجبات کے علاوہ سنن اور مستحبات کی دعوت دینے کو بھی یدعون الی الخیر کا عموم شامل ہوگیا، مستحبات کو چھوڑ دینا اگر چہ منکر نہیں ہیں لیکن ان پر عمل کرنے میں بہت بڑا فائدہ ہے اس لئے ان کی دعوت بھی دیتے رہنا چاہئے لیکن سختی نہ کی جائے، البتہ فرائض اور واجبات کی دعوت سختی سے دی جائے جس درجہ کا جو حکم ہے اسی درجہ میں اس کی دعوت ہونی چاہئے، بہت سے لوگ فرائض اور واجبات میں مسامحت کرتے ہیں بلکہ خود بھی فرائض کو چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں اور مستحبات کے بارے میں سختی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں، شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) میں جس چیز کا جو درجہ ہے اُسی درجہ کے مطابق دعوت میں سختی اور نرمی اختیار کی جائے۔ لفظ خیر ہر نیک کام کو شامل ہے۔

تفسیر ابن کثیر ص ۳۹۰ ج ا میں حضرت ابوجعفر باقرؒ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ تلاوت فرمائی پھر فرمایا کہ الخیر اتباع القراٰن وسنتی (کہ قرآن کا اور میری سنت کا اتباع کرنا خیر ہے) اس کے مطابق ہر چھوٹی بڑی نیکی کو لفظ ''خیر'' شامل ہے۔

کامیاب کون لوگ ہیں؟......جو حضرات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں اُن کے بارے میں فرمایاوَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کہ یہ لوگ پورے پورے کامیاب ہیں۔ کامیابی کو تو ہر شخص چاہتا ہے لیکن مقاصد کے اعتبار سے ہر ایک کے نزدیک کامیابی کا معیار الگ الگ ہے۔ قرآن کریم نے بھی کامیابی کا معیار بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے کام کئے جائیں۔ جن کی وجہ سے دوزخ سے حفاظت ہو جائے اور جنت مل جائے اور اوپر جو کام بتائے ہیں وہ اللہ کی رضا کے کام ہیں۔ اس لئے ان پر عمل پیرا ہونے والوں کو مفلحون (کامیاب) فرمایا۔

دلائل سے حق واضح ہونے کے بعد انحراف کرنے والوں کی سزا......پھر فرمایاوَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (اورمت ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو آپس میں متفرق ہوگئے اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام پہنچے)

صاحب روح المعانی ص ۲۲ ج ۴ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جنہوں نے اختلاف کیا اور افتراق کی راہ اختیار کی، امتِ مسلمہ کو حکم ہوا کہ اُن جیسے نہ ہو جاؤ جن کے پاس آیات بینات اور حجج بالغہ آئیں جو متحد رہنے کا حکم دے رہی تھیں انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور اتحاد کی بجائے افتراق کو اپنایا، یہ افتراق دنیاوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑنے اور اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، بہت سے اصحاب ہوٰی دین کو اپنی افکار و آراء کے تابع بنا کر چلتے ہیں اور ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو جاتے ہیں، مرجیہ، کرامیہ، مجسمہ، مشبہہ، جہمیہ فرقے عصر ماضی میں گذر چکے ہیں، اور اب بھی ایسے بہت سے فرقے ہیں جو مدعی اسلام ہیں لیکن ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو حدیث نبوی (ﷺ) کی حجیت کے منکر ہیں اور وہ لوگ بھی جو تحریف قرآن کے قائل ہیں اور ایسی جماعت بھی ہے جو سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی مانتی ہے اور بھی طرح طرح کے کفریہ عقائد رکھنے والے موجود ہیں۔

افتراق کرنے والے جو اپنے اہواء وافکار کی وجہ سے حدودِ اسلام سے نکل جائیں ان کے لئے آخرت کا عذاب بتاتے ہوئے ارشاد

فرمایا: وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (اوران کے لئے بڑا عذاب ہے جس دن بہت سے چہرے سفید ہوں گے اور بہت سے چہرے سیاہ ہوں گے) پھر فرمایا: فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ. (سوجن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد سو چکھ لو عذاب اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے سو وہ اللہ کی رحمت یعنی جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

قیامت کے دن اہلِ کفر کی بدصورتی...... قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی قیامت کے دن چہروں کا سفید و سیاہ ہونا مذکور ہے، سورۂ عبس کے آخر میں فرمایا: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ (اس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے ہنستے ہوئے ہوں گے۔ خوش ہوں گے اور اس دن بہت سے چہرے ایسے ہوں گے کہ جن پر ظلمت ہوگی جن پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، یہ لوگ کافر فاجر ہوں گے)۔

سورۂ زمر میں فرمایا: يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ط (اور اے مخاطب تو قیامت کے دن دیکھے گا ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)۔

سورۂ یونس میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ط مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ج كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ط اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (اور جن لوگوں نے برے کام کئے بدلہ برائی کا اسی جیسا ہوگا اور چھا جائے گی ان پر ذلت، ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیئے گئے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

مضمون کے ختم پر فرمایا: تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ. (کہ یہ اللہ کی آیات ہیں ہم تمہارے اوپر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں کے ساتھ ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا)۔

پھر فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ (کہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اسی کی طرف تمام اُمور لوٹتے ہیں) وہ مالک اور متصرف ہے اسے سب اختیار ہے اپنی مخلوق میں جیسا تصرف کرے کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ

تم سب اُمتوں سے بہتر امت ہو جو نکالی گئی لوگوں کے لئے، بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان

بِاللّٰهِ ط وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰

لاتے ہو، اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا، اُن میں سے بعض مؤمن ہیں اور اکثر اُن میں سے فرمانبرداری سے باہر ہیں۔

امتِ محمدیہ ﷺ کی امتیازی صفات

اس آیتِ شریفہ میں امت محمدیہ ﷺ کو خَیْرُ اُمَّۃٍ فرمایا ہے اور اس امت کا نبی بھی خیر الانبیاء ہے جس کا آیت لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ میں ذکر فرمایا ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا سید ولد اٰدم یوم القیامۃ کہ میں قیامت کے دن آدم کی تمام اولاد کا سردار ہوں گا۔ (رواہ مسلم ص ۲۴۵ ج ۲) نیز آپ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میں آدم کی تمام اولاد کا سردار ہوں گا اور بطور فخر کے نہیں کہہ رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور بطور فخر کے نہیں کہہ رہا ہوں اور اس دن آدم ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور نبی ہو سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور میں سب سے پہلا وہ شخص ہوں گا جس سے زمین پھٹے گی (یعنی قبر سے سب سے پہلے ظاہر ہوں گا) اور میں بطور فخر کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ (رواہ الترمذی کما فی المشکوٰۃ ص ۵۱۳)

سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تلاوت فرمائی پھر فرمایا کہ تم ستر ویں (۷۰) امت کو پورا کر رہے ہو تم سب امتوں سے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک سب امتوں سے بڑھ کر اکرم ہو۔ (قال الترمذی ہذا حدیث حسن) اس امت کو خیر الامم بتاتے ہوئے اس کے اوصاف بھی بتا دیئے اور وہ یہ کہ تم بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، معلوم ہوا کہ اس اُمت کا طرۂ امتیاز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ امت کا ہر فرد اس کام میں لگے البتہ اس میں تفصیلات ہیں کبھی فرض عین ہوتا ہے کبھی فرض کفایہ کبھی واجب اور کبھی سنت۔

روح المعانی ص ۲۸ ج ۴ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: یاایّھا الناس من سرہ ان یکون من تلکم الامۃ فلیؤد شرط اللہ تعالٰی واشار بذٰلک الی قولہ سبحانہ تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ (اے لوگو! تم میں سے جو شخص یہ چاہتا ہو کہ وہ بہترین امت میں سے ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شرط پوری کرے۔ اور شرط کے لفظ سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کی طرف اشارہ کیا ہے) گذشتہ رکوع میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فضیلت اور ضرورت اور اہمیت بیان ہو چکی ہے اس کو دوبارہ دیکھ لیا جائے۔ یہاں یہ بات بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ کو کیوں مؤخر کیا جبکہ ایمان ہر عمل سے مقدم ہے اور ہر عمل کے قبول ہونے کے لئے شرط ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس سلسلہ میں تین باتیں لکھی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مقصود بالبیان اس جگہ پر چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اس لئے ان دونوں کو مقدم کیا۔ لیکن پھر ایمان کا تذکرہ بھی فرما دیا تا کہ ہر عمل کی جو شرط ہے اس کا ذکر متروک نہ ہو جائے۔ بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ وتؤمنون باللہ اس لئے فرمایا کہ آگے اہلِ کتاب سے جو کلام متعلق ہے اس سے مرتبط ہو جائے۔

اکثر اہلِ کتاب فرمانبرداری سے خارج ہیں ...... اہلِ ایمان کا ذکر فرمایا وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ اُن کے لئے بہتر تھا) اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد آپ سے پہلے جس کسی نبی یا جس کسی کتاب سماوی پر کسی کا ایمان تھا یا اب ہے وہ معتبر نہیں ہے جب تک کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہو۔ پھر فرمایا اہل کتاب میں بعض مؤمن ہیں جیسے عبداللہ بن سلام اور بعض دیگر اہلِ کتاب (جنہوں نے حق کو قبول کیا اور دنیاوی منافع نے اُن کو حق سے نہیں روکا) اور اہلِ کتاب میں اکثر اللہ کی فرمانبرداری سے خارج ہیں، یعنی کافر ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ

تم کو ہرگز ضرر نہ پہنچا سکیں گے مگر ذرا سی تکلیف، اور اگر تم سے جنگ کریں گے وہ تو پشت پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر اُن کی مدد نہ کی جائے گی۔ جمادی گئی

عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

اُن پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جائیں، مگر ایسے سبب سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایسے سبب سے جو لوگوں کی طرف سے ہو اور وہ لوٹ گئے

مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ

اللہ کے غصہ کو لے کر، اور جمادی گئی اُن پر مسکنت، یہ اس لئے کہ وہ کفر کرتے تھے اللہ کی آیتوں کے ساتھ، اور وہ نبیوں کو

الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہ لوگ سب برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں سے ایک جماعت

اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

ایسی ہے جو حق پر قائم ہے، رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور آخرت

الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ

کے دن پر اور امر بالمعروف کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

صالحین میں سے ہیں۔ اور یہ لوگ جو بھی کچھ خیر کا کام کریں گے تو اس کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ متقیوں کو جاننے والا ہے۔

یہود کی ذلت اور مسکنت

زمانۂ نبوت میں یہودیوں کی دشمنی ظاہراً بھی تھی اور پوشیدہ بھی تھی۔ مسلمانوں کو اُن سے تکلیف پہنچتی رہتی تھی، خطرہ تھا کہ کوئی ایسی کارروائی نہ کر بیٹھیں جس سے زیادہ تکلیف پہنچ جائے۔ بلکہ رؤسا یہود نے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان عوام کو جو یہودیت چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ زبانی طور پر ایذا دینے کا سلسلہ شروع بھی کر دیا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے مسلمانوں کے اس خطرہ کو دور فرما دیا اور فرمایا کہ یہ لوگ تمہیں بس ذرا سی تکلیف پہنچا سکیں گے اور اگر انہوں نے جنگ چھیڑی تو پشت پھیر کر بھاگ جائیں گے، پھر یہودیوں کی حالت مغضوبیت بیان فرمائی کہ اُن پر ذلت کی چھاپ ماردی گئی جہاں کہیں بھی ہوں گے ذلیل ہوں گے۔

یہود کی موجودہ حکومت...... ہاں اگر اللہ کے کسی عہد میں آ جائیں یا انسانوں کے کسی عہد میں آ جائیں تو (دنیاوی) ذلت سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے عہد میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً مسلمانوں سے ان کا کوئی معاہدہ ہو جائے اور معاہدہ کے موافق مسلمان ان سے تعرض نہ کریں یا یہ لوگ جزیہ قبول کریں اور مسلمانوں کی عملداری میں رہنا قبول کریں تو اس صورت میں ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جو ذمیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا کہیں لڑائی ہو تو مسلمان ان کے بچے اور عورتوں کو حسبِ قانونِ شرعی قتل کرنے سے باز رہیں گے اور

انسانوں کے عہد میں آنے کا یہ مطلب ہے کہ کسی حکومت سے ان کا کوئی معاہدہ ہو جائے وہ حکومت ان کو امان دے دے۔

جب سے یہودیوں کی حکومت قائم ہوئی ہے لوگوں کو اشکال ہو رہا ہے کہ قرآن نے تو اُن کے بارے میں ذلت کا اعلان کیا تھا پھر اُن کی حکومت کیسے قائم ہوئی؟ درحقیقت قرآن کے اعلان میں کوئی بات قابلِ شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ اوّل تو قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمیشہ ہمیش تا قیامت ان لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ دوام ذلت دنیاویہ تو کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں، پھر یہودیوں کی جو حکومت قائم ہے وہ حبل من الناس کی وجہ سے ہے۔ یہودیوں سے کچھ معاہدے کر کے بعض نصرانی حکومتوں نے ان کی حکومت قائم کی ہے اور نصاریٰ ہی کے بل بوتے اور سہارے پر ان کی حکومت قائم ہے قرآن کریم نے جو حبل من الناس فرمایا ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ان کے بعض حالات انسانوں سے جوڑ توڑ رکھنے کی وجہ سے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں ان کو کچھ عزت مل جائے اور ضربت علیھم الذلۃ کا اطلاق عام مستثنیٰ ہو جائے۔

پھر فرمایا کہ یہودی اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور ان پر مسکنت کی چھاپ ماردی گئی اور اس کا سبب بتایا کہ وہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہ مضمون سورۂ بقرہ کے رکوع سات کے اخیر میں بھی گذر چکا ہے۔

بعض اہلِ کتاب کی تعریف جنہوں نے اسلام قبول کیا...... پھر اُن اہل ایمان کی تعریف فرمائی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا کہ وہ راتوں رات اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انجام دیتے ہیں۔ نیکیوں میں آگے بڑھتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں، اور یہ لوگ جو بھی خیر کا کام کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ کو متقیوں کا علم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ

بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا ہرگز ان کے کام نہ آئیں گے اُن کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی، اور یہ لوگ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کی مثال جو کچھ وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے

كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ

ہیں ایسی ہے جیسے ایک ہوا ہو جس میں سخت سردی ہو جو ایسے لوگوں کی کھیتی کو پہنچ گئی جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا پھر اس کو برباد کر دیا اور اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا

اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١١٧﴾

لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

کافروں کے اموال اور اولاد عذاب سے نہ بچا سکیں گے

پہلی آیت میں تو یہ فرمایا کہ اہلِ کفر پر جب اللہ کا عذاب آئے گا تو اُن کے مال اور اولاد کچھ بھی نفع نہ دے سکیں گے یہ لوگ اپنے کفر کی

وجہ سے دوزخی ہیں اور دوزخ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ سورۂ آلِ عمران کے رکوع ۲ کے شروع میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے۔ پھر ان لوگوں کے اخراجات اور نفقات کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ جو کچھ خرچ کرتے ہیں (اور ان اخراجات میں وہ اموال بھی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کئے جاتے ہیں) ان اخراجات کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ایسی قوم کی کھیتی ہو جنہوں نے کفر اور معاصی کے ذریعہ اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو۔ اس کھیتی پر اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیج دی جس میں سخت ٹھنڈک تھی اس ٹھنڈک نے ساری کھیتی کو برباد کر دیا۔ کھیتیوں کو سخت سردی پہنچ جاتی ہے تو اس کو عام محاورات میں پالا پڑ جانا یا پالے سے ہلاک ہو جانا کہتے ہیں یہ ہوا بطور سزا اور عقاب کے ان کے کھیتوں کو لگی اور سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُن پر اللہ نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہی خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، یہ عذاب ان کے کرتوتوں کی وجہ سے آیا۔ اللہ کو کوئی الزام نہ دیں اپنے کفر اور معاصی کو دیکھیں، کافروں نے ثواب کی نیت سے جو کچھ خرچ کیا وہ بھی بھسم ہے اُس کا کوئی ثواب آخرت میں نہیں ملے گا اور جو کچھ دین اسلام کی دشمنی میں خرچ کرتے ہیں ظاہر ہے اس کا کیا ملنا ہے؟ دنیا میں بھی مالوں کی بربادی ہے اور آخرت میں زیادۃ فی الکفر کی وجہ سے عذاب در عذاب کا سبب بنے گا۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ایسی ہے جیسے کہیں راکھ پڑی ہو، آندھی کے دن میں سخت تیز ہوا اس کو اڑا دے، یہ لوگ قادر نہ ہوں گے اپنے کمائے ہوئے میں سے کسی چیز پر بھی، یہ دور کی گمراہی ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ

اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو اپنا رازدار مت بناؤ، وہ لوگ تمہارے بگاڑ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے، اُن کو وہ چیز پسند ہے جس سے تمہیں تکلیف ہو

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ

بغض ظاہر ہو چکا ہے، اُن کے مونہوں سے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے، تحقیق ہم نے بیان کر دیں تمہارے لئے آیات

اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ

اگر تم عقل رکھتے ہو۔ تم لوگ ایسے ہو کہ اُن سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم پوری کتاب پر ایمان

كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ڝ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا

لاتے ہو، اور وہ جب آپس میں تنہائیوں میں جاتے ہیں تو مارے غصہ کی جلن کے اپنی انگلیوں کو دانتوں سے کاٹ لیتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ مر جاؤ

بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ

اپنی جلن میں، بے شک اللہ جاننے والا ہے اُن سب چیزوں کو جو سینوں میں ہیں، اگر تم کو کوئی اچھی حالت پہنچ جائے تو اُن کو بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی بُری حالت

سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا

پہنچ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی مکاری تمہیں کچھ بھی ضرر نہ پہنچائے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اُن کے

يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۱۲۰﴾

اعمال کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔

کافروں کو راز دار نہ بناؤ

ان آیات میں دشمنانِ اسلام کی دشمنی کو خوب زیادہ واضح کر کے بیان فرمایا ہے اور چونکہ وہ دشمن ہیں اس لئے دشمن سے دشمنی ہی کی امید رکھی جاسکتی ہے سب سے پہلے ارشاد فرمایا کہ اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کو اپنا راز دار مت بناؤ وہ تمہیں بگاڑنے اور خراب کرنے میں ذرا سی بھی کسر نہ چھوڑیں گے اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

مسلمانوں کی بدحالی...... تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی بھی اس نصیحت کے خلاف کیا ہے مسلمانوں نے مار کھائی، دشمن اسی طریقہ سے قابو پاتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو مال دے کر یا عہدے دے کر اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے یہ مال کے لالچی اور عہدوں کے حریص دشمنوں کے سامنے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی خفیہ باتیں سب اُگل دیتے ہیں، دشمنوں نے مسلمانوں کے ملکوں میں مسلمانوں میں سے ایسے جاسوس بنا رکھے ہیں جو ہر چھپی ڈھکی بات اور ہر خفیہ مشورہ دشمنوں تک پہنچا دیتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومتیں زیر زبر ہوتی رہتی ہیں۔ اہم افراد قتل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کا کلمہ پڑھنے کے باوجود اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔

کافروں کو خیر خواہ سمجھنے کی بیوقوفی...... دشمن سے تو کبھی کسی طرح کی دوستی کرنے کی گنجائش ہی نہیں، مسلمانوں کی بعض حکومتیں دشمنوں کے بل بوتے پر قائم ہیں اور اس ڈر سے کہ وہ حکومت کسی اور کو نہ دلا دیں دشمنوں کی ہر بات مانتے ہیں اور جس طرح دشمن کہتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔ دشمنوں نے سمجھا رکھا ہے کہ عوام کو بہکانے کے لئے کہتے رہو کہ ہم اسلام قائم کریں گے۔ اگر کوئی شخص واقعی اسلام لانے لگے تو وہ مقتول یا معزول ہو جاتا ہے، دشمن کے سہارے اقتدار لے کر بیٹھنا ہی اسلام کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ دشمن تو مسلمانوں کی تکلیف سے خوش ہیں جیسا کہ رب العزت جل شانہٗ نے فرمایا: وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ کفر ملت واحدہ ہے سارے کافر خواہ کسی بھی دین سے تعلق رکھتے ہوں اندر سے سب ایک ہیں اور مسلمانوں کے دشمن ہیں جب کبھی موقعہ آتا ہے ان کی وحدت کا مظاہرہ ہو جاتا ہے ان میں سے بہت سے لوگ صاف اور صریح الفاظ میں اسلام دشمنی کا اعلان کر بھی دیتے ہیں جیسا کہ زمانہ نبوت میں یہودیوں نے کیا تھا، اسی کو فرمایا: قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ (کہ ظاہر ہو چکا ہے بغض اُن کے مونہوں سے اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے)

مسلمانوں کو بار بار جھنجھوڑ کر ارشاد فرمایا قَدۡ بَيَّنَّا لَكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ o (کہ بلاشبہ ہم نے تمہارے لئے آیات بیان کر دیں اگر تم عقل رکھتے ہو)۔

مسلمانوں کی غفلت پر سرزنش...... مزید فرمایا کہ اے مسلمانو! تم ایسے ہو کہ دشمنوں سے محبت کا برتاؤ کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، تم اُن کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہو جو انبیائے سابقین علیہم السلام پر نازل ہوئیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے، تم جو ان کی کتاب پر ایمان رکھتے ہو انہیں اس کی کچھ پاسداری نہیں، ان میں منافقت ہے۔ جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو غصہ کی جلن کے مارے اپنی انگلیاں کاٹے لیتے ہیں کہ مسلمان کیسے آگے بڑھ رہے ہیں اور کیسے قوت پا رہے ہیں ان کے اس حال کے بارے میں ارشاد فرمایا قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ کہ تم اپنے غصہ کی جلن میں مر جاؤ۔ دین اسلام کو قوت ہو کر

رہے گی۔ اسلام کی قوت اور شان وشوکت بڑھنے پر انگلیاں کاٹنے سے کیا ہوتا ہے اس غصہ میں مر بھی جاؤ گے تب بھی اسلام کا کلمہ بلند ہو گا۔ سب دینوں پر اسلام غالب ہوگا۔ پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (بے شک اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے) تمہارے دلوں میں جو کفر ہے اُسے اس کا پتہ ہے اُس نے مسلمانوں کو بھی تمہارا حال بتا دیا تا کہ وہ چوکنے ہو کر رہیں اور آخرت میں تمہیں کفر کی سزا دے گا۔

مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (کہ اگر تم کو اچھی حالت پیش آ جاتی ہے اس سے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور اگر تم کو کوئی ناگواری کی حالت پیش آ جائے تو وہ خوش ہوتے ہیں) کیا ایسے لوگ محبت کرنے کے قابل ہیں؟

تفسیر درمنثور ص ۶۶ ج ۲ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ کا سببِ نزول یہ نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے تھے.......جن کا زمانۂ جاہلیت میں یہود مدینہ کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے تعلق تھا۔ اور بعض مواقع میں آپس میں ایک دوسرے کے حلیف بھی بن جاتے تھے اس پرانے تعلق کی وجہ سے قبولِ اسلام کے بعد بھی اُن مسلمانوں نے یہودیوں سے اپنا تعلق جاری رکھا۔ اللہ جل شانہٗ نے مسلمانوں کو ایسے تعلق سے منع فرمایا جس سے دشمن رازدار بن جائے (تجارت اور معاملات کی حد تک تو تعلق رکھنے کی گنجائش ہے لیکن ایسے تعلق کی کوئی گنجائش نہیں جس سے مسلمانوں کے راز دشمنوں پر کھلیں اور مسلمانوں کی اندرونی حالت سے دشمن باخبر ہو جائیں) آیت کے سببِ نزول سے معلوم ہوا کہ یہودیوں کے پاس بعض مسلمانوں کا آنا جانا تھا اس پر تنبیہ فرمائی اور یہودیوں کا ظاہر باطن سب بتا دیا چونکہ ہر زمانے کے کافروں کا مسلمانوں کے بارے میں ایک ہی حال ہے اس لئے ہم نے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر دی اور بتا دیا کہ کسی بھی کافر کو رازدار نہ بنائیں اور مسلمانوں کے بھید ان کو نہ پہنچ جائیں۔

یہودیوں کی مکاریاں اور دسیسہ کاریاں ابھی تک جاری ہیں۔ گو احوال اور ظروف کے اعتبار سے کچھ بدل گئی ہیں۔ نصاریٰ کی حکومتوں میں بھی یہودیوں کا بہت بڑا دخل ہے۔ وہ مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں کے افراد کو بھی استعمال کرتے ہیں اور نصرانی حکومتوں میں بھی ان کی خفیہ سازشیں اور پوشیدہ مکاریاں جاری ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ یہ جو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار اپنی تدبیروں میں مسلمانوں پر کیوں غالب ہیں اس کا جواب آیت کے آخیر میں دے دیا جو ہمیشہ کے لئے ناطق فیصلہ ہے اللہ جل شانہٗ نے فرمایا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (کہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی مکاری تمہیں کچھ بھی نقصان نہ دیں گی)

مسلمان صبر اور تقویٰ اختیار کریں دین پر جمیں گناہوں سے بچیں تو دشمن کی مکاریاں کچھ بھی ضرر نہ دیں گی۔ ہتھیاروں کا انتظام کرنا جیسا کہ دشمن کے دفاع کا سبب ہے اسی طرح سے صبر و تقویٰ بھی دفاع دشمن کا ایک ہتھیار ہے بلکہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جس سے اہلِ ایمان غافل رہتے ہیں، آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (کہ بلا شبہ اللہ کو تمہارے دشمنوں کا پوری طرح علم ہے وہ ان کو اپنی حکمت مشیت وارادہ کے مطابق سزا دے گا)۔

فائدہ...... کافروں کے میل ملاپ سے جو منع فرمایا۔ اور ان کو رازدار بنانے کی جو ممانعت فرمائی اس میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑی عبرت اور موعظت اور نصیحت ہے۔ کافروں کو دوست بناتے ہیں اور قرآن مجید میں جو واضح طور پر فرمایا ہے لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا اس سے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ لوگ تمہارے فساد اور بگاڑ میں ذرا بھی کوتاہی نہ کریں گے۔ یہود ونصاریٰ اور تمام مشرکین حتیٰ کہ وہ لوگ

جو اسلام کے مدعی ہیں لیکن اپنے عقائد کے اعتبار سے کافر ہیں (جن میں روافض پیش پیش ہیں) یہ سب اسلام اور اہلِ اسلام کے پورے اور پکے دشمن ہیں۔ ان سے دوستی کر کے اچھی اُمید رکھنا بیوقوفی ہے، اسلام کے عہدِ اوّل سے ہی دشمنانِ اسلام اپنی مکاریوں اور تدبیروں سے کبھی غافل نہیں ہوئے اسلام کو بڑھتا دیکھتے ہیں تو جلتے ہیں اگر ان کے بس میں ہوتا تو اسلام مکہ سے آگے نہ بڑھتا۔ لیکن یہ جلتے رہے اور اسلام بڑھتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ط

دشمن تو تباہ کرنے کی فکر میں ہے اور مسلمان ہیں کہ ان سے دوستی کرنے ہی کو ہنر سمجھ رہے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِکَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ط وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۲۱﴾

اور جب آپ اپنے گھر سے صبح کے وقت نکلے مسلمانوں کو قتال کرنے کے لئے مقامات بتا رہے تھے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا لا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا ط وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ بزدل ہو جائیں، اور اللہ ان کا ولی تھا اور اللہ پر بھروسہ کریں مؤمن بندے۔

غزوۂ احد کا تذکرہ

ان آیات میں غزوۂ اُحد کا تھوڑا سا ذکر ہے۔ پھر آئندہ رکوع میں اور اس کے بعد والے رکوع میں تفصیل سے اس غزوہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظّمہ میں جب اسلام کی دعوت دی تو مکہ کے مشرکین آپ کے دشمن ہو گئے۔ بڑی بڑی مشکلات سے گذرتے رہے دشواریاں پیش آتی رہیں۔ تیرہ سال تک محنت مجاہدہ کرتے ہوئے اور مشقت اٹھاتے ہوئے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اسلام کی دعوت دی لیکن مکہ معظّمہ کے مشرکوں نے آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور انصارِ مدینہ کی دعوت پر آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے، یہاں آ کر بھی مشرکین مکہ نے پیچھا نہ چھوڑا اور یہود مدینہ نے اندرونی خلفشار اور دشمنی کا سلسلہ جاری رکھا۔ منافقوں کا بھی ظہور ہوا یہ لوگ ظاہری طور پر اسلام کا نام لیتے تھے اور اندر سے کاٹ کرتے تھے۔ چونکہ یہودی بہت بڑے دشمن تھے اس لئے ان سے میل محبت کا تعلق رکھنے سے منع فرمایا جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہو چکا اُس وقت کے موجودہ دشمن یہودی تھے (جو مدینہ میں رہتے تھے) اور مشرکین مکہ بھی دشمن تھے ان سب سے میل ومحبت سے منع فرمایا اور ہمیشہ کے لئے تمام مسلمانوں کو یہ ممانعت کر دی گئی۔

مشرکین مکہ اپنی دشمنی کی وجہ سے ہجرت کے دوسرے سال بہت بھاری تعداد میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے چڑھ آئے اور مقامِ بدر میں فیصلہ کن جنگ ہوئی سب کی نظروں کے سامنے حق و باطل کا فیصلہ ہو گیا۔ غزوۂ بدر کا واقعہ کچھ اسی رکوع میں آنے والی آیات میں بیان فرمایا اور کچھ سورۂ آلِ عمران کے دوسرے رکوع میں گذر چکا اور تفصیل کے ساتھ سورۂ انفال کے پہلے اور دوسرے رکوع میں اور چھٹے اور ساتویں رکوع میں بیان فرمایا۔ ہم اس کو تفصیل سے سورۂ انفال کی تفسیر میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

غزوۂ اُحد کے موقعہ پر صحابۂ کرامؓ سے مشورہ...... ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ مشرکین مکہ کو غزوۂ بدر میں چونکہ بہت بڑی شکست ہوئی تھی جس میں تین سو تیرہ نہتے مسلمان دشمن کے تین گنا تعداد پر غالب آئے اور دشمن کے ستر آدمی مقتول ہوئے اور ستر کو قیدی بنا کر مدینہ منورہ لایا گیا اس لئے قریش مکہ کو بدلہ لینے کی بہت بڑی فکر تھی۔ لہٰذا آپس میں خوب زیادہ چندہ کیا اور قریش آپس میں مجتمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لئے مکہ معظّمہ سے نکلے قریش مکہ اپنے اموال اور فوج اور سپاہ کو لے کر مدینہ

منورہ پہنچے تو احد پہاڑ کے قریب پڑاؤ ڈال لیا آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ صحابہؓ سے مشورہ کیا آپ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے باہر نہ نکلیں لیکن وہ مسلمان جو گذشتہ سال غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم شہر سے باہر نکلیں گے اور احد جا کر ہی اُن سے لڑیں گے، ان حضرات کا اندازہ تھا کہ جس طرح مسلمان سالِ گذشتہ بدر میں دشمن کے مقابلہ میں فتح یاب ہو چکے ہیں اس مرتبہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور غالب ہوں گے یہ حضرات برابر اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باہر نکلنے پر آمادہ کرلیا آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری فرمالی۔ زرہ پہن لی اور خود (لوہے کی ٹوپی) اوڑھ لی آپ مشورہ کی وجہ سے آمادہ تو ہو گئے لیکن ہتھیار پہننے سے پہلے آپ نے فرمادیا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں ایک مضبوط زرہ کے اندر ہوں جس کی تعبیر میں نے یہ دی کہ اس سے مدینہ منورہ مراد ہے اور میں نے ایک خواب میں دیکھا کہ میری تلوار کچھ کند ہوگئی اس کی تعبیر میں نے یہ دی کہ تمہارے اندر کچھ شکستگی ہوگی اور میں نے یہ خواب دیکھا کہ ایک بیل کو ذبح کیا جا رہا ہے اور وہ بھاگ رہا ہے۔ مطلب اس خواب کے بیان کرنے کا یہ تھا کہ مدینہ منورہ ہی کے اندر رہنا چاہیئے اور یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانوں میں شکستگی ہوگی۔ بعد میں بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہماری تاریخ یہ ہے کہ جب کبھی اندر رہتے ہوئے جنگ لڑی ہے تو ہم کامیاب ہوئے ہیں اور جب کبھی باہر نکل کر جنگ کی ہے تو دشمن فتح یاب ہوا ہے۔ لہٰذا رائے یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے اندر ہی رہیں باہر نہ نکلیں جن حضرات نے خوب جماؤ کے ساتھ باہر نکلنے کا مشوہ دیا تھا بعد میں ان کو بھی ندامت ہوئی جب آپ کی خدمت میں دوسرا مشورہ پیش کیا اور عرض کیا کہ آپ کی جیسی رائے ہو آپ اسی پر عمل فرمائیں تو آپ نے فرمایا کسی نبی کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ سامانِ جنگ سے آراستہ ہو جائے اور دشمن کی طرف نکلنے کا حکم دیدے تو وہ قتال کئے بغیر واپس ہو جائے، میں نے تم کو پہلے اس امر کی دعوت دی تھی کہ مدینہ ہی میں رہیں لیکن تم لوگوں نے نہیں مانا پس اب اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے تو جماؤ کے ساتھ جنگ کرنا اور اللہ نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو۔

اسکے بعد آنحضرت سرورِ عالم ﷺ مسلمانوں کو لے کر احد کی طرف تشریف لے چلے اس وقت آپ کے ساتھ ایک ہزار کی نفری تھی اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اُحد جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ قیام کیا تو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ لہٰذا مسلمانوں کی تعداد سات سو رہ گئی۔ عبداللہ بن اُبی جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس ہو گیا تو انصار کے دو قبیلے بنی سلمہ اور بنی حارثہ کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہو گئی اور ان کے اندر بھی بزدلی کا اثر ہونے لگا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو استقامت دی اور یہ بھی لشکر اسلام کے ساتھ ٹھہر گئے اسی کو آیت بالا میں فرمایا: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (اور جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ بزدل ہو جائیں اور اللہ اُن کا ولی ہے اور اللہ پر بھروسہ کریں مؤمن بندے)۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے دامن میں پہنچ گئے اور وہاں ایک گھاٹی میں نزول فرمایا آپ نے اور آپ کے لشکر نے اُحد کی طرف پشت کر لی تا کہ احد پیچھے رہے اور دشمن سے احد کے سامنے میدان میں قتال کیا جا سکے وہیں ایک پہاڑی پر پچاس صحابہؓ کو مقرر فرما دیا اور اُن کا امیر حضرت عبداللہ بن جُبَیرؓ کو بنا دیا اور اِن حضرات سے فرمایا کہ تم لوگ اسی پہاڑ پر ثابت قدم رہنا۔ فتح ہو یا شکست تم یہاں سے مت ٹلنا۔ اگر تم یہ دیکھو کہ ہم کو پرندے بھی بوٹی بوٹی کر کے لے اڑیں تب بھی اس جگہ سے نہ جانا، ان حضرات کا کام یہ تھا کہ دشمن کے لشکر کو مقررہ پہاڑی سے تیر مارتے رہیں تا کہ وہ ان کی طرف سے گذرتے ہوئے لشکر اسلام پر حملہ نہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو زرہیں پہنے ہوئے تھے اور جھنڈا حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ نے اپنے

لشکر کی ترتیب دی اور ان کے ٹھکانے مقرر فرمائے۔ میمنہ اور میسرہ کی تعین فرمائی جس کو آیتِ بالا میں اس طرح بیان فرمایا وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (اور جب آپ اپنے گھر سے صبح کے وقت نکلے مسلمانوں کو قتال کے لئے مقامات بتا رہے تھے)۔

جب جنگ شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور فتحیاب فرمایا لیکن پھر یہ ہوا کہ جن پچاس افراد کو تیر اندازی کے لئے ایک پہاڑی پر مامور فرمادیا تھا انہوں نے جب فتح وظفر دیکھی تو ان میں آپس میں اختلاف ہوگیا اور اُن میں سے بعض صحابہؓ کہنے لگے کہ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے اب تو ہم فتح یاب ہو ہی چکے لہٰذا اس جگہ کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں اور بعض صحابہ نے فرمایا کہ جو بھی صورت ہو ہمیں جم کر رہنے کا حکم ہے، جماعت کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے کچھ ساتھی وہیں جمے رہے اور اکثر حضرات نے جگہ چھوڑ دی اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے۔ دشمن کے پاؤں اُکھڑ چکے تھے اور وہ شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کر چکا تھا لیکن جب اس نے دیکھا یہ تیر انداز پہاڑی سے اُتر چکے ہیں تو پلٹ کر پھر جنگ شروع کر دی، اب صورتِ حال بدل گئی اور مسلمانوں کو شکست ہوگئی۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور بلاشبہ اللہ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی، حالانکہ تم کمزور حالت میں تھے، پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار ہو۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

جب آپ مؤمنین سے فرما رہے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرما دے جو

مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ

اتارے گئے ہوں۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن تم پر فوراً آ پہنچے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ،

اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ

جن پر نشان لگے ہوئے ہوں گے۔ اور اللہ نے یہ مدد صرف اس لئے کی کہ تمہارے لئے بشارت ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن

بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

ہوں اور مدد نہیں ہے مگر صرف اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمت والا ہے۔ تاکہ کافروں میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا اُن کو

اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

ذلیل کر دے تو وہ واپس ہو جائیں محروم ہو کر۔

غزوۂ بدر کی فتح یابی کا تذکرہ

ابھی غزوۂ اُحد کا واقعہ مکمل نہیں ہوا، ان شاء اللہ تعالیٰ آگے مزید اس کا بیان ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ نے غزوۂ اُحد کا واقعہ تھوڑا سا بیان فرما کر

غزوۂ بدر کا تذکرہ فرمایا، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو خوب زیادہ بڑھ چڑھ کر فتح حاصل ہوئی اور اللہ جل شانہٗ نے مسلمانوں کی خوب مدد فرمائی تھی یہاں اس مدد کا تذکرہ ہے۔ غزوۂ بدر والی مدد اُحد کی حالیہ شکست کے مقابلہ میں سامنے رکھی جائے تو وہی زیادہ معلوم ہوگی کیونکہ بدر میں ستر کافر قتل ہوئے اور ستر کافروں کو قید کر کے مدینہ منورہ لے آئے۔ اور غزوۂ اُحد میں ستر صحابہؓ شہید ہوئے تھے لہٰذا اس فتح کے سامنے یہ شکست آدھی رہ جاتی ہے۔ اس طرح سے غزوۂ بدر کے تذکرہ میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑی تسلی ہے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (الآیہ) میں فرشتوں کے نزول کے وعدہ کا تذکرہ ہے غزوۂ بدر میں فرشتے آئے تھے انہوں نے جنگ میں بھی حصہ لیا اور مسلمانوں کو ہمتیں دلائیں اور اُن کو ثابت قدم رکھا۔ کیا غزوۂ احد میں بھی فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔ اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے، آیتِ بالا میں جو تین ہزار فرشتوں کے نزول کا تذکرہ ہے اس کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں غزوۂ بدر ہی کے فرشتوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ سورۂ انفال میں غزوۂ بدر میں ایک ہزار فرشتوں کے نزول کا تذکرہ فرمایا ہے اور یہ سب غزوۂ بدر سے متعلق ہے اوّل ایک ہزار پھر تین ہزار پھر پانچ ہزار فرشتوں کے نزول کا وعدہ فرمایا اور پانچ ہزار کا نزول ہوا۔

معالم التنزیل ص ۳۴۷ ج ۴ میں حضرت قتادہؓ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ مسلمانوں نے بدر میں صبر کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر پانچ ہزار فرشتے نازل فرمائے۔ نیز معالم التنزیل میں ضحاک اور عکرمہ کا قول یوں نقل کیا ہے کہ جس وعدہ کا اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں ذکر ہے یہ جنگ اُحد کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں سے بشرطِ صبر مدد کا وعدہ فرمایا تھا لیکن انہوں نے صبر نہیں کیا لہٰذا اُن کی مدد نہیں کی گئی۔ صاحبِ روح المعانی اسی قول کو معتمد بتاتے ہیں کہ یہ آیت جس میں پانچ ہزار فرشتوں کی آمد کا ذکر ہے۔ اس میں غزوۂ بدر ہی کا ذکر ہے۔

لفظ مُسَوِّمِيْنَ کا ترجمہ ''نشان لگے ہوئے'' سے کیا گیا ہے ان فرشتوں کے کیا نشان تھے اس کے بارے میں صاحب روح المعانی ص ۴۶ ج ۴ بحوالہ ابن اسحٰق اور طبرانی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں فرشتوں کی نشانی یہ تھی کہ وہ سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے جن کے شملے کمروں پر ڈالے ہوئے تھے اور غزوۂ حنین میں ان کے عمامے سرخ تھے، اس بارے میں اور بھی اقوال ہیں جو کتبِ تفسیر میں مذکور ہیں۔

مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے ...... پھر فرمایا وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (اور اللہ نے یہ مدد صرف اس لئے کی کہ تمہارے لئے بشارت ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر صرف اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمت والا ہے)۔

یہ آیت تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ غزوۂ بدر کے تذکرہ میں سورۂ انفال کے دوسرے رکوع کے ختم پر بھی ہے۔ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ فرشتوں کے ذریعہ جو مدد کی گئی وہ اس لئے ہے کہ تمہارے دل خوش ہو جائیں اور مطمئن ہو جائیں تاکہ دشمن کی کثرت کا خوف نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے وہ جس کی مدد فرمائے وہی منصور اور کامیاب ہوگا لوگوں کی آپس کی مدد کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ کی مدد کے سامنے ہر جماعت شکست خوردہ ہے اور ہر مدد بے حیثیت ہے۔ اللہ عزیز ہے یعنی غالب ہے اور حکیم بھی ہے۔ وہ حکمت کے موافق مدد فرماتا ہے اور بعض مرتبہ حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ مدد نہ کی جائے تو ایسا بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ غزوۂ احد میں ہوا۔

پھر فرمایا: وَلِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تم کو اس لئے غلبہ دیا کہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک فرما دے یا اُن میں سے بعض کو ذلیل اور خوار کر دے پھر وہ ناکام ہو کر لوٹ جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی

ہوا بدر میں ستر کافر مارے گئے جو اپنی جماعت کے رؤسا تھے اور ستر قید کر کے لائے گئے جو بچے تھے وہ ناکام ہو کر واپس ہو گئے اُن کی تعداد اور سامان نے کچھ کام نہ دیا اللہ کی مدد کی وجہ سے مسلمان غالب ہوئے حالانکہ وہ تھوڑے سے تھے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ

آپ کو کچھ بھی اختیار نہیں ہے، اللہ چاہے تو اُن کو توبہ کی توفیق دے یا اُن کو عذاب دے کیونکہ وہ ظلم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ ہی

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ

کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ مغفرت فرماتا ہے جس کی چاہے اور عذاب دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

غفور ہے رحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کو سب کچھ اختیار ہے

یہاں سے پھر غزوۂ اُحد کے واقعہ کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اسباب النزول ص ۱۱۱ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانت شہید ہو گئے اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا تھا۔ چہرۂ مبارک سے خون بہہ رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے کہ وہ قوم کیسے کامیاب ہو گی جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون سے رنگ دیا اس حال میں کہ وہ انہیں اُن کے رب کی طرف بُلا رہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (الآیۃ) نازل فرمائی (یعنی تمام امور اللہ کی طرف مفوض ہیں اور سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آپ کو صبر کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو گی تو ان کو ایمان کی توفیق دے کر ان کی توبہ قبول فرمالے گا اور اگر چاہے گا تو اُن کو عذاب دے گا۔ کفر پر مریں گے، عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جو لوگ اُحد میں مکہ معظّمہ سے لڑنے کے لئے آئے تھے اُن میں سے بعض بعد میں مسلمان ہو گئے جن میں ابو سفیان بھی تھے۔ صفوان ابن اُمیہ بھی تھے ابو سفیان کی بیوی ہندہ بھی مسلمان ہو گئی جس نے آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا اور وحشی بن حرب بھی مسلمان ہوئے جنہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

اے ایمان والو مت کھاؤ سود چند در چند بڑھا کر اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم

تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ

کامیاب ہو جاؤ۔ اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی تاکہ

تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ لا

تم پر رحم کیا جائے۔ اور جلدی آگے بڑھو مغفرت کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جنت کی طرف جس کا عرض ایسا ہے جیسے تمام آسمان اور زمین،

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٣﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ

وہ تیار کی گئی ہے متقیوں کے لئے ۔ جو خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں، اور جو ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو، اور جو لوگوں کو

عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣٤﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

معاف کرنے والے ہیں، اور اللہ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے جب کوئی برا کام کیا یا اپنی جانوں پر ظلم کیا

ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ۚ وَلَمْ يُصِرُّوْا

تو اللہ کو یاد کیا اور اپنے گناہوں کی مغفرت چاہی اور گناہوں کو کون بخشے گا سوائے اللہ کے اور انہوں نے اپنے کئے

عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ

پر اصرار نہیں کیا وہ جانتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ مغفرت ہے اُن کے رب کی طرف سے اور باغ ہیں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ

نیچے جاری ہیں نہریں اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ تم سے پہلے بہت سے طریقے گذر چکے ہیں

سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ

لہٰذا تم چلو زمین میں پھر دیکھو کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔ یہ بیان ہے لوگوں کے لئے

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾

اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے متقیوں کے لئے۔

سود کھانے کی ممانعت اور مغفرت خداوندی کی طرف بڑھنے میں جلدی کرنے کا حکم

ابھی غزوۂ اُحد کا واقعہ پورا ذکر نہیں ہوا اس کا بہت سا حصہ باقی ہے۔ درمیان میں بعض گناہوں سے خصوصی طور پر بچنے کا حکم فرمایا اور تقویٰ کا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم فرمایا اور بعض طاعات کی ترغیب دی اور اہلِ طاعت کے اخروی بدلہ کا تذکرہ فرمایا۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں سے جو حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تھی۔ جس کا ذکر آیت شریفہ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا میں فرمایا ہے یہاں عمومی طور پر گناہوں سے بچنے اور طاعت میں لگنے کا حکم فرمایا تا کہ معلوم ہو جائے کہ گناہ عمومی طور پر مصیبتوں کو لانے والے ہیں اور طاعت مصائب کو دور کرنے کا سبب ہیں اور آخرت میں مغفرت اور جنت ملنے کا ذریعہ ہیں۔ خاص کر سود لینے کی ممانعت فرمائی۔ یہ گناہ ایسا ہے جو انسان کو خالص دنیادار بنا دیتا ہے۔ سودخواروں کے دلوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا باقی نہیں رہتا مال زیادہ ہو جانا ہی ان کا وظیفہ بن جاتا ہے۔ اور مخلوق پر رحم کھانے کا ان میں جذبہ رہتا ہی نہیں، یہ جو فرمایا ہے کہ چند در چند سود نہ کھاؤ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ تھوڑا بہت سود کھانا جائز ہے۔ کیونکہ سود کا ایک درہم لینا بھی حرام ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ سود کا ایک درہم بھی کوئی شخص کھاتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ سود کا ہے تو وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۶ از احمد و دارقطنی)

جو لوگ سود پر رقمیں دیتے ہیں عموماً ان کے اصل مال سے سود کا مال بڑھ جاتا ہے اور ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ماہانہ مقررہ فیصد پر رقم قرض دیتے ہیں پھر جب وقت پر ادا نہیں ہوتا تو اصل اور سود دونوں پر سود لگا دیتے ہیں اور جب تک اصل رقم اور سود ادا نہ ہوگا ہر ماہ سود بڑھتا ہی رہے گا۔ اصل پر اور سود پر برابر سود کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس طرح اضعافاً مضاعفہ (چند در چند گناہ) ہوتا چلا جاتا ہے۔ سود خواروں میں جو طریقہ مروج ہے آیت کریمہ میں اس کا ذکر فرما دیا ہے۔ کوئی سود خوار فاسق یہ نہ سمجھ لے کہ تھوڑا بہت سود ہو تو جائز ہے (العیاذ باللہ من ذالک) سود خواری کا خصوصی ذکر اس جگہ غزوہ کے ذیل میں بیان فرمانا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ سود خوار کا جہاد میں حوصلہ نہیں ہو سکتا وہ اپنے مال کی وجہ سے ایمانی تقاضے پورا کرنے سے عاجز رہے گا سود کے بارے میں جو وعیدیں حدیث شریف میں وارد ہوئیں ان کا تذکرہ آیتِ کریمہ اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ کے ذیل میں ہو چکا ہے اور بھی معلومات متعلقہ سود وہاں لکھی جا چکی ہیں۔ (انوار البیان ص ۳۷۹ ج ۱)

سود سے بچنے کا حکم دینے کے بعد تقویٰ کا حکم فرمایا اور اس کو کامیابی کا سبب بتایا پھر دوزخ کی آگ سے بچنے کا حکم دیا۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے ہر گناہ دوزخ کی طرف کھینچنے والا ہے۔ گناہوں سے بچنا ہی دوزخ سے بچنا ہے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ یعنی دوزخ کی آگ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ اصل مقام کافروں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کو گناہوں میں مبتلا ہو کر اس مقام میں جانا نہایت شرم کی بات ہے دشمن کی جگہ تو یوں بھی نہیں جانا چاہئے چہ جائیکہ عذاب کی جگہ پہنچنے کی راہ ہموار کی جائے اور عذاب بھی معمولی نہیں بلکہ سخت در سخت ہے۔ اُن مؤمن مخلص بندوں کی حرص کریں جو جنت ہی کے کاموں میں لگے رہتے ہیں اور جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے جیسا کہ انہیں آیات میں مذکور ہے، تقویٰ اختیار کر کے جنت میں جائیں جو مؤمنین کا اصل مقام ہے گناہوں میں مبتلا ہو کر دوسری راہ کیوں اختیار کریں۔

پھر ارشاد فرمایا: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم لانے والی چیز اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔

پھر ارشاد فرمایا: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (الآیۃ) کہ اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جلدی جلدی آگے بڑھو مسارعت اور مقابلہ کی چیز مغفرت اور جنت ہے، اعمالِ صالحہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

جنت کا طول وعرض ...... ساتھ ہی جنت کی وسعت کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کہ اس جنت کا چوڑاؤ ایسا ہے جیسے تمام آسمانوں اور زمین کی وسعت ہے، انسانوں کی نظر کے سامنے چونکہ آسمان اور زمین ہی طول وعرض کے اعتبار سے سب سے بڑی چیزیں ہیں اس لئے جنت کی وسعت بتانے کے لئے تقریب الی الفہم کے طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ جنت کی چوڑائی ایسی ہے جیسی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے۔ صاحب روح المعانی ص ۵۶ ج ۴ نے فرمایا **کنایة عن غایة السعة بما هو فی تصور السامعین** حقیقت میں جنت آسمانوں اور زمینوں سے بہت بڑی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے آخری جنتی کو جنت میں اتنی بڑی جگہ ملے گی جیسی یہ دنیا ہے اور اس جیسی دس گنی اور مزید ملے گی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۹۲ ج ۲)

جس خالق نے آسمان وزمین پیدا فرمائے اس کی قدرت میں یہ بھی ہے کہ ان سے بڑی مخلوق پیدا فرما دے۔ لوگ آسمان پر تو پہنچے ہی نہیں زمین کے لمبے چوڑے سفر کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں تو فلاں چیز نہیں ملی جس کا قرآن وحدیث میں ذکر ہے، اوّل تو اسی کی کوئی دلیل نہیں کہ ہر جگہ پہنچ چکے ہیں اور اگر زمین کو ہر جگہ ٹٹول بھی لیا تو اس زمین کے علاوہ اور چھ زمینیں ہیں اور سات آسمان ہیں ان سب کے

درمیان خلا ہے وہاں تک تو پہنچے ہی نہیں اور سورج تک پہنچنے کا تصور ہی نہیں کر سکتے پھر یہ سوال کرنا کہ جنت دوزخ کہاں ہے سراپا بے وقوفی ہے جو چیز آسمان اور زمین سے باہر ہو وہ آسمانوں میں اور زمین میں کیسے ملے گی۔

صاحب معالم التنزیل ص ۳۵۱ ج ۱ لکھتے ہیں کہ جنت کے عرض کو بیان فرمایا ہے اور معلوم ہے کہ طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے جب اُس کا عرض اتنا بڑا ہے تو طول کتنا بڑا ہوگا، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ جنت آسمان میں ہے یا زمین میں۔ انہوں نے فرمایا کہ کون سی زمین اور کون سا آسمان ہے جس میں جنت کے سما جانے کی گنجائش ہو؟ عرض کیا گیا پھر کہاں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور عرش کے نیچے ہے حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ یہ جانتے تھے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے عرش کے نیچے ہے اور دوزخ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ (انتھی بحذف)۔

متقیوں کی بعض صفات

پھر فرمایا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے اس کے بعد متقیوں کی بعض صفات بیان فرمائیں۔

اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنا......اوّل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ یہ حضرات خرچ کرتے ہیں تکلیف میں بھی اور خوشی میں بھی) اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا بہت بڑی سعادت ہے۔ ہر حال میں خرچ کرتے رہنا چاہیئے، ایک ہزار روپے میں جو ایک روپے کی حیثیت مالدار کے لئے ہے وہی حیثیت ایک روپے میں سے ایک پیسے کی غریب آدمی کیلئے ہے۔ جن کو اللہ کے لئے خرچ کرنے کا ذوق ہے وہ تنگدستی میں بھی خرچ کرتے ہیں فراخی میں بھی دُکھ تکلیف میں بھی اور خوشی میں بھی اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی حاجت کو روک کر دوسروں کی حاجت پوری کرتے ہیں جس کی تعریف فرماتے ہوئے سورۂ حشر میں فرمایا ہے وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (کہ وہ اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اُن کو خود حاجت ہو) فی سبیل اللہ خرچ کرنا مالداروں ہی کا حصہ نہیں غریبوں کا بھی حصہ ہے، سخاوت ایک مزاج ہے جس کا تعلق مالداری سے نہیں جسے سخاوت کا مزاج نصیب ہو جائے وہ ہر حال میں خرچ کرتا ہے۔

غصہ پینے کی فضیلت......دوم یہ فرمایا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہ یہ حضرات اپنے غصے کو ضبط کرنے والے ہیں یعنی جب غصہ آتا ہے تو اس کو پی جاتے ہیں اور غصہ کے مقتضٰی پر عمل نہیں کرتے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے (بلکہ) پہلوان وہی ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو پالے۔ (رواہ البخاری ص ۹۰۳ ج ۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ نے اللہ کے نزدیک کوئی گھونٹ اس گھونٹ سے زیادہ فضیلت والا نہیں پیا جو غصہ والا گھونٹ ہو جسے وہ اللہ کی رضامندی کے لئے ضبط کر جائے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۴ از مسند احمد) سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ غصہ شیطان سے ہے اور بیشک شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی ہی بجھاتا ہے سو تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے تو وضو کرے، اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اس طرح غصہ چلا جائے تو بہتر ہے ورنہ لیٹ جائے۔ (رواہ الترمذی کما فی المشکوٰۃ ص ۴۳۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنی زبان کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے اور جس نے اپنے غصے کو روک لیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روک لیں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۴)

معاف کرنے کی فضیلت......سوم یہ فرمایا: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ کہ یہ لوگ لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ معاف کرنا بہت فضیلت والی صفت ہے اور یہ فضیلت ہر قسم کے مظالم کے معاف کرنے کو شامل ہے کسی آدمی نے مال مار لیا ہو حق روک لیا ہو مار پیٹ کی ہو غیبت کی ہو بہتان لگایا ہو ان سب کے معاف کرنے میں اجر و ثواب ہے اور معاف کرنے کا بلند مرتبہ یہ ہے کہ قدرت ہوتے ہوئے معاف کردے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے رب آپ کے نزدیک آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ باعزت کون ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو قدرت ہوتے ہوئے معاف کردے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۴ از بیہقی فی شعب الایمان)

محسنین اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں...... چہارم یوں فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے) المحسنین محسن کی جمع ہے جس کا مصدر احسان ہے اور احسان ہر کام کو خوبی کے ساتھ انجام دینے کو کہا جاتا ہے۔ عبادات کا احسان تو حدیث جبریل میں بیان فرمادیا کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے جیسے تو اس کو دیکھ رہا ہے سو اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے) اور بندوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں احسان یہ ہے کہ ان کے ساتھ جو معاملات پیش آئیں اُن میں خوبی اور عمدگی اختیار کرے۔ مثلاً قرضوں کے تقاضوں میں نرمی اختیار کرے بڑوں کی عزت کرے چھوٹوں پر رحم کرے۔ یتیموں، مسکینوں اور ضعیفوں کی خدمت کرے ضرورت مندوں کو کھلائے پلائے، پہنائے اور دوسروں کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

حضرت زین العابدینؒ کا ایک واقعہ...... صاحب روح المعانی نے یہاں ایک واقعہ لکھا ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام زین العابدین کو اُن کی ایک باندی وضو کرا رہی تھی اُس کے ہاتھ سے لوٹا گر گیا جس سے اُن کا چہرہ زخمی ہو گیا انہوں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ پڑھ دیا اس پر انہوں نے کہا کہ میں نے اپنا غصہ ضبط کر لیا پھر اس نے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ پڑھا آپ نے اس کو معاف کردیا۔ پھر اس نے وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ پڑھا اس پر انہوں نے فرمایا اچھا جا تو اللہ کے لئے آزاد ہے۔

توبہ و استغفار کی فضیلت...... پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ (الآیہ) اس میں اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جن سے کوئی فحش گناہ سرزد ہو جائے یا کسی بھی گناہ کے ذریعہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو استغفار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اس کے بعد اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں اور اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ اس میں توبہ کی ایک بڑی شرط کی طرف رہنمائی فرمائی اور وہ یہ کہ جب گناہ ہو جائے اور توبہ کرے تو توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے گناہ پر اصرار نہ کرے زبان سے توبہ توبہ کرے اور گناہ کے کام بھی جاری رہیں تو اس طرح سے توبہ نہیں ہوتی۔ اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

سبحہ برکف توبہ برلب دل پراز ذوق گناہ   معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما

اور حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا کہ اِسْتِغْفَارُنَا يَحْتَاجُ اِلَى اسْتِغْفَارٍ كَثِيْرٍ (ذکرہ ابن الجزری فی الحصن الحصین) یعنی ہمارا استغفار ایسا ہے اس کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہے کیونکہ وہ سچے دل سے نہیں ہوتا غفلت کے ساتھ جو استغفار ہے وہ مقامِ بندگی کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی گناہوں کا بخشنے والا نہیں ہے...... درمیان میں فرمایا وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (کہ اللہ کے سوا وہ کون ہے جو گناہوں کو معاف فرمائے) اس میں جہاں مؤمن بندوں کو توجہ دلائی ہے کہ اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوں وہاں اس میں نصاریٰ کے عقیدہ کی بھی تردید ہے کہ جو کچھ گناہ کریں گے اتوار کے دن گرجا میں جا کر اپنے پوپ سے معاف کرالیں گے، عام گناہوں کو تو وہ بغیر کسی درخواست کے معاف کر دیتا ہے اور بعض گناہ ایسے ہیں جن کے بارے میں انہوں نے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ پوپ کے کان میں کہہ دے کہ ہم نے یہ گناہ کیا اس پر وہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ کیسی بیہودہ بات ہے جو عقل سے بھی باہر ہے کہ انسان گناہ کرے اللہ کا اور اس کی بخشش کر دے کوئی انسان۔ نعوذ باللہ من اباطیلھم و جھلھم۔

نیک بندوں کا ثواب...... پھر نیک بندوں کی جزاء بیان فرمائی کہ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (الآیۃ) یعنی ان کے اعمال کا بدلہ مغفرت ہے ان کے رب کی طرف سے اور جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ پھر اس بدلہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (کیا ہی خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا)

امم سابقہ سے عبرت...... پھر فرمایا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ (الآیۃ) (یعنی تم سے پہلے بہت سے طریقے گذر چکے ہیں۔ لہٰذا تم چلو زمین میں پھر دیکھو کیا انجام ہے جھٹلانے والوں کا) مطلب یہ ہے کہ تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات گذر چکے ہیں جنہوں نے اللہ کے نبیوں کو جھٹلایا اور جھٹلانے والے انجام کے اعتبار سے مغلوب اور معذب اور ہلاک ہوئے دنیا میں چل پھر کر ان کا انجام اپنی نظروں سے دیکھ لو، کتنی قومیں تھیں کہاں کہاں آباد تھیں اُن کی بربادی کے نشانات ابھی تک دنیا میں موجود ہیں جو آنکھوں والوں کو عبرت کے لئے کافی ہیں۔ (قال صاحب الروح ص ۶۵ ج۴ ای وقائع فی الامم المکذبۃ اجراھا اللہ تعالیٰ حسب عادتہٖ)

اگر وقتی طور پر تمہارے دشمنوں کو کسی طرح کی ظاہری فتح حاصل ہوگئی تو اس سے گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ تمہیں پھر فتح یابی سے سرفراز فرمائے گا۔ (قال فی معالم التنزیل ص ۳۵۴ ج ۱ یقول اللہ عزوجل وانا امھلھم واستدرجھم حتی یبلغ اجلی الذی اجلت فی نصرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأولیاءہ واھلاک عدائہ) (معالم التنزیل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: میں انہیں مہلت اور ڈھیل دے رہا ہوں تا کہ میرا وہ مقرر کردہ وقت آجائے جو میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہ کی مدد اور آپ کے دشمنوں کی ہلاکت کے لئے مقرر کیا ہے)

آخر میں فرمایا هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (الآیۃ) (کہ یہ لوگوں کے لئے بیان ہے اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے) یعنی جو کچھ اوپر بیان ہوا۔ یہ واضح بیان ہے لوگوں کے لئے لوگوں کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو جنگ کرنے کے لئے آئے تھے اور عام مکذبین بھی، آخر میں وھدی و موعظۃ للمتقین فرما کر یہ بتادیا کہ اہلِ تقویٰ ہی واقعی طور پر ہدایت اور عبرت اور نصیحت حاصل کرتے ہیں (قال صاحب روح المعانی ص۶۶ ج۳ والمراد بیان لجمیع النّاس لکن المنتفع بہ المتقون لانھم یھتدون بہ وینتفعون بوعظہ). (صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: مراد یہ ہے کہ بیان تو تمام انسانیت کے لئے ہے لیکن اس سے نفع متقی اٹھاتے ہیں کیونکہ وہی اس سے راہنمائی لیتے ہیں اور اس کی نصیحت سے نفع مند ہوتے ہیں)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور ہمت نہ ہارو اور غمگین نہ ہو اور تم ہی بلند ہو گے اگر تم مؤمن ہو۔

تم ہی بلند ہو گے اگر مؤمن ہو

اسباب النزول ص ۱۲۰ میں علامہ واحدی حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ اُحد میں صحابہ کو شکست ہوگئی تو خالد بن ولید (جو اس وقت مشرکین کے لشکر میں تھے) مشرکین کے لشکر کو لے کر آگے بڑھے ارادہ یہ تھا کہ پہاڑ کے اوپر سے چڑھ کر پھر حملہ کر دیا جائے۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یوں دعا کی۔ اَللّٰھُمَّ لَا یَعْلُوْنَ عَلَیْنَا اَللّٰھُمَّ لَا قُوَّۃَ لَنَا اِلَّا بِاللّٰہِ اَللّٰھُمَّ لَیْسَ یَعْبُدُکَ بِھٰذِہِ الْبَلْدَۃِ غَیْرَ ھٰؤُلَاءِ النَّفَر (اے اللہ! یہ ہم پر بلند نہ ہو جائیں اے اللہ ہمارے پاس کوئی قوت نہیں سوائے آپ کی قوت کے اس شہر میں ان چند آدمیوں کے علاوہ آپ کی عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور چند مسلمان جو تیر انداز تھے پہاڑ پر چڑھ گئے جنہوں نے مشرکین کی گھوڑے سوار جماعت کو تیروں کا نشانہ بنایا جس سے وہ شکست خوردہ ہو کر واپس چلے گئے۔ مسلمانوں کی ہمت ٹوٹی ہوئی تھی پھر بھی انہوں نے ہمت کر لی اور دشمن کو تیروں کی بوچھاڑ سے مار بھگایا۔

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ ؕ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ

اگر تم کو زخم پہنچ گیا تو تمہاری مقابل قوم کو اس جیسا زخم پہنچ چکا ہے اور یہ دن ہیں جنہیں ہم باری باری بدلتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان

وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَآءَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِیُمَحِّصَ

اور تاکہ اللہ جان لے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے، اور بنالے تم میں سے شہادت پانے والے، اور اللہ پسند نہیں فرماتا ظالموں کو اور تاکہ پاک

اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ

صاف کرے ایمان والوں کو، اور مٹا دے کافروں کو۔ کیا تم نے یہ خیال کیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے اُن

الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ کُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ

لوگوں کو جو جہاد کرنے والے تم میں سے، اور تاکہ وہ جان لے ثابت قدم رہنے والوں کو۔ اور اس میں شک نہیں کہ تم لوگ موت کے سامنے آنے سے پہلے

قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْہُ ۪ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْہُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع

اس کی آرزو کرتے تھے، سو اب تم نے موت کو دیکھ لیا اس حال میں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

مسلمانوں کو تسلی

ان آیات میں اوّل تو مسلمانوں کو تسلی دی اور فرمایا کہ اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے تمہارے دشمنوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچ چکا ہے (کہ بدر میں ان کے بھی ستر آدمی مارے جا چکے ہیں) پھر یہ بیان فرمایا کہ ہم اہلِ زمانہ کا حال یکساں نہیں رکھتے یہ ایام باری باری سے بدلتے رہتے ہیں کبھی کسی کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی اس کے مقابل دشمن کو غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسی معمول کے مطابق پچھلے سال تمہارے دشمن مغلوب ہو گئے اور اس سال انہوں نے غلبہ پالیا اور تم کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا۔

واقعہ اُحد کی حکمتیں......اس کے بعد واقعہ اُحد کی بعض حکمتیں بیان فرمائیں۔ **پہلی حکمت**: اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ جان لے کہ ایمان والے کون ہیں، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مصیبت کے وقت امتحان ہو جاتا ہے اور مخلص اور غیر مخلص کی پہچان ہو جاتی ہے، چنانچہ منافقین وہ معرکہ پیش آنے سے پہلے ہی واپس ہو گئے اور جو اہلِ ایمان تھے شکست کھا کر بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے (اللہ تعالیٰ کو علم تو ہر بات اور ہر واقعہ کا پہلے ہی سے ہے لیکن ایک علم وہ ہے جو قبل الوقوع ہے اور ایک علم وہ ہے جو بعد الوقوع ہے اس قسم کے مواقع میں وہ علم مراد ہوتا ہے جو بعد الوقوع ہو کیونکہ یہ علم ہونا کہ اب یہ واقعہ ہو چکا یہ وقوع کے بعد ہی ہو سکتا ہے اس کو خوب سمجھ لیں)۔ **دوسری حکمت**: یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کو تم میں سے شہید بنانا منظور تھا، شہادت بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی قیمت اور عظمت وہی جانتے ہیں جن کا قرآن وحدیث پر ایمان ہے۔

تیسری حکمت: یہ بیان فرمائی کہ اللہ کو یہ منظور تھا کہ ایمان والوں کو پاک وصاف کر دے، کیونکہ مصیبت پر صبر کرنے اور تکلیفیں جھیلنے سے اخلاق اور اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے۔

چوتھی حکمت: یہ بیان فرمائی کہ اللہ کو یہ منظور تھا کہ کافروں کو مٹا دے وہ اس مرتبہ غالب ہوئے تو آئندہ بھی اسی گمان سے چڑھ کر آئیں گے کہ ہمیں غلبہ ہو گا اور مسلمانوں کے مقابلہ میں آ کر ہلاک ہوں گے۔

صاحب روح المعانی ص ۷۰ ج ۴ فرماتے ہیں کہ یہاں کافرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اُحد کے موقع پر جنگ کرنے کے لئے آئے پھر کفر پر مصر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سب کو ختم کر دیا اور ہلاک فرما دیا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر جب کبھی غالب ہو جاتے ہیں تو شیطان ان کو ورغلاتا ہے اور ان کے دلوں میں یہ بات ڈالتا ہے کہ برابر کفر پر مُصر رہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک فرما دیتا ہے اور ہمیشہ کے لئے وہ عذابِ نار میں داخل ہو جاتے ہیں۔

کیا جنت میں بغیر جہاد اور صبر کے داخل ہو جاؤ گے؟......پھر ارشاد فرمایا اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (الآیۃ) (کیا تم نے یہ خیال کیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کا علم نہ ہو جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو نہ جان لے جو صبر کرنے والے ہیں) مطلب یہ ہے کہ تم جنت کے طلب گار ہو جنت حاصل کرنے کے لئے محنت، مشقت، جہاد اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے جنت میں جانے کی آرزو رکھنے والوں کو ان سب چیزوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور حسبِ موقع ان چیزوں میں اپنی جانوں کو لگا دینا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ وہ تم کو تکالیف میں مبتلا کرے پھر وہ تمہاری جہاد والی محنت کو اور صبر کو ان کے وقوع کے بعد جان لے کہ تم نے واقعی جہاد کیا اور صبر سے کام لیا۔

شہادت کی آرزو کرنے والوں سے خطاب......آخر میں فرمایا وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (اور اس میں شک نہیں کہ تم لوگ موت کے سامنے آنے سے پہلے اس کی آرزو کرتے تھے سو اب تم نے موت کو دیکھ لیا اس حال میں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے) اس میں اُن حضراتِ صحابہؓ سے خطاب ہے جو غزوۂ بدر میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے۔ بدر میں جنگ کی صورت پیش آ جائے گی یہ بات اُن کے ذہن میں نہ تھی اس لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے جب وہاں معرکہ پیش آیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت نازل ہوئی جس میں بعض صحابہؓ شہید بھی ہوئے تو یہ پیچھے رہ جانے والے شریک نہ ہونے پر نادم ہوئے یہ حضرات جنگ کی آرزو کرنے لگے اور کہنے لگے کہ کاش ہم بھی اُن حضرات کے ساتھ مقتول ہو جاتے جو بدر میں مقتول ہوئے اور ہم بھی شہادت کا درجہ پا لیتے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں شرکت کا موقعہ دیا اور مسلمانوں کی فتح کے بعد

صورتِ حال پلٹ گئی اور مشرکین بھاگنے کے بعد اُلٹ کر واپس آ کر حملہ آور ہوئے جس سے مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تو ان لوگوں نے بھی ثابت قدمی کا ثبوت نہ دیا جو شہادت کے پیشِ نظر غزوہ میں شریک ہوئے تھے۔ (روح المعانی ص ۷۱ ج ۴)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى

اور محمد صرف رسول ہیں، اُن سے پہلے رسول گذر چکے ہیں، تو کیا اُن کو موت آ جائے یا مقتول ہو جائیں تو تم

اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے ؟ اور جو شخص اُلٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہ دے گا، اور اللہ عنقریب شکر گذاروں

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا

کو ثواب دے گا۔ اور کسی جان کو موت نہیں آ سکتی مگر اللہ کے حکم سے اس طرح پر کہ اُس کا وقت مقرر کیا ہوا ہے، اور جو شخص دنیا کے بدلہ کا ارادہ کرے گا ہم اس میں سے

نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اس کو دے دیں گے اور جو شخص آخرت کے ثواب کا ارادہ کرے گا ہم اس میں سے اُسے دے دیں گے اور عنقریب ہم شکر گذاروں کو جزا دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پر پریشان ہونے والوں کو تنبیہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ حضرات صحابہؓ کو ابتداءً غزوۂ اُحد میں فتح حاصل ہوگئی لیکن جب فتح یابی دیکھ کر اُن تیر انداز حضرات نے اپنی جگہ چھوڑ دی جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پہاڑی پر مقرر فرما دیا تھا تو مشرکین نے واپس ہو کر حملہ کیا اور ستر مسلمان شہید ہو گئے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلبؓ بھی تھے اور وہ حضرات بھی جو پہاڑی پر استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس موقعہ میں تکلیف پہنچی آپؐ کے دندان مبارک میں ایک پتھر آ کر لگا جس سے سامنے کے بعض دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ اسی موقع پر ایک مشرک نے آپؐ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا حضرت مصعب بن عمیرؓ وہاں موجود تھے جن کے ہاتھ میں جھنڈا تھا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا لیکن خود شہید ہو گئے دشمن نے یہ سمجھا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو اس نے پکار کر کہا میں نے محمد (ﷺ) کو شہید کر دیا اور بعض اصحاب سیر لکھتے ہیں کہ ابلیس نے یہ اعلان کیا۔ یہ آواز سن کر مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی اور ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اس موقعہ پر بعض منافقین نے یوں کہا کہ محمد تو مقتول ہو گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) لہٰذا اب اپنے پہلے دین کو اختیار کر لو۔ منافقین تو پہلے ہی دین اسلام پر نہ تھے ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان کہتے تھے اب جب ایسا موقعہ آ گیا تو مخلص مسلمانوں کو بھی دین اسلام سے پھر جانے کی دعوت دینے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارنا شروع کیا۔ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ (کہ اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ) چنانچہ تیس آدمی آپ کے آس پاس جمع ہو گئے اور انہوں نے آپ کی حفاظت کی حتیٰ کہ مشرکین کو دفع کر دیا۔ اس موقعہ پر بعض صحابہؓ نے بہت ہی دلیری سے کام کیا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اتنی تیر اندازی کی کہ اُن کی کمان کا ایک حصہ مڑ گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دست مبارک سے ان کو تیر دیتے رہے اور فرماتے رہے کہ اے سعد تیر پھینکو تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اس موقعہ پر حضرت طلحہؓ

نے اپنے ہاتھوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچایا ان کا ایک ہاتھ تیر لگنے سے بالکل بیکار ہو گیا۔ حضرت قتادہ کی آنکھ حلقے سے نکل کر ان کے رخسار پر گر پڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھ کو دوبارہ حلقے میں لگا دیا وہ پہلے سے بھی اور زیادہ اچھی ہو گئی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور صحابہؓ جمع ہونے شروع ہوئے تو سب سے پہلے آپ کو حضرت کعب بن مالکؓ نے پہچانا اُن کی نظر آپ کی مبارک آنکھوں پر پڑ گئی دیکھا کہ آپکی مبارک آنکھیں خود کے نیچے سے پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہیں۔ انہوں نے بلند آواز سے پکارا کہ خوشخبری سن لو۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ آپ نے خاموش رہنے کو فرمایا (شاید اس میں یہ مصلحت ہو کہ دشمن ارادہ بدل کر واپس نہ آجائے) حضرت کعب کی آواز سن کر صحابہؓ کی ایک جماعت آپؐ کے پاس پہنچ گئی آپ نے ان کو ملامت کی کہ تم لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی وہ کہنے لگے یا رسول اللہ! ہمارے باپ دادے اور بیٹے آپ پر قربان ہوں ہم نے جو خبر سنی تھی کہ آپ شہید کر دیئے گئے اس سے ہمارے دلوں پر رعب چھا گیا اور ہم بھاگ نکلے اس پر آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (الآیۃ) نازل ہوئی۔

جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اُڑا دی گئی تو حضرت انس ابن نضرؓ نے صحابہ سے کہا کہ آپ لوگ کیوں بیٹھے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اب ہم کیا کریں انہوں نے کہا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہ کر ہی کیا کرو گے قوموا فموتوا علی ما مات علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاؤ اور اسی دین پر مر جاؤ جس دین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دے دی اس کے بعد انہوں نے دشمن کی طرف رخ کیا اور جنگ کرتے کرتے شہید ہو گئے۔

حضرت ثابت بن دحداح نے بھی حضرات صحابہؓ سے اسی قسم کا خطاب کیا اور فرمایا اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قُتِلَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ فَقَاتِلُوْا عَنْ دِيْنِكُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ مُظْهِرُكُمْ وَ نَاصِرُكُمْ (یعنی اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو اللہ تو ہمیشہ زندہ ہے اُسے موت نہیں آئے گی لہٰذا اپنے دین کی طرف سے لڑائی لڑو اللہ تمہیں پاک صاف فرمائے گا اور تمہاری مدد فرمائے گا) کچھ انصاری ان کے کہنے سے جمع ہو گئے اور انہوں نے لڑنا شروع کر دیا حتیٰ کہ خالد بن ولید نے نیزہ مار کر اُن کو شہید کر دیا۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک مہاجر صحابی کا ایک انصاری پر گذر ہوا جو اپنے خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے۔ مہاجر صحابی نے اُن سے کہا کیا تمہیں پتہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے اس انصاری نے اسی حالت میں جواب دیا اگر وہ شہید ہو گئے تو انہوں نے رسالت کا کام پورا کر دیا (اب ہمارا کام باقی ہے) لہٰذا اپنے دین کی طرف سے قتال کرو حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اسی طرح کا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں بھیجا اور فرمایا کہ ان کو کہیں دیکھ لو تو میرا اسلام کہنا۔ حضرت زید بن ثابتؓ اُن کو مقتولین میں تلاش کر رہے تھے تو دیکھا کہ اُن میں زندگی کے دو چار سانس رہ گئے ہیں اور ستر زخم ان کے جسم میں آچکے ہیں۔ حضرت زید نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیا اور ان سے کہا کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اللہ کے رسول پر سلام اور تم پر سلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دینا کہ جنت کی خوشبو پا رہا ہوں اور میری قوم انصار سے کہنا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک دشمن پہنچ گئے اور تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھتی رہی (یعنی تم میں سے کوئی بھی زندہ رہ گیا) تو تمہارے لئے اللہ کے نزدیک کوئی عذر نہ ہوگا۔ یہ کہا اور اُن کی روح پرواز کر گئی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر اُڑی جس سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے تو اس وقت ابوسفیان نے (جو اس وقت مشرکین کے لشکر کا قائد تھا) پہاڑ کے نیچے والے حصے سے آواز دی اُعْلُ هُبَلْ (ہبل مشرکین کا ایک بُت تھا) مذکورہ الفاظ میں اس کا

نعرہ لگایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم اس کا جواب نہ دیں آپؐ نے فرمایا ہاں جواب دو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے جواب میں یہ نعرہ لگایا کہ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ (کہ اللہ سب سے بالا اور برتر ہے اور بزرگ تر ہے) پھر ابوسفیان نے کہا لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ (کہ ہمارے لئے عزّیٰ ہے اور تمہارے لئے عزّیٰ نہیں) عزّیٰ بھی ان لوگوں کا بت تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا یوں جواب دو اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ (اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں) چنانچہ یہ جواب دے دیا گیا۔

پھر ابوسفیان نے پوچھا کہ فلاں فلاں کہاں ہیں۔ اس کا یہ سوال حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں تھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا یہ رسول اللہ ہیں اور یہ ابوبکر ہیں اور میں بھی موجود ہوں۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ بدر کے دن کا بدلہ ہے اور یہ بھی کہا کہ دن بدلتے رہتے ہیں کبھی کسی کی فتح ہوتی ہے اور کبھی کسی کی، لڑائی برابر سرابر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ برابر نہیں ہے ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمہارے مقتولین دوزخ میں ہیں۔ ابوسفیان نے کہا کہ اگر تم یہ عقیدہ رکھتے ہو تو ہم تو بالکل ہی برباد ہیں۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ افراد رہ گئے تھے (بعد میں دیگر افراد بھی حاضر ہو گئے تھے) ان کے علاوہ جو صحابہؓ تھے ان میں سے کچھ لوگ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے اور کچھ پہاڑی پر چڑھ گئے آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت حارث بن صمہ اور دیگر چند صحابہ تھے۔ (رضی اللہ عنہم) آپ ان حضرات کے ساتھ گھاٹی کی طرف روانہ ہو گئے جہاں جنگ سے پہلے قیام تھا۔

مشرک ابی بن خلف کا قتل...... جب آپ گھاٹی میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تو اُبی بن خلف مشرک نے آپ کو دیکھ لیا اور کہا کہ میں محمد (ﷺ) کو قتل کردوں گا۔ یہ بات وہ پہلے سے کہا کرتا تھا جب مکہ مکرمہ میں تھا۔ آپ نے فرمایا میں تجھے قتل کردوں گا۔ یہ شخص پوری طرح لوہے کے ہتھیاروں سے مسلح تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہنسلی نظر آ گئی آپ نے اس کو ایک نیزہ مار دیا جس کی وجہ سے وہ گھوڑے سے گر پڑا آپ کا نیزہ لگنے سے اسے بظاہر معمولی سی خراش آ گئی تھی لیکن وہ گائے کی طرح آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے اور کہنے لگے تو اتنا کیوں چیختا ہے ذرا سی ہی تو خراش آئی ہے، وہ کہنے لگا کہ مرکر رہوں گا کیونکہ محمد (ﷺ) نے کہا تھا کہ میں اُبی کو قتل کروں گا۔ پھر کہنے لگا کہ یہ تکلیف جو مجھے ہو رہی ہے اگر سب اہل حجاز کو ہو جائے تو سب مر جائیں واپس ہوتے ہوئے رابغ میں مر گیا اور جہنم رسید ہوا۔ (صحیح بخاری، تفسیر روح المعانی، تفسیر ابن کثیر)

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے پورے غزوات میں یہی ایک شخص مقتول ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ شخص مبتلا ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو یا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو یا جس نے والدین میں سے کسی کو قتل کیا ہو اور تصویر بنانے والوں کو بھی سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا اور اس عالم کو بھی سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہ کیا ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۷)

آیت بالا میں اللہ جل شانہٗ نے ارشاد یہ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے عہدہ اور مرتبہ کے اعتبار سے رسول ہی تو ہیں۔ تم نے یہ کیسے اپنے پاس سے تجویز کرلیا کہ اُن کو موت نہیں آئے گی۔ یہ تو خالقِ کائنات جل مجدہ کی شان ہے کہ وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پھر مسلمانوں کو سرزنش فرمائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف بلانے والے تھے۔ معبود نہیں تھے۔ معبود تو اللہ تعالیٰ

کی ذات ہے۔ اپنی دعوت کا کام کر کے شرک چھڑا کر اور تم کو توحید پر لگا کر اور اللہ کی عبادت کی تعلیم دے کر اگر اپنی طبعی موت سے اس دنیا سے تشریف لے گئے یا مقتول ہو گئے تو کیا تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے کیا دین حق کو چھوڑ کر پھر دینِ باطل کو اختیار کر لو گے۔ دین تو اللہ کا بھیجا ہوا ہے جس کا دین ہے وہ تو ہمیشہ زندہ ہے۔ ہمیشہ اسی کی عبادت کرتے رہو۔ ان باتوں اور ان وسوسوں کا کیا مقام ہے جو اس وقت تمہارے نفسوں میں ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خطاب...... غزوۂ اُحد کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ مقتول ہوئے تھے نہ آپؐ کو موت طبعی طاری ہوئی تھی لیکن جس دن آپؐ کو واقعی موت آئی تھی۔ اُس دن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بہت زیادہ حیرانی پریشانی ہوئی۔ حضرت عمرؓ جیسے جری اور سمجھدار شخص بھی کہنے لگے کہ اللہ کی قسم آپ کو موت نہیں آئی آپ تو اپنے رب سے ملاقات کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں جیسے حضرت موسیٰ چالیس رات کے لیے اپنے رب کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تھے، پھر واپس آ گئے، اسی طرح آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس تشریف لے آئیں گے جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت آ گئی اُن کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ اے عمر ٹھہرو خاموش ہو جاؤ، اس کے بعد انہوں نے اللہ جل شانہٗ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا کہ اے لوگو! تم میں سے جو کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو وہ سمجھ لے کہ اُن کو موت آ چکی ہے اور جو کوئی شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے زندہ ہے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کو موت نہیں آئے گی۔ اس کے بعد انہوں نے آیتِ بالا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (آخر تک) تلاوت فرمائی۔ حضرات صحابہؓ اور حضرت عمرؓ کے ذہنوں میں اس وقت یہ آیت نہ تھی۔ گویا کہ انہیں اس کا علم ہی نہ تھا۔ آیات شریفہ سن کر سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا یقین ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی فرمایا کہ جب میں نے یہ آیت سن لی تو میں نے بھی جان لیا کہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موت آ گئی ہے۔ (البدایہ والنہایہ)

آیتِ شریفہ میں اس سرزنش کے بعد کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو جائیں یا مقتول ہو جائیں تو کیا تم پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔ یوں فرمایا وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا کہ جو شخص پچھلے پاؤں پلٹ جائے اور دین حق کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دے گا۔ اس میں یہ ارشاد فرمایا کہ جو کوئی شخص دینِ حق پر ہے یعنی دین اسلام قبول کئے ہوئے ہے۔ وہ ہرگز یہ نہ سمجھے کہ میرے ایمان و اسلام سے اور میری عبادت سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نفع ہے اگر میں اس دین کو چھوڑ دوں اور اللہ کی عبادت نہ کروں تو اللہ کا کوئی نقصان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے برتر اور بالا ہے کہ اُسے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچے۔ البتہ جو کوئی شخص موحد مؤمن مسلم ہے۔ اللہ کی عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ اس کو اس کے ایمان کی اور اعمالِ صالحہ کی جزا دے گا۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ میں خود مؤمنین کا اپنا نفع ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ الشاکرین سے الشابتین علی دین الاسلام مراد ہیں۔ اسلام پر ثابت قدمی اُسی وقت ہوتی ہے جب اس کی حقانیت کا یقین ہو۔ اور اسلام پر ثابت رہنا شکر ہے اور اس دین کو چھوڑ دینا کفرانِ نعمت ہے (اور بہت بڑا کفران وہ ہے جو کفر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے)

ہر شخص کو اَجل مقرر پر موت آئے گی...... پھر فرمایا وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (الآیۃ) (یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے) یعنی جس کو بھی موت آئے گی اللہ کے حکم سے آئے گی اور اجل مقرر کے مطابق آ جائے گی جس کی جو اَجل یعنی موت کا وقت مقرر ہے اس سے پہلے موت نہیں آ سکتی۔ اور اس وقت سے ٹل بھی نہیں سکتی جو اس کے لئے مقرر ہے۔

صاحب روح المعانی ص ۵۷ ج ۴ فرماتے ہیں کہ اس میں جہاد کی ترغیب ہے اور قتل کے ڈر سے جہاد کو چھوڑ دینے پر ملامت کی گئی ہے۔ پھر فرماتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی جو خبر سنی اس میں استبعاد کی کوئی بات نہیں۔ اُن کو بھی اللہ کے حکم سے موت آئے گی۔ جیسا کہ سب جانوں کو موت آنا ہے۔ اگر ان کی موت ہو ہی گئی جو اللہ کے حکم سے ہے تو ان کے دین کو چھوڑنے کا کیا جواز ہے۔

پھر ارشاد فرمایا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (الآیۃ) کہ جو شخص اپنے عمل سے دنیا کا بدلہ چاہے گا۔ مثلاً جہاد سے مالِ غنیمت کا طالب ہو تو ہم اس میں سے اُسے دے دیں گے۔ (مگر ضروری نہیں کہ دے ہی دیں) کما فی سورۃ بنی اسرائیل عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ اور جو شخص آخرت کے ثواب کا ارادہ کرے گا تو ہم اُس میں سے دے دیں گے۔ پھر فرمایا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ اور عنقریب ہم شکر گذاروں کو بدلہ دیں گے۔ اس میں ان حضرات پر تعریض ہے جنہوں نے غنیمت کے مالوں کی طرف توجہ کر لی اور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد میں جو مصلحت تھی اس پر غور نہ کیا اور ان حضرات کی تعریف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

دورِ حاضر کے مقررین اور اصحابِ جرائد کو تنبیہ ...... اللہ جل شانہٗ کے افعال میں بڑی بڑی حکمتیں ہوتی ہیں۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر اُڑ جانے سے مسلمانوں کے پریشان اور سراسیمہ ہونے میں پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے عتاب نازل ہونے میں (کہ اگر محمد ﷺ مر جائیں یا مقتول ہو جائیں کیا تم اللہ کا دین چھوڑ دو گے اور واپس دینِ باطل کو اختیار کر لو گے)۔ ہمیشہ کے لئے سبق دے دیا گیا کہ دین اللہ جل شانہٗ کا ہے اسی کی عبادت کرنا وہ ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسی آیت کو سامنے رکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس ﷺ کی وفات کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو خاموش کیا اور اسی سے تسلی دی اور آئندہ رہتی دنیا کے تمام مسلمانوں کو سبق دے دیا کہ کسی بھی شخصیت کی وفات پا جانے پر اگر طبعی رنج ہو تو ہو لیکن عقلی طور پر اس بات کے سمجھنے اور جاننے اور ماننے کی ضرورت ہے کہ جس خادمِ دین مفتی، مرشد، محدث کی وفات ہوئی ہے اس کی موت ہونا تو ضروری ہی تھا رنج کر کے اور آنسو بہا کر بیٹھ رہنا کوئی سمجھ داری کی بات نہیں جس محنت اور دعوت اور اعمالِ صالحہ پر انہوں نے زندگی گزاری اسی پر زندہ رہیں اور باقی زندگی گذاریں نہ عقلی طور پر رنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے نہ جاہلانہ دُہائی کا موقعہ ہے کہ ہائے اب کیا ہوگا۔ ہمارے حضرت کی وفات ہوگئی اور نہ اعمالِ صالحہ میں اور دعوتِ حق میں کچا پڑنے کی ضرورت ہے عالم برحق اور مرشد برحق نے جو کچھ کیا اسی کو کرتے رہیں، جو گیا وہ تو دوبارہ دنیا میں آنے والا نہیں اور یہ بات کہ آگے کیا ہوگا اس کے بارے میں سوچ لیں کہ جب یہ نہیں تھے تو دین کس طرح قائم تھا آخر ان کے بھی مشائخ تھے جن کی موت کا رونا لے کر بیٹھے ہیں۔ جب دین اللہ کا ہے اور اللہ حی اور باقی ہے تو اس کے دین پر چلتے رہو آنے والے آتے رہیں گے اور جانے والے جاتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں اصحابِ جرائد، مدیرانِ صحف و مجلّات تعزیتی جلسوں کے مقررین بڑی بیباکی سے ایسے کلمے کہہ گذرتے ہیں جن سے کفر تک عائد ہو جاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ قدرت کے سفاک ہاتھوں نے (العیاذ باللہ) اس شخص کو ہم سے ایسے موقعہ پر چھین لیا جبکہ اس کی ہم کو بہت زیادہ ضرورت تھی، کوئی لکھتا ہے کہ اب اس جیسا کوئی شخص کہاں پیدا ہوگا۔ کوئی کہتا ہے کہ حضرت ہم کو بے سہارا چھوڑ گئے۔ یتیم کر گئے۔ (گویا کہ وہ اجل مقرر سے پہلے اور اذن الٰہی کے بغیر خود سے چلے گئے) .... (العیاذ باللہ)

آیتِ بالا میں اس قسم کے ماتمی کلمات کہنے والوں کا جواب ہے۔ اللہ کی قضا اور قدر پر راضی رہو اور اعمالِ صالحہ ادا کرتے رہو جب تک اللہ چاہے گا۔ اس کا دین دنیا میں باقی رہے گا کسی شیخ اور محدث اور مفتی اور پیر و مرشد کے مرنے جینے پر دین کی بقاء موقوف نہیں، واقعہ اُحد

سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سالانہ ماتم کرنے والوں کی بھی تردید ہوگئی۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے بعد سات سال تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے آپ نے اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کوئی ماتم نہیں کیا اور ماتم کرنا ٹسوے بہانا یوں بھی زندہ قوم کو زیب ہی نہیں دیتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ

اور بہت سے نبی گذرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، پھر جو مصیبتیں اُن کو اللہ کی راہ میں پہنچیں اُن کی

اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ

وجہ سے ہمت ہارے نہ کمزور پڑے اور نہ عاجز ہوئے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اور اُن کا قول اس کے سوا کچھ نہیں تھا

اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا

کہ انہوں نے یوں کہا کہ اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو، اور ہمارے کاموں میں حد سے آگے بڑھ جانے کو اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ، اور کافر

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ

قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما، سو اللہ نے اُن کو دنیا کا بدلہ دے دیا اور آخرت کا عمدہ بدلہ دیا

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور اللہ پسند فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں کو۔

انبیاء سابقین علیہم السلام کے ساتھیوں کے مجاہدات اور اُن کی دعائیں

دنیا میں عہد قدیم سے ایمان اور کفر کی جنگ رہی ہے۔ سیدنا حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کی اولاد میں جب سے اہل کفر کا وجود ہوا اُسی وقت سے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا آپس میں مقابلہ اور مقاتلہ ہوتا رہا ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جو ساتھی تھے اُن کو اپنے اپنے زمانہ میں کافروں سے جنگ کرنی پڑی۔ دشمن کے مقابلہ میں ان حضرات نے جانوں کی بازی لگائی۔ ان آیات میں اُن حضرات کی تعریف فرمائی کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کرنے میں نہ ہمت ہاری نہ سستی دکھائی نہ دشمن کے سامنے عاجزی ظاہر کی۔ صبر و ثبات اور استقامت کے ساتھ جنگ کرتے رہے، عمل تو ان کا یہ تھا اور قول یہ تھا کہ اللہ جل شانہٗ سے گناہوں کی مغفرت مانگتے رہے اور اپنے کاموں میں جو کچھ اسراف ہوا یعنی حدود سے آگے بڑھ گئے اسکی بھی مغفرت طلب کی، اور کافروں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا یعنی فتح اور ظفر نصیب فرمائی اور آخرت میں بدلہ بھی دیا جو اچھا بدلہ ہے یعنی اللہ کی رضا اور جنت۔

اُمتِ محمدیہ کے لئے ان تمام امور میں عبرت اور نصیحت ہے کہ تم سے پہلی اُمتیں اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ دشمنوں کے ساتھ جم کر لڑیں وہ مصائب اور شدائد سے نہ گھبرائے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اللہ والوں کو ایسی مشکلات پیش آتی ہی ہیں۔ دشمن اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں جنگ کرنی پڑتی ہے اپنے آدمی مقتول بھی ہوتے ہیں۔ ہر صورت حال پر قابو پانے کو

ع ۱۵ ۶

اپنا وطیرہ بناؤ اور جم کر لڑو، سستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔ دشمن کے سامنے عاجز نہ ہو جاؤ۔

امم سابقہ کی جو دعائیں نقل فرمائی ہیں کہ اے اللہ ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما اور ہمارے حد سے آگے بڑھ جانے کو معاف فرما اور کافروں کے مقابلہ میں ہم کو ثابت قدمی عطا فرما۔ اس میں اس بات کی بھی تعلیم ہے کہ نیکیاں کرتے ہوئے بھی استغفار کی ضرورت ہے کیونکہ مالک الملک جل جلالہٗ کی شان اقدس کے لائق بندوں سے عمل ہو ہی نہیں سکتا ادائے حق میں کوتاہی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا جو حضرات جہاد میں یا کسی بھی نیک عمل میں مشغول ہوں۔ استغفار بھی ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔ استغفار سے گناہ بھی معاف ہوں گے اور اعمال میں بھی جو کوتاہیاں ہوں گی اُن کی بھی تلافی ہوگی اور بعض مرتبہ کسی نیک کام میں لگنے سے جو دوسرے نیک کام چھوٹ جاتے ہیں۔ اور اس طرح حدود سے آگے بڑھ جانے کی صورت بن جاتی ہے۔ جس کو اسراف سے تعبیر فرمایا استغفار سے اس کی بھی تلافی ہوگی۔ کافروں کے مقابلہ میں ثبات قدمی کی دُعا کرنے میں اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اپنے آلات اور اسباب اور تعداد پر کبھی گھمنڈ نہ کریں۔ اللہ ہی سے مدد مانگیں اور اُسی کی طرف متوجہ رہیں۔

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا

اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے کفر اختیار کیا تو وہ تم کو اُلٹے پاؤں پھیر دیں گے جس کی وجہ سے تم

خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا

نا کام ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے۔ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس وجہ سے کہ انہوں

الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

نے ایسی چیز کو اللہ کا شریک بنایا جس کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ ظلم کرنے والوں کا بُرا ٹھکانہ ہے۔

کافروں کی اطاعت نہ کرو

اوپر تین آیتوں کا ترجمہ مذکور ہے۔ پہلی آیت میں کافروں کی بات ماننے پر زجر و توبیخ ہے اور اس کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو وہ تم کو واپس اُلٹے پاؤں لوٹا دیں گے۔ یعنی پھر سے دین شرک میں داخل کر لیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تم بُری طرح سے نا کام ہو جاؤ گے، دنیا کی خیر اور آخرت کی سعادت دونوں سے محرومی ہوگی۔ پھر دوسری آیت میں فرمایا: بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اسی کی فرمانبرداری کرو اور اُسی سے مدد مانگو اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے۔ صاحب روح المعانی ص ۸۷ ج ۴ لکھتے ہیں کہ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے منافقین مراد ہیں۔ جب شکست ہوگئی تو انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف واپس ہو جاؤ اور اُن کے دین میں داخل ہو جاؤ۔ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی یعنی مشرکین مکہ جو غزوۂ احد میں جنگ کرنے کے لئے آئے تھے وہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے عاجزی ظاہر نہ کرو اور اُن سے امان طلب نہ کرو (کیونکہ اس موقعہ پر بعض لوگوں نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اب ہتھیار ڈال دیں اور دشمنوں سے امان طلب کریں)۔ اور یہود و نصاریٰ بھی مراد ہو سکتے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اُن کے مشوروں میں اُن کو مخلص نہ جانو اُن کی باتیں نہ مانو۔ ابن جریج نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ قرآن مجید کا طرزِ بیان عام ہے جس میں ہمیشہ کے لئے تمام مسلمانوں کو کافروں کی

باتیں اور ان کے مشورے ماننے کی ممانعت فرمادی ہے۔ مؤمن کا کام ہے کہ اللہ ہی سے مانگے اُسی کو اپنا مددگار سمجھے کافروں کے سامنے نہ جھکے اور نہ اُن کو خیر خواہ سمجھے۔

کافروں کے قلوب میں رعب ڈالنے کا وعدہ...... سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (الآیۃ) صاحب روح المعانی اس کا سبب نزول بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ جب ابوسفیان اور اس کے ساتھی غزوۂ احد کے بعد مکہ مکرمہ کی طرف چل دیئے اور کچھ دور پہنچ گئے تو نادم ہوئے اور کہنے لگے کہ تم لوگوں نے بُرا کیا، چاہیئے تھا کہ اُن لوگوں کو (یعنی سب مسلمانوں کو) قتل کر کے آتے یہاں تک کہ اُن میں اُس کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہتا جو اِدھر اُدھر نکلا ہوا ہو لہٰذا واپس چلو اور اُن سب کو ختم کر کے آ ؤ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا اور وہیں سے واپس چلے گئے البتہ ایک اعرابی کو اس بات پر کچھ دینا کیا کہ تو مدینہ منورہ پہنچے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو یہ کہہ دینا کہ ہم نے اُن کے لئے ایسی ایسی تیاری کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر دے دی آپ نے مقام حمراء الاسد تک اپنے صحابہ کو بھیجا تا کہ اُن کا پیچھا کریں وہ لوگ جا چکے تھے۔ کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کا ذکر فرمایا کہ ہم اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیں گے اور رعب ڈالنے کا سبب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا: بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطَانًا کہ ہمارے اس رعب ڈالنے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا جس کی کوئی دلیل اور سند اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ دنیا میں ان کے دلوں میں رعب ڈال کر مؤمنین کو محفوظ رکھا اور اُن کا آخرت کا عذاب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا وَمَاْوٰھُمُ النَّارُ کہ اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ اور وہ ظالموں کا بُرا ٹھکانہ ہے۔ آیت کے اندازِ بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ شرک باللہ رعب واقع ہونے کا سبب ہے اور یہ آزمائی ہوئی بات ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب فارس کی طرف رخ کیا تو وہاں کے مشرکین آتش پرست بڑی بھاری تعداد میں اُن کے مقابلہ میں آتے تھے۔ پھر جب معرکہ شروع ہوتا تھا۔ ان کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے اور بچے کھچے بے تحاشا بھاگ جاتے تھے۔ صلیبی جنگوں میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ ہندوستان پر جب مسلمانوں نے حملے کئے تو مشرکین رعب کھا گئے۔ مقتول ہوئے اور راہِ فرار اختیار کی اور فاتحین نے اُن کے ملک پر توحید کے جھنڈے لہرا دیئے۔ شرک کے مزاج میں مرعوبیت اور توحید کے مزاج میں شجاعت دلیری اور بہادری ہے۔

دینِ حق وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو...... مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطَانًا میں یہ بات بتائی ہے کہ زندگی گذارنے کا طریق کار وہی صحیح ہے جس کی اللہ کی طرف سے سند اور دلیل ہو انسان فطری طور پر اس بات کو مانتا ہے کہ میں مخلوق ہوں اور میرا کوئی خالق اور مالک اور معبود ہے لیکن جنہوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا دامن نہیں پکڑا انہوں نے اپنے خالق اور مالک حقیقی کی عبادت میں شرک کی ملاوٹ کر دی وہ اپنے خالق کی بھی عبادت کرتے ہیں اور مخلوق کی بھی عبادت کرتے ہیں اور بہت سے لوگوں نے اپنے خالق اور مالک کے بارے میں ایسے عقیدے تجویز کر لئے ہیں جو گمراہی پر مبنی ہیں۔ عقائد اور عبادات کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ تجویز کر لینا بالکل گمراہی ہے اسلام کے علاوہ دنیا میں جو مذاہب معروف ہیں اور اُن میں جو عبادات کے طریقے رائج ہیں ان کے ماننے والے اپنے عقائد اور اعمال کے بارے میں کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ان کے یہ عقائد اور اعمال انہیں ان کے خالق کی طرف سے بتائے گئے ہیں یہ عقائد اور اعمال ان کے مذہب کے بانیوں نے یا بعد کے لوگوں نے بنائے ہیں اور بتائے ہیں جو عقیدہ اور عمل خالق کی طرف سے نہ بتایا گیا ہو اس کو زندگی کا مشغلہ بنانا اور اس پر نجات کی اُمید رکھنا عقل وفہم کی رو سے کسی بھی طرح صحیح نہیں۔ ایسے عقائد اور

اعمال کے اختیار کرنے کی وجہ سے یہ اُمید رکھنا کہ موت کے بعد نجات ہوگی اور عذاب سے محفوظ ہوں گے بہت بڑی نادانی ہے جو عقل و دانش کے سراسر خلاف ہے ان سب لوگوں سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہے کہ خالق کی ذات وصفات کے بارے میں جو عقائد رکھتے ہو اور جن طریقوں سے تم اس کی عبادت کرتے ہو کیا تمہارے پاس اس کی کوئی سند ہے کہ خداوند قدوس جل مجدہٗ نے تمہیں یہ عقائد اور اعمال بتائے ہیں۔ مشہور ادیان میں نصاریٰ کا دین بھی ہے نصاریٰ کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہو کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں یا یہ فرمایا ہو کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے اور میرے قتل کے بعد جو شخص یہ عقیدہ رکھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو قتل کرا کر اُن سب لوگوں کو نجات دے دی جوان کو اللہ کا بیٹا مانیں۔ اُن میں سے کوئی بات بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہیں فرمائی یہ سب باتیں عرصۂ دراز کے بعد تجویز کی گئیں، ہر مذہب والا اس بات پر غور کرے کہ میں جس دین پر ہوں میرے پاس اس کی کیا دلیل اور سند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دین پر چلنے کا حکم دیا ہے اور اس پر چل کر آخرت میں میری نجات ہوگی۔ قرآن شریف نے واضح طور پر بتادیا کہ ہر عقیدہ اور ہر عبادت وہی صحیح ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہو اور جو سند صحیح کے ساتھ بندہ تک پہنچی ہو سب کو معلوم ہے کہ دین اسلام کے علاوہ کوئی دین ایسا نہیں ہے جو اس بات کی سند پیش کر سکے کہ میرا دین اللہ کی طرف سے ہے۔ پس جب ان لوگوں کے پاس اپنے اپنے دین کے صحیح ہونے کی سند خالق و مالک جل مجدہٗ کی طرف سے نہیں ہے تو ہر شخص اس دین پر آئے جو دین اللہ جل شانہٗ نے بھیجا ہے اور تمام انسانوں کی نجات اسی پر رکھی ہے اور وہ دین اسلام ہے۔ ادامنا اللہ علیہ و اماتنا علیہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰىٓ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ

اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا جو اس نے تم سے کیا تھا جس وقت تم دشمنوں کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور حکم کے بارے میں تم نے

فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا

آپس میں اختلاف کیا اور تم نے اسکے بعد نافرمانی کی جبکہ تمہیں اللہ نے وہ چیز دکھا دی جسے تم محبوب رکھتے تھے، تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

اور بعض آخرت کے طلب گار تھے، پھر اللہ نے تم کو دشمنوں کی طرف سے پھیر دیا تاکہ تم کو آزمائے، اور البتہ تحقیق اللہ نے تم کو معاف فرما دیا اور اللہ

ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ

مؤمنین پر بڑے فضل والا ہے۔ جب تم دور چلے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے تو رسول تم کو پکار رہے تھے،

اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا

تمہارے پیچھے سے، پس اللہ نے تمہیں غم کی پاداش میں غم دیدیا تاکہ تم غمگین نہ ہو اس چیز پر جو تم سے جاتی رہے اور نہ اس مصیبت پر جو تم کو پہنچ جائے اور اللہ تمہارے سب کاموں سے

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ

باخبر ہے۔ پھر اللہ نے غم کے بعد تم پر امن کو نازل فرما دیا جو اُونگھ کی صورت میں تھی جو تم میں سے ایک جماعت پر چھائی ہوئی تھی، اور ایک جماعت

قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا

ایسی تھی جن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی یہ لوگ اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیت والا خیال کر رہے تھے، یوں کہہ رہے تھے کہ کیا ہمارے ہاتھ میں

مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ

بھی کچھ اختیار ہے، آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ سب اختیار اللہ ہی کو ہے، یہ لوگ اپنے نفسوں میں ایسی بات چھپا رہے ہیں جسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تھے،

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ

یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اگر ہمارا کچھ بھی اختیار چلتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، آپ فرما دیجئے اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی بلاشبہ وہ لوگ جن کے بارے میں

الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ

قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا اپنی اُن جگہوں کیلئے نکل کھڑے ہوتے جہاں جہاں وہ قتل ہو کر گرے اور تاکہ اللہ آزمائے جو تمہارے سینوں میں ہے اور تاکہ اسکو

مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ

صاف کرے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ بے شک تم میں سے جو لوگ اُس دن پشت پھیر کر چلے گئے جس دن دونوں جماعتیں

الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ

آپس میں مقابل ہوئی تھیں بات یہی ہے کہ اُن کو شیطان نے لغزش دے دی بعض ایسے اعمال کے سبب جو انہوں نے کئے، اور البتہ تحقیق اللہ نے ان کو معاف فرما دیا

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

بے شک اللہ بخشنے والا ہے حلم والا ہے۔

ع ۱۶/۷

غزوۂ احد میں شکست کے اسباب کیا تھے؟

ان آیات میں مسلمانوں کی اس عارضی شکست کے اسباب بیان فرمائے جو انہیں غزوۂ اُحد میں پیش آ گئی تھی اور ابتداً جو مسلمانوں کو غلبہ ہوا تھا اس کا بھی تذکرہ فرمایا، نیز مسلمانوں کو غم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ایک آرام اور چین کی صورت پیش آ گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر اونگھ کا غلبہ فرما دیا تھا تاکہ غم غلط ہو جائے اس کا بھی تذکرہ فرمایا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کے ایک دستہ کو ایک پہاڑی پر مقرر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے مت ٹلنا اور یہ کہ ہم برابر غالب ہی رہیں گے جب تک کہ تم اپنی جگہ پر ثابت قدم رہو گے۔ اس وعدہ کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا تھا مسلمانوں کو ابتداء میں فتح حاصل ہوئی اور وہ دشمنوں کو باذن اللہ قتل کرتے رہے یہاں تک کہ مشرکین کی عورتیں جن میں ہندہ بنت عتبہ بھی تھیں بھاگنے لگیں اپنے سامان میں سے قلیل یا کثیر اُٹھا کر چلنے کا بھی ان کو ہوش نہ رہا۔ لیکن فتح دیکھنے کے بعد (جو مسلمانوں کو محبوب تھی) تیر انداز حضرات (جو پہاڑی پر مقرر تھے) نے اوّل تو آپس میں اختلاف کیا کہ ہم کیا کریں اختلاف کرنا ہی صحیح نہ تھا کیونکہ یہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھا (اس کو تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ سے تعبیر فرمایا) اور پھر اکثر افراد پہاڑی کو چھوڑ کر چلے ہی

گئے اور مالِ غنیمت لینے لگے (اس کو وَعَصَیْتُمْ مِّنْ م بَعْدِ مَآ اَرٰکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ میں بیان فرمایا) اور مالِ غنیمت کے لوٹنے میں مشغول ہونے کے بارے میں مِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا فرمایا، جب دشمنوں نے پہاڑی خالی دیکھی تو پلٹ کر حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کی ہمت نہ رہی اور دشمنوں کا دفاع نہ کر سکے اس کو ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْهُمْ سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس میں تمہاری آزمائش مقصود تھی لِیَبْتَلِیَکُمْ ساتھ ہی معافی کا اعلان بھی فرمادیا وَلَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔

کافروں کے پلٹ کر حملہ کرنے سے جو مسلمانوں میں انتشار ہوا اور میدان چھوڑ کر چل دیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ پر بھی متوجہ نہیں ہوئے (مگر چند افراد) تو اللہ تعالیٰ نے غم کے بدلہ غم پہنچایا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تم نے تکلیف پہنچائی تھی اس تکلیف کے بدلہ تم کو تکلیف پہنچائی گئی۔ اس کو اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّام بِغَمٍّ میں بیان فرمایا ہے۔

تُصْعِدُوْنَ بابِ افعال سے ہے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس کا معنی ذِھَاب اور ابعاد فی الارض ہے بعض حضرات نے اس کے مشہور معنی بھی لئے ہیں اور گھوڑوں کا چڑھنا مراد لیا ہے۔

غَمًّام بِغَمٍّ کی ایک تفسیر تو وہی ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی، اور اس کے علاوہ مفسرین کے اور بھی چند اقوال اس کی تفسیر کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ ایک غم تو مقتول اور مجروح ہونے اور مشرکین کے غالب ہونے کی وجہ سے تھا اور دوسرا غم وہ تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اُڑ جانے سے ہوا (اس صورت میں ب مصاحبت کے لئے ہوگی) مزید اقوال جاننے کے لئے روح المعانی کا مطالعہ کیا جائے۔

غم پہنچنے میں بھی حکمت ...... پھر فرمایا لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ (تاکہ تم غمگین نہ ہو اس چیز پر جو تم سے جاتی رہے اور نہ اس مصیبت پر جو تم کو پہنچ جائے) مطلب یہ ہے کہ جو غم تم کو پہنچا اس میں یہ حکمت ہے کہ تم میں پختگی ہو جائے اور آئندہ جب کبھی کوئی مشکل درپیش ہو مثلاً کوئی چیز جاتی رہے یا کوئی مصیبت آپڑے تو تم صبر کرو۔ صبر کی عادت ہو جانے سے ہر مشکل آسانی سے گذر جائے گی، اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے صبر سے اللہ کی مدد نازل ہوتی ہے۔

غم غلط کرنے کے لئے نیند کا غلبہ ...... مسلمانوں کو جو تکلیف پہنچ گئی اور شکست کا جو سامنا ہوا (جو بہت بڑا غم تھا) اس غم کو غلط کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اُونگھ بھیج دی اور اتنی زیادہ اُونگھ سوار ہوئی کہ رنج و غم کی طرف توجہ ہی نہ رہی۔ علاج کرنے والوں کا یہ قاعدہ ہے کہ جب مریض کی تکلیف بڑھ جاتی ہے اور کسی طرح سے افاقہ نہیں ہوتا تو تکلیف سے بے خبر کرنے کیلئے کوئی ایسی دوا دے دیتے ہیں یا انجکشن لگا دیتے ہیں جس سے نیند آ جائے، اللہ جل شانہٗ نے اُن حضرات پر نیند غالب فرما دی جس سے غم کا محسوس ہونا ختم ہو گیا۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ م بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَةً مِّنْکُمْ میں اسی کو بیان فرمایا اور اونگھ کو اَمَنَةً یعنی چین اور راحت بتایا، یہ تو مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ جو منافقین تھے ان کا دوسرا ہی رنگ تھا اُن کو اپنی ہی جانوں کی پڑی تھی۔ انہیں رسول اللہ ﷺ سے اور دین اسلام سے کچھ بھی ہمدردی نہ تھی اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیت کے خیالات پکار رہے تھے۔ کہتے تھے کہ ہماری تو کچھ چلتی ہی نہیں۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ شہر سے باہر جا کر نہ لڑیں ہماری بات چلتی اور ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہاں آ کر ہم کیوں مارے جاتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُن کو جواب دے دو کہ سب اختیار اللہ ہی کو ہے۔ سب کام اللہ کی قضا اور قدر کے مطابق ہوتے ہیں اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی وہ لوگ گھروں سے نکل کر اپنی اپنی قتل گاہوں میں پہنچ جاتے جن کے بارے میں مقتول ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

پھر فرمایا وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (اور تا کہ اللہ آزمائے جو تمہارے سینوں میں ہے اور تا کہ اس کو صاف کرے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا اس لئے پیش آیا کہ اللہ تمہارے باطن کی آزمائش فرمائے کیونکہ مصیبت کے وقت سچوں اور جھوٹوں کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ منافقوں کا نفاق کھل گیا اور مؤمنین کا ایمان اور زیادہ مضبوط اور ثابت ہو گیا اور یوں تو اللہ تعالیٰ سب باتوں کو جانتا ہی ہے لیکن علم ظہور کے طور پر یہ باتیں ظاہر ہو گئیں، اور مسلمانوں کو بھی سچوں اور جھوٹوں کا پتہ چل گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی معافی کا اعلان ...... آخر میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ (الآیہ) بے شک تم میں سے جو لوگ اس دن پشت پھیر کر چلے گئے جس دن دونوں جماعتیں آپس میں مقابل ہوئیں بات یہی ہے کہ اُن کو شیطان نے لغزش دے دی بعض ایسے اعمال کے سبب جو انہوں نے کئے اور البتہ تحقیق اللہ نے اُن کو معاف فرمایا بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے) اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو تسلی بھی دی ہے (کیونکہ اُن کی معافی کا اعلان فرمایا ہے) اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ پشت پھیر کر چل دیئے تھے اُن کو شیطان نے لغزش دے دی تھی اور اس لغزش کا سبب اُن کے بعض گناہ بن گئے اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گناہوں کی طرف کھینچتے ہیں ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے اور گناہوں کے ذریعہ شیطان دوسرے گناہوں پر آمادہ کر دیتا ہے۔

(غزوۂ احد کے بارے میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے حافظ ابن کثیر کی تفسیر سے اور البدایہ والنہایہ سے اور تفسیر روح المعانی سے ماخوذ ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ

اے ایمان والو! اُن لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں سے کہا جب وہ زمین میں سفر کرنے لگیں

اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ

یا غازی بن جائیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تا کہ اللہ اس بات کو اُن کے دلوں میں حسرت بنا دے،

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ

اور اللہ زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھنے والا ہے۔ اور البتہ اگر تم قتل کر دیئے جاؤ، یا اللہ کی راہ میں مر جاؤ تو بلاشبہ (اللہ کی طرف

مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

سے مغفرت اور رحمت بہتر ہے اس چیز سے جسے وہ لوگ جمع کرتے ہیں) اور اگر تم مر گئے یا قتل ہو گئے تو ضرور اللہ کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔

کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کو جہاد میں جانا پسند نہیں

بہت سے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خیر کا کام نہ خود کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں اور جو لوگ خیر کے کاموں میں لگیں ان کو طعنے دیتے ہیں اور جو خیر انہیں نصیب ہوا اُسے نقصان سے تعبیر کرتے ہیں، جو لوگ حبِّ دنیا میں غرق ہوں انہیں دوسروں کے آخرت کے اعمال نہیں بھاتے، اللہ کے لئے جو اُن کی جانی یا مالی قربانی ہو وہ انہیں اچھی نہیں لگتی۔ منافقین کا یہی حال تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے بھائی (نسب میں اُن کے بھائی ہوتے تھے اور منافقین ظاہری طور پر دینی بھائی بھی کہلاتے تھے) جو سفر میں گئے یا جہاد میں شریک ہوئے یہ اگر

یہیں ہمارے پاس رہتے سفر میں نہ جاتے جہاد نہ کرتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، بظاہر ان کا یہ کہنا ہمدردی جتانے کے لئے تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمدردی خیر کے کاموں سے روکنے میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ، ایسا کہنا ان کے قلوب میں حسرت کا سبب ہے پھر فرمایا کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے کوئی شخص کسی جگہ قیام کرنے سے قضا الٰہی سے نہیں بچ سکتا وہ جہاں بھی ہوگا قضا اور قدر کے موافق اجل مسمّی پر اس کو موت آ ہی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت دنیاوی سامان سے بہتر ہے...... پھر فرمایا کہ تم اللہ کی راہ میں اگر قتل ہو گئے یا اللہ کی راہ میں مر گئے تو یہ کوئی نقصان کا سودا نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا سبب ہے اور اللہ کی مغفرت اور رحمت اس سب سے بہتر ہے جو کچھ ایسی باتیں کرنے والے جمع کرتے ہیں۔ دنیا کے لالچی دنیا ہی کے لئے سوچتے ہیں اور اسی دنیا کو دوسروں کے لئے پسند کرنے کی وجہ سے انہوں نے یہ بات کہی کہ یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ مزید زندگی پا لیتے کچھ پیسہ اور کما لیتے، یہ پیسہ اللہ کی مغفرت اور رحمت کے سامنے کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر تم مر گئے یا مقتول ہو گئے تو اللہ کی بارگاہ میں ضرور جمع کئے جاؤ گے۔ مرنا اور بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونا ہر ایک کے لئے ضروری ہے پھر اللہ کی راہ میں کیوں نہ مریں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠

سو اللہ کی رحمت کے سبب آپ اُن کے لئے نرم ہو گئے، اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے،

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ

سو آپ ان کو معاف فرما دیجئے، اور ان کے لئے استغفار کیجئے، اور کاموں میں ان سے مشورہ لیجئے پھر جب آپ پختہ عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کیجئے،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

بے شک توکل کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ

غزوۂ احد کے موقعہ پر مسلمانوں سے جو لغزش ہوگئی تھی (کہ میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم پہنچا اور تکلیف ہوئی اس پر آپ نے اُن سے سختی کا معاملہ نہیں کیا۔ ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ان کریمانہ اخلاق اور آپ کی نرم مزاجی کی اس آیت میں تعریف فرمائی۔ نیز مسلمانوں کی بھی دلداری اور دل جوئی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اوّل تو دو مرتبہ اپنی طرف سے معافی کا اعلان فرمایا جس کا ذکر پچھلے رکوع میں آ چکا ہے پھر اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ بھی معاف فرما دیں اور نہ صرف یہ کہ خود معاف فرما دیں بلکہ ان کے لئے اللہ جل شانہٗ سے بھی استغفار کریں اور مزید دلداری یوں فرمائی کہ آپ کو ان سے مشورہ لینے کا حکم دیا پھر فرمایا کہ مشورہ کے بعد جس طرف آپ کی رائے پختہ ہو جائے۔ اللہ کے بھروسہ اس پر عمل کر لیجئے جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھتے ہیں وہ اللہ کو محبوب ہیں۔

خوش خلقی کا بلند مرتبہ...... آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خوش اخلاق نرم مزاج ہمیشہ ہی سے تھے اس موقعہ پر خاص طور پر اس کا مظاہرہ ہوا۔ موطا میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ حُسنِ اخلاق کی تکمیل کروں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ سب سے زیادہ بھاری چیز قیامت کے دن جومؤمن کی ترازو میں رکھی جائے گی۔ وہ اچھے اخلاق ہوں گے، اور بے شک اللہ کو فحش گو اور بدزبان مبغوض ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک مؤمن اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے راتوں رات نماز پڑھنے والے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا درجہ پالیتا ہے۔ نرمی خوش خلقی کا بہت بڑا جزو ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص نرمی سے محروم ہوگیا وہ خیر سے محروم ہوگیا۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نرمی جس کسی چیز میں بھی ہوگی اُسے زینت دے دے گی اور جس چیز سے نرمی نکال دی جائے گی۔ وہ عیب دار ہوجائے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں بتادوں جو آتش دوزخ پر حرام ہے اور جس پر آتش دوزخ حرام ہے پھر فرمایا کہ یہ صفت اس شخص کی ہے جس سے ملنا جلنا آسان ہو نرم مزاج ہو قریب ہو۔ سہل ہو۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سخت مزاج بداخلاق داخل نہیں ہوگا۔ (یہ روایات مشکوٰۃ المصابیح باب الرفق والحیاء وحسن الخلق) میں مذکور ہیں۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام خلق حسن والوں کے سردار تھے۔ آپ کیوں نرم نہ ہوتے آپ کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچیں سب کو سہہ گئے اور نرمی کے ساتھ نباہ گئے۔

یہ جو فرمایا وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوجاتے) اس میں جہاں آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور نرم مزاجی اور رأفت اور شفقت کا ذکر ہے۔ وہاں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ یہ صحابہ جو آپ کے پاس جمع ہیں اور آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور دل و جان سے آپ پر نثار ہیں اس میں اس کا بہت دخل ہے کہ آپ سخت مزاج اور سخت دل نہیں ہیں اگر خدانخواستہ آپ ایسے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے چلے جاتے اور منتشر ہوجاتے۔

معلّمین اور مرشدین خوش خلقی اختیار کریں......انسان کا مزاج ہے کہ وہ بردبار خوش اخلاق متواضع اور منکسر المزاج کے پاس جانا اور اُٹھنا بیٹھنا اور اس سے فیض لینا اور علم و معرفت حاصل کرنا پسند کرتا ہے۔ جو حضرات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں معلم ہیں، محدث ہیں، مفتی ہیں، مرشد ہیں، مبلغ ہیں، داعی اور ہادی ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے اس میں بہت بڑی نصیحت ہے، اگر اُمت کو علم سکھانا اور فیض پہنچانا ہے تو نرم مزاج، نرم خو، شفیق اور مہربان بردبار بنیں، ورنہ فیض نہ ہوگا۔ سخت مزاجی اور بدخلقی سے لوگ دور بھاگتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ فلاں صاحب بڑے عالم اور اونچے درجہ کے مرشد ہیں اور ہمیں ان سے فیض مل سکتا ہے پھر بھی فیض لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یوں تو ہر مسلمان ہی کو خوش اور نرم مزاج ہونا چاہیئے لیکن خاص کر معلمین، مصلحین، مبلغین، مرشدین کو تو بہت ہی زیادہ اس صفت سے متصف ہونا ضروری ہے۔ حضرت سعدیؒ نے کیا اچھا فرمایا۔

کس نہ بیند کہ تشنگان حجاز برلب آب شور گرد آیند
ہر کجا چشمۂ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند

کمال یہی ہے کہ عامۃ المسلمین میں گھل مل کر رہے۔ خیر کے کام کرے خیر کی تعلیم دے اور اُن سے جو تکلیف پہنچے اُس کو برداشت کرے۔ اپنی ذاتی نیکیوں کو لے کر تنہائی میں بیٹھ جانا تاکہ لوگ تکلیف نہ دیں اس میں وہ بات نہیں ہے جو خیر پہنچانے اور تکلیف اٹھانے میں ہے۔ سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان لوگوں میں گھل مل کر رہتا ہے اور اُن سے جو تکلیف

پہنچے اس پر صبر کرتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو گھل مل کر نہیں رہتا اور لوگوں کی تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۲)

مشورہ کرنے کا حکم ...... پھر فرمایا **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** اللہ جل شانہٗ نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام ﷺ سے مشورہ فرمانے کا حکم دیا۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی اپنے صحابہؓ سے مشورہ فرماتے تھے اور اس کے بعد بھی آپ نے مشورے فرمائے۔ آیت شریفہ میں مشورے کا حکم دے کر حضرات صحابہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ نے دلجوئی فرمائی اور ان کا اعزاز و اکرام فرمایا یہ مشورہ اُن اُمور میں نہیں تھا جہاں کوئی نص قطعی اور واضح حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے موجود ہو، جن اُمور کو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرما دیا گیا اُن میں مشورہ کرنے کا حکم فرمایا۔

مشورہ کی ضرورت اور اہمیت ...... اس سے مشورے کی اہمیت اور ضرورت ظاہر ہوئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ جب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ سے مستغنی نہیں تو آپ کے بعد ایسا کون ہوسکتا ہے جو مشورہ سے بے نیاز ہو، آئندہ آنے والے امراء اور اصحاب اقتدار اور امت کے کاموں کے ذمہ دار جو بھی آئیں سب کے لئے مشورہ کرنے کی ضرورت واضح ہوگئی۔ مشورہ میں بہت خیر ہے جو اصحاب رائے ہوں خواہ عمر یا مرتبہ میں چھوٹے ہی ہوں اُن کو مشورہ میں شریک کرنا چاہئے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مشورہ کرنے کی صورت میں مختلف رائیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان رایوں کے درمیان سے کسی مناسب ترین رائے کو اختیار کر لینا آسان ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ بڑے کی نظر سے وہ گوشے اوجھل رہ جاتے ہیں جو چھوٹوں کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ تمام گوشے سامنے آنے سے کسی پہلو کو اختیار کرنے میں بصیرت حاصل ہوجاتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ** (یعنی جس نے استخارہ کیا وہ ناکام نہ ہوگا۔ اور جس نے مشورہ کیا اُسے ندامت نہ ہوگی)۔ (ذکرہ الہیثمی فی مجمع الزوائد ص ۲۸۰ ج ۲)

خانگی اُمور میں اور اداروں کے معاملات میں مشورے کرتے رہنا چاہئے جن لوگوں سے مشورہ کیا جائے ان کے ذمہ لازم ہے کہ وہ وہی رائے دیں جسے اپنی دیانت سے **فیما بینهم وبین الله** صحیح سمجھتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **ان المستشار مؤتمن** (یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہے)۔ (اخرجه الترمذی فی ابواب الزهد وابن ماجه فی کتاب الادب)

اگر کوئی شخص اپنے ذاتی معاملہ میں مشورہ کرے تب بھی اُسے وہی مشورہ دے جو اس کے حق میں بہتر ہو۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من اشار علی اخیه بامر یعلم ان الرشد فی غیره فقد خانه** (کہ جس نے اپنے بھائی کو کوئی ایسا مشورہ دیا جس کو وہ سمجھتا ہے کہ مشورہ لینے والے کی بہتری دوسری رائے میں تھی (جو پیش نہیں کی گئی) تو اس نے خیانت کی) (رواہ ابوداؤد فی کتاب العلم) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کا ایک قاعدہ کلیہ مروی ہے جسے علامہ سخاوی نے المقاصد الحسنہ ص ۳۸۳ میں نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ **فاذا استشیر احدکم فلیشر بما هو صانع لنفسه** (کہ جب کسی سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ مشورہ دے جسے وہ اپنے لئے اختیار کرتا اگر وہ خود اس حال میں مبتلا ہوتا جس میں مشورہ لینے والا مبتلا ہے) اور یہ مضمون اس حدیث کے مطابق ہے جس میں افضل الایمان بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ **ان تحب للناس ما تحب لنفسک وتکره لهم ما تکره لنفسک** (یعنی یہ کہ تو لوگوں کے لئے اُسی کو پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور لوگوں کے لئے اس چیز کو ناپسند جانے جس کو اپنے لئے ناپسند جانتا ہے) (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۶)

مشورہ کی شرعی حیثیت ...... مشورے کا حکم دینے کے بعد فرمایا **فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ** ۝ (پھر

جب آپ پختہ عزم کرلیں تو اللہ پر توکل کیجئے۔ بے شک توکل کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں) مطلب یہ ہے کہ مشورے کے بعد آپ جب کسی جانب طے فرما کر عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اپنے عزم کے مطابق عمل کیجئے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد آپ کو سب کے یا کسی ایک کے مشورے کا پابند ہونا ضروری نہیں ہے۔ جس طرف آپ کا رجحان ہو اُس پر عمل کرلیں، اس میں مشورہ دینے والوں کو بھی دلگیر ہونے کی ضرورت نہیں مشورہ دینا اور لینا ضائع نہیں ہے کیونکہ اس میں ہر شخص کو غور وخوض کرنے اور اپنی رائے پیش کرنے کا ثواب مل چکا ہے، اب آپ جس رائے کو مناسب جانیں اور رایوں میں اپنی ذاتی رائے بھی ہے) اس پر عمل فرمائیں۔

اپنا عزم فرمانے کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنے کا حکم فرمایا اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ تمام مشوروں اور تدبیروں کے بعد بھروسہ صرف اللہ ہی پر رہے بندوں کی رائیں اور تدبیریں صرف اسباب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسباب پر بھروسہ کرنا مؤمن کا کام نہیں، مؤمن کا بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے۔

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مشورہ کی سنت جاری ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات سمجھ لینا چاہیئے کہ مشورہ لینے والے کے لئے خواہ امیر المؤمنین ہی ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا مشورہ مانے۔ باوجود مشورہ لینے کے اُسے اپنی رائے پر عمل کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ حق بات یہ ہے کہ جب مشورہ لینے والا بھی مخلص ہو اور مشورہ دینے والے بھی مخلص ہوں اور ہر ایک کو اللہ کی رضا مقصود ہو تو کسی وقت بھی بدمزگی پیدا ہونے کا موقعہ نہیں رہتا۔ آپس میں ضد اضدی اور یہ اعتراض کہ میری رائے پر عمل کیوں نہ کیا اور امیر کی شکایت کہ وہ آمر مطلق ہے مشورہ کر کے بھی اپنی رائے پر عمل کرتا ہے۔ یہ سب باتیں جبھی ہوتی ہیں جب امیر اور مامور میں اخلاص نہ ہو اور آپس میں اعتماد نہ ہو اور امارت کے اصول پر امیر و مامور کو چلنے کا ارادہ نہ ہو۔ نفسانی اور دنیاوی چیزوں نے جگہ پکڑ رکھی ہو۔ اگر امیر کے انتخاب میں اللہ کی رضامندی کا دھیان رکھا ہو اور متقی آدمی کو امیر بنایا ہو جس کے علم و عمل اور اخلاص پر اعتماد ہو جو دنیادار نہ ہو عہدہ کا طالب نہ ہو تو اس صورت میں امیر کا اپنی رائے پر عمل کرنا ناگوار نہ ہوگا۔ انتخاب تو غلط کریں اور پھر امیر کے خلاف احتجاج کرنے جلوس نکالنے کے جاہلانہ طریقوں سے امیر کو ہٹانے کی کوشش کریں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ نہیں کھاتا۔

موجودہ جمہوریت اور اُس کا تعارف

زمانۂ قدیم میں بادشاہتیں جاری تھیں ولی عہدی کے اصول پر بادشاہت ملتی تھی عرب وعجم میں بادشاہ تھے ان میں ظالم بھی تھے رحم دل بھی تھے اور انصاف پسند بھی، لیکن بادشاہت کی تاریخ میں زیادہ تر مظالم ہی ملتے ہیں۔ ان مظالم سے تنگ آ کر یورپ والوں نے جمہوریت کا طرزِ حکومت جاری کیا اور اس کا نام عوامی حکومت رکھا۔ اس کے جو طریق کار ہیں انہیں عام طور سے سبھی جانتے ہیں۔ اس جمہوریت کا خلاصہ عوام کو دھوکہ دینا اور کسی ایک پارٹی کے چند افراد کے ملک پر مسلط ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عنوان یہ ہے کہ اکثریت کی رائے انتخاب میں معتبر ہوگی اور انتخاب بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوگا اس میں امیدوار کے لئے عالم ہونا، دیندار ہونا بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں پڑھے لکھے اور بالکل جاہل چٹ مرد عورت امیدوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں بعض پارٹی کے نمائندے ہوتے ہیں اور بعض آزاد ہوتے ہیں ان میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو اسلام کے خلاف بولتے رہتے ہیں۔ اسلام کے نظام حدود وقصاص کو ظالمانہ کہتے ہیں جس کی وجہ سے حدود کفر میں داخل ہو جاتے ہیں اور انتخاب میں پارٹیوں کے زور پر اور سرداروں کے زور پر اور پیسوں کے زور پر ووٹ دینے والے بھی عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جو دین اسلام کے تقاضوں کو نہیں جانتے لہٰذا بے پڑھے اور ملحد اور زندیق بھی منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں آجاتے ہیں۔ جس شخص کو زیادہ ووٹ مل گئے وہی ممبر منتخب ہو جاتا ہے اگر کسی سیٹ پر گیارہ آدمی کھڑے ہوں تو اُن میں سے

اگر دس آدمیوں کو ۱۵۔۱۵ ووٹ ملیں اور ایک شخص کو سولہ ووٹ مل جائیں تو یہ شخص سب کے مقابلہ میں کامیاب مانا جائے گا۔ اور کہا یہ جائے گا کہ اکثریت سے منتخب ہوا حالانکہ اکثریت اس شخص کے مخالف ہے ڈیڑھ سو افراد نے اُسے ووٹ نہیں دیئے۔ سولہ آدمیوں نے ووٹ دیئے ہیں ڈیڑھ سو کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں یہ جمہوریت ہے جس میں ۱۵۰ آدمیوں کی رائے کا خون کیا گیا اور سولہ افراد کی رائے کو مانا گیا۔ پھر پارلیمنٹ میں جس کسی پارٹی کے افراد زیادہ ہو جائیں اسی کی حکومت بن جاتی ہے اور وہ افراد اسی طریقہ پر پارلیمنٹ میں آئے ہیں جو ابھی ذکر ہوا، اس طرح سے تھوڑے سے افراد کی پورے ملک پر حکومت ہو جاتی ہے اور پارٹی کے چند افراد اختیار سنبھال لیتے ہیں اور سیاہ سفید کے مالک ہو جاتے ہیں خود پارٹی کے جو افراد کسی بات سے متفق نہ ہوں، انہیں پارلیمنٹ میں پارٹی ہی کے موافق بولنا پڑتا ہے اپنی ذاتی رائے کا خون کر دیتے ہیں۔ یہ جمہوریت اور اکثریت کی حقیقت ہے۔

پھر خدا کی پناہ مرکزی حکومت کے صدر اور وزیراعظم اور دوسرے وزراء کے بے تکے اخراجات، بنگلے اور ان کی سجاوٹیں، گاڑیاں، ڈرائیور، پٹرول کا خرچ، باورچی، مالی اور دوسرے خادموں کی تنخواہیں اور وزیروں کی بے جا کھپت پارٹی کے آدمی ہونے کی بنیاد پر خواہ مخواہ عہدے نکالنا اور حد یہ ہے کہ وزیر بے قلمدان بنانا اور کثیر تعداد میں مشیروں کو کھپانا ان سب کا بوجھ قوم کی گردن پر ہوتا ہے۔ پھر ہر صوبہ کا گورنر، وزیراعلیٰ، دوسرے وزراء اور نائب وزراء ان سب اخراجات سے ملک کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے اور ملک چلانے کے لئے سودی قرضے لیتے ہیں اور قوم پر ٹیکس لگاتے ہیں۔ انکم ٹیکس، برآمد ٹیکس کسٹم ڈیوٹی یہ سب مصیبت قوم پر سوار ہوتی ہے اور عوام کو دھوکہ دے رکھا ہے کہ تمہاری حکومت ہے، عوام ان پارٹی بازوں اور سیاسی بازی گروں کی باتوں میں آجاتے ہیں اور سیدھا سادھا اسلامی نظام جس میں ایک امیر مرکزی حکومت میں ہو جس کا معمولی سا وظیفہ ہو اور علاقوں میں چند امیر ہوں اور یہ سب لوگ سادگی کے ساتھ رہیں بقدرِ ضرورت واجبہ ان کو وظیفہ مل جائے معمولی سے گھر میں رہیں اگر کسی کا اپنا گھر ہے تو اسی میں قیام پذیر ہو اس نظام کو ماننے کے لئے لوگ تیار نہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ○

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلام میں شوریٰ کی بھی کوئی حیثیت ہے تو یہ بات ٹھیک ہے۔ مگر اس کی حیثیت وہی ہے جو اوپر ذکر کر دی گئی، ایسی جمہوریت جس میں پورے ملک میں انتخاب ہو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہر کس و ناکس ووٹر ہو اور کثرتِ رائے پر فیصلہ رکھا جائے اسلام میں ایسی جمہوریت نہیں ہے۔ بعض اہل علم بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اسلام کی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بڑی محنتوں سے جمہوریت کو لائے اب اس کے خلاف کیسے بولیں اور ان کی لائی ہوئی جمہوریت بالکل جاہلانہ جمہوریت ہوتی ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، انتخاب میں کوئی بھی کیسا ہی بے دین منتخب ہو جائے جمہویت جاہلیہ کی وجہ سے اس کے عہدہ کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اب کیا کریں اب تو منتخب ہو ہی گیا عوام کی رائے کو کیسے ٹھکرائیں ان لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ حکومت عوام کی سمجھتے ہیں حالانکہ حاکم اللہ تعالیٰ شانہٗ ہے عوام اللہ کے قانون کے تابع ہیں اس کے خلاف چلنے بولنے کی کوشش کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔

حضرات خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کا انتخاب...... یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم خلفاء راشدین تھے ان حضرات کو منتخب کرتے وقت کوئی بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخاب نہیں ہوا۔ نہ پورے ملک سے ووٹ لئے گئے تاریخ اور سیرت کے جاننے والے اس امر سے واقف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرات مہاجرین اور انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ وہاں اس بات کا مشورہ ہو رہا تھا کہ امیر کون ہو۔ انصار میں سے بعض حضرات یہ رائے دے رہے تھے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو

اور ایک مہاجرین میں سے ہو۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی وہاں پہنچ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ اپنا ہاتھ لائیے میں بیعت کرتا ہوں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ حضرت عمرؓ نے بیعت کر لی اس کے بعد مہاجرین نے بیعت کر لی ان کے بعد انصار نے بیعت کی۔ یہ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب تھا جو سب سے پہلے خلیفہ تھے۔ اس کی تفصیل البدایۃ والنہایہ ص ۲۴۶ ج ۵ میں مذکور ہے۔

اس کے بعد جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے بغیر کسی مشورہ کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دشمن نے خنجر مار دیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب میں جانبر ہونے والا نہیں ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ خلافت کا مستحق ان حضرات کے علاوہ کوئی نہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے اور اسی حالت رضامندی میں آپ کی وفات ہوئی۔ پھر انہیں حضرات میں سے حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے نام لئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا جائے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میرا بیٹا عبداللہؓ مشورے میں شریک ہوگا لیکن اُسے خلافت سپرد نہ کی جائے اور فرمایا کہ اگر سعد کو منتخب کر لیا جائے تو وہ اس کے اہل ہیں اور اگر اُن کے علاوہ کسی دوسرے کو امیر بنا لیا جائے تو وہ ان سے مدد لیتا رہے، جب حضرت عمرؓ کی وفات ہوگئی اور ان کو دفن کر دیا گیا تو وہ حضرات جمع ہوئے جن کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا تھا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا کہ تم سب اپنا معاملہ تین آدمیوں کے سپرد کر دو حضرت زبیرؓ نے فرمایا میں نے اپنا معاملہ حضرت علیؓ کے سپرد کیا اور حضرت طلحہؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنا معاملہ عثمانؓ کے سپرد کیا۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنا معاملہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ تم دونوں میرے سپرد کرتے ہو تو میں تم میں جو افضل ترین ہوگا۔ اس کے انتخاب میں کوتاہی نہیں کروں گا ان دونوں نے کہا کہ ہاں ہم تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے دونوں سے علیحدہ علیحدہ تنہائی میں بات کی اور دونوں نے اقرار کیا کہ اگر میرے علاوہ دوسرے کو تم نے امیر بنا دیا تو میں فرمانبرداری کروں گا اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا لاؤ ہاتھ بڑھاؤ یہ کہہ کر ان سے خود بیعت کر لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اُن سے بیعت کر لی۔ دوسرے حضرات جو باہر منتظر تھے وہ بھی اندر آئے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ سے بیعت کر لی۔ مفصل واقعہ صحیح بخاری ص ۵۲۴ ج ۱ میں مذکور ہے۔ یہ انتخاب خلیفہ ثالث کا تھا (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برضا و رغبت حضرت عثمانؓ سے بیعت کی تھی اور پہلے سے اقرار کر لیا تھا کہ اگر ان کو امیر بنا دیا گیا تو میں فرمانبردار رہوں گا)۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو ان کی جگہ کسی امیر کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی اہلِ مصر جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اصرار کرتے رہے کہ آپ خلافت کا بوجھ سنبھالیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور باغوں کی طرف تشریف لے گئے کوفہ والوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو تلاش کیا وہ بھی نہ ملے۔ بصرہ والوں نے حضرت طلحہؓ سے عرض کیا، انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر حضرت سعد بن ابی وقاص کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معروض پیش کی انہوں نے بھی قبول نہ کیا۔ حضرت ابن عمرؓ کے پاس گئے انہوں نے بھی نہ مانا ساری کوششیں کر کے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خلافت قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے آخر میں انہوں نے ذمہ داری قبول فرمائی۔ یہ تفصیل البدایۃ والنہایہ ص ۲۲۶ ج ۷ میں لکھی ہے۔

یہ چاروں خلفاء کا انتخاب تھا ان میں کبھی بھی پورے ملک میں الیکشن نہیں ہوا۔ بلکہ پورے صحابہؓ بھی شریک نہیں ہوئے نہ پورا مدینہ

شریک ہوا چند افراد نے منتخب کر لیا سب نے مان لیا۔ ممکن ہے یورپ کی جمہوریت جاہلیہ سے مرعوب ہو کر بعض ناواقف یہ کہنے لگیں کہ صحیح طریقہ وہی ہے جو آج کل رواج پائے ہوئے ہے۔ اُن حضرات نے انتخاب صحیح نہیں کیا۔ (العیاذ باللہ) اس جاہلانہ اُپچ کا جواب دینے کی ضرورت تو ہے نہیں لیکن پھر بھی ہم عرض کر دیتے ہیں کہ یہ اعتراض اللہ تعالیٰ کی ذات پر پہنچتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مہاجرین اور انصار اور جو خوبی کے ساتھ ان کا اتباع کریں ان کی تعریف فرمائی اور اُن کے بارے میں رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ فرمایا اگر انہیں حضرات نے اسلام کو نہیں سمجھا اور امیر کا انتخاب جس طرح ہونا چاہیے تھا اُس طرح کیا تو اُن کے بعد اسلام کو اور اسلام کے تقاضوں کو جاننے والا کون ہے؟ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین. (رواہ ابوداؤد والترمذی) (کہ میرے طریقے کو اور خلفاء راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا) اگر ان حضرات کا اپنا انتخاب صحیح نہیں اور انہوں نے دوسروں کا انتخاب صحیح نہیں کیا تو وہ خلفاء راشدین ہو ہی نہیں سکتے اگر آج کے جاہلوں کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حضرات صحابہؓ میں سے کوئی بھی خلیفہ راشد نہیں ہوا۔ (العیاذ باللہ) دشمنوں کے طریقہ کار سے مرعوب ہو کر اسلام کی تحریف اور تبدیل کرنے پر آمادہ ہو جانا ایمانی تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہیں بغیر مدد کے چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے گا

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اور اللہ ہی پر بھروسہ کریں مؤمن بندے۔

اللہ تعالیٰ مدد فرمائے تو کوئی غالب نہیں ہو سکتا

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں) اس آیت شریفہ میں اللہ پر توکل کرنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ کسی قوم پر غالب ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد ہی اصل چیز ہے قلت اور کثرت اور اسباب سے اس کا حقیقی تعلق نہیں ہے اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب ہونے والا نہیں۔ بدر میں اللہ تعالیٰ نے نصرت فرمائی۔ مسلمان تھوڑے سے تھے سامانِ حرب بھی معمولی تھا دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اُن کے پاس سامان بھی بہت تھا لیکن دشمن مغلوب ہوئے۔ پھر فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تم کو مدد کے بغیر چھوڑ دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ اور واقعۂ احد میں یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ حاصل یہ کہ مدد اور نصرت کے لئے ہمیشہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور اسی سے مدد طلب کریں اور اسی پر توکل کریں۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى

اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا پھر ہر شخص کو اس کے کئے

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

کا بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

جو شخص خیانت کرے گا قیامت کے دن ساتھ لے کر آئے گا

تفسیر درِمنثور ص ۱۵۱ ج ۲ میں ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مال غنیمت میں سے ایک سرخ چادر نہیں مل رہی تھی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ غلول کرے؟ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ غلول کا اصل معنی یہ ہے کہ خفیہ طریقہ سے کوئی چیز لے لی جائے۔ پھر یہ لفظ مال غنیمت میں سے کوئی چیز چُرا لینے کے لئے مخصوص کر دیا گیا اس کو غلول بھی کہا جاتا ہے۔ مطلق خیانت کو بھی غلول کہتے ہیں کیونکہ اس میں سے ایک طرح سے خفیہ طریقے پر دوسرے کا مال اپنا مال بنا لیا جاتا ہے جو اپنے لئے حلال نہ ہو۔

پھر فرمایا وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کہ جو شخص خیانت کرے گا۔ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا (تا کہ اسکی خوب اچھی طرح رسوائی ہو اور لوگ جان لیں کہ اس نے خیانت کی تھی) سنن ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرماتے تھے کہ تم لشکر میں یہ پکار دو کہ جس کے پاس جو بھی مالِ غنیمت ہو وہ حاضر کر دے جب مال جمع ہو جاتا تو آپ اس میں سے پانچواں حصہ لے کر (جس کا ذکر وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ (الآیۃ) میں ہے) باقی مال کو مجاہدین پر تقسیم فرما دیتے تھے، ایک دن ایک شخص تقسیم کے بعد بالوں کی ایک رسی لے کر آیا جسے باگ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اور اس نے عرض کیا یہ وہ ہے جو مجھے مالِ غنیمت میں سے ملی تھی۔ آپ نے فرمایا کیا تو نے بلال کی آواز سنی تھی؟ تین مرتبہ سوال فرمایا اس نے کہا جی ہاں سنی تھی آپ نے فرمایا پھر تو کیوں نہیں لے کر آیا تجھے اس کے لانے سے کیا مانع تھا اس نے کچھ عذر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا اب تو ہی اسے قیامت کے دن لے کر آئے گا میں تجھ سے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ یہ کہتے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے کہ فلاں شہید اور فلاں شہید۔ اسی ذیل میں انہوں نے ایک آدمی کا ذکر کیا آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں بلاشبہ میں نے اُسے دوزخ میں دیکھا ہے ایک چادر کے بارے میں جس کا اس نے غلول کر لیا تھا (یعنی چھپا کر رکھ لی تھی) پھر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابن خطاب! جاؤ اور لوگوں میں پکار کر تین بار کہہ دو کہ جنت میں داخل نہ ہوں گے مگر ایمان والے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اس مضمون کا تین مرتبہ اعلان کر دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۵۲ ج ۲)

مالِ غنیمت کے علاوہ اور بھی جو کوئی مال کسی طرح سے لے لیا جائے جو لینے والے کا حق نہ ہو اس مال کا لینے والا قیامت کے دن گردن پر لے کر آئے گا۔ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو جو قبیلہ بنی ازد میں سے تھے۔ صدقات وصول کرنے پر مقرر فرمایا جب وہ آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپ کے لئے ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: اما بعد میں بہت سے لوگوں کو ان کاموں پر مقرر کرتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے والی بنایا پھر اُن میں سے ایک شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے، کیوں نہ بیٹھ گیا وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں پھر وہ دیکھتا کہ اُسے ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو بھی کوئی شخص اُس مال میں سے کچھ بھی لے لے گا جس کی تحصیل کے لئے مقرر کیا گیا تو قیامت کے دن اُسے لے کر

آئے گا جسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا اگر اونٹ ہوگا تو وہ بولتا ہوا ہوگا اور گائے ہوگی تو وہ بھی آواز نکال رہی ہوگی اور بکری ہوگی تو وہ بھی منمنا رہی ہوگی، پھر آپ نے ہاتھ اُٹھائے یہاں تک کہ ہم نے آپ کی مبارک بغلوں کی سفیدی دیکھ لی۔ پھر دوبارہ آپ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۵۶) جو لوگ اوقاف کے اموال یا عامۃ الناس کے مالوں میں، بیت المال کی املاک میں غبن کرتے ہیں۔ آخرت کے دن کا تصور کریں اور غور کریں کہ اموال میں خیانت کرنے اور غبن کرنے کا انجام کیا ہوگا آیت کے ختم پر جو کچھ ارشاد فرمایا اسے بار بار ذہن میں بٹھائیں۔ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (پھر ہر جان کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور اُن پر ظلم نہ ہوگا)

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

کیا جو شخص اللہ کی رضا کا تابع ہو وہ ایسے شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات میں مختلف ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں کو دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب اس جیسا نہیں جو ناراضگی کا مستحق ہو

ان دونوں آیتوں میں اللہ کی رضا تلاش کرنے والے اور اللہ کے غصہ کے مستحق ہو جانے والے کے درمیان جو فرق ہے وہ بیان فرمایا ہے ارشاد ہے کہ اللہ کی رضا کے طالب اور وہ لوگ جو اپنے اعمال بد کی وجہ سے اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے یہ دونوں فریق برابر نہیں ہو سکتے۔ اس مضمون کو بیان فرمانے کے لئے استفہام انکاری کا طریقہ اختیار فرمایا تا کہ سننے والے خود بھی غور کرلیں۔ اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے والوں کے ذیل میں جنت کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ وہ تو حاصل ہو ہی جائے گی اور صرف اللہ کی رضا کے طالب ہونے پر اکتفا فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جنت سے بھی بڑی چیز ہے اور دوسری جانب میں غضب الٰہی کا تذکرہ فرمایا اور یہ بھی ذکر فرمایا کہ غضب الٰہی کے مستحقین دوزخ میں داخل ہوں گے اور فرمایا کہ دوزخ بہت بُری جگہ ہے پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں فریق مختلف درجات والے ہوں گے (جو لوگ اللہ کی رضا کے طالب ہیں وہ جنتوں میں طرح طرح کی نعمتوں میں ہوں گے، اور جو لوگ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے وہ دوزخ کے مختلف عذابوں میں ہوں گے) یہ درجات جنت اور درجات جہنم اللہ کے علم میں ابھی سے مقرر ہیں اور اللہ سب کے اعمال کو دیکھتا ہے اچھے بُرے اعمال کی جزا دے گا۔ کسی کا کوئی عمل اس کے علم سے باہر نہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان فرمایا جبکہ اُن میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

النصف

اپنا رسول بھیج کر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا

اللہ جل شانہٗ بہت بڑا کریم ہے۔ صدیوں سے لوگ شرک اور کفر کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، بجز خال خال چند افراد کے اللہ کے ماننے والے دنیا میں رہے ہی نہ تھے جو لوگ اپنے خیال میں اللہ کو مانتے اور جانتے تھے وہ بھی عموماً مشرک تھے عرب اور عجم سب پر شیاطین کا تسلط تھا۔ پوری دنیا کفر کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ایسے موقعہ پر اللہ جل شانہٗ نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپ کی ذات گرامی سے تاریکیاں چھٹ گئیں ایمان کا نور پھیل گیا۔ لاکھوں افراد جو کفر اور شرک کی وجہ سے مستحق دوزخ ہو چکے تھے انہوں نے اسلام قبول کیا اور وہ خود اور اُن کی قیامت تک کی آنے والی نسلیں جو دین اسلام قبول کریں گی وہ سب جنتی بن گئے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے انسانوں میں سے رسول بھیجا تاکہ وہ قول سے بھی بتائے اور عمل سے بھی کر کے دکھائے اور انہیں کے اندر رہتے ہوئے ان کی اصلاح کرے اُن کو اللہ کی آیات بھی سنائے اور اُن کو کتاب اور حکمت بھی سکھلائے اور اُن کا تزکیہ بھی کرے یعنی ان کے نفوس کو صفات رذیلہ اور اخلاق ذمیمہ سے پاک کرے، یہ مضمون تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹ میں بیان ہو چکا ہے جو پارہ اوّل کے ختم کے قریب ہے اس کو دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ

اور جس وقت تم کو ایسی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی مصیبت تم پہنچا چکے ہو تو کیا تم یوں کہتے ہو کہ یہ کہاں سے ہے آپ فرما دیجئے یہ تمہاری ہی طرف سے ہے

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جو تکلیف تمہیں پہنچی جس دن دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آئی تھیں سو یہ اللہ کے حکم سے تھا اور تاکہ اللہ تعالیٰ

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ

جان لے مؤمنین کو۔ اور جان لے ان کو جنہوں نے نفاق اختیار کیا اور اُن سے کہا گیا کہ آؤ جنگ کرو اللہ کی راہ میں یا

ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ

دفاع کرو، وہ کہنے لگے کہ اگر ہم جنگ کرنا جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے، وہ لوگ بہ نسبت ایمان کے آج کفر سے زیادہ قریب ہیں

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا

وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ خوب جاننے والا ہے اُس بات کو جسے وہ چھپاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا

لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ

اور خود بیٹھ رہے کہ اگر ہماری بات مانتے تو نہ مارے جاتے، آپ فرما دیجئے تم اپنی جانوں سے موت کو دفع کرو

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

اگر تم سچے ہو۔

مسلمانوں کو تسلی اور منافقوں کی بدحالی کا بیان

مسلمانوں کو جو غزوۂ احد میں وقتی طور پر شکست ہوئی اور اس سلسلہ میں تکلیف پہنچی اس مصیبت پر کچھ لوگوں کے منہ سے یہ نکلا اَنّٰی هٰذَا (یہ مصیبت ہم کو کہاں سے پہنچی؟) اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اے نبی! (ﷺ) آپ اُن کو جواب میں فرمادیں کہ یہ اسبابِ ظاہرہ میں تمہاری اپنی جانوں کی طرف سے ہے کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور پہاڑی پر جن تیراندازوں کو بٹھادیا گیا تھا انہوں نے باوجود تاکیدی حکم کے اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ اور مالِ غنیمت لوٹنے میں لگ گئے اس بات کو بیان فرماتے ہوئے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا بھی فرمایا کہ تم کو جو تکلیف پہنچی ہے گذشتہ سال غزوۂ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تم دشمنوں کو پہنچا چکے ہو۔ ستر آدمی اُن کے قتل ہوئے تھے اور ستر آدمیوں کو تم قیدی بنا کر مدینہ منورہ میں لے آئے تھے۔ اس میں تسلی دینے کا پہلو اختیار فرمایا کہ تم اپنے دشمنوں کو اپنی مصیبت سے دوگنی مصیبت پہنچا چکے ہو اب اگر تمہیں مصیبت پہنچ ہی گئی اور وہ بھی تمہاری نافرمانی کی وجہ سے تو اس پر غمگین کیوں ہو رہے ہو، پھر فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (جس دن دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئی تھیں اس روز تمہیں جو تکلیف پہنچی سو یہ تکلیف پہنچنا اللہ کے حکم سے تھا) یعنی سبب ظاہر وہی تھا جس کا ذکر ہوا کہ تم نے نافرمانی کی اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ جنگ کے موقع پر جو کچھ مصیبت پیش آئی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم تکوینی سے تھی وہ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ بعض حکمتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں اور بعض حکمتیں آگے بیان ہوتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ تاکہ اللہ مؤمنین کو جان لے کہ مخلص مؤمن کون ہیں۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا اور تاکہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جان لے جنہوں نے منافقت کی جو اندر سے مسلمان نہ تھے۔ زبانوں سے کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں گھل مل کر رہتے تھے اب جب جنگ کا موقعہ آیا تو ظاہری دوستی بھی چھوڑ بیٹھے اور اُن کا نفاق کھل کر ظاہر ہو گیا جس کی صورت آگے بیان فرمائی۔ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا یعنی ان سے کہا گیا کہ آجاؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ اگر جنگ نہیں کر سکتے ہو تو ہمارے ساتھ ہی رہو اگر ہمارے ساتھ رہو گے تو دشمن کو ہماری جماعت زیادہ نظر آئے گی اس سے بھی دشمن کے دفاع کی ایک صورت بنے گی (ذکرہ فی الروح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) آگے اُن کا جواب نقل فرمایا: قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ وہ کہنے لگے اگر ہم جنگ کرنا جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو ترجمہ میں ظاہر کیا گیا اور ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی مفید ہو سکتی ہے تو ہم تمہارے ساتھ جنگ میں شرکت کر لیتے، ہمارے خیال میں تو لڑائی کا ڈھنگ نہیں ہے یہ کیا لڑائی ہے کہ تم تھوڑے سے آدمی ہو اور دشمن زیادہ ہے۔ سامانِ حرب بھی تمہارے پاس کم ہے۔ کم سے کم برابر کی ٹکر ہو تو لڑائی لڑی جائے۔ غالب ہونے کی اُمید نہ ہو تو کم از کم مدافعت کرنے کی قوت تو ہو اب تو ظاہری حالات میں اپنے کو جنگ میں جھونک دینا سراسر ہلاکت میں ڈال دینا ہے۔ (ذکرہ فی الروح)

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ یعنی اس بات کے کہنے سے وہ اب ظاہر میں بھی کفر سے زیادہ قریب ہو گئے جبکہ اس سے ایمان کے جھوٹے دعوے کر کے مسلمانوں میں گھلے ملے رہنے کی وجہ سے ظاہر میں ایمان کے قریب تھے۔ اندر سے کافر تو پہلے ہی سے تھے لیکن ظاہر میں جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے اس دعوے پر خود ان کے اپنے قول و فعل نے پانی پھیر دیا۔ ہر عقل مند اُن کی باتوں کے پیش نظر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ مؤمن نہیں ہیں کیوں کہ باتیں کافروں جیسی کر رہے ہیں۔

پھر فرمایا يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ کہ وہ اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہیں۔ ان

کا یہ کہنا کہ ہم جنگ کو جانتے ہوتے یا یہ کہ جنگ کا ڈھنگ دیکھتے تو تمہارے ساتھ ہو جاتے دونوں باتیں ایسی ہیں جو اُن کے قلبی عزائم کے خلاف ہیں۔ حقیقی بات یہ ہے کہ وہ کوئی بھی حیلہ بہانہ کریں اُن کو تمہارے ساتھ ہونا ہی منظور نہ تھا۔ پھر فرمایا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یَکْتُمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ کو پوری طرح اس کا علم ہے جس کو وہ دلوں میں چھپاتے ہیں (مؤمنین تو اجمالی طور پر علامات سے ان کے ظاہر کو دیکھ کر باطن کا اندازہ کرتے ہیں اور اللہ جل شانہٗ پوری طرح انکے باطن سے باخبر ہے انکے قلبی عزائم کو پوری طرح جانتا ہے۔

جنگ میں شرکت نہ کرنے سے موت سے چھٹکارہ نہیں ہوسکتا...... منافقین کا مزید حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو لڑائی سے جان بچا کر بیٹھ رہے اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا (جو اُن کے نسب میں رشتہ دار تھے) کہ ہم نے تو پہلے ہی رائے دے دی تھی کہ جنگ نہ کی جائے ہماری بات مان لیتے تو مقتول نہ ہوتے، اُن کے جواب میں بطور سرزنش اور توبیخ کے ارشاد فرمایا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کہ آپ فرما دیجئے موت سے کہاں بچاؤ ہے لڑائی چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہے اور یہ سمجھ لیا کہ موت سے بچ گئے یہ بیوقوفی ہے موت تو پھر بھی آنی ہی ہے۔ جب تم کو موت آنے لگے جو اپنے مقررہ وقت پر آئے گی تو موت کو دفع کر دینا اور اُسے ٹال دینا اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ جنگ میں شرکت نہ کرنے سے موت سے بچاؤ ہوسکتا ہے۔

منافق کے نزدیک جان کی قیمت زیادہ ہے اللہ کی راہ میں جان دینے سے کتراتا ہے مؤمن کو اللہ کی رضامندی مقصود ہے وہ اللہ کے لئے جیتا ہے اور اُسی کے لئے مرتا ہے اللہ کے لئے لڑنے اور جان دینے سے اُسے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور ہرگز گمان نہ کرو اُن لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں،

فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ

وہ خوش ہیں اس سے جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا اور وہ خوش ہو رہے ہیں اُن لوگوں کی وجہ سے جو اُن کے پاس نہیں پہنچے۔ اُن کے پیچھے رہ گئے

اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّ

کہ کوئی خوف نہیں اُن پر اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے ۔ وہ خوش ہو رہے ہیں بوجہ نعمت اور فضل خداوندی کے اور اس بات

اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

سے خوش ہیں کہ بلاشبہ اللہ ضائع نہیں فرماتا مؤمنین کے اجر کو۔

وقف لازم ع ۱۷

شہداء زندہ ہیں اور خوش ہیں

اوپر کی آیت میں مذکور ہے کہ منافقین نے اللہ کی راہ میں مقتول ہو جانے والوں کے بارے میں یوں کہا تھا کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو مقتول نہ ہوتے، گویا کہ ان کا مقتول ہو جانا ان کے نزدیک اچھا نہ ہوا اور ان کی خیر خواہی اس میں ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مقتول نہ ہوتے اور دنیا میں اور زیادہ زندہ رہ جاتے، آیتِ بالا میں ان لوگوں کی جاہلانہ بات کا توڑ بھی ہے اور مؤمنین کو تسلی بھی ہے اور بشارت بھی

کہ جو حضرات اللہ کی راہ میں مقتول ہوئے اُن کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور دنیا کی چیزیں ان کے پاس نہیں ہیں تو یہ کوئی نقصان کی بات نہیں کیونکہ اُن کو وہاں ان کے رب کے پاس سے رزق ملتا ہے جو دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر اعلیٰ اور افضل ہے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انہیں عطا فرمایا اُس پر وہ خوش ہیں ہشاش بشاش ہیں۔ وہ تو نعمتوں میں ہیں اور رحمتوں میں ہیں اور منافقین خواہ مخواہ کی ہمدردی ظاہر کر رہے ہیں کہ ہماری بات مانتے تو مقتول نہ ہوتے یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی راہ میں مرجانا موت نہیں ہے بلکہ وہ زندگی ہے اور عمدہ زندگی ہے اور بہت بڑی زندگی ہے۔

جو حضرات شہید ہو گئے وہ نہ صرف اپنی نعمتوں میں خوش ہیں بلکہ وہ اُن مسلمانوں کے بارے میں بھی خوش ہو رہے ہیں جو اُن تک ابھی نہیں پہنچے اس دنیا میں اُن سے پیچھے رہ گئے۔ کہ اگر یہ لوگ بھی اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں تو ان پر بھی ہماری طرح انعام ہوگا نہ خوف زدہ ہوں گے نہ مغموم ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے اَجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ نہ اُس نے ہمارا اجر ضائع فرمایا نہ ہمارے بعد میں آنے والے اہلِ ایمان کا اجر ضائع فرمائے گا۔ **قال صاحب الروح** ص۱۲۳ ج۴، **ای یستبشرون بما تبین لهم من حسن حال اخوانهم الذین ترکوهم احیاء وهو انهم عند قتلهم فی سبیل الله تعالیٰ یفوزون کما فازوا او یحوزون من النعیم کما حازوا** ۔(صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: یعنی اپنے زندہ بھائیوں کے اچھے حالات واعمال کی خبر ملنے پر خوش ہوتے ہیں کہ وہ بھی بھی قتال فی سبیل اللہ میں کامیاب ہوتے ہیں جیسا کہ یہ کامیاب ہوئے یا وہ بھی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جیسا کہ یہ ہوئے۔)

حضرت مسروق تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ کا مطلب معلوم کیا انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب معلوم کر چکے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں ان کے لئے قندیل ہیں جو عرش سے لٹکے ہوئے ہیں وہ جنت میں جہاں چاہیں چلتے پھرتے ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں واپس آجاتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے خاص توجہ فرمائی اور اُن سے دریافت فرمایا کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے انہوں نے عرض کیا ہمیں کس چیز کی خواہش ہوگی؟ اور حال یہ ہے کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں چلتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے تین مرتبہ اسی طرح سوال فرمایا جب انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمیں کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی پڑے گا جب تک خواہش کا اظہار نہ کریں سوال ہوتا ہی رہے گا تو اللہ تعالیٰ شانہٗ سے عرض کیا کہ اے رب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں ہمارے جسموں میں واپس کر دی جائیں تا کہ ہم ایک بار پھر آپ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں جب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ انہیں اور کوئی حاجت نہیں ہے تو سوال کرنا چھوڑ دیا گیا (اوّل تو کسی چیز کی خواہش ظاہر نہ کی اور ظاہر کی بھی تو یہ کہا کہ ہمیں دنیا میں دوبارہ واپس بھیج دیا جائے تا کہ ایک بار پھر شہید ہو جائیں وہاں سے واپس آنے کا قانون نہیں اور اس کے سوا اور کچھ مانگتے نہیں لہٰذا آگے سوال نہیں فرمایا)۔ (رواہ مسلم ص۱۳۵ ج۲)

شہادت اور شہداء کی فضیلت کا مزید بیان سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

مع اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو مان لیا اس کے بعد کہ اُن کو زخم پہنچ چکا تھا ان میں سے جنہوں نے نیکی کے کام کئے اور تقویٰ اختیار کیا

وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

اُن کیلئے بہت بڑا ثواب ہے۔ یہ ایسے ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ لوگوں نے تمہارے لئے سامان کیا ہے لہٰذا تم اُن سے ڈرو تو اُن کی اس بات نے

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ

اُن کا اور زیادہ ایمان بڑھا دیا اور کہنے لگے کہ ہم کو اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ سو وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر واپس ہوئے

لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ

ان کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچی اور وہ اللہ کی رضامندی کے تابع رہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ جو بات پیش آئی صرف اس وجہ سے کہ شیطان اپنے

اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

دوستوں سے ڈراتا ہے سو تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

صحابہؓ کی تعریف جنہوں نے زخم خوردہ ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم مانا

درمنثور ص ۱۰۱ ج ۲ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب ابوسفیان اور اس کے ساتھی (غزوۂ احد کے بعد) واپس ہوئے اور مشرکین کا آپس میں مشورہ ہوا کہ ہم شکست دے کر واپس آ گئے (یہ تو کچھ بھی نہ ہوا) سب مسلمانوں کو ختم ہی کر دیتے لہٰذا واپس چل کر پھر حملہ کریں، اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگئی تو آپ اپنے صحابہؓ کو لے کر اُن کے پیچھے چلے اور مقام حمراء الاسد تک اُن کا پیچھا کیا جب ابوسفیان کو یہ پتہ چلا کہ آپ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں تو ابوسفیان اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں بنی عبدالقیس کے چند سواروں سے ملاقات ہوئی ان سے ابوسفیان نے کہہ دیا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ دو کہ ہم واپس لوٹ کر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تا کہ مسلمانوں کو بالکل ہی ختم کر دیں۔ ان لوگوں کی حمراء الاسد میں آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی انہوں نے ابوسفیان کی بات نقل کر دی اس پر آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہا کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور ہمارا کارساز ہے)۔

اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی (جس میں مسلمانوں کی تعریف ہے کہ غزوۂ اُحد میں زخم خوردہ ہونے کے بعد بھی) اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لی اور دشمن کا پیچھا کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے حمراء الاسد تک پیچھا کیا اور جب دشمن کی طرف سے یہ بھبکی ملی کہ ہم نے بہت سا سامان تیار کر لیا ہے۔ تو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ مضبوط اعتقاد اور یقین کے ساتھ پڑھ لیا۔ اور دشمن واپس نہ ہوئے اور سیدھے مکہ معظمہ چلے گئے۔

اور ابن شہاب زہری نے بحوالہ بیہقی فی الدلائل نقل کیا ہے کہ ابوسفیان نے چلتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اب بدر میں جنگ ہوگی جہاں تم نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا تھا اس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ بدر کے لئے روانہ ہوئے ساتھ ہی تجارت کے لئے سامان بھی لے لیا تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو جنگ کر لیں گے۔ ورنہ تجارت تو ہو ہی جائے گی جب یہ حضرات بدر کے لئے جا رہے تھے تو راستہ میں شیطان نے اپنے دوستوں کو ان کے ڈرانے کے لئے کھڑا کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے مقابلہ کے لئے

بہت سا سامان تیار کرلیا گیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے ارادہ سے باز آ ؤ اور احتیاط سے کام لو دشمن تم سے جنگ کرے گا اور تمہارا سامان چھین لے گا ان شیطانی حرکتوں کا ان حضرات پر کچھ اثر نہ ہوا اور برابر چلتے رہے حتیٰ کہ بدر میں پہنچ گئے وہاں دشمن کا نام ونشان بھی نہ تھا انہوں نے اپنے اموال کو فروخت کیا اور نفع کے ساتھ واپس ہوئے۔

مذکورہ بالا آیات میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف ہے جو غزوۂ احد میں چوٹ کھانے کے باوجود دشمن کا پیچھا کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور دشمن کی جھوٹی بھبکیوں اور شیطان کی حرکتوں کا بھی ذکر ہے۔ اور مسلمانوں کو جو مال تجارت میں نفع حاصل ہوا اس کا بھی تذکرہ ہے۔ شیطان کے دوستوں نے جوڈرایا کہ تمہارا دشمن ایسے ایسے سامان حرب سے لیس ہو کر حملہ آور ہونے والا ہے اس کا اثر لینے کی بجائے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور مضبوط یقین کے ساتھ انہوں نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہا جس سے اُن کا قلب بھی قوی ہوا ایمان بڑھ گیا۔ مؤمن بندوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا لازم ہے۔ شیطان اور شیطان کے دوستوں کی شرارتیں تو جاری رہتی ہی ہیں لیکن مسلمان کو اللہ کافی ہے اور وہی اُن کا کارساز ہے اگر اللہ کی مدد اور نصرت نہ ہوتی تو اسلام پورے عالم میں کیسے پھیلتا۔ شیطان اور اُس کے دوستوں نے کبھی بھی اسلام کی دشمنی میں کمی نہیں کی۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں جبکہ اللہ تو اپنی روشنی کو کامل کر کے رہے گا اگر چہ کافر برا مانیں)۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ

اور آپ کو وہ لوگ رنجیدہ نہ کریں جو تیزی کے ساتھ کفر میں جا پڑتے ہیں بے شک وہ لوگ اللہ کو کچھ بھی ضرر نہ دے سکیں گے، اللہ چاہتا ہے

اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ

کہ اُن کو آخرت میں کچھ بھی حصہ نہ دے اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کو ایمان کے

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِىْ

بدلہ خرید لیا وہ ہرگز اللہ کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور اُن کیلئے دردناک عذاب ہے۔ اور ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ ہم جو اُن کو مہلت دے رہے ہیں

لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

وہ ان کی جانوں کیلئے بہتر ہے، بات یہی ہے کہ ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہوں میں اور زیادہ ترقی کرلیں اور ان کیلئے عذاب ہے ذلیل کرنیوالا۔

جو لوگ تیزی کے ساتھ کفر میں گرتے ہیں ان کے عمل سے رنجیدہ نہ ہوں

اس آیت میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے تسلی دی ہے۔ خطاب تو آپ کو ہے لیکن تسلی کے مضمون میں تمام مسلمان شریک ہیں مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تیزی کے ساتھ کفر میں گر رہے ہیں اور کفر انہیں خوب زیادہ مرغوب ہے اُن کی حرکتوں اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف ان کوششوں سے رنجیدہ نہ ہوں اور یہ اندیشہ نہ کریں کہ یہ لوگ آپ کو نقصان پہنچا دیں گے اور آپ کے مقابلہ میں دوسروں کی مدد کریں گے۔ قال صاحب الروح ص۱۳۳ ج۴ والمراد لا یحزنک خوف ان یضروک ویعینوا علیک۔ (صاحب

روح المعانی فرماتے ہیں: لا یحزنک سے مراد یہ ہے کہ آپ کی مضرت رسانی اور اپنے مخالفوں کیلئے ان کی مدد کا غم نہ کریں)

حضرت مجاہد تابعی نے فرمایا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ سے یہاں منافقین مراد ہیں۔ جنہوں نے غزوۂ اُحد میں شرکت نہیں کی، اور حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ اس سے تمام کفار مراد ہیں۔ آیت نازل ہونے کے وقت خواہ منافقین ہی مراد ہوں لیکن مضمون عام ہے۔ تمام کافروں کی ہر قسم کی حرکتیں سامنے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو غمگین نہیں ہونا چاہیئے۔ کافر تیزی کے ساتھ کفر میں پڑتے ہیں اور اسلام کے خلاف کافرانہ سازشیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہاں مضاف مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لن یضروا أولیاء الله شیئا اور بعض اکابر نے یہاں لفظ ''دین'' کو مقدر مانا ہے۔ ای لن یضروا دین الله شیئا یعنی یہ لوگ اللہ کے دین کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ کافروں کی سازشیں ہمیشہ سے رہیں اور برابر رہیں گی۔ مؤمن بندے غمگین نہ ہوں کیونکہ دشمن کو تو دشمنی کرنی ہی ہے لیکن اُن کی دشمنی سے اللہ کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا جسے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا وہی تمہارا مددگار ہے۔ لہٰذا اسی پر بھروسہ کرو اور اس سے مدد مانگو۔

دشمن جو تیزی سے کفر میں گر رہے ہیں اور اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آخرت میں اُن کا ذرا سا حصہ بھی نہ ہو ظاہری دنیا کے اعتبار سے اُن کو غلط فہمی ہے کہ ہم اچھے رہے کہ اسلام قبول نہ کیا اور اپنے جان و مال کو بچالیا۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ آخرت کے منافع سے بالکل محروم ہو گئے بلکہ وہ وہاں بڑے عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

پھر فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (بے شک جن لوگوں نے کفر کو ایمان کے بدلہ خرید لیا وہ ہرگز اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور اُن کے لئے عذاب ہے دردناک) کفر کو ایمان کے بدلے خرید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کے بدلہ کفر اختیار کرلیا۔ ایمان کو چھوڑ کر کفر کو رغبت کی چیز بنالی۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہاں جو مکرر لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا فرمایا یہ بطور تاکید کے ہے اھ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس سے تعریض مقصود ہو اور مطلب ہو کہ یہ لوگ صرف اپنی ہی ذاتوں کو ضرر دے رہے ہیں۔ اللہ کو کوئی ضرر نہیں دے سکتے اور اپنی حرکتوں کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔

پھر فرمایا وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (اور ہرگز گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ ہم جو اُن کو مہلت دے رہے ہیں وہ اُن کی جانوں کے لئے بہتر ہے بات یہ ہے کہ ہم ان کو مہلت دے رہے ہیں اس لئے ہے کہ وہ گناہوں میں اور زیادہ ترقی کرلیں اور اُن کے لئے عذاب ہے ذلیل کرنے والا)

کافروں کو جو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم تو بہت اچھے حال میں ہیں۔ صاحبِ مال ہیں، صاحبِ اولاد ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں ہمیں اسی حال میں اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور ہماری زندگیاں دراز ہو رہی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض نہیں ہے۔ یہ ان کی ناسمجھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ہمارے ڈھیل دینے کو یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا ڈھیل دینا اُن کے حق میں بہتر ہے، ہم تو صرف اس لئے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہوں میں ترقی کرتے چلے جائیں پھر اُن کو خوب زیادہ سزا ملے۔ اور سزا بھی خوب ذلیل کرنے والی ہوگی۔ یہ مضمون قرآن مجید میں کئی جگہ میں وارد ہوا ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (اور جن لوگوں نے کہ ہماری آیات کو جھٹلایا ہم اُن کو اس طور پر بتدریج لئے جارہے ہیں کہ اُن کو علم بھی نہیں اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں، بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے)۔ سورۂ توبہ میں فرمایا: فَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ تَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ وَھُمْ کٰفِرُوْنَ ○ (سو ان کے اموال اور اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں

اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیاوی زندگی میں اُن کو گرفتار عذاب رکھے اور اُن کی جانیں اس حال میں نکل جائیں کہ وہ کافر ہوں)۔

مسلمانوں کو بھی اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ دنیا میں مال اولاد زیادہ ہونا دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ چیزیں ہوں وہ اللہ کا محبوب ہی ہو اللہ تعالیٰ جن سے ناراض ہے اُن کو بھی یہ چیزیں دیتا ہے بلکہ اپنے محبوبین سے زیادہ دیتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو جو دنیاوی چیزیں زیادہ عنایت فرماتا ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ یہ لوگ کفر اور معاصی میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرتے رہیں پھر ان کو یکبارگی سخت ترین عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ اسی طرح بہت سے فاسقوں اور فاجروں کو بھی مال بہت زیادہ دیتا ہے۔ مخلصوں اور متقیوں کو اتنا نہیں دیتا۔ جن لوگوں کو اللہ کا تکوینی قانون معلوم نہیں ہے وہ اس پر تعجب کرتے ہیں اور بعض تو تعجب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر اعتراض بھی کر دیتے ہیں، جنہیں ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ حلال مال مل گیا گو تھوڑا ہی ہو وہ بہت مبارک ہے اور جسے کفر کے ساتھ مال دولت مل گیا یا فسق و فجور کے ساتھ مال مل گیا جس کی وجہ سے کافر ہو جاتے ہیں یا وہ شخص فسق و فجور میں ترقی کرتے رہتے ہیں تو یہ کوئی نعمت کی چیز نہیں ہے استدراج کا خطرہ پیش نظر رہنا چاہیئے اگر مال حلال ہی ہو اور گناہوں میں خرچ ہو تو یہ زبردست مواخذہ کی چیز ہے اور اگر حرام ہو تو وہ سراپا عذاب ہی عذاب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کر کیونکہ تجھے معلوم نہیں کہ موت کے بعد اُسے کس مصیبت سے دوچار ہونا ہے اس کے لئے اللہ کے نزدیک ایک قاتل ہے جو کبھی نہ مرے گا۔ یعنی دوزخ کی آگ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۷)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ

اللہ مؤمنین کو اس حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ فرما دے، اور اللہ تم کو

اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

امور غیب پر مطلع نہیں فرماتا لیکن اللہ منتخب فرما لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے، سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے

وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

رسولوں پر، اور اگر تم ایمان پر قائم رہے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے ثواب عظیم ہے۔

اللہ تعالیٰ اچھے اور بُرے لوگوں میں امتیاز فرمائے گا

منافقین مخلص مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے ان کے ظاہری دعوؤں کی وجہ سے اور بعض نمازوں میں حاضر ہونے کی وجہ سے ظاہری طور پر یہ امتیاز نہ ہو پاتا تھا کہ منافق کون ہے اور مخلص کون ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تم کو اس حالت پر نہیں رکھنا چاہتا جس پر تم اب ہو بلکہ اللہ پاک کی طرف سے ایسے شدائد اور مصائب پیش آتے ہیں اور پیش آئیں گے کہ ناپاک لوگ یعنی منافقین کا پاک لوگوں (یعنی مخلصین) سے امتیاز ہو جائے کیونکہ مصیبت کے وقت اپنے پرائے کا اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے۔

پھر فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اس میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ تمہیں منافقین کے نفاق پر اس طرح مطلع فرما دیں کہ تم اُن کے قلوب کو جان لو ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، حکمت یہ ہے کہ عملی طور

پر ظاہری طریقے پر منافقوں کا نفاق کھل جائے اور وہ اس طرح سے واضح ہو کہ جب مصیبتیں پیش آئیں اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے مواقع آئیں تو منافقین بھاگ نکلیں غزوۂ احد میں عمل سے بھی راہِ فرار اختیار کی اور زبانی طور پر بھی ایسے کلمات بول اُٹھے جن سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ اندر سے مؤمن نہیں ہیں۔ اگر مسلمانوں کو منافقوں کے قلوب کا حال بتا دیا جاتا اور مسلمان اپنے اسی علم کی بنیاد پر یہ کہتے کہ تم منافق ہو مسلمان نہیں ہو تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ تمہارے پاس ہمارے منافق ہونے کی کیا دلیل ہے تم غلط کہتے ہو ہم تو سچے پکے مسلمان ہیں۔ لیکن جب مصیبتوں کا سامنا ہوا اور منافق بھاگ کھڑے ہوئے تو ظاہری طور پر خود ہی مسلمانوں سے الگ ہو گئے اور اب اُن کا یہ منہ نہ رہا کہ مؤمن مخلص ہونے کا دعویٰ کریں۔

ہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے غیب کی بات بتا دیتا ہے اس غیب میں یہ بھی ہے کہ کسی کا نفاق اور دل کا چور اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتا دے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ظاہر فرمائے یا مصائب اور شدائد اور تکالیف اور قربانی کے مواقع سامنے لا کر منافقین کا نفاق ظاہر فرمائے اور سب کے سامنے رسوا فرمائے یہ سب حکمت کے مطابق ہے **قال صاحب الروح ص ۱۳۷ ج ۴ والاستدراک اشارۃ الٰی کیفیۃ وقوعہ علی سبیل الاجمال وان المعنی ما کان اللہ لیترک المخلصین علی الاختلاط بالمنافقین بل یرتب المبادی حتی یخرج المنافقین من بینھم وما یفعل ذٰلک باطلاعکم علی ما فی قلوبھم من الکفر والنفاق ولکنہ تعالٰی یوحی الی رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم فیجزہ بذٰلک وبما ظھر منھم من الاقوال والافعال حسبما حکی عنھم بعضہ فیما سلف فیفضحھم علی رؤس الاشھاد ویخلصکم مما تکرھون۔**

(صاحب روح المعانی" فرماتے ہیں اور لٰکِنَّ سے استدراک اجمالی طور پر منافقین کی اطلاع کے وقوع کی طرف اشارہ ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلصوں کو منافقین کے ساتھ ملا ہوا نہیں چھوڑے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا فرمائے گا کہ منافقین جدا ہو جائیں گے اور اس سے ان کے دلوں میں موجود کفر و نفاق کی اطلاع کر دے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کر کے اس کی خبر دیتا ہے اور اس سلسلہ میں ان سے ظاہر ہونے والے افعال و اقوال کو واضح کرتا ہے کہ خود انہی کے لوگ اپنی گذشتہ کسی بات کو ظاہر کر دیتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ انہیں سب کے سامنے رسوا کر دیتا ہے اور تمہیں تکلیف دہ امور سے بچا دیتا ہے۔)

آخر میں فرمایا فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ یعنی اسی پر ثابت قدم رہو، اور اگر تم مؤمن رہو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے)۔

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ

اور ہرگز خیال نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اُس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بخل کرنا اُن کے لئے بہتر ہے،

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ

بلکہ وہ اُن کے لئے برا ہے، جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا عنقریب قیامت کے دن ان کو اس کا طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ کے لئے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع ۱۸/۹/۹

آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور اللہ اُن کاموں کی خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔

جو لوگ بخیل ہیں وہ بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں

جو لوگ مؤمن نہ تھے وہ اللہ کی راہ میں جس طرح جان دینے سے بچتے تھے اسی طرح مال خرچ کرنے سے بھی گریز کرتے تھے۔ اس آیت میں بخل کی مذمت فرمائی اور فرمایا کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں جو لوگ کنجوسی کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کا یہ عمل اُن کے لئے بہتر ہے۔ یہ تو اُن کے لئے بہت ہی بُرا ہے اور اس کا برا انجام آخرت میں سامنے آئے گا۔ ان کا مال قیامت کے دن طوق بنا کر اُن کے گلوں میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جسے اللہ نے مال دیا پھر اُس نے اُس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کا مال قیامت کے دن گنجا سانپ بنا دیا جائے گا (جس سانپ کے زیادہ زہریلا ہونے کی وجہ سے سر کے بال اُڑ گئے ہوں اُسے گنجا سانپ کہا جاتا ہے) یہ گنجا سانپ اُس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا پھر وہ اُس کی دونوں باچھوں کو پکڑ کر کہے گا انا مالک انا کنزک (کہ میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں) پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ (الآیۃ) (رواہ البخاری ص ۱۸۸ ج ۱) پھر فرمایا وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یعنی آسمانوں کی اور زمین کی میراث سب اللہ کے لئے ہے) سب کا وہی مالک ہے ملکیت حقیقی میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کا حکم نازل ہونے پر خرچ نہ کرنا اور مال خرچ کرنے میں اللہ کی رضا کا خیال نہ کرنا بڑی بے وقوفی ہے جن مالوں کو آپس میں یکے بعد دیگرے میراث میں تقسیم کر لیتے ہیں وہ اوّلاً آخراً سب اللہ ہی کا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ اور جو بھی عمل کرتے ہو سخاوت ہو یا کنجوسی، خیر ہو یا شر اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے وہ ان سب کا بدلہ دے گا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا (وقف لازم)

بلاشبہ اللہ نے سن لی اُن کی بات جنہوں نے کہا ہے کہ بے شک اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں، عنقریب ہم اُن کی بات کو

وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ

لکھ لیں گے اور جو انہوں نے نبیوں کے ناحق خون کئے ہیں اس کو بھی لکھ لیں گے اور ہم کہیں گے کہ چکھ لو جلنے کا عذاب۔ یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تمہارے

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ

ہاتھوں نے آگے بھیجے، اور بلاشبہ اللہ بندوں پر ظلم فرمانے والا نہیں ہے۔ جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ نے ہم سے یہ فرمایا کہ ہم کسی رسول پر ایمان

لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ

نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی کی چیز نہ لائے جسے آگ کھا جائے، آپ فرما دیجئے مجھ سے پہلے بہت سے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور جو تم

وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ

کہہ رہے ہو وہ بھی لائے پھر تم نے اُن کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو؟ سو اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے رسول جھٹلائے

مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

جا چکے ہیں وہ کھلی کھلی نشانیاں لائے اور صحیفے لائے اور روشن کتاب لائے۔

یہود کی بیہودگی اور اُن کے لئے عذاب کی وعید

لباب النقول ص ۶۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دن یہودیوں کے بیت المدارس (یعنی مدرسہ) میں تشریف لے گئے وہاں ایک شخص کے پاس یہودی جمع تھے جس کا نام فنحاص تھا فنحاص نے کہا اے ابوبکر ہمیں اللہ کی طرف کوئی محتاجی نہیں اور اللہ ہمارا محتاج ہے اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض کیوں مانگتا۔ تمہارا نبی یہ بتاتا ہے کہ اللہ قرض طلب کرتا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور فنحاص کے چہرے پر طمانچہ مار دیا۔ فنحاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا اور کہنے لگا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھو تمہارے ساتھی نے میرے ساتھ کیا کیا۔ آپ نے ابوبکرؓ سے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے بہت سخت بات کہی ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ اس پر فنحاص منکر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ جب آیت کریمہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا نازل ہوئی تو یہودی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے محمد! تمہارا رب تو فقیر ہو گیا۔ وہ بندوں سے مانگتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ (آخیر تک) نازل فرمائی۔ یہ تو مشہور ہی ہے کہ اعتراض کرنے والا اندھا ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے زکوٰۃ صدقات دینے کا جو حکم فرمایا پھر اس پر آخرت میں ثواب دینے کا وعدہ فرمایا اس کو مہربانی کے طور پر قرض سے تعبیر فرما دیا کہ یہاں میرے بندوں پر خرچ کر دو اور اس کا اجر و ثواب میں تم کو آخرت میں دے دوں گا۔ سارے بندے اور بندوں کے سارے مال سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں وہ اگر سارے مال خرچ کا حکم دیتا اور بالکل کچھ بھی ثواب نہ دیتا تو اُسے اس کا بھی اختیار ہے وہ تو بے غرض اور بے حاجت ہے غنی ہے مغنی ہے بے نیاز ہے اُسے کسی چیز کی حاجت نہیں اس نے ابتلاء اور امتحان کے طور پر بندوں کو حکم دیا کہ بندوں پر خرچ کریں اور اپنے پاس سے دینے کا وعدہ فرما لیا۔ یہودیوں نے اس کرم اور فضل اور مہربانی کو نہ سمجھا کہ اللہ نے اپنے دیئے ہوئے مال میں سے حکم کے مطابق خرچ کرنے کا نام قرض رکھ دیا اور ثواب کا وعدہ فرما لیا اور قرآن کی اس تعبیر پر اعتراض کر بیٹھے اور کہنے لگے کہ اللہ فقیر ہو گیا ہم سے مانگتا ہے۔ لہٰذا ہم مالدار ہوئے اور وہ فقیر ہوا۔ (العیاذ باللہ)

اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ انہوں نے جو کہا ہے اس کو ہم لکھ لیں گے۔ یعنی صحائف اعمال میں اس کو درج کرا دیں گے اور ان کی یہ بات محفوظ رہے گی۔ جس پر ان کو سزا ملے گی۔ یہودیوں کی اس بات میں اللہ جل شانہٗ کے بارے میں بدعقیدہ ہونے کا اظہار ہے اور قرآن کا استہزا ہے اور اُن کا ایک یہی قول باعث عذاب و عقاب نہیں ہے بلکہ وہ تو اور بھی بہت سی بُری حرکتیں کر چکے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ناحق انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کیا۔ یہ کام کیا تو تھا ان کے آباء و اجداد نے لیکن موجود یہودیوں کو اس پر کوئی نکیر نہیں اور اپنے آباء و اجداد کے اس عمل سے راضی ہیں لہٰذا یہ بھی قیامت کے دن ان کے اعمال ناموں میں لکھا ہوا ملے گا۔ کافرانہ عقیدوں اور حرکتوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کا عذاب چکھ لو اور یہ عذاب تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے دنیا میں کئے اور آخرت میں بھیج دیئے۔ جو کچھ بھی عذاب ہے تمہارے اپنے کئے کا پھل ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم فرمانے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد یہودیوں کی ایک اور بات نقل فرمائی پھر اس کا جواب دیا۔ یہودیوں نے کہا کہ اے محمد ﷺ ہم تم پر کیسے ایمان لائیں۔ ہمیں تو اللہ نے توراۃ میں حکم دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ جو بھی کوئی شخص رسالت اور نبوت کا مدعی ہو ہم اس کی تصدیق نہ کریں جب تک

کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش نہ کرے اور یہ قربانی ایسی ہو جسے آگ جلا کر بھسم کر دے۔ یہ آگ کا جلانا دلیل اس بات کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی قبول ہوگئی اور یہ شخص جس نے قربانی پیش کی ہے واقعی اللہ کا رسول ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ آپ جواب میں فرما دیجئے کہ تم سے پہلے کثیر تعداد میں انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ان کے پاس کھلے کھلے معجزات تھے اور تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ قربانی پیش کی جائے جسے آگ جلا دے انہوں نے تمہارے سامنے یہ بھی کیا قربانیاں پیش کیں جنہیں آگ نے جلایا، تم تو اس پر بھی ایمان نہ لائے، اور نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ تم نے اُن کو قتل کر دیا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو انبیاءِ سابقین پر ایمان لے آتے بات یہ ہے کہ تمہیں ایمان لانا نہیں ہے بطور کٹ حجتی حیلے بہانے تراشنے کے لئے ایسی باتیں کہتے ہو۔ (روح المعانی ص ۱۴۱ تا ۱۴۴ ج ۴)

پھر فرمایا فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْا بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے۔ وہ حضرات کھلے کھلے معجزات لے کر آئے اُن کے پاس اللہ کے عطا فرمودہ صحیفے تھے اور خوب اچھی طرح واضح کر کے بیان کرنے والی کتاب تھی۔ اس سب کے باوجود جنہیں ایمان نہ لانا تھا وہ ایمان نہ لائے اور رسولوں کی تکذیب کرتے رہے، اگر آپ کی تکذیب کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اُن حضرات نے صبر کیا آپ بھی صبر کریں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ

ہر جان موت چکھنے والی ہے اور بات یہی ہے کہ تم کو قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، سو جو شخص بچا دیا گیا آگ سے

اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

اور داخل کر دیا گیا جنت میں سو وہ کامیاب ہو گیا، اور دنیا والی زندگی دھوکہ کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے

اس آیتِ شریفہ میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کو مرنا ہے اور موت کا مزہ چکھنا ہے مؤمن ہو یا کافر سب کو یہاں سے چلا جانا ہے۔ اور زندگی کا مرحلہ موت پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی میں جو اچھے یا بُرے کام کئے موت کے بعد اُن کا بدلہ ملے گا اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ حساب ہوگا اعمال کی پیشی ہوگی۔ قاضی روزِ جزا جل مجدہٗ فیصلے فرمائے گا۔ ان فیصلوں کے نتیجے میں ایک جماعت دوزخ میں اور ایک جماعت جنت میں جائے گی جو شخص دوزخ سے بچا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اصل کامیاب وہی ہے۔

کامیاب کون ہے؟...... لوگوں نے دنیا میں اپنی کامیابی کے لئے بہت سے معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ حکومتوں والے سمجھتے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں۔ سیٹھ اور مہاجن اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ ہم کامیاب ہیں، بڑے بڑے عہدوں پر پہنچنے والے اپنی کامیابی کے گھمنڈ میں ہیں، بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے گمان کر رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں، ان لوگوں کو آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذرا بھی دھیان نہیں ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ جو دوزخ سے بچا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہے، اس میں یہودیوں کو بھی نصیحت ہوگئی جو اپنے احوال اور اموال میں مست ہیں اور کفر کو اختیار کرنے کے باوجود اپنے کو کامیاب سمجھ رہے ہیں یہ لوگ بہت بڑی گمراہی میں ہیں اور اپنی جانوں کو دوزخ میں دھکیل رہے ہیں یہاں کی عارضی زندگی کو کامیابی سمجھ رہے ہیں اور دوزخ کے داخلے کی صورت میں جو

ناکامی سامنے آئے گی اور جو جنت سے محرومی ہوگی اس بات کی طرف ذرا دھیان نہیں ہے۔

مسلمانوں کو بھی اس میں تعلیم دی گئی کہ دنیا میں کسی قوم یا فرد کی مال اور دولت والی زندگی دیکھ کر اپنے کو ناکام نہ سمجھیں۔ جب مؤمن ہو اور جنت اور دوزخ کو مانتے ہو اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ مؤمن جنت میں اور کافر دوزخ میں داخل ہوں گے تو اپنی وہاں کی کامیابی پر نظر رکھو اور اُسی پر خوش رہو۔

دنیا دھوکہ کا سامان ہے ...... آخر میں فرمایا وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (اور دنیا والی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں) اس جملے کی تشریح ہزاروں صفحات میں ہو سکتی ہے۔ دنیا اور احوالِ دنیا اور اصحابِ دنیا اور اُن کے احوال پر نظر ڈالیں تاریخ کا مطالعہ کریں۔ بادشاہوں کی تاریخ دیکھیں۔ دولت مندوں کے واقعات سنیں، اپنے سامنے جو دنیا میں حوادث پیش آرہے ہیں اُن کو دیکھیں انقلابات پر نظر ڈالیں تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ دنیا والی زندگی صرف دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ جس کی مثال کھیتی کی طرح ہے آج لہلہا رہی ہے۔ کل کو سوکھ گئی کسانوں نے کاٹ پیٹ کر برابر کر دی (فاصبح هشيمًا تذروه الرياح) لوگوں کے سامنے انقلابات ہیں، حوادث ہیں، قرونِ اولیٰ کی تاریخ ہے اور یہ بھی پتہ ہے کہ مریں گے۔ پھر بھی دنیا ہی سے دل لگائے ہوئے ہیں اُسی کے لئے سوچتے ہیں۔ اسی کے لئے جیتے ہیں اسی کے لئے مرتے ہیں اور آخرت کی دائمی اور عظیم نعمتوں کے حاصل کرنے کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے اور دوزخ کے عذاب سے بچنے کا ذرا دھیان نہیں کرتے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

تم لوگ ضرور ضرور آزمائے جاؤ گے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور جن لوگوں نے شرک کیا اُن کی

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

طرف سے ضرور بالضرور بہت سی باتیں دل آزاری کی سنو گے، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

جانوں اور مالوں میں تمہاری ضرور آزمائش ہوگی

اس آیت شریفہ میں مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ صبر اور آزمائش کے جو واقعات تمہارے سامنے آئے یہ نہ سمجھو کہ یہ آخری ہیں ان کے بعد بھی ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے جن سے تمہاری آزمائش ہوتی رہے گی۔ یہ آزمائش جانوں میں بھی ہوگی اور مالوں میں بھی ہو گی، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ سب کو برداشت کرتے رہو، نیز اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہیں ایذا پہنچاتے رہیں گے اور اُن سے ایسی باتیں سنو گے جن سے تمہیں دکھ پہنچے گا۔ دشمن اپنی حرکت سے باز نہ آئے گا۔ تمہیں ان کی ایذاؤں سے اور بدزبانیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ صبر اختیار کرو اور تقویٰ کو ہاتھ سے نہ جانے دو تمہارے لئے اسی میں خیر ہے اور صبر اور تقویٰ اختیار کرنا ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

صبر کرنے سے تسلی ہوتی ہے اور تقویٰ سے اعمالِ صالحہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں اختیار کر لیں دشمن کی دل آزاریوں سے صرفِ نظر کرنا آسان ہوگا۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫

اور جب اللہ نے ان لوگوں سے مضبوط عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم ضرور ضرور کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور اس کو نہ چھپانا،

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ

سو انہوں نے اس کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا اور انہوں نے اس کے ذریعہ تھوڑی سی قیمت خرید لی، سو بُری ہے وہ چیز جو وہ خریدتے ہیں۔ آپ ہرگز

الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ

خیال نہ کریں کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے اُن پر اُن کی تعریف کی جائے اُن کے بارے میں آپ ہرگز یہ خیال

مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

نہ کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ گئے اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے ملک آسمانوں اور زمینوں کا اور اللہ ہر

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ؑ

چیز پر قادر ہے۔

ع ۱۹ / ۱۰

اہلِ کتاب سے میثاق لینا اور ان کا عہد سے پھر جانا

جن لوگوں کو اُمت محمدیہؐ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دی گئی جن میں یہود و نصاریٰ کے علماء بھی تھے اُن سے اللہ تعالیٰ نے عہد لیا تھا کہ جو کتاب تمہیں دی گئی ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور کسی چیز کو چھپانا نہیں۔ عہد کی اُن لوگوں نے پاسداری نہ کی اور اس کو پسِ پشت ڈال دیا اور حقیر دنیا حاصل کرنے کے لئے کتاب کے مضامین کو چھپایا اور حق کو بیان کرنے سے پیچھے ہٹتے رہے۔ اللہ کے عہد کو پس پشت ڈال کر اور حق کو چھپا کر جو اپنے معتقدین سے ذرا بہت دنیا حاصل کر لی یہ انہوں نے بہت بڑے نقصان کا سودا کیا اپنی آخرت برباد کی اور ذرا سی دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، حق چھپانے کے واقعات یہودیوں کی طرف سے پیش آتے رہتے تھے ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماءِ یہود سے کوئی بات پوچھی (جو توریت شریف میں تھی) اُن لوگوں نے اصل بات کو چھپا دیا اور اس کی جگہ دوسری بات نقل کر دی۔ جب وہاں سے چلے گئے تو خوش ہو رہے تھے کہ واہ ہم نے خوب کام کیا اور اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی اس پر تعریف کی جائے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب بیان کر دی اس پر آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ منافقین میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں نہیں گئے اور مدینہ منورہ ہی میں بیٹھے رہے جب آپ واپس تشریف لائے تو جھوٹے عذر پیش کئے جن پر قسمیں کھا گئے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ جو کام نہیں کیا اس پر تعریف کی جائے (یعنی جہاد کے شرکاء میں اُن کو شامل کر لیا جائے) اس پر آیتِ کریمہ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ (آخر تک) نازل ہوئی۔ (درمنثور ص ۱۰۸ ج ۲)

دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ دونوں ہی باتیں سبب نزول ہو سکتی ہیں۔ انسان کے نفسانی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی

تعریف کی جائے اور اس کی محبت اس درجہ میں ہے کہ جو عمل نہیں کئے وہ عمل اس کی طرف منسوب کئے جائیں اور پھر ان کی تعریف کی جائے، یہودیوں اور منافقوں کا یہی طریقہ تھا اور بھی بہت سے لوگ اس مزاج کے پائے جاتے ہیں، جو حضرات متقی اور محتاط ہیں وہ اپنے اعمال حسنہ پر بندوں کی طرف سے تعریف کئے جانے کی تمنا نہیں کرتے پھر جو عمل نہیں کئے ان پر کہاں تعریف کے متمنی ہو سکتے ہیں؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ بازار میں گذر رہے تھے ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ دیکھو یہ شخص پوری رات نماز پڑھتا ہے۔ یہ سن کر حضرت امام صاحب پوری رات نماز پڑھنے لگے اور فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ اس عمل پر میری تعریف ہو جو میں نے نہیں کیا۔

یہودیوں نے اور منافقین نے جو اس بات کی آرزو کی کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے ان پر ان کی تعریف کی جائے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم کامیاب ہو گئے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ یہ لوگ عذاب سے چھوٹ گئے بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے)۔

آخر میں فرمایا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اس میں بہت سی باتیں آ گئیں جو لوگ حقیر دنیا کے لئے حق کو چھپاتے تھے ان کو بھی بتا دیا کہ جو کچھ لینا ہے اللہ سے لو اس کی رضا کے کام کر کے لو۔ ہر چیز کا وہی مالک ہے اور مسلمانوں کو بھی توجہ دلا دی کہ اگر دنیا میں کسی فاسق فاجر کے پاس مال زیادہ ہے تو اس کی طرف نظریں نہ اٹھائیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے وہ جب چاہے گا تم کو بھی عطا فرما دے گا اور اس کی مشیت ہوگی تو تمہیں دشمنوں سے زیادہ عطا فرما دے گا وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں،

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین

وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ

کے پیدا کرنے میں، اے ہمارے رب آپ نے اسکو عبث پیدا نہیں فرمایا، ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں سو آپ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا دیجئے۔ اے ہمارے رب اس میں شک

تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا

نہیں کہ جسے آپ دوزخ میں داخل فرما دیں تو واقعی آپ نے اسکو رسوا کر دیا، اور ظالموں کیلئے کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب بلاشبہ ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان کیلئے پکار

يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا

رہا ہے کہ تم ایمان لاؤ اپنے رب پر، سو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب سو آپ مغفرت فرما دیجئے ہمارے گناہوں کی، اور کفارہ کر دیجئے ہمارے گناہوں کا اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ

موت دیجئے اے ہمارے رب اور ہمیں عطا فرمائیے جو آپ نے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجئے بلاشبہ آپ وعدہ خلافی

لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ

نہیں فرماتے۔ پس اللہ پاک نے ان کی دُعا قبول فرمائی کہ میں ضائع نہ کروں گا تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا

اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ

عورت، تم آپس میں ایک دوسرے سے ہو سو جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو ایذا دی گئی

سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ

اور انہوں نے جنگ کی اور قتل کئے گئے سو میں ضرور ضرور ان کے گناہوں کا کفارہ کردوں گا، اور اُن کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے

تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

نہریں جاری ہوں گی یہ بدلہ ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

عقلمندوں کی صفات اور اُن کی دعائیں

ان آیات میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ آسمانوں کو اور زمین کو جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کا جو نظام رکھا ہے جس کے مطابق رات اور دن آگے پیچھے آتے رہتے ہیں اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں یعنی یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ان کا پیدا فرمانے والا قادرِ مطلق ہے، خالق ہے، حکیم ہے۔ یہ نشانیاں ایسی ہیں کہ عقل والے ان کو دیکھتے ہیں اور ان کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! یہ جو کچھ آپ نے پیدا فرمایا ہے بے کار عبث اور لایعنی نہیں ہے۔ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تو ہمیں عذاب دوزخ سے بچا دینا۔ درمیان میں ان عقل والوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ لوگ کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ زبان سے اور دل سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اللہ کی ذات وصفات کا تذکرہ کرنا اس کی تکوین وتخلیق بیان کرنا اس کی قدرت اور حکمت کا تذکرہ کرنا یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہے جن لوگوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے وہی حقیقت میں عقل والے ہیں اور ان کے عقل مند اور عارف ہونے کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں، کھڑے ہوں، چل رہے ہوں کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ کسی جگہ پر بیٹھے جس میں انہوں نے اللہ کو یاد نہ کیا اور اپنے نبی پر درود نہ بھیجا تو یہ مجلس ان کے لئے نقصان کا باعث ہوگی۔ اللہ چاہے تو ان کو عذاب دے اور چاہے تو مغفرت فرمائے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی جگہ میں لیٹا اس میں اللہ کو یاد نہ کیا تو اس کا یہ لیٹنا اللہ کی طرف سے اس کے لئے نقصان کا باعث ہوگا اور جو شخص کسی جگہ میں چلا اس نے چلنے کے دوران اللہ کو یاد نہ کیا تو یہ چلنا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقصان کا باعث ہوگا۔ (الترغیب ص۴۰۹ ج۲) درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی اس عالم کی روح ہے جب تک اس دنیا میں ایک مرتبہ بھی اللہ اللہ کہا جاتا رہے گا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی۔ (کما رواہ مسلم ص۸۴ ج۱)

آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں عقلمند سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر سائنس کی معلومات میں اور دیگر امور کی معرفت حاصل کرنے میں بہت محنت کی ہے لیکن ان معلومات کے ذریعہ انہوں نے خالق کائنات جل مجدہ کو نہیں پہچانا۔ ان میں بہت

سے تو خالق جل مجدہ کے وجود ہی کے منکر ہیں اور جو لوگ اسے موجود مانتے ہیں وہ بھی اس کے صفات جلال و جمال کو نہیں جانتے اور اس کی تکوینی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اس کے مظاہر قدرت سے اس کی معرفت حاصل کرنے کی بجائے مادہ ہی کو یا طبیعت ہی کو سب کچھ مانتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ طبیعت خود ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئی۔ یہ ان لوگوں کی اپنے خالق کی معرفت سے محرومی ہے پھر انہیں یہ احساس نہیں کہ ہم کیوں پیدا ہوئے اور اس دنیا کے بعد ہمارا کیا بنے گا اور یہ کہ ہمارے خالق نے زندگی گزارنے کا جو نظام بھیجا ہے وہ ہم پر قبول کرنا فرض ہے ان کے علوم اور تجربات سب اسی دنیا تک ہیں یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔

اولوا الالباب (عقل والے لوگوں) کی جو دعائیں ذکر فرمائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (کہ اے ہمارے رب! بلاشبہ آپ جسے دوزخ میں داخل فرمائیں اسے رسوا فرمائیں گے) اور یہ ایسی رسوائی ہے جس سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں۔ دوزخ کا عذاب عَذَابٌ مُّهِيْنٌ یعنی ذلیل کرنے والا ہے، اور وہاں کی رسوائی سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں۔ تمام اولین و آخرین کے سامنے ذلیل ہونا بہت بڑی رسوائی ہے، لوگ یہ تو سوچتے ہیں کہ دنیا میں رسوائی نہ ہو اور آخرت کی رسوائی سے محفوظ رہنے کا کوئی خیال نہیں رکھتے وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ پھر فرمایا وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا) سب سے بڑا ظلم کفر ہے۔ کما قال تعالیٰ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ میدانِ قیامت میں کافروں کا نہ کوئی دوست ہوگا نہ مددگار اور نہ سفارشی۔

اولو الالباب یعنی عقل والوں کی یہ دعا بھی ذکر فرمائی: رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (اے ہمارے رب بلاشبہ ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار سنی جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، سو اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے، سو ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمارے گناہوں کا کفارہ فرما اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ موت دیجئے، اے ہمارے رب اور ہمیں وہ اجر ثواب عطا فرما جس کا ہم سے آپ نے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے، بلاشبہ آپ وعدہ خلاف نہیں فرماتے) اس دعا میں جو مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ وارد ہوا ہے اس کے بارے میں صاحب روح المعانی نے مفسرین کے دو قول لکھے ہیں۔

اوّل یہ کہ اس سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہی مروی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے قرآن کریم مراد ہے۔ مفسر طبری نے اسی کو اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن ایسا منادی ہے جو قیامت تک باقی رہے گا اور ایمان کی دعوت دیتا رہے گا۔

پھر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ جس جس کو بھی (تا قیامت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی اور آپ کی دعوت پہنچی (اگرچہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے) ان سب کے حق میں آپ منادی اور ہادی اور داعی ہیں۔ اس لئے بعد میں آنے والے بھی آپ کے بارے میں سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا پہلا قول بھی صحیح ہے۔

صاحب روح المعانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مُنَادِيًا فرمایا اور دَاعِيًا نہیں فرمایا کیونکہ نداء معنوی اعتبار سے ابلغ ہے کیونکہ نداء آواز بلند کرنے کے بغیر نہیں ہوتی اور ظاہر ہے نداء دور تک پہنچتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبوں میں خوب بلند آواز سے نصیحت اور موعظت

فرماتے تھے اور حاضرین سے یہ بھی فرماتے تھے "لیبلغ الشاھد منکم الغائب" (یعنی جو لوگ موجود ہیں ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں)۔

"فَامَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا" اس میں فاء تفریعیہ ہے مطلب یہ کہ ہم منادی کی آواز سن کر ایمان لے آئے لہٰذا ہمارے گناہ معاف فرما دیجئے چونکہ مغفرت ایمان پر مرتب ہے اس لئے درمیان میں فاء لائی گئی۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایمان نہ ہو تو گناہوں کی مغفرت نہیں ہوسکتی اور کافر کی توبہ کافر ہوتے ہوئے مقبول نہیں۔

"وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّـاٰتِنَا" (اور ہماری برائیوں کا کفارہ فرما دیجئے) ذُنُوْبَنَا کے بعد جو سَيِّـاٰتِنَا لایا گیا ہے اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ذُنُوْبَنَا سے پہلے گناہ اور سَيِّـاٰتِنَا سے پچھلے گناہ مراد ہیں اور دوسرا قول یہ لکھا ہے کہ ذُنُوْبَنَا سے کبائر اور سیّئا تِنَا سے صغائر مراد ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ ذُنُوْبَنَا سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا یہ جانتے ہوئے ارتکاب کیا ہو کہ یہ گناہ ہیں اور سَيِّـاٰتِنَا سے وہ گناہ مراد ہیں جو جہالت اور لاعلمی کی بنا پر صادر ہو گئے (چونکہ لاعلمی بھی گناہ ہے اس لئے ایسے گناہوں کی بخشش طلب کرنے کی ضرورت بھی ہے)۔ (روح المعانی ص۱۶۴ ج۴)

وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (اور ہمیں نیک آدمیوں کے ساتھ وفات دیجئے) مطلب یہ ہے کہ ہمیں صالحین میں شمار فرمائیے اور موت کے بعد ہم سے وہی معاملہ فرمائیے جو نیک آدمیوں کے ساتھ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی دُعا میں یوں کہا تھا تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ مَعَ الْاَبْرَارِ میں تواضع ہے اور حسن ادب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ابرار میں سے تو نہیں ہیں لیکن ہمیں ابرار میں شامل فرما دیجئے ہم اس کے اُمیدوار ہیں۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (اور اے ہمارے رب جس کا ہم سے آپ نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عطا فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے اور بلاشبہ آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے)۔

ایمان اور اعمالِ صالحہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو اجر وثواب عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اس میں اس کے ملنے کی عاجزانہ درخواست ہے۔ اعمال میں جو کمی اور کوتاہی ہو اس سے درگذر فرما کر وہی ثواب پورا پورا عطا کیجئے جس کا رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے اور بعض حضرات نے مَا وَعَدْتَّنَا سے نصرت علی الاعداء یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں مدد فرمانے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ مراد لیا ہے، اگر نصرت علی الاعداء مراد لیا جائے تو اس سے عطاء دنیوی مراد ہوگی جیسا کہ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سے عطائے اخروی مراد ہے۔ جسے آخرت میں ثواب مل گیا اور وہاں کے عذاب سے محفوظ ہو گیا وہ وہاں کی رسوائی سے بچ گیا۔

اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (بلاشبہ آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے) ان الفاظ میں اپنی دُعاؤں کی مقبولیت کا یقین ظاہر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے ہیں جو دُعائیں ہم نے کی ہیں وہ ضرور قبول ہوں گی۔ اسکا وعدہ سورۂ بقرہ کی آیت اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں اور سورۂ مؤمن کی آیت وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں فرمایا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں، تذییل لتحقیق ما نظموا فی سلک الدعاء۔

"المیعاد" سے بعث بعد الموت بھی مراد ہوسکتا ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح ہے اگر یہ معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ یوم الحساب کا جو وعدہ آپ نے فرمایا وہ ضرور واقع ہوگا اس دن کے حساب

اور عذاب سے ہمیں محفوظ فرمائیے اور ہمیں اس دن رسوانہ کیجئے۔

دُعاؤں کی مقبولیت ...... فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (سو ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا (اور فرمایا) کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا مرد ہو یا عورت اعمال کا ثواب سب کو ملے گا) جو بھی کوئی فرد ایمان قبول کرے گا۔ اعمالِ صالحہ میں لگے گا، دُعائیں کرے گا اس کا کچھ بھی عمل ضائع نہ ہوگا جیسے مردوں کے اعمالِ صالحہ مقبول ہیں اسی طرح عورتوں کے اعمالِ صالحہ بھی مقبول ہیں۔

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (تم میں سے بعض بعض سے ہیں) اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں ماقبل سے مرتب ہونے کے اعتبار سے ''ضحاک'' کا قول اقرب معلوم ہوتا ہے جسے معالم التنزیل ص ۳۲۷ ج ا میں نقل کیا ہے رجالکم شکل نسائکم و نسائکم شکل رجالکم فی الطاعة یعنی اللہ کی فرمانبرداری میں مرد عورتوں کی طرح ہیں اور عورتیں مردوں کی طرح ہیں۔ جو بھی فرمانبردار ہوگا اپنا اجر و ثواب پائے گا۔ نیز اعمالِ خیر میں مرد عورتوں کے اور عورتیں مردوں کی معاون ہیں ایک دوسرے کے لئے خیر کا سبب ہیں جیسا کہ سورۂ توبہ میں فرمایا وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (اور مؤمن مرد مؤمن عورتیں بعض بعض کے معاون اور مددگار ہیں)

مہاجرین اور مجاہدین کا ثواب ...... فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (الٰی قوله تعالٰی) وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (سو جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میرے راستے میں انہیں ایذا دی گئی اور جنہوں نے قتال کیا اور جو مقتول ہوئے میں ضرور ضرور ان کی برائیوں کا کفارہ کردوں گا اور ضرور ضرور ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کو اللہ کی طرف سے بدلہ دیا جائے گا، اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے) اس آیت میں چند اعمالِ خیر کا تذکرہ فرمایا۔ پھر اصحاب اعمال کے بدلہ کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا اور یہ حضرات جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ جن اعمال کا تذکرہ فرمایا ان میں ایک ہجرت ہے۔ جن لوگوں نے دشمنوں کے مجبور کرنے سے دین حق پر باقی رہنے کے لئے اپنے وطن کو اور جاگیر و جائیداد اور اعزہ و اقرباء کو چھوڑا ان کی بڑی قربانی ہے۔ نیز اللہ کی راہ میں جن لوگوں کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اور وہ صبر و استقامت کے ساتھ ایمان پر باقی رہے۔ اور اعمال صالحہ میں لگے رہے یہ عمل بھی بہت بڑا ہے جسے وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ سے تعبیر فرمایا۔ نیز اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کا بھی تذکرہ فرمایا جس میں کافروں کو قتل کیا جاتا ہے اور اہلِ ایمان بھی مقتول ہوجاتے ہیں اس عمل کو وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا سے تعبیر فرمایا۔ جہاد بہت بڑا عمل ہے جسے ایک حدیث میں چوٹی کا عمل بتایا (ذروة سنام الجهاد، مشکوٰۃ ص ۱۴) مذکورہ بالا اعمالِ خیر کا بدلہ تکفیر سیئات اور دخول جنت کی صورت میں ہوگا۔ آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ اس میں عمومی طور پر فرمادیا کہ نیک اعمال کا جو بدلہ اللہ کے پاس سے ملے گا وہ اچھا ہی ہوگا۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ

ہرگز دھوکہ میں نہ ڈالے آپ کو کافروں کا شہروں میں آنا جانا۔ یہ تھوڑا سا نفع ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور وہ بُرا بچھونا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

میں ہمیشہ رہیں گے، یہ مہمانی ہو گی اللہ کی طرف سے اور جو اللہ کے پاس ہے بہتر ہے نیک بندوں کے لئے۔

کافروں کے احوال واموال دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیں

گذشتہ آیت میں اہلِ ایمان کا اجر وثواب بتایا ہے اہلِ ایمان میں تنگدست فقراء اور مساکین بھی ہوتے ہیں اور دنیاوی احوال واموال کے اعتبار سے ان میں ایک گونہ کمزوری ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ اہلِ کفر کو جو دنیا میں ادھر اُدھر آنے جانے اور اموال کمانے کی قدرت اور وسعت دی گئی ہے یہ کوئی قابلِ رشک چیز نہیں ہے ان لوگوں کی خوشحالی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے، یہ تو چند دن کی بہار ہے اس کے بعد ان کے لئے عذاب ہی عذاب ہے۔ عذاب بھی معمولی نہیں بلکہ جہنم کا عذاب ہے جو آگ ہی آگ ہے، ایسی خوشحالی پر کیا رشک کرنا جس کے کچھ عرصہ کے بعد آگ کے دائمی عذاب میں داخل ہونا پڑے، اسباب النزول ص ۱۳۴ میں لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی یہ لوگ خوشحال تھے، تجارت کرتے تھے اور دنیا کے ساز وسامان سے منتفع ہوتے تھے۔ بعض اہلِ ایمان کے منہ سے نکل گیا کہ اللہ کے دشمن تو اچھے حال میں ہیں اور ہم بھوک اور مشقت سے ہلاک ہو رہے ہیں اس پر آیت لَا یَغُرَّنَّكَ آخر تک نازل ہوئی۔

جہنم کے بارے میں کہیں بِئْسَ الْمَصِیْرُ اور کہیں بِئْسَ الْمِهَادُ فرمایا اور کہیں دوسرے الفاظ میں اس کا بُرا ٹھکانہ ہونا بتایا، یہاں بِئْسَ الْمِهَادُ برا بچھونا جو فرمایا ہے سیاق کلام کے اعتبار سے نہایت ہی برمحل ہے۔ کیونکہ جو لوگ اصحاب اموال ہوتے ہیں دنیاوی چیزوں سے منتفع اور متمتع ہونے کے جو ان کے طریقے ہیں ان میں جہاں عمدہ کھانا پینا اور لباس فاخر ہوتا ہے۔ وہاں بستر ے بھی عمدہ اور نرم ہوتے ہیں۔ آیتِ شریفہ میں بتا دیا کہ ان کے یہاں کے بستروں کو نہ دیکھو ان کے اصلی اور دائمی بستر پر نظر کرو جو دوزخ کی آگ کا ہوگا۔ وہاں آرام کا نام نہیں اور نیند کا گمان نہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت سفر کے ذرائع یہی چوپائے تھے گھوڑے، اونٹ خچر وغیرہ، دورِ حاضر میں سیارے اور طیارے ہیں۔ جن سے تقلب کا مفہوم بہت زیادہ واضح ہے۔ ایک شخص ایک ہی دن میں ایشیا میں بھی ہے اور یورپ میں بھی، دوسرا شخص امریکہ جاتا ہے پھر شام تک واپس بھی آ جاتا ہے، ایشیا والوں کے لئے افریقہ اور آسٹریلیا ایسے ہیں جیسے کبھی دو تین میل کی مسافت تک جا کر واپس آ جاتے تھے۔ یہ تقلب کا بہت بڑا مصداق ہے۔ قرآن مجید میں جو لفظ تقلب ہے قیامت تک آنے والی سواریوں کے لئے شامل ہے۔

سورۂ مؤمن میں بھی اس مضمون کو بیان فرمایا: مَا یُجَادِلُ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَلَا یَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِی الْبِلَادِ (نہیں جھگڑتے ہماری آیات کے بارے میں مگر وہی لوگ جنہوں نے کفر کیا۔ سو دھوکہ میں نہ ڈالے آپ کو شہروں میں ان کا چلنا پھرنا)۔

متقیوں کا ثواب...... پھر فرمایا: لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (جو لوگ اپنے رب سے ڈریں ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے) اس میں تسلی ہے اہلِ ایمان کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں کہ تمہیں ہمیشہ کے لئے وہ نعمتیں ملیں گی جو اہلِ کفر کے تصور میں بھی نہیں اُن نعمتوں کو ہیچ سمجھو۔ اُن کی نعمتیں ان کے لئے باعثِ عذاب ہیں اور تمہاری نعمتیں واقعی اور حقیقی اور دائمی ہوں گی جو اللہ کی طرف سے بطور مہمانی کے عطا کی جائیں گی۔ کما قال اللّٰه تعالیٰ...... نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (یہ مہمانی ہے اللہ کی طرف سے اور جو کچھ اللہ کے

پاس ہے وہ نیک بندوں کے لئے بہتر ہے) کیونکہ یہ دائمی ہے اور کثیر در کثیر اور کافروں کے پاس قلیل در قلیل اور عارضی ہے۔

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ

اور بلاشبہ بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا تمہاری طرف اور جو نازل کیا گیا اُن کی طرف جو عاجزی کرنے

لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ

والے ہیں اللہ کے لئے، وہ نہیں خریدتے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، بے شک

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

مؤمنین اہلِ کتاب کا اجر

مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب سب ہی ایسے نہیں جو کفر پر جمے رہیں۔ اور اللہ کے آخری نبی اور آخری کتاب کے انکار پر تلے رہیں۔ بلکہ ان میں ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو کتاب تم پر یعنی اہلِ اسلام پر نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو کتاب ان لوگوں پر اُتاری گئی (یعنی ان کے انبیاء علیہم السلام کے واسطہ سے) اس پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ ان میں عناد اور تکبر نہیں ہے۔ وہ اللہ کے سامنے جھکتے ہیں اور اللہ کی آیات کے ذریعہ تھوڑی سی قیمت حاصل نہیں کرتے یعنی یہ لوگ طالب دنیا نہیں ہیں جو پوری کی پوری آخرت کے مقابلہ میں ذرا سی چیز ہے یہ لوگ آخرت کے طالب ہیں اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ اللہ کے ہاں ان کو اپنا اجر ملے گا لہٰذا حق کو نہیں چھپاتے۔ اور اللہ کی آیات کو صحیح صحیح بیان کرتے ہیں اپنی قوم سے کسی طرح کی رشوت کے طالب نہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس) یعنی ان کے اعمال کا ثواب ان کو ملے گا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اضافت عہد کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کو وہ اجر عطا کر دیا جائے گا جس کا ان سے وعدہ فرمایا ہے جو سورۂ قصص میں مذکور ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (کہ انہیں دہرا اجر دیا جائے گا اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا)۔

اسبابِ النزول ص ۱۳۴ میں حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ آیت بالا نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی (جو حبشہ کا بادشاہ تھا اور وہیں اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی کی موت کی خبر دی آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ چلو اپنے بھائی کی نمازِ جنازہ پڑھو جو تمہاری اس سرزمین کے علاوہ دوسری جگہ وفات پا گیا۔ آپ بقیع کی طرف روانہ ہو گئے اور جب اس کی نماز پڑھانے لگے تو نجاشی کا جنازہ آپ کے سامنے کر دیا گیا (یہ بطور معجزہ کے تھا) آپ نے نمازِ جنازہ پڑھی اور اس کے لئے استغفار کیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اس کے لئے استغفار کرو اس پر منافقین کہنے لگے کہ دیکھو یہ ایک حبشی نصرانی کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں جس کو انہوں نے دیکھا بھی نہیں اور جو اُن کے دین پر بھی نہیں تھا۔ اس پر آیت وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ آخر تک نازل ہوئی۔

پھر حضرت مجاہد اور ابن جریج اور ابن زید سے صاحبِ اسباب النزول نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان تمام اہلِ کتاب کے بارے میں

نازل ہوئی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ سبب نزول خاص ہوتے ہوئے بھی الفاظ کا عموم تمام اہل کتاب مومنین کو شامل ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (بے شک اللہ جلدی حساب لینے والا ہے) ابرار اور صالحین کو ان کا بدلہ دیا جائے گا اور کفار اور اشرار کو ان کا بدلہ دے دیا جائے گا۔ یہ دنیاوی زندگی گذرنے میں جو دیر لگ رہی ہے اس کو دیر نہ سمجھنا چاہیئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰

اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں جم کر رہو اور نیک کاموں میں لگے رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اہلِ ایمان کو چند نصیحتیں

یہ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت ہے اس میں اہل ایمان کو چار وصیتیں فرمائیں۔ جن میں جینے کا طریقہ بتایا ہے، عام حالات میں کیسے رہیں اور کافروں سے مقابلہ ہو تو کیسے لڑیں اجمالی طور پر یہ بات بتادی ہے۔ پہلی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: صبر کرو۔ صبر کے تینوں معنی ذہن میں لے آئیں (یعنی نیک کاموں پر مضبوطی سے قائم رہنا اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے رہنا اور جو دُکھ تکلیف پیش آئے اس کے بارے میں جزع فزع سے باز رہنا)۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی وَصَابِرُوْا چونکہ یہ باب مفاعلہ ہے اس لئے عربی قواعد کے اعتبار سے دونوں جانب سے اشتراک کو چاہتا ہے۔ اسی کے پیش نظر حضرات مفسرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ دشمنوں سے مقابلہ کی نوبت آ جائے تو خوب جم کر مقابلہ کرو گو اِصْبِرُوْا میں بھی یہ مفہوم داخل ہے لیکن مستقل طریقہ پر اس کو علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ قتال کے موقع پر صبر کی اہمیت اور فضیلت زیادہ ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں وذکرہ بعد الامر بالصبر العام لانہ اشد فیکون افضل فالعطف کعطف جبریل علی الملائکۃ والصلوٰۃ الوسطی علی الصلوات۔ (صبر عام کا حکم دینے کے بعد پھر قتال کے موقع پر صبر کا حکم دیا کیونکہ یہ مشکل ہے اور اس کی فضیلت بھی زیادہ ہے پس صابروا کا عطف اصبروا پر ایسا ہی ہے جیسے جبریل کا عطف ملائکہ پر اور صلوٰۃ وسطیٰ کا عطف صلوات پر ہے)

تیسری نصیحت یہ فرمائی وَرَابِطُوْا یہ بھی باب مفاعلہ سے ہے۔ جس کا مادہ ربط ہے اور ربط باندھنے کو اور اپنے نفس کو کسی کام پر جمائے رکھنے کو کہتے ہیں۔ کفار کے مقابلہ کے لئے گھوڑے باندھ کر رکھنا اور ان کو کھلانا پلانا چرانا جنگ کے لئے تیار کرنا اس کے لئے بھی لفظ رباط وارد ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (اور تیاری کرو ان کے لئے جو بھی طاقت تمہارے بس میں ہو اور گھوڑوں سے بھی تیاری کرو جو تمہارے پاس بندھے ہوئے ہیں تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رعب ڈالتے رہو گے)۔ نیز لفظ رباط اسلامی ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھی آیا ہے۔ جنگ کے مواقع تو کبھی کبھار آتے ہیں لیکن چونکہ کافروں کی طرف سے حملہ کرنے کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس لئے سرحدوں پر لشکروں کو پڑاؤ ڈالنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کی بھی بہت فضیلت ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے صاحب روح المعانی نے لفظ رَابِطُوْا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ای اقیموا فی الثغور رابطین خیولکم فیھا حابسین لھا مترصدین للغزو مستعدین لہ بالغین فی ذٰلک المبلغ الا وفی اکثر من اعدائکم (یعنی سرحدوں میں قیام کئے رہو، گھوڑوں کو وہاں باندھ کر رکھو اور جہاد کے مواقع کی

تاک میں رہو۔خوب اچھی طرح جنگ کے لئے تیار رہو تمہاری تیاری دشمنوں کی تیاری سے بڑھ کر ہو)۔

سرحد کی حفاظت کے لئے پڑاؤ ڈال کر رہنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیھا** (اللہ کی راہ میں ایک دن سرحد کی حفاظت میں گذارنا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سب سے افضل ہے)۔ (رواہ البخاری ص ۴۰۵ ج ۱)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اسلامی سرحد کی حفاظت میں گذارنا ایک ماہ کے روزے رکھنے اور ایک ماہ راتوں رات نماز میں قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر اسی عمل میں موت آ گئی تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کرتا تھا۔ اور اس کا رزق اسے ملتا رہے گا۔ اور وہ قبر میں عذاب دینے والوں سے بے خوف رہے گا۔ (رواہ مسلم ص ۱۴۲ ج ۲)

اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے وفات پا گیا وہ بڑی گھبراہٹ (یعنی قیامت کے دن پریشانی سے محفوظ رہے گا۔ اور (قبر میں) اسے صبح شام رزق ملتا رہے گا اور اسے برابر مرابط (یعنی رباط کے کام میں لگنے والے) کا ثواب ملتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے دن قبر سے) اٹھائے۔ (رواہ الطبرانی و رواتہ ثقات کما فی الترغیب ص ۲۴۴ ج ۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رباط کے ثواب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک رات رباط کے کام میں مشغول رہا مسلمانوں کی حفاظت کرتا رہا تاکہ دشمن حملہ آور نہ ہو جائے تو اسے ان سب لوگوں کا ثواب ملے گا جو اس کے پیچھے روزہ رکھ رہے ہوں اور نماز پڑھ رہے ہوں۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط باسناد جید کما فی الترغیب ص ۲۴۵ ج ۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن اللہ کی راہ میں رباط کے کام میں خرچ کرنا ان ہزار دنوں سے افضل ہے جو اس کے علاوہ دوسری عبادات میں خرچ کئے جائیں۔ (رواہ النسائی والترمذی وقال حدیث حسن غریب کما فی الترغیب ص ۲۴۶ ج ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں جنہیں دوزخ کی آگ نہیں پہنچے گی، ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے روئی ہو اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں (مسلمانوں کی) حفاظت کرتے ہوئے رات گذاری ہو۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب کما فی الترغیب ص ۲۴۸ ج ۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں ایسی رات بتادوں جو شب قدر سے بھی افضل ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ وہ رات ہے کہ جس میں کسی نے خوف و خطرہ کی جگہ چوکیداری کی (مسلمانوں کی حفاظت میں رات گذاری) اسے خطرہ ہے کہ شاید اپنے گھر واپس ہی نہ جائیگا (لیکن پھر بھی حراست اور حفاظت کے کام میں لگا ہوا ہے)۔ (رواہ الحاکم وقال صحیح علی شرط البخاری کما فی الترغیب ص ۲۵۰ ج ۲)

روایات حدیث سے معلوم ہوا کہ عین سرحد پر ہی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے رات گذارنا فضیلت عظیمہ کا باعث نہیں بلکہ جس موقع پر بھی شہر میں، محلّہ میں آبادی سے باہر یا اندر مسلمانوں کی حفاظت میں وقت خرچ کیا جائے وہ سب بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث

ہے، حدیث شریف میں بعض اعمالِ صالحہ میں پابندی سے لگے رہنے کو بھی رباط سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں وہ اعمال نہ بتادوں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خطاؤں کو محو فرمادے گا (یعنی بالکل ختم کردے گا) اور درجات کو بلند فرمادے گا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا (وہ کام یہ ہیں)

ا۔ ناگواریوں کے باوجود وضو کا پانی اچھی طرح اعضاء پر پہنچانا (سردی میں گرمی میں ہر حالت میں خوب اچھی طرح ہر جگہ اعضائے وضو پر پانی پہنچانا اگرچہ نفس کو ناگوار ہو، خاص کر سردی کے زمانہ میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا ہے)۔

۲۔ مسجدوں کی طرف کثرت کے ساتھ جانا۔

۳۔ نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا۔ یہ بیان فرما کر آپ نے فرمایا فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ (یہ رباط ہے جس میں نفس کو پابند رکھا جاتا ہے) بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے ذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ دومرتبہ فرمایا۔ (صحیح مسلم ص ۱۲۷ ج ۱) اور موطا میں ہے کہ اس لفظ کو تین بار فرمایا (کما فی شرح النووی)

اوپر جو رابطوا کا ترجمہ کیا گیا کہ نیک کاموں میں لگے رہو اسی عموم کے اعتبار سے کیا ہے جسکی طرف اس حدیث میں اشارہ ملتا ہے۔

چوتھی نصیحت فرماتے ہوئے وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا۔ یہ حکم بار بار، جگہ جگہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور صفتِ تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو خیر کے ہر کام پر لگاتی اور گناہوں سے بچاتی ہے۔ یہ صفت جامع الخیرات ہے اس لئے بار بار اس کا اعادہ فرمایا۔

آخر میں فرمایا لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ تم یہ کام کرو گے تو کامیاب ہو گے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے جو ایمان اور اعمالِ صالحہ پر اور تقویٰ اختیار کرنے پر موقوف ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ ایک دن رات کو اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے پاس سو گئے (یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ تھیں) اور مقصد یہ تھا کہ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ تہجد دیکھیں۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ جب آپ رات کو اٹھے تو آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے شروع فرما کر ختم سورت تک سورۂ آل عمران کی آخری آیات کی تلاوت فرمائی۔ (صحیح بخاری ص ۶۵۷ ج ۲، صحیح مسلم ص ۲۶۱ ج ۱) لہٰذا تہجد پڑھنے کے لئے اٹھیں تو ان آیات کو پڑھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے سورۂ آلِ عمران کا آخری حصہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے کسی رات میں پڑھ لیا تو اسے پوری رات نماز میں قیام کرنے کا ثواب ملے گا۔ (رواہ الدارمی ص ۲۲۵ ج ۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے سورۂ آلِ عمران پڑھ لی وہ مالدار ہے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ فقیر آدمی کا خزانہ سورۂ آلِ عمران ہے۔ جسے وہ تہجد کی نماز میں پڑھتا ہے۔ (سنن دارمی ص ۲۲۵ ج ۲)

ولقد تم تفسیر سورة اٰلِ عمران بفضل الله وحسن توفيقه والحمد لله اولًا و اٰخرًا وظاهرًا و باطنًا

☆☆☆..................☆☆☆

مدنی	سورۃ النسآءِ	۱۷۰ آیتیں ۲۴ رکوع

ایاتہا ۱۷۰ (۴) سُوْرَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ (۹۲) رکوعاتہا ۲۴

سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اس میں ایک سوستر آیتیں اور ۲۴ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا، اور اُس جان سے اُس کا جوڑا، پیدا فرمایا اور اُن دونوں سے

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ

بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے آپس میں سوال کرتے ہو، اور قرابت داریوں سے بھی ڈرو، بے شک

اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪

اللہ تم پر نگہبان ہے۔ اور دیدو یتیموں کو اُن کے مال، اور مت بدلو خبیث مال کو اچھے مال سے، اور مت کھاؤ اِن کے مالوں کو اپنے

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

مالوں میں مِلا کر، بے شک ایسا کرنا بڑا گناہ ہے۔

بنی آدم کی تخلیق کا تذکرہ اور یتیموں کے مال کھانے کی ممانعت

ان آیات میں اوّل تو تمام انسانوں کو ان کے خالق و مالک اور پرورش کرنے والے سے ڈرنے کا حکم فرمایا، اور یہ حکم جگہ جگہ قرآن حکیم میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ شانہٗ سے ڈرنا ہی سب کامیابیوں کی کنجی ہے کوئی شخص خلوت میں ہو یا جلوت میں اپنے رب تعالیٰ شانہٗ سے ڈرے گا اور خوف وخشیت ......کی صفت سے متصف ہوگا تو دنیا وآخرت میں اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ دنیا وآخرت کی بربادی گناہوں میں مبتلا ہونے سے ہوتی ہے اور خوف وخشیت دل میں جگہ پکڑ لے تو پھر گناہ چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَاِنَّهٗ اَزْيَنُ لِاَمْرِكَ كُلِّهٖ (کہ تم اللہ سے ڈرنے کو لازم پکڑ لو کیونکہ اس سے تمہارے ہر کام میں زینت آجائے گی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۵) پھر رب جل شانہٗ کی ایک صفتِ جلیلہ بیان فرمائی اور وہ یہ کہ اُس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُس جان سے اُس کا جوڑا پیدا فرمایا پھر اس

جوڑے سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔ایک جان سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔

حضرت حوا کی تخلیق ...... ان کا جوڑا یعنی حضرت حواء علیہا السلام کو ان ہی سے پیدا فرمایا۔صحیح مسلم ص ۴۷۵ ج ۱ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے وہ کسی طریقے پر تیرے لئے سیدھی نہیں ہوسکتی۔سو اگر تو اس سے نفع حاصل کرنا چاہے تو اس کی کجی یعنی ٹیڑھے پن کے ہوتے ہوئے ہی نفع حاصل کرسکتا ہے اور اگر تو اسے سیدھا کرنے لگا تو توڑ ڈالے گا۔اور اُس کو توڑ دینا طلاق دینا ہے۔صحیح بخاری ص ۷۷۹ ج ۲ کی ایک روایت میں بھی یہ مضمون وارد ہوا ہے۔قرآن مجید میں جو وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا فرمایا اس کی تفسیر حدیث شریف سے معلوم ہوگئی کہ حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئیں۔

بہت سے لوگ جن کا مزاج معتزلہ والا ہے وہ چونکہ اپنی عقل کو پہلے دیکھتے ہیں، بعد میں قرآن وحدیث پر نظر ڈالتے ہیں اور جو چیز ان کی عقل میں نہ آئے اس کے منکر ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں نے یہاں بھی ٹھوکر کھائی ہے۔انہوں نے حضرت حوا کا حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے کا انکار کیا ہے۔آیت کو انہوں نے سمجھنا نہیں چاہا آیت کے مفہوم صریح تک ان کے ذہن کی رسائی نہیں ہوئی، رہی حدیث تو اس مزاج کے لوگ احادیث کو مانتے ہی نہیں، هداهم الله تعالٰی۔ پھر فرمایا: وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً کہ ان دونوں (یعنی ایک مرد اور ایک عورت) سے بہت سارے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں پیدا ہوئیں ان ہی سے آگے نسل چلی جس سے کروڑوں انسان مرد اور عورتیں زمین پر پھیل گئے۔(درمنثور ص ۱۱۶ ج ۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کی بیوی پیدا فرمائی پھر اُن دونوں سے خوب زیادہ نسل چلی اور پھلی، پھولی اور پھیلی۔موجودہ دَور کے انسان اسی نسل سے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کو بھی سامنے رکھیں اور صفتِ ربوبیت کو بھی۔کہ اُس نے پیدا بھی فرمایا اور پرورش بھی فرمائی اور پرورش کے سامان پیدا فرمائے کئی طرح سے اس کا شکر واجب ہے، اور شکر کا بہت بڑا اجزو یہ ہے کہ اُس کی نافرمانی نہ کی جائے۔یعنی جو مال و اولاد اس نے عطا فرمایا ہے اس کو گناہوں سے محفوظ رکھا جائے اور انہیں اللہ کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنایا جائے، یہ تقویٰ کی صفت ہے۔شروع آیت میں تقویٰ کا حکم فرمایا اور یہ بھی بتا دیا کہ تقویٰ کیوں اختیار کیا جائے؟ جس نے اللہ تعالیٰ شانہٗ کی صفتِ خالقیت اور صفتِ ربوبیت کو جان لیا وہ ضرور متقی ہوگا اور خلوت وجلوت میں گناہوں سے بچے گا۔

اللہ سے ڈرنے کا حکم ...... پھر فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ (کہ تم اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر آپس میں ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو) جس نے حق مار لیا ہو یا حق دینے میں دیر لگا دی ہو اس سے کہتے ہو کہ تو خدا سے ڈر اور میرا حق دے۔حقوق مانگنے کے سوا دوسری ضروریات کے لئے بھی ایک دوسرے سے یوں کہتے ہو کہ اللہ کے لئے میرا یہ کام کر دو، خدا کے لئے مجھے یہ دے دو۔جس خدا تعالیٰ کے نام سے اپنے کام چلاتے ہو اس سے ڈرو اور گناہوں سے بچو۔

صلہ رحمی کا حکم اور قطع رحمی کا وبال ...... پھر فرمایا وَالْاَرْحَامَ ارحام رحم کی جمع ہے۔عربی میں رحم بچہ دانی کو کہا جاتا ہے جس کے اندر ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، پھر یہ کلمہ مطلقاً رشتہ داری کے تعلقات کے لئے استعمال ہونے لگا۔زمانہ اسلام سے پہلے بھی اہلِ عرب کے نزدیک رشتہ داری کے تعلقات باقی رکھنا اور انہیں خوبی کے ساتھ نباہنا بہت اہم کام تھا۔تعلقات باقی رکھنے کو صلہ رحمی اور تعلقات توڑ دینے کو قطع رحمی کہتے ہیں۔اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو باقی رکھا، صلہ رحمی پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ فرمایا اور قطع رحمی پر وعیدیں بیان

فرمائیں۔ اہلِ عرب آپس میں صلہ رحمی کے تعلقات کو یاد دلایا کرتے تھے اور قسم دلا کر کہتے کہ اے فلاں! تجھے رحم کی قسم ہے تو ہماری رعایت کر اور قطع رحمی نہ کر۔ اس آیت شریفہ میں عرب کی اس عادت کو یاد دلایا ہے اور فرمایا کہ تم قرابت داری کے حقوق ضائع کرنے سے ڈرو۔ آپس میں ایک دوسرے کو رحم کا واسطہ دے کر جو سوال کرتے ہو اس واسطہ کی لاج رکھو اور آپس کے حقوق ضائع نہ کرو۔ صلہ رحمی کی شریعت اسلامیہ میں بھی بہت اہمیت ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جسے پسند ہو کہ اس کا رزق زیادہ کر دیا جائے اور اُس کی عمر بڑھادی جائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے۔ (رواہ البخاری ص ۸۸۵ ج ۱)

اپنے قرابت داروں سے ملنا جلنا اور شریعت کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے آنا جانا لینا دینا یہ سب صلہ رحمی میں شامل ہے، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس قوم میں کوئی بھی شخص قطع رحمی کرنے والا ہو اُن پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۰ ج ۲)

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (ایضاً) سنن ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے لفظ رحم کو اپنے نام میں سے نکالا ہے جو شخص صلہ رحمی کرے گا میں اُسے اپنے سے ملالوں گا۔ اور جو شخص قطع رحمی کرے گا۔ میں اُسے اپنے سے کاٹ دوں گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۰ ج ۲)

آجکل قطع رحمی کا گناہ بہت عام ہے جو لوگ دینداری کے مدعی ہیں نمازوں کے پابند ہیں تہجد گذار ہیں وہ بھی اس گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ کسی کا بہن کے گھر آنا جانا نہیں کوئی بھائی سے روٹھا ہوا ہے۔ کوئی چچا سے ناراض ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ماں باپ سے ہی تعلقات صحیح نہیں۔ لوگوں کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ غیروں کے ساتھ گذارہ کر سکتے ہیں اچھے تعلقات رکھ سکتے ہیں مگر اپنوں کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔ معمولی سی باتوں کی وجہ سے قطع تعلق کر بیٹھتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ آپس کے تعلقات درست رکھے جائیں، ایک دوسرے سے جو قصور اور کوتاہی ہو جائے اس سے درگذر کرتے رہیں اور صلہ رحمی کی فضیلت اور دنیاوی و اُخروی منفعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کا دستِ مبارک پکڑ کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے فضیلت والے اعمال بتادیجئے۔ آپ نے فرمایا یَا عُقْبَةُ صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَکَ وَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ ظَلَمَکَ (کہ اے عقبہ! جو شخص تمہارے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کرے اس سے تعلقات جوڑے رکھو اور جو تمہیں نہ دے اُسے دیتے رہو اور جو شخص تم پر ظلم کرے اس سے اعراض کرتے رہو (یعنی اس کے ظلم کی طرف دھیان نہ دو) اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے یوں فرمایا وَاعْفُ عَنْ مَّنْ ظَلَمَکَ (جو شخص تم پر ظلم کرے اسے معاف کردو)۔ (الترغیب والترہیب ص ۳۴۲ ج ۳)

جو شخص یوں کہتا ہے کہ رشتہ دار میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو میں بھی کروں گا ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں وہ تو بدلہ اتارنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تعلق جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلہ اتار دے بلکہ تعلق جوڑنے والا وہ ہے جب اس کے ساتھ قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے۔ (صحیح بخاری ص ۸۸۶ ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ مہمان کا اکرام کرے اور جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ صلہ رحمی کرے اور جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔ (صحیح بخاری ص ۸۸۹ ج ۲)

اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے ...... پھر فرمایا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگران ہے) مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔ تمہارا کوئی عملِ خیر یا شر اس کے علم سے باہر نہیں۔ وہ اعمال کے بدلے پورے پورے دیدے گا۔ اس میں تقویٰ کے مضمون کو دوسرے الفاظ میں دہرادیا ہے۔ جو ذاتِ پاک خالق اور مالک ہے جسے ہر عمل کا علم ہے جو خلوتوں اور جلوتوں کے تمام اعمال کو جانتا ہے۔ اس سے ڈرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

اموال یتامیٰ کے بارے میں تین حکم ...... پھر یتیموں کے اولیاء کو حکم دیا کہ تم اُن کے مال ان کو دے دو اور اچھے مال کو بُرے مال سے تبدیل نہ کرو اور اپنے مال اُن کے مالوں میں ملا کر نہ کھاؤ اس میں تین باتوں کا حکم فرمایا ہے۔

یتامیٰ کے اموال دے دو ...... اوّل: یہ کہ جو یتیم بچے تمہاری پرورش میں ہیں اُن کے مال جو انہیں میراث میں ملے ہیں یا کسی نے انہیں ہبہ کردیئے ان کے بالغ ہونے تک ان کے مالوں کو محفوظ رکھو اور بقدرِ ضرورت اُن کے مالوں میں سے اُن پر خرچ کرتے رہو۔ پھر جب وہ بالغ ہوجائیں تو اُن کے مال اُن کے سپرد کردو۔ ایسا نہ کرو کہ جب وہ بالغ ہوجائیں تو اُن کا مال بلاوجہ اپنی تحویل میں رکھے رہو اور اُن کو دینے سے منع کردو۔ اسباب النزول ص ۱۳۶ میں ہے کہ یہ آیت بنی غطفان کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی اس کی پرورش میں ایک یتیم بچہ تھا جو اس کے بھائی کا لڑکا تھا۔ جب یتیم بالغ ہوگیا تو اُس نے اپنا مال طلب کیا۔ چچا نے اس کا مال سپرد کرنے سے انکار کردیا اس پر دونوں چچا بھتیجے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جس پر یہ آیت نازل ہوئی، چچا نے جب یہ آیت سنی تو کہا کہ اللہ ورسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں اور بڑے گناہ سے پناہ مانگتے ہیں یہ کہا اور یتیم کا مال اس کے حوالے کردیا۔

یتامیٰ کے اچھے مال کو بُرے مال سے تبدیل نہ کرو ...... دوم: یہ فرمایا کہ بُرے مال کو اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ یتیم بچے جو تمہاری پرورش اور نگرانی میں ہیں جن کا مال تمہارے قبضہ میں ہے ان کے اچھے مال کو خود اپنے حصے میں اور اپنا گھٹیا مال اس کے عوض ان کے حصے میں نہ لگاؤ، اُن کا جو عمدہ اور اچھا مال ہے اُس کو اپنا نہ بنالو اپنے گھٹیا مال کو اُس کے عوض اُس کے حساب میں لگا کر حساب پُورا نہ کردو۔ اپنی اولاد کی خاطر لوگ یتیم کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ اچھی جائیداد اور اچھا مال جو یتیموں کی ملکیت ہو اُسے اپنا بنا کر اپنے نام رجسٹری کروالیتے ہیں اور یتیم بچوں کو گھٹیا مال دے دیتے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ کا یہ معنی بھی بتایا ہے کہ اپنے حلال مال کو چھوڑ کر یتیموں کا مال نہ کھاؤ۔ جن کا کھانا تمہارے لئے حرام ہے اگر ایسا کرو گے تو طیب کو چھوڑ کر خیانت کرکے دوسرے کا مال کھانے والے بن جاؤ گے اور یہ مال چونکہ تمہارے لئے حرام ہوگا اس لئے خبیث ہوگا۔ یہ معنی بھی لفظ قرآنی سے بعید نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اپنا گھٹیا مال یتیم کے حصہ میں لگا کر اُس کا اچھا مال لے لینا حرام ہے تو یہ تو بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا کہ اُن کا مال بالکل ہی بلا بدل کے کھالیا جائے۔

یتامیٰ کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھاجاؤ ...... سوم: یہ ارشاد فرمایا کہ وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰۤى اَمۡوَالِكُمۡ (اور یتیموں کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاجاؤ) یتیم بچے جن لوگوں کی پرورش میں ہوتے ہیں اُن میں جن کا مزاج خیانت والا ہوتا ہے ایسے لوگ مختلف طریقوں اور تدبیروں سے یتیموں کا مال اپنے مالوں میں ملا کر کھا جاتے ہیں، کچھ لوگ تو غفلت اور بے دھیانی میں ایسا کر گذرتے ہیں کہ گھر کی مشترکہ ضرورتوں میں مشترکہ مال خرچ کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یتیم بچے پر اُس کے اپنے ذاتی مال میں سے کتنا خرچ ہوا اور اُس کے مال میں سے مشترکہ ضروریات میں دوسروں پر کتنا خرچ ہوا ہے؟ اور کچھ لوگ قصداً و ارادۃً ایسا کرتے ہیں کہ یتیم بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اُن کے مال کو کسی نہ کسی طرح اپنے نام میں یا اپنی اولاد کے نام میں لکھوادیتے ہیں پھر جب وہ بالغ

ہو جاتا ہے تو اُسے اپنے مال میں سے ذرا بہت ملتا ہے یا بالکل ہی محروم ہو جاتا ہے۔

فائدہ...... یتیم بچوں کا کھانا اپنے کھانے میں ملا کر پکانے کے بارے میں ضروری ہدایات سورۂ بقرہ کی آیت وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتَامٰی کی تفسیر میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔ (دیکھو انوار البیان ص ۳۱۲ ج ۱)

آخر میں فرمایا اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا (یعنی یتیم کے مال میں خیانت کرنا بڑا گناہ ہے) ہر امانت داری کی خلاف ورزی گناہ ہے لیکن یہاں مستقل طریقہ پر یتیم کے مال میں خیانت کرنے پر تنبیہ فرمائی اور صرف یہی نہیں فرمایا کہ گناہ ہے بلکہ یہ فرمایا کہ بڑا گناہ ہے، جو لوگ تیموں کے مالوں کے محافظ و متولی ہیں پوری آیت کو بار بار پڑھیں۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

اور اگر تم کو ڈر ہو کہ تیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اُن عورتوں سے نکاح کر لو جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو، تین تین، چار چار،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾

سو اگر تم کو ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کر لو، یا اُن لونڈیوں پر بس کرو جو تمہاری ملکیت ہوں، یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم زیادتی نہ کرو۔

یتیم بچیوں کے نکاح کرنے کے بارے میں ہدایات

آیت کا مضمون سمجھنے سے پہلے سببِ نزول ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ تفسیر درِ منثور ص ۱۱۸ ج ۲ میں بخاری وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اے میری بہن کے بیٹے اس آیت میں ایسی یتیم بچیوں کا ذکر ہے جن کا باپ فوت ہو جاتا تھا اور جو مال میراث میں ملتا وہ اُس بچی اور اس کے ولی کا مالِ مشترک ہوتا تھا جسے تقسیم کرنا لازم تھا۔

اب ہوتا یہ تھا کہ جو شخص اس یتیم بچی کا ولی (سرپرست) ہوتا تھا وہ اُس کے مال میں یا جمال میں رغبت رکھنے کی وجہ سے اُس سے نکاح کر لیتا تھا لیکن بچی چونکہ اپنے ہی گھر میں اپنی ہی پرورش میں ہے اس لئے اُس کا مہر جس قدر ہونا چاہیئے اُتنا مقرر نہیں کرتے تھے، دوسری جگہ سے جو مہر ملتا اس سے کم مقرر کیا جاتا، لہٰذا اس بات سے منع فرمادیا گیا کہ ان لڑکیوں سے نکاح کریں اور پورا مہر نہ دیں، بلکہ حکم یہ فرمایا کہ ان لڑکیوں کو پورا حق مہر دو جتنا زیادہ سے زیادہ ان کو دوسری جگہ سے مل سکتا تھا۔ (راجع صحیح البخاری ص ۷۶۲ ج ۲) اور یہ بھی حکم فرمایا کہ اگر ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو اُن کے علاوہ اپنی پسند کی دوسری عورتوں سے نکاح کر لیں۔ دوسری عورتوں سے نکاح کریں گے تو چونکہ وہ خود سوچ سمجھ والی ہوں گی اور پہلے سے اُن پر قابو نہ ہوگا تو حسبِ منشاء جتنا مہر چاہیں گی مقرر کرالیں گی کیونکہ اُن پر کوئی دباؤ نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص یتیم لڑکی ہی سے نکاح کرنا چاہے اور مہر اُس کو پورا پورا دے تو یہ بھی درست ہے اسی لئے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فرمایا۔

نیز تفسیر درِ منثور میں بحوالۂ ابن جریرؒ وغیرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص کی سرپرستی میں کوئی یتیم لڑکی ہے اور وہ مالدار بھی ہے تو جس کی سرپرستی میں ہے وہ اُس سے مال کی وجہ سے نکاح کر لیتا تھا لیکن چونکہ طبعی طور پر اُسے پسند نہ تھی اس لئے اُس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا تھا لہٰذا اس بارے میں نصیحت فرمائی۔

سببِ نزول کے جاننے سے معلوم ہوا کہ یتیم لڑکیاں جو صاحبِ مال ہوتی تھیں اُن سے نکاح تو کر لیتے تھے لیکن اُن سے سلوک اچھا نہ

رکھتے تھے۔ اور اُن کو مہر بھی اتنا نہ دیتے تھے جتنا ان کو اور جگہ سے مل سکتا تھا۔لہٰذا اُن کو حکم دیا کہ اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتوں سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند ہوں۔

چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت اور عدل کرنے کا حکم...... اور ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی تعداد کے بارے میں بھی ارشادفرمادیا کہ جو عورتیں پسند ہوں ان میں دودو، تین تین، چار چار سے نکاح کرسکتے ہو، اور اگر یہ ڈر ہو کہ ان میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی عورت سے نکاح کرلو، یا باندیوں پر بس کرو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اوّل تو ہر شخص کو بیک وقت دویا تین یا چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ جو تمہیں اچھی لگیں اُن سے نکاح کرلو ایک سے زائد نکاح کرنا جائز ہے۔فرض اور واجب نہیں ہے اور جائز بھی اس شرط پر ہے کہ جتنی بیویاں ہوں اُن سب کے درمیان عدل وانصاف رکھے۔قلبی تعلق پر تو کوئی مواخذہ (گرفت) نہیں ہے کہ یہ اختیاری چیز نہیں۔البتہ اختیاری چیز میں عدل نہ کیا تو گرفت ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو عورتیں ہوں اور وہ اُن دونوں عورتوں کے درمیان عدل یعنی برابری نہ کرتا ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا (جتنی راتیں ایک کے پاس رہے اتنی ہی راتیں دوسری کے پاس رہے تقسیم جس طرح چاہے کرے اس کے اختیار میں ہے)۔(مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۷۹ از ترمذی وغیرہ)

بہت سے لوگ پیسہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یا خواہ مخواہ شوق میں آکر یا پہلی بیوی پرانی ہوجانے کی وجہ سے نئی بیوی کے مالدار ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرلیتے ہیں۔لیکن پھر برابری نہیں کرتے اور کسی ایک کے ساتھ ظلم وزیادتی بھی کرتے رہتے ہیں یہ شرعاً حرام ہے۔اگر کسی کو برابری پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھے تاکہ ظلم وزیادتی سے محفوظ رہے۔پھر آیت کے خاتمے پر فرمایا: ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا (یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم زیادتی نہ کرو) یعنی نکاح کے بارے میں جو تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے اُس کے مطابق عمل کرو گے تو ظلم وزیادتی سے محفوظ رہ سکتے ہو مذکورہ ہدایات پر عمل کرنا ظلم سے بچانے کے لئے بہت زیادہ قریب تر ہے۔

فائدہ..........شریعتِ اسلامیہ میں بیک وقت صرف چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے مگر مذکورہ بالا شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ دوسری قوموں میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔لیکن اُس کے بدلے اُن کے یہاں یہ جائز ہے کہ بہت سی دوستانیاں (گرل فرینڈز) رکھ لے۔زناکاری کرنا اُن کے نزدیک کچھ عیب کی بات نہیں ہے البتہ نکاح کرکے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا اور حلال طریقہ سے زندگی گزارنا اُن کے نزدیک عیب ہے۔اسلام پر جو بعض جاہلوں کے اعتراضات ہیں اُن میں سے ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت ہے۔یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو چار تک کی اجازت ہے واجب نہیں۔دوسرے دنیاوی احوال کے اعتبار سے اس اجازت کی ضرورت ہے۔اوّل تو اس میں نسل بڑھانے کا فائدہ ہے اور دوسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ جب کسی وجہ سے مردوں کی قلّت ہوجائے (جیسا کہ جہاد کے مواقع میں مرد شہید ہوجاتے ہیں) تو جو عورتیں بیوہ ہوجائیں۔تحفظ آبرو کے ساتھ ان کے اخراجات کا انتظام ہوجائے۔پھر جب عورتوں کی کثرت ہو اور مردوں کی کمی ہو (جیسا کہ اس کا دور شروع ہوچکا ہے) تو عورتوں کی عفت وعصمت اور شریفانہ معیشت کا انتظام اسی میں ہے کہ مرد ایک سے زیادہ نکاح کریں۔جو لوگ گہرائیوں میں نہیں جاتے۔حکمتوں کو نہیں سمجھتے انہوں نے اپنے ذمہ صرف اعتراض کرنا ہی لے رکھا ہے جب اجازت اور اباحت کو عدل کے ساتھ مشروط ومقید کردیا گیا تو پھر کسی عقلمند کے لئے کسی طرح بھی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

فائدہ......... بیک وقت چار عورتوں تک سے نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن اس میں شرطیں ہیں، ہر عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا، مثلاً جو عورت کسی مرد کی عدت میں ہو اس سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ دو بہنیں ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں اور جن عورتوں سے ہمیشہ کے لئے نکاح حرام ہے ان سے کبھی نکاح نہیں ہوسکتا جس کی تفصیل اس سورت کے چوتھے رکوع میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ، اگر کوئی شخص بیک وقت چار عورتیں نکاح میں ہوتے ہوئے پانچویں عورت سے نکاح کرے گا تو یہ نکاح شرعی نہ ہوگا اور یہ عورت اس کی شرعی بیوی نہ بن سکے گی، زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ بغیر کسی قانون کے بہت سی عورتوں سے نکاح کرلیا کرتے تھے، اسلام میں صرف چار تک کی اجازت دی گئی اور عدل وانصاف کی قید لگادی گئی۔ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو اُن کے پاس دس عورتیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار کو رکھ لو اور باقی کو چھوڑ دو۔ (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الطلاق)

باندیوں سے جماع کرنے کی اجازت...... پھر فرمایا اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی انصاف پر قائم نہ رہ سکنے کی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرو یا پھر اُن باندیوں سے گذارہ کرو جو تمہاری ملکیت میں ہیں، ملکیت میں جو باندی ہو اس سے بھی بحق ملکیت جماع کرنا جائز ہے لیکن اُن کے حقوق بیوی والے حقوق نہیں ہیں اگر کئی باندیاں ہوں تو اُن سے جماع کرنا تو جائز ہے لیکن چونکہ جماع باندی کا حق نہیں اس لئے اُن کے درمیان راتیں تقسیم کرنا بھی لازم نہیں ہے۔ البتہ بسبب ملکیت ان کے کھلانے پلانے اور پہنانے کے جو حقوق ہیں وہ اپنی جگہ پر واجب ہیں۔

جو کافر عورتیں قید میں آجاتی تھیں ان کو مجاہدین میں تقسیم کردیا جاتا تھا لہٰذا وہ اُن کی ملکیت ہوجاتی تھیں اور اُن سے گھر بار کی خدمت لینے کے علاوہ جماع کرنا بھی جائز تھا اس کے جائز ہونے کی بھی کچھ شرطیں ہیں جو کتب فقہ میں لکھی گئی ہیں۔ باندی سے جو اولاد ہوجاتی تھی وہ ثابت النسب ہوتی تھی اور وہ اولاد آزاد ہوتی تھی، اور جس باندی سے اولاد پیدا ہوتی وہ باندی آقا کی موت کے بعد آزاد ہوجاتی تھی، تفصیلی احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

کافر قیدیوں کو غلام باندی بنانے میں حکمت...... جب مسلمان جہاد کرتے تھے تو جن کافروں کو قید کرلیا جاتا تھا ان میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ امیر المؤمنین کو اختیار تھا کہ ان کو جہاد کرنے والوں میں تقسیم کردے جب ان مجاہدین میں قیدی تقسیم ہوجاتے تھے تو ان کی ملکیت میں آجاتے تھے اس لئے ان کا بیچنا، فروخت کرنا جائز تھا اور یہ غلامی کفر کی سزا ہے اور اس میں ان غلاموں کا یہ نفع ہے کہ دارالاسلام میں رہیں گے تو مسلمانوں کے اسلامی معاشرہ سے مانوس ہوں گے، اذانیں سنیں گے، نمازیں دیکھیں گے۔ اسلامی عبادات سامنے آئیں گی۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے اسلام سے قریب ہوں گے اور اسلام قبول کریں گے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچ جائیں گے اور حکومتِ اسلامیہ کا یہ نفع ہے کہ جب ان کو مجاہدین پر تقسیم کردیا تو ان کی قوت بھی ٹوٹ گئی جس سے بغاوت کا اندیشہ تھا اور بیت المال پر ان قیدیوں کے کھلانے پلانے کا بار نہ پڑا، اگر ان کو جیل میں رکھتے تو بغاوت کا بھی خطرہ تھا۔ آپس میں مشورہ کرتے رہتے اور دارالحرب سے تعلقات پیدا کرکے دارالاسلام میں فساد کا باعث بن جاتے اور بیت المال کو روزانہ ان لوگوں پر بھاری رقم خرچ کرنی پڑتی۔ دوسری طرف مجاہدین کو نفع ہوا ان کو کام کاج کرنے والے افراد مل گئے اور چونکہ یہ لوگ اپنے مالکوں کا کام کریں گے اس لئے ان کو کھلانا پلانا بھی ناگوار نہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ جو غلام تمہارے احوال کے مناسب اور موافق ہوا سے اسی میں سے کھلاؤ جس میں سے تم کھاتے ہو اور اُسی میں سے پہناؤ جس میں سے تم پہنتے ہو اور جو تمہارے احوال کے مناسب نہ ہو اس کو بیچ دو اور اللہ کی مخلوق کو عذاب نہ دو۔ (رواہ احمد وابوداؤد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۹۲)

مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے احوال کے موافق اور مناسب نہ ہوگا تو خواہ مخواہ اس کی مار پیٹ کی طرف بھی طبیعت چلے گی اور کھلانے پلانے میں بھی کوتاہی ہوگی، اُسے بیچ دو گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ دوسری جگہ اس کے حال کے مناسب مل جائے گی، جب غلام اسی کھانے میں سے کھائے گا جو گھر والوں کے لئے پکایا گیا اور اُسی کپڑے میں سے پہنے گا جو دوسرے گھر والے پہنتے ہیں اور اُس کے علاوہ رواداری، دلداری اور حسنِ معاشرت کے مظاہرے اس کے سامنے آئیں گے تو حسن وخوبی کے برتاؤ کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرے گا اور رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے کے قریب تر آ جائے گا۔ اسلام کی تاریخ میں بڑے بڑے محدثین ایسے حضرات گذرے ہیں جو غلام تھے یا باندیوں کی اولاد تھے۔ حدیث کی کتابوں میں غلاموں کے ساتھ حسنِ معاشرت کے ساتھ گذارہ کرنے اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کرنے کے بارے میں مفصل ہدایات موجود ہیں۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں بار بار یہ فرمایا اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (تم نماز کا دھیان رکھنا اور جو تمہارے غلام اور باندیاں ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت کرنا۔ (رواہ احمد ص ۸۱۷ ج ۳) یہ ہے وہ غلامی جسے یورپ کے متعصب جاہلوں نے اعتراضات کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

فائدہ نمبر (۲)......... غلام اور باندیوں کے جو احکام بیان ہوئے ہیں یہ سب اب بھی مشروع ہیں۔ کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہے لیکن اس دَور میں مسلمان غلام اور باندیوں سے اس لئے محروم ہیں کہ اوّل تو اللہ کے لئے جہاد نہیں کرتے اور جو کوئی جنگ ہوتی ہے وہ دشمن کے اشارہ سے ہوتی ہے اور دشمن ہی کے اشارہ سے بند کردی جاتی ہے۔ پھر دشمنوں نے مسلم حکومتوں کو ایسے معاہدوں میں جکڑ رکھا ہے جن کی وجہ سے وہ قیدیوں کو غلام اور باندیاں نہیں بنا سکتے، غلام اور باندیاں جو بہت بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دی تھی کہ گھر گھر ان کے باندیاں اور غلام ہوں ان سب سے یکسر محروم ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دشمنوں کے پنجے سے چھڑائے اپنے دین پر چلائے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور اصولِ شریعت کے مطابق جہاد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نوکرانیاں باندیاں نہیں ہیں ان سے جماع کرنا حرام ہے

اور آزاد لڑکے اور لڑکی کو فروخت کرنا بھی حرام ہے...... وہ باندیاں جن سے جماع کرنا جائز ہے وہ وہی قیدی ہیں جو جہاد کے موقع پر لائے گئے ہوں اور جنہیں امیر المؤمنین نے مجاہدین میں تقسیم کر دیا ہو۔ اس کے سوا ابتداً کسی مرد یا عورت کو غلام باندی بنانے کا کوئی راستہ نہیں، گھروں میں جو نوکرانیاں رکھ لیتے ہیں یہ باندیاں نہیں ہیں ان سے پردہ بھی واجب ہے اور ان سے جماع کرنا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح دوسری عورتوں سے حرام ہے۔ ان عورتوں سے جماع کرنا سراپا زنا کاری ہے اس کو خوب سمجھ لیا جائے، اگر کسی لڑکی کے ماں باپ لڑکی فروخت کر دیں یا کہیں سے اغوا کر کے کوئی لا کر بیچ دے یا کوئی عورت خود سے کہہ دے کہ میں باندی بن کر رہوں گی اس طرح سے وہ شرعی باندی نہ بنے گی اور اس سے جو جماع کیا جائے گا وہ زنا ہوگا۔

کیسی عورتوں سے نکاح کیا جائے...... فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ میں لفظ طَابَ فرمایا ہے یہ خوبی بہتری اور عمدگی کے معنی میں آتا ہے اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ جو عورتیں تمہیں پسند ہوں اس سے نکاح کرلو۔ پسند آنے کے اسباب میں حسن و جمال بھی ہے۔ مال بھی ہے اور دین داری بھی ہے۔ خوش خلقی بھی ہے اور بہت سے اوصاف ہیں جو عورتوں میں ہوتے ہیں۔ آیت کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ خوبی والی عورتیں تلاش کرنا غلط کام نہیں ہے بلکہ اس کی اجازت ہے اگر حسن و جمال دیکھا جائے تو یہ بھی جائز ہے البتہ دیندار کو ترجیح دینی چاہیئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا چار چیزوں کی وجہ سے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے مال کی وجہ سے، اس کے صاحب مرتبہ ہونے کی وجہ سے (شخصی حیثیت کی وجہ سے) اس کے جمال کی وجہ سے، اس کے دین کی وجہ سے، پس

اے مخاطب تو دین والی کو حاصل کر کے کامیاب ہو جا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ (رواہ مسلم ص ۴۷۳ ج ۱)

اچھی بیوی کی صفات...... ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا ساری کی ساری نفع کی چیز ہے اور دنیا کے منافع میں سب سے بہتر چیز نیک عورت ہے۔ (رواہ مسلم ص ۴۷۵ ج ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہتر عورتیں جو اونٹوں پر سوار ہیں (عرب عورتیں) قریش کی وہ عورتیں ہیں جو بچوں پر بہت زیادہ شفیق ہوتی ہیں اور شوہر کے مال کی بہت زیادہ حفاظت کرتی ہیں۔ (رواہ البخاری ص ۷۶۰ ج ۲)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تقوے کے بعد جو چیزیں بندہ کو حاصل ہوں ان میں نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی بہترین نعمت نہیں ہے۔ پھر نیک بیوی کے اوصاف بیان فرمائے۔

۱...... اگر اُسے حکم دے تو فرمانبرداری کرے۔

۲...... اور اُس کی طرف دیکھے تو اُسے خوش کرے۔

۳...... اور شوہر کوئی قسم کھائے (جو عورت کے عمل کرنے سے متعلق ہو مثلاً یوں کہے کہ تم فلاں کام ضرور ضرور کرو گی) تو اُس کی قسم پوری کرے۔

۴...... اور اگر شوہر کہیں چلا جائے تو اپنی جان اور شوہر کے مال میں خیر خواہی کرے۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۳۳)

جس طرح عورتوں میں دینداری کو دیکھ کر نکاح کرنے کو ترجیح دینی چاہیئے اسی طرح لڑکیوں کے لئے مرد بھی نیک دیکھنے چاہئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیغام بھیجے جس کی دینی اور اخلاقی حالت تمہیں پسند ہو تو اُس سے نکاح کر دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ ہو گا اور (لمبا) چوڑا فساد ہو گا۔ (رواہ الترمذی ص ۲۰۷ فی ابواب النکاح)

نکاح کرنا شرعی ضرورت ہے: نکاح انسان کی ضروریات میں سے ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے مرد میں عورت کی اور عورت میں مرد کی خواہش رکھی ہے۔ یہ خواہش فطری اور طبعی ہے نفس اور نظر کو پاک رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ سنن ترمذی (اوّل کتاب النکاح) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں پیغمبروں کے طریقے میں سے ہیں۔ ۱۔ حیاء، ۲۔ خوشبو لگانا، ۳۔ مسواک کرنا، ۴۔ نکاح کرنا۔

بے نکاح کے رہنا کوئی کمال اور دینداری کی بات نہیں ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اے جوانو! تم میں سے جسے نکاح کرنے پر قدرت ہو نکاح کر لے، کیونکہ وہ نظر کو پست رکھنے والا ہے اور شرم کی جگہ کو پاک رکھنے والا ہے، اور جسے نکاح کی قدرت نہ ہو وہ روزے رکھے کیونکہ اس سے شہوت دب جائے گی۔ (رواہ البخاری ص ۷۵۸ ج ۲)

قوت مردانہ زائل کرنے کی ممانعت...... اگر نکاح کرنے کا موقع نہ لگے تو قوت مردانہ ختم کرنے کی اجازت نہیں البتہ عارضی طور پر اور بقدر ضرورت روزے رکھ کر شہوت کو دبا لے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خصی ہونے اور قوت مردانہ زائل کرنے کی اجازت مانگی تو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَصٰی وَلَا اخْتَصٰی اِنَّ خَصَاءَ اُمَّتِیْ الصِّیَامُ یعنی وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی کو خصی کرے یا خود خصی ہو بلاشبہ میری اُمت کا خصی ہونا یہ ہے کہ روزے رکھا کریں۔ (رواہ فی شرح السنۃ کما فی المشکوٰۃ المصابیح ۶۹) نکاح کرنے میں دینی، دنیاوی بہت سے منافع ہیں مرد کو سکون کی جگہ مل جاتی ہے۔ کام کاج کر کے تھکا ماندہ آ کر آرام کا ٹھکانا پکڑ لیتا

ہے جیسے سورت اعراف میں لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا سے تعبیر فرمایا اور عورت کو بھی اخراجات کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اسے کمانا نہیں پڑتا پردہ میں محفوظ رہتی ہے مرد و عورت دونوں کی حیثیت اور شخصیت بن جاتی ہے گھر بار والے آل اولاد والے کہلاتے ہیں پھر جو اولاد ہوتی ہے اس سے دل خوش ہوتا ہے، بچوں کو کھلانے پلانے پہنانے سے مسرت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں اور اس اولاد کو جب دین اور علمِ دین پڑھا دیا جائے تو آخرت میں بھی رفع درجات کا ذریعہ بن جاتی ہے، اسلام کے احکام فطرت انسانیہ کے موافق ہیں۔ انسانی خواہشوں کو اسلام نے ختم نہیں فرمایا بلکہ ان کی حدود مقرر فرما دی ہیں اور متعلقہ احکام کی تعلیم دے کر ان کا پابند بنا دیا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ﴿۴﴾

اور تم عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو، سو اگر وہ تمہارے لئے اس میں سے نفس کی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو اُس سے مبارک طور پر خوشگواری کے ساتھ کھالو۔

عورتوں کے مہر ادا کرنے کا حکم

شریعتِ مطہرہ میں عورت کی ایک حیثیت ہے، جب کوئی مرد اس سے نکاح کرے تو اس کا مہر مقرر کرے اور جس قدر مہر پر وہ راضی ہو اتنے مہر پر نکاح ہوگا، مہر کی مقدار مقرر کرنے کے لئے اس پر زبردستی نہیں کی جا سکتی، پھر جب مہر مقرر کر دیا تو اُس کا ادا کرنا فرض ہے اور مرد جب تک مہر ادا نہ کرے بیوی کا قرض دار رہے گا اگر عورت پورا مہر یا کچھ حصہ معاف کر دے یا کچھ حصہ لینے کے بعد واپس کر دے تو اس کو رکھ لینا جائز ہے البتہ اس میں ایک شرط لازم ہے اور وہ یہ کہ عورت نے جو کچھ دیا ہو یا معاف کیا ہو وہ اس نے طیب نفس کے ساتھ دیا ہو۔ طیب نفس کا معنی یہ ہے کہ اچھی طرح خوب خوشی سے دل کی گہرائی سے دے یا معاف کر دے اگر زبردستی معاف کروا لیا یا لکھوا لیا یا دھوکہ دے کر دستخط کرا لئے یا انگوٹھا لگوا لیا تو خواہ اسکی وجہ سے دنیاوی عدالتوں میں دعوٰی نہ کر سکے لیکن اس کا حق باقی رہے گا۔ اور آخرت میں ادا کرنا ہوگا۔

وہ مُعافی معتبر ہے جو طیب نفس سے ہو...... قرآن مجید میں مہر چھوڑنے کو جو طیب نفس کے ساتھ مشروط کیا ہے اس میں یہ بتایا ہے کہ جب تک سچ مچ اندر کے جذبات سے بلا دباؤ اور بلا اکراہ معاف نہ کیا گیا ہو اس وقت تک معاف نہ سمجھا جائے، بغیر طیبِ نفس کے معاف سمجھ لینا غلط ہے۔ طیب نفس کا لفظ استعمال فرمایا طیب قلب نہیں فرمایا اس میں یہ نکتہ ہے کہ انسان جب سوچنے بیٹھتا ہے تو بہت کچھ سوچ کر فیصلہ کرتا ہے اس سوچ بچار میں آئندہ حالات کے پیشِ نظر نفع نقصان کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ رشوت دینے والے سوچ سمجھ کر جان بوجھ کر رشوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بیس روپے دیں گے تو سو روپے بچیں گے یہ قلب (دل) کا اور دماغ کا کام ہے۔ لیکن نفس کبھی بھی اپنا حق چھوڑنے یا بے جگہ پیسہ خرچ کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ جب شوہر بیوی سے مہر معاف کرواتے ہیں تو اسے پتہ بھی نہیں ہوتا اگر میں معاف نہ کروں تو کتنے نوٹوں کے گڈے میری ملکیت میں آئیں گے اور ان کے خرچ کرنے کے بارے میں مجھے پورا پورا اختیار ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب معاف کرانے لگتے ہیں تو وہ دور تک سوچتی ہے کہ میں نے اگر معاف نہ کیا تو شوہر کو ناگواری ہوگی اور یہ ناراض ہو گیا تو کہاں جا کر رہوں گی۔ ماں باپ کب تک سہارا دیں گے۔ بھائی ہمیشہ رکھ نہیں سکتے ایسی باتیں سوچ کر اور یہ سمجھ کر کہ ملتا تو ہے نہیں لاؤ معاف ہی کر دوں، لہٰذا اوپر کے دل سے معاف کر دیتی ہیں۔ شرعاً بددلی کی معافی کا کوئی اعتبار نہیں، زبردستی یہی نہیں ہے کہ کسی سے ڈنڈا مار کر چھین لیا جائے۔ جو بھی چیز بددلی کے ساتھ لی جائے وہ لینے والے کے لئے حلال نہیں ہوتی۔ آیت شریفہ میں مہر کی معافی یا بخشش کے بارے میں فرمایا کہ طیب نفس سے دیدیں تو کھالو اور حدیث شریف میں قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ قانون بتا دیا کہ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا

اَلا لا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلاَّ بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (خبردار ظلم نہ کرو، خبردار کسی شخص کا مال حلال نہیں ہے مگر اس کے نفس کی خوشی کے ساتھ) (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۵)

بہت سے لوگ دوسرے کا مال لے لیتے ہیں وہ لحاظ میں یا کسی قسم کے دباؤ میں کچھ نہیں کہتا اور اندر سے تلملاتا رہ جاتا ہے۔ اس کی خاموشی سے حلال سمجھ لینا غلط ہے اس طرح مال لے لینا حرام کھانے ہی کے درجہ میں ہے۔ بعض لوگ مذاق میں کسی کی چیز لے لیتے ہیں پھر واپس نہیں کرتے اور جس کی چیز ہے وہ دل سے راضی نہیں ہوتا اس طرح سے کسی کا مال لے لینا حرام ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لا یَاْخُذُ اَحَدُکُمْ عَصَا اَخِیْهِ لاَعِبًا جَادًّا فَمَنْ اَخَذَ عَصَا اَخِیْهِ فَلْیَرُدَّهُ اِلَیْهِ (تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی اس طرح سے نہ لے لے کہ (ظاہر میں) دل لگی ہو اور دل سے واقعی طور پر لینے کا ارادہ ہو، جو شخص اپنے بھائی کی لاٹھی لے لے تو واپس کر دے (لاٹھی کو بطور مثال کے فرمایا چونکہ یہ معمولی چیز ہوتی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا یہی حکم ہے)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۵)

آخر میں یہ جو فرمایا فَکُلُوْهُ هَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز خوش دلی سے دی جائے اس کا کھانا مبارک بھی ہوگا اور خوشگوار بھی ہوگا۔ دل میں فرحت بھی ہوگی اور خوبی کے ساتھ جسم و جان میں بھی لگے گا۔ برخلاف اس کے جو چیز کسی کو بد دلی سے دی جائے، وہ مبارک نہ ہوگی نہ خوشگوار ہوگی اور نہ صحیح طور پر جسم و جان میں لگے گی۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاکْسُوْهُمْ

اور بیوقوفوں کو اپنے مال مت دو جن کو اللہ نے تمہارے لئے زندگی گذارنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور اُن مالوں سے اُن کو کھانے پینے کیلئے دے دو اور اُن کو کپڑے پہنا دو،

وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا

اور اُن سے بھلی بات کہہ دو۔ اور آزمالو تم یتیموں کو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل ہو جائیں، سو اگر تم اُن کی طرف سمجھ داری محسوس کرو

فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْکُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا ؕ وَمَنْ کَانَ

تو اُنکے مال اُن کو دے دو، اور مت کھاؤ انکے مالوں کو فضول خرچی کرتے ہوئے اور اُنکے بڑے ہو جانے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے، اور تم میں سے جو

غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ کَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْکُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ

شخص صاحب مال ہو وہ پرہیز کرے، اور جو شخص تنگدست ہو سو وہ مناسب طریقہ پر کھا لے، سو جب تم دے دو اُن کو اُن کے مال

اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝۶

تو اس پر گواہ بنالو، اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔

یتیم بچوں کے مالوں کے بارے میں چند ہدایات

ان دونوں آیتوں میں متعدد احکام ذکر فرمائے ہیں، اوّل یہ فرمایا کہ بیوقوفوں کو اپنے مال نہ دے دو۔ بیوقوفوں سے یتیم مراد ہیں۔ اوّل یہ حکم فرمایا تھا کہ یتیموں کو اُن کے مال دے دو جب وہ بالغ ہو جائیں، اور یہاں یہ فرمایا کہ باوجود بالغ ہو جانے کے ان کا مال اُن کو نہ دو، اگر اُن کے اندر ہوش مندی اور سمجھداری نہ پائی جائے، بالغ ہو کر بھی اُن میں بچپن کی بیوقوفی موجود ہو جس سے اندیشہ ہو کہ مال کو برباد کر دیں

گے تو اُن کے مال ان کے سپرد نہ کرو بلکہ اپنی تحویل میں حفاظت سے رکھو اور اُن کے کھانے، پینے، پہننے کے اخراجات میں خرچ کرتے رہو اور جب وہ دلگیر ہوں بُرا مانیں کہ ہمارا مال ہمارے قبضہ میں نہیں آیا تو اُن کو سمجھا دو کہ تمہاری مصلحت کے لئے میں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ ذرا اور بڑے ہو جاؤ تمہارا مال ہے تم ہی کو ملے گا وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ اَمْوَالَهُمْ نہیں فرمایا بلکہ اَمْوَالَكُمْ فرمایا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یتیموں کے مالوں کو خورد برد کرنے اور اپنے اوپر خرچ کرنے کے بارے میں تو اُن کے مال کو اپنا مال نہ سمجھو لیکن حفاظت سے رکھنے کے بارے میں ایسا سمجھو جیسے تمہارا ہی مال ہے ان کے مال کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرو، اور اس طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ تم میں سے جو کوئی شخص کسی یتیم کو مال ہبہ کرے تو اس مال کو بھی حفاظت سے رکھے اور اُن کو اُس وقت تک حوالہ نہ کرے جب تک کہ اُن میں بالغ ہونے کے بعد ہوشمندی سمجھداری نہ دیکھ لے۔

نیز ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ مال کو قیاماً سے تعبیر فرمایا اس میں یہ بتایا کہ مال کے ذریعہ انسان کی زندگی اچھی طرح سے گذرتی ہے اور مال انسانی زندگی کے صحیح طریقے پر قائم رہنے اور انسانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ ہے۔ اللہ کسی کو حلال مال دے تو اس کی قدر کرے اپنی جان پر اہل و عیال پر خرچ کرے مال کو ضائع نہ کرے فضول خرچی میں نہ اُڑا دے۔ مال ضائع کرنا ہنر اور کمال نہیں بلکہ حرام ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ نے تم پر حرام فرمایا ہے ماؤں کو تکلیف دینا، اور بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا (جیسے اہلِ عرب کرتے تھے) اور جس کا حق چاہیئے اس کا حق روک دینا اور جس پر اپنا حق نہ ہو اس سے مانگنا، اور اللہ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ قیل و قال کی جائے، اور زیادہ سوال کئے جائیں، اور مال ضائع کیا جائے۔ (رواہ البخاری ص ۳۲۴ ج ۱)

دوسرا حکم یہ دیا کہ یتیموں کو آزما لو، جب وہ بالغ ہو جائیں تو دیکھو ان کے اندر سمجھداری اور ہوشمندی ہے یا نہیں، اگر اُن کا مال اُن کے سپرد کر دیا جائے تو حفاظت سے رکھتے ہوئے سلیقہ سے اچھے چال چلن کے ساتھ زندگی گزارنے کا ذریعہ بنا سکیں گے یا نہیں بے جا خرچ کر کے مال کو برباد تو نہ کریں گے، جب تم یہ محسوس کر لو کہ مال کو ضائع نہیں کریں گے خوبی سے خرچ کریں گے تو اُن کے مال ان کو دے دو اس صورت میں بالغ ہو جانے کے بعد ان کے مال اُن کے سپرد کرنے میں دیر نہ لگاؤ۔

تیسرا حکم یہ ارشاد فرمایا کہ یتیموں کے مالوں کو فضول خرچی کر کے نہ کھا جاؤ اور اس ڈر سے نہ اُڑا دو کہ یہ بڑا ہو جائے گا تو اپنا مال مانگ لے گا اور ضابطہ کے مطابق اس کو دینا پڑے گا، یہ سوچ کر اس کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اپنی ذات یا اپنی اولاد پر یا احباب و اصحاب پر خرچ نہ کر ڈالو۔

چوتھا حکم یہ بیان فرمایا کہ جو اولیاء یتیموں کے مالوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں ان میں جو لوگ صاحبِ حیثیت ہیں وہ ان یتیموں کے مالوں میں سے نہ کھائیں، اور جو لوگ محتاج و ضرورت مند ہوں، وہ مناسب طریقے پر ان کے مال میں سے کھا سکتے ہیں، اس کے بارے میں علامہ آلوسی نے روح المعانی ص ۲۰۸ ج ۴ میں تین قول لکھے ہیں۔ اوّل: یہ کہ پہلے ضرورت مند ولی کو یتیم کے مال سے کھانے کی اجازت تھی بعد میں آیتِ کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى (الآیہ) نے اس کو منسوخ کر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو تنگدست ہو بطور قرض بقدرِ ضرورت اس کے مال سے کھا سکتا ہے، جب مال ہاتھ میں آ جائے

تو ادائیگی کردے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد اور حضرت ابوالعالیہ اور حضرت عبیدہ سلمانی اور حضرت باقر رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ تیسرا قول: یہ ہے کہ یتیم کا ولی جو ضرورت مند ہو اس کے مال کی نگرانی اور متعلقہ امور ضروریہ کی مشغولیت کے عوض بطور اجرت اس میں سے کھا سکتا ہے، مگر یہ کھانا بالمعروف یعنی مناسب طریقہ پر ہو۔ مثلاً ایک یتیم ہے اس کے باپ نے جائیداد چھوڑی بہت دکانیں ہیں، مکان ہیں، کھیتیاں ہیں، باغات ہیں ان کی دیکھ بھال کرنے، کرائے وصول کرنے اور محکموں میں جانے، مزدوروں کسانوں کو تلاش کرنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے اس دوڑ دھوپ، محنت و کوشش کے عوض وہ شخص کھا سکتا ہے جو ان کاموں میں لگا ہوا ہے، اور یہ کھانا بھی بالمعروف یعنی مناسب طریقے پر ہو، اس میں یتیم کی ہمدردی کا پورا پورا لحاظ رہے مال اُڑانے کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، اُس سے زیادہ نہ لے جتنا اور کسی شخص کو کسی کی اُجرت دینا گوارا ہوتا، اور یہ بھی دیکھ لیں کہ ہم اپنے کام کے لئے آتے تو کتنا خرچ ہوتا۔ ایسا نہ کریں کہ یتیم کے مال کی نگہداشت کرنے کے سلسلہ میں سفر میں جائیں تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہر کر بے تحاشا مال خرچ کردیں اور اپنی ضرورت سے اسی شہر میں جائیں تو معمولی سے کرائے کی جگہ لیں اور معمولی سا کھانا کھا کر گذار لیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ جو اپنے لئے پسند کریں وہی یتیم کے لئے پسند کریں۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ جب یتیموں کو اُن کے مال سپرد کرنے لگو تو گواہ بنالیا کرو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بعد میں وہ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے مال نہیں لیا، اور جتنا مال دیا ہوگا اس کی مقدار کا علم بھی رہے گا اور کبھی کوئی بات مخالفت اور اعتراض کی پیش آ گئی تو گواہوں کے ذریعہ فیصلہ ہو سکے گا۔

آخر میں فرمایا وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا (اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے) اس لفظ میں بہت جامعیت ہے جو بھی ولی یا وصی یتیم کے مال کی نگرانی کرے گا اس سلسلہ میں غلط طریقہ اختیار کرے گا مثلاً حساب غلط لکھے گا۔ کسی حاکم کو رشوت دے کر غلط فیصلہ کرالے گا یا یتیم بالغ ہو کر مال لینے کے بعد وصول کرنے سے انکاری ہو جائے گا یا جتنا مال ملا ہے اس کی مقدار کم ظاہر کرے گا (غرض جس جانب سے بھی غبن یا خیانت ہو) تو وہ دنیا کی ظاہری کاغذی کارروائی کے ذریعہ مطمئن نہ ہو جائے اس کے پیش نظر رہے کہ یوم آخرت بھی سامنے ہے، اللہ جل شانہٗ حساب لینے والا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے وہاں کے حساب میں صحیح اترنا چاہیئے۔

فائدہ...... آیتِ بالا میں جو یہ فرمایا حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ کہ یتیم بچے جب بالغ ہو جائیں تو سمجھداری محسوس ہونے پر اُن کے مال ان کے حوالے کردو اس میں بلوغ کا ذکر ہے۔ لڑکا بالغ جب ہوتا ہے جب احتلام ہو جائے یا انزال ہو جائے اور لڑکی اس وقت بالغ ہوتی ہے جب اُسے حیض آ جائے یا احتلام ہو جائے یا حاملہ ہو جائے اگر ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہ ہو تو لڑکا یا لڑکی جب بھی ہجری سال کے اعتبار سے پندرہ سال کا ہو جائے شرعاً بالغ سمجھا جائے گا۔ قول مفتی بہ یہی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ

مردوں کے لئے اس مال میں سے حصہ ہے جو اُن کے ماں باپ نے اور رشتہ داروں نے چھوڑا، اور عورتوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو اُن کے

الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا، وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے۔

میراث میں مردوں اور عورتوں کے حصے مقرر ہیں

اس آیت شریفہ میں میراث جاری کرنے کی اہمیت بتائی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مردوں اور عورتوں کے جو حصے مقرر ہیں ان کا دے دینا فرض ہے۔ مردوں کا بھی اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے متروکہ مالوں میں حصہ مقرر ہے۔ اور عورتوں کے لئے بھی اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے اموال واملاک میں حصہ مقرر ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو مرنے والے کی میراث سے حصہ نہیں دیا کرتے تھے اور اب بھی بہت سی قوموں میں یہی رواج ہے، اوّل تو لوگ میراث تقسیم کرتے ہی نہیں جس کے قبضہ میں جو کچھ ہوتا ہے اس پر قبضہ جمائے بیٹھا رہتا ہے۔ اور اگر حصہ دینے بھی لگتے ہیں تو مرنے والوں کی بیویوں اور لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے۔ خاص کر جہاں دو بیویوں کی اولاد دھوان میں جس بیوی کی اولاد کا قابو ہو گیا وہی سارا مال دبا لیتے ہیں شرعی طور پر حق دینے کا ذرا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ وارثین میں یتیم بچے بھی ہوتے ہیں ان کا مال بھی کھا جاتے ہیں اور میراث کا جو شرعی نظام ہے اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، نماز پڑھنے کی حد تک تو مسلمان ہیں تلاوت ذکر اذکار بھی خوب کرتے ہیں لیکن میراث جاری کرنا جو شریعت کا ایک لازمی حکم ہے اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ آیتِ بالا سے معلوم ہوا کہ جیسے والدین سے میراث پہنچتی ہے ایسے ہی دوسرے رشتہ داروں کے مال میں سے بھی بطور میراث مردوں اور عورتوں کو حصہ پہنچتا ہے جس کی کچھ تفصیلات ان شاء اللہ سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی تفسیر میں معلوم ہوں گی ہر رشتہ دار کو حصہ نہیں پہنچتا ہے اس کے کچھ اصول مقرر ہیں جو کتب فرائض میں مذکور ہیں۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جب تقسیم کرنے کے موقعہ پر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین حاضر ہو جائیں تو اس مال میں سے ان کو

وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا

بھی کچھ دیدو، اور اُن سے اچھے طریقہ پر بات کرو۔ اور چاہیئے کہ وہ لوگ ڈریں جو اپنے پیچھے ضعیف بچوں کو چھوڑ جاتے اور ان

خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ

پر خوف ہوتا سو یہ لوگ اللہ سے ڈریں اور ٹھیک بات کریں۔ بیشک جو لوگ ظلم کے طریقے پر

الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾

یتیموں کا مال کھاتے ہیں بات یہی ہے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اور عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

یتیموں کا مال کھانے پر سخت وعید اور اُن کے مالوں کی نگرانی کا حکم

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میراث کا مال تقسیم ہونے لگے تو عزیز رشتہ دار اور یتیم مسکین بھی حاضر ہو جاتے ہیں جن کو میراث میں شرعاً حصہ نہیں پہنچتا اگر یہ لوگ ایسے موقعہ پر حاضر ہو جائیں تو بالغ ورثاء اپنے حصوں میں سے کچھ دے دیں تاکہ ان کی دلداری ہو جائے اور اُن کو مناسب طریقہ پر نرمی کے ساتھ اچھے الفاظ میں سمجھا دیں کہ شرعاً تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے تم کو میراث میں سے نہ دینا کوئی ظلم زیادتی کی بات نہیں ہے اور یہ ہم اپنے پاس سے پیش کر رہے ہیں۔ آپ حضرات قبول کر لیں اور دلگیر نہ ہوں اللہ کی قضا وقدر اور اس کی شریعت پر

راضی رہیں، پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کے قبضہ میں مرنے والے کا مال آ جائے وہ لوگ مال کو خود ہی لے کر نہ بیٹھ جائیں، شرعی حصہ داروں کو اُن کے حصے دے کر شرعی فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں، ان میں ضعیف بھی ہوتے ہیں محتاج بھی، یتیم بھی، اور چھوٹے بچے بھی، اگر ان کا حصہ نہ دیا یا حصہ دینے میں دیر لگائی تو اُن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا یہ غور کریں کہ اگر ہم مر جاتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ جاتے تو ہماری کیا خواہش ہوتی۔ اپنی اولاد کے بارے میں یہ سوچتے کہ پورا پورا حصہ ملے تاکہ ضائع ہو جانے سے بچ جائیں۔ یہی بات دوسروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے بارے میں سوچنی چاہیئے، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میراث صحیح طریقہ پر تقسیم کرو اور بچوں کا مال ایسے ولی یا وصی کے سپرد کرو جو مال کو ضائع نہ کردے خیانت نہ کرے اور بچوں پر مناسب طریقہ پر خرچ کرے اور جب بالغ ہو جائیں تو اُن کو دے دے عملی طور پر بھی بچوں کو مطمئن کر دے اور اُن کا حصہ دے دے تاکہ حق بحق دار رسید پر عمل ہو جائے اور قولی طور پر بھی ایسی باتیں کرے جو مناسب ہوں جن میں اُن کی دلداری ہو۔

پھر فرمایا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا ہی سب کچھ ہے، کھایا پیا یہیں برابر ہو جائے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ آگے آنے والی گھاٹی بہت سخت ہے یوم آخرت میں حساب و کتاب ہے یتیموں کا مال کھا جانا آسان بات نہیں۔ یہاں وہ ضعیف ہیں معصوم بچے ہیں کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن بارگاہِ خداوندی میں جب پیشی ہوگی تو اس حرام خوری کی سزا بھگتنی ہوگی۔ یتیم کا مال کھا رہے ہیں، بظاہر روٹی سے پیٹ بھر رہے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے پیٹ میں ''نار'' آگ کے انگارے بھر رہے ہیں اور پھر قیامت کے دن دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ جو لوگ ورثہ کا مال تقسیم نہیں کرتے یتیموں کا حق نہیں دیتے اور جو لوگ یتیم خانے کھول کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ یتیموں کے نام سے چندے کرتے ہیں اور اُن پر ذرا بہت خرچ کر کے خود ہی کھا جاتے ہیں۔ آیت کے مضمون پر بار بار غور کریں حقیقت یہ ہے کہ میراث کے مال تقسیم نہ کرنے کی وجہ سے گھر گھر یتیم کا مال کھایا جا رہا ہے اور کھانیوالوں کو ذرا اس طرف توجہ نہیں۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ

اللہ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے ،لڑکے کے لئے اتنا حصہ ہے جتنا دو لڑکیوں کا ہے، سو اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو اُن کے لئے

فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا

اس مال کا دو تہائی ہے جو مرنے والے نے چھوڑا، اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے اور اس کے ماں باپ کیلئے یعنی ہر ایک کے لئے چھٹا چھٹا

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ

حصہ ہے اس مال میں سے جو مرنے والے نے چھوڑا بشرطیکہ اس کے اولاد ہو، پس اگر اُس کیلئے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اُس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کیلئے تہائی ہے،

فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ

سو اگر مرنے والے کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے۔ اس وصیت کے نافذ کرنے کے بعد جو مرنے والے نے کی ہو یا اُس قرض کی ادائیگی کے بعد جو میت

وَاَبْنَاۗؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پر ہو، تمہارے باپ اور بیٹے ہیں تم نہیں جانتے کہ ان میں سے تم کو کون شخص نفع پہنچانے میں زیادہ قریب تر ہے، یہ حصے اللہ کی طرف سے

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

مقرر ہیں۔ بے شک اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

میراث پانے والوں کے حصوں کی تفصیل

اس رکوع میں تفصیلی طور پر اللہ جل شانہ نے میراث کے احکام بتائے ہیں اور میراث کے بعض احکام سورۂ نساء کے آخری رکوع میں بھی مذکور ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں ماں باپ اور اولاد کے حصے بیان فرمائے۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ اللہ تم کو اولاد کی میراث کے بارے میں حکم دیتا ہے اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ مرنے والے کے چھوڑے ہوئے مال میں جو حصے دیئے جا رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ خود مرنے والے کو یا کسی بھی حکومت کے لئے جائز نہیں کہ اُن میں ردوبدل کرے، قرآن کے بیان فرمودہ قانون کے خلاف جو کوئی قانون بنا دیا جائے وہ قانون باطل ہوگا اس کے بعد فرمایا: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ یعنی لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دے دو۔

۱۔۔۔۔۔ مثلاً اگر ماں باپ نہ ہوں اور بیوی اور شوہر بھی نہ ہو اور ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہوں تو متروکہ مال کے چار حصے کر کے دو حصے لڑکے کو اور ایک ایک حصہ ہر لڑکی کو دے دیا جائے۔

۲۔۔۔۔۔ اور اگر مرنے والے کے ماں باپ ہیں یا دونوں میں سے ایک ہے یا شوہر یا بیوی ہے تو ان کا حصہ دے کر جو مال بچ جائے اس کو بھی اسی اصول کے مطابق تقسیم کر دیا جائے یعنی ہر لڑکے کو ہر لڑکی سے دوگنا دے دیا جائے۔

۳۔۔۔۔۔ اور اگر مرنے والے نے اولاد میں صرف لڑکیاں چھوڑی ہیں لڑکا کوئی نہیں ہے تو اگر صرف ایک لڑکی ہے تو اُس کو کل مال کا آدھا حصہ دے دیا جائے (اور باقی حسبِ ضابطہ دوسرے وارثوں کو دے دیا جائے گا)۔

۴۔۔۔۔۔ اور اگر لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں اور لڑکا کوئی نہ ہو تو ان دونوں لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی ۲/۳ حصہ دے دیا جائے یعنی ہر لڑکی کو تہائی تہائی حصہ دے دیں اور باقی ایک تہائی دوسرے وارثوں کو حسبِ ضابطہ دے دیا جائے۔

۵۔۔۔۔۔ اگر مرنے والے کے ماں باپ بھی ہیں اور اولاد بھی ہے اگرچہ ایک لڑکا یا ایک لڑکی ہی ہو تو ہر ایک کو چھٹا چھٹا حصہ یعنی ۱/۶ دے دیا جائے۔ یعنی باپ کو بھی چھٹا حصہ اور ماں کو بھی چھٹا حصہ دے دیں، باقی مال جو بچے وہ اولاد پر تقسیم کر دیا جائے۔ جس کا اصول اوپر بیان کیا گیا۔

۶۔۔۔۔۔ اور اگر مرنے والے کی اولاد نہ ہو نہ لڑکا ہو نہ لڑکی۔ اور میراث پانے والے صرف والدین ہی ہوں تو کل مال کا ایک تہائی حصہ ۱/۳ والدہ کو اور دو تہائی ۲/۳ والد کو دے دیا جائے۔

۷۔۔۔۔۔ اگر مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور میراث پانے والے ماں باپ ہوں اور ساتھ ہی اس کے بھائی بہن بھی ہوں جو ایک سے زیادہ ہوں (مثلاً ایک بھائی اور ایک بہن ہو) خواہ سگے ہوں یا باپ شریک ہوں یا ماں شریک ہوں تو اس صورت میں اس کی ماں کو کل مال سے چھٹا حصہ ۱/۶ دیا جائے گا اور باقی جو بچا وہ اس کے والد کو دے دیا جائے (بہن یا بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔ البتہ اُن کے موجود ہونے سے اتنا فرق پڑے گا کہ والدہ کا حصہ تہائی سے کم ہو کر چھٹا حصہ رہ گیا)۔

وَهٰذَا حَجْبُ النُّقْصَانِ فِيْ اِصْطِلَاحِ اَهْلِ الْفَرَائِضِ وَانْتَقَصَ حِصَّةُ الْاُمِّ مَعَ اَنَّ الْاِخْوَةَ لَمْ يَنَالُوْا شَيْئًا.

۸.....اور اگر مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور میراث پانے والے ماں باپ ہوں اور ساتھ ہی اُس نے صرف ایک بھائی یا صرف ایک بہن چھوڑی ہو تو اس سے والدہ کے حصہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ وہ حسبِ ضابطہ ۱/۳ حصہ لے گی اور باقی ۲/۳ باپ کو ملے گا۔

اولاد اور والدین کے حصے بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا یعنی یہ تمہارے اصول و فروع ہیں تمہیں پتہ نہیں کہ ان میں سے کون سا شخص تم کو (امید کے اعتبار سے) نفع پہنچانے میں زیادہ قریب تر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر میراث کی تقسیم چھوڑ دی جاتی تو تم تو یہ دیکھتے کہ جو شخص ہمیں زیادہ نفع پہنچانے والا ہو اسی کو حصہ زیادہ دیں اسی طرح حصے مقرر ہی نہ ہو سکتے تھے اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ کسی سے زیادہ امید باندھ کر زیادہ مال دینے کی وصیت کر دی جاتی خواہ اُس نے کچھ بھی نفع نہ پہنچایا ہو لہٰذا نفع یا اُمیدِ نفع پر میراث کے حصوں کی تقسیم نہیں رکھی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری مصلحتوں کے اعتبار سے خود ہی حصے مقرر فرما دیئے اور حصوں کی بنیاد اولاد یا ماں باپ ہونے پر رکھ دی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور جس کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے اسے وہی دینا ہو گا۔ کمی بیشی کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ وارث کو محروم کرنا بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اس نے جو کچھ حکم دیا وہ حکمت کے مطابق ہے۔

فائدہ.......... بہت سے لوگ اپنی بعض اولاد کو عاق کر دیتے ہیں اور حاکم کے یہاں یہ لکھوا دیتے ہیں کہ اس کو ہماری میراث سے کچھ نہ دیا جائے ایسا کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص ایسا لکھ بھی دے تب بھی کوئی اولاد حصہ شرعی سے محروم نہ ہو گی اور لامحالہ شرعی حصہ دینا ہی ہو گا۔ میراث کی تقسیم نفع پہنچانے یا خدمت زیادہ کرنے کی بنیاد پر نہیں ہے۔ بلکہ اولاد ہونے کی بنیاد پر ہے لہٰذا کسی بھی لڑکے یا لڑکی کو میراث سے محروم کرنا یا ایسی وصیت کر دینا کہ اِسے میراث نہ ملے شرعاً حرام ہے۔

فائدہ ثانیہ.......... اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ماں باپ کی میراث میں تمام اولاد کو حصہ دار بنایا ہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ البتہ لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا رکھا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ لڑکی کو شوہر کی طرف سے مہر بھی ملے گا اور اس کی اولاد کی پرورش بھی اس کے شوہر یعنی بچوں کے باپ کے ذمہ ہو گی۔ برخلاف اس کے لڑکوں کو اپنی بیویوں کو مہر دینے ہوں گے اور اولاد کی پرورش بھی خود کرنی ہو گی۔

بہنوں کو میراث سے محروم کرنا حرام ہے...... اور یہ بات ملحوظ رہے کہ لڑکیوں کو میراث سے محروم کر دینا اور اُن کو جو میراث سے حصہ ملتا ہے وہ لڑکوں کا آپس میں ہی تقسیم کر لینا (جیسا کہ اکثر یہی ہوتا ہے) یہ سخت حرام ہے۔ بہنوں پر ظلم ہے اور قانونِ خداوندی سے بغاوت ہے اگر کسی فرد یا جماعت یا پنچائت یا ملک کے احکام اپنے مروجہ قانون کے مطابق لڑکوں ہی میں مرنے والوں کی میراث تقسیم کر دیں اور لڑکیوں کو محروم کر دیں تو اس طرح سے لڑکوں کے لئے شرعاً بہنوں کا حصہ لے لینا حلال نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے لڑکیوں کے حصہ کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فرمایا یعنی لڑکوں کا حصہ علیحدہ سے بتایا ہی نہیں بلکہ لڑکیوں کا حصہ بتاتے ہوئے لڑکوں کا حصہ بتایا ہے، غیر منقسم ہندوستان میں جب انگریزوں کا تسلط تھا اور انہیں کا قانون رائج تھا اس زمانہ میں ایک مسلمان، انگریز مجسٹریٹ کے یہاں اپنے باپ کی میراث تقسیم کرانے کے لئے گیا اور اس سے کہا کہ آپ انگریزی قانون کے مطابق تقسیم کر دیں۔ مجسٹریٹ نے کہا چونکہ میں سرکاری ملازم ہوں اس لئے میں اسی طرح تقسیم کر دوں گا جیسے آپ کہہ رہے ہیں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ آپ مسلمان ہوتے ہوئے قرآن کے مطابق کیوں تقسیم نہیں کراتے؟ قرآن میں تو آدھی سطر سے بھی کم میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کا حصہ بیان فرما دیا ہے آپ قرآن کے لفظ لِلذَّكَرِ کو تو ماننے کے لئے تیار ہیں مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ماننے کو تیار نہیں۔ یہ قرآن ماننے کا کون سا طریقہ ہے؟ مسلمان صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

بعض لوگ بہنوں کا حصہ یوں کہہ کر دبا لیتے ہیں کہ وہ لیتی ہی نہیں یا انہوں نے معاف کر دیا ہے۔ اگر واقعی سچے دل سے معاف کر دیں تو وہ معاف ہو جاتا ہے لیکن اگر انہوں نے اوپر کے دل سے معاف کر دیا تو اس سے معاف نہیں ہوگا، اس میں بھی وہی تفصیل ہے جو فَـاِنْ طِبْـنَ لَـكُمْ عَنْ شَيْءٍ کے ذیل میں مہروں کی معافی کے سلسلہ میں ذکر ہو چکی ہے۔ اگر بہنوں کو بتادے کہ تمہارا اتنا اتنا حصہ ہے، اتنے اتنے ہزار روپے تمہارے حصے میں آ رہے ہیں اور باغ میں تمہارا اتنا حصہ ہے اور مکان میں، جائیداد میں اور زرعی زمین میں اتنا اتنا حصہ ہے۔ اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اپنے اپنے حصہ میں صاحب اختیار ہیں۔ معاف نہ کریں تو ہمارے بھائی ضرور ہمارا حصہ ہم کو دے دیں گے اس کے باوجود معاف کر دیں تو یہ معافی معتبر ہوگی اگر انہوں نے یہ سمجھ کر اوپر کے دل سے معاف کر دیا کہ ملنا تو ہے ہی نہیں۔ بھائیوں کا دل بھی کیوں بُرا کیا، اگر شوہر سے مخالفت ہوگئی یا اُس کی موت ہوگئی تو ان بھائیوں کے پاس آنا پڑے گا۔ اس وقت بھائی بُرا مانیں گے اور بھابیاں طعنہ دیں گی اس لئے لاؤ مجبوراً زبانی طور پر معاف ہی کر دیں۔ ایسی معافی کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ معافی طیب نفس سے اور اندر کی خوشی سے نہیں ہے۔

فائدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔میت کے مال میں سے جو حصے تقسیم ہوں گے۔ وہ قرضوں کی ادائیگی اور وصیت نافذ کرنے کے بعد جاری ہوں گے جس کو مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ کے مختصر الفاظ میں بیان فرمادیا ہے یہ واضح رہے کہ قرضوں کی ادائیگی میراث نافذ کرنے سے پہلے ہوگی اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں اوراق میں بیان ہوگی۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ

اور تمہارے لئے اس مال میں سے آدھا ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے اولاد نہ ہو، سو اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارے لئے اس کا مال

فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ ۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ

چوتھائی ہے جو کچھ انہوں نے چھوڑا، اُس وصیت کے نافذ کرنے کے بعد جو وہ وصیت کر گئیں اور اس قرضے کی ادائیگی کے بعد جو اُن کے ذمہ ہے، اور ان کیلئے اس مال

مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ

کا چوتھائی ہے جو تم نے چھوڑا اگر تمہارے اولاد نہ ہو، سو اگر تمہارے اولاد ہو تو اُن کے لئے آٹھواں ہے اس میں سے جو تم نے چھوڑا، اُس وصیت کے

مِّنْ ۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ

نافذ کرنے کے بعد جو تم وصیت کر گئے ہو، یا قرض کی ادائیگی کے بعد جو تمہارے ذمہ ہو۔

میراث میں شوہر اور بیوی کا حصہ

اس آیت میں شوہر اور بیوی کا حصۂ میراث بیان فرمایا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔۔۔۔۔اگر بیوی فوت ہو جائے تو اس کے کل متروکہ اموال و املاک سے شوہر کو آدھا مال ملے گا۔ بشرطیکہ اس نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو نہ کوئی لڑکا ہو اور نہ کوئی لڑکی، نہ ایک اور نہ ایک سے زیادہ، نہ اس شوہر سے اور نہ کسی پہلے شوہر سے۔

۲۔۔۔۔۔اگر عورت فوت ہو جائے اور اس نے کوئی اولاد چھوڑی ہو خواہ ایک لڑکا یا لڑکی ہی ہو، موجودہ شوہر سے ہو یا پہلے شوہر سے تو جس شوہر کی زوجیت میں ہوتے ہوئے فوت ہوئی ہے اس شوہر کو اس عورت کے متروکہ مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اور دونوں صورتوں

میں یہ حصہ ادائے دین اور انفاذ وصیت کے بعد دیا جائے گا۔

۳......اگر شوہر فوت ہو جائے اور اُس نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو نہ موجودہ بیویوں میں سے کسی سے اور نہ کسی پہلی بیوی سے تو مرتے وقت منکوحہ موجودہ بیوی کو کل متروکہ مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا۔

۴......اور اگر شوہر نے کوئی اولاد بھی چھوڑی ہے خواہ ایک لڑکا یا ایک لڑکی ہی ہو (کسی سابقہ یا موجودہ بیوی سے) تو موت کے وقت جو بیوی اس کے نکاح میں تھی اس کو شوہر کی میراث سے آٹھواں حصہ ملے گا۔

یہ حصہ دونوں صورتوں میں ادائیگی دیون اور انفاذِ وصیت کے بعد دیا جائے گا۔

فائدہ......اگر مرنے والے نے ایک سے زیادہ بیویاں چھوڑی ہوں تو ۱/۴ یا ۱/۸ میں سب شریک ہوں گی اور مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق چوتھائی یا آٹھواں حصہ مشترکہ طور پر سب کو ملے گا۔ ایسا نہیں کہ ہر ہر بیوی کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ دیا جائے۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ

اور اگر مرنے والا کوئی مرد یا کوئی عورت ہو جس کو مورث بنایا جا رہا ہو اور حال (۱) یہ ہے کہ اس کے ماں باپ (۲) میں سے کوئی نہ ہو اور نہ کوئی بیٹا بیٹی ہو اور نہ پوتا پوتی ہو اور اس نے کوئی بھائی

مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ

یا بہن چھوڑی ہو، تو اُن میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے، سو اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی مال میں شریک ہوں گے اس وصیت کے

وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ

نافذ کرنے کے بعد جس کی وصیت کی گئی ہو اور ادائے قرض کے بعد، اس حال میں کہ نقصان پہنچانے کی نیت نہ کی ہو، یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾

اور اللہ تعالیٰ علیم ہے اور حلیم ہے۔

اخیافی بہن بھائی کا حصہ

یہاں پر کلالہ کی میراث کا حکم بیان فرمایا ہے۔ کلالہ وہ مرد یا عورت ہے جس کی نہ ماں زندہ ہو نہ باپ نہ دادا، نہ بیٹی ہو، نہ بیٹا، نہ بیٹے کی اولاد ہو، اگر کلالہ مر جائے اور اُس کے سگے بہن بھائی ہوں یا باپ شریک بہن بھائی ہوں تو ان کا حصہ سورۂ نساء کی آخری آیت يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ میں بیان فرمایا ہے اور اگر ایسے مرد یا عورت کا کوئی بہن یا بھائی ماں شریک ہو (جسے فقہاء کی اصطلاح میں اخیافی بہن بھائی کہتے ہیں) تو ان کا حصہ یہاں بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت کلالہ ہو اور اس کا ایک بھائی ماں شریک یا ایک بہن ماں شریک ہو تو اس میں سے ہر ایک کو مرنے والے کے مال میں سے چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ اُس صورت میں ہے جبکہ صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہو، اور اگر یہ لوگ ایک سے زیادہ ہوں یعنی ماں شریک دو بھائی ہوں یا دو بہنیں ہیں یا ایک بھائی

---

۱)...... کلالہ کی تفسیر کو ترجمہ میں لے لیا گیا ہے ۱۲۔ ۲)...... دادا بھی باپ کے حکم میں ہے ۱۲۔

اور دو بہنیں ہوں یا دو بھائی اور ایک بہن ہو یا اس سے بھی زیادہ ہوں تو وہ سب مرنے والے کے تہائی مال میں برابر کے شریک ہوں گے۔ ان میں مذکر مؤنث کا حصہ برابر ہوگا اور باقی دو تہائی مال دوسرے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ ان کو دونوں صورتوں میں جو حصہ ملے گا ادائے دین اور انفاذِ وصیت کے بعد دیا جائے گا یہ تفصیل اخیافی بہن بھائی کے حصوں کے بارے میں ہے۔

عینی اور علاتی بہن بھائیوں کا حصہ......: اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو گیا جو کلالہ ہے یعنی اس کی اولاد یا ماں باپ نہیں ہیں اور اُس کی ایک بہن حقیقی یا باپ شریک ہے تو اس بہن کو مرنے والے کا آدھا مال دیا جائے گا اور اگر کوئی عورت وفات پا گئی جو کلالہ ہے جس کے اولاد اور ماں باپ نہیں ہیں اور اس کا ایک بھائی حقیقی یا باپ شریک ہے تو یہ بھائی اپنی بہن کے کل مال کا وارث ہو جائے گا۔ اگر مرنے والا کلالہ ہے اور اس کی دو بہن ہیں سگی یا باپ شریک ہیں تو یہ دونوں مرنے والے کے کل ترکہ سے دو تہائی ۲/۳ مال لے لیں گی اور اگر دو بہنوں سے زیادہ ہوں تب بھی سب دو تہائی ہی میں شریک ہوں گی

اور اگر کوئی شخص کلالہ فوت ہو گیا اور اس نے سگے یا باپ شریک بہن بھائی چھوڑے ہوں تو ان میں مرنے والے کی میراث لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے اصول پر تقسیم ہوگی، یعنی ہر لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کی وفات ہوگئی جس کی اولاد اور ماں باپ نہیں ہیں اور اس نے ایک سگا بھائی اور دو سگی بہنیں چھوڑی ہیں تو کل مال کے چار حصہ کر کے دو حصے بھائی کو اور ایک ایک حصہ ہر بہن کو دے دیا جائے گا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کلالہ کے بہن بھائیوں کی میراث کا حکم سورۂ نساء میں دو جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں ماں شریک بہن بھائیوں کا حصہ بتایا ہے، اور سورۂ نساء کے آخری رکوع میں سگے اور باپ شریک بہن بھائیوں کا حصہ بتایا ہے۔

میراث کے مقررہ حصے ادائے دین اور انفاذِ وصیت کے بعد دیئے جائیں گے...... جتنے بھی حصے شروع رکوع سے اب تک بیان فرمائے ان سب میں یہ قید لگائی ہے کہ یہ حصے مرنے والے کی وصیت نافذ کرنے اور ادائے دین کے بعد دیئے جائیں گے، یہاں یہ بات واضح رہے کہ وصیت کا ذکر اگرچہ دین سے پہلے آیا ہے لیکن اصول یہ ہے کہ پہلے مرنے والے کے مال سے اس کے کفن و دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں جو واجبی شرعی اخراجات ہوں، اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں۔ اگر پورا مال قرضوں کی ادائیگی میں خرچ ہو جائے تو اُس نے جو کچھ وصیت کی ہو نہ اُس کی کوئی حیثیت باقی رہے گی اور نہ کسی وارث کو کچھ ملے گا۔

ادائے دین انفاذ وصیت سے مقدم ہے...... حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَیْنٍ (جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وصیت مقدم ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت نافذ کرنے سے پہلے قرضے کی ادائیگی کا فیصلہ فرمایا ہے (رواہ ابن ماجہ والترمذی۔ مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۶۳)۔

وصیت تہائی مال میں نافذ ہوگی...... اگر قرضوں کی ادائیگی کے بعد کم یا زیادہ کچھ مال بچ گیا تو مرنے والے کے تہائی مال کے اندر اندر وصیت نافذ کی جائے گی (بشرطیکہ وصیت شرعاً صحیح ہو) اگر اُس نے تہائی سے زیادہ کی وصیت کی ہے تب بھی تہائی مال میں نافذ ہوگی ہاں اگر بالغ ورثاء اپنے حصہ میں سے خرچ کرنے پر راضی ہو جائیں تو جتنے مال کی اجازت دیں اسی قدر مال میں وصیت نافذ ہو سکے گی، نابالغ وارث کی اجازت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر مرنے والے کی کوئی وصیت نہیں ہے تو قرضوں کی ادائیگی کے بعد جو بھی مال بچے گا۔ اس سارے مال میں میراث جاری ہوگی، اگر نہ قرض ہے اور نہ وصیت ہے تو وارث اپنے اپنے مقررہ حصوں کے بقدر پورا مال تقسیم کر لیں گے۔

وصیت کے بعض احکام......اگر کوئی شخص آخرت کے اجر و ثواب کے لئے بطور صدقہ جاریہ کچھ مال خرچ کرنے کی وصیت کر دے یا وارثوں کے علاوہ کسی دوسرے عزیز قریب یا کسی اجنبی کو اپنے مال میں سے کچھ دینے کے لئے وصیت کر دے تو صرف تہائی مال میں وصیت کرے اور بہتر یہ ہے کہ تہائی سے بھی کم میں کرے، جب مرنے والے نے وصیت کر دی تو اب وارثوں پر فرض ہے کہ جو وصیت شریعت کے مطابق ہو اس کو نافذ کریں اور وصیت کا مال خود نہ کھا جائیں اگر ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے، قرآن مجید میں جو وصیت کو دین سے پہلے ذکر کیا ہے (اور بار بار ایسا ہی فرمایا ہے) بعض علماء نے اس کی یہی حکمت بتائی ہے کہ جن لوگوں کا قرض ہے وہ تو لڑ جھگڑ کر قوت و طاقت سے وصول کر لیں گے اور وصیت کا نافذ کرنا محض وارثوں کے رحم و کرم پر ہے۔ نہ مسجد و مدرسہ والے دعویٰ لے کر اٹھیں گے نہ دوسرا شخص جس کے لئے وصیت کی ہے جھگڑنے کے لئے کھڑا ہوگا (بلکہ بعض مرتبہ اُسے پتہ بھی نہیں ہوتا جس کے لئے وصیت کی ہے) اس لئے قرآن مجید میں بطور تاکید اور شدتِ اہتمام ظاہر فرمانے کے لئے وصیت کو ترتیبِ ذکری میں مقدم فرمایا اگر چہ وہ عملاً دین سے مؤخر ہے۔

مسئلہ..........اگر کسی شخص پر حج فرض تھا اور اس نے وصیت کر دی کہ میری طرف سے حج کرا دیا جائے تو یہ وصیت بھی تہائی مال میں نافذ ہوگی۔ وارثوں پر فرض ہوگا کہ اس کے تہائی مال میں سے حج بدل کرا دیں۔ یہ لوگ اس وصیت پر عمل نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے اگر تہائی مال سے حج کے مصارف پورے نہ ہوتے ہوں تو جہاں سے سفر کرانے سے تہائی مال سے مصارف پورے ہو سکتے ہوں وہاں سے کسی کو بھیج کر حج بدل کرا دیں۔ اور اگر ورثا اپنے حصے میں سے باقی اخراجات برداشت کر لیں تو یہ بہتر ہے۔ ثواب میں شریک ہو جائیں گے۔

فائدہ..........وارثوں کو میراث سے محروم کرنا یا اس کی نیت کرنا حرام ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے وارث کی میراث سے کچھ کاٹ دیا اللہ تعالیٰ جنت سے اس کی میراث کاٹ دے گا۔ (رواہ ابن ماجہ ص ۱۹۴) (مثلاً کسی وارث کے بارے میں یوں کہا کہ اسے میراث نہ دی جائے یا خود ہی اپنی موت سے پہلے سارا مال ادھر ادھر کر دیا تا کہ وارث کو نہ ملے تو اللہ تعالیٰ جنت سے اُس کی میراث کاٹ دے گا)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ کی فرمانبرداری کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں پھر موت کے وقت ایسی وصیت کر جاتے ہیں جس میں (وارثوں کو) ضرر پہنچا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ میراث کا یہ حصہ تلاوت فرمایا مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ الیٰ قولہ تعالیٰ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (رواہ احمد کما فی مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲٦)

مسئلہ..........وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہاں اگر دوسرے ورثاء اجازت دیں تو اس کی گنجائش ہے۔

مسئلہ..........قاتل کو مقتول کی میراث نہیں ملے گی۔

میراث کے بعض احکام مسئلہ......مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (رواہ البخاری ص ۱۰۰۱ ج ۲)

فائدہ......میراث پانے والے تین قسم کے رشتہ دار ہیں۔ اوّل اصحاب الفرائض جن کے حصے قرآن مجید نے مقرر کئے ہیں (جن کا بیان

تفصیل کے ساتھ اوپر گذر چکا ہے) دوم: عصبات، جو مال اصحاب الفرائض سے بچ جائے یہ لوگ اس کے مستحق ہوتے ہیں، مثلاً مرنے والے کی اولاد میں جبکہ لڑکے لڑکیاں دونوں موجود ہوں تو دوسرے اصحاب الفروض کا حصہ دیکر جو بچے گا وہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کے اصول پر تقسیم کریں گے اسی طرح میت کے باپ کی اولاد یعنی میت کے بھائی اور میت کے دادا کی اولاد یعنی چچا اور چچاؤں کے لڑکے یہ سب اقرب فالاقرب عصبہ ہونے کی بنیاد پر وارث ہوتے ہیں اور ان میں تفصیل بہت ہے جو میراث کی کتب میں مذکور ہے اس مختصر سے بیان کو پڑھ کر مفتی نہ بن جائے، اگر اصحاب فرائض نہ ہوں تو پورا مال بعد ادائے دیون وانفاذ وصیت یہی لوگ لے لیتے ہیں۔ ان کے بعد ذوی الارحام کا درجہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عصبات نہ ہونے کی صورت میں حصہ ملتا ہے جیسے بیٹیوں کی اولاد، بہنوں کی اولاد، بھائیوں کی بیٹیاں۔ ان کے مسائل میں تفصیلات بہت ہیں جو باقاعدہ استاد سے پڑھنے سے سمجھ میں آتی ہیں۔

مسئلہ...... بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عصبات نہیں ہوتے اور اصحاب الفرائض سے جو مال بچ جاتا ہے ان ہی کو بقدر اُن کے حصوں کے واپس کر دیا جاتا ہے اس کو علماء میراث کی اصطلاح میں رد کرنا کہتے ہیں، اس سے شوہر اور بیوی مستثنیٰ ہیں ان پر رد نہیں کیا جاتا۔

مسئلہ...... مرنے والے نے بیوی کا مہر اگر ادا نہیں کیا تو بیوی بحیثیت قرض خواہ ہونے کے اوّل اپنا قرض لے گی جو بصورت مہر شوہر پر واجب ہے۔ پھر اپنا میراث کا مقررہ حصہ مستقل لے گی۔ عام طور سے لوگ مرنے والے کی بیویوں پر ظلم کرتے ہیں مہر نہیں دیتے یا میراث نہیں دیتے یا دونوں ہی سے محروم کر دیتے ہیں یہ ظلم آخرت میں وبال بن کر سامنے آئے گا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ

یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں، اور جو شخص اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اُسے اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ

ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے آگے

حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

نکل جائے وہ اسے آگ میں داخل فرمائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے عذاب ہے ذلیل کرنے والا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم اور نافرمانی پر وعید

میراث کے حصے بیان فرمانے کے بعد احکام خداوندیہ پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ اوپر بیان ہوا یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں خدائے پاک کے قانون کو توڑنا اور حد بندیوں سے آگے بڑھنا بغاوت ہے اور قانون کی پاسداری کرنا اور اس کی حفاظت کرنا اللہ تعالیٰ شانہٗ کی رضامندی اور اس کے انعامات حاصل ہونے کا سبب ہے۔ فرمانبرداروں کے لئے باغ ہیں جو دار النعیم میں ہوں گے۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے ان باغوں میں داخل ہو جانا بہت بڑی کامیابی ہے اور جو لوگ حدود وقوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ نافرمان ہیں۔ نافرمانوں کی سزا دوزخ کا عذاب ہے جو ذلیل کرنے والا ہے۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کو نہیں مانتے یا جھوٹے منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن اللہ کے قوانین کو غلط قرار دیتے ہیں ان کو ظالمانہ قوانین بتاتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں وہ تو کافر ہیں ہی ان کے لئے سزا دائمی اور ابدی ہے ان کو دوزخ سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا اور جو لوگ ایمان رکھتے ہوئے

بے عمل ہیں سزا کے مستحق وہ بھی ہیں۔ اللہ کی جب مشیت ہوگی اُن کی دوزخ سے رہائی ہو جائے گی۔ قوانین میراث کے بارے میں جو عملی خلاف ورزیاں ہوئی ہیں۔ ان کا تذکرہ سلسلۂ بیان میں کچھ آ چکا ہے، بعض باتیں جو رہ گئی ہیں اب اُن کے بارے میں عرض کیا جاتا ہے۔

ضروری مسائل و فوائد متعلقہ میراث...... ۱۔ دورِ حاضر کے جاہل کہتے ہیں کہ مرنے والے کا مال جو اس کے بیٹوں پر برابر تقسیم ہو اس میں یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی بیٹا باپ سے پہلے مر گیا تو اس کا حصہ مرنے والے کے بیٹے کے بیٹوں کو دے دیا جائے۔ یہ بات ملحدوں اور زندیقوں نے نکالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تقسیم میراث میں اقربیت کو بنیاد بنایا ہے۔ مرنے والے کے بیٹے ہوں گے تو پوتوں کو میراث نہ ملے گی اور یہ کہنا کہ مرنے والے کے بیٹے کا حصہ اس کے بیٹے کے بیٹوں کو دے دیا جائے سراپا جہالت اور گمراہی ہے اس لئے کہ باپ کی زندگی میں اس کے مال میں اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا یعنی بطور میراث کسی کا کوئی استحقاق نہیں ہوتا۔ جس کسی کا کوئی حصہ ہے اصول کے مطابق مرنے والے کی موت کے بعد ہی ہے۔ جو میراث کے عنوان سے ملتا ہے۔

۲...... مرنے والے کی بیویوں، بیٹیوں کو عموماً میراث نہیں دیتے یہ ظلم ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا۔

۳...... عموماً میراث تقسیم کرتے ہی نہیں اُسے مل جل کر کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ وارثوں میں یتیم بچے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا مال کھا پی کر دوسرے لوگ برابر کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے پیٹوں میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں۔

۴...... کفن میں غیر شرعی اخراجات کرتے ہیں۔ چارپائی کے اوپر کی چادر کفن کے ساتھ خریدی جاتی ہے۔ قبر میں اتارنے کے لئے علیحدہ ایک چادر خریدی جاتی ہے۔ پھر یہ چادریں قبرستان والوں کو یا رسم کے مطابق جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔ یہ چیزیں کفن کی ضرورت میں شامل نہیں ہیں۔ میراث کے مشترک مال سے ان کو خریدنا خصوصاً جبکہ غائب وارث اور یتیم بچے بھی ہوتے ہیں جائز نہیں ہے۔ جو لوگ یہ کپڑے لے لیتے ہیں ان کے لئے یہ کپڑے لے لینا حرام ہے کیونکہ یہ میراث کا مالِ مشترک ہے، جو تقسیم سے پہلے دیا گیا ہے۔

۵...... بعض علاقوں میں اس میراث کے مشترک مال سے دفن کے بعد قبر پر روٹیاں یا کوئی اور چیز تقسیم کی جاتی ہے اور بعض جگہ دفن کے بعد فقیروں یا شرکائے جنازہ کو گھر بلا کر کھانا کھلایا جاتا ہے اور یہ سب اسی مشترک مال میں سے خرچ کیا جاتا ہے یہ رسم بدعت بھی ہے اور اس میں مشترک مال سے خرچ کرنے کا وبال بھی ہے۔ کھانے والوں کو ہوش نہیں کہ ہم کیا کھا رہے ہیں۔

۶...... پھر اسی مشترک مال سے تیجا، دسواں، چالیسواں کیا جاتا ہے اور سال بھر کے بعد برسی کی جاتی ہے ان کا بدعت ہونا تو سب کو معلوم ہی ہے۔ لیکن میراث کے مشترک مال میں سے خرچ کرنا یہ مستقل گناہ ہے۔

۷...... بہت سے لوگوں کو قرآن پڑھنے کے لئے ایصالِ ثواب کے لئے گھر بلایا جاتا ہے یا بعض لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے کہ قبر پر چالیس دن تک قرآن پڑھتے رہو اور اُن کو نذرانہ اور کھانا پینا اُجرت کے طور پر دیا جاتا ہے اس میں اوّل تو مالِ مشترک میں سے خرچ کرتے ہیں جو ناجائز ہے دوسرے ایصالِ ثواب کے دھوکہ میں رہتے ہیں جو شخص دنیاوی لالچ کے لئے قرآن مجید پڑھے اسے خود ہی ثواب نہیں ہوتا دوسروں کو کیا ثواب بخشے گا۔

۸...... بہت سے علاقوں میں حیلہ اسقاط کا رواج ہے۔ میراث کے اسی مالِ مشترک سے لے کر بیس تیس سیر غلہ میت کے چاروں طرف گھماتے ہیں پھر جو لوگ حاضر ہوتے ہیں آپس میں بانٹ لیتے ہیں، اور بعض علاقوں میں رواج ہے کہ اولیاء میت پر یکمشت مخصوص رقم واجب کر دی جاتی ہے بالکل دکانداری کی طرح میت کا ولی گھٹاتا ہے اور واجب کرنے والا بڑھاتا ہے اور جس مقدار پر اتفاق ہو جاتا

ہے اس کو بھی واجب کرنے والے آپس میں بانٹ لیتے ہیں یہ سب کچھ اسی مشترک مال میں سے ہوتا ہے جس میں نابالغوں کا بھی حصہ ہے اس کا خرچ کرنا جائز نہیں۔ تقسیم کرنے والے اور اس مال کے کھانے والے بظاہر اہل علم اور دیکھنے میں صالحین ہوتے ہیں یہ لوگ اپنی ظاہری دنیاوی آمدنی کو دیکھتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ آخرت میں اس کا کیا وبال ہوگا۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ

اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں سو اُن پر چار آدمیوں کی گواہی طلب کر لو جو تم میں سے ہوں، سو اگر

شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

وہ گواہی دے دیں تو اُن عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ اللہ ان کو موت دے یا اُن کے لئے کوئی راہ تجویز فرما دے۔

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ

اور جو بھی دو شخص تم میں سے بے حیائی کا کام کریں اُن کو اذیت پہنچاؤ، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے اعراض کرو، بلاشبہ

اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

اللہ توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔

احکام متعلقہ مردوزن جوفواحش کے مرتکب ہوں

ان دونوں آیتوں میں زنا کاروں کے بارے میں بعض احکام بتائے ہیں۔ اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو عورتیں فاحشہ کام کر گذریں ان کے اس عمل پر چار گواہ طلب کرلو جب کسی عورت کے بارے میں یہ بات سنی جائے کہ اس نے ایسا کام کیا ہے تو خبر چونکہ کانوں کان محلّہ اور بستی میں گونج جاتی ہے (اگرچہ جھوٹی ہی ہو) اور یہ عورت کے لئے اور اُس کے خاندان کے لئے باعث ننگ و عار بن جاتی ہے اس لئے شریعتِ اسلامیہ نے گواہ طلب فرمانے کا حکم دیا۔ اس قسم کے امور گواہوں کے بغیر ثابت نہیں ہوتے، جب حاکم کے پاس معاملہ چلا جائے تو وہ گواہ طلب کرے یہ گواہ صرف مرد ہوں گے۔ عورتوں کی گواہی اس سلسلہ میں معتبر نہیں۔ گواہ بھی چار ہوں گے اور مسلمان ہوں گے۔ دیگر امور میں دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ننگ و ناموس اور عزت و آبرو کا معاملہ ہے اس لئے اس میں سختی کی گئی۔ جب تک چار مرد گواہی نہ دیں اس وقت تک کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اگر چار گواہ نہ ملیں تو جن لوگوں نے یہ بات اُڑائی ہے وہ سب اور خود گواہ جو چار سے کم رہ گئے ان سب پر حد قذف یعنی تہمت لگانے کی سزا نافذ کی جائے گی جو ۸۰/کوڑے ہیں۔ سورۂ نور کے پہلے رکوع میں حد قذف بیان فرمادی ہے۔

اگر کسی عورت پر زنا کی تہمت لگائی گئی اور چار مرد مسلمان گواہ قائم نہ ہو سکے تو عورت پر سزا نافذ نہ کی جائے گی۔ البتہ اگر واقعی اُس نے ایسا کام کیا ہو جسے وہ جانتی ہے تو اللہ کے حضور میں توبہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ چونکہ قاضی کے پاس ثبوت نہ ہو سکا اور مجھ پر سزا نافذ کرنے کا فیصلہ نہیں دیا گیا تو میں یہ کام کرتی ہی رہوں۔ اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۔ بندوں کو علم ہو یا نہ ہو وہ گناہوں پر سزا دے گا۔ لہٰذا ہر گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔

اگر چار مسلمان مرد گواہی دے دیں کہ فلاں عورت نے زنا کیا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ شادی شدہ عورت نے اگر ایسا کیا ہو تو اسے رجم

کر دیا جائے یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اور اگر شادی شدہ نہ ہو تو سو کوڑے مارے جائیں یہ شریعت کا حکم ہے جو سورۂ نور میں مذکور ہے۔ اس سے پہلے یہ حکم تھا کہ ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھیں کیونکہ باہر نکلنے سے عموماً زنا کاری کے واقعات پیش آتے ہیں یہ حکم سورۂ نساء میں مذکور ہے ارشاد ہے فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا (یعنی ان کو گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کو موت دیدے یا اُن کے لئے کوئی راستہ نکال دے) یہ حکم سورۂ نور کی آیت سے منسوخ ہو گیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا الرجم للثیب و الجلد للبکر یعنی شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کرنا اور غیر شادی شدہ کے لئے کوڑے لگانا، یہ سزا مرد عورت دونوں کے لئے ہے اس کی مزید تفصیل و توضیح ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ نور کے پہلے رکوع کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

دوسری آیت وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا میں یہ حکم دیا کہ جو دو آدمی (مرد و عورت) بدکاری کریں تو اُن کو ایذا دو۔ ایذا دینے میں زبان سے عار دلانا اور زجر و توبیخ کی باتیں کرنا بھی شامل ہے اور اس آیت میں مار پیٹ کی صورت میں کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی۔ اس کو حکام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن سورۂ نور کی آیت میں سزا مقرر کر دی گئی تو اب اس پر عمل کرنا لازم ہو گیا...... ایذا دینے کا حکم دے کر فرمایا کہ اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے اعراض کرو اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

غیر فطری طریقے پر قضاء شہوت کرنے والوں کی سزا...... وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا کے بارے میں بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ چونکہ یہ اسم موصول تثنیہ مذکر کے لئے ہے اس لئے اس سے مراد غیر فطری طریقہ سے قضائے شہوت کا کام کرنے والے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی اس آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے عمل کا تذکرہ ہے۔ لفظوں کے اعتبار سے یہ تفسیر مستبعد نہیں ہے لیکن اس کو بھی منسوخ ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ جو لوگ اس موجب لعنت عمل کو کریں ان کے لئے اب اتنی سی ہی بات نہیں ہے کہ ان کو ایذا دی جائے۔ بعض روایات حدیث میں فرمایا ہے کہ یہ جو لوگ ایسا کریں فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کیا جائے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۲) قتل کی کیا صورت ہو؟ اس کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور دوسرے صحابہ کے مشورہ سے جلانے کا حکم دیا تھا۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا کام کرنے والے کو سب سے اونچی جگہ پر لے جا کر اوندھے منہ کر کے گرا دیا جائے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ کمافی فتح القدیر)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کے لئے وہی سزا مقرر فرمائی جو زانی یا زانیہ کی ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کی کوئی سزا خاص مقرر نہیں ہے پہلی بار ایسا کرے تو امام المسلمین مار پیٹ کی سزا دیدے اور دوسری بار کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ (کماذکرہ الشامی عن الاشباہ وغیرہ)

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ

پس اللہ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے جو حماقت کے ساتھ گناہ کر لیتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں، سو یہ وہ

فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا، اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ اور اُن لوگوں کی توبہ نہیں جو بُرے کام کرتے رہتے ہیں

السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہو جائے تو کہتا ہے کہ بے شک میں نے اب توبہ کی، اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کافر ہونے کی حالت میں مرتے ہیں،

وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

توبہ کی ضرورت اوراس کا طریقہ

ان دونوں آیتوں میں توبہ کا قانون بیان فرمایا ہے۔ اولاً تو یہ فرمایا کہ جولوگ حماقت سے گناہ کر بیٹھیں پھر جلدی ہی توبہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے اگر توبہ سچی ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبول ہوگی اور گناہ معاف ہو جائے گا۔ صغیرہ گناہوں کا کفارہ تو نیکیوں سے بھی ہوتا رہتا ہے لیکن کبیرہ گناہ (یقینی طور پر) صرف توبہ ہی سے معاف ہوتے ہیں اور صغیرہ گناہ پر اصرار کرنے سے صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اور صغیرہ گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ بھی خالق و مالک جل مجدہ کی بغاوت ہے اور اس پر بھی مواخذہ اور عذاب ہوسکتا ہے جب کوئی گناہ ہو جائے چھوٹا ہو یا بڑا جلد سے جلد توبہ کریں جیسا کہ آیتِ بالا میں يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فرما کر جلدی توبہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔

توبہ کی حقیقت...... توبہ کی کیا حقیقت ہے اس کو سمجھنا چاہیئے، بہت سے لوگ زبان سے توبہ توبہ کے الفاظ نکال دیتے ہیں اور اُن کے دل میں ذرا بھی اس بات کی کسک نہیں ہوتی کہ گناہ کو چھوڑیں، سو جاننا چاہیئے کہ توبہ کے تین جزو ہیں۔ اوّل یہ کہ جو بھی گناہ ہو گئے ہیں ان سب پر سچے دل سے خوب ندامت ہو اور اس بات کی شرمندگی و پشیمانی ہو کہ ہائے! میں نے کیا کر دیا! میں نے اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کر دی۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا خوب پکا مضبوط عہد ہو۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ جو حقوق ضائع کئے (اللہ کے حقوق ہوں یا بندوں کے) ان کی ادائیگی کرے۔ اللہ کے حقوق مثلاً زکوٰتیں نہیں دیں۔ حج فرض تھا وہ ادا نہیں کیا دیگر فرائض و واجبات چھوڑے ان سب کی تلافی کرے گذشتہ تمام سالوں کی زکوٰتیں حساب کر کے دے اور اتنا مال دیدے کہ یقین ہو جائے کہ اس سے زیادہ کی ادائیگی فرض نہ ہوگی اور حج بھی کرے اور نمازوں کی بھی قضا کرے۔ فرضوں اور وتروں کی قضا ہوگی ان میں بھی حساب لگائے کہ زیادہ سے زیادہ اتنی ہوں گی ان سب کو ادا کرے۔ اگر رمضان کے روزے چھوڑے ہوں ان کی بھی قضا کرے اور ان کے علاوہ بھی غور کرے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کیا کیا ضائع کئے ہیں اور ان کی تلافی کی فکر کرے۔ بندوں کے حقوق کی بھی ادائیگی کرے۔ کس کس کی مالی خیانت کی ہے، چوری کی ہے، سودا بیچتے وقت ناپ تول میں کمی کی ہے اور خرید و فروخت میں دھوکہ دیا، قرض لے کر مار لیا ہے، غیبتیں کی ہیں یا سنی ہیں، بہتان باندھے ہیں، کسی کو گالیاں دی ہیں، مار پیٹ کی ہے وغیرہ وغیرہ ان سب امور کی تلافی کرے، مالی حقوق کو ادا کرے ادائیگی کا انتظام نہ ہو تو اُن لوگوں سے معاف کرائے جن کے حقوق ہیں جن کی غیبتیں کی ہیں یا سنی ہیں ان سے معافی مانگے اور جن پر بہتان باندھے ہیں ان سے بھی معافی مانگے اور جن کو گالیاں دی ہیں ان سب سے معافی مانگے ظالمانہ مار پیٹ کی تلافی کرے یعنی جس کو بلا اجازتِ شرعی مارا ہو اگرچہ وہ اپنے سے چھوٹا ہی ہو اس کو بدلہ دے یا معافی مانگے اس میں

خفت اور ذلت محسوس نہ کرے۔ کیونکہ آخرت میں اصحاب حقوق کے گناہ ظلم کرنے والے کے ذمہ ڈال دیئے جائیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ توبہ کے تین اہم جزو ہیں اوّل گناہ پر نادم ہونا، دوم آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرنا، سوم ضائع کردہ حقوق کی تلافی کرنا، یہ چیزیں نہ ہوں اور زبانی توبہ توبہ کرتا رہے تو اس سے مطلوبہ توبہ نہیں ہوتی خوب سمجھ لیا جائے، آجکل غفلت کے ساتھ توبہ کی جاتی ہے جو زبان کی حد تک ہوتی ہے اور دل میں اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا۔ دل کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ میری زبان سے توبہ کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اسی کو حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا اِسْتِغْفَارُنَا یَحْتَاجُ اِلَی اسْتِغْفَارٍ کَثِیْرٍ یعنی ہمارا استغفار بھی ایک طرح کا گناہ ہے (کیونکہ غفلت کے ساتھ ہے) اس کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہے۔ ع

ہست استغفار ما محتاج استغفار ما

جب سچے دل سے پوری شرطوں کے ساتھ توبہ کی جائے گی تو ضرور قبول ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ!

فائدہ ...... آیت شریفہ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ فرمایا ہے اس میں جہالت حماقت کے معنی میں ہے جو بھی کوئی شخص گناہ کرتا ہے وہ حماقت ہی سے کرتا ہے کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو عذاب آخرت میں مبتلا کرنے کا راستہ اختیار کرتا ہے گناہ میں جو ذرا سا مزہ ہے اس مزہ کے لئے آخرت کے بڑے عذاب کے لئے اپنی جان کو تیار کرنا حماقت نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جہالت کے یہی معنی منقول ہیں۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ عمداً گناہ کو گناہ جانتے ہوئے کوئی شخص گناہ کرے تو توبہ قبول نہ ہوگی۔ گناہ عمداً ہوں یا سہواً خطأً ہوں یا جہلاً توبہ سے سب معاف ہو جاتے ہیں مگر شرط وہی ہے کہ توبہ اصول و شرائط کے مطابق ہو۔

موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی ...... پھر ارشاد فرمایا کہ جو لوگ گناہ کرتے چلے جائیں اور جب موت آنے لگے تو توبہ کرنے لگیں ایسے لوگوں کی توبہ کوئی توبہ نہیں۔ اور جو لوگ کفر پر مر رہے ہیں ان کی توبہ بھی کوئی توبہ نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جب موت کا وقت آجائے۔ دوسرے عالم کے حالات نظر آنے لگیں اس وقت جو کوئی توبہ کرے وہ توبہ قبول نہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْ غِرْ بِنَفْسِهٖ (رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح غیر عبدالرحمٰن وھو ثقۃ کما فی مجمع الزوائد) کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک کہ غرغرہ کی حالت نہ ہو جائے جب روح نکلنے لگے اور اندر سے جان نکلنے کی آواز آنے لگے اس وقت کو غرغرہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت چونکہ عالم غیب کی چیزیں سامنے آجاتی ہیں فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اور جان کنی کی تکلیف شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح سے دوسرے عالم سے تعلق ہو جاتا ہے اس لئے اس حالت میں توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس وقت نہ مؤمن کی توبہ قبول ہوتی ہے جو گناہوں سے توبہ کرے اور نہ کافر کی توبہ قبول ہوتی ہے جو کفر سے توبہ کرنے لگے کیونکہ ایمان وہ معتبر ہے جو ایمان بالغیب ہو۔ جب عالم برزخ کی چیزیں نظر آنے لگیں اور اُن کا مشاہدہ کر لیا تو اب ایمان بالغیب نہ رہا اس لئے اس وقت کسی کا ایمان معتبر نہیں ہے۔

غرغرہ کی حالت سے پہلے سب کی توبہ قبول ہے۔ اگر غرغرہ سے پہلے کافر ایمان لے آئے تو وہ بھی معتبر ہے مؤمن ہمیشہ توبہ کرتا رہے اور جب توبہ کرے پکی توبہ کرے اگر توبہ کے بعد گناہ ہو جائے تو پھر توبہ کرے اور توبہ کی شرائط جو اوپر لکھی گئی ہیں ان کا لحاظ رکھے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث ہو جاؤ اور تم ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت رکھو کہ جو مال تم نے اُن کو

لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ

دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے لو، مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح فحش کام کر بیٹھیں، اور تم اُن کے ساتھ اچھے طریقہ پر زندگی گذارو،

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

سو اگر تم کو وہ ناپسند ہیں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُس میں زیادہ خیر رکھ دے۔

جبر و اکراہ کے ساتھ عورتوں کی جان و مال کا وارث بننے کی ممانعت

جاہلیت کے زمانہ میں عورتوں پر لوگ طرح طرح سے ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ یہ ظلم ان کی جانوں پر بھی ہوتا تھا اور اُن کے مالوں پر بھی۔ ان کی جانوں پر اس طرح ظلم ہوتا تھا کہ جب کسی عورت کا شوہر مر گیا تو اس عورت کو میت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے۔ عورت کو اپنی جان میں کوئی اختیار نہ ہوتا تھا اور خود سے کہیں اپنا نکاح نہیں کر سکتی تھی۔ پھر جو لوگ وارث ہوتے وہ اس عورت کو اپنی مرضی سے جہاں چاہتے بیاہ دیتے تھے اور یہ بیاہنا ایک طرح کا بیچنا ہوتا تھا۔ مہر میں جو مال ملتا تھا خود ہی کھا جاتے تھے یا باقاعدہ باندی کی طرح بیچ دیتے تھے اور قیمت پر قابض ہو جاتے تھے۔ نیز عورت کے مال کے جبراً مالک بن جاتے تھے۔ میراث میں جو اس کا حق نکلتا۔ اُسے خود ہی دبا لیتے تھے یا اُس کو نکاح نہ کرنے دیتے تھے۔ تاکہ یہیں ہمارے گھر پڑی پڑی مر جائے اور ہم اس کا مال لے لیں یا وہ اپنے مال میں سے دینے پر مجبور ہو جائے (یہ چیزیں اب بھی بہت سے خاندانوں میں پائی جاتی ہیں) عورتوں کا مال زبردستی وصول کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ عورت کو طرح طرح سے تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں اور جب وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے طلاق مانگے تو اُس سے کہیں کہ اتنی رقم دیدے یا حق معاف کر دے تو میں چھوڑوں، وہ بیچاری مصیبت زدہ اپنی جان چھڑانے کے لئے مجبور ہو کر مال دے دیتی ہے۔ یا مہر معاف کر دیتی ہے۔ آیت کے عمومی الفاظ سے اہلِ ایمان کو اس طرح کی تمام حرکتوں سے منع فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے ایسا کرنا حلال نہیں ہے۔ البتہ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فرما کر یہ بتا دیا کہ اگر عورتیں کوئی صریح نازیبا حرکت کر لیں تو اُن سے مال لیا جا سکتا ہے۔

صریح نازیبا حرکت سے کیا مراد ہے بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے عورت کی زبان درازی، بدخلقی نافرمانی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر عورت ایسی حرکتیں کرے تو شوہر اپنا مال جو مہر کی صورت میں دیا تھا وہ بطور خلع لے سکتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ مال لینا جائز ہوگا اور بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ ان سے العیاذ باللہ اگر زنا صادر ہو جائے تو خاوند اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے لے اور اس کو طلاق دے کر جدا کر دے۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں حدود نازل ہونے سے پہلے تھا اب جب زنا کی حد نازل ہو گئی تو یہ حکم باقی نہیں رہا۔ لہٰذا عورت کے زنا کر لینے سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔

عورتوں کے ساتھ حُسنِ معاشرت کا حکم ...... پھر ارشاد فرمایا وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ اور تم عورتوں کے ساتھ اچھے طریقہ پر زندگی گذارو یعنی خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ نان نفقہ خوراک و پوشاک کی خیر و خبر رکھو اور اگر تمہیں اُن کی کوئی ادا طبعی طور پر ناپسند ہو تو اس کو برداشت کر لو اور یہ سمجھ لو کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کسی ایسی چیز میں کوئی بڑی منفعت رکھ دے جو چیز تمہیں ناپسند ہو۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ رنگ و روپ اور شکل و صورت کے لحاظ سے عورت دل کو نہیں بھاتی لیکن خدمت گذار ہوتی ہے۔ مال کی

حفاظت کرتی ہے گھر بار کو سنبھال کر رکھتی ہے۔ بچوں کی اچھی تربیت کرتی ہے ان کو تقویٰ اور اعمالِ صالحہ پر ڈالتی ہے۔ یہ خیر کی صورتیں ہیں۔ تھوڑی سی طبعی ناگواری اس طرح کے منافع کے لئے برداشت کرنی چاہیئے۔

سمجھدار اور دیندار مرد ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرد مؤمن کسی مؤمنہ (بیوی) سے بغض نہ رکھے اگر اس کی ایک خصلت ناپسند ہوگی تو دوسری خصلت پسند آ جائے گی۔ (رواہ مسلم ص ۴۷۵ ج ۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کامل ایمان والوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ سب سے اچھے اخلاق والے اور سب سے زیادہ مہربان ہوں (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۲) حضرت عائشہؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنے اہل کے لئے سب سے بہتر ہیں اور میں تم میں اپنے اہل کے لئے سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۱ از ترمذی)

درحقیقت بات یہ ہے کہ بیویوں کے ساتھ معاشرت ہو یا دوسرے لوگوں کے ساتھ مرافقت ومصاحبت ہو سو فیصدی ہر ایک کا ہر ایک کے ساتھ دل مل جائے اور ذرا سی بھی طبعی وعقلی اذیت نہ پہنچے اس دار المصائب میں عموماً ایسا ہوتا ہی نہیں، فوائد ومنافع کو دیکھ کر ناگواریوں کو برداشت کرنے ہی سے مصاحبت اور مرافقت باقی رہ سکتی ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا

اور اگر ایک بیوی کو دوسری بیوی کی جگہ بدلنا چاہو اور تم اُن میں سے ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اُس میں سے کچھ

مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى

بھی نہ لو۔ کیا تم اس کو واپس لو گے بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کا ارتکاب کر کے، اور تم اس کو کیسے لیتے ہو حالانکہ تم ایک

بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

دوسرے تک پہنچ چکے ہو اور انہوں نے تم سے خوب پختہ عہد لے لیا ہے۔

بیویوں کو جو کچھ دے دیا ہو اس کے واپس لینے کی ممانعت

اگر کسی شخص کے نکاح میں کوئی عورت ہو اور وہ اُسے طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہے اس کے متعلق آیتِ بالا میں ہدایت فرمائی ہے کہ اگر کسی بیوی کو چھوڑ رہے ہو جسے تم مہر میں یا مہر کے علاوہ بھی بطور ہبہ وعطیہ کے بہت سا مال دے چکے ہو تو اس مال میں سے کچھ نہ لو، اوّل تو طلاق دینا ہی مبغوض چیز ہے پھر ایسی عورت کو جو ایک عرصہ ساتھ رہی ہے خصوصاً جبکہ اس کا کوئی قصور نہ ہو اس کو طلاق دینا اور جو مال اس کو دے دیا ہو وہ اس سے واپس لے لینا اخلاق اسلامیہ کے خلاف ہے اس قسم کے مواقع میں عورتیں مال واپس کرنے سے گریز کرتی ہیں لہٰذا مال لینے کے لئے طرح طرح سے انہیں تنگ کیا جاتا ہے یا اُن پر کسی طرح کی تہمت رکھ دی جاتی ہے یا زبردستی چھین لیا جاتا ہے۔ یہ سراپا ظلم ہے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (کیا تم واپس لوگے بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کا ارتکاب کر کے؟)

پھر فرمایا وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ کہ جو مال تم نے اپنی بیوی کو دے دیا ہے حالانکہ تم ایک دوسرے سے بے حجاب ہو کر مل بھی چکے ہو، وہ اپنی

ذات تمہارے حوالے کر چکی ہے (اور مہر اُسی کا عوض ہے) تو اب اس عوض کو جو تم دے چکے ہو کس طرح واپس لو گے؟ یہ تو عقلاً بھی بُرا ہے اور مزید یہ ہے کہ وہ عورتیں تم سے مضبوط اقرار لے چکی ہیں کہ تم نے جو مہر مقرر کئے وہ مہر ادا کرو گے۔ لہٰذا اس عہد کی خلاف ورزی کرنا عقلاً وشرعاً مذموم ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ بوقتِ نکاح ادائے مہر کا عہد و پیمان ہوا۔ پھر آپس میں مل کر بے حجابانہ میل جول بھی رکھتے رہے اب اُن کو مجبور کرنا کہ مال واپس کر دو یا معاف کر دو یہ سراپا ظلم و جور ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً

اور اُن عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر جو پہلے گزر چکا۔ بے شک یہ بے حیائی کا

وَّ مَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۲۲

اور غصہ کا کام ہے اور بُرا راستہ ہے۔

والد کی بیوی سے نکاح کرنے کی حرمت

اسبابِ نزول میں (ص ۱۴۱) نقل کیا ہے کہ یہ آیت حصن بن ابی قیس کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا نیز اسود بن خلف اور صفوان بن امیہ نے اور بھی دو تین افراد کے نام لکھے ہیں جو باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کے مرتکب ہوئے ابوقیس کی بیوی کو جب ابوقیس کے بیٹے نے نکاح کا پیغام دیا تو وہ کہنے لگی کہ میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں تجھ سے کیسے نکاح کروں؟ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کرونگی چنانچہ وہ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں (اور بات سامنے رکھی) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ مرنے والے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا کرتے تھے۔ ابتداً اسلام میں بعض ایسے واقعات پیش آئے پھر ہمیشہ کے لئے باپ کی بیوی سے نکاح کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیدیا۔ واضح رہے کہ جس کسی بھی عورت سے کسی شخص نے نکاح کر لیا صرف نکاح کر لینے سے ہی وہ عورت اس شخص کے بیٹوں پر حرام ہوگئی باپ کے ساتھ اس عورت کی خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میرے ماموں ابو بریدہ میرے پاس سے گذرے ان کے پاس ایک جھنڈا تھا میں نے کہا آپ کہاں جا رہے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے، مجھے حکم دیا ہے کہ میں اُس کا سر کاٹ کر لاؤں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۷۴)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ

حرام کی گئیں ہیں تم پر تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں، اور بہنیں، اور تمہاری پھوپھیاں، اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی

وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ

بیٹیاں، اور بہن کی بیٹیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ

اور تمہاری اُن بیویوں کی بیٹیاں جن بیویوں سے دخول کر چکے ہو جو تمہاری گودوں میں ہیں، سو اگر تم نے ان بیویوں سے دخول نہ کیا ہو

بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ ؗ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ

تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان کی لڑکیوں سے نکاح کرلو، اور حرام ہیں تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشت سے ہیں اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں

الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۳﴾

کو اپنے نکاح میں جمع کرو مگر جو گذر چکا، بلاشبہ اللہ غفور ہے رحیم ہے۔

جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا تفصیلی بیان

ان آیات میں تفصیل کے ساتھ محرمات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ محرمات میں وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح جائز نہ ہو۔ بعض عورتیں تو وہ ہیں جن سے کبھی بھی نکاح جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے، پہلی آیت میں ان عورتوں کا ذکر ہے، اور بعض عورتیں وہ ہیں جن سے کسی موجودہ سبب کی وجہ سے نکاح جائز نہیں۔ اگر وہ سبب دور ہو جائے تو نکاح جائز ہو جاتا ہے مثلاً کوئی عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو تو جب تک وہ عورت اس مرد کے نکاح سے نہ نکل جائے (اس مرد کی وفات ہو جانے یا طلاق دینے کی وجہ سے) اور عدت نہ گذر جائے۔ اس وقت تک کسی دوسرے مرد سے اس عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا، طلاق یا موت کے بعد عدت گذر جائے تو یہ عورت کسی ایسے مرد سے نکاح کر سکتی ہے جس سے نکاح کرنا حلال ہو۔ اسی طرح جب کسی عورت نے کسی مرد سے نکاح کر لیا تو جب تک یہ عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی اس وقت تک اس عورت کی بہن سے اس مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ منکوحہ بہن کا شوہر طلاق دیدے یا فوت ہو جائے اور اس کی عدت گذر جائے تو اُس کی بہن اس کے شوہر کے نکاح میں آ سکتی ہے جس نے طلاق دی ہے یا فوت ہوا ہے۔

محرمات اَبدیہ...... جن سے کبھی بھی نکاح درست نہیں تین طرح کی ہیں۔ اوّل محرمات نسبیہ (جو نسب کے رشتے کی وجہ سے حرام ہیں) دوم محرمات رضاعیہ (جو دودھ پینے کے رشتے کی وجہ سے حرام ہیں) سوم محرمات بالمصاہرہ (جو سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہیں)۔

محرمات نسبیہ...... بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں) اس کے عموم میں مائیں اور ماؤں کی مائیں اوپر تک جہاں تک سلسلہ چلا جائے سب کی حرمت آ گئی۔

وَبَنٰتُكُمْ (اور حرام کی گئیں تمہاری بیٹیاں) اس کے عموم میں بیٹیاں اور بیٹوں اور بیٹیوں کی بیٹیاں اور اُن کی بیٹیاں سب داخل ہو گئیں۔

وَاَخَوٰتُكُمْ (اور حرام کی گئیں تمہاری پھوپھیاں) اس میں باپ کی سگی بہنیں اور باپ شریک بہنیں اور ماں شریک بہنیں سب داخل ہو گئیں

وَخٰلٰتُكُمْ (اور حرام کی گئیں۔ تمہاری خالائیں) اس کے عموم میں بھی ماں کی سگی بہنیں اور باپ شریک بہنیں اور ماں شریک بہنیں سب داخل ہو گئیں۔

وَبَنٰتُ الْاَخِ (اور بھائی کی بیٹیاں حرام کی گئیں) اس کے عموم میں سگے بھائی کی بیٹیاں اور باپ شریک بھائی کی بیٹیاں اور ماں شریک

بھائی کی بیٹیاں سب داخل ہیں۔
وَبَنَاتُ الْأُخْتِ (اور بہن کی بیٹیاں حرام کی گئیں) اس کے عموم میں سگی بہن، باپ شریک بہن، ماں شریک بہن سب کی بیٹیاں داخل ہیں۔
محرمات بالرضاع ...... یہاں تک محرمات نسبیہ کا بیان ہوا، اس کے بعد رضاعی رشتوں کا ذکر فرمایا ارشاد ہے وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ (اور حرام کی گئیں تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا)۔
وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ (اور حرام کی گئیں تمہاری بہنیں جو تمہاری دودھ شریک ہیں) قرآن مجید میں رضاعت کے رشتہ کو حرمت کا سبب بیان فرماتے ہوئے رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرنے پر اکتفا فرمایا ہے۔ احادیث شریفہ میں اس کا قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلرَّضَاعَةُ تُحَرِّمُ مَا تُحَرِّمُ الْوِلَادَةُ یہ (صحیح بخاری ص ۷۶۴) کے الفاظ ہیں (مطلب یہ ہے کہ جو عورت ولادت کے رشتہ سے حرام ہے رضاعت کے رشتہ سے بھی حرام ہے) اور صحیح مسلم ص ۴۶۷ میں یہ الفاظ ہیں یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ (بلاشبہ رضاعت کی وجہ سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں) حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد میرے رضاعی چچا میرے پاس آئے جنہوں نے اندر آنے کی اجازت چاہی میں نے اجازت نہ دی اور جواب میں کہہ دیا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرلوں گی اجازت نہ دوں گی جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے آپؐ سے دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا وہ تمہارا رضاعی چچا ہے اسے اندر آنے کی اجازت دے دو۔ میں نے عرض کیا مجھے تو عورت نے دودھ پلایا ہے، مرد نے تو دودھ نہیں پلایا، آپؐ نے فرمایا وہ تمہارا چچا ہے تمہارے گھر میں اندر آسکتا ہے۔ (رواہ البخاری ص ۷۶۴، ۷۸۸ و مسلم ۴۶۷ ج ۱) صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی بچہ کو دودھ پلا دے تو یہ بچی اس عورت کے شوہر پر اور اس کے باپوں پر اور اس کے بیٹوں پر حرام ہو جائے گی اور جس شوہر کے ذریعہ دودھ پلانے والی عورت کا دودھ اُترا ہے وہ اس دودھ پینے والی بچی کا باپ ہو جائے گا۔ اور جس کسی عورت کا دودھ کسی لڑکے نے پی لیا اور اُس عورت کا دودھ کسی لڑکی نے بھی پی لیا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، اور جس لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پی لیا اس لڑکی کا دودھ پلانے والی کے لڑکے سے نکاح نہیں ہوسکتا اور دودھ پلانے والی کے پوتے سے بھی اس دودھ پینے والی لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی بچہ نے کسی عورت کا دودھ پی لیا تو اُس بچہ کا نکاح دودھ پلانے والی کے شوہر کی بہن سے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ اس کی رضاعی پھوپھی ہے۔ رضاعی باپ (جس کی بیوی کا دودھ پیا ہو) کی بیوی سے دودھ پینے والے بچے کا اور رضاعی بیٹے کی بیوی سے دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ ...... ذرا سا دودھ (اگرچہ ایک ہی قطرہ ہو) اگر حلق میں صرف ایک ہی بار اتر جائے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ ...... دو سال (چاند کے اعتبار سے) کی مدت کے اندر حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے اس پر سب آئمہ کا اجماع ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دودھ پلانے کی مدت ڈھائی سال ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ ڈھائی سال کے اندر کوئی بچہ یا بچی دودھ پی لے تو اس دودھ پینے کی وجہ سے حرمت کا فتویٰ دیا جائے اکثر اماموں کے نزدیک دو سال کے بعد دودھ پینے سے اور حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک ڈھائی سال کے بعد دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ.........محض کسی ایک عورت یا چند عورتوں کے کہنے سے کہ فلاں عورت نے فلاں لڑکے یا لڑکی کو دودھ پلایا ہے۔حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی بلکہ اس کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ہونا شرط ہے، البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے کہ میں نے فلاں لڑکے اور لڑکی کو دودھ پلایا ہے تو اُن کا آپس میں نکاح نہ کیا جائے۔

مسئلہ.........اگر مُردہ عورت کا دودھ چھاتی سے نکال لیا جائے اور کسی بچہ یا بچی کے حلق میں ڈال دیا جائے تو اس سے بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ.........اگر مرد کے دودھ اتر آئے اور وہ کسی بچہ کو پلا دیا جائے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی رضاعت سے متعلقہ مسائل میں کچھ مزید تفصیل بھی ہے اور حرم من الرضاعِ ما حرمَ من النّسب کے عموم میں تھوڑا سا استثناء بھی ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے۔

محرمات بالمصاہرہ......اس کے بعد محرمات بالمصاہرہ کا تذکرہ فرمایا: وَاُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ یعنی تمہاری بیویوں کی مائیں تم پر حرام کی گئیں، ان سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا، کسی عورت سے نکاح ہو جانا ہی اس کی ماں سے نکاح ہونے کی حرمت کے لئے کافی ہے۔ بیوی سے خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

وَرَبَآئِبُكُمُ الّتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ. یعنی جن عورتوں سے تم نے نکاح کیا ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جنہیں تم گودوں میں لیتے ہو اور کھلاتے ہو ان لڑکیوں سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، بشرطیکہ تم نے ان لڑکیوں کی ماؤں سے جماع کیا ہو۔ اگر کسی عورت سے نکاح تو کر لیا لیکن جماع نہیں کیا پھر اُسے طلاق دے دی تو اس عورت کے پہلے شوہر والی لڑکی سے نکاح جائز ہے۔ فِیْ حُجُوْرِكُمْ قیدِ احترازی نہیں ہے جس بیوی سے نکاح کر کے جماع کر لیا اس کی لڑکی سے نکاح درست نہیں اگر چہ وہ کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس پرورش پاتی ہو اور اس کی گود میں پلتی ہو۔

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ یعنی تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پشتوں سے ہیں وہ بھی تم پر حرام ہیں۔ اس میں بھی عموم ہے حرمت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ بیٹے نے کسی عورت سے نکاح کر لیا ہو۔ نکاح کے بعد جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو بہر حال اب نکاح کرنے والے کے باپ سے اس عورت کا نکاح حرام ہوگا۔

مسئلہ.........پوتوں کی بیویوں سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

مسئلہ.........رضاعی بیٹے کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے کا حکم.........مسئلہ......اگر کسی کو منہ بولا بیٹا بنا لیا جائے اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور عدت گذر جائے تو اسکی بیوی سے نکاح کرنا جائز ہے (بشرطیکہ اور کوئی مانع نہ ہو) مفسرین نے فرمایا ہے کہ مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید ذکر فرما کر اسی مسئلے کو بیان فرمایا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنّٰی (منہ بولے بیٹے) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی بیوی سے ان کے طلاق دینے کے بعد نکاح فرما لیا تھا اس پر دشمنانِ دین نے اعتراض کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حلت کی تصریح نازل ہوئی اور فرمایا: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَیْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (سورۃ الاحزاب ع ۵) (پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تا کہ مسلمانوں پر کسی طرح کی کوئی تنگی نہ رہے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے بارے میں جبکہ وہ

اپنی حاجت پوری کر چکیں)۔

فائدہ..........جس طرح منہ بولا بیٹا اصلی بیٹا نہیں ہوتا۔اسی طرح منہ بولا باپ یا منہ بولا بھائی یا بہن یا منہ بولی ماں حقیقی ماں، باپ اور بھائی، بہن نہیں ہو جاتے اگر کوئی دوسرا رشتہ محرمیت کا نہ ہو تو صرف منہ بولا باپ یا ماں یا بھائی یا بہن یا بیٹا یا بیٹی بنا لینے سے محرم والے احکام جاری نہیں ہوتے۔ان کا آپس میں پردہ کرنا واجب ہوتا ہے اور آپس میں نکاح کرنا بھی جائز ہے(بشرطیکہ کوئی اور مانع نہ ہو)۔

جمع بین الاختین کی حرمت......اس کے بعد ان محرمات کا ذکر فرمایا جو بعض اسباب کی وجہ سے حرام ہوتی ہوں اگر وہ عارض دور ہو جائے تو نکاح اپنی شرائط کے ساتھ جائز ہو جاتا ہے، ارشاد فرمایا: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کہ یہ بھی تم پر حرام کیا گیا کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں جمع کرو، جب ایک بہن سے کسی نے نکاح کر لیا تو جب تک اسے طلاق نہ دیدے یا فوت نہ ہو جائے اور اس کی عدت نہ گذر جائے اس وقت تک اس کی کسی بھی بہن سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے نکاح کر لیا تو شرعاً وہ نکاح نہ ہوگا۔

فائدہ..........جس طرح دو بہنوں کو بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح سے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی، ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی عورت کا اس کی پھوپھی پر یا پھوپھی کا اس کے بھائی کی بیٹی پر اور کسی عورت کا اس کی خالہ پر یا خالہ کا اپنی بہن کی بیٹی پر نکاح کیا جائے نہ بڑی کا نکاح چھوٹی پر کیا جائے اور نہ چھوٹی کا بڑی پر کیا جائے۔(رواہ الترمذی وابوداؤد و مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۷۴ و ہو فی البخاری ص ۷۶۶ ج ۲ باختصار)

مطلب یہ ہے کہ چونکہ خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پہلے سے کسی مرد کے نکاح میں بڑی ہو تو چھوٹی سے اور چھوٹی ہو تو بڑی سے اس مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

فائدہ..........حضرات فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جن دو عورتوں میں ایسا رشتہ ہو کہ اُن میں سے کسی ایک کو مرد فرض کر لیا جائے تو دونوں کا آپس میں نکاح نہ ہو سکے ایسی دو عورتیں بھی بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

☆☆☆..................☆☆☆

پارہ نمبر ۵ / والمحصنٰت

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

اور حرام ہیں وہ عورتیں جو کسی مرد کے نکاح میں ہوں، سوائے اُن عورتوں کے جن کے تم مالک ہو جاؤ، اللہ نے ان احکام کو تم پر فرض فرما دیا ہے،

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ

اور تمہارے لئے حلال کی گئیں ہیں وہ عورتیں جو اُن کے علاوہ ہیں کہ تم اپنے مالوں کے بدلہ طلب کرو اس حال میں کہ تم پاک دامنی اختیار کرنے والے ہو،

مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ

پانی بہانے والے نہ ہو، سو ان میں سے جن عورتوں سے نفع حاصل کر لو ان کے مہر دے دو جو مقرر ہو چکے ہیں اور تم پر اس بات

عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

میں کوئی گناہ نہیں کہ مقرر مہر کے بعد آپس کی رضامندی سے کسی بات پر راضی ہو جاؤ بلاشبہ اللہ علیم ہے حکیم ہے۔

جو عورت کسی کے نکاح میں ہو اس سے نکاح کرنے کی حرمت

محرمات بالسبب میں وہ عورتیں بھی ہیں جو کسی مرد کے نکاح میں ہوں یعنی جب کسی عورت کا کسی مرد سے نکاح ہو گیا ہو اگرچہ رخصتی ابھی نہ ہوئی ہو تو اس کا نکاح کسی دوسرے مرد سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ عورت اپنے شوہر کے نکاح سے نہ نکلے اس کا شوہر مر جائے یا طلاق دیدے اور پھر اس کی عدت گذر جائے تب کسی دوسرے مرد سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا اسی کو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ میں بیان فرمایا ہے ہاں اگر ایسی صورت پیش آئے کہ مسلمان کافروں سے جہاد کریں اور وہاں سے عورتوں کو قید کر کے لے آئیں اور امیر المؤمنین عورتوں کو باندی بنا کر مجاہدین پر تقسیم کر دے تو یہ مجاہدین بحق ملکیت (بالشرائط المعتبرۃ) ان باندیوں سے جماع کر سکتے ہیں اگرچہ وہ اپنے شوہر دار الکفر میں چھوڑ کر آئی ہوں، اصول یہ ہے کہ جب دار الحرب کی عورتوں کو قید کر کے دار الاسلام میں لے آئیں تو اپنے سابقہ شوہروں کے نکاح سے نکل جاتی ہیں۔ ان کو باندی بنا کر امیر المؤمنین جس کسی مسلمان کو دے دے وہ ان سے جماع کر سکتا ہے شروط اور قیود کے لئے کتب فقہ کی مراجعت کر لی جائے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ کے بعد جو اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فرمایا ہے اس استثناء میں ان ہی عورتوں کا ذکر ہے جو دار الحرب سے قید کر کے لائی گئی ہوں اور ان کے شوہر وہیں دار الحرب میں رہ گئے ہوں۔ (راجع صحیح مسلم ص ۴۷۰)

پھر فرمایا وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ یعنی جن عورتوں سے نکاح کرنے کی حرمت اب تک بیان ہوئی ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ مثلاً خالہ اور چچا کی لڑکی، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہن یا ماموں اور چچا کی بیوی جس کی عدت ماموں یا چچا کی وفات یا طلاق کے بعد گذر جائے۔ بشرطیکہ اور کوئی رشتہ یا کوئی سبب حرمت کا موجود نہ ہو، لفظوں کے عموم میں بہت

سی صورتیں داخل ہیں، اور اسی عموم میں بعض استثناء کی صورتیں بھی ہیں ان میں سے بعض گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہیں اور بعض فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

مہروں کے ذریعہ ازواج طلب کرو ...... اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ میں یہ بتایا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعہ نکاح میں لانے کے لئے عورتوں کو تلاش کرو (جن سے نکاح کرنا حلال ہو) اس سے معلوم ہوا کہ نکاح میں مہر ہونا ضروری ہے، اگر مرد عورت بلا مہر کے آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہو جائیں تب بھی مہر لازم ہوگا جس کی کم سے کم مقدار حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دس درہم ہے۔ اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو نکاح تب بھی ہو جائے گا لیکن مہر پھر بھی دینا ہوگا جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کے رکوع نمبر ۳۱ کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

نکاح سے عفت و عصمت مقصود ہے ...... اور مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ .... میں یہ ارشاد فرمایا کہ مالوں کے ذریعہ جو عورتیں تلاش کی جائیں اس سے عفت و عصمت کو باقی رکھنا اور پاکدامن رہنا مقصود ہو محض شہوت رانی پیش نظر نہ ہو۔ مؤمن کے نکاح کا مقصد تکثیر نسل اور نفس و نظر کی حفاظت اور عفت و عصمت کے ساتھ زندگی گذارنا ہے زناکاری میں بھی گو مال خرچ ہوتا ہے لیکن اس میں صرف شہوت رانی مقصود ہوتی ہے عفت و عصمت کا خون کر کے یہ کام کیا جاتا ہے۔ جس میں طلب اولاد کا مقصد بالکل نہیں ہوتا اور اولاد ہو بھی جاتی ہے تو ثابت النسب نہیں ہوتی۔ حرامی بچوں کو لوگ عزت کا مقام نہیں دیتے اور وہ بچہ چونکہ کسی باپ کا نہیں ہوتا تو کئی طرح سے اس کی بربادی ہوتی ہے اسی لئے کسی دین میں بھی زنا کی اجازت نہیں دی گئی۔

متعہ کی حرمت ...... مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ میں متعہ کی حرمت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا جس کا بعض گمراہ فرقوں میں رواج ہے۔ متعہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے اس سے عفت و عصمت مقصود نہیں ہوتی اور نہ اولاد حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے محض شہوت رانی کے لئے کیا جاتا ہے، متعہ کی حرمت خوب واضح کر کے سورۂ مؤمنون کے پہلے رکوع میں اس طرح بیان فرمائی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ۔ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ o (اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا مملوکہ باندیوں سے جو استمتاع کر لیتے ہیں اس پر کوئی ملامت نہیں سو جو شخص اس کے علاوہ کا طلب گار ہو تو یہ لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں) اس میں صاف بتا دیا گیا کہ اپنی شرمگاہوں کو صرف بیویوں اور باندیوں میں استعمال کرنا جائز ہے ان کے علاوہ کوئی جگہ تلاش کرنے والا حلال کی حدود سے آگے بڑھ جانے والا ہے جو لوگ متعہ کرتے ہیں وہ لوگ بھی متعہ والی عورت کو منکوحہ بیوی کی حیثیت نہیں دیتے نہ اُس کو بیوی شمار کرتے ہیں اور نہ اُس کو میراث دیتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک بھی ان کا شمار ازواج میں نہیں ہے۔

مہر کی ادائیگی کا حکم ...... پھر فرمایا فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (سو ان میں سے جس عورت سے نفع حاصل کرو تو اُن کے مہر دے دو جو مقرر ہو چکے ہیں) اس میں ادائیگی مہر کی تاکید فرمائی ہے۔ اگر نکاح کرنے کے بعد خلوت صحیحہ ہو گئی تو جو مہر مقرر ہوا تھا پورا ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی تو نصف مہر ادا کرنا واجب ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کے رکوع ۳۱ میں گذر چکا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو میاں بیوی بن کر رہتے سہتے ہیں لیکن بیوی کے مہر کی ادائیگی کا فکر نہیں کرتے اور بیوی لحاظ میں کچھ نہیں کہتی اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے تاکید اور تنبیہ ہے کہ ادائیگی مہر کی فکر کریں اور بیوی کے تقاضے کے بغیر ادا کریں۔

پھر فرمایا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اس میں یہ بتایا ہے کہ مہر مقرر کرنے کے بعد آپس میں میاں

بیوی جس بات پر مہر کے سلسلے میں خوشی کے ساتھ راضی ہو جائیں اس میں کچھ حرج نہیں۔ مثلاً یہ کہ عورت بخوشی پورا مہر معاف کر دے یا کچھ حصہ چھوڑ دے یا شوہر مہر میں اپنی طرف سے اضافہ کر دے تو یہ سب درست ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اگر عورت مہر معجّل کو مؤجل کر دے یعنی یہ مان لے کہ میرا مہر بعد میں دے دینا تو یہ بات بھی درست ہے۔

آیت کے ختم پر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا بلاشبہ اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے اُس نے اپنی مخلوق کے احوال و طبائع کو جانتے ہوئے احکام مقرر فرمائے ہیں اور تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں ان احکام کی تعمیل کرنے میں بندوں کا سراسر نفع ہے جو کوئی ان کی خلاف ورزی کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے موافق سزا دے گا۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور تم میں جس شخص کو اس کا مقدور نہ ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو آپس کی ایمان والی باندیوں سے نکاح کر لے

مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ

جو تمہاری مملوکہ ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے ایمان کو، تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، سو تم مذکورہ باندیوں سے ان

بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ

کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور انہیں ان کے مہر بہتر طریقہ پر دیدو، یہ منکوحہ باندیاں نہ علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ طریقہ پر دوست

اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ

بنانے والی ہوں، پس جب وہ باندیاں نکاح میں آ جائیں تو اگر کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں تو اُن پر اس کی آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں

الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

پر ہے، یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رکھتا ہو، اور یہ بات کہ صبر کرو بہتر ہے تمہارے لئے، اور اللہ غفور ہے رحیم ہے۔

باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت

اپنی مملوکہ باندی سے تو (شروط و قیود کے مطابق) بلا نکاح بھی جماع کرنا جائز ہے اور اپنی باندی سے نکاح درست بھی نہیں۔ اور نہ اس کی حاجت ہے کیونکہ اس سے جماع بھی حلال ہے اور اس سے جو اولاد ہوگی وہ بھی (حسبِ ضابطہ) ثابت النسب ہوگی، البتہ دوسرا کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی باندی سے نکاح کرنا چاہے تو یہ نکاح کرنا درست ہے، یہ نکاح باندی کے مالک کی اجازت سے ہوسکتا ہے اور جو مہر مقرر کر دیا گیا ہو وہ خوبی کے ساتھ ادا کر دیا جائے اس مہر کا مالک اس باندی کا آقا ہی ہوگا۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو شخص آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو وہ باندی سے نکاح نہ کرے۔ چونکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مفہوم شرط اور مفہوم وصف معتبر ہے اس لئے ان کے نزدیک آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے کسی بھی باندی سے نکاح کرنا درست نہیں۔ اگر آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو تو ان کے نزدیک باندی سے نکاح کرنا جائز ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے بھی باندی سے نکاح درست ہے۔ بشرطیکہ وہ باندی

مسلمہ ہو یا کتابیہ لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔ آزاد مسلمان عورت سے نکاح کی قدرت ہو تو باندی سے نکاح نہ کرے اور اگر باندی سے نکاح کرے تو مؤمنہ تلاش کرے۔ (من البحر الرائق ص۱۱۲ ج۳) یہ مفہوم شرط اور مفہوم وصف والی بحث علمی بات ہے جس کی تفصیل اصولِ فقہ کی کتابوں میں لکھی ہے اس کے سمجھنے کے لئے کسی عالم سے رجوع کرلیں۔

بات یہ ہے کہ شادی کا مقصد پاک دامن رہنا اور اولاد کا طلب کرنا ہے۔ اولاد کی تربیت میں ماؤں کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے جس طرح بچہ ماں کی زبان سیکھتا ہے (اور اسی لئے اس کی زبان کو مادری زبان کہتے ہیں) اسی طرح سے دین و ایمان، اخلاق و آداب، اطوار و عادات بھی ماں سے سیکھتا ہے اوّل تو یہی کوشش رہے کہ آزاد مسلمان عورت سے نکاح کیا جائے پھر مسلمان عورتوں میں بھی دیندار صالحہ اور تقویٰ طہارت والی عورت کو تلاش کیا جائے۔ اگر آزاد مسلمان عورت سے نکاح پر قدرت نہ ہو۔ اس کے مہر کی ادائیگی اور دیگر اخراجات کا تحمل نہ ہو تو پھر لونڈی سے نکاح کرلے۔ اس میں بھی مؤمنہ باندی کو ترجیح دی جائے۔

یہ جو فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا خوب اچھی طرح علم ہے۔ ایمان ہی وجہ فضیلت ہے بعض مرتبہ مؤمن باندی مرتبہ ایمانیہ میں آزاد عورت کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس کے نکاح سے عار نہ کریں اور باندی کے آقا کی اجازت سے اس سے نکاح کریں اور جنس انسانیت کے اعتبار سے سب حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں اور کسی نے باندی سے نکاح کیا تو اپنی جنس ہی سے نکاح کیا۔

اور یہ جو فرمایا مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن باندیوں سے نکاح کرلو جو پاکدامن ہوں مُسَافِحَاتٍ (اعلانیہ زنا کرنے والی) اور مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ (خفیہ طریقہ پر آشنا تلاش کرنے والی نہ ہوں) پاکدامن عورت ہی نکاح کے لائق ہے آزاد ہو یا باندی ہو۔

یہاں خصوصیت کے ساتھ باندیوں کے نکاح کے ذیل میں اس بات کا اس لئے تذکرہ فرمایا کہ باندیوں کی نگرانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ کام کاج کے لئے وہ باہر جاتی ہیں۔

پھر فرمایا فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب باندیاں نکاح میں آجائیں اور اس کے بعد زنا کا ارتکاب کرلیں تو اُن کو آدھی سزا ملے گی بمقابلہ اس سزا کے جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے اگر وہ زنا کر بیٹھیں، یہاں آزاد عورتوں سے غیر شادی شدہ آزاد عورتیں مراد ہیں۔ غیر شادی شدہ عورت اگر زنا کرے تو اس کی سزا سو کوڑے ہے اس اعتبار سے باندی اگر زنا کرے تو اس کو پچاس کوڑوں کی سزا ملے گی۔ شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اس کی سزا رجم ہے۔ یعنی پتھروں سے ماردینا ہے۔ چونکہ رجم میں تنصیف نہیں ہوسکتی اس لئے اگر باندی اور غلام شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس سے زنا سرزد ہوجائے تو پچاس کوڑے ہی لگیں گے۔ زنا کی سزا کا تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۂ نور کے پہلے رکوع کی تفسیر میں لکھا جائے گا۔

آخر میں فرمایا ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (کہ باندیوں سے نکاح کرنا اُس شخص کے لئے ہے جو زنا میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ رکھتا ہو، اور باوجود اجازت کے صبر کرنا بہتر ہے)۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ط

اللہ چاہتا ہے کہ بیان فرمائے تمہارے لئے اور تم کو بتلا دے طریقے اُن لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے اور یہ کہ وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے،

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ قف وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ

اور اللہ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے اور جو لوگ خواہشات نفسانیہ کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں

اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ج وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ تخفیف کا ارادہ فرماتا ہے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے اور نفس کی خواہشوں کے پیچھے چلنے والے تمہیں راہِ حق سے ہٹانا چاہتے ہیں

ان آیات میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیئے ہیں اور زندگی گذارنے کے جو طریقے بتائے ہیں اس میں تمہارا فائدہ ہے، تم سے پہلے جو صالحین تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے طریقے بھی تمہیں بتائے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ گذشتہ امتوں کے لئے بھی احکام آئے تھے اور وہ اُن پر عمل کرتے تھے۔ (تم کو بھی عمل کرنا چاہیے) اللہ تعالیٰ کو تمہاری توبہ قبول کرنا منظور ہے اس نے جو بھی کچھ حکم دیا ہے۔ تمہارے لئے اس میں خیر ہے وہ علیم ہے تمہارے انفرادی واجتماعی اعمال کو جانتا ہے اور حکیم بھی ہے اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تمہاری توبہ قبول فرمائے (لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اُس کے احکام پر چلو) اور جو لوگ نفسانی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں جنہوں نے خواہشات ہی کو اپنا پیشوا بنا رکھا ہے وہ خود ڈوبے ہیں اور تمہارے لئے بھی یہی چاہتے ہیں کہ راہِ حق سے ہٹ جاؤ اور بہت دور تک ہٹتے چلے جاؤ۔ ان لوگوں کو اپنے لئے عفت وعصمت اور حیاء وشرم محبوب نہیں ہے۔ فحاشی اور شہوت پرستی ہی ان کے پیشِ نظر ہے یہ تم کو بھی اپنی راہ پر لانا چاہتے ہیں۔ تمہاری عفت وعصمت بھی ان کو کھلتی ہے اور انہیں یہ گوارا نہیں کہ تم حیاو شرم کے ساتھ زندگی گذارو، تم احکام خداوندیہ پر مضبوطی سے جمے رہو تاکہ یہ شہوت کے بندے اور خواہشوں کے غلام تمہیں اپنے راستے پر نہ ڈالیں (ناول افسانے لکھنے والے سینما میں کام کرنے والے ایکٹر اور ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر میں بے حیائی اور فحاشی کے مناظر سامنے لانے والے سب ہی عفت وعصمت کے دشمن ہیں)۔

احکام شرعیہ میں انسانی کمزوریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے...... پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تمہارے لئے احکام میں تخفیف فرمائے یعنی آسانی فرمائے۔ اس نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ انسان کا ضعف اور انسان کی کمزوری اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ ان کمزوریوں کا احکام میں لحاظ رکھا ہے اور ایسے احکام دیئے ہیں جو بندہ کی قدرت سے باہر نہیں ہیں۔ اوّل تو نکاح کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کا حکم دیا اور ایک سے لے کر چار بیویوں تک کی اجازت دی، اور عورتوں کے لئے مہر مقرر فرمانے کا حکم دیا تاکہ معاشرہ میں عورت کی بھی حیثیت و عزت قائم رہے اور مردوں کو باندیوں سے استمتاع کرنے کی بھی اجازت دی، مملوکہ ہوں یا منکوحہ، یہ سب آسانیاں ہیں جن کی انسان کو حاجت ہے احکام نکاح کے علاوہ دوسرے احکام میں بھی آسانیاں رکھی ہیں اور کوئی حکم ایسا نہیں دیا جس کی تعمیل انسان کے بس سے باہر ہو۔ البتہ انسان کو شتر بے مہار کی طرح آزاد بھی نہیں چھوڑا، جو مرد جس عورت سے چاہے استمتاع کرے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ یہ تو حیوانی زندگی ہے اگر سب کچھ حلال کر دیا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہے گا؟ اس طرح سے تو انسانیت کا شرف ہی ختم ہو جائے گا جس پر پابندی نہیں وہ تو انسان ہی نہیں۔

شہوت پرستوں کا طریق کار ...... جو لوگ شہوتوں کے بندے ہیں انہیں انسانیت محبوب و مرغوب ہی نہیں وہ تو انسان ہو کر پچھتا رہے ہیں اور نفس کے مزہ کے لئے محض حیوانیت پر اتر آئے ہیں۔

یورپ، امریکہ میں بے ہودگی، آوارگی، فحاشی، زنا کاری کا جو سیلاب آیا ہوا ہے۔ چھوٹے بڑے حاکم و محکوم اور ہر طبقہ کے لوگ اس میں بہہ چکے ہیں۔ حکومتوں کا یہ حال ہے کہ کوئی قانون بناتے ہیں پھر جب دیکھتے ہیں کہ عوام اس کے مطابق نہیں چلتے قانون کو بدل دیتے ہیں۔ تھوڑا بہت جو قانون کا بھرم باقی ہے تو صرف اتنا سا ہے کہ زنا بالجبر ممنوع ہے۔ آپس کی خوشی سے زنا کاری جتنی مرتبہ بھی ہو جائے اس پر ان کے نزدیک کوئی مواخذہ نہیں اور اب تو استلذ اد بالمثل کا قانون پاس کر دیا ہے ان شہوت پرستوں کے نزدیک عورت عورت سے اور مرد مرد سے استمتاع کر سکتا ہے۔ اور خلافِ فطرت قضائے شہوت میں ان کے بڑے لوگ بھی مبتلا ہیں (دینی بڑے ہوں یا دنیاوی ذمہ دار ہوں) ایسے پارک ہیں جن میں کسی عمل پر کوئی پابندی نہیں، اس پارک میں علانیہ طور پر مرد اور عورت جو فعل کرے ان کے یہاں اس پر قانون کی کوئی گرفت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جو یَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ. فرمایا ہے اس کے پورے پورے مصداق بنے ہوئے ہیں۔

جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں وہاں بھی بہت سے لوگ یورپ اور امریکہ کے حیوانوں کی طرح جنسی خواہشات پورا کرنے کے متوالے ہیں، یہ لوگ نہ صرف یہ کہ خود بے حیائیوں، فحاشیوں اور زنا کاریوں میں مبتلا ہیں بلکہ باقاعدہ ان کی سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں جن کی برابر اور مستقل یہ کوشش ہے کہ نکاح اور حیا و شرم کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، ایسے جرائد ہفت روزہ اور ماہنامے جاری ہیں جن میں بے حیائی کے کاموں کو اچھالا جاتا ہے ننگی تصویریں شائع کی جاتی ہیں، جذباتِ نفسانیہ کو اُبھارا جاتا ہے اور ایسی انجمنیں بنی ہوئی ہیں جو عامۃ المسلمین کو بے حیائی اور زنا کاری کی غار میں دھکیلنے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ ننگوں کے کلب ہیں زنا کاری کے اڈے ہیں ان کی سرپرستی کی جاتی ہے، فاحشہ عورتوں کو حکومتیں لائسنس دیتی ہیں، پہلے تو اتنا ہی تھا کہ سینما ہال میں معاشقہ کے نظارے کئے جاتے تھے اور ننگی سے ننگی اور گندی سے گندی فلمیں بنوا کر سینماؤں کے مالکان خوش ہوتے تھے (کیونکہ اس میں ذریعہ آمدنی بہت زیادہ ہے) اور اب تو گھر گھر عشقیہ فلمیں اور ڈرامے دیکھے جا رہے ہیں، ٹی وی کے پروگراموں نے اور وی سی آر (وڈیو کیسٹ ریکارڈ) نے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا ہے، بے حیا ماں باپ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور بچوں کو دکھاتے ہیں۔ جن حکومتوں کے سربراہوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری اسلامی حکومت ہے ان کے ٹی وی پروگراموں میں اور یورپ امریکہ کے پروگراموں میں کوئی فرق نہیں۔ وی سی آر بازاروں میں فروخت ہو رہے ہیں۔ دینداری کے دعویدار بھی اپنے بچوں کو اس سے منع نہیں کرتے۔ پورا معاشرہ عریانی و فحاشی کی راہ سے گذر رہا ہے۔ پرانے قسم کے جو کچھ لوگ باقی ہیں وہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کھلتے ہیں اور قرآن و حدیث کی عفت و عصمت کی تعلیم نوجوانوں کو پسند نہیں۔ بے حیائی کے داعیوں نے عامۃ الناس کو اس طرح سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ پیچھے مڑنے اور حیا و شرم اختیار کرنے کے لئے بہت بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ گذشتہ زمانوں میں کوئی شخص زنا کرتا تو چھپ چھپا کر کرتا تھا اور اس طرح کا پیشہ کرنے والی عورتوں کو بھی بُری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ معاشرہ میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی لیکن آج تو عفت و عصمت حیا و شرم عیب بن گئی ہے اور بے حیائی اور فحاشی و عریانی ہنر اور کمال سمجھی جا رہی ہے اور اُسے معاشرہ کا جزو اعظم سمجھا جاتا ہے۔

حیا و شرم انبیاء کرام علیہم السلام کے اخلاقِ عالیہ میں سے ہیں ...... عفت و عصمت اور حیاء و شرم کی تمام انبیاء کرام نے اپنی

اپنی اُمتوں کو تعلیم دی ہے اور یہ اہلِ ایمان کا شعار ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقۂ زندگی میں سے ہیں۔ (۱) حیاء، (۲) تعطر (یعنی خوشبو لگانا)، (۳) مسواک کرنا، (۴) نکاح کرنا۔ (رواہ الترمذی فی اوّل کتاب النکاح) نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر دین کا ایک خاص مزاج ہے اور دین اسلام کا مزاج حیا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیا اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں جب اُن میں سے ایک چھین لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی چلا جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۳۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا نظروں کے سامنے ہے کہ جن قوموں میں حیا نہیں ان میں ایمان نہیں اور جو قومیں مسلمان ہونے کی دعویدار ہیں ان میں جیسے جیسے بے حیائی بڑھ رہی ہے ویسے ویسے ایمان اور ایمانیات سے محروم ہوتے جارہے ہیں، یورپ اور امریکہ میں جو مسلمان جا کر بسے ہیں ان میں جو تھوڑا بہت ایمان واسلام تھا وہ ان کی نسلوں میں وہاں تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے عفت وعصمت کے لئے جو قانون بنائے اور اُن کی حفاظت کے لئے جو پابندیاں رکھی ہیں ان میں پہلی پابندی نظر پر ہے اور بدنظری کو حرام قرار دیا ہے، نیز عورتوں کے لئے پردہ لازمی قرار دیا ہے۔ عورتوں کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دیا ہے جو کوئی عورت خوشبو لگا کر باہر نکلے اُسے زناکار قرار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر نظریں ڈالنے لگتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۶۹) تعجب اُن لوگوں پر ہے جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور ساتھ ہی بے حیا بھی ہیں اور عفت و عصمت کے دشمن بھی ہیں، جو لوگ عفت وعصمت کے دشمن ہیں عام مسلمانوں کو بڑی حد تک بے حیائی پر ڈال چکے ہیں ان کی کوششیں جاری ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بالکل ہی عفت وعصمت اور حیاوشرم سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ولقد صدق اللہ تعالیٰ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا اللہ تعالیٰ کی بات نہ ماننا اور دشمنوں کی راہ اختیار کرنا یہ کیسی مسلمانی ہے؟ فاللہ یھدیھم ویوفقھم لما یحبُّ و یرضٰی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی تجارت آپس کی

تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

رضا مندی سے ہو، اور مت قتل کرو اپنی جانوں کو، بے شک اللہ تم پر بہت بڑا مہربان ہے۔ اور جو شخص زیادتی اور

عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

ظلم اختیار کرے گا سو عنقریب ہم اسے دوزخ میں داخل کر دیں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

باطل طریقے پر مال کھانے کی ممانعت اور تجارت کا اصول

اس آیتِ کریمہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ پر نہ کھاؤ۔ صاحب معالم التنزیل ص ۴۱۷ ج ۱ پر لکھتے ہیں بالحرام یعنی بالربوا والقمار والغصب والسرقة والخیانة ونحوھا، وقیل ھو العقود الفاسدة یعنی باطل سے مراد یہ ہے کہ حرام طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ مثلاً سود لے کر جوئے بازی کے طریقے سے اور چھین کر، چوری کر کے، خیانت کر کے اور اسی

طرح کے دوسرے غیر شرعی طریقوں سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے عقود فاسدہ مراد ہیں یعنی خرید وفروخت اور اجارہ وغیرہ کے وہ طریقے جو شرعاً فاسد ہیں ان کے ذریعہ ایک دوسرے کا مال حاصل نہ کرو۔ لفظ باطل بہت عام ہے مال حاصل کرنے کا ہر وہ طریقہ جو شرعاً جائز نہ ہو وہ سب باطل کے عموم میں داخل ہے۔

پھر اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ فرماتے ہوئے تجارت کے ذریعہ مال حاصل کرنے کو جائز قرار دیا اور ساتھ ہی عَنْ تَرَاضٍ کی بھی قید لگا دی یعنی تجارت کے ذریعہ وہ مال حاصل کرنا حلال ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو۔ خریدار یا صاحب مال دونوں کسی معاملہ پر راضی ہو جائیں اور یہ رضامندی خوش دلی سے ہو تو لین دین جائز ہے کسی فریق کو خریدنے یا بیچنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی کی چیز اٹھا کر چل دیتے ہیں یہ غصب یا لوٹ مار ہے اور بعض لوگ صاحبِ مال کو کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ اوّل تو وہ بیچنے پر راضی نہیں ہوتا اور اگر راضی ہو جائے تو اتنی قیمت نہیں دیتے جس پر وہ خوش دلی سے راضی ہو زبردستی کسی کی چیز لے لینا یا اپنے پاس سے خود قیمت تجویز کر کے دے دینا جس سے صاحب مال راضی اور خوش نہ ہو یہ سب حرام ہے۔

چند غیر شرعی معاملات کا تذکرہ ...... جتنے بھی غیر شرعی معاملات ہیں ان کے ذریعہ جو مال حاصل ہوگا وہ باطل طریقے پر کھانے میں شمار ہوگا۔ شراب، خنزیر اور مردار کی بیع حرام ہے۔ رشوت لینا حرام ہے جو پیسہ اس ذریعہ سے ملے وہ بھی حرام ہے جو چیز اپنی ملکیت میں نہیں اس کی بیع باطل ہے۔ پرندہ کی بیع جبکہ وہ اُڑ رہا ہے اور مچھلی کی بیع جبکہ وہ سمندر میں ہو یہ بھی بیع باطل ہے۔ اگر مال مثلاً سو روپے کا لیا ہو اور خریدار سے یوں کہے کہ میں نے ایک سو دس میں لیا ہے اور تمہیں اصل دام پر دیتا ہوں یہ بھی حرام ہے اس میں جھوٹ بھی ہے اور فریب بھی۔ کرایہ پر مکان، دکان کا دینا لینا بھی ایک قسم کی تجارت ہے اس میں بھی باہمی رضامندی شرط ہے بہت سے لوگ کسی خالی مکان کو دیکھ کر قبضہ کر لیتے ہیں پھر صاحبِ مکان کو مجبور کرتے ہیں کہ کرایہ لے لو اگر وہ کرایہ لینا منظور کرے تو اپنا منہ بولا کرایہ دینے پر مجبور کرتے ہیں وہ مجبور ہو کر بددلی کے ساتھ تھوڑا کرایہ منظور کر لیتا ہے یہ بھی حرام ہے اور بعض لوگ حکومتوں کے غیر شرعی قانون کی آڑ لے لیتے ہیں، حکومتوں کا قانون ہے کہ کرایہ دار سے خالی نہیں کرا سکتے۔ کرایہ بھی نہیں بڑھا سکتے۔ ایسے قانون بنانا اور ایسے قانون کو استعمال کر کے مالک مکان کو نقصان پہنچانا یہ بھی حرام ہے۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ مال ایک ہزار کا خریدا اور دکاندار سے کیش میمو بارہ سو کا بنوالیا پھر جب کوئی شخص خریدنے آیا تو اُس کو وہ کیش میمو دکھا کر یہ باور کرا دیا کہ یہ مال ہم نے بارہ سو میں خریدا ہے لہٰذا تم دام کے دام خرید لو یا سو روپیہ نفع دے کر لے لو۔ یہ سب دھوکہ دہی ہے اور حرام ہے۔

پھر فرمایا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنی جانوں کو قتل نہ کرو) اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ حرام مال کھا کر اپنی جانوں کو قتل نہ کرو (کیونکہ آخرت میں عذاب دنیاوی قتل کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے) اور بعض حضرات نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا لَا يَقْتُلُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس میں خودکشی کی ممانعت فرمائی ہے۔ (معالم التنزیل ص ۴۱۸) چونکہ الفاظ میں عموم ہے اس لئے آیت کا مفہوم ان سب کو شامل ہے۔

اس زمانہ میں قتل و غارت کی بہت کثرت ہے۔ مسلمان مسلمان کو قتل کرتا ہے، لسانی اور صوبائی عصبیتوں اور طرح طرح کی جاہلانہ باتوں کی وجہ سے خونریزی کا بازار گرم ہے دشمنوں نے مسلمانوں کو آپس کے جنگ وجدال پر آمادہ کر رکھا ہے۔ بظاہر دنیاوی مفاد سامنے آتا ہے۔ اس لئے بے تحاشا قتل کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اس کے بارے میں جو وعیدیں ہیں سورۂ نساء کی آیت وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا (الآیۃ رکوع ۱۴) کے ذیل میں ان شاء اللہ بیان ہوں گی۔

خود کشی کا گناہ...... جیسا کہ کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے اپنی جان کو قتل کرنا بھی حرام ہے۔ یہ جان اس ذات پاک کی ملکیت ہے جس نے جان بخشی ہے کسی کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی بھی طرح سے خودکشی کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے پہاڑ سے گر کر خودکشی کر لی وہ دوزخ کی آگ میں ہوگا ہمیشہ ہمیشہ اس میں (چڑھتا) اور گرتا رہے گا، اور جس شخص نے زہر پی کر خودکشی کر لی۔ اس کا زہر اُس کے ہاتھ میں ہوگا دوزخ کی آگ میں وہ ہمیشہ ہمیشہ اس کو پیتا رہے گا اور جس شخص نے کسی لوہے کی چیز سے خودکشی کر لی اس کا وہ لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا دوزخ کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ اس لوہے کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا۔ (رواہ البخاری کمافی المشکوٰۃ ص ۹۹) دنیا کی مصیبتوں سے تنگ آ کر بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ آخرت کا عذاب اس دنیاوی تکلیف سے بہت زیادہ ہے۔

آخر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بہت بڑا مہربان ہے، اس نے جو احکام بھیجے ہیں ان کو اپنے حق میں خیر سمجھو۔ ان احکام کی تعمیل ہی میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی خیر ہے۔ جس حکم کی تعمیل میں تکلیف محسوس ہوتی ہو ہمت کر کے اس کی بھی تعمیل کرو کیونکہ حکم کی خلاف ورزی میں تمہارے لئے سراپا ضرر ہے اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان میں تمہیں نقصان اور ضرر سے بچایا ہے۔

دوسری آیت میں قتلِ نفس کی وعید بتائی اور ارشاد فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا کہ جو شخص زیادتی اور ظلم کے طور پر کسی جان کو قتل کرے ہم اس کو دوزخ میں داخل کریں گے۔ بعض صورتوں میں قتل کرنے کا جو شرعی جواز ہے اس سے آگے بڑھ جانا اور حدودِ شرعی سے نکل کر کسی کو قتل کر دینا حرام ہے۔ قتلِ نفس کی سزا جہنم کا داخلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب پر قدرت ہے کوئی اس کی قدرت سے باہر نہیں اور اس کے ملک سے کوئی نہیں نکل سکتا نہ موت سے پہلے نہ موت کے بعد۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ آسان ہے۔ اور ہر طرح کی قدرت ہے جس کو جیسے چاہے سزا دے سکتا ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

جن چیزوں سے تمہیں منع کیا جاتا ہے اگر اُن میں سے بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ کر دیں گے اور تمہیں عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

تکفیر سیئات کا وعدہ

اس آیت میں کبائر سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے اور صغائر کو معاف کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے تو اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔ دیگر نصوص کثیرہ کی بنا پر بعض علماء نے یہ اشکال کیا ہے کہ محض اجتناب کبائر سے (جن میں عدم ادائے فرائض بھی داخل ہے) اگر صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں تو جتنے بھی صغائر ہیں بظاہر نتیجہ کے طور پر مباح کا درجہ لے لیں گے کیونکہ ان کے ارتکاب کرنے والے کو یہ یقین رہے گا کہ کبائر سے بچنے کی وجہ سے میرے تمام صغائر معاف ہیں۔ لہٰذا صغائر پر کوئی عتاب اور عذاب نہ ہوگا اور مباح ہونے کا یہی معنی ہے اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے معتزلہ کی تردید کے ذیل میں صاحبِ مدارک التنزیل ص ۲۲۲ ج ۲ تحریر فرماتے ہیں وتشبث المعتزلة بالاٰية على ان الصغائر واجبة المغفرة باجتناب الكبائر وعلى ان الكبائر غير مغفورة باطلٌ لان الكبائر والصغائر فى مشيئة الله تعالىٰ سواءٌ ان شاء عذب عليهما وان شاء عفا عنهما لقوله تعالىٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ، فقد وعد المغفرة لما دون الشرك وقرنها

بمشیته تعالیٰ و قوله إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ فهذه الأية تدل على ان الصغائر والكبائر يجوز ان يذهبا بالحسنات لأن لفظ السيئات يطلق عليها ۔ (معتزلہ کا اس آیت سے اس بات پر دلیل پکڑنا کہ صغیرہ گناہ کی مغفرت کبیرہ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے واجب ہے اور اس پر کہ کبیرہ گناہ ہرگز معاف نہیں ہوں گے باطل ہے کیونکہ صغیرہ کبیرہ گناہ کی مغفرت کرنا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت میں برابر ہے چاہے تو ان پر عذاب دے اور چاہے تو بخش دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) بے شک اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کو معاف نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے شرک کے علاوہ کی بخشش کا وعدہ کیا ہے البتہ اسے اپنی مشیئت کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: (ترجمہ) بے شک نیکیاں سیّئات کو ختم کر دیتی ہیں یہ کبیرہ وصغیرہ دونوں قسم کے گناہوں کا نیکیوں سے ختم ہونا ممکن ہے کیونکہ سیّئات کے لفظ کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔)

مطلب یہ ہے کہ وعدہ مغفرت تو ہے لیکن مشیت الٰہی پر موقوف ہے وہ جس گناہ کو چاہے گا معاف فرمادے گا۔

اور بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ یہاں کبائر ما تنهون عنه سے وجوہ کفر مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام وجوہ کفر سے اجتناب کرو گے یعنی مسلمان رہو گے تو تمہارے سب گناہ معاف کرنے کا وعدہ ہے۔ کفر کے علاوہ جو باقی گناہ ہیں وہ چونکہ کفر کے مقابلہ میں صغائر ہیں (اگرچہ فی نفسہ اُن میں بھی فرق مراتب ہے ان میں صغیرہ بھی ہیں اور کبیرہ بھی) اُن کے معاف فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن یہ وعدہ تحت المشیۃ ہے اور اس آیت کا مفہوم اور آیت کریمہ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ کا ایک ہی مفہوم ہے۔

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وقيل المراد بها انواع الكفر بدليل قراءة عبدالله كبير ما تنهون عنه وهو الكفر (اور بعض نے کہا اس سے مراد کفر کی انواع ہیں عبداللہ کی قراءت "کبائر ما تنهون") کی دلیل ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی یہ بات کہی ہے اور جمع والی قرأت كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سے اجناس کفر مراد ہیں پھر فرماتے ہیں والآية التي قيدت الحكم فترد اليها هذه المطلقات كلها قوله تعالىٰ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ. (ص۱۵۹ ج۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة ورمضان الى رمضان مكفرات لما بينهن اذا اجتنبت الكبائر (یعنی پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے درمیانی وقفہ کے گناہوں کا کفارہ کرنے والے ہیں جبکہ بڑے گناہوں سے پرہیز کیا جائے)۔ (صحیح مسلم ص۱۲۲ ج۱)

اور صحیح مسلم ص۱۲۱ ج۱ کی ایک حدیث مرفوع میں یوں ہے کہ ما من امرئ مسلم تحضره صلوة مكتوبة فيحسن وضوءها وخشوعها وركوعها الا كانت كفارة لما قبلها من الذنوب مالم يؤت كبيرة (یعنی جس مسلمان کی موجودگی میں فرض نماز کا وقت ہو گیا اور اس نے اچھی طرح وضو کیا اور اس کا رکوع سجود اچھی طرح ادا کیا تو اس سے اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا جب تک کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو۔

ان حدیثوں میں بظاہر وہی بات ہے کہ جب بڑے گناہوں سے پرہیز کیا جائے گا تو نیکیوں سے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ لیکن علامہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں۔

معناه ان الذنوب كلها تغفر الا الكبائر فانها لا تغفر ، وليس المراد ان الذنوب تغفر ما لم تكن كبيرة فان كانت

لا يغفر شئ من الصغائر فان هذا وان كان محتملا فسياق الحديث ياباه قال القاضي عياض هذا المذكور في الحديث من غفران الذنوب مالم يؤت كبيرة هو مذهب اهل السنة وان الكبائر انما يغفرها التوبة ورحمة الله تعالٰى وفضله والله اعلم. (اس کا معنی یہ ہے کہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں سوائے کبیرہ کے کیونکہ وہ نہیں بخشے جاتے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ بخشے جاتے ہیں جب تک کہ کبیرہ نہ ہوں اگرچہ صغیرہ معاف نہ ہوں، اس کا احتمال تو ہے مگر حدیث کا سیاق اس کا انکار کرتا ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث میں جو گناہوں کی معافی کا ذکر ہے یہ اس وقت تک ہے جب تک کہ گناہ کبیرہ نہ ہو اہل سنت کا مذہب یہی ہے کبیرہ گناہوں کو توبہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل معاف کرتا ہے) (شرح صحیح مسلم ص ۱۲۱ ج ۱)۔

مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے ذریعہ جو گناہ معاف ہونے کا وعدہ ہے یہ صغیرہ گناہوں سے متعلق ہے کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہ ہوں گے۔ اور یہ مطلب نہیں ہے کہ بڑے گناہ نہ ہوں تو چھوٹے گناہ معاف ہوں گے۔ ظاہری الفاظ میں اس معنی کا احتمال تو ہے لیکن حدیث کا سیاق اس سے انکار کرتا ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ یہ جو حدیث میں گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہوا کہ جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو صغائر معاف کردیئے جائیں گے یہ اہلسنّت والجماعت کا مذہب ہے اور کبائر صرف توبہ سے یا اللہ کی رحمت و فضل سے معاف ہوں گے۔ بظاہر آیت شریفہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ اور حدیث اذا اجتنبت الكبائر اور مالم يؤت كبيرة سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بڑے گناہوں کے ہوتے ہوئے چھوٹے گناہوں کا کفارہ نہ ہوگا لیکن علامہ نووی فرماتے ہیں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں اگرچہ محتمل ہے۔ امام نوویؒ نے جو بات فرمائی ہے اور جو بات قاضی عیاض سے نقل کی ہے اور جو کچھ علامہ نسفی نے لکھی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے آیت اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم چاہیں گے تو تمہارے سارے گناہوں کا کفارہ کردیں گے بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ ہو (کبیرہ گناہوں کا کفارہ نہ ہوگا کیونکہ ان کی مغفرت اور کفارہ کے لئے توبہ شرط ہے) امام نوویؒ کی بات اُن نصوص کی وجہ سے دل کو لگتی ہے جن میں اعمالِ صالحہ کے ذریعہ گناہوں کے کفارہ کا تذکرہ ہے اور اُن میں کبیرہ گناہوں سے بچنے کی کوئی قید یا شرط نہیں سورۂ ھود میں فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (کہ بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو ختم کردیتی ہیں) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے واقعہ کی خبر دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ نازل فرمائی اُس شخص نے عرض کیا کہ یہ بشارت میرے ہی لئے ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کے تمام افراد کے لئے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۸ ج ۱) آیتِ بالا کے الفاظ میں جو عموم ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ نیکیوں کے ذریعہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور بے شمار احادیث میں ان نیکیوں کا ذکر ہے جن کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔

لفظ اِنْ تَجْتَنِبُوْا سے جو شرط معلوم ہو رہی ہے اس کے بارے میں جو اکابر نے فرمایا ہے وہ ہم نے لکھ دیا ہے۔ بعض حضرات نے اور بھی توجیہات کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آیت کا تعلق گذشتہ آیت سے ہے۔ گذشتہ آیت میں یہ فرمایا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل ذریعہ سے مت کھاؤ اب یہاں یہ بات بیان فرمائی کہ باطل مال لینے کے لئے کوئی شخص چلا جس کا ارادہ مثلاً غصب کرنے یا چوری کرنے کا تھا پھر وہ غصب یا چوری کرنے سے پہلے ہی گناہ کے ارادہ سے باز آ گیا تو ارتکابِ کبیرہ کے لئے جو وہ اپنے گھر سے روانہ ہوا یہ روانگی اور وہ سب گناہ معاف ہو گئے جو غصب یا چوری کے ارتکاب کے لئے کئے تھے، جب اُس نے چوری اور غصب کو اللہ کے خوف سے چھوڑ دیا تو اس سلسلہ میں جو عمل کئے تھے وہ بھی معاف ہو گئے۔

اور بعض حضرات نے یوں فرمایا کہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا میں مفہوم شرط معتبر نہیں یعنی کبائر سے اجتناب کرنے کی وجہ سے تو صغیرہ گناہ معاف ہوں گے لیکن عدم اجتناب کبائر سے صغیرہ معاف نہ ہوں اس پر اس کی دلالت نہیں ہے۔

کبیرہ گناہ کون سے ہیں؟ ...... کبیرہ گناہ کون سے ہیں اس کے بارے میں حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الکبائر کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے فرمایا کہ ان کی تعیین میں حضرات علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک یہ ہے کہ کبیرہ گناہ سات ہیں جنہیں بخاری و مسلم کی حدیث اجتنبوا السبع الموبقات میں بیان فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ کبیرہ گناہ ستر کے قریب ہیں پھر فرمایا کہ جس حدیث میں سات گناہوں کا ذکر ہے اس میں حصر مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت بڑے بڑے گناہوں کا تذکرہ فرمادیا ہے۔ نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو کبیرہ گناہ ہیں اُن میں خود فرق مراتب ہے۔ بعض بعض سے بڑے ہیں۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں ص ۱۵۹ ج ۳ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر دوزخ کے داخلے کی یا اللہ کے غصے کی یا لعنت کی یا عذاب کی وعید آئی ہو، نیز حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ کبیرہ گناہ سات سو کے قریب ہیں۔ ساتھ ہی ان کا یہ مقولہ بھی نقل کیا ہے کہ لا کبیرۃ مع استغفار ولا صغیرۃ مع اصرار یعنی جب استغفار ہوتا رہے تو کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا (بشرطیکہ استغفار سچے دل سے ہو، زبانی جمع خرچ نہ ہو) اور صغیرہ پر اصرار ہوتا رہے تو پھر وہ صغیرہ نہیں رہتا۔ پھر لکھتے ہیں وقد اختلف الناس فی تعدادھا وحصرھا اختلاف الآثار فیھا. والذی اقول انہ قد جاء ت فیھا احادیث کثیرۃ صحاح وحسان لم یقصد بہ الحصر ولکنھا بعضھا اکبر من بعض الی ما یکثر ضررہ الی اٰخر ما قال۔ (اور علماء نے کبیرہ گناہوں کی تعداد اور اس بارے میں احادیث میں مذکور تعداد کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف کیا ہے جو چیز میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس بارے میں بہت سی صحیح اور حسن احادیث مذکور ہیں جن سے مقصود حصر نہیں ہے لیکن اتنا ہے کہ بعض گناہ بعض سے بڑے ہیں اس لئے کہ ان کا ضرر زیادہ ہے)

حافظ ذہبیؒ نے اپنی کتاب میں ستر گناہ لکھے ہیں اور اُن کے بارے میں جو وعیدیں ہیں وہ بھی درج ہیں۔ ان کی کتاب کا مراجعہ کرلیا جائے۔

کبیرہ گناہوں کی فہرست ...... اجمالی طور پر ہم حافظ ذہبیؒ کی کتاب سے کبیرہ گناہوں کی فہرست لکھتے ہیں۔

۱۔ شرک اور شرک کے علاوہ وہ عقائد و اعمال جن سے کفر لازم آتا ہے (کفر و شرک کی مغفرت کبھی نہ ہوگی کما جاء مصرحًا فی کتاب اللہ تعالٰی)

۲۔ کسی جان کو عمداً قتل کرنا۔

۳۔ جادو کرنا۔

۴۔ فرض نماز کو چھوڑنا یا وقت سے پہلے پڑھنا۔

۵۔ زکوٰۃ نہ دینا۔

۶۔ بلا رخصت شرعی رمضان شریف کا کوئی روزہ چھوڑنا یا رمضان کا روزہ رکھ کر بلا عذر توڑ دینا۔

۷۔ فرض ہوتے ہوئے حج کئے بغیر مرجانا۔

۸۔ والدین کو تکلیف دینا۔ اور اُن امور میں ان کی نافرمانی کرنا جن میں فرمانبرداری واجب ہے۔

۹۔رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنا۔
۱۰۔زنا کرنا۔
۱۱۔غیر فطری طریقے پر عورت سے جماع کرنا یا کسی مرد یا لڑکے سے اغلام کرنا۔
۱۲۔سود کا لین دین کرنا یا سود کا کاتب یا شاہد بننا۔
۱۳۔ظلماً یتیم کا مال کھانا۔
۱۴۔اللہ پر یا اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا۔
۱۵۔میدانِ جہاد سے بھاگنا۔
۱۶۔جو اقتدار اعلیٰ پر ہو اس کا رعیت کو دھوکہ دینا اور خیانت کرنا۔
۱۷۔تکبر کرنا۔
۱۸۔جھوٹی گواہی دینا یا کسی کا حق مارا جارہا ہو تو جانتے ہوئے گواہی نہ دینا۔
۱۹۔شراب پینا یا کوئی نشہ والی چیز کھانا پینا۔
۲۰۔جوا کھیلنا۔
۲۱۔کسی پاکدامن عورت کو تہمت لگانا۔
۲۲۔مالِ غنیمت میں خیانت کرنا۔
۲۳۔چوری کرنا۔
۲۴۔ڈاکہ مارنا۔
۲۵۔جھوٹی قسم کھانا۔
۲۶۔کسی بھی طرح سے ظلم کرنا (مار پیٹ کر ہو یا ظلماً مال لینے سے ہو یا گالی گلوچ کرنے سے ہو)۔
۲۷۔ٹیکس وصول کرنا۔
۲۸۔حرام مال کھانا یا پینا یا پہننا یا خرچ کرنا۔
۲۹۔خودکشی کرنا یا اپنا کوئی عضو کاٹ دینا۔
۳۰۔جھوٹ بولنا۔
۳۱۔قانونِ شرعی کے خلاف فیصلے کرنا۔
۳۲۔رشوت لینا۔
۳۳۔عورتوں کا مردوں کی یا مردوں کا عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا (جس میں داڑھی مونڈنا بھی شامل ہے)۔
۳۴۔اپنے اہل وعیال میں فحش کام یا بے حیائی ہوتے ہوئے دور کرنے کی فکر نہ کرنا۔
۳۵۔تین طلاق دی ہوئی عورت کے پرانے شوہر کا حلالہ کروانا اور اس کے لئے حلالہ کر کے دینا۔
۳۶۔بدن میں یا کپڑوں میں پیشاب لگنے سے پرہیز نہ کرنا۔

۳۷۔دکھاوے کے لئے اعمال کرنا۔

۳۸۔کسب دنیا کے لئے علم دین حاصل کرنا اور علمِ دین کو چھپانا۔

۳۹۔خیانت کرنا۔

۴۰۔کسی کے ساتھ سلوک کر کے احسان جتانا۔

۴۱۔تقدیر کو جھٹلانا۔

۴۲۔لوگوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ لگانا۔تجسس کرنا،اور کنسوئی لینا۔

۴۳۔چغلی کھانا۔

۴۴۔لعنت بکنا۔

۴۵۔دھوکہ دینا اور جو عہد کیا ہو اس کو پورا نہ کرنا۔

۴۶۔کاہن اور منجم (غیب کی خبریں بتانے والے) کی تصدیق کرنا۔

۴۷۔شوہر کی نافرمانی کرنا۔

۴۸۔تصویر بنانا یا گھر میں لٹکانا۔

۴۹۔کسی کی موت پر نوحہ کرنا۔منہ پیٹنا، کپڑے پھاڑنا، سر منڈانا، ہلاکت کی دُعا کرنا۔

۵۰۔سرکشی کرنا۔اللہ کا باغی ہونا، مسلمانوں کو تکلیف دینا۔

۵۱۔مخلوق پر دست درازی کرنا۔

۵۲۔پڑوسی کو تکلیف دینا۔

۵۳۔مسلمانوں کو تکلیف دینا اور اُن کو بُرا کہنا۔

۵۴۔خاص کر اللہ کے نیک بندوں کو تکلیف دینا۔

۵۵۔ٹخنوں پر یا اس سے نیچے کوئی کپڑا پہنا ہوا لٹکانا۔

۵۶۔مردوں کو ریشم اور سونا پہننا۔

۵۷۔غلام کا آقا سے بھاگ جانا۔

۵۸۔غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا۔

۵۹۔جانتے بوجھتے ہوئے اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو باپ بنالینا۔یعنی یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں میرا باپ ہے حالانکہ وہ اس کا باپ نہیں۔

۶۰۔فساد کے طور پر لڑائی جھگڑا کرنا۔

۶۱۔(بوقت حاجت) بچا ہوا پانی دوسروں کو نہ دینا۔

۶۲۔ناپ تول میں کمی کرنا۔

۶۳۔اللہ کی گرفت سے بے خوف ہو جانا۔

۶۴۔ اولیاء اللہ کو تکلیف دینا۔
۶۵۔ نماز باجماعت کا اہتمام نہ کرنا۔
۶۶۔ بغیر شرعی عذر نماز جمعہ چھوڑ دینا۔
۶۷۔ ایسی وصیت کرنا جس سے کسی وارث کو ضرر پہنچانا مقصود ہو۔
۶۸۔ مکر کرنا اور دھوکہ دینا۔
۶۹۔ مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی ٹوہ لگانا اور ان کی پوشیدہ چیزوں پر دلالت کرنا۔
۷۰۔ کسی صحابیؓ کو گالی دینا۔

یہاں تک حافظ ذہبیؒ کی کتاب سے اقتباس ختم ہوا۔ ہم نے ترتیب سے نمبر ڈالے ہیں بعض چیزیں مکرر بھی آ گئی ہیں اور بعض مشہور چیزیں اُن سے رہ گئی ہیں۔ اور ان کی کتاب کے بعض نسخوں میں بعض چیزیں زائد ہیں (جو ذیل میں درج شدہ فہرست میں آ گئی ہیں)۔ صغائر و کبائر کے بیان میں علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی صاحب بحر الرائق رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک رسالہ ہے جو الاشباہ والنظائر کے آخر میں چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کبیرہ گناہوں کی فہرست دی ہے جو حافظ ذہبی کی فہرست سے زیادہ ہے مثلاً

۷۱۔ کسی ظالم کا مددگار بننا، قدرت ہوتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنا۔
۷۲۔ جادو کا سیکھنا اور سکھانا یا اس پر عمل کرنا۔
۷۳۔ قرآن کو بھول جانا۔
۷۴۔ کسی حیوان کو زندہ جلانا۔
۷۵۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا۔
۷۶۔ مردار یا خنزیر بغیر اضطرار کے کھانا۔
۷۷۔ صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا۔
۷۸۔ گناہوں پر مدد کرنا اور اُن پر آمادہ کرنا۔
۷۹۔ گانے کا پیشہ اختیار کرنا۔
۸۰۔ لوگوں کے سامنے ننگا ہونا۔
۸۱۔ ناچنا۔
۸۲۔ دنیا سے محبت کرنا۔
۸۳۔ حاملین قرآن اور علماء کرام کے حق میں بدگوئی کرنا۔
۸۴۔ اپنے امیر کے ساتھ غدر کرنا۔
۸۵۔ کسی کے نسب میں طعن کرنا۔
۸۶۔ گمراہی کی طرف دعوت دینا۔
۸۷۔ اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا۔

۸۸۔ اپنے غلام کو خصی کرنا یا اس کے اعضا میں سے کوئی عضو کاٹ دینا۔
۸۹۔ کسی محسن کی ناشکری کرنا۔
۹۰۔ حرم میں الحاد کرنا۔
۹۱۔ نرد سے کھیلنا، اور ہر وہ کھیل کھیلنا جس کی حرمت پر امت کا اجماع ہے۔
۹۲۔ بھنگ پینا (ہیروئن اسی کے حکم میں ہے)۔
۹۳۔ کسی مسلمان کو کافر کہنا۔
۹۴۔ بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنا۔
۹۵۔ مشت زنی کرنا۔
۹۶۔ حالت حیض میں جماع کرنا۔
۹۷۔ مسلمانوں کے ملک میں مہنگائی ہو جائے تو خوش ہونا۔
۹۸۔ جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا۔
۹۹۔ عالم کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا۔
۱۰۰۔ کھانے کو عیب لگانا۔
۱۰۱۔ بے ریش حسین لڑکے کی طرف دیکھنا۔
۱۰۲۔ کسی کے گھر میں بلا اجازت نظر ڈالنا اور بلا اجازت اندر چلے جانا۔

علامہ ابن نجیم کی فہرست متعلقہ کبائر ختم ہوئی۔ ہم نے مکررات کو ختم کر دیا یعنی حافظ ذہبیؒ کے رسالہ میں جو چیزیں آئی تھیں ان کو نہیں لیا اور بعض دیگر چیزوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

صغیرہ گناہوں کی فہرست...... اس کے بعد حافظ ابن نجیم نے صغائر کی فہرست دی ہے جو یہ ہے۔

۱۔ جہاں نظر ڈالنا حرام ہو وہاں دیکھنا۔
۲۔ بیوی کے سوا کسی کا شہوت سے بوسہ لینا یا بیوی کے سوا کسی کو شہوت سے چھونا۔
۳۔ اجنبیہ کے ساتھ خلوت میں رہنا۔
۴۔ سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا۔
۵۔ کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا یعنی سلام کلام بند رکھنا۔
۶۔ کسی نمازی کا نماز پڑھتے ہوئے اپنے اختیار سے ہنسنا۔
۷۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔
۸۔ مصیبت پر نوحہ کرنا اور منہ پیٹنا (یا گریبان پھاڑنا اور جاہلیت کی دہائی دینا)۔
۹۔ مرد کو ریشم کا کپڑا پہننا۔
۱۰۔ تکبر کی چال چلنا۔

۱۱۔ فاسق کے ساتھ بیٹھنا۔

۱۲۔ مکروہ وقت میں نماز پڑھنا۔

۱۳۔ مسجد میں نجاست داخل کرنا یا دیوانے کو یا بچے کو مسجد میں لے جانا جس کے جسم یا کپڑے پر نجاست ہونے کا غالب گمان ہو۔

۱۴۔ پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا یا پشت کرنا۔

۱۵۔ تنہائی میں بطور عبث شرم گاہ کو کھولنا۔

۱۶۔ لگاتار نفلی روزے رکھنا جس میں بیچ میں افطار نہ ہو۔

۱۷۔ جس عورت سے ظہار کیا ہو کفارہ دینے سے پہلے اس سے وطی کرنا۔

۱۸۔ کسی عورت کا بغیر شوہر اور محرم کے سفر کرنا۔

۱۹۔ کسی دوسرے خریدار سے زیادہ قیمت دلوانے کے لئے مال کے دام زیادہ لگا دینا جبکہ خود خریداری کا ارادہ نہ ہو۔

۲۰۔ ضرورت کے وقت مہنگائی کی انتظار میں غلّہ روکنا۔

۲۱۔ کسی مسلمان بھائی کی بیع پر بیع کرنا یا کسی کی منگنی پر منگنی کرنا۔

۲۲۔ باہر سے مال لانے والوں سے شہر سے باہر ہی سودا کر لینا (تاکہ سارا مال اپنا ہو جائے اور پھر دام چڑھا کر بیچیں)۔

۲۳۔ جو لوگ دیہات سے مال لائیں اُن کا مال اپنے قبضہ میں کر کے مہنگا بیچنا۔

۲۴۔ اذان جمعہ کے وقت بیع وشراء کرنا۔

۲۵۔ مال کا عیب چھپا کر بیچنا۔

۲۶۔ شکار یا مویشیوں کی حفاظت کی ضرورت کے بغیر کتا پالنا۔

۲۷۔ مسجد میں حاضرین کی گردنوں کو پھاند کر جانا۔

۲۸۔ زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہو جانے کے بعد ادائیگی میں تاخیر کرنا۔

۲۹۔ راستے میں بیع وشرا یا کسی ضرورت کے لئے کھڑا ہونا جس سے راہ گیروں کو تکلیف ہو یا راستے میں پیشاب پاخانہ کرنا (سائے اور دھوپ میں جہاں لوگ اُٹھتے بیٹھتے ہوں اور پانی کے گھاٹ پر پیشاب کرنا پاخانہ کرنا بھی اسی ممانعت میں داخل ہے)

۳۰۔ بحالت جنابت اذان دینا یا مسجد میں داخل ہونا یا مسجد میں بیٹھنا۔

۳۱۔ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنا اور کپڑے وغیرہ سے کھیلنا۔

۳۲۔ نماز میں گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھنا۔

۳۳۔ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا۔ اور وہ کام کرنا جو عبادت نہیں ہیں۔

۳۴۔ روزے دار کو بوس وکنار کرنا۔ اگر اپنے نفس پر اطمینان نہ ہو۔

۳۵۔ گھٹیا مال سے زکوٰۃ ادا کرنا۔

۳۶۔ ذبح کرنے میں اخیر تک (پوری گردن) کاٹ دینا۔

۳۷۔ بالغ عورت کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لینا۔

۳۸۔ایک سے زیادہ طلاق دینا۔

۳۹۔زمانۂ حیض میں طلاق دینا۔

۴۰۔جس طہر میں جماع کیا ہو اُس میں طلاق دینا۔

۴۱۔اولاد کو لینے دینے میں کسی ایک کو ترجیح دینا۔ اِلّا یہ کہ علم یا صلاح کی وجہ سے کسی کو ترجیح دے۔

۴۲۔قاضی کو مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان برابری نہ کرنا۔

۴۳۔سلطان کا یا جس کے مال میں غالب حرام ہو ہدیہ قبول کرنا اور اس کا کھانا کھانا اور اس کی دعوت قبول کرنا۔

۴۴۔کسی کی زمین میں بغیر اجازت کے چلنا۔

۴۵۔انسان یا کسی حیوان کا مثلہ کرنا (یعنی ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹ دینا)

۴۶۔نماز پڑھتے ہوئے تصویر پر سجدہ کرنا یا ایسی صورت میں نماز پڑھنا کہ نمازی کے مقابل یا اُس کے برابر تصویر ہو۔

۴۷۔کافر کو سلام کرنا۔

۴۸۔بچہ کو وہ لباس پہنانا جو بالغ کے لئے جائز نہ ہو۔

۴۹۔پیٹ بھرنے کے بعد بھی کھاتے رہنا۔

۵۰۔مسلمان سے بدگمانی کرنا۔

۵۱۔لہو ولعب کی چیزیں سننا۔

۵۲۔غیبت سن کر خاموش رہ جانا (غیبت کرنے والے کو منع نہ کرنا اور تردید نہ کرنا)۔

۵۳۔زبردستی امام بننا (جبکہ مقتدیوں کو اس کی امامت گوارا نہ ہو اور اس کی ذات میں دینی اعتبار سے کوئی قصور ہو)۔

۵۴۔خطبے کے وقت باتیں کرنا۔

۵۵۔مسجد کی چھت پر یا مسجد کے راستے میں نجاست ڈالنا۔

۵۶۔دل میں یہ نیت رکھتے ہوئے کسی سے کوئی وعدہ کر لینا کہ پورا نہیں کروں گا۔

۵۷۔مزاح یا مدح میں افراط کرنا۔

۵۸۔غصہ کرنا (ہاں اگر دینی ضرورت سے ہو تو جائز ہے)

عام طور پر جن چیزوں میں لوگ مبتلا ہیں وہ ہم نے ذکر کر دی ہیں بعض چیزیں جو ابن نجیم کی کتاب میں ہیں وہ ہم نے چھوڑ دی ہیں اور صغائر میں انہوں نے بعض وہ چیزیں ذکر کی ہیں جن کو ذہبیؒ نے کبائر میں شمار کیا ہے اور یوں بھی مذکورہ گناہوں میں بعض کو صغائر میں شمار کرنا محل نظر ہے۔ خاص کر کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا اور سلام کلام بند رکھنا اس کو صغائر میں شمار کرنا نادرست ہے اس پر حدیث شریف میں سخت وعید آئی ہے اور یہ ایک اجتہادی اَمر ہے کہ صغیرہ گناہ کون کون سے ہیں اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق حضرات اکابر نے تعیین فرما دی ہے۔

حج یا عمرہ کا احرام میں داخل ہو کر اُسے فاسد کر دینا یا ممنوعاتِ احرام کا قصداً ارتکاب کرنا یا نماز شروع کر کے بغیر عذر شرعی توڑ دینا اس کا

ذکر نہ حافظ ذہبیؒ نے کیا نہ ابن نجیم نے، اگر دیگر احادیث شریفہ پر نظر ڈالی جائے تو بہت سے اور گناہ بھی سامنے آ جائیں گے۔

ہمارا رسالہ گناہوں کی فہرست بھی ملاحظہ کرلیا جائے جس میں گناہ اور گناہوں پر جو وعیدیں ہیں وہ ذکر کردی گئی ہیں۔

صغیرہ گناہ بھی گناہ ہے۔ اس سے بھی بچنا واجب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھوٹے گناہوں سے بھی بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا بھی مؤاخذہ کرنے والے ہیں یعنی فرشتے جو نیکی بدی لکھنے پر مامور ہیں وہ ان کو بھی لکھتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۸)

فائدہ.......... صغیرہ گناہ کا ارتکاب اگر عذاب اور مواخذہ سے ڈرتے ہوئے کرلیا جائے تو صغیرہ ہے۔ اگر لا پرواہی سے کیا جائے اور یہ سمجھ کر کرے کہ اس میں کوئی بات نہیں تو پھر کبیرہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صغیرہ پر اصرار کرنے یعنی بار بار ارتکاب کرنے سے بھی صغیرہ کبیرہ ہو جاتا ہے اور جس عمل کی جو ممانعت قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے اُس ممانعت کو کوئی حیثیت نہ دینا یہ کفر ہے۔ خواہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ

اور تم کسی چیز کی تمنا نہ کرو جس کے ذریعہ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں نے جو اعمال کئے ان کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے،

وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ

اور عورتوں نے جو اعمال کئے ان کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے، اور اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرو، بلاشبہ اللہ ہر چیز

شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ

کو جاننے والا ہے۔ اور ہر ایک کے لئے ہم نے اُس مال میں وارث مقرر کردیئے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ

اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

ہوا، ان کو ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ کو ہر چیز کی اطلاع ہے۔

ع ۸/۲

امورِ غیر اختیاریہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی آرزو مت کرو

معالم التنزیل ص ۴۲۰ ج ۱ میں حضرت مجاہد تابعیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم جہاد نہیں کرتیں اور اُن کا میراث میں بھی دوگنا حصہ ہے اگر ہم مرد ہوتے تو ہم بھی جہاد کرتے اور ہم کو بھی میراث میں ان کے برابر حصہ ملتا۔ اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ پھر بعض حضرات سے یوں نقل کیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے بیان فرماتے ہوئے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فرمایا تو عورتوں نے کہا کہ ہم زیادہ حصہ کی مستحق ہیں کیونکہ ہم ضعیف ہیں اور مرد قوی ہیں اور انہیں روزی حاصل کرنے پر قدرت زیادہ ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ جب لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ نازل ہوئی تو بعض مردوں نے کہا کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ نیکیوں کے اعتبار سے عورتوں سے بڑھ جائیں اور ہمارا ثواب عورتوں کے ثواب سے دوگنا ہوگا۔ جیسا کہ دنیا میں میراث کے حصہ میں زیادہ دیا گیا ہے۔ اس پر آیت لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا نازل ہوئی اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے

تشریعاً اور تکویناً اس کے سب کام اور سب فیصلے اور احکام حکمت کے مطابق ہیں اس نے جس کو جس حال میں رکھا ہے اور جتنی قوت دی ہے اور جس کام کا اہل بنایا ہے۔ اور جس کام پر لگایا ہے یہ سب حکمت کے موافق ہے اگر سبھی کی ایک جنس ہو جاتی یا سب قوت میں برابر ہوتے تو دنیاوی معیشت و معاشرت میں بہت سارخنہ پڑ جاتا رہا آخرت کا معاملہ اس کا تعلق اعمال سے اور اخلاص سے ہے۔ جو شخص مرد ہو یا عورت اپنی فطری قوت و توانائی کے اعتبار سے اخلاص کے ساتھ عمل کرے گا۔ اس کا وہ اجر و ثواب پائے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ صرف مرد ہونے کی وجہ سے یا عورت ہونے کی وجہ سے کسی کے ثواب میں اضافہ یا نقصان نہ ہوگا۔ یہ بات کہ اللہ نے جس کو جو فضیلت دی ہے دوسرا اُس کی آرزو نہ کرے اس کا تعلق امورِ غیر اختیاریہ سے ہے اور جو امورِ اختیاریہ ہیں اس میں محنت کوشش کر کے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ البتہ حسد نہ ہو، ریاکاری نہ ہو، اعجابِ نفس نہ ہو، اپنی تعریف کرانا مقصود نہ ہو، آپس میں نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اور سَابِقُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فرمایا ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اُسے شاکر صابر لکھ دیں گے۔ (۱) جس نے اپنے دین میں اپنے سے اوپر کو دیکھا اور اس نے اُس کی اقتداء کی۔ (۲) جس نے اپنی دنیا میں اپنے سے نیچے کو دیکھا اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے اس سے زیادہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو شاکر صابر لکھ دیں گے۔ اور جس نے اپنے دین میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھا اور دنیا میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھا اور اس پر رنج کیا (کہ مجھے تو اس قدر مال نہ ملا) تو اللہ تعالیٰ اُسے شاکر و صابر نہ لکھیں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۸) آنحضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ایک شخص کو اللہ نے مال و علم دیا۔ وہ مال کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور صلہ رحمی کرتا ہے اور مال میں جو حقوق ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ادا کرتا ہے تو (مالی اعتبار سے) یہ شخص سب سے افضل ہے اور ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم دیا اور مال نہیں دیا لیکن اُس کی نیت سچی ہے وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں شخص کی طرح خرچ کرتا تو ان دونوں شخصوں کا اجر برابر ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح از ترمذی ص ۴۵۱)

جن کمالات کے حاصل کرنے میں عملی کوشش کو دخل نہیں۔ اُن کی تمنا نہ کرے اور جو کام کر سکتا ہے ان میں محنت کوشش کر کے آگے بڑھے۔

پھر فرمایا لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا مردوں کے لئے ان کے عمل کا حصہ ہے جو انہوں نے کمایا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ اور عورتوں کے لئے ان کے عمل کا حصہ ہے جو انہوں نے کمایا، مرد ہو یا عورت ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے مطابق ثواب ملے گا جیسے مردوں کو ایک نیکی کا کم از کم دس گناہ ثواب ملے گا ایسے ہی عورتیں بھی اسی قدر ثواب کی مستحق ہوں گی۔

پھر اللہ تعالیٰ سے فضل کا سوال کرنے کا حکم فرمایا وَ سْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ لٰہذا عمل بھی کرتے رہیں اور اُس کے فضل کا سوال بھی کرتے رہیں۔ عمل کی توفیق، شکر کی توفیق، عمل کو قبول فرمانا۔ مزید توفیق دینا یہ سب اللہ کا فضل ہے۔

چونکہ بعض خواتین نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم ضعیف ہونے کی وجہ سے میراث کا دوگنا حصہ ملنے کے زیادہ مستحق ہیں اس لئے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ (الآیۃ) کہ ہم نے اس مال کے وارث مقرر کر دیئے۔ جسے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ حصوں کی یہ تقسیم حکمت پر مبنی ہے۔ جس کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے اس کا حصہ دے دو۔ اللہ حکمت والا ہے اور ہر ایک کی مصلحت کو جانتا ہے۔

مولی الموالاۃ کی میراث...... آیت کے ختم پر جو فرمایا: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہوا اُن کو اُن کا حصہ دے دو) اس میں عقد موالات کا تذکرہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ تھا کہ دو شخص آپس میں یوں اقرار

کر لیتے تھے کہ ہماری تمہاری آپس میں دوستی ہے جب ہم میں سے کوئی جنایت کرے تو دوسرا اس کی دیت کا متحمل ہو اور جب دونوں میں سے کوئی مر جائے تو اس کے مال کا وارث ہو ان میں سے ہر شخص کو مولی الموالاۃ کہا جاتا تھا۔ کیا اس کا حکم اسلام میں باقی ہے؟ اس کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایسا معاقدہ اور معاہدہ دو آدمی آپس میں کر لیں پھر اُن میں سے کوئی شخص مر جائے۔ اور مرنے والے کا کوئی بھی وارث اصحاب فرائض میں سے اور عصبات کے رشتہ داروں میں سے اور ذوی الارحام میں سے موجود نہ ہو تو مولی الموالاۃ کو میراث مل جائے گی اگر دو شخصوں نے آپس میں کوئی ایسا معاہدہ کیا ہو تو اُسے آپس میں منسوخ بھی کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کی طرف سے دیت ادا نہ کی ہو اگر ان میں سے کوئی شخص دوسرے کی دیت ادا کر چکا ہے تو اب یہ موالاۃ فسخ نہیں ہو سکتی۔

حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ عقد موالات کی وجہ سے اب ایک کی دوسرے کو میراث نہیں ملے گی۔ بلکہ جس کسی شخص نے کسی سے موالاۃ کی ہو۔ اگر وہ مر جائے اور اس کا کوئی وارث رشتہ داروں میں سے نہ ہو تو اس کی میراث عامۃ المسلمین کو ملے گی (یعنی اس کا ترکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا)۔ علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ آیت بالا سے مولی الموالاۃ کی میراث ثابت ہو رہی ہے اور کوئی ایسی چیز کتاب وسنت میں نہیں ہے جس سے اس کو منسوخ کیا جا سکے۔ اور آیت کریمہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ سے امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس میں ذوی الارحام کو مولی الموالاۃ سے اولیٰ بتایا ہے (امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے) پس اگر ذوی الارحام میں سے کوئی موجود نہ ہو تو بتقاضائے آیتِ کریمہ مولی الموالاۃ کو میراث ملنی چاہیئے۔ (احکام القرآن ص۱۸۶ ج۲)

علامہ نسفی مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں والمراد به عقد الموالاة وهي مشروعة والوراثة بها ثابتة عند عامة الصحابة رضي الله عنهم وهو قولنا ۔ آخر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہے کوئی شخص اپنے کسی عمل کو اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا)۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ

مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے اُن میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مالوں میں سے خرچ کیا،

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ

سو جو عورتیں نیک ہیں وہ اطاعت کرنے والی ہیں، مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہبانی کرنے والی ہیں، اور جن عورتوں کی بدخوئی کا تمہیں ڈر ہو اُن کو نصیحت

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ

کرو اور انہیں لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو، اور ان کو مارو، سو اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کریں تو اُن پر زیادتی کرنے کے لئے بہانہ نہ ڈھونڈو،

اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

بے شک اللہ تعالیٰ رفعت والا ہے بڑا ہے۔

زن اور شوہر کے بارے میں چند ہدایات

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کا شان نزول بیان کیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طمانچہ مار دیا تھا، وہ عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فریاد لے کر حاضر ہوئی۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قصاص (بدلہ) ہوگا۔ اس پر یہ آیت اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ نازل ہوئی۔ آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ایک بات کا ارادہ کیا (یعنی بدلہ دلانے کا) اور اللہ تعالیٰ نے دوسری بات کا ارادہ فرمایا۔ (اسباب النزول للواحدی ص ۱۴۵)

مرد عورتوں پر حاکم ہیں...... آیت بالا میں اوّل تو یہ فرمایا کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اور ساتھ اُس کے دو سبب بیان فرمائے اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی (جس میں یہ بھی ہے کہ عموماً مردوں کی سمجھ زیادہ ہوتی ہے اور ان کے فکر میں بہت کچھ نشیب و فراز آتا رہتا ہے وہ پیش آنے والے حالات کے پھیلاؤ اور گہراؤ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے ان کی نارسا فہم وہاں تک نہیں پہنچتی جہاں تک مردوں کی رسائی ہوتی ہے) لہٰذا جن گھریلو معاملات میں اختلاف ہو جائے اور کوئی بھی قضیہ کھڑا ہو جائے اس میں مردوں کی رائے معتبر ہوگی اور مرد جو کہیں گے اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ عورتیں محکوم ہیں وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں۔ دوسرا سبب مردوں کے حاکم ہونے کا یہ بیان فرمایا کہ مرد عورتوں پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں عورت کا نان ونفقہ، روٹی کپڑا مرد کے ذمہ ہے وہ چونکہ خرچ کرتا ہے اس لئے عورتوں کو پابند رہنا چاہیئے۔ یہی عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ عورت خرچہ تو لے مرد سے اور کرے اپنی من مانی یہ کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ بہت سی عورتیں جن کے مزاج میں نیکی ہوتی ہے وہ شوہر کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اللہ کا حکم ہے کہ شوہر کی فرمانبرداری کریں اور عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ شوہر کی فرمانبرداری کرتے ہوئے زندگی گذاریں۔

صالحات کی تعریف...... ایسی عورتوں کے بارے میں فرمایا فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ کہ نیک عورتیں فرمانبرداری کرنے والی ہوتی ہیں۔ اللہ کی فرمانبرداری کرتی ہیں اور شوہروں کی فرمانبرداری بھی کرتی ہیں اور مرد گھر پر موجود نہ ہو تب بھی اپنی آبرو اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس حفاظت اور نگہداشت کی توفیق دی ہے اور انہیں برائیوں سے بچایا ہے۔ (قال صاحب الروح ص ۲۴ ج ۵)

فَالصَّالِحَاتُ مِنْهُنَّ مُطِيْعَاتٌ لِّلّٰهِ تَعَالٰى وَلِاَزْوَاجِهِنَّ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ اَیْ يَحْفَظْنَ اَنْفُسَهُنَّ وَفُرُوْجَهُنَّ فِیْ حَالِ غَيْبَةِ اَزْوَاجِهِنَّ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ اَیْ بِمَا حَفِظَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى فِی مُهُوْرِهِنَّ وَاِلْزَامِ اَزْوَاجِهِنَّ النفقة. قاله الزجاج وقيل بحفظ الله تعالٰی لهن وعصمته اياهن، ولولا ان الله تعالٰی حفظهن وعصمهن لما حفظن انتهی بحذف۔ (نیک و کار عورتیں یعنی جو اللہ تعالیٰ کی اور شوہر کی فرمانبردار ہوں حافظات للغیب یعنی شوہروں کی غیر موجودگی میں اپنی جانوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ بما حفظ اللّٰہ یعنی جیسا کہ اللہ نے شوہروں کے ذمہ ان کے نفقات اور مہر لازم کر کے ان کی حفاظت کی ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ اور ایک قول میں ہے جیسے کہ اللہ نے ان کی آبرو کی حفاظت کی۔ اگر اللہ ان کی حفاظت نہ کرتا تو وہ خود اپنی آبرو کی حفاظت نہ کر پاتیں)

حافظاتٌ للغیب کے عموم میں سب چیزیں داخل ہیں۔ مرد کے مال کی حفاظت کرنا اس کی اولاد کی حفاظت کرنا۔ اور اپنی جان میں خیانت نہ کرنا یعنی دوسرے غیر مردوں کو گھر میں نہ آنے دینا۔ غیر مردوں سے تعلقات پیدا نہ کرنا۔ یہ سب اس کے عموم میں داخل ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ عورتوں میں کون سی عورت بہتر ہے؟ فرمایا

وہ عورت بہتر ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو اُسے خوش کرے اور حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور اپنی جان و مال کے بارے میں شوہر کی مخالفت نہ کرے (یعنی ایسے کام نہ کرے جو شوہر کو نا گوار ہوں) (رواہ النسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۲۸۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کو چار چیزیں مل گئیں اس کو دنیا و آخرت کی خیر مل گئی۔ (۱) شکر گذار دل، (۲) ذکر کرنے والی زبان، (۳) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن، (۴) ایسی بیوی جو اپنی جان میں اور شوہر کے مال میں خیانت نہیں کرتی۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ ص ۲۸۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو عورتیں اونٹوں پر سوار ہیں (عرب عورتیں) ان میں سب سے بہتر قریش کی نیک عورتیں ہیں جو بچوں پر ان کی چھوٹی عمر میں بہت زیادہ شفقت کرنے والی ہوتی ہیں اور شوہر کے مال کی خوب زیادہ حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ (رواہ البخاری ص ۷۶۰ ج ۲)

معلوم ہوا کہ مؤمن عورت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ بچوں کی ہر طرح سے حفاظت کرے، اور شوہر کے مال کی بھی حفاظت کرے اس کے مال کو بے جا خرچ نہ کرے۔ اُس کی مرضی کے خلاف خرچ نہ کرے۔ اور اپنی عفت و عصمت محفوظ رکھے۔ شوہر ہر وقت گھر میں نہیں رہتا۔ وہ بیوی کی اور اپنے مال کی اور اپنے بچوں کی ہر وقت دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ وہ کسبِ معاش اور دیگر ضروریات کے لئے گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔ اب عورت ہی کی ذمہ داری ہے کہ اپنی آبرو اور شوہر کی آبرو اور اپنے شوہر کے مال اور اپنی اولاد اور اپنے شوہر کی اولاد کی نگہداشت کرے۔ بچوں کی حفاظت اور نگہداشت میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کی اچھی تربیت کرے دیندار اور خوش اخلاق بنائے اگر وہ بے علم بے دین بد اخلاق ہو گئے تو اس میں اُن کی سراپا بربادی اور ہلاکت ہے۔

نافرمان عورتوں کے بارے میں ہدایات......اس کے بعد اُن عورتوں کے بارے میں ہدایات دیں جن کے مزاج میں نافرمانی ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ کہ جن عورتوں کی نافرمانی کا خوف ہو (یعنی احتمال قوی ہو) اُن کو ناصحانہ طور پر سمجھاؤ تاکہ وہ نافرمانی سے باز رہیں اگر وہ نہ مانیں نافرمانی پر ہی اتر آئیں تو ان کے بستروں میں لیٹنا چھوڑ دو جو ایک سمجھدار وفادار دیندار عورت کے لئے اچھی خاصی سزا ہے۔ اگر یہ طریق کار کامیاب نہ ہو تو پھر مار پیٹ اختیار کر سکتے ہو۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفات میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اس میں یہ بھی تھا فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِی النِّسَاءِ فَاِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَا يُوْطِئْنَ فُرُوْشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهٗ فَاِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ۔

(کہ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ تم نے ان کو ایسے عہد کے ذریعہ لیا ہے جو تمہارے اور اللہ کے درمیان ہے اور تم نے اُن کی شرم گاہوں کو اللہ کی شریعت کے مطابق حلال کیا ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے بستروں پر کسی کو نہ آنے دیں۔ جسے تم (غیرتِ ایمانی کی وجہ سے) نا گوار سمجھتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسا مارنا مارو کہ جس سے ہڈی پسلی نہ ٹوٹے، اور تم پر اُن کی خوراک اور پوشاک واجب ہے جسے اچھے طریقہ پر ادا کرو)۔ (رواہ مسلم ص ۳۹۷ ج ۱)

معلوم ہوا کہ جن صورتوں میں مارنے کی اجازت ہے اس میں یہ بھی شرط ہے کہ سخت مار نہ مارے جس سے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے یا اس طرح کی کوئی اور تکلیف پہنچ جائے۔ صاحب روح المعانی ص ۲۵ ج ۵ لکھتے ہیں کہ اوّل نصیحت کرنا پھر ساتھ لیٹنا چھوڑ دینا، پھر مارنا ترتیب کے ساتھ ہے قال والذی یدل علیہ السیاق والقرینة العقلیة ان هذه الامور الثلاثة مرتبة فاذا خیف نشوز المرأة

تنصح ثم تهجر ثم تضرب اذا لو عكس استغنى بالاشد عن الأضعف اھ۔ (فرمایا سیاق اور عقلی قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تینوں کا حکم ترتیب کے ساتھ ہے پس جب بیوی کی نافرمانی کا خدشہ ہو تو پہلے اسے نصیحت کرے پھر بستر الگ کرے پھر مارے اگر اس ترتیب کے الٹ کیا تو زیادہ سخت عمل کرنے کی وجہ سے اس سے کمزور کی ضرورت نہیں رہے گی)

پھر فرمایا فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا یعنی اگر عورتیں تمہاری فرمانبرداری کریں تو انہیں تکلیف دینے کا راستہ تلاش نہ کرو ان پر کوئی زیادتی نہ کرو۔ ظلم سے پیش نہ آؤ زبانی ڈانٹ ڈپٹ سے بھی پرہیز کرو اور عملی طور پر کوئی تکلیف نہ دو۔

قال صاحب الروح فَلَا تَطْلُبُوْا سَبِيْلًا وَّطَرِيْقًا اِلَى التَّعَدِّىْ عَلَيْهِنَّ اَوْ تَظْلِمُوْهُنَّ بِطَرِيْقٍ مِّنَ الطُّرُقِ بِالتَّوْبِيْخِ اللِّسَانِىْ وَالْاَذٰى الْفِعْلِىْ وغیرہ۔ اس میں اُن لوگوں کو نصیحت ہے جو بیویوں کو خواہ مخواہ ساس نند کے اُکسانے پر جھوٹی شکایتوں پر یا اُن کاموں کے نہ کرنے پر سزا دیتے ہیں جو شرعاً اُن کے ذمہ نہیں ہیں جو لوگ ضعیفوں پر ظلم کرتے ہیں انہیں یہ بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ روزِ محشر میں پیشی ہوگی اور ضعیف کو قوی سے بدلہ دلایا جائے گا۔ آیت کے ختم پر اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا فرمایا اس میں اس بات کو واضح طور پر بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ برتر ہے بڑا ہے اس کو سب پر قدرت ہے تمہیں جو اپنے ماتحتوں پر قدرت ہے اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت ہے قال صاحب الروح فاحذروا فان قدرته سبحانه عليكم اعظم من قدرتكم على من تحت ايديكم ۔ (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں پس تم ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تم پر جو قدرت ہے وہ اپنے ماتحتوں پر تمہاری قدرت سے کہیں زیادہ ہے)

عورتوں کو مارنے کے بارے میں تنبیہ ...... یہ جو ارشاد فرمایا کہ اُن کو نصیحت کرو اور اُن کے بستروں میں ساتھ لیٹنا چھوڑ دو اس سے معلوم ہوا کہ ناراضگی میں گھر چھوڑ کر نہ نکل جائیں خود بھی گھر میں رہیں بیوی بھی گھر میں رہے اور نافرمانی کی سزا کے طور پر ساتھ لیٹنا چھوڑ دیں۔ اگر گھر چھوڑ کر چلے گئے تو اس میں اور بہت سے خطرات ہیں۔ حضرت معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بیوی کا ہم پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا حق یہ ہے کہ جب تو کھائے تو اُسے بھی کھلا اور جب تو پہنے اُسے بھی پہنا۔ اور چہرہ پر نہ مار۔ اور بُرے الفاظ زبان سے نہ نکال اور اس سے تعلق مت چھوڑ مگر گھر میں رہتے ہوئے۔ (ابوداؤد ص ۲۹۱ ج ۱)

حجۃ الوداع کی حدیث کا ٹکڑا جو اوپر نقل کیا ہے اس میں ارشاد ہے کہ سخت مار نہ مارو اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مارنا ہو تو چہرہ پر نہ مارو، بیوی کو مارنا درجہ مجبوری میں ہے جب کسی بھی طرح کام نہ چلے تو بقدر ضرورت اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے، حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو نہ مارو (چند دن کے بعد) حضرت عمرؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! عورتیں تو دلیر ہو گئیں (یعنی جب انہیں پتہ چل گیا کہ مارنے کی ممانعت ہے تو سر چڑھ گئیں) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے کی اجازت دے دی۔ اب تو عورتیں آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں پہنچیں اور شوہروں کے مارنے کی شکایتیں کرنے لگیں۔ لہٰذا آپؐ نے فرمایا کہ محمدؐ کے گھر والوں کے پاس بہت سی عورتیں آئی ہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں کر رہی تھیں۔ یہ لوگ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں۔ (رواہ ابوداؤد ص ۲۹۲ ج ۱)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں ص ۲۵ ج ۵ کہ عورتوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کریں اور صبر سے کام لینا مارنے سے افضل ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی مجبوری پیش آ جائے تو مار پیٹ سے کام چلا لو۔ اور مارنے میں اعتدال ملحوظ رہے۔ سخت مار نہ دی جائے جیسا کہ اوپر گذرا۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی بیویوں کو ایسے نہ مارو جیسے غلام کی پٹائی کی جاتی ہے کیونکہ اس کے بعد دن کے آخر حصہ میں اس سے جماع کرنے لگو گے۔ (رواہ البخاری ص ۷۸۴ ج ۲)

مطلب یہ ہے کہ مرد کو عورت کی حاجت ہے اس سے مطلب نکلتا ہے ابھی تو مار بجائی پھر چند گھنٹے بعد ساتھ لیٹنے لگیں گے۔ اس وقت شریف الطبع آدمی کو لحاظ آئے گا ابھی تو اُس کو مارا تھا اور اب اسے محبوبہ بنا کر ساتھ لٹا لیا۔ ایسا کام کیوں کرے جس سے خفت ہو۔ اپنے نفس کو بھی خفت محسوس ہوگی اور عورت کے دل میں عزت کم ہوگی وہ کہے گی کہ یہ کیسا مرد موا ہے۔ ذرا سے میں کچھ ہے اور ذرا میں کچھ،

صاحب روح المعانی ص ۲۵ ج ۵ پر لکھتے ہیں کہ مرد چار باتوں پر عورت کو مار سکتا ہے۔

۱۔ بناؤ سنگھار چھوڑنے پر جبکہ شوہر اُس کو چاہتا ہو۔

۲۔ شوہر کے پاس آنے سے انکار کرنے پر جبکہ وہ اپنے بستر پر بلائے۔

۳۔ فرض نماز اور فرض غسل چھوڑنے پر۔

۴۔ گھر سے نکلنے پر جبکہ نکلنے کے لئے کوئی شرعی مجبوری نہ ہو۔

ان چار چیزوں جیسی کوئی اور بات ہو تو اس پر بھی سزا دی جا سکتی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ

اور اگر تم کو شوہر اور بیوی کے آپس کے اختلاف کا ڈر ہو تو بھیج دو ایک آدمی فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی فیصلہ کرنے والا عورت کے

اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

خاندان میں سے، اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرما دے گا، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان مخالفت ہو جائے تو دو آدمی موافقت کرانے کے لئے بھیجے جائیں

جب دو آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کبھی کبھی کوئی ناگواری کی بات پیش آ ہی جاتی ہے اور میاں بیوی کا تو روزانہ رات دن کا ساتھ ہے اس میں ناگواری پیش آ جانا کوئی بعید بات نہیں۔ سمجھدار میاں بیوی تو بات کو آئی گئی کر دیتے ہیں گویا کہ کچھ تھا ہی نہیں، لیکن کبھی بات بڑھ جاتی ہے اور زیادہ ناچاقی ہو جاتی ہے اس لئے اللہ جل شانہ نے صلح کرانے کے بارے میں ایک طریق کار تجویز فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جب میاں بیوی کے درمیان آپس میں اختلاف ہو جائے (ان خفتم بمعنی علمتم علی ما قال بعض المفسرین) تو ایک آدمی مرد کے گھر والوں میں سے۔ اور ایک آدمی عورت کے گھر والوں میں سے بھیج دیں جو حَکَم (فیصلہ کرنے والے) ہوں گے۔ یہ دونوں طرف کی شکایتیں سنیں اور مصالحت کی کوشش کریں۔ جوڑ بٹھائیں جس کی بھی زیادتی ہو اُس کو سمجھائیں اگر ان دونوں فیصلہ کرنے والوں میں نیک جذبات ہوں گے اور اخلاص کے ساتھ کام کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان دونوں میں موافقت پیدا فرما دے گا، ان شاء اللہ ۔ میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے پر زیادتی کرنا اور ایک دوسرے کے بارے میں غلط بیان دینا جائز نہیں۔ اور جو لوگ فیصلہ کرنے کے لئے گئے ہیں ان کو بھی اختلاف بڑھانے کی باتیں کرنا اور مخالفت کی خلیج وسیع کرنا جائز نہیں۔ جو کوئی شخص غلط عمل کرے گا غلط بات کہے گا اس کا مواخذہ ہوگا۔ اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے آیت کے اخیر میں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا باخبر ہے) اللہ تعالیٰ کو سب کے ظاہر اور باطن کا علم ہے، جو شخص ظلم اور زیادتی کرے گا مستحق سزا ہوگا۔

میاں بیوی میں جو جھگڑے ہوتے ہیں اور طول پکڑ جاتے ہیں جس میں بعض مرتبہ جدائی کی نوبت آ جاتی ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر زیادتی کرتے چلے جاتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کے جذبات ختم کر دیتے ہیں۔ پھر اوپر

سے اس لاوے پر دونوں فریق کے خاندانوں کا عمل آگ کا کام دیتا ہے۔ دونوں خاندان صلح جوئی اور آپس میں موافقت کی فضا بنانے کی بجائے مزید مخالفت کو شہہ دیتے ہیں، جوڑ بٹھانے کے لئے حکم بٹھانے کی بجائے آپس میں اتنا بُعد پیدا کر دیتے ہیں کہ مل بیٹھنے اور صلح صفائی کا موقع ہی نہیں رہتا۔ اللہ جل شانہ نے جو طریقہ اصلاح کا بیان فرمایا اس کی خلاف ورزی کے باعث میاں بیوی میں افتراق ہو جاتا ہے اور دونوں خاندانوں میں بغض و عناد اور دشمنی جگہ پکڑ لیتی ہے۔ بغض و عناد اور دشمنی کی فضا بنانا اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے اور یہ دنیا و آخرت میں گرفت کا باعث ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى

اللہ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اور قرابت داروں اور یتیموں

وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ

اور مسکینوں کو پاس والے پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ

ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۟ۙ﴿۳۶﴾

جو مالکانہ طور پر تمہارے قبضہ میں ہیں اچھا سلوک کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں فرماتا جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے شیخی کی باتیں کرے

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ

جو لوگ کنجوسی کرتے ہیں اور لوگوں کو کنجوسی کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے

فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۟ۚ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

اسے چھپاتے ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔ اور جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے

رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا

کے لئے اور اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت کے دن پر، اور شیطان جس کا ساتھی ہو سو وہ بہت بُرا ساتھی ہے،

فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ

اور کیا نقصان ہے اُن کا اگر وہ ایمان لائیں اللہ پر، اور آخرت کے دن پر اور خرچ کریں اُس میں سے جو اللہ

اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً

نے انہیں دیا ہے، اور اللہ اُن کو خوب جانتا ہے۔ بے شک اللہ ظلم نہیں فرمائے گا۔ ذرہ برابر بھی اور اگر نیکی ہو گی تو اس کو

يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

چند در چند کر دے گا اور اپنے پاس سے بڑا ثواب عطا فرمائے گا۔

والدین، اقربا، پڑوسی، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا حکم

ان آیات میں اوّل تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادت ہی کے لئے پیدا فرمایا ہے اس لئے بار بار قرآن میں اس کی یاد دہانی فرمائی ہے۔ سب سے بڑی عبادت توحید ہے اور شرک سے توحید ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے بار بار شرک سے بیزار ہونے کا بھی حکم فرمایا، عبادت اللہ کا حق ہے **حقوق اللہ** کو ذکر فرمانے کے بعد حقوق العباد کا تذکرہ فرمایا جن میں سب سے پہلے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا چونکہ ماں باپ اس دنیا میں اولاد کے وجود میں آنے کا سبب ہیں اس لئے ان کا حق بہت بڑا ہے۔ حق اللہ بیان فرمانے کے ساتھ ہی حکم فرمایا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ لفظ حسن سلوک میں سب باتیں آ جاتی ہیں۔ جس کو سورۂ بقرہ میں اور یہاں سورۂ نساء میں اور سورۂ انعام میں اور سورۂ اسراء میں وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا سے تعبیر فرمایا ہے۔ ماں باپ کی فرمانبرداری راحت رسانی اور ہر طرح کی خدمت ان لفظوں کے عموم میں آ جاتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری جائز نہیں۔ مزید تشریح سورۂ بقرہ کے دسویں رکوع کے ذیل میں گذر چکی ہے۔ وَبِذِي الْقُرْبٰى فرما کر دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم فرمایا، ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے اور انہیں لینے دینے کو صلہ رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صلہ رحمی کی دینِ اسلام میں بہت بڑی فضیلت ہے۔ اور اس کے برخلاف قطع رحمی کی بہت زیادہ مذمت آئی ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا کچھ بیان اور اس کی تفصیلات سورۂ بقرہ (ع ۲۲) کے ذیل میں گذر چکی ہیں، نیز یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے بارے میں بھی وہیں لکھا جا چکا ہے۔ اس کو دیکھ لیا جائے (انوار البیان ص ۲۳۸ ج ۱) قطع رحمی کے بارے میں اسی سورۂ نساء کے پہلے رکوع کی تفسیر دوبارہ دیکھ لیں۔

پھر وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى اور وَالْجَارِ الْجُنُبِ اور اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ اور ابْنِ السَّبِيْلِ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم فرمایا ہے اَلْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى کا ترجمہ پاس والا پڑوسی اور الجار الجنب کا ترجمہ دور والا پڑوسی کیا گیا ہے اور اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ سے مفسرین نے ہم مجلس مراد لیا ہے۔

یوں تو تمام مسلمانوں بلکہ سارے انسانوں کے ساتھ خوش اخلاقی والی زندگی گذارنا اور ہر ایک کے حقوق پہچاننا اور ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن عام طور پر چونکہ والدین اور عزیز قریب اور پڑوسی سے اور ہم مجلس سے واسطہ زیادہ پڑتا ہے اس لئے اُن کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرنے کی خصوصیت سے نصیحت فرمائی۔

پڑوسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم...... حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبریل علیہ السلام مجھے برابر پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہو گیا کہ وہ پڑوسی کو وارث ہی بنا دیں گے۔ (رواہ البخاری ص ۸۸۹) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسیوں میں اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات میں اور حسن سلوک میں سب سے بہتر ہو۔ (رواہ الترمذی)

ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے اچھا عمل کیا یا بُرا عمل کیا آپؐ نے فرمایا کہ جب تو اپنے پڑوسیوں سے سنے کہ تیرے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ تو نے اچھا کیا تو سمجھ لے کہ واقعی تو نے اچھا کیا اور جب تو اپنے پڑوسیوں سے سنے کہ وہ تیرے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ تو نے بُرا کیا تو سمجھ لے کہ تو نے بُرا کیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۴)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسیوں کو

تکلیف نہ دے اور جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ (رواہ البخاری ص ۸۸۹ ج ۲)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم وہ مؤمن نہیں۔ عرض کیا گیا، کون یا رسول اللہؐ؟ فرمایا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے بے فکر نہیں۔ (رواہ البخاری ص ۸۸۹ ج ۲)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے بے خوف نہ ہو۔ (رواہ مسلم ص ۵۰ ج ۱) بہت سے لوگوں کو نفلیں پڑھنے اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہنے کا تو خیال ہوتا ہے لیکن پڑوسیوں کو ان سے تکلیف پہنچتی رہتی ہے حالانکہ حقوق العباد کا خیال رکھنا نفل عبادت سے زیادہ ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! فلاں عورت کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ نمازیں بہت پڑھتی ہے روزے بہت رکھتی ہے اور صدقہ بہت دیتی ہے لیکن وہ پڑوسیوں کو اپنی زبان سے ایذاء بھی پہنچاتی ہے آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخ میں ہے۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نفلی روزے کم رکھتی ہے اور صدقہ بھی کم دیتی ہے اور نفل نماز بھی کم پڑھتی ہے اور پنیر کے کچھ ٹکڑوں کا صدقہ دیتی ہے اور اپنی زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی آپؐ نے فرمایا کہ وہ جنت میں ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۴۲۴)

حضرت ابن عباسؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص مؤمن نہیں جو پیٹ بھر لے اور اس کا پڑوسی اس کی بغل میں بھوکا رہ جائے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ ص ۴۲۴) تمام ہی پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا دھیان رکھا جائے۔ اگر کچھ لینا دینا ہو (اور زیادہ نہ ہو) تو اُس میں قریب ترین پڑوسی کا خیال رکھے۔ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو شوربا پکائے تو اُس کا پانی زیادہ کر دینا اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھنا۔ (رواہ مسلم ص ۳۲۹) حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! میرے دو پڑوسی ہیں، میں اُن میں سے کس کو ہدیہ دوں؟ آپؐ نے فرمایا ان دونوں میں سے جس کا دروازہ تم سے زیادہ قریب ہو اس کو دے دو۔ (صحیح بخاری ص ۸۹۰ ج ۲)

اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی کا ایک مطلب تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا یعنی نزدیک والا پڑوسی اور دوسرا مطلب وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ نے بیان فرمایا کہ پڑوسی بھی ہو اور رشتہ دار بھی اس طرح سے اس کے دو حق ہو جائیں گے۔ ایک پڑوسی ہونے کا اور دوسرا قرابت دار ہونے کا اور اَلْجَارِ الْجُنُبِ سے صرف وہ پڑوسی مراد ہوگا، جو رشتہ دار نہ ہو۔

اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ کا ترجمہ تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی پہلو کا ساتھی اور مفسرین نے اس سے ہمنشین یعنی مجلس میں ساتھ بیٹھنے والا مراد لیا ہے، پاس بیٹھنے والوں کے بھی حقوق ہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اپنی ایسی حالت نہ رکھے جس سے انہیں تکلیف ہو اور مجلس کی بات کو امانت سمجھے دوسری جگہ نہ پہنچائے۔ چغل خوری نہ کرے۔ اِدھر کی اُدھر نہ لگائے اور عموم لفظ کی وجہ سے بعض مفسرین نے سفر کے ساتھی کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

لہٰذا ہر رفیقِ سفر رشتہ دار، غیر رشتہ دار سب کے ساتھ حسن سلوک کرے، نہ قول سے تکلیف دے اور نہ عمل سے۔ اور نہ کسی اور طرح سے، جگہ تنگ ہو تو فراخ کرنے کی کوشش کرے تاکہ اپنا اور سب کا سفر اچھی طرح سے گذرے، جو لوگ کسی جگہ ایک ساتھ کام کرتے ہیں وہ بھی اَلصَّاحِبِ بِالْجَنُبِ کے عموم میں شامل ہیں۔ (من روح المعانی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خیر الاصحاب عند الله خیرھم لصاحبه یعنی ساتھیوں میں سب سے بہتر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۴)

حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سفر میں جماعت کا سردار وہی ہے جو اُن کا خدمت گذار ہو سو جو شخص اپنے ساتھیوں سے خدمت میں بڑھ گیا۔ وہ شہید ہونے کے علاوہ کسی عمل کے ذریعہ اس سے آگے نہ بڑھیں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۴۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ (پہلو کا ساتھی) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا **ھو المرأۃ تکون معہ الی جنبہ** یعنی اس سے بیوی مراد ہے جو پہلو میں ساتھ رہتی ہے۔ (ذکرہ فی معالم التنزیل) یہ تفسیر بھی الفاظِ قرآنیہ سے قریب ہے بلکہ قریب تر ہے۔

وَابْنِ السَّبِیْلِ یعنی مسافر۔ صاحب معالم التنزیل ص ۴۳۵ ج ۱ لکھتے ہیں کہ اکثر حضرات نے اس کو مہمان پر محمول کیا ہے۔ درحقیقت مسافر کے عموم میں مہمان بھی آ جاتا ہے۔ مسافر مہمان ہو یا غیر مہمان اس کی دلداری کی مدد اور اعانت ضروری ہوتی ہے۔ پردیس میں وہ ذرا ذرا سی میٹھی بات کو ترستا ہے اس کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا بہت بڑے اجر و ثواب کی چیز ہے۔

غلام باندیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم ...... پھر فرمایا وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کہ جو تمہارے باندی اور غلام ہیں اور وہ تمہارے تصرف میں ہیں ان کے ساتھ بھی خوبی کا برتاؤ کرو۔ اور اُن کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آؤ۔ ان کی خوراک پوشاک کا خیال کرو۔ ان پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔ طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ یہ باندی غلام تمہارے بھائی ہیں (اور) تمہارے خادم ہیں۔ اللہ نے ان کو تمہارے تصرف میں دے دیا ہے۔ سو جس کے تصرف میں کوئی غلام ہو وہ اُسے اُسی میں سے کھلائے جس میں سے خود کھاتا ہے اور اُسی میں سے پہنائے جس میں سے خود پہنتا ہے۔ اور اُن سے وہ کام نہ لو جس کی ان کو طاقت نہ ہو۔ اگر طاقت سے زیادہ کام لو تو ان کی مدد کر دو۔ (رواہ البخاری ص ۳۴۶)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے غلام کو ایسے عمل پر سزا دی جو عمل اس نے نہیں کیا تھا یا اُسے طمانچہ مار دیا تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ اُس کو آزاد کر دے۔ (رواہ مسلم ص ۵۱ ج ۲)

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے مملوک کے ساتھ بُری طرح پیش آتا ہو۔ (رواہ الترمذی باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض الوفاۃ میں یہ وصیت فرماتے رہے کہ نمازوں کا اہتمام کرنا اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کرنا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ص ۲۹۱) مسلمانوں میں شرعی جہاد نہیں رہا تو غلاموں اور باندیوں کی نعمت سے بھی محروم ہو گئے اللہ وہ دن لائے کہ شرعی جہاد ہوں اور کافر قیدی بھی آئیں اور غلام اور باندیاں بنیں۔

تکبر کی مذمت ...... پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (کہ بلاشک اللہ دوست نہیں رکھتا اس شخص کو جو اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور شیخی کی باتیں کرے) آیت کے اس جز میں ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو حقیر جانتے ہیں فخر، کبر اور نخوت کے نشے میں بھرے رہتے ہیں یہ مضمون سورۂ لقمان میں اور سورۃ الحدید میں بھی بیان فرمایا ہے لفظ مختال، خیلا سے ماخوذ ہے اور باب افتعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ لفظ اپنے کو بڑا سمجھنے، اترانے، آپے میں پھولے نہ سمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اپنے کو بڑا سمجھنا یہ دل کا بہت بڑا روگ ہے اور اکثر گناہ اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔ شہرت کا طالب ہونا، اعمال میں ریاکاری کرنا، بیاہ

شادی میں دنیاداری کی رسمیں برتنا اور یہ خیال کرنا کہ ایسا نہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے، یہ سب تکبر کے شعبے ہیں۔

ٹخنے سے نیچے کپڑا پہننا تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جو شخص تکبر کرتے ہوئے اپنا کپڑا گھسیٹ کر چلا۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے نہ دیکھے گا۔ (رواہ البخاری ص ۸۶۱)

حضرت ابوسعید خدریؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مؤمن کا تہمد آدھی پنڈلیوں تک ہونا چاہیئے (اور) اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں کہ آدھی پنڈلیوں اور ٹخنوں کے درمیان ہو اور جو اس کے نیچے ہو وہ دوزخ میں لے جانے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا۔ جس نے اپنا تہمد اتراتے ہوئے گھسیٹا۔ (رواہ ابوداؤد ص ۲۱۰ ج ۲) کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کا گناہ صرف تہمد ہی میں نہیں، بلکہ دوسرے کپڑوں میں بھی ہے۔ کرتا، عمامہ، پائجامہ کو اگر کوئی ٹخنوں سے نیچے لٹکالے تو یہ بھی اس ممانعت میں شامل ہے۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الاسبال فی الازار والقمیص والعمامۃ من جرَّ منھا شیئا خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ. (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمد، قمیض اور پگڑی کو لٹکانے کے بارے میں فرمایا جس نے ان میں سے کسی کو تکبر کے طور پر لٹکایا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں فرمائے گا) (رواہ ابوداؤد ص ۲۱۰ ج ۲)

حضرت جابر بن سلیمؓ کو آنحضرت ﷺ نے جو نصیحتیں فرمائیں ان میں سے یہ بھی ہے۔ اِیَّاکَ وَاِسْبَالَ الازار فَاِنَّھَا مِنَ الْمَخِیْلَۃِ وَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُخِیْلَۃَ (کہ تہمد کو لٹکانے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ تکبر پسند نہیں فرماتا۔ (رواہ ابوداؤد ص ۲۰۸ ج ۲)

آنحضرت سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّھَا مِنَ الْمُخِیْلَۃِ فرما کر ان لوگوں کی بات کی تردید فرمادی جو ٹخنوں سے نیچا کپڑا پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تکبر کی وجہ سے نہیں پہنتے، جو لوگ ٹخنوں سے نیچا کپڑا پہنتے ہیں اگر اونچا کپڑا پہن لیں تو اس میں اپنی اہانت سمجھتے ہیں اور جو لوگ اونچا کپڑا پہنتے ہیں ان کو حقیر جانتے ہیں یہی تو تکبر ہے یہ لوگ کسی بھی طرح آدھی پنڈلی تک تہمد باندھ کر بازار میں جا کر دکھادیں دیکھو نفس گوارا کرتا ہے یا نہیں؟ اس سے پتہ چل جائے گا کہ ٹخنوں سے نیچا پہننا تکبر کے لئے ہے یا نہیں؟ سابقہ اُمتوں میں سے ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ تکبر سے اپنے تہمد کو گھسیٹتا ہوا جا رہا تھا لہٰذا اُس کو زمین میں دھنسا دیا گیا۔ وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ (رواہ البخاری ص ۸۶۱ ج ۲)

تکبر کے چند شعبے...... ناحق پر اصرار کرنا حق کو ٹھکرانا، غلط بات کہہ کر غلطی واضح ہو جانے پر حق قبول نہ کرنا۔ شریعت پر چلنے میں خفت محسوس کرنا۔ گناہوں کو اس لئے نہ چھوڑنا کہ معاشرہ والے کیا کہیں گے۔ یہ سب تکبر سے پیدا ہونے والی چیزیں ہیں۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! ایک آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، جوتا اچھا ہو (کیا یہ تکبر ہے؟) فرمایا۔ اللہ جل شانہٗ جمیل ہے جمال کو پسند فرماتا ہے، تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرائے اور لوگوں کو حقیر جانے۔ (رواہ مسلم ص ۶۵ ج ۱) مختال کی مذمت کے ساتھ فخور کی مذمت بھی فرمائی ہے۔ لفظ فخور فخر سے ماخوذ ہے شیخی بگھارنا اپنی جھوٹی سچی تعریفیں کرنا، ان سب کو فخر شامل ہے بہت سے لوگوں میں یہ مرض ہوتا ہے کہ مال یا علم یا عہدہ کی وجہ سے نشہ میں چُور رہتے ہیں۔ شیخی بگھارتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ ان کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ ان کے پاس جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کو دیا ہے۔ اور وہ اللہ کے عاجز بندے ہیں۔ جو کچھ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہیں اس انداز میں لوگوں کے سامنے ان کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے ان کے حاصل ہونے میں ان کا کمال شامل ہے اور جن کے پاس وہ چیزیں نہیں ان سے اپنے کو بلند اور برتر سمجھتے ہیں اور اپنے خالق و مالک کو بھول جاتے ہیں، اُس نے جس کو دیا ہے اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اور جس کو نہیں دیا اس

میں اُس کی حکمت ہے، بندہ کا مقام یہ ہے کہ اپنے کو عاجز سمجھے اور شکر گذار رہے۔ اور اللہ کے دوسرے بندوں کو حقیر نہ سمجھے۔

صاحب روح المعانی نے مذکورہ بالا احکام ذکر کرنے کے بعد متصلاً تکبر، فخر ومباہات کی مذمت بیان کرنے کا ارتباط ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے ای ذا خیلاء و کبر یانف من جیرانه مثلاً واقاربه ولا یلتفت الیهم یعد مناقبه علیهم تطاولاً و تعاظمًا والجملة تعلیل للامر السابق۔ مطلب یہ ہے کہ تکبر وغرور اور شیخی والا اپنے عزیزوں پڑوسیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اُن کے مقابلہ میں اپنی فضیلتیں شمار کرتا ہے اور اس تکبر وفخر کی وجہ سے حسن سلوک سے متعلق جو احکام ہیں اُن پر عمل نہیں کرتا۔ صاحب روح المعانی نے ٹھیک فرمایا جن لوگوں میں اپنی بڑائی اور برتری کا دھیان ہوتا ہے۔ وہ اعزہ واقربا پڑوسیوں کی مدد تو کیا کرتے ان کی تو خواہش یہی رہتی ہے کہ یہ لوگ حاجت مند غریب اور فقیر ہی رہیں تاکہ ہماری برابری نہ کرسکیں۔ اگر ایک بھائی پیسے والا ہے تو غریب بھائی کے گھر آنا جانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور اس میں خفت وبے آبروئی محسوس کرتا ہے۔ یہ جذبۂ تکبر صلہ رحمی سے مانع رہتا ہے۔

بخل کی مذمت...... پھر فرمایا اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (یعنی یہ لوگ ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اس کو چھپاتے ہیں) اس میں بھی ان لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے جن کا اوپر تذکرہ ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ متکبر ہیں، فخر کرنے والے ہیں اور کنجوس بھی ہیں، اور صرف خود ہی کنجوس نہیں بلکہ دوسروں کو بھی کنجوسی کا حکم دیتے ہیں۔ خود تو اعزہ واقرباء ضعفاء یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرتے ہی نہیں دوسروں کو بھی خرچ نہیں کرنے دیتے۔ جن لوگوں کا مزاج اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا نہیں ہوتا۔ انہیں دوسروں کا خرچ کرنا بھی کھلتا ہے۔ مال کی محبت اس درجہ دل میں بیٹھ جاتی ہے کہ دوسروں کا خرچ کرنا بھی نفسوں کو ناگوار اور شاق ہوتا ہے۔

سورۃ الفجر میں فرمایا كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (کہ تم لوگ یتیم کا اکرام نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو)

کنجوسی کرنے والے مال کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے نہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں نہ اُس کی مخلوق پر خرچ کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ مال کس نے دیا ہے؟ مال صرف اللہ نے دیا ہے۔ اور وہ بھی اپنے فضل سے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ خوب بڑھ چڑھ کر اللہ کی رضامندی کے کاموں میں خرچ کرتے رہیں۔

پھر فرمایا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا (کہ ہم نے کافروں کے لئے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے) صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہاں کفر سے کفرانِ نعمت یعنی ناشکری کے معنیٰ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اور کافر بمعنی معروف بھی مراد ہوسکتا ہے۔ پھر آیت کا سببِ نزول بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہودی انصار کے پاس آتے تھے اور اُن سے خیر خواہانہ طور پر کہتے تھے کہ تم لوگ اپنے مال کو خرچ نہ کرو ہمیں ڈر ہے کہ تمہارے مال ختم ہوجائیں۔ اگر اخراجات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوگے تو نہ جانے آگے کیا ہوگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ سے وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِیْمًا تک آیت نازل فرمائی۔ اگر سبب نزول کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو کافروں سے کفر کا معنی معروف ہی مراد ہوگا۔

ریاکاری کے طور پر مال خرچ کرنے کی مذمت...... پھر فرمایا وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (اور جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور آخرت کے دن پر) یہ

بھی مُخْتَالًا فَخُوْرًا کی صفت ہے۔ درمیان میں بطور جملہ معترضہ کافروں کے لئے عذابِ مہین کا تذکرہ فرما دیا اس میں یہ بتایا کہ یہ تکبر اور فخر کے متوالے اللہ کی رضا کے کاموں میں تو خرچ نہیں کرتے البتہ لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ دنیا دار کو جاہ و شہرت مطلوب ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میری تعریف ہو اور لوگوں پر میری مالداری ظاہر ہو۔ اسی لئے اہلِ دنیا اللہ کی رضا کے کاموں میں مال خرچ کرنے سے جان چراتے ہیں۔ ان لوگوں کی مذمت فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے۔ اللہ پر ایمان لاتے تو اس سے ثواب لینے کی اُمید رکھتے اور عذاب سے ڈرتے اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے (جہاں اعمال کی جزا ملتی ہے) تو اپنی زندگی کو درست کرتے۔

آخیر میں فرمایا: وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا (یعنی اور شیطان جس کا ساتھی ہو سو وہ بُرا ساتھی ہے) صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہاں الشیطان سے ابلیس اور اس کے مددگار جو اس کے قبیلہ سے ہیں اور وہ لوگ جو اس کی باتوں پر چلتے ہیں یہ سب مراد ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ نفسانی قوتیں اور خواہشیں اور شیاطین الانس والجن بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ شیطان کو بُرا ساتھی اس لئے بتایا کہ ہمیشہ گناہوں کی طرف بلاتا ہے اور گناہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور گناہ دوزخ میں داخل ہونے کا سبب ہے۔

پھر فرمایا وَمَاذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (الآیۃ) (یعنی یہ لوگ جو کفر میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کے منکر ہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ نہیں کرتے ان پر کیا وبال آ جائے اور کیا ضرر لاحق ہو جائے اگر ایمان لائیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کریں) یہ سوال بطور استفہام انکاری کے ہے۔ بطور زجر و توبیخ یہ سوال کیا ہے اور اُن کی توجہ دلائی ہے کہ اپنے طرزِ زندگی کے بارے میں فکر مند ہوں اور نفع و نقصان کے بارے میں سوچیں۔ اگر غور کریں گے تو اُن پر واضح ہو جائے گا کہ اُن کا طریقہ غلط ہے اور جو اہلِ ایمان کا طریقہ ہے اسی کو اختیار کرنا لازم ہے اسی میں ان کا بھلا ہے اور اس کی مخالفت میں ضرر ہے اور وبال ہے۔ قال صاحب الروح (ص۳۱ ج۵) بل المراد توبیخُهُمْ عَلَى الْجَهْلِ بِمَكَانِ الْمنفعة وَالْاِعْتِقَادِ فِي الشَّيْءِ عَلٰى خِلَافِ مَا هُوَ عَلَيْهِ وَتَحْرِيْضُهُمْ عَلٰى صَرْفِ الْفِكْرِ لتحصيل الجَوَابِ لَعَلَّهُ يُؤَدِّي بِهِمْ اِلَى الْعِلْمِ الخ۔

اللہ تعالیٰ ذرّہ بھر بھی ظلم نہ کرے گا...... پھر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں فرماتا) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نافرمانی کے بغیر عذاب نہیں دے گا اور کسی کی کوئی نیکی ضائع نہیں فرمائے گا۔ اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہو گی اس کا ثواب بھی عطا فرمائے گا بلکہ وہ اس نیکی کو چند در چند بڑھا دے گا اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ ایک نیکی کم از کم دس نیکی کے برابر تو کر دی ہی جاتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ انعام وغیرہ میں فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور اس کے بعد سات سو تک اور سات لاکھ تک اور اس سے بھی بڑھ کر جہاں تک اللہ چاہے ایک نیکی کا ثواب عطا کر دیا جاتا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھ کر دیکھے اور گناہ چھوڑے نیکیوں میں لگے پھر دیکھے کیسا مالا مال ہوتا ہے۔ حقیر دُنیا چونکہ نظر کے سامنے ہے اس لئے اس کے لئے گناہ بھی کر لیتے ہیں۔ اور نیکیوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ جعلنا الله من السابقين الى الخيرات و المبادرين الى الحسنات۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

پس کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان پر گواہ بنائیں گے۔

وقف النبی ﷺ

قیامت کے دن ہر امت کے ساتھ ایک گواہ ہوگا

اس آیت میں میدانِ آخرت کا ایک منظر بتایا ہے کہ قیامت کے دن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں کے ساتھ آئیں گے اور ہر نبی اپنی اپنی امت کے بارے میں گواہی دے گا کہ یہ لوگ عقائد و اعمال کے لحاظ سے ایسے ایسے تھے ان لوگوں کی گواہیوں پر حضرت خاتم الانبیاء سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں گے کہ یہ حضرات سچ فرما رہے ہیں اور ان کی گواہی صحیح ہے۔ سورۂ بقرہ میں لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی امتیں جب منکر ہو جائیں گی کہ کسی نے ہم کو تبلیغ نہیں کی تو امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں گواہی دے گی کہ واقعی ان حضرات نے تبلیغ کی تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں گے کہ میری امت کی گواہی صحیح ہے اور یہ گواہی دینے کے لائق ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ میں نے عرض کیا، کیا آپ کے سامنے تلاوت کروں حالانکہ آپ پر تو نازل ہی ہوا ہے آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ کسی دوسرے سے سنوں اس پر میں نے سورۂ نساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۢ بِشَهِيْدٍ تو آپؐ نے فرمایا کہ بس کرو۔ میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (رواہ البخاری ص ۶۵۹ ج ۲)

یہ حدیث نقل کر کے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ جب شاہد کا یہ حال ہے کہ اس شہادت کے استحضار سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تو مشہود علیہ یعنی اُس کا کیا حال ہوگا جس کے خلاف یہ گواہی ہوگی اور جسے یوم قیامت کے مصائب نے گھیر رکھا ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

جس دن وہ لوگ آرزو کریں گے جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی کہ کاش! ان پر زمین برابر کر دی جاتی اور یہ لوگ اللہ سے کوئی بات بھی نہ چھپائیں گے۔

قیامت کے دن کافروں کی آرزو کہ کاش زمین کا پیوند ہو جاتے

گذشتہ آیت میں جس دن کی گواہی کا ذکر ہے اس دن کی مصیبت اور شدت اور بدحالی اس آیت میں بیان فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ جس دن یہ گواہیاں ہوں گی اس دن کفار اور وہ لوگ جنہوں نے رسولوں کی نافرمانی کی (علی ارادۃ الجنس) اس بات کی تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! ہم آج کے دن دفن کر دیئے جاتے اور زمین کا پیوند بنا دیئے جاتے اور جس عذاب اور مصیبت میں مبتلا ہیں اس سے رہائی ہو جاتی۔ اور اس دن اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے خود اپنے اقرار اور اپنے اعضاء و جوارح کے اقرار سے دوزخ میں داخل ہوں گے اُس دن حالات مختلف ہوں گے۔ کبھی تو پوشیدہ رکھیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (کہ قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے

ہم شرک کرنے والے نہ تھے) لیکن پھر اعضاء اور جوارح کی گواہیوں کے بعد اپنی نافرمانیوں کا اقرار کریں گے اس وقت یہ کہیں گے کہ ہائے کاش! ہم زمین کا پیوند بنا دیئے جاتے۔ (من روح المعانی ص ۳۵ ج ۵)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا

اے ایمان والو! اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جان لو کہ کیا کہہ رہے ہو، اور نہ اس حالت میں نماز

اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ

کے پاس جاؤ جبکہ تم پر غسل فرض ہو، مگر یہ کہ راستہ گذرنے والے ہو یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ اگر تم مریض ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کی

الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ

جگہ سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر پانی نہ پاؤ تو ارادہ کرو پاک مٹی کا، سو مسح کر لو اپنے چہروں کا

وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اور ہاتھوں کا بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا مغفرت فرمانے والا ہے۔

حالتِ نشہ میں نماز پڑھنے کی ممانعت

اس آیت شریفہ میں اوّلاً تو یہ فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ، اگر کوئی حالتِ نشہ میں ہو تو اس وقت تک نماز نہ پڑھے جب تک کہ ہوش نہ آجائے اور یہ نہ جان لے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ابتداءِ اسلام میں جب تک شراب پینا حرام قرار نہیں دیا گیا تھا اس عرصہ میں ایک واقعہ پیش آیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کھانا تیار کیا اور ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا، کھانا کھلایا اور شراب بھی پلا دی۔ شراب نے اپنا اثر دکھایا پینے والوں کو نشہ آ گیا اور اُسی وقت نماز کا وقت ہو گیا حاضرین نے مجھے امامت کے لئے آگے بڑھا دیا۔ میں نے قُلْ يَآ اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ پڑھی جس میں وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ دیا (جس سے مفہوم بدل گیا اور معنی اُلٹ گیا) اس پر اللہ جل شانہٗ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو جب تک یہ نہ جان لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو (اخرجه الترمذی فی تفسیر سورة النسآء قال حسن غریب صحیح) اس کے بعد قطعی طور پر شراب بالکل حرام کر دی گئی جس کا ذکر سورۂ مائدہ کی اس آیت میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ (الآیۃ)۔

لباب النقول میں دوسرا سبب نزول یوں نقل کیا ہے کہ حضرت اسلع بن شریکؓ نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا کجاوہ باندھا کرتا تھا۔ ایک رات مجھ پر غسل فرض ہو گیا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے موت یا مرض کا اندیشہ ہو گیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى (آخر تک) نازل فرمائی۔ (جس میں تیمّم کی بھی اجازت دی گئی ہے)

تیمّم کے مسائل ...... یہ پہلی آیت ہے جس میں تیمّم کرنے کی اجازت مذکور ہے۔ دوسری آیت تیمّم سورۂ مائدہ میں ہے جو دوسرے

رکوع کی ابتداء میں ہے اس آیت میں وضو کا طریقہ بھی بتایا ہے اور تیمّم کا طریقہ بھی۔ دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں یا مریض یا مسافر ہونے کی حالت میں حدثِ اکبر اور حدثِ اصغر دونوں سے پاک ہونے کے لئے تیمّم کرنا درست ہے، غسل فرض ہو جائے تو اس کو حدثِ اکبر، اور وضو ٹوٹ جائے تو اسے حدثِ اصغر کہا جاتا ہے اور دونوں آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدثِ اکبر یا حدثِ اصغر کے ہوتے ہوئے نماز پڑھنا ممنوع ہے اور چونکہ تیمّم کی اجازت دے دی گئی ہے اس لئے پانی نہ ہونے کا عذر بنا کر نماز چھوڑ دینا جائز نہیں ہے، جیسے حدثِ اکبر یا حدثِ اصغر ہوتے ہوئے نماز پڑھنا حرام ہے اس طرح سے نماز کو قصداً و عمداً اس وقت سے مؤخر کر دینا بھی حرام ہے۔ لفظ وَلَا جُنُبًا میں غسل فرض ہونے کی حالت بیان فرمائی ہے اور اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ میں حدثِ اصغر کی حالت بیان فرمائی ہے۔ اَلْغَآئِطُ نشیبی زمین کو کہتے ہیں جس میں قضائے حاجت کے لئے جاتے ہیں۔ لفظ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے حضرت علیؓ و حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک حدثِ اکبر کی حالت بیان کرنا مقصود ہے لٰمَسْتُمْ کا اصل معنی چھونے کا ہے لیکن ان حضرات نے اس کو بطور کنایہ جَامَعْتُمُ کے معنی میں لیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو اپنے حقیقی معنی پر رکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ عورت کو بغیر حائل کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور بعض دیگر حضرات کا بھی یہی مذہب ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور لٰمَسْتُمْ، جَامَعْتُمْ کے معنی میں ہے جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا۔

حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھتے رہتے تھے اور میں آپؐ کے سامنے جنازہ کی طرح لیٹی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ آپؐ وتر پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو میرے پاؤں کو ہاتھ لگا دیتے تھے۔ (رواہ النسائی ص ۳۸)

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، جب حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا تو آیت شریفہ میں جو اَوْ لٰمَسْتُمْ وارد ہوا ہے اس کا معنی جَامَعْتُمْ متعین ہو گیا۔ تین صورتوں میں تیمّم کرنے کی اجازت معلوم ہوئی اوّل یہ کہ پانی موجود نہ ہو، دوم یہ کہ مریض ہو، سوم یہ کہ مسافر ہو، ان سب کی تفصیلات اور توضیحات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ مختصر طریقہ پر یہ جان لینا چاہیئے کہ پانی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نمازی جہاں بیٹھا یا لیٹا ہے اسی جگہ پانی موجود ہو۔ قریب میں اگر پانی ہو تو پانی کا طلب کرنا اور وضو کرنا لازم ہے۔ گھر میں یا بستی میں عموماً پانی ہوتا ہے۔ کنوئیں ہوتے ہیں نل ہوتے ہیں۔ عام طور سے قیمۃً یا بلا قیمت پانی مل جاتا ہے۔ ان صورتوں میں پانی تک پہنچ کر وضو کرے۔ یہ سمجھ کر کہ میرے گھر میں پانی نہیں ہے غسل یا وضو کی جگہ تیمّم کرنا درست نہیں ہے اگر کنوئیں پر کھڑا ہے لیکن ڈول رسی نہیں ہے تو تیمّم کر سکتا ہے۔ اگر پانی کہیں بھی نہیں ہے تو مجبوراً تیمّم کرنا ہی لازم ہوگا۔ مریض کو بھی تیمّم کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن ہر مریض کو نہیں، بعض امراض تو ایسے ہوتے ہیں جن میں پانی کا استعمال مضر ہوتا ہی نہیں۔ بلکہ مفید ہوتا ہے۔ سخت سردی ہو یا پانی بہت ٹھنڈا ہو گرم کرنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ سخت مریض ہو جانے کا یا مرض بڑھ جانے یا کسی عضو یا جان کے تلف ہو جانے کا غالب اندیشہ ہو تو تیمّم کرے۔ اسی طرح کوئی شخص سفر میں ہے اور پانی موجود نہیں ہے تو وہ بھی تیمّم کرے۔ اس میں کچھ تفصیل ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے مثلاً آس پاس قریب میں پانی ہو تو تلاش کرے اپنے ساتھیوں سے طلب کرے اگر پانی قیمۃً مل جاتا ہو اور مناسب قیمت پر یا کچھ زیادہ قیمت میں ملتا ہو تو حسب ضرورت پانی خرید کر غسل یا وضو کرے۔ تیمّم امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے انبیاء کرام علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی۔ اوّل مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے۔ دوم رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی (کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں میں

میرا رعب ڈال دیا جس کی وجہ سے حملہ آور ہونے سے ڈرتے ہیں)۔ سوم میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا (جو کافروں سے جنگ کے موقع پر ہاتھ لگتا ہے) چہارم ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ یعنی نماز پڑھنے کی جگہ بنا دی گئی اور ساری زمین میرے لئے پاک کرنے والی بنا دی گئی (کیونکہ اگر پاک مٹی سے تیمّم کر لیا جائے جبکہ شرائط تیمّم متحقق ہوں تو اس سے وہی پاکی حاصل ہوتی ہے جو وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے) پنجم میں ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں (آپ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام خاص اپنی قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے)۔ ششم انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد میری آمد پر ختم کر دی گئی اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۲)

اس حدیث میں فضیلت والی چھ چیزوں کا ذکر ہے، دوسری احادیث میں اور بہت سے فضائل مذکور ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پاک مٹی مسلمان کو پاک کرنے والی ہے۔ اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے۔ پس جب پانی مل جائے تو اُسے استعمال کرے۔ (رواہ الترمذی)

تیمّم کا طریقہ ...... پھر تیمّم کرنے کا طریقہ بتایا اور فرمایا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ (پس مسح کرو اپنے چہروں اور ہاتھوں کا) سورۂ مائدہ میں اس کے آگے لفظ مِنْهُ بھی ہے یعنی مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ احادیث شریفہ میں وارد ہوا ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر ایک مرتبہ پورے چہرہ کا مسح کیا جائے اور پھر دوسری دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں کا مسح کہنیوں تک کر لیا جائے یعنی جہاں تک وضو میں ہاتھوں کو دھویا جاتا ہے وہاں تک دونوں ہاتھوں کا مسح کیا جائے۔ تیمّم میں نیت بھی شرط ہے اگر کسی نے کوئی عمارت گرائی اس سے چہرہ اور ہاتھ مٹی میں بھر گئے تو اس سے تیمّم نہ ہوگا۔

پھر آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے) وہ بخشتا اور معاف کرتا ہے اس نے احکام میں آسانی بھی دی ہے پانی نہ ہونے یا مسافر و مریض ہونے کی حالت میں تیمّم کو مطہر بنا دیا اور حدثِ اکبر و حدثِ اصغر دونوں کے لئے تیمّم کا طریقہ مشروع فرما دیا جو ایک ہی طریقہ ہے دونوں کے تیمّم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا

کیا تو نے اُن لوگوں کو دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور یہ ارادہ کرتے ہیں کہ تم

السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ

راہ سے بھٹک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جاننے والا ہے اور اللہ کافی ہے ولی ہونے کے اعتبار سے اور اللہ کافی ہے مددگار ہونے کے اعتبار سے۔ جو لوگ

هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ

یہودی ہیں ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کلمات کی تحریف کرتے ہیں ان کی جگہوں سے اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور نہیں مانیں گے اور کہتے ہیں کہ سُن لے

وَّرَاعِنَا لَيًّا ۢ بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ

اس حال میں کہ تو سننے والا نہ ہو، اور اپنی زبانوں کو موڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے۔ لفظ رَاعِنَا کہتے ہیں اور اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا

وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اور آپ سن لیجئے اور ہم پر نظر فرمائیے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا اور لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے سے آدمی۔

یہودیوں کی شرارت اور شقاوت

تفسیر درمنثور ص ۱۶۸ ج ۲ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رفاعہ بن زید یہودیوں کا ایک چودھری تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تو اپنی زبان موڑ کر بات کرتا پھر اس نے اسلام میں طعنہ زنی شروع کر دی اور احکام اسلام میں عیب نکالنے لگا اس پر یہ آیت شریفہ اِلَّا قَلِيْلًا تک نازل ہوئی۔ یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے توراۃ کا علم دیا تھا باوجودیکہ اس میں تحریف کر لی تھی۔ پھر بھی اس میں آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت و رسالت کا ذکر موجود تھا۔ ہر قوم کے چھوٹے اپنے بڑوں کے پیچھے لگتے ہیں۔ یہودیوں کے علماء اور زعماء حق جانتے ہوئے نہ اسلام کی طرف آتے تھے اور نہ عوام کو اس کی طرف آنے دیتے تھے، ہدایت کی جگہ گمراہی اختیار کی، اپنی قوم کو بھی کفر پر جمایا اور مسلمانوں کو بھی اسلام سے ہٹانا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمایا کہ اللہ کو تمہارے دشمنوں کا خوب علم ہے اور تمہاری مدد کے لئے کافی ہے۔

یہودی آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو زبان موڑ کر بات کرتے تھے۔ ایسے الفاظ بولتے تھے جن کا ظاہری معنی کچھ اور ہوتا تھا اور دل سے دوسرے معنی لیتے تھے ان الفاظ میں سے لفظ رَاعِنَا بھی تھا۔ جس کا معنی عربی میں تو یہ ہے کہ ہماری رعایت فرمائیں اور ان کی زبان میں یہ لفظ موت کی بددعا کے لئے بولا جاتا تھا۔ جس کی تشریح سورۂ بقرہ کے رکوع نمبر ۱۳ میں آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا کے ذیل میں گذر چکی ہے۔ اس آیت شریفہ میں بھی ان لوگوں کی اس حرکتِ بد کا تذکرہ فرمایا ہے وہ بات سنتے تھے ساتھ ہی عَصَيْنَا بھی کہتے تھے کہ ہم فرمانبرداری نہیں کریں گے اس بات کو نہیں مانیں گے (یہ تو ان کا مطلب دل میں تھا اور ظاہری مطلب یہ تھا کہ آپ کے خلاف کسی کی بات نہ مانیں گے) اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اِسْمَعْ کہتے تھے تو ساتھ ہی غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی لگا دیتے تھے۔ صاحب روح المعانی ص ۷۴ ج ۵ لکھتے ہیں کہ اس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک معنی شر کا ہے اور وہ یہ کہ تم سننے والے نہ رہو جس کا مقصد قوت سامعہ ختم ہو جانے کی بددعا دینا تھا۔ اور یہی ان لوگوں کا مقصود تھا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ آپ کو کوئی مکروہ بات سننا نہ پڑے۔ یہودی ملعون قوم ہے وہ بطور استہزاء یہ لفظ بولتے تھے تاکہ ظاہر میں کچھ اور سمجھا جائے اور اپنے دلوں میں وہ اپنی نیت کے مطابق معنی لیتے رہے۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا) کہتے اور اِسْمَعْ (سن لیجئے) کہتے اور ساتھ ہی غَيْرَ مُسْمَعٍ کا لفظ نہ ملاتے اور اُنْظُرْنَا (ہماری طرف توجہ فرمائیے) کہتے (اور رَاعِنَا نہ کہتے) تو اُن کے لئے اچھا تھا اور ٹھیک تھا۔ انہوں نے بیہودگی اختیار کی۔ اللہ پاک نے اُن کے کفر کے سبب ان کو ملعون قرار دے دیا۔ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے ہاں ان میں سے تھوڑے سے آدمی ایمان لائیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ

اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا جو اُس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اس سے پہلے کہ

اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ

ہم چہروں کو مٹا دیں پھر ان کو اُلٹی جانب کی طرح بنا دیں یا ان پر لعنت کردیں جیسا کہ ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت کی،

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔

یہود کا ملعون ہونا

درمنثور ص ۱۶۸ ج ۲ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤساءِ یہود سے بات کی جن میں عبداللہ بن صوریا اور کعب بن اسد بھی تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ اے یہودیو! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو۔ اللہ کی قسم تم جانتے ہو کہ جو دین میں لے کر آیا ہوں وہ حق ہے، کہنے لگے کہ اے محمدؐ! ہم اس کو نہیں پہچانتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی اور فرمایا کہ اے اہلِ کتاب جو کتاب ہم نے نازل کی ہے اس پر ایمان لاؤ جو کتاب تمہیں دی گئی تھی یعنی توریت شریف یہ کتاب اس کی بھی تصدیق کرتی ہے اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم (سزا کے طور پر) چہروں کو بالکل مٹا دیں اور اُن کو اُلٹی جانب یعنی گدی کی طرح بالکل صفاچٹ بنا دیں۔ ناک آنکھ منہ کچھ بھی نہ رہے۔ یا ہم اُن لوگوں پر لعنت کردیں، جیسا کہ ہم نے سنیچر کے دن زیادتی کرنے والوں پر لعنت کی تھی، یہودیوں کو سنیچر کے دن کی تعظیم کا حکم دیا گیا تھا جس میں یہ بھی تھا کہ اس دن شکار نہ کریں، وہ لوگ نہ مانے نافرمانی کی، تو اُن کو بندر بنا دیا گیا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ رکوع ۸ میں اس کا بیان گذر چکا ہے۔ چونکہ یہ واقعہ یہودیوں کا تھا ان ہی میں پیش آیا تھا اور باپ دادوں سے سنتے چلے آئے تھے۔ اس لئے ان کو یاد دلایا اور بتایا کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ آخر میں فرمایا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کسی امر کا ہو جائے تو وہ ہو کر ہی رہے گا۔ اس کے فیصلہ کو کوئی روک نہیں سکتا۔

آیتِ بالا میں جو طمس الوجوہ (یعنی چہروں کے مسخ) فرمانے کا ذکر ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہ مسخ دنیا میں یہودیوں کے ساتھ ہو چکا ہے، یا آئندہ کبھی ہوگا؟ صاحب روح المعانی نے اس کے بارے میں دو صفحے خرچ کئے ہیں اور مفسرین کے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ واقعہ پیش نہیں ہوا کیونکہ اس کے بعد بعض یہود مسلمان ہو گئے تھے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے پہلے یہ واقعہ پیش آئے گا اور یہودیوں میں مسخ ہوگا۔ بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ دو چیزوں کا ذکر تھا۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ اس میں حرف عطف اَوْ استعمال فرمایا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ چہرے مسخ کر دینا یا لعنت کر دینا دونوں میں سے ایک ہوگا جب یہود پر لعنت ہو گئی تو دونوں میں سے ایک چیز وجود میں آ گئی اور وعید پوری ہو گئی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ آخرت میں مسخ کرنا مراد ہے۔

لیکن حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ایمان نہ لاؤ گے تو مسخ ضرور ہوگا۔ بلکہ بطور احتمال ایک سزا کا ذکر فرمایا ہے اس کے وہ مستحق تو ہیں اللہ کو اختیار ہے کہ عذاب دے نہ دے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے بخش دے گا اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے

فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

تو اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

شرک بہت بڑا گناہ ہے اور مشرک کی بخشش نہیں ہوگی

اس آیت میں اس بات کا واضح طور پر اعلان فرمادیا کہ شرک کرنے والا جو بغیر ایمان لائے مَر جائے اس کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور شرک کے علاوہ دوسرے جو گناہ ہیں اللہ جن کو چاہے گا معاف فرمادے گا اور جس گناہ پر چاہے گا عذاب دے گا۔ شرک بہت ہی بڑا جرم ہے۔ پیدا کیا اللہ نے زندہ وہ رکھے، کھانے پینے کو وہ دے، حاجتیں وہ پوری کرے اور عبادت میں یا استعانت میں یا ایسی تعظیم میں جو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے زیبا ہے دوسروں کو شریک کرلیا جائے عقلی طور پر بھی یہ بہت بڑی حماقت ہے اور سفاہت ہے اور ناانصافی ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ توحید کا حکم فرمایا صرف اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک اور رب سمجھیں اور صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کریں، شرک کی جگہ جگہ مختلف عنوانات سے تردید فرمائی ہے اور مشرکین کی بے عقلی پر تنبیہ فرمائی۔ دنیا میں کوئی شخص کسی چیز کا مالک ہو اور دوسرے لوگ کسی شخص کے بارے میں کہنے لگیں کہ وہ بھی اس میں شریک ہے تو مالک کو کتنا ناگوار ہوتا ہے حالانکہ وہ صرف مالک مجازی ہے، نہ مالک حقیقی ہے نہ خالق ہے پھر بھی اسے دوسرے کی شرکت کا تصور ناگوار ہوتا ہے جن کو مشرکین اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اور وہ خود اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ وہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اُن کو موت بھی آتی ہے ٹوٹتے پھوٹتے بھی ہیں۔ کھاتے پیتے بھی ہیں، عاجز محض ہیں اُن کو خدائی کا درجہ دینا نہایت ہی حماقت کی بات ہے اور خالقِ کائنات جل مجدہٗ کی ناراضگی کا باعث ہے جو بھی کوئی شخص حالتِ شرک میں مرے گا ہمیشہ کے لئے دوزخ کے عذاب میں داخل ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں جیسے مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بتاتے تھے اور جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بتاتے ہیں اور جیسے یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ سب شرک ہے

مشرکوں کے علاوہ دوسرے کافروں کی بھی بخشش نہ ہوگی...... مشرک کے علاوہ اور جو کفر کی دوسری صورتیں ہیں جو شخص ان کا مرتکب ہوگا وہ بھی ہمیشہ کے لئے دوزخ کے عذاب میں داخل ہوگا۔ جس کی تصریح قرآن مجید کی دوسری آیات میں وارد ہوئی ہے۔ سورۂ احزاب میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا. خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا. (بے شک اللہ نے لعنت کی کافروں پر اور اُن کے لئے تیار کی ہے دہکتی ہوئی آگ، اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، نہیں پائیں گے کوئی دوست اور مددگار)

سورۂ نساء میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (جو لوگ کافر ہوئے اور ظلم کیا ہرگز اللہ ان کو بخشنے والا نہیں اور نہ دکھلائے گا ان کو کوئی راہ مگر دوزخ کی راہ، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے)۔

خدا تعالیٰ شانہٗ کے وجود کے منکر دہریے اور اسلام کے منکرین اور خدا تعالیٰ پر اعتراض کرنے والے قرآن کے منکر اور ارکانِ اسلام

کے منکر قرآن وسنت کا مذاق بنانے والے ختم نبوت کے منکر اور ہر اس بات کے منکر جو قطعی الثبوت ہو یہ سب کافر ہیں، مشرک اور کافر بھی ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی جانوں کو پاکیزہ بتاتے ہیں، بلکہ اللہ جس کو چاہے پاکیزہ بناتا ہے اور لوگوں پر کھجور کی گٹھلی کے تاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع

دیکھو کہ یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں اور اُن کا یہ افتراء صریح گناہ ہونے کیلئے کافی ہے۔

یہودیوں کی مذمت جو اپنے کو پاکیزہ بتاتے تھے

گذشتہ آیت میں یہودیوں کی بعض بدحرکتوں کا ذکر تھا۔ اس میں بھی اُن کے ایک فعل بد کا ذکر ہے۔ صاحب روح المعانی بحوالہ ابن جریر حضرت حسن سے نقل فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود ونصاریٰ دونوں فریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ اُن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب بندے ہیں) اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو یہودی ہو یا نصرانی ہو) اس طرح انہوں نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کیا یعنی اپنے کو نیک اور صالح اور مستحق جنت بتایا اور اللہ کا محبوب ہونے کا دعویٰ کیا۔ باوجود کفر میں مبتلا ہونے کے اپنے نفسوں کی تعریف کی اور اپنے کو اچھا بتایا۔ اور اپنے بارے میں عقیدہ بھی اچھا رکھا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ اے مخاطب کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی جانوں کا تزکیہ کرتے ہیں یعنی اپنے کو پاک بتاتے ہیں، حالانکہ وہ پاک نہیں ہیں، خود اپنی تعریف کرنے سے انسان نہ پاک ہوتا ہے اور نہ مستحق نجات ہوتا ہے خود اپنا تزکیہ حماقت ہے بلکہ وبال ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ کو سب کے عقائد اور اعمال کی خبر ہے اور انجام کی بھی خبر ہے وہ جس کا تزکیہ فرمائے وہی پاک ہے جو لوگ کفر میں مبتلا ہوتے ہیں اپنے کو پاکباز بتارہے ہیں اللہ تعالیٰ شانہٗ اِن کی بدکرداری کی سزا دے گا۔ اور ان کو جو عذاب دیا جائے گا وہ ان کے اعمالِ بد کے اعتبار سے مناسب اور موافق ہوگا ان پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ ایسا نہ ہوگا کہ جتنا جرم کیا ہے اس سے زیادہ سزا دے دی جائے۔

حقیر اور صغیر چیز کی مثال دینے کے لئے اہلِ عرب لفظ نقیر اور فتیل اور قطمیر استعمال کیا کرتے تھے۔ کھجور کی گٹھلی میں جو گڑھا ہے اُسے نقیر اور اس گڑھے میں جو تاگا ہوتا ہے اُسے فتیل اور گٹھلی پر جو ہلکا سا چھلکا ہوتا ہے اُسے قطمیر کہا جاتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے اُن پر ذرا سا بھی ظلم نہ ہوگا یہاں لفظ فتیل استعمال فرمایا ہے۔ اسی سورت کے آئندہ رکوع میں اور چند رکوع کے بعد لفظ نَقِيْرًا آیا ہے اور سورۂ فاطر میں فرمایا ہے مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ (کہ وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی مالک نہیں)۔

پھر فرمایا اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ کہ دیکھ لو یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھتے ہیں ان کا یہ کہنا کہ ہم اللہ کے مقبول بندے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ العیاذ باللہ اللہ کے نزدیک کفر پسندیدہ چیز ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ پر بڑی تہمت ہے۔

پھر فرمایا وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا کہ اُن کا یہ قول سراسر صریح بہتان ہونے کے لئے کافی ہے، اپنے جھوٹے دعوؤں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ رہے ہیں کہ ہم اس کے نزدیک محبوب اور مقبول ہیں۔

تزکیہ نفس کی ضرورت اور اہمیت: اپنے نفس کو رذائل سے اور بُرے اخلاق سے پاک صاف کرنا چاہیے اور یہ بہت مبارک عمل ہے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کارہائے نبوت میں یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے موافق جو شخص اپنے نفس کو رذائل سے اور بُرے اخلاق اور بُرے اعمال سے پاک کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف میں فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (کہ بے شک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہوا) جو لوگ رذائل اور بد اخلاقی میں مبتلا ہیں اُن کا اپنے کو پاکباز بتانا یہ تو دہرا جرم ہے، ہیں بُرے اور بنتے ہیں اچھے۔ لیکن جو لوگ سچ مچ نیک اور صالح ہیں، رذائل سے پاک ہیں اخلاقِ حسنہ سے متصف ہیں اُن کو بھی اپنی تعریف اور تزکیہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کا باعث عموماً تکبر ہوتا ہے۔ سورۂ والنجم میں ارشاد فرمایا فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (سو تم اپنے نفسوں کی پاکیزگی بیان مت کرو اللہ کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے)۔

اپنی تعریف کرنے کی ممانعت...... اگر کوئی شخص عمومی طور پر گناہوں سے اور رذائل سے اور بد اخلاقیوں سے بچتا ہو تب بھی کچھ نہ کچھ خرابی کوتاہی تو باقی رہ ہی جاتی ہے۔ پھر انجام کا پتہ نہیں کہ خاتمہ کس حالت پر ہوگا اس لئے اپنے تزکیہ سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسا نام رکھنا بھی پسند نہیں فرمایا جس سے اپنی تعریف کا پہلو نکلتا ہو۔ حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ نے بیان فرمایا کہ میرا نام برہ (نیک عورت) رکھ دیا گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ارشاد فرمایا کہ اپنی جانوں کو پاکیزہ نہ بتاؤ۔ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم میں نیک کون ہے اس کا نام زینب رکھ دو۔ (رواہ مسلم ص ۲۰۸ ج ۲)

تحدیث بالنعمۃ کی اجازت...... اللہ نے اگر کسی کو اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کی نعمت سے نوازا ہوا اور وہ بطورِ تحدیث بالنعمۃ اپنی اچھی حالت بیان کر دے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن بیان کرتے وقت اپنے باطن کا جائزہ لے لے کہ نفس کہیں دھوکہ تو نہیں دے رہا ہے، تحدیث بالنعمۃ کے پردہ میں اپنی تعریف اور تزکیہ کا کام تو نہیں ہو رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ

کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو، اور کافروں کے

لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ

بارے میں کہتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے ان کی بہ نسبت یہ کافر زیادہ راہِ راست پر ہیں۔ ایسا کہنے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی

اللّٰہُ ؕ وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ نَصِیْرًا ﴿۵۲﴾

اور جس پر اللہ لعنت کر دے تو اس کے لئے کوئی مددگار نہ پائے گا۔

یہودیوں کی جسارت جنہوں نے شرک کو توحید سے افضل بتادیا

لباب النقول ص ۷۱ میں اس آیت کا شانِ نزول بتاتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے علماء اور رؤساء جو قبیلہ بنی نضیر میں سے تھے مکہ معظمہ پہنچے۔ قریش مکہ نے آپس میں کہا کہ یہ لوگ علماءِ یہود ہیں پہلی کتابوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ ان سے دریافت کرو کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین بہتر ہے؟ چنانچہ انہوں نے علماءِ یہود سے دریافت کیا۔ اُن

لوگوں نے (یہ جانتے ہوئے کہ قریش مکہ مشرک ہیں اور دین ابراہیمی کو چھوڑ چکے ہیں اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں واقعی اللہ کے نبی ہیں) جواب میں کہہ دیا کہ تم لوگ محمدؐ سے اور اُن کا اتباع کرنے والوں کی نسبت زیادہ ہدایت پر ہو، اس پر اللہ تعالیٰ نے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتَابِ سے لے کر مُلْکًا عَظِیْمًا تک آیات نازل فرمائیں۔

یہودی یہ جانتے تھے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، وہ آپ کی آمد کے انتظار میں بھی تھے اور جو علامات پہلے سے انہیں معلوم تھیں اُن کے اعتبار سے آپ کو پہچان بھی لیا لیکن چند افراد کے علاوہ یہود کے علماء اور عوام نے اسلام قبول نہ کیا۔ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الْکَافِرِیْنَ اور مشرکین کو بھی انہوں نے یہ بتادیا کہ تم بنسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحابؓ اور اتباع کے زیادہ ہدایت والے ہو۔ نفسانیت اور عناد کا ناس ہو جب یہ دونوں چیزیں کسی کے دل میں جگہ پکڑ لیتی ہیں تو حق اور حقیقت کو دیکھنے ہی نہیں دیتیں، آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہیں دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کے پاس توریت شریف کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام توحید کی دعوت دینے کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ شرک بدترین چیز ہے اس بات کو جانتے ہوئے علماءِ یہود نے مشرکینِ مکہ کو ضد اور عناد میں داعی توحید سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ اور اتباع سے زیادہ ہدایت پر بتادیا۔ جو کچھ علم اُن کے پاس تھا اس کی کچھ لاج نہ رکھی اور جبت اور طاغوت پر ایمان لے آئے۔

جبت اور طاغوت کا معنی...... لفظِ جبت اور طاغوت کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ جبت ایک بت کا نام تھا۔ اس کے بعد وہ ہر معبود باطل کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور طاغوت ہر باطل چیز کو کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ جبت جادوگر کے لئے اور طاغوت شیطان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ ہم نے بعض اقوال کے مطابق آیت شریفہ کا ترجمہ کر دیا ہے یہودیوں کی شرارتِ نفس دیکھو کہ علم کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور جہالت اختیار کر لی اور اہلِ شرک کو ہدایت پر بتادیا، اور اس طرح وہ بتوں پر اور شیطان پر ایمان لے آئے۔

ایسی جاہلانہ باتیں عصبیت جاہلیہ کی وجہ سے دورِ حاضر کے بعض فرقوں اور بعض جماعتوں سے بھی صادر ہوتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان پر لعنت کی یعنی اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ اس لعنت نے ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ ملعون ہونے کی وجہ سے نڈر اور بے باک ہو کر کفر اور شرک کی حمایت کر رہے ہیں اور مشرکین کو اصحابِ توحید کی نسبت زیادہ ہدایت پر بتا رہے ہیں۔

پھر فرمایا وَمَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا (کہ اللہ نے جس کو ملعون قرار دے دیا تو اس کے لئے کوئی مددگار نہ پائے گا) دنیا و آخرت میں جب اُسے سزا ملنے لگے گی تو کوئی مددگار اور بچانے والا نہ ہوگا۔

مشرکوں اور کافروں پر تو لعنت ہے ہی بہت سے گنہگاروں پر بھی حدیثوں میں لعنت آئی ہے۔ گناہ تو سبھی چھوڑنے لازم ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ اُن گناہوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے والوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔ ذیل میں چند وہ احادیث لکھی جاتی ہیں جن میں گناہوں پر لعنت کا ذکر ہے۔

شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت...... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی۔

۱۔ شراب بنانے والے پر۔ ۲۔ شراب بنوانے والے پر۔
۳۔ اس کے پینے والے پر۔ ۴۔ اس کے اٹھانے والے پر۔
۵۔ جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے اس پر۔ ۶۔ اس کے پلانے والے پر۔
۷۔ اس کے بیچنے والے پر۔ ۸۔ اس کی قیمت کھانے والے پر۔
۹۔ اس کے خریدنے والے پر۔ ۱۰۔ جس کے لئے خریدی جائے اس پر۔

(مشکوٰۃ ص ۲۴۲، از ترمذی، وابن ماجہ)

مسلمان کو نقصان پہنچانا یا اس کے ساتھ مکاری کرنا ...... حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو کسی مؤمن کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر کرے۔ (مشکوٰۃ ص ۴۲۸، از ترمذی)

تقدیر کو جھٹلانا اور کتاب اللہ میں کچھ بڑھا دینا: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھ اشخاص ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے۔ اور ہر نبی کی دُعا قبول کی جاتی ہے۔ (وہ چھ اشخاص یہ ہیں)۔

۱۔ اللہ کی کتاب میں بڑھانے والا۔ ۲۔ تقدیر کو جھٹلانے والا۔
۳۔ اللہ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا اُن کو حلال کرنے والا۔
۴۔ میری عترت یعنی اولاد کی بے حرمتی کرنے والا۔ ۵۔ اور سنت کو چھوڑنے والا۔

(مجمع الزوائد ص ۲۰۵ ج ۷ عن الطبرانی فی الاوسط ورجالہ ثقات)

اس حدیث میں ابتداء چھ افراد کا ذکر کیا لیکن شمار میں پانچ ہیں۔ ممکن ہے کسی کاتب سے کچھ رہ گیا ہو۔ مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۲ میں بھی یہ حدیث ہے۔ اس میں چھٹا آدمی اس شخص کو ذکر کیا ہے جو زبردستی اقتدار حاصل کرلے تاکہ اس کو عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا اور اُس کو ذلت دے جس کو اللہ نے عزت دی۔ صاحب المشکوٰۃ نے یہ حدیث امام بیہقی کی کتاب المدخل سے نقل کی ہے۔ اس حدیث میں تارکِ سنت کو جو ملعون قرار دیا ہے اس سے وہ شخص مراد ہے جو بالکل ہی آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے روگردانی کرے یا کسی بھی سنت کا مذاق اُڑائے۔ (کما ذکرہ علی القاری فی المرقاۃ)

عورتوں کا قبروں پر جانا اور وہاں چراغ جلانا ...... حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کے لئے جانے والی عورتوں پر اور اُن لوگوں پر لعنت فرمائی جو قبروں کو سجدہ گاہ بنائیں اور جو قبروں پر چراغ جلائیں (ابوداؤد، ترمذی) اس حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور ان لوگوں پر جو قبروں کو سجدہ گاہ بنائیں اور وہاں چراغ جلائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۷۱)

نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت ...... حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والی عورت اور (اس کا نوحہ) سننے والی پر لعنت کی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۵۱ از ابوداؤد)

شوہر کی نافرمانی ...... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کردے جس کی وجہ سے شوہر غصہ کی حالت میں رات گذارے تو اس عورت پر صبح ہونے تک فرشتے لعنت کرتے رہیں گے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۸۰، از بخاری و مسلم)

حضرات صحابۂ کرامؓ کو بُرا کہنا...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو بُرا کہہ رہے ہیں تو اُن سے کہہ دو کہ تمہارے شر پر اللہ کی لعنت۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۵۴ از ترمذی)

سود کھانا اور سود کا کاتب اور گواہ بننا...... حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر اور اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والوں پر اور فرمایا کہ (گناہ میں) یہ سب برابر ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۴، از مسلم) اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ نے لعنت کی ہے سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر اور گودنے والی اور گدوانے والی پر، اور تصویر بنانے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۱، از بخاری)

رشوت کا لینا دینا اور اس کا واسطہ بننا...... حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی رشوت دینے والے پر اور رشوت لینے پر (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۲۶، از ابوداؤد، ابن ماجہ) اور حضرت ثوبانؓ کی روایت میں یہ بھی ہے جو شخص رشوت لینے والے اور دینے والے کے درمیان واسطہ بنے اس پر بھی اللہ کی لعنت ہے۔ (مشکوٰۃ از شعب الایمان)

ضرورت کے وقت غلّہ روکنا...... حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص دوسری جگہ سے (شہر یا بستی میں) غلّہ لے کر آئے (جس سے لوگوں کو خوراک ملتی ہے) ایسا شخص مرزوق ہے (یعنی اللہ اس کو رزق دے گا) اور جو شخص (ضرورت کے وقت) غلہ روک کر رکھے (مہنگائی کا انتظار کرتا ہے) ایسا شخص ملعون ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۱، از ابن ماجہ)

جاندار چیز کو تیر اندازی کا نشانہ بنانا...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر لعنت کی جو کسی جاندار چیز کو نشانہ بنائے (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۵۷، از بخاری و مسلم) زندہ مچھلی کو کانٹے میں لگا کر مچھلیاں پکڑنا بھی حرام ہے۔

مردوں کو زنانہ پن اور عورتوں کو مردانہ وضع اختیار کرنا...... حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۰، از بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیجڑہ بننے والے مردوں پر اور مردوں کی طرح (وضع قطع بنا کر یا لباس پہن کر) مردانہ مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔ (ایضاً)

اس حدیثِ پاک میں اُن مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجنے کا ذکر ہے جو فطرتِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسری جنس کی وضع قطع شکل و صورت لباس و پوشاک اختیار کریں۔ البتہ جو پیدائشی ہیجڑہ ہو چونکہ وہ اپنے اختیار سے نہیں بنا ہے اس لئے اُسے ملعون نہ کہا جائے گا۔ لیکن جو مرد قصداً ترکیب اور تدبیر کر کے عورت پن اختیار کرتے ہیں یعنی اپنے اعضائے مردی کو ختم کر دیتے ہیں یا عورتوں کی طرح بال بڑھا کر چوٹی بناتے ہیں یا زنانہ لباس پہنتے ہیں۔ حدیثِ بالا کی رُو سے بلاشبہ وہ ملعون ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے گھروں میں آنے کی اجازت دینا سخت گناہ ہے۔

مردوں کو عورتوں کا اور عورتوں کو مردوں کا لباس پہننا...... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ لعنت بھیجی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس مرد پر جو عورت کا لباس پہنے اور اس عورت پر جو مردوں کا لباس پہنے۔ (مشکوٰۃ ص ۳۸۳، از ابوداؤد)

کسی مرد یا عورت سے اغلام کرنا سبب لعنت ہے...... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو اپنی بیوی کے پیچھے والے حصہ میں شہوت پوری کرے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۶، از احمد و ابوداؤد) اور مسند احمد ص ۳۰۹

ج ا میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کی لعنت ہو اس شخص پر جو لوط علیہ السلام کی قوم جیسا عمل کرے تین باریوں ہی فرمایا اور مسند احمد ص ۳۱۷ ج ا میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو کسی چوپائے سے اپنی شہوت پوری کرے۔

عورتوں کا بالوں میں بال ملانا اور گودوانا...... حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی بالوں میں بال ملانے والی پر اور بالوں میں بال ملوانے والی پر اور گودنے والی پر اور گدوانے والی پر۔ (الترغیب والترہیب ص ۱۲۰ ج ۳، از بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی گودنے والیوں پر اور گدوانے والیوں پر اور چہرے کے بال اُکھاڑنے والیوں پر اور لعنت بھیجی اُن عورتوں پر جو حسن کے لئے دانتوں کو گھس کر باریک بناتی ہیں جو اللہ کی تخلیق کو بدلنے والی ہیں۔ (الترغیب والترہیب ص ۱۲۰ ج ۳، از بخاری و مسلم)

عیب چھپا کر بیچ دینا...... حضرت واثلہؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی (چیز) کو عیب (کے ساتھ) فروخت کر دیا جس سے خریدار کو آگاہ نہیں کیا تو برابر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہے گا یا (فرمایا کہ) اس پر فرشتے لعنت کرتے رہیں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۹، از ابن ماجہ)

غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا اور زمین کی حد بندی کی نشانی چرانا...... حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو غیر اللہ تعالیٰ کے لئے ذبح کرے، اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو زمین کی نشانی چرائے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اللہ کی لعنت ہو اس پر جو کسی ایسے شخص کو ٹھکانہ دے جس نے (دین اسلام میں عمل یا عقیدہ کے اعتبار سے) کوئی نئی چیز نکالی ہو۔ (صحیح مسلم ص ۱۶۰ ج ۲)

اس حدیث میں کئی شخصوں پر لعنت کی ہے اُن میں سے ایک وہ شخص ہے جو زمین کی حد بندی کی نشانی کو چرالے، یعنی کھیتوں کے درمیان جو نشانیاں مقرر کر دیتے ہیں ان کو ہٹا دے یا چرا کر پھینک دے یا مینڈھ کو کاٹ دے۔ اور اس طرح دوسرے کی زمین اپنی زمین میں ملالے، بہت سے لوگ پٹواری سے مل کر اور کچھ لے دے کر نقشہ بدلوا کر یا کسی بھی طرح دوسرے کی زمین اپنے نام کرا لیتے ہیں، یہ سب حرام ہے اور سبب لعنت ہے جو کسان ایسی حرکت کرتے ہیں اس حدیث سے عبرت حاصل کریں۔

نامحرم مرد و عورت کا دیکھنا اور دکھانا موجب لعنت ہے...... حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو دیکھنے والے پر اور جس کی طرف دیکھا جائے اس پر بھی۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۰، از شعب الایمان) یہ حدیث بہت سے جزئیات پر حاوی ہے جس میں بطور قاعدہ کلیہ کے ہر نظر حرام کو مستحق لعنت بتایا ہے اور نہ صرف دیکھنے والے پر لعنت بھیجی بلکہ اپنی خوشی اور اختیار سے جو کوئی مرد یا عورت کسی ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں اس پر نظر بد ڈالی جا سکے اس پر بھی لعنت بھیجی۔

نیز اگر کوئی بھی مرد و عورت کسی بھی مرد و عورت کے سامنے وہ حصہ کھول دے یا کھلا رہنے دے جس کا دیکھنا اس کے لئے حلال نہ ہو جس کے سامنے کھولا ہے تو یہ دکھلانے والا بھی مستحقِ لعنت ہے۔

نسب بدلنا...... حضرت عمرو بن خارجہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا باپ بنایا یا اپنے موالی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اس پر فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے نہ فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔ (مسند احمد ص ۱۸۷ ج ۴)

اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہے جو اپنا نسب بدلتے ہیں، اونچے خاندان کی طرف اپنی نسبت کر لیتے ہیں اور ناموں کے ساتھ انہیں نسبتوں کو لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جو فرمایا کہ جس نے اپنے موالی کے علاوہ دوسرے کسی شخص کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی تو اس پر لعنت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے پاس باندی اور غلام تھے اس وقت وہ غلام اور باندیوں کو آزاد کر دیا کرتے تھے۔ آزاد کرنے والے اُن کے موالی تھے اُن کے درمیان جو نسبت قائم ہوتی تھی۔ اس کو وِلاء کہا جاتا تھا۔ اس نسبت کے بدلنے پر بھی لعنت وارد ہوئی ہے۔

مُحَلِّلُ اور مُحَلَّلُ لَهٗ:........حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ لعنت بھیجی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُحلِّل پر اور اُس شخص پر جس کے لئے حلال کی جائے۔ (مشکوٰۃ المصابیح عن الدارمی ص ۲۸۴ و رواہ ابن ماجہ عن علیؓ و ابن عباسؓ و عقبۃ بن عامرؓ)

شریعت مطہرہ میں اوّل تو طلاق دینا ہی مبغوض ہے پھر اگر طلاق دے تو طلاق رجعی سے کام چلائے جس میں عدت میں رجوع ہو جاتا ہے۔ اگر تین طلاقیں دے دیں (چاہے ایک ساتھ دی ہوں یا متفرق کر کے) تو پھر طلاق دینے والے شوہر کے نکاح میں دوبارہ اس طرح آسکتی ہے کہ عدت گذرنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو جائے جس سے نکاح جائز ہو پھر وہ مرد جماع کرے پھر وہ مرے یا طلاق دے پھر اس کی عدت گذرے۔ بعض لوگ تین طلاق دے کر کسی دوسرے مرد سے اس شرط پر نکاح کر دیتے ہیں کہ تو جماع کر کے طلاق دے دینا ایسی صورت میں جو شخص حلال کر کے دے یعنی نکاح کر کے جماع کر کے طلاق دے اس کو مُحَلِّلُ اور شوہر اوّل کو مُحَلَّلُ لَهٗ کہا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پر لعنت فرمائی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نکاح اس لئے ہے کہ دونوں میاں بیوی بن کر رہیں اس لئے نہیں ہے کہ جدا ہو جائیں اور جدائی بھی ایسی جس کا نکاح سے پہلے ہی ارادہ کر لیا گیا تھا۔ یہ مقاصدِ شریعت کے خلاف ہے اس لئے یہ تحلیل کا کام موجبِ لعنت ہے۔

نابینا کو غلط راستہ پر ڈال دینا اور والدین کو تکلیف دینا......حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے اس پر لعنت کی جو زمین کی نشانیوں کو بدل دے۔ اللہ نے لعنت کی اس شخص پر جو نابینا کو راستہ سے بھٹکا دے۔ اللہ نے اس پر لعنت کی جو اپنے ماں باپ کو دکھ دے۔ (مسند احمد ص ۳۱۷ ج ۱)

پیسے کا غلام بننا......حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دینار کا غلام اور درہم کا غلام لعنت کیا گیا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۱ از ترمذی)

اس حدیث میں اصلی دنیا دار کا نقشہ کھینچا ہے، یوں دنیا میں پیسہ تو سبھی کماتے ہیں اور کمانا پڑتا بھی ہے۔ حلال کمائیں، حلال کھائیں، اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ اپنی ضرورتوں کے لئے حلال کمانے میں ثواب بھی ہے۔ لیکن یہ بات کہ پیسے ہی کا غلام ہو کر رہ جائے پیسے ہی کے لئے کمائے اور نہ حلال دیکھے نہ حرام دیکھے۔ سوئے بھی پیسہ کے لئے جاگے بھی پیسے کے لئے کسی سے ملے تو بھی پیسے کے لئے نہ تن کا ہوش نہ پیٹ کا خیال، نہ ماں باپ اور اولاد کا فکر، نہ اللہ کے فرائض و واجبات کا دھیان، بس کمانا ہی کمانا ہے ایسا شخص دینار اور درہم کا غلام ہے۔ اس پر لعنت کی گئی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہلاک ہو دینار کا غلام اور درہم کا غلام اور چادر کا غلام (اگر ان چیزوں میں سے) کچھ دے دیا گیا تو راضی ہو گیا اور اگر نہ دیا گیا تو ناراض ہو گیا، ایسا شخص ہلاک ہوا اور اوندھے منہ ہو کر گرے، اور جب اس کو کانٹا لگ جائے تو خدا کرے اس کا کانٹا بھی نہ نکلے۔ (رواہ البخاری کما فی المشکوٰۃ ص ۴۳۹) غور کیا جائے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ

علیہ وسلم نے دنیا دار کو، پیسے کے غلام کو کیسی بد دعا دی۔

ان اوراق کے لکھتے وقت یہ چند احادیث ذہن میں آ گئیں، مزید تتبع اور تلاش سے ان شاء اللہ تعالیٰ مزید احادیث بھی مل سکتی ہیں جن میں لعنت کے اسباب مذکور ہوں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ

کیا اُن لوگوں کا ملک میں کچھ حصہ ہے سو ایسی صورت میں لوگوں کو وہ ذرا سی چیز بھی نہ دیتے۔ کیا وہ لوگوں سے اس چیز پر حسد

عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ

کرتے ہیں جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دی ہے، سو ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور ہم نے اُن کو

مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

بڑا ملک عطا کیا۔ سو اُن میں سے بعض اس پر ایمان لائے اور بعض نے اُس سے روگردانی کی، اور کافی ہے دوزخ کا دہکتی ہوئی آگ ہونا۔

یہودیوں کو بغض اور حسد کھا گیا

لباب النقول ص ۷۱ میں ہے کہ اہلِ کتاب نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یوں کہتے ہیں کہ اُن کو جو کچھ دیا گیا تواضع کی وجہ سے دیا گیا اور اُن کی نو بیویاں ہیں۔ اور اُن کا مقصد بس نکاح کرنا ہی ہے اور اس سے بڑھ کر کون سا بادشاہ ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ آخر تک نازل فرمائی۔

یہود حق کو تو قبول کرتے نہ تھے۔ البتہ اعتراضات اور جھوٹے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے اور کچھ نہ ملا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرتِ ازواج پر ہی اعتراض کر دیا جب دلائل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت ثابت ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہے کہ نبی اور رسول، اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف نہ خود چلتے ہیں نہ دوسروں کو چلاتے ہیں تو اب یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوا کہ اس نے ایسے شخص کو کیوں نبی بنایا جس کی بیویوں کی تعداد زیادہ ہے، اعتراض کرنا یہودیوں کی جہالت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اگر ملک کا کچھ حصہ ان کے پاس ہے تو کسی کو نقیر کے برابر بھی کچھ نہیں دیتے۔ (نقیر کھجور کی گٹھلی کے اندر کے گڑھے کو کہا جاتا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم نے یوں کیا ہے کہ کسی کو ذرا بھی کچھ نہ دیتے) خود تو کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کو تیار نہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ کسی کو عطا فرمایا اس پر حسد کرتے ہیں۔ حسد کرنے والا بہت بڑا بیوقوف ہوتا ہے اس کے حسد سے کسی کی نعمت چھن نہیں جاتی اور وہ خواہ مخواہ ان نعمتوں کو دیکھ دیکھ کر جو اللہ نے کسی کو دی ہیں اندر اندر کُڑھتا رہتا ہے اور حسد کی آگ میں جلتا بھنتا ہے، حسد کی یہ سب سے بڑی شناعت اور قباحت ہے کہ حاسد اللہ کی قضا و قدر پر راضی نہیں۔ اللہ نے تو اپنی مہربانی سے نعمت عطا فرما دی۔ لیکن حاسد اللہ کے اس انعام سے راضی نہیں۔

آلِ ابراہیم کو اللہ نے کتاب اور حکمت اور ملک عظیم عطا فرمایا...... چونکہ یہودی بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف تھے اس لئے ان کو اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب بھی دی اور حکمت بھی دی اور اُن کو بڑا ملک بھی عطا کیا۔ آلِ ابراہیم سے حضرت داؤد علیہ السلام مراد ہیں۔ داؤد علیہ السلام کو اللہ نے اپنی کتاب زبور عطا فرمائی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو حکومت اور سلطنت بھی عطا کی تھی

اوران حضرات کی بیویاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ معالم التنزیل ص۴۴۲ ج ا میں لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار تین سو بیویاں تھیں۔ اور داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں، جیسے وہ حضرات آلِ ابراہیمؑ میں سے تھے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ بھی آلِ ابراہیمؑ میں سے ہیں اُن کی بیویاں متعدد ہوگئیں تو اس میں کیا اشکال کی بات ہے۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (اور البتہ تحقیق ہم نے بھیجے آپ سے پہلے رسول اور ہم نے اُن کو بیویاں دیں اور ذریت بھی دی)۔

اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو جو نعمت چاہے عطا فرمائے اس میں کسی کو کیا اعتراض ہے اللہ کی عطا اور بخشش پر اعتراض کرنا اور اس سے راضی نہ ہونا کفر ہے پھر جس طرح تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کو پورا پورا اختیار ہے جس کو جو چاہے عطا فرمائے اسی طرح تشریعی طور پر اُسے اختیار ہے کہ جس کے لئے جو کچھ چاہے حلال قرار دے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے لئے بہت سی بیویاں حلال فرمادیں اور سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نو بیویوں کی اجازت دے کر ارشاد فرمایا: لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (الآیۃ) اور امت محمدیہ کو صرف چار بیویوں تک کی اجازت دے دی۔ وہ مالک تکوین و تشریع ہے اس پر اعتراض کرنا جہالت اور ضلالت ہے۔

پھر فرمایا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ (الآیۃ) یعنی اُن لوگوں میں سے بعض ایمان لے آئے اور بعض نے اعراض کیا۔ صاحبِ روح المعانی تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے اور مطلب یہ ہے کہ آلِ ابراہیم کو جو کچھ کتاب و حکمت دی گئی بعض اس پر ایمان لے آئے اور بعض منکر ہوئے۔ اسی طرح آپ کے زمانہ کے لوگ بعض ایسے ہیں جو ایمان لے آئے اور بعض ایسے ہیں جو اعراض کررہے ہیں۔ یہ پہلے سے ہوتا آیا ہے آپ رنجیدہ نہ ہوں جو لوگ منکر ہیں ان کے لئے دہکتی ہوئی آگ ہے جو اُن کے لئے کافی ہے۔ اُن کی ساری شرارتوں اور حرکتوں پر انہیں سخت ترین عذاب مل جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا

بلاشبہ جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا عنقریب ہم ان کو آگ میں داخل کریں گے جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کی کھالوں کے

غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا

علاوہ ان کی دوسری کھالیں پلٹ دیں گے تاکہ عذاب چکھیں، بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام

الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ

کئے عنقریب ہم اُن کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اُن میں

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

اُن کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو گھنے سائے میں داخل کریں گے۔

کافروں کو دوزخ میں سخت عذاب، کھالوں کا بار بار جلنا اور بار بار نئی کھال پیدا ہونا اور اہلِ ایمان کا جنتوں میں عیش کرنا

اوپر مؤمنین اور منکرین کا ذکر تھا۔ اب یہاں کافروں کا عتاب اور مؤمنین کا ثواب ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلی آیت میں کافروں کے سخت

عذاب کا اور دوسری آیت میں اہلِ ایمان کا اجر وثواب اور انعامات کا ذکر ہے۔

کافروں کے بارے میں فرمایا کہ بلاشبہ ہم اُن کو آگ میں داخل کریں گے یہ آگ معمولی نہ ہوگی بہت بڑی آگ ہوگی جس پر لفظ نَارًا کی تنوین دلالت کرتی ہے۔ اور سورۂ اعلیٰ میں اس آگ کے بارے میں فرمایا ہے یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری یہ آگ (جو دنیا میں ہے) جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے عرض کیا گیا یا رسول اللہ (انسانوں کے عذاب کے لئے) تو یہی کافی تھی آپؐ نے فرمایا (اس کے باوجود) دوزخ کی آگ دنیاوی آگ پر ۶۹ درجہ زیادہ بڑھادی گئی ہے ہر درجہ حرارت اسی قدر ہے جس قدر دنیا کی آگ میں حرارت ہے۔ (صحیح بخاری ص ۴۶۲ ج ۱)

اہلِ دوزخ کے عذاب کی کچھ تفصیل بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب اُن کی کھالیں جَل کر پک جائیں گی تو ہم اُن کی جگہ دوسری کھالیں پلٹ دیں گے اور بار بار ایسا ہی ہوتا رہے گا دنیا میں جس طرح ہوتا ہے کہ آگ نے جلا دیا اور جل کر ختم اور بھسم ہوگئے۔ وہاں ایسا نہ ہوگا وہاں تو ہمیشہ ہی عذاب ہوگا اور وہ عذاب والی زندگی ایسی ہوگی جس کے لئے لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی فرمایا کہ نہ تو زندگی ہی ہوگی جس میں آرام ہو اور اُسے زندگی کہا جائے اور نہ موت آئے گی تاکہ عذاب ختم ہوجائے۔ اسی لئے فرمایا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ یعنی ہم کھالوں کو پلٹتے رہیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں۔

پھر فرمایا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا کہ بلاشبہ اللہ زبردست ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے اور غالب ہے اس کے ارادہ سے اُسے کوئی روکنے والا نہیں اور وہ حکیم بھی ہے اس کا ہر فیصلہ اور ہر فعل حکمت کے موافق ہے۔

اہلِ کفر کی سزا بیان فرمانے کے بعد اہلِ ایمان کے انعامات کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (الآیۃ) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کئے ہم اُن کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی وہ ظاہری آلائش حیض ونفاس اور بلغم اور میل کچیل سے پاک ہوں گی اور بُرے اخلاق اور بدمزاجی اور ہر اس چیز سے پاک ہوں گی جو نفرت اور وحشت کا سبب ہو۔

آخر میں فرمایا وَنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا (اور ہم اُن کو گھنے یعنی گنجان سایہ میں داخل کریں گے) مطلب یہ ہے کہ وہ جن باغوں میں داخل ہوں گے اُن میں گنجان اور گھنا سایہ ہوگا۔ گھنا سایہ خوب ٹھنڈا ہوتا ہے اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سایہ بھی ہوتا ہے لیکن پتوں کے درمیان سے دھوپ بھی چھن کر آتی رہتی ہے وہاں ایسا نہ ہوگا۔ سارا سایہ متصل ہوگا اور گنجان ہوگا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ

بے شک اللہ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ امانت والوں کو امانتیں دے دیا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو

اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ﴿۵۸﴾

انصاف کے ساتھ فیصلے کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس چیز کی تمہیں نصیحت فرماتا ہے وہ بہت اچھی ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

امانت کی ادائیگی اور فیصلوں میں انصاف کا حکم

اس آیت کے سببِ نزول میں حضرات مفسرین کرام نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے

عثمان بن طلحہ حجبی سے کعبہ شریف کی چابی لے لی تھی (ان کے خاندان میں عرصہ دراز سے کعبہ شریف کے کھولنے اور بند کرنے کی خدمت آ رہی تھی جس کو اہلِ عرب سدانۃ البیت کے نام سے تعبیر کرتے تھے) آپ کعبہ شریف میں داخل ہوئے وہاں نماز پڑھی جب باہر نکلے تو حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ چابی ہمیں دے دیجئے تا کہ بنی ہاشم میں سقایۃ الحاج (حاجیوں کو پانی پلانا) اور سدانۃ البیت دونوں جمع ہو جائیں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ عباس بن عبدالمطلبؓ نے یہ سوال کیا تھا۔ آپ ؐ نے ان دونوں میں سے کسی کو چابی نہ دی۔

جب آپ کعبہ شریف سے باہر تشریف لائے تو آیت بالا اِنَّ اللّٰهَ يَـاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰىٓ اَهْلِهَا تلاوت فرما رہے تھے رب العالمین جل مجدہٗ کے فرمان کے مطابق آپ ؐ نے چابی اُسی کو دے دی جس سے لی تھی۔ جب آپ ؐ نے ان کو چابی عطا فرمائی تو فرمایا خذوها یا بنی ابی طلحة بامانة الله لا ینزعها منکم الاّ ظالم (اے بنی طلحہ اس چابی کو اللہ کی امانت کے طور پر لے لو اس چابی کو تم سے ظالم کے علاوہ کوئی نہیں چھینے گا) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا خذوها یا بنی ابی طلحة خالدةً قالدةً (اے بنی ابی طلحہ اس کو ہمیشہ کے لئے لے لو یہ تمہارے لئے خاندانی میراث ہے)۔ اس کے بعد سے آج تک یہ چابی انہیں کے خاندان میں ہے، جس کے پاس چابی ہوتی ہے اہلِ مکہ اس کو شیبی کہتے ہیں۔ عثمان بن طلحہ کے والد ابوطلحہ تھے جن کا نام عبداللہ ابن عبدالعزیٰ تھا اور عثمان، شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کے چچازاد بھائی تھے۔ یہی شیبہ بن عثمان ابن ابی طلحہ ہیں جن کے خاندان میں اب تک کعبہ شریف کی کلید برداری چلی آ رہی ہے اور اسی لئے اس خاندان کو شیبی خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے ہی چابی لی تھی اور درمیان میں حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ اس کے طالب بن گئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ امانت کو امانت والوں کے پاس پہنچاؤ۔ (تفسیر درمنثور ص ۱۷۴ ج ۲ تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۵ ج ۱، اسباب النزول للواحدی ص ۱۵۱)

قرآن مجید کی متعدد آیات میں ادائے امانت کا حکم فرمایا ہے اور خیانت کرنے والوں کی مذمت کی ہے، سورۃ الانفال میں ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اے ایمان والو! تم اللہ اور اس کے رسول کے حقوق میں خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

سورۂ یوسف میں فرمایا وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو راہ نہیں دیتا۔

سورۂ انفال میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

سورۂ حج میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا۔

سورۂ معارج میں اچھے لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔

امانتوں کی تفصیل ۔۔۔۔۔۔ سورۂ نساء کی آیت بالا اور دیگر آیات جو ہم نے نقل کی ہیں ان سب سے عمومی طور پر ہر قسم کی امانتوں کی ادائیگی کا حکم اور ہر قسم کی خیانت کی مذمت معلوم ہوئی۔ اللہ کے حقوق جو بندوں پر ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزے، کفارات نذر اور ان کے علاوہ بہت سی چیزیں یہ سب امانتیں ہیں۔ جن کی ادائیگی یا اضاعت ہر شخص کو معلوم ہوتی ہے کہ میں نے کس حکم پر عمل کیا اور کس حکم کی حکم عدولی کی، دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی اسی طرح سے آپس میں حقوق العباد جو ایک دوسرے پر واجب ہیں وہ بھی امانتیں ہیں ان کی ادائیگی فرض ہے، کسی نے مال امانت رکھ دیا قرض دے دیا یا کسی سے مال غصب کر لیا یا کسی کے مال میں خیانت کر لی یا چوری کر لی یہ سب اموال امانتیں ہیں ان کی ادائیگی فرض ہے حکام کو بلکہ صاحبِ مال کو معلوم ہو یا نہ ہو ہر شخص اپنے اپنے متعلقہ احکام میں امانتدار ہے چھوٹے بڑے حکام اور

ملوک اور رؤسا اور وزراء امانتدار ہیں انہوں نے جو عہدے اپنے ذمہ لئے ہیں وہ ان کی ذمہ داری شریعتِ اسلامیہ کے مطابق پوری کریں۔ کسی بھی معاملے میں عوام کی خیانت نہ کریں۔ اسی طرح سے بائع اور مشتری اور سفر کے ساتھی اور پڑوسی اور میاں بیوی اور ماں باپ اور اولاد سب ایک دوسرے کے مال کے اور دیگر متعلقہ اُمور کے امانتدار ہیں جو بھی کوئی کسی کی خیانت کرے گا گنہگار ہوگا اور میدانِ آخرت میں پکڑا جائے گا۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ سو اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا وہ دوسرے کی امانت کو ادا کردے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

امانتداری ایمانی تقاضوں میں سے ہے: حضرت انسؓ نے بیان فرمایا کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا ہو اور یہ نہ ارشاد فرمایا ہو کہ **لا ایمان لمن لا امانة لهٗ و لا دین لمن لا عهد له** (اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانتدار نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پورا نہیں)۔ (مشکوٰۃ المصابیح عن البیہقی فی شعب الایمان ص ۱۵)

صحیح مسلم ص ۵۶ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور وہ یہ خیال کرے کہ میں مسلمان ہوں۔

۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

۳۔ اور جب اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی تو یوں سمجھا جائے گا کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک اُسے چھوڑ نہ دے۔

۱۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

۲۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۳۔ جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔

۴۔ جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے۔ (صحیح بخاری ص ۱۰ ج ۱)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب تیرے اندر چار خصلتیں ہوں تو تجھے اس بات کا کوئی ضرر نہیں کہ دنیا کی باقی چیزیں تیرے پاس نہیں۔ (۱) امانت کی حفاظت، (۲) بات کی سچائی، (۳) اخلاق کی خوبی، (۴) لقمے کی پاکیزگی۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا کہ آپ علم و فضل کے اس مرتبے پر کیسے پہنچے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات کی سچائی، امانت کی ادائیگی اور لایعنی سے پرہیز ان تینوں کی وجہ سے میں اس مرتبہ پر پہنچا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۵)

اداروں کے اموال کی حفاظت میں امانتداری...... جن لوگوں کے ہاتھوں میں دوسروں کے اموال ہیں ان میں ملوک اور حکام بھی ہیں اور یتیموں کے اولیاء بھی، مسجدوں کے متولی بھی اور مدارس کے مہتمم بھی، اور بیت المال کے نگران بھی، اور کہیں پر پڑا ہوا مال اٹھانے

والے بھی، اور بہت سے عہدیدار ہیں جن پر دوسروں کے مالوں کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یہ سب لوگ اس بات کے مامور ہیں کہ مالوں کی حفاظت کریں اور ذراسی بھی خیانت نہ کریں، امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ سارے عہدے جنہیں دنیا میں خوشی خوشی قبول کرلیا جاتا ہے۔ پھر اُن سے متعلقہ ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا جاتا۔ قیامت کے دن وبال بن جائیں گے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! آپ مجھے کسی عمل پر نہیں لگاتے ؟ (یعنی مجھے کوئی عہدہ عنایت نہیں فرماتے) اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مونڈھے پر ہاتھ مارا پھر فرمایا اے ابوذر تو ضعیف ہے اور بلاشبہ یہ عہدہ امانت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا ذریعہ ہوگا۔ سوائے اس شخص کے جس نے حق کے ساتھ لیا اور متعلقہ ذمہ داری کو پورا کیا۔ اور ایک روایت یوں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اے ابوذر میں تمہیں ضعیف دیکھتا ہوں اور میں تمہارے لئے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں دو آدمیوں کا امیر مت بننا اور یتیم کے مال کا متولی نہ ہونا۔ (رواہ مسلم)

نااہلوں کو عہدے دینا خیانت ہے...... بہت سے لوگ نااہلوں کو اپنی کوشش سے یا اپنے اقتدار سے چھوٹے بڑے عہدے دے دیتے ہیں یا دلا دیتے ہیں حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ جس کو عہدہ دیا جارہا ہے یہ اس عہدہ کا اہل نہیں ہے یہ عہدہ ایک امانت ہے اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے لیکن دنیاوی تعلقات اور دنیاوی منافع کے پیش نظر جو فاسقوں، فاجروں، ظالموں، بے نمازیوں کو عہدے دیئے اور دلا دیئے جاتے ہیں، یہ سب امانت میں خیانت ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جسے اقتدار سپرد کیا جارہا ہے یہ شریعت اسلامیہ سے واقف ہے یا ناواقف ہے۔ اس کے عقائد اسلامی ہیں یا غیر اسلامی، جسے اقتدار اعلیٰ سپرد کر دیا جاتا ہے جب وہ عہدے تقسیم کرنے لگتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو عہدہ دیا جارہا ہے اس میں خداترسی کی شان ہے بھی یا نہیں اور یہ دین پر چلے گا یا نہیں اور عوام کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہوگا یا بُرا۔ عہدہ سپرد کرنے میں رشتہ دار یا اپنی پارٹی کا آدمی دیکھا جاتا ہے، یا وطنی عصبیتوں کی رعایت کی جاتی ہے، یعنی صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ اپنوں کو نوازنا مقصود ہوتا ہے دینِ خداوندی پر چلنے اور چلانے اور امت مسلمہ کے ساتھ عدل وانصاف اور خیرخواہی اور ہمدردی کے جذبات کا کہیں سے کہیں تک بھی دھیان نہیں ہوتا۔ اسی لئے سارے فیصلے غیر شرعی ہوتے ہیں اور عوام عہدہ داروں کے ظالمانہ فیصلوں کو بھگتتے رہتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کے متعلقہ امور سے جو شخص کسی امر کا والی بنا۔ پھر اُس نے اُن پر کسی شخص کو (ذاتی) مروّت اور تعلقات کی بنا پر امیر بنا دیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور اُس سے کوئی فرض یا نفل قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس کو دوزخ میں داخل فرمادے گا۔ (الترغیب والترہیب ص ۱۷۹)

پھر جن لوگوں کے سیاسی وعدے ہوتے ہیں جب عہدہ مل جاتا ہے تو عوام پر ظلم بھی کرتے ہیں اور وعدہ فراموشی بھی کرتے ہیں اور غدر بھی کرتے ہیں۔ اس بارے میں جو ارشادات نبویہ صلی اللہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ ہیں۔ ان سب کو یکسر بھول جاتے ہیں۔ حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **مامن وال یلی رعیة من المسلمین فیموت وھو غاشٌ لھم الا حرم اللہ علیہ الجنة** (صحیح بخاری ص ۱۰۵۲ ج ۲) جو بھی کوئی شخص مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا والی بنا (یعنی ان کی دیکھ بھال اس کے ذمہ کی گئی) پھر وہ اس حال میں مرگیا کہ وہ اُن کے ساتھ خیانت کرنے والا تھا تو اللہ اس پر جنت حرام فرمادے گا۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ **ما من عبد یسترعیه رعیة فلم یحطھا بنصیحة الا لم یجد رائحة الجنّة.** (صحیح بخاری ص ۱۰۵۸ و ۱۰۵۹ ج ۲)

ترجمہ: جس کسی بندہ کو اللہ نے چند افراد کا نگہبان بنایا پھر اس نے ان لوگوں کی اچھی طرح خیر خواہی نہ کی تو جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔

رعیت کو دھوکہ دینے کے بارے میں حدیث ذیل پڑھیے: عن سعید رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لکل غادر لواء عند استه یوم القیامة وفی روایة لکل غادر لواء یوم القیامة یرفع له بقدر غدره الا ولا غادر اعظم غدراً من امیر عامة: (رواه مسلم، کما فی المشکوة ص ۳۲۳)

ترجمہ: حضرت سعیدؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قیامت کے دن ہر دھوکہ دینے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا جو اس کے پاخانہ کے مقام پر نصب کیا جائے گا وہ اس کے دھوکہ کے بقدر بلند کیا جائے گا (پھر فرمایا) کہ خبردار جو شخص عوام کا امیر ہو اس کے غدر یعنی دھوکے سے بڑھ کر کسی کا غدر نہیں۔

کام پوارنہ کرنا اور تنخواہ پوری لینا خیانت ہے...... جو لوگ تنخواہ پوری لیتے ہیں اور کام پورا نہیں کرتے یا وقت پورا نہیں دیتے یہ سب لوگ خیانت کرنے والے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ رشوت لیتے ہیں اور رشوت لینے کی وجہ سے کار مفوضہ انجام دینے کی بجائے رشوت دینے والے کی مرضی کے مطابق اس کا کام کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی خیانت کرنے والے ہیں۔ رشوت تو حرام ہے ہی، ملازمت کی تنخواہ بھی پوری حلال نہیں ہوتی کیونکہ جس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے اس کے خلاف کام کرتے ہیں۔ درحقیقت امانتداری کی صفت بہت بڑی صفت ہے اور اس کو پورا کرنا ایمان کا بہت بڑا مطالبہ ہے۔ یہ ایسی عظیم صفت ہے۔ جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ یہ صفت صرف مالیات ہی سے متعلق نہیں۔

مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں...... دیگر امور میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امانتداری پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ **المجالس بالامانة** کہ مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں۔ (رواہ ابوداؤد فی کتاب الادب) یعنی مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ امانت ہوتی ہیں اُن کو مجلس سے باہر لے جانا اور تجھ مجھ سے بیان کر دینا امانتداری کے خلاف ہے۔ اور اہلِ مجلس کی خیانت ہے ہاں اگر مجلس میں کسی کا خون کرنے یا زنا کاری کا یا کسی کا ناحق مال حاصل کرنے کا مشورہ کیا گیا ہو تو اس کو دوسروں سے بیان کر سکتے ہیں تا کہ اس گناہ پر عمل نہ ہو وقد زاد فی الحدیث الا ثلثة مجالس سفک دم حرام و فرج حرام او اقتطاع مال بغیر حق ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی آدمی نے کوئی بات کہی پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا (کہ کوئی سن تو نہیں رہا) تو یہ بات امانت ہے۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

مشورہ دینا امانت ہے...... اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان **المستشار مؤتمن** کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد) مطلب یہ ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے اُس پر واجب ہے کہ صحیح مشورہ دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے کے حق میں بہتر ہو۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ مشورہ مصلحت کے خلاف ہے تو اس نے مشورہ لینے والے کی خیانت کی۔ (اخرجہٗ ابوداؤد فی کتاب العلم)

بلا اجازت کسی کے گھر میں نظر ڈالنا خیانت ہے...... آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ تین کام ایسے ہیں کہ جن کا کرنا کسی کے لئے حلال نہیں۔

(۱) شخص کسی جماعت کا امام بنے پھر اُن کو چھوڑ کر صرف اپنے لئے ہی دعا کرے اگر ایسا کیا تو اس نے خیانت کی۔
(۲) کوئی شخص اجازت لئے بغیر کسی گھر میں نظر نہ ڈالے، اگر اس نے ایسا کیا تو گھر والوں کی خیانت کی۔
(۳) کوئی شخص پیشاب پاخانہ روکے ہوئے نماز نہ پڑھے جب تک ہلکا نہ ہو جائے (یعنی ان سے فارغ نہ ہو جائے)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۹۶)

ان احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ اموال کے علاوہ دیگر امور میں بھی امانت داری کی صفت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

عدل و انصاف کا حکم ...... ادائیگی امانت کا حکم فرمانے کے بعد فیصلوں میں عدل و انصاف کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کرو) شریعتِ اسلامیہ میں جن امور کا بہت زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اُن میں انصاف کے ساتھ فیصلے کرنا بھی ہے۔ عدل و انصاف کرنے والوں کو بلند مراتب کی خوشخبری دی گئی ہے اور ظالمانہ فیصلے کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور اُن کے لئے بڑی بڑی وعیدیں ہیں، اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جو فیصلوں کے قوانین اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجے ہیں، انکے مطابق فیصلے کرنے ہی سے انصاف ہوگا، نیز اللہ کے قانون میں جس کی جو چیز ہو اور جس کا جو حق ہو وہ حق اور وہ چیز مستحق کو دلانے سے انصاف قائم ہوگا۔

قرآن وحدیث کیخلاف فیصلے ظالمانہ ہیں ...... انسانوں نے اپنی طرف سے جو دساتیر اور قوانین بنائے ہیں عموماً وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں۔ قرآن وحدیث کے خلاف فیصلے کرنا ظلم ہے اگرچہ اہلِ دنیا اسے انصاف ہی کہتے ہوں۔ میراث اور وصیت دیت اور قصاص حدود اور جنایات کے شرعی قوانین، تجارت و زراعت سے متعلقہ احکام نکاح وطلاق کے مسائل، حکومت سپرد کرنے اور حکومت چلانے کے قوانین، اور انسانی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کے اصول وقواعد جو شریعتِ اسلامیہ نے بتائے ہیں۔ ان کے خلاف فیصلے دینا ظلم ہے۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اُتارا تو یہ لوگ ظلم کرنے والے ہیں) جن ملکوں میں کافروں کی عملداری ہے وہاں تو اللہ کی شریعت کے خلاف فیصلے ہوتے ہی ہیں لیکن جن ملکوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اقتدار دیا ہے وہاں کے ذمہ دار بھی اسلامی احکام کو قبول کرنے اور اُن کے مطابق فیصلے کرنے کو تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن جب اُن کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلامی قوانین نافذ کرو تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عوام جو مغربی قوانین کے مطابق فیصلوں کے باعث ظلم سہتے ہیں وہ بھی اسلامی نظام نافذ کرنے کے حق میں نہیں۔ دعویٰ مسلمان ہونے کا کرتے ہیں اور قوانین اور احکام دشمنانِ دین کے نافذ کرتے ہیں۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (کیا پھر یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے اچھا کون ہوگا، یقین رکھنے والوں کے لئے)۔

ظالمانہ فیصلوں کی وجہ سے، مصائب کی کثرت ...... اب جو غیر اسلامی فیصلے ہو رہے ہیں اُن کی وجہ سے آفات اور مصائب کا طوفان آیا ہوا ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے آپؐ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا۔ جب تمہارے اندر پانچ چیزیں موجود ہو جائیں اور میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ چیزیں تمہارے اندر موجود ہوں۔

۱...... جس قوم میں زنا کاری کھلم کھلا ہونے لگے ان میں طاعون پھیل جائے گا اور ایسے ایسے مرض ظاہر ہو جائیں گے جو اُن کے آباؤ

اجداد میں نہیں تھے۔

۲......اور جو لوگ زکوٰۃ دینا روک دیں گے اُن کو آسمان کے قطروں سے یعنی بارش سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر چوپائے نہ ہوں تو (بالکل بھی) بارش نہ ہو۔

۳......اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے ان کو قحط بھیج کر سزا دی جائے گی اور اُن کو سخت محنت میں اور صاحب اقتدار کے ظلم میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

۴......اور جس قوم کے اُمراء اس فیصلے کے علاوہ کوئی فیصلہ کریں گے جو اللہ نے نازل فرمایا تو اللہ تعالیٰ اُن پر دشمن مسلط فرما دے گا پھر یہ دشمن اُن کے قبضے کی بعض چیزوں پر قبضہ کر لیں گے۔

۵......اور جو لوگ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کو معطل کر دیں گے (یعنی اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے) اللہ تعالیٰ ان کے درمیان جنگ وجدال کی صورت پیدا فرما دیں گے۔ (ذکره المنذری فی الترغیب والترهیب ص ۱۴۰ ج ۳ وعزاه الی البیهقی وقال فی آخره رواه الحاکم بنحوه من حدیث بریدة وقال صحیح علی شرط مسلم)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس کسی قوم میں خیانت ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتے ہیں اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگتے ہیں ان کا رزق کاٹ دیا جاتا ہے اور جو لوگ ظلم کے فیصلے کرتے ہیں ان میں خونریزی پھیل جاتی ہے اور جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں ان پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔ (رواه مالک فی المؤطا وهو موقوف فی حکم المرفوع)

تقویٰ کے بغیر انصاف نہیں ہوسکتا...... انصاف جبھی ہوسکتا ہے جبکہ اللہ کا خوف ہو، تقویٰ ہو، حق کا اتباع مقصود ہو قرآن وحدیث کا علم ہو قضا کے احکام اور مسائل سے واقفیت ہو۔ امیر وغریب، اپنے پرائے، چھوٹے بڑے کی کوئی رعایت نہ ہو۔ عادلانہ فیصلے کا معیار ایک حدیث میں یوں بتایا۔ **وحکموا للنّاس کحکمهم لانفسهم** کہ لوگوں کے درمیان وہی فیصلے کرتے ہیں جو اپنی جانوں کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۲۲) مطلب یہ ہے کہ جیسے اپنے لئے حق اور انصاف چاہتے ہیں اسی طرح جب دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے لگیں تب بھی حق وانصاف اختیار کریں۔ آج کل فیصلہ اُس کے حق میں ہوتا ہے جو ہم وطن ہو یا ہم پیشہ ہو یا ہم زبان ہو، ایسے حاکم کے لئے آخرت میں سخت عذاب ہے جو ظلم کا فیصلہ دے اور ظالم کا ساتھی بنے اور اس کی رعایت کرے جس سے کسی قسم کا تعلق ہو، اور جس کا واقعی شرعی حق بنتا ہو اُسے حق سے محروم کر دے۔ رشوتیں لے کر بھی فیصلے دیئے جاتے ہیں، جس نے رشوت دے دی موٹی رقم پکڑا دی اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ رشوتیں اور موٹی رقمیں نوٹوں کے گڈے دنیا میں اچھے لگتے ہیں لیکن آخرت میں جو اُن کا وبال ہوگا اس کی طرف سے بے خبر ہیں۔

انصاف کے فیصلے کرنے والوں کے لئے بشارت اور ظالموں کی ہلاکت...... جیسے ظلم کرنے والوں کے لئے وعیدیں ہیں ایسے ہی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کے لئے بشارتیں ہیں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قاضی (فیصلے دینے والے) تین قسم کے ہیں ان میں سے ایک جنت میں ہے اور دو دوزخ میں ہیں، جنت والا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا اور اُن میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور ظلم کا فیصلہ کیا سو یہ شخص دوزخ میں ہوگا اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو جہالت کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے (اس کو حق ناحق کا کچھ پتہ نہیں) سو یہ بھی دوزخ میں ہوگا۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ کما فی الترغیب ص ۱۵۶ ج ۳)

جن سات آدمیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن وہ اللہ کے عرش کے سائے میں ہوں گے جس دن اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اُن میں سب سے پہلے امام عادل کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کا وہ اعلیٰ اقتدار والا شخص جو انصاف کرنے والا ہو۔ (رواہ البخاری ص ۱۹۱ ج ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اہلِ جنت تین قسم کے لوگ ہوں گے۔

۱۔ وہ صاحبِ اقتدار جو انصاف والا ہے اور اُسے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔

۲۔ وہ شخص جو رحم کرنے والا ہے نرم دل ہے۔ ہر قرابت دار کے لئے جو مسلمان ہو۔

۳۔ وہ شخص جو صاحبِ اہل وعیال ہوتے ہوئے (حرام سے اور سوال سے) پرہیز کرنے والا ہو اور پرہیز کرنے کا اہتمام کرتا ہو۔ (رواہ مسلم کمافی الترغیب ص ۱۶۷ ج ۳)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کو سب سے زیادہ پیارا اور اللہ سے سب سے زیادہ قریب مجلس کے اعتبار سے امام عادل ہوگا اور اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض اور مجلس کے اعتبار سے اللہ سے سب سے زیادہ دور امام جائر ہوگا۔ (الترغیب ص ۱۲۷ ج ۳ عن الترمذی والطبرانی)

امام جائر سے مراد ہے ظلم کرنے والا شخص جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہو۔

حاکم بننا اور فیصلے کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لینا یہ معمولی چیز نہیں یہ ذمہ داری بہت بڑی ہے اور آخرت میں اس کا حساب بہت بڑا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے والا مقرر کردیا گیا تو وہ بغیر چھری کے ذبح کردیا گیا۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ کمافی المشکوٰۃ ص ۳۲۴) مطلب یہ ہے کہ اس عہدے کا انجام بہت بُرا ہے، عام طور سے لوگ عدل وانصاف پر قائم نہیں رہتے، قیامت کے دن یہ عہدہ وبال بنے گا اور اس عہدے کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے پر جو عذاب ہوگا اس کو اس دنیا میں اس طرح سمجھ لیا جائے جیسے کسی کو چھری کی بجائے (دھاردار آلے کے علاوہ) کسی چیز سے ذبح کردیا جائے چھری سے ذبح کرنے کی تکلیف ذرا دیر ہوتی ہے لیکن اگر بغیر چھری کے ذبح کیا جائے تو اس کی تکلیف بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔

حاکموں کو ضروری تنبیہ۔۔۔۔۔۔ اس حدیث پر ہر وہ شخص غور کرے جو حاکم وقاضی ومجسٹریٹ بنا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو بھی کوئی حاکم لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے قیامت کے دن اُسے لایا جائے گا پھر جہنم کے کنارے پر اُسے کھڑا کردیا جائے گا پھر اگر حکم ہوگا کہ اسے دھکا دے دیا جائے تو اس کو دھکیل دیا جائے گا جس کے نتیجے میں وہ ستر سال تک گہرائی میں گرتا چلا جائے گا۔ (رواہ البزار کمافی الترغیب ص ۱۷۳ ج ۳)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انصاف کرنے والے قاضی پر قیامت کے دن ضرور ایک ایسی گھڑی آئے گی کہ وہ حساب کی سختی کی وجہ سے یہ تمنا کرے گا کہ میں کبھی کسی ایک کھجور کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کرتا تو اچھا تھا۔ (الترغیب ص ۱۷۵ ج ۳)

حاکم کیسے شخص کو بنایا جائے؟۔۔۔۔۔۔ شاید کسی کو یہ خیال گذرے کہ جب یہ وعیدیں ہیں تو لوگوں کے درمیان جو جھگڑے ہوں اُن کے فیصلے کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ شریعت کے اصول کے مطابق اگر کسی کو حاکم بنا دیا جائے اور پھر وہ شریعت کے مطابق فیصلے کرے حق وانصاف کو سامنے رکھے قرآن وحدیث کے مطابق اپنی زندگی گذارے اور دوسروں کو بھی اسی پر ڈالے تو ایسا قاضی ان شاء اللہ

کامیاب ہوگا۔ وہ اصول کون سا ہے جس کے موافق قاضی بنایا جائے؟ وہ یہ ہے کہ جو شخص قاضی بننے کی تمنا نہ کرے نہ اس کا طلب گار ہو نہ اس کے لئے کوشش کرے نہ سفارشیں کروائے نہ رشوتیں دے اور عہدۂ قضا سے بچتا رہے اس کو قاضی بنا دیا جائے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عہدۂ قضا کا طلب گار ہو اور اس سلسلے میں سفارش کرنے والوں سے سوال کرے (جس پر اُسے عہدہ دے دیا جائے) تو وہ اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد نہ ہوگی وہ جانے اس کا نفس جانے، جب ایسا ہوگا تو ظاہر ہے کہ نفس کے موافق فیصلے ہوں گے اور جس کو قاضی بننے پر مجبور کیا جائے اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اُسے ٹھیک راستے پر چلاتا رہتا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی کمافی الترغیب ص۱۶۲ ج ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عہدہ قضاء کا طلب گار ہو اُسے تو عہدہ سپرد کیا ہی نہ جائے جس کے دل میں خواہش ہے کہ میں فیصلے کرنے والا بنوں وہ حق پر قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کی رغبت اور خواہش بتا رہی ہے کہ وہ اس سے دنیاوی منافع حاصل کرے گا۔ اُسے جاہ اور مال کی رغبت ہے اسی لئے وہ اس عہدے کا طالب ہوا۔ اُسے عہدہ مل جائے گا تو فیصلے اپنی مرضی کے مطابق کرے گا اور جہالت کے ساتھ کرے گا۔ رشوتیں بھی لے گا اور اپنے پرائے کا خیال بھی کرے گا اور جس پر زبردستی کر کے عہدہ قضا ڈال دیا گیا وہ اس کی ذمہ داریوں سے جیسا پہلے ڈرتا تھا ایسے ہی اب اپنے نفس کو ذمہ داریاں پورا کرنے کا پابند بنائے گا۔ یہ ایک ایسا سنہری اصول ہے کہ اسے اختیار کر لیا جائے تو فیصلوں میں جو ظلم ہوتے ہیں اُن کی روک تھام ہو جائے گی۔ اب تو ہوتا یہ ہے کہ جن کو جج اور مجسٹریٹ بننا ہے وہ پڑھتے ہی اس لئے ہیں کہ ہم ڈگری لے کر اس کام میں لگیں گے پھر درخواستیں دیتے ہیں۔ سفارشیں لاتے ہیں رشوتیں دیتے ہیں پھر جن لوگوں کے ہاتھ میں تقرر ہوتا ہے وہ بھی رشوتوں اور سفارشوں اور ڈگریوں کی بنیاد پر جج اور مجسٹریٹ بنا دیتے ہیں۔ اور اوپر جسٹس تک یہی سلسلہ چلتا ہے یہ جس کا تقرر کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ تو دیکھا ہی نہیں جاتا کہ اسے قرآن وحدیث کا کچھ علم ہے یا نہیں اور اس میں تقویٰ کتنا ہے خدا ترسی کتنی ہے۔ اس سے انصاف کی اُمید کتنی ہے۔

حاکم تک کوئی شخص خود نہیں پہنچ سکتا وکیل کے بغیر حاکم کے ہاں کسی مظلوم کا کیس پیش نہیں ہو سکتا اول وہ وکیل کی فیس فراہم کرے پھر اُس کا استغاثہ دائر ہو پھر تاریخوں پر تاریخیں پڑتی رہتی ہیں جس سے اس کے وقت اور پیسے کا خون ہوتا رہتا ہے یہ دشمنان اسلام کا طریق کار ہے مجسٹریٹ اسی سے مانوس ہیں اور اسی پر چلتے ہیں اور اسی کی تنخواہ لیتے ہیں مظلوم کی دادرسی کا ذرا دھیان نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نصیحت قبول کرنے میں خیر ہے...... آخر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا (بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس چیز کی تمہیں نصیحت فرماتا ہے وہ بہت اچھی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جو حکم دیا ہے اس میں تمہارے لئے بہتری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور ہدایت تمہارے لئے سراپا بہتر ہے اس میں دنیا و آخرت کی خیر ہے اس کو خوشی سے قبول کرو اور عمل کرو۔ اور جو شخص نصیحت نہ مانے گا۔ خیر کو قبول نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے اس کی جزا دے دے گا وہ سمیع یعنی سننے والا ہے اور بصیر یعنی دیکھنے والا ہے۔ کسی کا کوئی عمل اس کے علم سے خارج نہیں، درحقیقت یہ بہت بڑی تنبیہ ہے جو لوگ خلافِ شرع فیصلے کرنے اور نااہلوں اور ظالموں کو اور رشوت خوروں کو عہدہ قضا دینے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ وہ سب لوگ اس کا مراقبہ کریں اور غور کریں کہ آخر بارگاہِ خداوندی میں پیش ہونا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی فرمانبرداری جو اولوالامر ہیں تم میں سے،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

پس اگر تم آپس میں کسی چیز کے بارے میں جھگڑنے لگو تو اس کو لوٹا دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تم اللہ اور یوم آخرت

وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۫ ﴿۵۹﴾ ع ۹

پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بہت خوب تر ہے۔

اللہ اور رسول ﷺ اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم اور امور متنازعہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے کا فرمان

آیت کا سببِ نزول بتاتے ہوئے علامہ واحدی نے اسباب النزول ص ۱۵۲ میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی ص ۶۵ ج ۵ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ کا امیر بنا کر بھیجا اُن کی زیرِ امارت حضرت عمار بن یاسرؓ بھی تھے۔ انہوں نے حضرت خالدؓ سے اجازت لئے بغیر ایک شخص کو امان دے دی۔ حضرت خالدؓ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا اور اُن سے کہا کہ میری بغیر اجازت تم نے کیوں امان دی۔ اس میں دونوں میں تلخی پیدا ہوگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معاملہ پیش ہوا تو آپ نے عمار کی امان کو نافذ فرما دیا اور اُن سے فرمایا کہ آئندہ امیر سے رائے لئے بغیر امان نہ دیا کریں پھر آپس میں دونوں کی رضامندی ہوگئی۔

سببِ نزول جو بھی ہو آیت کا مفہوم عام ہے جس میں اللہ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور اولوالامر کی فرمانبرداری کا بھی حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تم میں کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو، جو حکم اور فیصلہ وہاں سے ملے اُسے قبول کرلو اور اس پر راضی ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ خالق اور مالک ہے احکم الحاکمین ہے اس نے اپنا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور ان کے ذریعہ احکام نازل فرمائے۔ ان کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہے اور نافرمانی باعثِ مواخذہ اور سببِ عتاب وعذاب ہے۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کرنے کا بھی حکم دیا ہے بات یہ ہے کہ جب کسی کو امیر بنالیا جسے امام اور خلیفہ کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اس کا حکم ماننے ہی سے امت کا شیرازہ مجتمع رہ سکتا ہے امیر کی فرمانبرداری نہ کرنے سے شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور ہر ایک اپنی اپنی راہ پکڑتا ہے۔ جب انتشار ہوتا ہے تو وحدت قائم نہیں رہتی اور دشمن حاوی ہو جاتا ہے پھر امیر اعلیٰ جن لوگوں کو مختلف جماعتوں کا امیر بنائے یا چند مسلمان مل کر کسی کو امیر بنائیں تو اس کی اطاعت بھی ضروری ہے اس کی اطاعت نہ کرنے سے بھی پھوٹ پڑے گی اور آپس میں نزاع اور جدال کی صورتیں پیدا ہوں گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ امیر کی اطاعت کرو اس لئے امیر کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اس اطاعت میں ثواب بھی ہے اور امت مسلمہ کا اتحاد

بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ (معالم التنزیل ص ۴۴۴ ج ۱)

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری نہیں ہے ...... حضرت ام الحصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم پر ایسا شخص امیر بنا دیا جائے جس کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں اور وہ تم کو اللہ کی کتاب کے مطابق لے کر چلتا ہو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ (رواہ مسلم ص ۱۲۵ ج ۲)

جو لوگ امیر ہوں اُن کی اطاعت واجب ہے لیکن انہی امور میں اطاعت واجب ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آدمی پر بات سننا اور فرمانبرداری کرنا واجب ہے دل چاہے یا نہ چاہے جب تک کہ گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ سو جب گناہ کا حکم دیا گیا تو کوئی بات سننا نہیں اور کوئی فرمانبرداری نہیں۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۵۷ ج ۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گنہگاری میں کوئی فرمانبرداری نہیں۔ فرمانبرداری صرف اچھے کام میں ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۹)

آجکل جو لوگ عہدے لے لیتے ہیں امارت سنبھال لیتے ہیں اُن کو یہ تو خیال ہو جاتا ہے کہ ہم اولوالامر ہیں اور اس خیال کے مطابق وہ چاہتے ہیں کہ عوام اور خواص ہماری اطاعت کریں۔ لیکن خود یہ نہیں سوچتے کہ ہم جو حکم دے رہے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تو نہیں ہے؟ خود بھی اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہوتے ہیں اور ماتحتوں سے بھی اللہ کی نافرمانی کراتے ہیں اور جب کوئی بات منوانی ہو اور جاہلی قانون کے مطابق کوئی فیصلہ کرنا ہو یا آرڈی نینس جاری کرنا ہو تو آیت مذکورہ بالا ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کرا دیتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارا فرمان واجب العمل ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرما دیا کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری نہیں۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جائے وہ لوگ خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند رہیں اور دوسروں کو بھی شرعی احکام پر چلائیں۔

حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ امام المسلمین پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل فرمودہ احکام کے مطابق فیصلے کرے اور امانت ادا کرے۔ وہ جب ایسا کرے گا تو رعیت پر واجب ہوگا کہ اس کی بات سنیں اور فرمانبرداری کریں۔ (معالم التنزیل ص ۴۴۴ ج ۱)

اُولُوا الْاَمْرِ سے کون مراد ہیں؟ ...... اولوالامر سے امراء مراد ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہی فرمایا، اور حضرت ابن عباس اور حضرت جابرؓ نے فرمایا ہے کہ اولوالامر سے فقہاء اور علماء مراد ہیں جو لوگوں کو دینی احکام سکھاتے ہیں، حضرت حسنؓ اور حضرت مجاہدؒ کا بھی یہی قول ہے اور حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ اولوالامر سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما مراد ہیں اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ اس سے مہاجرین و انصار اور تابعین بالاحسان مراد ہیں۔ (ذکرہ البغوی فی تفسیرہ ص ۴۴۴، ۴۴۵ ج ۱)

مفسر ابن کثیر ص ۵۱۸ ج ۱ فرماتے ہیں والظاهر والله اعلم انها عامة فی کل اولی الامر من الامراء والعلماء (یعنی بظاہر آیت شریفہ کا عموم تمام اولی الامر کو شامل ہے امراء اور علماء بھی اولی الامر ہیں) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ علماء کے ہاتھ میں نظام دین ہے ان کی فرمانبرداری بھی ضروری ہے اور امراء کے ہاتھ میں نظامِ حکومت ہے دونوں فریق کی فرمانبرداری سے دین کے تمام شعبوں پر عمل ہو سکتا ہے اور اتحاد باقی رہ سکتا ہے۔

رفع تنازع کے لئے کیا، کیا جائے؟...... پھر فرمایا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (پس اگر تم آپس میں کسی چیز کے بارے میں جھگڑنے لگو تو اس کو لوٹا دو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو) آپس کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے اس آیت میں سب سے بڑا سنہری اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ پر ایمان لے آئے اور آخرت کے دن کی پیشی اور وہاں کے حساب کتاب کو بھی جزوِ ایمان بنالیا۔ تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ ہر معاملے میں اور ہر موقع پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرے آپس میں جب کوئی نزاع ہو جائے تو اس کو نبٹانے کے لئے ہر فریق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کی طرف رجوع کرے اور جو کتاب وسنت کا فیصلہ ہے اس پر راضی ہو جائے۔ اور اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سامنے ختم کردے۔ بہت سے لوگ جن میں رؤساء، وزراء، امراء، عوام و خواص سب ہی شامل ہیں اپنی رائے پر ضد کرتے ہیں اور بہت سے وہ لوگ جن کا کوئی دنیاوی نفع قرآن وحدیث کے فیصلے پر چلنے کی وجہ سے مارا جاتا ہے وہ بھی بس اپنے ہی دعوے کو دیکھتے ہیں مؤمن بندہ کا یہ طریقہ نہیں۔ مؤمن بندہ کا یہ طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی رہے۔

مسلم حکومتوں کا غلط طریقِ کار...... مسلمانوں کی حکومتیں ہیں صاحبِ اقتدار اسلام کے دعویدار ہیں اسمبلی میں قانون بناتے ہیں تو یورپ کے طرزِ حکومت کو سامنے رکھتے ہیں۔ قرآن وحدیث کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ یورپین حکومتوں نے جو قوانین بنا رکھے ہیں انہیں میں کچھ ردّ و بدل کر کے قوانین نافذ کر دیتے ہیں۔ حدود اور جنایات کے احکام شریعت کے مطابق نافذ کرنے کو کہا جاتا ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں دیت اور قصاص کا قانون نافذ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو بات سننے کو تیار نہیں۔ کسی ملک میں اقتدار مل جاتا ہے تو دشمنوں کو خوش کرنے کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا طریقہ کار نیشنل ازم ہوگا کوئی مُلک اعلان کرتا ہے کہ ہم کمیونزم اور سوشلزم جاری کریں گے کچھ لوگ مغربی جمہوریت کے دلدادہ ہیں۔ اور کچھ لوگ لادینی حکومت بنانے کا اعلان کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور اسلامی نظام نافذ کرنے میں شرماتے ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ طور طریق کہاں تک زیب دیتا ہے۔ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ چلیں اور عوام کو بھی چلائیں۔ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فرما کر اسی پر تنبیہ فرمائی ہے۔

یہ صورتِ حال مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی طبقات میں ہے کہ جو حکم قرآنی اپنے فائدہ کے مطابق ہو اُسے تو ماننے کے لئے تیار ہیں اور جو حکم طبیعت کے خلاف ہو اور اپنے مفاد کے خلاف ہو دنیاوی رواج کے خلاف ہو اُسے نہیں مانتے۔ حاکم محکوم سرمایہ دار فیکٹری کے مالک مستأجر اور اجیر کسان اور مزدور سب ہی اختلافات کے مواقع میں اپنے ذاتی منافع کو اور اپنی اپنی رایوں کو اور قبیلوں کے رواج کو سرداروں کے فیصلوں کو دیکھتے ہیں قرآن کی طرف دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔

بدعت اور سنت ہونے کا معیار...... بہت سے امور جن کو ایک جماعت بدعت کہتی ہے اور دوسری جماعت ان کو امور دین بتاتی ہے۔ ان اختلافات کا حل بالکل آسان ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع ہوں جو فیصلہ قرآن وحدیث سے ملے اسی پر راضی ہو جائیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ بدعتوں کے جاری کرنے والے ہیں اور اُن کے خوگر ہو چکے ہیں وہ آیات اور حدیث کے مقابلہ میں اپنی رائے اور اپنی جاری کردہ بدعت ہی کی پاسداری کرتے ہیں۔

آخر میں فرمایا ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بہت خوب تر ہے) اس میں تنبیہ فرمائی کہ اپنی اپنی رایوں پر چلنے میں خیر نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میری رائے یا میری جماعت کی رائے بہتر ہے۔ بہتر وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے

حکم دیا۔ دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا انجام بہتر ہوگا خیر اور بہتری اللہ ہی کا قانون ماننے میں ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی فرمانبرداری میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ

کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے جو اللہ نے آپ کی طرف نازل فرمایا اور اُس پر بھی ایمان لائے جو آپ سے پہلے

قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ

نازل کیا گیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ شیطان کی طرف اپنا قضیہ لے جائیں حالانکہ اُن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کے منکر ہوں، اور

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ

شیطان چاہتا ہے کہ اُن کو گمراہ کرکے دور کی گمراہی میں ڈال دے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے نازل فرمایا اور آجاؤ رسول کی

رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ

طرف تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے ہٹتے ہیں۔ پس کیا حال ہوگا جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچے اُن کے ہاتھوں کے کئے ہوئے

اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾

کرتوتوں کی وجہ سے پھر وہ آئے آپ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی کی صورت نکل آئے اور آپس میں موافقت ہو

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ

جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ اُن کے دلوں میں ہے اللہ اُسے جانتا ہے، سوآپ اُن سے اعراض کیجئے اور ان کو نصیحت کیجئے، اور اُن کی ذاتوں کے متعلق اُن سے ایسی باتیں کہہ دیجئے

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ

جو اُن کے حق میں خوب زیادہ فائدہ مند ہوں۔ اور ہم نے پیغمبر نہیں بھیجے مگر اسی لئے کہ بحکم خداوندی ان کی فرمانبرداری کی جائے اور جب انہوں نے

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

اپنی جانوں پر ظلم کیا آپ کے پاس آتے پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسولؐ ان کیلئے استغفار کرتا تو ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربانی فرمانے والا پالیتے۔

ایک منافق کا واقعہ جو یہودی کے پاس فیصلہ لے گیا

صاحب معالم التنزیل نے ص ۴۴۶ ج اسبابِ نزول بتاتے ہوئے یہاں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور وہ یہ کہ بشر نامی ایک منافق تھا اس کے اور ایک یہودی کے درمیان جھگڑا تھا۔ فیصلہ کرانے کے لئے کہیں جانا تھا۔ یہودی نے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں اُن سے فیصلہ کرالیں لیکن بشر منافق نے کہا کہ کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ کعب بن اشرف یہودیوں کا سردار تھا۔ یہودی نے کہا کہ نہیں، میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس لے چلوں گا، جب منافق نے یہ دیکھا کہ یہ اور

کسی جگہ جانے کو تیار نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دونوں حاضر ہو گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرما دیا جب باہر آئے تو بشر منافق نے یہودی سے کہا کہ عمرؓ کے پاس چلیں چنانچہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے یہودی نے پورا واقعہ سنایا اور بتا دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بارے میں یہ فیصلہ فرما دیا ہے اور اب یہ چاہتا ہے کہ آپ سے فیصلہ کرائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں یہ کہہ کر وہ اندر گھر میں تشریف لے گئے اور اندر سے تلوار لے کر نکلے جس سے بشر منافق کو انہوں نے قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو اللہ کے اور اللہ کے رسولؐ کے فیصلے پر راضی نہ ہو ہمارے نزدیک اس کا یہ فیصلہ ہے اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ عمرؓ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر کے دکھا دیا اسی وجہ سے ان کو فاروق کہا جانے لگا۔

غیر اسلامی قانون کا سہارا لینے والے کی مذمت۔۔۔۔۔۔ واقعۂ مذکورہ کے علاوہ کتبِ تفسیر میں سببِ نزول بتاتے ہوئے بعض دیگر واقعات بھی لکھے ہیں۔ سببِ نزول جو بھی کچھ ہو آیتِ مذکورہ میں اُن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن پر بھی ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کی کتب سابقہ پر بھی ایمان لائے۔ دعویٰ تو اُن کا یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں لیکن جب کوئی قضیہ درپیش ہو جائے اور فیصلہ کرنا پڑے تو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق فیصلہ کرانے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ مقدمہ ایسے لوگوں کے پاس لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے امید ہو کہ غیر اسلامی قانون کو سامنے رکھ کر یا رشوت لے کر ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ کر دیں، یوں تو بڑے زور و شور سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب معاملات اور خصومات کا موقعہ سامنے آتا ہے تو طاغوت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی سے فیصلہ چاہتے ہیں، لفظ طاغوت شیطان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں قرآن مجید میں یہ لفظ کعب بن اشرف یہودی کے لئے استعمال فرمایا ہے جو بہت بڑا یہودی شیطان تھا۔ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی بھی شیطان کی بات نہ مانیں اور ہر غیر اسلامی قانون سے پرہیز کریں جس کو وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ میں بیان فرمایا۔ لیکن دنیا کے غلام اور مادی منافع کے طالب اسلام کے مدعی ہونے کے باوجود اُن لوگوں سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں جو اسلامی قوانین کے خلاف اُن کے حق میں فیصلہ کر دیں جب کوئی شخص یہ راہ اختیار کرے گا تو شیطان اس کو راہ حق سے ہٹا دے گا اور اُسے دور پھینک دے گا اور اسی کو فرمایا وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا ۢ بَعِیْدًا۔

بشر منافق کا جو واقعہ پیش آیا اس کو الفاظ کے عموم میں اس طرح بیان فرمایا: وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کیا اور اللہ کے رسولؐ کی طرف آؤ تو منافقین رسولؐ کے پاس آنے سے بچتے ہیں اور کٹتے ہیں) مسلمان ہونے کے دعوے تو بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں لیکن فیصلے کرانے کے لئے کسی دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم بنانے کی بجائے دوسروں سے فیصلہ چاہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بشر کے علاوہ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے آیتِ شریفہ میں عام الفاظ استعمال فرمائے تاکہ سب کو تنبیہ ہو جائے۔

منافق مذکور کے قبیلہ والوں کی غلط تاویلیں۔۔۔۔۔۔ صاحب روح المعانی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ جس شخص کو حضرت عمرؓ نے قتل کر دیا تھا اس کے ورثاء خون کا بدلہ طلب کرنے کے لئے حاضر ہو گئے اور جب اُن کے سامنے یہ بات لائی گئی کہ تمہارا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سن کر دوبارہ فیصلہ کرانے کے لئے اپنے ساتھی یعنی یہودی کو حضرت عمرؓ کے پاس کیوں لے گیا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے کیوں ناراض ہوا جو سراسر کفر ہے۔ تو وہ اپنے آدمی کے اس عمل کی تاویلیں کرنے لگے۔ اُن کی ان باتوں کا ذکر

فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (الآیۃ) کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا کہ جب ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچ جائے تو آپ کے پاس (مدد طلب کرنے کے لئے) آئیں اور قسمیں کھا کھا کر کہیں کہ بشر والے معاملے میں ہم لوگوں کا مقصد اچھی صورت نکالنا اور باہمی رضامندی کے ذریعہ موافقت پیدا کرنا تھا۔ دل سے ہم کسی غیر کے فیصلے پر راضی نہ تھے۔ جو کچھ تھا اوپرا اوپر سے تھا اس میں اُن لوگوں کے لئے وعید ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ عذر پیش کریں گے لیکن عذر کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اُن کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا لہٰذا کوئی معذرت قابلِ قبول نہ ہوگی۔

پھر فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (الآیۃ) کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دلوں کا حال معلوم ہے وہ ان کو سزا دے گا۔ آپ ان سے اعراض کریں زجر و توبیخ نہ کریں ہاں ان کو نصیحت کرتے رہیں جو ان کی ذاتوں کے بارے میں ہو اور انتہائی وضاحت کے ساتھ ان سے ایسی باتیں فرمائیں جو مؤثر ہوں راہِ حق پر لانے والی ہوں۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ کا ایک مطلب تو مفسرین نے یہی بتایا ہے جو ابھی اوپر بیان ہوا کہ اُن سے اعراض کریں اور زجر و توبیخ سے کام نہ لیں اور دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کا عذر قبول کرنے سے اعراض فرمائیں اور انہوں نے جو بشر مقتول کے خون کا دعویٰ کیا ہے اس طرف توجہ نہ فرمائیں کیونکہ اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں نیز وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ کا ایک مطلب تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ ان کی ذاتوں کے بارے میں انہیں نصیحت فرماتے رہیں اور دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ ان کو تنہائی میں نصیحت فرمائیں کیونکہ تنہائی میں سمجھانا نصیحت قبول کرنے کے لئے زیادہ قریب تر ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر ص ۵۱۹ ج ا روح المعانی ص ۶۹ ج ۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اطاعت ہی کیلئے ہے...... جن لوگوں نے اپنے عمل کی تاویلیں پیش کیں اور جھوٹے عذر سامنے لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے لگے۔ اُن کیلئے مزید تنبیہ فرمائی اور توبہ و استغفار کی طرف متوجہ فرمایا۔ ارشاد فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ ہم نے جو بھی کوئی رسول بھیجا اسی لئے بھیجا کہ بحکمِ خداوندی اس کی اطاعت کی جائے رسول کا کام اللہ کے احکام پہنچانا ہے۔ اور رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے اور رسول کی نافرمانی اللہ ہی کی نافرمانی ہے۔ جن لوگوں نے طاغوت کی طرف مقدمہ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا اس سے راضی نہ ہوئے اور حضرت عمرؓ کے پاس پھر سے مقدمہ پیش کرنے کی ضد کی اس میں سراسر اللہ کے رسولؐ کی اور اللہ کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی کے باعث بشر منافق تو مقتول ہو گیا لیکن اس کے متعلقین نے جو اس کے عمل کی تاویل کی اور عملِ شر کو عملِ خیر بنانے کی کوشش کی ان لوگوں نے بھی اللہ کی نافرمانی کی۔ ان کو چاہیئے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے اور آپؐ بھی اُن کے لئے اللہ سے مغفرت کی دُعا فرماتے تو اس طرح ان کی مغفرت اور بخشش کی صورت بن جاتی۔ توبہ صحیح کے بعد اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتا ہے۔ خواہ تنہائی میں توبہ کی جائے یا مجمع میں لیکن خاص طور سے اُن لوگوں کے لئے یہ فرمانا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اللہ سے استغفار کرتے اور آپ بھی ان کے لئے استغفار کرتے تو اللہ کو توّاب اور رحیم پا لیتے اس سے جو خدمت عالی میں حاضر ہونے کی شرط مفہوم ہو رہی ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ چونکہ انہوں نے آپ کے منصبِ نبوّت پر حملہ کیا اور آپ کے فیصلے کو نظر انداز کرنے کا تاویلوں کے ذریعہ جواز نکالا اور آپ کو دکھ پہنچایا اس لئے ان کے جرم کی توبہ کے لئے یہ شرط لگائی گئی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے توبہ کریں، اور یہ بھی کہ آپؐ اُن کے لئے استغفار کریں۔ پوشیدہ گناہ کی توبہ پوشیدہ طریقے پر اور اعلانیہ گناہ کی توبہ اعلانیہ طور پر ہو یہ توبہ کا اصول ہے۔ اُن کی حرکت معروف و مشہور ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو اُن سے دکھ پہنچ گیا لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ بارگاہ عالی میں حاضر ہو کر اللہ کے حضور میں توبہ کریں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ

سو قسم ہے آپ کے رب کی وہ مؤمن نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ جو اُن کے آپس کے جھگڑے ہوں اُن میں آپ کو فیصلہ کرنے والا بنا کر آپ کے فیصلے سے

اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

اپنے دلوں میں کسی بھی طرح کی تنگی محسوس نہ کریں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو دل و جان سے قبول کئے بغیر مؤمن نہ ہوں گے

صحیح بخاری کتاب التفسیر ص ۶۶۰ ج ۱ میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا ایک انصاری سے کاشت کے سیراب کرنے کے سلسلے میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (پانی کا بہاؤ کچھ اس طرح سے تھا کہ پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین پڑتی تھی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے زبیر! تم اپنی کھیتی کو سیراب کرلو پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دو۔ اُس انصاری نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی کا بیٹا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کو ترجیح دیدی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ اے زبیر! تم اپنی زمین کو سیراب کرو اور پانی کو یہاں تک روک لو کہ تمہاری کیاریوں کے اوپر تک آ جائے پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انصاری کے غصہ دلانے والے کلمات کی وجہ سے زبیر کو اُن کا صاف صاف پورا حق دلا دیا۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ایسی بات فرمائی تھی جس میں دونوں کے لئے گنجائش تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ آیت فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی (مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر جب فریق مقابل راضی نہیں ہوا بلکہ اعتراض بھی کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کے بیٹے کو ترجیح دیدی تو اس پر تنبیہ فرمانے کے لئے آیت شریفہ نازل ہوئی) حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیرؓ کو اپنی زمین کو سیراب کرنے کا حق پہلے اس لئے دیا کہ اُن کی زمین پہلے پڑ رہی تھی اور آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ پہلے اپنی کیاریوں میں اوپر تک پورا پانی بھر لینا بلکہ صرف اتنا فرما دیا تھا کہ تم اپنی زمین سیراب کر کے اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دینا۔ لیکن انصاری نے جب ایسی بات کہہ دی جو اوپر مذکور ہوئی کہ آپؐ نے زبیرؓ کو اُن کا پورا پورا حق دے دیا کہ پہلے تم اچھی طرح سیراب کرلو پھر پانی چھوڑ دو۔ پہلا فیصلہ انصاری کے حق میں بہتر تھا اس نے یہ تو نہ دیکھا کہ زبیر کو پوری کیاریاں پُر کرنے کو نہیں فرمایا ہے بلکہ یہ دیکھ لیا کہ ان کو پہلے اپنی زمین سیراب کرنے کا حق دے دیا۔

آیت بالا میں مستقل یہ قانون بتا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر دل و جان سے راضی ہونا یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ سامنے آ جائے تو اس کے خلاف اپنے نفس میں ذرا بھی کچھ تنگی محسوس نہ کرے۔ سبب نزول خواہ وہی ہو جو حضرت زبیرؓ نے بیان فرمایا لیکن آیت کے عموم نے بتا دیا کہ جب کبھی بھی کوئی واقعہ پیش آ جائے جہاں ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کرتا ہو اور اُن کے جھگڑے ہٹانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ موجود ہو تو ہر فریق دل و جان سے اسی پر راضی ہو جائے۔ دل میں ذرا سا بھی کوئی تکدر اور میل نہ لائے۔ بہت سے لوگ جو اپنے معاملات اور مخاصمات میں غیر اسلامی قوانین کی طرف

دوڑتے ہیں اوران کے سامنے قرآن وحدیث کا فیصلہ لایا جاتا ہے تو اس سے راضی نہیں ہوتے ایسے لوگ اپنے ایمان کے بارے میں غور کرلیں، اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیتِ بالا میں قسم کھا کر خوب واضح طریقے پر بتادیا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جھگڑوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں اور فیصلہ کرا کر آپؐ کے فیصلے پر دل وجان سے راضی نہ ہوں اور پوری طرح فیصلے کو تسلیم نہ کرلیں تو ایسے لوگ مؤمن نہ ہوں گے، جب تک آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تھے اس وقت تک آپ کی ذاتِ اطہر سامنے تھی اور آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد قرآن مجید اور آپ کی احادیث موجود ہیں۔ اب اُن کو سامنے رکھ کر اپنے فیصلے چکائیں اور جو مسلمان قاضی اور حاکم ہیں انہیں کے مطابق فیصلے کریں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو قرآن مجید کی تصریح کے مطابق لَا یُؤْمِنُوْنَ کا مصداق ہوں گے۔

دورِ حاضر کے لوگوں کی بدحالی...... لوگوں کے ذہن مغرب کے بنائے ہوئے ظالمانہ قوانین سے اس قدر مغلوب اور مانوس ہو چکے ہیں کہ ان کے مطابق ظالم بننے اور مظلوم بننے کو تیار ہیں لیکن اسلام کے عادلانہ قوانین پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ زناکاری کے عام ہوجانے پر خوش ہیں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جنہیں بھگتتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان قوانین کو نہ صرف دل سے بُرا جانتے ہیں بلکہ صاف الفاظ میں ظالمانہ کہہ کر کفر اختیار کر لیتے ہیں اگر چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں اور زانیوں کو سنگسار کرنے اور کوڑے لگانے کی حد جاری کی جائے اور شراب پینے والوں کو کوڑے لگائے جائیں اور ڈاکوؤں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے۔ کہ اُن کو (حسبِ واردات) قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے یا اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں یا جیل میں ڈالا جائے اور قاتلوں سے قصاص دلایا جائے اور دیت کے احکام نافذ ہوں تو یہ جھگڑے فسادات، چوریاں، ڈکیتیاں اور زناکاری کا وجود ختم ہوجائے کہنے کو مسلمان ہیں لیکن احکامِ قرآنیہ پر راضی نہیں، کافروں کے قوانین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اور فیصلے کراتے ہیں ایسے لوگ غور کرلیں کہ اُن کا کیا دین وایمان ہے، آیتِ بالا میں فرمایا کہ مؤمن ہونے کے لئے صرف یہی شرط نہیں ہے کہ اپنے جھگڑوں کے فیصلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ آپ کے فیصلے پر دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس نہ کریں۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ

اور اگر ہم اُن پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو یا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو اس پر عمل نہ کرتے مگر تھوڑے

مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ

سے لوگ، اور اگر وہ لوگ اُن کاموں کو کرتے جن کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ اُنکے حق میں بہتر ہوتا، اور یہ اُنکے ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا عمل ہوتا، اور اُس

مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

وقت اُن کو ہم اپنے پاس سے ضرور اجرِ عظیم عطا کرتے۔ اور ہم اُن کو سیدھے راستے پر چلاتے۔

جانوں کے قتل کرنے اور گھروں سے نکلنے کا حکم ہوتا تو تھوڑے افراد عمل کرتے

اوپر کی آیات میں یہ بتایا کہ مؤمن کی شان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلے پر بلاچون وچرا سچے دل سے راضی ہو اور دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس نہ کرے۔ اور اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کو جو یہ حکم دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کریں

اور آپ کے حکم کو تسلیم کریں اور آپ کے فیصلہ پر راضی ہو جائیں یہ کوئی ایسی مشکل چیز نہیں ہے جس پر عمل نہ ہو سکے، اور اگر ہم اُن پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو (جیسا کہ بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت کرنے کی وجہ سے بطور توبہ جانوں کے قتل کرنے کا حکم ہوا تھا) یا یہ حکم دیتے کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ (جیسا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کا حکم ہوا تھا) تو اس پر عمل نہ کرتے مگر تھوڑے سے افراد۔ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! اگر مجھے حکم دیں کہ اپنی جان کو قتل کروں تو میں ضرور ایسا کر گذروں گا۔ آپؐ نے فرمایا اے ابوبکرؓ! تم نے سچ کہا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اگر یہ چیز فرض کی جاتی تو یہ بھی انہیں قلیل افراد میں سے ہوتے جو اس پر عمل کر لیتے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا۔ حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ میں سے چند حضرات نے کہا کہ اگر یہ ہمیں حکم ہوگا تو ہم ضرور عمل کر لیں گے۔ اُن لوگوں کی یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی آپؐ نے فرمایا کہ ایمان ان کے قلوب میں مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ جما ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے سب تعریف ہے جس نے ہمیں عافیت سے رکھا اگر ہمیں حکم ہوتا کہ اپنی جانوں کو قتل کریں تو ہم ضرور ایسا کر لیتے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ بلاشبہ میری اُمت میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے دلوں میں ایمان جمے ہوئے پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ (روح المعانی ص ۷۲ ج ۵، معالم التنزیل)

بعض آثار میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت زبیرؓ زمین کی سیرابی والے قضیہ کا فیصلہ کرا کر واپس ہو رہے تھے تو حضرت مقدادؓ پر ان کا گذر ہوا حضرت مقدادؓ نے پوچھا کہ کس کے لئے فیصلہ ہوا۔ انصاری نے اپنا منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا اپنی پھوپھی کے بیٹے کے لئے فیصلہ کر دیا وہاں ایک یہودی بھی موجود تھا اس نے بات کو سمجھ لیا اور کہنے لگا کہ اللہ ان لوگوں کا بُرا کرے یہ لوگ گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور اس کے باوجود اگر آپ کوئی فیصلہ کر دیں اس میں آپؐ کو (جانبداری کی) تہمت لگاتے ہیں۔ قسم اللہ کی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ایک گناہ کیا تھا۔ انہوں نے توبہ کی دعوت دی اور توبہ کے سلسلے میں جانوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر عمل کرتے ہوئے ہم لوگوں نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ مقتولین کی تعداد ۷۰ ہزار کو پہنچ گئی۔ اور اس سے ہمارا رب راضی ہو گیا۔ واقعہ مذکورہ ایک ہی انصاری کا تھا لیکن یہودی نے تمام انصار و مہاجرین پر طعن کر دیا۔ اس پر ثابت بن قیسؓ اور ابن مسعود اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہمیں جان کے قتل کا حکم ہوگا تو ہم ضرور عمل کریں گے۔ یہودی کا یہ کہنا اور حضراتِ صحابہؓ کی طرف سے اس کا جواب دینا اس کی سند تو بیان نہیں کی گئی لیکن بشرط ثبوت آیت شریفہ کا ربط آیتِ سابقہ سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ (از روح المعانی ص ۷۲ ج ۵) جس شخص کا یہ واقعہ ہے وہ منافق تھا، انصار کے کسی قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے اسے انصاری کہہ دیا گیا تھا۔

پھر فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (الآیۃ) کہ اگر یہ لوگ اس پر عمل کرتے جو اُن کو نصیحت کی جاتی ہے تو دنیا و آخرت میں ان کے لئے بہتر تھا اور ان کو سختی کے ساتھ حق پر جمانے کا ذریعہ ہوتا۔ اور جب یہ اس پر عمل کر لیتے جس کی اُن کو نصیحت کی جاتی ہے تو ہم اُن کو اپنے پاس سے اجرِ عظیم عطا کر دیتے۔ اور اُن کو سیدھے راستہ پر چلاتے۔ (روح المعانی ص ۷۴ ج ۵)

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ

اور جو لوگ اللہ کی اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کریں سو یہ اُن اشخاص کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝

اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرنے والوں کے لئے بشارتِ عظیمہ

اوپر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ذکر ہے۔ یہاں بطور قاعدہ کلیہ فرمانبرداروں کا عظیم مرتبہ ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کا یہ صلہ ہے کہ ایسے لوگوں کو آخرت میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت حاصل ہوگی۔

معالم التنزیل ص ۴۵۰ ج ا لکھتے ہیں کہ حضرت ثوبانؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپ کی زیارت کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن حاضرِ خدمت ہوئے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا جس کی وجہ سے رنج و غم کا اثر ظاہر ہو رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تمہارا رنگ کس چیز نے بدل دیا عرض کیا یارسول اللہؐ! نہ مجھے کوئی مرض ہے نہ کوئی تکلیف ہے صرف اتنی بات ہے کہ مجھے آپؐ کی ملاقات کا بہت زیادہ شوق ہوا اور اس کے بغیر مجھے چین نہ آیا اور اپنے اندر بہت سخت وحشت محسوس کرتا رہا پھر مجھے آخرت یاد آ گئی اس پر یہ خیال آیا کہ وہاں آپؐ کو نہ دیکھ سکوں گا کیونکہ آپؐ نبیوں کے درجات میں ہوں گے اور اگر میں جنت میں داخل ہو گیا تو آپ کے درجے سے نیچے کے درجے میں ہوں گا اور اگر جنت میں داخلہ نہ ملا تو کبھی بھی آپ کو نہ دیکھ سکوں گا اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ باوجود درجات مختلف ہونے کے اہلِ جنت کی آپس میں معیت اور ملاقات ہوگی۔

جس سے محبت ہو اسی کے ساتھ ہوں گے...... حضرت ابن مسعودؓ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص حاضرِ خدمت ہوا اور اس نے عرض کیا یارسول اللہ! ایسے شخص کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے جس نے کسی قوم سے محبت کی اور (علم وعمل) کے اعتبار سے اُن (کے مقام) کو نہ پہنچا اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ **المرء مع من احب** یعنی انسان اُس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ (رواہ البخاری کما فی المشکوٰۃ ص ۴۲۶)

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ **المرء مع من احب** (انسان اسی کے ساتھ ہے جس سے اُس نے محبت کی) اس کے عموم میں دونوں باتیں داخل ہیں، اچھوں سے محبت کی تو اچھوں کے ساتھ ہوگا اور بُروں سے محبت کی تو بُروں کے ساتھ ہوگا۔ نیز اس کا عموم دنیا و آخرت دونوں کے لئے شامل ہے۔ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بُروں کے ساتھ بُرے لوگ ہوتے ہیں اور اچھوں کے ساتھ اچھے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح سے آخرت میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ہر ایک اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل** (رواہ الترمذی وابوداؤد) (یعنی انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے سو تم میں سے ہر شخص غور کرے کہ وہ کس سے دوستی رکھتا ہے)

جس نے نماز کی پابندی نہ کی قارون وفرعون کے ساتھ ہوگا:...... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بیان فرمایا کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا جس نے نماز کی پابندی کی وہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی اور (اس کے ایمان کی) دلیل ہوگی اور (اس کی) نجات (کا سامان) ہوگی اور جس نے اس کی پابندی نہ کی اس کے لئے نہ نور ہوگی نہ دلیل ہوگی اور

نہ نجات کا سامان ہوگی اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ (رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ ص ۵۹)

علماء حدیث نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی پابندی نہ کرنے والے کئی قسم کے ہیں، کچھ لوگ مال کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے۔ یہ لوگ قارون کے ساتھی ہوں گے اور کچھ لوگ حکومت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے یہ لوگ فرعون کے ساتھ ہوں گے اور کچھ لوگ ملازمت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے یہ لوگ ہامان کے ساتھ ہوں گے (یہ شخص فرعون کا وزیر تھا) اور جو لوگ تجارت کی مشغولیت کی وجہ سے نماز کی پابندی نہیں کرتے وہ اُبی بن خلف کے ساتھ ہوں گے یہ ایک مشرک تھا، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے قتل کیا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح اچھے لوگ اچھے لوگوں کے ساتھ ہوں گے اسی طرح بدعمل بُرے لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔

صاحب روح المعانی ص ۷۸ ج ۵ پر لکھتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی معیت کا جو آیت میں ذکر ہے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ درجات میں اختلاف نہ ہوگا اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ صرف دخولِ جنت کے اشتراک کو معیت سے تعبیر فرمادیا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ نیچے کے درجات والے اوپر کے درجات والوں کو بُعد مسافت کے باوجود دیکھ بھی سکیں گے اور زیارت بھی کر سکیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیچے درجے والوں کو زیارت کے لئے اوپر جانے کی اجازت دی جائے اور بلند درجات والوں کو نیچے آنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اپنے بھائیوں کی زیارت کر لیں جو بھی صورت ہو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے والوں کو مذکورہ بالا حضرات کی معیت نصیب ہوگی۔ ان حضرات سے جو قلبی محبت ہے وہ ان کی معیت کا ذریعہ بن جائے گی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر دو بندوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں محبت کی اگر ان میں سے ایک شخص مشرق میں تھا اور دوسرا مغرب میں تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان دونوں کو جمع فرمائیں گے اور ارشاد ہوگا کہ یہ ہے وہ شخص جس سے تو میرے لئے محبت کرتا تھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۷)

حضرت ربیعہ بن کعبؓ کا واقعہ...... حضرت ربیعہ بن کعبؓ نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گذارا کرتا تھا (یہ بعض احوال اور بعض اوقات کا بیان ہے) اور (رات کو جب آپ بیدار ہوتے تو) آپ کی خدمت میں وضو کا پانی اور دوسری چیزیں حاضر کر دیتا تھا (ایک دن آپ نے) فرمایا کہ سوال کرلو (جو تم چاہتے ہو) میں نے عرض کیا میں جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں آپؐ نے فرمایا اس کے سوا اور کچھ چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا میرا مقصود تو یہی ہے آپؐ نے فرمایا اگر ایسی ہی بات ہے تو اپنے نفس کے خلاف میری اس طرح مدد کرو کہ سجدے زیادہ کرتے رہو (یعنی نفل نمازیں خوب زیادہ پڑھو)۔ (رواہ مسلم ص ۱۹۳ ج ۱)

معلوم ہوا کہ بلند درجات والوں کی معیت حاصل ہونے کے لئے اعمالِ صالحہ میں لگا رہنا چاہئے اور نماز ایمان کے بعد سب سے بڑی چیز ہے جتنی زیادہ نمازیں پڑھیں گے اتنے زیادہ سجدے ہوں گے اور سجدوں کی یہ کثرت معیت کا ذریعہ بنے گی۔ آرزو کے ساتھ عمل بھی ہونا چاہیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں میری مدد کرو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس انسان کو آگے نہیں بڑھنے دیتا اعمالِ صالحہ کرنے میں ہمت کرنی پڑتی ہے اور نفس سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اعمالِ صالحہ ایسے ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اُن اعمال پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء کی معیت کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سچا امانتدار تاجر نبیوں وصدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

(رواہ الترمذی فی البیوع) جنت میں درجات میں فرق مراتب بہت زیادہ ہوگا۔لیکن اس کے باوجود باہمی ملاقاتوں اور زیارتوں کے مواقع عطا کئے جائیں گے۔

جنت کے بالاخانے ...... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جنت میں سو درجے ہیں جن کو اللہ نے اُن لوگوں کے لئے تیار فرمایا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان وزمین کے درمیان فاصلہ ہے سو جب تم اللہ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ جنت کا سب سے زیادہ بہتر اور بلند درجہ ہے اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہیں۔(رواہ البخاری ص ۱۱۰۴ ج ۲)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ (عام) جنتی بالاخانوں کے رہنے والے کو اپنے اوپر اس طرح دیکھیں گے جیسے تم (دنیا میں) چمکدار ستارہ کو دیکھتے ہو جو آسمان کے کناروں میں مشرق یا مغرب کی جانب دور نظر آرہا ہو اور یہ اُن کے آپس کے فرق مراتب کی وجہ سے ہوگا۔صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو انبیاء کرام علیہم السلام کے رہنے کی جگہیں ہوں گی جہاں اور کوئی نہ پہنچے گا۔آپ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ وہ لوگ اُن میں رہیں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبروں کی تصدیق کی۔(رواہ البخاری ص ۴۶۱ ج ۱)

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا اُن حضرات کو چار جماعتوں میں ذکر فرمایا اوّل حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، دوم حضرات صدیقین یعنی وہ حضرات جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔جب نبی کی دعوت سامنے آئی فوراً لبیک کہا اور پھر آخر تک نہایت اخلاص کے ساتھ اپنے جان ومال اور ہر طرح کی خدمات سے حاضر رہے۔حضرت ابوبکرؓ کو اسی لئے صدیق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سنتے ہی فوراً تصدیق کی۔ہر منصب کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے گذرے وہ اس وقت اپنے بعض غلاموں پر لعنت کر رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ (یعنی کیا لعنت کرنے والے صدیق ہو سکتے ہیں؟) پھر فرمایا کلاّ و ربّ الکعبة یعنی ربّ کعبہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں (یعنی لعنت کرنے کی صفت اور صدیقیت دونوں جمع نہیں ہو سکتے)۔حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر اس دن اپنے بعض غلاموں کو آزاد کر دیا پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب ایسا نہیں کروں گا۔(مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۵)

سوم شہداء یعنی وہ حضرات جنہوں نے اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لئے دشمنانِ اسلام سے جنگ لڑی اور کافروں کے ہاتھوں مقتول ہو گئے۔یہ بھی مقربین بارگاہِ الٰہی ہیں اور اُن کے بڑے درجات ہیں۔

چہارم صالحین یعنی وہ حضرات جن کے قلوب بُرائیوں سے دور ہیں اور نیکیوں کی طرف راغب ہیں۔اخلاص کے ساتھ نیکیوں ہی میں لگے رہتے ہیں۔درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے کہ کوئی شخص صالح ہو اس کی طبیعت اور مزاج میں نیکی کرنا۔پوری طرح اثر انداز ہو چکا ہو صالح ہونا بہت بڑا وصف ہے اس لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی اس صفت کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِيْنَ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وَمِنَ الصَّالِحِيْنَ فرمایا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے دُعا میں عرض کیا، تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ (اے اللہ مجھے اس حال میں موت دے کہ میں مسلم ہوں اور مجھے نیکوں کے ساتھ ملا دے)۔چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر اوپر آچکا ہے۔اس لئے یہاں وہ صالحین مراد ہیں

جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ ہیں آیت کے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں پر انعام فرمایا ہے وہ چار ہی قسم کے حضرات ہیں۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور ان ہی حضرات کی راہ پر چلنے کی دُعا کرنے کی تلقین فرمائی۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اس میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ تلاوت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بہت زیادہ ہیں۔ کافر اور فاسق بھی اُن سے منتفع متمتع ہوتے ہیں لیکن اصل انعام وہی ہے جو مذکورہ اشخاص پر ہوا۔ کیونکہ ہدایت اور تعلق مع اللہ اور صلاح فلاح کا جو انعام ہے وہی حقیقی انعام ہے آخرت میں اس کی وجہ سے بلند درجات نصیب ہوں گے دوسرے انعامات اور اُن کے فوائد اسی دنیا میں رہ جائیں گے۔

آخر میں فرمایا وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا کہ مذکورہ بالا حضرات کی رفاقت بہت ہی اچھی ہے کیونکہ جنتوں میں ان کی معیت اور رفاقت حاصل ہوگی۔ پھر فرمایا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ کہ یہ مہربانی اللہ کی طرف سے ہے کہ اُس نے اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی توفیق دے دی اور اسی میں لگائے رکھا۔ یہاں تک کہ آخرت میں ان حضرات کا ساتھ نصیب ہوا جو اللہ کے مقرب بندے ہیں۔

آخر میں فرمایا وَكَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا یعنی اللہ تعالیٰ جاننے والا کافی ہے، اسے ہر عمل کا پتہ ہے اور وہ عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ

اے ایمان والو! تم اپنے بچاؤ کا سامان لے لو پھر نکل کھڑے ہو چھوٹی جماعتیں یا بڑی جماعتیں بنا کر، اور بلاشبہ تم میں بعض ایسے لوگ ہیں جو دیر

لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِیْدًا ﴿۷۲﴾

لگاتے ہیں، سو اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچ جائے تو کہتے ہیں اللہ نے مجھ پر انعام فرمایا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہ تھا۔

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَیَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهٗ مَوَدَّةٌ یّٰلَیْتَنِیْ

اور اگر تم کو اللہ کا فضل حاصل ہو جائے تو کہنے لگتے ہیں گویا کہ تمہارے اور اُن کے درمیان کوئی دوستی ہی نہیں۔ اے کاش میں

كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ

ان کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بڑی کامیابی حاصل ہوتی۔ سو جو لوگ آخرت کے بدلہ دنیا والی زندگی کو اختیار کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ

الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۷۴﴾

اللہ کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب ہو جائے سو عنقریب ہم اُسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۔

دشمنوں سے ہوشیار رہنے اور قتال کرنے کا حکم

ان آیات میں اوّل تو مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ دشمنوں کی جانب سے چوکنے رہیں ہتھیار تیار رکھیں اور موقع کے مطابق نکل کھڑے

ہوں، جہاں چھوٹی جماعتوں سے ضرورت پوری ہوتی ہو وہاں چھوٹی جماعتیں چلی جائیں اور جہاں بڑی جماعت کی ضرورت ہو وہاں بڑی جماعت چلی جائے۔

منافقوں کا طرزِ عمل......اس کے بعد منافقوں کے طرزِ عمل کا تذکرہ فرمایا۔ چونکہ منافقین مسلمانوں میں مل جل کر رہتے تھے اس لئے فرمایا کہ تم میں بعض وہ لوگ ہیں کہ جب اُن کے سامنے جہاد میں جانے کی بات آتی ہے تو چونکہ اندر سے ایمان نہیں ہے اس لئے اُن پر جہاد شاق گذرتا ہے دل سے شرکت کرنا نہیں چاہتے اس لئے بددلی کے ساتھ نکلتے ہیں۔ لَیُبَطِّئَنَّ باب تفعیل سے ہے اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی جانوں کو روکتے ہیں اور جہاد کی شرکت سے پیچھے رہ جانے اور نکلنے میں دیر لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کو جہاد کی شرکت سے روکتے ہیں جیسا کہ غزوۂ احد میں منافقین نے ایسا کیا تھا۔ چونکہ یہ لوگ صرف صاحبِ دنیا ہیں۔ باہر سے مسلمانوں میں شریک ہیں اور اندر سے ان کے دشمن ہیں اس لئے اُن کی زبانوں پر وہ باتیں آ جاتی ہیں جو اُن کے نفاق اور دل کے مرض کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ جب مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ اچھا ہی ہوا کہ اللہ نے مجھے گھر میں بیٹھنے کے انعام سے نوازا اور میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہ ہوا جہاں ان لوگوں کو مصیبت پہنچی، اور جب مسلمانوں کو اللہ کا فضل شامل حال ہو جائے، فتح یابی نصیب ہو جائے یا مالِ غنیمت مل جائے تو ایسے طور پر خودغرضی کے ساتھ کہ گویا مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ یوں کہتا ہے کہ ہائے کیا خوب ہوتا جو میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا اور مجھے بھی بڑی کامیابی حاصل ہوتی۔ مجھے بھی مال و دولت مل جاتا۔ چونکہ منافق دل سے مسلمانوں کا ساتھی نہیں اس لئے اُن پر جو اللہ کا فضل ہوا اُس فضل پر اُسے خوشی نہیں۔ بلکہ اُسے اس کا افسوس ہے کہ میں ساتھ نہ ہوا اور مالِ غنیمت سے محروم رہ گیا۔ جو لوگ دل سے مسلمان ہیں وہ اگر کسی وجہ سے جہاد میں نہ گئے اور مسلمانوں کو کامیابی ہوگئی تو وہ اس پر ایسی ہی خوشی مناتے ہیں جیسا کہ اُن کے ساتھ جاتے اور فتح یابی میں شریک ہوتے، منافق دنیا دار مال کا لالچی اس غم میں ڈوب رہا ہے کہ ہائے میں اُن کے ساتھ نہ ہوا، اور اس کے نزدیک مال ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے نزدیک اعلائے کلمۃ اللہ اور کفر اور اہلِ کفر کی شکست سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اس کے بعد فرمایا فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ یعنی جو لوگ طالبِ دنیا ہیں اپنی دنیا بنانے کے لئے آخرت کو چھوڑ رہے ہیں اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بھی مسلمانوں کی طرح سے اللہ کی راہ میں جنگ لڑیں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے گھروں سے نکلیں کفر کو دبائیں اور کافروں کو شکست دیں۔ هذا اذا كان شرى بمعنى اشترى یعنی الذین يختارون الدنيا على الأخرة وجاز ان يكون بمعنى يَبِيْعُوْن فيكون المراد من الموصول المؤمنون ويكون المعنى ان صدهم المنافقون فليقاتلوا فى سبيل الله ولا يبالوا بالمنافقين الذين يصدونهم۔ (یعنی یہ معنی اس صورت میں ہونگے جبکہ شری بمعنی اشتری ہو یعنی وہ لوگ جو آخرت کے بدلہ دنیا کو اختیار کر رہے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ یشرون بمعنی یبیعون ہو تو اس صورت میں اسم موصول الذین سے مؤمنین مراد ہونگے اور معنی یہ ہوگا اگر منافقین مؤمنین کو روکیں تو مؤمنین کو چاہئے کہ وہ اللہ کے راستے میں لڑتے رہیں اور منافقین کے روکنے کی پرواہ نہ کریں)۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت......اس کے بعد اللہ کی راہ میں قتال کرنے والوں کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا یعنی جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا وہ خواہ مقتول ہو جائے خواہ غالب ہو جائے ہر حال میں اس کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے اصل تو آخرت ہی کا اجر ہے اور دنیا میں جو مالِ غنیمت مل جائے

وہ مومن کا مقصود نہیں وہ الگ سے اللہ کا فضل ہے، اس میں منافقوں کو تنبیہ ہے کہ جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت مل جاتا ہے تو افسوس کرتے ہیں کہ ہائے ہم ساتھ نہ ہوئے ہم کو بڑی کامیابی حاصل ہوتی حالانکہ مال بڑی کامیابی نہیں ہے آخرت کا اجر بڑی کامیابی ہے، سچے دل سے ایمان قبول کر کے اللہ کی رضا کے لئے اللہ کے دشمنوں سے لڑیں۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت مل جانے سے اجر ضائع نہیں ہوتا کیونکہ مومن مخلص کی نیت مال حاصل کرنے کی نہیں ہوتی وہ تو صرف اللہ کی رضا کے لئے لڑتا ہے۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ

اور تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ضعیفوں کی خاطر جن میں مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جنگ نہ کرو

الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ

جو یوں کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب نکال ہم کو اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی

لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۚۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ

حمایت کرنے والا اور ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار بنا دے۔ جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں

سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ

جنگ کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، سو تم شیطان کے

اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾

دوستوں سے جنگ کرو بلاشبہ شیطان کی تدبیر ضعیف ہے۔

قتال کے دواعی ہوتے ہوئے قتال کیوں نہیں کرتے؟

اس آیت میں مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہ کرو۔ قتال نہ کرنے کا تو کوئی عذر ہے ہی نہیں قتال کرنے کا ایک بہت بڑا داعیہ موجود ہے اور وہ یہ کہ مردوں اور عورتوں اور بچوں میں جو لوگ ضعیف ہیں اور اپنے ضعف کی وجہ سے ہجرت کرنے سے عاجز ہیں اور مکہ معظمہ میں گھرے ہوئے ہیں اور مشرکین کے ظلم سے تنگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے رہنے والے ظالم ہیں جو شرک کی وجہ سے ظلم عظیم کے مرتکب ہیں اور اہل ایمان کو بھی تکلیفیں دے رہے ہیں، یہ ضعفاء مظلومین یہ دعا بھی کر رہے ہیں کہ ہمارے رب ہمارا کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارا کوئی مددگار بنا دے۔ صاحب روح المعانی ص ۸۲ ج ۵ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا قبول فرمائی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مکہ فتح ہوا اور آپ نے ان سب ضعفاء کی مدد فرمائی۔ پھر آپ نے اپنے صحابی عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی بنا دیا انہوں نے ان ضعفاء کی حمایت اور مدد کی یہاں تک کہ یہ لوگ سب سے زیادہ عزت والے ہو گئے۔

صحیح بخاری ص ۶۶۰ ج ۲ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں اور میری والدہ بھی انہیں لوگوں میں سے تھے جن کا

وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ میں ذکر ہے۔

جو حضرات ضعفاء تھے ہجرت نہ کر سکتے تھے اور مکہ معظمہ میں مشرکین کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اُن میں ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے نماز میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر (آخری رکعت میں) دُعا فرمایا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۱۳) پھر یہ حضرات کافروں کی بندش سے آزاد ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہو گئے تھے۔

مؤمن اور کافر کی جنگ میں نیتوں کا فرق ...... پھر مؤمن کافر کی جنگ کے مقاصد کا تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (الآیۃ) یعنی جو لوگ مؤمن ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ لڑتے ہیں اُن کا مقصد صرف اللہ کو راضی کرنا اور اس کے دین کو بلند کرنا ہوتا ہے اور کافر جو جنگ لڑتے ہیں وہ طاغوت یعنی شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کفر کو رواج دیں اور کفر کا غلبہ ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں کو حکم دیا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ کہ شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو۔ شیطان اپنے دوستوں کی مدد تو کرتے ہیں لیکن ان کی مدد اللہ کی مدد کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی، جب مؤمن بندے اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے میدان میں نکلتے ہیں اور ان کو اللہ کی مدد حاصل ہو جاتی ہے تو شیطان اور اس کے اولیاء راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی تھوڑی سی جماعت کے مقابلہ میں عاجز رہ جاتے ہیں۔ اور شیطان اور اس کی ساری تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں، بس اہلِ ایمان میں ایمان کی قوت اور اخلاص یعنی جہاد فی سبیل اللہ ہونا چاہیئے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ

کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو،

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ

پھر جب اُن پر جنگ کرنا فرض کیا گیا تو اس وقت ان میں سے ایک فریق لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جیسا اللہ سے ڈرتے ہوں بلکہ اس سے

خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ

بھی زیادہ ڈرنے لگے اور کہنے لگے کہ اے رب آپ نے ہم پر جنگ کیوں فرض کی ہم کو تھوڑی مدت کے لئے مہلت کیوں نہ دی،

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۚ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا نفع تھوڑا سا ہے اور آخرت بہتر ہے اس کیلئے جو پرہیزگاری اختیار کرے اور تم لوگوں پر کھجور کی گٹھلی کے تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

قتال سے پہلوتہی کرنے والوں کا تذکرہ

لباب النقول ص ۷۴ میں بحوالہ نسائی اور مستدرک حاکم حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور اُن کے بعض ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے) اور انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی ہم جب مشرک تھے تو عزت میں تھے پھر جب ہم ایمان لے آئے تو ذلت والے ہو گئے (لہٰذا ہمیں دشمنانِ دین سے جنگ کرنا چاہیے) آپ نے فرمایا کہ مجھے معاف اور درگذر کرنے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا جنگ نہ کرو جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ پہنچا دیا تو قتال کا حکم دیا اس وقت لوگ جنگ کرنے سے بچنے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے تو جہاد اور قتال کا شوق رکھتے تھے اور اس کی اجازت چاہتے تھے اس وقت اُن سے کہا گیا تھا کہ ابھی قتال نہ کرو نمازیں پڑھتے رہو اور زکوٰتیں دیتے رہو لیکن جب قتال کا حکم آ گیا اور قتال فرض قرار دے دیا گیا تو وہی لوگ جو قتال کی خواہش ظاہر کرتے تھے ان پر بزدلی سوار ہوگئی اور بزدلی بھی معمولی نہیں۔ اُن میں سے ایک جماعت لوگوں سے خوف کھانے لگی جیسے اللہ سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ اے ہمارے رب آپ نے ابھی سے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا۔ ہمیں تھوڑی سی مہلت اور مل جاتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ پہلے سے جہاد کا مطالبہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہر حال میں یہ الفاظ تو اعتراض کے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا مؤمن کی شان نہیں۔ عام مؤمنین بھی ایسی بات نہیں کہتے چہ جائیکہ حضرات صحابہؓ ایسا کہیں۔ اس کے جواب میں علامہ بغویؒ معالم التنزیل ص ۴۵۳ ج ۱ میں لکھتے ہیں کہ یہ الفاظ منافقین نے کہے تھے (یہ بات جب صحیح ہوسکتی ہے جبکہ مدینہ منورہ میں بھی فرضیت جہاد سے پہلے جہاد کی اجازت طلب کی گئی ہو اور ایسا ممکن ہے کہ ہجرت سے پہلے بھی جہاد کا مطالبہ کیا گیا ہو اور ہجرت کے بعد بھی اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ ان کے جواب میں اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ادائے زکوٰۃ کا بھی حکم ہے اور یہ معلوم ہے کہ زکوٰۃ مدینہ منورہ میں فرض ہوئی) علامہ بغویؒ نے دوسرا قول یہ لکھا ہے کہ یہ قول ایسے مسلمانوں سے سرزد ہوا جو علم میں راسخ نہ تھے۔ خوف اور بزدلی کی وجہ سے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے، بطور اعتقاد ایسا نہ تھا پھر بعد میں انہوں نے توبہ بھی کر لی، اور تیسرا قول یہ لکھا ہے کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی پہلے مؤمن تھے جب قتال فرض ہوا تو بزدلی کی وجہ سے منافق ہوگئے اور جہاد سے پیچھے رہ گئے۔

حُبِّ دنیا بزدلی کا سبب ہے ...... بہر حال جو بھی صورت ہو (اعتراض ہو یا صورتِ اعتراض) اس کا باعث بزدلی تھا اور بزدلی انسان پر حبِ دنیا کی وجہ سے طاری ہو جاتی ہے۔ اگر آخرت کی محبت ہو (جو باقی رہنے والی ہے) اور حقیر دنیا سے بے رغبتی ہو تو لڑنا مرنا اور اللہ کے لئے جان دینا سب آسان ہو جاتا ہے اسی لئے ان کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ کہ آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا فائدہ ذرا سا ہے، دنیا اوّل تو پہلے ہی تھوڑی ہے پھر اس تھوڑی میں سے بھی جس کو ملی ہے تھوڑی سی ملی ہے۔ اس ذرا سی دنیا کی وجہ سے آخرت کی رغبت نہ کرنا ناسمجھی ہے۔ مزید فرمایا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (آخرت بہتر ہے اس شخص کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے) تقویٰ اختیار کرنے میں کفر و شرک سے بچنا اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنا سب کچھ داخل ہے۔ اہلِ تقویٰ کے لئے آخرت ہی بہتر ہے اور دنیا (خواہ کتنی ہی زیادہ ہو) آخرت کی ذرا سی نعمت کے سامنے ہیچ ہے۔ پھر دنیا فانی ہے اسے ختم ہونا ہی ہے اور اس کے ختم ہونے سے پہلے دنیا والے ختم ہو جائیں گے۔ اور آخرت ابدالآباد تک ہے، باقی کا فانی سے اعلیٰ اور افضل ہونا ظاہر ہے۔

پھر فرمایا وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا کہ تم لوگوں پر (فتیل کے برابر یعنی) ذرا سا بھی ظلم نہ کیا جائے گا ہر عمل خیر پر پورا پورا بدلہ ملے گا بلکہ جس قدر عمل کیا چند در چند کر کے اس پر اجرِ عظیم عطا کیا جائے گا، پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ فتیل کھجور کی گٹھلی کے گڑھے میں جو تاگا ہوتا ہے اُسے کہا جاتا ہے اور اہلِ عرب اسے حقیر چیز کے لئے بطورِ مثال پیش کیا کرتے تھے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ

تم جہاں بھی ہو تم کو موت پکڑ لے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں کے اندر ہو اور اگر اُن کو کوئی اچھی

حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ

حالت پیش آ جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، اور اگر اُن کو کوئی بری حالت پیش آ جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری وجہ سے ہے،

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

آپ فرما دیجئے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے،سو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ

تجھے جو کوئی اچھی حالت پہنچ جائے سو وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور تجھے جو کوئی بری حالت پہنچ جائے سو وہ تیری طرف سے ہے، اور ہم نے

اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

آپ کولوگوں کے لئے پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی ہے گواہی دینے والا۔

تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت پکڑ لے گی

جولوگ بزدلی اختیار کرتے ہیں اور فی سبیل اللہ جہاد کرنے سے کتراتے ہیں موت کے ڈر سے ایسا کرتے ہیں،موت کا وقت مقرر ہے جب موت آئے گی مرنا ہی پڑے گا اور جہاں کہیں بھی ہوں موت پہنچ جائے گی۔

اس آیت میں فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں موت پکڑ لے گی اگرچہ مضبوط قلعوں کے اندر ہو،موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ،صاحب معالم التنزیل ص۴۵۳ ج ا لکھتے ہیں کہ آیت اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، جب غزوۂ احد میں مسلمان شہید ہو گئے تو منافقین نے کہا کہ لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ وہ مرتے اور نہ مقتول ہوتے)اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی بات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پکڑ ہی لے گی ،اگر مضبوط قلعے میں ہو تب بھی موت سے مفر نہیں۔

منافقوں اور یہودیوں کی احمقانہ باتیں…… جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ لوگ کہنے لگے کہ جب سے ان کی آمد ہوئی ہے ہمارے پھل کم ہوتے جارہے ہیں اور کھیتوں کی پیداوار بھی گھٹتی جارہی ہے،انہیں جو کوئی تکلیف پہنچی یا پیداوار میں کمی ہوئی یا مہنگائی ہوگئی تو اسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی طرف منسوب کر دیا،ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کے آنے کی نحوست ہے،اچھی حالت کو تو انہوں نے اللہ کی طرف منسوب کر دیا،اور جو کوئی چیزوں کی کمی یا مہنگائی کی زیادتی ہوگئی اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا،ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کہ آپ فرما دیجئے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے فرما دیں کہ سب کچھ نعمت اور نقمت ،خوشحالی اور بدحالی اللہ ہی کی طرف سے ہے،میرا اس میں کوئی دخل نہیں ،نعمت تو محض اللہ کے فضل سے ہے،اور نقمت و مصیبت کے آنے میں تمہاری بداعمالیوں کو بھی دخل ہے۔لیکن ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ سے۔

پھر فرمایا فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس نہیں پھٹکتے)باتوں کو سمجھتے تو کیا سمجھنے کے پاس بھی نہیں گذرتے ان کا جہل ان پر غالب ہے۔(روح المعانی ص۸۸ ج۵)

پھر فرمایا: مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (جو کچھ تجھے اچھی حالت پہنچ جائے وہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو کچھ تجھے بدحالی پہنچ جائے وہ تیری طرف سے ہے) یہ خطاب ہر انسان کو ہے اور اس میں اچھی حالت، بری حالت پیش آنے کا قانون بتا دیا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اس کا کوئی حق واجب نہیں جو بھی نعمت اور اچھی حالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، نیک اعمال کرنے سے بھی اللہ پر کسی کا کچھ حق واجب نہیں ہوتا۔ نیک اعمال پر جو نعمتوں اور برکتوں کے وعدے ہیں وہ سب اس کا فضل ہے، اور جو کوئی نعمت یا مصیبت بدحالی انسان کو پہنچ جائے وہ انسان کے اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے ہے۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (جو کچھ تم کو دُکھ تکلیف پہنچ جائے سو وہ تمہارے اپنے کئے ہوئے اعمال کی وجہ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سے اعمالِ بد سے درگذر فرما دیتے ہیں) مصیبتیں آتی ہیں تو انسانوں کے اعمال کی وجہ سے لیکن اس میں مؤمن بندوں کو یہ فائدہ ہو جاتا ہے کہ ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

آخر میں فرمایا: وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ عظیم یعنی رسالت کا بیان ہے، لفظ لِلنَّاسِ میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ تمام انسانوں کے لئے رسول ہیں اور وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا میں یہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص آپ کی رسالت کا منکر ہو تو اس کے انکار سے آپ کے منصب رسالت میں کوئی فرق نہیں آتا، منکرین کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، آپ کی رسالت پر اللہ کا گواہ ہونا کافی ہے۔

بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر گواہ ہے سب کے اعمالِ خیر و شر سے باخبر ہے وہ سب کا بدلہ دے دیگا۔ (روح المعانی ص ۹۰۔۹۱ ج ۵) یہ مطلب لینا بھی مضمونِ سابق کے مناسب ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰

جو شخص فرمانبرداری کرے رسول کی تو اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی، اور جس نے رُوگردانی کی سو ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے

اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اللہ ہی کی فرمانبرداری ہے۔ معالم التنزیل ص ۴۵۵ ج ۱ میں اس کا سببِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من احبنی فقد احب اللہ (جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی) تو بعض منافقین نے کہا کہ بس جی یہ آدمی تو یہی چاہتا ہے کہ ہم اسے رب ہی بنالیں۔ جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو رب بنایا تھا اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ جس میں یہ بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ ہی کی فرمانبرداری ہے کیونکہ آپ جو کچھ حکم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ پیغام پہنچانے والے کے واسطہ سے جو پیغام پہنچے اور اس پر عمل کیا جائے وہ پیغام بھیجنے والے کے ہی حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پیغام لانے والا رب ہو جائے۔ نصاریٰ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے درجہ سے آگے بڑھا دیا ان کو خدا کا بیٹا بتا دیا اور ان کو الوہیت کا درجہ دے دیا۔ کہاں نصاریٰ کی جہالت اور حماقت اور کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فتنہ انکارحدیث پر ایک نظر...... دورِ حاضر میں جن لوگوں نے انکارِحدیث کا فتنہ اٹھا رکھا ہے۔ آیتِ شریفہ میں ان کا بھی جواب ہے یہ لوگ عوام کو طرح طرح کی باتیں کر کے بہکاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجت نہیں (العیاذ باللہ) قرآن مجید میں جگہ جگہ اطاعتِ رسول اور اتباعِ رسول کا حکم دیا ہے اور آپ کو مقتدیٰ بتایا ہے اور فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور آپ کے بارے میں فرمایا ہے يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (وہ حلال قرار دیتے ہیں ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو اور خبیث چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتے ہیں) قرآن مجید مجمل ہے تفصیلی احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو شرعی حجت نہ مانے وہ درحقیقت قرآن کا بھی منکر ہے۔ منکرینِ حدیث نے اہلِ قرآن ہونے کا لیبل تو لگا لیا اور حقیقت میں قرآن وحدیث دونوں کے منکر ہیں جو قرآن ماننے کا دعویدار ہے وہ قرآن کی اس بات کو کیوں نہیں مانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع اور اقتداء فرض ہے اور آپ کے اتباع کو اللہ کا محبوب بننے کا ذریعہ بتایا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

آپ کا کام صرف ابلاغ ہے...... پھر فرمایا وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (کہ جو شخص روگردانی کرے آپ کی ہدایت قبول نہ کرے راہِ حق اختیار نہ کرے تو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آپ کے ذمہ پہنچا دینا ہے زبردستی عمل کروانا آپ کے ذمہ نہیں ہے) اگر کوئی شخص ایمان قبول نہ کرے تو آپ سے کسی قسم کی بازپرس نہیں۔ کما قال تعالیٰ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا و کما قال تعالیٰ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ. لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ.

صاحب معالم التنزیل اور صاحب درمنثور نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ یہ جہاد فرض ہونے سے پہلے کی بات ہے جب کہ آپ کی بعثت کا ابتدائی زمانہ تھا بعد میں جہاد کا اور سختی کرنے کا حکم نازل ہوا۔ اور جن آیات میں قتال کا حکم ہے وہ اس مضمون کے لئے ناسخ ہوگئیں۔

نسخ کی بات اسی صورت میں صحیح ہے جبکہ آیت کا مضمون یہ ہو کہ ابھی جہاد و قتال نہ کرو، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہو کہ آپ ہدایت قبول نہ کرنے والوں کی طرف سے فکرمند نہ ہوں کیونکہ آپ کے ذمہ صرف پہنچانا ہے۔ قبول کرانا نہیں ہے تو منسوخ کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ز فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ط وَاللّٰهُ يَكْتُبُ

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا کام بات ماننا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ اس بات کے خلاف کہتے ہیں جو وہ کہہ چکے تھے، اور اللہ لکھتا

مَا يُبَيِّتُوْنَ ج فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ

ہے جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کرتے ہیں، سو آپ ان کی طرف سے اعراض کریں اور اللہ پر بھروسہ کریں، اور اللہ کافی ہے کارساز۔ کیا وہ قرآن میں

الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾

غور نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی غیر کے پاس سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

منافقین کی ایک عادتِ بَد کا تذکرہ

اس آیت میں منافقین کی ایک عادت بد کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ جب آپ کی خدمت عالی میں موجود ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم آپ کے حکم سے کیسے باہر ہو سکتے ہیں ہمارا کام تو بات ماننا اور فرمانبرداری کرنا ہے (ای امرنا وشاننا طاعة) علی انه خبر مبتدأ محذوف پھر جب آپ کی مجلس سے باہر نکل جاتے ہیں اُن میں سے ایک جماعت (یعنی اُن کے رؤساء) راتوں کو اس بات کے علاوہ مشورے کرتے ہیں جو انہوں نے آپ کی مجلس میں کہا تھا۔ یعنی آپ کے ارشاد کے خلاف چلتے ہیں اور آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور خلاف ورزی کے منصوبے بناتے ہیں۔

وَاللّٰهُ یَکْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ (اور اللہ لکھتا ہے جو وہ رات کو مشورے کرتے ہیں) وہ دنیا اور آخرت میں ان کے عمل کا بدلہ دے دیگا۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (اُن سے اعراض کیجئے) اور ان سے بدلہ لینے کا فکر نہ کیجئے۔ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ (اور اللہ پر بھروسہ کیجئے) تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے۔ وَکَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیْلًا (اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا) وہی آپ کے سب کام بنائے گا۔ ان کے شر اور ضرر سے بھی محفوظ فرمائے گا۔ (روح المعانی ص ۵۲ ج ۵)

قرآن میں تدبر کرنے کی ترغیب ...... پھر فرمایا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (الآیۃ) کیا یہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر قرآن میں غور و فکر کریں تو ان کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ قرآن اللہ ہی کی طرف سے ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں جن کے رسول ہونے کی گواہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دی ہے وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا اور اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ اور کہیں سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔ اس کی خبروں میں بھی تعارض ہوتا۔ اس کی نظم و بلاغت میں تفاوت ہوتا۔ بعض خبریں صحیح ہوتیں اور بعض غلط ہوتیں، کہیں معنی فاسد ہوتا کہیں صحیح ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس کے الفاظ، معانی اور اخبار میں کہیں کچھ کہنے اور انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ قرآن نے مقابلے میں ایک آیت لانے کا چیلنج کیا جو اَب تک قرآن میں موجود ہے اور اب بھی سارے انسانوں کو چیلنج ہے۔ کوئی بھی اس کے مقابل نہ لا سکا اور نہ اس پر کوئی اعتراض کر سکا۔ اور اپنی بدفہمی سے جس کسی نے کوئی اعتراض کیا اس کا جواب اس کو قرآن ہی میں مل گیا۔ یا اہلِ دانش نے اس کا جواب دے دیا۔ (روح المعانی ص ۹۲۔۹۳ ج ۵)

قرآن میں تدبر کرنے کے اہل کون ہیں؟ ...... آیتِ بالا میں تدبرِ قرآن کی دعوت دی گئی ہے جن لوگوں کو اللہ نے علم و فہم دیا ہے وہ قرآن میں تدبر کریں ہر شخص اپنے اپنے فہم اور استعداد کے مطابق تدبر کر سکتا ہے اور جہاں کہیں کچھ سمجھ میں نہ آئے یا کوئی اشکال ہو تو اہلِ علم سے رجوع کرے۔ اہلِ فہم کے درجات مختلف ہیں اور تدبر کی صورتیں بھی مختلف ہیں معانی میں تدبر، حقائق و معارف کی تلاش، احکام و مسائل کا استنباط، فصاحت و بلاغت کی گہرائی میں اُترنا، اسلوب و بیان کو دیکھنا یہ سب تدبر میں آتا ہے حضرات ائمہ مجتہدینؒ نے خوب تدبر کیا مسائل کا استنباط کیا، معارف و حقائق کو سمجھا۔ اُن کے بعد دوسرے علماء بھی تدبر کرتے رہے ہیں انہوں نے بھی قرآن سے مسائل کا استنباط اور اثبات کیا ہے۔

تدبر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذرا بہت عربی اور اُردو پڑھے ہوئے لوگ جنہیں نہ صیغوں کی پہچان نہ علم الصرف کا علم نہ وجوہ اعراب کا پتہ نہ مشتق و مشتق منہ کی خبر نہ حروفِ اصلیہ اور زائدہ کا علم ان جیسے لوگ تدبر کرنے لگیں اور اپنے آپ کو علماءِ راسخین کے برابر سمجھ کر جو اپنی سمجھ

میں آئے اُسی کو قرآن کا مطلب بتانے لگیں یہ تو ان کی جہالت ہوگی۔

تفسیر بالرائے کی قباحت......لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن پر مولویوں کی ہی اجارہ داری کیوں ہے۔ہم اہلِ فہم ہیں اور اہل علم ہیں ہم بھی قرآن کا مطلب بتا دیتے ہیں۔ان میں سے بعض جاہلوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو درمیان سے نکال دیا اور کہنے لگے کہ قرآن اللہ نے ہمارے پاس بھیجا ہے ہم خود سمجھ لیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی ضرورت نہیں۔(العیاذ باللہ) جو شخص قرآن لانے والے سے قرآن نہ سمجھے گا اور قرآن لانے والے کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کو درمیان سے نکال دے گا وہ تفسیر بالرائے کرے گا۔تفسیر بالرائے گمراہی ہے بہت سے لوگ علم کے بغیر قرآن کی تفسیر لکھنے بیٹھے تو گمراہ ہوگئے اور اپنے اتباع اور اذناب کو گمراہی میں ڈال گئے۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔**من قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار** (کہ جس شخص نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنالے)اور حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من قال فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطأ** کہ جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور ٹھیک کہا تب بھی اس نے غلط کام کیا (رواھما الترمذی کمافی المشکوٰۃ ص ۳۵)

معلوم ہوا کہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنا ممنوع ہے۔اگر کوئی بات ٹھیک بھی کہہ دی تب بھی خطا کی کیونکہ جو منصب اس کا نہیں تھا اس نے اس کو اختیار کرلیا۔قرآن میں تدبر کریں تو تدبر کے قابل بنیں۔

رہی یہ بات کہ قرآن پر مولویوں کی اجارہ داری کیوں ہے تو یہ جاہلانہ سوال ہے۔جب علاج پر ڈاکٹروں کا قبضہ ہے اور قانون سازی پر قانون دانوں کا قبضہ ہے اور انجینئرنگ کے کاموں پر انجینئروں کا قبضہ ہے تو قرآن کے معانی اور مفاہیم بتانے کے لئے قرآن کے عالم کا قبضہ کیوں نہ ہوگا؟ شاید کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گذرے کہ قرآنِ حکیم میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا پھر اس کا تدبر اور سمجھنا سب کے لئے آسان کیوں نہیں؟ اس وسوسے کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن آسان ہے، مگر اصول وقواعد کے ساتھ آسان ہے کوئی بھی آسان چیز اپنے قاعدوں اور اصولوں کے بغیر آسان نہیں ہوتی۔مثلاً سب سے آسان کام حلوہ کا لقمہ نگل لینا ہے اور اُسے آسانی کی مثالوں میں بیان کیا جاتا ہے مگر نگلنے سے پہلے چینی، سوجی، گھی وغیرہ کا انتظام کرنا، بنانے اور پکانے کا طریقہ جاننا پھر قاعدے کے مطابق اسے تیار کرنا پھر لقمہ اٹھا کر منہ تک لے جانا تو بہر حال ضروری ہے۔قرآن آسان تو ہے مگر عربی میں ہے۔عربی سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے اُن کے بغیر قرآن سمجھنے کا ارادہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص نہ حلوہ بنانے کی چیزوں سے واقف ہو نہ حلوہ بنائے نہ منہ تک لے جائے مگر حلوہ کا لقمہ نگلنے کی مجنونانہ حرکت کرنے لگے۔قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا سمجھ لینا اور حرام وحلال جان لینا تو اس قدر آسان ہے کہ جس نے قرآن نہ پڑھا اس کے سامنے بیان کر دیئے جائیں تو وہ بھی سمجھ لے گا لیکن اوّل سے آخر تک پورے قرآن مجید کی تفسیر جاننا اور معارف ودقائق کا نکالنا۔مجمل ومبہم کی تعیین کرنا۔مشترک الفاظ کے معانی میں سے کسی ایک کو سیاق وسباق دیکھ کر طے کرنا اس کے لئے بہر حال عربیت کا بھر پور علم ہونا ضروری ہے۔

اس زمانہ کے جُہلاء اپنی طرف سے قرآن کا مطلب بتانے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے اور جن کی عمریں قرآن فہمی میں ختم ہوگئیں۔وہ لب کھولتے ہوئے لرزتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی احتیاط......حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ قرآن سے واقفیت رکھنے والا آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعد کون ہوسکتا ہے جب اُن سے سورۂ عبس کی آیت وَفَاکِهَةً وَّاَبًّا کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا کہ اَیُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِیُ اَوُ اَیُّ اَرُضٍ تُقِلُّنِیُ اِنُ قُلتُ فِیُ کِتَابِ اللّٰهِ مَالاَ اَعُلَمُ (تاریخ الخلفاء) مجھے کون سا آسمان سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اگر میں اللہ کی کتاب کے بارے میں وہ بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں۔

مفسر کی ذمہ داریاں...... مفسر کے لئے ضروری ہے کہ اوّلاً قرآن کی تفسیر خود قرآن شریف ہی میں تلاش کرے کیونکہ قرآن شریف میں اکثر ایسا ہے کہ ایک آیت کی توضیح وتفسیر دوسری آیات میں مل جاتی ہے۔ اگر کسی جگہ کی تفسیر قرآن شریف میں نہ ملے تو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں تلاش کرے کیونکہ سنتِ نبویہ (علی صاحبها الصلوۃ والتحیه) قرآن شریف کی مستند اور معتمد مفسر اور بہترین شارح ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ذاتِ گرامی پر قرآن نازل ہوا اس نے جو قرآن کی تفسیر کی ہو وہ سراسر حق ہوگی اور اس کے خلاف جو بھی شخص تشریح کرے گا وہ اور اس کی تفسیر مردود ہوگی۔ قال اللہ تعالٰی اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ ط

اگر کسی آیت کی تفسیر حدیث شریف میں بھی نہ ملے تو حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال کی طرف رجوع کرے کیونکہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن شریف کے سب سے زیادہ عالم تھے۔ حضراتِ صحابہؓ نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور اُن قرائن واحوال سے باخبر تھے جو نزولِ قرآن کے وقت سامنے آتے رہتے تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے فہم کامل، علمِ صحیح اور عملِ صالح کی دولت سے مالا مال تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنے صحابہؓ کو قرآن شریف کے الفاظ سکھاتے تھے۔ اسی طرح قرآن شریف کے معانی بھی بیان فرماتے تھے۔

ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ نے بیان کیا کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہم نے فرمایا کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھتے تھے تو جب تک اُن سے متعلقہ علم وعمل کو نہ جان لیتے تھے (دوسرے سبق کے لئے) آگے نہ بڑھتے تھے، قرآن اور قرآن کا علم وعمل ہم نے سب ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔

بے پڑھے مفسرین کو تنبیہ...... یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جو بھی آدمی کسی فن کی کتاب پڑھتا ہے (مثلاً حساب یا طب کی کتاب) تو ضرور بالضرور اس کے معانی اور مطالب کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کی مقدس کتاب کے معانی اور مطالب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم نہ کئے ہوں، حالانکہ قرآن کو نجات کا ذریعہ اور دونوں عالم کی صلاح وفلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

قرآن وحدیث اور تفسیر صحابہؓ پر جسے عبور نہ ہوا ایسا شخص محض عربی دانی کے زور پر جو قرآن کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرے گا ضرور گمراہ ہوگا اور امت کو گمراہ کرے گا۔ قرآن کے صحیح مطالب واضح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ عقیدہ اور عمل درست ہو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو جن عقائد واعمال پر ڈالا تھا اُن کا پابند ہو، فسق وفجور اور الحاد وزندقہ سے پاک ہو۔ قرآن پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کی نیت قرآن کو اپنے نظریہ اور خود ساختہ معنی پر چپکانے کی نہ ہو۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

اور جب اُن کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آ جاتی ہے تو اُسے مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر اس خبر کو پہنچا دیتے رسولؐ کی طرف

وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

اور اُن لوگوں کی طرف جو اُن میں سے فہم رکھنے والے ہیں تو ان میں جو ایسے حضرات ہیں جو اس سے استخراج کر لیتے ہیں وہ اس کو جان لیتے اور اگر تم پر اللہ

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے سوائے چند آدمیوں کے۔

غیر محقق بات کو پھیلانے کی مذمت اور خبروں کو اہلِ علم تک پہنچانے کی اہمیت

صحیح مسلم ص ۴۸۰ ج ۱ میں ایک تفصیلی واقعہ ذکر کیا ہے جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (طلاق دیئے بغیر کچھ عرصے کے لئے) ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار فرمائی تھی اس بات کی خبر لوگوں کو پہنچی تو اس کو طلاق پر محمول کر کے آگے بڑھانا شروع کر دیا اور یہ مشہور ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بارگاہِ رسالت میں حاضری کی اجازت چاہی، اجازت مِل جانے پر خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے اور سوال لیا یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں! عرض کیا کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو وہاں لوگ جمع تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی، آپؐ کی اجازت ہو تو میں اُن کو بتادوں کہ آپؐ نے طلاق نہیں دی آپؐ نے فرمایا اگر چاہو تو بتادو میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر اعلان کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی اور یہ آیت نازل ہوئی (جس کا اوپر ترجمہ کیا گیا) لہٰذا میں اُن لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس امر کا کھوج لگایا اور تحقیق کی کہ آپؐ نے واقعی طلاق دی ہے یا طلاق کی بات غلط مشہور ہو گئی۔

منافقین کی عادتِ بَد کا تذکرہ۔۔۔۔۔ علامہ بغویؒ معالم التنزیل ص ۴۵۶ ج ۱ میں لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف علاقوں میں فوجی دستے بھیجا کرتے تھے۔ جب وہاں سے واپس ہوتے تو منافقین جلدی سے آگے بڑھ کر اُن سے پوچھتے تھے کہ نتیجہ کیا ہوا آپ لوگ غالب ہوئے یا مغلوب ہوئے وہ حضرات باخبر کر دیتے تھے تو یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بات پہنچنے سے پہلے اس خبر کو پھیلا دیتے تھے (اگر شکست و ہزیمت کی خبر ہوتی تو اس سے نقصان پہنچتا تھا کیونکہ) اس سے مؤمنین کے قلوب میں ضعف پیدا ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا کہ جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی (یعنی فتح اور غنیمت کی) یا کوئی خبر خوف کی (یعنی قتل اور شکست کی) پہنچ جاتی ہے تو اسے شہرت دے دیتے ہیں اور اگر اس خبر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاتے اور اُن لوگوں کے پاس لے جاتے جو صحابہؓ میں صاحب رائے حضرات ہیں تو ان میں جو اہلِ علم ہیں جو بات کو سمجھتے ہیں اونچ نیچ کو جانتے ہیں اس کی گہرائی میں اترتے ہیں وہ اس کو سمجھتے اور اپنے علم کے مطابق عمل کرتے، جو چیز چھپانے کی تھی پھیلانے کی نہ تھی اُسے آگے نہ بڑھاتے اور جو چیز آگے بڑھانے کی تھی اُس کو آگے بڑھاتے اور پھیلا دیتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ علم اور اصحابِ رائے صحابہؓ تک پہنچانے سے پہلے ہی خبر کو اُڑا دینے سے مسلمانوں کو نقصان ہونے کا اندیشہ تھا لیکن چونکہ منافقین کو مسلمانوں کی خیریت مطلوب ہی نہ تھی اس لئے ذرا احتیاط نہ کرتے تھے اِدھر بات کو سنا اُدھر اس کو پھیلا دیا۔ بات کا نشیب و فراز کیا ہے اس طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا، لفظ يَسْتَنْۢبِطُوْنَ استنباط سے مضارع کا صیغہ ہے استنباط لغت میں زمین کے اندر سے پانی نکالنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں بات کی

تحقیق کرنے اور اس کی اونچ نیچ کو سمجھنے اور اس کی گہرائی میں اترنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اللہ کا فضل اور رحمت ...... پھر فرمایا وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیرو ہو جاتے سوائے چند آدمیوں کے) اللہ تعالیٰ نے دین اسلام بھیجا جو اس کا فضل ہے اور قرآن نازل فرمایا جو اس کی رحمت ہے ارشاد ہے کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم سب لوگ شیطان کے پیچھے لگ لیتے بجز چند افراد کے یہ چند افراد وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور نزولِ قرآن سے پہلے دینِ فطرت پر تھے اور توحید اختیار کئے ہوئے تھے شرک سے متنفر تھے جیسا کہ زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل وغیرہما۔ مشرکین کے ماحول میں رہتے ہوئے عقل کی رہنمائی سے توحید اختیار کرنا بھی اللہ ہی کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے لیکن چونکہ رسول کا بھیجنا اور کتاب کا نازل فرمانا خاص فضل اور خاص رحمت ہے اس لئے یوں فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم سب شیطان کا اتباع کر لیتے بجز چند لوگوں کے۔ (از معالم التنزیل ص ۴۵۶ ج ۱)

فائدہ (۱) .... آیتِ شریفہ کے ترجمہ اور سببِ نزول سے معلوم ہوا کہ جب کوئی بات سننے میں آئے تو اس کی تحقیق کی جائے۔ سنتے ہی اس کو آگے بڑھانا شروع نہ کر دے کیونکہ غلط ہونے کا امکان ہے، ہر سُنی ہوئی بات صحیح نہیں ہوتی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ (کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے اُسے آگے بیان کر دے) (رواہ مسلم فی مقدمتہ) آجکل نہ صرف یہ کہ سنی ہوئی باتوں کی نقل کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں بلکہ خود خبریں گھڑی جاتی ہیں اور اُن کو شائع کیا جاتا ہے اور جھوٹی خبروں کے ذریعے پیسے کمائے جاتے ہیں۔ جماعتیں اور حکومتیں ایسے افراد مہیا کرتی ہیں جنہیں پیسے دے کر جھوٹی خبریں بنانے اور پھیلانے کے کام پر لگایا جاتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے جو قرآن مجید سے بالتصریح معلوم ہوئی کہ جو خبر سچی بھی ہو اس کے پھیلانے اور آگے بڑھانے میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ سچی خبر کے پھیلانے سے بھی بعض مرتبہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔ منافقین جنگ سے واپس آنے والے حضرات سے فتح اور شکست کی صورتحال معلوم کر کے پھیلا دیتے تھے۔ اس پر اُن کو عتاب ہوا اور فرمایا کہ اگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ رائے تک پہنچا دیتے تو وہ اس کی اونچ نیچ اور نشیب و فراز کو سمجھ لیتے۔ پھر اس کو پھیلانا مناسب ہوتا تو پھیلا دیتے، اور اس میں جو سمجھنے کی بات ہوتی اس کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ بہر حال سننے میں پھر تحقیق کرنے میں پھر بات کے آگے بڑھانے میں احتیاط کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

فائدہ (۲) .... علامہ بغویؒ معالم التنزیل ص ۴۵۶ ج ۱ میں لکھتے ہیں **وفی الآیة دلیل علی جواز القیاس فان من العلم ما یدرک بالتلاوة والروایة وھو النصّ ومنه ما یدرک بالاستنباط وھو القیاس علی المعانی المودعة فی النصوص** یعنی آیتِ بالا میں قیاس (فقہی) کے جواز کی دلیل ہے۔ کیونکہ علم کا ایک حصہ وہ ہے جو تلاوت اور روایت کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جو نص (صریح) سے معلوم ہوتی ہیں اور علم کا ایک حصہ وہ ہے جو استنباط کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ استنباط ہی قیاس ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جو معانی نصوص میں موجود ہیں ان معانی پر غیر منصوص چیزوں کو قیاس کر لیا جائے، جو امور منصوصہ ہیں اُن کے بارے میں اجتہاد و استنباط کی ضرورت نہیں، اور نصوص کے ہوتے ہوئے قیاس جائز بھی نہیں۔ البتہ جو حکم نصوص شرعیہ میں نہ ملے اور امت کو اُن کا حکم جاننے کی ضرورت ہو اس کے بارے میں اجتہاد، استنباط اور قیاس سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ حضرات ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم استنباط فرماتے تھے اور مقیس مقیس علیہ میں جو کوئی چیز جامع ہوتی تھی اس کو دیکھ کر قیاس کر لیتے تھے، جن لوگوں کو قرآن و حدیث کا

بھرپور علم ہے اور اجتہاد کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے اُن سے بھی مالا مال ہیں ایسے حضرات حوادث اور نوازل میں آج بھی اجتہاد کر لیتے ہیں لیکن ان کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ آئمہ مجتہدین اور سلف صالحین نے اس قسم کے معاملات اور حالات میں کیا رخ اختیار کیا۔ اگر ائمہ سلف کو نہ دیکھیں گے تو بے راہ ہو جائیں گے جیسا کہ بہت سے گروہ اجتہاد کے مدعی ہو کر راہِ صواب سے ہٹ چکے ہیں، ان لوگوں کا یہ عالم ہے کہ اُن کے اندر نہ تقویٰ ہے نہ انہیں پورے قرآن مجید پر عبور ہے نہ صرف نحو اور علم اشتقاق سے واقف ہیں نہ احادیث شریفہ کا ذخیرہ ان کے پیش نظر ہے مگر دعویٰ اجتہاد ہے۔ ایسے لوگوں کے اجتہاد سے دور رہنا لازم ہے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ

سو آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجئے آپ مکلّف نہیں ہیں مگر اپنی جان کے، اور ایمان والوں کو ترغیب دیجئے، عنقریب اللہ کافروں

بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

کے زور کو روک دے گا اور اللہ بہت سخت ہے زور کے اعتبار سے، اور بہت سخت ہے سزا دینے کے اعتبار سے۔

اللہ کی راہ میں قتال کیجئے، اہلِ ایمان کو ترغیب دیجئے

علامہ بغویؒ معالم التنزیل ص ۴۵۷ ج ۱ میں لکھتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے بعد آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان سے (جو مشرکینِ مکہ کا سپہ سالار تھا) وعدہ فرمالیا تھا کہ ذیقعدہ میں بدر کے موقع پر پھر جنگ ہوگی وعدہ کے مطابق جنگ کے لئے پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہوئی تو آپؐ نے لوگوں کو چلنے کے لئے دعوت دی اس پر بعض لوگوں کو ناگوار ہوا۔ لہٰذا اللہ جل شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی جس میں یہ ارشاد فرمایا کہ آپ اللہ کی راہ میں جنگ کریں اگر کوئی ساتھ نہ دے تب بھی جہاد نہ چھوڑیں آپؐ صرف اپنی جان کے مکلّف ہیں اپنی جان کے ساتھ میدان میں حاضر ہو جائیں اللہ تعالیٰ کا آپ سے نصرت کا وعدہ ہے اور مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیتے رہیں اور اس کا ثواب بتاتے رہیں۔ جو ساتھ ہوگا وہ ثواب پالے گا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ستر سواروں کو لے کر نکلے اور اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی قتال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے وعدہ فرمایا کہ عنقریب اللہ کافروں کے زور کو روک دے گا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ زور والا ہے دنیا میں جب اہلِ ایمان کی مدد فرمائے تو ان پر کوئی غالب ہونے والا نہیں اور دنیا و آخرت میں وہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے (کافروں کے لئے سخت عذاب ہے)۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ

جو کوئی شخص اچھی سفارش کرے اُسے اس میں سے حصہ ملے گا اور جو شخص بُری سفارش کرے اس کو اس میں

لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

سے حصہ ملے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اچھی سفارش کا ثواب اور بُری سفارش کا گناہ

اس آیتِ شریفہ میں شفاعت یعنی سفارش کرنے کی ترغیب دی ہے جبکہ سفارش اچھی ہو، اور سفارش کرنے پر وعید بھی بتائی ہے جبکہ

سفارش بُری ہو۔ جب کسی کا مطلوب اچھا ہو تو اس کی سفارش کر دینا ثواب کا کام ہے، سفارش سے صاحبِ ضرورت کا کام بن جائے گا اور سفارش کرنے والے کو ثواب مل جائے گا، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بات پوری طرح نہیں پہنچا سکتے اور بات کو صحیح طریقے پر نہیں کہہ سکتے اور بہت سے لوگ اپنے علم و فہم اور لسان و بیان کے اعتبار سے اپنا مقصد ادا کرنے پر قادر تو ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں سے کام ہے اُن لوگوں تک پہنچ نہیں پاتے دونوں قسم کے لوگوں کے لئے سفارش کر دی جائے تو یہ بہت مبارک ہے اور ثواب کا کام ہے، ضروری نہیں کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا کام ہو ہی جائے البتہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ضرور مل جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَاءَ. (رواہ البخاری ص ۸۹۱ ج ۲) (یعنی تم سفارش کر دیا کرو تم کو ثواب دیا جائے گا۔ اور اللہ اپنے رسول کی زبانی جو چاہے فیصلہ فرمائے گا) مطلب یہ ہے کہ تم سفارش کر کے ثواب لے لو جس کی سفارش میرے پاس لاؤ گے اس کا پورا ہونا نہ ہونا یہ دوسری بات ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی تو میرے ذریعے سے کام ہو جائے گا اگر اس کا کام نہ ہوا تب بھی تمہارا ثواب تو کہیں نہیں گیا۔ شمائل ترمذی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وَاَبْلِغُوْنِيْ حَاجَةَ مَنْ لَا يَسْتَطِيْعُ اِبْلَاغَهَا فَاِنَّهٗ مَنْ اَبْلَغَ سُلْطَانًا حَاجَةَ مَنْ لَا يَسْتَطِيْعُ اِبْلَاغَهَا ثَبَّتَ اللّٰهُ قَدَمَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی تم اس شخص کی حاجت مجھ تک پہنچا دیا کرو جو خود اپنی حاجت نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ جو شخص کسی صاحبِ اقتدار کو کسی ایسے شخص کی حاجت پہنچا دے جو خود اپنی حاجت نہیں پہنچا سکتا تو اللہ تعالیٰ شانہٗ قیامت کے دن اس کو ثابت قدم رکھے گا۔

جس طرح اچھی سفارش کرنے پر ثواب ہے اسی طرح بُری سفارش کرنے پر گرفت ہے اور بُری سفارش کرنا گناہ ہے۔ کوئی شخص کسی گناہ کے کام میں لگنا چاہتا ہے کسی ایسے محکمہ میں ملازمت چاہتا ہے جو شرعاً حرام ہے سود یا قمار کا کاروبار کرنا چاہتا ہے حرام چیزیں بیچنے کے لئے دکان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ایسے شخص کے لئے سفارش کرنا حرام ہے اور یہ شفاعت سیئہ یعنی بُری سفارش ہے، بہت سے لوگ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارا اعزیز قریب ہے یا کسی دوست کا لڑکا ہے اس کے لئے سفارش کر دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ کس مقصد اور کس عمل کے لئے سفارش کر رہا ہوں یہ عمل اور یہ مقصد حرام ہے یا حلال، گناہ ہے یا ثواب؟ گناہ کی سفارش کر کے گناہ میں شریک ہو جاتے ہیں جس کے لئے سفارش کی ہے وہ جب تک گناہ کا کام کرتا رہے گا اس کے زیرِ اثر جو لوگ گناہ کریں گے ان سب کے گناہ میں سفارش کرنے والے کی شرکت رہے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے بارے میں جس کسی کی شفاعت حائل ہوگئی تو اس نے اللہ کا مقابلہ کیا اور جس نے باطل کے بارے میں جھگڑا کیا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ باطل ہے تو وہ برابر اللہ کی ناراضگی میں رہے گا جب تک کہ باز نہ آ جائے، اور جس کسی نے کسی مؤمن کے بارے میں ایسی بات کہی جو اُس میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے دوزخیوں کے جسموں سے نکلنے والے خون پیپ میں ٹھہرا دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے نکل جائے۔ (رواہ احمد وابوداؤد کمافی المشکوٰۃ ص ۳۱۵)

مسئلہ...... اللہ تعالیٰ نے جرائم کی جو حدود مقرر فرمائی ہیں۔ اُن کے رکوانے کے لئے سفارش کرنا حرام ہے۔ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کر لی تھی۔ قریش نے چاہا کہ اس کا ہاتھ نہ کٹے انہوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لئے آمادہ کیا جب وہ سفارش کرنے لگے تو آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتشفع فی حد من حدود اللہ (کیا تم اللہ کی مقرر فرمودہ حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو۔ پھر آپؐ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے کہ کوئی اونچے خاندان کا

شخص چوری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے اور کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے تھے۔ اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری کرتی (اعاذھا اللہ تعالیٰ) تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۰۳ ج ۲)

جس طرح گناہ کے کاموں کیلئے سفارش حرام ہے اسی طرح سے نااہل کیلئے بھی سفارش نہ کرے۔ کیونکہ جس شخص کو جو کوئی چھوٹا بڑا منصب یا عہدہ یا ملازمت دلائی جائے اگر وہ اس کا اہل نہ ہو تو اس میں حکومت کی اور عوام کی خیانت ہے اور نااہل کیلئے سفارش کر دینا غدر ہے اور فریب ہے۔ سفارش کرنے میں صرف اپنے اور پرائے ہی کو نہ دیکھے بلکہ حلال و حرام کو بھی دیکھے اور اہل اور نااہل کو بھی دیکھ لیا کرے۔

فائدہ .... سفارش کی حقیقت اتنی سی ہے کہ جس شخص سے کام بن سکتا ہو اس سے کہہ دیا جائے کہ فلاں شخص کا کام کر دے یہ اچھا آدمی ہے صاحب ضرورت ہے لیکن جس سے سفارش کی جائے اس پر واجب نہیں ہو جاتا کہ جس کام کی سفارش کی گئی اسے کر ہی دے، سفارش کر کے ثواب لے لیں لیکن اگر وہ شخص کام نہ کرے تو اس کی طرف سے رنجیدہ ہونا صحیح نہیں۔ اور اسی سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ کسی طرح کا زور ڈال کر سفارش کرنا صحیح نہیں۔ جس شخص پر کوئی کام کرنا واجب نہیں وہ کرے یا نہ کرے خوشی کا سودا ہے، دباؤ ڈال کر کام کروانا سفارش کے اصول کے خلاف ہے۔

مسئلہ .... : کسی بھی طرح کی سفارش پر کسی طرح کی کوئی رقم یا ہدیہ لینا حلال نہیں اگر کچھ لے لیا تو وہ رشوت کے حکم میں ہوگا اور حرام ہوگا۔

اخیر میں فرمایا وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے) اُسے ہر چیز پر قدرت ہے وہ نیکی پر ثواب دے اور برائی پر عذاب دے اُسے کوئی روکنے والا نہیں۔ لفظ مقیتا کے بارے میں امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں قیل مقتدرا وقیل حافظا وقیل شاھدا یعنی مقیت کا ترجمہ تینوں طرح کیا گیا۔ قدرت رکھنے والا، محافظت کرنے والا اور ہر چیز کی اطلاع رکھنے والا، مفردات القرآن میں تو اتنا ہی لکھا ہے لیکن معالم التنزیل میں اس کا ایک معنی یہ بھی لکھا ہے کہ یوصل القوت الی کل حیوان یعنی وہ ہر حیوان کی طرف اس کی خوراک پہنچاتا ہے اگر یہ معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ روزی تقسیم فرمانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اگر کسی کی سفارش نہ مانی گئی تو جس کے لئے سفارش کی ہے اس کی روزی میں کچھ فرق نہ پڑے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو روزی جس کے لئے تقسیم فرما دی ہے وہ اُسے ملنی ضرور ہے۔

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾

اور جب تمہیں کسی تحیہ کے ذریعہ دعا دی جائے تو تم اُس سے اچھی دُعا دے دو، یا اُسی کو لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

النصف

سلام اور جواب سلام کے احکام و مسائل

لفظ حُیِّیْتُمْ باب تفعیل سے بروزن سُمِّیْتُمْ صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اور فَحَیُّوْا اسی سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر تَحِیَّةٌ ہے اس کا اصل معنی ہے حیاک اللہ کہنا یعنی یہ دعا دینا کہ اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ تو اس کا اصل لغوی معنی ہوا۔ پھر لفظ تحیہ ملاقات کے وقت سلام کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا کیونکہ اسلام میں زندگی کے ساتھ سلامتی کی بھی دُعا ہے۔ سورۂ نور میں ارشاد فرمایا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً پھر جب تم گھر میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو دُعا کے طور پر جو خدا کی طرف سے مقرر ہے برکت والی عمدہ چیز ہے۔

اس لئے بعض اکابر نے اذا حُيِّيْتُم کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے۔

سلام کی ابتداء: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اُن کے اندر روح پھونک دی تو ان کو چھینک آئی انہوں نے **الحمدللّٰہ** کہا اُن کے رب نے **یَرْحَمُکَ اللّٰہُ** فرمایا (اور فرمایا) کہ اے آدم! اُن فرشتوں کی طرف جاؤ جو (وہاں) بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کو جا کر السلام علیکم کہو، حضرت آدم علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر **السلام علیکم** کہا تو فرشتوں نے اس کے جواب میں **علیک السلام و رحمۃ اللّٰہ** کہا پھر وہ واپس آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ تحیہ ہے تمہارا اور آپس میں تمہارے بیٹوں کا۔ (رواہ الترمذی کمافی المشکوٰۃ ص ۴۰۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سلام کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے سب انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو جا کر سلام کہو، انہوں نے **السلام علیکم** کہا فرشتوں نے اس کا جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سلام تمہارا اور تمہاری اولاد کا تحیہ ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو اس طرح ایک دوسرے کو دعا دیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا دین اسلام ہے اس میں دنیا و آخرت کی سلامتی ہے۔ جب آپس میں ملاقات کریں تو ملاقات کرنے والا بھی سلامتی کی دُعا دے یعنی **السلام علیکم** کہے اور جس کو سلام کیا وہ بھی اس کے جواب میں سلامتی کی دُعا دے اور **وعلیکم السلام** کہے۔ دونوں طرف سے لفظ سلام کے ذریعہ ہر وقت باسلامت رہنے کی دُعا دی جائے یہ سلامتی کسی وقت اور کسی حال کے ساتھ مخصوص نہیں۔

ان کلمات کا تذکرہ جو غیر اقوام کے یہاں ملاقات کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں...... یہ جو بعض قوموں میں گڈ مورننگ اور گڈ ایوننگ اور گڈ نائٹ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان میں اوّل تو سلامتی کے معنی کو پوری طرح ادا کرنے والا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ ان میں انسانوں کے بارے میں کوئی دُعا ہے ہی نہیں وقت کو اچھا بتایا جاتا ہے پھر اس سے بطور استعارہ انسانوں کی اچھی حالت مراد لی جاتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان الفاظ میں دائمی سلامتی کی دُعا نہیں ہے بلکہ اوقاتِ مخصوصہ کے ساتھ دعا مقید ہے۔

اسلام نے جو ملاقات کا تحیہ بتایا ہے وہ ہر لحاظ سے کامل اور جامع ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے بیان فرمایا کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں (ملاقات کے وقت) یوں کہا کرتے تھے **انعم اللّٰہ بِکَ عَیْنًا** (اللہ تیری آنکھیں ٹھنڈی رکھے) اور **اَنْعِمْ صَبَاحًا** (تو صبح کے وقت اچھے حال میں رہے) اس کے بعد جب اسلام آیا تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا۔ (رواہ ابوداؤد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے علاوہ ملاقات کے وقت دوسروں کے طریقے اختیار کرنا اور اُن کے رواج کے مطابق کلمات منہ سے نکالنا ممنوع ہے جو لوگ انگریزوں کے طریقے پر گڈ مورننگ وغیرہ کہتے ہیں یا عربوں کے رواج کے مطابق صباح الخیر یا مساء الخیر کہتے ہیں اس سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

دنیا کی مختلف اقوام میں ملاقات کے وقت مختلف الفاظ کہنے کا رواج ہے لیکن اسلام میں جو سلام کے الفاظ مشروع کئے گئے ہیں ان سے بڑھ کر کسی کے یہاں بھی کوئی ایسا کلمہ مروّج نہیں جس میں اظہارِ محبت بھی ہو اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی ہو کہ آپ کو اللہ تعالیٰ ہر قسم کی اور ہر طرح کی آفات اور مصائب سے محفوظ رکھے، لفظ **السلام** جہاں اپنا مصدری معنی رکھتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ شراح حدیث نے فرمایا ہے۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو سلامتی دینے والا ہے تمہیں اس کے حفظ وامان میں دیتا ہوں وہ تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔

سلام کی کثرت محبوب ہے...... اسلام میں سلام کی کثرت بہت زیادہ مرغوب اور محبوب ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

ارشادفرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب تک تم مؤمن نہ ہو گے جنت میں داخل نہ ہو گے اور مؤمن نہ ہو گے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو گے (پھر فرمایا) کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتادوں کہ اس پرعمل کرو گے تو آپس میں محبت پیدا ہوگی؟ پھر فرمایا آپس میں خوب سلام کو پھیلاؤ۔ (رواہ مسلم ص ۵۴ ج ۱) یہ سلام کا پھیلانا اور ایک دوسرے کوسلام کرنا ایمان کی بنیاد پر ہے جان پہچان کی بنیاد پر نہیں۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جوحقوق ہیں ان کو بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا اِذَا لَقِيْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ کہ جب تو مسلمان سے ملاقات کرے اس کوسلام کر۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳۳)

پھر جس طرح سلام کرنا حقوق مسلم میں سے ہے اسی طرح سلام کا جواب دینا بھی مسلم کے حقوق میں سے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ (۱) سلام کا جواب دینا، (۲) مریض کی عیادت کرنا، (۳) جنازوں کے ساتھ جانا، (۴) دعوت قبول کرنا، (۵) چھینکنے والے کا جواب دینا (یعنی جب وہ الحمدللّٰه کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللّٰه کہنا)۔ (رواہ مسلم ص ۲۱۳ ج ۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے بہتر کون سا عمل ہے آپ نے فرمایا یہ کہ کھانا کھلایا کرے اور اس کو بھی سلام کرے جس سے جان پہچان ہے اور اس کو بھی سلام کرے جس سے جان پہچان نہیں ہے۔ (صحیح بخاری ص ۶ ج ۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ تم میں سے جب کوئی شخص اپنے بھائی سے ملاقات کرے تو سلام کرے اس کے بعد اگر درمیان میں کوئی درخت یا دیوار یا پتھر کی آڑ ہو جائے اور پھر ملاقات ہو جائے تو پھر سلام کرے۔ (رواہ ابوداؤد)

راستہ کے حقوق: گھروں سے باہر اگر راستوں میں بیٹھیں تو راستے کے حقوق ادا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ راستوں میں نہ بیٹھو اور اگر تمہیں راستوں میں بیٹھنا ہی ہے تو راستے کا حق ادا کرو عرض کیا یا رسول اللہؐ! راستہ کا حق کیا ہے؟ ارشادفرمایا کہ نظریں نیچی رکھنا (تا کہ کسی ایسی جگہ نظر نہ پڑے جہاں نظر ڈالنا جائز نہیں) اور تکلیف دینے سے بچنا، اور سلام کا جواب دینا، اور بھلی بات کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا۔ (رواہ مسلم ص ۲۱۳ ج ۲)۔

کسی مجلس میں یا کسی گھر میں جائیں تو سلام کریں...... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی مجلس میں پہنچو تو سلام کرو اور اگر موقعہ مناسب جانو تو بیٹھ جاؤ پھر جب (روانہ ہونے کے لئے) کھڑے ہو تو دوبارہ سلام کرو، چونکہ جس طرح پہلی مرتبہ سلام کرنے کی اہمیت تھی اسی طرح دوسری مرتبہ بھی سلام کرنا اہم ہے۔ (ترمذی وابوداؤد)

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کوسلام کرو اور جب وہاں سے چلنے لگو تو انہیں سلام کے ساتھ رخصت کرو۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلا کما فی المشکوٰۃ ص ۳۹۹)

اپنے گھر والوں کوسلام...... حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بیٹا! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس جائے تو سلام کر، یہ چیز تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے برکت کا ذریعہ بنے گی۔ (رواہ الترمذی)

ابتدا بالسلام کی فضیلت...... سلام ابتدأ خود کرنے کی کوشش کی جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا البادئ بالسلام بریٌٔ من الکبر یعنی جو شخص خود سے ابتداء سلام کرے وہ تکبر سے بَری ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۰)

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ لوگوں میں اللہ سے قریب تر وہ شخص ہے جو ابتداءً خود سلام کرے۔ (رواہ ابوداؤد ص ۳۵۰ ج ۲)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کثرتِ سلام محبوب اور مرغوب ہے اور سلام اور سلام کا جواب دینا مسلم کے حقوق میں سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی کے گھر جائے تو گھر والوں کو سلام کرے اور جب وہاں سے چلنے لگے تب بھی سلام کرے، کسی مجلس میں پہنچے تو اس وقت سلام کرے، چلنے لگے تب بھی سلام کرے، اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرے۔ آیتِ بالا میں ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص تمہیں سلام کرے تو تم اس کے سلام کا اس سے اچھا جواب دو یا (کم از کم) جواب میں اسی قدر الفاظ کہہ دو جتنے الفاظ سلام کرنے والے نے کہے ہیں اگر کسی نے **السلام علیکم** کہا ہے تو اس کے جواب میں کم از کم **وعلیکم السلام** کہہ دیا جائے تا کہ واجب ادا ہو جائے اور بہتر یہ ہے کہ اس کے الفاظ پر اضافہ کر دیا جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جب فرشتوں کو خطاب کر کے **السلام علیکم** فرمایا تو انہوں نے جواب میں ورحمۃ اللہ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر سلام کرنے والا **و رحمۃ اللّٰہ** بھی کہہ دے تو جواب دینے والا وبرکاتہٗ اضافہ کر دے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے کہا السلام علیکم آپؐ نے اس کا جواب دے دیا پھر وہ بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اس کو دس نیکیاں ملیں پھر دوسرا شخص آیا اس نے کہا **السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ** آپ نے اس کا جواب دے دیا وہ بیٹھ گیا آپؐ نے فرمایا اس کو بیس نیکیاں ملیں، پھر تیسرا شخص آیا اس نے کہا **السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ** آپ نے اس کا جواب دے دیا وہ بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا اس کو تیس نیکیاں ملیں ایک اور شخص آیا اس نے کہا **السلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ ومغفرتہٗ** آپؐ نے فرمایا اس کو چالیس نیکیاں ملیں اور یہ بھی فرمایا کہ اسی طرح فضائل بڑھتے جاتے ہیں۔

یہ حدیث سنن ابوداؤد میں ہے نیز سنن ترمذی میں بھی ہے لیکن اس میں **و مغفرتہٗ** کا ذکر نہیں ہے امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن بتایا ہے پھر فرمایا **وفی الباب عن ابی سعید وعلی و سهیل بن حنیف** اور مفسر ابن کثیرؒ ص ۵۳۱ ج ۱ نے بحوالہ ابن جریر ایک روایت یوں نقل کی ہے کہ جب ایک شخص نے **السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ** کہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **وَعَلَیْکَ** اور فرمایا کہ تو نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ لہٰذا ہم نے اسی قدر واپس کر دیا جتنا تم نے کہا۔ اس کے بعد مفسر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وبرکاتہٗ سے آگے سلام میں اضافہ نہیں ہے۔ مفسر قرطبیؒ ص ۲۹۹ ج ۵ نے بھی یہی لکھا ہے کہ **فان قال سلام علیک ورحمۃ اللّٰہ زدت فی ردّک وبرکاتہ وهذا هو النهایة فلا مزید**، مطلب یہ ہے کہ **برکاتہٗ** سے آگے اضافہ نہیں ہے۔ صاحب درمختار نے کتاب الحظر والاباحہ میں لکھا ہے **ولا یزید الراد علی وبرکاتہ** یعنی جواب میں **برکاتہٗ** سے زیادہ نہ کہا جائے۔ سنن ابوداؤد میں جو سلام کرنے والے کی طرف سے ومغفرتہٗ کا اضافہ ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ **وبرکاتہٗ** سے آگے بھی اضافہ درست ہے لیکن جس روایت میں **ومغفرتہٗ** کا اضافہ آیا ہے سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اسی لئے فقہاء نے اس کو نہیں لیا۔ حضرت ابن عباسؓ کے عمل سے بھی حضرات فقہاء کی تائید ہوتی ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ یمن کے ایک شخص نے ان کو سلام کیا اور **السلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ** تک کہنے کے بعد کچھ اور اضافہ کر دیا تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا **ان السلام انتهی الی البرکة** (یعنی سلام برکت تک ختم ہو گیا) امام محمدؒ نے بھی اپنے مؤطا میں حضرت ابن عباسؓ والی روایت کو لکھا ہے پھر فرمایا **وبهذا ناخذ اذا قال وبرکاته فلیکفف فان اتباع السنة افضل** (یعنی ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ جب **وبرکاتہٗ** تک کہہ دے تو ختم کر

دے کیونکہ سنت کا اتباع افضل ہے)۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ایسی احادیث جمع کی ہیں جن سے و برکاتہٗ پر اضافہ ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں لیکن سب کے مجموعے سے ایک طرح کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ حافظ کی بات سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ وبرکاتہٗ پر اضافہ کرنا مسنون نہیں تو بہر حال جائز تو ہے ہی۔ **واللّٰہ تعالیٰ اعلم**

چند مسائل

مسئلہ.........سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے اور یہ ان چند چیزوں میں سے ہے جن میں سنت کا ثواب واجب سے بڑھا ہوا ہے۔

مسئلہ.........جب کسی کے گھر جانا ہو تو پہلے سلام کرے پھر اندر آنے کی اجازت مانگے۔ جس کے الفاظ حدیث شریف میں یوں آئے ہیں اَلسَّلامُ عَلَیْکُمْ ءَ اَدخُلُ (تم پر سلام ہو کیا میں داخل ہو جاؤں) تین مرتبہ سلام کرے اور اجازت طلب کرے اجازت نہ ملے تو واپس ہو جائے۔ بغیر اجازت نہ کسی کے گھر میں داخل ہو نہ نظر ڈالے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے **لا تاذنوا لمن لم یبدأ بالسلام** (کہ اُسے اندر آنے کی) اجازت نہ دو جو شروع میں سلام نہ کرے (یعنی سلام کر کے اجازت نہ مانگے)۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۰۔۴۰۱)

مسئلہ.........جب کوئی شخص کسی کے ذریعہ سلام بھیجے تو سلام کے جواب میں سلام لانے والے کو بھی شریک کرے مثلاً یوں کہے عَلَیْکَ وَعَلَیْہِ السَّلامُ ایک صحابی نے اپنے لڑکے کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام بھیجا تو آپ نے جواب میں فرمایا **علیک وعلی ابیک السلام** (تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام)۔ (رواہ ابوداؤد ص ۳۵۴)

مسئلہ.........جب دو آدمیوں میں رنجش ہو قطع تعلق ہو اور سلام کلام بند ہو تو دونوں کو چاہیئے کہ جلد سے جلد رنجش دور کریں تین دن سے زیادہ سلام کلام بند رکھنا حرام ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے لئے یہ حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے۔ ملاقات کر رہے ہیں تو یہ ادھر کو اعراض کر رہا ہے اور وہ دوسری طرف کو اعراض کر رہا ہے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ (رواہ البخاری ص ۸۹۷ ج ۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی مؤمن کے لئے حلال نہیں کسی مؤمن سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے جب تین دن گذر جائیں تو ملاقات کرے اور سلام کرے۔ جس کو سلام کیا تھا اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں ثواب میں شریک ہو گئے اور اگر اس نے جواب نہ دیا تو وہ گنہگار رہا اور سلام کرنے والا قطع تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔ (رواہ ابوداؤد ص ۷۱ ج ۲)

تین دن تک قطع تعلق کی اجازت یہ آخری حد ہے اس سے پہلے ہی تعلق صحیح کرنے کی کوشش کرلیں اور نفس کو آمادہ کرلیں چونکہ نفس متکبر ہوتا ہے اور جھکنا نہیں چاہتا اس لئے جو شخص سلام میں پہل کرے اس کی فضیلت زیادہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے **وخیرھما الّذی یبدأ بالسلام** یعنی اُن دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ (کما فی حدیث ابی ایوب)

مسئلہ.........جو شخص سواری پر جا رہا ہو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، اور پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کرے، اور تھوڑی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے اور چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ (صحیح بخاری ص ۹۲۱ ج ۲)

مسئلہ.........اگر بیٹھی ہوئی جماعت کو کسی نے سلام کیا تو ایک شخص کا جواب دے دینا کافی ہے اور گذرنے والوں میں سے اگر ایک

شخص سلام کرے تو یہ بھی سب کی طرف سے کافی ہے۔ (سنن ابوداؤد ص ۳۵۲ ج ۲)

مسئلہ .... نماز پڑھنے میں اگر کسی کو زبان سے سلام کرے یا کسی کے سلام کا زبان سے جواب دے اگر چہ بھول کر ہو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر نماز میں ہاتھ سے سلام کیا یا ہاتھ سے سلام کا جواب دیا تو یہ مکروہ ہے۔

مسئلہ .... نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہونے والے اور حدیث بیان کرنے والے اور خطبہ دینے والے اور خطبہ سننے والے اور علمِ دین پڑھنے پڑھانے میں جو شخص مشغول ہو اور جو شخص تلبیہ پڑھ رہا ہو اسی طرح جو قاضی قضا کے کام میں مشغول ہو ان سب کو کلام کرنا مکروہ ہے۔ اسی طرح اذان دینے والے اور اقامت کہنے والے کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ ان لوگوں کو کوئی شخص سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں۔

مسئلہ .... جو لوگ شطرنج کھیل رہے ہوں اور کسی گناہ میں مشغول ہوں ان کو بھی سلام نہ کیا جائے جو شخص قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہو اس کو بھی سلام نہ کیا جائے۔

مسئلہ .... کافر کو سلام نہ کیا جائے۔

مسئلہ .... جوان عورتیں جو اجنبی ہیں یعنی محرم نہیں ہیں ان کو سلام کرنا بھی مکروہ ہے۔

مسئلہ .... سونے والے کو اور جو شخص نشہ پیے ہوئے ہے۔ اُن کو بھی سلام نہ کیا جائے۔

مسئلہ .... گانے بجانے والے اور کبوتر اُڑانے والے کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

مسئلہ .... فاسق مُعلن (جو علانیہ گناہ کرتا ہو) کو بھی سلام کرنا ممنوع ہے۔ (یہ مسائل در المختار اور رد المحتار ص ۴۱۴ ۔ ۴۱۵ ج ۱ میں مذکور ہیں)۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا (بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے) ہر شخص کو اس کا استحضار رہنا چاہیئے تاکہ ادائیگی حقوق میں کوتاہی نہ کرے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد (جس میں سلام کا جواب بھی داخل ہے) سب کی ادائیگی کرتا رہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع ۱۱

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ضرور بالضرور قیامت کے دن تمہیں جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں، اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قیامت کے دن سب کو جمع فرمائے گا

اس آیت میں عقیدہ توحید اور عقیدہ حشر و نشر اور قیامِ قیامت کو بیان فرمایا اور فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میں کوئی شک نہیں وہ روزِ جزا ہے جس میں خیر و شر کا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اسکی خبر دی ہے اور اسکی بات سے بڑھ کر کسی کی بات سچی نہیں لہٰذا یقین مانو اور عمل کرو۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ

سو منافقین کے بارے میں تم کو کیا ہوا کہ دو گروہ بن گئے اور اللہ نے ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انہیں الٹا پھیر دیا، کیا تم چاہتے ہو کہ اُسے ہدایت پر لے

اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ

آ ؤ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اور جسے اللہ گمراہ کر دے سو تو اس کے لئے کوئی راستہ نہ پائے گا۔ اُن کی خواہش ہے کہ کاش تم کافر ہو جاؤ جیسا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا

سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ

پھر تم سب برابر ہو جاؤ، سو تم اُن میں سے دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اللہ کے راستے میں، سو اگر وہ اعراض کریں تو اُن کو پکڑو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ

اور اُن کو قتل کرو جہاں بھی تم اُن کو پاؤ، اور نہ بناؤ اُن میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار۔ مگر جو لوگ ایسے ہیں جو اُن لوگوں سے

اِلٰى قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا

میل ملاپ رکھتے ہیں جن کے اور تمہارے درمیان عہد ہے یا تمہارے پاس اس حال میں آ جائیں کہ اُنکے دل تمہارے ساتھ اور اپنی قوم کے ساتھ

قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا

جنگ کرنے سے رک رہے ہوں، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرما دیتا سو وہ ضرور تم سے لڑتے پس اگر وہ تم سے الگ رہیں سو تم سے قتال نہ کریں اور تمہارے

اِلَیْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَیْهِمْ سَبِیْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ

ساتھ سلامت روی کا معاملہ رکھیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر کوئی راہ نہیں دی۔ عنقریب تم دوسرے لوگوں کو پاؤ گے جو یہ چاہیں گے کہ تمہاری طرف سے

اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِیْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْكُمْ

بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں، جب کبھی لوٹائے جائیں فتنے کی طرف تو اُس کی طرف واپس لوٹ جائیں، سو اگر وہ تم سے یکسو نہ ہوں اور تمہاری طرف

وَیُلْقُوْۤا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ وَیَكُفُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ

سلامت روی کا معاملہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں سو ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں بھی ان کو پاؤ،

وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۲

اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہارے لئے ایسی حجت دے دی ہے جو واضح ہے۔

منافقوں اور دشمنوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے

روح المعانی ص ۱۰۷ ج ۵ میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہاں اُن لوگوں کا بیان ہے جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہم مہاجر ہیں پھر وہ مرتد ہو گئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ ہم مکہ معظمہ جا کر اپنا تجارتی سامان لے آئیں تاکہ تجارت کیا کریں۔ مسلمانوں کا آپس میں ان کے بارے میں اختلاف ہوا ایک جماعت نے کہا کہ یہ منافق ہیں دوسری جماعت نے کہا کہ یہ مؤمن ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کا نفاق کھول کر بیان فرما دیا۔ اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا

،اورضحاک سے نقل کیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ معظمہ ہی میں رہ گئے تھے انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان تو کیا لیکن ہجرت نہیں کی ان کے بارے میں حضرات صحابۂ کرامؓ کا اختلاف ہوا کچھ لوگوں نے ان سے میل محبت باقی رکھی اور کچھ لوگوں نے اُن سے بیزاری ظاہر کردی اور کہنے لگے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ آئے اور ہجرت نہیں کی لہٰذا اُن سے ہماری بیزاری ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اس آیت میں بتادیا کہ وہ لوگ منافق ہیں اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آئیں اُن سے دوستی کا تعلق نہ رکھیں۔

ان دو روایتوں کے بعد صاحب روح المعانی نے بحوالۂ بخاری ومسلم وترمذی ونسائی واحمد یوں نقل کیا ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ اُحد کے موقع پر جب اُحد کی طرف روانہ ہوئے تو آپ کے ساتھ روانہ ہونے والوں میں سے کچھ لوگ واپس ہو گئے ان واپس ہونے والوں کے بارے میں حضراتِ صحابہؓ میں اختلاف ہوا ایک جماعت کہتی تھی کہ ان کو قتل کردیں اور دوسری جماعت کہتی تھی کہ قتل نہ کئے جائیں اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث ص ۶۶۰ ج ۲ پر ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو کیا ہوا کہ منافقین کے بارے میں دو جماعتیں بن گئیں اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے واپس لوٹا دیا، اور ان کو گمراہ فرمادیا جسے اللہ نے گمراہ کردیا کیا تم ارادہ کرتے ہو اس کو ہدایت دے دو؟ اور فرمایا کہ جسے اللہ گمراہ فرمادے اس کے لئے تم کوئی صحیح راستہ پا ہی نہیں سکتے اس کے بعد ان منافقین کے عزائم اور ارادوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً کہ یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسا کہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور اس طرح سے وہ اور تم برابر ہو جاؤ، ایسے نالائقوں کو دوست نہ بناؤ۔ ہاں اگر فی سبیل اللہ ہجرت کرلیں جس سے ان کا ایمان متحقق ہو جائے تو ان سے دوستی کی جاسکتی ہے۔ ہجرت کو لفظ فی سبیل اللّٰہ کے ساتھ مقید فرمایا کیونکہ جو ہجرت اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو دنیاوی اغراض کے لئے ہو وہ ہجرت معتبر نہیں ہے۔ (آیات کا پورا مضمون سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات تینوں قسم کے منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن تمام احکام سب کے بارے میں نہیں ہیں کیونکہ مدینہ منورہ میں جو منافق تھے ان کو قتل نہیں کیا گیا ۱۲۔)

مزید فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا کہ یہ لوگ اگر ہجرت فی سبیل اللہ سے اعراض کریں تو جب بھی تمہیں ان پر قدرت حاصل ہو جائے ان کو جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو بھی دوست اور مددگار نہ بناؤ ان سے بالکل ہی کلی طریقے پر اجتناب کرو، قال صاحب الروح ای جانبوھم مجانبة کلیة ولا تقبلوا منھم ولایةً و نصرةً ابدًا۔

پھر فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ اس میں اُن لوگوں کو قتل سے مستثنیٰ فرمادیا جو ان لوگوں سے مل جائیں جن سے مسلمانوں کا عہد ہے یعنی صلح ہے اور اُن لوگوں کو بھی مستثنیٰ فرمایا جو مسلمانوں کے پاس اس حالت میں آجائیں کہ ان کا دل جنگ کرنے سے منقبض ہو وہ نہ مسلمانوں سے لڑنا گوارہ کریں اور نہ اپنی قوم سے جنگ کریں۔ (یعنی دونوں جماعتوں سے صلح رکھیں ایسے لوگ بھی پکڑنے اور قتل کرنے سے مستثنیٰ ہیں)

پھر اللہ تعالیٰ نے بطور امتنان ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرمادیتا اور وہ تم سے قتال کرتے اب جب وہ تم سے کنارہ کش ہو گئے اور تم سے جنگ نہ کی اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کردیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے قتل کرنے اور پکڑنے کا کوئی راستہ نہیں بنایا یعنی اُن کو پکڑنے اور قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

یہاں تک دو جماعتوں کا ذکر ہوا اوّل وہ جماعت جو اسلام تو قبول کرلیں مگر ہجرت نہ کریں یا ہجرت کرنے کے بعد واپس

دارالحرب میں چلے جائیں۔ دوسری وہ جماعت جو مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرلیں یا معاہدہ کرنے والوں سے جا کر مل جائیں۔ اس کے بعد تیسری جماعت کا تذکرہ فرمایا جو دفع الوقتی کے طور پر صلح کرلیں جن کا مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں کی طرف سے بے خطر ہوکر رہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، لیکن جب کبھی ان کو شرارت اور فتنہ گری کی طرف متوجہ کیا جائے تو فوراً اس کو قبول کرلیں اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے آمادہ ہوجائیں اور اپنا عہد توڑ دیں۔ اس جماعت کا ذکر سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ میں فرمایا ہے ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور سلامت روی کے ساتھ نہ رہیں اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں تو ان کو پکڑو اور جہاں کہیں ان کو پاؤ قتل کرو ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دے دی ہے یعنی ان کے قتل کی واضح طور پر اجازت عنایت فرمائی ہے، واضح رہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ دارالاسلام یعنی مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے آجائیں اور ہجرت کو ایمان کی شرط قرار دے دیا گیا تھا۔ جو لوگ ہجرت کر کے نہ آئیں اُن سے مسلمانوں جیسا معاملہ کرنا ممنوع تھا جیسا کہ اوپر آیت سے معلوم ہوا۔ اس کے بعد جب مکہ معظمہ فتح ہوگیا تو مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا فرض نہ رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۳۱) یعنی فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا فرض نہیں رہا جو ترک وطن کی صورت میں تھا اب جہاد ہے اور نیت ہے۔ جیسی ضرورت پڑے گی ہجرت کی یا جہاد کی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اور جب جہاد کے لئے نکلنے کو کہا جائے تو نکل کھڑے ہونا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

اور کسی مؤمن کی شان نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کرے مگر خطا کے طور پر اور جو شخص کسی مؤمن کو بطور خطا قتل کر دے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مؤمن

مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ

غلام آزاد کرے اور اس کے خاندان والوں کو دیت ادا کرے، الّا یہ کہ وہ لوگ معاف کر دیں، اور اگر وہ مقتول ایسی قوم میں سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں

لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو ایک مؤمن غلام آزاد کرنا واجب ہے، اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور اُن کے درمیان معاہدہ

مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

ہو تو دیت بھی واجب ہے جو اس کے خاندان والوں کو سپرد کر دی جائے اور ایک مؤمن غلام آزاد کرنا بھی واجب ہے، پھر جس شخص کو غلام نہ ملے تو وہ

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

لگاتار دو ماہ کے روزے رکھے بطریق توبہ کے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

قتلِ خطا کے مسائل

گذشتہ آیات میں قتل وقتال کا ذکر تھا یہاں قتل کے کچھ دنیوی اور اخروی احکام بیان فرمائے ہیں، قتلِ عمد میں تو قصاص ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۱ میں گذر چکا ہے اور قتل خطا میں دیت ہے اور ایک مؤمن غلام آزاد کرنا ہے، مؤمن غلام نہ ملے تو دو ماہ کے لگاتار

روزے رکھنا فرض ہے، اوّلاً تو یہ فرمایا کہ کسی مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کر دے، قتل کرنا ہر اس جان کا گناہ کبیرہ ہے جس کی حفاظت شرعاً واجب ہو اس میں ذمی اور معاہد کا قتل بھی داخل ہے جب ذمی اور معاہد کا قتل بھی حرام ہے تو مؤمن کا قتل کرنا بطورِ اولیٰ حرام ہوا سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ کہ کسی جان کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہو مگر حق کے ساتھ قتل کر سکتے ہو، کافر حربی کو جو کسی معاہدہ میں شامل نہیں ہے اور جو مستامن بھی نہیں ہے اس کا قتل کرنا جائز ہے، اور جو شخص محصن ہوتے ہوئے زنا کر لے وہ بھی قتل کیا جائے گا۔ (یعنی اسے سنگساری کی سزا دی جائے گی) اور جو شخص کسی کو عمداً قتل کر دے جس کا شرعاً قتل کرنا حلال نہیں ہے اس کے قتل کرنے سے قصاص لازم ہوگا۔

مؤمن کو قتل کرنے کا بہت بڑا گناہ ہے اور اس پر بہت سخت وعید قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے لہٰذا کسی مؤمن سے یہ تصور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اپنے مؤمن بھائی کو قصداً قتل کر دے، ہاں خطا یعنی غلطی سے کوئی قتل ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ غلطی سے قتل ہو جانے کو قتل خطا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قتل خطا کی دو صورتیں ہیں خطا فی القصد اور خطا فی الفعل، خطا فی القصد یہ ہے کہ اُس نے کسی چیز کو دیکھا اُسے شکار سمجھ کر تیر مار دیا اور وہ شکار نہ تھا بلکہ کوئی آدمی تھا یا اُس نے یہ سمجھا کہ سامنے کافر حربی کھڑا ہے اس کو مار دیا بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ مسلمان تھا، اور خطا فی الفعل یہ ہے کہ کسی نشانہ پر تیر پھینکے اور وہ تیر کسی آدمی کو لگ جائے، اِن دونوں صورتوں میں کفارہ بھی واجب ہوتا ہے اور دیت بھی واجب ہوتی ہے۔ دیت خون بہا کو کہتے ہیں یعنی جان کے بدلہ جو مال دیا جائے وہ دیت ہے یہ لفظ اصل میں وَدْیٌ تھا۔ وَزْنٌ زِنَةٌ اور وَعْدٌ عِدَةٌ کی طرح اس کا فاکلمہ یعنی واوٗ حذف کر دیا گیا اور آخر میں اس کے عوض تا لگا دی گئی۔ وَدَیٰ یَدِیْ لفیف مفروق ہے جس کا معنٰی بہنے کا ہے۔ چونکہ خون بہانے کا عوض دیا جاتا ہے اس لئے اُسے دیت کہتے ہیں۔ شریعتِ مطہرہ کے قانون میں دیت اور قصاص جانوں کی حفاظت کے لئے مشروع کئے گئے ہیں افسوس ہے کہ حکومتوں کے ذمہ دار جو اسلام سے انتساب رکھتے ہیں وہ دیگر احکامِ شریعت کی طرح ان احکام کو بھی عمل میں نہیں لاتے لہٰذا جانیں بے قیمت ہو کر رہ گئی ہیں۔ بعض ممالک میں جہاں دیت کی ادائیگی کرانے کا اہتمام ہے وہاں بڑی حد تک جانوں کی حفاظت ہے۔

دیت اور کفارہ ادا کرنے کا حکم ۔۔۔۔۔۔ آیت شریفہ میں یہ بتانے کے بعد کہ کسی مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ کسی مؤمن کو قتل کرے۔ اوّلاً دیت قتل خطا کا عمومی بیان فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ یعنی جو شخص کسی مؤمن کو خطأً قتل کر دے تو اس پر یہ فرض ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا ایک باندی آزاد کرے اور انکا مؤمن ہونا شرط ہے اور دیت بھی ادا کرے جو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دی جائے پھر فرمایا اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا کہ اگر یہ لوگ (یعنی وارثین) اس قاتل پر دیت کو صدقہ کر دیں یعنی معاف کر دیں تو یہ دیت معاف ہو جائے گی اگر سب معاف نہ کریں تو جو شخص معاف کر دے اسکا حصہ معاف ہو جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی اگر مقتول ایسی جماعت سے ہو جن سے تمہاری دشمنی ہے یعنی وہ حربی کافروں میں رہتا ہے خود تو وہ مؤمن ہے لیکن اس کی قوم مسلمان نہیں ہوئی اور اُن لوگوں سے صلح بھی نہیں ہے تو بطور کفارہ ایک رقبۂ مؤمنہ یعنی مؤمن غلام یا باندی آزاد کرنا ہوگا۔ رہی دیت تو وہ اس لئے واجب نہ ہوگی کہ اُس کے متعلقین کافر ہیں اور دیت میراث کے اصول پر تقسیم ہوتی ہے اور چونکہ کافر اور مؤمن کے درمیان میراث نہیں چلتی اس لئے دیت واجب نہ ہوگی۔ کسی کو بھی نہ دی جائے گی۔

غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے روزے ۔۔۔۔۔۔ پھر فرمایا وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی مؤمن مقتول اگر کسی ایسی قوم سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو تو اگر چہ وہ قوم کافر ہے لیکن یہ مقتول چونکہ مؤمن ہے اس لئے اس کے قاتل پر دیت واجب ہوگی جو اس کے خاندان کی طرف سپرد کر دی جائے گی، بشرطیکہ اس کے خاندان میں اہلِ اسلام موجود ہوں، اور اگر ان میں کوئی بھی مسلمان نہیں ہے تو دیت واجب نہ ہوگی، البتہ رقبہ مؤمنہ آزاد کرنا پھر بھی واجب ہوگا۔ (مزید تشریح آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

واضح رہے کہ قتل مؤمن میں دیت کا اور تحریر رقبہ یعنی غلام آزاد کرنے کا جو حکم ہے یہ صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کہ مقتول ایسی قوم میں سے ہو جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو بلکہ دارالاسلام میں مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہوئے کوئی مؤمن کسی مؤمن کو خطأً قتل کر دے۔ تب بھی دیت اور تحریر رقبہ واجب ہے۔ (روح المعانی ص ۱۱۴ ج ۵)

اس کے بعد فرمایا فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ کہ جو رقبہ یعنی غلام، باندی نہ پائے (مثلاً غلام باندی ملتے ہی نہ ہوں کما فی ھٰذا الزمان، یا ملتے تو ہوں لیکن خریداری کی طاقت نہ ہو) تو دو مہینے کے روزے لگا تار رکھے ان روزوں میں رمضان المبارک کا مہینہ نہ ہو۔ رمضان کے علاوہ پورے دو مہینوں کے روزے ہوں۔ یہ غلام آزاد کرنے کی جگہ روزے رکھنا بطورِ کفارہ ہے۔ دیت بہر حال واجب رہے گی۔

پھر فرمایا تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ یعنی یہ غلام آزاد کرنا یا روزے رکھنا بطور توبہ کے مشروع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ اس کی توبہ قبول فرمائے گا جو اس پر عمل کرے گا۔

پھر فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے اسے قاتل کا بھی علم ہے اور مقتول کا بھی اگر کسی نے قتل کر دیا اور بندوں کو حال معلوم نہ ہوا قاضی تک بات نہ پہنچی تو یہ نہ سمجھے کہ دونوں جہاں میں میرا چھٹکارا ہو گیا جس کی شریعت ہے وہ دیکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ آخرت کے دن احکام کی خلاف ورزی کی سزا دیدے گا۔ نیز وہ حکیم بھی ہے اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں، دیت اور تحریر رقبہ وغیرہ جو بھی کچھ احکام خداوندی بندوں کے لئے مشروع فرمائے ہیں ان سب میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔

تنبیہ.......... وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ میں چونکہ لفظ وَهُوَ مُؤْمِنٌ مذکور نہیں ہے اس لئے بعض فقہاء نے اس کو ذمی اور معاہد کے قتل پر محمول کیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن ص ۳۲۵ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباسؓ اور شعبیؒ اور نخعیؒ کا اور شافعیؒ کا قول ہے اور طبری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، پھر بحث کے ختم پر بعض علماء کا قول نقل کیا کہ مضمون عرب کے اُن مشرکوں کے بارے میں تھا جنہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا معاہدہ کیا ہوا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے یا اُن کو جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ معاہدہ ایک مخصوص میعاد کے لئے تھا اس زمانہ میں اُن میں سے کوئی شخص مقتول ہو جاتا تو دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوتے تھے پھر جب آیت کریمہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ نازل ہوئی تو یہ معاہدہ بھی ختم اور اس کے ساتھ معاہدہ کی وجہ سے جو کچھ التزام کیا گیا تھا وہ بھی ختم اب یہ حکم باقی نہیں رہا۔

مسائل متعلقہ دیت...... مسئلہ.......... قتل خطا میں ایک جان کی دیت سو اونٹ ہیں جن میں سے بیس بنت مخاض اور بیس بنت لبون اور بیس ابن مخاض اور بیس حِقّے اور بیس جذعے ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی طرح مروی ہے۔ (اونٹوں کے یہ القاب اُن کی عمروں کے اعتبار سے ہیں اہلِ عرب نے اونٹوں کے نام اس طرح رکھ رکھے تھے)۔

مسئلہ.......... اگر اونٹوں کے علاوہ دوسرے مال سے دیت دی جائے تو ہزار دینار سونے کے، اور دس ہزار درہم چاندی کے

دیئے جائیں۔

مسئلہ .... حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دیت صرف انہی تین چیزوں سے ادا کی جائے گی یعنی اونٹوں سے اور دینار سے اور درہم سے، اور امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا کہ گایوں اور بکریوں اور کپڑوں سے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر گایوں سے دیت ادا کی جائے تو سو گائیں دی جائیں، اور بکریوں سے دی جائے تو ہزار بکریاں دی جائیں، اور کپڑوں سے ادا کی جائے تو دو سو جوڑے ادا کئے جائیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس طرح مقرر فرمادیا تھا۔

مسئلہ .... عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔

مسئلہ .... مسلم اور ذمی کی دیت برابر ہے (ذمی وہ کافر لوگ ہیں جو مسلمانوں کی عملداری میں رہتے ہیں)۔

مسئلہ .... دیت میراث کے حکم میں ہے۔ جو مقتول کے شرعی ورثاء میں حسبِ حصص شرعیہ مقررہ فی الارث تقسیم کی جائے گی۔ اگر سب وارث معاف کردیں تو سب معاف ہوجائے گی اور بعض ورثاء معاف کریں تو اُن کے حصے کے بقدر معاف ہوجائے گی۔

مسئلہ .... جس مقتول کا کوئی وارث نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں جمع کردی جائے گی۔

مسئلہ .... قتلِ خطاء کی دیت عاقلہ پر واجب ہوتی ہے اور کفارہ (تحریر رقبة یاصیام شهرین متتابعین) بہرحال قاتل ہی پر واجب ہوتا ہے۔ عاقلہ سے اہلِ نصرت مراد ہیں جن میں قاتل رہتا سہتا ہو اور جو آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں اہلِ نصرت نہ ہوں تو پھر قاتل کا قبیلہ ہی عاقلہ ہوگا۔ اس اجمال کی تفسیر کتب فقہ میں مذکور ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دیت صرف قاتل کے کنبے اور قبیلے پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قتل تو صرف ایک شخص نے کیا ہے اس کی دیت اہلِ قرابت یا اہلِ نصرت پر کیوں پڑے اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ احادیث اور آثار سے ایسا ہی ثابت ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بے احتیاطی قاتل سے اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہلِ نصرت اور اہلِ قرابت پر بھروسہ کرتا ہے اور اُن کی نصرت اور حمیت کے پیشِ نظر وہ اپنے اندر ایک قوت محسوس کرتا ہے جن لوگوں پر اُسے اعتماد ہے ان لوگوں کو بھی دیت کی ادائیگی میں شریک کرلیا جائے تو وہ بھی اپنے قبیلے کے ہر فرد کو اور متعلقین کو جن سے نصرت اور حمیت کا تعلق ہے بہت زیادہ احتیاط کی تاکید کریں گے۔ اور اس طرح سے قتل خطا کا وجود بہت کم ہوگا۔ دیت کی ادائیگی کے خوف سے وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو برابر منع کرتے رہیں گے دیکھو قتل کا کوئی واقعہ نہ ہوجائے ورنہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔

مسئلہ .... عاقلہ سے تین سال میں تھوڑی تھوڑی کرکے دیت وصول کی جائے گی۔ قاتل کا اپنا قبیلہ اس لائق نہ ہو کہ دیت ادا کرسکے تو اس کے قبیلے سے جو قریب ترین قبیلہ نسب کے اعتبار سے ملتا ہو اُس کو بھی ادائیگی دیت میں شامل کرلیا جائے گا۔ خود قاتل بھی عاقلہ کا ایک فرد ہوگا اور اُس سے بھی حصہ مقررہ وصول کیا جائیگا۔ تفصیلات فقہ میں مذکور ہیں۔

قتل شبہ عمد .... مسئلہ: قتل خطا کے علاوہ ایک قسم قتل عمد ہے اور قتل شبہ عمد ہے قتل عمد کا ذکر آئندہ آیت میں ان شاء اللہ تعالیٰ آرہا ہے اور قتل شبہ عمد وہ ہے جس میں قصداً مارنے کا ارادہ کیا ہو لیکن دھاردار ہتھیار سے یا ہتھیار جیسی چیز سے (جس سے تفریق اعضاء ہو) نہ مارا ہو۔ مثلاً کوڑوں سے یا لاٹھی سے مارا ہو، قتل شبہ عمد میں بھی دیت اور کفارہ ہے اس کی دیت بھی عاقلہ پر ہوگی۔ دینار اور درہم سے دیت ادا کی جائے تو وہ تو اسی قدر ہے، جتنی قتل خطا میں ہے۔ اور اگر اونٹوں کے ذریعہ ادا کی جائے تو اس میں کچھ فرق ہے اور وہ یہ کہ اونٹ تو سو ہی ہوں گے لیکن اونٹوں کی پانچ قسموں کی بجائے چار قسمیں کی جائیں گی یعنی پچیس بنت مخاض اور پچیس بنت لبون اور پچیس حقّے اور پچیس

جذ ع دینے ہوں گے۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے جو حضرت ابن مسعودؓ سے منقول اور مروی ہے۔
مسئلہ .... کفارہ قتل میں آزاد کرنے کے لئے لفظ رقبہ وارد ہوا ہے یہ لفظ لونڈی اور غلام دونوں کو شامل ہے جسے بھی آزاد کردے گا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ بشرطیکہ مؤمن ہو، اور اعضاء صحیح سالم ہوں۔
مسئلہ .... اگر غلام نہ ملے تو دو ماہ کے روزے رکھنا لازم ہوگا۔ اگر مرض کی وجہ سے تسلسل ٹوٹ جائے تو دوبارہ روزے رکھنے ہوں گے۔ البتہ عورت کو اگر درمیان میں حیض آجائے تو اس کی وجہ سے تسلسل باطل نہ ہوگا اور رمضان کے روزے کفارہ کے حساب میں نہیں لگ سکتے۔ (کما ذکرناہ من قبل)
قتل کی کچھ اور صورتیں ...... قتل خطا کے ساتھ فقہاء نے دو چیزیں اور لکھی ہیں ایک ما اُجری مَجریَ الخطاء اور دوسری القتل بسبب۔ پہلی صورت کی مثال یہ ہے کوئی شخص سوتے ہوئے کسی پر پلٹ پڑے جس سے وہ قتل ہو جائے، اس میں کفارہ اور دیت دونوں واجب ہوتے ہیں اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کی مِلک میں کنواں کھود دے یا کوئی پتھر رکھ دے جو کسی کی جان جانے کا سبب بن جائے۔ اس صورت میں بھی عاقلہ پر دیت واجب ہوتی ہے لیکن اس میں کفارہ نہیں ہے۔
مسئلہ .... اگر کسی حاملہ عورت کے پیٹ میں مار دیا جس کی وجہ سے مرا ہوا بچہ گر گیا تو اس میں ایک غلام یا پانچ سو درہم واجب ہوں گے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس کو غُرّہ کہتے ہیں۔ اور اگر زندہ بچہ گر کر مر گیا تو اس کی پوری دیت دینی ہوگی اور اگر مردہ بچہ گرنے کے بعد ماں مر گئی تو ماں کی پوری دیت دینی ہوگی اور بچے کا غرّہ دینا ہوگا اور اگر چوٹ لگنے سے ماں مر گئی پھر بچہ زندہ نکل کر مر گیا تو ماں کی اور بچے کی علیحدہ علیحدہ دو دیتیں دینی ہوں گی اور حمل ساقط ہونے کی وجہ سے جو کچھ واجب ہوگا وہ اس بچے کے وارثوں پر تقسیم ہوگا۔
مسئلہ .... جو شخص جانور پر سوار ہو کر جا رہا ہو۔ اس کے ذمہ لازم ہے کہ سلامت روی کے ساتھ چلے اگر اس کی سواری نے کسی کو روند دیا یا ٹکر مار دی یا دانتوں سے کاٹ لیا تو ان سب صورتوں میں ضمان لازم آئے گا۔
مسئلہ .... اگر دو گھوڑے سوار جا رہے تھے جو آپس میں ٹکرا کر مر گئے تو ہر ایک کی عاقلہ پر دوسرے کی دیت واجب ہوگی۔
فائدہ .... قصاص اور دیت کا نظام درحقیقت جانوں کی حفاظت کے لئے ہے اللہ کا قانون جاری نہ کرنے کی وجہ سے پورے عالم میں قتل و خون کا بازار گرم ہے قوانینِ شرعیہ کو نافذ نہ کرنے والے ظالم ہیں جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور جو لوگ اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے نازل فرمایا وہ لوگ ظالم ہیں)۔
وزراء حکومت زعمائے سیاست میں جو لوگ احکام خداوندیہ کو ظالمانہ کہتے ہیں وہ کافر ہیں اگرچہ وہ مسلمان ہونے کے مُدعی ہوں۔ قصاص اور قتل کا قانونِ خداوندی نافذ نہ ہونے کی وجہ سے قاتلین کسی بھی جان کے قتل کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے وہ بڑی بیباکی کے ساتھ جس کو چاہتے ہیں قتل کر دیتے ہیں اگر کسی کو قتل کر دیا تو اوّل تو بغیر رشوت کے مقدمہ درج نہیں ہوتا اور درج ہوتا ہے تو قاتل کو سزا سے بچانے یا ہلکی سزا دلانے کے لئے قاتل سے رشوت لے کر رپورٹ کے الفاظ ہلکے کر دیئے جاتے ہیں۔ جو قانون کی گرفت میں نہیں آتے پھر جب مقدمہ چلتا ہے تو وکیل قانونی موشگافی کے ذریعے قاتل کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں، اور حاکم بھی رشوت کھانے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں اور اگر سارے مرحلوں سے گذر کر حاکم نے کسی قاتل کو سزا دے ہی دی تو وہ سزا قید و بند کی صورت میں ہوتی ہے۔ مقتول کے وارثوں کو ذرا بھی دیت نہیں ملتی۔ ان سب چیزوں نے امنِ عام کو برباد کر رکھا ہے۔ قصداً و ارادۃً قتل کرنے کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اور چونکہ قصاص جاری نہیں کیا جاتا اس لئے قاتل بے فکر ہو کر گھومتے پھرتے ہیں۔ حاکم بہت سے بہت عمر قید کا فیصلہ دے دیتا ہے

(بشرطیکہ حاکم تک معاملہ پہنچا ہوا اور اس نے ہمت کر کے فیصلہ دے دیا ہو) پھر یہ سزا اقتدار اعلیٰ کو رحم کی درخواست دینے سے یا حکومت کے بدل جانے سے (اقتدار جدید کی خوشی میں) معاف کر دی جاتی ہے مقتول کے ورثاء دیت اور قصاص سے محروم پھرتے ہیں حالانکہ اولیاء مقتول کا حق کسی کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ جو لوگ قانون الٰہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے نافذ نہیں کرتے اس کی بجائے دوسرے قانون نافذ کر رکھے ہیں اور ان کو موجودہ دور کے لئے مناسب سمجھتے ہیں (العیاذ باللہ) ان سب کا جواب اللہ تعالیٰ شانہٗ نے وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا فرما کر دے دیا اللہ جل شانہٗ نے اپنے علم اور حکمت کے مطابق قوانین عطا فرما دیئے ہیں ان کے خلاف لکھنا یا بولنا اللہ کے علم اور حکمت پر اعتراض ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

اور جو شخص کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس پر اللہ کی لعنت ہو گی ،

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور اس کے لئے اللہ نے بڑا عذاب تیار فرمایا ہے۔

کسی مؤمن کو قصداً قتل کرنے کا گناہِ عظیم

قتل خطا کے احکام بتانے کے بعد اس آیت میں قصداً عمداً قتل کرنے والے کی اخروی سزا کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ جو شخص کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اسکو غضب ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار فرمایا ہے۔ کسی مؤمن کا قتل در حقیقت بہت ہی بڑا گناہ ہے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پوری دنیا کا ختم ہو جانا اللہ کے نزدیک ایک مسلمان آدمی کے قتل کے مقابلے میں معمولی چیز ہے۔ (رواہ الترمذی والنسائی ووقفہ بعضہم وہو اصح ورواہ ابن ماجۃ عن البراء بن عازب کمافی المشکوٰۃ ص ۳۰۰)

حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمام آسمان و زمین والے کسی مؤمن کے خون میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اُن سب کو اوندھے منہ کر کے دوزخ میں ڈال دے گا۔ (رواہ الترمذی کمافی المشکوٰۃ ص ۳۰۰)

حضرت ابو درداءؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امید ہے اللہ ہر گناہ کو معاف فرما دے مگر جو شخص مشرک ہوتے ہوئے مر گیا اور جس نے کسی مؤمن کو قتل کر دیا ان کی مغفرت نہیں ہے۔ (رواہ ابوداؤد ورواہ النسائی عن معاویۃ کمافی المشکوٰۃ ص ۳۰۱) اتنی سخت وعیدیں ہوتے ہوئے دنیا میں قتل و خون کی گرم بازاری ہے اسلام کا نام لینے والے اور اپنے کو مسلمان سمجھنے والے آپس میں لسانی، قومی، قبائلی، وطنی اور صوبائی عصبیتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ قوم اور برادری اور ملک و وطن سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔ قتل مؤمن کا گناہ کبیرہ ساتھ لے کر قبر میں جانے والوں کو اپنی آخرت کا فکر نہیں دوزخ میں داخل ہونا اور اس میں سزا پانا، آگ میں جلنا معمولی سی بات سمجھ رکھا ہے۔ جاہلی عصبیتیں پھر اُبھر آئی ہیں، دشمنوں کے ورغلانے اور بھڑکانے سے آپس میں کٹا چھنی ہے دشمنوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں اور اپنا اتحاد پاش پاش کر رہے ہیں۔ انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے پر متحد ہو گئے تھے پرانی لڑائیاں جو صدیوں سے جاری تھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسلام نے سب کو متحد کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ بعض یہودیوں کے اُبھارنے سے پھر لڑائی کی فضا بن گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رفع دفع کیا اور اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت شریفہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا نازل فرمائی جس کی تفسیر اور واقعہ کا تذکرہ اسی آیت کے ذیل میں گذر چکا ہے۔ دشمن تو ہمیشہ مسلمانوں کو لڑانا ہی چاہتے ہیں ان کا اتحاد و اتفاق انہیں گوارا نہیں مسلمان ہیں کہ آپس میں قتل و قتال کر کے اپنی دنیا و آخرت دونوں تباہ کرتے ہیں اور ایک جماعت کے آدمی دوسری جماعت کے لوگوں کو محض اس وجہ سے قتل کرتے ہیں کہ وہ ہماری جماعت کا آدمی نہیں ہے۔

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں ذوالحجہ کو حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا تھا لا ترجعوا بعدی کفارًا یضرب بعضکم رقاب بعض (میرے بعد کافر مت ہو جانا جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردن مارو)۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۴۸ ج ۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا من حمل علینا السلاح فلیس منّا (جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے) رواہ البخاری ص ۱۰۴۷ ج ۲، کسی مسلمان کا قتل کرنا تو بڑی بات ہے کسی ہتھیار سے اس کی طرف اشارہ کرنا بھی حرام ہے۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ بھی نہ کرے وہ نہیں جانتا کہ ممکن ہے شیطان اس کے ہاتھ سے چھڑا دے (جس کی وجہ سے قتل کا حادثہ ہو جائے) پھر دوزخ کے گڑھے میں گر پڑے۔ (صحیح البخاری ص ۱۰۴۷ ج ۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے دنیا ختم ہونے سے پہلے ایسا دن ضرور آئے گا کہ قاتل کو بھی پتہ نہ ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا۔ اور مقتول کو بھی پتہ نہ ہوگا کہ میں کیوں قتل ہوا۔ کسی نے عرض کیا، ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا فتنہ کی وجہ سے ایسا ہوگا، قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں ہوں گے۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آجائیں تو وہ دونوں دوزخ والوں میں سے ہیں ایک شخص نے عرض کیا کہ ان میں سے جو قتل کر دے اس کا دوزخ میں جانا سمجھ میں آتا ہے جو قتل ہو گیا وہ دوزخ میں کیوں جائے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہ قد اراد قتل صاحبہ کہ مقتول بھی تو یہی ارادہ کئے ہوئے تھا کہ میں اس شخص کو قتل کر دوں لہٰذا وہ اپنی نیت کی وجہ سے دوزخ میں گیا (نیت تو دونوں ہی کی ایک دوسرے کو قتل کرنے کی تھی یہ بات اور ہے کہ ایک کا داؤ لگ گیا)۔ (رواہ البخاری ص ۱۰۴۹ ج ۲)

فائدہ......جمہور اہلسنّت کا یہی مذہب ہے کہ قاتل مؤمن عمداً کی بالآخر بخشش ہو جائے گی جیسے دوسرے گناہوں کا حکم ہے۔ البتہ حضرت ابن عباسؓ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اور ان سے اس کے خلاف بھی منقول ہے۔

قال سعید بن جبیر اختلف فیها (ای فی الآیة) اهل الکوفة فرحلت فیها الی ابن عباس فسالته عنها فقال نزلت هٰذه الآیة ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاء ه جهنم خالدا فیها هی آخر ما نزل وما نسخها شیٔ (رواہ البخاری ص ۶۶۱) قال البیضاوی قال ابن عباس رضی الله عنهما لا تقبل توبة قاتل المؤمن عمدا و لعله اراد به التشدید اذ روی عنه خلافهٗ والجمهور علی انه مخصوص بمن لم یتب بقوله تعالٰی وانّی لغفار لمن تاب و نحوه او المراد بالخلود المکث الطویل فان الدلائل متظاهرة علی ان عصاة المسلمین لا یدوم عذابهم او هو محمول علی المستحلّ

(ا ھ بحذب) (سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ اہل کوفہ نے اس آیت میں اختلاف کیا تو میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا اور ان سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزائہ جھنم خالدا فیھا آخر میں نازل ہوئی اور اسے کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔ قاضی بیضاویؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کسی مؤمن کو عمداً قتل کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ابن عباسؓ کا ارادہ اپنے اس فرمان سے اس امر کی شدت وشناعت بیان کرنا ہو کیونکہ ان سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔ جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ خلود کا حکم اس قاتل کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو اپنے گناہ سے توبہ نہ کرے۔ ان کی دلیل وانی لغفار لمن تاب اور اس جیسی دیگر آیات ہیں۔ یا خلود سے مراد طویل عرصہ تک آگ میں رہنا ہے کیونکہ دلائل اس کے متقاضی ہیں کہ گناہ گار مسلمانوں کو دائمی عذاب نہیں ہوگا..... یا دائمی خلود کا حکم اس کیلئے ہوگا جو کسی مؤمن کے قتل کو حلال سمجھے)

مسئلہ.......... جو شخص قصداً وارادۃً قتل کر دے اس میں اوّل تو بہت بڑا گناہ ہے جیسا کہ اوپر آیت میں گذرا اور قصاص بھی ہے جس کی کچھ تفصیل سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ میں گذر چکی ہے اور کچھ ان شاء اللہ سورۂ مائدہ کے رکوع ۷ کی تفسیر میں آئے گی۔ قصاص وارثوں کا حق ہے وہ چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو قصاص میں قتل کر دیں کسی بھی بادشاہ یا صدر یا وزیر یا کسی بھی چھوٹے بڑے حاکم کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ (کما ذکرنا من قبل)

مسئلہ.......... جو شخص اپنے کسی مورث کو قتل کر دے (جس سے میراث پانے والا تھا) تو قاتل میراث سے محروم کر دیا جائے گا (اُس نے چاہا کہ اپنے مورث کو قتل کر کے جلدی میراث پالے لہٰذا شریعت نے اُسی میراث سے بالکل محروم کر دیا)۔

مسئلہ.......... شبہ عمد میں بھی میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو، اور جو شخص تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے

اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ

اُسے یوں نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں ہے، تم دنیا والی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو، سو اللہ کے پاس

مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

غنیمت کے بہت مال ہیں، اس سے پہلے تم ایسے ہی تھے، سو اللہ نے تم پر احسان فرمایا، سو خوب تحقیق کر لیا کرو، بے شک اللہ

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے اسے یوں نہ کہو کہ تو مؤمن نہیں

تفسیر درمنثور ص ۱۹۹ ج ۲ میں بحوالہ بخاری ونسائی وغیرہما حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ جا رہے تھے، اُن سے کسی ایسے شخص کی ملاقات ہوگئی جو اپنا مال لئے ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے کہا السلام علیکم ان لوگوں نے

اس کو قتل کر دیا اور اس کا مال لے لیا۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ (راجع صحیح البخاری ص ۶۰۶ ج ۲) پھر حضرت ابن عباسؓ ہی سے بحوالہ ترمذی وغیرہ نقل کیا ہے کہ بنی سلیم میں سے ایک شخص اپنی بکریاں چراتے ہوئے چند صحابہؓ پر گذرا اُس نے انہیں سلام کر لیا۔ آپس میں کہنے لگے کہ اس نے ہمیں جان بچانے کے لئے سلام کیا (یعنی وہ مسلمان نہیں ہے، ہمیں دیکھ کر ڈر گیا کہ یہ قتل کر دیں گے اس لئے سلام کیا تا کہ مسلمان سمجھ کر چھوڑ دیں) ان حضرات نے اس کو قتل کر دیا اور اسکی بکریاں لے لیں، بکریاں لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ آیت شریفہ میں اس پر تنبیہ فرمائی کہ جو شخص اسلامی فرمانبرداری کا اظہار کرے، مثلاً سلام کرے یا اسلام کا کلمہ پڑھ لے یا کسی بھی طرح اپنا مسلمان ہونا ظاہر کر دے تو تم یوں نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے چونکہ اُن حضرات نے اس کا سامان بھی لے لیا تھا۔ اس لئے یہ بھی تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو غنیمتیں ہیں اُن کی طرف رغبت کرو اللہ تم کو بہت دے گا کسی شخص کو بلا تحقیق کافر قرار دے کر اس کا مال لینے کی جسارت نہ کرو۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ آج تم سلام کرنے والے کو یہ کہتے ہو کہ مؤمن نہیں ہے تم اپنا زمانہ یاد کرو کہ تم بھی کبھی ایسے ہی تھے، تمہارا اسلام کا ظاہری دعویٰ کرنا ہی جانوں کی حفاظت کے لئے کافی تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا اور تم اسلامی کاموں میں آگے بڑھ گئے تمہاری جماعت ہو گئی اور تمہارے بارے میں سب نے جان لیا کہ تم مسلمان ہو اسلام والے ہو اور یہاں تک کہ تم اپنی اس معرفتِ اسلامیہ کی وجہ سے دوسروں کو یہ کہنے لگے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

آیتِ بالا سے بالتصریح معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص سلام کرے یا اسلام کا کلمہ پڑھے یا یوں کہہ دے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کے ظاہری قول اور ظاہری دعوے پر اعتماد کرنا چاہیے خواہ مخواہ اس کے ایمان میں شک کرنا یا اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔ حقیقی ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور قلب کی تصدیق یا تکذیب کو بندے نہیں جانتے وہ ظاہر کے مکلّف ہیں اُن کو جو حکم دیا گیا ہے وہ اس کے پابند رہیں۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ لا الٰه الا اللّٰه کی گواہی دے دیں اور ساتھ یہ گواہی بھی دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، سو جب وہ ایسا کر لیں گے تو اپنی جانوں اور مالوں کو میری طرف سے محفوظ کر لیں گے ہاں اگر اسلام کے حق کی وجہ سے قتل کرنے کی صورت پیش آ جائے تو یہ اور بات ہے (مثلاً قصاص میں قتل کرنا پڑے) اور اُن کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ (رواہ البخاری و مسلم الا ان مسلما لم یذکر الا بحق الاسلام کما فی المشکوٰۃ ص ۱۲)

جو شخص اسلام کو ظاہر کرتا ہو ہم اُس کو مسلمان سمجھیں گے اگر وہ دل سے مسلمان نہیں تو اللہ تعالیٰ کو چونکہ دلوں کے احوال بھی معلوم ہیں اس لئے وہ اس سے اس کے عقیدہ کے مطابق معاملہ فرمائے گا۔ منافق ہے تو کافروں میں شمار ہوگا۔ سخت سے سخت عذاب میں جائے گا۔ دل سے مسلمان ہوگا تو اپنے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ثواب پائے گا۔

فائدہ (۱)۔۔۔۔۔۔۔۔ آیتِ بالا میں فَتَبَيَّنُوْا دو بار مذکور ہے پہلی جگہ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا ہے اور دوسری جگہ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا فرمایا ہے، دوسری جگہ سفر کا ذکر نہیں ہے معلوم ہوا کہ سفر ہو یا حضر ہو مسلمانوں کو ایک عام ہدایت دی گئی ہے کہ بلا تحقیق محض گمان پر عمل نہ کریں۔ تحقیق کے ساتھ کام کریں خصوصاً لوگوں کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کے بارے میں تو بہت زیادہ سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے، اسلام سلامتی والا دین ہے، ظلم والا دین نہیں ہے۔ محض گمان پر کسی کو بھی کچھ کہہ دینا یا کسی کی ذات کو مطعون کرنا درست نہیں ہے۔ بدگمانی کی وجہ سے تہمتوں اور غیبتوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ظلم و زیادتی کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔

فائدہ (۲) .... احتیاط میں بے احتیاطی کرنا درست نہیں۔ جو شخص یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں اور ساتھ ہی کفریہ عقیدوں کا اعلان بھی کرتا ہو جیسے بہت سے لوگ ختم نبوت کے منکر ہیں یا جیسے بعض لوگ اسلامی حدود اور قصاص کو ظلم کہتے ہیں یا جیسے کچھ لوگ حدیث شریف کی حجیت کے منکر ہیں یا جیسے بعض فرقے تحریف قرآن کے قائل ہیں، ایسے لوگوں کو کافر کہنے میں احتیاط کرنا مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنا ہے جس کا کفر ظاہر ہو جائے اس کا کفر ظاہر کرنا واجب ہے عام لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ کسی کلمہ گو کو کافر نہ کہو اس سے وہ کلمہ گو مراد ہے جس سے دعویٰ ایمان کے ساتھ کفر کی کوئی نشانی ظاہر نہ ہو رہی ہو۔

بہت سے لوگ فقہاء کی عبارت (لا نکفر احدا من اهل القبلة) کا مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے یوں کہتے ہیں کہ سب کلمہ گو مسلمان ہیں یا یوں کہتے ہیں کہ اہلِ قبلہ سب مسلمان ہیں یہ ان لوگوں کی سخت غلطی ہے جو جہالت پر مبنی ہے۔ ملا علی قاریؒ شرح فقہ اکبر کے تکملہ میں فرماتے ہیں۔

وان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لا يكفر ما لم يوجد شئ من امارات الكفر وعلاماته ولم يصدر عنه شئ من موجباته (ترجمہ) جاننا ضروری ہے کہ حضرات اہلسنّت نے یہ جو فرمایا ہے کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے یہ اس وقت ہے جب اہلِ قبلہ سے کوئی چیز کفر کی علامت میں سے ظاہر نہ ہو اور کوئی ایسی چیز صادر نہ ہو جس سے اس پر کفر عائد ہوتا ہو۔

فائدہ (۳) .... کسی گناہ میں ملوث ہونے کی وجہ سے کسی کو کافر نہ کہا جائے گا جب تک کہ گناہ کو حلال نہ سمجھتا ہو، اگر کسی گناہ کو حلال سمجھ کر کرتا ہو یا کسی فرض کے فرض ہونے کا انکار کرتا ہو تو اُسے کافر کہا جائے گا۔ ورنہ محض گناہ کرنے سے کسی مدعی اسلام کو کافر نہ کہیں گے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تین چیزیں ایمان کے تقاضوں میں سے ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص کلمہ اسلام پڑھ لے اس کی طرف سے (زبان اور ہاتھ کو) روک لیا جائے، دوم یہ کہ کسی گناہ کی وجہ سے اُسے کافر نہ کہو (یعنی کسی عمل کی وجہ سے اُسے اسلام سے خارج نہ کرو)

سوم یہ کہ جہاد باقی رہے گا جب سے اللہ نے مجھے بھیجا ہے یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ دجال سے قتال کریں گے۔ حکم جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل باطل نہیں کرسکتا (پھر فرمایا کہ) تقدیروں پر ایمان لانا (بھی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے)۔ (رواہ ابوداؤد)

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ

جو مسلمان عذر والے نہیں ہیں، ان میں جو بیٹھ رہنے والے ہیں اور جو اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

والے ہیں برابر نہیں ہیں، جو لوگ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والے ہیں ان کو بیٹھے رہ جانے والوں پر اللہ نے بڑے درجہ کی

دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا

فضیلت دی ہے اور سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور اللہ نے فضیلت دی ہے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہ جانے والوں پر اجر

عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

عظیم عطا فرما کر۔ جو اس کی طرف سے درجات اور بخشش اور مہربانی کی صورت میں ملے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ع ۱۳

مجاہدین اور قاعدین برابر نہیں

جیسا کہ اوپر حدیث میں گذرا، جہاد قیامت تک جاری ہے یہاں تک کہ اس امت کے آخری لوگ دجال سے قتال کریں گے۔ جان اور مال سے جہاد کیا جائے۔ بس اللہ کے دین کو بلند کرنا مقصود ہو۔ اس آیت شریفہ میں اوّل تو یہ فرمایا کہ جو لوگ جہاد میں شریک نہیں گھروں میں بیٹھے ہیں اور ان کو عذر بھی کچھ نہیں تو یہ لوگ اُن لوگوں کے برابر نہیں ہیں جو اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں کسی قسم کا بھی جہاد ہو بہر حال مجاہد گھر میں بیٹھ رہنے والے سے افضل ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوں و مالوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بڑے درجہ کی فضیلت دی ہے۔ لفظ درجة نکرہ ہے اس کی تنکیر تعظیم کے لئے ہے صاحبِ روح المعانی فرماتے ہیں، لایقادر قدرھا و لا یبلغ کنھھا ابتدائے آیت میں فرمایا کہ مجاہدین اور قاعدین برابر نہیں ہیں۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ مجاہدین کو قاعدین پر بڑے درجہ کی فضیلت حاصل ہے اس میں یہ واضح فرمادیا کہ قاعدین یہ سمجھ کر بیٹھے نہ رہ جائیں کہ ہمارا تھوڑا سا نقصان ہوا۔ بلکہ وہ بڑے درجے کی فضیلت سے محروم ہوں گے البتہ اولی الضرر کی اور بات ہے کیونکہ وہ معذوری کی وجہ سے مجبور ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (کاتب وحی) زید بن ثابت کو بلایا تا کہ آیتِ کریمہ لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لکھ دیں۔ وہ دوات اور لوح لے کر آئے آپؐ نے فرمایا لکھو لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ آپؐ کے پیچھے ابن ام مکتوم موجود تھے (جو نابینا تھے) انہوں نے عرض کیا کہ میں تو بینائی سے محروم ہوں۔ مجھے یہ فضیلت کیسے ملے گی۔ اس پر لفظ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ نازل ہوا۔ اور اب آیت اس طرح ہوگئی لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جس میں یہ بتادیا کہ جو لوگ صاحبِ عذر ہیں آیت کا عموم ان کو شامل نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو غزوۂ بدر کی شرکت سے رہ گئے۔ یعنی جنہوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی وہ اور جو شریک نہ ہوئے برابر نہیں ہوں گے۔ یہ روایات صحیح بخاری ص ۶۶۰ و ۶۶۱ ج ۲ میں مذکور ہیں۔ بات یہ تھی کہ غزوۂ بدر میں عام طور سے سب کو نکلنے کا حکم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بہت سے حضرات شریک نہ ہوئے تھے شرکت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ تو نہ ہوا لیکن شرکت کرنے والوں کو جو فضیلت ملی بہر حال وہ انہیں کو ملی۔ حضرت ابن عباسؓ نے جو اس کو اصحابِ غزوۂ بدر پر محمول فرمایا یہ اس اعتبار سے ہے کہ اسی زمانے میں نازل ہوئی تھی جب غزوۂ بدر ہو چکا تھا ورنہ آیت کا مفہوم ہمیشہ کے لئے عام ہے۔

وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی : پھر فرمایا وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی کہ اللہ نے مجاہدین اور قاعدین سب سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے بھلائی سے جنت مراد ہے جیسا کہ روح المعانی میں قتادہؒ سے نقل کیا ہے۔ چونکہ ایمان اور فرائض کی ادائیگی میں سبھی برابر ہیں اس لئے سب کے جنت میں داخل ہونے کا وعدہ فرمایا۔ یوں فرق مراتب دوسری بات ہے اور جہاد فرضِ عین ہونے کی صورت میں جو اُسے ترک کرے گا گنہگار ہوگا۔ پھر مجاہدین کی فضیلت دوبارہ بیان فرمائی اور فرمایا کہ اللہ نے مجاہدین کو قاعدین پر اجرِ عظیم عطا فرما کر فضیلت دی ہے۔ اللہ پاک کی طرف سے مجاہدین کو درجات ملیں گے مغفرت اور رحمت سے نوازے جائیں گے۔

آخر میں فرمایا وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا کہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے اس میں اجمالاً مضمونِ سابق کو دہرا دیا ہے

فائدہ..........وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی سے معلوم ہوا کہ جہاد فرضِ عین نہ ہونے کی صورت میں جو لوگ اپنے فرائض و واجبات میں مشغول رہتے ہوئے جہاد میں شریک نہ ہوں خصوصاً جو حضرات جہاد بالسیف کے علاوہ دوسری دینی خدمات میں مشغول ہوں ان کو

طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا درست نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اور ان دونوں سے متعلقہ علوم کی تعلیم اور تدریس بھی تو دینی مشغلہ ہے اور اس میں بھی بڑا مجاہدہ ہے جو حضرات اس میں لگے ہوئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا کام کرتے ہیں اور ان کی محنت سے بھی دین بلند ہوتا ہے اور اس کی اشاعت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں نیتوں پر بھی ثواب ملتا ہے جو لوگ خروج فی سبیل اللہ سے معذور ہوں اگر اُن کی نیت یہ ہوگی کہ ہم معذور نہ ہوتے تو ضرور جہاد میں شریک ہوتے تو اُن کو بھی شرکت کا ثواب ملتا ہے۔

حضرت انسؓ نے بیان فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو ہم نے مدینہ میں پیچھے چھوڑا تھا، ہم جس گھاٹی اور وادی میں چلے وہ ہمارے ساتھ ہی رہے (یعنی ثواب میں وہ بھی شریک تھے) ان کو عذر نے روک دیا تھا۔ (رواہ البخاری ص ۶۳۷ ج ۲)

جن حضرات کو عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت دے دی گئی ہو ان میں جو صاحب ذوق و شوق ہوتے ہیں وہ پھر بھی کسی طرح شریک ہو جاتے ہیں آیتِ بالا میں لفظ غیر اولی الضرر حضرت ابن ام مکتومؓ کی اس بات پر نازل ہوئی تھی کہ میں معذور ہوں شریک نہیں ہو سکتا پھر بھی وہ جہادوں میں شریک ہوتے تھے جنگ تو نہیں کر سکتے تھے لیکن جھنڈا اٹھانے کی خدمت اپنے ذمہ لے لیتے تھے۔ (کما ذکرہ فی روح المعانی ص ۱۲۴ ج ۵)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ

بے شک فرشتے جن لوگوں کی جان ایسی حالت میں قبض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جان پر ظلم کر رکھا تھا ان سے فرشتے کہتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے

قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا

وہ کہتے ہیں کہ ہم بے بس تھے زمین میں، فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم ترک وطن کر کے دوسری جگہ چلے

فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ

جاتے، سو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔ لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے قادر

وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى

نہ ہوں کہ کوئی تدبیر کر سکیں اور نہ راستے سے واقف ہوں۔ اُمید ہے کہ

اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

کافروں کے درمیان رہنے والوں کو تنبیہ

صحیح بخاری ص ۶۶۱ ج ۲ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (انہوں نے ہجرت نہ کی تھی) وہ مشرکین ہی کے ساتھ رہتے تھے مشرکین کی جماعت کی تکثیر کرتے تھے (مشرکین کہیں جنگ کرنے جاتے تو یہ بھی ساتھ چلے جاتے تھے جس سے مشرکین کی جماعت میں اضافہ ہو جاتا تھا) نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کو بعض مرتبہ تیر لگ جاتا تھا جس سے قتل ہو

جاتے تھے یا تلوار وغیرہ سے مقتول ہو جاتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔

لباب النقول ص ۷۹ میں نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو ان لوگوں کو ہجرت کرنا گوارا نہ ہوا (اور اپنے جان و مال پر) خوف کھانے لگے اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ بالا نازل فرمائی۔ دونوں باتیں سببِ نزول ہو سکتی ہیں۔ آیتِ شریفہ میں اس بات پر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے کہ کوئی شخص ہجرت کے مواقع میسر ہونے کے باوجود ہجرت نہ کرے اپنے دین و ایمان اور اعمال اسلام کے لئے فکرمند نہ ہو اور کافروں ہی میں گھسا رہے۔ اوّل تو ایسے لوگوں کو ظَالِمِیٓ اَنۡفُسِهِمۡ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور فرمایا کہ جب فرشتے ان کی جانیں قبض کرنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم کہاں تھے۔ دین کے ضروری کام کیوں نہیں بجا لاتے تھے۔ وہ جواب دیتے ہیں ہمارا رہنا سہنا ایسی سرزمین میں تھا جہاں ہم مغلوب تھے اس لئے بہت سی ضروریاتِ دین پر عمل نہ کر سکتے تھے۔ فرشتے جواب میں کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی، تم ترکِ وطن کر کے دوسری جگہ چلے جاتے وہاں فرائض ادا کرتے۔

ابتدائے اسلام میں مدینہ کے لئے ہجرت کرنا واجب تھا جن لوگوں نے بطورِ نفاق اسلام قبول کیا وہ لوگ اپنے نفاق کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہوئے اور جن لوگوں نے اسلام تو دل سے قبول کیا لیکن قدرت ہوتے ہوئے ہجرت نہ کی تو وہ ترکِ فرض کی وجہ سے اور اس لئے کہ ان کی وجہ سے دین کے دشمنوں کی مدد ہوتی تھی مستحقِ عذاب ہوئے۔ ہجرت کوئی سفرِ تجارت نہیں ہے کہ مال کے ساتھ اور آسانیوں کے ساتھ گھر سے نکل جائیں اور پھر واپس آ جائیں یہ تو ایک مشکل چیز ہے دین ایمان کو بچانے کے لئے گھر بار زمین و جائیداد چھوڑنا پڑتا ہے وطن کو مستقل طریقے پر خیرباد کر دیا جاتا ہے۔ پھر دشمن بھی نکلنے نہیں دیتے۔ موقع لگ گیا تو آل اولاد کو ساتھ لے لیا ورنہ اُن کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ حضرات صحابہؓ کرامؓ نے ابتدائے اسلام میں جو ہجرتیں کی ہیں اُن کے دردناک واقعات کتابوں میں موجود ہیں۔ اوّلاً چند حضرات حبشہ چلے گئے تھے اُن کے بعد مدینہ منورہ کے لئے ہجرت شروع ہوئی پھر حبشہ والے بھی مدینہ منورہ آ گئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ آل و اولاد کو چھوڑ کر مدینہ منورہ روانہ ہوئے دونوں کے متعلقین مکہ ہی میں رہے بعد میں وہ حضرات بھی آ گئے لیکن آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو مکہ معظمہ ہی میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا پڑا جب ہجرت کرنے کے ارادہ سے تشریف لانے لگیں تو ایک کافر نے بطن مبارک پر لات ماردی جس سے حمل ساقط ہو گیا۔

حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ ہجرت کے ارادہ سے حضرت ام سلمہؓ کو اور اپنے بیٹے سلمہ کو اونٹ پر بٹھا کر نکلے مکہ والے آڑے آ گئے حضرت اُم سلمہؓ کے گھر والوں نے حضرت ام سلمہ کو روک لیا پھر ابوسلمہ کے گھر والے آئے اور ان کے بیٹے سلمہ کو لے کر چلے گئے اس طرح تینوں میں جدائی ہو گئی۔ حضرت اُم سلمہ فرماتی ہیں کہ میں صبح سے شام تک روتی رہتی تھی اور اس پر ایک عرصہ گذر گیا بعد میں ایک آدمی نے میرے خاندان والوں سے کہا کہ تم نے اس عورت کو اس کے شوہر اور اس کے بچے سے جدا کر دیا اس مسکینہ کو کیوں جانے کی اجازت نہیں دیتے اس پر انہوں نے مدینہ منورہ جانے کی اجازت دے دی اور ابوسلمہ کے خاندان والے بچہ بھی دے گئے وہ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں نکل کھڑی ہوئی کہ میرے ساتھ کوئی بھی نہ تھا تنعیم میں پہنچی تو عثمان بن طلحہ مل گئے انہوں نے کہا کہاں جاتی ہو میں نے کہا مدینہ منورہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں، پوچھا تمہارے ساتھ کوئی ہے میں نے کہا اللہ کے اور اس بچے کے سوا کوئی ساتھ نہیں ہے یہ سن کر انہوں نے اونٹ کی مہار پکڑ لی اور مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ (ذکرہ الحافظ فی الاصابۃ)

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو ہجرت کے مواقع پر حضراتِ صحابہؓ کے ساتھ پیش آئے ان میں ایک واقعہ حضرت صہیبؓ رومی کا

بھی ہے جو آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ کی تفسیر میں گذر چکا ابتدائے اسلام میں مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا اس کی فرضیت فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ **لاھجرۃ بعد الفتح** لیکن حسب حالات دین وایمان بچانے کے لئے ہمیشہ ہجرت کی فرضیت مشروع ہے۔

اس زمانے میں بھی مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں ہجرت کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ انقلابات کے مواقع میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ کچھ مسلمان کافروں کے علاقے میں رہ جاتے ہیں باوجود موقع پانے کے گھر در مال جائیداد یا رشتہ داریوں کی محبت میں اپنے جائے پیدائش ہی میں جمے رہتے ہیں اذان بھی نہیں دے سکتے لیکن حُبِّ دنیا ان کو وطن نہیں چھوڑنے دیتی۔ ایسے لوگ ترکِ ہجرت سے گنہگار ہوتے ہیں ان پر ہجرت فرض ہوتی ہے۔ جس کے چھوڑنے سے گنہگار ہوتے ہیں اور یہ اس خطاب کے ذیل میں آتے ہیں کہ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔

۱۳۶۶ھ میں مشرقی پنجاب میں اس طرح کے واقعات پیش آ گئے تھے اور اب بھی یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے علاقوں میں ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں جہاں سے مسلمانوں کو ہجرت کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے لئے ہجرت کا ارادہ کرے گا تو اس کے لئے اللہ ضرور کوئی صورت پیدا فرمادے گا۔ جیسا کہ آئندہ آیت میں وعدہ فرمایا ہے یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً شرط یہ ہے کہ ہجرت اللہ کے لئے ہو۔

یورپ اور امریکہ جا کر بسنے والے اپنے دین وایمان اور اعمال کی فکر کریں...... آجکل تو لوگ الٹی راہ پر چل رہے ہیں اچھے خاصے دینی ماحول سے نکل کر دنیا کمانے کیلئے یورپ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا جا جا کر بس رہے ہیں اور وہاں اپنے دین و ایمان کا خون کر رہے ہیں اور اپنی نسلوں کیلئے دین وایمان سے محرومی کا انتظام کر رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر خود بھی دین میں کمزور ہو جاتے ہیں اور اولادیں بے دینی میں اُن سے بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ **اعاذنا الله من جميع البلايا والمحن وسائر الفتن ما ظهر منها وما بطن۔**

پھر فرمایا اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ اس میں یہ بتایا کہ جو مرد اور عورتیں اور بچے کافروں میں پھنس جائیں وہاں مغلوب ہوں ہجرت سے عاجز ہوں کوئی تدبیر سامنے نہ ہو اور راستہ بھی معلوم نہ ہو کہ کہاں جائیں اور کیا کریں تو ایسے لوگ مواخذے سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اور میری والدہ بھی انہیں لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔ (ص ۶۶۰ صحیح بخاری) ان کے علاوہ اور متعدد صحابہؓ تھے جو مکہ مکرمہ میں پھنسے ہوئے تھے اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی اور کافروں کے ماحول میں مصیبت میں پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قنوت نازلہ میں دُعا کیا کرتے تھے اُن میں سے عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام اور ولید بن ولید کے اسماء گرامی روایات میں آتے ہیں۔

آخر میں فرمایا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا کہ اللہ جل شانہٗ ان مستضعفین مغلوبین پھنسے ہوئے لوگوں کو معاف فرمادے گا وہ معاف فرمانے والا بخشنے والا ہے۔ صاحبِ روح المعانی ص ۱۲۷ ج ۵ لکھتے ہیں کہ اس میں یہ بتایا ہے کہ ہجرت کا چھوڑ دینا بڑے خطرہ کی چیز ہے یہاں تک کہ مجبور حال جس پر ہجرت فرض نہیں اس کا ہجرت چھوڑ دینا بھی اس درجے میں ہے کہ اس کو گناہ شمار کرلیا جائے کیونکہ معافی گناہ سے متعلق ہوتی ہے۔ ایسے مجبور حال کو بھی چاہیئے کہ موقع کی تلاش میں رہے اور اس کا دل ہجرت کے خیال میں لگا رہے۔ جیسے ہی موقع ملے روانہ ہوجائے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ

اور جو شخص اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے وہ زمین میں جانے کی بہت سی جگہ پائے گا اور اُسے بہت کشادگی ملے گی ،اور جو شخص

يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ

اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کرنے کی نیت سے نکل کھڑا ہو پھر اس کو موت آ پکڑے تو یقینی طور پر اس کا ثواب اللہ

اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

کے ذمہ ثابت ہوگیا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

فی سبیل اللہ ہجرت کرنے والوں کے لئے وعدے

لباب النقول ص ۷۹ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ضمرہ بن جندب نے ہجرت کی نیت سے نکلنے کا ارادہ کیا اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے سواری پر سوار کردو اور مشرکین کی سرزمین سے نکال دو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاؤں جب وہ روانہ ہوگئے تو راستہ میں موت آ گئی آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچ سکے آپ پر وحی کا نزول ہوا اور آیتِ بالا نازل ہوئی۔

دوسرا واقعہ ابوضمرہ زرقی کا نقل کیا ہے وہ مکہ معظمہ میں مشرکین میں پھنسے ہوئے تھے۔ جب آیتِ کریمہ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً نازل ہوئی۔ تو انہوں نے کہا کہ میں مالدار ہوں میں نکلنے کی تدبیر کرسکتا ہوں لہٰذا انہوں نے ہجرت کا سامان تیار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے ان کو مقام تنعیم میں موت آ گئی (جو حرم سے قریب تر جگہ ہے) اس پر آیتِ بالا وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ نازل ہوئی اور ایک واقعہ خالد بن حرامؓ کا لکھا ہے، وہ حبشہ سے (مدینہ منورہ آنے کے لئے) روانہ ہوئے راستے میں ان کو سانپ نے کاٹ لیا جس کی وجہ سے موت ہو گئی اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ صاحب لباب النقول نے اسی طرح کا ایک واقعہ اکثم بن صیفی کا بھی نقل کیا ہے۔ کسی آیت کے اسباب نزول متعدد بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی تعارض نہیں۔ پھر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ سببِ نزول اگرچہ وہ واقعات ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن آیت کا مفہوم عام ہے اس میں واضح طور پر یہ اعلان فرما دیا کہ جو کوئی شخص اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کے لئے نکل کھڑا ہوا اور اس کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہو دین ایمان کو بچانا چاہتا ہو تو اس کا یہ سچی نیت سے نکل کھڑا ہونا ہی باعثِ اجر و ثواب بن گیا اگرچہ وہاں تک نہ پہنچ سکا جہاں تک اس کو پہنچنا تھا۔ راستے میں موت ہو جانے کی وجہ سے مقصد ظاہری تک تو نہ پہنچ پایا لیکن حقیقی مقصد حاصل ہو گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا ثواب لکھ دیا گیا اور اس کی ہجرت منظور ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑے مغفرت والے اور بہت بڑے رحیم ہیں اچھی نیت پر بھی ثواب عطا فرما دیتے ہیں اگرچہ عمل ابھی پورا نہ بھی ہوا ہو۔

لفظ ہجرت عربی زبان میں چھوڑ دینے کو کہتے ہیں اور شرعی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر کوئی دوسرا وطن اختیار کرنے کو ہجرت کہا جاتا ہے بعض مرتبہ مؤمن بندے کفر کے ماحول سے جان چھڑانے کے لئے خود سے وطن چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعض مرتبہ اہلِ کفر اُن کو وطن سے نکال دیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں پر ہجرت صادق آتی ہے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھ بہت سے صحابہؓ نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی اور بھی مختلف علاقوں سے صحابۂ کرامؓ

ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔اس کے بعد بھی مختلف ادوار اور مختلف ازمان میں ہجرت کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہجرت میں بہت سخت تکلیف ہوتی ہے آبائی وطن چھوڑ نا پڑتا ہے۔ جائیدادوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔اعزہ واقرباء جدا ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کا ثواب......اس لئے اس بڑے عمل کا ثواب بھی بہت بڑا ہے۔سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں فرمایا فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (سو جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انہیں میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں۔اور انہوں نے قتال کیا اور مقتول ہوئے میں ضرور ان کی خطاؤں کا کفارہ کر دوں گا اور ضرور اُن کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ انہیں بدلہ ملے گا اللہ کے پاس سے،اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے)۔

اور سورۂ بقرہ میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے)۔

اور سورۂ توبہ میں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے درجہ والے ہیں اور یہی لوگ کامیاب بامراد ہیں)۔

اور سورۂ نحل میں فرمایا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ م بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (جن لوگوں نے اللہ کیلئے ہجرت کی اس کے بعد کہ اُن پر ظلم کیا گیا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ لیتے)۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ہجرت اور جہاد دونوں کی شریعتِ اسلامیہ میں بڑی اہمیت ہے ان دونوں کی برکات بھی بہت ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کیلئے ہجرت کرے گا اس کو ضرور ہی کسی نہ کسی جگہ ٹھکانہ مل جائے گا اور اسکو مالی کشائش بھی نصیب ہوگی۔ پردیس میں نیا نیا پہنچنے کی وجہ سے ابتداء کوئی تکلیف پہنچ جائے تو یہ اور بات ہے لیکن جلد ہی رحمت اور برکت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ظاہری و باطنی منافع ملنے لگتے ہیں اور معاش میں بھی فراوانی ہو جاتی ہے۔حضرات صحابہؓ نے مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ کو ہجرت کی تھی چند سال بعد مکہ معظّمہ بھی فتح ہو گیا۔ خیبر فتح ہوا بہت سے علاقے قبضے میں آئے بڑی بڑی جائیدادیں ملیں،اموالِ غنیمت ہاتھ آئے۔ پھر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مصر شام،عراق فتح ہوئے جو حضرات مکہ میں مجبور اور بے کس تھے ان کو بڑے بڑے اموال ملے۔

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہجرت اور جہاد سے کایا پلٹ جاتی ہے اور مسلمان نہ صرف یہ کہ ثواب آخرت کے اعتبار سے (جس کے برابر کوئی چیز نہیں ہو سکتی) بلکہ دنیاوی اعتبار سے بھی ہجرت اور جہاد کی وجہ سے عزت اور شرف اور کافروں پر غلبہ اور مالداری اور غلام اور باندیوں کی ملکیت کے اعتبار سے کامیاب اور فائز المرام ہو جاتے ہیں۔

اصل ہجرت یہ ہے کہ گناہ چھوڑ دیئے جائیں......ہجرت کس لئے کی جائے،اس لئے کہ اللہ کے دین پر چل سکیں احکامِ اسلام بجا لانے میں جو دشمن رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ رکاوٹ دور ہو جائے اور اہلِ ایمان میں پہنچ کر سکون واطمینان کے ساتھ دینی کاموں میں لگ سکیں۔صرف وطن چھوڑ دینا ہی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی

فرمانبرداری اور اطاعت کو شعار بنایا جائے۔ صحیح بخاری ص ۶ ج ۱ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **المھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ** (حقیقی مہاجر وہ ہے جو اُن چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے) ایک اور حدیث میں ہے **المھاجر من ھجر الخطایا و الذنوب** (واقعی مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے) مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۵۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ **ای الھجرۃ افضل** (کون سی ہجرت افضل ہے) آپؐ نے فرمایا **اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ** کہ تو ان کاموں کو چھوڑ دے جو تیرے رب کو ناگوار ہوں۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ صرف وطن چھوڑ دینے ہی کا نام ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت کے لوازم کو بھی اختیار کرنا لازم ہے۔

آجکل لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وطن تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن جہاں آ کر آباد ہوتے ہیں وہاں نہ صرف یہ کہ گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ سابق وطن میں جو دینی زندگی تھی اس کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ گناہوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نمازیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ شرعی پردہ بھی انہیں ناگوار ہونے لگتا ہے اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ زکوتیں حساب سے نہیں دیتے۔ بائن یا مغلظہ طلاق دے کر بھی جاہلی قانون کا سہارا لے کر عورت کو گھر میں رکھے رہتے ہیں اور عناد و فساد اور جنگ و جدال کو اپنا وطیرہ بنا لیتے ہیں۔ کوئی دین کیطرف متوجہ کرے تو اس کے گلے پڑتے ہیں۔ کفریہ کلمات تک بک جاتے ہیں، ان سب باتوں کے باوجود اپنے کو مہاجر ہی کہتے ہیں۔

جو شخص ہجرت کر کے آئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس مہاجر کی مدد کریں۔

انصارِ مدینہ کا بے مثال عمل ...... حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جب مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہر طرح سے اُن کی مدد کی۔ اسی لئے ان کو انصار (مدد کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ سورۂ حشر میں فرمایا **وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.**

ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے دار الاسلام کو پہلے سے اپنا ٹھکانا بنایا اور ایمان کو مضبوطی سے پکڑا ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اُن کی طرف ہجرت کی اور جو کچھ اُن کو دیا گیا اس سے اپنے سینوں میں کوئی شک محسوس نہیں کرتے اور اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو حاجت ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچا دیا گیا سو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)

انصارِ مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو کچھ لینے دینے کا اور نصرت و خدمت کا برتاؤ کیا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آجکل تو مہاجرین ہی مہاجرین ہیں انصار کا وجود نہیں ہے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ دینی تقاضوں کے مطابق زندگی گذارنے کا مزاج نہیں رہا مہاجرین کی خدمت کو اپنا کام سمجھنے کی بجائے دار الہجرت کے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ قوم ہمارے لئے بوجھ بن گئی اور ہمارے علاقے میں آ کر ہمارے حقوق چھیننے لگی، حضرات انصار کو یہ بھی گوارا نہیں کہ مہاجرین اپنے دست و بازو سے اور تجارت و زراعت سے مال حاصل کر کے کمائیں اور کھائیں، دونوں فریق کو عصبیت کھائے جاتی ہے، ہر شخص اپنی نیت کا جائزہ لے کہ اس نے کیوں ہجرت کی۔ ہجرت اللہ کے لئے ہوتی ہے تو اس کی برکات ہی اور ہوتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مہاجرین صاحبان دین پر قائم نہیں رہتے اعمالِ صالحہ سے بچتے ہیں بڑھ چڑھ کر گناہوں میں حصہ لیتے ہیں اور دشمنانِ دین کی شہہ پر مقامی لوگوں کو دشمن بنا لیتے ہیں اور قتل و قتال میں حصہ لیتے ہیں، دینی تقاضے تو چھوڑ دیئے۔ خالص دنیاداری اور

گنہگاری میں لگ گئے۔ اس کے باوجود یہ امید کرتے ہیں کہ انصار ہماری مدد کریں، مدد تو دین داری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دین داری کو پس پشت ڈال دیا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی اس کے لئے مرتے ہیں اُس کے لئے جیتے ہیں، اہل دنیا سے تو اسی طرح صلح ہوسکتی ہے کہ اُن کی ذاتی اشیاء سے گریز کیا جائے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازهد فی الدنیا یحبک الله و ازهد فیما عند الناس یحبک الناس (رواہ الترمذی وابن ماجۃ) (کہ تو دنیا سے بے رغبت ہو جا تجھ سے اللہ محبت فرمائے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبت ہو جا لوگ تجھ سے محبت کریں گے) اگر اس پر عمل نہ کیا تو وہی ہوگا جو ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا

فان تجتنبها کنت سلمًا لاهلها و ان تجتذبها نازعتک کلابُها

سو اگر تو دنیا سے پرہیز کرے گا تو دنیا والوں سے تیری صلح رہے گی۔ اور اگر تو اس کو اپنی طرف کھینچے گا تو دنیا کے کتے تجھ سے جھگڑا کریں گے۔

بہت سے ملکوں سے مسلمان نکالے گئے جن کو نکالا گیا ہے یہ خود دینی زندگی پر نہیں آتے۔ لامحالہ مقامی لوگ بھی ان سے محبت نہیں کرتے۔ جیسے ہر عمل میں اخلاص یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت شرط ہے اسی طرح ہجرت میں بھی اخلاص ضروری ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اعمال نیتوں کے ساتھ ہیں اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ سو جس شخص کی ہجرت اس کی نیت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو ثواب کے اعتبار سے بھی اس کی نیت اللہ اور اس کے رسول کی طرف مانی جائے گی اور جس کی ہجرت کسی دنیا کے حاصل ہونے کے لئے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے کی ہو تو جزا کے اعتبار سے بھی اس کی نیت اسی کے لئے مانی جائے گی جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور حدیث کی تقریباً سبھی کتابوں میں ہے۔ ایک آدمی نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا تھا، اس عورت کو ام قیس کہتے تھے جب نکاح کا پیغام آیا تو اس نے اس مرد سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کرنے کی شرط لگائی، وہ ہجرت کر کے آ گیا، حضرات صحابہؓ اسے مہاجر ام قیس کہا کرتے تھے۔ کما ذکرہ محشی البخاری ص۲ ج۱، عن الطبرانی فی الکبیر باسناد رجاله ثقات۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کر لو اگر تم کو اس بات کا خوف

أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾

ہے کہ کافر لوگ تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے، بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔

سفر میں نماز قصر پڑھنے کا بیان

جہاد اور ہجرت میں چونکہ سفر درپیش ہوتا ہے اس لئے ہجرت کے ساتھ سفر میں نماز قصر کرنے کا حکم بھی بیان فرما دیا، بموجب احکام کتاب وسنت مسلمان ہمیشہ نماز قصر پڑھتے آئے ہیں۔ قصر صرف چار رکعت والی نماز میں ہے یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعتوں کے بجائے دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ نماز مغرب اور نماز فجر میں قصر نہیں ہے ان کو سفر میں بھی پورا ہی پڑھنا فرض ہے۔ اگر مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اُسے بھی امام کی اقتداء میں چار رکعت والی نماز پوری پڑھنی فرض ہے۔ مقیم اگر مسافر کے پیچھے اقتداء کر لے تو جب

امام دو رکعت پر سلام پھیرے تو مقیم مقتدی کھڑے ہو کر اپنی چار رکعت پوری کرنے کے لئے باقی رکعات پڑھے۔

ہر سفر میں قصر پڑھنا درست نہیں ہے اگر تین منزل کا سفر ہو تو قصر کرنا درست ہے۔ایک منزل سولہ میل کی لینے سے مسافتِ قصر ۴۸ میل ہے اور کلومیٹر کے حساب سے ۸۸ کلومیٹر ہے یہ مسافت قصر ہے، اتنی مسافت کے لئے جب اپنی بستی کی حدود سے نکل جائے تو نماز سفر شروع کردے اگرچہ ذرا دور ہی پہنچا ہو اور جب تک کسی بستی یا شہر میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔نمازِ قصر ہی پڑھتا رہے۔ اگر کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرلی تو وہاں سے چلنے تک ہر نماز پوری پڑھے ،قصر نہ کرے۔

سفر میں سنتیں پڑھنے کا حکم ...... سنتوں میں قصر نہیں ہے البتہ اگر جلدی ہو، سواری چھوٹ جانے کا ڈر ہو تو سنتیں بالکل ہی چھوڑی جاسکتی ہیں، اطمینان ہو اور جلدی کا تقاضا نہ ہو تو سنتیں بھی پڑھ لے البتہ وتر ہرگز نہ چھوڑے اور فجر کی سنتیں بھی اہتمام سے پڑھ لے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں دو رکعت نمازِ ظہر پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں آپؐ کے ساتھ پڑھیں اور اس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی اور مغرب کی سفر اور حضر میں تین رکعت نماز پڑھی ان میں سفر اور حضر میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی اور یہ دن کے وتر ہیں اور ان کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ (رواہ الترمذی ص ۱۰۵)

حضرت براء بن عازبؓ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھارہ دن سفر میں رہا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ آپؐ نے سورج ڈھلنے کے بعد دو رکعتیں چھوڑی ہوں۔معلوم ہوا کہ سفر میں سنتیں پڑھنا بھی مشروع ہے۔امام ترمذیؒ فرماتے ہیں ثم اختلف **اهل العلم بعد النبی صلی الله علیه وسلم فرأی بعض اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم ان یتطوع الرجل فی السفر وبه یقول احمد واسحق ولم یر طائفة من اهل العلم ان یصلی قبلها ولا بعدها و معنی من لم یتطوع فی السفر قبول الرخصة ومن تطوع فله فی ذٰلک فضل کثیر وهو قول اکثر اهل العلم یختارون التطوع فی السفر** ۔(یعنی سفر میں سنتیں پڑھنے کی بابت اہل علم کا اختلاف ہے بعض صحابۂ کرامؓ کی رائے یہ ہے کہ آدمی کو دوران سفر فرضوں کے ساتھ ساتھ سنتیں بھی پڑھنی چاہئیں یہی امام احمد اور اسحٰق کا بھی مسلک ہے اور اہل علم کی ایک جماعت سفر میں سنتیں پڑھنے کی قائل نہیں نہ فرضوں سے پہلے نہ فرضوں کے بعد۔مقصد یہ ہے کہ جس نے سفر میں سنتیں نہیں پڑھیں اس نے رخصت پر عمل کیا اور جس نے سنتیں پڑھیں اس کیلئے بہت اجر وثواب ہے۔اہل علم کی کثیر تعداد کا یہی مسلک ہے کہ وہ سفر میں سنتیں پڑھنے کو پسند کرتے ہیں)

مسافر اگر پوری چار رکعت پڑھ لے؟ ...... قرآن مجید کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کافروں کے فتنے میں ڈالنے یعنی تکلیف پہنچانے کا اندیشہ ہو تو نماز قصر کرنے کی اجازت ہے۔اسی لئے حضرت یعلی بن امیہ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا کہ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ امن وامان ہو تو قصر نہ ہو) اب تو امن وامان ہو گیا (لہٰذا پوری پڑھنی چاہیئے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے بھی اس بات سے تعجب ہوا تھا جس سے تمہیں تعجب ہو رہا ہے (کہ اب تو امن وامان ہے۔لہٰذا پوری نماز پڑھا کریں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے تم پر صدقہ ہے لہٰذا اللہ کا صدقہ قبول کرو۔ (رواہ مسلم ص ۲۴۱ ج ۱)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں اوّل یہ کہ کافروں کی طرف سے فتنے میں ڈالنے کی شرط جو الفاظ قرآن سے مفہوم ہو رہی ہے یہ شرط ابتداء تھی، بعد میں یہ شرط نہیں رہی اور نماز قصر مستقل ایک حکم بن گئی اور مسافت قصر کے سفر پر ہی قصر کا مدار رہ گیا۔کسی قسم کا کوئی خوف اور کافروں کی فتنہ گری نہ ہو تب بھی چار رکعت والی نماز قصر ہی پڑھی جائے۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مکہ سے مدینہ کا سفر فرمایا اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ تھا۔ آپ دو، دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے۔ (مجمع الزوائد ص ۱۵۶ ج ۲)

حضرت حارثہ ابن وہب نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ لوگ خوب زیادہ امن وامان میں تھے۔ (رواہ مسلم ص ۲۴۳ ج ۱) دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بصیغۂ امر ارشاد فرمایا فاقبلوا صدقته کہ اللہ کے صدقے کو قبول کرو، اسی لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قصر کرنا واجب ہے۔ مسافر پوری نماز پڑھ لے گا تو اچھا نہ کرے گا۔ اور چونکہ اس پر دو رکعتیں فرض ہیں اسی لئے دو رکعتوں پر ہی اس کا قعدہ اخیرہ ہے اگر دوسری رکعت پر بیٹھے بغیر کھڑا ہو گیا اور اس طرح چار رکعتیں پڑھ لیں تو دوبارہ نماز پڑھے کیونکہ ترک فرض ہو گیا اور ترک فرض ہو جائے تو سجدہ سہو سے بھی اس کی تلافی نہیں ہوتی۔ اور عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں رہا ہوں آپ نے دو رکعتوں سے زیادہ (چار رکعت والی فرض) نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی اور حضرت ابوبکر کے ساتھ رہا ہوں انہوں نے سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ (فرض) نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اٹھالیا اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہا ہوں انہوں نے بھی سفر میں دو رکعت سے زیادہ (فرض) نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اٹھالیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی ذات شریفہ میں اسوۂ حسنہ یعنی اچھی اقتداء ہے) صحیح مسلم ص ۲۴۲ ج ۱

حضرت عثمانؓ اپنے آخری زمانۂ خلافت میں چار رکعتیں پڑھنے لگے تھے۔ (صحیح مسلم ص ۲۴۳ ج ۱) اس پر لوگوں کو اشکال ہوا تو جواب میں کہا گیا کہ انہوں نے تاویل کر لی ہے۔ یہ تاویل خود حضرت عثمانؓ سے مروی ہے۔ مجمع الزوائد ص ۱۵۶ ج ۲ میں مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی ذباب نے بتایا کہ حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی تو لوگوں نے اس کو اچھا نہیں جانا حضرت عثمانؓ نے جب لوگوں کی طرف سے انکار دیکھا تو فرمایا کہ میں نے مکہ میں وطن بنالیا ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں وطن بنالے تو وہاں مقیم والی نماز پڑھے، حضرت عثمانؓ کا تاویل کرنا اور وطن بنانے کی نیت کر کے چار رکعت پڑھنا اور حاضرین کا پوری نماز پڑھنے پر تعجب کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسافر کو قصر ہی پڑھنا لازم ہے اگر سفر میں چار رکعت والی نماز پوری پڑھنا جائز ہوتا یا افضل ہوتا ...... تو حاضرین کو حضرت عثمانؓ کے پورے نماز پڑھنے پر تعجب نہ ہوتا (جبکہ یہ حضرات صحابہؓ اور تابعین تھے) اور حضرت عثمانؓ کو بھی تاویل نہ کرنی پڑتی۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا

اور جب آپ اُن میں موجود ہوں پھر ان کے لئے نماز قائم کریں تو چاہیئے کہ اُن میں سے ایک جماعت آپکے ساتھ کھڑی ہو جائے اور یہ لوگ اپنے ہتھیار

اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا

لے لیں، پھر جب سجدہ کر چکیں تو یہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور دوسری جماعت آ جائے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی، سو وہ آپ

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ

کے ساتھ نماز پڑھیں، اور اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار ساتھ لے لیں، کافروں کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں

عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

سے اور اسباب سے غافل ہو جاؤ تو تم پر یک بارگی حملہ کر بیٹھیں ، اور تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں

اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا

کہ اگر بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا

حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا

سامان لے لو، بے شک اللہ نے کافروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار فرمایا ہے۔ سو جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو

اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ

یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر، پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز قائم کرو، بے شک نماز مؤمنین

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝۱۰۳

پر فرض ہے جس کا وقت مقرر ہے۔

صلوٰۃ الخوف کا طریقہ اور اس کے بعض احکام

اس آیتِ شریفہ میں صلوٰۃ الخوف (خوف کی نماز) کا ذکر ہے، لباب النقول ص ۸۱ میں حضرت ابوعیاش زرقی ؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام عسفان میں تھے سامنے سے مشرکین آ گئے جو خالد بن ولید کی سرکردگی میں تھے (وہ اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) یہ لوگ ایسی جگہ تھے جو ہمارے اور ہمارے قبلہ کے درمیان تھی، آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نمازِ ظہر پڑھائی تو مشرکین کہنے لگے کہ ہم نے غلطی کی جب یہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے اُس وقت ان پر حملہ کر دیتے ان کو تو ہمارے حملے کا خیال بھی نہ تھا۔ پھر کہنے لگے کہ ابھی ایک اور نماز آنے والی ہے (یعنی نمازِ عصر) وہ نماز ان کو اپنے بیٹوں سے اور اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ جب یہ لوگ آئندہ نماز میں مشغول ہو جائیں تو ان پر حملہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیت لے کر نازل ہوئے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (الآیۃ) نمازِ خوف کئی طرح سے ثابت ہے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ طریقے نقل کئے آیتِ بالا میں صلوٰۃ خوف کا جو طریقہ ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ امام نمازیوں کی دو جماعتیں بنائے اُن میں سے ایک جماعت شیطان کی طرف متوجہ رہے اور دشمن کی نگرانی کرے اور ایک جماعت امام کے پیچھے کھڑی ہو جائے جب امام کے ساتھ کھڑی ہونے والی جماعت پہلی رکعت کے دونوں سجدوں سے فارغ ہو جائے تو یہ لوگ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں اور دشمن کی طرف چلے جائیں اور وہ دوسری جماعت آ جائے جنہوں نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی، ان کے آنے تک امام ان کی انتظار میں بیٹھا رہے۔ اب یہ گروہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ لے۔ امام سلام پھیر دے امام کی دو رکعتیں ہو گئیں اور دونوں جماعتوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔ اب یہ دوسری جماعت سلام پھیرے بغیر دشمن کی طرف چلی جائے اور پہلی جماعت آ جائے جس کی ایک رکعت باقی ہے یہ اپنی باقی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اور دشمن کی طرف چلی جائے پھر دوسری جماعت آ جائے ان کی بھی اب

تک ایک رکعت باقی ہے وہ اپنی باقی ایک رکعت پڑھ لیں۔

یہ ہر جماعت کو ایک ایک رکعت پڑھانا اس صورت میں ہے جبکہ امام اور مقتدی مسافر ہوں اگر امام مقیم ہو تو ہر جماعت کو دو، دو رکعتیں پڑھائے باقی رکعتیں وہ لوگ پوری کر لیں اگر نمازِ مغرب میں ایسا واقعہ پیش آئے تو پہلی جماعت کو دو رکعتیں اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائے نماز میں آنا جانا چونکہ حالتِ اضطرار کی وجہ سے ہے اور شرعی اجازت سے ہے اس لئے اس سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت سے نہ صرف نماز کی بلکہ نماز باجماعت کی اہمیت معلوم ہو رہی ہے جبکہ دشمن سر پر سوار ہے اس وقت بھی نماز چھوڑنے کا ذکر تو کیا ہوتا بلا جماعت نماز پڑھنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا۔ ہاں اگر دشمن کا ہجوم اس انداز سے ہو جائے کہ اُن کے حملے کی حفاظت سے کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ اور نمازِ خوف پڑھنے کی صورت میں بھی حفاظت کی کوئی صورت نہ بن رہی ہو تو پھر علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیں اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو نماز بالکل بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔ جس کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے جب دشمن کا ہجوم نہ رہے تو چھوٹی ہوئی سب نمازیں قضا پڑھ لیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر کیا تھا۔

مسئلہ .... اگر دو امام بنالیں اور یکے بعد دیگرے ہر جماعت الگ الگ امام کے پیچھے نماز پڑھ لے تو یہ زیادہ افضل ہے۔ اگر سب ایک ہی کے پیچھے پڑھنے پر اصرار کریں تو اس کا وہ طریقہ ہے جو اوپر لکھا گیا۔

مسئلہ .... اگر جنگ کرنے کی حالت میں نماز پڑھیں گے تو عملِ کثیر سے نماز فاسد ہو جائے گا اس سلسلہ کے بعض مسائل سورۃ البقرہ کے رکوع (۳۱) میں گذر چکے ہیں آیت فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

وَلْيَأْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ میں یہ بتایا کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو ہتھیار ساتھ رکھ لیں اگر مقابلہ کی ضرورت پڑ جائے تو ہتھیار لینے میں دیر نہ لگے اگرچہ قتال کرنے سے نماز ٹوٹ جائے گی لیکن دشمن کا دفاع کرنے کی وجہ سے نماز توڑنے کا گناہ نہ ہوگا۔

پھر فرمایا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ (اگر تم کو بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیمار ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ اپنے ہتھیاروں کو رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ لے لو) مطلب یہ ہے کہ بارش یا بیماری کی مجبوری سے ہتھیار نہیں باندھ سکتے تو اتار کر رکھ سکتے ہیں لیکن دشمنوں سے حفاظت کا دھیان پھر بھی رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً ہتھیار باندھے نہیں تو قریب رکھے رہیں یا دشمن کی نگرانی کے لئے کسی کو مقرر کر دیں پھر نماز پڑھیں، پھر فرمایا فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی بیٹھے بھی، اور لیٹے بھی۔ نماز خود ذکر ہے اور ذکر ہی کے لئے مشروع ہوئی ہے جیسا کہ سورۂ طٰهٰ میں فرمایا اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (کہ نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو) نماز اوّل سے آخر تک ذکر ہے ذکر قلبی بھی ہے اور ذکر لسانی بھی اور ہر عبادت کی روح ذکر ہی ہے۔ ہر حالت میں ذکر کرتے رہنا چاہئے۔ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، چلتے پھرتے ہر حال میں ذکر کریں۔ جب اس دنیا میں کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو قیامت آ جائے گی۔ (کما رواہ مسلم ص ۸۴ ج ۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو چند لوگ کسی جگہ بیٹھے انہوں نے اپنی مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کیا اور اپنے نبی پر درود نہ بھیجا تو یہ مجلس ان کے لئے نقصان کا سبب ہوگی۔ پھر اگر اللہ چاہے تو ان کو عذاب دے اور اگر چاہے تو ان کی مغفرت فرما دے اور اگر کوئی شخص کسی جگہ لیٹا اور اس نے لیٹنے میں اللہ کو یاد نہ کیا تو یہ لیٹنا اس کے لئے اللہ کی طرف سے نقصان کا سبب

ہوگا اور جو شخص کسی جگہ چلا اور اس چلنے میں اس نے اللہ کو یاد نہ کیا تو اللہ کی طرف سے اس کا یہ چلنا نقصان کا باعث ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو لوگ کسی جگہ بیٹھے جس میں انہوں نے اللہ کو یاد نہ کیا اور اپنے نبی پر درود نہ بھیجا تو قیامت کے دن ان کا یہ بیٹھنا حسرت اور افسوس کا باعث ہوگا۔ اگرچہ ثواب کے لئے جنت میں داخل ہو جائیں۔ (الترغیب والترہیب ص ۴۰۱، ۴۰۹ ج ۲)

جہاد بہت بڑی عبادت ہے اس عبادت کو بھی ذکر سے معمور رکھنا چاہئے، ہر عبادت میں اللہ کے ذکر سے خوب زیادہ نورانیت آ جاتی ہے۔ یوں نہ سمجھیں کہ جہاد میں تو لگ ہی رہے ہیں ذکر سے غافل ہو گئے کوئی بات نہیں، ذکر ہر حال میں ہر مؤمن کی جان کا ساتھی ہے۔

فی سبیل اللہ نماز، روزہ اور ذکر کا ثواب ...... حضرت سہل بن معاذؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ فی سبیل اللہ جو مال خرچ کیا جائے، نماز، روزہ اور ذکر کا ثواب اس پر سات سو گنا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ (الترغیب والترہیب ص ۲۶۷ ج ۲)

پھر فرمایا فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو) مفسرین نے فرمایا کہ اس کا تعلق وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ سے ہے مطلب یہ ہے کہ جب سفر سے واپس ہو کر مقیم ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو، نیز اس کا تعلق نمازِ خوف سے بھی ہو سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب حالت خوف ختم ہو جائے تو نماز کو ٹھیک طرح سے اس کے قواعد مقررہ کے مطابق پڑھو۔

آخر میں فرمایا اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا بے شک نماز مؤمنین پر فرض ہے جس کے اوقات مقرر ہیں۔ سفر میں حضر میں، امن میں خوف میں، مرض میں صحت میں، ہر حال میں قواعد شرعیہ کے مطابق نماز کو اس کے اوقات میں پڑھو۔ چونکہ نماز کے اوقات مقرر ہیں اس لئے کسی نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں اور ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت پڑھنے کے لئے مؤخر کرنا جائز نہیں، قصداً و ارادۃً نماز کو قضا کر دینا سخت گناہ ہے۔ اگر سوتا رہ جائے یا بھول جائے ...... یا ایسی کوئی مجبوری ہو جائے جس میں دشمن کا ہر طرف سے ہجوم ہو اور نماز پڑھنے کا موقع نہ ہو تو بعد میں قضا پڑھ لے۔ سفر میں جمع صوری کی جا سکتی ہے، جمع صوری کے طریقے پر نمازِ ظہر و عصر اور مغرب، عشاء ادا کی جا سکتی ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ نمازِ ظہر اخیر وقت میں اور نمازِ عصر اول وقت میں اسی طرح نمازِ مغرب اخیر وقت میں اور نمازِ عشاء اول وقت میں پڑھ لے، دیکھنے میں تو جمع کر کے پڑھیں اور حقیقت میں اپنے وقت میں پڑھیں۔ آیت بالا میں چونکہ نماز کے بارے میں کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا فرمایا ہے یعنی اس کے اوقات معین اور محدود فرما دیئے ہیں۔ اس لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سفر میں بھی جمع حقیقی نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ دو نمازیں ایک ہی نماز کے وقت میں پڑھی جائیں، یہ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ ...... اگر کوئی شخص قصداً نماز ترک کر دے تو جلد اس کی قضا پڑھے اور بہت زیادہ توبہ و استغفار کرے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ

اور دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، اگر تم کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے جیسا کہ تمہیں تکلیف ہوتی ہے، اور تم اللہ سے

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۟

وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے، اور اللہ علیم ہے حکیم ہے۔

ع ۱۴

دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ دکھاؤ

جب دشمنوں کا پیچھا نہ کیا جائے تو وہ شیر ہو جاتے ہیں اور اہل ایمان کو ضعیف اور کمزور سمجھنے لگتے ہیں اور حملے کرنے کے ارادے کرتے

رہتے ہیں اس آیت میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ دشمنوں کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، کمزور نہ ہو جاؤ، سستی کا مظاہرہ نہ کرو۔ پھر چونکہ دشمنوں کا پیچھا کرنے سے قتال کے مواقع بھی آ جاتے ہیں اور اس میں قتل بھی ہوتے ہیں زخم بھی آتے ہیں اور بھی تکلیفیں پہنچ جاتی ہیں۔ اس لئے ان تکلیفوں کا احساس کم کرنے کے لئے اور طبعی طور پر جو دکھ محسوس ہو اس کا ازالہ کرنے کے لئے۔

اگر تم دکھ پاتے ہو تو دشمن بھی تو تکلیف اٹھاتے ہیں...... ارشاد فرمایا اگر تم دکھ پاتے ہو اور بے آرام ہوتے ہو تو یہ بات کوئی تمہارے ہی ساتھ خاص نہیں تمہارے دشمن بھی تو دکھ میں مبتلا ہوتے ہیں تکلیفیں سہتے ہیں مقتول اور مجروح ہوتے ہیں، تم دیکھ لو انھیں کیا ملتا ہے اور تمہیں کیا ملتا ہے؟ تم تو اللہ سے آخرت کے ثواب کی اُمید رکھتے ہو بڑے بڑے درجات کی اُمید میں تکلیف اٹھاتے ہو جنت کے آرزومند ہو اتنی بڑی نعمتوں کے سامنے یہ ذرا سی تکلیف کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی اور کافر جو دکھ اٹھاتے ہیں اور تکلیف سہتے ہیں اُن میں بہت سے تو موت کے بعد جزا سزا کے قائل ہی نہیں اور جو لوگ موت کے بعد حشر و نشر کے قائل ہیں وہ بھی قتل و قتال کی تکلیفوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے موت کے بعد کسی خیر کے آرزومند نہیں ہیں وہ تو اپنے باطل دینوں کے لئے لڑتے ہیں اور آخرت میں ثواب لینے کا کہیں سے کہیں تک بھی انہیں تصور نہیں۔ جب وہ جنگ کرتے ہیں اور جان و مال خرچ کرتے ہیں (حالانکہ وہ باطل پر ہیں اور موت کے بعد انہیں امید بھی خیر کی نہیں) تو تمہیں تو اُن سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خوب جم کر قتل و قتال کرنا چاہئے۔ جنگ میں تو تکلیف ہی ہے لیکن تم جنت کی آرزو لئے ہوئے ہو اور کافر کے سامنے اس کے دین باطل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا تمہارے لئے کمزوری کا کوئی پہلو نہیں ہمیشہ ہمت سے رہو اور شجاعت دلیری اور بہادری سے کام لو۔ جئے تو غازی مرے تو شہید تمہیں تو کوئی نقصان ہی نہیں۔

پھر فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کو سب کچھ علم ہے تمہاری مصلحتوں کو بھی جانتا ہے تمہارے اعمال سے بھی باخبر ہے۔ حکمت والا بھی ہے اسکے اوامر اور نواہی حکمت کے مطابق ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو گے تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ قال صاحب الروح ص ۱۳۸ ج ۵ فجدّوا فی الامتثال فان فیه عواقب حمیدة و فوزاً بالمطلوب۔ (صاحب روح المعانی ؒ فرماتے ہیں احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں کوشش کرو کیونکہ اس کے نتائج بہت عمدہ ہیں اور اسی میں مقصد کی کامیابی ہے)

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ

بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اُتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ دیں جو اللہ نے آپ کو سمجھایا، اور نہ ہو جائیے خیانت کرنے

خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ

والوں کے طرف دار۔ اور اللہ سے استغفار کیجئے، بے شک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔ اور آپ اُن لوگوں کی طرف سے جواب دہی نہ کیجئے جو اپنی جانوں

اَنْفُسَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ

کی خیانت کر رہے ہیں بے شک اللہ پسند نہیں فرماتا اس شخص کو جو خیانت کرنے والا گنہگار ہو۔ جو شرماتے ہیں

مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

لوگوں سے اور اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ وہ راتوں کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جس سے اللہ راضی نہیں ہے،

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور اللہ اُن کے سب کاموں کو جاننے والا ہے۔ خبردار تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے ہو اُن کی طرف سے دنیا والی زندگی میں سو کون جھگڑے گا اُن کی طرف سے قیامت کے

اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝١٠٩ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ

دن یا کون ہو گا ان کا کارساز۔ اور جو شخص کوئی گناہ کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو اللہ کو

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝١١٠ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا

پائے گا بخشنے والا مہربان۔ اور جو شخص کوئی گناہ کرے تو یہ گناہ کرنا اسی پر پڑے گا۔ اور اللہ علیم ہے

حَكِيْمًا ۝١١١ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗــــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝١١٢

ع ۱۶/۱۸ ۱۳

حکیم ہے، اور جو کوئی شخص چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ کرے پھر کسی بَری آدمی کو اس کی تہمت لگا دے تو اس نے بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لادلیا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ

اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو اُن میں سے ایک گروہ نے یہ ارادہ کر ہی لیا تھا کہ آپ کو بہکا دیں، اور وہ نہیں بہکاتے مگر

اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ

اپنی ہی جانوں کو، اور آپ کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچائیں گے، اور اللہ نے نازل فرمائی ہے آپ پر کتاب اور حکمت، اور آپ کو وہ باتیں بتائیں

الثلثہ

مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝١١٣ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىھُمْ اِلَّا مَنْ

جن کو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا فضل بہت بڑا ہے۔ نہیں ہے کوئی بھلائی ان کے بہت سے مشوروں میں مگر

اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ

جو شخص صدقے کا یا اچھی باتوں کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دے اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضا جوئی

اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝١١٤ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى

کے لئے کرے گا سو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔ اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت ظاہر ہو چکی

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝١١٥ اِنَّ اللّٰهَ

ع ۱۷ ۱۴

اور مسلمانوں کے راستے کے خلاف کسی دوسرے راستے کا اتباع کرے تو ہم اس کو وہ کام کرنے دیں گے جو وہ کرتا ہے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ بے

لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ

شک اللہ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے اور اسکے علاوہ جتنے گناہ ہیں جس کیلئے اُسے منظور ہو گا بخش دے گا، اور جو شخص اللہ کیساتھ شرک کرے تو وہ دور کی

ضَلٰلًۢا بَعِيۡدًا

بڑی گمراہی میں جا پڑا۔

ایک منافق کا چوری کرنا اور اس کی طرف سے دفاع کرنے پر چند تنبیہات

آیت بالا کا سبب نزول ایک واقعہ ہے جسے امام ترمذی نے اپنی کتاب میں حضرت قتادہ بن نعمانؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے قبیلے میں تین آدمی تھے۔ بشر، بشیر اور مبشر ان کو بنی اُبیرق کہا جاتا تھا۔ ان میں بشیر منافق آدمی تھا وہ ایسے شعر کہتا تھا جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ہجو ہوتی تھی پھر ان اشعار کو بعض اہل عرب کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور کہتا رہتا تھا کہ فلاں نے یوں کہا فلاں نے یوں کہا آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ (جب ان اشعار کو سنتے تھے تو سمجھ لیتے تھے کہ یہ اسی کی حرکت ہے اور) کہتے تھے کہ اللہ کی قسم یہ شعر تو اسی خبیث نے کہے ہیں اور کہتے تھے کہ یہ ابن الابیرق کے اشعار ہیں، یہ تینوں آدمی حاجت مند تھے ان کو فاقے رہتے تھے جاہلیت میں بھی ان کا یہ حال تھا اور زمانہ اسلام میں بھی ان کی یہ حالت تھی۔ اہل مدینہ کا گذارہ اس وقت کھجوروں اور جو پر تھا۔ جب ملک شام سے مال برآمد کرنے والے تاجر آتے تو میدہ فروخت کرنے کے لئے لاتے تھے یہ میدہ ایسے لوگ خاص کر اپنے لئے خرید لیتے تھے جو پیسے والے ہوتے تھے جبکہ ان کے اہل وعیال کھجوروں اور جو پر ہی گذارہ کرتے تھے۔

حضرت قتادہ بن نعمان نے مزید بیان فرمایا کہ شام سے کچھ تاجر آئے ان سے میرے چچا رفاعہ بن زید نے میدہ خرید لیا اور اُسے اوپر کی منزل کے ایک کمرہ میں رکھ دیا اس کمرہ میں ہتھیار بھی تھے زرہ بھی تھی اور تلوار بھی، نیچے سے کسی نے اُس کمرے میں نقاب ڈال کر کھانے کی چیز (یعنی میدہ) اور ہتھیار چرا لئے۔ جب صبح ہوئی تو میرے چچا رفاعہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ اے میرے بھائی کے بیٹے! اس رات میں ہمارے اوپر زیادتی کی گئی ہے کمرہ میں نقب لگایا گیا ہے اور ہمارا کھانے کا سامان اور ہتھیار کوئی شخص لے گیا۔ اس پر ہم نے تجسس کیا اور پتہ چلانے کی کوشش کی (محلے میں) پوچھ گچھ کی تو ہمیں لوگوں نے بتایا کہ بنی اُبیرق نے اس رات میں آگ جلائی ہے (یعنی کھانے پکائے ہیں) اور ہمارا اندازہ یہی ہے کہ انہوں نے آپ ہی لوگوں کا مال چرا کر کھانے پکانے میں رات گذاری ہے۔ جب ہم پوچھ گچھ کر رہے تھے اس وقت بنو ابیرق بھی موجود تھے وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ اللہ کی قسم آپ لوگوں کا یہ مال لبید بن سہل نے چرایا ہے۔ لبید بن سہل نیک آدمی تھے۔ سچے مسلمان تھے جب انہوں نے یہ بات سنی تو اپنی تلوار نکالی اور کہنے لگے کیا میں چراؤں گا؟ اللہ کی قسم یا تو یہ چوری پوری طرح ظاہر ہو جائے گی، ورنہ میں اسی تلوار سے تمہاری خبر لے لوں گا۔ میرے خاندان والوں نے کہا کہ آپ اس فکر میں نہ پڑیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ یہ کام کرنے والے نہیں ہیں ہم برابر پوچھ گچھ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ اس کام کے کرنے والے بنو اُبیرق ہی ہیں میرے چچا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا واقعہ بیان کر دو چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا میں نے عرض کیا کہ ہمارے قبیلے میں ایک خاندان ہے جن سے دوسروں کے تعلقات اچھے نہیں ہے انہوں نے میرے چچا رفاعہ کے گھر میں نقب لگا کر ہتھیار اور کھانے کا سامان چرا لیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہتھیار واپس کر دیں۔ اب رہا کھانے کا سامان ہمیں اس کی کچھ حاجت نہیں یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس بارے میں مشورہ کروں گا جب بنو اُبیرق کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اُسیر بن عروہ نامی ایک شخص سے بات کی اور کچھ لوگ جمع ہو کر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور اس کے چچا نے ہمارے قبیلے کے ایک خاندان کو جو مسلمان ہیں

اور نیک لوگ ہیں بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے چوری کی تہمت لگائی ہے، حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ سے بات کی تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک خاندان جس کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور نیک لوگ ہیں تم بغیر کسی دلیل اور گواہوں کے ان کو چوری کی تہمت لگا رہے ہو۔ میں واپس ہوا اور مجھے یہ تمنا ہوئی کہ میرا کچھ مال جاتا رہتا اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں بات نہ کرتا تو اچھا ہوتا میرے چچا رفاعہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم نے کیا کیا؟ میں نے اُن کو وہ بات بتادی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اس پر چچا نے کہا اللّٰه المستعان کہ اللہ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں اس کے بعد تھوڑا سا وقت ہی گذرا تھا کہ قرآن مجید میں آیاتِ بالا نازل ہوئیں۔ ان آیات میں خَائِنِیْنَ سے بنوابیرق مراد ہیں۔ ارشاد ہوا: وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (یعنی آپ خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ بنئے) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ (کہ قتادہ سے جو آپ نے بات کہی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیجئے)۔

جب قرآن مجید کی آیاتِ بالا نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہتھیار حاضر کر دیئے گئے، آپ نے ہتھیار رفاعہ کو واپس فرما دیے اس کے بعد بُشیر مشرکین کے ساتھ جا کر مل گیا اور سلافہ بنت سعد کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ اس پر آیتِ شریفہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (الی قوله) فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا نازل ہوئی۔ جب بُشیر سلافہ کے پاس جا کر مقیم ہو گیا تو حسان بن ثابت نے کچھ شعر کہے۔ جن میں سلافہ کو تہم کیا سلافہ نے بُشیر کی اونٹنی کا کجاوہ اٹھا کر اپنے گھر سے باہر سنگ ریزوں والی زمین پر جا کر پھینک دیا اور کہنے لگی تو میرے بارے میں حسان کے اشعار کا ذریعہ بن گیا مجھے تجھ سے کسی خیر کی اُمید نہیں۔

منکرینِ حدیث کی تردید: اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اوّلاً تو اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر کتاب اُتاری تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اپنی اس سمجھ کے ذریعہ فیصلے فرمائیں جو اللہ نے آپؐ کو عطا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر قرآن نازل فرمایا اور قرآن کے معانی اور مفاہیم بھی آپ کو بتائے ہیں۔ دورِ حاضر میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جو یہ کہتا ہے کہ العیاذ باللہ نبی کی حیثیت ایک ڈاکیہ کی ہے۔ اُس نے قرآن لا کر دے دیا آگے ہم اپنی سمجھ سے سمجھ لیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی جہالت ہے آیتِ بالا سے ان لوگوں کی کھلی تردید ہو رہی ہے، سورۂ نحل میں فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے لئے بیان کریں جو اُن کی طرف اتارا گیا اور تا کہ وہ فکر کریں) معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب کا پہنچانا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کا سمجھانا اور اس کے معانی اور مفاہیم کا بیان کرنا بھی منصبِ نبوت میں شامل تھا۔

خیانت کرنے والوں کی طرفداری کی ممانعت ...... اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا کہ آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنیں۔ اور اللہ سے استغفار کریں۔ چونکہ آپ نے حضرت قتادہؓ جیسے مخلص صحابی کی بات پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے یہ فرما دیا کہ میں مشورہ کروں گا جس سے اصلی چوروں کو اپنی بات کو آگے چلانے کا اور اپنے آپ کو بری کرنے کا کچھ موقع مل گیا اور اس طرح سے غیر شعوری طور پر اُن کی کچھ حمایت سی ہو گئی جس کا ارادہ نہ تھا اور جو صورتِ حال سامنے آئی تھی اس میں جہاں یہ پہلو تھا کہ بغیر گواہ اور دلیل کے کسی پر یقین نہ کیا جائے وہاں یہ پہلو بھی سامنے ہونا مناسب تھا کہ جو خاندان مسلمانوں سے مل جل کر نہیں رہتا تھا اور ان میں ایک فرد بدترین منافق بھی تھا۔ اس وجہ سے تحقیقِ حال میں جلدی کی جاتی اور حضرت قتادہؓ کو تسلی بخش جواب دیا جاتا اس لئے آپ کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنیں اور استغفار کا بھی حکم فرمایا بڑوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں پھر مزید تاکید فرمائی

کہ جو لوگ اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہیں آپ اُن کی طرف سے جوابدہی نہ کیجئے، ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ دوسروں کا مال چرا کر تو خیانت کی ہی ہے اپنے نفسوں کی بھی خیانت کر رہے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مال چرا کر اپنے کھانے پینے کا کام چلا کر بڑی ہوشیاری کا کام کیا اور اپنے خیال میں اس سے زیادہ ہوشیاری یہ کی کہ اپنا کیا ہوا عمل دوسرے کے سر ڈال دیا اس میں خود اپنے نفسوں کی خیانت ہے کیونکہ اس کا وبال آخرت میں خود ان پر پڑے گا۔ اور جب دنیا میں حقیقت ظاہر ہوگئی تو یہاں بھی ذلیل ہوئے۔ ان خیانت کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگوں سے چھپتے ہیں تا کہ ان کے سامنے شرمندہ نہ ہوں اور اللہ سے تو چھپ ہی نہیں سکتے۔ لوگوں سے شرماتے ہیں اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ وہ راتوں کو بیٹھ کر ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے وہ راضی نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ تم دنیا والی زندگی میں ان کی طرف سے جواب دہی کرتے ہو یہاں کی جواب دہی کرنے سے اگر کوئی شخص اپنے کالے کرتوت سے بَری ہو بھی جائے تو قیامت میں جب مواخذہ ہوگا اس وقت کون اللہ کے سامنے پیشی کے وقت ان کی طرف سے جوابدہی کرے گا۔ اور وہاں ان کا کون وکیل ہوگا۔ وہاں نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ وکیل ہوگا۔ اپنا کیا ہر ایک کو خود بھگتنا ہوگا۔ اس میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو مال چرا کر یا خیانت کر کے یا ڈاکہ ڈال کر یا فائلوں میں ردوبدل کر کے یا کسی صاحبِ اقتدار سے مل جل کر اپنا کیس دبا دیتے ہیں اور دوسروں کا مال کھا جاتے ہیں یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا میں ہم نے کاغذات ٹھیک کر کے یا کسی صاحبِ اقتدار کی پناہ لے کر اپنی جان کو دنیا میں بچالیا تو آخرت میں بچ گئے۔ آخرت کا حساب ہر گھڑی سامنے رکھنا لازم ہے وہاں کوئی مددگار اور وکیل نہ ہوگا۔

پھر فرمایا وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (جو شخص کوئی گناہ کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم پائے گا) جو بھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے توبہ استغفار کرے اور اسی توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس کسی کا کوئی مال لیا ہے وہ واپس کرے وہ چرانے والا شخص جو چوری ظاہر ہونے کے بعد مدینہ منورہ سے فرار ہو گیا اور دین اسلام کو بھی چھوڑ دیا اُسے اور اُس طرح کے تمام لوگوں کو تنبیہ ہے کہ گناہ ہو جانے پر اللہ سے دور نہ ہوتے چلے جائیں بلکہ قریب آئیں اور توبہ استغفار میں مشغول ہوں۔

پھر فرمایا وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (اور جو شخص کوئی گناہ کرلے تو اپنی ذات ہی کے لئے گناہ کرتا ہے اپنے کئے کی سزا بھگتے گا اور اللہ علم والا ہے جسے سب کچھ پتہ ہے اور حکمت والا ہے۔ حکمت کے مطابق سزا دے گا)۔

اپنا جرم کسی دوسرے پر ڈالنے کی مذمت اور اس پر وعید...... پھر فرمایا وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (کہ جس شخص نے کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ کیا پھر اس کو کسی دوسرے پر پھینک مارا جو اس سے بری ہے تو اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اوپر لاد دیا) چونکہ اس میں دوہرا گناہ ہے ایک تو وہ گناہ جس کا ارتکاب کیا اور اوپر سے دوسرا گناہ یہ کہ کسی ایسے شخص پر ڈال دیا جو اس سے بری ہے۔ اس کو صریح گناہ بتایا جو ظاہر ہے اور بڑا بہتان اس لئے فرمایا کہ اس نے جانتے بوجھتے ہوئے خود گھڑا ہے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر یا کسی دوسرے سے سن کر نہیں کہا، لہٰذا یہ بہتانِ عظیم ہے اس کی سزا ظاہر ہے خوب زیادہ ہوگی جو لوگ ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں وہ غور و فکر کریں۔

پھر فرمایا: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ کے ساتھ نہ ہوتی جس نے بذریعہ وحی آپ کو حقیقتِ حال سے باخبر فرما دیا تو کچھ لوگ یہ ارادہ کر ہی چکے تھے کہ آپ کو غلطی میں مبتلا کر دیں۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے ذریعہ خود ہی راہِ حق سے ہٹے، یہ لوگ آپ

کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور آپ کو وہ چیزیں بتائیں جنہیں آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

فائدہ ...... یہ جو فرمایا لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض مرتبہ اپنے اجتہاد سے فیصلے فرماتے تھے یہ فیصلے اُسی فہم پر مبنی تھے جو آپ اصولی طور پر قرآن مجید سے سمجھتے تھے۔ ان میں غلطی کا امکان نہ تھا اور اگر کبھی کوئی لغزش ہوگئی جو آپ کے بلند مرتبہ کے شایانِ شان نہ تھی تو اللہ تعالیٰ اس پر متنبہ فرما دیتے تھے۔

آپ کے علاوہ دیگر قضاۃ اور آئمہ جو اپنے اجتہاد سے فیصلہ کریں یا امورِ غیر منصوصہ میں کوئی اجتہاد کریں تو اُن کو بھی لازم ہے کہ قرآن و حدیث کے اصول و فروع کو سامنے رکھ کر اجتہاد کریں خالص اپنی ذاتی رائے اور ذاتی خیال معتبر نہیں۔ پھر ان کے اجتہاد پر غلطیوں کا بھی امکان ہے۔ اسی لئے آپس میں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ باوجود غلطیاں ہو جانے کے ثواب پھر بھی ملتا ہے کیونکہ اجتہاد کا کام یہ حضرات دینی ضرورت سے اللہ کی رضا کے لئے کرتے ہیں، امورِ غیر منصوصہ میں اجتہاد جائز نہیں۔ خوب سمجھ لیں۔

کون سے مشوروں میں خیر ہے؟ ...... پھر فرمایا لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ یعنی جو لوگ آپس میں مشورے کرتے ہیں اُن کے بہت سے مشوروں میں کوئی خیر نہیں کیونکہ یہ مشورے اللہ کی رضا کے خلاف بھی ہوتے ہیں اور ان مشوروں میں احکامِ اسلامیہ کے خلاف بھی باتیں سوچی جاتی ہیں۔ ہاں ان مشوروں میں اگر کوئی ایسی بات ہو کہ ایک دوسرے کو آپس میں صدقہ دینے کے لئے کہا جائے یا کسی نیک کام کے کرنے کا حکم ہو یا لوگوں کے درمیان صلح کرا دینے کی بات ہو تو یہ مشورے خیر کے مشورے ہوں گے۔ اللہ کی رضا کے لئے جو شخص یہ کام کرے گا اُسے اللہ تعالیٰ بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ اس کا تعلق اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَالَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ سے ہے۔ جن لوگوں نے چوری کی تھی۔ وہ رات کو ایسے مشورے کرتے رہے کہ ہم چوری کے الزام سے کیسے بچیں اور اس چوری کو کس کے سر دھریں، سببِ نزول تو ان چوری کرنے والوں کا عمل ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ایک عام طریقے پر مشوروں کا حکم بیان فرما دیا کہ لوگوں کے مشوروں میں عام طور سے خیر نہیں ہوتی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے لئے کوئی مشورہ کرتے ہیں اور خیر کے کام کے لئے فکر کرتے ہیں اور اس فکر کے لئے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں یہ لوگ بڑے اجر کے مستحق ہیں۔ سورۂ مجادلہ میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (کہ اے ایمان والو! جب تم آپس میں خفیہ طریقے پر مشورے کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے مشورے نہ کرو۔ اور بھلائی کے، تقویٰ کے مشورے کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم سب جمع کئے جاؤ گے) مؤمن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سب اللہ کی رضا کے لئے ہونی چاہیئے، ہر عمل میں تقویٰ اور آخرت کی پیشی سامنے رہے۔

صلح کرا دینے کی فضیلت ...... آیت میں فرمایا کہ صدقہ کا حکم اور امر بالمعروف (بھلائی کا حکم دینا) اور لوگوں کے درمیان صلح کرا دینا ان کاموں کا مشورہ ہونا چاہیے اصلاح بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان صلح کرا دینا اُن کی رنجشیں دور کر دینا اور اُن کے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کرنا، روٹھے ہوئے دوستوں کو منا دینا، میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کرا دینا بہت بڑی ثواب کی چیزیں ہیں، حضرت ابودرداءؓ نے بیان فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو نفلی روزوں اور صدقہ دینے اور نفلی نماز پڑھنے کے درجے سے بھی افضل چیز نہ بتا دوں۔ ہم نے عرض کیا ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چیز آپس میں صلح کرا دینا ہے، (پھر فرمایا کہ) آپس کا بگاڑ مونڈ دینے والا ہے۔ (رواہ ابو داؤد والترمذی وقال ھٰذا حدیث صحیح)

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بغض مونڈ دینے والی صفت ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے بلکہ وہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔ (رواہ الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راہ اختیار کرنا داخلۂ دوزخ کا سبب ہے: ۔۔۔۔۔ پھر فرمایا وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی (الآیۃ) کہ جو شخص ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مؤمنین کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ کا اتباع کرے ہم اُسے وہ کرنے دیں گے جو کرتا ہے (یعنی اپنے اختیار سے جس برائی میں لگا ہوا ہے دنیا میں ہم اُسے کرنے دیں گے اس کا اختیار سلب نہیں کریں گے) اور اُسے جہنم میں داخل کریں گے (یہ اُس کو آخرت میں سزا ملے گی) اور دوزخ بری جگہ ہے اس آیت میں دو باتوں میں دوزخ کے داخلہ کی خبر دی گئی اوّل یہ کہ جو شخص ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ وہ تمام لوگ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا علم ہوا اور پھر اسلام قبول نہ کیا اور ہر وہ شخص جس نے اسلام قبول کرلیا اور پھر اسلام قبول کر کے اسلام سے پھر گیا وہ سب لوگ اس آیت کی وعید میں شامل ہیں۔ چوری کرنے والا وہ شخص جس کا واقعہ ان آیات کا سببِ نزول بنا۔ مرتد ہو کر چلا گیا تھا اس لئے اس بات کو یہاں ذکر کیا گیا لیکن مفہوم اس کا عام ہے ہمیشہ جب کبھی بھی کوئی شخص اسلام کو قبول کرے پھر مرتد ہو جائے اس آیت کا مضمون اس پر صادق آئے گا یعنی وہ دوزخ میں جائے گا۔

اجماعِ امت بھی حجت ہے: ۔۔۔۔۔ دوسری بات یہ بتائی کہ جو شخص مؤمنین کے راستہ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کرے گا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسا کہ دین اسلام میں قرآن وحدیث حجت ہیں۔ اسی طرح اجماع امت بھی حجت ہے کیونکہ قرآن مجید کا مطلب اور عقائد و اعمال کی تفصیلات جو حضرات صحابہؓ سے لے کر ہر زمانے کے علماء، صلحاء اور مشائخ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے اُن کو ماننا اور اُن پر عمل کرنا ہی ذریعۂ نجات ہے۔ ان ہی کے ذریعہ قرآن مجید کی تفسیر ہم تک پہنچی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی آپ سے سمجھ کر حضرات صحابہؓ نے تابعینؒ کو بتائی پھر انہوں نے آگے اس کی روایت کی۔ عقائد بھی انہی حضرات کے ذریعہ ہم تک پہنچے اور فرائض و واجبات کا بھی انہی کے ذریعہ پتہ چلا، اب جو کوئی شخص ان حضرات کو بیچ میں سے نکال کر خود اپنے پاس سے قرآن کی تفسیر کرے گا اور آیات کے معانی و مفاہیم اپنے پاس سے تجویز کرے گا اور احکام اسلام کی اپنے طور پر تشریح کرے گا یا حجیت حدیث کا منکر ہوگا یا امت مسلمہ کے مسلّمہ عقائد کا انکار کرے گا۔ وہ کافر ہوگا، دوزخی ہوگا۔ جو لوگ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں یا جو لوگ پانچ نمازوں کے منکر ہیں یا جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے کے منکر ہیں یا جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل ہونے یا ان کی طبعی موت واقع ہونے کے قائل ہیں یہ سب لوگ کافر ہیں اور دوزخی ہیں کیونکہ حضراتِ صحابۂ کرامؓ سے لے کر اب تک پوری امت کے جو عقائد ہیں یہ لوگ ان کے منکر ہیں، اپنے تراشیدہ عقیدہ کے حامل ہیں۔ (اہل السنّت کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے نہ طبعی موت سے دنیا سے تشریف لے گئے وہ قیامت سے قبل دنیا میں تشریف لا کر امن وامان اور عدل وانصاف قائم کریں گے)

روح المعانی ص ۱۴۶ ج ۵ میں ہے کہ حضرات امام شافعیؒ سے ایک شخص نے کہا کہ اجماع کے حجت ہونے کی کیا دلیل ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے تین دن تک روزانہ رات اور دن میں تین تین بار پورا قرآن مجید پڑھا اُن کو یہ آیت مل گئی جس سے انہوں نے اجماع امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا۔ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بلاشبہ اللہ نے مجھ سے میری امت کے بارے میں تین وعدے فرمائے اور اُن کو تین چیزوں سے امان دی۔

اوّل یہ کہ کبھی پوری امت قحط کے ذریعے ہلاک نہ ہوگی۔

دوم یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان کو بالکل ہی ایک ایک فرد کر کے ختم نہ کر سکے گا۔

سوم یہ کہ ان کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا (رواہ الدارمی کما فی المشکوٰۃ ص ۵۱۳)

حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تین چیزوں سے امان دی۔

اوّل یہ کہ تمہارا نبی تم پر بددعا نہ کرے گا جس سے تم سب ہلاک ہو جاؤ۔

دوم یہ کہ اہل باطل اہل حق پر غلبہ نہ پائیں گے (جس سے حق مٹ جائے اور نور حق ختم ہو جائے)

سوم یہ کہ تم لوگ گمراہی پر جمع نہ ہو گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۳ ج ۲)

گمراہوں کی ایک جاہلانہ بات کی تردید...... گمراہی کی دعوت دینے والے بعض لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم گمراہ ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں گمراہی کی دعوت کیوں دینے دیتا ہے؟ گمراہی کی باتوں کی دعوت دینے پر اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاک کیوں نہیں فرما دیتا؟ آیت بالا میں اس کا بھی جواب دے دیا گیا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی فرما کر یہ بتایا کہ جو شخص گمراہی کے راستہ پر چلتا ہے ہم اُسے اس راہ پر چلنے دیتے ہیں کیونکہ یہ دنیا ابتلاء اور امتحان کی جگہ ہے۔ دنیا میں ایمان بھی ہے اور کفر بھی ہے اگر کسی پر جبر کیا جائے تو اختیار باقی نہ رہنے کی وجہ سے دنیا دارالامتحان نہ رہے گی، جو شخص گمراہی کو اختیار کرتا ہے اور تنبیہ کرنے والوں کی تنبیہ پر بھی واپس نہیں آتا۔ اللہ جل شانہٗ اس کے دل میں مزید زیغ اور گمراہی ڈال دیتے ہیں جیسا کہ سورۂ صف میں ارشاد فرمایا: **فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** (پھر جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو اور زیادہ ٹیڑھا کر دیا)۔

دنیا میں جو شخص اپنے لئے ہدایت کو اختیار کرے گا۔ اس کی اسی پر مدد کی جائے گی اور اس کے مطابق اسی کے لئے اللہ کی طرف سے آسانی فراہم ہوتی رہے گی۔ اور جو شخص اپنے لئے گمراہی کو اختیار کرے گا۔ اس کے لئے گمراہی کے راستے کھلتے رہیں گے۔ اور آخرت میں ہر شخص اپنے عقائد و اعمال کے اعتبار سے جنت یا دوزخ میں چلا جائے گا۔ آیتِ بالا سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ مومنین کے راستہ کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار کرنا دوزخ میں لے جانے والا ہے۔

مشرکین کی بخشش نہیں وہ دُور کی گمراہی میں ہیں...... آخر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (الآیۃ) یہ آیت شریفہ چند رکوع پہلے سورۃ نساء ہی میں گذر چکی ہے البتہ آخر کے الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ آیت کی تفسیر اور تشریح ہم وہاں لکھ چکے ہیں۔ یہاں اس مناسبت سے سابقہ مضمون کا اعادہ فرمایا ہے کہ چوری کرنے والا منافق ظاہراً بھی کافر ہو گیا تھا اور مشرکوں میں جا کر مل گیا تھا۔

فائدہ...... صاحب روح المعانی ص ۱۴۸ ج ۵ فرماتے ہیں کہ چند رکوع پہلے اس آیت کے ختم پر **فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا** فرمایا اور یہاں **فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا** فرمایا۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ وہاں یہودیوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی انہوں نے جو کچھ اپنی کتاب میں پڑھا تھا اس کی وجہ سے اس بات میں انہیں بالکل شک نہیں تھا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اُن کی شریعت کا اتباع فرض ہے اور وہ جو کچھ ایمان کی دعوت دیتے ہیں آپ کا ماننا لازم ہے ان سب کے باوجود انہوں نے شرک کی راہ اختیار کی اور کفر پر جمے رہے لہٰذا اُن کا یہ عمل افتراء ہو گیا اور اپنی طرف سے جھوٹ بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے رہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے اور ہم جس دین پر ہیں وہی اللہ تعالیٰ کا محبوب دین ہے، اور یہاں خالص مشرکین سے بات ہو رہی ہے جو اس سے پہلے نہ کتاب کو جانتے تھے نہ وحی سے واقف تھے۔ اُن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہدایت اور

دینِ حق لے کر کوئی شخص نہیں آیا تھا، لیکن حجت کے ساتھ حق واضح ہونے کے بعد اپنی سابقہ گمراہی پر ہی برقرار رہے اور شرک ہی کو اختیار کئے رہے۔ اس لئے اُن کے حق میں فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا فرمایا اور یہ بتایا کہ یہ لوگ گمراہ تو تھے ہی اور زیادہ گمراہ ہوتے چلے گئے اور دور کی گمراہی میں جا پڑے۔

ملت ابراہیمیہ میں جو توحید کا حکم تھا اس کو پس پشت ڈال کر مشرک ہو گئے تھے اور سمجھانے پر بھی شرک سے باز نہ آئے، گمراہی میں ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔

وقف لازم

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ

یہ لوگ اللہ کے سوا صرف عورتوں کو پکارتے ہیں اور نہیں پکارتے مگر شیطان کو، جو سرکش ہے۔ جس پر اللہ نے لعنت کی، اور شیطان نے کہا

لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ

کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ لے لوں گا۔ اور میں اُن کو گمراہ کروں گا اور امیدیں دلاؤں گا اور ان کو تعلیم دوں گا سو وہ جانوروں کے

اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ

کانوں کو کاٹیں گے اور میں اُن کو تعلیم دوں گا سو وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلا کریں گے، اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان

دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا

کو دوست بنا لے سو وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ شیطان اُن سے وعدے کرتا ہے اور اُن کو آرزوئیں دلاتا ہے، اور شیطان اُن سے صرف فریب والے

غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

وعدے کرتا ہے، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے۔

مشرکین مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان کے فرمانبردار ہیں

اوپر شرک کا ذکر تھا ان آیات میں شرک کی بعض صورتوں کا تذکرہ فرمایا ہے شرک اور کفر اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ہر کام یہ سب شیطان کے سمجھانے سے اور اس کے راہ بتانے سے وجود میں آتا ہے شیطان نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جو مجھے گمراہ قرار دیا ہے تو میں بنی آدم سے اس کا بدلہ لے لوں گا۔ بنی آدم کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی طرف لگا لوں گا تھوڑے بہت ہی لوگ بچیں گے۔ اکثر لوگوں کو اپنی اطاعت پر ڈال دوں گا جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے اور اُن کی ذریت پھیلنی شروع ہوئی اور شیطان مردود بھی دنیا میں آ گیا جو اپنی سرکشی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہو چکا تھا تو اُس نے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر ڈالنا شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور توحید چھڑا کر کفر اور شرک پر لگا دیا۔ بتوں کی پوجا کرنے کی تعلیم دی اور بتوں کے نام بتائے اور ان کے زنانے نام رکھوائے۔

اہلِ عرب نے جو بت تراش رکھے تھے اُن میں لات اور منات اور عُزّٰی کے نام معروف و مشہور ہیں یہ سب نام نسوانی ہیں یعنی ان کے لفظوں میں تانیث ہے۔ ہندوستان کے مشرکین میں جیسے کالی دیوی اور دُرگی وغیرہ مشہور ہیں ایسے ہی عربوں میں بتوں کے زنانے نام

تھے۔ یہ سب شیاطین کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے بت ہیں۔ ان بتوں کو سجدہ بھی کرتے ہیں ان کی نذریں بھی مانتے ہیں اور ان کے نام پر جانور بھی چھوڑتے ہیں اور نشانی کے لئے ان کے کان چیر دیتے ہیں یا کانوں میں سوراخ کر دیتے ہیں تا کہ یہ نشانی رہے کہ یہ بت کے نام پر چھوٹا ہوا ہے، جو کچھ شیطان نے کہا تھا اس نے بنی آدم سے وہ سب کچھ کروالیا۔ اکثر بنی آدم نے دشمن کی بات مان لی اور خالق و مالک جل مجدہ کی ہدایت پر عمل نہ کیا۔ شرک اختیار کر لیا اور توحید سے منہ موڑ لیا۔ کانوں کا چیرنا اور سوراخ کرنا بہت سے نام نہاد مسلمانوں میں بھی ہے بچوں کے کانوں کو چھید دیتے ہیں۔ اُن میں کوئی بُندہ وغیرہ ڈال دیتے ہیں اور اس کا نام بُندو رکھ دیتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بچہ زندہ رہے گا۔ جو قومیں ظاہری طور پر اسلام میں داخل ہوئیں اور اسلام کو پڑھا اور سمجھا نہیں ان لوگوں میں دینِ سابق کے شرک کے اثرات باقی رہ گئے۔ قبروں کی پرستش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بتوں کو چھوڑ کر قبروں پر شرک کرنے لگے۔ یہی قبر پرست اگر ان سے بت کو سجدہ کرنے کے لئے کہا جائے تو کبھی نہیں کریں گے اور قبروں کو سجدہ کرنے میں کچھ حرج نہیں سمجھتے حالانکہ غیر اللہ ہونے میں دونوں برابر ہیں۔

تغییر خلق اللہ...... ابلیس نے یہ بھی کہا وَلَاٰ مُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ کہ میں بنی آدم کو سکھاؤں گا کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو بدل ڈالیں، شیطان اس کی بھی تعلیم دیتا ہے اور لوگ اس کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں جو بنی آدم میں رواج پائے ہوئے ہیں۔ مشہور ترین تو یہی ہے کہ داڑھیاں مونڈی جاتی ہیں آج کی دنیا میں شاید ہی کوئی گھر ایسا خالی ہو جس میں داڑھی نہ مونڈی جاتی ہو اس کے علاوہ گودنا بھی رواج پذیر ہے سوئی سے گود کر رنگ دیتے ہیں۔ اس سے جسم پر کئی طرح کی تصویریں بنا لیتے ہیں۔ ہندوؤں میں تو گودنے کا بہت زیادہ رواج ہے مگر مسلمان بھی گودنے کا کام کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے والیوں پر اور گدوانے والیوں پر اور ان عورتوں پر جو (ابرو یعنی بھوؤں کے بال) چننے والی ہیں (تا کہ بھویں باریک ہو جائیں) اور خدا کی لعنت ہو اُن عورتوں پر جو حسن کے لئے دانتوں کے درمیان کشادگی کراتی ہیں جو اللہ کی خلقت کو بدلنے والی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ بات سن کر ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس طرح کی عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں؟ فرمایا کہ میں اُن لوگوں پر کیوں لعنت نہ بھیجوں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی، اور جن پر اللہ کی کتاب میں لعنت آئی ہے، وہ عورت کہنے لگی کہ میں نے سارا قرآن پڑھ لیا۔ مجھے تو یہ بات کہیں نہ ملی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے قرآن پڑھا ہوتا تو تجھے ضرور یہ بات مل جاتی کیا تو نے یہ نہیں پڑھا: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (اور رسول تم کو جو (ہدایت) دے اسے قبول کر لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ)۔

یہ سن کر وہ عورت کہنے لگی کہ ہاں یہ تو قرآن میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں نے جن کاموں کے کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے بھی ان کاموں کی ممانعت ثابت ہوئی کیونکہ قرآن نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کا حکم دیں ان پر عمل کرو اور جن چیزوں سے روکیں اُن سے رک جاؤ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۸۱) کسی انسان کو خصّی کرنا یا خود خصّی ہونا یہ بھی تغییر خلق اللہ میں شامل ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیس منا من خصی ولا اختصی وہ ہم میں سے نہیں ہے جو کسی کو خصّی کرے یا خود خصی ہو۔ (رواہ فی شرح السنۃ کمافی المشکوٰۃ ص ۶۹) ختنہ کرنا اور ناخن کاٹنا اور جن بالوں کو صاف کرنے کا شرعاً حکم دیا گیا جیسے بغلوں کے بال وہ حکم شرعی ہونے کی وجہ سے اُس

تغیر میں داخل نہیں جس کا شیطان نے حکم دیا بلکہ بعض قوموں کو تو اس نے ان جگہوں کے بالوں کو بڑھانے کا بھی حکم دے رکھا ہے۔ جیسے کہ سکھ کرتے ہیں، ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اللہ کے حکم پر چلے۔

شیطان مردود سے دوستی کرنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ صریح نقصان میں چلا گیا اور یہ نقصان آخرت کا عذاب ہے جو شیطان کی دوستی کے نتیجے میں ہمیشہ بھگتنا پڑے گا۔

شیطان جھوٹے وعدے کرتا ہے اور آرزوؤں پر ڈالتا ہے...... پھر فرمایا یَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ کہ (شیطان لوگوں سے وعدے کیا کرتا ہے اور آرزوئیں دلاتا ہے) اللہ کی رضامندی کے جو کام ہیں اُن کے خلاف اُبھارتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس تکلیف میں پڑ جاؤ گے اور ایسی ایسی لذت سے محروم ہو جاؤ گے۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (شیطان تم سے تنگدستی کے وعدے کرتا ہے یعنی یہ ظاہر کرتا ہے کہ نیک کاموں میں خرچ کرو گے تو تنگدست ہو جاؤ گے اور تمہیں برائیوں کا حکم دیتا ہے) آرزوئیں دلانے کا مطلب یہ ہے کہ جوانوں کو کہتا ہے کہ دل کھول کر گناہ کر لو بڑی زندگی پڑی ہے توبہ کر لینا، کوئی بوڑھا شخص توبہ کرنا چاہے تو اس سے کہتا ہے ابھی تو تمہاری عمر اچھی خاصی ہے ابھی تھوڑا ہی مر رہے ہو اسی طرح سے کوئی حلال کمائی میں لگے تو اس سے کہتا ہے کہ میاں اتنے ذرا سے پیسوں میں کیا ہو گا دنیا کما کھا رہی ہے تم ہی کو تقویٰ سوار ہے، ایسی باتیں سجھا کر حرام آمدنی اور حرام کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اس میں بڑے بڑے فائدے بتاتا ہے اور اس طرح سے شیطان کے بہت سے وعدے ہوتے رہتے ہیں اور وہ آرزوئیں دلاتا رہتا ہے یہ سب کچھ محض دھوکہ اور فریب ہوتا ہے اس کی باتوں میں آ کر خدا پاک کا نافرمان بن جانا اپنے کو عذاب دوزخ میں دھکیلنا ہے جب دوزخ میں داخل ہونے لگیں گے تو کوئی راہ بچنے کی اور فرار کی نہ پائیں گے۔ اسی کو یوں فرمایا: وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا.

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے عنقریب ہم اُن کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اُن میں ہمیشہ ہمیشہ

فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ

رہیں گے اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ فرمایا ہے، اور کون ہے جس کا کہنا اللہ سے زیادہ سچا ہو۔ نہ تمہاری آرزوؤں پر

وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی اُمیدوں پر، جو شخص بُرا عمل کرے گا اُس کا بدلہ دیا جائے گا اور نہ پائے گا اللہ کے سوا

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

کوئی دوست اور مددگار۔ اور جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ مؤمن ہو تو یہ لوگ داخل ہوں گے

يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ

جنت میں، اور اُن پر اتنا ظلم بھی نہ ہو گا جتنا گڑھا کھجور کی گٹھلی میں ہے۔ اور اس سے بڑھ کر دین کے اعتبار سے کون اچھا ہو گا جس نے اپنی ذات کو اللہ کیلئے جھکا دیا، اور وہ اچھے

لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

کام کرنے والا ہے، اور اس نے ابراہیمؑ کی ملت کا اتباع کیا جو سارے دینوں کو چھوڑ کر اللہ ہی کی طرف مائل ہونے والے تھے، اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

ع ۱۸ / ۱۱ / ۱۵

اور اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔

اہلِ ایمان کے لئے بشارت اور آرزوؤں پر بھروسہ کرنے کی ممانعت

ان آیات میں اوّل تو اُن حضرات کے لئے جو اہلِ ایمان ہوں اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہتے ہوں ایسے باغوں میں داخلے کی خوشخبری دی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور فرمایا کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو بالکل سچا پکا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا کون ہوسکتا ہے۔ جب اللہ نے وعدہ فرمالیا تو اب ایمان اور اعمالِ صالحہ کو اپنانا اور اس کے مطابق زندگی گذارنا بندوں کا سب سے بڑا اہم فریضہ ہوا۔

اس کے بعد فرمایا لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ لباب النقول ص ۸۳ میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی داخل نہ ہوگا اور قریش نے کہا کہ ہم موت کے بعد اٹھائے ہی نہ جائیں گے (تاکہ کوئی عذاب کی صورت سامنے آئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ پھر حضرت مسروق تابعی سے نقل کیا کہ نصاریٰ اور مسلمان جمع ہوئے اور آپس میں فخر کرنے لگے ہر فریق نے یہ کہا ہم تم سے افضل ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی بات زیادہ اقرب وانسب معلوم ہوتی ہے۔ جس میں قریش کو خطاب ہے کہ تم خود ہی سارے فیصلے کررہے ہو، تمہارا عجیب حال ہے، شرک بھی کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے کاموں میں لگے رہو اور جب موت کے بعد کے مواخذہ کا ذکر آئے تو یوں کہہ کر مطمئن ہوجاؤ کہ ہمیں تو موت کے بعد اٹھنا ہی نہیں ہے، نہ جزا نہ سزا، نہ ثواب نہ عقاب، یہ جو تمہارا خیال ہے محض ایک جھوٹی آرزو ہے۔ فیصلے کا حق خالق اور مالک جل مجدہٗ کو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور زندگی دی اور زندگی کے بعد موت دے گا اس نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ بتایا کہ موت کے بعد جی اٹھنا ہے اور کفر اور شرک پر دوزخ کا داخلہ ہوگا جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہوگا۔ خالق و مالک جل مجدہ نے کافر و مشرک کے لئے جو کچھ طے کیا ہے اور جو خبر دی ہے اُسی کے مطابق ہوگا، اپنے خیال سے یہ طے کرکے مطمئن ہوجانا کہ موت کے بعد کچھ نہیں اور ہم جو کچھ کرتے ہیں اس پر کوئی مواخذہ نہیں یہ سب جھوٹی آرزوئیں ہیں۔ آرزوؤں پر مدار نہیں ہے۔ مدار اُس فیصلے پر ہے جو خالق مالک نے اپنے بندوں کے لئے طے فرمادیا اور پھر بتا بھی دیا۔ اسی طرح سے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کا یہ کہنا کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا یہ ایک اپنا خود ساختہ خیال ہے۔ محض ایک آرزو ہے جو خود سے تجویز کرلی ہے۔ آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ نجات کا مدار ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنا آخری نبی بھیج دیا (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کی نبوت کے بارے میں یہود و نصاریٰ پہلے سے جانتے تھے۔ اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ علامات سے پہچان لیا کہ واقعی یہ اللہ کے وہی نبی ہیں جن کا ہمیں انتظار تھا۔ معجزات سے پرکھ لیا۔ اس کے باوجود اللہ کے آخری نبی پر ایمان نہیں لاتے۔ کفر پر جمے ہوئے ہیں اور آرزو یہ لئے بیٹھے ہیں کہ جنت میں بس ہم ہی ہم ہوں گے اور کسی کا

داخلہ نہ ہوگا۔ آرزوؤں سے کام چلنے والا نہیں ہے حقائق کو سامنے رکھو۔ دلائل کو دیکھو، جھوٹی آرزوئیں برباد کر دیں گی۔

حضرت مسروق نے جو آیت کا سببِ نزول بتایا کہ نصاریٰ نے اور مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا تھا اور ہر ایک نے اپنے کو افضل بتایا تھا اس پر آیتِ شریفہ نازل ہوئی اس کے اعتبار سے لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ میں مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم بھی آرزوئیں لئے بیٹھے ہو آرزوؤں سے کام نہیں چلتا۔ ایمان تو تم نے قبول کر لیا۔ اب اس پر استقامت بھی ضروری ہے اور ایمان پر مرنا بھی لازم ہے عملِ صالح کی وجہ سے بلند درجات بھی نصیب ہوں گے اس معنی کی تشریح کرتے ہوئے صاحبِ روح المعانی ص ۱۵۲ ج ۵ حضرت حسن کا قول نقل کرتے ہیں لیس الایمان بالتمنی ولکن ما وقر فی القلب وصدقه العمل اِنَّ قوما اَلهتهم امانی المغفرة حتی خرجوا من الدنیا ولا حسنة لهم وقالوا نحسن الظن بالله تعالیٰ وکذبوا لو احسنوا الظن لاحسنوا العمل یعنی ایمان صرف آرزو کا نام نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو دل میں جم جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے، بہت سے لوگوں کو مغفرت کی اُمیدوں نے غفلت میں ڈال دیا یہاں تک کہ دنیا سے اس حال میں چلے گئے کہ اُن کے پاس ایک نیکی بھی نہ تھی انہوں نے کہا کہ ہم اللہ سے اچھا گمان رکھتے ہیں اور وہ اپنے اس خیال میں جھوٹے تھے۔ اگر اللہ سے اچھا گمان رکھتے تو عمل بھی اچھے کرتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اپنی آرزوؤں پر بھروسہ کر کے ہلاک ہوئے تم آرزوؤں پر بھروسہ نہ کرو۔ ایمان پر استقامت رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ انجام دیتے رہو۔

بُرے اعمال کا بدلہ ملے گا...... پھر فرمایا مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (یعنی جو شخص کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا) ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قانونی اعتبار سے ہر بُرائی پر مواخذہ ہے اس کی جزا مل جائے گی یہ قانون ہے ضروری نہیں کہ واقعی طور پر ہر گناہ پر سزا مل ہی جائے کیونکہ توبہ واستغفار سے بھی گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ سے بھی برائیوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور دنیا میں جو کچھ سزا ملتی ہے وہ چھوٹی موٹی تکلیف اور مصیبتوں کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سنائی انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ہم میں سے ایسا کون ہے جس نے گناہ نہیں کئے اور ہمیں ہر گناہ کی سزا بھی ملنی ہے (تو ہمارا کیا بنے گا) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ تم اور تمہارے ساتھی اہلِ ایمان کا گناہوں پر گرفت کر کے دنیا ہی میں معاملہ صاف کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب اللہ سے ملو گے تو تم پر گناہ نہ ہوں گے اور دوسرے لوگ (جو اہلِ ایمان نہیں ہیں) اُن کے گناہ جمع کئے جاتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن ان کی سزا پائیں گے۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں کو سخت پریشانی ہوئی لہٰذا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی پریشانی پیش کی آپؐ نے فرمایا ٹھیک ٹھیک چلتے رہو اور کام کرتے رہو کیونکہ مسلمان کو جو بھی کچھ تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے لئے کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ جو کانٹا لگ جاتا ہے یا جو کوئی چوٹ لگ جاتی ہے ان سب کے ذریعے (گناہوں کا) کفارہ ہو جاتا ہے۔ (رواہ مسلم ص ۱۹ ج ۲)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جو بھی کوئی تھکن، دُکھن، فکر، رنج، تکلیف، غم پہنچ جائے یہاں تک کہ کانٹا بھی لگ جائے تو اللہ تعالیٰ اُس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ فرما دیتے ہیں۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کو جو ذرا بہت کوئی بھی

تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ گناہ ہی کی وجہ سے پہنچتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ معاف فرما دیتے ہیں وہ تو اس سے بہت زیادہ ہوتا ہے جتنے پر مواخذہ ہوتا ہے پھر آپؐ نے سورۂ شوریٰ کی یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ. (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو برابر اس کی جان میں، اس کے مال میں اور اولاد میں تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ (اور اس سے گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے) یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اس پر کوئی گناہ بھی نہ ہوگا۔ (رواہ الترمذی) اللہ پاک کا کتنا بڑا انعام ہے کہ مؤمن بندوں کو دنیا میں تکلیفیں دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ فرما دیتے ہیں اور آخرت کے عذاب سے بچا دیتے ہیں۔

مؤمنین مؤمنات کے لئے بھرپور ثواب...... پھر فرمایا وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی (الآیۃ) اس آیت کے بارے میں لباب النقول میں حضرت مسروق تابعی سے نقل کیا ہے کہ جب آیتِ کریمہ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ نازل ہوئی تو اہل کتاب نے مسلمانوں سے کہا کہ پھر ہم اور تم برابر ہوگئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں یہ بتا دیا کہ جو بھی کوئی شخص مرد ہو یا عورت نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اس میں لفظ مؤمن بڑھا کر یہ بتا دیا کہ اہل کتاب جب تک مؤمن نہ ہوں گے انہیں کسی عمل کا کوئی ثواب نہ ملے گا اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ لہٰذا مؤمن کافر میں برابری کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اہلِ ایمان سے جو یہ فرمایا کہ آرزوؤں پر مدار نہ رکھو۔ اس میں ایمان پر استقامت اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہنے کی تاکید فرمائی یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کا ایمان کام نہ دے گا۔ اہلِ کتاب کافر ہیں اگر کفر پر مر گئے تو اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور اہلِ ایمان کا ٹھکانہ جنت ہے۔ پھر برابری کہاں ہوئی؟

جو بندہ ایمان کے ساتھ کوئی بھی نیک عمل لے کر قیامت کے دن حاضر ہوگا اُسے اپنے عمل کا پورا پورا ثواب ملے گا جو بہت زیادہ ہوگا۔ اسی کو فرمایا وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا کھجور کی گٹھلی کے اندر جو ذرا سا گڑھا ہوتا ہے اُسے نقیر کہتے ہیں۔ اہلِ عرب جب کسی چیز کی کمی ظاہر کرتے تھے تو اُسے نقیر سے تشبیہ دیتے تھے۔ وقد ذکرناہ من قبل.

محسنین کی تعریف...... پھر فرمایا وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰهِ وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ط وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا اس میں لفظ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰهِ وارد ہوا ہے اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں ای اخلص نفسه لهٗ تعالیٰ لا یعرف لها ربّا سواہ وقیل اخلص توجهه له سبحانه وقیل بذل وجهه لهٗ عَزَّوجل فی السجود. مطلب یہ ہے کہ اسلم وجهه للّٰه کا مصداق وہ شخص ہے جس نے اپنی جان کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور متعین کر دیا وہ اپنے لئے اللہ کے سوا کسی کو رب نہیں پہچانتا، اور بعض حضرات نے اس کا معنی یہ بتایا ہے کہ اس نے اپنی توجہ خالص اللہ کے لئے کر دی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب ہیکہ اپنے چہرے کو اللہ جل شانہٗ کے لئے سجدہ میں ڈال دیا پھر وَھُوَ مُحْسِنٌ فرمایا جس کا معنی یہ ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ کو اس طریقے پر ادا کرتا رہا جو اُن کے ادا کرنے کا حق ہے۔ یہ لفظ احسان سے مشتق ہے۔ اسمِ فاعل کا صیغہ ہے احسان کا معنی ہے کسی چیز کو خوب اچھی طرح سے ادا کر دینا جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ احسان کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا الاحسان ان تعبداللّٰه کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک (کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے جیسا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے سو اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) اس میں عبادت کا احسان بیان فرمایا ہے اب پوری

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے اعتبار سے اس سے اچھا کون ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ ہی کے لئے خالص کر دیا۔ اس کی توجہ ظاہر سے اور باطن سے جسم سے اور جان سے صرف اللہ ہی کی طرف ہے۔ اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرتا ہے وہ ابراہیم جو حنیف تھے جنہوں نے تمام ادیان کی طرف سے پرہیز کیا اور اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہی دینِ ابراہیمی ہے۔ جس کے اتباع کا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ ؐ کی اُمت کو حکم ہوا۔

جو کوئی ان مذکورہ بالا صفات سے متصف ہو وہی دینی اعتبار سے سب سے اچھا ہے کیونکہ دوسرے سب دین جو اس کے سوا ہیں وہ سب کفر ہیں جن پر اللہ کے قانون میں عذاب دائمی مقرر ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ نے ابراہیم کو دوست بنا لیا۔ اللہ نے جسے دوست بنایا اُس کے دین پر چلنے والا ظاہر ہے کہ اللہ کا محبوب ہوگا اور آخرت میں نجات اور ثواب دائمی کا مستحق ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ علاقے کے لوگ بت پرست تھے خود اُن کا باپ بھی بت پوجتا تھا۔ اُن لوگوں کو توحید کی دعوت دی بڑے بڑے مقابلے ہوئے ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا اللہ نے آگ ٹھنڈی کر دی پھر اپنے بیٹے اسماعیل اور اُن کی والدہ کو مکہ معظّمہ کی چٹیل سرزمین میں جہاں آب و گیاہ کچھ بھی نہ تھا چھوڑ کر چلے گئے جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہوئے تو دونوں نے مل کر کعبہ شریف بنایا۔ اور اس وقت امت محمدیہ کے وجود میں آنے کی دُعا کی جس کا ذکر سورۂ بقرہ کے رکوع نمبر ۱۵ میں گذر چکا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت قربانیاں دیں جو بھی کوئی شخص اللہ کے لئے قربانیاں دے گا اللہ کا محبوب ہوگا۔ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خالص ہو جائے اور ظاہر و باطن سے اللہ کے لئے جھک جائے اور صفت احسان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے اور قربانی کے موقع پر قربانی بھی دے۔ یہ صفات صرف مؤمنین ہی کو حاصل ہیں اہلِ کفر اُن کے برابر کہاں ہو سکتے ہیں اگرچہ اہلِ کتاب ہی ہوں۔

آخر میں فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور سب اس کی مخلوق ہیں اور مملوک ہیں۔ اُسے اختیار ہے کہ تکوینی طور پر اُن کو جس حال میں رکھے اور تشریعی طور پر جو حکم دے۔ جس کام کا چاہے حکم دے اور جس سے چاہے منع کرے۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِيْطًا اور ہر چیز اللہ کے علم اور قدرت کے احاطہ میں ہے اُسے تمام اعمال کا اور عمل کرنے والوں کا علم ہے اور حکمت کے مطابق ہر ایک کو جزا و سزا دینے پر اُسے قدرت ہے۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِی الْكِتٰبِ
اور وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تمہیں اُنکے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور وہ جو کتاب میں تم پر تلاوت کیا جاتا ہے
فِیْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ
اُن یتیم عورتوں کے بارے میں جن کو تم وہ حق نہیں دیتے ہو جو اُن کیلئے مقرر کیا گیا اور تم رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کرو
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ
اور ضعیف بچوں کے بارے میں بھی تم پر آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور یہ کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف کے ساتھ قائم رہو۔ اور جو کوئی خیر کا کام کرو گے

اللّٰہَ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا ﴿۱۲۷﴾

سو اللہ تعالیٰ اُس کا جاننے والا ہے۔

یتیم بچوں اور بچیوں کے حقوق کی نگہداشت کا حکم

صحیح بخاری ص ۶۶۱ ج ۲ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے بیان فرمایا کہ کسی شخص کے پاس کوئی یتیم بچی ہوتی تھی وہ اس کا ولی بھی ہوتا تھا (اور شریکِ میراث بھی کیونکہ اس یتیم بچی کو اور اس کے ولی کو کسی وفات پانے والے سے میراث ملی) اب یہ ولی نہ تو اُسے اپنے نکاح میں لیتا تھا اور نہ کسی دوسرے مرد سے اُس کا نکاح کرتا تھا کیونکہ یہ ڈر تھا کہ دوسرے سے نکاح کر دوں گا تو وہ بحق زوجیت اس کا مال لے جائے گا۔ لہٰذا یتیم بچی کو تنگ کرتا تھا اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔ صاحبِ فتح الباری ص ۲۶۵ ج ۸ نے ابن ابی حاتم سے روایت نقل کی ہے کہ جابرؓ کی ایک چچازاد بہن تھی اس کا مال تھا جو اُسے اپنے باپ کی میراث میں ملا تھا جابر کو اس سے اپنا نکاح کرنا منظور نہ تھا لیکن کسی دوسرے سے بھی اس ڈر سے کہ اس کا شوہر مال لے جائے گا نکاح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا گیا اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ وہ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ اِن کو فتویٰ دیتا ہے اور اس سے پہلے جو قرآن میں آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی ان کو فتویٰ دے رہی ہیں جو اُن پر تلاوت کی جاتی ہیں۔ یہ فتویٰ یتیم عورتوں کے بارے میں ہے، جس کو تم ان کا مقررہ حق نہیں دیتے (یعنی میراث میں جو مال انہیں ملا ہے وہ دینا نہیں چاہتے) اور تم ان سے نکاح کرنے سے بے رغبت ہو۔ اس طرح سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسی کوئی صورت اختیار نہ کرو جس سے اُن کو تکلیف ہو۔ اسی طرح ضعیف بچوں کے بارے میں بھی تمہارے اوپر آیات تلاوت کی جارہی ہیں اُن میں اُن کے حقوق کی نگہداشت کی تعلیم دی گئی ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم لڑکیوں اور ضعیف بچوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تمہارے لئے احکام موجود ہیں اُن پر عمل کرو جن کو تم آپس میں پڑھتے اور سنتے رہتے ہو۔ اس آیت میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سورۂ نساء کے شروع میں گذر چکی ہیں، وھو قولہ تعالیٰ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی اور وَاٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَهُمۡ۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ بھی فتویٰ دیتا ہے کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف کے ساتھ قائم رہو صاحب روح المعانی ص ۱۶۱ ج ۵ لکھتے ہیں **وھو خطاب للائمۃ ان ینظروا لھم ویستوفوا حقوقھم او للاولیاء والاوصیاء بالنصفۃ فی حقھم** یعنی یہ حکام کو حکم ہے کہ یتیموں کی دیکھ بھال کریں اور ان کا جو کسی پر حق ہو پورا پورا وصول کریں یا اولیاء اور اوصیاء کو حکم ہے کہ یتیم بچوں کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں، اوصیاء وصی کی جمع ہے، وصی اُسے کہتے ہیں جسے خود مرنے والا یا حاکم بچوں کے اموال کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کرتا ہے آخر میں فرمایا وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا کہ جو کچھ تم خیر کا کام کرو گے اللہ کو اس کا علم ہے اپنے عملِ خیر کا ثواب پاؤ گے، یتیم بچی کے ساتھ جو انصاف اور حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے اللہ تعالیٰ اس کا ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

وَاِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا

اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی طرف سے بدمزاجی کا یا بے رخی کا اندیشہ کرے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی

بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۚ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ

خاص طریقہ پر صلح کرلیں۔ اور صلح اچھی چیز ہے، اور انسانوں کے نفسوں میں کنجوسی حاضر کر دی گئی ہے اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور پرہیزگاری اختیار کرو

اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہو کہ عورتوں کے درمیان عدل قائم رکھو اگرچہ تم حرص کرو،

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ

لہٰذا تم بالکل ہی نہ ڈھل جاؤ، جس کی وجہ سے ایک عورت کو ادھر میں لٹکی ہوئی چھوڑ دو، اور اگر تم اصلاح کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ

غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۲۹﴾ وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿۱۳۰﴾

غفور ہے رحیم ہے۔ اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی عطا کی ہوئی وسعت کے ذریعہ بے نیاز کر دے گا۔ اور اللہ کشائش والا اور حکمت والا ہے

میاں بیوی کا آپس میں صلح کر لینا، اور بیویوں میں انصاف کرنا

سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ ام المؤمنین حضرت سودہؓ کو یہ ڈر رہا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے جدائی اختیار نہ فرمالیں یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بوڑھی ہوگئی تھیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! میں اپنی باری کا دن عائشہ کو دیتی ہوں اس پر آیت اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ نازل ہوئی اور لباب النقول ص ۸۴ میں بحوالہ سعید بن منصور، حضرت سعید بن مسیّب تابعی سے نقل کیا ہے کہ محمد بن مسلمہ کی بیٹی رافع بن خدیج کے نکاح میں تھی۔ شوہر کو بیوی کی کسی بات سے ناگواری ہوئی یا بڑھاپے وغیرہ سے بے رغبتی ہوئی لہٰذا اس نے طلاق کا ارادہ کر لیا۔ اس پر عورت نے کہا کہ مجھے طلاق نہ دو اور میری طرف سے دوسری بیویوں کے مقابلے میں راتیں تقسیم کرنے کی کوئی پابندی نہیں جیسے چاہو تقسیم کرلو۔ اس پر آیت وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ نازل ہوئی۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ آیت وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ایک ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس کی ایک بیوی تھی جس سے کئی بچے پیدا ہو چکے تھے اس مرد کو خواہش ہوئی کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کسی عورت سے نکاح کرے لہٰذا اس عورت نے اس سے یہ صلح کرلی کہ وہ اُسی کے نکاح میں رہے اور راتوں کی تقسیم میں اُسے شامل نہ کیا جائے۔ نکاح بھی انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے، مردوں کو بھی اس کی ضرورت ہے اور عورتوں کو بھی، اور اس میں مرد اور عورت کی بہت ساری دینی اور دنیاوی مصلحتیں ہیں اور نکاح اسی لئے کیا جاتا ہے کہ زندگی بھر دونوں ساتھ رہیں اور حسن معاشرت کے ساتھ دونوں میاں بیوی خیر و خوبی اور محبت و الفت کے ساتھ زندگی گذاریں لیکن کبھی بعض امور ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ کچھ ناگواری کی صورتیں سامنے آ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ نباہ مشکل ہو جاتا ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے اس کے لئے طلاق اور خلع کی صورتیں بھی جائز رکھی ہیں۔ بعض مرتبہ مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے کیونکہ بسا اوقات جہاد کے موقع پر مجاہدین شہید ہو جاتے ہیں ان کی بیواؤں اور بچوں کو سنبھالنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ان بیواؤں سے مسلمان نکاح کرلیں۔ جب ایک سے زیادہ نکاح کرلیا تو اس میں تمام بیویوں کے ساتھ عدل کو سامنے رکھ کر زندگی گذارنا فرض ہے۔ اخراجات اور خوراک و پوشاک تو سبھی کے لئے ضروری ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر بیوی کے

پاس راتوں کو قیام کرنے میں برابری کرے، یعنی جتنی راتیں ایک کے پاس رہے دوسری کے پاس بھی اُسی قدر راتیں گذارے یہ وہ عدل ہے جس کا حکم دیا گیا ہے، جو انسان کے اختیار میں ہے، اور جو چیز اختیار میں نہیں ہے، یعنی یہ کہ قلبی میلان کسی کی طرف زیادہ ہو تو اس پر مواخذہ نہیں لیکن اس کی وجہ سے عدل اختیاری کو نہ چھوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں عدل فرماتے تھے یعنی انصاف کے ساتھ راتیں تقسیم کرتے تھے لیکن بعض بیویوں کی طرف قلبی رجحان زیادہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا **اللّٰھم ان ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک و لا املک** (اے اللہ یہ میری تقسیم ہے جو میرے اختیار میں ہے سو آپ اس میں مجھے ملامت نہ فرمائیے، جو چیز میرے اختیار میں نہیں)۔ (رواہ الترمذی)

اگر کوئی شخص امر اختیاری میں عدل و انصاف نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (**رواہ الترمذی**) اگر اپنے اختیار سے عدل کرنے میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی اور اُسے خیال ہوتا ہے یا عزم پختہ کر لیتا ہے کہ میں اس عورت کو طلاق دیتا ہوں جس کے ساتھ برابری کا معاملہ نہیں کر سکتا یا اس لئے طلاق دینا چاہتا ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہوگئی اور وہ عورت صورتحال کو سمجھ کر یوں صلح کر لے کہ چلو راتیں تقسیم کرنے والا، میرا حق فلاں بیوی کو دے دیا کریں یا یہ کہ نان نفقہ معاف کرتی ہوں یا مقدار کم کرتی ہوں تو ایسی صلح کر لینے میں کوئی گناہ کی بات نہیں اور صلح اچھی ہی چیز ہے۔ جب اتنی بڑی زندگی ساتھ گذاری ہے تو طلاق دے کر رنج پہنچانا اچھی بات نہیں، خصوصاً جب کہ وہ اپنا حق چھوڑنے پر بھی راضی ہے تو طلاق دینا بہت ہی نامناسب ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں **والصلح خیر ای من الفرقة وسوء العشرة او من الخصومة** یعنی صلح کرنا جدا ہونے سے اور بُرے طریقے پر زندگی گذارنے سے یا لڑتے جھگڑتے رہنے سے بہتر ہے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ لفظ الشُّحَّ کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ **ھو البخل مع الحرص** یعنی شح اس بخل کو کہتے ہیں جس میں حرص بھی ہو، اور درحقیقت بات یہ ہے کہ بخل اور حرص آپس میں ایک دوسرے کو لازم ہوتے ہیں، کیونکہ جو شخص حریص ہوتا ہے کنجوس بھی ہوتا ہے اور جو کنجوس ہوتا ہے حریص بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ان دونوں بُری خصلتوں کا سبب حبّ دنیا ہے اس لئے سورۂ تغابن اور سورۂ حشر میں فرمایا وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (جو شخص شحّ نفس سے بچالیا گیا سو یہ لوگ کامیاب ہیں) حدیث شریف میں فرمایا شَرُّ مَا فِی الرَّجُلِ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ بُری چیز حرص اور بخل ہے جو خوب زیادہ گھبراہٹ میں ڈالنے والا ہے اور دوسری چیز بزدلی ہے جو جان نکالنے والی ہے۔ (رواہ ابوداؤد کما فی المشکوٰۃ ص ۱۶۸) (وھو فی السنن فی کتاب الجہاد ص ۳۴۰ ج ۱)

مفسرین نے فرمایا ہے کہ جملہ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ میں یہ بتایا ہے کہ چونکہ نفوس انسانیہ میں ایک طرح کی حرص ہے اور خرچ نہ کرنے کے جذبات بھی ہیں اس لئے صلح میں آسانی ہوگی۔ جب شوہر یہ دیکھے گا کہ عورت پورا یا آدھا اپنا مالی حق چھوڑ رہی ہے یا یہ کہ دوسری عورت کو اپنی باری کا حق سپرد کر رہی ہے تو اس طرح سے میری طبعی حرص میں کچھ خلل نہیں آتا اور عورت بھی مفت میں میرے نکاح میں رہ جاتی ہے تو وہ نکاح میں رکھنے پر راضی ہو جائے گا اور عورت کو جو حرص ہے کہ وہ پرانے شوہر ہی کے نکاح میں رہے اس کی یہ حرص بھی پوری ہو جائے گی۔ اور اس طرح سے صلح آسان ہوگی۔ اگر بچے ہیں تو کسی فریق کو بچوں سے جدا ہونا بھی نہ پڑے گا اور مل جل کر سب کی خوشگوار زندگی گذرے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پھر فرمایا وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○ کہ اگر تم بھلائی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے وہ تمہیں نیکی اور تقویٰ کا اچھا بدلہ دے گا۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک

اختیار کرنے اور پرہیز گاری کرنے کی ترغیب دی ہے۔

صلح کا ذکر فرمانے کے بعد ایک بہت اہم بات کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ کہ تم سے ہرگز یہ نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں ہر طرح کی برابری کرو، کیونکہ رغبت قلبی غیر اختیاری چیز ہے اس لئے اس میں برابری نہ کر سکو گے پس اگر کسی بیوی کی طرف قلبی میلان زیادہ ہو تو اس کی وجہ سے کسی دوسری بیوی کے حقوق تلف نہ کریں۔ جس سے وہ دوسری بیوی مظلوم ہو جائے اور وہ درمیان میں لٹک کے رہ جائے نہ اُس کے حقوق ادا ہوں تا کہ وہ خاوند والی سمجھی جائے اور نہ اُس کو طلاق دی جائے تا کہ وہ بے خاوند والی ہو کر کسی اور جگہ اپنا نکاح کر سکے۔ اسے رکھنا ہے تو اچھی طرح سے رکھو۔ اور اگر اصلاح کرو گے اور پرہیز گاری اختیار کرو گے (جس میں گذشتہ حق تلفی کی تلافی بھی ہو) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ سب کچھ بخش دے گا۔

پھر فرمایا وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ یعنی اگر دونوں میاں بیوی میں کسی طرح موافقت نہ ہو پائے اور خلع یا طلاق کے ذریعہ آپس میں جدائی ہو ہی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے بے نیاز فرما دے گا۔ کوئی فریق یہ نہ سمجھے کہ میرے بغیر اس کا کام چلے گا ہی نہیں اللہ تعالیٰ سب کا کارساز ہے ہر ایک کیلئے جو مقدر فرمایا ہے وہ اس کے لئے میسر فرمائے گا۔ اس میں فریقین کو تسلی دی ہے کہ آپس میں صلح نہ کر سکیں تو جدا ہو ہی جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کیلئے خیر فرمائے گا۔ مرد کو کوئی دوسری بیوی مل جائے گی اور عورت کا بھی کوئی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی قدرت ہے وہ اپنی وسعت اور قدرت سے دونوں کا کام بنا دے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جو لوگ دوسری شادی کر لیتے ہیں اور پہلی بیوی کے ساتھ نہ برابری کا برتاؤ کرتے ہیں نہ طلاق دیتے ہیں اور اس پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تو ایسے ہی پڑی پڑی سڑتی رہے گی۔ ایسے ظالموں کو ان آیات کے مضامین پر خاص توجہ دینا لازم ہے۔ دنیا میں وہ مظلوم اگر کچھ نہیں کر سکتی تو آخرت تو سامنے ہے۔ اگر انصاف نہیں کر سکتے اور برابری کے ساتھ دونوں کو نہیں رکھ سکتے تو ایک ہی بیوی کے ساتھ گذارہ کریں جیسا کہ سورۂ نساء کے شروع میں فرمایا فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً۔

دشمنانِ اسلام نے تعدد ازواج کے بارے میں جو اسلام پر اعتراض کیا ہے۔ اُن کا جواب دینے کیلئے نام نہاد اسلام کے جھوٹے ہمدردوں نے آیت وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا کو پیش کر کے یوں کہا ہے کہ تعدد ازواج ممنوع ہے کیونکہ برابری کر ہی نہیں سکتے اس لئے ایک ہی پر بس کرنا لازم ہے۔ ان جاہل خیر خواہوں نے دشمنوں کو جواب دینے کیلئے مسئلہ شرعیہ میں تحریف کر دی۔ وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا میں فرمایا ہے کہ تم قلبی محبت میں برابری نہیں کر سکتے، جن امور میں اپنے اختیار سے برابری کر سکتے ہیں اس کیلئے ولن تستطیعوا نہیں فرمایا اور اسی اختیاری برابری کی بنیاد پر چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے جس کا ذکر سورۂ نساء کے شروع میں گذر چکا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ وَلَقَدۡ وَصَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ

اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور البتہ ہم نے اُن لوگوں کو وصیت کی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی

وَاِيَّاكُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اور تم کو بھی وصیت کی کہ اللہ سے ڈرو، اور اگر کفر کرو گے تو بلاشبہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ بے نیاز ہے

غَنِيًّا حَمِيۡدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۳۲﴾

لائق حمد و ستائش ہے۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور کارساز ہونے کے لئے اللہ کافی ہے۔

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیۡرًا ﴿۱۳۳﴾

اے لوگو اگر اللہ چاہے تو تم سب کو ختم کر دے اور دوسروں کو لے آئے، اور اللہ کو اس پر قدرت ہے۔

مَنۡ كَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹ ۸ ۱۶

جو شخص ارادہ کرے دنیا کے ثواب کا تو اللہ کے پاس دنیا و آخرت کا ثواب ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے، وہ غنی اور حمید ہے، سمیع اور بصیر ہے

ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے سب اس کی مخلوق ہیں، مملوک ہیں اور اس کے بندے ہیں۔ اسے سب اختیار ہے تکوینی طور پر جس حال میں رکھے اور تشریعی طور پر جو چاہے حکم دے۔ کسی کو کچھ ذرا بھی اعتراض کا حق نہیں، اور فرمایا کہ جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اُن کو اور تم کو اللہ نے یہ وصیت فرمائی ہے یعنی تاکیدی طور پر حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرنے ہی میں سارے دین پر عمل کرنے کا حکم آ جاتا ہے، فرائض و واجبات کی پابندی اور گناہوں کا چھوڑنا یہ سب تقویٰ ہے۔ مزید فرمایا کہ اگر تم کفر اختیار کرو گے تو اللہ کا اس میں کچھ بھی ضرر نہیں آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور وہ غنی ہے بے نیاز ہے اُسے کسی کی حاجت نہیں۔ کسی کی اطاعت سے اس کا کوئی نفع نہیں، اور ترک اطاعت اور عبادت سے اُس کا کوئی ضرر نہیں۔

وہ حمید بھی ہے یعنی ہمیشہ سے وہ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے محمود ہے، لائق تعریف ہے، مستحق حمد ہے۔ کسی کی مخالفت سے اس کی صفات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا اور کسی کی اطاعت سے اس کے کمال میں ذاتی کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ ساری مخلوق اس کی ملک ہے وہ سب کا کارساز ہے۔

پھر فرمایا: اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡكُمۡ اَیُّهَا النَّاسُ وَیَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ اے لوگو! اگر اللہ چاہے تو تم سب کو ختم کر دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیۡرًا اور اللہ تعالیٰ کو اس پر پوری پوری قدرت ہے باوجود قدرت ہونے کے اس نے تم کو باقی رکھا ہے تم اس کی اطاعت وعبادت کو غنیمت جانو۔

آخر میں فرمایا مَنۡ كَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ کہ جو شخص دنیا کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے اُسے دنیا کا طالب ہو کر آخرت کا ثواب نہیں کھونا چاہیے اللہ سے آخرت کا ثواب مانگے اور اس کی آرزو بھی رکھے، جو شخص دنیا کا طالب ہے اُسے بتا دو کہ اللہ کے پاس دونوں جہاں کا ثواب ہے۔ اشرف ترین چیز یعنی ثوابِ آخرت کا طالب ہونا چاہیئے۔ (روح المعانی ص ۱۶۶ ج ۵)

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مقصد آخرت ہی بن جائے اللہ تعالیٰ اس کے منتشر امور کو جمع فرما دے گا اور اس کے دل کو غنی کر دے گا اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آئے گی، اور جس کی نیت حصولِ دنیا ہو اس کے کاموں کو منتشر فرما دے گا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تنگی کر دے گا۔ اور دُنیا اُسے اتنی ہی ملے گی جتنی اس کے لئے لکھ دی گئی ہے۔ (الترغیب والترہیب ص ۱۲۱ ج ۴)

آخر میں فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا یعنی اللہ تعالیٰ تمام اقوال کو سنتا ہے اور تمام احوال کو دیکھتا ہے۔ جو لوگ طالبِ دنیا ہیں صرف دنیا کے لئے عمل کرتے ہیں۔ آخرت کی طرف نہیں بڑھتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان سب کا علم ہے، جو لوگ ریاکاری کے طور پر عمل کرتے

ہیں اللہ تعالیٰ سے ان کا حال پوشیدہ نہیں ہے وہ اپنے علم کے مطابق بدلہ دے گا۔

قال صاحب الروح ص ۱۶۷ ج ۵ ای کیف یرائی المرائی وان اللہ تعالٰی سمیع بما یھجس فی خاطرہ وما تامرہ بہ دواعیہ بصیر باحوالہ کلھا ظاھرھا و باطنھا ویجازیہ علٰی ذلک ۔ (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں کہ ریا کار ریا کاری کیسے کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں آنے والے وسوسے کو بھی سنتا ہے اور اس وسوسے کے تقاضوں کو بھی جانتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تمام حالات کو بخوبی جاننے والا ہے خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور اس پر پھر اسے بدلہ دے گا)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

اے ایمان والو! انصاف پر قائم ہونے والے اللہ ہی کے لئے گواہی دینے والے بن کر رہو اگرچہ تمہاری جانوں یا تمہارے ماں باپ یا تمہارے

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

رشتہ داروں کے خلاف پڑ جائے، اگر غنی ہے یا فقیر ہے تو اللہ تعالیٰ کو دونوں کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق ہے سو تم انصاف کرنے میں خواہش نفس کا اتباع نہ کرو

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

اور اگر تم کج بیانی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے۔

سچی گواہی دینے اور انصاف پر قائم رہنے کا حکم

لباب النقول ص ۸۵ میں اس آیت کا سبب نزول بتاتے ہوئے بحوالہ ابن ابی حاتم مفسر سُدّی سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ دو شخصوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا مقدمہ پیش کیا اُن میں ایک غنی تھا اور ایک فقیر تھا۔ آپ کا رجحان فقیر کی طرف ہوا کیونکہ خیال مبارک میں یہ آیا کہ فقیر غنی پر کیا ظلم کرے گا۔ اس پر آیتِ بالا نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انصاف کو قائم رکھا جائے۔

اصل چیز انصاف ہے وہی مطلوب ہے کسی کی بھی طرفداری کرنے سے انصاف باقی نہیں رہتا انصاف کرنے کے جو اصول ہیں یعنی گواہی اور قسم اُسی کے مطابق فیصلے کئے جائیں البتہ گواہ سچے ہوں اسی لئے جہاں یہ حکم دیا کہ انصاف پر قائم رہو وہاں یہ بھی حکم دیا کہ اللہ کیلئے گواہی دینے والے بنو۔ گواہ بھی جھوٹی گواہی نہ دیں اور کسی کی طرفداری نہ کریں۔ حق کو خوب اچھی طرح واضح کریں۔ گواہی دینے میں غلط بیانی نہ کریں۔ جیسے زبان موڑ کر یا الفاظ کی ہیرا پھیری کر کے بعضے گواہ گواہی دے جاتے ہیں۔ اس میں ظالم کی طرفداری ہو جاتی ہے یا حق واضح نہ ہونے سے حاکم فیصلہ دینے سے عاجز رہ جاتا ہے جس سے مظلوم کا حق مارا جاتا ہے اور گواہی دینے سے اعراض بھی نہ کرے کیونکہ جہاں کسی کا حق مارا جاتا ہو وہاں حق گواہی دینا واجب ہے اس واجب کی خلاف ورزی گناہ ہے۔ اسی کو فرمایا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا اور سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں فرمایا وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور فرمایا وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔

مزید ارشاد فرمایا کہ اللہ کے لئے گواہی دو اور گواہی میں یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کے خلاف جائے گی اگر حق کی گواہی تمہاری اپنی جانوں کے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے خلاف ہو یا رشتہ داروں کے خلاف ہو تب بھی صحیح اور حق گواہی دے دو۔ اگر تمہارا یا تمہارے عزیزوں کا کچھ نقصان ہوگا تو حقیر دنیا کا نقصان ہوگا حق قائم کرنے اور حق دلانے کے سامنے حقیر دنیا کے نقصان کی کوئی حیثیت نہیں، وَلَوْ عَلٰٓى

اَنْفُسِكُمْ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی کا کوئی حق اپنے ذمہ نکلتا ہو تو واضح طور پر اس کا اقرار کرنا لازم ہے گو یہ نفس کے خلاف گواہی ہے۔ نفس حق دینا نہیں چاہتا لیکن آخرت کی پیشی کو سامنے رکھ کر حقدار کا حق دے دینا لازم ہے۔

یہ جو فرمایا اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا اس میں یہ بتایا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ جس کے خلاف گواہی پڑ رہی ہے اور جس کے خلاف فیصلہ ہو رہا ہے یہ غنی ہے یا فقیر ہے، امیری غریبی اللہ کی دی ہوئی ہے اور امیر اور غریب سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے کیونکہ وہ اس کی مخلوق ہیں وہ ان کا حاجت روا ہے۔ تمہیں کسی امیر غریب سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا اللہ تعالیٰ کو تعلق ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے سب کی مصلحت اسی میں رکھی ہے کہ صحیح گواہی دی جائے حق بات کہی جائے تو تم اسی حکم پر عمل کرو۔ یہ نہ دیکھو کہ مالدار کے پاس مال جا رہا ہے یا اُسے دینا پڑ رہا ہے یا غریب کو نہیں مل رہا ہے یا غریب کو دینا پڑ رہا ہے بلکہ ہمیشہ حق ہی کو اختیار کرو اور صحیح گواہی دو۔

جس طرح رشتہ داری سامنے آ جاتی ہے اور گواہی میں اور فیصلے میں حق کو اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس کے خلاف فیصلہ جا رہا ہے وہ ہمارا رشتہ دار ہے اسی طرح یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہم جس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں یا فیصلہ لکھ رہے ہیں وہ ہمارا دوست ہے یا ہم وطن ہے یا ہم پیشہ ہے یا ہم زبان ہے، ایسے گواہ اور حاکم کے لئے سخت وبال اور گناہ کی بات ہے کہ ظالم کا ساتھ دے اور اس کی رعایت کرے جس سے کسی قسم کا تعلق ہے اور جس کا واقعی حق بنتا ہوا سے محروم کر دے۔ لسانی اور وطنی عصبیتوں کی وجہ سے متعصب عوام سے دب کر بہت سے اہل علم بھی عصبیت کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ زمانہ قریب کی تاریخ شاہد ہے کہ تقسیم ہند کے بعد کافروں کے مظالم سے بچ کر بہت سے مسلمان دوسرے مسلمانوں کے بعض علاقوں میں ہجرت کر کے پہنچ گئے اور پھر وہاں گھر در بنا لیے اور زمینیں خرید لیں اور پیسے کما لئے جب علاقے کے لوگوں کو علاقائی عصبیت کا خیال آتا تو ان پناہ گزین مسلمانوں کو اپنے علاقے سے نکالنے پر تل گئے۔ پناہ گزینوں کو بے تحاشہ ختم کیا اور اُن کے مالوں اور جائیدادوں پر قبضہ بھی کر لیا ہے اس وقت حکام اور عوام بلکہ اہل علم تک اس جہالت پر آمادہ ہو گئے کہ یہ ہماری زمین ہے۔ یہ رقم ہمارے یہاں رہتے ہوئے کمائی ہے۔ لہٰذا یہ سب کچھ ہمارا ہے اس عصبیت جاہلیت کی وجہ سے پناہ گزینوں پر بڑے بڑے مظالم ہوئے اور حکام اور عوام سب نے كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ کی خلاف ورزی کی۔ اگر کسی کے دل میں انصاف کی بات تھی تو عوام کے خوف سے وہ زبان پر نہ لا سکا۔ انصاف پر قائم رہنے میں یہ سب داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ ظالم کی حمایت نہ کی جائے مظلوم کا حق دیا جائے اور دلایا جائے گواہی دینے میں کسی اپنے پرائے کا خیال نہ رکھا جائے۔ گواہی حق ہو، خواہ کسی کے بھی خلاف پڑے۔ اپنے نفس پر اور مظلوموں پر ظلم کرنے والے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کے لئے گواہی نہیں دیتے جبکہ قرآن مجید میں شُهَدَآءَ لِلّٰهِ فرمایا اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو روزانہ کچہری میں حاضر ہو جاتے ہیں اور جس کے خلاف گواہی دلوائی جائے تھوڑے سے پیسے لے کر گواہی دے دیتے ہیں، جھوٹی گواہی دینا بہت سے لوگوں کا کاروبار ہے۔ ایسی گواہی دینا حرام ہے اور اس پر جو اجرت لیتے ہیں وہ بھی حرام ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو قیامت کے دن اللہ کے سائے کی طرف سب سے پہلے پہنچنے والے کون ہیں، عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی جانتے ہیں۔ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں حق دیا جاتا ہے تو قبول کر لیتے ہیں اور اگر ان پر کسی کا حق ہو تو جب مانگا جائے دیدیتے ہیں اور لوگوں کے بارے میں وہی فیصلے کرتے ہیں جو فیصلے اپنے لئے کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جیسے اپنے لئے حق اور انصاف چاہتے ہیں ایسے ہی جب دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع آ جائے اس وقت بھی انصاف کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۲۲)

شروع آیت میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرما کر یہ بتا دیا کہ انصاف قائم کرنا اور سچی صحیح گواہی دینا یہ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، جو

لوگ حکام ہیں اُن کو پوری اُمت انصاف کا پابند کرے تا کہ دنیا میں انصاف کی فضا بنے۔ جولوگ حاکم بناتے ہیں اُن پر فرض ہے کہ ایسے شخصوں کو حاکم بنائیں جو علم اور تقویٰ والے ہوں۔ ظالمانہ فیصلے نہ کریں قرآن وحدیث کے موافق فیصلے کریں۔ کافرانہ قانون کو سامنے رکھ کر فیصلے نہ کریں۔

فائدہ۔۔۔۔۔۔۔۔اس آیت میں كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ فرمایا اور سورۂ مائدہ میں قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ فرمایا۔ دونوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ انصاف قائم کرنا اور صحیح گواہی دینا یہ دونوں کام اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ لفظ للّٰہ میں یہ بتایا کہ انصاف اور گواہی اللہ کی رضا کے لئے ہو، اور آیت کے ختم پر اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا فرما کر۔۔۔۔۔۔۔ یہ بتایا کہ اللہ سے ڈرو قیامت کی پیشی کا دھیان رکھو۔ جب اللہ کی رضا بھی مقصود ہوگی اور اللہ کا خوف بھی ہوگا تو انصاف بھی قائم ہو سکے گا اور گواہ سچی گواہی دیں گے۔

فائدہ۔۔۔۔۔۔۔۔آیت میں جو یہ فرمایا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰىٓ اَنْ تَعْدِلُوا اس میں اجمالی طور پر مضمون بالا کی تاکید فرما دی کہ خواہش نفس کا اتباع نہ کرو۔ ظلم اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ حق کو اختیار کرنے کی بجائے خواہشِ نفس کا اتباع کیا جاتا ہے اور اللہ کی رضا کو سامنے نہیں رکھا جاتا اسی وجہ سے ظالمانہ فیصلے ہوتے ہیں اور جھوٹی گواہیاں دی جاتی ہیں۔

لفظ اَنْ تَعْدِلُوا میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ عدول سے مشتق ہو جس کا معنی یہ ہوگا کہ اتباع ہوٰی نہ کرنا جس کی وجہ سے حق سے ہٹ جاؤ گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ عدل سے مشتق ہو جس کا معنی یہ ہوگا کہ اتباع ہوئی نہ کرو۔ کیونکہ اتباع ہوئی کی وجہ سے عدل نہ کر سکو گے۔ وفيه حذف مضاف اى كراهية ان تعدلوا۔

گواہیوں اور فیصلوں میں رشتہ داریوں کو نہ دیکھا جائے۔۔۔۔۔۔ بے انصافی اختیار کرنے اور ظلم پر آمادہ ہونے کے لئے جس طرح رشتہ داروں کی یا دوستوں کی یا کسی بھی قسم کے تعلقات کی رعایت آڑے آ جاتی ہے اسی طرح سے کسی قوم کی دشمنی اور بغض اور عناد بھی انصاف سے روکنے والے بن جاتے ہیں۔ اس پر سورۂ مائدہ میں تنبیہ فرمائی اور فرمایا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوا (کہ کسی قوم کی دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا ہے اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم زیادتی کر جاؤ) اور فرمایا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوا (اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف نہ کرو)۔

اسلام ظلم کا ساتھی نہیں۔۔۔۔۔۔ دین اسلام میں حق اور انصاف کی قدر و قیمت ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے اور انصاف کے اصول مقرر فرما دیئے ہیں۔ صاحب حق امیر ہو یا غریب ہو اس کا حق دلانا فرض ہے۔ کسی سے اس لئے عناد کرنا کہ وہ امیر ہے یا غریب ہے یہ اسلام میں نہیں ہے اسلام حق کا ساتھی ہے ظلم کا ساتھی نہیں ہے، جب سے دنیا میں کمیونزم کا نظریہ چلا ہے اس وقت سے لوگوں کا کچھ مزاج ایسا ہو گیا کہ جس طرح سے ممکن ہو مالدار کو دباؤ۔ اگرچہ ظلم غریب کی طرف سے ہو جہاں کہیں کسی امیر اور غریب میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ عام لوگ غریب ہی کے ساتھی ہو جاتے ہیں حالانکہ حق کا ساتھی ہونا چاہئے اگر کسی امیر نے مزدور رکھا اور کام لے کر اس کی مزدوری نہ دی یا کم دی تو اس صورت میں غریب کا ساتھی ہونا چاہئے اور اس کا جو حق ہے وہ دلائیں اور اگر کسی غریب نے کسی امیر کا پیسہ مار لیا تو اس غریب سے اس امیر کا پیسہ دلائیں، اسلام حرام کا مخالف ہے۔ اگر امیر کے پاس حرام ہے تو وہ گنہگار، فاسق، فاجر ہے۔ جس کا مال مارا ہے اس کا حق ادا کرے، اور اگر کسی غریب نے کسی امیر کا ناجائز طور پر مال لے لیا ہے تو وہ بھی فاسق فاجر ہے اس کے ذمہ بھی واجب ہے کہ جس کا مال مارا ہے اس کا مال واپس کرے۔ امیری یا غریبی حق ہونے کا اور حق دار ہونے کا معیار نہیں ہے، اب مزدور یہ کرتے ہیں کہ جتنا معاملے کے اعتبار سے ان کا حق بنتا ہے اس سے زیادہ مانگتے ہیں اگر کارخانہ دار نہ دے تو ہڑتال کر دیتے ہیں پھر ہڑتال کے زمانے

کے بھی پیسے مانگتے ہیں، اور اس کو مزدور کا حق سمجھا جاتا ہے اور لوگ عموماً مزدور کے طرف دار ہو جاتے ہیں یہ مزدوروں کی ناجائز حمایت ہے اور انصاف کے خلاف ہے اگر کسی حکومت کے غلط قانون کی وجہ سے مالدار کارخانہ چلانے کی مجبوری سے اس زمانے کے پیسے دے دے جس زمانے میں مزدوروں نے کام نہیں کیا تو مزدوروں کو وہ پیسہ لینا حلال نہ ہوگا۔ مزدور آٹھ گھنٹے روزانہ کا معاملہ کرتے ہیں پھر وقت کم دیتے ہیں اور تنخواہ پوری لیتے ہیں یا وقت پورا دیتے ہیں تو کام پورے وقت میں نہیں کرتے کچھ کام کیا پھر بیٹھ گئے۔ باتوں میں وقت لگایا جو کام سپرد نہیں اُن کاموں میں لگ گئے اور تنخواہ پوری لے لی۔ ایسا کرنے سے پوری تنخواہ لینا حلال نہیں ہوتا۔ جو لوگ ایسے حق مارنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں وہ ظلم کے ساتھی ہیں۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا کے بعد جو فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا فرمایا ہے اس میں وہ لوگ غور کریں جو ظلم کے مواقع میں امیر یا غریب کا ساتھ دیتے ہیں اور اتباعِ ھویٰ کی وجہ سے حق کے ساتھی نہیں بنتے۔ واللہ یقول الحق وهو يهدی السبيل۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ

اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اُن کتابوں پر

الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ

جو اس سے پہلے نازل فرمائیں۔ اور جو شخص منکر ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ

ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا

گمراہ ہو کر دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر

لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾

ہوئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ اُن کو نہیں بخشے گا اور نہ اُن کو راہ دکھائے گا۔

اللہ پر اور اس کے رسولوں اور کتابوں فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان لانے کا حکم

ان آیات میں اوّلاً مسلمانوں کو خطاب فرمایا ہے کہ اپنے ایمان پر جمے رہو اور اس کے رسولوں پر اس کی موجودہ کتاب پر اور اس کی ان کتابوں پر جو پہلے نازل فرمائی ہیں ان سب پر ایمان لاؤ۔ مزید یہ فرمایا کہ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور آخرت کے دن کا انکار کرے وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ اس میں اصول ایمان بتائے ہیں ان چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے جو اس آیت میں مذکور ہوئیں۔

حدیث جبرئیل میں تقدیر پر ایمان لانے کو بھی اصول ایمان میں شامل فرمایا ہے۔ جب کوئی شخص ان چیزوں پر ایمان لائے گا تو آگے سارے دین پر ایمان لانا لازم ہو جائے گا۔ کیونکہ سارا دین اللہ نے اپنی کتاب میں خود بتایا ہے یا اپنے رسول کے ذریعہ بتایا ہے۔ جو بھی کسی چیز کا اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی چیزوں میں منکر ہوگا وہ کافر ہوگا۔ اور ان چیزوں کا انکار بہت بڑی گمراہی ہے جس کو ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا فرمایا۔

اس کے بعد منافقوں کا ذکر فرمایا، سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم نے بتایا تھا کہ منافقوں کا ظہور کیوں ہوا۔ اور منافقت اختیار کرنے والے کون لوگ تھے اور انہوں نے اس کی ضرورت کیوں محسوس کی وہاں دیکھ لیا جائے............ اُن لوگوں کے سامنے دنیا تھی۔ طلب دنیا کی وجہ سے مفاد ظاہری کے پیش نظر ظاہری طور پر............ ایمان قبول کر لیتے تھے اور اندر سے کافر ہی رہتے تھے۔

اُن میں سے بعض کو تو ایمان کی توفیق ہوگئی۔ اور بعض کفر ہی میں بڑھتے چلے گئے۔ جب انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے اور آخرت کا نفع نقصان سمجھنے کا موقع ہی ختم کر دیا جو شخص کفر اور شرک پر مر جائے اس کی بخشش کبھی نہیں ہے اور جب کفر پر مر گیا تو اب موت کے بعد جنت کی راہ دکھانے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا۔

آیتِ بالا کی تفسیر کرتے ہوئے بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے کہ وہ اوّل ایمان لائے پھر گائے کے بچھڑے کی عبادت کر کے کافر ہو گئے پھر توبہ کر کے مؤمن ہوئے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہوئے پھر انکار میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ جانتے بوجھتے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے بھی منکر ہو گئے۔ (ذکرہ فی الروح)

وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا اس کا ایک مطلب تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہشت کا راستہ نہ دکھائے گا کیونکہ وہ کفر پر مر چکے ہوں گے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اُن کے بار بار کفر کی طرف لوٹنے کی وجہ سے قبول حق کی توفیق ہی سلب ہو جائے گی۔ اور آئندہ توبہ کرنے اور ایمان لانے کا موقع ہی نصیب نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سورۂ صف میں بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد فرمایا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ قال صاحب الروح ص ۱۷۱ ج ۵ فان من تکرر منهم ارتداد و ازدیاد الکفر والاصرار علیه صاروا بحیث قد ضربت قلوبهم بالکفر و تمرنت علی الردۃ۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے کہ اُن کیلئے دردناک عذاب ہے۔ جو مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

کیا اُن کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں بلاشبہ ساری عزت اللہ کے لئے ہے۔

عزت اللہ ہی کے لئے ہے

اس آیت میں بھی منافقین کی بدحالی کا تذکرہ ہے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے خوشخبری تو اچھی حالت کی دی جاتی ہے لیکن عذابِ الیم کی خبر کو بھی خوشخبری سے تعبیر فرمایا کیونکہ وہ لوگ اپنی حرکتوں کے نتیجے میں اچھی حالت کے منتظر ہیں، اُن کی بے وقوفی ظاہر کرنے کے لئے اس خبر کو بشارت سے تعبیر فرمایا۔ منافقین نے جو نفاق اختیار کیا تھا۔ اس میں انہیں کافروں سے دوستی رکھنی پڑتی ہے۔ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے اور کافروں سے کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں کسی بھی فریق کے ساتھ نہ تھے۔ جیسا کہ آئندہ رکوع میں ہے لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ فرمایا ہے کوئی فریق ان کو اپنا نہیں سمجھتا تھا لیکن وہ یہی سمجھتے تھے کہ ہم بڑے کامیاب ہیں دونوں فریق کو اپنے تعلق میں اُلجھا رکھا ہے اس فریق سے بھی نفع حاصل کرتے ہیں اور دوسرے فریق سے بھی۔ اُن کی یہ چالاکی انہیں لے ڈوبی ایمان سے محروم رکھا۔ اخلاص کے ساتھ ظاہراً و باطناً اسلام قبول کر کے

سچے پکے مسلمان اس لئے نہیں بنتے تھے کہ انہیں یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کا غلبہ نہ ہوا تو ہم اسلام قبول کر کے اس عزت سے محروم ہو جائیں گے جو کافروں سے دوستی کرنے میں حاصل ہے۔ اسی کو فرمایا اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (کیا کافروں کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں عزت تو ساری اللہ ہی کے لئے ہے) اللہ خود عزیز ہے وہ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے یہ کافروں کی ذرا سی مال و جائیداد اور جتھہ کی جو عزت نظر آ رہی ہے اس کی کچھ حیثیت نہیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جو عزت دے گا اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو عزت دی وہ سب کافر ذلیل ہوئے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور منافقین نے بھی اُن کے ساتھ ذلت اٹھائی۔ کافر زیر ہوتے چلے گئے اور اہلِ اسلام کا غلبہ ہوتا گیا اور ممالک فتح ہوتے چلے گئے یہ تو دنیا میں ہوا اور آخرت میں تو ہر کافر کے لئے عذاب مھین (ذلیل کرنے والا عذاب) مقرر ہے ہی۔ دنیا میں جو اَب مسلمانوں کی بد حالی ہے وہ اس لئے ہے کہ عمومی طور پر مسلمانوں نے ایمانی تقاضوں کو اور ایمان کے مطالبات کو چھوڑ دیا ہے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اسلام کو سب سے بڑی عزت سمجھے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی سے عزت مانگے اور مسلمانوں کی دوستی ہی میں عزت سمجھے مسلمان ہوتے ہوئے کافروں سے دوستی کرنے میں یا ان کے افعال و اخلاق اختیار کرنے میں یا اُن کی شکل و صورت اور وضع قطع اختیار کرنے میں عزت نہ سمجھے، جو لوگ اللہ کے ہاں ذلیل ہیں اُن کے ساتھ یا اُن جیسا ہونے میں عزت نہیں ہے۔ طارق بن شہاب بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ (اپنے زمانہ خلافت میں) شام کی طرف روانہ ہوئے اور اُس وقت ہمارے ساتھ حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ بھی تھے، چلتے چلتے حضرت عمرؓ اپنی اونٹنی سے اتر گئے اور اپنے موزے اپنے کاندھے پر ڈال لئے اور اونٹنی کی باگ پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! آپ ایسا کرتے ہیں کہ موزے نکال کر کاندھے پر ڈال کر اونٹنی کی باگ پکڑ کر چل رہے ہیں؟ مجھے تو یہ اچھا نہیں لگتا کہ یہاں کے شہر والے اور لشکر اور نصاریٰ کے بڑے لوگ آپ کو اس حال میں دیکھیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا افسوس ہے تیری بات پر، اے ابوعبیدہؓ تیرے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو اُسے عبرتناک سزا دیتا جو امت محمدیہؐ کے لئے عبرتناک ہوتی پھر فرمایا کہ بلاشبہ ہم لوگ (یعنی عرب) ذلیل قوم تھے اللہ نے ہم کو اسلام کے ذریعہ عزت دی اس کے بعد جب کبھی ہم اس چیز کے علاوہ عزت طلب کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت دی ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل فرما دے گا۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک ص ۶۲ ج ۱)

آج دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان ہونے کے دعویدار نصاریٰ کے طور طریقے اختیار کرنے میں داڑھی مونڈنے میں افرنجی لباس پہننے میں کھانے پینے میں اور معیشت میں اور معاشرت میں حکومت میں اور سیاست میں دشمنانِ دین کی تقلید کرنے کو عزت کی چیز سمجھتے ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے میں، اسلامی لباس پہننے میں، بیاہ شادی میں، سنت کا طریقہ اختیار کرنے میں، اسلامی قوانین اختیار کرنے میں خفت اور ذلت محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح منافقین کافروں سے دوستی کر کے اُن کے یہاں عزت چاہتے تھے آج کے مسلمان بھی انہیں کے طرز کو اپنا رہے ہیں، اسلام اور اعمالِ اسلام میں عزت نہ سمجھنا اور کافروں سے دوستی کرنے اور ان کی طرف جھکنے اور ان کی تقلید میں عزت سمجھنا بہت بڑی محرومی ہے۔ حضرات صحابہؓ سچے مسلمان تھے کافر اُن سے ڈرتے تھے اب جبکہ مسلمان ہی کافروں کی طرف جھک رہے ہیں اور ان کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں تو عزت کہاں رہی؟ یہود و نصاریٰ اور ہنود کا اتباع کرنے والے غور کر لیں۔

سورۂ منافقون میں فرمایا: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (یعنی عزت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے لیکن منافقین نہیں جانتے) ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے جو ذلت دیکھ رہے ہیں۔ اسی سے سمجھ

لیں کہ ایمان کے تقاضوں کے خلاف جا رہے ہیں جس کی وجہ سے عزت سے محروم ہیں۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا

اور اللہ نے تم پر کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور اُن کا مذاق کیا

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ

جا رہا ہے تو اُن کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ بلاشبہ تم اس حالت میں اُن جیسے ہو جاؤ گے، بلاشبہ اللہ

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ (۱۴۰) الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ

منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع فرمادے گا۔ جو اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہارے اوپر کوئی مصیبت آپڑے، سو اگر تمہارے لئے اللہ کی طرف سے فتح یابی

مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ

حاصل ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو ان سے کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہ آ گئے تھے

نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى

اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا، سو اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلے فرمائے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ

الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۧ (۱۴۱)

میں غالب نہ فرمائے گا۔

ع ۲۰ / ۱۷

کافروں کی مجلس میں بیٹھنے کی ممانعت اور منافقین کی دوغلی باتوں کا تذکرہ

ان آیات میں اوّل تو مسلمانوں کو ایک اہم حکم قرآنی یاد دلایا جو اس آیت سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔ اور وہ یہ ہے وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (یعنی جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں (لہو ولعب کے طور پر) مشغول ہوتے ہیں تو تم ان سے اعراض کرلو (یعنی ان کو چھوڑ دو) یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر تمہیں شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو)۔ یہ آیت سورۂ انعام کی ہے جو مکی سورت ہے۔ کافر اور مشرک بطور لہو ولعب قرآنی آیات کا تذکرہ کرتے اور بطور مجلسی مشغلہ کے باتیں کرتے تھے۔ اور آیات قرآنیہ پر طعن کرتے تھے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ جب ایسا موقع ہو تو اُن کو چھوڑ کر چلے جائیں ان کے ساتھ نہ بیٹھیں، جب تک وہ اس مشغلے کو چھوڑ کر کسی اور مشغلے میں نہ لگیں اُن سے دور ہی رہیں۔

سورۂ انعام کی آیت کے مضمون کو یہاں سورۃ نساء میں یاد دلایا اور فرمایا کہ تمہیں پہلے یہ حکم دیا جا چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور اُن کا مذاق بنایا جا رہا ہے تو اس عمل میں جو لوگ مشغول ہوں ان کے ساتھ نہ بیٹھو اگر تم ایسے موقع پر وہاں سے نہ ہٹے تو تم بھی انہیں جیسے ہو جاؤ گے۔ کھلے کافر بھی آیتِ قرآنیہ پر اعتراض کرتے تھے اور منافقین بھی اس مشغلہ کو اختیار کرتے تھے۔

مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ایسے موقعہ پر ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اٹھ کر چلے جاؤ کیونکہ اگر اعتقاد میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ گے تو اُن ہی جیسے کافر ہو جاؤ گے اور اگر اعتقاد میں شریک نہ ہوئے تو گناہ کی شرکت تو بہر حال ہو ہی جائے گی۔ **قال صاحب الروح والمراد من المماثلة فی الجزاء المماثلة فی الاثم لانهم قادرون علی الاعراض والانکار لا عاجزون کما فی مکة او فی الکفر علی معنی ان رضیتم بذٰلک وھو مبنی علی ان الرضی بکفر الغیر کفر من غیر تفصیل الخ** ۔ (صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں جزاء میں ہم مثل ہونے سے مراد گناہ میں برابری ہے کیونکہ وہ ان سے اعراض اور انکار پر قادر تھے جیسا کہ مکہ میں تھے یا اگر ساتھ بیٹھنے والے ان کے کفر پر راضی تھے تو پھر کفر میں ان کے مثل ہیں اور یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ غیر کے کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے تفصیلات کی تفتیش کے بغیر)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے آیتِ بالا سے اس پر استدلال کیا ہے کہ فاسقوں اور اہلِ بدعت کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا حرام ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ اور ابراہیم نخعی نے اسی کو اختیار کیا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ایک روزے دار شخص شراب پینے والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی پٹائی کی اور یہی آیت تلاوت کی۔

صاحب روح المعانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ آیتِ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ کفریہ کاموں میں لگے ہوئے ہوں ان کی مخالفت اس طرح سے فرض ہے کہ وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے۔ محض قلب یا چہرہ سے اعراض کرنا کافی نہیں ہے۔ (ص ۱۷۴ ج ۵)

اگر کافر کسی جگہ جمع ہوں اور اُن کی باتوں اور اعتراضوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے کوئی شخص وہاں چلا جائے تو یہ ممانعت کے دائرہ میں نہیں آتا کیونکہ اہلِ کفر اور اہلِ بدعت سے مناظرہ و مجادلہ کرنا مشروع ہے۔ البتہ بہت سے وہ لوگ جو ہندوؤں یا نصرانیوں کی مجلسوں میں ہوتے ہیں اور اُن سے اسلام کے خلاف باتیں سنتے ہیں اور اسلام کی باتوں کا وہ لوگ جو مذاق اڑاتے ہیں اُسے بیٹھے ہوئے سنتے رہتے ہیں اور جہالت کی وجہ سے یا کافروں کی قوت ظاہرہ کی وجہ سے ان باتوں کا جواب دینے سے عاجز ہوتے ہیں ایسے لوگوں پر فرض ہے کہ وہاں سے اٹھ جائیں، آجکل بہت سے ممالک مثلاً انگلینڈ وغیرہ میں ایسا پیش آجاتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا **اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا** (کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں سب کو دوزخ میں جمع کرنے والا ہے) پھر مسلمان ان کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو اہلِ جنت کے پاس رہنا چاہیے انہیں کی مجلس میں بیٹھنا چاہیے۔ پھر منافقوں کا طریقہ کار اور کردار بیان فرمایا اور فرمایا کہ یہ لوگ بظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن چونکہ اندر سے مسلمان نہیں ہیں اس لئے وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑے (یہ مصیبت بعض مرتبہ کھلے کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کی صورت میں رونما ہو جاتی ہے) جب مسلمان کافروں سے لڑنے لگے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگئی تو یہ منافق مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لہٰذا جو کچھ غنیمت تمہیں ملی ہے اس میں سے ہم کو بھی حصہ دو، اور اگر کافروں کو کوئی حصہ مل گیا۔ یعنی لڑائی میں انہیں غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ منافق کافروں سے کہتے ہیں کیا مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو کر ہم تم پر غالب نہیں آگئے تھے؟ پھر کیا ہم نے تمہیں غالب کرنے کے راستے نہیں بتائے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کے بھید تم تک نہیں پہنچائے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا؟ ہماری کارکردگی ہی سے تو تم کو غلبہ ہوا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کو تمہارے خلاف اٹھنے سے روکا اور وہ جب لڑائی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو ہم اُن کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ تمہاری فتح یابی میں ہمارا دخل ہے۔ لہٰذا اپنے منافع میں ہم کو بھی شریک کرو چونکہ منافق نفاق کو اسی لئے اختیار کرتا ہے کہ دونوں جماعتوں سے فائدہ اٹھائے اور چت اور پٹ دونوں اسی

کی رہیں اسی لئے اس زمانہ کے منافقین یہ چال چلتے تھے جس کا اوپر ذکر ہوا، ایسے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلے فرما دے گا۔ اہلِ ایمان کو جنت عطا فرمائے گا اور منافقوں اور کافروں کو دوزخ کی سزا دے گا۔ یہ دنیا کی ذرا سی زندگی اگر نفاق اور مکر و فریب اور دغابازی کے ساتھ بظاہر کچھ اچھی گذار لی تو یہ کوئی خوش ہونے کی چیز نہیں ہے اس کے بعد منافقوں اور کافروں کے لئے دوزخ کا عذاب دھرا ہوا ہے۔

آخر میں ارشاد فرمایا وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ٥ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب فیصلے ہوں گے تو اللہ کافروں کو ایمان والوں پر غلبہ نہ دے گا دنیا میں تو مسلمانوں کے ابتلاء کے لئے اور کافروں کے استدراج کے لئے کبھی کافروں کا غلبہ ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں ہر حیثیت سے مسلمانوں ہی کا غلبہ ہوگا۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس آیت کا یہی مطلب مروی ہے۔ صاحب روح المعانی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ تام نہیں دے گا کہ جس سے سب مسلمان ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں، اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ کافروں کو کبھی بھی مؤمنین کے مقابلے میں کوئی ایسی حجت اور دلیل نہیں مل سکتی جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں سے جیت جائیں۔ دلائل کے اعتبار سے اہلِ ایمان ہی ہمیشہ غالب رہیں گے۔ (ص ۱۷۵ ج ۵)

اور صاحبِ ہدایہ نے اس آیت کو اس امر کے استدلال میں پیش کیا ہے کہ کسی کافر کی ولایت کسی مسلمان پر نہیں ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ کوئی کافر اپنی مسلمان اولاد کا ولی نہیں ہوسکتا۔ کافر اپنی کافر اولاد کا نکاح کر سکتا ہے۔ اپنی مسلمان اولاد کے نکاح کی ولایت اُسے حاصل نہیں ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ

بے شک منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اللہ اُن کی دھوکہ بازی کی ان کو سزا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں

النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰى

تو کسل مندی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔ ادھر میں لٹکے ہوئے ہیں اس کے درمیان، نہ ان لوگوں کی طرف نہ

هٰۤؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

اُن لوگوں کی طرف، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لئے تو ہرگز کوئی راستہ نہ پائے گا۔ اے ایمان والو! مؤمنوں کو چھوڑ

الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کر لو۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا

بے شک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے اور تو ہرگز اُن کے لئے کوئی مددگار نہ پائے گا۔ سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی

وَ اَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ

اور اصلاح کر لی اور اللہ پر مضبوط بھروسہ رکھااور اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر دیا، تو یہ لوگ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے اور عنقریب

اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ

اللہ مؤمنین کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گذار بنو اور ایمان لاؤ

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اور اللہ قدر دان ہے جاننے والا ہے۔

منافقوں کی چال بازی اور امورِ دینیہ میں کسل مندی کا تذکرہ اور مسلمانوں کو حکم کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں

ان آیات میں منافقین کے کردار پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ اور اُن کا طور طریق بتایا ہے۔ پھر اُن کا وہ مقام بتایا ہے جہاں انہیں دوزخ میں جانا ہے، پھر یہ بھی فرمایا کہ اُن میں سے جو لوگ توبہ کر لیں اور اصلاحِ حال کر لیں اور اللہ پر پختہ بھروسہ کر لیں اور اللہ کے لئے اپنے دین کو خالص کر لیں تو یہ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کی راہ ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ شروع میں ارشاد فرمایا کہ منافقین اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور سورۂ بقرہ کے دوسرے رکوع میں فرمایا یُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ وہ اللہ کو اور اہلِ ایمان کو دھوکہ دیتے ہیں۔ (مسلمانوں سے) جھوٹ کہہ دیتے ہیں کہ ہم مؤمن ہیں اندر سے مؤمن نہیں ہیں اور پھر انہیں نعمتوں اور برکتوں کے آرزو مند ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ گویا اُن کا عقیدہ اور ان کا ایمان سے منحرف ہونا اللہ کو معلوم ہی نہیں۔

پھر فرمایا وَهُوَ خَادِعُهُمْ (اللہ ان کے دھوکے کی اُن کو سزا دینے والا ہے)۔ لفظ وَهُوَ خَادِعُهُمْ علی سبیل المشاکلۃ فرمایا ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے وَهُوَ خَادِعُهُمْ کو اس صورتِ حال پر محمول کیا ہے جو قیامت کے دن اُن کے سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ روشنی میں مسلمانوں کے ساتھ چلتے رہیں گے۔ پھر وہ روشنی سلب کر لی جائے گی اور منافقین کے اور اہلِ ایمان کے درمیان دیوار لگا دی جائے گی۔ جس کا ذکر سورۂ حدید میں ہے قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ.

چونکہ منافقین کی حرکت بد کا وبال انہیں پر پڑنے والا ہے اس لئے سورۂ بقرہ میں فرمایا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (وہ دھوکہ نہیں دیتے مگر اپنی ہی جانوں کو اور وہ اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں)۔ منافقین کی دھوکہ دہی کے تذکرہ کے بعد اُن کی نماز کا حال بیان فرمایا، اور فرمایا وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں) جس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں ایمان نہیں ہے پھر نماز کی کیا اہمیت ہوتی۔ لیکن چونکہ ظاہراً یہ کہہ چکے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اس لئے ظاہر داری کے طور پر نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اور چونکہ نماز کی اہمیت اور ضرورت اُن کے دلوں میں اُتری ہوئی نہیں ہے اس لئے سستی کے ساتھ کسلاتے ہوئے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ مؤمن ہوتے تو اچھی نماز پڑھتے اور اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرتے لیکن وہاں تو مسلمانوں کو دکھانا مقصود ہے کہ ہم تمہاری طرح سے نمازی ہیں تاکہ اسلام سے جو ظاہری دنیاوی منافع ہیں اُن سے محروم نہ ہوں۔ اللہ سے ثواب لینا

مقصود ہو تو اچھی نماز پڑھیں۔ دکھاوے کے لئے جو عمل کیا جائے وہ اور طرح کا ہوتا ہے۔ اس میں خوبی اور عمدگی اختیار نہیں کی جاتی۔

ان کی اسی ریا کاری کو بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا یُرَآءُ وْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا (کہ وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا) صاحب بیانُ القرآن لکھتے ہیں یعنی محض صورت نماز کی بنا لیتے ہیں جس میں نماز کا نام ہو جائے اور عجب نہیں کہ اٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو۔ کیونکہ جہر کی ضرورت تو بعض نمازوں میں امام کو ہوتی ہے امامت تو ان کو کہاں نصیب ہوتی مقتدی ہونے کی حالت میں اگر کوئی بالکل نہ پڑھے فقط لب ہلاتا رہے تو کسی کو کیا خبر ہو تو ایسے بداعتقادوں سے کیا بعید ہے کہ زبان بھی نہ ہلتی ہو۔

منافقوں کی دوسری حالت بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ کہ وہ اس کے درمیان اُدھر میں لٹکے ہوئے ہیں۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ذالک مجموعہ ایمان وکفر کی طرف اشارہ ہے جس پر مؤمنین اور کافرین کے ذکر سے دلالت ہو رہی ہے پھر فرماتے ہیں کہ مؤمنین اور کافرین کی طرف اشارہ مانا جائے تو یہ بھی صحیح ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عالمِ حیرانی میں تردد میں پڑے ہوئے ہیں شیطان نے اُن کو حیرت میں ڈال دیا ہے، پھر امام راغب سے التذبذب کا معنی نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں صوت الحرکۃ للشیٔ المعلق ثم استعیر لکل اضطراب وحرکۃ او تردد بین الشیئین یعنی ذبذبہ اس آواز کہا جاتا ہے جو کسی لٹکی ہوئی چیز سے نکل رہی ہو۔ پھر بطور استعارہ ہر اضطراب اور ہر حرکت کے لئے یا دو چیزوں کے درمیان متردد ہونے کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ منافقین کفر وایمان کے درمیان اپنی حالت ظاہرہ کے اعتبار سے متردد ہیں ورنہ حقیقت میں تو کافر ہی ہیں۔

مزید فرمایا لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ یعنی منافقین بظاہر دونوں طرف ہیں مسلمانوں سے بھی ملتے ہیں اور کافروں سے بھی۔ اور ہر ایک کے ساتھ اپنی محبت اور دوستی ظاہر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں نہ اِنکی طرف ہیں نہ اُنکی طرف، جو لوگ منافق ہوتے ہیں اپنے خیال میں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے چالاک ہیں دیکھو دونوں جماعتوں کو اپنا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کو کوئی جماعت بھی اپنا نہیں سمجھتی۔ منافق کا کردار خواہ وہ کتنی ہی قسمیں کھائے کسی فریق کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مثل المنافق کالشاۃ العائرۃ بین الغنمین تعیر الی ھٰذہ مرۃ والٰی ھذہ مرۃ (رواہ مسلم عن ابن عمرؓ) یعنی منافق کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بکری دو ریوڑوں کے درمیان ہو کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے اور کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے۔ شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ اس سے وہ بکری مراد ہے جو گابھن ہونے کے لئے کبھی اس ریوڑ میں اپنے لئے نر تلاش کرتی ہے اور کبھی دوسرے ریوڑ میں۔ (ذکرہ القاری فی المرقاۃ)

فائدہ........ معلوم ہوا کہ نماز میں سُستی کرنا کسلاتے ہوئے نماز کے لئے اٹھنا بددلی سے نماز کے افعال ادا کرنا منافقوں کا طریقہ ہے، اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ خوب خوشی اور بشاشت اور نشاط کے ساتھ نماز پڑھیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس میں زردی آ جاتی ہے اور شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو کھڑے ہو کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے ان میں اللہ کو نہیں یاد کرتا مگر تھوڑا سا۔ (رواہ مسلم)

چار ٹھونگیں مارنے کا مطلب یہ ہے کہ لپ جھپ سجدہ کرتا ہے، سر رکھا بھی نہیں کہ اٹھا لیا جیسا کہ مرغا جلدی جلدی ٹھونگیں مار کر دانہ اٹھاتا ہے اور شیطان کے سینگوں کے درمیان سورج کے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جب سورج چھپتا ہے اور نکلتا ہے تو شیطان ایسی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے جو سورج کے اور اس کے دیکھنے والوں کے درمیان ہو وہاں کھڑے ہو کر سر ہلاتا ہے جس سے دیکھنے والوں کو سورج کی شعاعوں کی جگمگاہٹ محسوس ہوتی ہے وہ یہ حرکت اس لئے کرتا ہے کہ سورج کی پرستش کرنے والے اس وقت اس کی عبادت کریں۔

چونکہ منافقین مسلمانوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے تھے نماز کی فرضیت اور فضیلت اور اس کے اجر وثواب کا یقین نہیں تھا اس لئے بُرے دل سے نمازوں میں حاضر ہوجاتے تھے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھی اور سلام پھیر کر فرمایا کیا فلاں حاضر ہے؟ حاضرین نے عرض کیا نہیں، پھر فرمایا کیا فلاں حاضر ہے؟ عرض کیا گیا کہ نہیں، آپؐ نے فرمایا بلاشبہ یہ دو نمازیں (عشاء اور فجر) منافقین پر سب نمازوں سے زیادہ بھاری ہیں، اور اگر تم کو معلوم ہوجائے کہ ان میں کیا اجر وثواب ہے تو ان نمازوں میں حاضر ہوتے اگرچہ گھٹنوں کے بَل چل کر آنا پڑتا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی کما فی المشکوٰۃ ص ۹۶)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر ان میں سے (یعنی جماعت میں غیر حاضر ہونے والوں میں سے) کسی کو پتہ چل جائے کہ اُسے ایک چکنی ہڈی مل جائے گی یا بکری کے دو اچھے کھر مل جائیں گے تو عشاء کی نماز کے لئے حاضر ہوجائے۔ (صحیح بخاری ص ۸۹ ج ۱) طالبِ دنیا کو ذرا سی دنیا بھی مل جائے تو تکلیف اٹھانے اور نیند قربان کرنے کو حاضر ہوجاتا ہے اور جسے اعمالِ صالحہ پر اَجر وثواب ملنے کا یقین نہیں وہ اپنے نفس کو اجر وثواب والے عمل کے لئے آمادہ نہیں کرسکتا اس بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے کھر کی مثال دے کر واضح فرمایا۔

فائدہ.......... معلوم ہوا کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نماز اور جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ منافقوں کو بھی اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے نماز پڑھنی پڑتی تھی جب دینی فضا بن جاتی ہے تو جو اپنے دل سے دین دار نہ ہو اُسے بھی مجبوراً دینداروں کے ساتھ گھسٹنا پڑتا ہے۔ اور یہی حال بدعملی اور بے دینی کا ہے جب بدعملی اور بے دینی کی فضا ہوتی ہے تو اچھے جذبات والا بھی بےعملوں اور بے دینوں کے طور طریق اختیار کرلیتا ہے آج بے دینی اور بےعملی کی فضا ہے بے نمازی بغیر کسی شرم وحیا کے دینداروں میں گھل مل کر رہتے ہیں اور اپنا کوئی قصور محسوس نہیں کرتے، انہیں ایک نماز چھوٹنے کا ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔ اگر دوبارہ دینی فضا بن جائے تو پھر وہی عمل کی فضا لوٹ آئے جو زمانۂ نبوت میں تھی۔

پھر مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ) کافر منافق ہوں یا دوسرے عام کافر ہوں ان کو دوست بنانا اور اہلِ ایمان کو چھوڑ دینا منافقوں کا طریقہ ہے تم اسے اختیار نہ کرو: اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا (کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت صریحہ قائم کرلو) یعنی اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے منع فرمایا ہے اس چیز کو اختیار کرکے اپنے کو مجرم اور مستحقِ عذاب بنانے کے لئے اپنے عمل سے اپنے اوپر کیوں حجت قائم کرتے ہو۔

اس کے بعد منافقین کا عذاب ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ منافق دوزخ میں سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔ صاحب روح المعانی ص ۱۷۷ ج ۵ لکھتے ہیں کہ دوزخ کے سات طبقے ہیں پہلے طبقے کا نام جھنم اور دوسرے کا لَظٰی اور تیسرے کا حطمہ اور چوتھے کا سعیر اور پانچویں کا سقر اور چھٹے کا جحیم اور ساتویں کا ھاویہ ہے اور کبھی کبھی ان سب کے مجموعے کو اَلنَّار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان طبقات کو درجات اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ متدارک ہیں یعنی ایک دوسرے کے نیچے ہیں۔ درک اور درج میں یہ فرق ہے کہ اوپر سے نیچے آئیں تو ہر طبقے کو درک سے موسوم کرتے ہیں اور نیچے سے اوپر کو جائیں تو ہر طبقے کو درج سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس کے بعد صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں کہ منافق کو بنسبت دوسرے کافروں کے سخت عذاب اس لئے ہوگا کہ اس نے کفر کے ساتھ

مزید اس بات کو اختیار کرلیا کہ اسلام کا مذاق اُڑایا اور اہل اسلام کو دھوکہ دیا۔

پھر فرمایا وَلَنْ تَجِدَلَهُمْ نَصِيْرًا کہ اے مخاطب! منافقوں کے لئے تو کوئی مددگار نہ پائے گا جو انہیں عذاب سے نکال دے یا اُن کا عذاب ہلکا کردے۔

پھر فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا کہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے نفاق سے توبہ کی وَاَصْلَحُوْا اور اپنی نیتوں کو درست کرلیا اور نفاق کی حالت میں جو بگاڑ کیا تھا اس کو درست کردیا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ اور اللہ پر مضبوط بھروسہ رکھا (یعنی اپنی تدبیروں پر اور کافروں سے تعلق رکھنے پر جو بھروسہ تھا اس کو چھوڑا اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا اور توکل اختیار کیا)۔

وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کیا (یعنی اسلام کو سچے دل سے قبول کیا جس سے صرف اللہ کی رضا مقصود ہو لوگوں کو دکھانا مقصود نہ ہو اور یہ غرض سامنے نہ ہو کہ مسلمانوں کے سامنے اظہار اسلام کر کے مسلمانوں سے منافع حاصل کرتے رہیں گے اور ان سے جو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے اس سے بچتے رہیں گے) ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ کہ یہ لوگ مخلص مؤمنین کے ساتھ جنت کے بلند درجات میں ہوں گے۔ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (عنقریب اللہ مؤمنین کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا)۔

آخر میں فرمایا مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے سزا دینے سے کوئی نفع نہیں پہنچتا اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے جو تم کو سزا دینے سے پورا ہو جائے وہ حکمت کے مطابق کافروں کو سزا دیتا ہے اور کفر بہت بڑا کفرانِ نعمت ہے اگر شکر گذار بندے بنو جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان قبول کرو تو عذاب نہ ہوگا۔

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (اور اللہ تعالیٰ قدردان ہے) اصحابِ ایمان کے ایمان کی اور اعمالِ صالحہ کی قدردانی فرماتا ہے (اُسے ہر چیز کا علم بھی ہے) سب کا ثواب عطا فرمائے گا۔

قال صاحب الروح ص۱۷۹ ج۵ أی ایّ شیٔ یفعل الله سبحانه بسبب تعذیبکم أیتشفی به من الغیظ ؟ ام یدرک بـه الثار ام یستجلب نفعًا؟ او یستدفع به ضررًا کما هو شان الملوک وهو الغنی المطلق المتعالی عن امثال ذلک وانـما هو امر یقتضیه مرض کفرکم ونفاقکم فاذا احتمیتم عن النفاق ونقیتم نفوسکم بشریة الایمان والشکر فی الـدنیا برئتم وسلمتم والا هلکتم هلاکالا محیص عنه بالخلود فی النار ۔(صاحب روح المعانی فرماتے ہیں تمہیں عذاب دے کر اللہ تعالیٰ کیا کرے گا کیا اس سے اس کے غضب کو تسکین مل جائے گی یا اس سے اسے بدلہ مل گیا یا کوئی اور نفع مل گیا اس سے اس کی کوئی تکلیف دور ہوگی جیسا کہ بادشاہوں کی حالت ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو غنی مطلق ہے اس طرح کی چیزوں سے بلند ہے عذاب کا معاملہ تو تمہارے کفر و نفاق کا تقاضا ہے جب تم اپنے آپ کو نفاق سے آزاد کرلو اور اپنے نفسوں کو پاک کر کے دنیا میں ایمان و شکر اختیار کرو تو تم آزاد ہو گئے اور سلامتی والے ہو گئے ورنہ تو ایسی ہلاکت تم پر آئے گی کہ پھر ہمیشہ کے جہنم کے عذاب کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہوگا)۔